پہلا ایڈیشن

حصہ پنجم

تاریخ امتِ مسلمہ

خلافت عثمانیہ

پہلے خلیفہ سلطان سلیم اول سے آخری خلیفہ عبدالمجید ثانی تک

اسلامی اندلس:
پہلی صدی ہجری سے سقوطِ غرناطہ (897ھ تک)

تاریخ برصغیر:
سندھ اور بلوچستان کی مسلم حکومتیں

تقریظ
شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب مدظلہ

مقدمہ
شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

کاوش
مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ
استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی

بسم الله الرحمن الرحيم

تاریخ امت مسلمہ

خلافت عثمانیہ

پہلے خلیفہ سلطان سلیم اول سے آخری خلیفہ عبدالمجید ثانی تک

اسلامی اندلس:

پہلی صدی ہجری سے سقوط غرناطہ (897ھ تک)

تاریخ برصغیر:

سندھ اور بلوچستان کی مسلم حکومتیں

حصہ پنجم

تحقیق

مورخ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

بلاک A-1 گلستان جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی

0321-3135009|0321-2000870

www.almanhalpublisher.com

almanhalpublisher@gmail.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

تاریخِ اُمّتِ مُسلمہ

تحقیق

مورخ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

پاکستان بھر میں ملنے کے پتے

لاہور

مکتبہ رحمانیہ	0343-9697395 042-37224228
[illegible]	0332-4959155
المیزان	042-37122981
مکتبۃ العلم	042-37211788
[illegible] پبلشرز	0333-4101085

راولپنڈی

اسلامی کتاب گھر	0514-830451
[illegible]	0332-5459409

ملتان

مکتبہ حقانیہ	0300-4541093
مکتبہ امدادیہ	0300-6380664
مکتبہ [illegible] العلوم	0302-9635918

فیصل آباد

اسلامی کتاب گھر	0323-2000921

اسلام آباد

مکتبہ فریدیہ	0343-5846073

حیدرآباد

محمد حسن	0321-8728384
مکتبہ اصلاح و تبلیغ	0320-3015228

کوئٹہ

کتب خانہ رشیدیہ	0333-7825484

کوہاٹ

مکتبہ حسین بن علی	0334-8299029

پشاور

دارالاخلاص	0300-5831992 091-2567539
بیت العلم	0300-9348654
مکتبہ عمر فاروق	0311-8845717 091-2580103
مکتبہ فاروق اعظم	0345-9597693
مکتبہ [illegible]	0300-5990822

چمن

دار العلم	0315-4105987
مکتبہ عزیزیہ	0315-7788573

ڈیرہ اسماعیل خان

مرکزی کتب خانہ	0346-7851984 0336-9755780
مکتبہ حقانیہ	0346-5435446

درہ پیزو

مکتبہ علمیہ	0305-9571570

سرائے نورنگ

مکتبہ ختم نبوت کتاب گھر	0302-5565112

بنوں

مکتبۃ الاسلام	0334-5345720
مکتبہ عرفان	0333-9749663
مکتبہ شیخ الہند	0336-9283535

میران شاہ

مکتبہ رحمانیہ	

مردان

مکتبہ الابرار	0321-9872067
مکتبہ امام محمد	0311-9383776

کرک

مکتبہ حقانیہ	0313-9836011

اکوڑہ

مکتبہ سید احمد شہید	0332-9984701

سوات

مکتبہ صدیقیہ	0334-9332627
مکتبہ [illegible]	0344-8178216

مانسہرہ

ادارہ محمودی کتب خانہ	0311-8790712

ہنگو

مکتبہ [illegible]	0332-4345384

سواڑی بازار

مکتبہ حسن	0335-9520022
مکتبہ حبیبیہ	0333-9691389
مکتبہ صدیقیہ	0333-9705047

نوشہرہ

القاسم اکیڈمی	0346-4010613
ادارۃ العلم	0321-9746859

دیر بالا

ادارہ محمودیہ	0300-5571532
مکتبہ صدیقیہ	0331-8174101

صوابی

اسلامی کتب خانہ	0303-8004066
مدنی کتب خانہ	0302-5687765

شبقدر

مکتبہ بیت العلم	0345-0947410

مری

مکتبہ محمودیہ	0321-7484917
مکتبہ [illegible]	0310-2197703

ٹانک

مکتبہ [illegible]	0304-0988857

فہرست مضامین

تاریخِ اُمّتِ مُسلمہ

حصّہ پنجم

خلافت عثمانیہ

پہلے خلیفہ سلطان سلیم اول سے آخری خلیفہ عبدالمجید ثانی تک

اسلامی اندلس:

پہلی صدی ہجری سے سقوط غرناطہ (897ھ تک)

تاریخ برصغیر:

سندھ اور بلوچستان کی مسلم حکومتیں

بسم الله الرحمن الرحیم

قارئین سے چند باتیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ اُمتِ مُسلمہ کے چار حصوں میں لگ بھگ نوسو سال کی اسلامی تاریخ کا جائزہ لے چکے ہیں۔ ان نو صدیوں میں مسلمانوں پر عروج وزوال کے مختلف دور آئے۔ خلافتِ راشدہ کا سنہرا دور گزرا۔ خلافتِ بنواُمیّہ کے عروج کے تین عشروں میں فتوحات کا تانتا بندھا رہا۔ پھر بنوہاشم کی انقلابی تحریک برپا ہوئی جس کے نتیجے میں بنوعباس برسراقتدار آئے اور بغداد مرکزِ خلافت بنا۔ یہ شہر سوا پانچ صدیوں تک عباسی تہذیب وتمدن اور علم وثقافت کا گہوارہ رہا۔ اسی دوران عالمگیر اسلامی خلافت کا دور ختم ہوا اور مختلف ممالک میں الگ الگ خاندان آکر حکمران بنتے رہے۔

خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد تیسری صدی ہجری کے اواخر سے چھٹی صدی ہجری کے وسط تک عراق، شام اور افریقہ میں شیعہ حکومتوں کا زور رہا جسے غزنوی، سلجوقی اور ایوبی حکمرانوں نے ختم کیا۔

پانچویں صدی ہجری سے ساتویں صدی ہجری تک صلیبی جنگیں جاری رہیں اور شام ومصر کے ساحلی علاقے میدانِ جنگ بنے رہے۔ ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کی یورش نے عالمِ اسلام کا نقشہ بدل دیا۔ پھر یہ قوم ایک صدی کے اندر مشرف با اسلام ہوکر عراق، ایران، خراسان، وسطِ ایشیا اور بلادِ خزر کی حکمران بنی رہی۔

اس دوران ہندوستان کے خاندانِ غلاماں اور مصر کے مملوکوں نے اسلام کے دفاع کا حق ادا کیا، انہوں نے تاتاریوں کو اپنے علاقوں پر مسلط نہ ہونے دیا اور اسلامی علوم وثقافت کے صدیوں پرانے مراکز اور کتب خانوں کو محفوظ رکھا۔ ان ممالک کے علماء نے پوری تندہی سے امت کی علمی میراث کی حفاظت کی اور اسلام کی اصل شکل کو باقی رکھا۔

منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی بربادی کے بعد مرکزِ خلافت بھی تبدیل ہوکر مصر منتقل ہوگیا۔ یہاں نئے عباسی خلفاء مملوک بادشاہوں کی نگہداشت میں اُمت کے لیے علامتِ وحدت کے طور پر باقی رہے۔

اُدھر ایشیائے کوچک میں عثمانیوں نے ایک نئی حکومت قائم کرکے یورپ میں فتوحات کا سلسلہ شروع کردیا۔ نویں صدی ہجری کے وسط میں انہوں نے قسطنطنیہ فتح کرکے یورپ کا غرور خاک میں ملادیا۔ فتحِ قسطنطنیہ کے وقت مسلمانوں کے اقبال کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ تاریخ اُمتِ مُسلمہ کے حصہ چہارم کے آخر میں ہم سلطان محمد فاتح

کے حالات کے ضمن میں اس شاندار فتح کا جائزہ لے چکے ہیں۔ مجموعی طور پر اب تک ہم نے درج ذیل اہداف وعنوانات کو مکمل کیا ہے:

- تاریخ ماقبل از اسلام
- سیرت نبویہ
- خلافتِ راشدہ (۱۱ھ تا ۴۱ھ تک)
- خلافتِ اُموی۔ دورِ بنو سفیان (۴۱ھ تا ۶۴ھ)
- خلافت زبیریہ (۶۴ھ تا ۷۳ھ)
- خلافتِ اُموی۔ دورِ بنو مروان (۷۳ھ تا ۱۳۲ھ)
- خلافتِ عباسیہ بغداد (۱۳۲ھ تا ۶۵۶ھ)
- دولتِ بنو عبید۔ مصر وافریقہ (۲۹۷ھ تا ۵۶۷ھ)
- ایوبی سلطنت۔ شام ومصر (۵۶۷ھ تا ۶۵۸ھ)
- سلجوقی سلطنت۔ خراسان، وسطِ ایشیا، ایشیائے کوچک (۴۲۹ھ تا ۷۰۷ھ)
- خوارزم شاہی سلطنت۔ وسطِ ایشیا وخراسان (۵۳۸ھ تا ۶۲۸ھ)
- منگول سلطنتیں (ساتویں صدی ہجری کے اوائل سے آٹھویں صدی ہجری کے اواخر تک)
- دولتِ ممالیک مصر وشام (۶۴۸ھ تا ۹۲۳ھ)
- خلافت عباسیہ قاہرہ (۶۵۹ھ تا ۹۲۳ھ)
- سلطنتِ عثمانیہ۔ سلطان بایزید ثانی کی معزولی تک (۶۹۹ھ تا ۹۱۸ھ)

اب ہم حصہ پنجم کا آغاز عثمانی سلطان سلیم اوّل سے کر رہے ہیں جس کے دور میں شام اور مصر کی زمین کے ساتھ منصبِ خلافت بھی عباسیوں سے عثمانیوں کو منتقل ہو گیا۔ سلطان بایزید ثانی تک عثمانی صرف سلطان تھے مگر سلطان سلیم اوّل کے زمانے سے بابِ عالی[1] کو مرکزِ خلافت کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی اور آخر تک یہ اعزاز اسی کے پاس رہا۔

+++

تاریخ کے اس طویل وعمیق مطالعے کے دوران ہم نے قصداً دنیائے اسلام کے دو اہم خطوں سے زیادہ سروکار نہیں رکھا۔ ایک اندلس اور دوسرے برِصغیر۔ یہ دونوں خطے اُن سلطنتوں اور خلافتوں سے بہت دور تھے جو عالم اسلام کی مرکزی سیاست پر حاوی تھیں۔ خلافت چاہے بغداد میں رہی ہو یا قاہرہ میں، وہاں کے انقلابات اندلس اور برِصغیر پر

---

[1] سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ میں "بابِ عالی" یا "آستانہ" (پایۂ تخت) خاص اصطلاحات ہیں جن سے عثمانی ایوان یا دربارِ خلافت مراد لیا جاتا ہے۔

کچھ خاص اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ بایں ہمہ یہ عالمِ اسلام کے دو نہایت گنجان، مردم خیز اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بڑے ترقی یافتہ علاقے تھے جہاں فرزندانِ توحید نے صدیوں تک حکومت کی، یہاں متعدد حکمران خانوادے آئے، اسلام دشمن طاقتوں سے بڑے بڑے معرکے ہوئے اور باقی عالمِ اسلام سے ایک کنارے پر ہونے کے باوجود یہ مقامات اپنی جگہ خود مسلمانوں کے لیے بہشتِ ارضی کہلانے کے مستحق تھے اور یہاں کی دولت وثروت اور امن وامان کے قصے دنیا بھر میں مشہور تھے۔ پس ہم خلافتِ عثمانیہ کا باب مکمل کر کے پہلے سلطنتِ اسلامیہ اندلس اور پھر برصغیر کی اسلامی حکومتوں کا جائزہ لیں گے۔ اس بناء پر اس حصے کی ترتیب یوں ہوگی:

پہلا باب: خلافتِ عثمانیہ (سلطان سلیم اول تا سقوطِ خلافت)

دوسرا باب: اسلامی اندلس (ابتداء تا انتہاء)

تیسرا باب: تاریخ برصغیر (سندھ اور بلوچستان کی مسلم حکومتیں)

✦✦✦

اس حصے (حصہ پنجم) میں خلافتِ عثمانیہ کی تاریخ لکھتے وقت مجھے بہت سے نئے مآخذ بھی ملے جو حصہ چہارم میں سلطنتِ عثمانیہ کے حالات (ارطغرل سے بایزید ثانی تک) مرتب کرتے وقت دستیاب نہ تھے۔ میں یہ کتب فراہم کرنے والے مہربان دوستوں کے لیے دل سے دعاگو ہوں۔ خصوصاً بھائی اسلم آفتاب صدیقی (کینیڈا) کا بے حد شکرگزار ہوں کہ جنہوں نے ترکی سے بہت مفید کتب خرید کر مجھ تک پہنچانے کا بندوبست کیا۔ جزاہم اللہ خیر الاحسن الجزاء۔

سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ مرتب کرتے وقت ایک مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ مآخذ میں واقعات کی کہیں فقط ہجری تاریخ لکھی گئی ہے اور کہیں صرف شمسی تاریخ۔ ایسے میں راقم نے بعض تقویمی سوفٹ ویئرز استعمال کر کے ہجری اور شمسی تاریخوں کی بھی تخریج کی تاہم نقل اور تخریج میں فرق کرنے کے لیے منقولہ تاریخ کو اصلاً بیان کیا اور تخریج شدہ تاریخ کو قوسین میں نقل کر دیا۔ اس بناء پر آپ کو کہیں ہجری تاریخ کے ساتھ قوسین میں شمسی تاریخ اور کہیں شمسی تاریخ کے ساتھ قوسین میں ہجری تاریخ نظر آئے گی۔ اس کی وجہ ہجری تاریخ کو ثانوی سمجھنا نہیں بلکہ مذکورہ مجبوری ہے۔

سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ کے آخری اوراق میں راقم نے سلطان عبدالحمید ثانی کے حالات کو قدرے تفصیل سے پیش کیا ہے جس کی وجہ ان کی عبقری شخصیت اور ان کے دور کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ راقم کا اس مردِ مجاہد کے حالات پر مستقل کام کرنے کا بھی ارادہ ہے۔ اللہ سے توفیق کی دعا ہے۔

✦✦✦

اس حصے کا دوسرا باب "اسلامی اندلس" کی تاریخ سے متعلق ہے۔ اس باب کی تیاری میں لگ بھگ پچیس تیس قدیم عربی کتب کو سامنے رکھا گیا ہے جن میں علامہ ابن اثیر کی "الکامل فی التاریخ"، حافظ ابن کثیر کی "البدایۃ والنھایۃ"، حافظ ذہبی کی "تاریخ الاسلام" اور "سیر اعلام النبلاء"، علامہ زرکلی کی "الاعلام" اور ابن

خلدون کی شہرہ آفاق تاریخ جیسی موسوعات سرفہرست ہیں۔

نیز خاص اندلس اور افریقہ کی تاریخ پر لکھی گئی متعدد قدیم کتب پیش نظر رہیں جن میں ابن عذاری مراکشی کی ''البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب''، ابن ابار کی ''الحلۃ السیراء''، علامہ مقری کی ''نفح الطیب''، چھ اندلسی علماء کی مرتب کردہ ''المغرب فی حلی المغرب''، علامہ ضبی کی ''بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس''، علامہ محی الدین تمیمی مراکشی کی ''المعجب فی تلخیص اخبار المغرب'' اور دیگر کئی کتب شامل ہیں۔

خوش قسمتی سے اس دوران راقم کو مصر کے نامور محقق شیخ محمد عبداللہ عنان مرحوم کی شاہکار کتاب ''دولۃ الاسلام فی الأندلس'' مل گئی جو پانچ جلدوں میں ہے۔ درحقیقت اس بندۂ خدا نے یہ کتاب لکھ کر اندلس کی تاریخ پر ایسا شاندار کام کر دیا ہے کہ متقدمین ومتاخرین اور مسلم وغیر مسلم مؤرخین کی جملہ کتب کی تقریباً تمام تفاصیل اور جزئیات نہایت خوبصورت انداز اور بہترین ترتیب کے ساتھ یکجا ہو گئی ہیں۔ اگر میرے سامنے یہ کتاب نہ ہوتی تو فقط اندلس پر کام کرنے میں تین چار سال صرف ہو جاتے اور پھر بھی میں ویسی تحقیق نہ کر سکتا جیسی فاضل مصنف نے کی ہے۔ اللہ مصنف مرحوم سے اپنے شایانِ شان معاملہ فرمائے کہ ان کی سالہا سال کی محنت نے ہم جیسے طلبہ کے کئی سال بچا لیے۔ چنانچہ میں نے اندلس کے دورِ زوال کی تاریخ میں اکثر وبیشتر انہی کی کتاب پر اعتماد کیا ہے۔ نیز ڈاکٹر عبدالرحمن علی کی نہایت مفید تصنیف ''التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الیٰ سقوط غرناطۃ'' بھی بہت کام آئی۔

+++

سلطنتِ عثمانیہ اور اسلامی اندلس کی داستان کے آخری اوراق اُس دورِ زوال کا مرثیہ ہیں جس سے ہم آج تک نہیں نکل پائے۔ ان میں کئی الم ناک موڑ ایسے ہیں جہاں دشمنوں کی سازشوں سے زیادہ اپنوں کی خود غرضی، نادانی اور سنگ دلی پر ماتم کرنے کا جی چاہتا ہے۔ حوادث پر حوادث اور ناکامیوں پر ناکامیاں۔ بظاہر ایک لامحدود سلسلہ ہے جو آج تک جاری ہے۔ ان اوراق کو پڑھتے وقت قارئین بار بار دل فگار اور اشک بار ہوں تو عجب نہیں کہ خود لکھنے والے کا حال مختلف نہ تھا۔ قلم کے آنسو تو آپ نہ دیکھ پائیں گے مگر کئی مقامات پر جو حزنیہ اشعار قلم زد ہو گئے، وہ قارئین اور مصنف کے جذبات کی مشترکہ ترجمانی ہے۔

+++

تیسرا باب برصغیر میں سندھ اور بلوچستان کی حکومتوں سے متعلق ہے۔ یہ تاریخ زیادہ تر چھوٹی حکومتوں کی ہے جو یا تو کسی بڑی سلطنت کے ماتحت تھیں یا بڑی سلطنتوں کے دورِ زوال میں انہوں نے خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ اصل مآخذ میں ان حکمرانوں کے حالات بھی مختصر مختصر مذکور ہیں۔ اس لیے قارئین کو اس باب میں شاید کوئی خاص کشش اور دلچسپی محسوس نہ ہوگی، مگر اگلے اَدوار کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ معلومات بہر حال مفید ہیں۔ برصغیر کے عظیم حکمران

خانوادوں کا مفصل تذکرہ ان شاء اللہ تاریخ اُمت مسلمہ کے چھٹے حصے میں ہوگا جس پر کام شروع کیا جانے والا ہے۔

◆◆◆

تاریخ اُمت مسلمہ کے پانچویں حصے پر یہ کام ۲۰۲۰ء کے وسط میں شروع ہوا تھا اور اب ستمبر ۲۰۲۲ء میں اس کی تکمیل ہو رہی ہے۔ یوں اس پر تقریباً سوا دو سال کا عرصہ لگا ہے۔ اس حصے کی تیاری میں قدرے تاخیر ہوگئی جس کی ایک وجہ بعض اہم مآخذ کی کم یابی تھی۔ جب تک وہ نہ ملے، کام آگے نہ بڑھ سکا۔ بجلی کے بحران اور لوڈ شیڈنگ کی کثرت نے بھی کئی ماہ تک کام کی رفتار سست رکھی۔ اس کے علاوہ تاریخ اُمت مسلمہ کے شائع شدہ چاروں حصوں پر نظر ثانی اور انہیں بہتر بنانے کا کام بھی ساتھ ساتھ جاری ہے لہٰذا میرے اوقات کا ایک حصہ اس میں بھی صرف ہوتا رہا۔

راقم درمیان میں علیل بھی رہا۔ دائیں ہاتھ کو حرکت دینا اور کھڑے ہونا یا بیٹھنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ کئی ہفتے کے علاج کے بعد بحمد اللہ افاقہ ہو گیا، تاہم اس کا کچھ نہ کچھ اثر ابھی تک ہے۔ بہر کیف ان وجوہ سے کام میں تاخیر بھی ہوئی اور ترتیب و تدوین میں بعض ایسے دقیق لوازمات کا اہتمام بھی نہ ہو سکا، جو گزشتہ حصوں میں ملحوظ رہے۔

◆◆◆

واٹس ایپ پر روزانہ مجھے متعدد تاریخی سوالات پر مشتمل پیغامات موصول ہوتے رہتے ہیں جن میں سے اکثر کے جوابات میں تاریخ اُمت مسلمہ کے شائع شدہ چار حصوں (خصوصاً حصہ دوم کے آخری باب) میں دے چکا ہوں۔ اس لیے قارئین سے گزارش ہے کہ نئے سوال سے قبل تاریخ اُمت مسلمہ کے متعلقہ ابواب کا مطالعہ کر لیں تو بہتر ہوگا۔ اگر کوئی سوال ضروری ہو تو راقم کے ای میل پر بھیجا کریں۔ گزشتہ دو تین سال میں واٹس ایپ پر موصول ہونے والی چیزوں کی اس قدر کثرت ہوگئی ہے کہ ان پر ایک نظر ڈالنا بھی اچھا خاصا وقت لیتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ متنوع پیغامات کا یہ سیلاب یکسوئی میں بہر حال خلل انداز ہوتا ہے۔ کام کی رفتار اور معیار پر یہ چیزیں بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔

بہر کیف ان تمام عوارض کے ہوتے ہوئے راقم اپنی بساط بھر جدوجہد کے ساتھ جو کچھ کر سکا، وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کام کی تکمیل اور بہتری اور اس عاجز کی صحت و عافیت کے لیے آپ سے دعاؤں کی درخواست ہے۔

محمد اسماعیل ریحان

(rehanbhai@gmail.com)

شب گیارہ بج کر ۲۵ منٹ

جمعہ ۱۲ صفر ۱۴۴۴ھ (۹ ستمبر ۲۰۲۲ء)

ادارہ علوم القرآن، تحصیل حسن ابدال، ضلع اٹک

◆◆◆

پہلا باب

خلافتِ عثمانیہ

سلیم اوّل تا سلطان عبدالمجید ثانی

۹۲۳ھ تا ۱۳۴۲ھ

۱۵۱۷ء تا ۱۹۲۴ء

۴۱۹ سال

خلافتِ عثمانیہ کا اجمالی جائزہ

تُرکانِ عثمان کی خودمختار بادشاہی کا آغاز عثمان خان سے ہوا تھا جو ۶۸۷ھ میں اناطولیہ میں مسند نشین ہوا تھا، اگرچہ اُس نے بادشاہ کا خطاب ۶۹۹ھ میں حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد بالترتیب آورخان، مراد اول، بایزید اول (یلدرم) بادشاہ ہوئے۔ یلدرم ۸۰۵ھ میں تیمور سے شکست کھا کر گرفتار ہوگیا۔ گیارہ سال کی لامرکزیت اور خانہ جنگی کے بعد یلدرم کے بیٹے محمد چلپی نے ۸۱۶ھ میں دوبارہ مرکزی حکومت بنائی۔ اس کے بعد مراد ثانی، محمد ثانی الفاتح اور بایزید ثانی یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ ۹۱۸ھ میں بایزید ثانی کی وفات ہوگئی۔ یوں ۶۹۹ھ سے ۹۲۳ھ تک یعنی ۲۲۴ برس کی مدت عثمانیوں نے بطور بادشاہ حکومت کی۔

سلیم اوّل ۹۱۸ھ (۱۵۱۲ء) میں بادشاہ بنا۔ اس نے ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) میں خلافت کا منصب بھی حاصل کرلیا۔ تب سے لے کر یہ خلافت ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۳ء) تک قائم رہی۔ اس طرح عثمانیوں کا دورِ خلافت (ہجری لحاظ سے) ۴۱۹ سال طویل تھا۔ اس زمانے کو ہم چار مراحل میں تقسیم کرسکتے ہیں:

1. دورِ عروج...... سلیم اوّل سے سلیم ثانی تک: ۹۲۳ھ تا ۹۸۲ھ (۱۵۱۷ء تا ۱۵۷۴ء) ۶۷ سال[1]
2. دورِ زوال...... مراد ثالث تا احمد ثالث: ۹۸۲ھ تا ۱۱۴۳ھ (۱۵۷۴ء تا ۱۷۳۰ء) ۱۶۱ برس
3. دورِ ضعف، جدت و جد و جہد...... محمود خان تا عبدالحمید ثانی: ۱۱۴۳ھ تا ۱۳۲۸ھ (۱۷۳۰ء تا ۱۹۰۹ء) ۱۸۸ سال
4. ترقی پسندوں کے تسلط کا دور...... سلطان رشاد تا عبدالمجید ثانی: ۱۳۲۸ھ تا ۱۳۴۲ھ (۱۹۰۹ء تا ۱۹۲۳ء) ۱۴ سال

(1) دورِ عروج...... سلیم اوّل سے سلیم ثانی تک: ۹۲۳ھ تا ۹۸۲ھ (۱۵۱۷ء تا ۱۵۷۴ء)

اس دور میں سلطنتِ عثمانیہ نے خلافتِ اسلامیہ کا شرف بھی حاصل کرلیا۔ اس کی حدود ایک طرف شام و مصر اور شمالی افریقہ تک پھیل گئیں اور دوسری طرف ایران کا وسیع حصہ بھی اس کے زیرِ قلم آگیا۔ اس دور میں سلیمان القانونی کی عبقری شخصیت نمودار ہوئی اور ترکوں کے دھاوے آسٹریا تک جا پہنچے۔ سلیم اوّل اور سلیمان قانونی کے دور میں عروج اور خیر الدین باربروسا جیسے جہاز رانوں نے یورپ پر بحری فتوحات کا سکہ بٹھا دیا۔ اس دور میں امتِ مسلمہ کے مفادات کا تحفظ، ملت کی وحدت کا قیام اور صلیبیوں کے مقابلے میں مضبوط صف بندی، سلاطینِ بنو عثمان کے اصل اہداف تھے۔

---

① یاد رہے کہ سلیم اوّل کی تخت نشینی ۹۱۸ھ (۱۵۱۲ء) میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد پانچ برس تک وہ بادشاہ تھا، خلیفہ نہیں۔

اُدھر ہندوستان میں انہی دنوں مغلوں کی عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی جس کی علمی، صنعتی، تمدنی و اقتصادی ترقی نے دنیا کی آنکھیں چکاچوند کردیں۔

④ دورِ زوال..... مراد ثالث تا احمد ثالث: ۹۸۲ھ تا ۱۱۴۳ھ (۱۵۷۴ء تا ۱۷۳۰ء)

جس طرح نصف النہار کے بعد زوال شروع ہوجاتا ہے، اسی طرح سلیم ثانی کے بعد بہت جلد مسلمانوں کے زوال کا آغاز ہوگیا۔ اگرچہ زوال کی طرف یہ جھکاؤ، تدریجاً تھا۔ عثمانی ترک اس دوران بھی خاصے دنوں تک آن بان سے حکومت کرتے اور یورپ کے مضبوط مدمقابل کے طور پر اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ تاہم اولو العزم شخصیات کی جگہ کمزور طبع حکمران یکے بعد دیگرے آنے لگے۔ اُمورِ سلطنت میں شاہی خاندان کی خواتین کا عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ نئے حکمران کے تقرر میں قابلیت کو ثانوی درجہ دیا جانے لگا اور اپنی اغراض کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ حکمران بار بار تبدیل ہونے لگے اور ایک سیاسی بحران سلطنتِ عثمانیہ پر چھانے لگا۔

اس زمانے میں بین الاقوامی سیاست کے رنگ ڈھنگ تیزی سے بدلتے گئے۔ پہلے ترکانِ عثمان ایک غالب فریق کی سطح پر تھے۔ پھر وہ برابری کی سطح پر مذاکرات کرتے تھے، تاہم ان مذاکرات میں یورپی طاقتیں اپنی ہوشیاری، معاملہ فہمی اور عاقبت اندیشی کے باعث غالب رہتی تھیں جبکہ مسلمان حکمران غیر معمولی خود اعتمادی کے باعث، معاملے کے نازک پہلوؤں اور مستقبل پر ان کے اثرات کو نظر انداز کردیتے تھے۔ ایسے معاہدے بعد میں ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے تھے مگر چونکہ معاہدوں کا پاس کرنا اسلامی روایت تھی، اس لیے وہ نقصان برداشت کرتے رہتے تھے۔ دوسری طرف اہلِ یورپ کے لیے اگر کوئی معاہدہ مضر ہوتا تو اپنی مجبوری دور ہوتے ہی وہ بلا جھجک اس سے مکر جاتے تھے۔ دورِ زوال میں عثمانیوں کی سیاسی ساکھ اور عسکری قوت اتنی گھٹ گئی کہ اہلِ یورپ ان سے من مانی شرائط پر معاہدے کرانے لگے اور وہ بادلِ نخواستہ ان کی پابندی پر مجبور ہوتے چلے گئے۔ ان کی آزادی و خود مختاری تدریجاً سلب ہوتی گئی۔

اگرچہ اس وقت ایک طرف ترکانِ عثمان اور دوسری طرف مغل سلطنتِ ہند کی ظاہری شان و شوکت کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ مسلمانوں کا دورِ غلامی قریب ہے مگر اتنا ضرور تھا کہ مسلمانوں کی علمی، سیاسی، عسکری اور اقتصادی ترقی کی رفتار کم ہوچکی تھی جبکہ یورپ ان سے پیچھے ہونے کے باوجود اس دوران علم و تمدن، صنعت و حرفت، اسلحہ سازی، جغرافیہ دانی اور سائنس میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا جیسے وہ اپنی صدیوں کی نیند کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہو۔

سترہویں صدی عیسوی میں صورتحال مزید تبدیل ہوئی۔ اب مسلمان ساکت و جامد تھے اور یورپ سیاسی اثر و رسوخ، عسکری طاقت اور اقتصادی قوت میں ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مسلمان اس کے باوجود گہری نیند سوئے رہے۔

⑤ ضعف، جدت و جدوجہد..... محمود خان تا عبدالحمید ثانی: ۱۱۴۳ھ تا ۱۳۲۸ھ (۱۷۳۰ء تا ۱۹۰۹ء)

اٹھارہویں صدی عیسوی (بارہویں صدی ہجری) کے آغاز میں ترکانِ عثمان اور یورپی طاقتیں بظاہر برابری کی سطح پر دکھائی دیتی تھیں مگر اسی صدی کے اختتام پر صورتحال یہ تھی کہ یورپ عالمِ اسلام سے نہ صرف یہ کہ کہیں آگے نکل چکا

تھا بلکہ مختلف یورپی اقوام، عالم اسلام کے مختلف ممالک پر مسلط ہونے کے لیے کوشاں تھیں۔ گویا مسلمانوں کا وہ زوال جو پندرہویں صدی عیسوی میں غیر محسوس طور پر شروع ہوا تھا، اب ایک نہایت تلخ حقیقت بن کر سامنے آ چکا تھا اور تلافی کا وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس دور میں عثمانی سلاطین کی بیرونی مہمات تقریباً ختم ہو گئیں اور وہ فقط اپنے علاقوں کا دفاع کرنے پر مجبور رہے۔

اسی زمانے میں یورپی طاقتیں اپنے بہت سے اختلافات کے باوجود عثمانیوں کے خلاف باہم معاہدے کر کے متحد ہو گئی تھیں۔ روس بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ تاہم اسی دور میں وقت کی للکار سن کر بعض عثمانی سلاطین نے دوبارہ سلطنتِ عثمانیہ کو مضبوط کرنے کی کوشش کی جن میں سلطان عبدالعزیز اور سلطان عبدالحمید ثانی سب سے نمایاں ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں صورتحال یہ تھی کہ افغانستان اور ترکی کے سوا تقریباً تمام مسلم ممالک استعماری طاقتوں کے زیرِ نگیں تھے۔ افغانستان پر برطانوی فوج یکے بعد دیگرے حملے کر رہی تھی جبکہ خلافتِ عثمانیہ کی روز افزوں کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے ختم کرنے کی عالمی سازشیں شروع ہو چکی تھیں، اس کے لیے عثمانی صوبوں میں جگہ جگہ بغاوتیں کرائی جا رہی تھیں اور خود مسلمانوں میں ایسے لوگ تیار کر لیے گئے تھے جو عثمانیوں کے خلاف استعمار کے مددگار بن گئے جن میں محمد علی پاشا کا نام سرفہرست ہے۔ نیز یہودی تنظیمیں سلطنت میں جگہ جگہ متحرک تھیں اور فری میسن کی قائم کردہ ترک جوانوں کی تنظیم جمعیت اتحاد و ترقی نے ترک فوج میں نفوذ حاصل کر لیا تھا۔ ملک میں مذہب اور اقدار مشرق سے آزادی عام ہو گئی تھی۔

اس طویل دور میں دنیا کا تہذیبی، تمدنی، عسکری اور جغرافیائی منظر نامہ بھی تیزی سے بدلا۔ لڑائیوں میں تلوار، نیزے، تیر کمان اور منجنیقوں کا استعمال آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ توپوں، بندوقوں اور پستولوں کا رواج بڑھتا گیا۔ آتشیں اسلحے کو زیادہ سے زیادہ تباہ کن بنانے کی کوششیں جاری رہیں جس میں اہلِ یورپ مسلمانوں پر سبقت لے گئے۔ اس سے کہیں بڑھ کر مواصلات، نقل و حمل اور نشر و اشاعت کے وسائل میں یورپ کی پیش قدمی نے دنیا پر غیر معمولی اثر ڈالا۔ مشینی انقلاب کے باعث اہلِ مغرب مہینوں کا کام دنوں میں کرنے لگے جب کہ مسلمان ان وسائل کے استعمال میں بہت پیچھے رہ گئے۔ جو چیز مغرب میں پرانی ہو جاتی، وہ مسلمانوں کے ہاں جدید شمار ہوتی۔

ان دو صدیوں میں سب سے بڑا نقصان جو تمام خرابیوں کی وجہ بنا، یہ تھا کہ مسلمان اپنے دین اور تہذیب و تمدن سے دور ہونے لگے۔ جوں جوں جدید ایجادات، خصوصاً نقل و حمل اور معلومات کے جدید وسائل نے مشرق و مغرب کے فاصلے سمیٹے، ویسے ویسے مسلمان مغربی تہذیب سے متاثر ہوتے گئے۔ اہلِ یورپ نے مطالعے، تحقیق، تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف، لٹریچر اور فنونِ لطیفہ کے ساتھ ایک بھرپور نظریاتی جنگ شروع کی جس میں مسلمان پسپا ہوتے چلے گئے اور انہوں نے علوم و فنون ہی میں نہیں بلکہ معاشرت، نظریات اور اقدار میں بھی مغرب کی پیروی شروع کر دی۔ ترکی اس ماحول سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک تھا جس کی آبادی میں نصرانی، یہودی اور دیگر قومیں

بکثرت شامل تھیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں سلطنتِ عثمانیہ کے بڑے شہروں خصوصاً استنبول میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد اپنے لباس اور وضع قطع میں یورپی معلوم ہوتی تھی۔ صرف ترکی ٹوپی نے ان کا امتیاز باقی رکھا تھا۔ یہ صورتحال ظاہری تبدیلی سے بھی زیادہ اذہان پر حاوی تھی۔ سلطنتِ عثمانیہ میں جدت پسندوں کی کثرت ہو چکی تھی اور وہاں کے نوجوان اپنے دین، اپنی تعلیم، اپنی تہذیب وثقافت اور اپنی تاریخ کی بابت شدید احساسِ کمتری میں مبتلا ہو رہے تھے اور مغربی طرزِ حیات کو سامانِ نجات سمجھنے لگے تھے۔ آخر کار یہی ذہنی افلاس انہیں لے ڈوبا۔

④ ترقی پسندوں کا تسلط۔ سلطان رشاد تا عبدالمجید ثانی: ۱۳۲۸ھ تا ۱۳۴۲ھ (۱۹۰۹ء تا ۱۹۲۴ء)

جمعیت اتحاد وترقی کے فوجی کمانداروں کی بغاوت کے باعث ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید ثانی کو معزول ہونا پڑا۔ اس کے بعد دو سلاطین: سلطان محمد رشاد اور سلطان وحید الدین محدود اختیارات کے ساتھ تخت نشین رہے۔ اصل اختیارات جرنیلوں کے پاس تھے۔ آخری خلیفہ سلطان عبدالمجید ثانی کی خلافت محض برائے نام تھی۔

قلعوں کی تعمیر اور محصورانہ جنگوں کا سلسلہ بیسویں صدی عیسوی تک جاری رہا مگر بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہوائی جہاز کی ایجاد، جنگوں میں اس کے استعمال اور فضائی بمباری کے بھیانک رواج نے قلعہ بندی کو عملاً غیر مفید بنا دیا۔ چنانچہ تمام پرانے قلعے آثارِ قدیمہ بن گئے، زیادہ سے زیادہ انہیں فوج کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ سرحدوں کی حفاظت کے لیے زمین دوز بنکروں، توپ خانے اور خاردار تاروں سے کام لیا جانے لگا۔

اس زمانے میں جنگِ بلقان برپا ہوئی جس میں یورپ کا بچا کھچا علاقہ بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی اور اس میں شکست کے بعد خلافتِ عثمانیہ کو عملاً معطل کر دیا گیا۔ نئے معاہدوں میں عالمی طاقتوں نے ترکوں کو رسمی خلافت بھی ختم کرنے کا پابند کر دیا۔ آخر فوجی سربراہ مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کا عہدہ ختم کر کے ترکی کو جمہوریہ بنا دیا۔ یہ مسلمانوں کے دورِ زوال کی انتہا تھی۔ اگلے اوراق، انہیں چند سطور کی تشریح ہیں۔

خلافتِ عثمانیہ

پہلا مرحلہ

دورِ عروج

سلیم اوّل سے سلیم ثانی تک

۹۱۸ھ تا ۹۸۲ھ

(۱۵۱۲ء تا ۱۵۷۴ء)

۶۷ سال

سلطان یاوز سلیم اوّل بن بایزید ثانی

۹۱۸ھ تا ۹۲۶ھ

(۱۵۱۲ء تا ۱۵۲۰ء)

نویں صدی ہجری کے اختتام اور دسویں صدی ہجری کے آغاز میں ترکی پر بایزید ثانی کی حکومت تھی۔اس کے بعد اس کا بیٹا سلیم اول اپنے بھائیوں سے شدید کش مکش کے بعد ۹۱۸ھ (۱۵۱۲ء) میں باپ کی منظوری سے تخت نشین ہوا۔

اس کے اقتدار کے آغاز میں عالم اسلام ایک انقلابی دور میں داخل ہو رہا تھا۔اندلس سے اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا،پورے جزیرہ نما پر متعصب نصرانی قابض تھے،مسلمانوں کی نسل کشی اور انہیں جبراً نصرانی بنانے کی مہم جاری تھی۔نصرانیوں کا محکمۂ تفتیش مسلمانوں کو چن چن کر ختم کر رہا تھا۔اسپین کا یہودی جہازران کولمبس نئی دنیا امریکا دریافت کر چکا تھا۔وہاں یورپی اقوام کی نوآبادیات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور امریکا سے حاصل کردہ سونے سے یورپ کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ادھر پرتگالی مہم جو واسکوڈی گاما ہندوستان کے ساحلوں کی راہ دیکھ آیا تھا۔یوں یورپی ممالک کی تاخت و تاراج کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔پوپ کے حکم پر اسپین اور پرتگال کی مسیحی حکومتیں مسلمانوں کو دھمکانے لگی تھیں اور ان کے بحری بیڑے افریقہ اور ہندوستان کے ساحلوں پر چھاپے مار رہے تھے۔مصر کے مملوک حکمران کمزور ہو چکے تھے اور بحیرۂ روم میں پرتگال کا بحری بیڑہ ان پر حاوی تھا۔

اس کے ساتھ ہی مشرق میں شاہ اسماعیل صفوی نے ایک متعصب شیعہ ریاست قائم کر کے اسلامی دنیا میں زبردست خانہ جنگی اور بے پناہ کشت وخوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔چھٹی صدی ہجری کے وسط میں مصر کی دولتِ عبیدیہ کے خاتمے کے بعد لگ بھگ ساڑھے تین صدیاں ایسی گزری تھیں کہ دنیا میں شیعوں کی کوئی حکومت نہیں تھی مگر اسماعیل صفوی نے جو شیعہ حکومت قائم کی وہ نہ صرف تعصب میں بلکہ عسکری طاقت اور رقبے کی وسعت کے لحاظ سے بھی ماضی کی شیعہ حکومتوں سے بڑھ کر تھی۔[1]

صفوی کون تھے؟

ساتویں صدی ہجری میں ہلاکو خان نے خلافتِ عباسیہ بغداد کا خاتمہ کرنے کے بعد ایران،عراق اور آس پاس کے

[1] تاریخ دولة العلية العثمانية از فريد بك محامی: ۱۸۷، ۱۸۸

کئی علاقوں پر مشتمل ایک وسیع مملکت قائم کی تھی جو ڈیڑھ صدی تک باقی رہی۔ اس کے بعد یہ مملکت مختلف مغل سرداروں کے مابین تقسیم ہو گئی۔ نویں صدی ہجری میں تیمور لنگ نے ان تمام علاقوں کو زیر نگین کیا مگر اس کے جانشین یہاں اپنا اقتدار قائم نہ رکھ سکے۔ ایسے میں کئی ترکمان قبائل نے موقع پا کر دجلہ اور فرات کے ساحلی علاقوں میں اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب شاہانِ صفویہ کا بانی اسماعیل صفوی منظر عام پر آیا۔

شاہ اسماعیل صفوی کا نسب نویں صدی ہجری کے شیخ صفی الدین نامی ایک صوفی سے جا ملتا ہے جس نے آذر بائی جان میں صفوی سلسلۂ طریقت کی بنیاد رکھی تھی۔ تیمور لنگ بھی ان کی خانقاہ میں حاضر ہوا تھا۔ شیخ صفی الدین نے ۱۳۳۴ء (۷۳۴ھ) میں وفات پائی۔ یہ سلطان محمد فاتح کا دور تھا جس میں آل تیمور زوال کا شکار ہو چکے تھے اور ایران تقریباً دس چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکا تھا۔ ان میں ترکمانوں کی ریاست ''آق قویونلو'' سب سے طاقتور تھی۔ تبریز سے دیار بکر تک ان ترکمانوں کا راج تھا۔

اس ریاست کا سُنی حاکم اوزون حسن سلطنتِ عثمانیہ سے برسر پیکار تھا۔ اس دوران اثنا عشری مبلغین پیروں فقیروں کے روپ میں بڑی تیزی سے نہ صرف ایران و خراسان بلکہ ایشیائے کوچک کے ترکمانوں میں بھی اپنے عقائد پھیلا رہے تھے اور کچھ قد آور لوگ سیاسی اغراض کے لیے اس حلقے میں داخل ہو رہے تھے۔ چنانچہ شیخ صفی الدین کے جانشینوں کی پانچویں کڑی میں شیخ جنید نامی صوفی نے بھی اثنا عشری مذہب اختیار کر لیا۔ ہزاروں جاہل ترکمان اس کے گرد اکٹھے ہو گئے اور یہ لوگ صفوی کہلانے لگے۔

اوزون حسن نے شیخ جنید کی مقبولیت دیکھتے ہوئے اپنی سیاسی طاقت بڑھانے کے لیے اپنی بہن خدیجہ اس کے نکاح میں دے دی۔ اوزون حسن نے رشتہ دیتے ہوئے قطعاً نہ سوچا کہ یہ رشتہ داری آگے چل کر عالم اسلام کے لیے کس قدر نقصان دہ ثابت ہو گی۔ شیخ جنید اثنا عشری مبلغ تھا جب کہ اس کی یہ بیوی آخر تک سنی حنفی رہی۔

شیخ جنید کی موت کے بعد اس کا بیٹا حیدر خانقاہ میں اس کا خلیفہ بنا۔ وہ اپنے باپ کی طرح شیعہ تھا۔ اس کا نکاح اوزون حسن کی بیٹی یعنی اپنی ماموں زاد حلیمہ سے ہوا۔

حیدر کے بعد اس کا بیٹا اسماعیل صفوی خانقاہ میں گدی نشین بنا۔ وہ ۸۶۳ھ (۱۴۵۹ء) میں پیدا ہوا تھا اور باپ کی جگہ سنبھالتے وقت اس کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ اس کے مریدوں کی تعداد دن بدن بڑھتی گئی۔

اس دوران ۸۸۲ھ (۱۴۷۸ء) میں اس کا نانا اوزون حسن مر چکا تھا اور اس کی ریاست کمزور ہو گئی تھی۔ اسماعیل صفوی نے ۹۰۴ھ (۱۴۹۹ء) میں اس کے پایۂ تخت تبریز پر قبضہ کر کے اپنے اقتدار کا آغاز کیا اور ''آق قویونلو'' خاندان کی سُنی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اگلے پانچ سالوں میں اس نے جنوب میں شیراز اور یزد، مشرق میں استر آباد اور مغرب میں بغداد اور موصل تک کے علاقے فتح کر لیے۔ ہرات کے تیموری حکمران حسین بایقرا کی وفات کے بعد وہاں ازبک سردار شیبانی خان حاکم تھا۔ شاہ اسماعیل نے ۹۰۶ھ (۱۵۱۰ء) میں مرو کے قریب شیبانی خان کو ایک سخت جنگ کے بعد شکست دی

اور خراسان پر بھی قابض ہو گیا۔ یوں ایران، عراق اور خراسان کا وسیع وعریض علاقہ اس کے قبضے میں آ گیا۔

اسماعیل نہایت متعصب شیعہ تھا اور اہل سنت کا قتل واجب سمجھتا تھا۔ حد یہ ہوئی کہ اس بد بخت نے اپنی والدہ حلیمہ کو بھی شیعہ مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا مگر جب وہ نہ مانی تو اسے بھی بے دریغ قتل کر دیا۔

اسماعیل صفوی علوم وفنون سے بے بہرہ نہ تھا۔ اس کا شمار اپنے دور کے نامور شعراء میں ہوتا ہے۔ مگر اس نے روحانیت کے لبادے کو کامیاب سیاست کا ذریعہ بنایا۔ اس کے مریدوں میں سے بہت سے اسے ''خدا'' تصور کرتے تھے۔ اس کے ایک اشارے پر ہزاروں گردنیں کٹنے کے لیے تیار ہو جاتی تھیں۔

اسماعیل صفوی خود ترک النسل تھا اور اس کے مریدوں کی بڑی تعداد بھی ترک تھی۔ اس مناسبت سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے خلفاء کو ایشیائے کوچک بھیج چکا تھا جو دیہاتی لوگوں میں شیعیت کی تبلیغ کر کے انہیں اسماعیل صفوی کا وفادار بنا رہے تھے۔ ترک عقیدے کے لحاظ سے چاہے سنی حنفی کہلاتے تھے مگر ان کی بڑی تعداد جاہل تھی اور وہ کسی بھی نظریے سے متاثر ہو جاتے تھے۔ ہر سال ایسے ہزاروں لوگ ترکی سے ایران جاتے اور اسماعیل صفوی سے بیعت کرتے۔ یوں سنی حنفی ترک قوم دو حصوں: سنی اور شیعہ میں بٹتی چلی گئی۔

یہ وہ دن تھے جب عثمانیوں کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا مگر مشرق میں صفوی سلطنت بھی اسی طرح پھیلتی جا رہی تھی اور اس کی سرحدیں خلیج فارس سے بحیرۂ کیسپین اور دریائے فرات سے دریائے آمو تک وسیع ہو چکی تھیں۔ عثمانیوں اور صفویوں کی سرحدوں کے باہم مل جانے سے دونوں ملکوں میں سرحدی تنازعات بھی ہوئے۔ سنی، شیعہ کشیدگی کے علاوہ اس قسم کے سیاسی مسائل دونوں ملکوں میں آئندہ جنگوں کی وجہ بنے۔

شاہ اسماعیل صفوی محض مذہبی تعصب کی بنا پر سلطنتِ عثمانیہ اور مصر کی دولتِ ممالیک دونوں کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ دولتِ ممالیک اس وقت مضمحل ہو چکی تھی، اس لیے اصل حریف سلطنتِ عثمانیہ تھی۔ ان دونوں کے مابین کشیدگی بھی چل رہی تھی جس سے شاہ اسماعیل نے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی۔ اس نے مملوک سلاطین سے رابطہ کیا کہ اگر مصر ساتھ دے تو عثمانیوں کو دونوں طرف سے گھیرا جا سکتا ہے۔ مگر مملوک حکمران اس کی چال میں نہ آئے، وہ جانتے تھے کہ سلطنتِ عثمانیہ کے بعد شاہ اسماعیل، مصر پر بھی قبضہ کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔

شاہ اسماعیل کو اپنے مقصد کے لیے یورپی طاقتوں سے دوستی گانٹھنے سے بھی کوئی عار نہ تھی۔ اس نے یورپی حکمرانوں کی طرف سفیر بھیج کر انہیں یقین دلایا کہ سلطنتِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنا اس کا اولین ہدف ہے، اگر یورپی طاقتیں اس کا ساتھ دیں تو اس مشترکہ دشمن کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ تاہم فوری طور پر وہاں سے بھی کوئی مثبت جواب نہ ملا۔ کیوں کہ یورپی طاقتوں کا سلطنتِ عثمانیہ سے صلح کا معاہدہ چل رہا تھا اور وہ دوبارہ اپنی افواج میدان میں اتارنے سے قبل یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ اسماعیل میں خود کتنا دم خم ہے۔

شاہ اسماعیل نے زیادہ انتظار نہ کیا۔ اس زمانے میں عثمانی سلطان بایزید ثانی اور اس کے بیٹوں میں سخت کشیدگی چل

رہی تھی اور ہر بیٹا اپنے اپنے علاقے کا خود مختار حکمران بن گیا تھا۔ شاہ اسماعیل نے اس انتشار سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے شہزادہ احمد کی پشت پناہی کرتے ہوئے اسے بایزید سے لڑنے میں مدد دی۔ ان حالات میں شاہ اسماعیل کے خلاف مزاحمت کرنے والا واحد فرد شہزادہ سلیم تھا جو ایشیائے کوچک کا امیر تھا۔

۹۱۳ھ (۱۵۰۷ء) میں شاہ اسماعیل نے ایشیائے کوچک کی مشرقی سرحدوں پر واقع قبائلی ریاست "ذی القدر" کے سردار "علاؤ الدولہ بیگ" سے معمولی اختلاف کو بہانہ بنا کر وہاں فوج کشی کر دی، علاؤ الدولہ کو قتل کر کے اس کے آباؤ اجداد تک کی قبروں کو پامال کر دیا اور مرعش سے البستان تک سارا علاقہ تاراج کر ڈالا۔

شاہ اسماعیل کی ہوشیاری کا یہ عالم تھا کہ سرحدی خلاف ورزی کے بعد اس نے ترک حکومت کو مراسلہ بھیج کر اس کارروائی پر معذرت کی اور اسے اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے ایک ناگزیر اقدام قرار دیا۔ مگر مقتول علاؤ الدولہ، سلطان بایزید ثانی کا سسر اور شہزادہ سلیم کا نانا تھا۔ اس لیے ترک خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ شہزادہ سلیم ایک لاکھ سے زائد سپاہی لے کر سرحد پر پہنچ گیا اور شاہ اسماعیل کو بھاگنا پڑا۔ شہزادہ سلیم اسے کافی سمجھ کر گرجستان کی فتوحات میں مشغول ہو گیا۔ غالباً بھائیوں سے تنازعات اور سلطنت کے اندرونی جھگڑوں کے باعث اس وقت سلیم کے پاس صفویوں سے فیصلہ کن جنگ کی گنجائش نہ تھی۔ [1]

شاہ اسماعیل کے مرکز تبریز پر قبضہ:

سلیم اوّل کی تخت نشینی ۸ صفر ۹۱۸ھ (۲۵ اپریل ۱۵۱۲ء) کو قسطنطنیہ میں ہوئی۔ اس کے بعد اپنے بیٹے سلیمان کو وہاں نائب بنایا اور خود بھائیوں سے جنگ کے لیے نکل کھڑا ہوا جو جگہ جگہ خود مختار حکومتیں بنائے ہوئے تھے۔ ایک سال تک وہ بھائیوں سے مقابلہ کرتا رہا اور آخر صفر ۹۱۹ھ (اپریل ۱۵۱۳ء) میں وہ ان سب کی سرکوبی سے فارغ ہو گیا۔

جب وہ واپس ایڈریانوپل واپس آیا تو وینس، ہنگری اور ماسکو کے سفیر اس کے منتظر تھے۔ سلیم اوّل نے ان سب سے صلح کے معاہدے کیے تاکہ شاہ اسماعیل صفوی سے جنگ کے لیے یکسو ہو سکے۔ جو حالات اس کے سامنے تھے، ان کے پیش نظر اس پر لازم ہو چکا تھا کہ اسلام کے دشمنوں سے جہاد کرے اور اسلامی دنیا میں ان کے حامیوں کو بھی سزا دے۔ اس فکر کے نتیجے میں جنگِ چالدران لڑی گئی۔

جنگِ چالدران کا ذکر شروع کرنے سے قبل ہم اس کے اہم اسباب پر ایک نگاہ ڈال لیتے ہیں:

❶ عثمانیوں کی طرح ایرانیوں کی سلطنت بھی پھیل رہی تھی، اس دور کی سیاست کے مطابق اس کا لازمی نتیجہ تصادم کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا تھا۔

❷ بایزید ثانی کے دور سے عثمانیوں اور صفویوں میں سرحدی جھڑپیں ہوتی آ رہی تھیں، شاہ اسماعیل نے بعض ترک سرداروں کو شکست بھی دی تھی جو اناطولیہ کے سرحدی علاقوں کے حاکم تھے۔

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۰۱ تا ۲۰۴

❸ ایک مدت سے اسماعیل صفوی کے مبلغین، مشرقی اناطولیہ میں شیعہ مذہب کی تبلیغ کرتے پھر رہے تھے اور انہیں سلطنتِ عثمانیہ سے بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے۔

❹ سلیم اوّل کی تخت نشینی سے ایک سال پہلے، اسماعیل صفوی نے اپنے معتمدِ خاص شاہ قلی کو اناطولیہ بھیجا جس نے مقامی لوگوں کو نہ صرف شیعت کی تبلیغ کی اور بغاوت پر اکسایا بلکہ بایزید ثانی کے بیٹوں کے درمیان اقتدار کی جنگ کو بھی بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا۔

❺ اسماعیل صفوی نے سلیم کے تین بھتیجوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی، ان میں سے ایک سلیم کے بھائی شہزادہ احمد کا بیٹا مراد تھا۔ اسماعیل اسے سلطنتِ عثمانیہ کا جائز وارث قرار دے کر سلیم اوّل کا تختہ الٹنا چاہتا تھا تاکہ اپنے مہرے کو تختِ استنبول پر بٹھا کر اس کے نام پر خود حکومت کرے۔

❻ اسماعیل صفوی متشدد شیعہ تھا جبکہ سلیم اوّل کٹر سنی۔ ہر ایک نے اپنے مذہب کی اشاعت وحمایت کے لیے جنگ ناگزیر سمجھی۔

جنگِ چالیدران:

سلیم باقاعدہ اعلانِ جنگ کر کے صفویوں کے مرکز تبریز کی طرف روانہ ہوا۔ سرحد کی ایرانی افواج پسپا ہوتی چلی گئیں تاکہ کسی مناسب مقام پر عثمانیوں سے جم کر لڑ سکیں۔ ۱ رجب ۹۲۰ھ (۲۳ اگست ۱۵۱۴ء) کو تبریز کے باہر چالیدران کی وادی میں فریقین کا آمنا سامنا ہوا۔ یہ مقام مغربی آذربائی جان کی سرحد پر ہے جسے قراعین یا سیاہ چشمہ بھی کہا جاتا ہے۔ دونوں فوجوں کی تعداد ایک ایک لاکھ تھی۔ سلیم اوّل ترکوں کی قدیم روایت کے مطابق قلب لشکر میں تھا، ینی چری فوج کے دس ہزار پیادہ نوجوان اس کا خطرناک ترین ہتھیار تھے۔ اس کا وزیرِ اعظم سنان بیگ دائیں بازو پر تعینات تھا۔ بایاں بازو بگلر بیگ (سپہ سالارِ اعلیٰ) حسن پاشا کی کمان میں تھا۔

اسماعیل صفوی، لشکر کے دائیں بازو میں تھا۔ اس کے ساتھ انتہا پسند اور جوشیلے شیعہ گھڑ سواروں کا جم غفیر تھا جو اپنے شاہ کے لیے جان نثار کرنے پر آمادہ تھے۔ وہ دنیا کی کسی فوج کو اپنے ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے۔ جنگ کا آغاز ترکوں کے حملے سے ہوا جو اتنا تند و تیز تھا کہ اگلی صفوں میں شیعوں کے قدم اکھڑنے لگے۔ شاہ اسماعیل نے یہ دیکھ کر اپنے دائیں اور بائیں بازو کو نیم دائرے کی شکل دی اور گھڑ سواروں کو آگے بڑھایا۔ گھمسان کی لڑائی جاری تھی کہ سلیم نے بذاتِ خود صفویوں کے دائیں بازو پر ایک زوردار حملہ کیا جہاں شاہ اسماعیل موجود تھا۔ اس حملے میں شاہ اسماعیل کے ہاتھ اور پاؤں پر شدید زخم آئے۔ اس سے ملتی جلتی شکل والے ایک ترکمان نے شاہی لباس پہن کر اس کی جگہ لے لی، عثمانیوں نے اسے شاہ سمجھ کر گرفتار کر لیا، جبکہ شاہ اسماعیل موقع سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو گیا۔ عثمانی افواج کو شاندار فتح نصیب ہوئی۔ سلیم اوّل ۱۴ رجب ۹۲۰ھ (۴ ستمبر ۱۵۱۴ء) کو فاتحانہ شان سے تبریز میں داخل ہوا۔

شاہ اسماعیل کا خزانہ استنبول منتقل کر دیا گیا۔ عثمانی گرجستان کے دریائے اراس تک شاہ اسماعیل کے تعاقب میں

گے مگر پھر جاڑے کے آغاز اور برف باری نے ان کی پیش قدمی روک دی۔ سلیم اوّل استنبول واپس چلا گیا اور اس کی فوجوں نے اردگرد کے علاقوں میں پھیل کر ماردین، رقہ، موصل، دیار بکر اور کردستان کا وسیع علاقہ فتح کر لیا۔

اس کے بعد ۲۰ سال تک صفوی ترکی سے پنجہ آزمائی کی جرأت نہ کر سکے۔ تاہم شاہ اسماعیل انتقام لینے کے لیے سازشوں میں برابر مصروف رہا۔[1]

ممالیکِ مصر سے کشیدگی۔ شام کی فتح:

مصر، شام اور جزیرۃ العرب کے بڑے حصے پر تین صدیوں سے قاہرہ کے ممالیک حکومت کر رہے تھے۔ انہوں نے مشرق کے تاتاریوں اور مغرب کے صلیبی جنگجوؤں کو مسلسل شکستیں دے کر اپنی طاقت کا لوہا منوالیا تھا۔ تیمور لنگ ان سے صرف شام چھین پایا مگر بہت جلد مملوکوں نے اسے بازیاب کرا لیا تھا۔

مگر یہ ان کے زوال کا دور تھا۔ عثمانیوں اور مملوکوں کے تعلقات شروع میں ٹھیک تھے۔ کشیدگی کا آغاز تب ہوا جب بایزید ثانی کے دور میں شہزادہ جمشید مصر پہنچا اور مملوکوں نے بایزید ثانی کے خلاف اس کی مدد کی، بات اس حد تک بڑھی کہ دونوں ملکوں کی فوجوں میں جنگ بھی ہو کر رہی۔

سلیم اوّل کی فتوحات نے سلطنتِ ممالیک اور سلطنتِ عثمانیہ کی سرحدوں کو متصل کر دیا تھا جس سے ممالیک کے خدشات مزید بڑھ گئے تھے۔ ایرانی بادشاہ اسماعیل صفوی نے جو عثمانیوں سے شکست کے بعد انگاروں پر لوٹ رہا تھا، اپنی سازشوں کے ذریعے کشیدگی کی چنگاریوں کو جنگ کی آگ میں تبدیل کر دیا۔ اس نے مصر کے سلطان قانصوہ غوری کو یقین دلایا کہ صفوی اور مملوک متحد نہ ہوئے تو عثمانی ان دونوں کو پامال کر ڈالیں گے۔ قانصوہ نے ناسمجھی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہ اسماعیل سے اتحاد کر لیا۔ حالانکہ شاہ اسماعیل عثمانیوں کی توجہ اپنے سے ہٹانا اور دو مسلم ممالک کے درمیان جنگ کا تماشا دیکھنا چاہتا تھا۔

اسماعیل اور سلطان مصر قانصوہ کے درمیان معاہدے کی خبر سلیم اوّل سے پوشیدہ نہ رہ سکی، مصر اور ترکی میں سخت کشیدگی پیدا ہو گئی۔ قانصوہ غوری نے ایک بڑی فوج شام کے شمال میں تعینات کر دی تاکہ عثمانی لشکر کی نقل و حرکت کا پتا لگایا جا سکے اور اگر موقع ملے تو خود ایشیائے کوچک کے کسی شہر پر قبضہ کر لیا جائے۔

ایشیائے کوچک کی سرحدوں پر تعینات ترک جرنیل سنان پاشا نے سلیم اوّل کو اس خطرے کی اطلاع دی۔

سلیم اوّل نے استنبول میں تمام وزراء کی مجلس منعقد کی اور مشورہ لیا۔ میر منشی محمد پاشا نے رائے دی کہ سلطان کو نہ صرف بلا تاخیر شام اور مصر پر قبضہ کر لینا چاہیے بلکہ خادم الحرمین والشریفین کا حق بھی خود حاصل کرنا چاہیے۔ مجلس کے شرکاء نے اس پر اتفاق کیا کہ اس وقت سلیم اوّل ہی عالم اسلام کی سیادت و قیادت کا صحیح حق دار ہے، اور یہ حق حاصل

---

[1] جامع الدول تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از منجم باشی احمد بن لطف اللہ: ص ۲۲۵ تا ۲۲۸؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۱۹۱، ۱۹۲؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۱۷ تا ۲۱۹

کرنے کے لیے حجاز، شام اور مصر سے ممالیک کو بے دخل کر کے وہاں قبضہ ضروری ہے۔ مجلسِ شوریٰ نے یہ فیصلہ بھی دیا کہ پہلے قانصوہ غوری کو ماتحتی اختیار کرنے کی پیش کش کی جائے گی، جنگ صرف انکار کی صورت میں ہوگی۔ آخر سلیم اول کا سفیر یہ پیغام لے کر مصر گیا مگر قانصوہ غوری نے نہ صرف انکار کیا بلکہ ترک سفیر کو قید میں ڈال دیا۔ غرض مملوکوں کو رام کرنے کی کوششیں ناکام رہیں اور آخر سلیم اول مملوک سلطان کو سزا دینے کے لیے شام روانہ ہوگیا۔

قانصوہ، ۸۰ ہزار سپاہی لے کر سلیم سے مقابلے کے لیے نکلا اور شام کی شمالی سرحد پر پہنچ گیا۔ قانصوہ غوری، شمالی شام کے سب سے بڑے شہر حلب میں تھا۔ سلیم اول کے لشکرِ جرار کو آتا دیکھ کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اس نے سلیم کے سفیر کو آزاد کر دیا اور صلح کی پیش کش کی مگر سلیم نے اسے مسترد کر دیا۔

آخر مرج دابق کے میدان میں معرکہ ہوا۔ مملوک نہایت بے جگری سے لڑے مگر اپنے بعض افسران کی غداری نے انہیں کمزور کر دیا اور صرف آٹھ گھنٹے کی لڑائی کے بعد انہیں شکستِ فاش ہوئی۔ قانصوہ غوری فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ اس کی عمر ۷۶ سال تھی۔ یہ ۲۵ رجب ۹۲۲ھ (۲۴ اگست ۱۵۱۶ء) کا واقعہ ہے۔ سلیم اول فاتحانہ طور پر حلب میں داخل ہوا جہاں اہلِ شہر نے اس کی اطاعت کا وعدہ کیا۔[1]

حجازِ مقدس کی تولیت:

سلیم اول نے اس فتح کے بعد شام کے دوسرے شہروں کا رخ کیا، ہر جگہ مقامی عمائد نے شہروں کے دروازے کھول کر عثمانیوں کو خوش آمدید کہا۔ یوں ترک بڑی آسانی سے حماہ، حمص اور دمشق سمیت پورے شام پر قابض ہو گئے۔ سلیم اول نے مقامی باشندوں سے بہت اچھا سلوک کیا۔ شامی عمائد اور علماء کی عزت و تکریم کی، مساجد کے لیے وظائف مقرر کیے اور جامع اُموی دمشق کی تزئین و آرائش کے لیے رقم مختص کی۔[2]

حجازِ مقدس کی حفاظت اس وقت ایک اہم مسئلہ تھا، پرتگال جو اسپین کے بعد یورپ کی دوسری مضبوط طاقت تھا، مشرقی سمندروں میں مسلسل بحری بیڑے بھیج رہا تھا۔ پرتگالی سخت ترین دشمنانِ اسلام تھے، وہ مسلمانوں کو دھمکیاں دے رہے تھے کہ ہم مکہ اور مدینہ پر قبضہ کر کے (نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ) تمہارے پیغمبر ﷺ کا جسد نکال کر لے جائیں گے، اور اس وقت تک واپس نہیں کریں گے جب تک تم بیت المقدس کو نصرانیوں کے سپرد نہیں کر دیتے۔ مملوکوں میں اتنی قوت نہیں تھی کہ وہ پرتگالیوں کے حملوں کو روک کر حجازِ مقدس کو محفوظ بنا سکتے۔ پرتگالیوں کی اس بات کو محض دھمکی نہیں سمجھا جا سکتا تھا کیوں کہ انہیں اسلامی دنیا میں اپنے ہمدرد مل گئے تھے۔ ایران کے صفویوں نے پرتگالیوں سے اتحاد کر لیا تھا۔ یہ دونوں مل کر حجاز کی سلامتی کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتے تھے۔[3]

---

① جامع الدول تاریخ الدولة العثمانیة از منجم باشی احمد بن لطف اللہ: ص ۲۳۹ تا ۲۴۴؛ تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز توبا: ۱/ ۲۲۴ تا ۲۲۶؛

② تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز توبا: ۱/ ۲۲۴، ۲۲۵ ③ التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۹۸/۸

سلطان سلیم اول کے نزدیک ان حالات میں ضروری تھا کہ شام کے ساتھ حجاز کو بھی اپنی تحویل میں لیا جائے تاکہ مغربی طاقتوں کی ناپاک سازشوں کی راہ مسدود کی جاسکے۔ سلیم اول کے ارادے سے آگاہ ہونے کے بعد امیر مکہ شریف برکات الثانی نے اپنے بیٹے کو بھیج کر مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بیت اللہ اور روضۂ اطہر کی چابیاں سلطان سلیم کے حوالے کردیں۔ سلیم اول نے جمعے کے خطبے میں اپنے نام کے ساتھ "خَادِمُ الْحَرَمَيْنِ وَالشَّرِيفَيْنِ" کا اضافہ کیا۔ اس کے بعد سے آج تک حجاز کے ہر حکمران کے ساتھ یہ لقب چلا آرہا ہے۔[1]

مملوکوں کی شکست کا سبب:

مملوکوں کی شکست کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ اللہ کی نصرت اور عوامی حمایت کھو چکے تھے۔ لوگوں کے حقوق غصب کیے جارہے تھے اور مظلوم لوگ بددعائیں دے رہے تھے۔ علامہ عصامی رحمہ اللہ کے نقل کردہ ایک واقعہ سے ان دنوں مصر کی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ علامہ لکھتے ہیں:

"اولیاء میں سے ایک مستجاب الدعوات بزرگ نے واقعہ نقل کیا ہے کہ میں نے قانصوہ غوری کے ایام میں ایک چراکسی سپاہی کو دیکھا جس نے ایک پھیری والے سے سامان لیا اور اسے وہ قیمت نہیں دی جس پر پھیری والا راضی ہوتا۔ پس پھیری والا سپاہی کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور اپنا حق مانگنے لگا۔ سپاہی نے کوئی توجہ نہ دی۔ آخر پھیری والا بولا: میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ اللہ کی شریعت پر ہوگا۔

یہ سن کر سپاہی مڑا اور اس نے اپنا گرز پھیری والے کے سر پر دے مارا اور بولا: "یہ ہے اللہ کی شریعت۔"

پھیری والے کا سر پھٹ گیا اور وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ وہاں موجود مسلمانوں میں سے کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ سپاہی کو روکتا۔ یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا اور میں نے ہاتھ اٹھا کر اللہ کی بارگاہ میں اس ظالم سپاہی، اس کے بادشاہ اور اس کے حامیوں کے خلاف بددعا کی۔ پس وہ قبولیت کی ساعت تھی۔

میں نے وہ رات طہارت کی حالت میں (عبادت کرتے ہوئے) گزاری اور سوچتا رہا کہ یہ حکومت کیسے ختم ہوسکتی ہے جبکہ اس کے سپاہیوں نے زمین کو ظلم سے بھر دیا ہے؟ مسلمانوں کو کوئی مہربان اور عادل بادشاہ کیسے نصیب ہوسکتا ہے؟ یہ سوچتے سوچتے آنکھ لگ گئی۔ خواب میں دیکھا کہ آسمان سے فرشتے اترے جن کے ہاتھوں میں جھاڑو ہیں۔ وہ ان جھاڑوؤں سے مصر میں صفائی کررہے ہیں اور چراکسہ کو مصر سے دریائے نیل میں غرق کررہے ہیں۔ پھر میری آنکھ کھلی تو کسی قاری کی آواز آرہی تھی:

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ۝

پس ان کو سمندر میں غرق کردیا، اس سبب سے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی بے توجہی کرتے تھے۔[2]

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/۲۳۳، ۲۳۴ [2] سورۃ الاعراف، آیت ۱۳۶

میں سمجھ گیا کہ اللہ عن قریب ان (حکام) کا سخت مؤاخذہ کرے گا۔

اس واقعے کو کچھ ہی مدت گزری تھی کہ قانصوہ غوری اپنے لشکر، اپنے اموال، خزانوں، سپاہیوں اور حامیوں سمیت مصر سے نکلا تا کہ سلطان سلیمان خان (روایت میں یہی لفظ ہے، جبکہ صحیح سلیمان نہیں سلیم ہے) سے حلب میں جنگ کرے۔ کچھ ہی دنوں بعد خبر آئی کہ مرج دابق میں قانصوہ کو شکست ہوئی، اس کی اکثر فوج ماری گئی اور وہ خود گھوڑوں کے سُموں تلے کچلا گیا۔[1]

جنگ وردان اور قاہرہ پر قبضہ:

قانصوہ غوری کی موت کی خبر مصر پہنچی تو وہاں طومان بائی کو بادشاہ چن لیا گیا۔ سلیم اوّل نے سفیر بھیج کر اسے باب عالی (عثمانی سلطنت) کی ماتحتی اختیار کرنے کی پیش کش کی مگر طومان بائی نے اسے مسترد کر کے مقابلے کے لیے لشکر بھیج دیا۔ شام کی حدود میں ایک بار پھر ترکوں اور مملوکوں میں جنگ ہوئی۔ ترک اس بار بھی غالب رہے اور مملوک پسپا ہو گئے، ترک افواج تعاقب میں قاہرہ تک پہنچ گئیں۔

یہاں ایک بار پھر جنگ ہوئی جسے معرکہ وردان کہا جاتا ہے۔ طومان بائی نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ۲۹ ذوالحجہ ۹۲۲ھ (۲۲ جنوری ۱۵۱۷ء) کو وہ اپنے خاص سپاہیوں کے ساتھ ہلہ بول کر ترکوں کے قلب میں گھس گیا، یہاں سلیم اوّل کا وزیر سنان بیگ موجود تھا۔ اس حملے میں وہ مارا گیا۔ مملوک سمجھے کہ انہوں نے سلیم اوّل کو قتل کر دیا ہے اور اب جنگ ختم ہو جائے گی۔ مگر جلد ہی ان کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ آٹھ دن بعد عثمانی افواج مملوکوں کو پسپا کرتی ہوئی قاہرہ میں داخل ہو گئیں۔ مملوک شہر کی گلیوں اور محلوں میں بھی مقابلہ کرتے رہے مگر آخر کار پچاس ہزار لاشیں گرنے کے بعد ان کی مزاحمت کا زور ٹوٹ گیا۔ طومان بائی فرار ہو گیا مگر جلد ہی پکڑا گیا۔ سلیم نے اسے اپنے ساتھ ایک الگ تخت پر بٹھایا۔ طومان بائی نے دوران گفتگو کہا:

''تم اپنی دلیری کی وجہ سے نہیں، بندوقوں اور اسلحے کے بل بوتے پر ہم پر غالب آئے ہو۔''

سلیم نے جواب میں سورۃ الانفال کی آیت ''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ'' پڑھی جس میں مقابلے کے لیے اسلحے کی تیاری کا حکم دیا گیا ہے، اور کہا: ''تم نے اتنی بڑی حکومت کا مالک ہو کر بھی اسلحہ سازی پر توجہ کیوں نہ دی۔''

سلیم نے طومان بائی کو اپنے سالار علی پاشا کے حوالے کر دیا۔ مملوکوں نے ۲۵ سال پہلے علی پاشا کے والد کو گرفتار کر کے قاہرہ کے باب زویلہ پر قتل کیا تھا۔ علی پاشا نے طومان بائی کو اسی طرح، اسی جگہ پھانسی دے دی۔ یہ ۲۱ ربیع الاوّل ۹۲۳ھ (۱۳ اپریل ۱۵۱۷ء) کا واقعہ ہے۔ وہ مملوکوں کا آخری حکمران تھا، اس کی موت پر مصر کی مملوک بادشاہی ختم ہو گئی۔ سلیم اوّل نے اس کی آخری رسومات کے لیے بہت بڑی تقریب منعقد کی اور تین دن تک ایصال ثواب کے لیے فقراء میں سونے کے سکے تقسیم کیے۔ وہ ایک ماہ تک قاہرہ میں رہا، اس نے شہریوں سے حسن سلوک کر کے انہیں

---

[1] سمط النجوم العوالی: ٤/ ٦٦ تا ٦٤

باب عالی کا وفادار بنانے کی پوری کوشش کی۔[1]

شام ومصر کی فتوحات کے فوائد۔ نئے انتظامات:

سلطنتِ عثمانیہ کو شام اور مصر کی ان فتوحات سے درج ذیل فوائد نصیب ہوئے:

1. حلب کی فتح کے بعد شہر کی جامع مسجد کے خطیب نے خطبے کے دوران سلیم اوّل کے نام کے ساتھ خادم الحرمین والشریفین کے خطاب کا اضافہ کیا جو آئندہ ہر عثمانی حکمران کے نام کا حصہ بن گیا۔ اسے آئندہ کی فتوحات کی بشارت بھی خیال کیا گیا۔
2. حجازِ مقدس کسی لڑائی کے بغیر سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ بن گیا۔
3. دمشق کا عظیم الشان خزانہ عثمانیوں کو مل گیا جو آئندہ مہمات وفتوحات میں کام آتا رہا۔
4. قاہرہ کی عباسی خلافت ختم ہوگئی اور منصبِ خلافت ترکانِ عثمان کی طرف منتقل ہوگیا۔

شام اور مصر کی فتح کے بعد وہاں نئے انتظامات کیے گئے۔ وہاں سلطنت عثمانیہ کا مستحکم سیاسی، عسکری ومالی نظام قائم کر دیا گیا۔ ان دونوں صوبوں کو "۱۴۴" اضلاع پر تقسیم کر کے ہر ضلعے پر ایک حاکم مقرر کر دیا گیا۔ ان ضلعی حکام کا مرکز دیوان کبیر کہلاتا تھا۔ دیوان کبیر کا صدر پورے شام ومصر کا والی قرار دیا گیا۔ قاہرہ میں ایک مستقل فوج تعینات کر دی گئی جس کے بعد مملوکوں کے دوبارہ ابھرنے کے امکانات ختم ہوگئے۔

جب خلافت بنوعباس سے آل عثمان کی طرف منتقل ہوئی:

مصر میں اڑھائی صدیوں سے بنوعباس کے خلفاء، مملوک سلاطین کی نگرانی میں، مسندِ خلافت سنبھالے ہوئے تھے، کچھ رسمی ذمہ داریوں کے سوا، ان کا عالمِ اسلام کی سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ سلیم اوّل اسلامی نظامِ خلافت کو مضبوط دیکھنا چاہتا تھا، اس کے خیال میں ایک بے اختیار خلافت امت کو درپیش آزمائشوں میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتی تھی۔ خلافت کو مضبوط کرنے کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ موجودہ خلفاء کو جو نسلاً قریشی ہیں، تمام اختیارات سونپ دیے جائیں مگر اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی ذمہ داری کو سنبھال پائیں گے یا نہیں۔

دوسری صورت یہ تھی کہ عالم اسلام کا طاقتور ترین حکمران جو سیاست کو عملاً سنبھالے ہوئے ہے، خود خلیفہ کا لقب اختیار کرلے۔ اس میں یہ اشکال تھا کہ جمہور علمائے اُمت حدیثِ نبوی: "اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْش" (حکام قریشی ہونے چاہییں)[2] کے باعث خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط کو لازمی قرار دیتے تھے۔ سلیم اوّل قریشی تو کیا، عرب بھی نہ تھا۔ عالم اسلام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اس وقت تک ۷۳ خلفاء گزرے تھے جن میں سے ۵۴ خلفاء

---

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۱۹۳ تا ۱۹۵، تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۲۹، ۲۳۰

[2] مسند احمد، ح: ۱۲۳۰۷؛ قال المحقق: حدیث صحیح بطرقه و شواهده، واخرجه ابن ابی شیبة وغیرہ ایضاً

بنو عباس کے تھے جو بغداد اور قاہرہ میں مجموعی طور پر ۷۹۰ سال گزار چکے تھے۔ یہ سب قریشی تھے۔ مگر سلیم اول نے ناگزیر حالات کے تحت، ان علماء کی رائے سے فائدہ اٹھایا جو حدیث کو اس دور پر محمول کرتے ہیں جب مسلمانوں کی حکومت جزیرۃ العرب تک محدود تھی۔ اس اجتہاد کے مطابق سلیم اول کے نزدیک خلیفہ کا لقب اختیار کرنے کی گنجائش نکل آئی۔

سلیم اول آخری عباسی خلیفہ محمد المتوکل علی اللہ اور مصر کے قاضی القضاۃ کو اپنے ساتھ استنبول لے گیا جہاں جامع ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں قاہرہ کی جامعۃ الازہر اور استنبول کے نامی گرامی علماء شریک ہوئے۔ ان کی موجودگی میں خلیفہ متوکل نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات، پرچم، شمشیر اور چادر مبارک جو منصب خلافت کی علامت تھے، سلیم اول کے حوالے کر دیے۔ اس وقت سلیم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بارگاہ الٰہی میں سربسجود ہوا، اور یہ تبرکات قبول کیے۔ اس کے بعد سے ہر عثمانی سلطان امیر المومنین اور خلیفہ کہلانے لگا۔ [1]

فرقہ دروز پر قابو پانے کی کوشش:

اس زمانے میں لبنان کی حدود میں دروز نامی ایک فرقہ بڑی تیزی سے پنپ رہا تھا۔ اس فرقے کا موجودہ قائد "فخر الدین المعنی الاول" ایک اچھے خاصے رقبے پر قابض تھا۔ سلیم اول کے ۹۲۲ھ (۱۵۱۶ء) میں شام پر قبضے کے دوران، فخر الدین نے عثمانیوں کی اطاعت قبول کر لی اور اس وقت اسے کافی سمجھا گیا۔ سلیم اول کو اس کے فوراً بعد مصر اور پھر یورپ کی مہم در پیش ہوئی، زندگی نے اسے مزید مہلت نہ دی، ورنہ وہ "دروز" کا استیصال کیے بغیر نہ رہتا۔

دروز، اسماعیلی شیعوں کی ایک شاخ تھی جو مصر کے عبیدی شیعہ حکمران الحاکم بامر اللہ کو خدا مانتی تھی۔ حاکم بامر اللہ پانچویں صدی ہجری میں مصر کا انتہائی بدسیرت حکمران تھا جس کی حماقتوں سے عوام وخواص بھی تنگ تھے۔

الحاکم کی موت کے بعد نشتکین الدرزی نامی ایک بدبخت شخص نے اسے خدا قرار دے کر بہت سے اسماعیلی شیعوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہمارے مذہب کا بانی حمزۃ داعی ہے جو دراصل مسیح تھا اور اسی نے ۴۰۸ھ میں یہ حقیقت جانی تھی کہ الحاکم، خدا ہے۔

الدرزی نے شیعیت، نصرانیت، ہندومت اور دوسرے ادیان میں کچھ نئے کفریہ عقائد ملا کر ایک نیا دین ایجاد کیا، جو اس کی طرف منسوب ہو کر "دروز" کہلایا۔ اگرچہ اس میں بہت سے عقائد اسماعیلی شیعہ مذہب سے لیے گئے تھے تاہم جن عقائد نے اسے ایک الگ مذہب کی شکل دی وہ درج ذیل ہیں:

---

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۱۹۴، ۱۹۵؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱ / ۲۲۳، ۲۲۴
یلماز مزید تفصیل میں بتاتا ہے کہ سلیم اول نے مصر سے واپسی پر شام کے شہر حلب میں قیام کیا تھا جہاں ۲۹ اگست ۱۵۱۶ء (جو ۱۸ رجب ۹۲۲ھ ہوتی ہے۔) کو نماز جمعہ میں خطیب نے بطور خلیفہ جمعہ کے خطبے میں اس کا نام لیا جسے سن کر سلطان روتے ہوئے سجدے میں گر گیا۔ بعد میں اس نے خطیب کو گراں قدر انعامات سے نوازا۔ یوں اسی دن اسے منصب خلافت پر فائز مان لیا گیا تھا۔ البتہ بعد ازاں استنبول میں انعقاد خلافت کی خاص مجلس ہوئی تھی جس میں اسے تبرکات تحویل میں دیے گئے تھے۔

❶ اس فرقے کے نزدیک الحاکم خدا ہے، وہ صرف نگاہوں سے غائب ہوا ہے اور عن قریب دوبارہ ظاہر ہوگا۔
❷ اس کے نزدیک اسلام سمیت گزشتہ تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں۔
❸ یہ فرقہ تمام انبیائے کرام کا انکار کرتا ہے اور (معاذ اللہ) انہیں شیطان قرار دیتا ہے۔
❹ قرآن مجید کا منکر ہے اور اسے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی تصنیف قرار دیتا ہے۔
❺ جنت، جہنم اور اخروی ثواب وعذاب کا منکر ہے۔
❻ ہندوؤں کی طرح اس بات کا قائل ہے کہ مرنے کے بعد انسان مختلف روپ میں بار بار جنم لیتا رہتا ہے۔
❼ یہ فرقہ خود کو فخریہ طور پر مصر کے فرعونوں اور ہندوستان کے قدیم فلسفیوں کا وارث کہتا ہے۔
❽ یہ فرقہ تمام مذاہب، خصوصاً مسلمانوں کا سخت دشمن ہے، اور ان کی جان ومال پر دست درازی جائز سمجھتا ہے۔
❾ ان کے نزدیک قیامت کا مطلب یہ ہے کہ الحاکم دوبارہ دنیا میں آئے گا، کعبہ کو منہدم کرے گا اور دنیا بھر کے مسلمانوں اور نصرانیوں کو مغلوب کرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کائنات پر راج کرتا رہے گا۔
❿ ان کے نزدیک سچے پیغمبر صرف پانچ دروزی داعی (حمزہ، اسماعیل، محمد کلمہ، ابو الخیر اور بہاء) تھے جنہیں الحاکم نے دنیا میں بھیجا تھا۔
⓫ وہ روزے یا بیت اللہ کے حج کو نہیں مانتے۔ ان کا حج لبنان کی بستی ''حاصبیہ'' میں ہوتا ہے۔
⓬ دروزی مذہب میں داخلے کے لیے ایک خاص معاہدہ لیا جاتا ہے اور ہر رکن کا تحریری اندراج لازمی ہوتا ہے۔[1]

سلیم اوّل کی یورپ کے سفیروں سے ملاقات:

سلیم اوّل شام کے مختلف شہروں میں ٹھہرتا ہوا، رجب ۹۲۴ھ (جون ۱۵۱۸ء) میں استنبول پہنچا۔ کچھ دنوں بعد اس نے ایڈریانوپل میں اسپین کے سفیروں سے ملاقات کی جو یہ درخواست لے کر آئے تھے کہ ترک بھی مملوک حکمرانوں کی طرح انہیں بیت المقدس کی زیارت کی سہولیات دیں اور ان پر پابندیاں نہ لگائیں، وہ مملوکوں کی طرح ترکوں کو بھی اس کے بدلے سالانہ خطیر ٹیکس ادا کرتے رہیں گے۔ سفیروں نے سلطان کو یہ بھی یقین دلایا کہ اسپین کے مسلمان اپنی رضا ورغبت سے نصرانی بنے ہیں اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہو رہا۔ سلطان نے ان کی عرضی منظور کر لی۔[2]

پرتگالیوں کا زور توڑنے کی کوشش:

اس زمانے میں پرتگالی ہندوستان کے ساحلوں پر اپنے قلعے بنا چکے تھے۔ ۹۱۷ھ (۱۵۱۱ء) میں گجرات کے حاکم نے خطرہ محسوس کر کے ان کے خلاف ترک بحریہ کے جرنیل ایاز بیگ سے مدد لی تھی جس نے گجرات کے انتہائی جنوب میں واقع جزیرے ''دیو'' کو اپنا معسکر بنا کر پرتگالیوں سے ٹکر لی تھی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس وقت ترک فوج یہ دیکھ کر

---

[1] الموسوعة الميسرة للأديان: ۱/ ۴۰۰
[2] تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ۱۹۶

واضح ہوگئی تھیں کہ محدود طاقت کے ساتھ بحرِ ہند میں پرتگالیوں پر غلبہ مشکل ہے۔ ①

سلیم اوّل کی وفات:

سلیم اوّل نے اس تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے پہلے بحیرۂ روم میں پرتگالیوں کا زور توڑنے کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا وہ اپنے آخری ایام میں جزیرۂ روڈس پر حملے کی تیاری کر رہا تھا جس کے لیے ۱۵۰ نئے بحری جہازوں کی تیاری زور وشور سے جاری تھی۔ اُدھر شاہ اسماعیل کے سفیر صلح کے لیے حاضر ہوئے مگر سلیم نے یہ پیش کش مسترد کر دی کیوں کہ وہ ایران پر بھی لشکر کشی کا عزم کیے ہوئے تھا۔

مگر ان منصوبوں کی تکمیل کی نوبت نہ آسکی۔ ۹ شوال ۹۲۶ھ (۲۲ ستمبر ۱۵۲۰ء) کو سلطان کا انتقال ہوگیا۔ اس نے ۸ سال پانچ ماہ حکومت کی اور ۵۱ سال عمر پائی۔ ②

سلیم اوّل کی شخصیت اور اس کا زمانہ:

سلیم اوّل ایک پیشہ ور سپاہی اور مزاجاً بے لوچ تھا، لہٰذا اسے "یاوز" (سخت گیر) بھی کہا جاتا تھا۔ مگر لطافتِ طبع سے بے بہرہ نہ تھا بلکہ شعر وادب میں اچھی دسترس رکھتا تھا۔ فارسی شاعری میں اس کا پورا دیوان تھا۔ علومِ اسلامیہ کے علاوہ عصری علوم وفنون خصوصاً ریاضی، سائنس اور کئی ایشیائی زبانوں کا ماہر تھا۔ ③

اس نے مصر فتح کرنے کے بعد وہاں کے بحری بیڑے کو ناقابلِ شکست بنانے پر خاص توجہ دی تاکہ بحیرۂ روم میں پرتگالی اور ہسپانوی بحریہ کو ناکوں چنے چبوائے جاسکیں۔ مصر میں نئے بحری جہازوں کی تیاری کا ایک عظیم الشان کارخانہ لگایا گیا جس پر سلطان سلیم اوّل اور وزیر ابراہیم پاشا نے دل کھول کر خرچ کیا۔

مصری بحریہ کو بحیرۂ احمر میں متحرک کر کے حجازِ مقدس کا دفاع مضبوط کرنے کا منصوبہ بھی سلیم اوّل کے ذہن میں تھا۔ اس کے لیے وہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر کو جہاز رانی کے قابل ایک بڑی نہر کے ذریعے ملا دینا چاہتا تھا۔ مگر اس منصوبے پر عمل کی نوبت نہیں آئی۔ ④

وہ اپنے وزیروں اور مشیروں سے مشورہ ضرور کرتا تھا مگر اپنے عزائم کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ جلد بازی اور عجلت پسندی سے کوسوں دور تھا۔ وہ مضبوط قوتِ ارادی کا مالک، بہادر اور ذہین تھا۔ اسے عیش وتنعم کی زندگی پسند نہ تھی۔ حکومتی فرائض انجام دینے کے علاوہ اس کا باقی وقت مطالعے اور اہلِ علم کی صحبت میں گزرتا تھا۔

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/۳۲۳، ۳۲۴

② جامع الدول تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از منجم باشی احمد بن لطف اللہ: ۲۵۰؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۱۹۶، ۱۹۷؛ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۳۷

③ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۱۹۶، ۱۹۷؛ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۳۷

④ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۳۵۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اسی منصوبے کے مطابق نہر سویز بنائی گئی تھی۔

اس نے ۸ سالوں میں جو فتوحات حاصل کیں وہ ایک کرشمے سے کم نہیں۔ اس کی تخت نشینی کے وقت دولتِ عثمانیہ کا رقبہ ۲۳ لاکھ ۳۷ ہزار مربع کلومیٹر تھا۔ اس کی وفات کے وقت یہ رقبہ دوگنا سے بھی بڑھ کر ۶۵ لاکھ ۵۷ ہزار کلومیٹر ہو چکا تھا۔ جغرافیہ اس کا پسندیدہ مضمون تھا۔ پوری دنیا کا ایک عظیم نقشہ سفر و حضر میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ پڑھتے وقت نظر کا چشمہ لگاتا تھا۔ (1)

وہ پہلا عثمانی حکمران تھا جسے خادم الحرمین والشریفین کا لقب ملا اور اس نے اس لقب کی لاج رکھی۔ اس نے حجاز کے حاکم کو جسے ''شریفِ مکہ'' کہا جاتا تھا، بہترین مراعات دیں، اس کے وظیفے میں پانچ سو دینار کا اضافہ کیا۔

حرمین میں مستقل رہنے والے عبادت گزاروں میں سے ہر ایک کے لیے سو دینار مختص کیے، یہ وظائف مصر کے خزانے سے دیے جاتے تھے۔ اہلِ حرمین کے لیے ہر سال بھاری مقدار میں غلے کے ذخائر بھیجنے کا اہتمام کیا۔ مکہ اور مدینہ میں بکثرت رفاہی کام کرائے۔

علماء نے اس کی سیرت کے صرف دو پہلوؤں کو ناپسند کیا ہے: ایک یہ کہ وہ سخت گیر تھا۔ دوسرے وہ عثمانی سلاطین میں پہلا شخص تھا جو داڑھی منڈواتا اور گھنی لمبی مونچھیں رکھتا تھا۔

بہر کیف وہ صحیح العقیدہ اور کٹر سنی تھا۔ ایران کو شیعیت سے پاک کرنا اس کی بڑی آرزو تھی مگر موت نے اسے مہلت نہ دی۔ اس نے دولتِ عثمانیہ کو دنیا کی عالمگیر حکومت بنا دیا جو تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی۔ (2)

امیر البحر عروج کی داستانِ عزیمت

سلیم اوّل کے دور کی تاریخ امیر البحر عروج کے کارناموں کا تذکرہ کیے بغیر نامکمل ہے۔

سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں شمالی افریقہ کے ممالک: تیونس، الجزائر اور مراکش نہایت کس مپرسی کا شکار تھے۔ اکثر امراء، ہسپانوی یا پرتگالی حکمرانوں کو خراج دے کر اپنی گردن بچائے ہوئے تھے۔ وہاں چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں جو اپنا دفاع کرنے کے بھی قابل نہیں تھیں۔ مراکش کے امراء ٹکڑوں میں بٹ کر باہمی کش مکش میں مشغول تھے۔ شرشل، وہران اور تنس جیسے کئی ساحلی شہروں پر یورپی طاقتیں پنجے گاڑ چکی تھیں۔ پرتگال نے فاس کے ساحل پر دو قلعے بھی بنا لیے تھے۔ الجزائر کا مغربی علاقہ اور دار الحکومت تلمسان بربر امراء کے پاس تھا جن کی باہمی لڑائیوں نے ساحلی علاقوں کو یورپی طالع آزماؤں کے لیے تر لقمہ بنا دیا تھا۔ تیونس میں بنو حفص کی حکمرانی کو دو صدیاں ہونے کو آئی تھیں، نصرانیوں کے مضبوط عسکری مرکز جزیرہ سسلی یہاں سے زیادہ دور نہ تھا اس لیے تیونس کو ہر وقت بیرونی حملے کا خطرہ لاحق

---

(1) مسلم حکماء اس دور سے ایک صدی پہلے نظر کا چشمہ ایجاد کر چکے تھے۔ تیمور لنگ بھی نظر کا چشمہ لگاتا تھا۔ اہلِ یورپ نے پہلی بار چشمہ اس وقت دیکھا جب ان کی ایک سفارت تیمور لنگ کے دربار میں پہنچی۔

(2) تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۱/۲۳۸، ۲۳۹

رہتا تھا۔ یورپی طاقتیں سمندری دنیا پر راج کرنے کے لیے مختلف آزاد گروہوں کی سرپرستی کر رہی تھیں جو جہازرانی میں ماہر تھے۔ کولمبس، واسکوڈے گاما اور میگیلن جیسے جہازران ایسے ہی آزاد گروہوں کے سربراہ تھے جو مختلف حکومتوں کی مالی اعانت سے سمندری مہمات میں مشغول رہتے تھے۔ ان کا کام بحری قزاقی سے مختلف نہ تھا۔ یہ جنگجو لٹیرے اور نامی گرامی ڈاکو تھے جنہیں سزائیں معاف کر کے بحری مہمات سونپ دی گئی تھیں۔ نہ صرف بادشاہوں بلکہ روما کے پوپ کی جانب سے بھی ان قزاقوں کو ساحلوں پر آباد مسلم آبادیوں کو تاراج اور تباہ کرنے کی پوری اجازت دی گئی تھی۔ یہ جہازران بظاہر تاجروں کا بھیس بدل کر مہمات پر نکلتے مگر ان کا اصل مقصد نئی شکارگاہیں تلاش کرنا تھا۔

پرتگال کے واسکوڈے گاما نے افریقہ اور ہندوستان کے ساحل پر مسلمانوں کی کئی بستیاں تباہ کیں اور سینکڑوں معصوم لوگوں کو قتل کیا۔ کولمبس نے اپنی استعمار کو امریکا کا راستہ دکھایا جہاں مقامی باشندوں ریڈ انڈینز کا بری طرح قتل عام کیا گیا۔ اسی طرح اسپینی مہم جو میگیلن نے فلپائن کو اسپین کی نوآبادیات بنا دیا۔

۹۱۴ھ (۱۵۰۸ء) میں اسپین کا جرنیل جان پیڈرو نوار، پندرہ جنگی جہازوں میں چودہ ہزار سپاہی لے کر آیا اور امیر تیونس سے بجایہ کی بندرگاہ چھین لی۔ مئی ۱۵۰۹ء (محرم ۹۱۵ھ) میں اسپین کے ۳۳ جہاز قرطاجنہ پہنچے۔ ہسپانوی مغربی جزیرے واران کی بندرگاہ پر قابض ہو گئے اور چار ہزار مسلمانوں کو ذبح کرنے کے بعد ہزاروں کو غلام بنا کر ساتھ لے گئے۔ اس طرح تیونس مغرب اور مشرق دونوں طرف سے گھر کر رہ گیا۔ ڈون پیڈرو نے الجزائر کی بندرگاہ سے نصف کلومیٹر دور ایک جزیرے میں اپنا قلعہ تعمیر کرایا جس کے بعد الجزائر کی بندرگاہ کو جانے والی ہر کشتی یورپی توپوں کی زد میں آگئی۔ ہسپانوی توپچی اپنے دور مار اسلحے سے الجزائر کی مساجد کے میناروں کو بھی نشانہ بناتے رہتے تھے۔ یہ ناپاک حرکت عموماً اذان کے وقت کی جاتی۔ تیونس اور الجزائر کی کسی بندرگاہ پر اسپین کی اجازت کے بغیر کوئی جہاز لنگر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔

ہسپانوی قزاقوں کی تاخت وتاراج کے مقابلے میں جہازرانی کے ماہر کچھ دلیر مسلمان بھی مجبوراً مقابلے پر آئے۔ مصر اور عثمانی حکومتوں نے اپنے دفاع کے لیے ان کی سرپرستی شروع کر دی۔ اس شعبے کو "حرفۃُ القراصنۃ" کا نام دیا گیا، یعنی سمندر میں نصرانی جہازرانوں کا ناطقہ بند کرنا۔

سلیمان عالی شان کے والد سلیم اوّل کے دور میں ترک جہازرانوں: خیر الدین پاشا اور اس کے بھائی عروج کو ایسی مہمات میں حیرت انگیز کارناموں کے باعث بے حد شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے والد نور اللہ آغا اور دادا عبداللہ آغا سلطنت عثمانیہ کی فوج میں افسر تھے۔ ۸۶۶ھ (۱۴۶۲ء) میں جزیرہ میدللی کی فتح کے بعد انہیں وہاں وسیع جاگیریں مل گئیں۔ نور اللہ آغا نے وہیں ایک مقامی رومی خاتون سے شادی کی، اس سے پانچ بیٹے ہوئے جن میں الیاس، اسحٰق، عروج اور خیر الدین خضر پاشا کو شہرت دوام نصیب ہوئی۔ سرخ بالوں والے یہ بھائی تاریخ میں "باربروسا برادران" کے نام سے پہچانے گئے۔ (باربروسا رومی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب سرخ داڑھی والا ہے۔)

ان بھائیوں نے جہازوں کے ذریعے سمندری تجارت کا پیشہ اپنایا اور سالہا سال یہی کام کرتے رہے۔ اکثر ان کی

نقل وحرکت ترکی اور یونان کے درمیان ہوتی تھی۔ بعد میں وہ مصر تک آنے جانے لگے۔ ایک بار تجارتی سفر کے دوران انہیں جزیرہ روڈس کے قزاقوں سے پالا پڑ گیا۔ اس جھڑپ میں ان کا بڑا بھائی الیاس شہید ہو گیا، جہاز چھن گئے، عروج کو قیدی بنا لیا گیا۔ خیر الدین خضر نے منہ مانگا زرفدیہ دے کر اپنے بھائی کو رہا کرانے کی کوشش کی مگر نصرانی نہ مانے۔

انہی دنوں نصرانیوں کا عثمانی ترکوں سے ۱۰۰، ۱۰۰ قیدیوں کے تبادلے کا معاہدہ ہوا۔ نصرانیوں نے قید خانے سے ۱۰۰ مسلمان چنے اور ایک جہاز میں انہیں ترکی لے جانے لگے۔ نصرانی یہ طے کیے ہوئے تھے کہ عروج کو کبھی رہا نہیں کیا جائے گا مگر عروج چپکے سے قیدیوں کو لے جانے والے جہاز میں چھپ گیا۔ جب ترکی کا ساحل قریب آیا تو وہ سمندر میں کود گیا اور تیرتا ہوا ساحل پر پہنچ گیا۔ یہ ۹۱۲ھ (۱۵۰۶ء) کا واقعہ ہے۔

عروج اس وقت ۳۶ سالہ جوان تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے نصرانی قزاقوں کی غارت گری دیکھی اور ان کے ظلم سہے تھے، لہٰذا اس نے باقی زندگی، مسلمانوں کی حفاظت کے لیے وقف کرنے کا عزم کر لیا۔ وہ ترک حکام سے جا کر ملا جو بحیرۂ روم میں نصرانیوں کے بڑھتے ہوئے تسلط سے سخت خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ عروج کے مطالبے پر انہوں نے اسے دو جنگی جہاز دیے تاکہ وہ نصرانی قزاقوں کی روک تھام کرے۔ عروج یہ جہاز لے کر جنوبی اٹلی کی طرف چلا گیا اور سالہا سال تک سسلی، اٹلی اور اسپین کے جنگی جہازوں پر حملے کرتا رہا۔

۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں الجزائر کے حاکم سالم تومی نے شاہ اسپین فرڈیننڈ پنجم کے دربار میں حاضری دے کر اس کی باج گزاری قبول کر لی اور ہسپانویوں نے الجزائر کے ساحلوں پر آ کر قلعے تعمیر کر لیے۔ ان دنوں عروج کا بحری بیڑہ قریب ہی سسلی میں لنگر انداز تھا۔ الجزائر کے مسلمانوں نے اسے مدد کے لیے بلایا۔ عروج تیزی سے الجزائر کے ساحل پر پہنچا۔ سالم تومی نے اس کا استقبال کیا مگر وہ نماز جمعہ کے دوران عروج کے قتل کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ خوش قسمتی سے عین وقت پر یہ سازش طشت ازبام ہو گئی۔ عروج نے سالم کو قتل کرا کے الجزائر کے ساحل سے ہسپانویوں کے قلعوں کو نیست و نابود کر دیا۔

اس دوران اسپین کے مسلمان ظلم وستم کے مہیب طوفانوں کی زد میں تھے۔ خیر الدین خضر پاشا نے اپنا بحری بیڑہ ان کی امداد کے لیے وقف کر دیا جس میں ۳۶ بحری جہاز تھے۔ اس نے مختصر مدت میں اسپین کے سات چکر لگائے۔ اسپینی بحریہ اس کی روک تھام کے لیے سرتوڑ کوشش کرتی رہی مگر پاشا ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسپین کے ساحل تک پہنچ جاتا۔ ایک بار ہسپانوی بحریہ پاشا کو گھیرنے میں کامیاب ہو گئی مگر مسلم جانباز بڑی مہارت سے لڑے، انہوں نے تین اسپینی جہاز غرق کر دیے اور سات پر قبضہ کر لیا۔ پاشا نے ہر چکر میں دس ہزار مسلمانوں کو افریقہ کے ساحلوں تک پہنچایا۔ یوں اس مہم میں ستر ہزار اندلسی مسلمانوں کو موت کے منہ سے نکالا گیا۔

۹۱۹ھ (۱۵۱۳ء) میں عروج کے ترکوں سے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور وہ اپنے ذاتی چار بحری جہاز لے کر مصر چلا گیا۔ مصری سلطان قانصوہ غوری نے ساحلوں کی حفاظت کے لیے اس کی خدمات حاصل کر لیں۔ عروج نے طرابلس الغرب (لیبیا) اور تیونس کے درمیان واقع جزیرہ ''جربہ'' کو اپنا مرکز بنا لیا، کچھ دنوں بعد اس کا بھائی خضر بھی اپنے

آدمیوں اور ذاتی بحری جہازوں سمیت جزیرہ میڈلی سے وہاں پہنچ گیا۔ اب ان کے پاس مجموعی طور پر ۱۲ جنگی جہاز اور ایک ہزار مجاہدین تھے۔ دونوں نے مل کر نصرانی جہاز رانوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔

سلطان قانصوہ عروج کی شجاعت اور مہارت سے متاثر ہو کر اسے "بیٹا" کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور برملا کہتا تھا:

"میرا بیٹا عروج احسان شناس ہے، جس کی خیر و خوبی ساری دنیا میں مشہور ہے۔"

عروج اور خضر کا مرکز جزیرہ جربہ، تیونس کے قریب تھا، اس لیے دونوں بھائیوں نے امیر تیونس ابو عبداللہ حفصی کے ساتھ بھی اچھے تعلقات رکھے۔ امیر نے انہیں خلیج کا ایک قلعہ دے دیا۔ ۹۲۰ھ (۱۵۱۴ء) میں ان کی وہ مہمات شروع ہوئیں جنہوں نے یورپ میں تہلکہ مچا دیا۔ اہل یورپ کی چھوٹی سے چھوٹی کشتی اور بڑے سے بڑا جہاز بھی اب محفوظ نہ تھا۔ روما کے پوپ نے اپنے دو خاص جنگی جہاز بحیرۂ روم بھیجے جن کی مثال پوری دنیا میں نہیں تھی۔ عروج نے ایک ہی حملے میں دونوں پر قبضہ کر لیا۔

اس دوران عروج مسلسل غور و فکر کر کے یہ طے کر چکا تھا کہ مسلمانوں کے دفاع کے لیے شمالی افریقہ میں ایک مضبوط حکومت قائم کرنا بہت ضروری ہے۔ اس نے خانہ جنگیوں میں مشغول الجزائر کے امراء کو جو اسپین کے باج گزار تھے، اقتدار سے بے دخل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے الجزائر کے ساحل سے ۲۰۰ کلو میٹر دور، جزیرہ بجایہ کو ہسپانویوں سے چھینا جائے تاکہ وہ اپنے باج گزاروں کی مدد نہ کر سکیں۔

عروج چار جہاز لے کر ایک دن یکدم بجایہ کے ساحل پر پہنچ گیا۔ ہسپانیہ کے ۹ جہاز اس کا راستہ روکنے آئے مگر عروج نے ان میں سے ایک کو تباہ کر کے دو پر قبضہ کر لیا، باقی چھ جہاز فرار ہو گئے۔ عروج مجاہدین کو لے کر بجایہ کی فصیل تک پہنچ گیا اور توپوں سے شدید گولہ باری شروع کی۔ قریب تھا کہ شہر فتح ہو جاتا، اچانک فصیل سے برسنے والی ایک گولی عروج کے بائیں ہاتھ میں گھس گئی۔ یہ ۹۲۰ھ (۱۵۱۴ء) کا واقعہ ہے۔ زخم کی شدت کے باعث عروج کو واپس جانا پڑا اور یہ مہم ادھوری رہ گئی۔ علاج سے زخم تو بھر گیا مگر ہاتھ عمر بھر کے لیے شل ہو گیا۔

بہر حال بحری مہمات زور و شور سے جاری رہیں اور یہ جیالے نصرانیوں کو یاد دلاتے رہے کہ عالم اسلام میں ابھی اپنے دفاع کا دم خم باقی ہے۔ ۹۲۱ھ (۱۵۱۵ء) کے صرف چھ سرمائی مہینوں میں نصرانیوں کے ۲۰ جہاز چھینے گئے اور ۳۸۰۰ نصرانی قیدی بنائے گئے۔ موسم گرما شروع ہوا تو عروج کی صحت بھی بحال ہو گئی اور وہ خود حملوں کی نہ صرف قیادت کرنے لگا بلکہ اس نے اپنی ترک و تاز کا دائرہ اسپین کے ساحلی جزیروں تک بڑھا دیا۔ اس نے جزیرہ مینورقہ پر بیڑہ لنگر انداز کیا اور اسپین کے ہزاروں ستم رسیدہ مسلمانوں کو جنہیں جبراً نصرانی بنایا جا رہا تھا، شمالی افریقہ پہنچانے میں مشغول ہو گیا۔ اس طرح ہزاروں مسلمان مرد و زن اور بچے خیریت سے محفوظ مقامات تک پہنچ گئے۔

عروج اور خیر الدین، اپنی مہمات کا دائرہ مزید بڑھانا چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے ایک نمائندہ استنبول بھیج کر سلطان سلیم اوّل سے رابطہ کیا۔ سلطان نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان دونوں بھائیوں کو "لالا" (شاہ کا پروردہ) کا

لقب دیا۔ اسلحے سے لدے ہوئے دو جہازوں کے علاوہ دونوں کو ایک ایک شاہی تلوار بھی جو خاص وفاداروں کو دی جاتی تھی۔ یہ ۹۲۲ھ (۱۵۱۶ء) کا واقعہ ہے۔ خلیفہ کی سرپرستی حاصل ہو جانے کے بعد عروج اور خیر الدین کو مزید مقبولیت ملی۔ ان کے خطیب اور داعی افریقہ کی مساجد میں جا جا کر جہاد کی دعوت دینے لگے۔ سلطنت عثمانیہ سے ترکوں اور عربوں کی بڑی تعداد عروج کے پرچم تلے جمع ہونے لگی۔ خلیفہ کی طرف سے بھی امداد مل رہی تھی۔ ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) میں اسے مزید چار جہاز دیے گئے۔ اب عروج کا بحری بیڑہ ۲۸ جہازوں پر مشتمل تھا اور وہ کسی بھی ملک کی بحریہ سے ٹکر لے سکتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے شمالی افریقہ میں ایک مضبوط اسلامی حکومت قائم کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد کیا۔ وہ ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) میں ۸۰۰ بحری سپاہیوں اور پانچ ہزار عرب رضا کاروں کے ساتھ الجزائر کی بندرگاہ پر اترا اور کسی مزاحمت کے بغیر الجزائر پر اس کا قبضہ ہو گیا اور یہ علاقہ سلطنت عثمانیہ کا حصہ بن گیا۔ عروج کو مقامی طور پر ''سلطان'' کہا جانے لگا۔ اس نے مقامی امراء کو متحد کر کے وہاں اسپین کے خلاف مزاحمت کا جذبہ بیدار کر دیا۔

اسپین کے بادشاہ چارلس پنجم نے عروج کا زور توڑنے کے لیے، ستمبر ۱۵۱۷ء (شعبان ۹۲۳ھ) میں چالیس بحری جہازوں اور پندرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ الجزائر پر یلغار کی اور ساحل پر عروج کے تعمیر کردہ ایک نئے قلعے کو گھیر لیا۔ عروج نے جواب میں اتنا شدید حملہ کیا کہ ہسپانوی ۱۵۰۰ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

وہران پر قابض ہسپانوی، اس وقت تلمسان کے مسلمان حاکم محمد خامس کو پوری طرح دبائے ہوئے تھے۔ تلمسان اس وقت دنیا کے بڑے شہروں میں سے ایک تھا۔ اس کی آبادی سوا لاکھ سے متجاوز تھی۔ ①

محمد خامس کے پاس کوئی مضبوط فوج تھی نہ اسلحہ۔ اپنی گردن بچانے کے لیے وہ اسپین سے عثمانی سلطنت کے خلاف اتحاد کا معاہدہ بھی کیے ہوئے تھا۔ ہر سال وہ اسپین کو خراج کے طور پر دس ہزار لیرہ سونا، دس ہزار بکریاں اور دس ہزار گائے بیل سمیت بکثرت غلہ بھیجا کرتا تھا۔ تلمسان میں اسپین سے نکالے جانے والے ہزاروں مسلمان پناہ لیے ہوئے تھے۔ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ ان کا حاکم، ان کفار سے اتحاد کرے جو اسپین سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا رہے ہیں۔

وہاں کے علماء نے عروج کو اس صورتحال سے خبردار کیا۔ عروج فوج لے کر تقریباً ایک ہزار کلو میٹر سفر کر کے تلمسان پہنچا۔ محمد خامس نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ مقامی لوگوں نے عروج کا شاندار خیر مقدم کیا۔ تلمسان کے بعد عروج نے فاس کا رخ کیا اور اس کے مشرق میں سب سے بڑے شہر ''وجدہ'' پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح وہ طرابلس الغرب (لیبیا) سے الجزائر تک ایک وسیع و عریض علاقے کا حاکم بن گیا۔

اتنے بڑے علاقے پر گرفت باقی رکھنے کے لیے استنبول سے مسلسل کمک کی ضرورت تھی۔ مگر عروج کو توقع کے مطابق افرادی و اقتصادی مدد نہ مل سکی۔ اس کی فوج کا بڑا حصہ اب سمندری مہمات سے زیادہ، مفتوحہ علاقوں کی نگرانی

---

① اس زمانے میں لندن کی آبادی ۸۵ ہزار اور یورپ کے سب سے بڑے شہر پیرس کی آبادی تین لاکھ ۸۰ ہزار تھی۔

میں مصروف ہوگیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ''وہران'' کے ہسپانوی جرنیل ڈان مارٹن نے دس ہزار سپاہیوں اور دس ہزار عربوں کے ساتھ، وہران سے ۸۰ کلومیٹر دور اس قلعے کو گھیر لیا جہاں عروج کا بڑا بھائی اسحٰق مورچہ بند تھا۔ اسحٰق ۲۵ دن تک محصورانہ جنگ لڑتا رہا مگر عروج اور خیر الدین خضر دیگر محاذوں پر مصروفیت کے باعث کوئی کمک نہ بھیج سکے۔ قلعے میں خوراک کا ذخیرہ بہت کم تھا جو جلد ختم ہوگیا اور فاقہ کشی نے محصورین کو نڈھال کر دیا، ان کی اکثریت شہید ہوگئی اور ۳۱ جنوری ۱۵۱۸ء (۷ محرم ۹۲۴ھ) کو ڈان مارٹن نے قلعہ سر کر لیا۔ جب وہ قلعے میں داخل ہوا تو زخموں سے چور چور اسحٰق اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ ان سے بھڑ گیا۔ یہ سب لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔

اس کے فوراً بعد ڈان مارٹن ساڑھے گیارہ ہزار نصرانیوں اور ۳۵ ہزار عربوں کو لے کر تلمسان پہنچا اور عروج کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ عروج چھ ماہ تک محصورانہ جنگ لڑتا رہا۔ اسے فاس کے سلطان سے مدد کی امید تھی جو پوری نہ ہوئی۔ الجزائر میں اس کا بھائی خیر الدین خضر بھی سپاہیوں کی کمی کے باعث مدد نہ بھیج سکا۔

عروج کے پاس بچنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا جس میں زندگی اور موت کے امکانات برابر تھے۔ وہ یہ کہ قلعے سے نکل کر نصرانیوں کا گھیرا توڑتے ہوئے الجزائر کا رُخ کیا جائے۔ اس نے ایک دن ہسپانویوں پر زوردار دھاوا بولا اور ان کے ۲۰۰ افراد کو قتل اور ۱۰۰ کو قیدی بنالیا۔ اس حملے سے اس نے گھیرا توڑنے کے امکانات کا اندازہ لگالیا۔

ایک دو دن بعد اس نے صبح کاذب کے وقت اپنے باقی ماندہ چالیس سپاہیوں کے ساتھ دوبارہ حملہ کیا اور نصرانی پہرے داروں کو درہم برہم کر کے گھیرے سے نکلتا چلا گیا۔[1]

اسپین کے جرنیل گارسیا ڈی تنکو نے اس کا تعاقب شروع کر دیا، دریائے سلادو تک وہ سائے کی طرح عروج کے پیچھے لگا رہا۔ عروج دریا میں کود کر خیریت سے پار پہنچا تو اس کے ساتھ صرف بیس آدمی تھے۔ باقی بیس ساتھی پیچھے رہ گئے تھے اور دریا کے کنارے تعاقب کرنے والے ۴۵ نصرانی سپاہیوں سے نبرد آزما تھے۔

عروج چاہتا تو جان بچا کر آسانی سے فرار ہو سکتا تھا مگر اس نے آخر تک ساتھ دینے والے دوستوں کو چھوڑنا گوارا نہ کیا اور انہیں بچانے کے لیے واپس دریا میں کود گیا، مگر جب وہ لہروں کو چیر کر کنارے پر نمودار ہوا تو نصرانی ان ۲۰ مجاہدین کو جو کئی دنوں کے بھوکے پیاسے اور تھکے ماندے تھے، ختم کر چکے تھے۔ عروج کو بھی پار پہنچتے ہی شہید کر دیا گیا۔ اس کا سر قلم کر کے اسپین بھیج دیا گیا جہاں جگہ جگہ اس کی نمائش کی گئی۔ اس دوران سلیم اول دو ہزار سپاہی، گولہ بارود اور توپوں کی بھاری کھیپ کے علاوہ، بحری جنگوں کی تربیت کے لیے چار ہزار ترک الجزائر روانہ کر چکا تھا مگر یہ کمک عروج کی شہادت کے بعد الجزائر پہنچی۔

اس مردِ مجاہد کی عمر ۴۸ سال تھی، اس نے عمر بھر شادی نہیں کی اور ساری زندگی جہاد میں گزار دی۔

زندگی سے ہے پُر اتنا خاک داں معمور ہے .... موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۴۰ تا ۲۵۳

اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ اس کی شہادت نے سلطنتِ عثمانیہ کو یقین دلا دیا کہ جب تک شمالی افریقہ کو اسپین کی چیرہ دستیوں سے نجات نہیں دلائی جاتی، حفاظتِ ملک و ملت کی ذمہ داری ادھوری اور قومی سلامتی خطرے میں رہے گی۔

ڈاکٹر یلماز نے عروج کی شخصیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کا قد کسی قدر لمبا تھا۔ دھوپ سے اس کی رنگت سانولی ہوگئی تھی۔ ڈاڑھی سرخ تھی۔ آنکھیں نارنجی اور چمک دار تھیں، کاندھے چوڑے اور جسم نہایت مضبوط تھا۔ نہایت شریف اور سخی آدمی تھا۔ رحم دل اور بااخلاق تھا۔ اپنے کام میں انتہائی سنجیدہ اور جفاکش تھا۔ بحری فوج میں وہ حد درجے مقبول اور محبوب تھا۔ جری، بہادر اور ذہین تھا۔ پُرخطر مہمات انجام دینے میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اسلحے کے استعمال اور بحری جنگ کی چالوں کا بہت بڑا ماہر تھا۔''[1]

امیر البحر خیر الدین پاشا کی فتوحات

سلطان سلیم اوّل نے عروج کی شہادت کی تفصیلات سننے کے بعد الجزائر کو سلطنتِ عثمانیہ کی ماتحت ریاست کی بجائے، مستقل صوبے کی حیثیت دینے کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی خیر الدین پاشا کو بیگلر بیگ بحری (امیر البحر، ایڈمرل) بنا کر یورپی طاقتوں کو بحیرۂ روم سے بے دخل کر دینے کی ذمہ داری سونپی۔

خیر الدین پاشا نے اپنے اختیارات سے کام لینے میں دیر نہ کی۔ اسے ہسپانوی افواج سے عروج کی شہادت اور اندلسی مسلمانوں پر مظالم کا بدلہ لینا تھا۔ وہ ۹۲۵ھ (۱۵۱۹ء) میں انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا بحری بیڑہ لے کر اسپین کی بندرگاہ ''بلنسیہ'' جا پہنچا۔ اس کے اچانک حملے میں بندرگاہ پر کھڑے تمام اسپینی جہاز تباہ ہو گئے۔

اسپین نے اس کارروائی کے جواب میں سسلی کے ہسپانوی حاکم موکوڈا کو الجزائر پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ وہ ۱۷۰ بحری جہاز اور ۲۵ ہزار سپاہی لے کر الجزائر کے ساحل پر اترا۔ پایۂ تخت میں خیر الدین پاشا تین ہزار ترکوں اور بیس ہزار عربوں کے ساتھ موجود تھا جبکہ شہر تلمسان میں ۷۰۰ ترک اور دو ہزار عرب اس کے بڑے بیٹے حسن بیگ کی کمان میں تھے۔ موکوڈا نے پہلے تلمسان پر قبضے کی کوشش کی اور حسن بیگ کو پیغام بھیجا کہ وہ خونریزی نہیں چاہتا، مسلمان فوجی اپنی جانیں اور ساز و سامان لے کر پُرامن طور پر تلمسان چھوڑ سکتے ہیں۔

حسن بیگ کی بجائے اس پیغام کا جواب خیر الدین پاشا نے دیا اور وہ بھی توپوں کے دہانے کھول کر۔ یوں ۲۳ اگست ۱۵۱۹ء (۱۵ شعبان ۹۲۵ھ) کو ساحل پر ایک ہولناک لڑائی شروع ہوگئی۔ دو طرفہ گولہ باری اور آتش و آہن کی بارش کے بعد دست بدست مقابلہ شروع ہوا، گھنٹوں تک جنگ کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ ایسے میں پاشا نے پانچ سو تجربہ کار سپاہیوں کو اسپین کے ان جہازوں پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا جو ساحل پر لنگر انداز تھے۔ اسپینی فوج اپنے جہازوں

[1] تاریخ الدولة العثمانية از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۵۲

کو بچانے کے لیے اُدھر متوجہ ہوئی تو پاشا نے ساری قوت مجتمع کر کے عقب سے ان پر فیصلہ کن حملہ کر دیا۔ اس حملے میں اکثر ہسپانوی مارے گئے۔ مونکوڈا باقی ماندہ سپاہیوں کو افراتفری کے عالم میں جہازوں پر چڑھا کر تیزی سے فرار ہو گیا۔

اس کامیابی کے بعد مسلمانوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے۔ خیر الدین پاشا نے حسن بیگ کو ایک بار پھر اسپین پر حملے کا حکم دیا۔ وہ بحری بیڑہ لے کر بلنسیہ پہنچا اور وہاں ایسے ہزاروں نصرانیوں کو قیدی بنایا جو الجزائر پر حملوں میں شریک تھے۔ یہ بحری بیڑہ قیدیوں اور مالِ غنیمت کے علاوہ بڑی تعداد میں اندلسی مسلمانوں کو بھی آزاد کرا لایا۔

۹۲۶ھ (۱۵۲۰ء) کے موسم بہار میں اسپین نے اپنی شکستوں کا بدلہ لینے کے ایک بحری بیڑہ الجزائر بھیجا جس میں ۱۸ جہاز تھے۔ خیر الدین پاشا نے ان میں سے پانچ پر قبضہ کر لیا اور "تنیس" کو ہسپانویوں سے چھین لیا۔

اس کے بعد ۱۱۰ جہازوں پر مشتمل اسپین کا دوسرا بحری بیڑہ پہنچا جو امیر ال فرنانڈو کی کمان میں تھا۔ خیر الدین نے اپنے تمام جہاز جمع کر کے اس کا مقابلہ کیا اور اسے بُری طرح شکست دی۔ اسپین کے اکثر سپاہی مارے گئے، ۳۶ افسران اور ۳۶۰۰ سپاہی گرفتار کر لیے گئے۔ خود امیر ال فرنانڈو بھی گرفتار ہو گیا۔

خیر الدین کی یہ فتوحات جاری تھیں کہ سلطان سلیم اوّل کی وفات ہو گئی۔[1]

سلیم اوّل اور بھائیوں کا قتل:

سلیم اوّل پر سب سے سخت الزام یہ ہے کہ اس نے بھائیوں اور بھتیجوں کو قتل کیا۔ واقعاتی طور پر یہ درست ہے مگر اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب وہ تخت نشین ہوا تھا تو اس کے دو بڑے بھائی احمد اور قرقود پہلے اظہار اطاعت کرنے کے بعد پھر باغی ہو گئے تھے۔ احمد نے جو اناطولیہ کے ضلع اماسیا کا حاکم تھا، بروصہ پر قبضہ کر لیا اور اپنے دو بیٹوں کو شاہ اسماعیل صفوی کے پاس مدد طلب کرنے بھیج دیا۔ بہر حال انجام کار صفر ۹۱۹ھ میں احمد کو شکست ہوئی اور اُسے گرفتار کر کے اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اس دوران منیسا (ضلع صاروخان) میں قرقود بھی بغاوت پر آمادہ ہونے لگا۔ سلیم اوّل نے خبر کی تصدیق کے بعد اس کے خلاف کارروائی کی۔ وہ فرار ہوا مگر آخر پکڑا گیا اور اسے پھانسی دے دی گئی۔

بغاوتوں کی سرکوبی کے دوران سلیم اوّل کے تین مرحوم بھائیوں: شہنشاہ، علم شاہ اور محمود کے پانچ بیٹے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ بعد میں وہ گرفتار ہو گئے۔ سلیم اوّل نے اس خدشے کے تحت کہ کہیں یہ بھی بغاوت میں شامل نہ ہوں یا بعد میں مشکلات پیدا نہ کر دیں، انہیں بھی قتل کرا دیا۔ ان کے نام درج ذیل ہیں: محمد بن شہنشاہ، عثمان بن علم شاہ، موسیٰ بن محمود، اورخان بن محمود، امیر بن محمود۔[2]

باغی شہزادوں سے نمٹنے کو تو ایک سیاسی ضرورت مانا جا سکتا ہے مگر محض شک کی بنا پر جن شہزادوں کو قتل کیا گیا، اس کی شرعاً گنجائش تھی نہ اخلاقاً۔ درحقیقت اس قسم ماورائے قانون اقدامات ہی اکثر سلطنتوں کے زوال کا باعث ہوتے ہیں۔

◆◆◆

---

[1] تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز: ۱/۲۵۳ تا ۲۵۶ [2] جامع الدول از منجم باشی: ص ۲۱۸ تا ۲۲۱

سلطان سلیمان خان اوّل القانونی

بن سلطان سلیم اوّل، المعروف بہ سلیمان عالی شان

۹۲۶ھ تا ۹۷۴ھ
(۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء)

سلیم اوّل کے جانشین سلیمان خان کی ولادت یکم شعبان ۹۰۰ھ (۲۷ اپریل ۱۴۹۵ء) کو ہوئی تھی۔ باپ کی موت کے بعد وہ ۷ اشوال ۹۲۶ھ (۲۹ ستمبر ۱۵۲۰ء) کو اس مسندِ خلافت پر بیٹھا جو تین براعظموں پر حاوی تھی۔ مسند نشینی کے وقت اس کی عمر صرف ۲۶ سال تھی، اس نے ۴۶ سال نہایت آن بان سے حکومت کی۔ اس کا دور نہ صرف باب عالی بلکہ اسلامی تاریخ کا سنہرا دور مانا جاتا ہے۔

تخت نشینی کے بعد اس نے تمام صوبوں کے حکام کو مراسلے روانہ کر کے انہیں عدل و انصاف اور نظم و ضبط کے ساتھ کام کرنے کی ہدایت کی۔

یہ مراسلے اس آیت سے شروع ہوتے تھے: ”اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ“[1]

بلغراد کی فتح:

سلیمان خان کے ابتدائی دور کا سب سے اہم واقعہ ہنگری سے جنگ تھی۔ ہنگری نے ترکی کو خراج ادا کرنا بند کر دیا تھا۔ سلیمان خان نے تخت نشینی کے بعد سفیر بھیج کر شاہِ ہنگری لوئیس دوئم کو خراج ادا کرنے کا حکم دیا اور عدم ادائیگی کی صورت میں جنگ کی دھمکی دی۔ شاہِ ہنگری نے خراج سے انکار کرتے ہوئے سلیمان خان کے سفیر کو قتل کر دیا۔

سلیمان خان نے زبردست تیاریوں کے ساتھ ایک بڑا لشکر ساتھ لیا جس میں گولہ بارود اور گولیوں کی بوریوں سے لدے تین ہزار اونٹ اور خوراک سے بھری دس ہزار بیل گاڑیاں بھی تھیں۔ پچاس جنگی جہاز دریائے ڈینوب کے راستے اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ سلیمان منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہنگری کی سرحدوں میں گھس گیا۔ اس نے پہلے بلغراد کے شمال میں واقع شہر شاجس (Sabotica) پر حملہ کیا اور ۲ شعبان ۹۲۷ھ (۱۶ اگست ۱۵۲۱ء) کو اس پر قبضہ کر لیا۔

[1] تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامی: ص ۱۹۸، ۱۹۹

اس کے بعد دریائے ڈینوب کے پار بلغراد پر دھاوا بولا گیا جو ہنگریوں کا پایہ تخت، سب سے مضبوط اور ناقابلِ تسخیر شہر تھا۔ یہ وہ شہر تھا جہاں سے سلطان محمد فاتح کو بھی پسپا ہونا پڑا تھا۔ سلیمان خان نے خشکی اور دریا دونوں سمت سے اسے گھیر لیا اور سخت خونریز جنگ کے بعد ۲۵ رمضان ۹۲۷ھ (۲۹ اگست ۱۵۲۱ء) کو اسے بھی فتح کر لیا۔ شہر پر قابض ہونے کے بعد حریف کے کسی سپاہی یا شہری کو قتل نہیں کیا گیا بلکہ سب کو جان کی امان دی گئی۔ اس کے بعد گرد و نواح میں سابانچ، سلانکا، اور زملن کے قلعے بھی سر کر لیے گئے۔

بلغراد اب ترکوں کا اہم معسکر بن گیا۔ یورپ کی فتوحات کے لیے لشکر یہیں سے روانہ ہونے لگے۔[1]

عالمی منظر نامہ:

سلیمان خان کی تاج پوشی کے زمانے میں دنیا میں دو عالمی طاقتیں آمنے سامنے آچکی تھیں: ایک سلطنتِ عثمانیہ، دوسری ہسپانیہ۔ ہسپانیہ میں اس سے پہلے ارغون، سسلی اور نیپلس کا حکمران فرڈی ننڈ پنجم اور قسطالیہ کی ملکہ ازابیلا مل کر ایک طویل عرصے تک حکومت کرتے رہے، ان کی واحد وارث ان کی بیٹی "جوانا" تھی جس کی شادی برگنڈی کے حاکم فلپ سے ہوئی تھی۔ ازابیلا اور فرڈی ننڈ کی موت کے بعد ان کے جانشین کا مسئلہ سنگین شکل اختیار کر گیا، اگرچہ قسطالیہ میں عورت کی حکومت قانوناً جائز تھی مگر ارغون کی روایات میں اس کی گنجائش نہ تھی، لہٰذا متحدہ ہسپانیہ کا بادشاہ کوئی مرد ہی ہوسکتا تھا۔ آخر ۹۲۲ھ (۱۵۱۶ء) میں جوانا کے کم عمر بیٹے چارلس پنجم کی تخت نشینی پر سب کا اتفاق ہوگیا۔ اسے اپنے نانا اور نانی کی طرف سے بیک وقت ارغون، قسطالیہ، نیپلس اور سسلی کی بادشاہت ورثے میں ملی۔ یہ ایک بہت بڑی طاقت تھی جو نہ صرف بابِ عالی بلکہ پورے عالمِ اسلام کے لیے سخت خطرہ تھی۔ مگر چارلس پنجم کو تخت نشینی کے ساتھ ہی فرانس سے جنگ میں مشغول ہونا پڑا۔ اُدھر اٹلی کے کیتھولک چرچ کو پادری مارٹن لوتھر کے نئے فرقے پروٹسٹنٹ سے پالا پڑ گیا تھا۔ ہنگری کے آزاد علاقوں میں نئے بادشاہ لوئیس دوئم کی کم عمری کے باعث امراء نااتفاقی کا شکار تھے۔

یورپ کے اس سیاسی و مذہبی بحران سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلیمان خان نے مغرب میں نئی فتوحات کا عزمِ مصمم کر لیا۔

روڈس کی فتح:

ایشیائے کوچک کے جنوب مغرب میں اڑھائی ہزار مربع کلومیٹر پر مشتمل بحیرۂ روم کا یونانی جزیرہ روڈس، نصرانیوں کا نہایت مضبوط جنگی مرکز تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں اسے فتح کیا گیا تھا مگر ۶۰ھ میں یزید بن معاویہ نے تخت نشین ہوتے ہی اسے از خود خالی کر دیا تھا۔ اس کے بعد مسلمان اس جزیرے کو دوبارہ فتح نہ کر سکے۔

ساڑھے آٹھ سو سال سے یہ جزیرہ مسلمانوں کے لیے حلق کا کانٹا بنا ہوا تھا۔ اس کی فصیل اور قلعے کو دنیا کے مضبوط ترین جنگی مراکز میں شمار کیا جاتا تھا۔ اسے فتح کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ یہاں کلیسا سینٹ جان کے نائٹس کی حکومت تھی۔ جب بھی مسلمان اس پر حملہ کرتے یورپی جہاز ران متحد ہو کر اس کا دفاع کرنے آجاتے۔ سلطان

---

[1] جامع الدول تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از منجم باشی: ص ۲۵۶، ۲۵۷؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/ ۲۶۲

محمد فاتح نے اس پر تین بار فوج کشی کی۔ ۸۸۵ھ (۱۴۸۰ء) میں اس کے ایک سالار نے یہ جزیرہ سر کر لیا تھا مگر آخر میں مسلمان اپنی ہی بدنظمی کی وجہ سے پسپا ہو گئے۔ استنبول سے مصر تک بحری راستے کو محفوظ کرنے کے لیے روڈس پر قبضہ ضروری تھا۔ سلطان سلیم اول اسے فتح کرنے کی تیاری کر رہا تھا مگر اسے مہلت نہ ملی۔

سلیمان خان نے اپنے باپ کے منصوبے کی تکمیل کے لیے جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور نہایت تیزی سے اپنی بحریہ کو لے کر روڈس پر یلغار کر دی۔ جزیرے پر حملہ یکم اگست ۱۵۲۲ء، (۲۶ شعبان ۹۲۸ھ) کو شروع ہوا تھا۔

اس سے پہلے محکمۂ جاسوسی کے اہلکار روڈس پہنچ کر نصرانیوں میں گھل مل گئے تھے۔ روڈس کی جنگ میں ان جاسوسوں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ روڈس کا پرچم بردار "ڈان آمرال" بھی سلطنتِ عثمانیہ کا جاسوس تھا۔

سلیمان خان نے روڈس کے قریبی بارہ جزیروں کو یکے بعد دیگرے فتح کر لیا، آخر میں روڈس کی کلید سمجھے جانے والے جزیرہ بودروم کو بھی زیرنگین کر کے روڈس پر دھاوا بولا گیا۔ شہر کی فصیل پر گھمسان کی جنگ ہوئی، محصورین کی عورتیں تک لڑائی میں شریک رہیں، ۲۰ ہزار مسلمان اس حملے میں شہید ہوئے اس کے باوجود فصیل پر حملے جاری رہے۔ شہر میں موجود باب عالی کے جاسوسوں نے رات کے وقت روشنی سے اشارے دے کر فصیل کے کمزور مقامات کی نشان دہی کر دی۔ گولہ باری سے فصیل کو شکستہ ہوتے دیکھ کر نصرانی گھبرا گئے۔ آخر جزیرے کے فرنگی حاکم نے پُرامن انخلاء کی شرط پر جزیرہ حوالے کر دیا۔

یکم جنوری ۱۵۲۳ء، (۱۳ صفر ۹۲۹ھ) کو نصرانی کشتیوں میں سوار ہو کر جزیرہ مالٹا کی طرف نکل گئے اور ترکوں نے جزیرے کا کنٹرول سنبھال لیا۔ یہاں قید چھ ہزار مسلمان رہا کرا لیے گئے۔[1]

اسپین پر ضربِ کاری، فرانس سے اتحاد، ہنگری پر فوج کشی

اسپین میں محکوم مسلمانوں پر جو مظالم ہو رہے تھے، وہ سلیمان خان سے مخفی نہ تھے، اس لیے وہ اسپین کو ہر ممکن زک پہنچانا چاہتا تھا۔ اسپین اس وقت دنیا کی واحد سلطنت تھی جس کا بحری بیڑا عثمانیوں کی ٹکر کا تھا۔ یہ مہیب استعماری طاقت مشرق کی طرف بڑھتے ہوئے وسطی یورپ تک چھا گئی تھی اور مغرب میں بحر اوقیانوس کو پار کر کے امریکا تک جا پہنچی تھی۔ امریکا میں واقع سونے اور چاندی کی کانوں سے اس قدر دولت اسپین پہنچ رہی تھی کہ ہسپانوی نصرانی پوری دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اگر ان کے سامنے بند باندھنے والا کوئی تھا تو وہ صرف سلیمان عالی شان تھا جس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اس طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دم لے گا۔

اس نے اسپین پر دو طرفہ ضرب لگانے کا منصوبہ ترتیب دیا۔ سمندر میں اس نے یہ مہم خیر الدین باربروسا کو سونپی

---

[1] جامع الدول لتاریخ الدولة العثمانیة از منجم باشی: ص ۲۵۸ تا ۲۶۰؛ تاریخ الدولة العلیة از محامی: ص ۲۰۴ تا ۲۰۶

روڈس پر ترکوں کی حکومت پونے تین صدیوں تک رہی۔ نپولین بوناپارٹ نے مصر پر قبضے کے دوران ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں اسے مسلمانوں سے چھینا۔

جبکہ خشکی میں وسطی یورپ کے محاذ پر اس نے خود جنگ کی کمان کا فیصلہ کیا۔ اُدھر شاہِ اسپین چارلس پنجم نے عثمانیوں سے فیصلہ کن جنگ کا وقت قریب دیکھ کر ایران کے صفویوں سے رابطے کیے اور انہیں اپنا حلیف بنالیا تاکہ سلطنتِ عثمانیہ پر مشرق سے بھی حملہ کرایا جائے۔ اس لیے اگلے سالوں میں بابِ عالی کو ایرانیوں کی چیرہ دستیوں سے بھی پالا پڑا۔

ترکی کے لیے اس وقت اسپین پر براہ راست کوئی بڑا حملہ کرنا بہت مشکل تھا کیوں کہ یہ وقت اسپین کے انتہائی عروج کا تھا، جرمنی، ہالینڈ کے ساحلی علاقوں اور جنوبی اٹلی کے علاوہ جینوا، وینس اور سسلی تک اس کی ماتحت ریاستیں شمار ہوتے تھے۔ ایسے میں یہ زیادہ مؤثر تھا کہ اسپین کے حریف نصرانی ممالک ہی کو استعمال کر کے اسے کمزور کیا جائے۔

اسپین کا سب سے بڑا حریف فرانس تھا۔ شاہِ فرانس فرانسس اول (۱۴۹۴ء۔۱۵۴۷ء) اکیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس کی تخت نشینی کے ایک سال بعد اسپین سے مسلمانوں کی حکومت ختم کرنے والا مشہور بادشاہ فرڈی نند پنجم مر گیا اور اس کی جگہ اس کا سولہ سالہ پوتا چارلس پنجم (۱۵۰۰ء۔۱۵۵۸ء) حکمران بنا۔

فرانسس اول، اٹلی کے مشہور شہر "میلان" (جہاں ۱۹۴۵ء میں کمیونسٹوں نے مسولینی کو پھانسی دی تھی) پر استحقاق کا دعوے دار تھا۔ چارلس پنجم نے جرمنی کی فتح کے بعد میلان پر اپنے حق کا دعویٰ کر دیا۔ اس پر ۱۵۲۰ء میں فرانس اور اسپین میں جنگ چھڑ گئی۔ چارلس کو مسلسل فتوحات ہوئیں اور وہ کئی یورپی ممالک فتح کر کے فرانس کو تین اطراف سے گھیرنے میں کامیاب ہو گیا۔ صرف سمندر کی سمت فرانس کے لیے کھلی رہ گئی تھی۔ ۱۵۲۵ء (۹۳۱ھ) میں پیویا کے مقام پر ایک جنگ میں چارلس نے فرانسس اول کو عبرت ناک شکست دے کر گرفتار کر لیا۔

اس کی ماں نے سلیمان عالی شان کو درخواست بھیجی کہ وہ اس کے بیٹے کو رہا کرانے کی کوشش کرے۔ اس کا مراسلہ ۶ دسمبر ۱۵۲۵ء (۸ صفر ۹۳۲ھ) کو دربارِ خلافت میں سنایا گیا۔ یہ ترکی اور فرانس میں تعلقات کا نقطۂ آغاز تھا۔

چارلس پنجم نے چند ماہ بعد فرانسس اول کو ایسی سخت شرائط منوا کر آزاد کیا جن سے فرانس کی آزادی سلب ہو گئی۔ فرانسس اول، پیرس واپس پہنچا تو اسے اپنی بقا کے لیے آلِ عثمان سے اتحاد کے سوا کوئی راہ دکھائی نہ دی۔ اس کے سفیر بابِ عالی پہنچے اور درخواست کی کہ خلیفہ فرانس کا حلیف بن کر اسپین کے حامی ہنگری پر حملہ کر دے تاکہ فرانس کو اسپین سے بدلہ لینے کا موقع مل سکے۔ سلیمان عالی شان ہر قیمت پر اسپین کی طاقت کو توڑنا چاہتا تھا، نیز اس کے پاس ہنگری پر حملہ کرنے کی دو مزید اہم وجوہ بھی تھیں:

❶ سلیم اول کے آخری دور میں سلطنتِ عثمانیہ اور ہنگری میں کش مکش کی صورت حال پیدا ہو چکی تھی اور سرحدوں پر جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس کا منہ توڑ جواب دینا بھی ضروری تھا۔

❷ سلطنتِ عثمانیہ کی سرحدوں کو محفوظ بنانا بھی سلیمان کی پالیسی کا اہم حصہ تھا۔ ہنگری کے خود مختار ہوتے ہوئے سرحدیں ہر وقت خطرے کی زد میں تھیں۔

ان وجوہ سے سلیمان نے فرانسس اول کی پیش کش کا مثبت جواب دیا۔ یوں فرانس اور سلطنتِ عثمانیہ اتحادی بن

گئے۔ اتحاد کے ایجنڈے میں طے کیا گیا کہ فریقین مل کر اسپین اور اس کے ماتحت ممالک کو زیر کریں گے۔

سلیمان عالی شان نے یلغار میں دیر نہ لگائی اور ۱۵۲۶ء (۹۳۲ھ) میں ۳۰۰ توپیں اور ۸۰۰ بحری جہاز لے کر ایک لاکھ سپاہیوں کے ساتھ سربیا سے ہوتے ہوئے ہنگری میں داخل ہو گیا۔ اس دور میں ہنگری آج کل جیسا چھوٹا ملک نہیں تھا بلکہ بحیرۂ ایڈریاٹک تک وسیع تھا، چیکوسلواکیہ کا پورا علاقہ اس میں شامل تھا۔[1]

جنگ موہاکس:

۲۸ اگست ۱۵۲۶ء (۲۰ ذوالقعدہ ۹۳۲ھ) کو وادیٔ موہاکس (Mohacs) میں ہنگری اور ترکی کی فوجیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئیں۔ یہ جگہ بلغراد سے ۱۸۵ کلومیٹر شمال مغرب میں اور بوڈاپسٹ سے ۱۷۰ کلومیٹر جنوب میں ہے۔ استنبول سے یہاں تک پہنچنے کے لیے عثمانی افواج نے ۱۵۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ ۱۲۸ دن میں طے کیا تھا۔ ہنگری کی فوج دو لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھی، ان کے علاوہ جرمنی کے ۳۸ ہزار سپاہی ان کی کمک کے لیے پہنچ گئے تھے۔ شاہ ہنگری لوئیس دوئم خود اپنی فوج کی کمان کر رہا تھا۔

عثمانی لشکر کی کمان غازی بالی بیگ اور غازی خسرو بیگ کے ہاتھوں میں تھی، دونوں سلیمان کے پھوپھی زاد تھے۔

سلیمان عالی شان نے فجر کی نماز کے بعد فوج کی صفوں میں کھڑے ہو کر ایسی روح پرور تقریر کی کہ فوج میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ بعض جملے ایسے تھے کہ شہادت کے متوالے سپاہی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکے۔

عثمانیوں نے حملے میں پہل نہ کی اور اپنی جگہ صف بستہ رہے۔ صبح سے عصر ہو گئی، یہاں تک کہ ہنگرین فوج کا صبر وتحمل جواب دے گیا اور شاہ ہنگری لوئیس نے جارحانہ حملہ کر دیا۔ نہایت قہر انگیز جنگ شروع ہو گئی۔ سلیمان عالی شان نے جنگ کا نقشہ طے کیا ہوا تھا۔ اس نے توپ خانے کو عقب کے ٹیلوں پر چھپا کر ہنگرین فوج کا سامنا کیا مگر جلد ہی فوج کو پسپائی کا حکم دے دیا۔ ہنگرین پورے جوش وخروش سے ترکوں کا پیچھا کرنے لگے۔

ہنگری کے ۳۵ نائٹوں نے یہ قسم کھا کر اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی کہ وہ سلیمان کو قتل کیے بغیر واپس نہیں آئیں گے۔ ان میں سے تین جنگجو مفرور ترکوں کو مارتے کاٹتے ہوئے سلیمان تک پہنچ گئے۔ ایک نے سلیمان کا نشانہ لے کر تیر چلایا، نشانہ صحیح تھا مگر تیر سلیمان کی زرہ میں اٹک کر رہ گیا۔ اب تینوں جنگجو تلواریں سونت کر سلیمان پر ٹوٹ پڑے۔ مگر سلیمان بھی بلا کا شمشیر زن تھا، اس نے دست بدست مقابلہ کر کے تینوں کو موت کی نیند سلا دیا۔

عثمانی فوج طے شدہ منصوبے کے تحت پسپا ہوتے ہوئے توپ خانے کے پیچھے چلی گئی اور ہنگرین فوج آگے بڑھتے بڑھتے پوری طرح توپوں کی زد میں آ گئی۔ سلیمان کے اشارے پر گولے داغے جانے لگے۔ ایک ساتھ تین سو توپوں کی زد میں آ کر ہنگرین فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ ترکوں نے تعاقب کر کے انہیں گھیر لیا اور ہزاروں کو کاٹ کر رکھ دیا۔

بارشوں سے اس وادی کی کھائیاں تالابوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ ان گنت نصرانی بھاگتے ہوئے ان میں ڈوب کر

---

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۰۹ تا ۲۱۱؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۷۰

مر گئے۔ ۲۴ ہزار افراد گنوانے کے بعد ہنگریوں کی مزاحمت کا زور ٹوٹ گیا۔ شاہ ہنگری بھی اسی دارو گیر کے دوران کسی تالاب میں غرق ہو گیا تھا۔ اس کی لاش تک نہ ملی۔ آٹھ بڑے پادری اور کئی نامور نائٹس اور نواب بھی مارے گئے۔

پوری لڑائی ڈیڑھ دو گھنٹے میں ختم ہو گئی۔ زخمی ہونے والے مسلمان ہزاروں تھے مگر شہدا صرف ڈیڑھ سو تھے۔

۱۰ ستمبر ۱۵۲۶ء (۲۰ ذوالقعدہ ۹۳۲ھ) کو سلیمان نے ان کے نئے پایہ تخت بوڈاپسٹ پر آسانی سے قبضہ کر لیا اور ٹرانسلوانیا کے حاکم جان زاپولی کو وہاں نائب مقرر کر دیا۔ چھ ماہ تک جاری اس مہم کے بعد سلیمان عالی شان نومبر ۱۵۲۶ء (محرم ۹۳۳ھ) میں استنبول واپس پہنچا۔[1]

بغاوت۔ ہنگری پر دوبارہ فوج کشی:

اس فتح کو کچھ عرصہ گزرا تھا کہ ۱۵۲۷ء کے اواخر (اوائل ۹۳۴ھ) میں شاہ اسپین چارلس پنجم کے بھائی آرچ ڈیوک فرڈیننڈ نے جو جرمنی اور آسٹریا کا حکمران تھا، یہ کہہ کر ہنگری پر اپنا حق جتانا شروع کر دیا کہ وہ ہنگری کے مقتول بادشاہ لوئس کا قرابت دار ہے۔ فرڈیننڈ نے اس دعوے کے ساتھ ہنگری پر حملہ کیا اور جان زاپولی کو بے دخل کر دیا۔

جان زاپولی نے سلیمان عالی شان کو اطلاع بھیجی جس کے حکم پر صدر اعظم ابراہیم پاشا فروری ۱۵۲۸ء (جمادی الاولیٰ ۹۳۴ھ) میں لشکر لے کر ہنگری روانہ ہوا۔ اس کے بعد سلیمان خود اڑھائی لاکھ سپاہیوں اور تین سو توپوں پر مشتمل لشکرِ جرار لے کر نکلا اور راستے کے شہروں کو مسخر کرتے ہوئے ۳ ستمبر ۱۵۲۹ء (۱۷ ذوالحجہ ۹۳۵ھ) کو بوڈاپسٹ پہنچ گیا۔

آرچ ڈیوک فرڈیننڈ، سلیمان عالی شان کے ساتھ اتنا بڑا لشکر دیکھ کر سراسیمہ ہو گیا اور بھاگ کر اپنے ملک آسٹریا میں پناہ لی۔ ۸ ستمبر ۱۵۲۹ء (۲۲ ذوالحجہ ۹۳۵ھ) کو شہر فتح ہو گیا۔[2]

آسٹریا پر حملہ۔ ویانا کا محاصرہ:

ہنگری کی فتح کے بعد ترکوں کی سرحدیں آسٹریا (جسے عربی میں "النمسا" کہا جاتا ہے) سے جا ملی تھیں۔ شاہ آسٹریا فرڈیننڈ کو سزا دینا ضروری تھا جو اپنے پایہ تخت ویانا میں مورچہ بند تھا۔ چنانچہ ترکوں نے ہنگری سے ویانا کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ راستے میں شدید بارش اور کیچڑ کی وجہ سے تمام توپوں اور گولہ بارود کے سارے ذخیرے کو ساتھ لے جانا مشکل ہو گیا۔ اس لیے مجبوراً بہت سا بھاری اسلحہ ہنگری میں چھوڑ دیا گیا۔

۲۷ ستمبر ۱۵۲۹ء (۱۱ محرم ۹۳۶ھ) کو عثمانی افواج آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کا محاصرہ کر چکی تھیں۔ فریقین میں نہایت خونریز جنگ ہوتی رہی، توپوں نے شہر کی فصیل کے ایک حصے کو شکستہ کر دیا جس کے بعد تین دن تک عثمانی افواج نے پے در پے شہر پر حملے کیے اور اندر گھسنے کی کوشش کی مگر مقامی فوجوں نے سخت مزاحمت کی جس میں ہزاروں ترک

---

[1] جامع الدول لتاریخ الدولۃ العثمانیۃ از منجم باشی احمد بن لطف اللہ: ص۲۶۳، ۲۶۴؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۰۹ تا ۲۱٤ مع حاشیہ؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/۲۷۰ تا ۲۷۲

[2] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۱۵، ۲۱٦

شہید ہوئے۔۱۱۳ اکتوبر ۱۵۲۹ء (۲۷ محرم ۹۳۶ھ) کو آخری حملہ ہوا جس کی ناکامی کے بعد سلیمان نے واپسی کا حکم دے دیا۔ ویانا کے اس محاصرے کی ناکامی کی چند اہم وجوہ یہ تھیں:

❶ اہل یورپ نے ویانا کو اپنا آخری مورچہ سمجھ کر اس کی حفاظت کے لیے غیر معمولی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ ترکوں کو اتنے مضبوط دفاعی انتظامات کا اندازہ نہیں تھا۔

❷ بارشوں اور کیچڑ کی وجہ سے اکثر بھاری توپیں ہنگری میں چھوڑ دی گئی تھیں۔ محاذ پر موجود توپیں قلعہ شکنی کے لیے کافی نہیں تھیں۔

❸ ترک فوج استنبول سے ویانا تک ایک نہایت طویل اور دشوار گزار سفر طے کر کے آئی تھی۔ مرکز اور محاذِ جنگ میں اس غیر معمولی فاصلے نے لڑائی کو مشکل ترین بنا دیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ویانا کی فوج نے بہت ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر وہ طویل عرصے تک شہر کو نہیں بچا سکتی تھی۔ ظاہر ہے اتنے بڑے اور مستحکم شہر کی فتح کے لیے ۱۹ دن کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے، بلغراد ۴۳ اور روڈس ۱۴۳ دن کے محاصرے کے بعد فتح ہوئے تھے۔ اگر محاصرہ جاری رہتا تو ویانا کی فتح ناممکن نہیں تھی مگر موسمِ سرما قریب تھا اور محاصرہ طویل ہونے کی صورت میں برف باری ترکوں کی واپسی کی راہ مسدود کر سکتی تھی۔

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ سلیمان عالی شان دشمن کا تعاقب کر کے اسے مرعوب کرنے ویانا پہنچا تھا اور یہ مقصد محاصرے سے حاصل ہو چکا تھا۔ اگر وہ شہر کو بہر صورت فتح کرنے کا منصوبہ بناتا تو بھاری توپوں کے بغیر کوچ نہ کرتا بلکہ مہم کو برسات اور جاڑا ختم ہونے تک ملتوی رکھتا۔

بہر کیف یورپی تاریخ میں ویانا کے اس ناکام محاصرے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ یہ اسلامی افواج کی یلغار کی آخری حد تھی۔ مسلمان کبھی اس حد سے آگے نہ بڑھ پائے۔

واپسی میں ترک افواج نے مختلف سمتوں میں پھیل کر آسٹریا، ہنگری اور چیکوسلواکیہ کے متعدد شہر اور قلعے فتح کیے جن میں آسٹریا کا گرز (Graz)، چیکوسلواکیہ کا (Maribor)، ریاست باڈیریا کا پایۂ تخت (Regensbuvg) اور ریاست مورافیا کا پایۂ تخت (Brunn) قابلِ ذکر ہیں۔ اس طرح یہ سارا خطہ عثمانی افواج کی جولان گاہ بن گیا۔ ان مہمات میں کئی گھمسان کے معرکے ہوئے، مجموعی طور پر اس پورے سلسلۂ جنگ میں ۱۴ ہزار مسلمان شہید ہوئے۔①

آسٹریا پر دوسرا حملہ، جنگِ المانیا ۱۵۳۲ء (۹۳۸ھ):

محاصرہ ویانا میں ناکامی کے باوجود اس جنگ سے یورپ پر اسپین کے تسلط کو سخت ضرب لگی۔ یہ ثابت ہو گیا کہ چارلس پنجم یورپ کی حفاظت کے قابل نہیں، اور اہلِ یورپ کو اسپین سے الگ ہو کر عثمانیوں سے معاملات طے کرنا ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ آرک ڈیوک فرڈی ننڈ کے سفیر جنوری ۱۵۳۰ء (جمادی الاولیٰ ۹۳۶ھ) میں استنبول پہنچے اور

① تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۱۶، ۲۱۷، تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۷۳، ۲۷۴

درخواست کی کہ خلیفہ فرڈی ننڈ کو اپنا نائب بنا کر جان زابولی کی جگہ اسے ہنگری کی تولیت بخش دے اور جو چاہے شرائط منوالے مگر یہ درخواست رد کر دی گئی۔ سلیمان عالی شان نے جان زابولی ہی کو ہنگری کا حاکم برقرار رکھا۔

۱۵۳۱ء (۹۳۷ھ) میں فرڈیننڈ نے دوبارہ ہنگری میں فوج بھیجی اور بوڈاپسٹ کا محاصرہ کیا جسے وہاں کی محافظ فوج نے ناکام بنا دیا۔ سلیمان عالی شان نے یہ خبر سن کر رمضان ۹۳۸ھ (اپریل ۱۵۳۲ء) میں ایک بار پھر استنبول سے آسٹریا کا رخ کیا۔ اس کے ساتھ دو لاکھ سپاہی تھے۔ فرڈیننڈ نے صلح کی پیش کش کی مگر سلطان نے مسترد کر دی۔ سربیا کے شہر نیش (Nis) میں فرڈیننڈ کے سفیر ایک بار پھر صلح کا پیغام لیے منتظر تھے۔ سلطان نے وہاں بھی انہیں دھتکار دیا۔

بلغراد میں شاہِ فرانس فرانسس اوّل کے سفیروں سے ملاقات ہوئی۔ سلطان نے ان کا بڑا اعزاز و اکرام کیا اور شاہِ فرانس سے اتحاد کے معاہدے کی تجدید کر کے اس سمت فوج کشی جاری رکھی جہاں ہنگری، آسٹریا اور جرمنی کی سرحدیں ملتی ہیں تاکہ جرمنی کے بعض سرحدی قلعوں پر بھی حملہ کیا جاسکے۔

اس مہم میں جرمنی کے ۱۵ سرحدی قلعے فتح کیے گئے۔ فرڈی ننڈ یا شاہ اسپین چارلس نے کہیں بھی کھلے میدان میں مسلمانوں کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں کی۔ آسٹریا کی سرحد میں سیکلوس (Siklos) اور کنی جے (Kanijce) جیسے اہم قلعوں کو سر کرنے کے بعد سلیمان عالی شان نے ویانا سے ۹۰ کلومیٹر جنوب میں "کوزیگ" (Koszeg) نامی ایک اہم عسکری مرکز کو جا گھیرا۔ اس شہر کی محافظ فوج نے طویل مزاحمت کی۔ آخر کار اہلِ شہر نے ۲۸ اگست ۱۵۳۲ء (۲۶ محرم ۹۳۹ھ) کو اس شرط پر ہتھیار ڈالے کہ عثمانی افواج شہر میں داخل نہیں ہوں گی۔

اگر عثمانی افواج سیدھا ویانا پہنچ جاتیں تو موسمِ گرما میں محاصرہ شروع کیا جاسکتا تھا مگر اب موسمِ سرما قریب آچکا تھا۔ خدشہ تھا کہ محاصرہ طویل ہوا تو موسمِ سرما کی شدت کے باعث مہم ادھوری رہ جائے گی۔ سلیمان عالی شان کو یہ اطلاع بھی ملی کہ اسپین اور جرمنی کی فوجیں ویانا پہنچ گئی ہیں۔ چنانچہ اس نے واپسی کو ترجیح دی۔

سلیمان کے استنبول پہنچنے کے بعد شاہِ آسٹریا نے پھر صلح کی پیش کش کی۔ سلیمان نے عارضی جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا۔ طے ہوا کہ آسٹریا، ہنگری پر اپنا حق نہیں جتائے گا اور ترک معینہ مدت تک آسٹریا پر حملہ نہیں کریں گے۔[1]

دُوَلِ یورپ سے امن معاہدہ:

سلیمان خان نے اسپین کی بالادستی کو خاک میں ملانے اور یورپ کو بڑی حد تک دبانے کے بعد امن و امان کو ترجیح دی۔ جون ۱۵۳۳ء (ذوالقعدہ ۹۳۹ھ) میں جرمنی و آسٹریا کے حکمران فرڈی ننڈ سے سرحدوں کے احترام کا معاہدہ ہو گیا۔ ساتھ ہی طے ہوا کہ ہنگری میں بابِ عالی کے نائب، زابولی کے ساتھ آسٹریا کا کوئی بھی معاہدہ، بابِ عالی کی منظوری کے بغیر جائز نہیں ہوگا نیز اسپین کا اس معاہدے اور صلح نامے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ یوں سلیمان عالی شان نے اپنے منصوبے کے عین مطابق اسپین کو ایک عالمی طاقت بننے سے روک دیا۔[2]

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص۲۱۸، ۲۱۹؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۷۳تا۲۷۵

② تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۱۹؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۷۴، ۲۷۵

سلیمان عالی شان نے یورپ میں اپنے اتحادیوں کے ساتھ رابطے بہتر بنائے۔ ۱۵۳۶ء (۹۴۲ھ) میں فرانس کے ساتھ سولہ شقوں پر مشتمل ایک تجارتی معاہدہ ہوا، جس کے تحت دونوں ممالک کے تاجروں کو خاطر خواہ مراعات کے ساتھ آزادانہ تجارت کی اجازت دی گئی۔[1]

خیر الدین باربروسا کے ناقابلِ فراموش کارنامے

سلطان سلیمان عالی شان کے دور میں امیر البحر خیر الدین کا منصب و مقام برقرار تھا۔ حالات اچھے جارہے تھے کہ ایک افسوس ناک سانحہ پیش آ گیا۔ الجزائر کے سابق عرب امراء اور تیونس کے موجودہ حکام (بنوحفص) کی ریشہ دوانیوں نے بہت سے مسلمانوں کو ترکوں کے خلاف کھڑا کردیا۔ بغاوت کے آثار واضح دیکھ کر خیر الدین پاشا نے الجزائر کے امراء کو جمع کیا اور کہا:

''ہم یہاں مسلمانوں کا خون بہانے نہیں، جہاد کے لیے آئے ہیں۔ مسلمانوں کی گردنیں کٹنے کا وبال تمہارے اوپر ہوگا۔ دیکھتے ہیں تم مسلمانوں کو کفار سے کیسے بچاتے ہو۔'' یہ کہہ کر اس رجلِ عظیم نے پایہ تخت کی چابیاں مقامی امراء کے حوالے کردیں اور اپنے بحری بیڑے میں کسی اور منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

خیر الدین کے پاس چالیس جہاز تھے، مسلمانوں کی حفاظت کے لیے اسے سمندر میں کوئی مضبوط بندرگاہ بہر حال چاہیے تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بغاوت میں امیر تیونس کا بڑا ہاتھ ہے جو اسپین کا باج گزار ہے۔

خیر الدین امیر تیونس کو سزا دینے کے لیے اس کے جزیرے ''جربہ'' پر قابض ہو گیا۔ تیونس کے سفیر بات چیت کرنے آئے تو اس نے انہیں یہ کہہ کر واپس کردیا کہ وہ ایسے لوگوں سے بات نہیں کرنا چاہتا جو اندلس اور مشرقی افریقہ میں مسلمانوں کو قتل کرنے والے کفار سے تعاون کر رہے ہیں۔

الجزائر سے ترکوں کے انخلاء کے بعد وہاں ہسپانوی پھر حملے کرنے لگے۔ سمندری راستے غیر محفوظ ہو جانے سے ملکی تجارت کساد کا شکار ہو گئی۔ چار سال اسی طرح گزرے۔ امرائے الجزائر خیر الدین سے درخواست کرتے رہے کہ وہ واپس آ کر ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی وفد اس کے پاس آتا۔

آخر چار سال بعد خیر الدین پاشا دوبارہ الجزائر پہنچا جہاں اس کا شاندار استقبال ہوا۔ اس نے آسانی سے اسپین کے زیر تسلط الجزائری شہروں: شرشل، جزیرہ وہران اور تنیس کو بھی آزاد کرالیا۔

اسپینی فوج نے ''پینیون'' میں ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کر کے اسے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ مشہور ہسپانوی جرنیل ڈان مارٹن جس نے عروج کو آخری شکست دی تھی، یہاں مقیم تھا۔ خیر الدین پاشا نے اس قلعے کو گھیر لیا اور بیس دن کی گولہ باری کے بعد ۲۷ مئی ۱۵۲۹ء (۱۶ رمضان ۹۳۵ھ) کو اس کی ناقابلِ تسخیر فصیل کے پرخچے اڑا دیے۔ قلعے پر قبضے کے ساتھ ہی

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۲۵ تا ۲۳۰

ڈان مارٹن اور اس کے ساتھ ۷۰۰ سپاہی قیدی بنا لیے گئے۔ پاشا نے نصرانی قیدیوں کو کام پر لگا کر شہر کی بندرگاہ کے گرد ایک فلک بوس فصیل تعمیر کرا دی۔ اس دوران اسپینی بحریہ ۹ بحری جہازوں میں محصورین کے لیے کمک اور رسد کے ذخائر لے کر آئی، ان لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ مسلمان شہر فتح کر چکے ہیں۔ اسلامی بحریہ نے گھیر کر ان سب جہازوں پر قبضہ کر لیا۔

اس دوران پاشا کو اطلاع ملی کہ اسپین کا شاہ چارلس اور جرمنی کے حکام جنیوا میں ملاقات کر رہے ہیں۔ پاشا نے موقع غنیمت جانتے ہوئے یورپ کے مختلف نقاط پر چھاپے مارنے کے لیے ایک بحری بیڑا روانہ کیا جس کی قیادت رئیس بن احمد کر رہا تھا۔ اس کی بحری فتوحات کے سبب مسلمان اسے "ضارب الکفار" کہتے تھے جبکہ ہسپانوی اسے "شیطان" کہہ کر یاد کرتے تھے۔

رئیس بن احمد نے پہلے مارشلیا، پھر وینس اور آخر میں اسپین کی بندرگاہ بلنسیہ پر حملہ کیا۔ بلنسیہ سے ہزاروں مظلوم مسلمانوں کو لے کر وہ ساحل سے کچھ دور پہنچا تھا کہ اسپین کے ایڈمرل فرنانڈو نے تعاقب کر کے اسے گھیر لیا اور مطالبہ کیا کہ جہاز میں سوار تمام اندلسی مسلمانوں کو اس کے حوالے کر دیا جائے تاکہ انہیں قتل کر کے باقی اندلسی مسلمانوں کو عبرت دلائی جائے۔ رئیس بن احمد نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مسافروں سے بھرے ہوئے جہازوں کے ساتھ، ہسپانوی بحریہ سے مقابلہ ممکن نہیں۔

اس نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا۔ جہازوں میں منادی کر دی گئی کہ تمام مسافر ساحل پر اترنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ سن کر مسافروں میں کہرام مچ گیا۔ ان میں اکثریت عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور مریضوں کی تھی۔ کوئی بھی اس جہنم میں دوبارہ اترنے کے لیے تیار نہ تھا جہاں ملک سے بھاگنے کی کوشش کی سزا آگ کی بھٹیوں پر الٹا لٹکا کر دھیرے دھیرے کباب بنانے کے سوا کچھ نہ تھی۔

رئیس بن احمد نے سسکتے بلکتے مسافروں کو بمشکل چپ کرایا اور سمجھایا کہ وہ ہسپانوی بحریہ سے لڑنے کے لیے اس اقدام پر مجبور ہے۔ فتح کے بعد وہ انہیں دوبارہ جہاز میں سوار کر کے محفوظ مقام تک لے جائے گا۔

اس نے تیزی سے جہازوں کو قریبی ساحل پر لنگر انداز کیا اور تمام مسافروں کو کنارے پر اتار دیا۔ اس کے بعد جہازوں کو لڑنے کی ہیئت میں صف بستہ کر کے ہسپانوی بحریہ کا سامنا کیا۔

ساحل کے قریب ایک ہولناک جنگ شروع ہوئی۔ دوطرفہ گولہ باری کی گھن گرج کے ساتھ، کنارے پر موجود ہزاروں پناہ گزینوں کی آہ و بکا بھی میلوں دور دور تک سنائی دے رہی تھی جو دھاڑیں مار مار کر اللہ سے عثمانی افواج کی کامیابی اور سلیمان عالی شان کی بلند اقبالی کی دعائیں کر رہے تھے۔ ترک سپاہی جو پوری تندہی سے لڑ رہے تھے، اپنی سخت مزاجی کے باوجود یہ آہ و زاری سن کر بار بار آبدیدہ ہو جاتے اور پہلے سے بڑھ کر جوش و خروش کے ساتھ لڑنے لگتے۔ آخر کار اللہ نے ترکوں کو فتح دی۔ ہسپانوی اپنے نو جہاز ترکوں کے قبضے میں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ رئیس بن احمد نے بیڑے کو دوبارہ لنگر انداز کیا اور پناہ گزینوں کو لے کر منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ الجزائر پہنچا تو خیر الدین

پاشا نے اس مہم کا حال سن کر اس کی پوری تفصیل سلیمان عالی شان کو لکھ بھیجی، جہاں اس کامیابی کو بے حد سراہا گیا۔
ابھی شمالی افریقہ میں اسپین کے کچھ اڈے باقی تھے۔ ان میں سے ''مستغانم'' بہت اہم تھا۔ ۱۵۲۸ء (۹۳۴ھ) میں پاشا نے حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ پھر اس نے اس علاقے کے قلعے سر کیے جہاں اس کے بھائی عروج کو شہید کیا گیا تھا۔ اگلے مرحلے میں وہ تلمسان پہنچا اور ۲۰ دن کے محاصرے کے بعد اسے بھی فتح کر لیا۔ ان تمام علاقوں میں سلیمان عالی شان کے نام کا سکہ جاری کر دیا گیا۔
اس زمانے میں یورپ میں کپتان اینڈریا ڈوریا (Andrea Doria) کا طوطی بول رہا تھا۔ اس کی عمر ۷۰ سال تھی اور بحری جنگوں میں وہ لاثانی سمجھا جاتا تھا۔ وہ پاپائے روم سمیت مختلف یورپی حکومتوں کی ملازمت کر چکا تھا اور اب خطیر معاوضے پر شاہ اسپین چارلس پنجم کے لیے مہمات انجام دے رہا تھا۔
۱۵۳۰ء (۹۳۶ھ) میں وہ ۲۰ جنگی جہاز لے کر الجزائر آیا۔ پاشا ۴۲ جہاز لے کر نکلا اور اسے بدترین شکست دی۔ تعاقب کے دوران ۱۵۰۰ ہسپانوی قتل اور ۶۴۰ گرفتار ہوئے۔ اینڈریا ڈوریا کسی نہ کسی طرح بھاگ نکلا۔
اس مہم سے واپس آتے ہی پاشا کو سلیمان عالی شان کا مکتوب ملا جس میں فرانس سے صلح کی اطلاع دے کر تاکید کی گئی تھی کہ فرانسیسی جہازوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی سلیمان عالی شان نے خیر الدین پاشا کو استنبول طلب کیا اور اسے پوری سلطنت عثمانیہ کا امیر البحر مقرر کر دیا۔[1]

باربروسا، الجزائر کا حاکم:

یہ استنبول میں خیر الدین پاشا کی پہلی حاضری تھی۔ اس وقت وہ ۶۳ سال کا ہو چکا تھا مگر جہاد کے لیے جوانوں سے بڑھ کر مستعد تھا۔ سلیمان نے اس کے ساتھ طویل مشورے کیے جن میں نئے بحری بیڑے تیار کرنے اور اسپین پر کاری ضرب لگانے سے لے کر بحیرۂ ابیض میں نئی مہمات تک مختلف امور شامل تھے۔
خیر الدین پاشا قونیہ میں مولانا روم رحمہ اللہ کے مزار پر حاضری دیتا ہوا حلب پہنچا جہاں صدر اعظم ابراہیم پاشا سے بھی ان امور پر مشورے ہوئے۔ ابراہیم پاشا کا خیال تھا کہ ہمیں ایک بحری بیڑا امریکا بھیج کر وہاں سے اسپین کا تسلط ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، مگر خیر الدین پاشا کا کہنا تھا کہ ابھی بحیرۂ ابیض میں ہماری بحری فوج کی زیادہ ضرورت ہے تاکہ اسپین کو افریقہ کے مسلم ممالک پر دست درازی سے روکا جائے، بصورت دیگر اسپین مراکش اور الجزائر سمیت نہ صرف شمالی افریقہ کے تمام ممالک بلکہ مصر پر بھی قابض ہو جائے گا اور وہاں کے مسلمانوں کا وہی حال ہو گا جو اسپین میں ہو چکا ہے۔ سلیمان عالی شان نے پاشا کو دوبارہ استنبول بلا کر الجزائر کی امارت اس کے نام کر دی۔[2]

---

[1] تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۵۴ تا ۲۵۸
[2] تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۸۹، ۲۹۰

بار بروسا اور عثمانی بحریہ:

ان عہدوں کے بعد خیر الدین پاشا کے اختیارات بہت بڑھ گئے، وہ سلیمان عالی شان کے قریبی مشیر اور مقتدر ترین امراء میں شامل ہو گیا۔ اس مردِ حر نے اپنے سارے اختیارات اور وسائل قوم کی خدمت اور ملک کے دفاع میں جھونک دیے۔ وہ جانتا تھا کہ امریکا کے سونے چاندی نے اقتصادی لحاظ سے اسپین کی قوت بہت بڑھا دی ہے اور جہازوں کی تعداد کے لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

تاہم پاشا نے اپنے وسائل کو بخوبی استعمال کیا۔ اس نے سب سے زیادہ توجہ بحری سپاہیوں پر دی، انہیں سخت ترین تربیت کے ذریعے پیراکی، غوطہ خوری، جہاز رانی، خنجر زنی، شمشیر زنی، نشانہ بازی اور گولہ باری سمیت بحری جنگوں کے تمام امور کا ماہر بنا دیا۔ اس نے پرانی توپوں کی جگہ نئی توپیں ڈھلوائیں۔ پرانے جہازوں کو چھوڑ کر نئے جہاز تیار کرائے جو مضبوطی کے باوجود ہلکے ہونے کے سبب تیز رفتار تھے۔

اس طرح سلیمان عالی شان کے دور میں خلافتِ عثمانیہ کی بحریہ اتنی مضبوط ہو گئی کہ ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے بعد بھی طویل عرصے تک عثمانی بحریہ کا معیار یہی رہا اور یورپی طاقتیں اس سے خوف کھاتی رہیں۔[1]

تیونس کی فتح:

سلیمان کی ہدایت پر خیر الدین پاشا نے ایک نیا بحری بیڑا تیار کیا تاکہ ایک طرف ایڈریاٹک دریا کے حملوں کی روک تھام کی جا سکے اور دوسری طرف تیونس کو فتح کیا جا سکے جہاں بنوحفص کا ۲۲واں امیر مولائے حسن، چارلس پنجم کا باج گزار بن کر حکومت کر رہا تھا۔ مولائے حسن ایک کمزور حکمران تھا جس کی فوج صرف چار سو سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس کے باوجود اس کے ظلم و ستم کا یہ حال تھا، اس نے مسندِ اقتدار تک پہنچنے کے لیے اپنے ۴۴ بھائیوں کو قتل کرایا تھا۔

۱۵۳۴ء (۹۴۰ھ) کے موسم گرما میں پاشا بحیرۂ روم میں اتر اور مالٹا اور جنوبی اٹلی پر چھاپہ مار بحری حملے کرتے ہوئے اچانک تیونس کی طرف مڑ گیا۔ اہل تیونس مولائے حسن کے برے کردار کی وجہ سے اس سے نالاں تھے، اس لیے ۱۵۳۵ء (۹۴۱ھ) کے اوائل میں پاشا نے بڑی آسانی سے تیونس پر قبضہ کر کے اسے خلافتِ عثمانیہ کا حصہ بنا دیا۔[2]

اسپین کا تیونس پر حملہ:

چارلس پنجم اس خبر سے تلملا کر رہ گیا۔ اُدھر مولائے حسن جو ترکوں کی آمد پر جنوبی صحرا کی طرف فرار ہو گیا تھا، چارلس کو مراسلہ بھیج کر تیونس پر حملے کی دعوت دے چکا تھا۔ چنانچہ چارلس نے تیونس پر قبضہ کرنے اور مولائے حسن کو دوبارہ تخت پر بٹھانے کا منصوبہ بنایا۔ چارلس اس مہم کے لیے خود نکلا۔ پانچ سو جہازوں اور تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل اس

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۹۰، ۲۹۱

[2] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی، ص ۲۳۲؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۹۱، ۲۹۲

کا بحری بیڑا بڑی شان وشوکت سے برسلونہ کی بندرگاہ سے چلا، ۲۹ مئی ۱۵۳۵ء (۱۴ ذو القعدہ ۹۴۱ھ) کو یہ فوج اچانک تیونس کے ساحل پر اتر پڑی۔ اس نے دو حصوں میں تقسیم ہو کر ساحلی قلعے ''حلق الواد'' اور شہر تیونس پر ایک ساتھ حملہ کیا۔ ''حلق الواد'' کی نگہبانی سنان پاشا کر رہا تھا جسے ہسپانوی لشکر کی خشکی پر ۱۲۰ توپیں دن رات نشانہ بنا رہی تھیں۔ امیر سنان نے تین بار قلعے سے نکل کر دشمن پر دھاوا بولا، اس کی کارروائیوں میں چھ ہزار حملہ آور مارے گئے جن میں بعض نواب اور رئیس بھی شامل تھے۔ حملہ آوروں کو خوراک کی کمی کا سامنا تھا، اگر محاصرہ طویل ہوتا تو انہیں واپس جانا پڑتا مگر مولائے حسن، ان کے لیے آٹھ ہزار اونٹوں اور سولہ سو گھوڑوں پر خوراک ورسد کا ایک بہت بڑا ذخیرہ لادکر لے آیا جس کے بعد ان کی ہمت بڑھ گئی۔

تیونس میں خیر الدین پاشا بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ دشمن کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ مگر مقامی لوگ ڈر چکے تھے۔ تیونس کے چھ ہزار بربر رضا کاروں کو اسپین کی فتح اور مولائے حسن کی دوبارہ تخت نشینی کا یقین ہو گیا تھا لہٰذا انہوں نے حملہ آوروں کی نگاہ میں قابل تعریف بننے کی کوشش کی اور جیل میں قید دس ہزار نصرانیوں کو آزاد کر کے ان کے ساتھ ہی بھاگ نکلے اور نصرانی لشکر میں شامل ہو گئے۔ ادھر حلق الواد کا قلعہ سرنگوں ہو گیا، تاہم سنان پاشا ۹ ہزار ترک سپاہیوں کو بحفاظت نکال کر خیر الدین پاشا کے پاس تیونس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ بات واضح تھی کہ مزید مزاحمت نہیں ہو سکتی، ان دونوں مجاہد رہنماؤں نے حریف کا گھیرا توڑ کر بحفاظت نکل جانے کے لیے جارحانہ حملوں کا فیصلہ کیا مگر چارلس نے جو ہر قیمت پر خیر الدین پاشا کو زندہ گرفتار کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا، بہت سخت ناکہ بندی کر رکھی تھی اس لیے خیر الدین پاشا پہلے حملے میں اڑھائی ہزار جوان گنوا کر واپس آیا۔ دوسرے حملے میں وہ ۲۰۰۰ سپاہی لے کر نکلا مگر اس بار بھی دشمن کا گھیرا نہ ٹوٹ سکا۔

پاشا پسپا ہو کر واپس شہر کی طرف آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شہر میں بغاوت ہو چکی ہے۔ نصرانی قیدی شہر پر مسلط ہو کر اس کے دروازے بند کر چکے ہیں۔ یوں پاشا دونوں طرف سے نرغے میں آگیا تھا۔

خیر الدین پاشا نے پھر بھی ہتھیار نہ ڈالے۔ اس نے زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر حریف پر ایسا برق خیز حملہ کیا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے، ہسپانوی جو کسی سے بھی اس حد تک جرأت کی توقع نہیں رکھتے تھے، دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگے اور پاشا اپنے ساتھیوں سمیت ان کا گھیرا توڑ کر نکل گیا، نصرانیوں نے تعاقب کیا مگر پاشا اپنے جتھے سمیت ایسا غائب ہوا کہ لگتا تھا اسے زمین نگل گئی ہے۔ چارلس، اس مرد مجاہد کے بچ نکلنے پر غصے سے بل کھا کر رہ گیا اور اپنے سالاروں کو برا بھلا کہہ کر اپنی بھڑاس نکالنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

فتح کے بعد نصرانیوں نے تیس ہزار شہریوں کو قتل کیا، دس ہزار کو غلام بنا کر بیچ دیا، متعدد مساجد کو نذر آتش کر دیا، کتب خانے برباد کر دیے، جامع مسجد کے سامنے کتابوں کے اتنے ڈھیر پھینکے گئے کہ انہیں روندے بغیر کوئی مسجد تک نہیں جا سکتا تھا۔ طرح طرح سے شہریوں کے ایمان، آبرو اور عزت کو کچلنے کی کوشش کی گئی۔ چارلس جب تیونس میں داخل ہوا تو

شہر قصاب خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ مغربی مؤرخ ہیمر لکھتا ہے کہ انہی ایام میں سلطان سلیمان، اپنے بدترین دشمن صفویوں کے بہترین اور عظیم ترین شہروں: بغداد اور تبریز میں فاتحانہ داخل ہوا تھا مگر وہاں اس نے کوئی لوٹ مار ہونے دی نہ قتل وغارت۔

مولائے حسن کو باج گزاری کی سخت شرائط کے تحت ایک بار پھر تیونس کا کٹھ پتلی حکمران بنا دیا گیا۔ چارلس اپنے کچھ لشکر کو تیونس میں تعینات کر کے ۱۷ اگست ۱۵۳۵ء (۶ صفر ۹۴۲ھ) کو واپس اسپین روانہ ہو گیا۔

تیونس کے سقوط کے پچھلے دن خیر الدین پاشا، الجزائر پہنچ چکا تھا۔ اس کے اکثر ساتھی شہید ہو گئے تھے تاہم کئی ہزار سپاہی بچا لیے گئے تھے۔ سنان پاشا سمیت کئی عمر رسیدہ عمائد بھی محفوظ تھے۔[1]

جنگِ وینس و اٹلی ۱۵۳۷ء (۹۴۳ھ):

خیر الدین پاشا اس شکست کا فوری بدلہ لینے کے لیے بے تاب تھا مگر سلیمان عالی شان کا منصوبہ اس سے آگے کا تھا۔ جمہوریہ وینس سے گزشتہ ۳۵ سال سے جو صلح چل رہی تھی وہ ٹوٹ چکی تھی کیوں کہ اہل وینس جرمنی اور اسپین سے ساز باز کر کے انہیں ترکی اور فرانس کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔ جنوبی اٹلی جو اسپین کی عمل داری میں داخل تھا، سلیمان کے حملے کے لیے بہترین ہدف بن سکتا تھا۔

لہٰذا سلیمان نے وینس اور جنوبی اٹلی پر ایک بڑا حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے شاہِ فرانس، فرانسس اول کے ساتھ طے کیا کہ وہ مغرب سے اٹلی کی طرف پیش قدمی کرے، جبکہ عثمانی افواج مشرق سے حملہ کریں گی۔

مئی ۱۵۳۷ء (ذوالقعدہ ۹۴۳ھ) میں پہلے خیر الدین پاشا اور چند دن بعد سلیمان عالی شان الگ الگ بحری بیڑے لے کر استنبول سے نکلے۔ سولہ سالہ شہزادہ محمد اور تیرہ سالہ شہزادہ سلیم ثانی بھی اس کے ساتھ تھے۔

سلیمان عالی شان کا بیڑا جو ۲۸۰ جہازوں پر مشتمل تھا، پہلے البانیہ کی بندرگاہ افلونیا پر لنگر انداز ہوا، پھر وہ ۹۲ کلومیٹر طویل آبنائے اوٹرانتو کو عبور کر کے جنوبی اٹلی کے ساحل تک پہنچ گیا۔ ۲۳ اگست ۱۵۳۷ء (۳ ربیع الاول ۹۴۴ھ) کو اوٹرانتو دوبارہ فتح کر لیا گیا جہاں سے ۵۷ سال پہلے (۱۴۸۱ء مطابق ۸۸۶ھ میں) ترکوں کو نکالا گیا تھا۔

اس دوران ستمبر میں خیر الدین پاشا نے جزیرہ کریٹ اور کیکلاڈ پر چھاپے مارے، مجبوراً جمہوریہ وینس نے صلح کی درخواست کی اور فرانس نے بھی اس کی سفارش کی۔

شاہِ فرانس نے اس مہم میں بابِ عالی کا ساتھ دینے سے جی چرایا تھا۔ اگر وہ وعدہ ایفا کرتے ہوئے مغرب سے اٹلی پر حملہ کر دیتا تو دو طرفہ حملے کی زد میں آکر تاجِ روما سرنگوں ہو جاتا مگر شاہِ فرانس نے فقط جرمنی کا ایک قلعہ فتح کرنے پر اکتفا کیا اور شمالی اٹلی میں گھسنے کی جرأت نہیں کی۔ وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ اسے پادریوں کی طرف سے بے دینی کا الزام

---

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۳۳؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۹۲، ۲۹۳

عائد کیے جانے اور عوام کے شدید احتجاج کا خطرہ تھا۔ اسے شاہ فرانس کی بزدلی کہیں یا چالاکی، بہرکیف پورے اٹلی کو زیر کرنے کا وہ منصوبہ جو سلیمان عالی شان نے بنایا تھا، کامیاب نہ ہوسکا اور عثمانی افواج واپس ہوگئیں۔ فرانس کی سردمہری کے باوجود سلیمان عالی شان نے سفارتی تعلقات بگڑنے نہ دیے۔ غالباً وہ یورپ میں ایک ایسے اتحادی کو نہیں کھونا چاہتا تھا جو الگ ہوکر اس کا سخت مدمقابل بن سکتا تھا۔

خلافتی افواج کی واپسی کے باوجود خیرالدین پاشا کی مہمات جاری رہیں، جن کے باعث بحیرۂ روم میں یورپی جہاز رانوں کا جینا دوبھر ہوگیا۔ اسی دوران معرکہ پریویزا پیش آیا جس کا ذکر ہم ذرا آگے کریں گے۔①

جنگِ بغدان (مولڈافیا)، ۱۵۳۸ء (۹۴۵ھ):

سلیمان عالی شان استنبول واپس جا کر ایک بڑا لشکر تیار کرنے لگا۔ جولائی ۱۵۳۸ء (صفر ۹۴۵ھ) میں اس نے رومانیہ کی ریاست بغدان (مولڈافیا) کا رُخ کیا کیوں کہ سلطنتِ عثمانیہ کی باج گزاری قبول کرنے کے باوجود یہاں کا حاکم جرمنی سے ساز باز کر رہا تھا۔ سلیمان دریائے سیریت عبور کرکے رومانیہ پہنچا۔ بغدان کا حاکم بھاگ نکلا اور مقامی عمائدنے بابِ عالی سے وفاداری قائم رکھنے کا عہد کیا۔

۱۵ اکتوبر ۱۵۳۸ء (۹ جمادی الاولیٰ ۹۴۵ھ) کو سلیمان استنبول واپس جا رہا تھا کہ خیرالدین پاشا کے بیٹے حسن بیگ نے آکر اسے معرکہ پریویزا کی تفصیل سے آگاہ کیا۔②

معرکۂ پریویزا:

۱۵۳۷ء (۹۴۳ھ) میں سلیمان عالی شان کی اٹلی کے ساحلوں سے واپسی کے بعد پوپ پال سوم نے پورے یورپ کو عثمانیوں کے خلاف اتحاد کی دعوت دی ڈالی تھی۔ چنانچہ صلیبیوں کا ایک عظیم مشترکہ بحری بیڑہ تیار ہوا جس میں ۳۰۸ جنگی اور ۲۹۲ باربرداری کے جہاز تھے۔ بحری سپاہیوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ اس لشکر کی قیادت اس صدی کے مشہور ترین یورپی بحری کمانڈر اینڈریا ڈوریا کے ہاتھ میں تھی۔ خیرالدین پاشا نے روڈس اور کریٹ کے درمیان واقع "کریٹ" کے جزیرے فتح کرلیے تھے۔ اسی دوران اطلاع ملی کہ یورپی ممالک کا مشترکہ بحری لشکر اسے گھیرنے کے لیے آرہا ہے۔

خیرالدین پاشا نے اپنے امراء سے مشورہ کیا۔ انہوں نے رائے دی کہ پریویزا کے ساحل تک پیچھے ہٹتے چلے جانا مناسب ہوگا۔ وہاں ٹھہر کر دشمن کا انتظار کرنا چاہیے تاکہ جب دشمن وہاں پہنچے تو قلعے پر نصب توپوں سے بھی اس پر حملہ کیا جاسکے اور بری فوج بھی ہماری مدد کرسکے۔

خیرالدین نے کہا: "بحری جنگ ہمیشہ کھلے سمندر ہی میں موزوں ہوتی ہے نہ کہ ساحل پر۔ اگر ہم ساحل کے قریب ہوں گے تو ہمارے لیے جہازوں کو آزادی سے چکر دینا اور اپنی مرضی کے مطابق کہیں لے جانا ممکن نہیں ہوگا۔"

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۲۷۶/۱، ۲۷۷

② تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۳۴ تا ۲۳۶؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۲۷۸/۱

خیر الدین پاشا ۱۲۲ بحری جہازوں اور ۲۲ ہزار سپاہیوں کے ساتھ، اس عظیم قوت کے مقابلے پر نکلا اور ساحل سے نو کلومیٹر آگے پہنچ گیا۔ جب دشمن کے بحری جہاز دکھائی دیے تو پاشا اپنے جہازوں کے بادبان کھول کر انہیں دوسری طرف لے گیا، حریف کو تعاقب میں تھکانے کے بعد اس نے یونان کے مغربی ساحل پر خلیج "امورا کیکوس" کے قریب "پریویزا" کی حدود میں رُک کر حریف کا انتظار کیا۔

۲۵ ستمبر ۱۵۳۸ء (۱۸ ربیع الآخر ۹۴۵ھ) کی صبح دونوں بحری بیڑے اتنے قریب آگئے کہ دوربین کے بغیر ایک دوسرے کو دکھائی دے رہے تھے۔ آخر دو طرفہ توپیں گرجنے لگیں اور دونوں بحری فوجوں میں گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ پاشا اپنے ہلکے پھلکے جہازوں کو تیزی سے چکر دے کر دشمن کی گولہ باری سے بچتا رہا۔ یورپیوں کے جہاز بڑے بھاری بھرکم تھے، جوابی گولہ باری سے بچنے کے لیے وہ اتنی تیز حرکت سے قاصر رہے۔ پاشا نے اپنے بیڑے کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس کی جنگی چالیں اتنی عجیب تھیں کہ یورپی کپتان ششدر رہ گئے تھے۔ صرف پانچ گھنٹے کی لڑائی کے بعد یورپ کی مشترکہ بحری طاقت سمندر میں غرق ہوگئی، اور بچی کھچی فوج نہایت ذلت وخواری کے عالم میں بھاگ نکلی۔

اس فتح کی خوش خبری کا مراسلہ جب سلیمان عالی شان کو پہنچا تو اس نے مسرت اور تشکر کے طور پر اسے کھڑے ہو کر سنا۔ جمہوریہ وینس اور اٹلی اس شکست کے بعد ڈلماشیا (کروشیا) کے ساحل سمیت ان تمام جزیروں سے جو خیر الدین پاشا نے فتح کیے تھے، دست بردار ہوگئے اور تین لاکھ ڈوکٹ بطور تاوان جنگ باب عالی کو پیش کیے۔[1]

الجزائر میں ہسپانوی لشکر کی عبرت ناک شکست:

خیر الدین پاشا نے اپنے بیٹے حسن بیگ کو الجزائر واپس بھیج دیا اور وہ وہاں سے اسپین کے ساحلوں پر حملے کرتا رہا۔ وہ اندلس کے مسلمانوں کو افریقہ منتقل کرنے کا کام بھی کرتا رہا اور وہاں کے مجاہدین کو اسلحہ بھی پہنچاتا رہا۔ اس دوران اس نے دوبار جبل الطارق کے قلعے پر قبضہ بھی کیا۔

اسپین کا بادشاہ چارلس پنجم ان حملوں سے تنگ آگیا تھا۔ اس نے ایک چال چلی اور خیر الدین پاشا کو الجزائر کا بادشاہ بنادینے کی پیش کش کی بشرطیکہ وہ خلافت عثمانیہ سے قطع تعلق کرلے۔ چارلس نے اپنے پیغام میں پاشا کو یقین دلانے کوشش کی کہ اس سے معمولی خراج لیا جائے گا اور اسپین کی حمایت وسرپرستی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوگی۔

خیر الدین پاشا نے اس گھناؤنی پیش کش کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور اس طرح دشمن پر یہ واضح کر دیا کہ اللہ کے راستے میں اپنی جانوں کو بے قیمت کرنے والے اتنے بیش بہا ہو جاتے ہیں کہ دنیا میں کوئی ان کا مول نہیں لگا سکتا۔

چارلس پنجم کو اپنی پیش کش کی ناکامی پر اتنا غصہ آیا کہ وہ ۱۵۴۱ء (۹۴۸ھ) میں انڈریا ڈوریا کو ساتھ لے کر الجزائر پر حملے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اسپین، سسلی، مالٹا اور جرمنی کے حکام، نامور نائٹ اور نواب اس کے ہمراہ تھے۔ بحری بیڑہ ۵۱۶ جہازوں اور ۳۶ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ الجزائر کا بحری بیڑہ کسی اور محاذ پر گیا ہوا تھا۔ خیر الدین پاشا بھی موجود نہ

---

(1) تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از یلماز اوزتونا: ۱/ ۲۹۴ تا ۲۹۶

تھا۔ الجزائر کے نائب حاکم حسن بیگ کے پاس صرف ۶۰۰ ترکی سپاہی تھے، ان کے علاوہ وہ بمشکل دو ہزار رضا کار مزید جمع کر سکا۔ خطرہ تھا کہ اس بار اسپین کو الجزائر پر قابض ہونے سے روکنے والا کوئی نہیں۔

مگر حسن بیگ نے انہی مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ دشمن کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہسپانوی لشکر الجزائر کے ساحل پر اتر کر خیمے گاڑ چکا تھا۔ اس کے ہراول دستے ایک قلعے کا محاصرہ کرنے آگے آ چکے تھے۔ حسن بیگ نے انہیں اچانک حملے کا نشانہ بنایا جس میں سسلی کا حاکم، مالٹا کے ۱۴۰ نائٹ اور ۴۰۰ عام سپاہی مارے گئے۔ باقی لوگوں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ قلعے کا محاصرہ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

اسی رات حسن بیگ نے حریف کے مرکزی کیمپ پر ایک اور تندو تیز حملہ کیا جس میں تین ہزار نصرانی مارے گئے۔ چارلس کو مزید آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے حکم دیا کہ پوری فوج بحری جہازوں میں سوار ہو کر واپس ہو جائے۔ ابھی فوج جہازوں میں سوار ہونے کی تیاری کر رہی تھی کہ آندھی کے آثار محسوس ہونے لگے۔

حسن بیگ جو افریقہ کے طوفانوں کا عادی تھا، دور سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ نصرت الٰہیہ اس کے ساتھ تھی، مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ نصیب ہونے والی کامیابیوں نے اس کے عزائم بہت بلند کر دیے تھے لہٰذا وہ ہسپانوی بادشاہ کو ایسا سبق سکھانا چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ الجزائر کا رخ کرنے کی ہمت نہ کرے۔ اس نے آندھی سے برپا ہونے والے ہنگامے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر بے خبر نصرانیوں پر حملہ کر دیا اور ان کے بیسیوں جہازوں کو نشانہ بنا کر غرق کر دیا۔ دشمن کے گولہ بارود کے ذخائر جو جہازوں پر تھے، پانی میں ڈوب کر ناکارہ ہو گئے۔ بیس ہزار ہسپانوی، جرمن اور اطالوی مارے گئے، ترکوں نے ہزاروں گھوڑے بھی کاٹ ڈالے تاکہ دشمن کے سپاہی خشکی پر فرار نہ ہو سکے۔ یورپ کے کئی نامور شہزادے، نائٹ اور نواب قیدی بن گئے۔ ۱۳۰ جہاز مسلمانوں کو صحیح وسالم ہاتھ لگے۔ ڈوبنے والے ایک جہاز میں مسلمان قیدی بھی تھے، ان میں سے ۱۸۰۰ کو سمندر سے زندہ نکال لیا گیا۔

چارلس دس پندرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا مگر راستے میں اس شکست اور نقصان پر دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ غم و غصے کی شدت میں اس نے اپنا شاہی تاج سر سے اتار کر سمندر میں پھینک دیا۔

سلیمان عالی شان نے استنبول میں اس فتح کی خبر بڑی خوشی سے سنی۔ خیر الدین پاشا اس کے ایک ماہ بعد الجزائر پہنچ گیا اور اپنے بہادر بیٹے کو اس شاندار کارنامے پر شاباش دی۔[1]

جان زاپولی کی موت، آسٹریا سے دوبارہ لڑائی۔ جنگِ بوڈاپسٹ:

۱۵۴۰ء (۹۴۶ھ) میں ہنگری میں ایک بڑی تبدیلی آئی، وہاں کے نائب جان زاپولی نے بابِ عالی سے غداری کا منصوبہ بنایا اور اپنے حریف شاہِ آسٹریا فرڈی ننڈ سے ساز باز کی کہ دونوں متحد ہو کر سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف ڈٹ جائیں اور ہنگری کو آزاد کرا کے باہم تقسیم کر لیں۔

---

[1] تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۱/۲۹۸ تا ۳۰۰

ابھی یہ سازش عمل میں نہیں آئی تھی کہ جان زاپولی مرگیا۔ فرڈی ننڈ نے یہ اطلاع ملتے ہی ہنگری میں فوجیں داخل کردیں جو دریائے ڈینوب کے کئی ساحلی قلعوں پر قابض ہوگئیں۔ ساتھ ہی انہوں نے بوڈاپسٹ کا محاصرہ کرلیا۔

سلیمان عالی شان نے یہ خبر سنتے ہی ہنگری پر فوج کشی کی اور ۲۹ اگست ۱۵۴۱ء (۲۴ ربیع الآخر ۹۴۸ھ) کو بوڈاپسٹ پہنچ گیا۔ آسٹریا کی فوجیں محاصرہ چھوڑ کر فرار ہوگئیں۔ ینی چری دستے شہر میں داخل ہوگئے اور تمام انتظامات سنبھال لیے۔

اسی دوران شاہ آسٹریا نے سلیمان عالی شان کی خدمت میں تحائف بھیج کر صلح کی درخواست کی۔ ان تحائف میں ایک عجیب وغریب گھڑی بھی تھی جو دنوں، مہینوں اور ستاروں کی گردش کا تعین بھی کرتی تھی۔ سلیمان نے صلح کے لیے شرط لگائی کہ شاہ آسٹریا ہنگری کے تمام مقبوضہ قلعے خالی کردے۔ شاہ آسٹریا آمادہ نہ ہوا اور یوں مذاکرات ناکام ہوگئے۔

ان دنوں فرانس اور اسپین میں دوبارہ کشیدگی بڑھ گئی تھی۔ شاہ اسپین چارلس پنجم کے ایک نواب نے فرانس کے اس سفیر کو قتل کردیا تھا جو دوستی کا پیغام لے کر استنبول جارہا تھا۔

شاہ فرانس نے اس کی جگہ دوسرا سفیر بھیجا جس نے خلیفہ کو اسپین کے خلاف دوبارہ باہم متحد ہونے کی پیش کش کی۔ سلیمان عالی شان، فرانسس اول کی کم ہمتی سے واقف تھا۔ اس سے پہلے بھی ایسا اتحاد ہوا تھا جس میں شاہ فرانس نے کوئی کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔ تاہم اسی دوران اطلاع آئی کہ چارلس پنجم نے الجزائر پر حملہ کیا ہے جسے وہاں کی بحریہ نے ناکام بنادیا ہے۔ چارلس کی اس حرکت کے پیشِ نظر سلیمان عالی شان نے ایک بار پھر فرانس کو اتحادی بنانا قبول کرلیا۔①

فتح اسٹرگون:

۱۵۴۳ء کے موسم بہار (اوائل ۹۵۰ھ) میں سلیمان تازہ دم فوجیں لے کر پھر ہنگری میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ۳۷۱ بجرے (چھوٹے بحری جہاز) بحیرۂ اسود سے دریائے ڈینوب کے ڈیلٹا میں داخل ہوئے جن پر سامان رسد لدا ہوا تھا۔ دریائے ڈینوب کے متوازی یہ سفر بوڈاپسٹ سے ۳۰ کلومیٹر شمال میں واقع شہر "اسٹرگون" پر ختم ہوا۔

یہ ہنگری کے نصرانیوں کا مذہبی مرکز تھا۔ کیتھولک چرچ کا بشپ یہیں رہتا تھا۔ ۳۱۵ توپوں کے ساتھ اس قلعے پر حملہ ہوا اور بارہ دن میں اسے فتح کرلیا گیا۔ بلغراد سے کچھ دور "استولنی" نامی شہر بھی اہم تھا جہاں ہنگری کے بادشاہ دفن کیے جاتے تھے مگر اب اس پر جرمنی قبضہ کیے ہوئے تھا۔ ترکوں نے پندرہ دن کی جنگ کے بعد اسے بھی فتح کرلیا۔ یہاں پر شاہانِ ہنگری سونے کی صلیبوں اور جواہر سے مرصع تاجوں سمیت دفن تھے مگر ترکوں نے اس بیش بہا خزانے کو بھی ہاتھ نہ لگایا۔

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۳۵، ۲۳۶

اسٹرگون اور استولنی جرمنی کی سرحد پر واقع تھے اس لیے ایک مدت تک یہ عثمانیوں کا اہم معسکر رہے۔ یہاں سے جرمنی پر حملے بھی ہوئے جن کے بعد ۱۵۴۵ء میں جرمنی نے صلح کر لی۔ [1]

امیر البحر خیر الدین پاشا بڑھاپے کے باوجود توانا، پرجوش اور اپنے فرائض نبھانے میں مستعد تھا۔ اس نے فرانسیسی بحریہ کے ساتھ مل کر اپنے مشترکہ یورپی حریفوں کے خلاف سمندری معرکوں کا آغاز کر دیا۔ نیپلز اور روما کے درمیان واقع قلعہ "ریجیا" میں ہسپانوی کمانڈر ڈان ڈیاگو نے مزاحمت کی مگر یہ قلعہ صرف تین سپاہیوں کے نقصان کے ساتھ سر کر لیا گیا۔ خیر الدین پاشا نے ڈیاگو کی بیٹی سے نکاح کر کے اسے استنبول بھیج دیا۔ اس کے بعد اس نے 'اوستیا' کا شہر فتح کیا جو روم سے پندرہ کلومیٹر دور دریائے ٹیبر کے ڈیلٹا پر واقع ہے۔

خیر الدین پاشا اس کے بعد براہِ راست روم پر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر اس کے حلیف فرانسیسی کمانڈر نے اس کے قدموں میں گر کر درخواست کی کہ روم کا رُخ نہ کیا جائے ورنہ فرانس پوری دنیائے نصرانیت میں بدنام ہو جائے گا۔

پاشا نے فرانس کے ساحلی شہر "نیس" کو اسپین کے قبضے سے چھڑا کر اس کی چابیاں فرانسیسی حکام کے حوالے کر دیں۔ اس مہم میں اس کے سو ساتھی کام آئے۔ فرانسیسی حکام میں خیر الدین پاشا کو ایک مافوق الفطرت شخصیت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ شاہِ فرانس کی طرف سے اسے ان مہمات کے لیے خطیر رقم فراہم کی جاتی رہی۔

فرانس کے ساتھ مشترکہ مہمات ایک سال تک جاری رہیں۔ آخر شاہِ اسپین تنگ آ کر فرانس سے صلح پر مجبور ہو گیا، مارچ ۱۵۴۴ء (ذوالحجہ ۹۵۰ھ) میں دونوں ملکوں میں صلح کا معاہدہ طے پا گیا جس میں اسپین کے دیگر ماتحت ممالک بھی شامل تھے۔ اس کا افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ فرانس نے سلطنتِ عثمانیہ کو اعتماد لیے بغیر صلح کر لی تھی۔ اس بدعہدی نے فرانس اور سلطنتِ عثمانیہ کا باہمی رابطہ ختم کر دیا۔ [2]

خیر الدین پاشا کی وفات:

جنگ ختم ہونے پر ۱۵۴۴ء (۹۵۱ھ) میں خیر الدین پاشا استنبول واپس آ گیا۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ سمندری سفر نہیں کیا۔ آخری ایام میں اس نے اپنی دولت کو سلطنتِ عثمانیہ، اس کے خدمت گاروں اور اپنے جانباز ساتھیوں سے تعاون کے لیے بے دریغ خرچ کیا۔ اپنے ذاتی تیس جہاز سلطنتِ عثمانیہ کے لیے وقف کر دیے۔ اپنے غلاموں میں سے آٹھ سو سلیمان عالی شان کو اور دو سو صدرِ اعظم رستم پاشا کو پیش کر دیے۔ اپنے بھائی اسحٰق مرحوم کے بیٹے مصطفیٰ بیگ کو دس ہزار طلائی لیرے کا ہدیہ دیا۔ بشکتاش میں ایک جامع مسجد، قبرستان اور دیگر رفاہی کاموں کے لیے تیس ہزار طلائی لیرے مختص کیے۔ اپنے سینکڑوں جانثار مجاہدوں کو نقد رقمیں، جائیدادیں اور دیگر ساز و سامان اس کثرت سے دیا کہ وہ باقی زندگی آرام سے گزار سکتے تھے۔ رستم پاشا اس کا دو لاکھ دس ہزار لیرے کا مقروض تھا۔ خیر الدین پاشا نے اپنے بیٹے

---

[1] تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۲۸۳،۲۸۲/۱

[2] تاریخ الدولة العلیة العثمانیة از فرید بک محامی: ص ۲۳۷، ۲۳۸

حسن کو وصیت کی کہ وہ رستم سے کبھی قرض کی واپسی کا مطالبہ نہ کرے۔ اگر وہ دے بھی تو قبول نہ کرے۔

ان وصیتوں کے بعد ۴ جولائی ۱۵۴۶ء (۲۲ ربیع الآخر ۹۵۳ھ) کو عالم اسلام کا یہ بے مثل بحری سپاہی جس نے سمندروں کا سینہ، یورپی استعمار کے لیے تنگ کر دیا تھا، دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی عمر ۷۰ سال تھی۔

آنکھوں کے طاقچوں میں جلا کے چراغ درد

خون جگر کو پھر سے سپرد قلم کریں

زخموں سے پور پور جسم بنائیں نشان راہ

جو ہاتھ کٹ چکے ہیں، انہی کو علم کریں (۱)

استنبول کے ساحل بشکتاش پر اس کی قبر آج بھی استعمار کو للکار رہی ہے۔ آج بھی وہاں ترک بحریہ کی تقاریب منعقد ہوتی ہیں جن میں اس سمندری شیر کو بے پناہ خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ (۲)

آسٹریا سے جنگ بندی

اس دوران ہنگری کے میدانوں میں شاہ آسٹریا اور سلیمان عالی شان کے درمیان جنگ جاری تھی۔ کئی بار مذاکرات بھی ہوئے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ فرانس اول ایک بار پھر سلطنت عثمانیہ کے ساتھ صلح کرنا چاہتا تھا مگر ۱۵۴۷ء میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کے کچھ دنوں بعد آسٹریا اور سلطنت عثمانیہ میں پانچ سالہ جنگ بندی کا معاہدہ طے پا گیا۔ (۳)

عالمگیر خلافت اور عالمی مہمات

سلیمان عالی شان ایک عظیم المرتبت خلیفہ اور عالمگیر حکمران تھا۔ اس کے سیاسی اثر ورسوخ کے باعث دنیا بھر کے مسلم حکمران اس پر بھروسہ کرتے تھے اور مصیبت کے وقت اس سے امداد طلب کرتے تھے۔ سلیمان عالی شان نے ہمیشہ ایسے مسائل پر پوری سنجیدگی سے توجہ دی۔ اوپر خیر الدین باربروسا کی جس قدر مہمات کا ذکر آیا ہے، وہ سب عالمگیر خلافت کی عالمی مہمات ہی کا ایک حصہ تھیں۔ مزید کچھ مہمات کا ذکر درج ذیل ہے۔

پرتگالیوں کے خلاف گجرات کی مہم:

اس زمانے میں گجرات (ہندوستان) کا حکمران بہادر شاہ پرتگالی جہاز رانوں سے بہت پریشان تھا جو ہندوستان کے ساحلوں پر لوٹ مار کرتے آرہے تھے۔ اس نے استنبول سفارت بھیج کر سلیمان عالی شان سے پرتگالیوں کے خلاف مدد مانگی۔ پرتگالیوں کا بحر ہند، بحیرۂ عرب اور خلیج فارس پر قبضے کا خطرہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پرتگال بحر ہند

---

(۱) احمد فراز

(۲) تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۳۰۲، ۳۰۳

(۳) تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۳۹

پر اجارہ داری کے ذریعے جو دولت حاصل کر رہا تھا وہ اسپین کو امریکا کی سونے اور چاندی کی کانوں سے نصیب ہونے والی ثروت سے کم نہیں تھی۔ پرتگال نے ہندوستانی اور ترک جہاز رانوں کو بحر ہند میں سفر کرنے سے روک دیا تھا اس طرح وہ جنوبی ایشیا کی تجارت پر قابض ہو کر بے پناہ نفع حاصل کر رہا تھا کیوں کہ یہاں کی مصنوعات اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے یورپ میں بیس گنا قیمت تک فروخت ہو رہی تھیں۔ اس دولت وثروت کا خطیر حصہ مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاریوں میں صرف کیا جا رہا تھا۔

ان خطرات کے سدباب کے لیے ۱۵۳۰ء (۹۳۶ھ) میں عثمانی بحریہ گجرات کے ساحل پر پہنچی جہاں جزیرۂ دیو کو مرکز بنا کر پرتگالیوں سے جنگ کی تیاری کی گئی۔ یہ جزیرہ بمبئی سے ۲۵۰ کلومیٹر دور ہے۔ ۶ جنوری ۱۵۳۱ء (۵ جمادی الاولیٰ ۹۳۷ھ) کو پرتگالی کمانڈر ''ڈی چونا'' اپنے مرکز ''گوا'' سے ۳۰۰ جہاز لے کر، ترکوں کے مقابلے پر نکلا۔ اس فوج میں ۳۶۰۰ پرتگالی جبکہ باقی ہندو اور مقامی لوگ تھے۔ پرتگالیوں نے جزیرۂ دیو کو گھیر کر ۳۰ توپوں سے شدید گولہ باری شروع کر دی۔ تاہم جب ترکوں کی توپیں گرجنا شروع ہوئیں تو پرتگالی بحریہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔

اس کے فوراً بعد ترکوں کا بحری بیڑہ حرکت میں آیا اور اس نے پیچھے ہٹتی ہوئی پرتگالی بحریہ کو کھلے سمندر میں جالیا۔ اس معرکے میں دشمن کے ۴۰ جہاز غرق ہوئے، ۲۰ جہاز مسلمانوں کے ہاتھ لگے، ۱۵۰۰ پرتگالی اور ان کے ملازم ہزاروں ہندو مارے گئے۔[1]

دربارِ گجرات میں سازشیں اور ترکوں کی واپسی:

اس فتح کے بعد دربار گجرات میں عثمانی امراء کا اثر ورسوخ اتنا بڑھا کہ بہادر شاہ نے ترک امیر مصطفیٰ بیک کو سورت کا حاکم بنا دیا۔ گجرات کی بحری طاقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ عثمانی امراء نے ایک سو نئے جہاز تیار کر کے گجرات کی بحریہ کو مضبوط کر دیا۔

اگر حالات سازگار رہتے تو گجرات کے ساحل کو مرکز بنا کر عثمانی بحریہ، پرتگالیوں کو بحر ہند سے پوری طرح بے دخل کر سکتی تھی مگر خود عثمانی امراء میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ گجرات میں عثمانی بحریہ کا امیر ملک دوغان، اپنی فتوحات کے سبب بڑا نیک نام تھا۔ یہ اُس ایاز بیک کا بیٹا تھا جو سلطان سلیم اول کے دور میں گجرات کے دفاع کے لیے سب سے پہلے پہنچا تھا۔ ملک دوغان کی بڑھتی ہوئی قدر ومنزلت سے بعض ترک امراء کو اتنا حسد ہوا کہ انہوں نے بہادر شاہ کو اس کے خلاف بھڑکا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہادر شاہ نے ملک دوغان کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد گجرات میں عثمانی امراء کے لیے حالات ایسے ناموزوں ہوئے کہ پرتگالیوں سے کسی اور جنگ کی تیاری نہ کی جا سکی۔

مزید یہ کہ کچھ سالوں بعد بہادر شاہ کو مغل حکمران ہمایوں کے حملے کا خطرہ پیدا ہوا تو اس نے گجراتی بحریہ کے تمام

---

[1] تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۱/ ۳۲۶

جہازوں کو اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ کہیں یہ ہمایوں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ اس اقدام سے پرتگالیوں کی خوب بن آئی اور وہ ہندوستان کے ساحلوں پر آزادانہ گھومنے لگے۔ اکتوبر ۱۵۳۵ء (ربیع الآخر ۹۴۲ھ) میں انہوں نے ایک بار پھر جزیرہ دیو پر حملہ کیا، عثمانی امراء نے طویل مزاحمت کی مگر بحری جہاز ختم ہو چکے تھے اس لیے آخر انہیں شکست ہوئی اور اس معسکر پر پرتگالی قابض ہو گئے۔[1]

بحر ہند کی مہمات:

سلیمان عالی شان بحر ہند کی صورتحال سے غافل نہ تھا۔ اس نے ۱۵۳۸ء (۹۴۵ھ) میں مصر کے امیر سلیمان پاشا کی قیادت میں بیس ہزار سپاہی بھیج کر ایک بڑی مہم شروع کی جس میں پہلے عدن سمیت یمن کے کئی ساحلی شہروں پر قبضہ کیا گیا تاکہ بحیرۂ احمر کا دہانہ محفوظ ہو جائے۔ پھر مسقط اور آبنائے ہرمز پر قابض ہو کر بحیرۂ عرب اور خلیج فارس کو محفوظ بنایا گیا۔ اس کے بعد یہ بیڑا بحر ہند میں داخل ہوا اور گجرات پہنچا۔ سلیمان پاشا نے گوکالا بندر اور کیٹ پر قبضہ کرنے کے بعد "دیو" کا رخ کیا، پرتگالی بحریہ ایک ہزار لاشیں چھوڑ کر "دیو" میں محصور ہو گئی۔

ابھی یہ جنگ جاری تھی کہ سلیمان پاشا کے سامنے بعض سیاسی مسائل آ کھڑے ہوئے۔ گجرات میں اس وقت محمود شاہ کی حکومت تھی۔ بدخواہوں نے اسے یہ یقین دلا دیا کہ ترکوں کی نیت اچھی نہیں ہے اور وہ پرتگالیوں کو ختم کرنے کے بعد گجرات پر قبضہ کر لیں گے۔ اس خدشے کی بناء پر محمود شاہ کا جھکاؤ پرتگالیوں کی طرف ہو گیا جسے سلیمان پاشا جیسے ذہین شخص نے فوراً محسوس کر لیا مگر اس نے محمود شاہ کو غداری کی سزا دینے کی جگہ یہی بہتر سمجھا کہ واپسی کی راہ لی جائے کیونکہ خلیفہ نے اسے مسلمانانِ ہند کی امداد کے لیے پرتگالیوں سے لڑنے بھیجا تھا نہ کہ مسلمانوں کے خون میں ہاتھ رنگنے۔ چنانچہ سلیمان پاشا کا یہ بحری بیڑا فیصلہ کن جنگ سے پہلے ہی واپس ہو گیا۔ اگر اس وقت ترکوں کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائی جاتی تو ہندوستان کی تاریخ بہت مختلف ہوتی اور کسی مغربی طاقت کو یہاں قدم جمانے کا موقع نہ مل سکتا۔

واپسی میں سلیمان پاشا نے فوج کی توپیں اور بندوقیں، اریٹیریا اور صومالیہ کے ان مسلمانوں کے حوالے کر دیں جو پرتگال کے حملوں سے اپنے دفاع کے لیے اسلحے کے سخت محتاج تھے۔[2]

افریقی مسلمانوں کی امداد:

اریٹریا اور صومالیہ کچھ عرصے سے خلافتِ عثمانیہ کے تحت تھے۔ مشہور عثمانی امیر اُزدمیر بیگ نے مصر سے فوج کشی کر کے نہ صرف ان دونوں ملکوں بلکہ حبشہ کے بھی کچھ حصے کو خلافت کی عمل داری میں شامل کر لیا تھا۔

تاہم پرتگالی اس مفتوحہ علاقے کو چھیننے کے لیے اب بھی بے تاب تھے۔ اسی لیے ۱۵۴۱ء (۹۴۸ھ) میں پرتگال نے حبشہ کے نصرانی بادشاہ گلاوڈیاس کو بندوقیں اور توپیں فراہم کر دیں جس کے بعد گلاوڈیاس، صومالیہ کے حکمران

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱/ ۳۲۵، ۳۲۶

[2] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱/ ۳۲۸، ۳۲۹

احمد غران کو شکست دے کر صومالیہ کے خاصے رقبے پر قابض ہو گیا۔

یمن کے عثمانی امیر محمد پاشا کو یہ خبر ملی تو اس نے ، دس توپیں اور نو سو بندوق بردار ترک سپاہی ، صومالیہ بھیج دیے جن سے احمد غران کی طاقت بڑھ گئی ، اس نے حبشہ اور پرتگال کی مشترکہ فوج کو شکستِ فاش دے کر اپنا علاقہ واپس لے لیا۔ اس جنگ میں پرتگالی سپہ سالار جنرل کرسٹوفر ڈی گرفتار ہو گیا ، اس کا سر قلم کر کے احمد پاشا کو بھیج دیا گیا۔ ①

باب المندب کا تحفظ:

بحیرۂ احمر کو پرتگالیوں سے بچانے کے لیے باب المندب پر قبضہ برقرار رکھنا بہت ضروری تھا جو بحرِ ہند کو بحیرۂ احمر سے ملاتا ہے۔ پرتگالی جنرل ڈان مراکو نے عدن پر قبضہ کر کے ، باب المندب تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر عدن کے والی عبد الرحمن بیگ کے جوابی حملے میں وہ زندہ گرفتار ہو گیا اور اسے استنبول بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کی طرف سے مستقل طور پر ۲۵ جہاز عدن سے عمان کے درمیان گشت کرنے لگے ، جس سے پرتگالیوں کو باب المندب کے قریب پھٹکنے کی جرأت نہ رہی۔

اُدھر ازدمیر بیگ نے بحیرۂ احمر کو پوری طرح گرفت میں لینے کے لیے حبشہ اور سوڈان پر یلغار کر کے ان کے وسیع علاقے پر قبضہ کر لیا اور مقامی لوگوں پر شریعت کے مطابق سالانہ جزیہ مقرر کر دیا۔ یاد رہے کہ سوڈان میں اس وقت بکثرت بت پرست قبائل آباد تھے جبکہ حبشہ آرتھوڈکس فرقہ یعقوبیہ کے نصرانیوں کا ملک تھا۔ ②

دہلی کے مغل بادشاہوں سے تعلقات:

سلیمان عالی شان کے دور میں ہندوستان میں ایک انقلاب آیا۔ تیموری خاندان کا شہزادہ بابر دہلی پر قابض ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم سلطنت قائم کر ڈالی۔ تیموری اور عثمانی ترک ، ایک نسل ہونے کے باوجود قدیم حریف تھے۔ عثمانیوں کو انقرہ کی وہ جنگ کبھی نہیں بھول سکتی تھی جس میں تیمور لنگ نے ان کے مورث بایزید یلدرم کو شکست دے کر بُری طرح بے عزت کیا تھا۔

اس کے باوجود سلیمان عالی شان نے کبھی ہندوستان کی نوخیز مغلیہ حکومت کو دشمن نہیں سمجھا اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ایک مسلم حکومت کو انتقام کا نشانہ بنانے سے پوری طرح احتراز کیا۔

بابر کی موت کے بعد اس کے بیٹے ہمایوں اور بنگال کے صوبے دار شیر شاہ سوری میں جنگیں شروع ہوئیں تو ۱۵۳۷ء میں شیر شاہ سوری نے سفیر بھیج کر سلیمان عالی شان سے ہمایوں کے خلاف مدد طلب کی۔ مگر سلیمان عالی شان نے شیر شاہ اور ہمایوں کی اس لڑائی میں کوئی دخل نہ دیا جو ہمایوں کی شکست اور سوری کے اقتدار پر منتج ہوئی۔ ③

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۳۳۰ تا ۳۳۲

② تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۳۳۱، ۳۳۲

③ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۳۹

اس کا خوش گوار نتیجہ یہ نکلا کہ شیر شاہ کی وفات کے بعد جب ہمایوں کو دوبارہ حکومت ملی تو اس نے خلافتِ عثمانیہ سے اچھے مراسم رکھنا پسند کیا۔ ایک بار بحرِ ہند کا ترک امیر علی رئیس سمندری طوفان کی زد میں آ کر نہایت ابتر حالت میں ہندوستان پہنچا تو ہمایوں نے دہلی میں اس کا شاندار استقبال کیا۔ علی رئیس اور اس کے افسران ہمایوں کی وفات تک دہلی میں رہے۔ اکبر کی تخت نشینی کے کچھ عرصے بعد وہ واپس ترکی آ گئے۔ سلیمان عالی شان کو ہندوستان کے احوال سے اتنی دلچسپی تھی کہ اس نے علی رئیس کو ہندوستان کا سفرنامہ لکھنے کی تاکید کی۔[1]

ہنگری اور آسٹریا پر فوج کشی:

ادھر جنگ بندی کی مدت ختم ہوتے ہی، شاہِ آسٹریا فرڈی ننڈ نے ہنگری کی ملکہ ازابیلا (جان زابولی کی بیوہ) سے ساز باز شروع کر دی جس کے نتیجے میں ازابیلا نے ٹرانسلفانیا کا علاقہ آسٹریا کے سپرد کر دیا۔

سلیمان نے اس سازش سے مطلع ہو کر ستمبر ۱۵۵۱ء (رمضان ۹۵۸ھ) میں ۸۰ ہزار سپاہی ہنگری میں داخل کر دیے جنہوں نے دریائے ڈینوب کے شمال میں جرمنی پر (جو فرڈی ننڈ کی عمل داری میں شامل تھا) یلغار کی۔ بانات، اردل، لیوا، آرو، اور چاناد کے قلعے سر کر لیے گئے۔ صرف تامشوار کا قلعہ کامیاب مزاحمت کر سکا مگر دوسری یلغار میں جو جولائی ۱۵۵۲ء (رجب ۹۵۹ھ) میں ہوئی، یہ بھی فتح ہو گیا۔ اس دوران اگست ۱۵۵۲ء (شعبان ۹۵۹ھ) میں جرمن سپہ سالار ایک لاکھ سپاہی لے کر مقابلے میں آیا مگر اسے شکستِ فاش ہوئی اور وہ خود گرفتار ہو گیا۔[2]

فرانس کے ساتھ اٹلی کے خلاف مشترکہ مہم:

فروری ۱۵۵۳ء (صفر ۹۶۰ھ) میں فرانس کے نئے بادشاہ ہنری دوئم نے اسپین اور آسٹریا سے کشیدگی کے سبب بابِ عالی سے صلح کی تجدید کی۔ طے ہوا کہ مشترکہ حریفوں پر کاری ضرب لگانے کے لیے ترک اور فرنگی افواج مل کر اسپین اور اٹلی کے ساحلوں پر دھاوا بولیں گی اور خاص طور پر جزیرہ "کورسیکا" کو ہدف بنایا جائے گا۔

اس معاہدے کے مطابق دونوں ملکوں کی فوجیں سسلی اور جنوبی اٹلی کے بعض ساحلی علاقوں پر حملہ آور ہوئیں۔ مگر اس مہم کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا کیوں کہ دونوں فوجوں کے کمانڈروں کا مزاج نہیں ملتا تھا۔ فرانس کے ساتھ مشترکہ فوج کشی کا یہ آخری تجربہ تھا۔[3]

خیر الدین کے جانشینوں کے کارنامے:

خیر الدین پاشا کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں نے بحر و بر میں غاصب ہسپانوی افواج کو ناکوں چنے چبوانے کی مہم جاری رکھی۔ ان میں طرغد بیگ کا نام بھی قابلِ ذکر ہے جو عروج پاشا کا شاگرد اور خیر الدین پاشا کا دستِ راست

---

[1] تاریخ الدولة العثمانية از يلماز اوز تونا: ۳۳۶،۳۳۵

[2] تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامی: ص ۲۴۲،۲۴۱؛ تاريخ الدولة العثمانية از يلماز اوز تونا: ۱ / ۲۸۴تا۲۸۶

[3] تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامی: ص ۲۴۱تا۲۴۶

تھا، اس نے طرابلس الغرب (لیبیا) پر سالہا سال حکومت کی اور وہاں استعماری طاقتوں کو قریب نہ پھٹکنے دیا۔ اس نے باب عالی کے حکم پر فرانسیسی فوجوں سے مل کر بھی اسپین کے خلاف کئی مہمات سر کیں تاہم اسے ان مشترکہ مہمات میں کبھی لطف نہ آیا۔

ان جانبازوں میں صالح پاشا اور بیالہ پاشا کا ذکر بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جو خیر الدین پاشا کے قابل ترین ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے۔ اگر فقط انہی تین مجاہدوں کے کارنامے بیان کیے جائیں تو کئی اوراق درکار ہوں گے۔ ہم اختصاراً انہیں چھوڑ کر صرف خیر الدین پاشا کے بیٹے حسن پاشا کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔

خیر الدین پاشا کے بعد امارت بحریہ اور الجزائر کی امارت حسن پاشا کو دے دی گئی۔ اس نے ایک طرف سمندر میں استعماری طاقتوں کا ناطقہ بند رکھا اور دوسری طرف الجزائر کا امیر ہونے کی حیثیت سے خلافتِ عثمانیہ کی حدود میں اضافہ کرتا رہا۔ تلمسان میں بنی عبدالواد کی حکومت تین صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ حسن پاشا نے یہاں کے آخری حاکم مولائی عبدالقادر کو بے دخل کر کے تلمسان کو الجزائر میں ضم کر دیا۔

کچھ سالوں بعد حسن پاشا کو استنبول واپس بلا لیا گیا اور الجزائر کی امارت، خیر الدین پاشا کے معتمدِ خاص صالح پاشا کو سونپ دی گئی۔ صالح پاشا نے اندلس کے مظلوموں کو افریقہ منتقل کرنے میں نہایت سرفروشانہ کارنامے دکھائے تھے، وہ ایک بار قید بھی ہوا اور تین سال تک طرح طرح کی اذیتیں جھیلتا رہا۔ آخر خیر الدین پاشا نے قیدیوں کے تبادلے میں اسے آزاد کرایا۔ ہسپانوی کمانڈر اندرویا ڈوریا خیر الدین کے بعد صالح پاشا سے بہت ڈرتا تھا۔

صالح پاشا نے الجزائر کا امیر بننے کے بعد اس ملک کی جنوبی ریاستوں کو بھی فتح کر کے خلافتِ عثمانیہ میں شامل کر دیا۔ مراکش کا شہر "ریف" اور الجزائر کا قلعہ بجایہ ایک مدت سے اسپین کے قبضے میں تھے، صالح پاشا نے جنگیں لڑ کر ان دونوں کو واپس لے لیا۔ مراکش کا ایک اور اہم ساحلی شہر "وہران" جو اسپین کی بندرگاہ المریہ سے صرف ۲۰۰ کلومیٹر دور تھا، ۱۵۰۹ء (۹۱۵ھ) سے ہسپانوی فوج کے قبضے میں تھا۔ صالح پاشا اسے آزاد کرانے جا رہا تھا کہ راستے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی عمر ۶۸ سال تھی۔ سلیمان عالی شان نے اس کی موت کی خبر سن کر حسن پاشا کو دوبارہ الجزائر کا امیر بنا دیا۔

انہی دنوں سلیمان عالی شان کو اطلاع ملی کہ فاس کے باج گزار حاکم محمد ثانی نے اسپین کے نئے بادشاہ فلپ ثانی کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ محمد ثانی نے علی الاعلان بغاوت کر کے بعض اعلیٰ ترک افسران کے سر قلم کر کے استنبول بھیج دیے تھے۔ سلیمان نے غضب ناک ہو کر حسن پاشا کو اس باغی کی سرکوبی کا حکم دیا۔ حسن ۲۳ ہزار سپاہی لے کر فاس پہنچا تو محمد ثانی ۸۸ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس کے مقابلے میں آ گیا۔ فریقین میں جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ اچانک حسن پاشا کو اطلاع ملی کہ وہران کا ہسپانوی حاکم کاؤنٹ الکوڈٹ بارہ ہزار سپاہیوں کا بحری بیڑا لے کر تلمسان کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے۔

حسن پاشا نے محمد ثانی سے جنگ ملتوی کرتے ہوئے فوراً ہسپانوی فوج کو روکنے کے لیے واپسی کی۔ اس دوران اس کی بحریہ نے ہسپانوی فوج کے چار جہاز چھین لیے جس سے کاؤنٹ الکوڈٹ کا حوصلہ کمزور پڑ گیا۔ اس نے تلمسان کی جگہ راستے میں پڑنے والے ساحلی شہر "مستغانم" کا محاصرہ کافی سمجھا۔

ابھی محاصرے کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حسن پاشا اپنی فوج لیے اس کے مزاج پرسی کے لیے وہاں پہنچ گیا۔ کاؤنٹ کی فوج میں شامل بارہ ہزار عرب، حسن پاشا کو مقابلے میں دیکھ کر تتر بتر ہو گئے۔ کاؤنٹ کے پاس بھاگنے کا راستہ نہ تھا، اسے محاصرہ اٹھا کر کھلے میدان میں صف بندی کرنا پڑی۔

۵ ستمبر ۱۵۵۸ء (۹ ذوالقعدہ ۹۶۵ھ) کو مستغانم کے میدان میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں کاؤنٹ الکوڈٹ اپنے بارہ ہزار سپاہیوں سمیت مارا گیا۔ اس کا بیٹا ڈان مارٹن گرفتار ہو گیا۔ ایک ہسپانوی بھی صحیح سلامت بچ کر نہ جا سکا۔

اسپین کا معزول بادشاہ چارلس پنجم، اس وقت بستر علالت پر تھا۔ اس بدترین شکست سے اسے بالکل بے خبر رکھا گیا کہ مبادا اس کی حالت مزید بگڑ نہ جائے۔ بہرکیف اس کے ایام حیات پورے ہو چکے تھے۔ ۲۱ ستمبر ۱۵۵۸ء کو وہ فوت ہو گیا۔[1]

حسن پاشا اور جنگ جربہ (مئی ۱۵۶۰ء، مطابق شعبان ۹۶۷ھ):

بحیرۂ روم میں جزیرۂ جربہ، ترک بحریہ کا بہترین اڈا تھا جس کی نگرانی طرغد بیگ کے پاس تھی۔ اسپین اس پر قبضہ کر کے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اینڈریا ڈوریا کے بھتیجے جین اینڈریا کی قیادت میں ایک نہایت مضبوط بیڑا مرتب کیا گیا جس میں روما، سسلی، فلورنس، جرمنی، مناکو، مالٹا اور جینوا سمیت کئی یورپی ممالک کی بحری اور بری فوجیں شامل تھیں۔ ۳۰ ہزار سپاہیوں کا یہ لشکر ۲۱ سال قبل کے معرکۂ پرویزا کی شکست کا داغ دھونا چاہتا تھا۔

آغاز مئی ۱۵۶۰ء (اواخر رجب ۹۶۷ھ) میں یہ فوج جربہ کے ساحل پر اتری جہاں اس وقت صرف ایک ہزار محافظ سپاہی تھے۔ وہ مقابلہ ناممکن دیکھ کر جزیرے سے نکل کر طرابلس الغرب (لیبیا) چلے گئے۔

سلطان کو استنبول اور حسن پاشا کو الجزائر میں یہ خبر بھیج دی گئی۔ ادھر یورپی لشکر نے جزیرے میں ایک عظیم قلعہ تعمیر کیا اور اسے مرکز بنا کر طرابلس الغرب (لیبیا) پر حملے کی تیاری شروع کر دی۔ اسی دوران انہیں اطلاع ملی کہ ترک خود ان کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔

خیر الدین پاشا کا شاگرد پیالہ پاشا جو اس وقت ۳۵ سال کا تھا، اس مہم کا امیر بنایا گیا تھا۔ اس کے پاس ۱۲۰ جہاز تھے۔ طرغد بیگ جس کی عمر ۷۵ برس تھی، اس کے ساتھ تھا۔ وہ جربہ سے تین میل دور جہاز لنگر انداز کر کے جنگی حکمت عملی کے لیے مشورہ کرنے لگے۔ آخر طے ہوا کہ اپنے استاد خیر الدین پاشا کی جنگِ پرویزا میں اختیار کردہ چالوں کو استعمال کیا جائے گا۔ ۱۴ مئی ۱۵۶۰ء (۱۹ شعبان ۹۶۷ھ) کی صبح جزیرہ جربہ سے چند میل دور گہرے سمندر میں دونوں

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۳۰۶/۱ تا ۳۰۸۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا: مقالہ چارلس پنجم

فوجوں میں ایسی قہر انگیز جنگ ہوئی جس کی مثال نہیں ملتی۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ اتنی بڑی بحری جنگ دنیا کی تاریخ میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔ دوطرفہ گولہ باری نے قیامتِ صغریٰ بپا کر دی، ترک جہاز رانوں نے خیر الدین پاشا کی چالوں کو اس مہارت سے استعمال کیا کہ یورپی بحریہ کی کثرت بے کار ثابت ہوئی۔ جہازوں کے باہم ٹکرانے سے سمندر میں بھونچال آ گیا۔ مسلمانوں نے دست بدست لڑائی میں شمشیر زنی کے وہ ہاتھ دکھائے کہ بحیرۂ روم کا پانی سرخ ہوگیا۔ چند گھنٹوں کی لڑائی میں ہزاروں نصرانی قتل، ہزاروں غرق اور ہزاروں گرفتار ہو گئے۔ ان کے ۷۰ جہاز ڈوب گئے۔ ۳۶ پر قبضہ کر لیا گیا۔ ۳۰ ہزار میں سے صرف دس ہزار نصرانی زندہ بچ کر واپس جا سکے۔ ترکوں کے لگ بھگ ایک ہزار جوان شہید اور چند جہاز ضائع ہوئے۔

یورپی کمانڈر اینڈریا ڈوریا جس کی عمر اس وقت ۹۴ سال ہو چکی تھی، جنیوا کے ایک محل میں، اپنے بھتیجے کی فتح کی خوشخبری سننے کا منتظر تھا۔ جب اسے اس عبرت ناک شکست کی اطلاع ملی تو وہ بستر سے لگ گیا اور اسی سال ۲۵ نومبر کو فوت ہو گیا۔ ①

حسن پاشا اور جنگِ وہران:

۱۵۶۱ء (۹۶۸ھ) میں حسن پاشا الجزائر کی امارت سے مستعفی ہو کر واپس استنبول چلا گیا مگر ۱۵۶۳ء (۹۷۰ھ) میں اسے تیسری بار یہ خدمت سپرد کر دی گئی۔ حسن پاشا کی شدید آرزو تھی کہ وہ "وہران" کو ہسپانیہ سے بازیاب کرائے، اس لیے الجزائر کی امارت سنبھالتے ہی وہ ۲۸ ہزار سپاہیوں کے ساتھ وہران پہنچ گیا۔ حسن پاشا کی پوری کوشش تھی کہ اسپین سے کمک آنے سے قبل شہر فتح کر لیا جائے مگر ۲۶ دن تک شدید محاصرانہ جنگ کے باوجود کامیابی نہ ہوئی اور اس دوران اسپین سے ایک بہت بڑا بحری بیڑا "وہران" پہنچ گیا۔ حسن پاشا کو مجبوراً محاصرہ ترک کر کے پسپا ہونا پڑا۔

حسن پاشا مزید دو سال الجزائر میں رہا۔ ۱۵۶۵ء (۹۷۲ھ) میں مالٹا کے محاصرے میں شرکت کی۔ ۱۵۶۷ء (۹۷۴ھ) میں اسے استنبول بلا لیا گیا۔ ۱۵ مارچ ۱۵۷۲ء (۱۱۸ کتوبر ۹۷۹ھ) کو اس کی وفات ہوگئی۔ وہ اپنے عظیم والد خیر الدین پاشا کے پہلو میں دفن ہوا۔ ②

مالٹا کا محاصرہ:

سلطنتِ عثمانیہ کی ہنگری اور آسٹریا سے لڑائیاں اور جنگ بندیاں ہوتی رہیں۔ ۱۵۵۵ء، ۱۵۵۷ء، اور ۱۵۶۲ء (۹۶۲ھ، ۹۶۳ھ، ۹۶۹ھ) میں یکے بعد دیگرے جنگیں اور صلح کے معاہدے ہوئے۔

اسپین کی فوجیں الجزائر پر بار بار حملہ آور ہو رہی تھیں تاکہ اسے دوبارہ اپنے قبضے میں لے کر بحیرۂ روم پر تسلط حاصل کر سکیں۔ سلیمان نے انہیں جواب دینے کے لیے تیونس اور جنوبی اٹلی کے مابین واقع جزیرہ مالٹا کی تسخیر کا عزم کیا اور

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱/۳۱۴ تا ۳۱۶

② تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱/۳۰۷ تا ۳۰۹

۱۵۶۵ء (۹۷۱ھ) میں دوسو جہازوں پر مشتمل بیڑا بھیجا جس نے چار ماہ تک مالٹا کا محاصرہ جاری رکھا۔ اس کے بعد سخت سردی نے لڑائی مشکل ترین بنادی اور عثمانی افواج کو واپس آنا پڑا۔ (۱)

بحیرۂ روم کی جنگوں کے نتائج

اس میں شک نہیں کہ اپنی تخت نشینی سے لے کر وفات تک سلیمان عالی شان کا سب سے بڑا ہدف اسپین کی بالادستی کی روک تھام کرنا تھا اور بلاشبہ وہ اس میں کامیاب رہا تھا۔ اسپین کے طاغوت چارلس پنجم کو اپنے مین عروج کے دور میں، شدید خفت و ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ سلیمان عالی شان نے اس کے نائب حکام کو وسطی یورپ میں بار بار گھٹنوں کے بل جھکایا۔ خیر الدین پاشا نے اس کے جہاز رانوں کو بحیرۂ روم میں مسلسل شکستیں دیں۔

اگر یہ جری اور باہمت ہستیاں عالم اسلام کا دفاع نہ کرتیں تو کوئی بعید نہیں کہ اسپین کی بہیمانہ سیاست سے باقی عالم اسلام کا بھی وہی حشر ہوتا جو اندلس کے مسلمانوں کا ہوا تھا کیوں کہ جو علاقے اس طاغوتی طاقت کو مزاحمت سے پاک ملے وہاں اس نے درندوں کو بھی مات دے دی۔ صرف امریکا کا جزیرہ ہیٹی ہسپانوی سامراج کی آمد سے پہلے ۱۴۹۲ء میں پانچ لاکھ انسانوں سے آباد تھا۔ مگر اسپینی سورماؤں نے وہاں انسانیت کا ایسا بھیانک قتل عام کیا کہ ۲۲ برس بعد ۱۵۱۴ء میں اس خطے کی مردم شماری فقط تیرہ ہزار رہ گئی تھی۔ یہی اسپینی جہاز راں تھے جو افریقہ کے ساحلوں پر اتر کر وہاں کے سیاہ فام باشندوں کو قید کرتے اور غلام بنا کر امریکا لے جاتے تھے، وہاں کھیتی باڑی، سڑکیں بنانے، عمارتیں اور قلعے تعمیر کرنے اور نہریں کھدوانے سمیت محنت و مشقت اور ذلت و خواری کے تمام کام ان سے بیگار میں کرائے جاتے تھے۔ خود امریکا کے مقامی باشندے جنہیں ریڈ انڈینز کہا جاتا ہے، ایک بہت بڑی آبادی تھے جس میں قبائل کی تعداد ہی سینکڑوں تک تھی۔ ہسپانوی فوجوں نے انہیں غلام بنا کر جبری مشقت میں لگایا۔ جانوروں کی طرح قتل کیا اور آگ میں جلایا۔ ان بیچاروں کی جاں بخشی کی صرف ایک صورت تھی کہ وہ کیتھولک مذہب قبول کرلیں۔ (۲)

سلیمان عالی شان کی طرف سے پروٹسٹنٹ تحریک کی سرپرستی:

پوری دنیا میں کیتھولک مذہب کو پھیلانے کی ان غیر انسانی کوششوں کے باوجود چارلس خود اپنے گھر یورپ میں فرقۂ پروٹسٹنٹ کے بانی مارٹن لوتھر کی آواز کو نہ دبا سکا جس نے عبادت گاہوں میں دولت کے عوض مغفرت ناموں کی تقسیم کو غلط قرار دیا، بت پرستی سے منع کیا اور مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری کو چیلنج کیا۔

اس تحریک نے کیتھولک چرچ کا اقتدار ختم کر کے دنیائے نصرانیت کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اگرچہ اسپین، پرتگال اور اٹلی میں اس کی تحریک نفوذ نہ کرسکی مگر فرانس اور آسٹریا میں اسے روکا نہ جاسکا خصوصاً جرمنی میں تو عوام وخواص جوق

---

(۱) تاریخ الدولة العلیة العثمانیة از فرید بك محامی: ص ۲۴۹
(۲) تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۱ / ۲۸۶، ۲۸۷

در جوق اس فرقے میں داخل ہوئے جس پر چارلس کو شدید غم وغصہ تھا۔

پروٹسٹنٹ مذہب قبول کرنے والے شہزادوں اور نوابوں نے چارلس کے عتاب سے بچنے کے لیے سلیمان عالی شان کا سہارا لینے کی کوشش کی اور سلیمان عالی شان نے نہایت حکمت سے کام لیتے ہوئے ان کی سرپرستی قبول کرلی۔ پروٹسٹنٹ شہزادوں کا سفیر استنبول کا چکر لگا کر واپس یورپ پہنچا تو اس کے پاس باب عالی کا مراسلہ تھا جس میں پروٹسٹنٹ مذہب قبول کرنے والوں کی حمایت کا اعلان کیا گیا تھا۔ یوں چارلس پنجم جو پروٹسٹنٹ تحریک کو بالکل کچل دینا چاہتا تھا، اپنے ارادے میں ناکام ہوگیا کیوں کہ سختی برتنے کی صورت میں جرمنی سمیت کئی صوبے اس سے بغاوت کر دیتے۔

اپنی عظیم سلطنت کو تقسیم سے بچانے کے لیے ۱۳ اکتوبر ۱۵۵۵ء (۳ ذوالقعدۃ ۹۶۲ھ) کو اس نے بادل نخواستہ ملکی قانون میں پروٹسٹنٹ مذہب کی گنجائش کا قانون منظور کرلیا۔

کیتھولک چرچ کے نزدیک یہ چارلس کی مذہبی وسیاسی خودکشی تھی جس کا خود چارلس کو بھی احساس تھا چنانچہ اس نے کچھ دنوں بعد ۱۶ جنوری ۱۵۵۶ء (۲۱ صفر ۹۶۳ھ) کو اپنا تاج وتخت چھوڑ دیا اور اپنے بیٹے فلپ کو حکومت سونپ کر خود گوشہ نشینی اختیار کرلی۔[1]

سلیمان عالی شان کی کامیابی:

اگر کہا جائے کہ سلیمان عالی شان نے چارلس کے ساتھ لڑی جانے والی ۳۵ سالہ طویل جنگ اتنی واضح کامیابی سے جیتی کہ خود چارلس کو اعتراف شکست میں اپنا تخت چھوڑنا پڑا تو یہ غلط نہ ہوگا۔

پروٹسٹنٹ چرچ کو ماننے والے تمام نصرانی حکمرانوں کو سلطنتِ عثمانیہ اور خصوصاً سلیمان عالی شان کا شکر گزار ہونا چاہیے کیوں کہ اگر وہ کیتھولک اسپین اور پاپائے روم کے استبداد پر کاری ضربات نہ لگاتا، اور پروٹسٹنٹ فرقے کی حمایت نہ کرتا تو تاجِ اسپین اور کلیسائے روما بڑے اطمینان سے اس تحریک کا گلا گھونٹ دیتے۔

ایرانیوں سے کش مکش

صفوی سلطنت کے بانی اسماعیل صفوی نے، سلیمان عالی شان کے والد سلیم اوّل سے جنگ چالدران میں عبرت ناک شکست کھائی تھی۔ اس کے بعد رنج وغم میں گھلتے گھلتے ۲۲ مئی ۱۵۲۴ء (۱۹ رجب ۹۳۰ھ) کو وہ ۳۷ سال کی عمر میں فوت ہوگیا۔ اس کی جگہ اس کا دس سالہ جانشین شاہ طہماسپ تخت پر بیٹھا۔ یہ سلیمان اوّل کی تخت نشینی کا چوتھا سال تھا۔

ایرانی زعماء مسلسل عثمانیوں کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ جب ۱۵۳۲ء (۹۳۹ھ) میں سلیمان عالی شان، آسٹریا کی مہم پر تھا، ایرانیوں نے تبریز دوبارہ فتح کرلیا۔ اور عراق میں فوجیں پھیلا کر بغداد پر بھی قابض ہوگئے

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱/ ۲۸۷، ۲۸۸۔ گوشہ نشینی کے پونے تین سال بعد ستمبر ۱۵۵۸ء میں اس کی موت واقع ہوگئی۔

پھر وہ ترکی کی شمالی سرحدوں پر فوجیں لے آئے اور عثمانیوں کے حامی قبائلی سرداروں کو ساتھ ملانے لگے۔ سرحدی ریاست "بدلیس" (Bitlis) کا حاکم شریف بیگ منحرف ہو کر ایران کا وفادار بن گیا۔ سلیمان نے شاہِ ایران کو مزا چکھانے کی مہم صدرِ اعظم ابراہیم پاشا کو سونپی۔ اس نے آذربائی جان کے حاکم شمس الدین کو جو ایران کا حامی تھا، ساتھ ملایا۔ شمس الدین نے باغی شریف بیگ کا کام تمام کر دیا۔[1]

تبریز کی دوبارہ فتح، بغداد پر قبضہ:

۱۵۳۴ء (۹۴۰ھ) کے موسم بہار میں ابراہیم پاشا نے خود باغی ریاستوں پر فوج کشی کی۔ آخر میں تبریز پر حملہ کیا اور کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر ۱۳ مئی ۱۵۳۴ء (۷ اشوال ۹۴۰ھ) کو اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد تبریز کبھی ایران کا پایۂ تخت نہ بن سکا۔ چند ماہ بعد سلیمان عالی شان بھی جو آسٹریا سے صلح کے بعد ایران سے جنگ کے لیے فارغ ہو چکا تھا، تبریز پہنچ گیا۔

ابراہیم پاشا کے لشکر کو ساتھ ملا کر اس نے شمالی ایران کے شہر سلطانیہ کی طرف پیش قدمی شروع کی جہاں شاہ طہماسپ کا پڑاؤ تھا۔ یہ شہر گیلان کے مشرق میں نہایت دشوار گزار پہاڑوں پر واقع ہے۔ راستے میں شدید بارش شروع ہو گئی اور کیچڑ نے نقل و حرکت کو مشکل بنا دیا۔ سلیمان نے مجبوراً سلطانیہ کو چھوڑ کر عراق کا رُخ کیا اور بغداد پہنچ گیا۔ ۳۱ دسمبر ۱۵۳۴ء (۱۳ جمادی الاخریٰ ۹۴۱ھ) کو بغداد کسی مزاحمت کے بغیر ترکوں کے قبضے میں آ گیا۔

سلیمان عالی شان نے یہاں چار ماہ گزار کر داخلی انتظامات کو بہتر بنایا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مزار کے علاوہ نجف میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مزارات کی زیارت بھی کی۔[2]

ایران پر دوسرا حملہ:

صفوی اس کے بعد بھی سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف سازشوں میں مشغول رہے۔ شاہ طہماسپ نے ترکوں کے خلاف اسپین اور جرمنی سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ شمالی ایران کا امیر قفقاز، داغستان اور شیروان کے سنی مسلمانوں کو بزورِ شمشیر شیعہ بننے پر مجبور کر رہا تھا۔ ان سنی مسلمانوں کی فریاد پر عثمانی امراء نے فوج کشی کر کے ایرانیوں کو پیچھے دھکیلا اور ان علاقوں کو خلافتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا۔

اُدھر شیعہ داعی خفیہ طور پر ترکی میں سرگرم تھے اور لوگوں سے طہماسپ کے لیے بیعت لے کر انہیں سلطنتِ عثمانیہ کا باغی بنا رہے تھے۔ یہ فتنہ اس قدر پھیل گیا تھا کہ ترکی کے کئی شہروں کے ہزاروں بھولے بھالے لوگ اس کا شکار ہو چکے تھے۔ ہر مرید پر لازم تھا کہ وہ ایک طے شدہ رقم بطور "نذر" داعی کو پیش کرے۔ یہ تمام رقوم ایران بھیج دی جاتی تھیں۔ ترک حکام کو اس گھناؤنے کھیل کی خبریں مل رہی تھیں مگر ملکی قانون میں محض عقیدے کے اختلاف کی بنا پر کسی کو

---

[1] الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۲۲۲

[2] الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۲۲۲ تا ۲۲۴، تاريخ الدولة العثمانية از يلماز اوز تونا: ۱/ ۳۳۹ تا ۳۴۱

سزا دینے کی گنجائش نہیں تھی، اسی لیے ترک حکام احتیاط کر رہے تھے۔

آخر جب فوج میں بھی شیعہ داعیوں کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں تو تحمل کی گنجائش نہ رہی۔ سلیمان عالی شان نے ایسے ۴۰ سپاہیوں کو جن پر شاہ ایران کی بیعت کا الزام ثابت ہو گیا، قتل کرا دیا اور اس کے بعد ایران سے جنگ کا اعلان کر کے ۱۵۴۸ء (۹۵۵ھ) میں ایران کا رُخ کیا۔ طہماسپ مقابلے کی ہمت نہ کر سکا اور فرار ہو گیا۔ ترک امراء نے تبریز اور گرد و نواح کے بعض قلعوں پر قبضہ مضبوط کر لیا۔ اس مہم سے واپسی پر سلیمان عالی شان نے شام کا جائزہ لینا ضروری سمجھا اور کچھ وقت حلب میں گزارا۔[1]

ایران پر تیسرا حملہ:

عثمانیوں کو غافل سمجھ کر شاہ ایران نے سرحدی قلعوں: از جیش، برقیری اور اخلاط پر قبضے کی تیاری شروع کر دی۔ یہ خبر سن کر ۱۵۵۳ء (۹۶۰ھ) میں سلیمان عالی شان نے ایران پر تیسری بار فوج کشی کی۔ اس وقت سلیمان کی عمر ۵۸ برس ہو چکی تھی۔ اس مہم میں شہزادہ سلیم اور بایزید بھی شریک تھے۔ شاہ ایران اس بار بھی مقابلے میں نہ آیا اور صلح کی پیش کش کر دی۔ طویل مذاکرات کے بعد جو فیصلہ ہوا، وہ "معاہدہ آماسیا" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں باہمی سرحدوں کا تعین کر کے ایک دوسرے کی حدود میں عدم مداخلت پر اتفاق کر لیا گیا۔ سرحدی حدود تقریباً وہی طے ہوئیں جو آج کل ایران اور ترکی کے درمیان قائم ہیں۔ یہ صلح اگلے ۲۳ برسوں تک برقرار رہی۔[2]

بغاوتیں اور اندرونی مسائل

سلیمان عالی شان کا دور اگرچہ مجموعی طور پر کامیاب اور پُر امن رہا مگر اس کی سلطنت نہایت وسیع تھی اور دورِ اقتدار بھی طویل۔ لہٰذا اس دوران اندرونی بغاوتوں اور محلاتی سازشوں سے بھی پالا پڑتا رہا۔ بہت سے باغی قتل کیے گئے۔

اقتدار سنبھالتے ہی اسے شام کے حاکم غزالی کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا مگر اس کے جرنیل راحت پاشا نے بڑی تیزی سے جا کر اس بغاوت کو فرو کر دیا۔ غزالی دمشق میں محصور ہو کر لڑتا رہا مگر آخر ے اصفر ۹۲۷ھ (۲۷ جنوری ۱۵۲۱ء) کی فیصلہ کن جنگ میں اسے شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔[3]

۱۵۲۳ء (۹۲۹ھ) میں اس نے احمد پاشا کو مصر کا امیر مقرر کیا مگر احمد پاشا نے کچھ مدت بعد بغاوت کر کے مصر کو خود مختار بنانے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مرکز کے ایک وفادار جرنیل محمد بیگ کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کی جگہ قاسم پاشا کو مصر کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔[4]

---

(1) تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۲۴۰؛ تاريخ الدولة العثمانية از يلماز اوز تونا: ۱/ ۳۴۴تا۳۴۶

(2) تاريخ الدولة العثمانية از يلماز اوز تونا: ۱/ ۳۴۶، ۳۴۷؛ تاريخ عثمانى از اوزون حقى: ۲/ ۳۸۷

(3) تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۱۹۸ (4) تاريخ الدولة العلية العثمانية از محامي: ص ۲۰۶، ۲۰۷

ینی چری فوج کی خودسری اور اس کا تدارک:

ینی چری فوج جو عثمانی سلاطین کا بازوئے شمشیر زن تھی، بہت آزاد اور خودسر ہوتی جارہی تھی۔ ۱۵۲۴ء (۹۳۰ھ) میں سلطنت کے صدر اعظم اور سلیمان عالی شان کے بہنوئی ابراہیم پاشا کو مصر بھیجا گیا تاکہ وہاں کے انتظامات کو بہتر بنایا جاسکے۔ اس دوران استنبول میں ینی چری فوج نے ہنگامہ کردیا اور ابراہیم پاشا کے محل کے علاوہ یہودیوں کے محلے اور کئی عمارتوں کو لوٹ لیا۔ سلیمان نے خود وہاں پہنچ کر ینی چری جوانوں کو روکا اور ایک تقریر کر کے ان کے مطالبات ماننے کا یقین دلایا۔ انہیں ٹھنڈا کرنے کے لیے ان میں خطیر رقم تقسیم کی۔ امن وامان ہوجانے کے بعد لوٹ مار کے مرتکب ینی چری افسران کے خلاف کارروائی ہوئی اور ان میں سے چند ایک جو اس ہنگامے کے اصل مجرم تھے، سزائے موت دے دی گئی۔[1]

تاتاری ریاستوں کا الحاق، خلافتِ عثمانیہ کی حدود ماسکو تک:

بحیرۂ خزر کے ساتھ بلادِ قرم کے علاقے، دولتِ عثمانیہ کی باج گزار ریاستوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہاں کے حکمران چنگیز خان کی نسل سے تھے اور بابِ عالی کو خراج ادا کیا کرتے تھے۔ وہ روسی افواج کے لیے شمشیرِ بے نیام تھے۔ ان کا حاکم کیرائی خان جو ۴۳ سال برسرِ اقتدار رہا، ۱۵۱۴ء (۹۲۰ھ) میں فوت ہوگیا۔ اس کے جانشینوں نے ۱۵۲۱ء (۹۲۷ھ) میں روسی افواج کو شکست دے کر ماسکو کو تاراج کردیا۔ ۱۵۲۲ء (۹۲۸ھ) میں استرخان، ۱۵۲۴ء (۹۳۰ھ) میں "غوزکی" اور ۱۵۲۷ء (۹۳۳ھ) میں ماسکو کے جنوب مشرقی شہر "ریازان" کو بھی زیرِ نگین کرلیا۔

تاہم ان قبائلی سرداروں میں باہم کش مکش بھی بڑھ رہی تھی۔ سلیمان نے انہیں برقرار رکھتے ہوئے یہ علاقے باقاعدہ سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کرلیے۔ حکومت اگرچہ چنگیزی سرداروں کے پاس رہنے دی گئی مگر حکام کے تقرر کا اختیار خلیفہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس طرح سلطنتِ عثمانیہ کی حدود ماسکو کے نواح تک پہنچ گئیں۔[2]

خلافتِ عثمانیہ نے یورپی استعمار کے بڑھتے ہوئے خطرے کے مقابلے میں اپنے اثر ورسوخ کو بڑھانے کی کوششیں جاری رکھیں اور اس سلسلے میں وسطی افریقہ کے گھنے جنگلات میں آباد علاقوں پر بھی توجہ دی۔ ان کوششوں کے نتیجے میں شمالی نائیجیریا کی ایک وسیع وعریض ریاست بورنو (بورنوان) نے سلطنتِ عثمانیہ سے الحاق کرلیا۔ یہ ۱۵۵۰ء (۹۵۷ھ) کا واقعہ ہے۔

سلیمان عالی شان کی وفات:

شاہِ آسٹریا فرڈیننڈ ۱۵۶۴ء (۹۷۱) میں مرگیا۔ اس کے جانشین میکسملین نے تخت نشینی کے بعد ہنگری پر حملے شروع کردیے۔ سلیمان عالی شان نقرس کی بیماری کے باوجود خود اس مہم پر گیا اور "سگد وار" نامی شہر کا محاصرہ کر کے

---

[1] تاریخ الدولة العلية العثمانية از محامی: ص ۲۰۸

[2] تاریخ الدولة العلية العثمانية از محامی: ص ۲۰۷، ۲۰۸، تاریخ الدولة العثمانية از یلماز اوز تونا: ۱/ ۲۶۵

آسٹریا پر اپنی ہیبت قائم کردی۔ یہ ۱۵۶۶ء کے موسم گرما (اواخر ۹۷۳ھ) کا واقعہ ہے۔[1]
یہ محاصرہ پانچ ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران سلیمان کا مرض بڑھ گیا۔ آخر محاذ جنگ پر ہی ۲۰ صفر ۹۷۴ھ (۵ ستمبر ۱۵۶۶ء) کو اس عظیم مسلم حکمران نے جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔

رعب فغفوری ہو دُنیا میں کہ شان قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیم موت کی یورش کبھی
بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور[2]

دشمن کی ہمت بڑھنے اور اندرونِ مملکت کسی شورش کے خطرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی موت کی خبر خفیہ رکھی گئی۔ اس کی وفات کے تین دن بعد ۸ ستمبر کو شہر سگد وار فتح ہو گیا۔[3]

سلیمان عالی شان کے کارنامے اور اصلاحات:

سلیمان عالی شان کا دورِ اقتدار لگ بھگ نصف صدی پر مشتمل تھا۔ اس دوران وہ مسلسل سلطنت کی توسیع اور استحکام میں مصروف رہا۔ اس کے طرزِ حکومت، اصلاحات، کردار اور کارناموں کا ایک جائزہ پیش خدمت ہے:

① وہ غیر مسلموں پر ظلم قطعاً پسند نہیں کرتا تھا۔ حالتِ جنگ کے سوا، وہ کسی کے لیے تلوار بے نیام نہیں کرتا تھا۔ اپنے سپاہیوں کو ایسی زیادتیوں سے روکنے کے لیے سخت سزائیں دیتا تھا۔ مولڈافیا کی مہم میں اس کے دو سپاہیوں نے نصرانیوں کا کوئی مکان جلا دیا۔ سلیمان کو شکایت پہنچی تو دونوں کو قتل کرا دیا۔ یہ واقعہ یورپ کی تاریخ میں مشہور ہے۔[4]

② سلیمان عالی شان نے اپنے طویل دورِ اقتدار میں متعدد جنگیں لڑیں، جس کے لیے اسے فوج پر خاص توجہ دینا پڑی۔ اس کی وفات کے وقت سپاہیوں کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ تین سو توپیں اور تین سو بحری جہاز ہر وقت جنگ کے لیے تیار رکھے جاتے تھے۔

③ اس نے صرف فتوحات پر نہیں بلکہ ملکی نظم و نسق پر بھی مکمل توجہ دی۔ اس نے ملکی انتظامات کی بہتری کے لیے بکثرت نئے قوانین وضع کیے جس کی وجہ سے اسے سلیمان القانونی بھی کہا جاتا ہے۔

④ اس نے اپنی عظیم الشان سلطنت کو "۲۱" صوبوں پر تقسیم کیا، ہر صوبے کو "ولایت" کہا جاتا تھا۔ ہر ولایت، اضلاع میں منقسم تھی، ہر ضلع کو "سنجق" کہا جاتا تھا۔ اس کے دور میں سلطنتِ عثمانیہ کے اضلاع کی تعداد "۲۵۰" تھی۔

---

① تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامی: ص ۲۴۹، ۲۵۰
② علامہ اقبال
③ تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامی: ص ۲۴۹، ۲۵۰
④ تاریخ الدولة العثمانية از يلماز اوز تونا: ۱/ ۲۷۷

⑤ اس نے ینی چری جانبازوں کو از سر نو مرتب کیا۔ کارکردگی اور خدمات کے لحاظ سے ان کے تین درجات رکھے اور اس فوج کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچا دی۔[1]

⑥ اس نے فوج کا ایک الگ شعبہ قائم کیا جس میں بوڑھے، معزول اور معذور سپاہی شامل کیے جاتے تھے۔ انہیں ہلکی پھلکی خدمات سپرد کر دی جاتی تھیں تا کہ وہ بالکل معطل نہ ہو جائیں اور ان کی معاش کا سلسلہ بھی باقی رہے۔

⑦ اس کے دور میں عثمانی افواج اسلحے اور حربی صنعت میں یورپ سے بہت آگے تھیں۔

⑧ جاگیروں کی تقسیم در تقسیم سے بے شمار مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ سلیمان نے اس نظام میں بھی اصلاحات کیں۔ چھوٹی جاگیروں کے انضمام سے بڑی جاگیریں بنانے کی اجازت دی گئی مگر بڑی جاگیروں کی تقسیم کو حدود و ضوابط کا پابند کیا۔ کسی جاگیردار کے مرنے کی صورت میں اس کے ورثاء کے لیے ضروری تھا کہ وہ جاگیر کی تقسیم کے لیے خلیفہ سے اجازت حاصل کریں۔ اس نے قانون بنایا کہ کوئی جاگیر ایک مقررہ حد سے کم نہیں ہوگی۔ اس حد پر پہنچ کر اس کی تقسیم غیر قانونی ہوگی۔

⑨ اسے تعمیرات سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کے دور میں عظیم الشان مسجد، جامع سلیمانیہ تعمیر ہوئی جو ترکی فن تعمیر کا ایک لاجواب نمونہ ہے۔ استنبول کے علاوہ اس کے حکم سے بغداد، قونیہ اور دوسرے شہروں میں بھی کئی مساجد تعمیر ہوئیں، قدیم مساجد کی مرمت کرائی گئی، تمام شہروں میں نئے شفاخانے اور ہسپتال کھولے گئے، استنبول میں ایک نہر نکالی گئی۔ نئے پل تعمیر کیے گئے۔

⑩ سلیمان عالی شان ایک سپہ سالار ہی نہیں بلکہ ایک جید عالم اور بہترین شاعر و ادیب بھی تھا۔ وہ اپنے روزمرہ کے واقعات کو ایک ڈائری کی شکل میں تحریر کرنے کا عادی تھا۔ یہ سلسلہ دوران جنگ بھی جاری رہتا تھا۔

⑪ اس نے علماء اور اہل فضل و کمال کی ہمیشہ قدر دانی کی اور انہیں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ سلطان محمد فاتح کے قائم کردہ تعلیمی نظام کو اس نے مزید ترقی دی۔ مفتی کی تنخواہ تمام عہدے داروں سے زائد رکھی۔

⑫ اس نے بحریہ کی طاقت کو اتنا بڑھا دیا کہ یورپی جہاز رانوں کا ناطقہ بند ہو گیا۔

⑬ اس نے اہل سیف کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ خیر الدین پاشا، سیدی علی، پیری رئیس اور صدر اعظم ابراہیم پاشا اس کے نامور جرنیل تھے۔

⑭ عثمانی سلاطین میں محمد فاتح کے بعد وہ سب سے با عظمت اور با ہیبت حکمران شمار کیا گیا ہے، اس لیے تاریخ اسے سلیمان عالی شان اور سلیمان اعظم کے القاب سے یاد کرتی ہے۔ اس نے بلغراد، روڈس، ہنگری، ایران اور آسٹریا میں زبردست فتوحات حاصل کیں۔ ویانا کے محاصرے کے سوا، ہر جگہ اسے کامیابی ہوئی۔ اس کے دور میں خلافت عثمانیہ سات سمندروں پر محیط تھی جن میں بحیرۂ اسود، خلیج فارس، بحیرۂ احمر، بحیرۂ روم، بحیرۂ عرب اور بحیرۂ ایڈریاٹک شامل ہیں۔

---

① فی اصول التاریخ العثمانی، احمد عبدالرحیم مصطفیٰ: ص ۴۳، ط دار الشروق

تین براعظموں: ایشیا، افریقہ اور یورپ میں خلافت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ یہ خلافت شمالاً جنوباً دریائے ڈینوب سے دریائے دجلہ کے دہانے تک اور شرقاً غرباً آذربائی جان سے الجزائر تک وسیع تھی۔ (1)

سلیمان عالی شان کے بعض سخت اقدامات جن پر تنقید کی گئی:

سلیمان عالی شان کی سیرت میں بعض فیصلے ایسے بھی ہیں جو صاف اور اجلے دامن پر ایک دھبے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے عظیم المرتبت خلیفہ سے بعض ایسے غلط فیصلے کرانے میں بنیادی کردار اس کی یوکرائنی بیوی خرم کا تھا جس کا اصل نام روکسلین تھا۔ (2)

وہ مذہباً یہودی اور وطناً روسی (یوکرائنی) تھی۔ صوبہ قرم کے مسلم تاتاریوں نے اسے جہاد کے دوران گرفتار کیا تھا اور پھر باندی بنا کر بطور ہدیہ سلیمان عالی شان کے پاس بھیج دیا تھا۔ سلیمان عالی شان نے اس سے شادی کرلی۔ یہ حسین وجمیل یہودی النسل لڑکی سلیمان عالی شان کی چہیتی ملکہ بن کر اس کے مزاج پر حاوی ہوگئی۔ (3)

خرم کی شدید خواہش تھی کہ سلطنت کا وارث، اس کی اولاد کے سوا کوئی نہ ہو۔ اس نے صبر وتحمل، غیر محسوس انداز اور خفیہ تدابیر کے ذریعے سالہا سال تک اس ہدف کو سامنے رکھ کر چالیں چلیں اور آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی وجہ سے سلیمان عالی شان جیسے شخص کا دامن داغ دار ہوگیا۔

جس زمانے میں اس کھیل کی ابتداء ہوئی، اس وقت سلیمان کا بڑا بیٹا مصطفیٰ اپنی قابلیت کے باعث پورے ملک میں بڑا مقبول ومحبوب تھا اور خلیفہ اس کی ولی عہدی کا باقاعدہ اعلان کرچکا تھا۔ خرم اس کی جگہ اپنے بڑے بیٹے محمد کو دیکھنا چاہتی تھی مگر وہ اپنی اولاد کو جانشین بنانے کا غیر قانونی مشورہ دے کر خود کو خلیفہ کی نگاہوں میں گرانا نہیں چاہتی تھی۔ ہاں وزیرِ اعظم کو شیشے میں اتار کر اس سے یہ کام ضرور لیا جاسکتا تھا مگر اس وقت وزیرِ اعظم کا منصب خلیفہ کے بہنوئی ابراہیم پاشا جیسے چوکنا انسان کے پاس تھا جو پوری مملکت کا نظام بحسن وخوبی چلا رہا تھا۔ خرم جانتی تھی کہ وہ کبھی بھی اس کا آلہ کار نہیں بنے گا۔ وہ ایسے بندے کی تلاش میں رہی جسے وزارتِ عظمیٰ پر لا کر اس کے ذریعے خلیفہ کو اپنے من پسند راستے پر چلایا جائے۔ (4)

اس نے بساطِ سیاست کے اہم مہرے ”صدرِ اعظم“ کی جگہ اپنے پسندیدہ شخص کو لانے کے لیے، اپنی بیٹی کا نکاح، رستم پاشا نامی ایک امیر سے کرادیا۔ یوں رستم کے لیے اعلیٰ ترین عہدوں اور خرم کے لیے امورِ سیاست میں من چاہے فیصلے کرانے کی راہیں ہموار ہوگئیں۔ (5)

---

(1) تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۲۵۰، ۲۵۲۔ عثمانی ترک: ص ۹۴ تا ۹۶

(2) تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۲۳۰

(3) تاریخ الدولة العثمانية، از علی حسون: ص ۵۳، ط المكتب الاسلامی بیروت

(4) تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۲۳۰۔ تاریخ الدولة العثمانية از یلماز اوز تونا: ۱/ ۳۴۸

(5) تاریخ الدولة العثمانية، از علی حسون: ص ۵۳، ط المكتب الاسلامی بیروت

اسی دوران یہ سانحہ پیش آیا کہ خرم کا بڑا بیٹا شہزادہ محمد، جو مانیسا کا والی تھا، فوت ہوگیا۔ اس کے بعد خرم نے خلیفہ سے اپنے چھوٹے بیٹے سلیم کے لیے ولی عہدی طے کرانے کی ٹھان لی۔

وہ صدر اعظم ابراہیم پاشا کے خلاف سلطان سلیمان کے کان بھرنے لگی۔ یوں سلیمان، اس بہترین وزیر سے بدظن ہوتا چلا گیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ ابراہیم پاشا کا فوج اور انتظامیہ میں اثر ورسوخ اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ وہ کسی بھی وقت اس کا تختہ الٹ سکتا ہے۔ ۱۵۳۵ء (۹۴۱ھ) میں صفویوں کے خلاف تبریز پر حملے کی قیادت کرتے ہوئے ابراہیم پاشا کے اختیارات اور شان وشوکت میں مزید اضافہ ہوا جس نے سلیمان عالی شان کے شکوک وشبہات کو تقویت دی۔ آخر اس نے ابراہیم کو قتل کرادیا۔ یہ ۲۲ رمضان ۹۴۲ھ (۲۰ مارچ ۱۵۳۶ء) کا واقعہ ہے۔ ①

ابراہیم پاشا کے بارہ سالہ دورِ وزارت کے بعد صرف آٹھ برس میں تین وزیر اعظم: ایاز محمد پاشا، لطفی پاشا اور سلیمان پاشا تبدیل ہوئے۔ اس کے بعد ملکہ خرم کے منصوبے کے مطابق اس کا داماد رستم پاشا اس منصب پر آگیا جو اس کی ہر بات پر لبیک کہتا تھا۔

ملکہ نے اسے استعمال کر کے خلیفہ کو ولی عہد شہزادہ مصطفی سے بداعتماد کرنے کی سازش شروع کی۔ حالانکہ ولی عہد اپنی شجاعت اور حسنِ اخلاق کے باعث ینی چری فوج اور عوام وخواص میں بے حد مقبول تھا۔ مگر خلیفہ کو یہاں تک یقین دلا دیا گیا کہ وہ شاہِ ایران کے داعیوں سے متاثر ہے اور خفیہ طور پر شیعہ ہو چکا ہے۔

جب ۱۵۵۳ء (۹۶۰ھ) میں ایران پر حملے کے لیے فوج تیار ہوئی اور شہزادہ مصطفی کو فوج کے ایک حصے کی قیادت سونپی گئی، تو ملکہ خرم کی تدبیر کے مطابق رستم پاشا نے خلیفہ کو یہ یقین دلادیا کہ شہزادہ مصطفی، شاہِ ایران اور ینی چری فوج کی مدد سے تختہ الٹ دینے کی تیاری کر رہا ہے۔

اس شکایت نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور سلیمان عالی شان نے شہزادے کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ یہ ۶ نومبر ۱۵۵۳ء (۷ ذوالقعدہ ۹۶۰ھ) کا واقعہ ہے۔ اس سے پورے ملک میں غم واضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ ینی چری فوج نے شدید احتجاج کر کے اس سانحے کے اہم مجرم رستم پاشا کو معزول کرایا مگر ملکہ کے خلاف کوئی کچھ نہ کرسکا۔

مصطفی کے قتل کے بعد سلطان نے سلیم کی جانشینی کا اعلان کردیا۔ یوں ملکہ خرم کی مراد پوری ہوگئی۔ ②

خرم نے اپنے داماد رستم پاشا کی صدارتِ عظمیٰ سے برطرفی بھی برداشت نہ کی۔ اس نے سلطان کو نئے صدر اعظم احمد پاشا کے خلاف بھڑکانا شروع کیا، نتیجہ یہ نکلا کہ آخر کار سلیمان عالی شان نے احمد پاشا کو بھی قتل کرادیا، یوں رستم پاشا دوبارہ صدر اعظم بن گیا۔ ③

---

① تاریخ الدولة العلیة العثمانیة از فرید بک محامی: ص ۲۳۰. تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۱/ ۳۴۸، ۳۴۹

② تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۱/ ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۶۱

③ تاریخ الدولة العلیة العثمانیة از فرید بک محامی: ص ۲۴۷

چند سال بعد سلطان کے دوسرے بیٹے بایزید کا انجام بھی بڑا دردناک ہوا۔ سلطنت کے ایک بااثر امیر نے بایزید کو یقین دلایا کہ سلیم ولی عہدی کے ہرگز قابل نہیں کیوں کہ وہ عیش وعشرت میں منہمک رہتا ہے۔ اس امیر نے بایزید کو ورغلا کر اس سے کچھ ایسے خطوط لکھوا لیے جن میں نہ صرف سلیم بلکہ سلطان کے لیے بھی نازیبا فقرے تھے۔ سلیمان تک یہ خطوط پہنچے تو آگ بگولا ہوگیا اور بایزید کو اپنے ہاں طلب کیا۔

بایزید سزائے موت کے خوف سے حاضر نہ ہوا۔ جب اس کے خلاف فوج بھیجی گئی تو اس نے اپنے وفادار سپاہیوں کو لے کر مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر اپنے کنبے سمیت ایران فرار ہوگیا اور صفوی شاہ طہماسپ کی پناہ لی۔ تاہم سلیمان نے دباؤ ڈال کر طہماسپ کو مجبور کر دیا کہ وہ بایزید اور اس کے کنبے کو واپس استنبول بھیج دے۔ جب بایزید واپس پہنچا تو اسے اس کے چار بیٹوں: اُورخان، محمود، عبداللہ اور عثمان سمیت پھانسی دے دی گئی۔ یہ ۱۵ محرم ۹۶۹ھ (۲۵ ستمبر ۱۵۶۱ء) کا واقعہ ہے۔[1]

بلاشبہ ان واقعات میں سلیمان عالی شان کے فیصلے غلط تھے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی شخص غیب کا علم نہیں رکھتا۔ حکمران ہو یا کسی ادارے کا منتظم، وہ اپنی معلومات کے مطابق ہی فیصلے کرتا ہے۔ بعض اوقات معلومات غلط ہوتی ہیں، اس لیے ناگزیر طور پر فیصلہ بھی غلط ہو جاتا ہے۔ سلیمان قواعد وضوابط کا سخت پابند تھا، اس کے نزدیک بغاوت ناقابلِ معافی جرم تھا جس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں تھی۔ اس میں وہ کسی کی قطعاً رعایت نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے طور پر انصاف ہی کا ثبوت دیا کہ اپنی اولاد کی بغاوت بھی معاف نہیں کی۔ اگرچہ زمینی حقائق کے لحاظ سے یہ فیصلہ غلط تھا۔

ہم سلیمان عالی شان یا کسی بھی حکمران کے غلط اقدامات کی خواہ مخواہ کوئی توجیہ پیش نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ ان چند واقعات کے سوا اس عظیم خلیفہ کے کردار میں ڈھونڈے سے بھی کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ملتی۔

◆◆◆

[1] تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۲۴۶

سلطان سلیم خان ثانی بن سلیمان اوّل

۹۷۴ھ تا ۹۸۲ھ

(۱۵۶۶ء تا ۱۵۷۴ء)

سلطان سلیم خان ثانی نے اپنے والد سلیمان عالی شان کی وفات کے بعد مسندِ خلافت سنبھالی۔ وہ ۹۳۰ھ (۱۵۲۴ء) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں سلیمان عالی شان کی یہودی النسل روسی ملکہ روکسلین (خرم) تھی جس کی تدابیر اور محلاتی سازشوں کی بدولت سلیم خان باقی بھائیوں سے زیادہ لائق نہ ہونے کے باوجود آخر کار ولی عہد بنا۔

سلیم خان ثانی چھ سال قرامان (لارندہ) چودہ سال صاروخان (مانیسا) اور پانچ سال کوتاہیہ کا والی رہا تھا۔ سلیمان عالی شان نے ولی عہد مصطفیٰ کے قتل کے بعد ۱۵۵۳ء میں اسے ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کی موت کے ۲۳ دن بعد ۱۵ جمادی الاولیٰ ۹۷۴ھ (۳۰ ستمبر ۱۵۶۶ء) کو تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۴۴ سال تھی۔

سلیم خان ثانی اگرچہ عظمت وشوکت میں اپنے باپ کے ہم پلہ نہیں تھا تاہم سابقہ دور کی حکومتی ہیبت وسطوت اب بھی باقی تھی۔ اس دور کی کامیابیاں زیادہ تر صدر اعظم محمد پاشا کے مرہونِ منت تھیں، جس نے بڑی قابلیت، مستعدی اور ہمت کے ساتھ مملکت کی تمام ذمہ داریوں کو انجام دیا۔[1]

یمن کا قضیہ:

شیعوں کے تمام فرقوں میں زیدی معتدل ہیں۔ وہ صحابہ پر تبرا بازی نہیں کرتے اور اپنے ائمہ کی معصومیت کے قائل بھی نہیں۔ یمن میں صدیوں سے زیدی شیعوں کے ائمہ کی حکومت تھی جنہیں اہلِ سنت کے ہاں بھی احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ایک مدت سے یمن قانوناً سلطنتِ عثمانیہ کی باج گزار ریاست تھا۔ چونکہ ان دنوں بحرِ ہند میں پرتگالیوں کی بحری فوج کے تسلط سے یہ خطرہ لاحق ہو چکا تھا کہ کسی بھی وقت وہ یمن پر قبضہ کر کے بحیرۂ احمر اور بحرِ ہند کے مابین ترکوں کا راستہ بند کر دیں گے، اس لیے ضروری تھا کہ یمن کے اہم شہر ترک فوج کی تحویل میں ہوتے۔ مگر یمن کے زیدی ائمہ اپنے ہاں ترکوں کی مداخلت کے حق میں نہیں تھے۔ اس لیے امام المطہر بن شرف الدین نے بغاوت کر دی۔

سلیم ثانی کے حکم سے عثمان پاشا اور سنان پاشا ایک بڑا لشکر لے کر یمن پہنچے۔ ایک طویل مہم جوئی کے بعد زیدی

---

[1] تاریخ الدولة العلية العثمانية از فرید بك محامی: ص ۲۵۵

امام المطہر کی جمعیت کو منتشر کر کے عدن اور صنعاء زیدیوں سے لے لیے گئے۔ امام مطہر کو شمالی یمن سے جنوب کی طرف جانے پر مجبور کر دیا گیا، جہاں وہ قلعہ کوکبان میں مورچہ بند ہو گیا مگر آخر ۱۸ مئی ۱۵۷۰ء (۲۱ مارچ ۹۸۸ھ) کو یہ قلعہ بھی سر کر لیا گیا۔ اگرچہ زیدیوں نے عثمانی افواج کو شدید نقصان پہنچایا تھا مگر امام مطہر کے دینی مقام اور اچھی شہرت کا خیال کرتے ہوئے اسے کوئی گزند نہیں پہنچائی گئی۔ امام مطہر نے خلیفہ کی اطاعت کا معاہدہ کیا اور یہ مہم تکمیل کو پہنچی۔[1]

قبرص کی فتح:

بحیرۂ روم کا اہم جزیرہ قبرص ۸۲۸ھ (۱۴۲۴ء) سے مصر کے ممالیک کی باج گزار ریاست تھا۔ یہاں کے حکام نصرانی تھے جو ممالیک کو خراج ادا کرتے تھے۔ بعد میں یہاں جمہوریہ وینس کا قبضہ ہو گیا، یہ حکومت بھی ممالیک کو خراج ادا کرتے رہے۔ پھر جب سلیم اول کے دور میں عثمانیوں نے مصر فتح کر کے ممالیک کا خاتمہ کر دیا تو وینس کے حکام قبرص کا خراج باب عالی کو ادا کرنے لگے۔ تاہم اس کے بعد جب بھی وینس سے جنگ ہوئی تو قبرص کا مسئلہ دونوں ممالک کے درمیان تنازعے کا باعث بنتا رہا۔ اس لیے خلیفہ سلیم ثانی نے ضروری سمجھا کہ قبرص پر باقاعدہ قبضہ کر لیا جائے۔

سلیم ثانی کے حکم سے قرہ مصطفیٰ پاشا کی قیادت میں ۹ ذوالحجہ ۹۷۷ھ (۱۵ مئی ۱۵۷۰ء) کو ایک لاکھ سپاہی جن میں ۶۰ ہزار پیادے تھے، استنبول سے قبرص روانہ ہوئے۔ ترک بحری بیڑا ۱۷ محرم ۹۷۸ھ (یکم جولائی ۱۵۷۰ء) کو قبرص کے ساحل "لیماسول" پر لنگر انداز ہوا۔ ۳۰ محرم (۳ جولائی) کو لارنکا (ترلا) اور ۵ صفر کو کیرنا (سیرینیا) پر قبضہ کر لیا گیا۔

ایک ہفتے کے محاصرے کے بعد ۸ ربیع الآخر (۹ ستمبر) کو جزیرے کا پایۂ تخت "لفسوکا" (نوشکیا) بھی فتح کر لیا گیا۔ فیصلہ کن معرکے میں قبرص کا حاکم "نکولاو دینڈلو" مارا گیا۔ مضبوط قلعہ بند شہر "ماگوسا" (فاماگوستا) مقابلے میں ہمارا مگر طویل محاصرے کے بعد ۱۰ ربیع الآخر ۹۷۹ھ (یکم ستمبر ۱۵۷۱ء) کو اسے بھی سر کر لیا گیا۔ مجموعی طور پر اس لشکر نے تیرہ ماہ تک اس جزیرے میں جنگیں لڑیں۔ آخر پورا جزیرہ فتح کر لیا گیا۔ وہاں خلافتِ عثمانیہ کے امیر مصطفیٰ پاشا کو امیر مقرر کر دیا گیا۔ دو صدیوں (۱۸۷۷ء) تک یہ جزیرہ ترکوں کے پاس رہا۔[2]

انڈونیشیا کا قضیہ:

انڈونیشیا کے جزیرہ سماٹرا میں "آچے" نامی ایک مسلم ریاست ۱۵۱۴ء (۹۲۰ھ) سے ۱۹۰۳ء (۱۳۲۱ھ) تک قائم رہی، جو سماٹرا کے شمال اور ملیشیا کے بڑے رقبے پر مشتمل تھی۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے استنبول سے پرتگالیوں کے خلاف مدد مانگی تھی۔ انڈونیشیا کے علاوہ سری لنکا اور بنگال کے بعض ہندو راجاؤں نے بھی باب عالی سے جدید اسلحہ طلب کیا تھا تاکہ پرتگالیوں کی مار دھاڑ سے دفاع کیا جا سکے۔

---

① تاريخ الدولة العثمانية از يلماز اوز تونا: ۱/ ۳۶۴

② تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۲۵۵، ۲۵۶

بحر ہند اور مشرق بعید کے یہ ممالک اور جزائر بہت طویل مسافت پر تھے، ان ممالک تک رسائی کا راستہ مختصر کرنے کے لیے پہلے عثمانی خلیفہ سلیم یاوز نے نہر سوئز نکال کر بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر کو ملانے کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ کہیں بھی خشکی کا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہ پڑے اور عثمانی بحریہ استنبول سے سیدھا بحر ہند کے آخر تک جا پہنچے۔

سلیم اول کو اس منصوبے کے آغاز کی مہلت نہ ملی، سلیمان عالی شان نے اپنے وزیر اعظم سمیز پاشا کو نہر کی کھدائی کے لیے مناسب جگہ کا نقشہ بنانے کا حکم دے دیا تھا مگر خود عثمانی وزراء میں اس بارے میں اختلاف رائے ہو گیا۔ سلیم ثانی کے دور میں بھی بعض امراء کی طرف سے یہ منصوبہ شروع کرنے پر اصرار اور بعض کی جانب سے تحفظات کا اظہار بھی جاری رہا۔ اس لیے عملی طور پر کام شروع نہ ہو سکا۔

بہرکیف اس منصوبے سے قطع نظر سلیمان عالی شان نے جدید توپوں اور بحری بیڑے کے ساتھ اپنے بہترین جرنیل ریاست آچے بھیجے جس سے وہاں کے حکمران، باب عالی کے بے حد مشکور ہوئے۔

سلیم ثانی کے دور میں کئی سو بحری سپاہیوں، رضا کاروں اور ۲۲ جہازوں پر مشتمل ایک بڑا بیڑہ انڈونیشیا بھیجا گیا۔ اس وقت تک وہاں حسین شاہ برسر اقتدار تھا جس نے ۱۵۶۸ء (۹۷۵ھ) سے ۱۵۷۵ء (۹۸۳ھ) تک حکومت کی۔ اس مہم کے ذریعے یہ علاقے باقاعدہ خلافت کے سائے میں آ گئے۔ عثمانی بحریہ کے افسران کی ہمت وشجاعت نے ایک مدت تک انڈونیشیا کو استعماری طاقتوں سے محفوظ رکھا۔ ترک افسران اور سپاہی وہیں سکونت پذیر ہوئے اور مقامی قبائل سے ان کے رشتے ناتے بھی ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ساٹرا کے باسیوں کی بہت بڑی تعداد ان ترکوں کی اولاد ہے۔[1]

ماسکو کی فتح:

سلیم ثانی کے دور کا سب سے اہم واقعہ ماسکو کی فتح ہے۔ یہ کارنامہ باب عالی کی باج گزار ریاست کریمیا کے خانوں کے ہاتھوں انجام پایا۔ کریمیا کے خان جو تاتاری نسل سے تھے اور "گرائی" کہلاتے تھے، زاران روس کی چیرہ دستیوں کا سامنا کرتے رہتے تھے۔ ان کی کمر توڑنے کے لیے آخر کریمیا کے خان نے ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ماسکو کی طرف پیش قدمی کی۔ اس حملے میں آٹھ ہزار روسی مارے گئے اور باقی فوج فرار ہو گئی۔

۷ ذوالحجہ ۹۷۹ھ (۲۴ مئی ۱۵۷۱ء) کو خان کریمیا اپنے جوانوں کے ساتھ ماسکو میں داخل ہو گیا، مقامی روسی فوج مزاحمت نہ کر سکی۔ خان کریمیا وہاں سے پندرہ ہزار قیدیوں کے ساتھ واپس ہوا۔ یوں روسیوں کی ہوس ملک گیری پر شدید ضرب لگی جبکہ خان کریمیا کو اس شاندار کارنامے پر "تخت آلان" (تخت حاصل کرنے والا) کا لقب ملا۔

اگلے سال خان کریمیا نے روس پر دوبارہ یلغار کی اور دریائے وولگا کے معاون دریا "اوکا" تک پہنچ گیا۔ زار روس آئیون تیس ہزار گھڑ سوار اور چھ ہزار پیادے لے کر مقابلے پر نکلا مگر اسے شکست ہوئی اور وہ بمشکل جان بچا کر بھاگا۔

---

[1] تاریخ الدولة العثمانية از یلماز اوز تونا: ۱/۳۶۴ تا ۳۶۶

زار کی ملکہ زارینہ کے دو بھائی جنگ میں مارے گئے۔ کریملن کے قصر شاہی میں مسلمانوں کو زار کا بیش بہا خزانہ ہاتھ آگیا۔ آخر روسیوں نے ساٹھ ہزار طلائی لیرے سالانہ خراج کے معاہدے پر اپنی جان بچائی۔ یوں اس لڑائی سے روس کے حکمران خاندان "رورک" کی عزت خاک میں مل گئی۔ سلطان سلیم ثانی نے خان کریمیا کی ان فتوحات سے خوش ہو کر اسے مبارک باد کے پیغام کے ساتھ مرصع شمشیر اور دیگر شاہی اعزازات سے نوازا۔

دیگر اہم واقعات:

سلیم خان ثانی کے دور کے مزید اہم واقعات یہ ہیں:

1. ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء)...... باب عالی نے ایک معاہدے کے تحت سالانہ جزیے کے بدلے ہنگری کا علاقہ آسٹریا کی تحویل میں دے دیا۔
2. ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء)...... شاہ فرانس چارلس نہم کے ساتھ صلح کی تجدید ہوئی۔ فرانس کو اجازت مل گئی کہ وہ شام میں کیتھولک نصرانیوں سے رابطہ رکھ سکے اور ان کے وفود باہم ادھر سے ادھر آجا سکیں۔
3. ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء)...... اسپین کے سپہ سالار ڈون جان نے تیونس پر قبضہ کر کے بوحفص کے مولائے حسن کو ایک بار پھر کٹھ پتلی حکمران بنا دیا۔ وہاں تعینات عثمانی فوج اپنی عددی قلت کی وجہ سے اس وقت لڑے بغیر پسپا ہوگئی۔ تاہم آٹھ ماہ بعد سنان پاشا کی قیادت میں عثمانیوں نے دوبارہ حملہ کیا اور تیونس کو بازیاب کرالیا۔
4. ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء)...... بغداد میں بغاوت ہوئی مگر اسے کچل دیا گیا۔[1]

جزیرہ کریٹ کی مہم۔ عثمانی بحریہ کی شکست:

۹۷۹ھ (۱۵۷۱ء) میں ترک بحریہ بحیرۂ روم کے جزیرہ کریٹ پر حملہ آور ہوئی۔ ساتھ ہی اس نے بحیرہ ایڈریاٹک میں "دلنسیو" اور "انتیاری" کے ساحلی شہر فتح کر لیے۔ روما کے پوپ نے اٹلی کو عثمانیوں کے خطرے سے بچانے کے لیے، جمہوریہ وینس اور اسپین سے مل کر جنگ کی تیاری شروع کردی۔

وینس اور اٹلی میں سرگرم سلطنتِ عثمانیہ کے جاسوسوں نے بروقت یہ خبر باب عالی تک پہنچا دی، جس پر ترکوں کے بحری جہاز حریف کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے متحرک ہوگئے۔

باب عالی کی جانب سے برتو پاشا اور موذن زادہ علی پاشا کو اس مہم کا امیر بنا کر حتمی حکم دے دیا گیا کہ انہیں جہاں بھی یورپی بیڑا دکھائی دے، اسے فنا کر دیں۔ مگر یہ دونوں بڑی فوج کے جرنیل تھے، انہیں بحری جنگوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

وہ اپنے بیڑے کو خلیج پاتراس میں یونان کی بندرگاہ "اینِ بختی" (Lepanto) لے گئے جو عثمانیوں کے قبضے میں تھی۔ یہاں یہ جہاز ادھر ادھر بکھر کر ایک مدت تک گشت کرتے رہے۔ اگرچہ ان جہازوں کی تعداد کم نہ تھی مگر مسلسل

---

[1] التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/۱۲۳ تا ۱۲۵

استعمال کی وجہ سے انہیں مرمت کی ضرورت تھی۔ برتو پاشا اور مؤذن پاشا اس پہلو کو نہ دیکھ سکے۔

اس دوران پوپ نے اٹلی، وینس، مالٹا اور اسپین کے اتحاد کے ساتھ ۳۲۰ جہازوں کا ایک مشترکہ بیڑا مرتب کرلیا تھا جو شاہِ اسپین فلپ دوئم کے بھائی ڈان جان چارلس کی قیادت میں بندرگاہ اینبختی کی طرف آرہا تھا۔ مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ ڈان جان، شاہ کارلوس دوئم کی ناجائز اولاد تھا۔

حریف کے قریب آنے کی اطلاع پاکر برتو پاشا اور مؤذن زادہ نے، انیس (۱۹) اعلیٰ افسران کی مجلسِ مشاورت طلب کی اور انہیں آگاہ کیا کہ ہم ساحل کے قریب رہیں گے اور دشمن پر یک بارگی حملہ کردیں گے۔

بحری جنگ کے ماہر افسران نے اس فیصلے سے اختلاف کیا خصوصاً علی بیگ اولوج نامی کہنہ مشق افسر نے اس حکمتِ عملی کو بالکل غلط کہا مگر برتو پاشا اور مؤذن زادہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔

یہ دیکھ کر بحری افسران نے کہا کہ اگر ساحل پر رہ کر لڑنا ہے تو ہمیں حملے میں پہل نہیں کرنی چاہیے بلکہ قلعے پر نصب توپوں کے ذریعے گولہ باری کرکے پہلے ان کے بیڑے کو تتر بتر کرنا اور پھر ان کا تعاقب کرنا بہتر ہوگا۔

مگر دونوں جرنیلوں نے اس حکمتِ عملی کو اضاعتِ وقت سمجھا۔ بحری افسران نے آخری صورت یہ بتائی کہ ہمیں ساحل چھوڑ کر کھلے سمندر میں نکل جانا چاہیے۔ مگر برتو پاشا نے نہایت سختی کے ساتھ جواب دیا:

''ساحل سے دور جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس بیڑے کا مسئول میں ہوں۔''

یہ بات اس نے بار بار دہرائی اور ڈان چارلس کا مذاق اڑا کر کہا: ''اس کافر کتے سے بھلا میں کیوں ڈروں؟''

پھر اس نے افسران کو ڈانٹتے ہوئے کہا: ''مجھے نہ اپنے سر کی کوئی پرواہ ہے نہ منصب کی۔ خلیفہ کا حکم نامہ صاف بتا رہا ہے کہ حملہ کردیا جائے۔ اگر ہمارے ہر جہاز سے پانچ دس آدمی مارے جائیں تو کیا حرج ہے۔ کیا اسلامی غیرت ختم ہوگئی ہے؟ کیا ہم خلیفہ کی عزت نہیں بچائیں گے؟''

اس کی ڈانٹ کے سامنے سب نے چپ سادھ لی۔ صرف علی بیگ اولوج نے احتجاج کرتے ہوئے کہا:

''کہاں ہیں وہ لوگ جو خیر الدین پاشا کی قیادت میں لڑتے رہے؟ وہ چپ کیوں ہیں؟ کیا بحری جنگ بھی ساحلوں پر بھی لڑی جاتی ہے؟'' مگر اس کی پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ①

آخر برتو پاشا نے بحری بیڑے کو مرتب کیا اور یورپی بیڑے پر حملہ کردیا مگر عثمانی یہ جنگ کسی حکمتِ عملی کے بغیر لڑ رہے تھے۔ اگرچہ سپاہی جان پر کھیل گئے مگر یورپی کپتان کی مہارت کے آگے، ان کی شجاعت کام نہ آسکی۔

علی بیگ اولوج، جو دائیں بازو کا امیر تھا، اپنی حکمتِ عملی کے ساتھ لڑا اور اس نے اپنے ۴۲ جہازوں میں سے ایک بھی ضائع نہیں ہونے دیا اور اپنے مقابل آنے والے مالٹا کے بیڑے کو اس کے کمانڈر سمیت غرق کردیا۔

مگر اس دوران عثمانی بحریہ کے قلب اور بائیں بازو کو دشمن نے تہس نہس کردیا۔ ترکوں کو پہلی بار شکستِ فاش ہوئی،

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۳۷۲ تا ۳۷۴

ان کے ۱۳۲ جہاز غرق یا ناکارہ ہو گئے۔ ۶۰ جہاز ۱۱۷ بڑی اور ۲۵۶ چھوٹی توپوں سمیت صحیح سالم دشمن کے ہاتھ لگ گئے۔ دشمن نے تیس ہزار نصرانی قیدی بھی آزاد کرا لیے۔

ترکوں کے ساڑھے تین ہزار سپاہی قید جبکہ سولہ ہزار سے اوپر شہید ہوئے۔ مجموعی طور پر بیس ہزار سپاہیوں کا نقصان ہوا۔ مؤذن زادہ علی پاشا، اپنے ایک بیٹے سمیت شہید ہوا، اس کا دوسرا بیٹا گرفتار ہو گیا۔ برتو پاشا کا جہاز بھی غرق ہو گیا۔ علی بیک بقیہ جہازوں کو لے کر بمشکل معرکہ کارزار سے نکل پایا۔ نصرانیوں کا نقصان بھی کم نہ تھا۔ ان کے ۸ ہزار سپاہی مارے گئے جبکہ بیس ہزار زخمی ہوئے۔ ان کا کوئی جہاز ایسا نہ تھا جسے جزوی طور پر نقصان نہ پہنچا ہو۔①

پوپ نے اس فتح پر جشن منایا اور ڈون جان کو اس کارنامے پر اعزازات سے نوازا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خلافت عثمانیہ، یورپ کے لیے محض ایک سیاسی مسئلہ نہیں تھا بلکہ وہ اسے نقصان پہنچانا بلکہ یورپ کے مذہبی پیشوا اسے ختم کرنا ایک مذہبی ذمہ داری سمجھتے تھے۔②

جنگِ کریٹ میں شکست کے اثرات:

ترکوں کی اس شکست میں جانی و مالی ضرر سے کہیں زیادہ خسارہ، عزت و شہرت کا تھا۔ اب تک یہ مشہور تھا کہ دولتِ عثمانیہ کو کبھی مغلوب نہیں کیا جا سکتا مگر اب یورپ نے جان لیا کہ عثمانی ناقابلِ شکست نہیں۔ اسی لیے اس لڑائی کو خلافتِ عثمانیہ کے دورِ انحطاط کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔

اگر شکست کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو قیادت کی ناتجربہ کاری اور اپنی غلط رائے پر اصرار ہی اس کی بڑی وجہ تھی مگر اس کے ساتھ فوج کے اخلاق و کردار کا جائزہ لینے سے کچھ اور وجوہ بھی سامنے آجاتی ہیں مثلاً اس دور میں، فوج میں شراب نوشی کا مرض پیدا ہو چکا تھا، خصوصاً ینی چری دستوں میں یہ روگ عام ہو رہا تھا۔ ایسی چیزیں بڑی بڑی سلطنتوں کو کھوکھلا کر کے رہتی ہیں۔③

ینی چری کا زوال سلطان مراد رابع کے دور سے سترہویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا۔ اس وقت اس فوج سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد اتنی ہو گئی کہ انہی کی آل اولاد کو "ینی چری" میں بھرتی کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔④

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۳۷۱ تا ۳۷۴
② تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۵۷ ③ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از محامی: ص ۲۵۹
فائدہ: ینی چری کے افسر اعلیٰ کو "آغاسی" کہا جاتا تھا، نائب سپہ سالار "سکبان باشی" کہلاتا تھا۔ (تاریخ عثمانی: ۱/ ۵۷۶)
بعد میں جب ینی چری میں چیدہ نوجوانوں کی جگہ عام بھرتی ہونے لگی اور اس کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی تو اس کا نظم و ضبط بگڑ گیا۔ ایسے میں بادشاہ کے حمایت یافتگان کے الگ الگ عہدے یا خطاب بھی بہت اہمیت اختیار کر گئے مثلاً شوربجی باشی (افسر مطبخ) استا آغاسی (رئیس آب رسانی)، اودہ باشی (افسر خیمہ شاہی)۔ تمام نمود و رسوم اتنی اہمیت اختیار کر گئیں کہ دورِ زوال کے ینی چری جنگ کے دوران اپنے پرچم کی طرح اپنی دیگوں کی حفاظت کرتے تھے اور ان کے نزدیک جنگ میں دیگ کا گر جانا اجتماعی تذلیل کے مترادف تھا۔ اسی لیے ینی چری جب اپنے حکمرانوں کے خلاف غصے کا اظہار کرتے تو احتجاج کی انتہا دکھانے کے لیے دیگیں الٹ دیا کرتے تھے۔ (تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۱۲۲، ۱۲۳)
④ فی اصول التاریخ العثمانی از احمد عبدالرحیم مصطفیٰ: ص ۴۳، ۴۴ ؛ دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۱/ ۲۸

یہ تبدیلی ینی چری کے لیے سخت مضر ثابت ہوئی، خصوصاً اس لیے کہ اس وقت کمزور بادشاہوں کا دور شروع ہو گیا تھا جو ینی چری کو پوری طرح قابو نہیں کر پا رہے تھے۔ پہلے ینی چری فقط سلطان کے تابع تھے۔ نہ کوئی اور ان پر حکم چلا سکتا تھا اور نہ ہی وہ ملکی معاملات میں دخل دے سکتے تھے۔ مگر اب ان کا مختلف امراء اور وزراء سے بھی ربط و ضبط قائم ہو گیا اور وہ خود بھی ملکی معاملات میں مداخلت کرنے لگے جس کا نتیجہ سخت سیاسی و عسکری انتشار اور بغاوتوں کی شکل میں نکلا۔[1]

شکست کی تلافی کی کوشش:

صدر اعظم محمد پاشا نے اس شکست کی تلافی کرنے کے لیے، جنگ میں ضائع ہونے والے جہازوں کی جگہ بلا تاخیر نئے جہاز تیار کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ جس وقت نصرانی، اپنی فتح کی خوشی میں مریم و مسیح کی مورتیاں بنا رہے تھے ترکوں نے سردی کے چھ مہینوں میں دن رات کام کر کے ۲۵۰ جہازوں پر مشتمل بالکل نیا بحری بیڑا ترتیب دیا اور موسم گرما آتے ہی اسے سمندر میں اتار دیا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اس شکست نے خلافت عثمانیہ کی طاقت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔[2]

سلیم ثانی کی وفات:

۸ سال ۵ ماہ حکومت کر کے ۲۷ شعبان ۹۸۲ھ (۱۲ دسمبر ۱۵۷۴ء) کو دنیا سے رخصت ہو گیا۔ عمر ۵۲ سال تھی۔ اس کے چھ بیٹے: مراد، محمد، سلیمان، مصطفیٰ، جہانگیر اور عبداللہ اس کے وارث تھے۔[3]

کہا جاتا ہے کہ سلیم ثانی، عثمانی سلاطین میں سے پہلا فرد تھا جو استنبول میں پیدا ہوا تھا۔ اسی طرح عثمانی سلاطین میں سے وہ سب سے پہلا شخص تھا جس کی وفات استنبول میں ہوئی۔ وہ میانہ قامت تھا۔ جنگ اور شکار کا ماہر تھا۔ تیر اندازی کا شوقین تھا اور اپنے ہاتھ سے بہترین کمانیں تیار کرتا تھا۔[4]

◆◆◆

---

① التاريخ الإسلامي از محمود شاكر: ٨/ ٦٤
② تاريخ الدولة العثمانية، از يلماز اوزتونا: ١/ ٣٧٥
③ تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ٢٥٨
④ تاريخ الدولة العثمانية، از يلماز: ١/ ٣٨٢

خلافتِ عثمانیہ

دوسرا مرحلہ

دورِ زوال

مراد ثالث تا احمد ثالث

۹۸۲ھ تا ۱۱۴۳ھ

(۱۵۷۴ء تا ۱۷۳۰ء)

۱۶۱ برس

سلطان مراد ثالث بن سلیم ثانی

۹۸۲ھ تا ۱۰۰۳ھ
(۱۵۷۴ء تا ۱۵۹۵ء)

خلیفہ سلیم ثانی کی موت کے بعد اس کا بیٹا مراد ثالث استنبول کی مسندِ خلافت پر متمکن ہوا۔ وہ ۹۵۳ھ (۱۵۴۶ء) میں پیدا ہوا تھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۲۹ سال تھی۔ وہ علوم وفنون کا ماہر اور ترکی، فارسی اور عربی پر حاوی تھا۔[1]

مے نوشی پر پابندی لگانے کا مسئلہ:

مُراد ثالث بذاتِ خود عیش وعشرت سے متنفر اور اچھے کردار کا حامل تھا لہٰذا تخت نشین ہوتے ہی اس نے فوج میں شراب نوشی کی لت ختم کرنے کی کوشش کی جو اس کے باپ کے دور میں عام ہوئی تھی۔ مگر ینی چری فوج نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا اور ہنگامہ کر کے اس قدر شراب نوشی کی منظوری لے لی جو عقل کو مغلوب نہ کرے۔[2]

اس صورتحال سے ثابت ہوتا ہے عثمانی فوج سے وہ پختہ دینی مزاج رخصت ہو رہا تھا جس نے چند صدیاں پہلے اسے ایمان، تقویٰ اور جہادی صفات سے آراستہ کر کے ایک ناقابلِ شکست طاقت بنا ڈالا تھا۔ اس سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ اربابِ حل وعقد کی قوتِ فیصلہ کمزور تھی یا ان کی طبیعت میں تساہل تھا۔ تبھی تو مے نوشی جیسے گناہِ کبیرہ کی قرارِ واقعی روک تھام نہیں کی گئی اور فوج کے لیے کسی درجے میں اس کی گنجائش مان لی گئی۔

پانچ بھائیوں کا قتل:

مراد ثالث کے دور کا سب سے افسوس ناک واقعہ یہ ہوا کہ اس نے تخت نشینی کے بعد اپنے پانچ بھائیوں (یعنی سلطان سلیم ثانی کے بیٹوں): مصطفیٰ، عثمان، سلیمان اور دو دیگر شہزادوں کو قتل کرا دیا۔[3]

نہیں کہا جا سکتا کہ ایسے فیصلوں کے پیچھے کیا کچھ سازشیں کارفرما تھیں اور سلطان کے ذہن میں کیا چل رہا تھا مگر اس فعل کو کسی بھی طرح جائز نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے اقدامات سے سلطنت کی دینی ساکھ اور اسلامی وقار کو شدید نقصان پہنچا۔

---

① الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث از اسماعيل ياغي: ص ۱۰۰، ط مكتبة العبيكان
② تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۲۵۹
③ تاريخ عثماني از حقي: ۴۹/۲؛ تاريخ الدولة العلية از فريد بك: ص ۲۵۹

خواتین کا تسلط اور عہدوں کے لیے رشوت لینے کا آغاز:

مؤرخ منجم باشی کے مطابق مراد خان ثالث بیگمات اور کنیزوں میں گھرا رہتا تھا۔[1]

اکثر اوقات حرم سرا میں گزارتا تھا۔ اس کی چالیس باندیاں تھیں جن سے اس کے ۱۹ لڑکے اور ۲۶ لڑکیاں تھیں۔[2]

نیز منجم باشی کے بقول وہ مال جمع کرنے کا حریص تھا۔ وہ پہلا عثمانی سلطان تھا جو رشوت لیا کرتا تھا۔[3]

رشوت سے مراد یہ ہے کہ اُمرائے سلطنت بڑا عہدہ پانے کے لیے بھاری رقم نذر کیا کرتے تھے اور سلاطین یہ رقم قبول کر کے خوش ہوتے اور انہیں بڑا عہدہ دے دیتے تھے۔ چنانچہ نااہل افسران کو روز بروز ترقیاں ملنے لگیں۔

سلطان کے اس کردار کا اثر دوسروں پر بھی پڑ رہا تھا۔ چنانچہ ایوانِ سلطنت میں رشوت لینا دینا عام ہو گیا۔ مؤرخ اوزون حقی کا بیان ہے کہ اس زمانے میں چالاک قسم کے رئیس والدۂ سلطان، صدرِ اعظم یا سلطان پر اثر انداز کسی بھی شخص کو رشوت دے کر بڑے بڑے عہدے حاصل کر لیتے تھے کیوں کہ عہدے داروں کا انتخاب عموماً انہی چند شخصیات کی رائے سے ہوتا تھا۔ رشوت کے ذریعے عہدے لینے کے سبب ایسے وزراء و اُمراء کی تعداد حد سے بڑھ گئی جو کاروبارِ سلطنت میں کوئی مدد نہیں کر رہے تھے۔ سنان پاشا اپنی ثروت اور دولت کے زور پر پانچ بار صدرِ اعظم مقرر ہوا۔ پہلی بار کے سوا، چاروں بار وہ بھاری رقم نذر کر کے یہ عہدہ لینے میں کامیاب ہوا۔ نصوح پاشا نے ایک بار سلطان کی خدمت میں عریضہ بھیجا تھا کہ اگر اُسے نیابتِ سلطانی عطا کر دی جائے تو وہ چالیس ہزار طلائی سکے پیش کرے گا اور ان کے علاوہ افواج کو ہر قسم کا اسلحہ اور خوراک و رسد بھیجنے کا ذمہ لے گا۔[4]

بولونیا پر تسلط۔ آسٹریا سے معاہدہ:

بولونیا[5] کا حکمران ہنری ڈی فالوا اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر فرانس چلا گیا تھا۔ مراد ثالث کو یہ خبر ملی تو اس نے بولونیا کے عمائد کو مشورہ دیا کہ وہ ٹرانسلفانیا کے حکمران کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیں جو خلافتِ عثمانیہ کا باج گزار تھا۔ اس طرح ۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) میں بولونیا بھی خلافتِ عثمانیہ کے تحت آ گیا۔

آسٹریا سے غیر اعلانیہ سرحدی جھڑپوں کے بعد ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) میں ۸ سالہ صلح کا معاہدہ ہو گیا۔ اسی معاہدے میں آسٹریا نے بولونیا اور ٹرانسلفانیا کو خلافتِ عثمانیہ کے ماتحت مان لیا۔[6]

---

① جامع الدول از منجم باشی: ص ۳۳۷

② جامع الدول از منجم باشی: ص ۳۳۶

بعض سوشل میڈیائی دانشوراسے یوں مشہور کر رہے ہیں کہ سلطان کی ۴۰ بیویاں تھیں، حالاں کہ یہاں بیگمات کا نہیں باندیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔

③ جامع الدول از منجم باشی: ص ۳۳۷

④ تاریخ عثمانی از اوزون حقی: ۱۳۸/۳

⑤ بولونیا ایک طرف ترکی اور روس کے درمیان اور دوسری طرف یورپ اور روسی سرحدوں کے درمیان حائل ایک اہم ریاست تھی۔

⑥ الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث از اسماعیل یاغی: ص ۱۰۰، ط العبیکان

فرانس، وینس اور برطانیہ سے بہتر مراسم

فرانس اور وینس کے لیے مراعات بڑھادی گئیں۔ وینس کو مستثنیٰ کر کے تمام غیر ملکی وفود کے لیے فرانسیسی پرچم اور فرانسیسی سفیر کی سربراہی لازمی قرار دے دی گئی۔ برطانیہ کی ملکہ ایلزبتھ نے بھی باب عالی سے مراسم پیدا کیے اور برطانوی سفارتی وفود اور تاجر استنبول آنے جانے لگے۔[1]

صفویوں سے معرکے:

۱۵۷۶ء (۹۸۴ھ) میں دولتِ صفویہ کا حکمران طہماسپ مر گیا اس کا جانشین حیدر تخت نشینی کے فوراً بعد قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسماعیل بن طہماسپ تخت نشین ہوا مگر اگلے سال (۹۸۵ھ) کے دوران اُسے زہر دے کر مار دیا گیا۔

پھر اس کا بھائی خدابندہ حکمران بن گیا مگر ایرانی عمائد اس پر متفق نہ ہوئے۔ یوں وہاں سخت سیاسی بحران پیدا ہو گیا۔

صفویوں کی صفوں میں شدید انتشار دیکھ کر عثمانیوں نے موقع غنیمت جانا اور اپنی فوجیں دولتِ صفویہ کے شمالی صوبے گرجستان میں داخل کر کے ۱۵۷۷ء (۹۸۵ھ) میں اس کا مرکزی شہر تفلیس فتح کر لیا۔ اگلے سال عثمانی افواج شمالی آذربائی جان کے شہر شروان میں داخل ہو گئیں۔ ۱۵۸۳ء (۹۹۱ھ) میں وہ داغستان پر بھی قابض ہو گئیں۔[2]

خانِ تاتار سے معرکہ

۱۵۸۴ء (۹۹۲ھ) میں ترک جرنیل عثمان پاشا نے ناقابلِ بیان مشقت جھیل کر قفقاز کا کوہستان عبور کیا تاکہ کریمیا کے کرائی حکمران ”خان“ کو اس بات پر سرزنش کی جاسکے کہ اس نے خلافت کا ماتحت ہوتے ہوئے بھی صفویوں سے جنگ کے دوران عثمانیوں کی مدد سے کیوں احتراز کیا۔

خانِ کریمیا نے بہت بڑی فوج جمع کر کے عثمان خان کو گھیر لیا قریب تھا کہ وہ اسے کچل ڈالتا کہ عثمان خان نے اس کے بھائی کو حکومت کی امید دلا کر، خان کو زہر دلوادیا۔ خان کے مرتے ہی اس کی فوج منتشر ہو گئی۔ نئے خان نے خلافت کی اطاعت کا عہد کیا۔ یوں عثمان پاشا موت کے منہ سے فتح مند ہو کر استنبول لوٹا۔ اس کارنامے پر خلیفہ کی نگاہ میں اس کا مرتبہ اتنا بڑھا کہ اسے صدرِ اعظم مقرر کر دیا گیا۔[3]

صفویوں کو شکست۔ تبریز کی فتح:

۱۵۸۴ء (۹۹۳ھ) میں عثمان پاشا استنبول سے دو لاکھ ساٹھ ہزار سپاہیوں کو لے کر شمالی ایران پر حملہ آور ہوا۔ اس نے صفویوں کے سپہ سالار حمزہ مرزا کو شکست دے کر تبریز پر بھی قبضہ کر لیا۔ آخر مارچ ۱۵۸۵ء (ربیع الاول ۹۹۳ھ) میں دولتِ صفویہ نے گرجستان، شیروان، لورستان، آذربائی جان کے ایک حصے اور تبریز سے دست بردار ہوتے ہوئے

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۶۰

② تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۶۱

③ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از محامی: ص ۲۶۳

خلافتِ عثمانیہ سے صلح کر لی۔[1]

اسپین سے پہلی بار جنگ بندی:

ترک بحری بیڑے نے اسپینی بحریہ کے مقابلے میں بحیرۂ روم پر اپنی بالادستی برقرار رکھی۔ آخر اسپین نے پہلی بار بابِ عالی سے صلح کی داغ بیل ڈالی اور پانچ سال کے لیے سرکاری طور پر جنگ بندی ہو گئی، مگر اس کے باوجود، دونوں ملکوں کے رضاکار جنگجوؤں کے مابین سمندری جھڑپیں ہوتی رہیں۔[2]

افریقہ کی مہمات:

۱۵۷۸ء (۹۸۵ھ) میں مراکش کے ایک باغی گروہ نے پرتگال کی مدد سے سلطانِ مراکش کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ اس کی درخواست پر خلیفہ نے طرابلس کی فوج کو مراکش بھیجا جس نے طنجہ کے جنوب میں پرتگالیوں اور باغیوں سے ٹکرا کر انہیں تتر بتر کیا اور سلطانِ مراکش کا اقتدار بحال کر دیا۔ یوں مراکش اور شمالی افریقہ مکمل طور پر دولتِ عثمانیہ کے ماتحت آ گیا۔

اسی سال بورنو کے حکمران سلطان ادریس ثالث کو افریقہ کی بت پرست قوموں سے لڑنا پڑا۔ اس نے اپنے سفیر استنبول بھیج کر اطاعت کے پیمان کو مضبوط کیا، جواب میں بابِ عالی سے اسے جدید قسم کی توپیں بھیجی گئیں تاکہ انہیں جہاد میں استعمال کیا جا سکے۔[3]

کینیا کے جنوب مشرقی ساحل پر واقع ریاست "ممباسہ" پرتگالیوں کے حملوں کی زد میں رہتی تھی۔ ۱۵۹۰ء (۹۹۹ھ) میں اپنی حفاظت کے لیے وہ بھی خلافتِ عثمانیہ کے تحت آ گئی جس کے بعد ترکوں کے بحری بیڑے کو بحرِ اوقیانوس اور بحرِ ہند میں کھلا راستہ مل گیا۔ تاہم صرف تین سال بعد ۱۵۹۳ء (۱۰۰۱ھ) میں پرتگالیوں نے اسے ترکوں سے چھین کر اپنے قبضے میں لے لیا۔

مراکش کی دولتِ سعدیہ (ریاست فاس) کے حکمران مولائے احمد المنصور ثانی نے اپنی ریاست کا سلطنتِ عثمانیہ سے الحاق کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ طے ہوا کہ ریاستِ فاس کے خارجی معاملات بابِ عالی کے سپرد ہوں گے۔ فاس کا خراج استنبول جائے گا، ریاست میں سلطنتِ عثمانیہ کا نظام اور قانون نافذ ہو گا۔ البتہ اندرونی معاملات میں مولائے احمد خود مختار رہے گا۔ اگرچہ الجزائر کے عثمانی حکام، فاس کے اندرونی معاملات میں بھی اختیار حاصل کرنا چاہتے تھے مگر مولائے احمد اس پر تیار نہ ہوا۔[4]

---

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲٦٤

[2] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲٦۱

[3] ریاست بورنو پر ۱۹۰۰ء میں فرانسیسی اور برطانوی افواج نے قبضہ کر لیا۔

[4] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲٦۰؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱/ ۳۸۳ تا ۳۸٦
مولائے احمد کا دورِ حکومت ۹۸٦ھ سے ۱۰۱۲ھ تک (۱۵۷۸ء تا ۱۶۰۳ء) رہا۔ فاس کا سلطنتِ عثمانیہ سے الحاق نصف صدی سے زائد مدت تک رہا۔ مولائے احمد کے پوتوں کے دور میں ریاستِ فاس اور خلافتِ عثمانیہ میں فاصلے بڑھتے گئے اور ۱٦۵۸ء (۱۰٦۹ھ) میں یہ ریاست دوبارہ خود مختار ہو گئی۔

یہودیوں کی سازش:

مدتوں سے یہودی اپنی ایک خود مختار مملکت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کے ایک پیشوا "ابراہام" نے مراد ثالث کے دور میں صحرائے سینا کو یہودیوں کا مرکز بنانے کی سازش ترتیب دی اور خلیج سوئز کے مشرقی کنارے پر واقع شہر "طور" کو منتخب کیا تاکہ اس بندرگاہ کی وساطت سے پوری دنیا سے تجارتی روابط آسان رہیں۔ پہلے مرحلے کے طور پر ابراہام اپنے پورے خاندان سمیت وہاں منتقل ہو گیا۔ پھر ہر طرف سے یہودی تیزی سے وہاں سکونت پذیر ہونے لگے۔ اس تحریک کو "ہجرت" کا نام دیا گیا۔ یہاں آباد ہونے کے بعد یہودیوں نے غنڈہ گردی اپنائی اور مقامی نصرانیوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ یہ شکایات بابِ عالی تک پہنچیں تو فوراً کارروائی کی گئی اور ابراہام سمیت تمام یہودیوں کو سینا سے نکال دیا گیا، آئندہ بھی ان کے یہاں واپس آنے پر پابندی لگا دی گئی۔ [1]

ینی چری فوج کی ہنگامہ آرائی۔ آسٹریا سے جنگ:

مشرقی اور مغربی ممالک سے امن معاہدوں کے بعد بیرونی جنگیں تو کچھ مدت کے لیے ٹھنڈی پڑ گئیں مگر اس سے ینی چری فوج کو جو ہر وقت لڑنے بھڑنے کی عادی تھی، امن کا موسم سخت گراں گزرا، اور اس کے جوانوں نے استنبول، قاہرہ، تبریز اور ہنگری کے شہر بوڈاپسٹ سمیت ہر اس شہر میں اودھم مچا دیا جہاں ان کی چھاؤنیاں تھیں۔

یہ دیکھ کر صدرِ اعظم سنان پاشا نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ ینی چری فوج کو دوبارہ مہمات میں مشغول کر دیا جائے تاکہ اندرونِ ملک امن قائم ہو سکے۔ اس مشورے کے مطابق آسٹریا سے جنگ چھیڑی گئی مگر عثمانی افواج میں پہلے جیسی ایمانی روح باقی تھی نہ کوئی اعلیٰ ہدف ان کے پیشِ نظر تھا، اس لیے انہیں شکست ہوئی اور کئی قلعے ہاتھ سے نکل گئے۔ یوں عثمانیوں کی ہیبت اٹھ گئی جس کے بعد بغدان اور ٹرانسلفانیا سمیت بعض باج گزار یورپی ریاستوں نے آسٹریا سے اتحاد کر کے بغاوت کر دی۔ آخر ۱۵۹۵ء (۱۰۰۳ھ) میں سنان پاشا نے دوبارہ مہم جوئی کر کے پہلے اپنے چھینے گئے قلعوں کو بازیاب کرایا اور پھر "افلاق" (رومانیا) کے مرکز بخارسٹ تک جا پہنچا مگر آخر میں دریائے ڈینوب کے کنارے اسے شکست ہوئی اور عثمانی افواج پسپا ہو کر کئی شہروں کا قبضہ چھوڑتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

یہ کشمکش جاری تھی کہ ۱۵۹۵ء (۱۰۰۳ھ) میں مراد ثالث کا انتقال ہو گیا۔ اس کی عمر ۴۹ سال تھی۔ [2]

+++

---

[1] الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۲۹٤

[2] التاريخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/۱۲٦، ۱۲۷ ؛ تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك: ص ۲٦٤ تا ۲٦٦

سلطان محمد خان ثالث بن مراد ثالث

۱۰۰۳ھ تا ۱۰۱۲ھ
(۱۵۹۴ء تا ۱۶۰۳ء)

محمد خان ثالث، وینس کی ایک باندی کا بیٹا تھا جو بحری جھڑپ میں گرفتار ہو کر خلیفہ مراد ثالث کے حرم میں پہنچی تھی، اس کا اصل نام بافوتھا، اسلام قبول کرنے کے بعد خلیفہ نے اس کا نام صفیہ رکھا۔ وہ خلیفہ کی چہیتی اور با اثر بیگمات میں شمار ہوئی۔ اسی کے بطن سے ۱۵۶۷ء (۹۷۴ھ) میں محمد خان ثالث کی ولادت ہوئی۔ وہ ۱۵۹۴ء (۱۰۰۳ھ) میں تخت نشین ہوا، اس وقت اس کی عمر کم وبیش ۲۸ سال تھی۔[1]

بھائیوں کا قتل:

اس زمانے میں محل سرا کی خواتین سیاست میں بُری طرح دخل انداز تھیں اور اسی طرح اُمراء، وزراء اور یِنی چری افسران بھی سلاطین پر دباؤ ڈال کر انہیں بہت سے نقصان دہ فیصلوں پر مجبور کرتے رہے۔ اسی بناء پر اس دور کے بعض عثمانی سلاطین بلاوجہ اپنے بھائیوں کے قتل میں ملوث ہوئے۔ محمد خان ثالث کے دور میں اس کی سب سے مکروہ مثال سامنے آئی کہ جب اس سلطان نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے "۱۹" بھائیوں کو بلا جواز قتل کرا دیا۔[2]

مؤرخ منجم باشی کے مطابق سلطان نے یہ کام اپنے والد کی نعش دفنانے سے قبل کیا تھا۔ چنانچہ محل سے سلطان مراد ثالث اور اس کے ان اُنیس بیٹوں کے جنازے ایک ساتھ نکلے۔[3] اس قسم کے مکروہ اقدامات کے باعث سلطنت

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۶۷

② وخلف عشرین ولداً ذکراً غیر الاناث، فلما استقر ولدہ الاکبر علی سریر الملک امر بخنق اخوتہ فخنقوھم. (اخبار الدول وآثار الاول: ص ۷۹، وذکرہ منجم باشی فی جامع الدول (ص ۳۳۶، ۳۸۸، ۳۸۹)

یاد رہے کہ عظیم عثمانی سلاطین کے دور میں شہزادوں (بھائیوں یا بیٹوں) کے قتل کے جو واقعات ہیں، وہ اکثر و بیشتر بغاوت کے باعث قتل پر محمول ہیں مگر دورِ انحطاط میں محض شک اور بغاوت کا اندیشہ بھی قتل کا جواز بن گیا۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ "۱۹" بھائیوں کا قتل عموماً مراد ثالث کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو درست نہیں۔ مراد نے پانچ بھائیوں کو قتل کیا تھا جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔

③ جامع الدول از منجم باشی: ص ۳۳۶ — مقامِ عبرت ہے کہ سلطان مراد ثالث نے جس طرح چند سال قبل اپنے پانچ بھائیوں کو قتل کیا تھا، مکافاتِ عمل میں اس کی جگہ اس کے اپنے گھر سے بیس جنازے ایک ساتھ نکلے اور یہ ستم خود اس کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں ہوا۔

چاہے شہزادوں کی بغاوتوں سے قدرے محفوظ ہوگئی تھی مگر دوسری طرف قابل جانشینوں کا قحط پڑ چکا تھا۔ اسی لیے سلطنت اب روز بروز انحطاط کی طرف جارہی تھی۔

کرزت کی تاریخی جنگ:

اگرچہ خلافتِ عثمانیہ میں اضمحلال کے آثار واضح تھے مگر اس کے باوجود، خلفاء نے جہاد ترک نہیں کیا تھا اور یورپی استعمار کے سامنے ایک مضبوط بند باندھنے کے لیے وہ اب بھی فکرمند تھے۔

خلافت کی کمزوری بھانپ کر افلاق (رومانیا) کے باج گزار حاکم میخائیل نے نہ صرف آسٹریا سے ساز باز کر کے بغدان اور ٹرانسلفانیا کے بڑے حصے کو اپنی تحویل میں لے لیا بلکہ اپنے مقابلے پر آنے والے عثمانی لشکر کو بھی پسپا کر دیا۔

اس شکست نے سلطان محمد خان ثالث کے دل پر چوٹ لگائی اور وہ عہدِ زرّیں کی بازیافت کے لیے کمربستہ ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ گزشتہ کئی عشروں میں عثمانی افواج کی شکستوں کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ خلفاء نے خود جہاد کے لیے نکلنا چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے افواج کے حوصلے پست ہوگئے تھے۔

افواج کو ہمت دلانے کے لیے محمد خان ثالث نے خود جہاد میں نکلنے کا فیصلہ کیا اور ۱۵۹۶ء (۱۰۰۵ھ) میں ایک لشکرِ جرار لے کر استنبول سے نکل پڑا۔ بڑے بڑے علماء و مشائخ جہاد کی سعادت کے لیے سلطان کے ساتھ نکلے۔ ان میں شیخ سعدالدین آفندی بھی تھے۔ وہ استنبول سے چلتے وقت کہہ رہے تھے:

''میں آپ کے ساتھ اس لیے جارہا ہوں کہ خود کو گناہوں سے پاک کروں۔''

کرزت کے میدان میں جرمنی، ہنگری اور آسٹریا کی مشترکہ فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ گھمسان کی جنگ کے دوران عثمانیوں کی صفیں ٹوٹ گئیں اور نصرانی ہلہ بول کر محمد خان ثالث کے خیمے سے کچھ فاصلے پر پہنچ گئے۔ محمد ثالث جو حضور ﷺ کی چادر اوڑھے ہوئے تھے اور آپ ﷺ کا نیزہ تھامے، یہ نقشہ دیکھ رہا تھا، گھوڑے سے اتر کر خیمے میں چلا گیا اور آہ وزاری کے ساتھ دعا کرنے لگا۔ اتنے میں صدرِ اعظم ابراہیم پاشا اندر داخل ہوا اور گویا ہوا:

''اس وقت آپ کا یہاں سے نکل جانا ضروری ہے، ورنہ ڈر ہے کہ آپ گرفتار نہ ہو جائیں۔ یہ سلطنت کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔''

محمد خان ثالث یہ مشورہ مان کر گھوڑے پر زین کسوانے لگا تھا کہ خواجہ سعدالدین آفندی نے ان کے گھوڑے کی باگ پکڑلی اور بولے: اگر سپاہیوں نے دیکھا کہ سلطان پشت پر نہیں، تو سب تتر بتر ہو جائیں گے۔ ابھی جنگ جاری ہے ہمیں شکست ہرگز نہیں ہوگی۔ آپ اپنے مولا کی نصرت سے فتح یاب ہوں گے۔''

ان الفاظ نے محمد خان ثالث اور اس کے امراء کو ایک نئی ہمت دے دی۔ محمد ثالث نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تمام افسران و سپاہ نے اس کی کمان میں یک بارگی ایسا حملہ کیا کہ دھاوا بولنے والے حریف کی صفیں الٹ پلٹ ہوگئیں۔

پچاس ہزار اتحادی میدان جنگ میں مارے گئے جبکہ بیس ہزار ان گہرے تالابوں میں غرق ہوگئے جو اس وادی کے کنارے پر تھے۔ یہ تاریخی معرکہ ۲۶ اکتوبر ۱۵۹۶ء (۲۷ ربیع الاول ۱۰۰۵ھ) کو لڑا گیا تھا۔ مؤرخین اس فتح کو ۱۵۲۶ء کی جنگِ موہاکس کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں جس میں سلیمان عالی شان نے یورپی اتحاد کے پرخچے اڑا دیے تھے۔

تاہم عثمانی اس شاندار فتح سے کوئی خاص فائدہ اٹھائے بغیر لوٹ گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر نئے علاقے فتح کرنے کی جگہ اپنی سرحدوں کو محفوظ رکھنا کافی سمجھا۔[1]

اس کے بعد بھی فریقین میں کئی لڑائیاں ہوئیں جن میں کبھی ایک غالب آتا کبھی دوسرا۔

بغاوتوں کی سرکوبی:

محمد خان ثالث کے دور میں قرہ یازجی نامی ایک سابق افسر نے، جسے جنگ سے فرار کے جرم میں دارالخلافہ سے نکال دیا گیا تھا، یہ دعویٰ کیا کہ اسے خواب میں رسول اللہ ﷺ نے آلِ عثمان کے خلاف نصرت کی بشارت دی ہے۔ اس پر دارالخلافہ سے دھتکارے گئے بہت سے سپاہی اس کے گرد جمع ہوگئے اور انہوں نے عین تاب کو اپنا مرکز بنالیا۔ تاہم جب سرکاری افواج نے جوابی کارروائی کی تو اس کا کام تمام ہوگیا۔ اس کے بھائی نے باغی تحریک کی قیادت سنبھالی مگر وہ بھی ناکام رہا۔ آخر ۱۶۰۱ء (۱۰۱۰ھ) میں یہ تحریک بے نام ونشان ہوگئی۔

اسی دور میں استنبول کے گھڑ سوار سپاہیوں نے ہنگامے شروع کردیے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ بغاوت میں ان کی جن املاک کو نقصان پہنچا ہے، انہیں اس کا معاوضہ دیا جائے۔ دربارِ خلافت نے اس مطالبے کو پورا نہ کیا تو انہوں نے مساجد اور وقف عمارتوں کے اموال سمیت جو ہاتھ لگا، وہ لوٹ لیا۔ آخر بابِ عالی نے ینی چری دستوں کے ذریعے ان کے خلاف کارروائی کرکے اس ہنگامے کو ٹھنڈا کیا۔ محمد خان ثالث کا دورِ اقتدار نو سال رہا۔ ۱۶ دسمبر ۱۶۰۳ء (۱۲ رجب ۱۰۱۲ھ) کو اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی عمر ۳۷ برس تھی۔[2]

سلطان محمد خان ثالث کا کردار:

منجم باشی لکھتا ہے کہ سلطان محمد خان ثالث خوبصورت، مہربان اور پنج وقتہ نمازوں کو باجماعت ادا کرنے کا پابند تھا۔ جب بھی نبی اکرم ﷺ کا نام نامی سنتا تو ادب سے کھڑا ہوجاتا۔ وہ ترکی زبان کا شاعر تھا۔ اس کا تخلص عدلی تھا۔[3]

اگر اس کے دامن پر بھائیوں کے قتل کا بدنما داغ نہ ہوتا تو یقیناً اس کا شمار آلِ عثمان کے اچھے سلاطین میں ہوتا۔

◆◆◆

---

[1] تاريخ الدولة العثمانية از يلماز اوزتونا: ۱/ ۴۴۸، ۴۴۹ ؛ تاريخ آل عثمان از قرماني: ۶۳؛ تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۲۶۸

[2] التاريخ الاسلامي از محمود شاكر: ۱۲۸/۸ ؛ تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۲۶۹، ۲۷۰

[3] جامع الدول از منجم باشي: ص ۳۸۸

سلطان احمد اوّل بن محمد ثالث

۱۰۱۲ھ تا ۱۰۲۶ھ

(۱۶۰۳ء تا ۱۶۱۷ء)

سلطان احمد اوّل چودہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔اس نے اپنے بھائی مصطفیٰ خان کو ہر طرح کا سامان عیش وتنعم دے کر ایک محل میں نظر بند کر دیا تاکہ کسی بغاوت کا خدشہ نہ رہے۔

احمد اوّل کے دور میں خلافتِ عثمانیہ کو مزید ضعف سے بچانے کی پوری کوشش کی گئی۔اسے مراد پاشا جیسے قابل امراء ملے تھے جن کی مساعی نے سلطنت کو ہچکولے کھانے سے بچائے رکھا۔[1]

آسٹریا سے صلح:

آسٹریا کوشش کر رہا تھا کہ ہنگری کا حکمران جو عثمانیوں کا باج گزار تھا، بغاوت کر کے خود مختار بادشاہ بن جائے تاہم یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور ہنگری بدستور خلافت کا باج گزار رہا۔خلافتِ عثمانیہ اور آسٹریا کے مابین کش مکش ۱۶۰۶ء (۱۰۱۵ھ) میں آسٹریا سے اس معاہدے پر منتج ہوئی کہ آسٹریا یک مشت دو لاکھ ڈکٹ ادا کر کے خلافت کو سالانہ خراج (جو تیس ہزار ڈکٹ تھا) دینے سے مستثنیٰ سمجھا جائے گا۔[2]

بظاہر یہ معمولی بات تھی مگر درحقیقت اس معاہدے نے ایک سخت حریف کو آزادی نصیب کر کے مستقبل میں اس قابل بنا دیا کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کو مزید کمزور کرتا رہے۔اسی لیے بعض مؤرخین کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ یہ معاہدہ سلطنتِ عثمانیہ کے اس انحطاط کا بنیادی سبب تھا جو انجام میں معاہدۂ برلن پر منتج ہوا۔

ایران سے جنگیں اور صلح:

اس زمانے میں ایران میں شاہ عباس صفوی کی حکومت تھی جو اپنے پیشرو طہماسپ کی بہ نسبت، بہت ہوشیار اور قوی تھا۔اس نے خلافتِ عثمانیہ کو اندرونی بغاوتوں میں الجھا دیکھ کر فوراً فوج کشی کی۔عثمانی لشکر قرار واقعی مزاحمت نہ کر سکا اور

---

[1] جامع الدول از منجم باشی: ص ۴۳۴؛ تاریخ الدولة العلية العثمانية از فرید بک محامی: ص ۲۷۱

[2] تاریخ الدولة العلية العثمانية از فرید بک: ص ۲۷۲

نوٹ: ڈکٹ (Ducat) ایک یورپی کرنسی تھی جو تجارتی معاملات کے لیے مختلف ممالک باہم استعمال کرتے تھے۔یہ خالص سونے کا ایک سکہ تھا جس کا وزن کم وبیش ساڑھے تین گرام ہوتا تھا۔اس کرنسی کا رواج تیرہویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک رہا۔

شمالی عراق اور تبریز سمیت ایک وسیع علاقہ ترکوں سے چھن گیا۔ آخر کار ۱۶۱۲ء (۱۰۲۱ھ) میں دونوں ملکوں میں صلح ہوگئی جس کے مطابق خلیفہ سلیمان عالی شان کے دور میں فتح کردہ ایران کا تمام علاقہ صفویوں کو واپس کر دیا گیا۔[1]

آگے چل کر عثمانیوں کو اس شکست کے مزید نقصانات بھی جھیلنا پڑے۔ درحقیقت یہ پسپائی سلطنتِ عثمانیہ کا انحطاط کی طرف دوسرا قدم تھا۔

اسپین میں مسلمانوں کا استیصال اور ہالینڈ کا عروج:

احمد اوّل کے دور میں دنیا سترہویں صدی عیسوی میں داخل ہوگئی۔ یہی وہ ایام تھے جب اسپین میں مسلمانوں کو بالکل فنا کر دیا گیا۔ وہ مسلمان جنہوں نے آٹھ صدیوں تک اس سرزمین پر حکومت کی تھی، جب نصرانیوں کے محکوم ہوئے تو ان کے تمام حقوق سلب کر کے ان کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیا گیا۔ یہ دورِ غلامی ۱۱۸ سال تک جاری رہا، اس دوران مسلمانوں کی چار نسلوں نے ہر طرح کے جبر وتشدد کے باوجود اپنے دین وایمان کی حفاظت کی۔ یہ مسلمان خفیہ طور پر عثمانی بحریہ کو ہسپانوی جہازوں کی نقل وحرکت سے بھی خبردار کرتے رہتے تھے۔ ان کی آخری نسل نے کئی سالوں تک جنوب مشرقی اسپین کے پہاڑوں میں چھاپہ مار لڑائیاں بھی لڑیں مگر آخر کار ان سب کو فنا کر دیا گیا۔

جب سترہویں صدی عیسوی شروع ہوئی تو اسپین کا حکمران فلپ سوئم، یہ یقین کر چکا تھا کہ مسلمانوں کو پکا نصرانی بنانا کسی بھی طرح ممکن نہیں، لہٰذا اس نے ستمبر ۱۶۰۹ء (جمادی الآخرہ ۱۰۱۸ھ) میں اسپین میں آباد تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ ۷۲ گھنٹے کے اندر ملک سے نکل جائیں ورنہ ان کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اس حکم کا اصل مقصد مسلمانوں کو فنا کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا کیوں کہ سینکڑوں میل کی مسافت پر پھیلی ہوئی مسلم آبادیوں کے لیے اتنے وقت میں انخلاء ناممکن تھا۔ اس وقت اندلس میں مسلمانوں کی تعداد چھ لاکھ سے کم نہیں تھی۔ انہیں یک بارگی گھروں سے بے گھر ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں میں سفر کرنا پڑا۔ پناہ گاہوں کی تلاش اور دربدر پھرنے کا یہ سلسلہ دس ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران نصرانیوں کے لیے ان نہتے اور سسکتے لوگوں کو قتل کرنا بہت آسان تھا جن کی بڑی تعداد کو موسم کی شدت اور فاقوں نے پہلے ہی مار دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سال کے بعد اسپین میں ایک بھی مسلمان باقی نہیں تھا۔

سلطنتِ عثمانیہ اس المیے سے ناواقف نہیں تھی، سلطان احمد اوّل نے ان مصیبت زدہ مسلمانوں کی اشک شوئی میں غیر معمولی دلچسپی لی اور ۱۶۱۰ء (۱۰۱۹ھ) میں ایک اعلیٰ سطحی سفارت لندن بھیج کر تاج برطانیہ کو بتایا کہ ہم اسپین کے شمالی علاقوں سے مغربی یورپ کی طرف دھکیلے جانے والے مسلمانوں کو اپنے ہاں بسانا چاہتے ہیں لہٰذا اس سلسلے میں تعاون کیا جائے۔

یہ کوشش کامیاب ہوئی اور مغربی یورپ میں دربدر پھرنے والے ہزاروں مسلم خاندانوں کو جمع کر کے بحری جہازوں کے ذریعے ترکی پہنچا دیا گیا۔ ان مسلمانوں میں سے اکثر وہ تھے جو شمالی اسپین کے جاگیرداروں کے غلام تھے اور ان کی

---

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۷۲

زمینوں کی کاشت کا سارا کام سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے بعد اسپین کی زرعی خوشحالی، بدحالی میں بدل گئی۔

یہی وہ وقت تھا جب ہالینڈ نے تین عشروں کی خونریز جنگوں کے بعد اسپین کی ماتحتی سے آزادی حاصل کی اور ایک آزاد ملک بن کر مسلم دنیا پر ہاتھ صاف کرنے کی دوڑ میں شامل ہوگیا۔ اپنی آزادی کے صرف ایک سال بعد ۱۶۱۰ء میں ہالینڈ کا بحری بیڑا "انڈونیشیا" کے جزیرے "جاوا" کو اپنی نوآبادیات بنا چکا تھا۔ اس سے پہلے سولہویں صدی عیسوی میں بحرِ ہند پرتگالیوں کے ہاتھ میں رہا تھا مگر ہالینڈ نے پرتگالیوں کو بے دخل کر کے سترہویں صدی عیسوی میں بحرِ ہند کو اپنی جاگیر بنالیا۔ کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے بعد اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ سمندر برطانیہ کے قبضے میں آجائے گا۔[1]

بحیرۂ روم کی جھڑپیں:

۱۶۱۱ء سے ۱۶۱۴ء (۱۰۲۰ھ تا ۱۰۲۳ھ) تک بحیرۂ روم میں عثمانی بحریہ کی اسپین اور اٹلی کی بحری افواج اور جزیرہ مالٹا کے نصرانی قزاقوں سے بھی جھڑپیں وقتاً فوقتاً جاری رہیں، جن میں اکثر و بیشتر نصرانیوں کا پلہ بھاری رہا کیوں کہ اب اندلس میں کوئی نہ تھا جو عثمانی بحریہ کو ہسپانوی فوج کی نقل و حرکت کی اطلاعات دیتا۔

بحیرۂ روم میں اپنی بحریہ کو کمزور دیکھ کر صدرِ اعظم نصوح پاشا نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ بحیرۂ اسود کی بحری فوج کو بھی بحیرۂ روم میں منتقل کر دیا جائے۔ اس مشورے پر عمل سے بحیرۂ اسود پر گرفت کمزور پڑ گئی اور وہاں قزاقوں نے لوٹ مار کا طوفان گرم کر دیا۔ اس پر احمد اول سخت غضب ناک ہوا اور اس صورتحال کی ذمہ داری نصوح پاشا پر ڈال دی۔ کچھ حاشیہ برداروں نے معاملے کو مزید ہوا دی جس کے نتیجے میں احمد اول نے نصوح پاشا کو سزائے موت دے دی۔[2]

اندرونی مسائل:

احمد اول کے دور میں متعدد بغاوتیں ابھریں جن پر قابو پانے میں اس دور کے سب سے عمر رسیدہ سیاست دان مراد پاشا کا اہم کردار رہا، جو سلیمان عالی شان کے ایام سے دربار استنبول کا رکن تھا اور اس دورِ زرّیں کی آخری نشانی تھا۔ اس کی عمر ۸۰ سال سے تجاوز کر چکی تھی مگر اس نے اپنی سیاسی مہارت، جرأت و دور اندیشی اور حکمت و تجربے سے کام لے کر سلطنت کو کئی بحرانوں سے بچائے رکھا۔ کردستان کے ایک جنگجو "جان فولاذ" نے اپنی قوت اور جنگی مہارت سے حکومت کو پریشان کیا تو مراد پاشا نے ہی جا کر اس پر قابو پایا اور اسے بابِ عالی کی اطاعت پر مجبور کر کے دم لیا۔[3]

ایک مدت سے امراء کے ایک طبقے نے جو "جلالی" کہلاتا تھا، من مانی کر کے حکومت کے اندر ایک غیر اعلانیہ حکومت بنا کر نظام کو بگاڑ رکھا تھا۔ مراد پاشا نے ۱۶۰۸ء (۱۰۱۷ھ) میں ان کے خلاف مہم شروع کی اور تقریباً ڈیڑھ سال تک ان سے نبرد آزما رہ کر انہیں بالکل دبا دیا۔ اس مہم کے بعد ۱۶۱۰ء (۱۰۱۹ھ) میں مراد پاشا کی وفات ہوگئی۔[4]

سب سے بڑی بغاوت دروزی فرقے کے قائد فخر الدین المعنی الثانی کی تھی (جو فخر الدین المعنی الاول کا پوتا تھا)

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/ ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۵۲ تا ۴۵۴ ② الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۷۴
③ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از محامی: ص ۲۷۱، ۲۷۲ ④ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/ ۴۵۱، ۴۵۲

جس نے ۹۹۹ھ میں لبنان پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ لبنان میں نصرانیوں کے علاوہ نصیری فرقے کے متعصب شیعہ خاصی تعداد میں تھے۔ فخر الدین نے خلافت کے مقابلے میں ان سب کا تعاون حاصل کر لیا، تاہم وہ اتنا ہوشیار تھا کہ باب عالی کو اپنے عزائم کی بھنک تک نہ پڑنے دی بلکہ خلیفہ سے اظہار اطاعت کر کے، اس نے سرکاری طور پر کوہستان لبنان، ساحل بحیرۂ روم، فلسطین اور شام کے کچھ حصے کی ولایت بھی حاصل کر لی۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی طاقت بڑھاتا گیا یہاں تک کہ اس نے جابجا مضبوط قلعے بھی تعمیر کر لیے جن میں چالیس ہزار سپاہی اس کے تابع فرمان تھے۔ پوری تیاری کے بعد ۱۰۲۲ھ میں اس نے علم بغاوت بلند کر دیا تاہم عثمانی افواج کے سامنے وہ زیادہ دیر نہ ٹک سکا اور آخر اسے فرار ہو کر اٹلی میں پناہ لینا پڑی۔[1]

سلطان احمد کی وفات:

سلطان احمد نے چودہ سال حکومت کر کے ۲۲ نومبر ۱۶۱۷ء (۲۳ ذوالقعدہ ۱۰۲۶ھ) کو بخار میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ اس کی عمر ۲۸ برس تھی۔ اس سے پہلے ہمیشہ بڑے بیٹے کو ولی عہد مقرر کرنے کا دستور چلا آتا تھا مگر سلطان احمد کا سب سے بڑا بیٹا عثمان صرف ۱۳ برس کا تھا، اس لیے اس نے وفات سے پہلے اپنے بھائی مصطفیٰ خان کو جانشین مقرر کر دیا۔[1]

سلطان احمد کے کارنامے اور سیرت:

سلطان احمد کا یادگار کام، استنبول کی مسجد ''سلطان احمد'' ہے، جو فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے، چھ بلند و بالا میناروں والی یہ عظیم الشان مسجد، محمد آغا نامی انجینئر کے زیر نگرانی ساڑھے سات سال میں مکمل کی گئی۔[2]

مؤرخین کے مطابق احمد اول متقی اور پرہیزگار انسان تھا، سادہ لباس پہنتا تھا، امور حکومت بذات خود انجام دیا کرتا تھا، علماء و مشائخ کو مشورے میں شامل رکھتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی سے محبت و عقیدت کے اظہار کے لیے اس نے استنبول سے غلاف کعبہ تیار کر کے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سے قبل غلاف کعبہ مصر میں تیار کیا جاتا تھا۔[3]

نعتیہ اشعار:

وہ نعتیہ اشعار بھی کہتا تھا۔ اپنے اشعار پر مشتمل رقعہ اس کے عمامے کے نیچے ہوتا تھا جس میں کہا گیا تھا:

اَرْغَبُ دَوْمًا فِي حَمْلِ صُوْرَةِ ..... اِنْطِبَاعِ اَقْدَامِ النَّبِيِّ عَالِي الْمَقَامِ

''میں ہمیشہ نبی عالی مقام ﷺ کے قدموں کی بنی گئی تصویر کو اٹھانے پر راغب رہوں گا۔''

مَنْ هُوَ سَيِّدُ الْاَنْبِيَاءِ فَوَرْدَةُ ..... حَدِيقَةِ الْاَنْبِيَاءِ مَلَكَةُ هٰذِهِ الْاَقْدَامِ الشَّرِيفَةِ

''وہ کون ہیں جو سید الانبیاء ﷺ ہیں، نبیوں کے باغ کا گلاب ہیں، ان اقدام شریف کے مالک ہیں۔''

---

① التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۱۲۸/۸
② تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز: ۱/ ۳۵۲، ۳۵۳
③ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۷۳
④ الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۰۳

فَیَا اَحْمَدِیْ لَاتَتَرَدَّدْ وَلَوْ لِلَحْظَۃٍ ..... وَمَرِّغْ وَجْهَكَ بِاَقْدَامِ الْوَرْدَۃِ الرَّفِیْعَۃِ الشَّرِیْفَۃِ

"اے احمد! ایک پل بھی تردد نہ کرنا اور اپنا چہرہ اقدامِ عالیہ میں رگڑتے رہنا۔"[1]

◆◆◆

مصطفیٰ خان اوّل بن محمد خان ثالث

ذوالقعدہ ۱۰۲۶ھ تا ربیع الاوّل ۱۰۲۷ھ
(نومبر ۱۶۱۷ء تا فروری ۱۶۱۸ء) فقط تین ماہ

مصطفیٰ خان اوّل اپنے بھائی احمد اوّل کے دور میں نظر بند رہا تھا، اس لیے وہ عقل وشعور سے عاری اور اور سیاسی تجربے سے نابلد رہا۔ اس دورِ زوال میں سلاطین کے اپنے بھائیوں کو قید وبند میں رکھنے کی مثالیں متعدد ہیں۔ اگر اس کی جگہ ان شہزادوں کو جہاد، سیاسی مشاورت اور خدمتِ خلق جیسے اعلیٰ مقاصد کے لیے مصروف رکھا جاتا تو مستقبل میں اچھی قیادت میسر آنے کے امکانات زیادہ روشن رہتے۔[2]

مصطفیٰ ۲۵ برس کی عمر میں مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ اس کا دورِ حکومت برائے نام ہی تھا۔ اس نے تخت نشین ہو کر کم عقلی اور حماقت کے فیصلے دینا شروع کر دیے۔ وہ اکثر اپنے آباء واجداد کے مقبروں پر جا کر لوگوں پر ہزارہا اشرفیاں لٹا دیتا۔ کبھی دل چاہتا تو اشرفیاں اٹھا اٹھا کر سمندر میں پھینکنے لگتا۔ درحقیقت وہ کسی دماغی مرض میں مبتلا تھا۔ طبیبوں نے اس کا بہت علاج کیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔[3]

نااہلی اور معزولی:

وہ عیش وعشرت میں مشغول رہتا تھا۔ اسے کاروبارِ حکومت سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس کے دور کا صرف ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ فرانس کے سفیر نے جو ترکی کے دورے پر تھا، سرکاری تحویل میں نظر بند بولونیا کے ایک نصرانی رئیس کو فرار کرا دیا۔ یہ اطلاع ملنے پر مصطفیٰ خان نے فرنچ سفیر، اس کے کاتب اور مترجم کو جیل میں ڈال دیا تھا۔

تین ماہ بعد اس کی نااہلی سے تنگ آ کر امرائے سلطنت نے اسے معزول کر دیا۔ اس کی جگہ سابق حکمران کے کم سن بیٹے عثمان ثانی کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔[4]

◆◆◆

---

[1] الدولۃ العثمانیۃ: عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۰۳

[2] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از علی حسون: ص ۱۳٤

[3] جامع الدول از منجم باشی احمد بن لطف اللہ: ص ٤٦٤، ط دار الکتب العلمیۃ

[4] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۷٦

سلطان عثمان ثانی بن احمد اوّل

ربیع الاوّل ۱۰۲۷ھ تا رجب ۱۰۳۱ھ
(فروری ۱۶۱۸ء تا مئی ۱۶۲۲ء)

چودہ سالہ عثمان ثانی اپنے چچا کی معزولی کے بعد یکم ربیع الاوّل ۱۰۲۷ھ (۲۸ فروری ۱۶۱۸ء) کو تخت نشین ہوا۔[1]

اہم واقعات:

عثمان ثانی کا دور بھی مختصر تھا جس کے اہم واقعات یہ ہیں:

- فرانس کے بادشاہ نے اپنے سفارتی عملے کی حرکت پر معذرت خواہی کی، چنانچہ ان سب کو رہا کر دیا گیا۔
- لبنان کے باغی فخر الدین معنی الثانی کو معافی دے کر اس کے وطن لبنان واپس بھیج دیا گیا مگر وہ از سر نو باغیانہ تحریک کو پروان چڑھانے لگا۔
- بولونیا کے حاکم کی سازشوں سے مطلع ہو کر اس کے ملک پر قبضے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ ماسکو کے بادشاہ زار کی اُبھرتی ہوئی طاقت کے سامنے بند باندھا جا سکے۔ اس جنگ سے پہلے خلیفہ نے حفظِ ماتقدم کے طور پر مفتی کے انتظامی اختیارات ختم کر کے اسے صرف فتویٰ لکھنے کا مجاز قرار دیا تاکہ خلیفہ کے اختیارات اور فیصلوں میں خلل نہ آئے۔

عثمان ثانی جہاد کا اعلان کر کے لشکر کی قیادت کرتا ہوا بولونیا پہنچا۔ اس نے حریف کے قلعوں پر مسلسل حملے کیے جو بے سود رہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ینی چری دستے بادلِ نخواستہ اس محاذ پر آئے تھے، چنانچہ جلد ہی جنگ سے اکتا کر انہوں نے واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ عثمان ثانی ان پر جبر نہیں کر سکتا تھا اس لیے ۲۶ اکتوبر ۱۶۲۰ء (۷ ذوالقعدہ ۱۰۲۹ھ) کو حریف سے صلح ہو گئی۔ عثمانی ثانی اُن ینی چری افسران سے سخت مایوس تھا جنہوں نے محض سستی اور راحت پسندی کی وجہ سے جنگ ختم کر کے صلح پر زور دیا تھا۔ چنانچہ استنبول واپس آتے ہی اس نے ایسے افسران کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔[2]

عثمان ثانی کا انجام:

عثمان ثانی نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ ینی چری فوج کو بالکل ختم کر دیا جائے، مگر ینی چری سپاہیوں کو بھنک پڑ گئی۔ وہ موقع پا کر عثمان ثانی کے محل میں گھس گئے اور اسے گھر کی خواتین کے بیچ سے گھسیٹ کر، ایک دور دراز کے قلعے میں

[1] جامع الدول از منجم باشی احمد بن لطف الله: ص ٤٦٥ [2] الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ٢٧٧، ٢٧٨

لے گئے اور وہاں بدترین توہین و تذلیل کے بعد اسے قتل کر ڈالا۔[1] یہ ۷ارجب ۱۰۳۱ھ (۳۰ مئی ۱۶۲۲ء) کا واقعہ ہے۔[2] مقتول سلطان کی عمر فقط ۱۸ برس تھی۔ سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ میں فوج کے ہاتھوں کسی سلطان کے قتل کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ عثمانیوں کی تاریخ میں اسے "الماساۃ العثمانیۃ" (سانحۂ عثمانیہ) کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔[3]

عثمان ثانی ایک قابل نوجوان تھا۔ اس کا یہ شعر اس کے جذبے کی عکاسی کرتا ہے

كَانَتْ نِيَّتِي الْخِدْمَةُ لِحُكُوْمَتِي وَدَوْلَتِي ...... وَلِلْعَجَبِ اَنَّ الْحَسُوْدَ يَعْمَلُ لِنَكْبَتِي

"میری نیت حکومت اور ریاست کی خدمت کرنا ہے ...... حاسد پر تعجب ہے کہ وہ میری بربادی کے لیے کوشاں ہے۔"[4]

عثمان ثانی کے قتل نے عثمانیوں کی آن بان کو خاک میں ملا دیا اور ایک شدید ترین سیاسی بحران نے پایۂ تخت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

+++

مصطفیٰ خان (دوبارہ)

رجب ۱۰۳۱ھ تا ذوالقعدہ ۱۰۳۲ھ

(مئی ۱۶۲۲ء تا ستمبر ۱۶۲۳ء)

تاریخ کا سبق یہی ہے کہ سابق بادشاہ کے قاتل ہی اگلے بادشاہ کے سرپرست ہوتے ہیں اور وہ کسی کٹھ پتلی ہی کو آگے لاتے ہیں۔ چنانچہ ینی چری افسران نے ایک بار پھر نالائق مصطفیٰ خان کو تخت پر لا بٹھایا۔[5]

شیخ الاسلام اسعد آفندی نے جو نئے خلفاء کی بیعت کراتے تھے، اس کی بیعت کو ناجائز قرار دیا۔ اس پر عسکری قیادت نے انہیں منصب سے فارغ کر کے یحییٰ آفندی کو شیخ الاسلام بنا کر بیعت کی رسم پوری کرا لی۔[6]

مصطفیٰ خان پہلے ہی مخبوط الحواس تھا۔ ینی چری کے ہاتھوں میں پہلے سے بھی زیادہ ناکارہ اور بے بس ہو گیا۔ ینی چری افسران نہ صرف اس پر بلکہ پورے حکومتی نظام پر چھا گئے اور طرح طرح کی زیادتیاں کرنے لگے۔ ان کے مظالم سے عوام و خواص بھی تنگ تھے۔ ایک سال چار ماہ کی مدت میں سات بار صدرِ اعظم کو تبدیل کیا گیا۔ ہر نیا عہدے دار بمشکل چند ہفتے گزار پاتا۔ اس صورتحال میں پورا نظامِ سلطنت تہہ و بالا ہونے لگا۔ ارضِ روم، سیواس، انقرہ اور طرابلس سمیت جگہ جگہ صوبے داروں نے خودمختاری کے دعوے کر دیے۔[7]

---

① الدولة العلية العثمانية از محامی: ص ۲۷۷، ۲۷۸

② الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از دكتور الصلابی: ص ۳۰۴

③ الدولة العثمانية المجهولة: ص ۲۸۹

④ الدولة العثمانية از الصلابی: ص ۳۰۴

⑤ التاريخ الاسلامی از محمود شاكر: ۸/ ۱۳۰

⑥ جامع الدول از منجم باشی احمد بن لطف الله: ص ۴۷۸

⑦ التاريخ الاسلامی از محمود شاكر: ۸/ ۱۳۰

سلطان مراد خان رابع بن احمد اوّل

۱۰۳۲ھ–۱۰۴۹ھ
(۱۶۲۳ء تا ۱۶۳۹ء)

قریب تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ تباہی کے گہرے گڑھے میں جا گرتی مگر اللہ کی مدد شامل حال ہوئی اور سلطنت کی ابتر حالت دیکھ کر کچھ مخلص، با اثر اور دور اندیش امرا مل بیٹھے اور انہوں نے مصطفیٰ خان کو معزول کر دیا۔ یہ ۱۵ ذوالقعدہ ۱۰۳۲ھ (۱۱ ستمبر ۱۶۲۳ء) کا واقعہ ہے۔

اس کی جگہ عثمان ثانی کے بھائی مراد خان رابع کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اگرچہ وہ صرف ۱۲ برس کا تھا، اس لیے فوری طور پر اس سیاسی بحران پر قابو پانے کے قابل نہیں تھا جو ملک کو درپیش تھا مگر اس کی استعداد اور صلاحیت کے پیشِ نظر امید کی جا سکتی تھی کہ وہ نظام کو رفتہ رفتہ سنبھال لے گا۔ اور بلاشبہ اس نے اپنے سے وابستہ توقعات پوری کر دکھائیں۔

اس نے بہت جلد انتظامی تجربہ حاصل کر لیا اور پے در پے مہمات انجام دیں۔ وہ جفاکش، جنگجو اور بہادر تھا۔ اعصاب پر اسے اتنا قابو تھا کہ بعض اوقات جنگ کے دوران وہ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے نیند پوری کر لیتا تھا۔ اس نے جاسوسی کے شعبے کو نہایت فعال کر دیا اور ہر صوبے کے مفسدوں اور باغیوں کے کوائف حاصل کر لیے۔ جب وہ سفر کرتے ہوئے کسی بھی علاقے سے گزرتا تو وہاں کے مفسدین کی فہرست دیکھ کر انہیں طلب کرتا اور سخت سزائیں دیتا۔[1]

اسی طرح مرتد اور زندیق لوگوں کو وہ کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔ اکثر ان کا انجام پھانسی ہوتا تھا۔ اس نے خلافتِ عثمانیہ کی عمل داری میں شراب اور تمباکو نوشی کی سختی سے ممانعت کر دی تھی۔[2]

صفویوں سے کش مکش:

مراد رابع کی حکومت کے آغاز ہی میں بغداد کے امیر بکیر آغا نے بغاوت کر دی مگر وہ خود بھی اپنے ملک کو نہ سنبھال سکا جس کے نتیجے میں شاہِ ایران عباس صفوی کو موقع مل گیا اور وہ بغداد پر قابض ہو گیا اور وہاں کے امیر کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد بغداد کے اہلِ سنت کے ساتھ سخت زیادتیاں کی گئیں اور ان کے حقوق سلب کر لیے گئے۔

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی، ص ۳۰۵
② الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی، ص ۳۰۵

۱۰۳۸ھ (۱۶۲۹ء) میں شاہ عباس صفوی کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا کم سن بیٹا شاہ مرزا حکمران بنا۔ ترکی کے صدر اعظم خسرو شاہ نے اس وقت موقع غنیمت جان کر ایرانی مقبوضات پر چڑھائی کر دی۔ اگرچہ اس مہم کے دوران اس نے ۱۰۳۹ھ (۱۶۳۰ء) میں ہمدان فتح کر لیا مگر وہ اپنے اہم ترین شہر بغداد کو دوبار محاصرے کے باوجود بازیاب نہ کرا سکا۔[1]

ینی چری افواج کی تادیب:

ینی چری افواج کی سرکشی حد سے بڑھ چکی تھی۔ بغداد پر قبضے میں ناکامی کے بعد خلیفہ نے صدر اعظم خسرو پاشا کو معزول کر کے حافظ پاشا کو یہ منصب بخش دیا۔ خسرو پاشا نے اپنی معزولی پر برافروختہ ہو کر ینی چری فوج کے سامنے حافظ پاشا پر الزام لگایا کہ اسی نے سلطان کو غلط پٹی پڑھا کر مجھے معزول کرایا ہے۔

اس پر ینی چری فوج بھڑک گئی، ۱۸ رجب ۱۰۴۱ھ کو (۹ فروری ۱۶۳۲ء) وہ شاہی محل میں گھس گئے اور حافظ پاشا کو قتل کر ڈالا۔ سلطان کو خسرو پاشا کی اس حماقت پر اتنا غصہ آیا کہ اسے قتل کرائے بغیر نہ رہا۔

اسی وقت اس نے فیصلہ کر لیا کہ ینی چری کو لگام دینا پڑے گی، چنانچہ اس نے ینی چری کے فتنہ پرداز افسران اور فوجیوں کے خلاف ایک بڑی کارروائی شروع کرائی جس میں بہت سے مجرموں کو سزائے موت دی گئی اور باقی خوف زدہ ہو کر سرکشی سے باز آ گئے۔[2]

دروزی فرقے کے امام کی گرفتاری:

اس دور میں لبنان کے دروزی فرقے کے امام فخر الدین معنی الثانی نے نئے زور و شور سے اپنی تحریک شروع کر دی تھی۔ سلطان نے شام کے والی کو اس کے خلاف فوج کشی کا حکم دیا۔ اس کارروائی کے نتیجے میں فخر الدین اور اس کے بیٹے گرفتار ہو گئے۔ انہیں استنبول بھیجا گیا جہاں سلطان نے انہیں عزت واحترام کے ساتھ نظر بند کر دیا۔

مگر کچھ دنوں بعد اطلاع ملی کہ شام میں فخر الدین کے پوتے نے دوبارہ بغاوت کر دی ہے۔ اس خبر پر سلطان نے فخر الدین اور اس کے بڑے بیٹے کو سزائے موت دے دی۔ یہ ذوالقعدہ ۱۰۴۴ھ (اپریل ۱۶۳۵ء) کا واقعہ ہے۔

اس کے بعد دروزی فرقے کے باقی لوگوں نے خلافت کی اطاعت کا عہد کر لیا، لہٰذا ان کے علاقے کو انہی کی تحویل میں رہنے دیا گیا۔ فخر الدین کی اولاد میں وہاں کی امارت ایک صدی تک چلتی رہی۔[3]

بغداد کی فتح:

مراد خان رابع نے ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) میں ایران سے اپنے وہ علاقے واپس لینے کا تہیہ کیا جو سلیمان عالی شان

---

(1) تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک: ۲۸۰ تا ۲۸۲؛ الدولۃ العثمانیۃ عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۰۵

(2) تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ۲۸۲، ۲۸۳

(3) تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ۲۸۳

کے دور سے خلافت کا حصہ تھے۔ اس مہم کا آغاز تبریز پر حملے سے ہوا، جسے ۲۸ ربیع الاول (۱۰ ستمبر) کو فتح کیا گیا۔

مگر کچھ عرصے بعد ایرانیوں نے پھر بغاوت کر دی۔ مراد خان نے اس بار ضرب کاری لگانے کا فیصلہ کیا اور بڑی تیاری کے ساتھ نکل کر ۸ رجب ۱۰۴۸ھ (۱۵ نومبر ۱۶۳۸ء) کو بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ یہ مہم بڑی کٹھن تھی مگر اس جنگ میں مراد خان نے بنفسِ نفیس حصہ لیا اور اپنے ہاتھ سے مورچہ بندی کر کے فوج کا دل بڑھاتا رہا۔

عثمانی فوج کا آخری حملہ نہایت شدید و مدید تھا جو ۴۸ گھنٹے تک لگاتار جاری رہا جس کے نتیجے میں ۲۰ شعبان ۱۰۴۸ھ (۲۵ دسمبر ۱۶۳۸ء) کو بغداد ایک بار پھر خلافت عثمانیہ کی تحویل میں آ گیا۔

اس شکست نے صفویوں کی ہیبت پامال کر دی اور انہوں نے اس ڈر سے صلح کی پیش کش کر دی کہ کہیں عثمانی افواج ایران میں نہ گھس جائیں۔ دس ماہ تک بابِ عالی اور دولتِ صفویہ کے مابین مذاکرات جاری رہے۔ آخر کار صلح طے پا گئی اور سرحدوں پر چھائے ہوئے جنگ کے بادل چھٹ گئے۔[1]

سلطان مراد کی وفات:

سلطان مراد خان رابع کو وقت ملتا تو شاید وہ اپنے آباؤ اجداد کی فتوحات کی تاریخ دہرا دیتا۔ مگر فتح بغداد کے صرف ایک سال بعد شوال ۱۰۴۹ھ (فروری ۱۶۴۰ء) میں اس کی وفات ہو گئی۔ اس کی عمر ۳۱ برس تھی۔ اس نے سولہ سال گیارہ ماہ حکومت کی۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔[2]

سلطان مراد کے ۱۴ سالہ دور میں اس کی والدہ "کوسم سلطان" جو رومی نسل سے تعلق رکھتی تھی اور سلطان کی وفات کے وقت تقریباً ۶۰ برس کی ہو چکی تھی، امورِ مملکت میں دخل دینے لگی تھی اور رفتہ رفتہ اس کا اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سلطان مراد کے بعد امورِ حکومت کا کوئی فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔[3]

◆◆◆

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ۲۸۴، ۲۸۵

② تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ۲۸۵

③ تاریخ عثمانی از ازوزون حقی: ۳/ ۲۹۳

سلطان ابراہیم خان اوّل بن احمد اوّل

۱۰۴۹ھ تا ۱۰۵۸ھ
(۱۶۳۹ء تا ۱۶۴۸ء)

مراد خان رابع کے پورے دورِ حکومت میں اس کا بھائی ابراہیم خان اوّل جیل میں بند رہا تھا۔ مراد خان کے لاولد مرنے کے بعد امرائے دولت نے ابراہیم خان کو جیل سے نکالا اور دستور کے مطابق جامع ایوب انصاری لے جا کر اس کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر لی۔ ①

ابراہیم خان نے مسندِ خلافت پر متمکن ہوتے ہوئے یہ دعا کی:

''الحمد للہ! الٰہی! تو نے مجھ جیسے کمزور بندے کو اس مقام پر پہنچایا۔ یا اللہ تو میری حکومت کے دوران قوم کی حالت کو اچھا اور بہتر رکھ۔ ہمیں ایک دوسرے سے راضی رکھ۔'' ②

امن اور ترقی:

ابراہیم خان کے ۸ سالہ دور میں حکومتی انتظامات اچھے رہے۔ سابق خلیفہ مراد خان نے ینی چری افواج کی ایسی تادیب کی تھی کہ اب کسی کو سر اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس پر سکون ماحول میں بری اور بحری افواج کی ترقی پر خاص توجہ دی گئی۔ محصولات کا نظام بھی بہتر بنایا گیا۔ ③

کریٹ کی مہم:

اس زمانے میں جمہوریہ وینس کی بحریہ، جزیرہ کریٹ پر قابض ہو کر بحیرۂ ایجی کی ساری تجارت اپنے ہاتھ میں لے چکی تھی۔ باب عالی نے اسے تشویش کی نگاہ سے دیکھ کر جزیرہ کریٹ کے لیے جہادی مہم روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں جمہوریہ وینس کے خلاف باقاعدہ اعلانِ جہاد کر کے لشکر کشی کی گئی۔

اس جنگ کے دوران کریٹ کے کچھ علاقے پر قبضہ بھی کر لیا گیا مگر مزید فتوحات سے پہلے استنبول میں فوج نے بغاوت کر دی اس لیے یہ مہم اس وقت پوری نہ ہو سکی۔ ④

---

① تاریخ سلاطین بنی عثمان از یوسف آصاف: ۱۰۵
② الدولۃ العثمانیۃ فی التاریخ الاسلامی الحدیث، از اسماعیل یاغی: ص ۱۰۸
③ الدولۃ العثمانیۃ از الصلابی: ص ۳۰۶
④ الدولۃ العثمانیۃ، از یاغی: ص ۱۰۹

دلیر ترک کماندار حسین پاشا کی تصاویر یورپ میں:

تاہم عثمانی بیڑہ محاذ پر موجود رہا، کئی سالوں تک کریٹ میں خونریز جھڑپیں ہوتی رہیں۔ عثمانی بحریہ کے ایک امیر حسین پاشا نے ساحلی قلعے ''سوڈا'' پر حملہ کیا جہاں جزیرے کا حاکم کاؤنٹ کولورڈو موجود تھا۔ حملے کے دوران حسین شاہ نے کاؤنٹ کو قلعے سے بھاگتا دیکھ کر فائر کیا جس سے کاؤنٹ وہیں ہلاک ہوگیا۔ اسی لڑائی میں حسین پاشا کو خود بھی چہرے پر دو گولیاں لگیں۔ ایک اندر رہ گئی اور دوسری زخم کو چیر کر نکل گئی۔ حسین پاشا نے ناقابلِ یقین قوت برداشت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے چہرے کو رومال سے باندھ لیا اور اپنے گھوڑے قاقاس پر سوار ہو کر حملہ جاری رکھا۔

اس واقعے کی یورپ میں اتنی شہرت ہوئی کہ وہاں کے مصور حسین پاشا کی تصاویر بنا کر فروخت کرنے لگے جس میں وہ گھوڑے پر سوار زخمی حالت میں لڑتا دکھایا گیا تھا۔ [1]

اڑھائی ہزار نصرانی قیدی:

کریٹ کی جنگ وقفے وقفے سے جون ۱۶۵۶ء (شعبان ۱۰۶۶ھ) تک جاری رہی۔ اگرچہ عثمانی جزیرے پر قبضہ نہ کر سکے تاہم حریف کو سخت نقصانات پہنچائے گئے۔ عثمانیوں کا بحری بیڑہ استنبول واپس آیا تو اس پر اڑھائی ہزار نصرانی قیدی لدے ہوئے تھے۔ [2]

گروہ اغوات کا تسلط اور سلطان کا قتل:

سلطان ابراہیم کی اپنی والدہ ''کوسم'' سے اَن بن چلی آرہی تھی۔ ''کوسم'' سیاست وحکومت میں غیر معمولی دلچسپی رکھتی تھی اور بلاوجہ ان امور میں دخل دیتی رہتی تھی۔ اکثر وہ ان معاملات میں بیٹے پر حاوی ہو جاتی تھی۔

ابراہیم خان اس بات پر سخت نالاں تھا اور ماں کو ان کاموں میں پڑنے سے منع کرتا رہتا تھا، ایک بار اس نے تنگ آکر یہاں تک دھمکی دے ڈالی کہ اگر آپ باز نہ آئیں تو میں آپ کو جزیرہ روڈس میں نظر بند کرادوں گا۔ ابراہیم خان کے اس رویے سے کوسم چراغ پا ہوگئی اور اس نے اپنے وفادار ینی چری افسران کو بغاوت پر ابھارا۔ یہ باغی گروہ تاریخ میں ''اغوات'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سلطان ابراہیم کو اس سازش کا پتا اس وقت چلا جب وہ اپنی بیٹی کی شادی کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس نے شادی کے بعد بغاوت پر تلے ہوئے افراد کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ مگر باغی افسران کو اطلاع مل گئی اور انہوں نے اس سے پہلے ہی حملہ کر کے سلطان ابراہیم کو گرفتار کر لیا۔ [3] یہ واقعہ ۱۸ رجب ۱۰۵۸ھ (۱۸ اگست ۱۶۴۸ء) کا ہے۔

ابراہیم خان نے آٹھ سال نو ماہ حکومت کی۔ اس کی عمر ۳۳ سال تھی۔ [4]

---

(۱) تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز: ۴۹۸/۱

(۲) تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۴۹۹/۱

(۳) بعد میں ابراہیم کو قتل کر دیا گیا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۴) تاریخ الدولة العلیة العثمانیة از فرید بک: ص ۲۸۸، تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز: ۴۹۴/۱ تا ۴۹۶

سلطان محمد رابع بن ابراہیم اوّل

۱۰۵۸ھ تا ۱۰۹۹ھ
(۱۶۴۸ء تا ۱۶۸۸ء)

گروہ اغوات نے ابراہیم خان کو معزول کر کے اس کے کم سن بیٹے محمد رابع کو تخت پر بٹھا دیا، جو چھ سال سات ماہ کا تھا۔ وہ عثمانی سلاطین میں سب سے کم عمر تھا۔ اس کا دور حکومت چار عشروں پر محیط تھا مگر اس کے باوجود فتوحات یا ترقی کے لحاظ سے یہ طویل دور کسی شمار میں نہیں آتا۔ مغربی دنیا کے برخلاف سلطنت عثمانیہ میں یہ دستور چلا آرہا تھا کہ ملکہ کا منصب، حکمران کی بیگم کو نہیں بلکہ اس کی والدہ کو دیا جاتا تھا۔ اس لیے مختلف ادوار میں سلاطین کی مائیں امور حکومت میں دخیل رہیں، تاہم محمد رابع کے دور میں یہ دخل کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتا رہا۔

ملکہ کوسم کی حکومت:

محمد رابع کے دور حکومت کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: پہلا حصہ اس کی دادی "کوسم" کی حکمرانی کا تھا۔ اس سہ سالہ دور کو "سلطنتِ اغوات" کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس میں باغی ینی چری افسران کو کھلی چھٹی تھی کہ وہ جو چاہیں کریں۔ کوسم اپنے اثر ورسوخ سے فائدہ اٹھا کر پوتے کی سرپرست بن گئی اور ہر طرح کے احکام صادر کرنے لگی۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ حکومت سنبھالنے کے دسویں دن، سابق حکمران یعنی اپنے بیٹے ابراہیم خان کو قتل کرا دیا تاکہ اس کی مرضی میں کوئی آڑے نہ آئے۔ ملک کا حال نہایت ابتر تھا اور "کوسم" کا وفادار گروہ ہر معاملے پر حاوی تھا حتیٰ کہ اس نے ۸۰ سالہ صدر اعظم صوفی محمد پاشا کو بھی معزول کر کے قتل کر ڈالا۔

اس پر امرائے دربار سراپا غضب بن گئے۔ ملکہ کوسم نے امرائے دربار کو مطمئن کرنے کے لیے یہ عہدہ احمد پاشا کو دے دیا مگر وہ اپنی بے بسی دیکھ کر ایک سال بعد خود ہی مستعفی ہو گیا۔ پھر سیاوش پاشا کو یہ منصب دے دیا مگر درباریوں کا غم وغصہ اترنے میں نہ آیا۔ ملکہ کوسم کی بہو خدیجہ، بھی اپنے بیٹے یعنی سلطان محمد رابع کا تخت دادی کے قبضے میں دیکھ کر سخت نالاں تھی، اسے اپنے شوہر کے قتل کا بھی شدید صدمہ تھا، اس لیے وہ بھی ساس کے خلاف ہو گئی۔

ملکہ کوسم نے یہ دیکھ کر ضروری سمجھا کہ سلطنت کو اپنی دوسری بہو کے لڑکے سلیمان کی طرف منتقل کر دے اور اس سے پہلے موجودہ سلطان، دس سالہ محمد رابع کو قتل کرا دے۔

ملکہ خدیجہ کو اس سازش کی سن گن مل گئی اور اس نے اپنے وفاداروں کو ملکہ کوسم کے خلاف کارروائی کے لیے تیار کر لیا جنہوں نے ۲ اور ۳ ستمبر ۱۶۵۱ء کی درمیانی شب (پندرہویں شب رمضان ۱۰۶۱ھ) کو ۶۲ سالہ ملکہ کو اس کے محل میں گھس کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ملکہ کوسم نے اپنی اولاد میں سے تین خلفاء کا زمانہ دیکھا تھا اور ان تینوں پر حکم چلاتی رہی۔ سلطان مراد رابع اور سلطان ابراہیم خان، دونوں اس کے بیٹے تھے جبکہ سلطان محمد رابع پوتا تھا۔ ان تینوں کی مجموعی مدت حکومت تقریباً ۲۸ سال بنتی ہے۔ اس دور کے گیارہ سالوں میں یعنی ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) سے ۱۰۶۱ھ (۱۶۵۱ء) تک ملکہ پوری طرح سیاست پر حاوی تھی۔ ملکہ نے نہایت ہوشیاری سے اس طویل دور میں نسوانی سیاست کو عالمی سیاست میں داخل کیے رکھا مگر اس کا نتیجہ سلطنتِ عثمانیہ کے سخت سیاسی بحران کی شکل میں ظاہر ہوا۔[1]

ملکہ خدیجہ کا دور:

کوسم کی موت کے بعد اس کی بہو یعنی سلطان محمد رابع کی والدہ خدیجہ، نے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ سلطان محمد رابع کی حکومت کا یہ دوسرا دور تھا جسے "سلطنتِ والدہ" کہا جاتا ہے، پانچ سال تک برقرار رہا۔ یوکرائن سے تعلق رکھنے والی خدیجہ، عادات واطوار اور رنگ ونسل میں سلیمان عالی شان کی ملکہ "خرم" کے مشابہ تھی۔

اس کی حکومت آتے ہی "اغوات" گروہ کی چھٹی ہوگئی اور اس کے افسران اور ارکان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ختم کر دیا گیا۔ جب ان کے گھروں کی تلاشی لی گئی تو لوٹ مار کی بے تحاشا دولت برآمد ہوئی۔ صرف ایک ینی چری افسر اعلیٰ کے گھر سے پچاس کروڑ اشرفیاں نکلیں۔ (یہ رقم لگ بھگ ایک کھرب ۴۵ ارب ڈالر کے مساوی ہے۔) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پورے گروہ نے تین سالوں میں ملک وقوم کو کتنا لوٹا ہوگا۔[2]

حلفِ مقدس اور یورپی حکمرانوں کا اعلانِ جنگ:

محمد رابع کی کم عمری کی وجہ سے یورپ نے خلافتِ عثمانیہ سے بدلہ لینے کا موقع غنیمت جانا۔ پاپائے روم نے آسٹریا، بولونیا، وینس، روس اور مالٹا کی افواج کو جمع کر کے ایک معاہدہ کیا جسے "حلفِ مقدس" کا نام دیا گیا جس میں طے کیا گیا کہ اسلام کے اس ریلے کو مل کر روکا جائے گا جو خلافتِ عثمانیہ کی بدولت مشرقی یورپ سے گزر کر مغربی یورپ تک بھی پہنچ سکتا ہے۔[3]

ملکہ خدیجہ کی سمجھداری:

یورپی طاقتوں کا یہ اتحاد سلطنتِ عثمانیہ کے لیے جو شدید سیاسی بحران کا شکار تھی، خطرے کا پیغام تھا۔ ایسے میں ضرورت تھی کہ عثمانی اندرونی بگاڑ کو جلد از جلد درست کرتے۔ ایسے گھمبیر اندرونی وبیرونی مسائل سے نمٹنا ملکہ خدیجہ

---

① تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۱/ ۴۹۵ تا ۴۹۷

② تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۱/ ۴۹۵ تا ۴۹۸ ③ الدولة العثمانیة از الصلابی۔ ص ۳۰۸

کے بس کی بات نہ تھی۔ صدر اعظم کا منصب ایک کھیل بن گیا تھا۔ سیاوش پاشا صرف نو ماہ، درویش پاشا ایک سال سات ماہ، بشیر پاشا ساڑھے چھ ماہ، قرہ پاشا تین ماہ، سلیمان پاشا چھ ماہ، حسین پاشا صرف چھ دن اور مصطفیٰ پاشا صرف چھ گھنٹے کے لیے صدر اعظم رہا۔ سیاوش پاشا کو پھر لایا گیا مگر وہ ایک ماہ بعد فوت ہو گیا۔ پھر ۸۰ سالہ محمد پاشا ساڑھے چار ماہ تک رہا۔

ایسے میں بعض درباریوں نے ملکہ خدیجہ کو مشورہ دیا کہ وہ نیابتِ سلطانی کا عہدہ از خود چھوڑ دے اور کٹھ پتلی قسم کے لوگوں کی جگہ کسی تجربہ کار شخص کو صدر اعظم کے منصب پر فائز کرے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ''محمد کوبرولو پاشا'' کا نام پیش کیا جو ایک غیر معروف مگر عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ امیر تھا۔

خدیجہ نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور محمد کوبرولو کو یہ منصب پیش کیا مگر اس کہنہ مشق سیاست دان نے اس پیش کش کو قبول کرنے کے لیے کئی شرائط لگا دیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ صدر اعظم کے منصب کو پہلے با اختیار بنایا جائے اور ملکہ خود سیاست سے لاتعلق ہو جائے۔

پہلے تو ملکہ حیران ہوئی کیوں کہ سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے یہ عہدہ قبول کرنے کے لیے اپنی شرائط پیش کی ہوں مگر جلد ہی وہ سمجھ گئی کہ اسی میں ملک و قوم کا فائدہ ہے، چنانچہ وہ رضامند ہو گئی اور صدر اعظم کا منصب ایک مدت بعد کسی با اختیار اور قابل شخص کو ملا۔

ملکہ خدیجہ کا یہ فیصلہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ذہین اور قابل ہونے کے ساتھ ساتھ، ذاتی اغراض سے بالاتر اور ملک و ملت کی بھی خیر خواہ تھی۔ اس فیصلے کے وقت اُس کی عمر صرف ۲۹ سال تھی۔ ایسے میں وجاہت و سیادت کے نفسانی تقاضوں کو کچل دینا معمولی بات نہیں۔ اس کے بعد وہ تقریباً ۳۵ سال زندہ رہی اور ۵۶ سال کی عمر میں فوت ہوئی۔ اس دوران وہ نہ صرف خود سیاست سے کنارہ کش رہی بلکہ پورے شد و مد سے خاندان کی تمام عورتوں کو کسی بھی درجے میں سیاست میں دخیل ہونے سے روکتی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت میں عورتوں کی مداخلت کا دور جو تین عشروں سے چلا آ رہا تھا، ایسا ختم ہوا کہ پھر کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔

ملکہ خدیجہ نے باقی زندگی رفاہی کاموں اور اوقاف کی نگرانی اور ان پر صدقات و خیرات کے اجراء میں گزاری۔ وہ اپنی وفات تک اپنے بیٹے محمد رابع کو اسلام کی خدمت اور وطن کی حفاظت کی نصیحت کرتی رہی۔[1]

کوبرولو حکومت کا دور:

۱۵ ستمبر ۱۶۵۶ء (۲۲ رمضان ۱۰۶۶ھ) کو محمد رابع کی حکومت کا وہ دور شروع ہوا جب وہ کوبرولو خاندان کی رہنمائی کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ اس وقت محمد رابع چودہ سال کا ہو چکا تھا، اس لیے اس کے مستقل اور با اختیار ہونے کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ صدر اعظم محمد کوبرولو اس کا دستِ راست تھا جو اپنے حسنِ انتظام اور سیاسی حکمتِ عملی کے ذریعے

---

(1) تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوز تونا: ۱/ ۴۹۹ تا ۵۰۱

خلافت کی عظمت کو سہارا دیے رہا اور دشمنوں کے عزائم کو ناکام بناتا رہا۔ ۱۶۶۱ء (۱۰۷۲ھ) میں محمد کوپرولو کا انتقال ہو گیا۔

اس کی جگہ اس کے بیٹے احمد کوپرولو نے سنبھالی اور اس نے بھی خلافت عثمانیہ کی شان کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی۔ اس نے آسٹریا اور وینس کی جانب سے بھیجی گئی صلح کی پیش کش رد کر دی اور خود فوج لے کر آسٹریا کی سرحد پر گیا۔ اس جنگ کے دوران ویانا کے مشرق میں واقع آسٹریا کا سب سے بڑا قلعہ "نوہزل" فتح کر لیا گیا۔ یہ ۲۸ ستمبر ۱۶۶۳ء (۲۵ صفر ۱۰۷۴ھ) کا واقعہ ہے۔

صدر اعظم احمد کوپرولو کے دور میں فرانس کی بھی تادیب کی گئی۔ فرانس کو گزشتہ خلفاء نے غیر معمولی مراعات اور امتیازات سے نوازا تھا، مگر بعد میں حالات کشیدہ ہونے پر یہ مراعات واپس لے لی گئیں۔ محمد رابع کے دور میں فرانس نے سابقہ مراعات اور امتیازات بحال کرنے کی درخواست کی مگر صدر اعظم نے درخواست مسترد کر دی۔ اس پر شاہ فرانس لوئیس چہاردہم نے بحری بیڑے کے ساتھ ایک دھمکی آمیز مراسلہ بھیجا، مگر صدر اعظم نے اسے پرکاہ کی بھی حیثیت نہ دی اور صاف کہہ دیا: فرانس کو بخشے گئے امتیازات، محض ایک عنایت تھے۔ یہ کوئی ایسا معاہدہ نہیں تھا جسے پورا کرنا ہم پر لازم ہو۔"

اس کے بعد فرانس نے تواضع اور انکساری اختیار کرتے ہوئے، اپنی درخواست کو دہرایا۔ آخر کار باب عالی کی طرف سے عنایت کرتے ہوئے ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۳ء) میں فرانس کو بیت المقدس میں نصرانی عبادت گاہوں کی خدمت کا امتیاز واپس دے دیا گیا۔[1]

یورپی طاقتوں کے حملے اور سلطان محمد رابع کی معزولی:

صدر اعظم احمد کوپرولو کی وفات کے بعد محمد رابع کی حکومت کا دم خم جاتا رہا۔ آسٹریا نے باب عالی کے ان مقبوضات پر دھاوا بول دیا جو ہنگری کی حدود میں تھے۔ قلعہ نوہزل اور بوڈاپسٹ بھی چھن گئے۔ بولونیا کے حاکم نے ریاست بغدان پر حملہ کر دیا جو خلافت کے تحت تھی۔ ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں جمہوریہ وینس کی بحریہ نے موره اور یونانی مقبوضات پر حملے کر کے ایتھنز اور کورنتھ جیسے شہروں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

ان حالات کو دیکھ کر دربار کے امراء اور علماء نے مل کر فیصلہ کیا کہ محمد رابع کو معزول کر دیا جائے، چنانچہ ۱۰۹۹ھ (۱۶۸۸ء) میں اسے معزول کر کے، اس کے بھائی سلیمان خان ثانی کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ معزولی کے وقت محمد رابع ۶۰ برس کا ہو چکا تھا۔[2]

◆◆◆

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی۔ ص ۳۰۸

② الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی۔ ص ۳۰۸

سلطان سلیمان خان ثانی بن ابراہیم اوّل

۱۰۹۹ھ تا ۱۱۰۲ھ
(۱۶۸۸ء تا ۱۶۹۱ء)

سلیمان خان ثانی ۴۷ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ وہ بھی امرائے دربار کی توقعات پوری نہ کر سکا۔ اس کے دور میں خلافت عثمانیہ مزید کمزور ہوئی۔ اس کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال آسٹریا نے مزید پیش قدمی کرتے ہوئے بلغراد پر بھی قبضہ کر لیا جو ہنگری کا پایہ تخت تھا۔ دوسری طرف جمہوریہ وینس کی بحریہ نے بحیرۂ ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر واقع ڈالماسیا سمیت کئی یونانی مقبوضات کو عثمانیوں سے چھین لیا۔

ایسے میں صدر اعظم مصطفیٰ بن محمد کوپرولو نے حالات کو سنبھالا۔ اس نے سلطنت عثمانیہ کے ذمی اور نصرانی شہریوں کے ساتھ بہت عمدہ برتاؤ کیا، تاکہ یورپی طاقتیں انہیں خلافت کی مخالفت پر نہ ابھار سکیں۔ اس نے استنبول میں نصرانیوں کے تمام چرچوں کو ازسر نو تعمیر کرنے کی اجازت دی۔ اس نے ایسے لوگوں کو سخت سزائیں دیں جو غیر مسلم شہریوں کے جائز حقوق میں خلل ڈال رہے تھے۔

اس عدل وانصاف پر مبنی حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''موریا'' کے نصرانی شہریوں نے خود جمہوریہ وینس سے بغاوت کر کے، دوبارہ خلافت کے ماتحت آنے کا اعلان کر دیا کیوں کہ وینس کے حکام مقامی شہریوں کو کیتھولک مذہب اختیار کرنے پر مجبور کر رہے تھے جبکہ خلافتِ عثمانیہ میں ایسا کوئی جبر نہیں تھا بلکہ ہر کسی کو اپنے مذہب پر باقی رہنے کی آزادی تھی۔[1]

۲۶ رمضان ۱۱۰۲ھ (۲۵ جون ۱۶۹۱ء) کو سلیمان ثانی تین سال آٹھ ماہ حکومت کر کے فوت ہو گیا۔ اس کی عمر ۵۰ سال تھی۔[2]

✦✦✦

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابي: ص ۳۰۸

② تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۳۰۶

سلطان احمد ثانی بن ابراہیم اوّل

۱۱۰۲ھ تا ۱۱۰۶ھ
(۱۶۹۰ء تا ۱۶۹۴ء)

سلیمان ثانی کی کوئی اولاد نہیں تھی، اس لیے اس کی جگہ اس کا بھائی احمد ثانی تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت کے پہلے سال صدر اعظم مصطفیٰ کوپریلو، آسٹریا سے جنگ کے دوران فوج کی کمان کرتے ہوئے شہید ہوگیا۔[1]

اس کی موت سلطنتِ عثمانیہ کے لیے ایک زبردست دھچکا ثابت ہوئی جس کے بعد جمہوریہ وینس نے موقع غنیمت جان کر بحیرۂ ایجی کے بعض عثمانی مقبوضات پر قبضہ کرلیا۔ تاہم عثمانی افواج نے یورپی دشمنوں کو مزید آگے نہ بڑھنے دیا اور اس کے بعد ہلکی پھلکی جھڑپوں کے سوا کچھ نہ ہوا۔

سلطان احمد ثانی کا دورِ حکومت مختصر رہا۔ وہ تقریباً چار سال حکومت کرکے ۱۱۰۶ھ (۱۶۹۴ء) میں فوت ہوگیا۔[2]

❖❖❖

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی۔ ص ۳۱۰

② الدولة العثمانية فی التاریخ الاسلامی الحدیث از اسماعیل یاغی: ص ۱۱۵

سلطان مصطفیٰ ثانی بن محمد رابع

۱۱۰۶ھ تا ۱۱۱۵ھ
(۱۶۹۴ء تا ۱۷۰۳ء)

احمد ثانی کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا، مصطفیٰ ثانی بن محمد رابع تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر ۳۲ سال تھی۔ اس دور میں عثمانیوں کی روحِ ایمانی، شوقِ تبلیغ، جذبۂ جہاد، ولولۂ ترقی اور قومی غیرت و حمیت کو لگنے والا زنگ پوری طرح ظاہر ہو چکا تھا۔ یورپی طاقتیں سلطنتِ عثمانیہ کے ضعف و انحطاط کو اچھی طرح بھانپ کر اس پر چڑھ دوڑیں۔[1]

میثاقِ کارلوفتس، عثمانیوں کی بڑی پسپائی:

عثمانیوں نے اپنی کمزوری کے باعث مجبور ہو کر زغرب کے جنوب مغرب میں دریائے ڈینوب کے کنارے واقع شہر "کارلوفتس" (سارلوفتس) میں روس سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت سلطنتِ عثمانیہ، ہنگری اور ٹرانسلفانیا کے تمام شہروں سے دست بردار ہوگئی۔ یہ معاہدہ ۲۴ رجب ۱۱۱۰ھ (۲۶ جنوری ۱۶۹۹ء) کو ہوا۔ اس کے بعد ان شہروں میں بسنے والے لاکھوں مسلمان ایک بے رحم دشمن کے شکنجے میں آگئے۔

یہ بہت بڑی پسپائی تھی جس نے عثمانیوں کے چار صد سالہ رعب داب کو ختم کر دیا، اور یورپی استعمار اب پوری دنیا پر راج کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس معاہدے نے اندرونِ ملک بھی منفی اثرات مرتب کیے اور ینی چری فوج نے صدرِ اعظم اور سلطان کے خلاف بغاوت کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کے یہ اعلیٰ عہدے دار معزول کر دیے گئے۔

معزولی کے چار ماہ بعد سلطان مصطفیٰ ثانی کا انتقال ہو گیا۔ اس کی عمر ۳۹ سال تھی۔[2]

✦✦✦

---

(1) تاریخ الدولة العلیة العثمانیة از محامی: ص ۳۰۸، ۳۰۹؛ الدولة العثمانیة از الصلابی: ص ۳۱۰

(2) تاریخ الدولة العلیة العثمانیة از فرید بک محامی: ص ۳۰۸ تا ۳۱۱؛ الدولة العثمانیة، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۱۰

ملحوظہ: معاہدہ کارلوفتس (سارلوفتس، کارلووِٹ) جمادی الاولیٰ ۱۱۵۲ھ (ستمبر ۱۷۳۹ء) میں معاہدہ بلغراد کے باعث ختم ہو گیا جو جنگ میں عثمانیوں کی شاندار فتح کے بعد طے پایا تھا۔ یوں معاہدہ کارلوفتس کا سیاہ دور "۴۰" سال طویل تھا جس کی تفصیل سلطان محمود خان اول کے دور میں آئے گی۔ بہر حال اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جبراً مسلط کیے گئے معاہدوں سے مکمل آزادی کا بہترین راستہ جہاد ہی ہے۔

سلطان احمد ثالث بن محمد رابع

۱۱۱۵ھ تا ۱۱۴۳ھ
(۱۷۰۳ء تا ۱۷۳۰ء)

سلطان مصطفیٰ ثانی کے بعد اس کے بھائی احمد ثالث کو تخت پر بٹھایا گیا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۳۱ سال تھی۔ وہ ایک اچھا منتظم اور قابل آدمی تھا۔ ①

روس کا عروج:

سلطان احمد ثالث کے دور میں ایک بار پھر عثمانیوں نے جہاد کی رسم کو تازہ کیا۔ اس دور کی خاص بات، روسی حکمران زار پیٹر اعظم کے مقابلے میں اپنی سرحدوں کا کامیاب دفاع تھا۔ روس "سلاف" قوم کا قدیم مسکن ہے، جس کا صدر مقام سینکڑوں برس سے مسکووی (ماسکو) چلا آرہا ہے۔ یہاں کے بادشاہ مذہباً نصرانی تھے اور آرتھوڈوکس چرچ سے وابستہ تھے۔ سب سے پہلے روسی حکمران "ولادیمیر" نے ۹۸۹ء (۳۷۹ھ) میں نصرانیت قبول کی تھی اور اسی نے سب سے پہلے روس کی سرحدوں کو وسعت دی تھی۔ روس نے ایک استعماری طاقت کا روپ اس وقت دھارا جب ۱۵۳۰ء (۹۳۶ھ) میں آئی وان چہارم ماسکو کا بادشاہ بنا اور "زار" کا لقب اختیار کیا۔ یہ لقب تین صدیوں تک روسی حکمرانوں میں چلتا رہا۔

سولہویں صدی کے آخر میں روسی حکمرانوں نے اسلامی دنیا پر حملے شروع کیے۔ ۱۵۵۶ء (۹۶۳ھ) میں روس نے تاتاریوں کے دارالحکومت "استراخان" پر قبضہ کر کے وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں اور ایران تک کا راستہ پالیا۔ ۱۶۷۰ء (۱۰۸۱ھ) میں روس نے جبیل اورال پر بھی قبضہ کر لیا۔ ②

پیٹر اعظم کے استعماری عزائم:

زاران روس، میں سے سلطان احمد ثالث کا ہم عصر "زار" رومانوف پیٹر اعظم (بطرس اکبر) تھا جو ۱۶۸۹ء سے ۱۷۲۵ء (۱۱۰۰ھ تا ۱۱۳۷ھ) تک برسر اقتدار رہا۔ روس کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنانا اس کا خواب تھا۔ روس کے تمام سمندر چھ ماہ کے لیے یخ بستہ ہو کر جہاز رانی کے قابل نہیں رہتے تھے۔ اس لیے پیٹر کسی بھی طرح اپنی عمل داری گرم

---

① تاریخ سلاطین بنی عثمان: ص ۱۰۳
② الموسوعة العربية العالمية، مادہ: روسیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، مادہ: Russia

سمندروں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اسلامی خلافت کا مرکز استنبول اس کا اصل ہدف تھا۔ اس نے یورپ سے تعلقات مضبوط کیے اور اپنی فوج کو یورپی افسران سے تربیت دلوا کر انہیں عالم اسلام کو مسخر کرنے کے لیے تیار کیا۔

۱۶۹۲ء (۱۱۰۳ھ) میں اس نے ترکی کی سرحدیں پامال کر کے اس جارحیت کی ابتدا کی جس کے ردعمل میں روسیوں اور عثمانیوں میں دو صد سالہ خونریز جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۶۹۶ء (۱۱۰۷ھ) میں روس ترکی کے اہم شہر آزاق (روستوف، جو دریائے دون کے دہانے پر واقع اہم شہر ہے) ہو گیا۔ پھر اس نے ترکوں سے بحیرۂ اسود کے کچھ اور علاقے بھی چھین لیے۔

روسی جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے سلطان احمد ثالث نے صدر اعظم بلطہ پاشا کو منتخب کیا۔ وہ ۱۷۱۱ء (۱۱۲۳ھ) کے موسم بہار میں ایک لاکھ چالیس ہزار مجاہدوں کو لے کر سرحد پر پہنچا۔ دریائے بروت کے کنارے پیٹر اعظم اور ملکہ کیتھرائن ساٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ موجود تھے جن کی پوری کوشش تھی کہ ترکوں کو دریا عبور نہ کرنے دیں مگر نائب سپہ سالار عثمان پاشا حریف کی شدید گولہ باری کے باوجود، دریا پر چار پل بنا کر فوج کو شمالی کنارے پر پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔

زار پیٹر جو کھلے میدان میں لڑنے نکلا تھا، گھبرا کر خندقوں میں مورچہ بندی پر مجبور ہو گیا۔ بلطہ پاشا نے ان مورچوں کے گرد سخت محاصرہ قائم کر کے، پے در پے حملے شروع کیے۔ اگر جنگ جاری رہتی تو زار روس اپنی ملکہ کیتھرائن اور پوری فوج سمیت قیدی بن جاتا، اس کے بعد روس باقی رہ بھی جاتا تو دنیا کی ایک چھوٹی اور کمزور مملکت کی شکل میں۔

مگر ایسے میں ملکہ کیتھرائن نے اپنے سفیر کو بیش بہا ہیرے جواہر دے کر ترکوں کے پاس بھیجا، جس نے بلطہ پاشا کے بعض اعلیٰ افسران کو یہ جواہرات پیش کر کے، بدلے میں درخواست کی کہ کسی طرح زار کو اپنی فوج سمیت پسپائی کا راستہ دے دیا جائے۔ افسران نے یہ رشوت قبول کر کے بلطہ پاشا کو یقین دلایا کہ اس وقت اپنی شرائط منوا کر صلح کر لینا ہی بہتر ہے۔ بلطہ پاشا نے یہ دیکھتے ہوئے کہ افسران مزید جنگ سے کترا رہے ہیں، صلح منظور کر لی۔[1]

معاہدے میں طے کیا گیا کہ "آزاق" ترکی کو واپس کر دیا جائے گا۔ صلح کا یہ معاہدہ میثاق فلکون کے نام سے موسوم ہے۔ اس معاہدے کے تحت، گویا جیتی ہوئی جنگ ہار دی گئی۔ احمد ثالث نے اس اقدام پر صدر اعظم کو معزول کر دیا، تاہم اب اس غلطی کی تلافی نہیں ہو سکتی تھی جو صدر اعظم سے سرزد ہو چکی تھی۔ اگر یہ صلح نہ ہوتی تو روس پر ایسی کاری ضرب لگتی کہ وہ شاید ایک صدی تک دوبارہ اٹھنے کے قابل نہ رہتا۔ مگر اس معاہدے نے روس کو نئی زندگی بخش دی۔[2]

---

① بعض مؤرخین نے ایک بے سروپا حکایت نقل کی ہے کہ صدر اعظم ملکہ کیتھرائن کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا اور ملکہ نے اسے اپنے زیورات پیش کر کے صلح پر رضامند کر لیا تھا۔ اس روایت کی کوئی حقیقت نہیں۔ صدر اعظم اور روسی قیادت کے مابین تمام بات چیت سفیروں کے ذریعے ہوئی تھی۔ صدر اعظم ایک بار بھی زار یا کیتھرائن سے ملے تک نہیں گیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صلح کی پیش کش قبول کرنے میں عورت کے احترام کے اس روایتی جذبے کا دخل بھی تھا جو ہر اچھے مسلمان میں پایا جاتا ہے۔

② تاریخ الدولة العثمانية از یلماز اوزتونا: ۱/ ۵۹۵، ۵۹۶

بد عہدی اور صلح:

زار کے نزدیک یہ معاہدہ محض ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا۔ اس کا مقصد فقط اپنی ملکہ کے ساتھ ترکوں کی قید سے بچنا تھا۔ چنانچہ واپس جا کر وہ عالم اسلام کا پہلے سے بڑھ کر دشمن ثابت ہوا۔ اس نے اپنے دار الحکومت پہنچ کر اطمینان کا سانس لینے کے بعد آزاق شہر ترکوں کو لوٹانے سے انکار کر دیا۔

یہ دیکھ کر سلطان احمد ثالث نے استنبول میں لشکر تیار کر کے اس کی کمان خود سنبھالی اور سرحد کی طرف کوچ کر دیا۔ زار کو اطلاع ملی تو اس نے گھبرا کر پھر صلح کا ہاتھ بڑھا دیا۔ مگر احمد ثالث تیار نہ ہوا۔

اس دور میں ہالینڈ کے علاوہ برطانیہ بھی بحرِ ہند میں اثر کر دنیا کی سیاست میں بہت نمایاں ہو چکا تھا۔ ان دونوں ملکوں نے روس کو شکست سے بچانے کے لیے سفارتی کوششیں شروع کر دیں۔ آخر "معاہدۂ ایڈریانوپل" عمل میں آ گیا جس کے مطابق روس نے آزاق شہر سمیت بحیرۂ اسود کے ساحلی علاقوں سے اپنی فوجیں نکال لیں اور جنگ ختم ہو گئی۔ یہ ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۶ء) کا واقعہ ہے۔[1]

یورپی محاذ پر کامیابیاں:

احمد ثالث کے دور میں یورپی محاذ پر بھی کامیابیاں ہوئیں۔ جمہوریہ وینس کی بحریہ کو شکست دے کر کریٹ سمیت کئی جزیروں اور ساحلی علاقوں کو دوبارہ قبضے میں لے لیا گیا۔ وینس نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے آسٹریا سے اتحاد کر کے ان علاقوں کی واپسی کا مطالبہ کیا جسے باب عالی نے مسترد کر دیا۔ اس کے بعد دونوں ملکوں میں نئے سرے سے جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کے آخری مرحلے میں آسٹریا کا پلہ بھاری ہو گیا۔ ۱۱۲۹ھ (۱۷۱۷ء) میں عثمانیوں کو بلغراد سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ آخر کار ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) میں ہالینڈ اور برطانیہ نے بیچ میں پڑ کر صلح کرا دی جسے "میثاق بساروفتز" کہا جاتا ہے جس کے مطابق:

1. بلغراد، سربیا اور مورہ کے علاقے باب عالی کو واپس کر دیے گئے۔
2. مشرقی بحیرۂ ایڈریاٹک کی بندرگاہ ڈالماسیا، وینس کو لوٹا دی گئی۔
3. سلطنت عثمانیہ کی حدود میں کیتھولک نصرانیوں کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے قدیم گرجے پھر سے تعمیر اور آباد کر سکتے ہیں۔
4. معاہدے میں شامل تمام ممالک نے باہمی تجارت کے دروازے کھول دیے۔

یوں آسٹریا سمیت کئی یورپی ممالک کو سلطنتِ عثمانیہ میں آمد و رفت کا کھلا موقع مل گیا۔[2]

---

① الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث از اسماعيل ياغي: ص ۱۱۷

② في اصول التاريخ العثماني از احمد عبد الكريم مصطفى: ص ۱۵۷، ۱۵۸، ط دار الشروق

افغانستان سے جنگ:

اس زمانے میں افغانستان اور مشرقی ایران میں ''ہوتکی سلطنت'' قائم تھی جس نے افغانستان کو متحد اور مضبوط کر کے صفویوں کو مغرب اور شمال کی طرف دھکیل دیا تھا۔

مگر اس خانوادے کے حکمران شاہ محمود کے مرتے ہی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ شاہ محمود کے بھائی میر حسین ہوتکی نے قندھار کو پایہ تخت قرار دے کر افغانستان کا علاقہ الگ کر لیا۔ جب کہ اصفہان میں شاہ محمود کے چچازاد بھائی شاہ اشرف نے تاج و تخت سنبھال لیا۔ اس نے ۱۷۲۵ء سے ۱۷۲۹ء (۱۱۳۷ھ تا ۱۱۴۱ھ) تک حکومت کی۔

اس دور میں ایرانی صفوی بادشاہت کا وارث شہزادہ طہماسپ، روس کی مدد سے اپنے باپ کا کھویا ہوا تاج و تخت حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھا، اس نے زارِ روس سے معاہدہ کیا کہ اگر وہ اسے ایران کا تخت واپس دلادے تو وہ آذربائی جان، دربند، گیلان اور بحیرۂ کیسپین سے ملحقہ تمام ایرانی اضلاع روس کے حوالے کر دے گا۔ طہماسپ نے خلافتِ عثمانیہ سے بھی سابقہ رقابتیں فراموش کر کے اعانت کی درخواست کی تھی جو منظور کر لی گئی تھی۔

اب شاہ اشرف نے بھی ترکی سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی مگر اس کے سفارتی وفد نے حکمت سے کام نہ لیا اور آغاز ہی میں بابِ عالی سے مطالبہ کیا کہ وہ شمالی ایران کے علاقے شاہ اشرف کے لیے خالی کر دے۔ اس مطالبے پر تعلقات مزید خراب ہوگئے اور خلافتِ عثمانیہ نے جواباً مطالبہ کر دیا کہ شاہ اشرف ایران کو خالی کر کے حکومت شاہ حسین صفوی کو واپس کر دے۔

شاہ اشرف نے نہ صرف یہ مطالبہ مسترد کر دیا بلکہ شاہ حسین صفوی کو بھی قتل کرا دیا۔ اس پر دونوں حکومتوں کے تعلقات بگڑتے چلے گئے حتیٰ کہ ۱۷۲۶ء (۱۱۳۸ھ) میں ترکی اور افغانستان کی فوجیں تاریخ میں پہلی بار آمنے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ اصفہان اور یزد کے درمیان زوردار معرکہ ہوا۔ خلافِ توقع شاہ اشرف نے فتح پائی۔ تاہم اس نے اس موقع پر دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام مالِ غنیمت منصبِ خلافت کے احترام میں ترکی کو واپس کر دیا۔ اس کا اچھا اثر ہوا اور دونوں حکومتوں کے تعلقات بحال ہوگئے۔ شاہ اشرف نے ترکی سے شمالی ایران کے علاقوں کی بازیابی کا مطالبہ بھی ترک کر دیا۔[1]

روس اور ایران سے کش مکش:

اُدھر سلطنتِ عثمانیہ کی کمزوری کا اندازہ لگا کر روس نے بھی مطالبہ کیا کہ اس کے شہریوں کو بیت المقدس کی زیارت کی کھلی اجازت دی جائے۔ بابِ عالی نے اسے بھی قبول کر لیا۔

مگر اس کے بعد زار پیٹر اعظم نے اچانک مشرقی علاقوں کی طرف قدم بڑھا دیے اور داغستان سمیت بحیرۂ کیسپین کے ساحلی علاقوں کو فتح کر کے شمالی ایران تک آن پہنچا۔ عثمانیوں نے یہ دیکھ کر مشرقی سرحدوں کو محفوظ بنانے کے لیے

---

[1] افغانستان در مسیر تاریخ، میر غلام محمد غبار: ۱/۴۳۳

آرمینیا اور گرجستان میں فوجیں داخل کردیں۔ قریب تھا کہ روس اور ترکی میں ایک بار پھر جنگ چھڑ جاتی مگر روس کے کہنے پر فرانس نے مداخلت کرکے صلح کرادی جس کے بعد فریقین نے نئے مقبوضات کو باہم تقسیم کرلیا اور اپنی اپنی افواج کو واپس لے گئے۔

تاہم اُدھر صفویوں کو عثمانیوں کا مشرق کی طرف آنا سخت ناگوار گزرا اور وہ مقابلے میں نکل آئے۔ مگر آخر میں شکست کھا کر بھاگے جس کے بعد عثمانی افواج تبریز اور ہمدان پر بھی قابض ہوگئیں۔ آخر ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۸ء) میں صلح ہوگئی۔

ابھی یہ کشمکش جاری تھی کہ ینی چری فوج نے احمد ثالث کے خلاف بغاوت کردی اور اسے معزول کرکے اس کے بھتیجے محمود کو تخت پر بٹھادیا۔[1]

ابراہیم پاشا کی اصلاحات اور اس کا اثر:

یہ وہ دور تھا کہ یورپ معاشی ترقی، عسکری تنظیم اور سیاسی بالادستی کے سفر پر ایک لمبی دوڑ لگا کر عالم اسلام کے برابر آچکا تھا اور اس کی سبک رفتاری بتارہی تھی کہ وہ چند عشروں میں ساری دنیا سے بہت آگے نکل جائے گا۔ ایسے میں بعض ترک امراء یورپ کی فتوحات کے راز پر غور کرنے لگے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ترکی بھی فوجی نظم ونسق اور جدید اسلحے کی ایجاد میں یورپ سے کسی طرح پیچھے نہ رہے۔ ان میں احمد ثالث کے دور کے صدر اعظم ابراہیم پاشا کا نام سرفہرست ہے، وہ پہلا شخص تھا جس نے یورپ کے نئے طور طریقوں سے واقفیت کی ضرورت پر زور دیا اور استنبول میں مقیم یورپی سفیروں کے ساتھ مسلسل اور منظم روابط کا آغاز کیا۔ اس نے یورپ کے مختلف ممالک میں اپنے قابل سفیروں کو بھی بھیجا اور انہیں تاکید کی کہ وہ تجارتی معاہدوں اور سیاسی موقف میں باب عالی کی ترجمانی سے کہیں زیادہ توجہ یہ جاننے پر مرکوز رکھیں کہ یورپ کی سیاسی، عسکری، اقتصادی اور عمرانی ترقی کن اصولوں پر منحصر ہے۔[2]

اس میں شک نہیں کہ کسی قوم کی برتری اور ترقی کے پس پردہ حقائق کو جاننا ضروری ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ اس میں مغز اور چھلکے کا فرق ملحوظ رکھا جائے۔ سبب اصلی کو تلاش کیا جائے اور ظاہری نقشے کے ہیر پھیر میں نہ الجھا جائے۔ چونکہ مسلم دنیا کو پہلی بار ایسے عالم گیر زوال کی صورتحال سے سابقہ پڑا تھا، اس لیے مسلم عمائد میں ایک شدید احساس کمتری جگہ بنا تا جا رہا تھا۔ ابراہیم پاشا ان لوگوں میں سے تھا جن کی حقائق پر نگاہ تھی مگر بہت سے سیاست دان جب یورپ میں آنے والے سنہرے انقلاب کو دیکھتے تھے تو اس کی چمک دمک سے ان کی نگاہیں خیرہ ہونے لگتی تھیں اور حقیقت نگاہ سے اوجھل ہوجاتی تھی۔ وہ اہل یورپ کی حب الوطنی، قومی حمیت، نظم وضبط، علم وفکر کے میدان میں ان تھک محنت، قومی معاملات میں وسیع مشاورت، ادارہ جاتی نظام میں جدتیں پیدا کرنے کی مہارت، پابندیٔ وقت، وقت کی بچت کے لیے بہتر سے بہتر آلات وایجادات کی جستجو اور اقوام عالم سے مسابقت کے عزم مصمم کو نہیں دیکھ

---

[1] الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی۔ ص ۳۱۱

[2] فی اصول التاریخ العثمانی از احمد عبدالرحیم مصطفی: ص ۱۵۹

رہے تھے، بلکہ ان کی نگاہیں پوشاکوں کی بناوٹ، وردیوں کی تراش خراش، محلات کی آرائش وتزئین، بناؤ سنگھار کی جدتوں اور طعام وشراب کی لذتوں میں الجھ کر رہ گئیں۔ ترک امراء یورپی لباس اور طرزِ تعمیر کو زمانے کا فیشن سمجھ کر اختیار کرنے لگے۔[1]

نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں اہل یورپ سے جو سیکھنا تھا، وہ نہ سیکھ پائے اور جس سے بچنا تھا، اس کے پیچھے پڑ گئے۔ یہ نقالی اس زوال کی اہم وجہ تھی جو گزرتے دنوں کے ساتھ، عالم اسلام کی تقدیر بن گیا۔

✦✦✦

---

[1] الدولة العثمانية في التاريخ الإسلامي الحديث، از اسماعیل یاغی: ص ۱۱۹

خلافتِ عثمانیہ

تیسرا مرحلہ
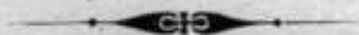
ضُعف، جدّت اور جدّ و جہد کا دور

سلطان محمود خان اوّل تا سلطان عبدالحمید ثانی

۱۱۴۳ھ تا ۱۳۲۸ھ

(۱۷۳۰ء تا ۱۹۰۹ء)

۱۸۸ سال

سلطان محمود خان اوّل بن مصطفیٰ ثانی

۱۱۴۳ھ تا ۱۱۶۸ھ (۱۷۳۰ء تا ۱۷۵۸ء)

سلطان محمود اوّل، سلطان مصطفیٰ ثانی کا بیٹا تھا۔ اس کی پیدائش ۳ محرم ۱۱۰۸ھ (۱۳ اگست ۱۶۹۶ء) کو ہوئی تھی۔ تخت نشینی کی ابتداء میں وہ افسران کے ہاتھوں میں کھلونا تھا مگر بہت جلد اس نے حالات پر قابو پا کر اپنے اختیارات ہاتھ میں لے لیے اور مفسدین کو سخت سزائیں دے کر امن وامان بحال کر دیا۔

ایران سے جنگیں:

اس کے دور میں شاہ ایران طہماسپ سے کئی خونریز جنگیں ہوئیں۔ آخر میں شاہ ایران نے صلح کر لی اور طے ہوا کہ ایران تبریز، ہمدان اور لورستان کے سوا باقی شمالی علاقے ترکی کے حوالے کر دے گا۔ ۱۲ رجب ۱۱۴۴ھ (۱۰ جنوری ۱۷۳۲ء) کو اس معاہدے پر دستخط ہوئے۔ مگر دربار ایران کے سب سے بااثر امیر، نادر خان افشار نے اس معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور شاہ طہماسپ کو معزول کر کے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔[1]

اس طرح ایران اور ترکی میں پھر ٹھن گئی۔ نادر شاہ نے ترکی کی حدود میں گھس کر کئی شہر فتح کیے یہاں تک کہ وہ بغداد پر بھی قابض ہو گیا۔ آخر کار طویل مذاکرات کے بعد ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۳۹ھ (۲۴ ستمبر ۱۷۳۶ء) کو اس بات پر صلح ہو گئی کہ دونوں ملکوں کی سرحدوں کا تعین سلطان محمد رابع کے دور میں ۱۶۳۹ء (۱۰۴۹ھ) کے معاہدے کے مطابق کیا جائے گا۔[2]

جدید فوجی تربیت دلانے کی کوشش:

سلطان محمود اوّل نے ینی چری افواج کا اثر ورسوخ کم کرنے کے لیے، فرانسیسی افسران کو اپنے ہاں بھرتی کیا اور ان کو اعلیٰ مناصب دیے۔ ینی چری فوج جو کبھی عثمانیوں کی فتوحات کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، ایک ڈیڑھ صدی سے ملک و

---

① نادر شاہ افشار ۱۶۸۸ء میں خراسان میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ایک مسلح جتھہ بنا کر طاقت پکڑی اور خراسان کے کچھ علاقے پر قابض ہو کر سیاسی سفر کا آغاز کیا۔ شاہ ایران شاہ حسین صفوی کی موت پر ۱۷۲۲ء میں اس کے جانشین طہماسپ کے دربار سے وابستہ ہوا اور افغانستان کے خلاف لڑ کر دربار میں اونچا مقام حاصل کر لیا۔ ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۲ء) میں اس نے طہماسپ کو معزول کر کے اس کے شیر خوار بیٹے عباس کو برائے نام بادشاہ بنا دیا اور تمام اختیارات خود سنبھال لیے۔ چار سال بعد عباس فوت ہوا تو نادر شاہ خود بادشاہ بن گیا۔ اس نے ایران اور افغانستان میں پے در پے فتوحات حاصل کیں یہاں تک کہ مغل بادشاہوں کو شکست دے کر دہلی میں گھس گیا اور وہاں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ ۱۱۶۰ھ میں وہ اپنی ہی فوج کی بغاوت میں مارا گیا۔

② تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۲۰، ۳۲۱

قوم کے لیے دردِ سر بن چکی تھی، سلطان محمود اسے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرکے، منتشر کرنا چاہتا تھا مگر ینی چری افسران نے اتنی سخت مزاحمت کی کہ اس ارادے کو عمل میں نہ لایا جا سکا۔

سلطان محمود یورپ میں آنے والے انقلاب کے بارے میں حقیقت پسندانہ رائے رکھتا تھا اور جانتا تھا کہ اس وقت اقوامِ عالم سے مسابقت کے لیے عسکری تنظیم اور سائنسی ترقی بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے ایک صورت یہ تھی کہ پختہ دینی مزاج رکھنے والے کچھ ذہین اور قابل لوگوں کو یورپ بھیج کر، وہاں کی علمی وفنی مہارتوں کو سمیٹا جاتا اور یہ لوگ اپنے وطن آکر ان فنون کی تعلیم وترویج کرتے مگر اس میں یہ خطرہ تھا کہ یورپ جانے والے خود نہ بگڑ جائیں، اس لیے یہ بہتر سمجھا گیا کہ یورپی ماہرین کو بلا کر اپنے قابل افراد کو اپنے ہی وطن میں پڑھایا جائے۔ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سلطان محمود نے فرانسیسی جنرل الیگزنڈر کاؤنٹ ڈی بونفال، کو اپنا معتمد بنالیا اور اسے درج ذیل اہداف دیے:

1. ترک سپاہیوں کو یورپی افواج کے طرز پر تربیت دی جائے۔
2. فوج کی ادارہ جاتی تنظیم کو فرنچ اور آسٹرین ترتیب میں ڈھالا جائے۔
3. جدید اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کیے جائیں۔ جدید طرز کا گولہ بارود، رائفلیں اور گاڑیاں تیار کی جائیں۔
4. توپ خانے کو یورپی توپ خانے کے ہم پلہ بنایا جائے۔
5. ایک عسکری درسگاہ قائم کی جائے جس میں ریاضی اور سائنس خصوصاً انجینئرنگ کی بہترین تعلیم دی جائے۔
6. کاغذ سازی کا کارخانہ قائم کیا جائے۔

جنرل نے ان اہداف پر کام شروع کردیا۔ اسی دوران اس نے اسلام قبول کرلیا اور اس کا نام احمد پاشا رکھا گیا۔ اس کی محنت اور لگن سے، بہت جلد اسلحہ ساز کارخانے، عسکری درسگاہ اور کاغذ سازی کے کارخانے کا افتتاح ہوگیا۔

مگر ینی چری افسران، فرانسیسیوں کا بڑھتا ہوا اثرورسوخ برداشت نہ کرسکے۔

انہوں نے ایسا ہنگامہ مچایا کہ یہ تمام ادارے بند کرنے پڑے، اور فرانسیسی جو اس وقت دولتِ عثمانیہ سے تعلق کو غنیمت سمجھتے تھے اور شکریہ کے ساتھ اس تعلق کا حق ادا کرنے پر تیار تھے، اپنی مہارتوں سمیت پیچھے ہٹ گئے۔ خطیر اخراجات سے شروع کیے گئے یہ کارخانے اور ادارے کچھ ہی عرصے میں قصۂ پارینہ بن گئے۔ یہ لگ بھگ ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء) کا قصہ ہے۔[1]

رجعت پسندی کا نتیجہ:

یہ ایسا وقت تھا کہ یورپ، جو گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں سے خاصا پیچھے تھا، تیز دوڑ لگا کر دو قدم آگے ہو چکا تھا، کیوں کہ مسلمان دو صدیوں سے ایک ہی جگہ رکے ہوئے تھے۔

عالمِ اسلام کے پاس، دوڑ میں شامل رہنے یا ندرہنے کے لیے فیصلہ کن لمحہ یہی تھا۔ اگر وہ، وقت کی رفتار کو سمجھ کر قدم

---

[1] فی اصول التاریخ العثمانی از احمد عبدالرحیم مصطفیٰ: ص ۱۶۲، ۱۶۳، ط دار الشروق

اٹھانا شروع کر دیتے تو اگلی صدی میں انہیں سر اٹھا کر جینے کا حق نصیب رہتا۔ لیکن اگر وہ بدستور اسی جگہ پڑاؤ ڈالے رہنے کو اپنی عزت و توقیر سمجھتے تو چند عشروں بعد ان کا شمار پس ماندہ اقوام میں ہونے والا تھا۔ افسوس کہ مسلمانوں کو کوئی حقیقت پسندانہ فیصلہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ فرانس کے لگائے ہوئے کارخانے انہوں نے خود بند کرادیے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ صرف پچاس سال بعد یہی فرانس نہ صرف دنیا کی عالمگیر طاقت بلکہ سلطنتِ عثمانیہ کا خطرناک حریف بھی بن چکا تھا اور ایک صدی گزرنے پر خلافتِ عثمانیہ یورپی طاقتوں کے رحم وکرم پر تھی اور اس کے مستقبل کے فیصلے یورپی ممالک مل بیٹھ کر کرتے تھے۔

جنگِ روس و آسٹریا اور معاہدۂ بلغراد:

اسی دور میں سلطنتِ عثمانیہ اور روس کے درمیان بولونیا پر استحقاق کے مسئلے میں کشیدگی پیدا ہوئی جو اتنی بڑھی کہ جنگ چھڑ گئی۔ بولونیا، خلافتِ عثمانیہ کے ماتحت ریاست تھی جہاں مقامی نصرانی زعماء حکومت کرتے تھے۔ ریاست بولونیا، ترکی اور روس کے درمیان حدِ فاصل تھی۔ روس کے مشہور آمر، پیٹر اعظم نے اپنے جانشینوں کو وصیت کر رکھی تھی کہ وہ بولونیا پر تسلط حاصل کر کے استنبول تک پہنچنے کا خواب پورا کر سکتے ہیں۔ اس لیے روسی حکومت، بولونیا کو کمزور کر کے لقمۂ تر بنانے پر تلی تھی۔

۱۷۴۲ء (۱۱۳۴ھ) میں آسٹریا اور روس نے خفیہ معاہدہ کیا کہ بولونیا میں کوئی ایسا حکمران مسلط کیا جائے جو دولتِ عثمانیہ کی جگہ ان کا وفادار بن کر علاقے میں ان کے مفادات کا تحفظ کرے۔ یہ طے تھا کہ کسی بھی حکمران کی موت پر نئے حکمران کا انتخاب بولونیا کے امراء خود کریں گے۔ اس معاملے میں ترکی اور فرانس دونوں مقامی امراء کی رائے کا احترام کرتے تھے، چنانچہ ۱۷۳۳ء (۱۱۴۵ھ) میں بولونیا کے حکمران اگست دوئم کی موت پر ترکی اور فرانس نے مقامی امراء کے اتفاقِ رائے سے ایک ہوشیار نواب سٹانسلاس کو تخت پر بیٹھنے کا موقع دیا۔

اس پر روس اور آسٹریا نے عسکری مداخلت کرتے ہوئے بغاوت کرائی اور اپنی مرضی سے اگست سوئم کو بطور حکمران مسلط کر دیا۔ جواب میں فرانس کو بھی مقابلے میں آنا پڑا۔ اور اس نے استنبول میں تعینات فرنچ سفیر احمد پاشا (سابق الیگزینڈر) کے واسطے سے بابِ عالی سے بھی درخواست کی کہ وہ بھی بولونیا کے دفاع کے لیے لشکر کشی کرے۔

مگر بابِ عالی کے وزراء نے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے اس مسئلے پر کوئی توجہ نہ دی۔ حالانکہ بولونیا کا دفاع خود ترکی کے تحفظ کے لیے بہت اہم تھا اور یہ جنگ درحقیقت اسی کے خلاف تھی۔

اس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ فرانس کا ترکی پر اعتماد کمزور پڑ گیا۔ آسٹریا نے، جو اس خوف میں مبتلا تھا کہ اگر فرانس اور ترکی حلیف بن کر مقابلے میں نکل آئے تو اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے، موقع غنیمت سمجھا اور فوراً اپنے سفیر فرانس کی طرف دوڑائے۔ جس کے نتیجے میں ۱۷۳۵ء (۱۱۴۷ھ) میں "ویانا" میں آسٹریا نے فرانس سے معاہدہ کر کے اسے ترکی کا ساتھ نہ دینے پر راضی کر لیا۔ یوں ترکی تنہا رہ گیا۔

اس دوران پولونیا پر روس اور آسٹریا کا قبضہ ہو چکا تھا۔ روس نے ریاست بغدان اور اس کے مرکز یاسی پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۲۸ مئی ۱۷۳۶ء (۱۶ محرم ۱۱۴۹ھ) کو روسی افواج پہلی بار سرحد عبور کر کے تاتاری ریاست "قرم" میں داخل ہوئیں اور اسے پامال کرنے لگیں تاہم تاتاری خان گرائی دوئم نے جوابی حملہ کر کے روسیوں کو یوکرائن کی آخری حدود تک پسپا کر دیا اور واپسی میں ایک لاکھ افراد کو قیدی بنا لایا۔

اُدھر استنبول کے صدر اعظم حاجی محمد پاشا نے خداداد حکمت و تدبر اور مستعدی کے ساتھ دشمنوں کے مقابلے کے لیے نقشۂ جنگ مرتب کیا جس کے بعد عثمانی افواج ایک چٹان کی طرح اتحادیوں کے آگے ڈٹ گئیں۔

آسٹریا کی افواج کی مجموعی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی جو تین حصوں میں بٹ کر افلاق (رومانیا)، بوسینا اور سربیا کی سمت سے پیش قدمی کر رہی تھیں۔ ۲۷ جولائی ۱۷۳۷ء (۲۸ ربیع الاول ۱۱۵۰ھ) کو وہ نیش شہر پر قابض ہو گئیں مگر ۴ اگست ۱۷۳۷ء (۱۶ ربیع الآخر ۱۱۵۰ھ) کو بوسنیا کے میدان میں آسٹریا کے ۸۰ ہزار سپاہیوں کو بدترین شکست ہوئی اور ان میں سے ۲۰ ہزار وہیں مارے گئے۔

اسی طرح ۲۰ اکتوبر ۱۷۳۷ء (۲۴ جمادی الآخرہ ۱۱۵۰ھ) کو سربیا کی جنگ میں نصرانی جنگجو چھ ہزار لاشیں چھوڑ کر دریائے ڈینوب کے پار بھاگ گئے اور نیش شہر پر دوبارہ عثمانی پرچم لہرا دیا گیا۔ اسی طرح افلاق (رومانیا) اور بغدان میں بھی اتحادیوں کو شکست ہوئی۔

آزاق کے میدان میں روسی افواج کو بھی پسپا ہونا پڑا۔ مارشل وون میونچ ایک لاکھ ۸۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ ترکی کے اہم قلعے "اوز" پر حملہ آور ہوا۔ تیس ہزار سپاہیوں کو ضائع کرنے کے بعد جب وہ قلعے میں گھسا تو یہ جان کر حیران رہ گیا کہ قلعہ دار یحییٰ پاشا صرف چھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ لڑتا رہا تھا جن میں سے اب فقط ۱۰ ہزار مجاہد زندہ بچے تھے۔ تاہم روس کو جتنے نقصانات ہوئے تھے ان کے مقابلے میں اس قلعے کی فتح کچھ بھی نہیں تھی۔

اُدھر عثمانی افواج، بلغراد تک پہنچ گئی تھیں اور اس کا محاصرہ کر لیا تھا۔ آسٹریا نے مجبور ہو کر فرانسیسی سفیر کی وساطت سے صلح کی پیش کش کی۔ روس بھی اس میں شامل ہو گیا۔ مگر صدر اعظم محمد پاشا نے جو خود فوج کی کمان کر رہا تھا، ایسی سخت شرائط پیش کیں کہ اتحادی اس پر تیار نہ ہوئے۔ لیکن اس کے فوراً بعد جب ۲۳ جولائی ۱۷۳۹ء (۱۵ ربیع الآخر ۱۱۵۲ھ) کو آسٹریا کے مشہور کمانڈر جنرل ویلز کو بھی شکست ہو گئی تو اتحادی تمام شرائط ماننے پر آمادہ ہو گئے۔

یوں ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۵۲ھ (۱۸ ستمبر ۱۷۳۹ء) کو معاہدۂ بلغراد عمل میں آیا۔ جس میں طے پایا کہ:

1. آسٹریا بلغراد اور سربیا کے وہ تمام علاقے خلافتِ عثمانیہ کے حوالے کر دے گا جو معاہدۂ سارو فتس کی رو سے اسے دے دیے گئے تھے۔
2. روس بندرگاہ آزاق پر تعمیر کردہ اپنے سارے قلعے منہدم کر دے گا اور آئندہ وہاں قلعہ بندی نہیں کرے گا۔
3. روس بحیرۂ اسود میں کوئی تجارتی یا حربی جہاز نہیں بھیجے گا۔ تجارت کے لیے اسے غیر ملکی جہازوں کی خدمات

لینا ہوں گی۔

❷ اس جنگ میں سلطنتِ عثمانیہ سے چھینے گئے تمام قلعے، شہر اور علاقے واپس کر دیے جائیں گے۔

اس تاریخی معاہدے نے سلطنتِ عثمانیہ کو نہ صرف وہ تمام علاقے بھی لوٹا دیے جو میثاق کارلوفش (سارو فتس) کی بناء پر اس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے، بلکہ اس کی کھوئی ہوئی عظمت و ہیبت بھی کسی حد تک بحال ہو گئی۔

اس جنگ کے بعد ۱۷۴۰ء (۱۱۵۳ھ) میں فرانسیسی سفیر موسیو فلنوف کی کوششوں سے ترکی نے سویڈن سے (جس کی روس سے پرانی دشمنی چلی آرہی تھی) ایک دفاعی معاہدہ بھی کر لیا کہ آئندہ دونوں ملکوں میں سے کسی پر بھی روس کا حملہ ہوا تو مل کر دفاع کیا جائے گا۔[1]

فرانس کی پیش کش جس سے فائدہ نہ اٹھایا گیا:

۱۷۴۰ء (۱۱۵۳ھ) میں آسٹریا اور فرانس میں سخت کشیدگی پیدا ہو گئی جو ایک نئی جنگ پر منتج ہوئی۔ کئی سال کی لڑائیوں کے بعد آخری مرحلے میں فرانس کو شکست ہوئی۔ اس جنگ کے دوران، فرانس نے اپنے سفیر کے توسط سے بابِ عالی کو پیش کش کی کہ اگر وہ جنگ میں اس کا اتحادی بن کر آسٹریا پر حملہ کر دے، تو دونوں مل کر اس دشمن کو پوری طرح مغلوب کر لیں گے اور سلیمان عالی شان کے دور تک فتح کردہ تمام علاقہ ترکی کا مان لیا جائے گا اور اس کے بعد ترکی، آسٹریا سے بالکل بے فکر ہو کر اپنے دوسرے دشمن روس کی خبر لے سکے گا جو ترکی کو ہڑپ کرنے کی ٹھانے ہوئے ہے۔ سفیر نے متنبہ کیا کہ اگر اس وقت موقعے سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو یہ دشمن آئندہ سر اٹھا کر بہت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

مگر دربارِ خلافت میں اس پیش کش کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھا گیا، غالباً خلیفہ طویل جنگوں کے بعد اب اندرونی ترقی کے لیے یکسو رہنا چاہتا تھا اور بلاضرورت بندگانِ خدا کا خون نہیں بہانا چاہتا تھا۔ شاید امرائے دربار کو ان خطرات کا اندازہ اس وقت نہیں ہو سکتا تھا جو آئندہ روس کی طرف سے پیش آئے۔ بہر حال ایک مورخ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دشمنوں کو کچلنے کا ایک عمدہ موقع ضائع ہو گیا جو آگے چل کر بہت سی جنگوں، کئی شکستوں اور بے پناہ جانی و مالی اتلاف سے بچاؤ کا ذریعہ بن سکتا تھا۔[2]

یورپی مقبوضات کے انتظام میں فروگزاشت:

محمود اوّل کے دور میں ایک اور بڑی غلطی بھی ہوئی۔ امرائے دربارِ خلافت نے بحیرۂ اسود کی ساحلی ریاستوں: بغدان اور فلاخ کے نصرانی عمائد کی بغاوتوں کا علاج یہ تجویز کیا کہ وہاں کی حکومت اُن رومی تاجروں کے حوالے کر دی جائے جو استنبول سے وابستہ ہیں۔ چنانچہ ان ریاستوں کا انتظام رومی رئیسوں کے پاس آگیا جو بابِ عالی کو سالانہ خراج دینے کی پابندی کے سوا، تمام امور میں آزاد تھے۔ ان رومیوں نے سابق نوابوں کو بے عزت کرنے اور رعایا کو

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ۳۲۲ تا ۳۲۵؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوز تونا: ۱/ ۶۰۸ تا ۶۱۱

② تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۲۳، ۳۲۴

لوٹنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ایک مدت دراز تک یہ سلسلہ جاری رہا تو وہاں کے عوام وخواص نے روس کی بالادستی قبول کرنے میں عافیت سمجھی جس کے نتیجے میں وہاں بغاوتیں ہوئیں اور اگلے عشروں میں وہاں روس قابض ہو گیا۔ اگر باب عالی کی جانب سے وہاں عدل وانصاف پر مبنی نظام قائم رکھا جاتا تو بغاوتوں کا سلسلہ بھی بند ہو جاتا اور یہ علاقے روس کا حصہ بننے کو ترجیح نہ دیتے۔[1]

محمود اوّل کی وفات:

جمعہ ۲۷ صفر ۱۱۶۸ھ (۱۳ دسمبر ۱۷۵۴ء) کو محمود اوّل ۶۰ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ وہ ایک عادل، بردبار، رحم دل، دور اندیش اور بالغ نظر انسان تھا۔ اس نے ۲۵ سال حکومت کی اور خلافت کے گرتے ہوئے وقار کو سہارا دیا۔ اس کے دور میں سلطنتِ عثمانیہ نے اپنے بہت سے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے لیے۔ بلغراد کی فتح اس کا سب سے شاندار کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ علوم وفنون کی اشاعت اور کتب خانوں کے قیام کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ استنبول میں اس کے قائم کردہ چار کتب خانے اس کی علم دوستی کے گواہ ہیں۔[2]

+++

سلطان عثمان ثالث بن مصطفیٰ ثانی

(۱۱۶۸ھ تا ۱۱۷۱ھ (۱۷۵۸ء تا ۱۷۶۱ء))

محمود خان اوّل کے بعد اس کا بھائی عثمان ثالث ۵۸ سال کی عمر میں مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ وہ اس سے قبل اپنے بھائی کے دورِ حکومت میں اُسے احتیاطاً قید خانے میں رکھا گیا تھا، لہٰذا اتنی طویل قید کاٹ کر خلوت نشینی اس کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی۔[3] بہرکیف وہ ایک انصاف پسند حکمران تھا۔ رعایا کا حال معلوم کرنے کے لیے کبھی کبھار رات کو بھیس بدل کر گشت کرتا تھا۔ اس نے تین سال حکومت کی۔[4]

اس دور میں کوئی بیرونی لڑائی نہیں ہوئی اور خلیفہ اطمینان سے اندرونی انتظامات کو بہتر بنانے میں مشغول رہا۔ اس نے شریعت کی بالادستی کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور خلافِ اسلام چیزوں کی سختی سے ممانعت کی۔ عثمان ثالث کے دور میں بعض اندرونی بغاوتیں ہوئیں جن پر قابو پا لیا گیا۔ کردوں کی بغاوت غیر معمولی تھی مگر فرو کر دی گئی۔[5]

+++

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۲۵

② تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۲۵

③ تاریخ سلاطین بنی عثمان: ص ۱۰۹

④ الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۱۳، ۳۱۴

⑤ الدولۃ العثمانیۃ فی التاریخ الاسلامی الحدیث، از اسماعیل یاغی: ص ۱۲۱

سلطان مصطفیٰ ثالث بن احمد ثالث

۱۱۷۱ھ تا ۱۱۸۷ھ
۱۷۵۷ء تا ۱۷۷۳ء

مصطفیٰ ثالث ۴۲ سال کی عمر میں مسند نشین ہوا۔ اس نے مشرق تا مغرب وسیع سلطنت کے انتظامات کو بہتر بنانے کے لیے شعبہ خبر رسانی پر خاص توجہ دی تاکہ ہر شہر کے حالات جلد از جلد بلا کم و کاست معلوم ہوتے رہیں۔ اس دور میں شامی عربوں نے بغاوت کر کے حاجیوں کے قافلوں کو لوٹنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا مگر صدر اعظم راغب پاشا نے ایک مؤثر کارروائی کر کے ان پر قابو پالیا۔[1]

پیش بندی اور معاہدے:

مصطفیٰ ثالث نے اندازہ لگایا تھا کہ روس کی بڑھتی ہوئی طاقت، عالم اسلام خصوصاً خلافت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے، وہ جانتا تھا کہ زار پیٹر اعظم کی وصیت کے مطابق، استنبول کو فتح کر کے سلطنتِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنا، روسی حکومت کا اولین ہدف ہے۔ اس لیے مصطفیٰ ثالث، روس سے جنگ کے لیے دفاعی تیاریاں کرتا رہا۔ صدر اعظم راغب پاشا نے پروشیا سے روس اور آسٹریا کے خلاف دفاعی تعاون کا معاہدہ بھی کر لیا۔[2]

ترقیاتی کام:

اس دور میں بحری اور بری تجارتی راستوں کو وسعت دینے کی کوشش کی گئی۔ صدر اعظم راغب پاشا نے دریائے دجلہ کو نہری راستے سے بحیرۂ اسود کے ساتھ ملانے کے منصوبے کی بھی منظوری دے دی تاکہ تاجروں کے بحری جہاز بحر ہند سے سیدھے استنبول تک پہنچ سکیں۔ مگر اس منصوبے کے آغاز سے پہلے ہی ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) میں راغب پاشا کی وفات ہوگئی اور یہ کام ملتوی ہوگیا۔[3]

پیٹر اعظم کا وصیت نامہ:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ روس سے جنگوں کا احوال بتانے سے قبل یہاں پیٹر اعظم کے اس چودہ نکاتی وصیت نامے

---

(1) الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث، از یاغی: ص ۱۲۲ (2) تاريخ الدولة العلية العثمانية از محامی: ص ۳۳۰ تا ۳۳۱
(3) الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی، ص ۳۱۴

کا خلاصہ پیش کر دیا جائے جو آج تک روسی حکمرانوں کے لیے ایک منشور کی حیثیت رکھتا ہے، تاکہ اس قوم کی حکمت عملی اور اہداف کو ہم اچھی طرح سمجھ سکیں۔

❶ فوج کو ہمیشہ جنگ میں مشغول رکھا جائے۔ اگر آرام دینا ضروری ہو تو حملے کے لیے مناسب موقعے کو نگاہ میں رکھا جائے اور موقع ملتے ہی فوراً حملہ کر دیا جائے۔ روس کو چاہیے کہ وہ صلح اور امن کے وقت کو جنگ میں قوت کا ذریعہ بنائے اور جنگ کو صلح اور امن کے لیے ذریعہ بنائے۔

❷ جنگ کے دوران فوج کے نظم ونسق کے لیے ان تمام ممکنہ وسائل کو بروئے کار لایا جائے، جن سے یورپی قومیں خوب واقف ہیں۔ امن کے دور میں بھی علوم وفنون کے ماہرین کی خدمات حاصل کی جائیں۔ تمام ممالک کی اچھی چیزوں سے استفادہ کیا جائے۔

❸ موقع ملتے ہی یورپی ممالک کے معاملات اور مفادات میں دخل اندازی کی جائے، خصوصاً اختلافات اور تنازعوں کے وقت۔

❹ دوسرے ملکوں میں فساد، دشمنی اور نفرت پھیلانے کے لیے رشوت دی جائے اور دولت خرچ کی جائے۔

❺ روسی شاہی خانوادے پر لازم ہے کہ وہ یورپی شاہی خاندان ہی سے شادیاں کرے تاکہ ان ملکوں میں ہمارا اثر ورسوخ بڑھ سکے۔

❻ ریاست ''اسوج'' کی بعض سمتوں پر قبضہ کیا جائے، پھر باقی علاقے پر بھی تسلط حاصل کیا جائے۔[1]

❼ اپنی بحری قوت بڑھانے کے لیے برطانیہ سے اتفاق واتحاد اور تجارتی تعلقات بہت مفید ہوں گے۔

❽ روس کو دن بدن شمال میں بحیرۂ بالٹک اور جنوب میں بحیرۂ اسود کی طرف بڑھتے رہنا چاہیے۔

❾ استنبول اور ہندوستان کی طرف جس قدر ممکن ہو، پیش قدمی کی جائے۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ جو استنبول پر حکومت کرتا ہے، وہ ساری دنیا پر حکومت کر سکتا ہے۔ اس لیے مسلسل جنگیں چھیڑی جائیں۔ کبھی ترکی سے، کبھی ایران سے۔ یوں تدریجاً بحیرۂ اسود پر قبضہ کیا جائے

❿ آسٹریا سے اتحاد واتفاق کا بہت خیال رکھا جائے۔

⓫ ترکوں کو روملی (یوگوسلاویہ اور یونان) سے پسپا کرنے میں آسٹریا سے مدد لی جائے مگر استنبول پر قبضے کے بعد ہمیں چاہیے کہ آسٹریا پر یورپ کی قدیم مملکتوں کو مسلط کر دیں۔

⓬ ہنگری اور سلطنت عثمانیہ میں آباد ان نصرانیوں کو اپنی طرف مائل کرنا چاہیے، جو (روم کے) پوپ سے منحرف ہیں، تاکہ روسی حکومت ہی ان کی سرپرست اور مددگار رہے۔

---

[1] پولینڈ کی طرح یہ بھی یورپ اور روسی سرحدوں کے درمیان حائل ایک اہم ریاست تھی۔

⑬ یورپی، ایرانی اور عثمانی دشمنوں کو مغلوب کرنے کے بعد ہم بحیرۂ اسود اور بحیرۂ بالٹک کے درمیان اپنا فوجی مرکز بنائیں گے۔ اس کے بعد ہم پہلے فرانس اور پھر آسٹریا کے ساتھ طے کریں گے کہ دنیا کی حکومتوں کو کس طرح باہم بانٹ کر ہڑپ کرنا ہے۔ جب روس تمام مشرقی دنیا اور مشرقی یورپ کو فتح کرلے گا، تو فرانس اور آسٹریا کو بھی دبانا آسان ہوگا۔

⑭ بالفرض اگر یہ دونوں ملک ہمارے قابو میں نہ آئے تو ہم ان میں انتشار واختلاف کو ہوا دے کر باہم لڑا دیں گے۔[1]

اس وصیت نامے سے نہ صرف ہمسایہ ممالک بلکہ تمام دنیا کے لیے روس کے خطرناک عزائم بالکل ظاہر ہیں۔

روس سے جنگ اور شکست:

۱۱۸۲ھ (۱۷۶۸ء) میں روس کے ایماء پر اس کے باج گزار قوزاق حکمرانوں نے ترکی کی سرحدوں پر حملے شروع کردیے، اگرچہ خلافت کے حامی قرم کے تاتاری خانوں نے قوزاقوں کو مار بھگایا مگر اس دوران روسی جنرل جالسٹین نے پیش قدمی کرکے سرحدی شہر "شوکزیم" کو نرغے میں لے لیا تھا۔ استنبول سے امین پاشا نے محاذ پر پہنچ کر محاصرہ توڑنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر اس کی پیش نہ گئی۔

اس کے بعد علی پاشا کو بھیجا گیا مگر یہ فوج دریائے ڈینسٹر عبور کرتے ہوئے لہروں کی طغیانی کا شکار ہوگئی۔ جو سپاہی دوسرے کنارے پر پہنچے وہ روسی توپوں کی زد میں آکر شہید ہوگئے۔ یہ ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۱۸۳ھ (۱۸ ستمبر ۱۷۶۹ء) کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد روسی فوج نے آگے بڑھ کر بغدان اور افلاق (رومانیا) پر بھی قبضہ کرلیا۔[2]

روسی بحری جہاز، درۂ دانیال کے قریب:

دوسری طرف روسی کارندوں نے سازش کرکے "مورہ" میں بغاوت کرادی جو ناکام بنادی گئی۔ اسی دوران روس کا ایک بحری بیڑہ، ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل ازمیر کے قریب عثمانی بحریہ سے جا ٹکرایا۔ اگرچہ اسے شکست ہوئی مگر پسپائی کے بعد اس کے دو جہاز کیا یک "چشمہ" (ازمیر) کی بندرگاہ پر پہنچ گئے جہاں فتح مند عثمانی بیڑہ لنگر انداز تھا۔ روسی جہازوں کی اچانک گولہ باری سے ایک قطار میں کھڑے تمام جہازوں میں، گولہ بارود کی کثرت کے باعث آگ لگ گئی۔ اس کامیابی نے روسی جنرل الفنسٹن کو یقین دلایا کہ درۂ دانیال میں ترکوں کے دفاعی انتظامات کمزور ہیں، چنانچہ اس نے براہِ راست استنبول کی بندرگاہ پر اسی قسم کے حملے کا منصوبہ بنایا مگر اس سے پہلے اس نے ترکی کے قریب ایک معسکر کی ضرورت محسوس کی اور درۂ دانیال سے کچھ دور جزیرہ لموس کو فتح کرنے کی کوشش شروع کردی۔

سلطان مصطفیٰ ثالث نے اس وقت فوری فیصلہ کیا اور ہنگری کے ایک ماہر انجینئر بیرن ڈی توت کو درۂ دانیال کے دونوں کناروں پر قلعے بنانے اور ان میں توپیں نصب کرنے کا حکم دیا۔ نیز ایک نیا کارخانہ کھلوا کر نئی توپوں کی تیاری کا

---

① تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامی: ص ۳۳۰ تا ۳۳۵

② تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامی: ص ۳۳۵ ، الدولة العثمانية فی التاريخ الاسلامی الحديث از اسماعيل ياغی: ص ۱۲۲

کام بھی شروع کرا دیا گیا۔ ساتھ ہی اس نے اسلحہ سازی اور جدید حربی مہارت کا ایک مدرسہ کھلوا دیا جس سے نوجوان ترک افسران نے کچھ ہی عرصے میں اسلحہ سازی اور جدید جنگی حکمت عملی میں مہارت حاصل کر لی۔

اس تربیت کے نتیجے میں قبطان (کپتان) حسن بیگ چند بحری جہاز لے کر ۱۷۷۱ء (۱۱۸۵ھ) میں جزیرہ لمنوس پہنچا اور روسی افواج کو آناً فاناً راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔[1]

روسیوں کی پسپائی، مظالم اور بزدلی:

یوں روس سے جاری اس جنگ کے کئی مراحل میں ترکوں کا پلہ بھاری رہا۔ کچھ مزید معرکوں اور مذاکرات کے کئی ادوار کے بعد ۲۳ ذوالقعدہ ۱۱۸۶ھ (۱۵ نومبر ۱۷۷۳ء) کو روسی ملکہ کیتھرائن کے سفیر نے جنگ بندی کے لیے شرائط پیش کیں کہ: ❶ سلطنتِ عثمانیہ قرم، جسن کریش اور یکی قلعہ کے علاقوں سے دست بردار ہو جائے۔

❷ روسی جہازوں کو بحیرۂ اسود اور جزائر یونان کے آس پاس گزرنے کی کھلی اجازت دی جائے۔

خلیفہ مصطفیٰ ثالث نے ان شرائط کو مسترد کر دیا، جس کے بعد دریائے ڈینیوب کے کنارے دوبارہ جنگ چھڑ گئی، یہاں ''بخارست'' کے جنوب مشرقی شہر ''سلستریا'' اور جنوب مغربی شہر ''روست جوق'' پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے روسیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر دونوں جگہ انہیں شکست ہوئی اور وہ آٹھ ہزار سے زائد لاشیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ جاتے ہوئے وہ اپنا غصہ اتارنے کے لیے ایک چھوٹے شہر ''بازارجق'' میں گھس گئے اور بلاتفریق ان گنت بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد روسی افسران دسترخوان سجائے بیٹھے تھے کہ ترک لشکر کے تعاقب میں آنے کی خبر ملی، جس پر وہ خوف زدہ ہو کر افراتفری کے عالم میں اپنی سرحدوں کی طرف بھاگ گئے۔ ترک جب شہر میں داخل ہوئے تو ہانڈیوں اور رکابیوں میں گوشت جوں کا توں رکھا تھا۔[2]

اس واقعے سے روسیوں کی بے رحمی کے ساتھ ساتھ ان کی بزدلی کا بھی خوب اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

روس کے ایماء پر مصر میں بغاوت:

روس خلافتِ عثمانیہ کے خلاف خفیہ جنگ بھی لڑ رہا تھا اور اندرونی بغاوتیں کرا کے، ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازشیں شروع کر چکا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کی طرف سے مصر کا امیر علی بیگ تھا جسے روسی سفیروں نے سہانے سپنے دکھا کر بغاوت پر آمادہ کیا اور یقین دلایا کہ اسے ایک آزاد حکمران مان کر اس کی ہمیشہ پوری مدد کی جائے گی۔ شام کے ساحلی شہر عکا کا حاکم طاہر عمر بھی اس سازش میں شریک ہو گیا جس کے بعد ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) میں علی بیگ نے مصر کا خودمختار حکمران ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ کچھ دنوں بعد وہ مصر سے لشکر لے کر شام پہنچا جہاں طاہر عمر کی مدد سے اس نے یافا، صیدا، اور بیروت پر چڑھائی کی۔ اس دوران روسی بحریہ اسے مدد دے رہی تھی، اس لیے اسے وقتی طور پر کچھ کامیابیاں ہوئیں

---

[1] قپودان یا قبطان، ترک بحریہ کا اعلیٰ عہدہ تھا۔ یہ لفظ فارسی اور اردو میں کپتان اور انگریزی میں کیپٹن بن گیا۔

[2] تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامی: ص ۳۳۷ تا ۳۳۹

مگر جوں ہی وہ مصر لوٹا، وہاں عثمانی جرنیل محمد بیگ، اس کے مقابلے کے لیے تیار تھا۔ باغیوں کو شکست فاش ہوئی اور علی بیگ کا سر قلم کر دیا گیا۔ محمد بیگ اس کے فوراً بعد طاہر عمر کی سرکوبی کے لیے عکا پہنچا۔ اگرچہ محمد بیگ شہر کو بازیاب کرانے سے پہلے وفات پا گیا مگر عثمانی افواج نے جنگ جاری رکھی اور عکا کو آزاد کرا کے طاہر عمر کو پکڑ لیا۔ اسے سزائے موت دے دی گئی۔[1]

سلطان مصطفیٰ ثالث کی وفات:

روس سے چھ سالہ جنگ میں مسلسل فکر مندی اور اپنے علاقے چھن جانے کے غم نے سلطان مصطفیٰ ثالث کی طبیعت پر سخت اثر ڈالا اور وہ بیمار پڑ گیا۔ ۸ ذوالقعدہ ۱۱۸۷ھ (۲۱ جنوری ۱۷۷۴ء) کو اس کی وفات ہو گئی۔ اس کی عمر ۵۷ سال تھی۔ اس نے سولہ سال عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی اور جذبۂ جہاد کے ساتھ زندہ رہا۔ اگرچہ اس کے دور میں روس نے کئی علاقوں پر قبضہ کیا جو واپس نہ لیے جا سکے مگر اس نے حریف کو برابر کی چوٹ دی اور اس کی شرائط پر سر نہ جھکایا۔[2]

وہ سخی اور مہربان تھا اس نے کئی درسگاہیں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ استنبول کے مشرقی محلے اسکدار میں اس نے اپنے والد کی قبر کے ساتھ ایک جامع مسجد بنوائی۔ مسجد سلطان محمد فاتح کی مرمت کرا کے اسے مستحکم کیا۔[3]

◆◆◆

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص۳۳۹، ۳۴۰، ۳۵۹

② الدولۃ العثمانیۃ فی التاریخ الاسلامی الحدیث، از اسماعیل یاغی: ۱۲۳

③ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص۳۴۰

سلطان عبدالحمید اوّل بن احمد ثالث

۱۱۸۷ھ تا ۱۲۰۳ھ

۱۷۷۳ء تا ۱۷۸۸ء

مصطفیٰ ثالث کے بعد اس کا بھائی ۴۹ سالہ عبدالحمید اوّل، جو اپنے بھائی کی حکومت کے دوران نظر بند تھا مسند خلافت پر بیٹھا۔ وہ سلطان احمد ثالث کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس نے پندرہ سال تین ماہ حکومت کی اور ۶۴ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ ①

روس سے جنگ اور معاہدۂ قینارجہ:

اس کی مسند نشینی کے وقت روس سے جنگ جاری تھی۔ مصطفیٰ ثالث کی موت سے باب عالی کو پہنچنے والے صدمے سے روسیوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور جون ۱۷۷۴ء (ربیع الآخر ۱۱۸۸ھ) میں روس کے فیلڈ مارشل رومانزوف نے محاذ پر بکھری ہوئی تمام افواج کو جمع کر کے دریائے ڈینوب عبور کر کے شہر "وارنا" کی طرف یلغار کر دی۔ ترک جرنیل عبدالرزاق آفندی نے روسی فوج کو روکنے کی کوشش کی مگر ۱۲ جولائی ۱۷۷۴ء (۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۸۸ھ) کے خونریز معرکے میں روسیوں کو فتح ہوئی اور انہوں نے صدر اعظم محسن زادہ کے معسکر کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔

صدر اعظم نے اپنا پلہ کمزور دیکھ کر مذاکرات کی پیش کش کی، یوں بلغاریہ کے شہر قینارجہ میں ایک معاہدہ ہوا جس کی اہم دفعات یہ تھیں:

❶ روس اور ترکی کے مابین دشمنی کی جگہ دوستانہ تعلقات قائم ہوں گے۔
❷ فریقین، ایک دوسرے کے غداروں اور مجرموں کو پناہ نہیں دیں گے۔
❸ "قرم" کو خود مختاری دی جائے گی، عثمانی افواج وہاں سے انخلاء کر جائیں گی۔ وہاں کے لوگ اپنا حکمران خود منتخب کریں گے۔ ان پر کوئی خراج لاگو نہیں ہوگا۔ البتہ شرعی معاملات میں وہ خلیفہ سے رہنمائی لیں گے۔
❹ روسی سفیر کو دربار خلافت میں اعلیٰ مقام دیا جائے گا اور سابقہ رنجش کی معافی مانگی جائے گی۔
❺ خلافت اپنی حدود میں نصرانیوں کے حقوق کا لحاظ کرے گی، ان کے گرجوں میں مداخلت نہیں کرے گی۔

---

① تاریخ الدولة العلیة العثمانیة از فرید بک محامی: ص ۳۴۱

❻ روسی پادری، بیت المقدس سمیت دیگر مذہبی مقامات کے سفر کے لیے آزاد ہوں گے۔

❼ روسی جہاز رانوں اور تاجروں کو بحیرۂ روم اور بحیرۂ اسود کی تمام بندرگاہوں پر آمد ورفت کی اجازت ہوگی۔

❽ روسی حکومت کو افریقی ممالک میں تجارتی امور اور معاہدوں کی اجازت ہوگی۔

❾ روسی حکومت، استنبول کی شاہراہ پر ایک گرجا تعمیر کرے گی۔

❿ روس بحیرۂ روم کے جو جزیرے خلافتِ عثمانیہ کی تحویل میں واپس دے گا، وہاں کے باشندوں کو عام معافی اور مکمل مذہبی آزادی دی جائے گی اور ان پر جزیہ عائد نہیں ہوگا۔[1]

صلح کا خاتمہ اور دوبارہ جنگ:

اس معاہدے کی منظوری کو روس نے اپنی فتح شمار کیا، ملکہ کیتھرائن نے خوشی سے بے قابو ہوکر ماسکو میں جشن منایا، کیوں کہ تاریخ میں پہلی بار ترکی نے اپنی حریت اور آزادی کے خلاف شرائط پر سمجھوتہ کیا تھا۔

اس دوران روس اور آسٹریا ریاست اسوج اور بولونیا کے بڑے حصے پر قبضہ کرکے انہیں باہم بانٹ چکے تھے۔ اس طرح روس اور یورپ کے درمیان حائل جغرافیائی رکاوٹیں تقریباً ختم ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد روس اپنی پوری توجہ ترکی سے جنگ پر مرکوز کر سکتا تھا۔

چنانچہ روس نے معاہدے میں اپنے اوپر لاگو ہونے والی کسی پابندی کا خیال نہیں کیا اور "قرم" سے ترک افواج کے انخلاء کے فوراً بعد وہاں ستر ہزار سپاہی تعینات کرکے اسے عملاً اپنے قبضے میں لے لیا۔

خلیفہ عبدالحمید اول نے اس اطلاع پر صلح کو یکسر مسترد کرکے جنگ کا اعلان کرنے کا فیصلہ کرلیا مگر فرانس کے سفیر نے تحمل کا مشورہ دیا اور کہا کہ روس، آسٹریا سے خفیہ دفاعی معاہدہ کر چکا ہے، اور اس حرکت کا مقصد ہی یہ ہے کہ ایک نئی جنگ چھیڑ کر ترکی کو تباہ کیا جائے۔

خلیفہ جانتا تھا کہ اس وقت ترکی کی حالت اتنی مضبوط نہیں کہ ایک نئی جنگ میں فتح کی امید کی جاسکے، اس لیے قرم کا روس سے الحاق برداشت کرلیا گیا۔ لیکن روس کی زیادتیاں بڑھتی چلی گئیں، اس نے سیواسٹوپول کے ساحل پر قلعہ بندی شروع کردی اور بحیرۂ اسود میں جنگی بیڑا لا کھڑا کیا۔ روسی جاسوس، دولتِ عثمانیہ کے یورپی صوبوں میں پھیل کر نصرانیوں کو بغاوت پر اکسانے لگے، جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ روس جنگ پر تلا ہوا ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اگست ۱۷۸۷ء (شوال ۱۲۰۱ھ) میں بابِ عالی نے بھی صلح کو مسترد کردیا اور روسی سفیر کو گرفتار کرکے جنگ کا اعلان کردیا۔ اس دوران کیتھرائن کی تاکید پر آسٹریا کے حکمران جوزف دوئم نے بھی اعلان جنگ کردیا۔ وہ "شبش" کو معسکر بنا کر آگے بڑھا اور بلغراد پر قبضہ کرلیا۔ مگر اس دوران صدرِ اعظم یوسف پاشا استنبول سے تیز ترین کوچ کرتا ہوا لشکرِ جرار کے ساتھ محاذ پر پہنچ گیا، اس نے ۲۱ ستمبر ۱۷۸۸ء (۱۹ ذوالحجہ ۱۲۰۲ھ) کو شبش کی وادی میں جوزف

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۴۰ تا ۳۵۴

دوئم کی فوج کو پارہ پارہ کر ڈالا۔ آسٹریا کے پچاس ہزار سپاہی قیدی بنے۔ شاہِ آسٹریا جوزف دوئم گرفتاری سے بال بال بچ کر بھاگ نکلا اور بلغراد دوبارہ ترکوں کے قبضے میں آ گیا۔

اُدھر شمال مشرقی محاذ پر روسی جنرل پوٹمکین ۸۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ یلغار کر کے بحیرہ اسود کی مغربی بندرگاہوں ''بندر'' اور ''اوزی'' پر قابض ہو گیا تھا۔ اوزی میں ترک سپاہیوں کے علاوہ ۲۵ ہزار معصوم شہریوں کو بھی قتل کر کے خون کی ندیاں بہادی گئیں۔[1]

یہ جنگ جاری تھی کہ ۱۲ رجب ۱۲۰۳ھ (۸ اپریل ۱۷۸۹ء) کو سلطان عبدالحمید اوّل کی وفات ہو گئی۔ اس کی عمر ۶۶ سال تھی، اس نے پندرہ سال آٹھ ماہ تک حکومت کی۔[2]

◆◆◆

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱/۶۳۹، ۶۴۰

② تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۶۲

سلطان سلیم خان ثالث بن مصطفیٰ ثالث

۱۲۰۳ھ تا ۱۲۲۲ھ

۱۷۸۸ء تا ۱۸۰۷ء

سلطان مصطفیٰ ثالث کا بیٹا سلیم خان ثالث، اپنے چچا عبدالحمید کے بعد تخت نشین ہوا تو جنگ کی بھٹی پوری شدت سے تپ رہی تھی۔ اگرچہ ترکوں کی ہمت ٹوٹنے لگی تھی مگر سلیم ثالث نے نہایت حوصلے کے ساتھ حالات کا سامنا کیا اور پرچم جہاد کو جھکنے نہ دیا۔

قوم سے ولولہ انگیز خطاب:

اس نے مسند نشین ہونے کے بعد عمائدِ قوم کو مخاطب کر کے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس میں ان اسباب کا ذکر کیا جو ماضی میں پسپائی کا باعث بنے تھے۔ اس نے کہا کہ مسلمانوں کا دین سے دور ہوتے جانا اور کتاب وسنت کی اتباع کو ترک کر دینا ان شکستوں کا اصل سبب ہے۔ اس نے جہاد، قربانی، اور ایثار کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہم اللہ پر توکل کر کے ان دشمنوں سے لڑتے رہیں گے جو مسلمانوں کے علاقوں پر قابض ہو کر ہزاروں بے گناہوں کو قتل اور گرفتار کر چکے ہیں، یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک صوبہ قرم واپس نہیں لے لیا جاتا۔[1]

دفاعی ترتیب اور حکمتِ عملی:

سلیم ثالث نے اسپین، فرانس اور پروشیا کے سفیروں کی طرف سے جنگ بندی کی سفارشات کو مسترد کر دیا اور صدر اعظم کو تاکید کی کہ تمام محاذوں خصوصاً دریائے ڈینوب کے کنارے افواج کو متحرک رکھا جائے۔ اس نے فوج کے بجٹ اور دفاعی اخراجات میں اس قدر خطیر اضافے کیے جو گزشتہ ادوار میں کبھی نہیں کیے گئے تھے۔[2]

اس نے اپنے پرانے دوست حسین پاشا کو امیر البحر مقرر کیا اور بری فوج کی کمان حسن پاشا کے سپرد کی۔ روسی سرحدی قصبے "اسماعیل" پر ایک امیر مقرر کر کے اسے تاکید کی کہ وہ کسی بھی قیمت پر قلعہ اوزی کو روس سے واپس لے، اور بری راستے

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص۳۲۰

② الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص۳۲۰

سے قرم کی طرف یلغار کرے۔ ①

سلیم ثالث نے روس اور آسٹریا کے مقابلے میں حلیفوں کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے سویڈن سے دفاعی معاہدہ کرلیا اور اس سے مطالبہ کیا وہ شمال سے روس پر حملہ کردے، اس خدمت کے بدلے اسے دس سال تک سالانہ ایک خطیر رقم پیش کی جائے گی۔ ②

روس اور آسٹریا سے جنگ۔ صلح کا معاہدہ:

فوکشانی کے محاذ پر روس اور آسٹریا کی فوجیں ایک ساتھ پہنچیں۔ یہاں یکم اگست ۱۷۸۹ء (۸ ذوالقعدہ ۱۲۰۳ھ) کی جنگ میں ترک سپہ سالار مصطفیٰ پاشا نے تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ، اتحادیوں کے سیلاب سے ٹکر لی اور اسے پسپا کردیا۔

ترک افواج پیش قدمی کرتے ہوئے آسٹریا کی سرحد میں دریائے رمینک تک پہنچ چکی تھیں کہ ایک دن، خلافِ توقع روسی اور آسٹرین فوج نے ''بوزاؤ'' کے میدان میں ان پر دھاوا بول دیا۔ ترک اس حملے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ۲۲ ستمبر ۱۷۸۹ء (یکم محرم ۱۲۰۴ھ) کو برپا ہونے والے اس معرکے میں ترکوں کو شکست ہوئی اور ان کے ۲۳ ہزار مجاہد شہید ہوئے، جس کے بعد آسٹریا نے افلاق کے مرکز بخارسٹ، اور روس نے بغدان کے پایہ تخت یاشی پر قبضہ کرلیا۔ ③

اس شکست کا سلطنتِ عثمانیہ کے دفاع پر سخت منفی اثر مرتب ہوا اور اس کے بعد نیا دفاعی خط قائم کرنا ممکن نہیں رہا، لہٰذا ترک افواج دریائے ڈینوب کے جنوب کی طرف پسپا ہوگئیں اور رومانیہ سے ان کا زمینی اتصال ختم ہوگیا۔ ۱۸ اکتوبر (۷ امحرم) کو آسٹریا کے جنرل لوڈن نے تین ہفتوں کے محاصرے کے بعد بلغراد پر بھی قبضہ کرلیا۔

آسٹرین فوجوں نے اس کے بعد دریائے ڈینوب عبور کرنے کی کوشش کی مگر ترکوں کے جوابی حملے میں وہ پانچ ہزار لاشیں اور ایک ہزار قیدی چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔ جس سے ظاہر ہوگیا کہ آسٹریا کے لیے دریائے ڈینوب کے جنوبی علاقے میں گھسنا ممکن نہیں۔ اُدھر غازی حسن پاشا نے ۲۳ ستمبر (۲ محرم) کو وادیٔ اسماعیل میں روسی جنرل بوتمکین کو پندرہ ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کردیا۔

یہ جنگ اگلے سال تک جاری رہی۔ اس دوران چار اہم قلعے: کیلی، اسماعیل، ہتلکا، اور ''ایساکچی'' روس کے قبضے میں آگئے۔ قصبہ اسماعیل پر قبضے کے بعد جنرل بوتمکین نے تیس ہزار مسلمانوں کو تہ تیغ کرکے اپنی درندگی کا ثبوت دیا۔

تین سال دس ماہ تک جاری رہنے والی اس جنگ میں کسی فریق کو غالب برتری نصیب نہیں ہوئی۔ بے پناہ جانی ومالی نقصانات کے بعد ۴ اگست ۱۷۹۱ء (۳ ذوالحجہ ۱۲۰۵ھ) کو آسٹریا نے صلح کرکے بلغراد اور افلاق سے دست برداری قبول کرلی۔

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی۔ ص ۳۲۱

② الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی۔ ص ۳۲۱

③ تاریخ الدولة العثمانية از یلماز: ۱/۹۳۱ ؛ الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۲۱، ۳۲۲

۹ جنوری ۱۷۹۲ء (۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۰۶ھ) کو روس نے بھی برطانیہ کے تعاون سے ہونے والی بات چیت کے بعد صلح کے معاہدے کو قبول کرلیا، جس کے مطابق:

❶ بغدان، اکرمان، بیساراپیا، بودولیا، اور بوجاق، ترکی کو واپس مل گئے۔

❷ بندرگاہ ازوف، بلادِ قرم، جزیرہ نما طمان، بلادِ قوبان، بسارابیا اور دریائے بوگ اور دینسٹر کے درمیان واقع بحیرۂ اسود کے ساحلی علاقے اپنے قلعوں سمیت روس کے حوالے کردیے گئے۔

❸ دریائے ڈینسٹر کو روس اور ترکی کے درمیان سرحد مان لیا گیا۔

❹ قیدیوں کا تبادلہ کیا گیا اور رعایا کو عام معافی، امن وامان اور کہیں بھی رہنے یا نقل مکانی کی اجازت دی گئی۔[1]

معاہدے میں یورپی طاقتوں کی دلچسپی کی وجہ:

یہ معاہدہ کرانے میں برطانیہ اور بعض یورپی ممالک نے غیر معمولی دلچسپی لی، جس کی چند وجوہ تھیں:

❶ جنگ جاری رہنے سے ان کے تجارتی منافع پر بھاری ضرب لگ رہی تھی جو وہ بحیرۂ اسود، بحیرۂ احمر اور بحیرۂ روم کے راستوں سے امن کی حالت میں حاصل کررہے تھے۔ اس کے علاوہ روس کے مقابلے میں وہ سلطنتِ عثمانیہ کو ایک مضبوط آڑ تصور کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں مسلمانوں کے مفاد سے کوئی غرض نہیں تھی، مگر وہ روس سے خطرہ محسوس کررہے تھے، اس لیے سلطنتِ عثمانیہ کا باقی رہنا، اس وقت خود ان کی سیاسی وتجارتی مصلحتوں کے لیے اہم تھا۔ مگر ساتھ ہی وہ سلطنتِ عثمانیہ کی واضح برتری کے حق میں بھی نہیں تھے، اس لیے دوستی کا دم بھرنے کے باوجود سویڈن سمیت کسی یورپی ملک نے ترکی کا عملاً ساتھ نہیں دیا کیوں کہ سلطنتِ عثمانیہ کا استحکام بھی وہ اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔

❷ یورپ میں پاپائیت کو کلیسا تک محدود کرنے کی تحریک کی کامیابی کے بعد، اب شہنشاہیت کے خلاف تحریک تیز تر ہوگئی تھی۔ فرانس میں جمہوری انقلاب آچکا تھا۔ اس تحریک کے اثرات دوسرے یورپی ممالک میں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے میں ہر یورپی حکمران مشرقی یورپ میں چھڑی ہوئی جنگ کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ تصور کرتے ہوئے امن وامان چاہتا تھا تاکہ وہ اپنے اندرونی استحکام کی طرف متوجہ ہوکر جمہوریت کا راستہ روک سکے۔

❸ فرانس نپولین کی قیادت میں، یورپ کی سب سے بڑی طاقت بنتا جارہا تھا اور اپنے حریف ممالک سے صدیوں کی شکستوں کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ نپولین کو روکنے کے لیے ضروری تھا کہ روس اور آسٹریا کو سلطنتِ عثمانیہ سے الجھنے سے بچا کر فرانس کے مقابلے میں کھڑا کیا جاتا۔

روس اور یورپ کو ملنے والے فوائد:

اگرچہ یہ معاہدہ خود سلطنتِ عثمانیہ کے دفاع، سرحدات کے تحفظ اور اگلی جنگ کی تیاری کے لیے ناگزیر تھا مگر روس اور یورپ نے اس کے ذریعے اپنے کئی اہم اہداف حاصل کرلیے، مثلاً:

---

[1] تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز: ۱/ ۶۳۱، ۶۳۲ و الدولة العثمانیة، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۲۳

(۱) دریائے ڈینیوب کے پار سلطنتِ عثمانیہ کے تمام مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے اور مشرقی یورپ میں اس کی افواج انتہائی دفاعی ہیئت میں آگئیں۔

(۲) ازوف، اوڈیسا اور سیفاستبول جیسی بندرگاہیں، روسی بحریہ کے اڈے بن گئیں۔

(۳) دریائے ڈینیوب، دریائے ونیج، دریائے ڈینسٹر اور دریائے بروت کے ڈیلٹا روس کے قبضے میں آگئے۔

(۴) روس اور یورپی ممالک سلطنتِ عثمانیہ کو پہلے کمزور، پھر شکست اور آخر میں ختم کرنے کے اس مشترکہ ہدف کی طرف پیش رفت میں کامیاب ہو گئے، جس کی طرف ان کے سیاست دان، فلسفی، شعراء اور ادیب ایک عرصے سے دعوت دے رہے تھے۔ باہمی اختلافات اور تنازعات کے باوجود خلافتِ عثمانیہ کا سقوط ان سب کا نصب العین تھا۔

یورپ کا فکری و سیاسی انقلاب:

سلطنتِ عثمانیہ اور فرانس میں چار صدیوں سے کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی۔ ۱۳۹۶ء (۷۹۸ھ) میں "نکوپولو" کی جنگ ان دونوں ملکوں کے مابین واحد لڑائی تھی۔ اس کے بعد سیاسی اختلافات یا کشیدگی کی نوبت تو آتی رہی مگر باقاعدہ کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ بلکہ سلیمان عالی شان کے دور میں فرانس کے ساتھ خوش گوار مراسم قائم ہوئے، جو بعد میں بھی باقی رہے۔ سلیم ثالث کی تخت نشینی کے چند ماہ بعد ۱۷۸۹ء (۱۲۰۳ھ) میں فرانس میں جمہوری انقلاب آیا جو اپنے پیچھے ایک خاص پس منظر رکھتا تھا۔ سترہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جبکہ فرانس پر شاہ لوئیس چہاردہم کی حکومت تھی، لوگ حکام کے مظالم اور جاگیردارانہ نظام سے تنگ آچکے تھے۔ مناصب سے لے کر اعزازات اور شرافت و عالی نسبی کے تمغے، سب کچھ متاعِ بازار بن چکا تھا۔ بدعنوان اور بدکردار لوگوں کی بالادستی کے راستے کھلے تھے۔ ٹیکسوں نے عوام کی کمر توڑ دی تھی مگر امیر ترین لوگ رشوت دے کر ٹیکس سے بالکل آزاد تھے۔ اس صورتحال سے ملک میں معاشی بدحالی پھیل گئی تھی۔ یورپی فلسفی اور مفکرین جن میں خاصی تعداد یہودیوں کی تھی، ایک مدت سے مذہب کو دقیانوسیت اور شہنشاہیت کو ناموزوں قرار دے کر عقلیت پسندی اور عوامی حکمرانی کے حق میں آواز بلند کر رہے تھے۔ حریت، اخوت اور مساوات ان کے اہم عنوانات تھے۔ اس فکر کو پروان چڑھانے میں روسو، مونٹیسکو اور والٹیئر کا کردار بہت اہم تھا۔ اگرچہ ان کی آراء میں اختلاف بھی تھا مگر مذہبی، سیاسی و معاشرتی اقدار میں تبدیلی کی ضرورت پر یہ سب متفق تھے۔

والٹیئر (۱۶۹۴ء تا ۱۷۷۸ء) معاشرتی اقدار کا ناقد تھا اور چرچ کو شرمناک ادارہ کہا کرتا تھا۔ مگر وہ جمہوریت کے مقابلے میں ایک مطلق العنان حکومت کا حامی تھا اور کہتا تھا کہ سو چوہوں کی بجائے ایک شیر کی ماتحتی زیادہ بہتر ہے۔

مونٹیسکو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۵ء) کا کہنا تھا کہ جب تک اختیارات کی تقسیم نہیں ہوگی، مطلوبہ آزادی میسر نہیں آسکتی۔ اس کے خیال میں عدلیہ، انتظامیہ اور قانون ساز اداروں کے اختیارات مختلف تنظیموں کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں تاکہ عوام کی آزادی کا خواب پورا ہو سکے۔ مونٹیسکو کی تصنیف "Spirt of Laws" (روحِ قوانین) نے جو ۱۷۴۸ء (۱۱۶۱ھ) میں شائع ہوئی یورپ میں جمہوری نظریات کو پروان چڑھانے میں بہت مؤثر کردار ادا کیا۔

روسو (۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء) کا کہنا تھا کہ تمام سیاسی نظاموں کو ختم کر کے انسان کو اس کی فطری حالت پر چھوڑ دیا جائے، وہ خود اپنے لیے بہتر نظام چن لے گا۔ اس نظام کا اظہار انسانوں کی ایسی حکومت سے ہوگا جس کا نصب العین انسانوں کی آزادی میں حتی الامکان اضافہ کرنا ہو۔

یہودیوں کو اس تحریک سے اس لیے دلچسپی تھی کہ آمرانہ طرزِ حکومت کی جگہ ایک جمہوری معاشرے میں وہ آسانی سے پھل پھول سکتے تھے، اس لیے ان کی خفیہ تنظیم فری میسن جمہوریت کی راہ ہموار کرنے میں پیش پیش تھی۔ ①

فرانس میں جمہوریت:

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب لوئیس شانزدہم بادشاہ بنا تو فوج اور دربار شاہی کے خاصے ارکان جمہوری تحریک سے متفق ہو چکے تھے۔ لہٰذا مئی ۱۷۸۹ء (شعبان ۱۲۰۳ھ) میں جب بادشاہ نے تین طبقات: یعنی اشرافیہ، مذہبی رہنماؤں اور عوامی نمائندوں کو طلب کر کے یہ عندیہ دیا کہ ملک کو افلاس سے نجات دلانے کے لیے مزید ٹیکس لاگو کرنا ضروری ہو چکا ہے، تو عوامی نمائندوں نے اسے سختی سے مسترد کر کے، ایک جماعت تشکیل دے ڈالی اور اعلان کیا کہ ملک کے جدید دستور کی تشکیل کا اختیار عوام کے سوا کسی کو نہیں۔ شاہ لوئیس شانزدہم نے فوجی طاقت استعمال کر کے، اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کی اور بے شمار افراد کو باسٹل جیل میں ٹھونس دیا مگر عوامی جماعت نے بھی مسلح جتھے بنا کر فوج کا مقابلہ شروع کر دیا اور ۱۴ جون کو جیل توڑ کر قیدیوں کو آزاد کرا لیا۔

آخر بادشاہ نے مجبور ہو کر عوامی تحریک کو ملک کے جدید دستور کی تشکیل کا حق دے دیا۔ جمہوریت پسندوں نے طے کیا کہ ملکی دستور میں بادشاہ کا کردار محدود ہوگا اور پارلیمنٹ قانون سازی کی مجاز ہوگی۔

ان دنوں روس اور آسٹریا، سلطنتِ عثمانیہ سے جنگ میں مصروف تھے۔ آسٹریا نے فرانس میں انقلاب آتا دیکھ کر جنگ کو بند کرنا ضروری سمجھا اور جنگ بندی کے فوراً بعد اس نے پروشیا کو ساتھ ملا کر شاہِ فرانس کی حمایت کا اعلان کر دیا اور اسے پہلے کی طرح بااختیار بنانے کا مطالبہ کر کے اپریل ۱۷۹۲ء میں فرانس پر حملہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر فرانس کی جمہوری جماعت نے بادشاہ کو معزول کر کے جیل میں ڈال دیا اور ستمبر ۱۷۹۲ء میں فرانس کے جمہوریہ ہونے کا اعلان کر دیا۔

نپولین بوناپارٹ کا ظہور:

اس دوران فرانسیسی فوج کا نوجوان افسر نپولین بوناپارٹ، ابھر کر سامنے آیا اور اس نے فرانس کو بحرانی حالت سے

---

① فری میسن یہودیوں کی قدیم خفیہ تنظیم ہے جو صدیوں سے ایک عالمگیر صیہونی حکومت قائم کرنے کے لیے سرگرم ہے۔ اس کے کارکن ہر ملک کی بااثر شخصیات کو اپنا رکن بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حریت، اخوت اور مساوات جیسے خوشنما عنوان اس تنظیم کو بظاہر مثبت سرگرمیوں میں مشغول دکھاتے ہیں مگر درحقیقت اس کے عزائم ہر قوم کے لیے سخت خطرناک ہیں۔ یہ تنظیم اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں یورپ کے مختلف ممالک کے سرکردہ سیاست دانوں اور دانشوروں کو اپنا حلقہ بگوش بنا چکی تھی جس کے بعد اس کی سازشیں تیزی سے کامیاب ہونے لگیں۔ یہودیوں کی آج دنیا پر سیاسی واقتصادی اور فکری ونظریاتی اجارہ داری کے پیچھے فری میسن تحریک کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

نکال کر ایک نئے دور میں داخل کر دیا۔ نپولین ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ فرانس کی عسکری درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہوا۔ اپنی غیر معمولی ذہانت وشجاعت اور عسکری مہارت کے باعث وہ تیزی سے ترقی کر کے اعلیٰ افسر کے منصب تک پہنچا اور اسی دوران جمہوری تحریک کا رکن بھی بن گیا۔ ۱۷۸۹ء کے انقلاب کے بعد اس کا رتبہ مزید بلند ہو گیا اور ۱۷۹۲ء میں وہ فوج کا سپہ سالار اعلیٰ بنا دیا گیا۔ تب اس کی عمر صرف ۲۳ سال تھی۔

جب آسٹریا نے جمہوریت پسندوں کو کچلنے کے لیے فرانس پر حملہ کیا تو نپولین نے فوج کے سربراہ کی حیثیت سے ملک کا کامیاب دفاع کر کے دکھایا۔ اس سلسلے میں ۱۷۹۶ء سے ۱۷۹۷ء تک جاری رہنے والی جنگ بہت اہم ہے جس میں نپولین نے نسبتاً کم نفری کے ساتھ آسٹریا کی افواج کو چار میدانوں میں شکست فاش دی۔ جب وہ فاتح بن کر لوٹا تو پیرس میں اس کا ایک قومی ہیرو کی طرح استقبال ہوا۔ اگرچہ اس نے باقاعدہ اپنی حکومت کا اعلان نہیں کیا تھا مگر اب عملی طور پر فرانس کا قائد وہی تھا اور قوم اس کے پیچھے تھی۔[1]

نپولین کا مصر پر قبضہ:

جنگ آسٹریا کا فاتح بننے کے فوراً بعد اٹھائیس سالہ نپولین ۱۷۹۷ء (۱۲۱۱ھ) میں بالکل غیر متوقع طور پر جنوب مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس اچانک مہم جوئی کے اہم اہداف یہ تھے:

❶ نپولین بحرِ ہند پر قبضہ کر کے اپنے دشمن برطانیہ کا عسکری وتجارتی راستہ بند کر دینا چاہتا تھا کیوں کہ اس وقت ہندوستان کے ساحلوں پر برطانیہ اپنے قدم جما چکا تھا اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت فرانس کے لیے شدید خطرہ تھی۔[2]

❷ فرانس کے یہودی ایک مدت سے بیت المقدس کو اپنا وطن بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ انہوں نے انقلاب فرانس میں فکری رہنمائی اور اقتصادی تعاون کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا تھا اور اس شرط پر نپولین سے بھی بھرپور تعاون کیا تھا کہ انہیں فلسطین میں ایک آزاد وطن دلوایا جائے گا۔

❸ نپولین، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی اقدار میں انقلابی تبدیلی کا علم بردار تھا اور فرانس کے بعد اس انقلاب کو مشرقی دنیا میں منتقل کرنا چاہتا تھا۔ اسے توقع تھی کہ شخصی حکومتوں سے دبے ہوئے مسلمان عوام بھی اسی قسم کے انقلاب کے منتظر ہیں لہٰذا وہاں اس تبدیلی کو خوشی سے قبول کر لیا جائے گا۔ اس لحاظ سے نپولین کی یہ مہم محض عسکری نہیں، نظریاتی

---

① الموسوعۃ العربیۃ العالمیۃ: مقالہ نپولین، مقالہ فرنسا

② ان دنوں برطانیہ میسور کے غیور حکمران ٹیپو سلطان کے خلاف فیصلہ کن جنگ شروع کر چکا تھا۔ ٹیپو سلطان کے فرانس سے بہتر تعلقات قائم تھے۔ جب انگریزوں نے برصغیر کے اس جلیل القدر مجاہد کو سری رنگا پٹم میں گھیرا تو اس نے تمام مددگاروں سے مایوس ہو کر نپولین سے ہندوستان پر فوج کشی کر کے انگریزوں کو مار بھگانے کی تاکیدی درخواست کی تھی جس کے جواب میں نپولین نے تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ جب خلافت عثمانیہ کو فرانس اور ٹیپو کے دوستانہ تعلقات کا علم ہوا تو ٹیپو سلطان کو فہمائش کی وہ انگریزوں سے صلح کرلے اور فرانس سے تعلق قطع کر دے۔ ٹیپو نے انگریزوں کے عزائم کو بھانپتے ہوئے خلافت عثمانیہ کے پیغام پر عمل نہ کیا۔ چنانچہ عثمانیوں سمیت کسی نے ٹیپو کا ساتھ نہیں دیا اور آخر کار ہندوستان کا یہ سرفروش مجاہد ۱۷۹۹ء کو اپنے پایہ تخت سری رنگا پٹم میں انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: سیرت سلطان ٹیپو شہید از مولانا محمد الیاس ندوی)

جنگ کا پہلو بھی رکھتی تھی اور اسی لیے وہ یورپ کے "۱۲۲" نامور دانش وروں کو بھی اپنے ساتھ لیے جا رہا تھا۔[1]

نپولین بڑی تیزی سے جنوب مشرق کی طرف بڑھا،اس نے بحری بیڑا سمندر میں ڈال کر وینس پر قبضہ کیا اور پھر ۱۲ جون ۱۷۹۸ء (۲۶ ذوالحجہ ۱۲۱۲ھ) کو جزیرہ مالٹا بھی فتح کر لیا۔ یکم جولائی ۱۷۹۸ء (۱۶ محرم ۱۲۱۳ھ) کو وہ سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے ۳۵۰ جہازوں اور ۶۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ مصر کی بندرگاہ اسکندریہ پر اتر چکا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے لیے یہ حملہ بالکل غیر متوقع تھا، جس کے دفاع کی کوئی تیاری نہیں کی جا سکی تھی۔ اس لیے نپولین بلا مزاحمت اسکندریہ پر قابض ہو گیا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ مصر میں ایک حکمران کا تقرر کر کے چلا جائے گا۔

فرانسیسی فاتح نے چند دنوں بعد قاہرہ کا رُخ کیا۔ ۱۳ جولائی (۲۸ محرم) کو ترک جرنیل مراد بیگ نے دس ہزار جوانوں کے ساتھ قاہرہ کی شاہراہ پر اُسے روکنے کی کوشش کی۔ یہاں نہایت خونریز معرکہ ہوا جسے "معرکۂ رحمانی میدنی" کہا جاتا ہے۔ مسلمان جاں توڑ لڑائی لڑے مگر نپولین کے بھاری بھرکم لشکر کے سامنے ان کی پیش نہ گئی اور آخر انہیں پسپا ہونا پڑا۔ فرانسیسی افواج پیش قدمی کرتے ہوئے قاہرہ کے باہر اس صحرا تک آن پہنچیں جہاں سے اہرام کی چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں ابوبکر پاشا کے بیس ہزار سپاہیوں سے سامنا ہوا۔ ۲۱ جولائی ۱۷۹۸ء (۶ صفر ۱۲۱۳ھ) کو وہ لڑائی ہوئی جسے "معرکۂ اہرام" کہا جاتا ہے۔ اس سے پہلے نپولین نے فوج کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"چالیس صدیوں کی تاریخ آج اہرام سے تمہیں دیکھ رہی ہے۔"

ابوبکر پاشا کو بھی شکست ہوئی اور نپولین قاہرہ میں داخل ہو گیا۔[2]

نپولین کی عالم اسلام میں حکمت عملی:

نپولین جانتا تھا کہ مسلمان اسلام سے بڑی محبت کرتے ہیں، لہٰذا اس نے عالم اسلام میں اپنی سیاسی حکمت عملی تین نکات پر استوار کی تھی۔

1. اسلام کا احترام کرنا اور شہریوں کی عبادات اور رسم و رواج میں دخل نہ دینا۔
2. مصر اور شام کو خلافتِ عثمانیہ کی ماتحتی سے نکالنا۔
3. ان علاقوں میں مقامی دانشوروں اور فضلاء کی وطنی حکومتیں قائم کرنا۔

اس نے مذہبی حوالے سے تحمل اور رواداری کا اظہار کرنے کے لیے مصر کے عمائد سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"آپ کو کہا گیا ہے کہ میں آپ کے دین کو مٹانے کے لیے آیا ہوں۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اسے ہرگز نہ مانیں۔ جو لوگ اس دھوکے میں آ چکے ہیں انہیں بتایئے کہ میں صرف اس لیے آیا ہوں تاکہ ظالموں سے آپ کی گلوخلاصی کرا کے آپ کے حقوق آپ کو دوں۔ میں یہاں کے حکام کی بہ نسبت اللہ کو زیادہ ماننے والا ہوں۔ اس

---

[1] الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از صلابی: ص ۳۲۶
[2] تاريخ الدولة العثمانية از يلماز اوزتونا: ۱/۶۳۹، ۶۵۰

کے رسول اور قرآن کا احترام کرتا ہوں۔ سب لوگ اللہ کے نزدیک برابر ہیں۔ فقط عقل، فضائل اور علوم انہیں ممتاز کرتے ہیں۔''[1]

باب عالی کا نپولین کے خلاف اعلانِ جہاد اور اس کے اثرات:

اس دوران برطانوی جنرل نیلسن جو کئی ہفتوں سے فرانسیسی بیڑے کے تعاقب میں تھا، اپنے بحری جہاز لیے اسکندریہ پہنچ گیا اور یکم اگست کو اس نے اچانک حملہ کر کے بندرگاہ پر لنگر انداز فرانسیسی جہازوں کو تہس نہس کر دیا۔ یوں نپولین کے لیے بحری راستہ اختیار کر کے آگے پیش قدمی کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔

اُدھر ۲ ستمبر ۱۷۹۸ء (۲۰ ربیع الاول ۱۲۱۳ھ) کو باب عالی نے فرانس کے خلاف باقاعدہ اعلانِ جہاد کر دیا۔ چونکہ نپولین کے عزائم برطانیہ کے خلاف بالکل ظاہر تھے، اس لیے ۳ جنوری ۱۷۹۹ء (۲۴ رجب ۱۲۱۳ھ) کو برطانیہ نے اس جنگ میں ترکی کا حلیف بننے کا اعلان کر دیا۔ پھر نپولین سے خوفزدہ زار روس نے بھی یکم مئی (۲۴ ذوالقعدہ) کو فرانس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔[2]

مصر پر نپولین کے قبضے سے جو سلطنتِ عثمانیہ کی چار سو سالہ تاریخ میں سب سے بڑی ہزیمت تھی، پورے عالمِ اسلام میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی تھی۔ سلطان سلیم ثالث نے جب اعلانِ جہاد کیا تو ہر طرف سے مجاہدین پرچمِ جہاد تلے جمع ہونے لگے۔ اس دور کے معاصر مؤرخ الجبرتی کا بیان ہے:

''جب فرانسیسیوں کی خبریں حجاز پہنچیں کہ وہ مصر پر قابض ہو گئے ہیں تو اہلِ حجاز کو سخت صدمہ ہوا۔ انہوں نے حرم میں گڑگڑا کر دعائیں کیں۔ شیخ کیلانی لوگوں کو وعظ کر کے جہاد کی دعوت دینے، اور انہیں دینِ حق کی نصرت پر ابھارنے لگے۔ سب لوگوں نے ان کی نصیحت مانی اور اپنے جان و مال کی قربانی دیتے ہوئے جمع ہو گئے۔ چھ سو مجاہدین جن میں ینبوع کے لوگ بھی شامل تھے، سمندری راستے سے سلطان کے پاس پہنچے۔

حجاز کے یہ مسلمان، مراد بیگ کی قیادت میں روانہ ہوئے اور بونا پارٹ کی طرف سے صعیدِ مصر میں تعینات کیے گئے جنرل ڈیزی کے سخت حریف ثابت ہوئے۔ انہیں دو میں سے ایک کامیابی کا یقین تھا۔ شہادت یا فتح۔ انہوں نے اس آیتِ قرآنی کو اپنا شعار بنالیا تھا: اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ...... نکلو اللہ کی راہ میں خواہ ہلکے ہو خواہ بوجھل ہو۔ اور جہاد کرو اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانتے ہو (التوبۃ: ۴۱) ان مجاہدین نے مصر، ہوارہ اور نوبہ کے عرب رضا کاروں اور مراد بیگ کی فوج کے ساتھ مل کر ان نصرانی لشکروں کا سامنا کیا جن میں فرانسیسی بری و بحری فوج کے علاوہ، پادری یعقوب یوحنا کی قیادت میں قبطی

---

① عجائب الآثار فی التراجم والاخبار از عبدالرحمن بن حسن الجبرتی م ۱۲۳۷ھ: ۲/۱۸۳
② تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱/۶۵۰

(مصری نصرانی) بھی شامل تھے۔"[1]

قاہرہ میں فرانسیسیوں کے مظالم:

نپولین نے اس کے جواب میں قاہرہ کے کوہِ مقطم پر توپیں نصب کیں اور شہر میں جہاد کے مرکز جامعۃ الازہر کے محلے کو بطورِ خاص نشانہ بنایا۔ پھر فرانسیسی سپاہی شہر میں گھس گئے۔ انہوں نے قاہرہ کے لوگوں سے بدترین انتقام لیا۔ جامعۃ الازہر کے نواحی محلے لوٹ لیے گئے۔ علماء اور سینکڑوں شہریوں کو گرفتار کر کے سزائے موت دی گئی۔ شہر کی بہت سی عمارتیں گرا کر وہاں عسکری کیمپ بنالیے گئے۔ اس تاخت وتاراج کے دوران فرانسیسی گھوڑوں سمیت جامعۃ الازہر میں گھس گئے اور قرآن مجید کے نسخوں سمیت دینی کتب کو زمین پر پھینک کر انہیں پیروں تلے روندتے رہے۔

کئی دنوں تک فرانسیسی سپاہیوں نے جامعۃ الازہر کو اپنا ٹھکانہ بنائے رکھا۔ آخر علماء کے ایک وفد نے جا کر نپولین سے ملاقات کی اور بڑی منت سماجت کے بعد جامعۃ الازہر کو ان سے خالی کرایا۔[1]

نپولین کا شام کے ساحلوں پر قبضہ۔ عکا کا محاذ:

نپولین فروری ۱۷۹۹ء کے شروع میں مصر سے شام کی طرف نکلا اور ۲۵ فروری ۱۷۹۹ء (۱۸ رمضان ۱۲۱۳ھ) کو غزہ کو زیرِ نگین کر کے تیزی سے فلسطین پہنچ گیا۔ ۱۳ مارچ (۵ شوال) کو اس نے یافا پر حملہ کر کے دس ہزار ترک سپاہیوں اور شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ۱۹ مارچ (۱۱ شوال) کو وہ عکا کا محاصرہ کر چکا تھا۔ یہ وہ شہر تھا جہاں صلاح الدین ایوبی نے صلیبی افواج کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ اس وقت یہاں کے عثمانی حاکم جزار احمد پاشا نے اسلاف کی یادیں تازہ کرتے ہوئے مورچہ بند ہو کر بڑی پامردی سے، نپولین کا مقابلہ کیا۔ اس دوران استنبول اور برطانیہ کے بحری بیڑے عکا کی مدد کے لیے پہنچ گئے تھے۔ نپولین اڑھائی ماہ تک عکا کا محاصرہ کیے رہا مگر اس شہر کو فتح نہ کرسکا۔ برطانوی جنرل نیلسن نے اس محاذ پر فرانس کے بحری بیڑے کو غرق کر کے بڑی شہرت حاصل کی۔[2]

نپولین نے عکا کے محاذ پر دنیائے یہودیت کے نام اپنا مشہور اعلامیہ جاری کیا جسے "فلسطین کی قانونی وراثت" کا نام دیا گیا۔ اس میں واضح کیا گیا تھا کہ فرانسیسی لشکر، فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کا وعدہ پورا کر کے جائے گا۔[3]

جامعۃ الازہر کا اعلانِ جہاد:

مصر کی سب سے بڑی دینی درسگاہ جامعۃ الازہر کے مشائخ فرانسیسی حملے کو صلیبی جنگ تصور کرتے تھے اور جانتے تھے کہ اس کا ہدف دینِ اسلام اور خلافتِ اسلامیہ ہے۔ سلطان سلیم ثالث کے اعلانِ جہاد کے بعد انہوں نے بھی

---

① عجائب الآثار فی التراجم والأخبار: ۱۲۰/۳

② الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از صلابی: ص ۳۳۳

③ تاریخ الدولة العثمانية، از یلماز اوزتونا: ۱/۶۵۰، ۶۵۱

④ الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از صلابی: ص ۳۲۹

فرانسیسی استعمار کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے کر عوام کو نپولین کے خلاف کھڑا کر دیا۔ نپولین عکا کے محاذ پر مصروف تھا کہ پیچھے مصر کے عوام فرانسیسی استعمار کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے فرانسیسی سپاہیوں کو قاہرہ سے نکال دیا۔[1]

مصر میں افریقی مجاہدین کے کارنامے:

اس دوران ندائے جہاد پر لبیک کہنے والا طرابلس الغرب (لیبیا) کا مجاہد مہدی درناوی قبائلی مسلمانوں کا لشکر مرتب کر کے مصر آچکا تھا اور اسکندریہ میں تعینات فرانسیسی فوج کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔

اپریل ۱۷۹۹ء (ذوالقعدہ ۱۲۱۳ھ) میں اسکندریہ سے سولہ میل دور "دمنہور" کے میدان میں فرانسیسی فوج کے حامیوں سے سخت جنگ ہوئی جس میں مجاہدین غالب آئے۔ اس کے بعد فرنچ جنرل مارمون نے مہدی کے مقابلے پر تربیت یافتہ فوج بھیجی جس سے "دمنہور" کے میدان میں وہ خونریز لڑائی ہوئی جسے اس پورے جنگی سلسلے کا سب سے سخت معرکہ کہا جاتا ہے۔ سات گھنٹوں میں کشتوں کے پشتے لگ گئے اور آخر فرانسیسیوں کو بھاگنا پڑا۔[2]

عکا کے محاذ پر نپولین کو شکست:

اُدھر مزید سات بحری جہاز تین ہزار جدید تربیت یافتہ سپاہیوں کو لے کر عکا پہنچ گئے اور شہر کی قوتِ مزاحمت میں اضافہ ہو گیا۔ پھر جب نپولین کو اطلاع ملی کہ مصر میں اس کے خلاف بغاوت برپا ہو چکی ہے، تو اس کا شام میں قدم جمائے رکھنا ناممکن ہو گیا۔ اس کا کہنا تھا: "اگر عکا راستے میں نہ آجاتا تو میں سارے مشرق کو فتح کر لیتا۔"[3]

۲۱ مئی (۱۵ ذوالحجہ) کو وہ عکا کا محاصرہ چھوڑ کر تیزی کے ساتھ مصر کی طرف پسپا ہو گیا۔

کوچ سے پہلے اس نے انتہائی بے رحمی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے لشکر کے تمام زخمی، بیمار اور لاچار سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تاکہ اس کی تیز رفتاری میں خلل نہ آئے۔[4]

نپولین کی واپسی:

ابھی مصر میں مجاہدین کے قدم جمنے نہیں پائے تھے کہ ۱۴ جون ۱۷۹۹ء (۹ محرم ۱۲۱۴ھ) کو نپولین دوبارہ قاہرہ پہنچ گیا۔ مگر جلد ہی اسے اطلاع ملی کہ ترک جرنیل مصطفیٰ پاشا ۸۰ کشتیوں میں آٹھ ہزار سپاہیوں کی کمک لے کر اسکندریہ کے ساحل پر اتر پڑا ہے۔ ۲۵ جولائی ۱۷۹۹ء (۲۱ صفر ۱۲۱۴ھ) کی جنگ میں فرانسیسی فوج نے مصطفیٰ پاشا کو شکست دے کر گرفتار کر لیا مگر اس کے بعد استنبول سے ایک اور بحری بیڑا روانہ ہونے کی خبر آگئی۔

چند دنوں بعد نپولین کو قاہرہ میں یہ اطلاع بھی ملی کہ آسٹریا نے فرانس کی سرحدوں پر حملہ کر دیا ہے۔ تب نپولین نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ وہ دو جہازوں میں کچھ سپاہیوں کو ساتھ لے کر یکدم گہرے سمندر کی طرف نکل گیا۔ عثمانی یا برطانوی بحریہ کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور وہ فرانس پہنچ گیا۔

---

① الدولۃ العثمانیۃ از صلابی: ص ۳۳۱

② الدولۃ العثمانیۃ از الصلابی: ص ۳۳۰، ۳۳۱

③ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱/۶۵۱

④ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک: ص ۳۷۵

نپولین کی پسپائی پر ایک طرف دربار خلافت اور دوسری طرف برطانیہ اور کئی دیگر یورپی ممالک میں خوشیاں منائی گئیں۔ سلطان سلیم ثالث نے عکا کے فاتح جزار احمد پاشا کو سونے کا تاج بھجوایا اور برطانوی افسر نیلسن کو جس نے فرانسیسی بیڑے کو تباہ کیا تھا، بیش قیمت ہیرے ہدیہ کیے۔[1]

قاہرہ کی جہادی تحریک، فرانسیسی گورنر جنرل کا قتل:

مصر اور شام کی مہم میں فرانسیسی فوج کے ساٹھ ہزار میں سے صرف پندرہ ہزار سپاہی باقی رہ گئے تھے۔ ان کی بڑی تعداد مجاہدین کی مزاحمت میں تلف ہوئی تھی جبکہ بہت سے سپاہی طاعون کی وبا کا شکار بھی ہوئے تھے۔ نپولین کے بعد فرانسیسی جنرل کلیبر باقی فوج کی قیادت کر رہا تھا۔ اُدھر برطانوی فوج ان کے تعاقب میں تھی۔

۲۰ مارچ ۱۸۰۰ء (۲۳ شوال ۱۲۱۴ھ) کو قاہرہ سے کچھ دور، برطانیہ اور فرانس کی افواج کے درمیان نہایت خوں ریز معرکہ ہوا، جس میں خلاف توقع فرانسیسی کمانڈر کلیبر کو فتح ہوئی مگر جب وہ فاتحانہ انداز میں قاہرہ کے قریب پہنچا تو اسے پتا چلا کہ عثمانی امیر ابراہیم بیگ اس کی عدم موجودگی میں شہر پر قابض ہو چکا ہے۔

جنرل کلیبر نے قاہرہ کا محاصرہ کر کے گولہ باری شروع کی۔ فصیل اور عمارتوں کو شدید نقصان پہنچانے کے بعد وہ قاہرہ میں داخل ہو گیا۔ دس دن تک شہر کی سڑکوں پر فرنگی سپاہی اور مجاہدین نبرد آزما رہے۔ آخر میں جامعۃ الازہر کے مشائخ نے شہریوں کی ترجمانی کرتے ہوئے عام معافی کی درخواست کی جسے قبول کر لیا گیا مگر شہر پر قبضہ مستحکم کرنے کے بعد معافی کے اعلان کو پس پشت ڈالتے ہوئے مجاہدین کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ جنرل کلیبر نے پادری یعقوب یوحنا کو کھلی اجازت دے دی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جو چاہے کرے۔ شہر کے عمائد، رؤساء اور علماء سے لے کر عام مزدور طبقے تک سب پر بلا استثناء بھاری ٹیکس عائد کر دیے گئے۔

ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ جامعۃ الازہر کے ایک دلیر شامی طالب علم سلیمان نے موقع پا کر جنرل کلیبر کو قتل کر دیا۔ یہ ۲۴ جولائی ۱۸۰۰ء (۲ ربیع الاول ۱۲۱۵ھ) کا واقعہ ہے۔ سلیمان خود بھی فرانسیسیوں کے ہاتھوں گرفتاری کے بعد شہید ہو گیا۔[2]

فرانسیسی فوج کی شکست، انخلاء اور صلح:

فرانسیسی افواج کی قیادت اب جنرل مینو نے سنبھال لی جو اسلام قبول کرنے کا اعلان کر چکا تھا اور جنرل عبداللہ مینو[3]

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱/۶۳۸ تا ۶۵۱

② تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۷۹؛ الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۳۵

③ جنرل عبداللہ کا اصل نام جیکیس فرانسس مینو (Jacques-François de Menou) تھا۔ وہ ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوا اور جوان ہو کر فرانسیسی فوج میں بھرتی ہو گیا اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ وہ ایک نامور سیاست دان بھی تھا۔ ۱۷۹۵ء کے انقلاب فرانس میں اس کا اہم کردار تھا۔ ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔

کہلاتا تھا۔ وہ ایک مدت تک باقی فوج کے ساتھ اسکندریہ میں محصور رہا۔ آخر کار یکم ستمبر ۱۸۰۱ء (۲۲ ربیع الآخر ۱۲۱۶ھ) کو اس نے ترکوں اور برطانوی افواج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ معاہدے کے مطابق برطانیہ نے اپنے جہازوں پر اسے اس کے باقی ماندہ سپاہیوں سمیت فرانس پہنچا دیا۔ یوں مصر کی وہ مہم اختتام کو پہنچی جس سے یہود کو بڑی توقعات تھیں اور جس کے ذریعے نپولین خلافتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کر کے مشرق و مغرب کا بلاشرکتِ غیرے تاج دار بننا چاہتا تھا۔

نپولین فرانس واپس پہنچ کر جمہوری حکومت کا سربراہ بن گیا۔ اس نے خلافتِ عثمانیہ سے ازسرِ نو روابط قائم کرنے چاہے اور اس کے سفیر نے خلیفہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ترکوں کے لیے روس اور برطانیہ کی بہ نسبت فرانس سے دوستی زیادہ مفید ہے۔ خلیفہ نے احتیاط کرتے ہوئے فقط سابقہ تعلقات بحال کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ یوں ۹ اکتوبر ۱۸۰۱ء (یکم جمادی الآخرہ ۱۲۱۶ھ) کو تعلقات کی بحالی کا معاہدہ ہو گیا۔[1]

مصر پر نپولین کے حملے کے اثرات:

مصر پر نپولین کے حملے سے یہاں یورپی تعلیم و ثقافت کے اثرات تیزی سے پڑنے لگے۔ استشراق کی تحریک بھی تیز ہو گئی اور یورپی مؤرخین اسلامی دنیا کی تاریخ پر پہلے سے زیادہ تندہی سے کام کرنے لگے۔ نپولین کے ساتھ آئے ہوئے دانشوروں کے ایک وفد نے ۱۹ جلدوں میں مصر کی شہرہ آفاق تاریخ (Description de L'Egypte) مدوّن کی۔[2]

نپولین کے حملے سے بہت پہلے، سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے درمیان فرانسیسی افسران اور دانشور مصر میں سرگرم ہو چکے تھے۔ مقامی قبطی نصرانیوں اور یہودیوں سے ان کے گہرے تعلقات تھے، بعض مسلمان امرا بھی ان کے حلقے میں شامل تھے جنہیں فکری اور تہذیبی طور پر ہمنوا بنایا جا چکا تھا۔ قاہرہ کے محلے ناصریہ میں فرانسیسی کالج جغرافیہ، طب، حیاتیات، نباتات اور تاریخ کی تعلیم دے رہا تھا اور وہاں مسلمانوں کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔[3]

الغرض مصر میں جدیدیت کے آثار نپولین کے حملے سے پہلے ظاہر ہونا شروع ہو چکے تھے۔ نپولین کے حملے کے بعد یہ سلسلہ مزید تیزی سے بڑھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مصر میں فری میسن کے لاجز بھی قائم ہو گئے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے انیسویں صدی عیسوی میں مصر کے امیر محمد علی پاشا کے لیے بغاوت کی راہ ہموار کی اور مصر کو سلطنتِ عثمانیہ سے الگ کر دیا۔[4]

ملکی استحکام کی طرف توجہ، اسبابِ زوال پر غور و فکر کی دعوت:

سلیم ثالث نے ملک کے استحکام کی طرف بھی توجہ دی۔ اس نے امرائے سلطنت، علماء اور دانش وروں کو حکم دیا کہ

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۸۰

② تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از یلماز اوزتونا: ۱/۶۳۹

③ عجائب الآثار فی التراجم والاخبار: ۱۲۰/۳

④ الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النہوض و اسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۲۷

وہ سلطنت کے زوال کے اسباب پر غور کر کے، ایسی تجاویز دیں کہ عظمتِ رفتہ کی بازیافت ہو سکے۔ اس حوالے سے اس وقت ترکی میں امراء، علماء اور دانش وروں کے تین فکری گروہ بن چکے تھے:

① قدامت پسند ② اعتدال پسند ③ جدت پسند

قدامت پسند گروہ (جس کے ہاتھ میں اس وقت زمامِ اقتدار تھی) کی آراء کا خلاصہ یہ تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ ماضی کی عالمگیر حکومت تھی جس کا کوئی مدِ مقابل نہ تھا کیوں کہ اس کا انتظامی ڈھانچہ اور ماتحت ادارے مضبوط تھے۔ اب بھی اس ڈھانچے کو مضبوط کرنا اور اداروں کو نئی زندگی دینا عین ممکن ہے۔ اس طرح سلطنت کو از سرِ نو مستحکم کیا جا سکتا ہے۔

اعتدال پسندوں کا کہنا تھا کہ یورپ بعض میدانوں میں ہم سے آگے نکل گیا ہے۔ ہمیں یورپ کی وہ ٹیکنالوجی حاصل کر لینی چاہیے جو ہمارے ہاں رائج نہیں۔ اس کے بعد ہم یورپ کے مدِ مقابل آ سکتے ہیں۔

جدت پسندوں کی رائے یہ تھی کہ انحطاط کی وجہ اس پرانے نظام پر اصرار ہے جو موجودہ دور کی تیزی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ابھی یورپ چند میدانوں میں آگے ہے لیکن اگر ہم قدیم نظام پر تکیہ کیے رہے تو یورپ تمام میدانوں میں سبقت لے جائے گا۔ ہمیں پہلے اپنے نظام کو بدلنا ہوگا، اس کے بعد ہی ہم ترقی و استحکام میں یورپ کو پیچھے چھوڑ سکتے ہیں۔

سلیم ثالث نے ان تمام آراء پر غور کرنے کے بعد ۳ فروری ۱۷۹۳ء (۲۱ جمادی الآخرہ ۱۲۰۷ھ) کو سلطنتِ عثمانیہ کا نظام تبدیل کرنے کا اعلان کر دیا۔ نئے نظم و نسق کو "نظامِ جدید" کا نام دیا گیا۔[1]

نظامِ جدید کا نفاذ:

اس نظام کے تحت جہاز سازی اور اسلحہ سازی کے لیے فرانسیسی طرز کے کارخانے لگوائے گئے۔ جدید حربی فنون کی تعلیم کے لیے مغربی انداز کی درسگاہیں بھی کھولی گئیں۔ مواصلات کا جدید نظام قائم کرنے کا عزم کیا گیا۔

بلاشبہ یہ اصلاحات نہایت ضروری تھیں کیوں کہ تین براعظموں میں پھیلی ہوئی اس عظیم سلطنت کا داخلی نظام فرسودہ ہو چکا تھا۔ مرکز اور صوبوں نیز عوام اور حکام کے مابین واسطے بکثرت ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے گھٹن اور ابتری پھیل رہی تھی اور جگہ جگہ صوبے خود مختاری کی طرف مائل ہو رہے تھے۔[2] اس سلسلے میں سربیا کے شہر "ودین" کے امیر بازوند اوغلی کی بغاوت قابلِ ذکر ہے جس پر قابو پانے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور آخر کار ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں اسے خود مختار حاکم مان لیا گیا کیوں کہ ڈر تھا کہ کہیں یہ بغاوت پھیل کر پورے بلقان کو لپیٹ میں نہ لے لے۔[3]

نظامِ جدید کے اطلاق میں مسائل:

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام میں جدت پسندی یا دیگر اقوام سے استفادے کی گنجائش کس

---

① تاریخ الدولة العثمانية، از یلماز اوزتونا: ۱/۶۳۵، ۶۳۶
② تاريخ الدولة العلية العثمانية از فرید بک: ص ۳۷۰ ؛ الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث از اسماعیل یاغی: ص ۱۲۷
③ تاريخ الدولة العلية العثمانية از فرید بک محامی: ص ۳۷۱

حد تک ہے۔ غیر مسلم اقوام سے استفادے کی تین صورتیں ہیں:

① نئی ایجادات، صنعت وحرفت، سائنس اور ٹیکنالوجی میں ان کے تجربات سے استفادہ کرنا، ریاضی، کیمیا، فزکس، طب وغیرہ میں ان کی مہارتوں کو سیکھنے اوران کے طریقے اختیار کرنے کی پوری گنجائش ہے۔ بلکہ جہاں مسلمانوں کی دینی ودنیوی ضروریات (مثلاً آب پاشی، زراعت، تجارت، مواصلات، تعلیم وتبلیغ، دفاع اور جہاد) ان مہارتوں کے بغیر پوری نہ ہوسکیں، وہاں ان علوم وفنون سے استفادہ ضروری ہوجاتا ہے۔

② اخلاق وآداب، تہذیب، رہن سہن، وضع قطع میں غیر مسلموں کی جو چیز اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے اور اپنا قومی امتیاز کھونے اور کفار سے مشابہت کے ذیل میں آتی ہے، تو اسے اختیار کرنا ناجائز ہے۔

③ عبادات، عقائد، مبدأ ومعاد، کائنات، زندگی اور انسان کی حیثیت کے متعلق غیر مسلموں کے افکار کو درست سمجھ کر اختیار کرنا کفر ہے۔

ان حدود وقیود کو پیشِ نظر رکھ کر اگر جدید وقدیم میں قابلِ اختیار اور قابلِ ترک چیزوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سمجھنا آسان ہوجاتا ہے کہ مغرب کی اُن علمی وفنی ابحاث، اُن ایجادات اوراُن سائنسی دریافتوں سے استفادہ کرنا، جن کی بدولت مغرب ترقی کی شاہراہ پر آگے نکلا ہے، ہمارے لیے فقط جائز نہیں بلکہ ضروری ہے۔ حکمت کو مؤمن کی متاعِ گمشدہ کہا گیا ہے، جو کسی بھی قوم یا فرد سے اخذ کی جاسکتی ہے۔ کوئی شخص کسی شعبے میں دوسروں سے آگے بڑھنا چاہتا ہو یا کوئی ملت اقوامِ عالم پر برتری حاصل کرنا چاہتی ہو، دونوں صورتوں میں ضروری ہے کہ کامیاب لوگوں اور فاتح قوموں کے حالات کو پوری تحقیق وتفتیش، ژرف نگاہی اور عرق ریزی کے ساتھ پڑھا جائے اور حشو وزوائد کو نظر انداز کرتے ہوئے، اقبال مندی اور عروج کے اصل اسباب اور طریق کار کو سمجھا جائے۔ انفرادی کامیابی مطلوب ہو یا اجتماعی، ہر صورت میں کسی کوشش کو سنجیدہ تبھی مانا جاسکتا ہے جب وہ اندھا دھند نہیں، نپی تلی ہو۔ یہی فطرت کا ضابطہ ہے۔ ایسی سنجیدگی کے بغیر کوئی بھی جدوجہد کارگر نہیں ہوتی۔ ہمیں اس حقیقت کو ماننا چاہیے کہ دنیا کی ہر وہ قوم جو کسی زمانے میں تاریخ کے اُفق پر چھائی رہی، اس کے حالات میں ہمیں کوئی نہ کوئی سبق مل سکتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس سبق کو محض اس لیے ترک کردیں کہ وہ قوم مسلمان نہیں تھی۔

مگر اسی کوشش اور جدوجہد کا دوسرا رُخ جو احتیاطی بھی ہے اور کامیابی کے لیے ضروری بھی، یہ ہے کہ ہم قوموں کے اسبابِ فتح مندی کا تجزیہ کرتے ہوئے، اصل علت تک پہنچیں اور ظاہری نقش ونگار میں نہ الجھ جائیں۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ اہلِ مغرب پینٹ، شرٹ، ٹائی اور کوٹ پہننے، شراب پینے، سگرٹ اور سگار کا دھواں اڑانے اور خواتین کو نیم برہنہ کرکے باہر لانے کی وجہ سے ہم پر سبقت لے گئے ہیں تو یہ بہت ہی سطحی بات ہوگی۔ اسی طرح کوئی یہ خیال کرے کہ مغرب کی ترقی کا راز خدا کے انکار، عبادت گاہوں سے فرار اور محض عقل پر انحصار میں پنہاں ہے تو یہ بھی ایک کھوکھلی سوچ ہوگی۔ پس اغیار سے استفادے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم اس میں تقلید نہیں، تحقیق کا راستہ اختیار کریں۔ ان کی ہر

شے کو ہم شرعی وعقلی میزانوں پر تولیں۔ جو شے ان دونوں کسوٹیوں پر پوری اترے اسے ہم اپنے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے اختیار کریں نہ کہ کسی احساسِ کمتری یا بیرونی دباؤ کی بنا پر۔

جو چیلنج اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں اُمت کے سامنے تھا، وہ آج بھی اسی طرح موجود ہے۔ اُس وقت اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک ایسی عبقری شخصیت کی ضرورت تھی، جو پوست اور مغز کو الگ کر کے دکھاتی اور اُمت کو مغربیت کے طوفان سے یوں سلامت نکال کرلے جاتی کہ دامن بھیگنے نہ پاتا اور گوہر مراد بھی ہاتھ سے نہ جاتا۔

مگر عالم اسلام کی قیادت ایسی شخصیات کی رہنمائی سے محروم رہی۔ سلطان سلیم ثالث یقیناً جدت پسندی کی طرف مائل ہونے کے ساتھ شرعی حدود کا لحاظ رکھنا بھی ضروری سمجھتا تھا جیسا کہ اس کے پہلے خطاب سے عیاں ہے جس میں اس نے امت کے زوال کا اصل سبب شریعت سے انحراف بتایا تھا۔ اس لیے اگر اس کے دور میں جدید وقدیم کے قضیے کو پوری چابک دستی سے حل کرلیا جاتا تو اُمت بعد میں مغرب کی اُس اندھی تقلید سے بچ جاتی جس کے پیچھے دین ومذہب سے انحراف کا عنصر پوری طرح کارفرما تھا۔

مگر افسوس کہ سلطان سلیم ثالث اور اس جیسے کچھ نیک نیت، سنجیدہ اور وسیع النظر قائدین کی کوششوں کے باوجود، اُمت مسلمہ وقت کے اس اہم ترین چیلنج سے صحیح طور پر نہ نمٹ پائی۔ اگرچہ سلطان سلیم ثالث کی جانب سے کیا گیا نظام جدید کے اطلاق کا فیصلہ بنیادی طور پر درست تھا اور صحیح جذبے پر مبنی تھا اور اگر اس پر اعتدال کے ساتھ عمل کیا جاتا تو کسی مضرت کا اندیشہ نہیں تھا، مگر ایک تو اُس وقت قوم قدیم وجدید علوم میں یکساں مہارت رکھنے والی کسی غیر معمولی شخصیت کی علمی وفکری رہنمائی سے محروم تھی۔ اس کے علاوہ، اس کی ایک اور اہم وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ خود ان لوگوں میں جو نظام کی تبدیلی کے حق میں تھے، تین طبقے موجود تھے:

پہلا طبقہ ان مخلص اور ذہین لوگوں کا تھا جو سیاسی، عسکری، سائنسی، اور اقتصادی میدانوں میں یورپ سے استفادہ کر کے ترکی کو ترقی دینا چاہتا تھا۔ سلیم ثالث اور اس کے کئی قابل امراء اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

دوسرا طبقہ یورپ کی ہر چیز کو ترکوں کی ہر چیز پر ترجیح دیتا تھا۔ اس کے خیال میں ترقی کے لیے ترکوں کا، بالکل یورپی بننا ضروری تھا۔ یہ یورپ کی ذہنی غلامی تھی۔

تیسرا طبقہ اغراض پرستوں کا تھا جو جدت پسندوں میں صرف اس لیے شامل ہو گیا تھا تاکہ نئے نظام کے قیام کے بہانے اسے اعلیٰ مناصب تک پہنچنے کا موقع ملے۔ اسے ملک وقوم کے بھلے بُرے سے کوئی غرض نہیں تھی۔

سلیم ثالث نے جب نظام جدید کا اطلاق کیا تو اسے لازمی طور پر جدت پسندوں ہی سے کام لینا پڑا کیوں کہ مغربی علوم وفنون اور انداز واطوار سے وہی واقف تھے۔ ان میں سے یورپ کے ذہنی غلاموں نے، نظام جدید کو اُن قدامت پسند عمائد سلطنت کی تضحیک وتذلیل کا ذریعہ بنا لیا جو ایک طویل مدت سے ملک وقوم کے محافظ اور بہی خواہ تھے۔ اغراض پرستوں نے ''نظام جدید'' کا نعرہ لگاتے ہوئے اس مہم کو تیز تر کرنے کے دوران اپنے مناصب سے اندھادھند ذاتی

فوائد حاصل کیے اور ملک وقوم کو لوٹنے لگے۔

یہ دیکھ کر قدامت پسندوں کو کہنا پڑا کہ آیا یہی وہ نظام جدید ہے جس کے سبز باغ دکھائے گئے تھے؟ کیا عوام و خواص کو اسی کا انتظار تھا؟ سبک دوش کیے گئے سابق امراء یہ بھی کہے بغیر نہ رہے کہ آخر ایسے خائن، مغرب پرست اور قومی غیرت وحمیت سے عاری لوگوں کو ہم جیسے وفادار اور تجربہ کار قدیم خادموں پر کیوں ترجیح دی گئی؟①

فوج کی تربیتِ نو کی سعی:

سلیم ثالث نے نظام جدید کے تحت فوج میں بھی بڑے پیمانے پر تبدیلیاں شروع کیں۔ اس نے ۱۷۹۶ء (۱۲۱۰ھ) میں پیادہ فوج کی تربیت کے لیے انگریز افسران کی خدمات حاصل کیں۔ ان میں سے ایک افسر نے اسلام قبول کرلیا اور جنرل مصطفی کہلایا۔ ان افسران کے ذریعے ۶۰۰ از یر تربیت نوجوانوں کو انگریزی قواعدِ حرب کے مطابق تربیت دلائی گئی تاکہ آئندہ یہی نوجوان، باقی فوج کو تربیت دیں۔②

ینی چری کی اصلاح کی کوشش اور بغاوت:

سلیم ثالث دیکھ رہا تھا کہ ینی چری کا قدیم ادارہ زمانے کا ساتھ دینے کے قابل نہیں بلکہ ملک پر ایک بوجھ اور مسلسل فتنوں کا باعث ہے، لہٰذا اس نے ینی چری کو ختم کر کے فوج کو نئے نظم ونسق سے آراستہ کرنے کی کوشش کی۔

مگر ینی چری افسران اور قدامت پسند امراء اصلاحات کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ انہیں ورغلانے میں سرکاری منصب پر فائز مفتی کا بھی بڑا ہاتھ تھا جنہوں نے فتویٰ دیا تھا کہ ہر وہ حکمران جو مغربی نظام اور ان کے طور طریقوں کو اختیار کرتا ہے اور رعایا کو اس کی پابندی پر مجبور کرتا ہے، وہ حکمرانی کے قابل نہیں۔ اس فتوے کی مدد لے کر قدامت پسند امراء اور ینی چری نے بغاوت کر دی اور ملک وملت کے اس بہی خواہ خلیفہ کو معزول کر دیا۔ یہ ۲۸ جون ۱۸۰۷ء (۲۱ ربیع الآخر ۱۲۲۲ھ) کا واقعہ ہے۔

سلیم ثالث سال بھر قید رہا۔ اس کے بعد نئے سلطان نے ۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۲۳ھ (۲۸ جون ۱۸۰۸ء) کو اسے قتل کرا دیا۔ سلطان سلیم ثالث کی عمر ۴۸ سال تھی۔ اس نے ۱۹ سال حکومت کی۔③

اصلاحات میں ناکامی کی وجوہ:

سلیم ثالث کی پوری کوشش کے باوجود اصلاحات کی مہم ناکام رہی۔ تمام حالات پر غور کرنے سے اس کی درج ذیل وجوہ سامنے آتی ہیں:

① جدید نظام اختیار کرنے میں قرار واقعی احتیاط اور باریک بینی ملحوظ نہیں رکھی گئی تھی۔

---

① تاریخ الدولة العثمانية، از یلماز اوزتونا: ۱/۶۳۵، ۶۳۶

② تاریخ الدولة العلية العثمانية از فرید بک محامی: ص ۳۷۱

③ التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۱۵۸/۸؛ تاریخ الدولة العلية العثمانية از فرید بک محامی: ص ۳۹۳؛ الدولة العثمانية فی التاریخ الاسلامی الحدیث، از اسماعیل یاغی: ص ۱۲۷

④ اس اہم اور نازک کام کے لیے صحیح رجال کار میسر نہیں آئے تھے، نااہل، سطحی ذہنیت رکھنے والے اور اغراض پسند لوگوں نے اس کام کو بگاڑ دیا۔

⑤ قوم کو کسی مجدد اور محقق شخصیت کی رہنمائی میسر نہ تھی جو مغرب کی ترقی کی اصل علتوں کو اس طرح واضح کرتا کہ حقیقت اور بناوٹ کا فرق واضح ہو جاتا۔

خلاصہ یہ کہ زمانے کے ایک عظیم چیلنج کو پورا کرنے کی ذمہ داری کمزور بنیادوں پر شروع کی گئی تھی اس لیے نتائج خلاف توقع نکلے۔

مسلمانوں کی بقا کا راز اور اس کے خلاف یورپ کی حکمتِ عملی:

سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں جو واقعات اور انقلابات پیش آئے ان سے یورپی طاقتوں نے یہ جان لیا تھا کہ مسلمانوں کی بقا اور قوت کا راز دو چیزیں ہیں:

❶ اسلام کی اخلاقی و روحانی تاثیر اور مسلمانوں کی اس دین سے پختہ وابستگی

❷ دوسرے خلافتِ عثمانیہ کی سطوت و ہیبت اور وسعت و مقبولیت

پہلی چیز کا چشم دید مشاہدہ انہیں خود اس وقت ہو گیا جب سلطنتِ عثمانیہ سے تعلقات کے دوران بعض نامور یورپی افسران نے اسلام قبول کر لیا۔[1]

اس لیے انہوں نے علمی و فکری میدانوں میں مسلمانوں کو شکست دینے، انہیں اسلام سے دور کرنے اور خود اسلام میں تحریف کرنے کے لیے دانشوروں کی ایک فوج میدان میں اتار دی جنہیں ''مستشرقین'' کہا جاتا ہے۔

دوسری چیز کے خاتمے کے لیے انہوں نے خلافتِ عثمانیہ کی وسعت کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تبدیل کرنے، اس کی تہذیب و ثقافت کو بدلنے، اس کے علمی و فکری منہج کو بگاڑنے، اس کی طاقت کو ختم کرنے اور آخر میں خلافت کے ادارے ہی کو قصہ پارینہ بنا دینے کی پوری کوشش کی۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب اصلاح اور جدت پسندی کی مہم دوبارہ شروع ہوئی تو یورپ کو اپنی نظریاتی یلغار کے لیے کھلے راستے مل گئے، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ تب تک ترکی میں یورپ کے ذہنی غلاموں اور اغراض پرستوں کی اجارہ داری مزید بڑھ گئی تھی جن میں سے بعض فری میسن کے آلۂ کار بھی بن گئے تھے۔ اس لیے اگلی صدی میں نظام کی تجدید کے اثرات پہلے سے بڑھ کر منفی نکلے اور تب سلطنت پہلے سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ روبہ زوال ہوئی۔[2]

✦✦✦

---

① قرأة جديدة في تاريخ الدولة العثمانية از زکریا سلیمان بیومی: ص ۱۳۳

② اس کی تفصیل ہم سلطان عبدالمجید اول کے حالات میں پڑھیں گے۔

سلطان مصطفیٰ رابع بن عبدالحمید اوّل

ربیع الآخر ۱۲۲۲ھ تا جمادی الاولیٰ ۱۲۲۳ھ

جون ۱۸۰۷ء تا جون ۱۸۰۸ء

سلیم ثالث کی معزولی کے بعد باغی ینی چری افواج نے سلطان عبدالحمید اوّل کے بیٹے مصطفیٰ رابع کو مسند خلافت پر بٹھا دیا۔ اس کی عمر ۲۸ سال تھی۔ وہ بہت کمزور حکمران تھا اور اس کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ (۱)

روس سے جنگ، فرانس کی مداخلت اور ناکام معاہدہ:

اس وقت سرحدوں پر روس سے جنگ جاری تھی۔ سلیم ثالث کی معزولی اور اس کی جگہ مصطفیٰ رابع جیسے ضعیف حکمران کی تخت نشینی کی خبر سن کر ترک سپاہیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ ایسے میں عین ممکن تھا کہ روس مزید جارحیت کا ارتکاب کرتا۔ لیکن خوش قسمتی سے ۳ جون ۱۸۰۷ء (۲۶ ربیع الاوّل ۱۲۲۲ھ) کو نپولین نے روس اور اس کے اتحادیوں کو "فریڈ لانڈ" کے معرکے میں رُسوا کن شکست دے ڈالی تھی۔ جس کی وجہ سے روسی افواج جنگ کے بغیر ہی بغدان چھوڑ کر پسپا ہو گئیں۔ ۷ جولائی کو روس اور فرانس میں ایک معاہدہ ہوا جس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ روس اور ترکی کے تنازعے میں فرانس ثالث کا کردار ادا کرے گا اور صلح کے معاملات طے ہونے سے پہلے روسی افواج بغدان اور افلاق کو خالی رکھیں گی۔

اس کے ساتھ ہی ایک خفیہ معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ اگر باب عالی نے فرانس کی ثالثی قبول نہ کی، تو روس اور فرانس متحد ہو کر یورپ میں ترکی کے تمام مقبوضات کو باہم بانٹ لیں گے۔ بوسنیا اور البانیہ فرانس کو، افلاق، بغدان اور بلغاریہ روس کو جبکہ سربیا آسٹریا کو دے دیے جائیں گے۔ یہ خفیہ معاہدہ نپولین اور زارِ روس الیگزنڈر اوّل نے روس اور پروشیا کی سرحد پر واقع، دریائے نیمن کے مشرقی شہر "تلسیت" میں باہم ملاقات کر کے کیا تھا۔

اطلاقیہ معاہدے سے باب عالی کو آگاہ کر دیا گیا جہاں سے ۲۴ اگست ۱۸۰۷ء (۲۰ جمادی الآخرہ ۱۲۲۲ھ) کو اس کی منظوری دے دی گئی اور جنگ بندی ہو گئی لیکن اس کے باوجود روس نے طے شدہ کسی شرط کا احترام نہیں کیا، اس لیے یہ تمام بات چیت کالعدم ہو گئی۔ (۲)

---

(۱) تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از محامی: ص ۳۹۳ (۲) تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از محامی: ص ۳۹۵، ۳۹۶

روس اور فرانس کا خفیہ معاہدہ بھی ٹوٹ گیا کیوں کہ زارِ روس نے اس پر اصرار شروع کر دیا کہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد استنبول پر روس قبضہ کرے گا۔ نپولین اس پر تیار نہ ہوا، کیوں کہ استنبول کئی سمندروں اور براعظموں کے سنگم پر ہونے کی وجہ سے پوری دنیا کی کلید سمجھا جاتا تھا اور نپولین اسے اپنا عسکری مرکز بنانا چاہتا تھا۔[1]

بغاوت اور معزولی:

سلطان مصطفیٰ رابع صرف تیرہ ماہ حکومت کر سکا۔ کچھ امراء اور عمائدان تمام عناصر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے سلطان سلیم ثالث کو معزول کیا تھا۔ ۲۸ جون ۱۸۰۸ء (۴ مئی ۱۲۲۳ھ) کو مصطفیٰ رابع کے خلاف بغاوت ہوگئی۔ مظاہرین نے مطالبہ کیا کہ سلیم ثالث کو دوبارہ تخت پر بٹھایا جائے۔ اس کے جواب میں مصطفیٰ رابع نے سلیم ثالث کو قتل کرا کے اس کی لاش مظاہرین کے سامنے پھینکوا دی۔ اس اقدام نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مظاہرین نے حملہ کر کے مصطفیٰ رابع کو حراست میں لے لیا۔ انجام کار یہ شورش مصطفیٰ رابع کی معزولی پر منتج ہوئی۔[2]

◆◆◆

---

① تاریخ الدولة العلية العثمانية از فرید بک محامی: ص ۳۰۱، ۳۰۲
② تاریخ الدولة العلية العثمانية از فرید بک محامی: ص ۳۹۷

سلطان محمود ثانی بن عبدالحمید اوّل

۱۲۲۳ھ تا ۱۲۵۵ھ

۱۸۰۸ء تا ۱۸۳۹ء

مصطفیٰ رابع کی معزولی کے بعد سلطان عبدالحمید اوّل کا ۲۳ سالہ لڑکا محمود ثانی تخت نشین ہوا۔ افسران اور امراء یہ توقع کر کے اسے اقتدار میں لائے تھے کہ وہ سلطان سلیم ثالث کی اصلاحات اور جدت پسندی کو ختم کر دے گا۔ مگر سلطان محمود ثانی دلی طور پر ان اصلاحات کے حق میں تھا۔[1]

صدر اعظم کی کوششِ اصلاح اور ینی چری کی بغاوت:

اس نے تخت نشینی کے بعد مصطفیٰ پاشا بیرقدار کو صدر اعظم بنا کر حکم دیا کہ وہ ینی چری افواج کی جدید انداز میں تربیت کرے۔ صدر اعظم نے عہدہ سنبھال کر ینی چری افواج سے خطاب کرتے ہوئے انہیں ان کے ماضی کے کارنامے اور دورِ حاضر کی کارستانیاں یاد دلائیں اور کہا کہ فتوحات کے لیے جدید دور کے علوم وفنون اور ٹیکنالوجی سے استفادہ ناگزیر ہے لہٰذا تمام سپاہی اس جدید آتشیں اسلحے کی تربیت لینا شروع کریں جو روسی فوج استعمال کر رہی ہے۔ صدر اعظم نے حکم دیا کہ تمام فوج خصوصاً کنوارے سپاہی چھاؤنی میں رہائش یقینی بنائیں اور عام لوگوں سے میل جول ختم کریں۔ نیز روزانہ کی مشقوں میں پابندی سے شریک ہوں اور یورپی افواج کی حربی تنظیم کو سیکھیں۔

اگر ینی چری صدر اعظم کے احکام پر عمل کرتی تو اب بھی تربیت اور تنظیم کے ذریعے وہ کچھ مدت بعد ایک بار پھر یورپ کے مدمقابل آسکتی تھی مگر ینی چری نے ایک بار پھر فتنہ انگیزی کا ثبوت دیا اور کچھ دنوں کی پخت وپز کے بعد ۱۶ نومبر ۱۸۰۸ء (۲۷ رمضان ۱۲۲۳ھ) کو بغاوت کر کے معزول سلطان مصطفیٰ رابع کو دوبارہ تخت پر بٹھانے کی کوشش کی۔ مگر اس کے جواب میں خلیفہ کے وفاداروں نے معزول سلطان کو قتل کر کے اس کی لاش ینی چری کے سامنے پھینک دی۔ مصطفیٰ رابع نے خلیفہ سلیم ثالث کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔[2]

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۹۸، ۳۹۹

② تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۹۸، ۳۹۹

روس سے جنگ:

خلیفہ محمود ثانی پر عیاں ہو گیا کہ ابھی ینی چری فوج پر بس نہیں چل سکتا۔ اس نے مصلحتِ وقت کا لحاظ کر کے سلیم ثالث کے نظام جدید کو معطل کر دیا۔ تاہم وہ موقعے کا منتظر رہا تا کہ ینی چری کا پتہ صاف کر کے دوبارہ اصلاحات کا بیڑا اٹھایا جائے۔ مگر اسے یہ موقع ملنے میں کئی سال گزر گئے کیوں کہ اس کا دور جنگ و جدل سے بھرپور تھا۔ ①

روس سے جنگ میں کامیابی:

محمود ثانی نے تخت نشینی کے دوسرے سال ۱۸۰۹ء (۱۲۲۴ھ) میں برطانیہ اور روس سے صلح کے معاہدے کیے مگر روس نے بہت جلد معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جنگ چھیڑ دی۔ اس سہ سالہ جنگ کی ابتداء میں ترکوں کو بعض مقامات پر شکست ہوئی جس کی وجہ سے صدر اعظم ضیا، یوسف پاشا کو معزول ہونا پڑا۔ تاہم نئے صدر اعظم احمد پاشا نے جنگ جیت کر دکھائی اور روسیوں کو ان کی حدود میں واپس دھکیل دیا۔ ②

نپولین کی فتوحات اور روس پر حملہ:

ادھر فرانس کی قوت بہت بڑھ چکی تھی۔ نپولین مصر سے فرانس پہنچ کر آسٹریا سے بھڑ گیا اور ۱۴ جون ۱۸۰۰ء (۲۱ محرم ۱۲۱۵ھ) کو "مارنجو" کے میدان میں آسٹریا کو گھٹنوں پر جھکا چکا تھا۔ مئی ۱۸۰۴ء (صفر ۱۲۱۹ھ) میں وہ اپنے ملک کا جمہوری حکمران چن لیا گیا تھا۔ اسی سال دسمبر میں اس نے تاج پوشی کر کے باقاعدہ بادشاہت کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ محمود ثانی کی حکمرانی کے تیسرے سال ۱۸۱۰ء (۱۲۲۵ھ) میں وہ ہالینڈ اور شمالی جرمنی کے بڑے حصے کو فتح کر چکا تھا۔ پھر جب ۱۸۱۲ء (۱۲۲۷ھ) میں وہ ساٹھ ہزار سپاہی لے کر روس کی طرف بڑھا تو راستے کا ہر شہر اس کے سامنے جھکتا چلا گیا۔ فرانسیسی فوجوں کو سر پر دیکھ کر روس کو نئے اتحادیوں کی تلاش ہوئی۔ ③

روس اور ترکی میں صلح۔ میثاقِ بخارست:

یہ تھے وہ حالات جن کی بنا پر روس نے ۲۸ مئی ۱۸۱۲ء (۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۲۷ھ) کو ترکی سے صلح کا معاہدہ کر لیا جو میثاق بخارست کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کے مطابق افلاق، بغدان اور سربیا، ترکی کے ماتحت مان لیے گئے۔ سربیا کے ایک سردار نے معاہدے کو ٹھکراتے ہوئے ترکی کے خلاف بغاوت کر دی جس پر قابو پالیا گیا اور باغی سردار نے بھاگ کر آسٹریا میں پناہ لے لی۔ ④

ادھر نپولین پیش قدمی کرتے ہوئے ماسکو کے قریب پہنچ گیا۔ ۷ ستمبر ۱۸۱۲ء (۳۰ شعبان ۱۲۲۷ھ) کو "بورڈینو" کے میدان میں پندرہ گھنٹے کی لڑائی کے بعد روسی شکست کھا کر پسپا ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد روسیوں نے ماسکو کو خالی کر کے

---

① الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث، از اسماعيل ياغي: ص ۱۲۷، ۱۲۸

② الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث از اسماعيل ياغي: ص ۱۲۸

③ الموسوعة العربية العالمية: مادة نابولين

④ الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث از اسماعيل ياغي: ص ۱۲۸

نذرِ آتش کر دیا، جب نپولین ماسکو پہنچا تو اس تباہ و برباد شہر میں اس کی فوج کو خوراک و رسد میسر آنا مشکل ہو گیا۔ اسی دوران شدید برف باری نے وہاں ٹھہرنا دوبھر کر دیا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۸۱۲ء (۱۳ شوال ۱۲۲۷ھ) کو نپولین نہایت ابتری کی حالت میں ماسکو سے واپس ہوا۔ نومبر کے اواخر میں دریائے بیریزینا عبور کرتے ہوئے، اس کی فوج کی بہت بڑی تعداد ہلاک ہوئی۔ نپولین جب نہایت شکستہ حالت میں پیرس واپس پہنچا تو اس کی فوج کے ساٹھ ہزار میں سے صرف دس ہزار باقی بچے تھے۔[1]

نپولین کا ترکی پر الزام:

نپولین نے روس سے شکست کی ذمہ داری خلافتِ عثمانیہ پر ڈال دی اور کہا کہ خلیفہ نے عین وقت پر روس سے صلح کر کے فرانس کو دھوکا دیا اور روس کو اپنی تمام افواج ترکی کے محاذ سے ہٹا کر فرانس کے مقابلے پر لانے کا موقع دیا۔[2]

فرانس کا یہ موقف نہایت عجیب تھا کیوں کہ ترکی کے پاس اپنی سرحدوں کی حفاظت کا یہی ایک موقع تھا جسے اس نے استعمال کیا۔ دوسری طرف روس، فرانس اور تمام یورپی ممالک، سیاست میں ہر طرح کی بدعہدی اور مکاری کے عادی تھے۔ لفظ سیاست ان کے ہاں "جھوٹ" اور "دھوکا دہی" کے ہم معنی ہو گیا تھا۔ وہ کسی معاہدے کا پاس کیے بغیر سلطنتِ عثمانیہ پر جارحیت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اس بار سلطنتِ عثمانیہ نے برابر سرابر کا معاملہ کرتے ہوئے اپنے دفاع (نہ کہ جارحیت) کے لیے، ان کی سیاست کا جواب انہی کے انداز میں دیتے ہوئے فرانس سے کنی کترا کر روس سے معاہدہ کیا تو نپولین بلبلا اٹھا۔ اس سے یورپی سیاست دانوں کی اخلاقی میزان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کے باٹ دینے کے الگ اور لینے کے الگ ہیں۔

نپولین کا انجام:

نپولین کو فرانس واپس پہنچ کر ۱ اکتوبر ۱۸۱۳ء (شوال ۱۲۲۸ھ) میں لیپزگ کے میدان میں روس، آسٹریا اور برطانیہ کی متحدہ فوجوں سے جنگ لڑنا پڑی، جس میں اسے شکست ہوئی۔

وہ واپس پیرس پہنچا تو اس کے سیاسی مخالفین نے بغاوت کر دی اور مارچ ۱۸۱۴ء (ربیع الاول ۱۲۲۹ھ) میں پیرس پر قابض ہو گئے۔ نپولین کو برطرف کر کے ایک چھوٹے سے جزیرے البا کا حاکم بنا دیا گیا مگر عوامی جماعتیں نپولین کی حمایت میں کھڑی ہو گئیں۔ کچھ دنوں بعد ایک جلوس اسے کاندھوں پر اٹھا کر پیرس واپس لایا اور دوبارہ زمامِ اقتدار اسے سونپ دی گئی۔

۱۸ جون ۱۸۱۵ء (۱۰ رجب ۱۲۳۰ھ) کو نپولین اپنی سابقہ شکستوں کا بدلہ لینے کے لیے "واٹرلو" کے میدان میں

---

[1] الموسوعة العربية العالمية: مادة: نابولين،
Encyclopaedia Britannica:Napoleon 1 ,moscow,waterloo battle

[2] تاريخ الدولة العلية العثمانية از فريد بك محامي: ص ۲۰۱

برطانیہ، ہالینڈ، پروشیا اور بلجیم کی مشترکہ فوجوں کے مقابل آیا مگر اس بار بھی اسے شکست ہوئی۔ اس لڑائی نے انیسویں صدی عیسوی میں برطانیہ کو دنیا کی سب سے طاقتور مملکت کا اعزاز دلا دیا۔ نپولین کو ایک جزیرے میں قید رکھا گیا جہاں سرطان میں مبتلا ہو کر وہ ۵ مئی ۱۸۲۱ء (۲ شعبان ۱۲۳۶ھ) کو ۵۱ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔①

محمد علی پاشا کی بغاوت اور مصر کی علیحدگی

انیسویں صدی عیسوی کے اوائل کا ایک اہم ترین سانحہ مصر میں محمد علی پاشا کی بغاوت اور مصر کا اعلان خودمختاری تھا۔

محمد علی پاشا ایک ہوشیار، جاہ پسند اور خود غرض ترک افسر تھا۔ مؤرخین کے بقول وہ دھوکہ باز، جھوٹا، عہد شکن اور ظالم انسان تھا۔②

محمد علی پاشا کی شخصیت:

وہ ۱۷۶۹ء (۱۱۸۳ھ) میں پیدا ہوا تھا۔ یورپی فلسفی میکاولی کے افکار سے اسے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس نے میکاولی کی مشہور کتاب "The Prince" کا ترجمہ کرایا جس میں سیاسی قوت کے حصول، تنظیم اور توسیع کے لیے دھوکہ بازی اور مکر و فریب پر مبنی گر پیش کیے گئے ہیں۔③

نپولین کے مصر پر قبضے کے دوران قاہرہ میں فری میسن کا جو مرکز قائم ہوا، اگرچہ محمد علی پاشا کا اس سے براہ راست تعلق ثابت نہیں مگر اس دور کے ایک نامور جدت پسند دانشور شیخ حسن عطار سے (جسے فری میسن کا آلۂ کار بتایا جاتا ہے) اس کے گہرے روابط تھے۔④

وہ اپنے بارے میں خود کہا کرتا تھا کہ میں عثمانی وردی میں فرنگی دماغ والا آدمی ہوں۔⑤

محمد علی پاشا کا عروج:

اسے فرانسیسی افواج کے خلاف کارروائی کے لیے مصر بھیجا گیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۳۰ سال تھی۔ مصر پر اب تک باب عالی کی نیابت میں مملوک ترکمان امراء حکومت کرتے آ رہے تھے۔ محمد علی پاشا نے بڑی چالاکی سے مقامی امراء اور علماء کا اعتماد حاصل کیا اور رفتہ رفتہ اثر و رسوخ بڑھا کر باقی ترک عثمانی اور مملوک امراء کو بے دخل کر دیا۔

اگرچہ اس نے ماضی میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا جو اس کے مرتبے میں اضافے کا باعث ہوتا مگر ان دنوں

---

① بحوالہ: الموسوعة العربية العالمية، مادہ: نابولیون ؛
Encyclopaedia Britannica:Napoleon 1 ,moscow,waterloo battle

② قراءة جديدة في التاريخ العثماني: ص ۱۵۹

③ الدولة العثمانية، عوامل النهوض وأسباب السقوط از الصلابي: ص ۳۳۳

④ الدولة العثمانية عوامل النهوض وأسباب السقوط از الصلابي: ص ۳۳۴

⑤ الدولة العثمانية عوامل النهوض وأسباب السقوط از الصلابي: ص ۳۳۵

جزیرۃ العرب میں وہابی تحریک کے ظہور سے ایک کش مکش برپا تھی۔ محمد علی پاشا نے مراسلت کر کے خلیفہ سلیم ثالث کو یقین دلایا کہ اگر اسے مصر کا حاکم (بیگلر بیگ) بنا دیا جائے تو وہ جزیرۃ العرب پر قابو پالے گا۔ مصر کے ان امراء اور علماء نے بھی، جو محمد علی پاشا کی ظاہری شرافت سے متاثر تھے، باب عالی کو آگاہ کیا کہ وہ اس کی حکومت پر راضی ہیں۔ چنانچہ جولائی ۱۸۰۵ء (ربیع الآخر ۱۲۲۰ھ) میں اسے مصر کی حکومت دے دی گئی۔[1]

مصر کی خود مختاری:

انہی دنوں برطانیہ نے جو محمد علی پاشا کا سرپرست تھا، باب عالی سے سفارش کی کہ یا تو محمد علی پاشا کو مصر کا مستقل حکمران مان لیا جائے یا اسے کسی اور علاقے کی حکومت دے دی جائے۔ خلیفہ نے دوسری صورت پسند کی اور محمد علی پاشا کو "سلانیک" کا صوبہ دار بنانے کا اعلان کیا مگر مصری جرنیل اور عمائد جو محمد علی پاشا کے حلقہ بگوش بن چکے تھے، اس پر رضامند نہ ہوئے۔ یوں محمد علی پاشا کو مصر کے خود مختار حکمران کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس نے "خدیو" کا لقب اختیار کر کے وہاں "دولتِ خدیویہ" کی بنیاد ڈالی۔[2]

باب عالی کی جانب سے مصر کی خود مختاری کو بھی قبول نہ کیا جاتا کیوں کہ اس صورت میں تیونس، طرابلس الغرب (لیبیا) اور الجزائر بھی ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ تھا، مگر اس وقت یورپ اور روس کی طرف سے مسلط کردہ جنگوں کے دوران محمد علی پاشا سے جنگ میں فتح کا امکان بہت کم تھا۔ اس لیے باب عالی نے مصر کے مسئلے پر مفاہمت کر لی۔

محمد علی پاشا نے بھی سلطنتِ عثمانیہ سے تعلقات بگڑنے نہ دیے بلکہ خلفاء کو یہ یقین دلانے میں کامیاب رہا کہ وہ دولتِ عثمانیہ کا ہمدرد، خیر خواہ اور دوست ہے۔ محمد علی پاشا کے مصر کی خود مختاری ویسی ہی تھی جیسی عباسی خلافت کے دور میں سلجوقیوں یا غوریوں کی خود مختاری۔ اس نئے مصر کے باب عالی سے نیاز مندانہ مراسم تھے۔ مصر اس امر کا پابند تھا کہ جب بھی ضرورت ہوگی اس کی فوج باب عالی کے کام آئے گی۔

محمد علی پاشا کا مصر:

محمد علی پاشا کے متعدد اقدامات یہ ثابت کرتے رہے کہ وہ فرانس، برطانیہ، روس اور آسٹریا کے ساتھ تھا۔ اس نے شرعی حدود کو معطل کر دیا، مغربی تعلیم اور یورپی تہذیب و تمدن کے نفوذ کے لیے راہیں ہموار کر دیں۔ وہ عالم اسلام کا پہلا حکمران تھا جس نے قوم کو "ماڈرن" بنانے کی کوشش کی۔ علم و معرفت اور جہاد و دعوت کا مرکز مصر اس کے دور میں کفار کی سازشوں کا مرکز بن گیا۔ اس نے قبطی، نصرانی اور یہودی زعماء سے گہرے روابط رکھے اور ان کا مقام و مرتبہ بلند کر دیا۔ اس کے دور میں عوام پر سخت ٹیکس عائد کیے گئے، حق گو علماء کا ناطقہ بند کر دیا۔ یورپی تاجروں کے لیے تجارت کے دروازے پاٹوں پاٹ کھول دیے گئے جس سے ملکی معیشت و تجارت کساد بازاری کا شکار ہوگئی اور مہنگائی عروج پر پہنچ

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱/ ۶۵۳؛ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۹۱

[2] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۹۰، ۳۹۱

گئی۔ زراعت اس قدر تباہ ہوئی کہ لوگ زمینیں چھوڑ کر ملک سے فرار ہونے لگے۔[1]

اس نے مصر میں اپنی مخالفت کا ہر امکان مٹانے کے لیے بدترین مظالم روا رکھے۔ اسے ترکمان مملوک امراء سے عدم تعاون کا خدشہ رہتا تھا۔ لہٰذا یکم مارچ ۱۸۱۱ء (۵ صفر ۱۲۲۶ھ) کو اس نے قلعے میں ایک محفل منعقد کر کے تمام مملوک امراء کو مدعو کیا۔ ایک جگہ جمع کر کے ان پر دیواروں اور چھت سے گولیوں کی ایسی بارش کی گئی کہ سب تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ جو امراء دعوت میں نہیں آئے تھے، انہیں گھروں میں گھس کر مارا گیا۔ جو فرار ہوئے انہیں بھی چن چن کر ختم کر دیا گیا۔ یوں اس آمر نے اپنے ہر مدِ مقابل کو فنا کر ڈالا۔[2]

جزیرۃ العرب اور شیخ محمد بن عبدالوہاب

سلطنتِ عثمانیہ کا روز افزوں زوال اور یورپ کی بڑھتی ہوئی ترقی دیکھ کر عالم اسلام میں دو آراء بڑی شدت سے قائم ہوگئی تھیں: ایک رائے یہ تھی کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب ان کی قدامت پسندی ہے۔ پھر اس رائے میں تشدد کرنے والے دین و مذہب ہی کو زوال کا سبب قرار دینے لگے اور ترقی و خوشحالی کو مغرب کی پیروی میں منحصر سمجھنے لگے۔ اس رائے کا حامل طبقہ محمد علی پاشا کی سربراہی میں مصر پر قابض ہو کر اسے مغربی رنگ میں رنگ رہا تھا۔

دوسری طرف ایک طبقے کی رائے یہ تھی کہ ہمارے زوال کی اصل وجہ اُس دینِ مبین سے دوری ہے جو ہمیں قوت ایمانی، تسلیم و توکل، اعلیٰ اخلاق، تربیت نفس اور ایثار و قربانی جیسی صفات بخشتا ہے۔ ہمیں دَر دَر پر جھکنے سے بچا کر ایک اللہ سے تعلق مضبوط رکھنا سکھاتا ہے۔ ہمیں حقائق جاننے، کائنات میں غور و فکر کرنے، فواحش و منکرات سے بچنے، انصاف قائم رکھنے، ظالم کا ہاتھ روکنے اور حریف کے مقابلے میں متحد و متفق اور چوکس و تیار رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اس طبقے کا کہنا تھا کہ مسلمان اس وقت جن فضول اوہام، جن آبائی رسوم، اور جن علاقائی عادات و اطوار کو اسلام سمجھتے ہیں، وہ اسلام نہیں بلکہ ان میں سے اکثر چیزیں اسلام سے بغاوت ہیں۔

اس طبقے کے قائدین میں سے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی سب سے نمایاں تھے جن کا تعلق عرب قبیلے بنو تمیم سے تھا۔ وہ ۱۷۰۳ء (۱۱۱۵ھ) میں ریاض (نجد) کے شمالی قصبے العیینہ میں پیدا ہوئے تھے جہاں بدعات و خرافات کا بڑا زور تھا۔ وہ حافظِ قرآن، محدث اور حنبلی فقیہ تھے۔ انہوں نے زبانی دعوت کے علاوہ اہم اور معرکۃ الآراء موضوعات پر بکثرت تصنیفی کام بھی کیا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تحریک شروع کر کے لوگوں کو دین کی صحیح اور سچی تعلیمات سے آراستہ کرنے کی کوشش کی۔[3] وہ عقیدۂ توحید کے داعی اور شرکیہ عقائد و رسومات کے سخت خلاف تھے۔ قبروں

---

[1] الدولۃ العثمانیۃ، از الصلابی: ص ۳۳۷، ۳۳۸ [2] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۴۰۷

[3] مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض مسائل میں انہوں نے بہت تشدد اختیار کر لیا اور ایسے امور پر بھی جن کی بعض شرائط کے ساتھ شرعی گنجائش نکلتی ہے، انہوں نے بہت سخت موقف اپنا لیا اور قدیم علماء خصوصاً اشاعرہ و ماتریدیہ پر شدید رد کیا۔ بالخصوص ان افکار پر جمہور علمائے اُمت کو بھی نکیر کرنا پڑی۔

کو پختہ کرنے اور ان پر گنبد اور عمارتیں تعمیر کرنے سے منع کرتے تھے۔

جو لوگ اپنے خیالات کو ایمانیات اور آبائی رسم و رواج کو عبادات و اعمال تصور کیے ہوئے تھے، وہ اپنی جہالت کی وجہ سے یہ سمجھنے لگے کہ ہمیں کسی نئے دین کی دعوت دی جارہی ہے۔ وہ مشائخ اور واعظین بھی جو اپنا حلقہ قائم رکھنے کے لیے بدعات و خرافات کی گنجائش نکالے ہوئے تھے، اپنے مریدوں کو اپنے ساتھ وابستہ رکھنے کی خاطر شیخ کے مخالف ہو گئے۔ حکام نے بھی یہی سمجھ کر کہ شیخ ان کی کرسی اور اقتدار کے درپے ہیں، اس تحریک کو سخت شک و شبہے بلکہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ ان تمام عوامل کے تحت شیخ کی تحریک کو ''وہابیت'' کہہ کر مشہور کر دیا گیا۔

ان حالات میں جب نجد کے امیر محمد بن سعود نے شیخ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر ان کا ساتھ دیا تو ان کے حامیوں کے پاس عسکری طاقت بھی آ گئی مگر جزیرۃ العرب کے وہ لوگ جو ایک مدت سے بدعات اور رسومات کے عادی تھے، ان کی مخالفت میں یک جان ہو گئے۔ یوں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی تحریک کے مخالفین میں جھڑپیں ہونے لگیں۔

۱۷۷۳ء (۱۱۷۸ھ) میں جب کہ شیخ عبدالوہاب ۷۰ برس کے ہو چکے تھے، امیر محمد بن سعود کے بیٹے عبدالعزیز نے ریاض پر قبضہ کر کے وہاں کے بدعنوان اور سخت گیر حاکم دہام بن دواس کو بے دخل کر دیا جس کے بعد ریاض، اس تحریک کا مرکز بن گیا۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب ۹۰ سال کی عمر پا کر ۱۷۹۲ء (۱۲۰۶ھ) میں فوت ہوئے۔ آل سعود نے ان کی تحریک کو جاری رکھا۔ حجاز کے حاکم شریف غالب بن مساعد سے ان کی کئی جھڑپیں ہوئیں۔ آل سعود نے ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) میں مکہ معظمہ اور ۱۸۰۵ء (۱۲۲۰ھ) میں مدینہ منورہ پر بھی غلبہ حاصل کر لیا۔ سعود بن عبدالعزیز کے دور میں یمن کے سوا پورا جزیرہ نمائے عرب، شام میں حوران اور عراق میں کربلا تک کے علاقے آل سعود کے قبضے میں آ چکے تھے۔ یہ آل سعود کے اقتدار کا پہلا دور تھا۔ اس کے عمائد کی پوری کوشش تھی کہ مسلمان صحیح، سچے اور خالص دین پر چلیں۔ اس دور میں حاجیوں کے بہت سے قافلے نقارے اور طبل بجاتے ہوئے مسلح حالت میں حرم آتے تھے۔ آل سعود نے ان چیزوں پر پابندی لگا دی تاکہ مقامات مقدسہ کا تقدس برقرار رہے۔

جزیرہ نمائے عرب کو یورپی طاقتوں کے اثرات سے محفوظ رکھنا بھی آل سعود کے اہم اہداف میں سے ایک تھا، ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) میں آل سعود کی سرپرستی میں لڑنے والے مجاہدین نے برطانوی بیڑے کو سخت زک پہنچا کر خلیج فارس کو بھی اپنے تسلط میں لے لیا تھا۔ اس لیے برطانیہ اس نئی حکومت کی ترقی و استحکام کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

مغرب کی پیروی کو ترقی کی معراج سمجھنے والے گروہ کو بھی وہابی تحریک سے خطرہ محسوس ہونا ایک لازمی امر تھا لہٰذا جدت پسندوں کے قائد محمد علی پاشا نے اس تحریک کو ٹھکانے لگانے کی ٹھان لی۔ اس کے اور برطانیہ کے گٹھ جوڑ سے شروع کی گئی کوششوں نے خلیفہ محمود ثانی کو بھی یہ یقین دلا دیا کہ ''وہابی تحریک'' کا مقصد خلافت کو ختم کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ خلیفہ نے آل سعود کو حجاز سے بے دخل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے پہلے عراق کے

حاکم کو یہ مہم انجام دینے کا حکم دیا مگر وہ بعض ناگزیر وجوہ سے اس سے قاصر رہا۔ آخر خلیفہ نے محمد علی پاشا اور برطانوی فوجوں سے ہی آل سعود کے خلاف مدد طلب کی۔

آل سعود، اس وقت ایک اصلاحی تحریک کی شکل میں تھے، اور ان کے پاس عسکری قوت کچھ زیادہ نہیں تھی، اس لیے جب ۱۸۱۳ء (۱۲۲۸ھ) میں محمد علی پاشا کی افواج حجاز پہنچیں تو آل سعود کے امیر عبداللہ بن سعود نے کچھ شرائط کے ساتھ حجاز کا قبضہ چھوڑنے پر رضامندی ظاہر کر دی لیکن محمد علی پاشا نے شرائط مسترد کر دیں۔ دو سال تک جھڑپیں جاری رہیں۔ آخر کار جنوری ۱۸۱۵ء (۱۲۳۰ھ) میں "بسل" کے مقام پر محمد علی پاشا نے سعودیوں کی قوت کو توڑ دیا اور یوں وہ حجاز پر قابض ہو گیا۔ اس کی فوج کا خاصا حصہ نصرانیوں اور فرانسیسیوں پر مشتمل تھا اور وہ خود بھی شرعی حدود کی پروا نہیں کرتا تھا اس لیے اس حملے میں حجاز کے معصوم شہری، بچے اور عورتیں بڑی تعداد میں جاں بحق ہوئے۔

محمد علی پاشا کی واپسی پر سعودی ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے جس کے نتیجے میں ۱۸۱۶ء (۱۲۳۱ھ) میں پاشا کے بیٹے ابراہیم پاشا نے دوبارہ جزیرۃ العرب پر حملہ کیا۔ اس بار مصری فوجوں نے آل سعود کے مرکز درعیہ (نجد) پر یلغار کی۔ امیر عبداللہ بن سعود نے شکست کھا کر آخر میں ایک معاہدے کے تحت خود کو ترک فوج کے حوالے کر دیا۔ اسے استنبول بھیج دیا گیا اور پھر معاہدے کا پاس نہ کرتے ہوئے سزائے موت دے دی گئی۔

اس جنگ کے نتیجے میں محمد علی پاشا کو مصر کے علاوہ جزیرۃ العرب پر بھی اثرات ڈالنے کا موقع مل گیا اور اس پورے خطے میں برطانوی اثر ورسوخ بھی غیر معمولی طور پر بڑھ گیا کیوں کہ محمد علی پاشا کے برطانیہ سے گہرے روابط تھے۔ برطانیہ نے حجاز کے اس قضیے سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل کیا کہ اس خطے میں ترک اور عرب منافرت کو ہوا دے کر مسلمانوں کے باہم لڑتے رہنے کی ایک مستقل وجہ پیدا کر دی۔

اگر خلیفہ محمود ثانی، محمد علی پاشا اور برطانیہ کو دخل اندازی کا موقع دیے بغیر آل سعود کی اس تحریک کو، جو ایک دینی معاشرے کے قیام اور حرمین شریفین کے تقدس کو برقرار رکھنے کے لیے شروع ہوئی تھی، اپنی سرپرستی میں لے لیتا تو حجاز پر ترکوں کا اثر ورسوخ بھی برقرار رہتا اور خود وہاں عربوں اور ترکوں کی وہ کشمکش بھی نہ شروع ہوتی جس نے اگلی صدی میں مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔[1]

سربیا کی بغاوت اور نیم خود مختاری:

ایک طویل مدت سے دولتِ عثمانیہ نے اپنے یورپی مقبوضات میں نصرانیوں کو دین اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش ترک کر دی تھی۔ ان کی زبان، تعلیم اور تہذیب وثقافت میں تبدیلی لانے کا کوئی منصوبہ عمل میں لائے بغیر صرف ان سے جزیہ لینے پر اکتفا کرتی آرہی تھی۔ اسی لیے یورپی صوبوں کے باسیوں کی ہمدردیاں اور روابط، دنیائے نصرانیت سے باقی تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے اس دورِ زوال میں جب مسلم اکثریتی صوبے خود مختاری کی طرف مائل ہو

---

[1] الدولة العثمانية عوامل النهوض وأسباب السقوط از الصلابي: ص ۳۵۰ تا ۳۶۰

رہے تھے تو غیر مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی یہ سوچ پیدا ہوتے ہوئے دیر نہ لگی۔ خصوصاً جب پوری یورپی دنیا اس سازش میں شریک تھی اور دولتِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کے دیرینہ منصوبے کو آگے بڑھا رہی تھی۔

چنانچہ ۱۸۱۵ء (۱۲۳۰ھ) میں سرب نصرانیوں کے رہنما "میلوش" (تھیوڈوروفتش) نے پوری قوم کو یکجا کر کے، ترکی کے خلاف بغاوت کردی۔ دو سال تک ترک افواج اس پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہیں مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ آخر میں اس معاہدے پر صلح ہوگئی کہ سرب اپنی حکومت اور رہنما کا انتخاب خود کریں گے، محصولات و مصارف سمیت تمام داخلی معاملات میں آزاد ہوں گے۔ ان کا خراج مقامی حکومت وصول کر کے انہی پر خرچ کرے گی۔ سلطنتِ عثمانیہ کی فوج صرف سرحدی کے قلعوں کی نگرانی کرے گی۔ اس معاہدے نے سربیا کو نیم خود مختاری دے دی۔[1]

مشرقی مسئلہ۔ یونان میں بغاوت:

۱۸۲۱ء (۱۲۳۶ھ) میں یونانی مقبوضات میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے، لگ بھگ دس سال تک وہاں جنگ ہوتی رہی اور انجام کار یونان خلافت کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس بغاوت کے پیچھے ایک پوری منصوبہ بندی کار فرما تھی۔

ہوا یہ تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ کو ٹھکانے لگانے کی متعدد ناکام کوششوں کے بعد یورپی ممالک، روس کو ساتھ ملا کر سر جوڑ کے بیٹھے اور انہوں نے طے کیا کہ اپنے تمام تنازعات کو ثانوی حیثیت دے کر ترکی کو اپنا پہلا ہدف قرار دینا چاہیے جو کئی صدیوں سے تن تنہا پورے یورپ کا مقابلہ کر رہا ہے اور اس زوال کی حالت میں بھی اس پر قابو پانا مشکل ہو رہا ہے۔ چنانچہ سب نے ترکی کو ختم کرنے کی مشترکہ جدوجہد کو "مشرقی مسئلہ" کا عنوان دیا جس کے بعد روس، برطانیہ اور فرانس مل کر کبھی خفیہ اور کبھی علانیہ یونان کی آزادی کی حمایت کرنے لگے۔ انہوں نے ترکی کو 'یورپ کے مرد بیمار' کا لقب دے دیا تاکہ عثمانیوں کی ہمت پست کی جا سکے۔

یونانیوں نے ۱۳ جنوری ۱۸۲۲ء کو ایک یونانی سیاست دان ماروکورڈاٹو (Mavrokordato) کو اپنا حکمران منتخب کر لیا اور بحیرۂ ایجی کے اکثر جزائر قبضہ کر کے جزیرہ موڑہ کے مشرق میں واقع جزیرہ نپولین (آنا پولی) کو اپنا دار الحکومت قرار دے دیا۔ ان جزائر میں آباد جو مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر قتل کیا گیا جبکہ بہت سے مسلمان نقل مکانی کر گئے۔

خلیفہ محمود ثالث نے بغاوت کی سرکوبی کے لیے کپتان علی پاشا کو بھیجا جس نے ۱۱ اپریل کو محاذ پر پہنچ کر ایک ہفتے کی جنگ کے بعد باغیوں پر قابو پا لیا۔ ان میں سے بہت سے لڑتے ہوئے قتل اور باقی گرفتار ہو گئے۔

یورپ جو جزائر میں مسلمانوں کے قتل عام پر خاموش تماشائی بنا بیٹھا تھا، باغیوں کی شکست پر چیخ اٹھا۔ یورپ میں محبانِ یونان کے عنوان سے تنظیمیں قائم کردی گئیں جو جنگی مصارف کے لیے چندہ اور اسلحہ باغیوں کو بھیجنے لگیں، رزمیہ شاعری لکھی اور پھیلائی گئی جس نے جذبات کو ابھارا اور پورے یورپ سے نوجوان لڑائی کے لیے یونان پہنچنے لگے جن

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۲۰۲، ۲۰۳

میں امریکا کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کا بیٹا اور مشہور انگریز شاعر لارڈ بیرن بھی شامل تھے۔

یوں بغاوت کی آگ دوبارہ نہایت تیزی سے بھڑک اٹھی۔ اُدھر روس کھلم کھلا یونان کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور اسے خود مختاری دینے کا مطالبہ کرنے لگا۔ خلیفہ محمود ثالث نے یونان کو بچانے کی پوری کوشش کی مگر استنبول کی فوج اس محاذ پر ناکافی تھی۔ آخر میں خلیفہ یہاں بھی محمد علی پاشا سے مدد لینے پر مجبور ہوا۔ اس نے یونانی مقبوضات کو محمد علی پاشا کی تولیت میں مان لیا تا کہ وہ انہیں بچانے کی پوری کوشش کرے۔

محمد علی پاشا نے ۱۸۲۴ء (۱۲۳۹ھ) میں اپنے بیٹے ابراہیم کو لشکر دے کر یونانی جزیروں پر بھیجا، وہ روڈس سے ہوتا ہوا جزیرہ کریٹ پر قابض ہوا، اور پھر جزیرہ مورہ پہنچا جہاں بغاوت کے شعلے آسمان کو چھو رہے تھے۔

اگرچہ پورے یورپ کے مقابلے میں یہ جنگ جیتنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی ابراہیم پاشا پیش قدمی کرتا چلا گیا۔ اُس نے انتہائی مشکل جنگ لڑ کر ۱۸ مئی ۱۸۲۴ء (ھ) کو نوارین کی اہم بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۲۵ء میں جزیرۂ مورا بھی واپس لے لیا گیا۔ اس دوران شمال سے ترک جرنیل رشید پاشا بھی اپنا بحری بیڑا لے آیا اور جزیرہ اٹیکا کو باغیوں سے بازیاب کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ ابراہیم پاشا اور رشید پاشا کی مشترکہ افواج نے اس کے بعد ''مسولونگی'' کو گھیر لیا اور ۱۳ اپریل ۱۸۲۶ء کو ایک سال کے محاصرے کے بعد اسے باغیوں سے چھڑا لیا۔ یوں باغیوں کے دارالحکومت نپولین کے سوا تقریباً تمام علاقے دوبارہ عثمانیوں کے قبضے میں آگئے۔[1]

ینی چری کا استیصال:

یونان سے جنگ میں عثمانیوں کی مسلسل فتوحات دیکھ کر سلطان محمود ثانی نے اطمینان کا سانس لیا اور قدرے فرصت پا کر ینی چری کے اس محکمے کا خاتمہ کرنے کا عزم مصمم کیا جو قوم کے لیے ایک ناسور اور ملکی خزانے پر ایک بوجھ بنا ہوا تھا۔ اس کے افسران اور سپاہی شراب نوشی، لوٹ مار اور طرح طرح کی سیاہ کاریوں میں ملوث تھے اور کوئی انہیں روکنے والا نہیں تھا۔ حد یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف ہر کارروائی کو ناکام بنا دیتے تھے اور جس خلیفہ کو چاہتے قتل کر دیتے اور جسے چاہتے تخت سے اتار دیتے تھے۔

قوم کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلانے کی سعادت سلطان محمود ثانی کے نصیب میں لکھی تھی۔ اس نے علماء، عمائدِ سلطنت اور وفادار جرنیلوں کو آہستہ آہستہ اعتماد میں لیا اور پھر ایک دن ملک کے مفتی اعظم کے گھر میں اجلاس بلا کر اس مسئلے پر رائے لی۔ صدر اعظم سلیم احمد نے ابتدائی تقریر میں ینی چری محکمے کی کمزوریوں، غلط کاریوں اور فتنہ پردازیوں کا ذکر کر کے یہ حقیقت واضح کی کہ یہ شعبہ نہ صرف خود ناقابلِ اصلاح ہے بلکہ ہر اصلاح کی راہ میں رکاوٹ ہے، لہٰذا اسے ختم کر دینا ضروری ہے۔ تمام حاضرین نے اتفاقِ رائے سے اسے منظور کر لیا۔ مجلس میں مدعو ینی چری محکمے کے اعلیٰ افسران کو بھی اس قومی اتفاقِ رائے میں شامل کیا گیا۔

---

[1] تاریخ الدولة العثمانية لا يلماز اوزتونا: ۱/۶۵۳؛ التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۱۶۳، ۱۶۵

مگر مجلس ختم ہونے کے بعد ینی چری کے انہی افسران نے ینی چری سپاہیوں کو بغاوت پر آمادہ کرلیا اور استنبول کی چھاؤنی میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ سلطان محمود ثانی کو اس کی پوری توقع تھی۔ اس نے علماء و مفتیان سے انہیں بزور طاقت تہس نہس کرنے کی اجازت لی اور پھر ساٹھ ہزار سپاہیوں اور توپ خانے سمیت ان کی چھاؤنی کو گھیر لیا۔

یہاں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ ینی چری کے پاس اس وقت توپ خانہ نہیں تھا، اس لیے جلد ہی وہ اپنی بیرکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے مگر وہاں بھی گولہ باری کی گئی۔ اس طرح ان کی طاقت فنا کردی گئی۔ ان کے محکمے کا نام، وردی، تمغے اور تمام امتیازات کالعدم قرار دے کر ان کے مفرورین کو باغی شمار کیا گیا۔ یہ ۲۵ جون ۱۸۲۶ء (۹ ذوالقعدہ ۱۲۴۰ھ) کا واقعہ ہے۔ اس جنگ میں کلیدی کردار ادا کرنے والے افسر حسین پاشا کو سپہ سالار بنادیا گیا۔

اس کے بعد سلطان محمود ثانی نے پوری آزادی سے ''نظام جدید'' کا اعادہ کیا۔ اس ضمن میں اس نے فوج کی وردی اور درباری و سرکاری لباس بھی تبدیل کردیا۔ کرتے شلوار پر یورپی وردی کو ترجیح دی گئی۔ عمامے کی جگہ ترکی ٹوپی کو دے دی گئی۔[1] نئے جوانوں کو بھرتی کرکے جدید تربیت کا کام شروع کیا گیا اور اسی سال کے ختم ہونے سے قبل بیس ہزار سپاہی تیار کرلیے گئے۔[2]

روس اور برطانیہ یونان کے ساتھ:

اُدھر یونان کے محاذ پر عثمانیوں کی فتوحات تکمیل کے قریب تھیں۔ صرف باغیوں کا دارالحکومت نپولین باقی رہ گیا تھا۔ عالمی طاقتیں قطعاً ترکی کو فاتح نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ روس اس معاملے پر پہلے ہی کھلم کھلا یونانی باغیوں کے ساتھ کھڑا ہوکر ترکی کے مدِ مقابل آچکا تھا اور دونوں ملکوں میں جنگ کا خطرہ سر پر آگیا تھا۔

ایسے میں برطانیہ نے روس کی حمایت کرتے ہوئے ایک طرف یونان کی خودمختاری کی حمایت کردی اور دوسری طرف روس اور ترکی کے مابین ایک معاہدہ کرادیا جو ''میثاق آق کرمان'' کہلایا۔ اس میں طے کیا گیا کہ:

1. روس کو بحیرۂ اسود میں جہازرانی کا حق حاصل ہوگا۔
2. اس کے جہاز، ترکی کی بندرگاہوں سے بغیر تلاشی دیے گزر سکیں گے۔
3. افلاق و بغدان کے حکام کا تقرر بذریعۂ انتخاب ہوگا۔ روس کی مرضی کے بغیر انہیں معزول نہیں کیا جاسکے گا۔
4. سربیا کو خودمختاری دے دی جائے گی اور ترکی سربیا اور بلغراد کے بیچ میں فقط تین قلعوں کا مالک رہے گا۔

اس معاہدے پر روس اور ترکی کے علاوہ آسٹریا، پروشیا اور فرانس کے نمائندوں نے بھی دستخط کیے۔ اس میں یونان کے مسئلے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا اور ظاہر یہ کیا گیا کہ اصل مسئلہ روس اور ترکی کا ہے جن کا جھگڑا ختم ہونے کے بعد یونان

---

[1] الدولة العثمانية عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۲۰، ۳۲۱
[2] تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بک محامی: ص ۴۳۱

کے مسئلے کو دوسرے مرحلے میں حل کر لینا آسان ہوگا۔ ①

یورپی اتحاد کا ترکی پر متفقہ دباؤ:

مگر درحقیقت یورپی طاقتیں مسئلے کو حل کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے ترکی کو یہ جتا کر کہ ہماری کوششوں سے امن قائم ہو رہا ہے، اگلے مرحلے میں یہ مطالبہ کر دیا کہ سلطنتِ عثمانیہ اگر اپنے یورپی مقبوضات کو پُر امن رکھنا چاہتی ہے تو ان پر براہِ راست حکومت کرنے کی بجائے، ان کا انتظام یورپی ممالک کی وساطت سے چلائے۔

سلطان محمود ثانی اس مطالبے کے پس پردہ یورپی طاقتوں کی بدنیتی کو اچھی طرح سمجھتا تھا، لہٰذا اس پیش کش کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ ترکی کے داخلی معاملات میں مداخلت کے مترادف ہے۔

اس پر یورپی ممالک جو اب تک یونان کی پس پردہ حمایت کر رہے تھے، کھلم کھلا سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف ہو گئے اور سب نے متفقہ طور پر اعلامیہ جاری کر دیا کہ اگر ترکی یونان کو آزادی دے تو یونان اسے سالانہ جزیہ دیتا رہے گا جس کی مقدار فریقین آئندہ طے کر سکتے ہیں لیکن ایک ماہ تک ترکی نے یہ پیش کش قبول نہیں کی تو یورپی طاقتیں اپنے طور پر اس مسئلے کو حل کر لیں گی۔ خلیفہ نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ ②

معاہدہ ایڈریانوپل:

آخر کار یورپی ممالک کے مشترکہ بحری بیڑے نے ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء (۲۸ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ) کو نوارین کی بندرگاہ پر عثمانی بیڑے کو شکستِ فاش دی جس میں ترکی اور مصر کی مشترکہ بحری طاقت فنا ہو گئی اور تیس ہزار مسلمان شہید ہو گئے۔

اس کے بعد ترکی کے لیے یہ جنگ جیتنا ناممکن ہو گیا۔ اس لیے فرانس، برطانیہ اور روس کے نمائندوں نے ترکی کو اعتماد میں لینے کی ضرورت سمجھے بغیر لندن میں یک طرفہ طور پر یونان کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

خلیفہ نے اس فیصلے کو ناقابلِ قبول قرار دیتے ہوئے ۱۸ دسمبر ۱۸۲۷ء (۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۳ھ) کو اپنے اعلامیے میں واضح کیا کہ یورپی ممالک خصوصاً روس، یورپ کی واحد اسلامی مملکت، خلافتِ عثمانیہ کے بارے میں بدنیت ہیں اور اس دشمنی کی وجہ سیاسی نہیں مذہبی ہیں، اس لیے مسلمانوں کو اپنے دین، اپنی ملت اور اپنے وطن کے دفاع کے لیے جہاد کی تیاری کر لینی چاہیے۔ ③

خلیفہ کے اس بیان پر روس تلملا اٹھا اور اس نے ۲۶ اپریل ۱۸۲۸ء (۱۱ شوال ۱۲۴۳ھ) کو ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ خلیفہ نے بھی روسی سرحدوں پر لشکر بھیج دیے۔ اس دوران یونان کے محاذ پر جنگ ختم ہو گئی اور محمد علی پاشا نے وہاں مزاحمت بے سود تصور کر کے ستمبر ۱۸۲۸ء (ربیع الاول ۱۲۴۴ھ) میں مصری افواج کو یونان سے واپس بلا لیا۔ ④

---

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۱۶۴، ۱۶۵

② التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۱۶۵، ۱۶۶

③ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از محامی: ص۴۲۷، ۴۲۸

④ تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از محامی: ص۴۲۸

ترکی اور روس کی جنگ:

اپریل ۱۸۲۸ء (شوال ۱۲۴۳ھ) میں روس کے اعلانِ جنگ کے بعد ترک فوج ڈیڑھ سال تک روس سے نبرد آزمارہی۔ دریائے بروت، بغدان، افلاق اور دریائے ڈینوب کے محاذوں پر شدید جنگیں ہوئیں۔ ینی چری کے خاتمے کے بعد تیار کیے جانے والے متبادل ترک دستے بہت کم تھے مگر جہاں جہاں وہ تعینات تھے، وہاں روس کو ماضی کی تمام جنگوں سے بڑھ کر نقصانات ہوئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ینی چری کے خاتمے اور جدید تربیت یافتہ فوج کی تیاری کا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔ کاش یہ فیصلہ چند سال پہلے کرلیا جاتا تو ہر میدان میں ذلت آمیز شکستیں، اعدائے اسلام کا مقدر بن جاتیں۔

چونکہ اس ناگزیر فیصلے میں تاخیر در تاخیر ہوئی تھی اسی لیے یونان میں ترکی کو شکست ہوئی اور روس کے محاذ پر بھی بعض کامیابیوں کے باوجود اکثر مقامات پر پسپائی ہوئی کیوں کہ ینی چری کو کالعدم قرار دیے ہوئے ابھی دو سال ہی گزرے تھے اور اس مدت میں اتنے نوجوانوں کی تربیت نہیں ہوئی تھی، جو ہر محاذ پر تعینات کیے جاسکتے۔

کئی جنگی نقاط پر ترکوں کی پسپائی کے بعد روس "وارنا" پر قابض ہوکر بحیرۂ اسود میں داخل ہوگیا اور اس کی فوجوں نے استنبول کے شمال میں "قارص" اور مغرب میں "ادرنہ" (ایڈریانوپل) پر بھی قبضہ کرلیا جو ترکوں کا سابق پایۂ تخت تھا۔ بحری راستے میں روس کی کھلی پیش قدمی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ معرکۂ نوارین میں ترکی کی بحری طاقت تباہ ہوگئی تھی۔[1]

معاہدۂ ادرنہ (میثاقِ ایڈریانوپل):

ادرنہ پر روسی تسلط کے بعد خطرہ تھا کہ وہ استنبول پر بھی قبضہ کرلے گا۔ چونکہ ہر یورپی ملک دنیا کے اس اہم عسکری وسیاسی مقام پر قابض ہونا چاہتا تھا اور روس کا وہاں قبضہ یورپ کے لیے خطرہ بن سکتا تھا، لہٰذا فرانس اور برطانیہ نے بیچ میں آکر صلح کرادی۔ ۱۴ ستمبر ۱۸۲۹ء (۱۵ ربیع الاول ۱۲۴۵ء) کو میثاقِ ایڈریانوپل پر دستخط ہوئے جس کے مطابق:

1. افلاق، بغدان، بلقان، قارص، ارض روم اور بلغاریہ، ترکی کو واپس کردیے گئے۔
2. دریائے بروت کو ترکی اور روس کے مابین سرحد قرار دیا گیا۔
3. روس کو بحیرۂ اسود میں جہاز رانی کی کھلی اجازت دے دی گئی۔
4. سلطنتِ عثمانیہ کو پابند کیا گیا کہ وہ روس کو تاوانِ جنگ ادا کرے۔
5. سربیا کو خودمختاری دے دی گئی۔ البتہ اس کے کچھ حصے دولتِ عثمانیہ میں باقی رہے۔

"میثاقِ ایڈریانوپل" عثمانیوں کی بڑی شکست تھی جس نے بہت سے مقبوضات کو ان کے ہاتھوں سے نکال دیا۔[2]

الجزائر پر فرانس کا قبضہ:

نپولین کی مشرقی مہم کے باوجود فرانس، بحرِ ہند میں برطانیہ کا تسلط ختم کرنے میں ناکام ہوچکا تھا مگر وہ بحیرۂ روم میں

---

① تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از محامی: ص ۴۳۲، ۴۴۴ ② التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/ ۱۶۳، ۱۶۴

بہر حال برطانیہ کو مات دینا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے الجزائر پر قابض ہو کر بحیرۂ روم پر تسلط کا فیصلہ کرلیا۔ مگر معاہدہ ایڈریانوپل کے بعد فرانس کے پاس حملے کا کوئی بہانہ نہیں تھا۔

انہی دنوں فرانس کو غلے کی ضرورت پڑی تو وہاں کے یہودی تاجروں نے الجزائر کے عثمانی حاکم حسین بائی سے بھاری مقدار میں غلہ خرید کر فرانس منتقل کر دیا۔ یہ سودا اس شرط پر ہوا تھا کہ قیمت فوراً ادا کی جائے گی مگر فرانس نے ادائیگی میں ٹال مٹول شروع کر دی۔ حاکم الجزائر نے فرانس کے سفیر سے اس کی شکایت کی تو فرانسیسی سفیر نے بھری محفل میں جہاں ملک کے امراء اور وزراء بھی موجود تھے، حاکم کی بے عزتی شروع کر دی۔ حاکم نے اسے ہاتھ کی پنکھی کھینچ ماری۔ فرانس جو ترکی کو کمزور تر دیکھ کر الجزائر پر قبضے کا بہانہ تلاش کر رہا تھا، یہ اطلاع ملتے ہی آمادۂ پیکار ہو گیا اور اسے اپنی توہین قرار دے کر ۷ فروری ۱۸۳۰ء (۱۳ شعبان ۱۲۴۵ھ) کی مجلس وزراء میں قرار داد منظور کی کہ اب الجزائر پر قبضہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ چنانچہ بلا تاخیر ۲۸ ہزار سپاہی الجزائر روانہ کر دیے گئے۔ فرانس نے ساتھ ہی یہ موقف بھی اختیار کیا کہ وہ مسلم قزاقوں کے اپنے تجارتی جہازوں پر حملے برداشت نہیں کر سکتا۔

خلیفہ کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے فوراً ایک سفیر الجزائر روانہ کر دیا تاکہ وہ حاکم الجزائر کو فرانس سے اپنی بد اخلاقی پر معذرت کرنے کا حکم دے۔ مگر فرانسیسی فوج نے خلیفہ کے سفیر کو راستے میں گرفتار کر لیا اور الجزائر پر قبضے کے بعد ہی اسے رہا کیا۔ فرانس کی فوج ۱۲ جون (۲۰ ذوالحجہ ۱۲۴۵ء) کو الجزائر کے ساحل پر اتری اور گھمسان کی جنگوں کے بعد جولائی ۱۸۳۰ء (محرم ۱۲۴۶ء) میں دارالحکومت پر قابض ہو گئی۔ اس کے بعد فرانسیسی افواج یکے بعد دیگرے آکر اس ملک کے طول و عرض میں پھیلتی گئیں۔ محمد علی پاشا، الجزائر کے بالکل پڑوس میں، ایک نہایت طاقتور فوج کے ساتھ موجود تھا مگر اس نے الجزائر کے دفاع کے لیے کچھ بھی نہ کیا۔ اُدھر خلیفہ کے لیے روس سے شکست، بحیرۂ روم کے جزیروں سے محرومی اور مصر کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اپنا دفاع بھی مشکل تھا، چہ جائے کہ وہ الجزائر کی کچھ مدد کر سکتا۔[1]

امیر عبدالقادر الجزائری کی جدوجہد:

ایسے میں الجزائر کے مردِ حُر امیر عبدالقادر الجزائری نے ملک کے علماء، قبائل کے عمائد اور نوجوانوں سے جہاد پر بیعت لی اور انہیں منظم کر کے فرانس کا مقابلہ شروع کر دیا۔ اکثر میدانوں میں انہوں نے فرانسیسی افواج کو شکستِ فاش دی۔ اس حوالے سے وہران اور مستغانم کے معرکے یادگار ہیں۔ مجبوراً فرانس کو امیر عبدالقادر سے صلح کرنا پڑی جس کے بعد الجزائر کے اکثر علاقے پر مجاہدین کی حکومت قائم ہو گئی۔ تاہم ایک سال بعد فرانس نے اچانک صلح توڑ کر دوبارہ جنگ شروع کر دی۔ فرانسیسی جہاں قبضہ کرتے، وہاں خون کی ندیاں بہا دیتے۔ ۱۸۴۳ء میں "زمالہ" پر قابض ہو کر انہوں نے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو زندہ نہ چھوڑا اور ایسے مظالم کیے جنھیں سن کر بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ امیر عبدالقادر سترہ سال تک فرانس کا مقابلہ کرتے رہے مگر انہیں کہیں سے کمک نہ ملی اور آخر انہیں شکست ہو گئی۔

---

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۴۳۷، ۴۳۸

۸ جولائی ۱۸۴۷ء (۲۳ رجب ۱۲۶۳ھ) کو انہوں نے گرفتاری دے دی۔ یوں اس ملک پر فرانس کا تسلط مکمل ہو گیا۔ عبدالقادر الجزائری کو چار سال بعد رہائی مل گئی۔ انہوں نے باقی عمر ترکی اور حجاز میں گزاری اور آخر ۱۸۷۳ء (۱۲۹۰ھ) میں وفات پا کر مکہ میں مدفون ہوئے۔[1] ان کی سرفروشانہ زندگی پر محمد علی جوہر مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ...... ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

محمد علی پاشا کا شام پر حملہ:

خلافتِ عثمانیہ کو کمزور دیکھ کر اس کا دوست نما دشمن محمد علی پاشا بھی اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوا۔ الجزائر پر فرانس کے قبضے سے بابِ عالی کو جو دھچکا لگا، اس سے محمد علی پاشا بڑا خوش تھا اور اسے امید ہو گئی کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کو ختم کر سکتا ہے۔

چنانچہ اس نے ۱۸۳۱ء (۱۲۴۶ھ) میں اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو بحری و بری فوجیں دے کر شام بھیج دیا۔ ابراہیم ترک افواج کو شکست دے کر حمص پر قابض ہو گیا۔ ۲۸ مئی ۱۸۳۲ء (۲۷ ذوالحجہ ۱۲۴۷ھ) کو اس نے عکا پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ شمالی شام اور ترکی کی سرحد کی طرف بڑھتا ہوا، حلب کے قریب پہنچ گیا۔

ادھر سلطان محمود ثانی نے سقوطِ عکا کی خبر سن کر اپنی تمام فوج کو جس کی تعداد ساٹھ ہزار تھی، حسین پاشا (جس نے ینی چری کے استیصال میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا) کی قیادت میں شام بھیج دیا۔ مگر ۲۹ جون ۱۸۳۲ء (۲۸ محرم ۱۲۴۸ھ) کی جنگ میں اس کے ہراول کو شکست ہوئی جس کے بعد مصری لشکر حلب پر قابض ہو گیا۔ حسین پاشا یہ دیکھ کر پسپائی اختیار کرتے ہوئے، شام اور ترکی کے درمیان واقع پہاڑی سلسلے کوہستان طوروس میں مورچہ بندی کرنے لگا تاکہ مصری فوج کو وہیں روکا جاسکے۔ مگر ۲۹ جولائی (یکم ربیع الاول) کو ابراہیم نے آگے بڑھتے ہوئے اس کے حفاظتی انتظامات تہس نہس کر دیے اور ترک فوج تتر بتر ہو گئی۔ ابراہیم پاشا یلغار کر کے اناطولیہ کے وسطی شہر قونیہ تک پہنچ گیا اور ۲۰ دسمبر ۱۸۳۲ء (۲۷ رجب ۱۲۴۸ھ) کو یہاں دوسرے ترک اعلیٰ افسر رشید پاشا کو بھی شکست دے دی۔

ترکی کی حالت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اب استنبول کے سقوط کا خطرہ پیدا ہو گیا مگر ایسے میں روس نے، جو پیٹر اعظم کی وصیت کے مطابق استنبول کو اپنا عالمی مرکز بنانے کے خواب دیکھتا چلا آرہا تھا، بڑی تیزی دکھائی اور خلیفہ کو پیش کش کی کہ وہ پندرہ ہزار روسی سپاہی استنبول کے دفاع کے لیے بھیجنے کے لیے تیار ہے۔ خلیفہ کو کوئی دوسری صورت نظر نہ آئی تو اجازت دے دی، یوں روسی افواج پہلی بار استنبول پہنچیں اور بندرگاہوں پر تعینات کر دی گئیں۔

روس سے ایک دفاعی معاہدہ بھی ہو گیا جس میں طے پایا کہ روس استنبول پر محمد علی پاشا یا کسی بھی حملہ آور کو روکنے کے لیے تعاون کرے گا اور روسی بحریہ استنبول کی خلیجوں سے بلا اجازت گزر سکے گی۔ اس معاہدے کو "میثاقِ خونکار اسکلہ سی"

---

[1] ملاحظہ کریں: الامیر عبدالقادر رائد الکفاح الجزائری، از دکتور یحیی بو عزیز، ط الدار العربیۃ للکتاب، تیونس

نوٹ: الجزائر پر فرانس کا قبضہ ۱۳۰ سال تک برقرار رہا۔ اس دوران یہاں کے مسلمان مختلف شکلوں میں اپنی آزادی کے لیے کوشاں رہے۔ آخر ۱۹۶۲ء میں الجزائر کو ایک جمہوری ریاست کے طور پر آزادی دے دی گئی۔

کہا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے روس نے استنبول میں مداخلت کا مستقل راستہ حاصل کر لیا۔

مصری افواج کے استنبول سے قریب تر آنے اور ترکی میں روس کا عمل دخل بڑھ جانے سے مغربی ممالک جن میں سے ہر ایک استنبول کو اپنی راجدھانی بنانا چاہتا تھا، پریشان ہو گئے، اور انہوں نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ معاملہ قابو سے باہر ہونے سے پہلے محمد علی پاشا سے صلح کر لی جائے۔ خلیفہ اپنے دفاع سے عاجز تھا اس لیے مجبور ہو کر صلح کا معاہدہ کر لیا جو میثاق کوتاہیہ کے نام سے موسوم ہے، اس میں طے ہوا کہ:

1. مصری فوج ایشیائے کوچک سے نکل جائے گی۔
2. محمد علی پاشا تاحیات مصر کا حکمران رہے گا۔
3. شام کے چار صوبوں: عکا، حمص، طرابلس اور حلب میں وہ اپنے نائبین مقرر کرے گا۔[1]

محمد علی پاشا اور شام کی حکومت:

محمد علی پاشا نے شام پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں یہود و نصاریٰ خصوصاً برطانیہ کے عزائم کے لیے راہیں ہموار کرنا شروع کر دیں۔ فرانس اور امریکا کے مشنری اداروں کو مسیحیت کی تبلیغ کی اجازت دے دی گئی۔ غیر مسلموں پر لاگو شریعت کے خصوصی قوانین معطل کر دیے گئے۔ امریکا نے اپنا پریس جزیرہ مالٹا سے بیروت منتقل کر لیا۔ ایلی سمتھ اور اس کی بیوی نے بیروت میں پہلا گرلز اسکول بھی کھول لیا۔ عین طورہ کا کالج مستشرقین کے افکار سے آراستہ ادیب اور مفکرین پیدا کرنے لگا۔ یورپ اس کوشش میں کامیاب رہا کہ اسلامی ملکوں میں لگنے والے جدید پریس، نصرانی سرمایہ داروں کے سوا کسی کی ملکیت نہ ہوں۔ اس مطابع سے شائع ہونے والے لٹریچر اور ان تعلیم گاہوں کے ذریعے اسلامی تہذیب و تمدن کے خلاف مہم چلائی گئی۔ شام اور مصر میں وطنیت کا جذبہ عام کیا گیا تاکہ ترکوں اور عربوں کو مزید لڑایا جا سکے۔ فری میسن کے لاجز جگہ جگہ کھل گئے اور اسلام کی جڑیں کاٹی جانے لگیں۔[2]

شام پر مصر کا دوسرا حملہ اور ترکوں کو دوبارہ شکست:

محمد علی پاشا نے یورپی طاقتوں کے دباؤ میں آ کر ترکی سے صلح کا معاہدہ کیا تھا ورنہ وہ پورے ترکی کو ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ اُدھر خلیفہ نے بھی جنگ کی تیاری کا وقت لینے کے لیے صلح کی تھی۔ اس دوران محمد علی پاشا سے مذاکرات بھی ہوئے جس میں پاشا نے پوری کوشش کی کہ وہ شام اور ترکی کے مابین حائل "کوہ طوروس" پر بھی اپنا حق تسلیم کرائے مگر خلیفہ اس پر راضی نہ ہوا کیوں کہ یہی پہاڑ ترکی کی قدرتی فصیل تھے۔ مذاکرات کی ناکامی پر دوبارہ جنگ چھڑ گئی۔ ۲۴ جون ۱۸۳۹ء (۱۲ ربیع الآخر ۱۲۵۵ھ) کو الجزیرہ کے علاقے نصیبین میں ترکوں اور مصریوں میں نہایت خونریز جنگ ہوئی جس میں ایک بار پھر ترک افواج کو شکست ہوئی۔ مصری فوج کو ۱۶۶ توپیں اور بیس ہزار بندوقیں غنیمت میں ملیں۔[3]

---

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از محامی: ص ۳۵۰، ۳۵۱

[2] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۳۵۲، ۳۵۳

[3] الدولۃ العثمانیۃ از الصلابی: ص ۳۶۹

محمود ثانی کی وفات:

اس شکست کی اطلاع ملنے سے پہلے ہی ۲ جولائی (۱۹ ربیع الآخر ۱۲۵۵ھ) کو خلیفہ محمود ثانی کی وفات ہوگئی۔ اس کی عمر ۵۵ سال تھی۔ اور مدت خلافت ۳۱ سال دس مہینے۔ [1]

سلطان محمود ثانی کا کردار، کارنامے اور غلطیاں:

محمود ثانی سلطنتِ عثمانیہ کے عظیم خلفاء میں سے ایک تھا۔ اس نے طویل دورِ حکومت پایا اور سلطنت کو جدید نظام سے متعارف کرایا۔ اگر یہ انتظامات نہ کیے جاتے تو ترکی جو پانچ سو سالہ قدیم نظام پر تکیہ کیے ہوئے تھا، شاید مزید پانچ دس سال بھی نہ گزار پاتا اور روس یا برطانیہ کا غلام بن جاتا۔

مسلسل جنگوں کے باوجود سلطان محمود ثانی کا مسلسل اصلاحات میں مصروف رہنا، اس کی ہمت، ذہانت اور مضبوط قوتِ ارادی کا واضح ثبوت ہے۔ سلطنت کے دو طبقات جو ''اعیان'' اور ''اشراف'' کہلاتے تھے، ایک مدت سے صوبوں اور اضلاع میں اپنی من مانی کیا کرتے تھے۔ سلطان نے ان کے استبداد اور مطلق العنانی کا خاتمہ کر دیا اور ایک حکم نامہ جاری کر کے ان دونوں طبقات کو کالعدم قرار دے دیا۔ ان کی جگہ انتظامات کی جدید تشکیلات کی گئیں جو مرکز کے تابع تھیں۔

سلطان نے ینی چری کے ناقابلِ اصلاح ادارے کو ختم کر کے اس کی جگہ جدید افواج تشکیل دیں اور یوں جدید فنونِ حرب سے ناآشنا بھاری بھرکم لشکروں کی جگہ بہترین افواج کو تربیت دلائی۔ اس سلسلے میں اس نے ''مکتب فنون حربیہ شاہیہ'' (المدرسۃ الحربیۃ الامبراطوریہ) کا افتتاح کیا، اس دن سخت برفباری ہو رہی تھی۔ تاہم سلطان خود کیچڑ اور برف سے گزر کر وہاں پہنچا اور اس ادارے کا افتتاح کیا۔ اس کیڈٹ کالج سے تربیت پانے والوں کو فوری طور پر ''زعیم'' (افسر) کا درجہ مل جاتا تھا۔

سلطان محمود ثانی نے ''مہندس خانہ بری ہمایونی'' (آرمی انجینئرنگ کالج) کو ترقی اور وسعت دیتے ہوئے ساتھ ہی ''مہندس خانہ بحری ہمایونی'' (نیول انجینئرنگ کالج) بھی قائم کر دیا جہاں سے بحری افسران تربیت پانے لگے۔ ان اداروں کے لیے یورپ سے بہترین اساتذہ منگوائے گئے اور یہاں کے انتظامات عالمی معیار کے مطابق کیے گئے۔

نیز اس نے ''شاہی مدرسہ طبیہ عسکریہ'' نامی کالج قائم کیا جہاں سے فارغ ہونے والے ڈاکٹر اور سرجن میدانِ جنگ میں طبی خدمات انجام دینے کے لیے مستعد رہتے تھے۔ اس ادارے میں تمام تعلیم فرانسیسی میں ہوتی تھی۔

سلطان نے ایک ادارہ ''دار الترجمہ'' کے نام سے قائم کیا۔ یہ ادارہ صدرِ اعظم اور دیگر وزراء کے لیے (جو غیر ملکی زبانیں نہیں جانتے تھے) تحریروں اور دستاویزات کا ترجمہ کیا کرتا تھا۔ نیز یہاں نوجوانوں کو غیر ملکی زبانیں خصوصاً فرانسیسی

---

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۴۵۳

سکھائی جاتی تھی۔

سلطان نے یورپ کے جدید نظام حکومت سے کئی چیزیں اپنائیں۔ وزارت خارجہ قائم کی اور صدر منشی کے عہدے کو وزیر خارجہ میں بدل دیا۔ وزارت داخلہ قائم کی اور "کتخدا الصدارۃ" (اندرونی معاملات کے ذمہ دار) کو وزیر داخلہ کا نام دیا۔ باش دفتر (افسر بیت المال) کو وزیر مالیات میں تبدیل کردیا اور مالیاتی انتظامات کا ایسا جدید نظام قائم کردیا جو مغربی دنیا کے نظام سے بہتر تھا۔

یونان سے جنگ میں ترکوں کا بحری بیڑہ تباہ ہوگیا تھا۔ سلطان نے اس کی جگہ پہلے سے بڑھ کر عظیم الشان بحری بیڑہ تیار کرادیا۔ اس نے تعمیر وترقی کے متعدد محکمے قائم کیے جن کے تحت ہزار ہا خستہ حال اور تباہ شدہ عمارتوں کی مرمت یا تعمیر نو کی گئی۔ بے شمار سڑکیں بنائی گئیں اور پل تعمیر کیے گئے۔

سلطان محمود ثانی نے شعبۂ مواصلات اور نشر و اشاعت پر خاص توجہ دی۔ ملک میں حجری طباعت (لیتھو پرنٹنگ) کا آغاز کیا اور پریس لگوائے۔ یکم فروری ۱۸۳۱ء (۱۸ شعبان ۱۲۴۶ھ) کو "تقویم وقائع" کے نام سے ایک اخبار نکالا جو تین زبانوں: عربی، ترکی اور فرنچ میں شائع ہوتا رہا۔

اس کا سب سے بڑا کارنامہ شہریوں کو حکومت میں شریک کرنا تھا۔ اس نے شہری محکموں کو عسکری محکموں سے الگ کردیا اور وہاں ان شعبوں میں مہارت رکھنے والے شہریوں کو انتظامات سونپ دیے۔

ایک زمانے سے بہت سے محکمے علمائے دین کے سپرد تھے۔ اب وہاں جدید مہارتوں کی ضرورت تھی مگر علمائے دین جدید عصری علوم سے ناواقف تھے، اس بنا پر وہ محکمے زیادہ فعال نہیں رہے تھے۔ سلطان نے علماء کو صرف تین محکموں یعنی: محکمۂ امور دینی مدارس، محکمۂ امور دین اور محکمۂ شہری حقوق میں رہنے دیا۔ باقی کئی شعبوں مثلاً: تجارت، صنعت و حرفت اور بلدیات میں ان کی جگہ ماہرین فن کو بھرتی کیا۔ عثمانی دربار کے علماء بڑے بھاری بھرکم لباس اور بہت اونچے عمامے پہنا کرتے تھے۔ سلطان نے ان کے لیے عام علماء جیسا لباس رائج کردیا۔

ان جدتوں کے ضمن میں سلطان سے ایک سنگین غلطی بھی ہوئی جس نے ترکوں پر مغربی تہذیب وتمدن کے دروازے کھول دیے۔ ہوا یہ کہ سلطان نے اپنے داماد اور مشیر خلیل رفعت پاشا کے اصرار پر مشرقی لباس کی جگہ یورپی لباس کو لازم کردیا۔ خلیل رفعت پاشا مغربی تہذیب وتمدن اپنانے کا داعی تھا۔ اس کا کہنا تھا:

"اگر ہم نے اہل یورپ کی مشابہت اختیار نہ کی تو دیگر ایشیائی قوموں کی طرح ہمیں بھی غلام بننا پڑے گا۔"

آخر سلطان نے ۳ مارچ ۱۸۲۹ء (۲۷ شعبان ۱۲۴۴ھ) کو یہ حکم جاری کردیا کہ تمام درباریوں، سرکاری افسران اور ملازمین کے لیے عمامہ، کرتا شلوار اور مقامی طرز کے جوتے ممنوع ہیں۔ سرخ رومی ٹوپی، پتلون اور شرٹ لازمی ہے۔ عسکری عہدے دار اس حکم سے مستثنیٰ اور فوجی وردی پہننے کے پابند تھے۔ عمامہ اور کرتا شلوار صرف علماء کے لیے مخصوص کردیے گئے۔ سلطان کے اس حکم سے اکثر درباری اور امراء متفق نہ تھے مگر بادل نخواستہ انہوں نے یہ حکم قبول

کرلیا۔ سلطان نے ان اصلاحات کی مخالفت کرنے والوں پر بہت سختی کی اور ان کی آواز کو دبا دیا۔[1]

اگرچہ سلطان ایک مذہب پسند مسلمان تھا اور اس کے نظریات اپنے آباء و اجداد سے مختلف نہ تھے مگر یہ ایک امر لازم ہے کہ ظاہر کا اثر انسان کے باطن پر بھی ہوتا ہے، چنانچہ مغربی لباس اپنانے کے بعد ترک افسران کے دلوں میں مغربی طرزِ حیات اور افکار و نظریات کے لیے بھی نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔ اگلے چند عشروں میں اس صورتحال نے ملک کو بڑی تیزی سے مغربی افکار اور نظریات کی طرف دھکیل دیا، بقول اکبر الٰہ آبادی۔

برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر
آگیا تارِ امید و بیم ان کے ہاتھ میں
مغربی رنگ و روش پر اب نہ آئیں کیوں قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں، تعلیم ان کے ہاتھ میں

+++

① تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوزتونا: ۲/۱۹ تا ۲۲

سلطان عبدالمجید اوّل بن محمود ثالث

۱۲۵۵ھ تا ۱۲۷۷ھ
۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء

سلطان محمود ثانی کی وفات کے بعد اس کا سترہ سالہ بیٹا عبدالمجید اوّل تخت نشین ہوا۔ وہ جسمانی لحاظ سے کمزور مگر ذہین، مہربان اور قابل نوجوان تھا۔ وہ ترقی واستحکام کے لیے نظام میں فوری تبدیلی کا خواہاں تھا۔ اس نے فوج کے نظام میں بکثرت اصلاحات کرائیں، تجارت کو وسعت دی، شرقی علوم کے ساتھ جدید فنون کی اشاعت کی اور بہت سی نئی تعمیرات کرائیں۔ [1] اسی دور میں ترکی میں پہلا بینک کھولا گیا اور کاغذی نوٹ جاری کیے گئے۔ [2]

شام میں ترکی اور مصر کا قضیہ:

عبدالمجید اوّل کی تخت نشینی کے وقت شام اور الجزیرہ کے علاوہ اناطولیہ کے علاقوں: عین تاب، قیصریہ اور ملطیہ پر بھی مصری فوجیں قابض ہو چکی تھیں اور سلطنتِ عثمانیہ کا گویا دم لبوں پر تھا۔ پھر گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے کے بمصداق، ترکی کے امیر البحر احمد پاشا نے اپنا بحری بیڑہ اسکندریہ لے جا کر محمد علی پاشا کے حوالے کر دیا۔ اس حرکت کی وجہ صرف یہ تھی کہ اسے صدر اعظم نہیں بنایا گیا تھا جب کہ اسے اس منصب کے حصول کی شدید خواہش تھی۔

ترکی کا بحری بیڑہ ہاتھ آجانے کے بعد محمد علی پاشا کسی بھی وقت، بحری اور بری طاقت سے محروم استنبول پر فیصلہ کن حملہ کر سکتا تھا، مگر یہ بات یورپی طاقتوں کے مفادات کے خلاف تھی کیوں کہ ترکی کو فتح کرنا اب ان کے لیے کوئی مشکل مسئلہ نہیں رہا تھا۔ وہ ترکی کو بل بانٹ کر اپنی مرضی سے تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے کسی کا وہاں بزورِ قوت قابض ہو جانا، ان کے طے شدہ منصوبوں میں رخنہ ڈال سکتا تھا۔

چنانچہ فرانس، برطانیہ، آسٹریا، روس اور پروشیا نے بیچ میں آکر آواز لگا دی کہ مصر اور ترکی کے باہم تنازعے میں کوئی یک طرفہ فیصلہ عالمی امن کو خطرے میں ڈال سکتا ہے لہٰذا اس قضیے کا فیصلہ ان کی مرضی کے بغیر نہیں ہوگا۔ خلیفہ

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از علی حسون: ص ۱۸۹، ط المکتب الاسلامی بیروت
② الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۷۶

عبدالمجید اول نے اسے قبول کرلیا۔ محمد علی پاشا کے پاس بھی یورپی ممالک کے سامنے جھکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔[1]

شام سے مصری فوج کا انخلاء:

اب تک یورپی طاقتوں نے محمد علی پاشا کو ایک خوبصورت اسلامی ہیرو کے طور پر پیش کیا تھا تا کہ باقی مسلمان بھی اس کی پیروی کریں۔ اس کے پردے میں یورپی طاقتوں نے اسلام دشمن یہودی ونصرانی تحریکوں اور تنظیموں کو عالم اسلام میں داخل کردیا تھا، وہ کھلم کھلا تجارتی مراعات حاصل کر کے مشرق کی دولت لوٹنا جائز کر چکے تھے۔ علماء وفقہاء کا مرتبہ پست کر کے انہیں اُمت کی قیادت سے روک دیا گیا تھا۔ یورپی طاقتیں محمد علی پاشا کی پشت پناہی کر کے اسے مضبوط کرتی رہیں۔ پھر اسی طاقت کے ذریعے انہوں نے خلافتِ اسلامیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس قدر کمزور کر دیا کہ خلیفہ دارالخلافہ کے دفاع کے لیے اپنے بدترین دشمن روس کو بلانے پر مجبور ہوا تھا۔[2]

مگر جب یورپ کے یہ اہداف پورے ہو گئے تو اس نے محمد علی پاشا کو بھی کمزور کرنا شروع کر دیا تا کہ مستقبل میں وہ کبھی بھی یورپ کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔ اس لیے جب یورپی ممالک نے ترکی اور مصر کے درمیان اپنی مرضی کی مصالحت کرنے کا حق جتلایا اور متحارب فریقین نے اسے قبول کرلیا تو اس کے نتیجے میں ۱۵ جون ۱۸۴۰ء (۱۴ ربیع الآخر ۱۲۵۶ھ) کو ترکی اور مصری کش مکش کا اختتام درج ذیل معاہدے پر ہوا:

1. محمد علی پاشا ترکی کے حق میں شام سے دست بردار ہو جائے گا۔
2. مصری حکومت محمد علی پاشا کی اولاد میں نسل در نسل چلتی رہے گی۔
3. مصری فوج اٹھارہ ہزار سپاہیوں سے زیادہ نہیں رکھی جائے گی۔
4. مصر اپنی بحریہ کے لیے جہاز سازی نہیں کرے گا۔
5. مصر کے حکمران کو فوج کے افسران منتخب کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ صرف سپاہی بھرتی کرنے کا اختیار ہوگا۔

محمد علی پاشا نے شروع میں بڑی کوشش کی کہ کوئی ایسا معاہدہ طے ہو جس کی وجہ سے خطے میں مصر کی بالادستی قائم رہے مگر یورپی طاقتیں کسی طرح نہ مانیں اور جب اسے دھمکانے کے لیے برطانیہ کا بحری بیڑہ شام کے ساحلوں تک آن پہنچا تو محمد علی پاشا کو یورپ کے مسلط کردہ فیصلے سے اتفاق کر کے شام سے افواج کا انخلاء کرنا ہی پڑا۔

ابراہیم پاشا کی قیادت میں مصری فوج کا انخلاء دسمبر ۱۸۴۰ء (۱۲۵۶ھ) میں شروع ہوا۔ راستے میں بدوؤں نے، جو شام پر مصر کے تسلط کے سخت مخالف تھے، مصری افواج پر جگہ جگہ چھاپے مارے۔ اس کے علاوہ موسم کی شدت مستزاد تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مصر واپس پہنچتے پہنچتے ابراہیم پاشا تین چوتھائی فوج گنوا چکا تھا۔ اس طرح مصر کی قوت بہت کم رہ گئی۔

محمد علی پاشا عالم اسلام کا پہلا سیاسی رہنما تھا جس نے اغیار کو سرپرست اور قبلہ بنا کر اپنا سیاسی قد وقامت اونچا کیا مگر

---

① تاریخ الدولة العلیة العثمانیة از فرید بک محامی: ص ۳۵۶، ۳۵۷

② الدولة العثمانیة، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۴۰

جب وہ خود کو بالا دست سمجھ کر عروج کی طرف پرواز کے لیے تیار ہوا تو انہی سر پرستوں نے اس کے پر کاٹ لیے۔ محمد علی پاشا کے بعد ایسے قائدین کی آمد و رفت ایک تسلسل سے آج تک جاری ہے۔[1]

"میثاق خونکار اسکلہ سی" کی تنسیخ:

میثاق خونکا کے مطابق روس نے ترکی کو دفاعی تعاون فراہم کرنے کے بدلے استنبول کی تمام خلیجوں میں جہاز رانی کی کھلی چھٹی لے لی تھی جس سے مغربی اقوام کو سخت تشویش تھی لہٰذا سب نے مل کر ترکی اور روس پر مسلسل دباؤ ڈالا اور آخر ۱۸۴۱ء (۱۲۵۷ھ) میں اس معاہدے کی تنسیخ کرا کے نیا معاہدہ طے کرایا جس کے مطابق استنبول کی خلیجوں سے گزرنے کے لیے بلا استثناء ہر ملک کو اجازت لینا لازم ہو گیا۔ اسے "میثاق مضائق" کہا جاتا ہے۔[2]

میثاق بلطہ لیمان:

اسی زمانے میں افلاق اور بغدان کے عوام نے ٹرانسلفانیا کے ساتھ انضمام کی تحریک چلائی اور ان دونوں ریاستوں کے حاکموں کو کرسی چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ عوام نے وہاں ایک عبوری حکومت تشکیل دے دی۔ یہ دیکھ کر خلیفہ نے وہاں فوج بھیج کر دونوں ریاستوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس پر روس بگڑ گیا اور جنگ کا خطرہ سر پر آ گیا۔ تاہم ۱۸۴۹ء (۱۲۶۵ھ) میں دونوں ملکوں نے استنبول کے قریب "بلطہ لیمان" میں یہ طے کیا کہ سات سال تک ترکی اور روس کی افواج مشترکہ طور پر ان دونوں ریاستوں کا انتظام سنبھالے رہیں گی۔[3]

جنگ کریمیا:

فرانس اب تک روس کے ہاتھوں نپولین کی شکست کی ذلت نہیں بھولا تھا اور بدلہ لینے کے لیے مناسب وقت کا منتظر تھا۔ عالمی سیاست میں اپنا پلہ بھاری دیکھ کر اس نے روس کو جنگ کی دھمکی دے ڈالی۔ روس نے اپنے بچاؤ کے لیے ترکی کے ساتھ "معاہدہ خونکار اسکلہ سی" کی تجدید کرنے کی کوشش کی مگر خلیفہ نے اسے منظور نہ کیا۔

اس پر روس اور ترکی کے تعلقات دوبارہ کشیدہ ہو گئے اور روس نے بغدان اور افلاق پر قبضے کے لیے فوج کشی کر دی۔ ترکی کے جوابی حملے سے قبل آسٹریا، پروشیا، فرانس اور برطانیہ نے متحارب فریقین کے نمائندوں کو ۱۸۵۳ء (۱۲۶۹ھ) کے اواخر میں بات چیت کے لیے بٹھایا مگر فرانس اور برطانیہ اس قضیے میں روس کو دبانا چاہتے تھے، اس کی وجہ مسلمانوں سے ہمدردی نہیں بلکہ اپنے مفادات تھے اس لیے یہ دونوں ملک ترکی کو مشورہ دے چکے تھے کہ وہ روس کے مطالبات کے سامنے نہ جھکے۔ اس لیے ترکی نے روس کے مطالبے مسترد کر دیے اور مذاکرات ناکام رہے۔

اس کے فوراً بعد ترکی نے روس کو پندرہ دن کے اندر افلاق اور بغدان سے فوجیں نکالنے اور بصورت دیگر جنگ

---

(۱) الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۴۲۱؛ تاریخ الدولة العلية العثمانية از فرید بک محامی: ص ۳۶۹ تا ۳۶۰

(۲) التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۱۴۳ (۳) التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۱۴۵

کے لیے تیار رہنے کا پیغام دے دیا۔ روس کی ہٹ دھرمی کے نتیجے میں آخر ترک فوج عمر پاشا کی قیادت میں گئی اور روسیوں کو شکست دے کر مقبوضہ علاقوں سے نکال دیا۔ اس کے بعد سردی اور برف باری نے جنگ کو ناممکن بنائے رکھا مگر موسم بدلتے ہی روسی بحریہ نے بحیرۂ اسود میں کارروائی کی اور عثمانی بحریہ کو پسپا کر دیا۔ جواب میں برطانوی اور فرانسیسی بحریہ جو ترکی کی مدد کے لیے قریب آچکی تھی، بحیرۂ اسود میں داخل ہو گئی۔

۱۵ فروری ۱۸۵۴ء (۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۰ھ) کو فرانس، برطانیہ اور ترکی نے روس کے خلاف جنگ کا مشترکہ معاہدہ کیا جس میں طے پایا کہ:

1. فرانس کے پچاس اور برطانیہ کے پچیس ہزار سپاہی ترکی کا ساتھ دیں گے۔
2. روس کو ترکی کے کسی حصے پر قبضہ نہیں کرنے دیا جائے گا۔
3. یورپی افواج استنبول اور گیلی پولی میں جمع ہوں گی اور روس کو شکست دینے کے پانچ ہفتوں بعد وہ ترکی سے واپس چلی جائیں گی۔

اس اعلان کے بعد اپریل (رجب) میں روس نے آسٹریا کو ساتھ ملا کر ان تینوں ملکوں سے جنگ شروع کر دی اور اس کی فوجوں نے دریائے ڈینوب عبور کر کے سلستریا کا محاصرہ کر لیا۔ مگر عثمانیوں کو بروقت کمک مل گئی اور روسیوں کو واپس بھاگنا پڑا۔ ترکوں نے روسیوں کے پیچھے ہٹتے ہی، افلاق اور بغدان میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر آسٹریا کی فوجوں نے آگے ان کا راستہ روک لیا۔

ترکی اور اس کے اتحادیوں نے روس میں گھس کر "سیواستوپول" کی بندرگاہ کا محاصرہ کر لیا۔ روسی فوج شہر کو نذرِ آتش کر کے پسپا ہو گئی۔ موسمِ سرما تک یہ جنگ جاری رہی اور روس کو مسلسل شکست ہوتی رہی۔[1]

سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ کا پہلا بیرونی قرضہ:

اس جنگ کے دوران سلطنتِ عثمانیہ کو سخت مالی نقصانات ہوئے اور مزید جنگی مصارف اُٹھانے کی سکت نہ رہی۔ صورتحال یہاں تک پہنچ گئی کہ ۲۸ جون ۱۸۵۵ء (۱۳ اکتوبر ۱۲۷۱ھ) کو سلطنتِ عثمانیہ نے برطانیہ سے پچاس لاکھ اشرفیاں پانچ فیصد شرحِ سود کے ساتھ قرض لیں۔ یہ پہلا قرض تھا جو سلطنتِ عثمانیہ نے اپنی تاریخ میں کسی ملک سے لیا تھا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور بیس برس بعد سلطنتِ عثمانیہ معاشی طور پر ایک کمزور اور مقروض سلطنت بن گئی۔[2]

ترکی دُولِ یورپ کا رُکن بن گیا:

اڑھائی سال کی ہولناک جنگ کے بعد آخر کار شرائطِ صلح کے لیے ویانا میں ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں یورپی ممالک نے دولتِ عثمانیہ کو باضابطہ طور پر مجلسِ دولِ یورپ کا رُکن تسلیم کر لیا اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کی متفقہ طور پر ضمانت دی۔ سلطنتِ عثمانیہ کی طرف سے بلا امتیاز رنگ و نسل تمام شہریوں کے لیے اصلاحِ احوال اور ان کی

---

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۱۷۵ تا ۱۷۸　[2] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ لیلماز اوزتونا: ۲/۵۳

فلاح و بہبود کا وعدہ کیا گیا جبکہ یورپی حکومتوں نے متفقہ طور پر یہ تسلیم کر لیا کہ انہیں انفرادی یا اجتماعی طور پر سلطنتِ عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہ ہوگا۔[1]

میثاقِ پیرس:

اقوامِ یورپ کو سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ دیکھ کر آخر روس کو بھی جھکنا پڑا۔ ۲۵ فروری ۱۸۵۶ء (۱۸ جمادی الآخرہ ۱۲۷۲ھ) کو پیرس میں سلطنتِ عثمانیہ، فرانس، برطانیہ، روس، آسٹریا اور سارڈینا کے نمائندے جمع ہوئے اور ایک ماہ کی بحث کے بعد میثاقِ پیرس عمل میں آیا جس کی اہم شقیں یہ تھیں:

1. متحارب فریقین جنگ کے دوران قبضے میں لیے گئے تمام مقامات کو خالی کر دیں گے۔
2. بحیرۂ اسود میں جہاز رانی کا حق سب کو ہوگا مگر ترکی سمیت کوئی ملک وہاں جنگی بیڑا نہیں لا سکے گا۔
3. دریائے ڈینوب میں بھی جہاز رانی کا حق سب کو ہوگا۔
4. افلاق، بغدان اور سربیا ترکی کے ماتحت ہوں گے۔ البتہ سربوں کو داخلی خود مختاری میسر رہے گی۔[2]

یہ معاہدہ ۳۰ مارچ ۱۸۵۶ء (۲۳ رجب ۱۲۷۲ھ) کو پیرس میں طے پایا۔ اس معاہدے کے کچھ عرصے بعد یورپی ممالک نے ترکی کو رضامند کر کے ترکی اور تمام یورپی ممالک کی سرپرستی کے ساتھ افلاق اور بغدان میں ایک متحدہ حکومت کی شکل دے دی۔[3]

میثاقِ پیرس کے اثرات رُوس پر:

میثاقِ پیرس سے بظاہر سب سے زیادہ نقصان روس کا ہوا، کیوں کہ اس طرح رُوس کے اُن تمام عزائم پر پانی پھر گیا جن کے لیے وہ ڈیڑھ صدی سے کوشاں تھا۔ رُوس کے چار اہم مقاصد تھے:

(1) بحیرۂ اسود میں اپنی عسکری بالادستی قائم کرنا (2) بحیرۂ روم تک رسائی حاصل کرنا (3) سلطنتِ عثمانیہ کی نصرانی رعایا کی نگہداشت کے حقوق حاصل کرنا (4) سلطنتِ عثمانیہ کو تقسیم کر دینا۔

مگر میثاقِ پیرس میں اقوامِ یورپ نے رُوس کی راہ میں کئی قانونی رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔ یوں میثاقِ پیرس رُوس کی بہت بڑی شکست تھی مگر عہد شکنی کا عادی رُوس بدلے کے لیے موقع کا منتظر رہا۔ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۸ء (۱۲۸۷ھ اور ۱۲۹۵ھ) میں اُس نے معاہدے کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے سلطنتِ عثمانیہ پر دو جنگیں مسلط کیں جن کی تفصیل آگے آئے گی۔[4]

---

(1) دولت عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۲/ ۸۸

(2) THE CONGRESS AND TREATY OF PARIS, 1856BY SEBASTIAN SOLON SIMPSONA. B. University of Illinois, 19 17

(3) التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/ ۱۷۸ تا ۱۸۰، دولت عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۲/ ۸۸، ۸۹

(4) دولت عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۲/ ۸۹، ۹۰

میثاقِ پیرس کے اثرات سلطنتِ عثمانیہ پر، بغاوتوں کا سلسلہ:

میثاقِ پیرس کا عثمانیوں کو مطلق فائدہ نہ ہوا۔ اگرچہ یورپی سیاست دانوں کا یہ اقدام سلطنتِ عثمانیہ کی بقا کے لیے تھا مگر درحقیقت انہیں عثمانیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا واحد مقصد روس کو قابو میں رکھنا تھا جس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے وہ خوفزدہ تھے۔ اس معاہدے کے ذریعے انہوں نے روس کی پیش قدمی بند کر دی تو ان کا مقصد حاصل ہو گیا۔

رہے سلطنتِ عثمانیہ کے مفادات تو ان کی کوئی پروا نہیں کی گئی۔ میثاقِ پیرس میں سلطنتِ عثمانیہ کے مفادات کا خلاصہ یہ تھا کہ اقوامِ یورپ اس کی خود مختاری اور اس کی سرحدوں کا تحفظ کریں گی اور اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گی۔ مگر افسوس کہ اقوامِ یورپ نے بعد میں انہی دونوں چیزوں کی سب سے زیادہ خلاف ورزی کی۔

میثاقِ پیرس کے فوراً بعد مولڈیویا اور ولاچیا کی ریاستوں کو باہم متحد کرنے اور انہیں سلطنتِ عثمانیہ سے آزادی دلانے کی تحریکوں کو ابھارا گیا اور میثاقِ پیرس کے صرف دو سال بعد ۱۸۵۸ء (۱۲۷۴ھ) میں یورپی اتحاد نے ان ریاستوں کو متحد کر کے وہاں اپنی طرف سے ایک رئیس الیگزینڈر کوزا کو سربراہِ مملکت مقرر کر دیا۔ سلطنتِ عثمانیہ نے کچھ اپنی کمزوری کے سبب اور کچھ قیامِ امن کی خاطر اس دھاندلی کو برداشت کرتے ہوئے اس اتحاد اور انتخاب کو تسلیم کر لیا۔

اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے کریٹ، سرویا، مونٹی نگرو، بوسنیا، ہرزیگوینیا اور بلغاریہ میں باغیانہ تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور ہر ریاست میں شورش پسندوں کو کسی نہ کسی یورپی ملک کی سرپرستی حاصل تھی۔ الغرض سلطنتِ عثمانیہ کے مقبوضات کی حفاظت کا وعدہ یورپی اتحاد نے جابجا بغاوتیں کر کے نبھایا۔ اسی طرح سلطنتِ عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا عہد اس طرح پورا کیا گیا کہ جب باب عالی نے ان بغاوتوں پر قابو پانے کے لیے افواج بھیجیں تو یورپی ممالک بیچ میں آ گئے۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء (۱۲۷۴ھ) میں فرانس اور روس نے اپنے بحری جہاز عین اس وقت مونٹی نیگرو کے ساحلوں پر بھیج دیے جب عثمانی افواج ایک بغاوت کو روکنے وہاں داخل ہو رہی تھیں۔ [1]

سربیا کی بغاوت اور دُولِ یورپ کی دورُخی:

اسی زمانے میں سربیا نے بھی بغاوت کر دی اور وہاں مکمل آزادی کے نام پر مزاحمت کی تحریک شروع ہو گئی جسے یورپی ممالک کی حمایت حاصل تھی، اسی لیے جب ترکی نے سربوں کی تحریکِ مزاحمت کو کچلنے کی کوشش کی تو یورپی طاقتوں نے دباؤ ڈال کر ترکی کو ایسی کسی بھی کارروائی سے روک دیا۔ [2]

یوں یورپ نے سلطنتِ عثمانیہ کے تحفظ کا راگ الاپتے ہوئے اس کے متعدد یورپی اضلاع اس سے الگ کرا دیے۔ اقوامِ یورپ نے سلطنتِ عثمانیہ کو مجلس دول یورپ کا رکن تو بنا لیا تھا مگر یہ رکنیت اس کے کسی کام نہ آئی۔ اُلٹا اس بہانے سلطنتِ عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں یورپی ممالک کی مداخلت دن بدن بڑھتی گئی اور سلطنتِ عثمانیہ

---

① دولت عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۲/ ۹۰، ۹۱

② التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/ ۶۸، ۶۹، ۱۷۰

کے گرد یورپی دنیا کا گھیرا تنگ سے تنگ ہوتا گیا۔[1] بقول خواجہ الطاف حسین حالی۔

تجھ پہ اے دار الخلافت انقلاب آنے لگے ..... غیب سے تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے

طالع مشفق کے پیغامِ عتاب آنے لگے ..... تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے

لبنان میں دروز اور مارونیوں کے مابین خانہ جنگی اور یورپی طاقتوں کی مداخلت:

برطانیہ اور فرانس نے عالم اسلام کے حصے بخرے کرنے کے لیے لبنان میں خانہ جنگی کو ہوا دینا شروع کر دی تھی۔ وہاں فرقہ دروز اور فرقہ مارونیہ بہت طاقتور ہو چکے تھے، برطانیہ دروز کو مدد دے رہا تھا اور فرانس مارونیہ کا پشت پناہ تھا۔ دروز نے ۱۸۴۱ء (۱۲۵۷ھ) میں مارونیہ کو پسپا کر کے پہاڑی علاقوں کا وسیع رقبہ قبضے میں لے لیا۔ چار سال تک اس کی غارت گری عروج پر رہی۔ آخر خلیفہ نے وہاں کے دروزی حاکم بشیر شہابی کو معزول کر کے، ایک عثمانی حاکم مقرر کر دیا مگر یورپی اقوام جو کہ اب ترکی کے ہر فیصلے پر اپنی مہر لگاتی تھیں، اس پر رضامند نہ ہوئیں۔ مجبوراً وہاں ایک دروزی اور ایک مارونی کو نائب کے طور پر رکھا گیا، اس کے باوجود ان فرقوں کے جھگڑے باقی رہے اور باہم چھاپہ مار حملوں کا سلسلہ ۱۸۶۰ء (۱۲۷۷ھ) تک جاری رہا۔

۱۸۵۹ء (۱۲۷۶ھ) میں جب مارونیوں نے دروزیوں کو بری طرح روندا اور دروز نے جواباً بڑی کارروائی شروع کی تو لبنان، صیدا، طرابلس اور لاذقیہ سے دمشق تک خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ آخر ترکی نے فواد پاشا کی قیادت میں وہاں فوج بھیج کر اس خونریزی پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اسی دوران فرانس نے خانہ جنگی روکنے کے بہانے اگست ۱۸۶۰ء (محرم ۱۲۷۷ھ) میں اپنی فوج بیروت میں اتار دی جس کا مقصد لبنان اور شام کے نصرانیوں کو تقویت دینا تھا۔ خانہ جنگی کے خاتمے پر فرانس نے اپنی خدمات کا نقد عوض یہ حاصل کیا کہ لبنان پر تین سال کے لیے ایک مقامی نصرانی کی حکومت کی منظوری لے لی۔ دس ماہ لبنان میں ٹھہر کر مئی ۱۸۶۱ء (ذوالقعدہ ۱۲۷۷ھ) میں فرانسیسی فوج واپس چلی گئی۔[2]

سلطان عبدالمجید اوّل کی وفات:

فرانسیسی افواج کی واپسی کے بیس دن بعد ۲۷ مئی ۱۸۶۱ء (۱۷ ذوالحجہ ۱۲۷۷ھ) کو سلطان عبدالمجید اوّل کی وفات ہو گئی۔ اس کی عمر صرف ۳۸ سال تھی۔[3]

ٹیلی گراف اور ریلوے لائن:

سلطان عبدالمجید اوّل کے دور میں ٹیلی فون لائن اور ریلوے لائن بھی بچھائی گئیں جبکہ مغربی دنیا میں بھی ان ایجادات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ ٹیلی گراف (تار) کا نظام اس وقت تک دُنیا کے صرف چار ممالک: امریکا،

---

① دولت عثمانیہ از ڈاکٹر عزیز: ۲/ ۹۰، ۹۱

② التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/ ۱۴۳، ۱۷۵، ۱۷۹، ۱۸۰

③ التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۸/ ۱۸۰

برطانیہ، فرانس اور روس میں استعمال ہوتا تھا۔ سلطان عبدالمجید اول نے ۱۸۵۵ء (۱۲۷۱ھ) میں ٹیلی گراف کی تاریں اور ریلوے لائنیں بچھانے کا کام شروع کرایا جسے اس کے جانشینوں: سلطان عبدالعزیز اور پھر سلطان عبدالحمید ثانی نے مکمل کرایا۔ سلطنتِ عثمانیہ دُنیا کی نویں مملکت تھی جہاں یہ نئی ایجاد متعارف ہوئی۔ اس وقت تک چین اور جاپان میں ریلوے لائن کا نام ونشان بھی نہ تھا۔[1]

دورِ تنظیمات، مصطفیٰ رشید پاشا اور جدید اصلاحات

سلطان عبدالمجید کی تخت نشینی سے سلطان عبدالحمید ثانی کے برسرِ اقتدار آنے تک (۱۸۳۹ء تا ۱۸۷۶ء) کا زمانہ ''دورِ تنظیمات'' (دور التنظیمات الخیریۃ العثمانیۃ) کہلاتا ہے جس میں مملکت کے نظام میں مسلسل اصلاحات اور تبدیلیاں ہوئیں، نظام کو جدید سے جدید تر بنانے کی کوششیں جاری رہیں اور اس حوالے سے مختلف تنظیمات یعنی سرکاری ادارے اور محکمے قائم ہوئے۔

ان کوششوں کا بظاہر ہدف اس قدر تھا کہ تین براعظموں میں پھیلی ہوئی سلطنتِ عثمانیہ میں رہنے والے مختلف نسلی گروہوں میں ایک مشترکہ قومیت کا جذبہ ابھارا جائے۔ اس قومیت کو ''عثمانیت'' کا نام دیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ غیر ترک اور غیر مسلم باشندوں کو پہلے کی بہ نسبت زیادہ آزادیاں فراہم کرتے ہوئے عثمانیت کے پرچم تلے متحد کیا جائے اور اس طرح سلطنت کے مختلف صوبوں خصوصاً یورپی مقبوضات میں ابھرنے والی نسلی اور لسانی قومیت کی تحریکوں کا زور توڑا جائے۔ ان اصلاحات میں یورپ کی طرز پر عوام کی آواز ایوانِ بالا تک پہنچانے کے انتظامات بھی زیرِ غور رہے جو آخر کار ۱۸۷۶ء میں پارلیمانی جمہوریت کے قیام پر منتج ہوئے۔

اس مہم میں سلطنت کے مختلف جدت پسند اُمراء اور وزراء شریک تھے جن میں سب سے نمایاں نام مصطفیٰ رشید پاشا کا ہے جو لندن اور پیرس میں سفیر اور سلطان محمود ثانی کے دور میں وزیرِ خارجہ رہا تھا۔ وہ جدت پسندی کا پرجوش حامی تھا۔ اس نے سلطان عبدالمجید اول کی تخت نشینی کے بعد اس کی تصدیق کے ساتھ ایک نیا دستور (جسے خطِ ہمایونی کا نام دیا گیا تھا) پیش کیا جس کا خلاصہ یہ تھا:

1. رعایا کی زندگی اور عزت کی ہر طرح حفاظت کرنا۔
2. انہیں مذہبی معتقدات کے متعلق منافرت سے بچانا
3. ملکی آمدن کو درست طریقے سے وصول کر کے صحیح مصارف میں خرچ کرنا
4. فوج کے اختیارات اور فرائض میں عدل وانصاف کو مدنظر رکھنا
5. مسلم اور غیر مسلم رعایا کے تمام حقوق کا بلا تفریق خیال رکھنا[2]

---

(1) تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۲/۵۵ (2) تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از علی حسون: ص ۱۸۵، ۱۸۶

نئے نظام کے تحت فوج کو چھ "کورز" میں تقسیم کردیا گیا: دو کورز بلقان میں، دو کورز اناطولیہ میں، ایک شام میں اور ایک یمن میں۔ عسکری، طبی اور سائنسی مہارتیں سکھانے کے لیے فرانس اور دیگر یورپی ممالک سے ماہرین کی آمد ہونے لگی۔ نیز پہلی بار سلطنتِ عثمانیہ کے طلبہ کے یورپ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ لازمی ابتدائی تعلیم کے مفت مراکز بھی کھول دیے گئے۔ [1]

ایک باپ کی اولاد ہیں:

عبدالمجید اول کے دور میں سلطنت کے ایک اعلیٰ عہدے دار رضا پاشا نے جزیرہ گلخانہ میں مسلم، یونانی، ارمن اور یہودیوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے واضح طور پر کہا: "آپ سب ایک حکمران کی رعایا اور ایک باپ کی اولاد ہیں۔ سلطان آپ کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھتے۔" [2]

مگر یاد رہے کہ دستور میں مسلم اور غیر مسلم میں تفریق نہ کرنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ غیر مسلموں کو ان خاص چیزوں کا بھی اختیار ہوگا جن میں اسلام شرط ہے مثلاً امامت، عہدۂ قضا اور امارتِ حج وغیرہ۔ بلکہ مطلب یہی تھا کہ ملکیت، رہائش، صنعت و حرفت، تحصیل علوم و فنون، جان و مال اور عزت و ناموس کے تحفظ، نیز اپنے عقیدے پر قائم رہنے، اپنے مذہب کے مطابق عبادات بجالانے اور اپنی رسوم کے مطابق شادی بیاہ کرنے کا حق سب کو ہوگا۔ سب قانون کی نگاہ میں برابر ہوں گے، ہر ایک کو انصاف ملے گا، جرم پر مسلم یا کافر کی گرفت برابر ہوگی۔

انسانی حقوق اور شریعت میں کوئی تضاد نہیں:

یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ انسانی حقوق اور اسلامی شریعت میں کوئی تضاد نہیں اور اسی لیے سلطنتِ عثمانیہ اپنے دورِ عروج میں جب اسلامی شریعت پر عمل پیرا تھی، تو وہاں انسانی حقوق انتہائی محفوظ تھے اور مسلم و غیر مسلم بھی بالکل مطمئن تھے۔ دورِ زوال میں جب شریعت کی پابندی میں تساہل ہوا تو اس وقت مسلم اور غیر مسلم شہری مختلف مسائل کا شکار ہونے لگے۔ اس کا علاج بھی شریعت کو دوبارہ مضبوطی سے تھامنا اور شریعت کی روشنی میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ مرتب اور منضبط آئین تیار کرانا اور اس پر عمل درآمد کرانا تھا۔ ۱۸۳۹ء میں سلطان عبدالمجید اول کی تخت نشینی کے وقت پیش کردہ دستور کے ابتدائیے میں بھی یہی کہا گیا تھا:

> "رعایا سے مخفی نہیں کہ ہماری عظیم سلطنت اپنے آغاز سے قرآن مجید اور شرعی قوانین کی پابند رہی ہے، اسی لیے ہماری سلطنت کی قوت و ترقی اور رعایا کی خوش حالی کی کوئی حد نہیں تھی، مگر ڈیڑھ صدی سے معاملہ برعکس جا رہا ہے کیوں کہ نہ شریعتِ مطہرہ کی پابندی ہے اور نہ ہی مفید قوانین کی پیروی ہے، یہی پے در پے حوادث اور طرح طرح کے مصائب کا سبب ہے۔ پس ہماری قوت ضعف میں بدل گئی اور ہماری خوشحالی کی جگہ مفلسی نے لے لی۔" [3]

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از علی حسون: ص ۱۸۶، کور سے مراد فوج کا ایک بڑا حصہ ہے جس کے قائد کو "کور کمانڈر" کہا جاتا ہے۔
② الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۷۵ ③ الدولۃ العثمانیۃ، از الصلابی: ص ۳۷۴

مصطفیٰ رشید پاشا کی مخالفت، معزولی اور بحالی:

بہر کیف یہ نیا نظام راسخ العقیدہ مسلمانوں اور خصوصاً علماء کے لیے قابل قبول نہ تھا، اس لیے جدید نظام کے محرک مصطفیٰ رشید پاشا کے متعلق نفرت عام ہوگئی اور اس دستور کو شریعت کا انکار اور دین میں مداخلت تصور کیا گیا۔ مشہور ہوگیا کہ مصطفیٰ رشید پاشا فری میسن کا رکن ہے اور یہ دستور فری میسن کی ''آزادی، اخوت اور مساوات'' پر مبنی مہم کا عکس ہے۔ رشید پاشا کے خلاف دباؤ اتنا شدید تھا کہ بغاوت کے خدشے کے باعث اسے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ تاہم چار سال بعد لوگ ٹھنڈے ہوگئے تو اُسے دوبارہ ایوان کا رکن بنا دیا گیا اور ۱۸۴۶ء میں اسے صدر اعظم کا عہدہ مل گیا۔ وہ ۱۸۵۶ء تک اس منصب پر رہا۔[②]

۱۸۵۶ء، قضا کا نظام معطل:

اس دوران ارباب حل وعقد کی جدت پسندی بڑھ چکی تھی اور انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ ہر قدیم شے ان کے زوال کا باعث ہے۔ چنانچہ اسلام کا نظام قضا اور سلطنت میں علماء کا اثر ورسوخ بھی انہیں ناگوار گزرنے لگا۔ بیرونی طاقتوں کا دباؤ قبول کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور آخر کار ۱۸۵۶ء (۱۲۷۲ھ) میں اس دستور میں کچھ مزید شقوں کا اضافہ کر دیا گیا جن میں ایسی شقیں بھی تھیں جو سلطنتِ عثمانیہ کے اسلامی تشخص کے مطابق نہ تھیں اور اغیار کی فکری و نظریاتی یلغار کے لیے سازگار ماحول مہیا کرتی تھیں۔ یہ اضافی شقیں درج ذیل تھیں:

❶ فوجی بھرتی میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہوگی۔
❷ دین ومذہب کا امتیاز کیے بغیر تمام شہریوں سے یکساں معاملہ برتا جائے گا۔
❸ غیر مسلم ممالک کے عمائد کو حاصل امتیازات اور مراعات کی حفاظت کی جائے گی۔
❹ نظام جدید کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو ختم کر دیا جائے گا تاکہ تمام شہری اپنے حقوق سے مستفید ہوں۔
❺ نصرانی شہریوں کو حق ہے کہ وہ اپنے علاقائی مسائل حل کرنے کے لیے اپنے لوگوں کی مجلسِ شوریٰ بنائیں جس کے ارکان بھی وہ خود منتخب کر سکتے ہیں۔
❻ نصرانی شہریوں کے لیے درسگاہیں کھولی جائیں گی تاکہ وہ بھی سرکاری ملازمتیں حاصل کر سکیں۔
❼ رشوت اور فساد کی کثرت کے باعث، قضاء کا نظام معطل کیا جارہا ہے۔[①]

یوں اب نئے نظام میں مغربی مطالبات کی چھاپ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ خاص کر نظام قضا کو معطل کرنا یقیناً مغربی دُنیا کی اندھی تقلید یا ان کا دباؤ قبول کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نیز مسلم وغیر مسلم بھی کو فوج میں شمولیت اور ترقی کے یکساں مواقع مہیا کرنا بھی آگے چل کر سلطنت کے لیے مسائل اور مصائب کا باعث بنا۔

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض وأسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۷۷، ۳۷۸

② الدولة العثمانية، عوامل النهوض وأسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۷۶، ۳۷۷

ترکی میں جدید وقدیم کی کش مکش:

اس دوران ترکی میں قدیم وجدید کی کش مکش میں قدامت پسند اور جدت پسند دو انتہاؤں کی طرف جانے لگے۔ بدگمانی، الزام تراشی، جذباتیت اور انتہاء پسندی کار جحان بڑھتا گیا اور فریقین میں سے ہر ایک دوسرے کی ضد میں راہِ اعتدال سے دور ہٹتا چلا گیا۔ رشید پاشا جیسے جدت پسند لوگ، روز بروز علماء سے دور اور مغربیت کی طرف مائل ہوتے چلے گئے اور انہوں نے تصور کر لیا کہ اسلام میں دورِ حاضر کے مسائل کا کوئی حل نہیں ہے اور یہ دین ایک جدید مملکت کو چلانے کے لیے ناکافی ہے۔ اس کے ردِ عمل میں قدامت پسند طبقے نے سدِ باب کے طور پر ان چیزوں سے منع کرنا بھی ضروری سمجھا جن میں مغربیت کی ٹو بو محسوس ہوتی ہو، چاہے شریعت میں اس کی گنجائش ہو جیسا کہ مغربی زبانیں اور وہاں مروج سائنس وٹیکنالوجی سیکھنا۔

درحقیقت، انیسویں صدی کی ابتداء میں ترکی کو امام غزالی، امام رازی اور ابن تیمیہ رحمہم اللہ جیسی کسی ایسی عبقری شخصیت کی ضرورت تھی جو اسلامی روح، مقاصدِ شرعیہ اور فقہی قوانین پر گہری نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ زمانے کے تقاضوں، سیاستِ حاضرہ کے نشیب وفراز اور معاشرے کی ضروریات سے بھی بخوبی واقف ہوتا۔ وہ مغربی علوم وفنون کے مبادی وعواقب کو جانچتے، یورپ کی فکری ونظریاتی جنگ کا جواب دیتے، دنیا کو درپیش انفرادی واجتماعی مسائل کا حل نکالنے اور اسلامی حدود کے مطابق قابلِ عمل راہ دکھانے کا تجدیدی کارنامہ انجام دے سکتا۔ تُرکانِ عثمان کے اس دورِ زوال میں یا تو ایسی علمی شخصیات نایاب تھیں یا حکومت نے ایسی شخصیات سے استفادہ کرنے کی کوشش نہیں، یا گردشِ حالات اور ناقدری نے ایسے لوگوں کے علمی وفکری کام کو سامنے نہیں آنے دیا۔ بہرصورت نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان عبدالمجید کے آخری ایام میں قدیم وجدید اور مشرق ومغرب کی خلیج اتنی وسیع ہو چکی تھی کہ اسے پاٹنا مشکل تھا۔ بڑے بڑے عمائدِ سلطنت اسلامی سیاست کی صحیح تشریح سامنے نہ ہونے کے سبب تیزی سے مغربی تہذیب وتمدن اور سیکولرازم کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ اس دور کے مشہور عالم علامہ محمود آلوسی عراقی فرماتے تھے:

> ''آج کسی شہر پر اللہ کی اتنی رحمت بھی بہت ہے کہ اس کا حاکم اس خرابی (مغربیت زدگی) سے بچا ہوا ہو۔ کیوں کہ اس بُرے زمانے میں بہت کم لوگ اس سے محفوظ ہیں۔''[1]

نئے قوانین سے اسلام دشمنوں نے کس طرح فائدہ اُٹھایا؟

چوں کہ نئے نظام کی بدولت فوج میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق ختم کر دی گئی تھی، نصرانی شہریوں کو الگ درسگاہیں قائم کرنے کی اجازت سمیت غیر معمولی مراعات دے دی گئی تھیں۔[2] لہٰذا طاغوتی طاقتوں کو ترکی میں اپنے اثرات

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص۳۷۸
② الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص۳۷۷

بڑھانے کا موقع مل گیا۔ مشنری اداروں نے فوری طور پر ان مراعات سے فائدہ اٹھایا اور بڑی تیزی سے ترکی میں اپنے اسکول اور تعلیمی ادارے کھولنے شروع کر دیے جو آگے چل کر نصرانیت کی تبلیغ اور مغربی تہذیب کی تشہیر کا ذریعہ بنے۔ (1)

اس دور میں سلطنتِ عثمانیہ کے دارالحکومت استنبول میں مغربی تہذیب وثقافت کے اثرات اس قدر بڑھتے جارہے تھے کہ فرانسیسی مؤرخ لیبان جو مشرقی تہذیب وتمدن کا دلدادہ تھا، افسوس کے ساتھ لکھتا ہے:

"آج کل ترکوں کے بڑے شہروں میں خاص کر استنبول میں اسلامی حرم کی حالت اچھی نہیں ہے۔ استنبول کے حرموں کی معاشرت تو اس وقت تقریباً اسی قدر آزادانہ ہے جیسی یورپ کے بڑے دارالحکومتوں کی۔ اہلِ یورپ کے اثر، عیش وعشرت کی کثرت اور گزشتہ جنگ کے بعد کے افلاس نے ترکوں کے اخلاق کو بہت بگاڑ دیا ہے۔" (2)

جناب اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

خیر ان کو کچھ نہ آئے پھانس لینے کے سوا
مجھ کو اب کرنا ہی کیا ہے سانس لینے کے سوا
تھی شب تاریک، چور آئے، جو کچھ تھا لے گئے
کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

سلطان عبدالمجید اوّل کے چند کارہائے خیر:

اگرچہ سلطان ترقی پسند تھا اور اس کے قریبی وزراء وامراء مغربی نظام سے متاثر تھے جن کے ہاتھوں جدت پسندی کا میٹھا زہر سلطنت کی جڑوں میں اُترا مگر ہمارا حسنِ ظن ہے کہ سلطان نے یہ سب کچھ نیک نیتی سے کیا تھا۔ وہ ذاتی طور پر ایک صحیح العقیدہ مسلمان اور نرم ومہربان انسان تھا جو خیرات وحسنات کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ (3)

اس کے نیک کاموں میں سے یادر ہنے والا کارنامہ مسجدِ نبوی کی جدید تعمیر ہے۔ یہ کام ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں شروع ہوا اور چار سال میں مکمل ہوا۔ آج بھی مسجدِ نبوی کا قدیم مرکزی حصہ سلطان عبدالمجید اوّل کے تعمیراتی ذوق اور حضور سرورِ کونین ﷺ سے اس کی سچی محبت کی گواہی دیتا ہے۔

اس کے علاوہ سلطان نے حرمین شریفین میں اور کئی تعمیرات کرائیں۔ نیز اس نے ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۹ء) میں بیت اللہ کے میزاب کی تجدید کرائی۔ اس کے علاوہ استنبول میں جامع مجیدی کے نام سے ایک خوبصورت مسجد تعمیر کرائی۔ (4)

◆◆◆

---

(1) الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۷۹

(2) تمدنِ عرب: ص ۳۸۰، ۳۸۱، ط حیدر آباد دکن

(3) الدولة العثمانية المجهولة: ص ۳۹۷ (4) تاريخ الدولة العثمانية، از علی حسون: ص ۹۸، ط المكتب الاسلامی بیروت

ملحوظہ: یاد رہے کہ "سوشل میڈیائی دانشوروں" نے سلطان کے متعلق شرمناک عیاشیوں کے متعدد قصے اختراع کیے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔

سلطان عبدالعزیز بن محمود ثانی

۱۲۷۷ھ تا ۱۲۹۳ھ
(۱۸۶۱ء تا ۱۸۷۶ء)

عبدالعزیز، محمود ثانی کا بیٹا اور عبدالمجید اول کا بھائی تھا۔ وہ ۳۱ سال کی عمر میں مسند نشین ہوا۔ اس کے ایک ابتدائی فرمان سے اس کی اسلام پسندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جس میں کہا گیا تھا:

''شریعت مطہرہ جو کہ خالص عدل پر مبنی ہے، سلطنتِ عالیہ کی مضبوطی کی بنیاد اور اس کی شان و شوکت کی اساس ہے۔ اس کے احکام جو ہم سب کے لیے مفید ہیں، راہ سلامتی کی دلیل ہیں، پس ایسے میں شرعی احکام کو وقتِ نگاہ سے سمجھنا ہم سب کے لیے یقیناً مطلوب ہے۔ چونکہ ہر حکومت کی بقا اور اس کی شوکت کے لیے ضروری ہے کہ رعایا طے شدہ قوانین کی پابندی کرے، اس لیے کوئی چھوٹا یا بڑا قانون کے دائرے سے باہر نہ ہو۔''[1]

اصلاحات اور جدید تعلیم کی کوشش:

اس کے ساتھ ہی سلطان نظام کو جدید و مستحکم بنانے کا بھی حامی تھا مگر وہ ایک زوال پذیر سلطنت کا حکمران تھا جس کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر یورپی ممالک اپنے اہداف کو تیزی سے آگے بڑھا رہے تھے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں سلطان محمود اول نے جب نظام کی تجدید کا ارادہ کیا تھا تو اس کے سامنے اصل ہدف ملکی دفاع کی مضبوطی اور عہد رفتہ کی سی عظمت بحال کرنا تھا۔ اس وقت سلطنتِ عثمانیہ اگرچہ کمزور ہو رہی تھی مگر آسٹریا، فرانس، برطانیہ یا روس میں سے وہ کسی بھی یورپی طاقت کا مقابلہ کر سکتی تھی۔

پھر اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب سلیم ثالث نے تجدید کی کوشش کی تھی تو اس وقت سلطنت متعدد شکستوں اور بہت سے یورپی علاقے کھو دینے کی وجہ سے یقیناً ابتری کا شکار تھی اور حالات کا دباؤ بلاشبہ بڑھ چکا تھا مگر اس وقت بھی ہدف یہی تھا کہ کسی طرح اپنی شکستگی کو استحکام و ترقی میں بدل دیا جائے۔

مگر انیسویں صدی عیسوی میں سلطان محمود ثانی اور سلطان عبدالمجید اول کے ہاتھوں کی جانے والی تجدید میں سلطنت کے استحکام کے علاوہ کسی نہ کسی طرح یورپی ممالک کو مطمئن رکھنا اور کسی بہانے سے اپنی سلطنت کو بچانا بھی

---

[1] تاریخ الدولة العلية العثمانية از فرید بک محامی: ص ۵۳۱

مقصود تھا کیوں کہ اس وقت یورپی ممالک جو درحقیقت ترکی کے خاتمے پر متفق ہو چکے تھے، کبھی حریف اور کبھی حلیف بن کر جنگوں یا معاہدوں کے ذریعے ترکی پر مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے۔ وہ امور سلطنت میں دخیل ہو کر کبھی ناصحانہ اور کبھی تحکمانہ انداز میں مطالبہ کر رہے تھے کہ ترکی اپنے نظام کہن کو بدل ڈالے۔

بظاہر ان کا مقصد ترکی کو ترقی یافتہ مملکت بنانا تھا مگر وہ جس قسم کی اصلاحات کے درپے تھے، ان کا لازمی اثر یہی نکل سکتا تھا کہ مسلمانانِ ملت اپنے دین سے دور ہو کر نسلی و علاقائی اکائیوں میں بٹ جائیں اور ترکی ایک عالمگیر خلافت کی جگہ محض ترک نسل کا آبائی وطن بن کر رہ جائے۔

انیسویں صدی عیسوی میں ترکی اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ تن تنہا کسی ایک ملک سے بھی لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اسے ایک ملک سے بچاؤ کے لیے دوسرے کا سہارا لازمی طور پر درکار تھا۔ ایسے میں ہر یورپی ملک کی کوشش تھی کہ وہ ترکی سے دوستانہ معاہدے کر کے اسے انتظامی، قانونی، تعلیمی اور دفاعی امور کی تجدید میں اس طرح مدد دے کہ ترکی اسی کے رنگ میں رنگا جائے اور اس کی تزویری اغراض کا پابند ہو جائے۔ ہر یورپی ملک کی کوشش تھی کہ جب تک ممکن ہو، وہ ترکی کی جغرافیائی حیثیت کو بلاشرکتِ غیرے اپنے تجارتی و دفاعی مفادات کے لیے استعمال کرتا رہے۔

سلطان عبدالعزیز اپنی مملکت کو بچانے اور یورپ کو اطمینان دلانے کے لیے تجدید کا کام انجام دیتا رہا۔ اس نے تمام اعلیٰ عہدے داروں کو پابند کیا کہ وہ اصلاحات کا نفاذ یقینی بنائیں۔ اس نے ۱۸۶۴ء (۱۲۸۱ھ) میں ''قانون ولایات'' کی منظوری دی۔ محکمہ عدلیہ کو جدید شکل دی اور قاضیوں کے قدیم نظام کی جگہ ''دیوان الاحکام العدلیہ'' قائم کیا جو عدالتِ عظمیٰ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) میں اس نے فرانسیسی طرز کی پارلیمنٹ کی داغ بیل ڈالی جسے ''شوارئ دولت'' یعنی مجلس شوریٰ کہا جاتا تھا۔[1]

تعلیمی نظام میں تبدیلیاں کرتے ہوئے اس نے ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) میں استنبول کے محلے ''غلطہ سرائے'' میں ایک درسگاہ کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا تھا جو آگے چل کر سرکاری اداروں کو جدید طرز پر چلا سکیں۔ اس میں اکثر مضامین فرانسیسی زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔ زیادہ تر طلبہ مسلمان تھے مگر یونانی اور ارمن نصرانی لڑکوں کے لیے بھی گنجائش رکھی گئی تھی۔ ایک ہی سال میں اس درسگاہ کے طلبہ کی تعداد چھ سو تک پہنچ گئی۔[2]

کریٹ کی ناکام بغاوت:

عبدالعزیز کے دور میں جزیرہ کریٹ میں بغاوت ہوئی جو ۱۸۶۶ء (۱۲۸۳ھ) میں فرو کر دی گئی۔[3]

یورپ کا دورہ:

عبدالعزیز پہلا عثمانی حکمران تھا جس نے یورپ کا دورہ کیا جس کی دعوت شاہ فرانس نپولین سوئم نے دی تھی۔

---

① الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث، از اسماعيل ياغي: ص ۱۵۹

② الدولة العثمانية از اسماعيل ياغي: ص ۱۵۹ ③ التاريخ الاسلامي للدكتور محمود شاكر: ۱۸۰/۸

جنوری ۱۸۶۷ء (صفر ۱۲۸۳ھ) میں وہ مصر سے ہوتے ہوئے پیرس پہنچا اور نپولین سوئم سے ملا۔ اس کے بعد لندن میں ملکہ وکٹوریہ سے بھی ملاقات کی۔ اس وقت یورپی ممالک ترکی کے خلاف متحد ہونے کے باوجود باہمی اغراض کے لحاظ سے تنازعات کا شکار بھی تھے، اس لیے فرانس اور برطانیہ ترکی سے بظاہر رواداری برت رہے تھے۔ [1]

اس سفر میں ہر معاملے پر ترکی کے موقف کا باوقار انداز میں دفاع کیا گیا۔ یورپی حکام نے صدرِ اعظم فواد پاشا سے پوچھا: ''آپ جزیرۂ کریٹ کس قیمت پر فروخت کرنا پسند کریں گے؟''

صدرِ اعظم نے جواب دیا: ''اسی قیمت پر جس پر خریدا ہے۔'' (یعنی ہم نے نسل در نسل جہاد کر کے اسے فتح کیا ہے۔ آپ کو اتنی ہی مدت جنگ لڑنا پڑے گی۔)

صدرِ اعظم سے یہ بھی پوچھا گیا: ''اس وقت دنیا کی سب سے طاقتور حکومت کون سی ہے؟''

جواب دیا: ''دولتِ عثمانیہ! کیوں کہ آپ اسے باہر سے تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہم اسے اندر سے کمزور کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود سب مل کر بھی اسے ختم نہیں کر پا رہے۔'' [2]

حقیقت یہ ہے کہ مفادات کے جھگڑوں سے قطع نظر یورپی دنیا اس نکتے پر متفق تھی کہ جوں ہی موقع ملے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ کیوں کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ یورپی قوانین اور مغربی تہذیب وثقافت کو ترکی میں جوں کا توں نافذ کرنا اس لیے ناممکن ہے کہ ترکی کے آئین ودستور کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ نبویہ ہے۔

اسی لیے برطانوی وزیرِ خارجہ لارڈ کلارنڈون نے ۱۸۶۵ء (۱۲۸۲ھ) میں واضح طور پر کہا:

''عثمانیوں کی اصلاح کا ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ انہیں روئے زمین سے بالکل مٹا دیا جائے۔'' [3]

یہود الدونمۃ، مسلم نما یہودی

انیسویں صدی عیسوی میں ترکی میں آباد یہودیوں کے ایک طبقے ''یہود الدونمۃ'' نے خلافتِ عثمانیہ پر ضرب کاری لگانے میں بدترین کردار ادا کیا۔ ''دونمۃ'' کا مطلب ''ارتداد'' ہے۔ یہود الدونمۃ سے مراد ایسے یہودی ہیں جو ایشیائے کوچک کے مغرب میں آباد تھے اور خود کو مسلمان ظاہر کرتے تھے۔

سولہویں صدی عیسوی میں اسپین کے حکام اور پادریوں کے مظالم سے تنگ آ کر لاکھوں مسلمانوں کے ساتھ ہزاروں یہودی بھی ترکِ وطن پر مجبور ہوئے تھے۔ اسی دور میں زارانِ روس کے جبر وستم نے بھی بہت سے یہودیوں کو

---

① الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النھوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۹۱۔
نوٹ: اس دور میں دخانی جہازوں کی وجہ سے سمندری سفر کی رفتار تیز ہو چکی تھی، اس لیے اس سفر میں صرف ۴۹ دن خرچ ہوئے جبکہ گزشتہ صدی میں ایسے سفر میں کم از کم چھ مہینے لگتے تھے۔

② الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النھوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۰۱

③ الدولۃ العثمانیۃ فی التاریخ الاسلامی الحدیث، از اسماعیل یاغی: ص ۱۵۹

نقل مکانی پر مجبور کر دیا تھا۔ یہودیوں کی شرانگیزیوں سے پُر سیاہ تاریخ کو دیکھتے ہوئے دنیا کا کوئی ملک انہیں پناہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ عوام وخواص، ادارے، تنظیمیں، ممالک اور ریاستیں بھی ان سے نفرت کرتے تھے۔

ایسے میں انہیں سلطنتِ عثمانیہ کے نامور حکمران سلیمان عالی شان القانونی کی چہیتی بیگم خرم (روکسلین) کی شکل میں اپنا نجات دہندہ مل گیا جو کہ خود بھی یہودی النسل تھی۔ جب یہودیوں نے اسے واسطہ بنا کر سلیمان عالی شان سے ترکی کی شہریت کی درخواست کی تو اسے منظور کر لیا گیا۔ یہ یہودی ازمیر، اُدرنہ، بورصہ، اور شمالی وغربی استنبول میں آبسے۔ انہیں یہاں ایک پناہ گاہ ہی نہیں بلکہ خوشحالی اور آزادی بھی نصیب ہوئی۔ [1]

سباتائی زیفی کی تحریک:

ترکی میں یہودیوں کی آبادکاری کے چند عشروں بعد فرقہ ''دونمہ'' وجود میں آیا جس کا بانی ''سباتائی زیفی'' تھا۔ یہ شخص ۱۶۲۶ء (۱۰۳۵ھ) میں اناطولیہ کے شہر ازمیر میں پیدا ہوا اور یہودیوں کا بڑا عالم شمار ہوا۔ اُس دور کے یہود ونصاریٰ میں یہ خبر عام تھی کہ مسیح کا ظہور اسی صدی میں ہونے کو ہے۔ اس فضا سے فائدہ اٹھا کر سباتائی نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا اور ہزاروں لوگ اس کے پیروکار بن گئے۔

سباتائی کی شہرت پولینڈ، جرمنی اور ہالینڈ میں آباد یہودیوں تک بھی پہنچ گئی اور وہاں بھی اس کے عقیدت مند پیدا ہو گئے۔ آخر اس کے مریدین 'ازمیر' میں جمع ہوئے اور ''شہنشاہ یہود'' کے طور پر اس کی تاج پوشی کی۔ سباتائی نے اعلان کیا کہ میں سلیمان بن داؤد کی اولاد ہوں اور عن قریب فلسطین پوری دنیا کا سیاسی مرکز بنے گا۔ اس نے پوری دنیا کو ۳۸ حصوں میں تقسیم کر کے اپنے مریدوں میں سے ہر ملک کے لیے ایک یہودی بادشاہ مقرر کر دیا۔

یہ اطلاعات اس وقت کے عثمانی خلیفہ سلطان محمد رابع تک پہنچیں تو اس نے سباتائی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ آخر میں اسے ایڈریانوپل بلایا گیا جہاں سلطان پردے میں بیٹھا اور علماء کو حکم دیا کہ اس بدبخت پر اتمام حجت کر دیں۔ علماء نے اس کو کہا: ''اگر تو مسیح ہے تو اپنے دعوائے نبوت کی دلیل میں معجزہ دکھا۔ ہم ماہر تیراندازوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ تجھ پر تیروں کی بارش کریں۔ اگر تیروں نے تجھ پر کوئی اثر نہ کیا تو تیرا دعویٰ قابل قبول ہوگا۔''

سباتائی نے موت سامنے دیکھ کر مکر سے کام لیتے ہوئے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور اس کا نام عزیز آفندی رکھ دیا گیا۔ اپنی جان بچانے کے بعد اس نے علماء سے درخواست کی کہ وہ یہودیوں میں اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے۔ اجازت ملنے پر اس نے اپنے مریدوں سے رابطہ کیا اور انہیں اطمینان دلایا کہ اس کا اسلام قبول کرنا در اصل خدا کے حکم کی تعمیل میں ہے کیوں کہ قدیم یہودی کتب میں پیش گوئی ہے کہ مسیح کے پیروکار مسلمان ہوں گے۔

اپنے مریدوں کو مکمل اعتماد میں لینے کے بعد اس نے ایک نئے خفیہ فرقے کی بنیاد رکھی جس کے پیروکاروں کے لیے فرض تھا کہ وہ ظاہر میں مسلمان رہیں اور اندر سے یہودی۔ ان پر ضروری تھا کہ وہ عمامے اور جبے پہنیں۔ کسی پر بھی

---

[1] الدولة العثمانية از الصلابي: ۳۳۹ تا ۳۴۱؛ التاريخ الاسلامي للدكتور محمود شاكر: ۸/۲۰۱، ۲۰۲

ظاہر نہ ہونے دیں کہ وہ روزے نہیں رکھتے یا قربانی نہیں کرتے۔ ان پر یہ لازم تھا کہ کم از کم عید کی نمازوں میں ضرور شرکت کریں۔ ان کے لیے اپنے اصل عقائد کا اظہار اور اپنے فرقے کے سوا کسی اور سے شادی بیاہ حرام تھا۔ یہودی حلقے میں ان کے نام الگ تھے اور مسلم معاشرے کو دکھانے کے لیے الگ نام اختیار کیے گئے تھے۔ کئی سالوں بعد حکومت کو سباتائی کی ان ناپاک حرکتوں کا علم ہوا لہٰذا اسے جلاوطن کر دیا گیا اور ۱۶۷۵ء میں وہ مر گیا۔

مگر اس کا لگایا ہوا شجرہ خبیثہ پھلتا پھولتا رہا۔ اگلی دو صدیوں میں ان کے متعدد افراد غیر معمولی علمی و فنی مہارتوں کے سبب سلطنت عثمانیہ کے مختلف عہدوں پر رہے۔ ایسے لوگوں کی اصل تعداد کتنی تھی؟ کوئی نہیں جانتا۔ مگر کبھی کبھار ان میں سے کسی کی قلعی کھل جاتی تو معلوم ہوتا کہ یہ لوگ کہاں کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ عبداللہ یعقوب چلپی (جوزف کریدو) اور عبدالغفور آفندی (جوزف بیلوسوف) اس کی مثال تھے۔ وہ طہارت حتیٰ کہ غسل جنابت بھی نہیں کرتے تھے مگر ظاہری طور پر مسلمان سمجھے جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو مخصوص علامات سے پہچان لیتے تھے۔ ان کی عورتوں کے جوتے زرد رنگ کے ہوتے تھے۔ ان کے مرد سفید ٹوپیاں اور سبز عمامے پہنتے تھے۔ ①

یہود الدونمہ دکھاوے کے لیے نمازیں بھی پڑھ لیتے تھے اور حج کرنے بھی چلے جاتے تھے۔ لوگوں نے ان کی حقیقت کو فراموش کر دیا تھا اور انہیں مسلمان سمجھنے لگے تھے۔ ترکی میں ان کی تنظیمیں قائم ہو چکی تھیں جو خفیہ طور پر ملت کی جڑیں کاٹ رہی تھیں۔ ②

مدحت پاشا کا ظہور:

سلطان عبدالعزیز کے دور میں انہی مسلم نما یہود میں سے ایک شخص مدحت پاشا، شام اور عراق میں سلطنت عثمانیہ کے اعلیٰ عہدوں پر رہا اور فری میسن نے پوری دنیا میں اسے ترکی کا بہترین مدبر اور جرأت مند قائد بنا کر پیش کیا۔ اس نے فری میسن کے تعاون سے جدت پسند ترک نوجوانوں کی تنظیم "جمعیت الاتحاد والترقی" قائم کی جس نے آگے چل کر ترکی میں خلافت کے خاتمے اور لادینی انقلاب لانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ③

طاغوتی تنظیموں کی تشکیل:

سلطان عبدالعزیز نے یورپی طاقتوں کے دباؤ پر عوام کو جو حقوق اور داخلی آزادی مہیا کی، اس سے فائدہ اٹھا کر سلطنت عثمانیہ کے بعض یہودیوں اور نصرانیوں نے ترکی میں ایسی تنظیموں اور جماعتوں کی داغ بیل ڈالی جو بظاہر علمی و ادبی ترقی کے لیے کام کر رہی تھیں مگر درحقیقت ان کے مقاصد سیاسی و مذہبی تھے۔ ان کے ساتھ ہی مشنری اداروں کی

---

① یہود الدونمة از محمد علی قطب: ص ۱۱ تا ۲۵، الدولة العثمانیة از الصلابی: ص: ۴۳۱، ۴۳۲

② التاریخ الاسلامی للدکتور محمود شاکر: ۱۹۳/۸ ③ الیہود والماسونیة از عبدالرحمن الدوسری: ص ۷۰، ۷۱

نوٹ: یاد رہے کہ مدحت پاشا کی اصلیت سلطان عبدالحمید ثانی کے دور میں ظاہر ہوئی تھی اور معلوم ہوا تھا کہ وہ یہود الدونمہ اور فری میسن سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ سلطان نے اسے معزول کر دیا تھا۔ تفصیل سلطان عبدالحمید کے حالات میں آئے گی۔

سرگرمیاں بھی بڑھ گئیں اور انہوں نے اپنی سرپرستی میں علوم وفنون کی اشاعت کی تنظیمیں بھی قائم کر دیں جیسا کہ امریکی مشنری اداروں کی مدد سے ترکی کے دو نصرانیوں: پطرس البستانی اور ناصیف یازجی نے "جمعیت العلوم والفنون" تشکیل دی جس کا مقصد بظاہر یورپی علوم وفنون کی اشاعت اور ترکی کے یورپ سے روابط بہتر بنانا تھا۔

شروع میں ایسی جماعتوں کی طرف مقامی نصرانی ہی راغب ہوئے چنانچہ جمعیت العلوم والفنون کی تاسیس کے پہلے دو سالوں میں اس کے ارکان صرف پچاس تھے اور وہ سب شام کے نصرانی تھے۔ اسی طرح ۱۸۵۰ء (۱۲۶۶ھ) میں ترکی کے کچھ نصرانیوں نے "الجمعیۃ الشرقیۃ" کی بنیاد ڈالی، اس کے ارکان بھی نصرانی ہی تھے۔ ان نصرانی جماعتوں کی کوشش یہی رہی کہ علمی وفنی سرگرمیوں کی آڑ میں پورے سلطنتِ عثمانیہ میں پھیلے ہوئے نصرانیوں کو متحد اور منظم کر لیا جائے۔ ترکی کے مسلمان ابتداء ہی میں سمجھ گئے تھے کہ ان جماعتوں کا مقصد ملک میں مذہبی منافرت پھیلانا ہے اس لیے وہ ان کے کسی فریب میں نہ آئے۔ ان کوششوں کو رائیگاں دیکھ کر ۱۸۵۶ء (۱۲۷۲ھ) میں انہی عناصر نے "الجمعیۃ العلمیۃ العربیۃ" قائم کی جس میں مسلمانوں کو بھی شریک کیا گیا تاہم کوشش کی گئی کہ زیادہ اہمیت دروز اور شیعوں کو دی جائے۔

استنبول میں بھی کچھ تنظیمیں کام کرنے لگیں جن کی باگ ڈور یہود الدونمۃ کے ہاتھ میں تھی، مغربیت سے متاثر بہت سے ترک نوجوان تیزی سے ان میں شامل ہو گئے۔ جو جماعتیں زیادہ آزادی پسند خیالات کی تشہیر کر رہی تھیں، یورپ نے ان کی زیادہ حوصلہ افزائی کی اور انہیں اپنے شہروں میں مراکز قائم کرنے کا موقع دیا۔ چنانچہ سیکولرازم کے حامی احمد رضا بیگ کی قائم کردہ ترک نوجوانوں کی تنظیم "جمعیۃ الترکیا الفتاۃ" (جوانانِ ترک) کا ہیڈ کوارٹر پیرس میں تھا جبکہ اس کی شاخیں سلانیک، برلن اور استنبول میں تھیں۔ یہودیوں کا خفیہ ادارہ فری میسن ان تمام جماعتوں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ ان جماعتوں کی دعوت یہ تھی کہ مغربی افکار اور یورپی تہذیب وتمدن کو اپنایا جائے اور خلافتِ عثمانیہ کو ختم کیا جائے جو اس ہدف کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

یہ ترک نوجوان "ترک" قومیت کے تعصب کو بھی ہوا دے رہے تھے جس سے خلافتِ عثمانیہ کے ماتحت عرب صوبوں کو ترکی پر ایک بوجھ باور کرا رہے تھے۔ اس طرح ترک عرب منافرت بڑھ رہی تھی۔ ①

مغربی مفکرین کے ترکوں کی نسلِ نو پر اثرات:

قوم پرست ترک نوجوان ادبی وسیاسی فضا میں پروان چڑھے تھے اور تقریباً سبھی صحافی، ادیب یا شاعر تھے۔ ان نوجوانوں پر فرانس اور اٹلی کے انقلاب کا غیر معمولی اثر تھا۔ فرانس کا جمہوری انقلاب اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں ابھرا تھا جبکہ انیسویں صدی عیسوی کے دوران اٹلی میں مازینی (۱۸۰۵ء تا ۱۸۷۲ء) نے وطنیت (فاشزم) کی تحریک کی داغ بیل ڈال دی۔ یہ تحریک فرانس پر نپولین بوناپارٹ کے قبضے اور اٹلی کے حصے بخرے کرنے کے ردِ عمل

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۸۲/۸، ۱۸۳

میں ابھری تھی۔ اگرچہ ۱۸۱۴ء میں "واٹرلو" کے معرکے میں نپولین کی شکست کے بعد یورپی ممالک نے "ویانا" کانفرنس میں اٹلی کو آزاد ملک مان لیا تھا مگر اس کے صوبہ سردانیا کو الگ ریاست کی حیثیت دے دی گئی تھی، جزیرۂ سسلی اور ناپولی فرانس کے بوربون شہزادوں کے حوالے کر دیے گئے تھے، وینس سمیت اٹلی کے بیشتر علاقے آسٹریا کا حصہ تسلیم کر لیے گئے تھے۔ یوں اٹلی کا شاہی خاندان ایک محدود رقبے کے ساتھ فرانس اور آسٹریا کے رحم و کرم پر رہ گیا۔

مازینی اٹلی کے زوال سے دل گرفتہ اور اس کی سابقہ شان و شوکت کی بازیافت کا علم بردار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاہی نظام فرسودہ ہو چکا ہے لہٰذا اٹلی کو مضبوط کرنے کے لیے یہاں بھی جمہوری نظام نافذ کرنا ضروری ہے۔ اس نے قوم کو یکجا کرنے کے لیے "وطنیت" کا نعرہ بلند کیا۔ انقلابی خیالات کی پاداش میں اسے ۱۸۳۰ء میں جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ پہلے فرانس اور پھر سوئٹزرلینڈ پہنچا اور وہاں اپنے ہم خیال ساتھیوں کو منظم کر کے ۱۸۳۲ء میں "نوجوانانِ اٹلی" نامی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اٹھارہ برس کی جلاوطنی کے دوران وہ اٹلی میں اپنے افکار کی اشاعت کرتا رہا اور لاتعداد رضاکار تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آخر ۱۸۴۸ء میں وہ وطن واپس آیا جہاں جمہوریت کے لیے فضا ہموار ہو چکی تھی۔ یہاں اس نے صفِ اول کے سیاسی رہنما کے طور پر ملک سے بادشاہت ختم کر کے جمہوری انقلاب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مگر فرانس نے نئی حکومت کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے اٹلی پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں مازینی کو پھر ملک سے فرار ہو کر پہلے لندن اور پھر سوئٹزرلینڈ میں پناہ لینا پڑی۔

مگر مازینی کے افکار نے اطالوی شاہی خاندان میں وطنیت کی روح پھونک دی تھی، لہٰذا آخر کار سردانیا کے شہزادے "وکٹور ایمانوئیل دوئم" نے ۱۸۶۱ء میں اٹلی کو متحد کر دکھایا۔ اگرچہ مازینی کا ارمان پورا نہیں ہوا تھا کیوں کہ وہ اپنے وطن میں بادشاہت نہیں جمہوریت چاہتا تھا مگر اٹلی کے دوبارہ طاقت پکڑنے کا سہرا اسی کے سر مانا جاتا ہے۔[1]

جدید عثمانی اور مدحت پاشا:

اٹلی کے دوبارہ روبہ عروج ہونے سے بعض جدت پسند ترک نوجوان، جو پہلے انقلابِ فرانس کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے زوال پذیر ترکی کو بامِ عروج پر لے جانے کا منشور پیش کر کے ۱۸۶۵ء کے دوران استنبول میں ایک خفیہ جماعت "اتفاقِ الحمیۃ" کی بنیاد رکھی جس کا طریقِ کار "نوجوانانِ اٹلی" کے مشابہ تھا۔ ان بانی نوجوانوں میں ترک ادیب و شاعر نامق کمال، محمد ضیاء اور علی واسعی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ بہت جلد یہ تینوں پیرس جا کر "جمعیت ترکیا الفتاۃ" (جوانانِ ترک) کے لیڈروں سے ملے اور ان سب کے اشتراک سے ایک نئی تنظیم "العثمانیون الجدد" (جدید عثمانی) وجود میں آئی۔ اس تنظیم نے بہت جلد قصرِ استنبول کے اہم رکن مدحت پاشا کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا جو پہلے ہی مغربی طاقتوں کا آلۂ کار بن چکا تھا۔[2]

---

① الموسوعة العربية العالمية، مادة مازيني

② الدولة العثمانية، عوامل النهوض وأسباب السقوط از الصلابی: ص: ۵۰۳،۵۳۵

پان ترک ازم (عثمانی اتحاد):

پان ترک ازم یا عثمانی اتحاد سے مراد جدید عثمانیوں کی شروع کردہ وہ تحریک ہے جو انیسویں صدی کے وسط میں ابھری۔ اس صدی میں یورپ قومیت اور وطنیت کے جس طوفان سے آشنا ہوا تھا، اس کے اثرات سلطنتِ عثمانیہ میں بھی پڑ کر رہے۔ سلطنتِ عثمانیہ میں آباد مختلف نصرانی قوموں نے خود مختار حکومتوں کے مطالبات شروع کر دیے جن کی پشت پناہی مغربی طاقتیں کر رہی تھیں۔ یونان سمیت کئی صوبوں نے مغربی طاقتوں کی سرپرستی میں آزادی کے سپنے دیکھے اور انہی طاقتوں کی مدد سے انہیں پورا کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

ان حالات سے سلطنتِ عثمانیہ کا پورا نظام متاثر ہونے لگا اور عثمانی سلاطین خود مختاری کے ناروا مطالبات کے ردِ عمل میں، مطلق العنانی کا راستہ اختیار کرنے لگے۔ ایسے میں مدحت پاشا جیسے لوگوں نے پان ترک ازم کی تحریک شروع کی، جس کا منشور یہ تھا کہ سلاطین کی مطلق العنانی ہی سارے بگاڑ کی بنیاد ہے، اس کی جگہ عثمانی سلطنت کی تمام قوموں کو نسل اور مذہب کی تفریق کے بغیر مساویانہ حقوق فراہم کیے جائیں تاکہ یورپی اقوام مطمئن ہو جائیں اور سلطنتِ عثمانیہ کی تقسیم و تحلیل کی کوششیں ترک کر دیں۔

صحافت جدید عثمانیوں کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ انہوں نے برطانیہ اور فرانس کے اخبارات و جرائد کی طرز پر ترکی میں صحافت کی داغ بیل ڈالی۔ ترک نوجوانوں کو متاثر کرنے میں ان ذرائع ابلاغ کا کردار سب سے زیادہ تھا۔[1]

جمعیت اتحاد و ترقی۔ رکنیت سازی کا طریقہ کار:

مدحت پاشا نے تنظیم میں شامل ترک فوجی افسران اور سپاہیوں کی ایک الگ تنظیم "جمعیة الاتحاد والترقی" قائم کی جس نے اہداف کے حصول کے لیے تیز تر پیش قدمی کی۔ خلیفہ کے اختیارات کو محدود کرنا اس تحریک کا اہم مقصد تھا۔ دینی اخوت کی جگہ اس کی بنیاد وطنیت کے جذبے پر تھی جو یورپی تحریکات کی روح تھی۔

جمعیت اتحاد و ترقی کے لیڈروں نے اس کے اصل اہداف کو چھپاتے ہوئے رکنیت سازی کے حلف نامے میں اللہ کی کبریائی، دین کی سربلندی اور قرآن مجید کی پیروی کے الفاظ کو اس طرح شامل کیا کہ جذباتی نوجوانوں کا ذہن تنظیم کے اصل مقاصد کی طرف نہیں جاتا تھا۔ تنظیم کی رکنیت کا طریقہ فری میسن کے انداز سے مشابہ تھا۔ ترغیب کے ذریعے جو نوجوان تنظیم میں شمولیت پر آمادہ کر لیا جاتا، اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر رات کے اندھیرے میں کسی خفیہ مقام پر پہنچا دیا جاتا۔ تلواروں اور بندوقوں سے مسلح چند نقاب پوش اس کے ہاتھ میں قرآن مجید دے کر یہ حلف اٹھواتے:

"میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت اور اس کے عدل و رحم پر ایمان رکھتا ہوں۔ انسانی اخوت پر یقین رکھتا ہوں۔ قوانین و حقوق میں تمام انسانوں کو کسی نسلی امتیاز کے بغیر برابر سمجھتا ہوں۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ آج سے میری جان و مال کا پورا اختیار تنظیم کو ہے۔ تنظیم ظلم و استبداد سے نجات کے لیے جو بھی تحریک چلائے گی میں نہ صرف

[1] تاریخ الدولة العثمانیة، از یلماز اوزتونا: ۲/۱۰۳

سچے دل سے اس میں شرکت کروں گا بلکہ ہر قسم کی قربانی بھی دوں گا۔ اگر میں اس جماعت یا اس کے منشور سے انحراف کروں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس صورت میں تنظیم کو میرے قتل کا پورا اختیار حاصل ہوگا۔“

رکنیت کا حلف اٹھانے والے پر واضح کر دیا جاتا تھا کہ اگر اس نے تنظیم کے کسی راز سے کسی کو مطلع کیا تو اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ کسی رکن کے منحرف ہونے کی صورت میں اس پرانے رکن کو اس کے قتل کی ذمہ داری سونپی جاتی جس نے اسے ترغیب دے کر تنظیم میں شامل کیا تھا۔ اس قتل میں کوتاہی کرنے والے پر وہ خود سزائے موت کا حق دار بن جاتا۔ [1]

ان عناصر نے سلطنت میں اثر ورسوخ پیدا کرنے کے بعد عثمانی خلفاء کو ظالم، جابر، آمر، مطلق العنان اور خود غرض مشہور کیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کا یہ مطالبہ زور پکڑتا گیا کہ ترکی کو شرعی قانون ودستور کی بجائے یورپین طرز کا آئین دیا جائے۔ قوم پرستوں نے حکومت کی طرف سے روک تھام کی کوششوں کے باوجود جرائد ومجلات کے ذریعے اپنے خیالات کی اشاعت جاری رکھی اور ان کے حامیوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ [2]

سلطان عبدالعزیز کے اقدامات:

سلطان عبدالعزیز بذات خود ایک پکا اور غیور مسلمان تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ یورپی ممالک کے باہمی تنازعوں سے فائدہ اٹھا کر ترکی کو مستحکم بنایا جائے۔ اس سلسلے میں مختصر مدت میں اس نے درج ذیل اہم اقدامات کیے:

❶ مغربی آئین ودستور اور مغربی تہذیب وتمدن کی خلاف اسلام شکلوں کو ترکی میں نافذ کرنے سے انکار کر دیا۔

❷ فوج کو قدیم ہتھیاروں کی جگہ جدید اسلحہ فراہم کیا، اس کے لیے زر کثیر خرچ کر کے یورپ کی بہترین اسلحہ ساز فیکٹریوں کا تعاون حاصل کیا گیا۔

❸ فوج کو ایک نئی ترتیب میں ڈھالا جس میں قدیم فوجی نظام کی جھلک تھی۔ تمام صوبوں کی چھاؤنیوں میں دستوں کو قبیلوں اور برادری کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا۔

❹ قلعوں اور چھاؤنیوں کو جدید ترین توپوں سے لیس کیا گیا۔ توپوں کی ڈھلائی کے کارخانے کو جدید شکل دی۔

❺ یورپی ممالک کے اعتراض کے باوجود تمام ممالک میں، ان کے نامہ نگاروں کی جگہ اپنے خبر نویس مقرر کیے۔

❻ بحری فوج میں اضافہ کیا گیا۔

❼ احتساب کے شعبہ کو فعال بنایا، قانون سے کسی کو مستثنیٰ نہیں رکھا، اسی لیے خسرو پاشا، عاکف پاشا اور طاہر پاشا جیسے بڑے بڑے امراء کٹہرے میں لائے گئے۔ [3]

❽ ایک رسالہ ”مجلة الاحكام العدليه“ اور ایک رسالہ ”مجلة الاحكام التجارية“ جاری کیا تاکہ

---

① خلافت اسلامیہ سقوط واحیاء از حق نواز: ص ۸۳، ۸۵، ط زہیر پبلیکیشنز ملتان

② التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۱۸۳ ③ الدولة العثمانية از الصلابی: ص: ۳۹۳

اقتصادی نیز ملکی و بین الاقوامی معاملات میں قوم کے سامنے شرعی وقانونی موقف واضح ہو جائے۔ یہ رسائل دورِ جدید کے ان مسائل کے بارے میں ایک قانونی وفقہی دستاویز تھے جن کے متعلق لوگ ابہام کا شکار تھے۔ ان کی تیاری میں نامور علماء شریک تھے جن میں سے ایک علامہ ابن عابدین شامی کے فرزند علامہ علاؤ الدین بھی تھے۔ [1]

سلطان عبدالعزیز کے خلاف عالمی سازش اور اپنوں کی غداری:

یورپی طاقتوں کو جو ترکی کو زیادہ سے زیادہ کمزور کرنا چاہتی تھیں، سلطان عبدالعزیز کے ان اقدامات سے ترکی کے دوبارہ ابھرنے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ دوسری طرف سلطان عبدالعزیز نے بھی یورپی ممالک کا دورہ کر کے اور ترکی سے ان کی مکارانہ سیاست کا تسلسل دیکھ کر یہ سمجھ لیا تھا کہ ان کی دوستی، دشمنی سے کم نقصان دہ نہیں۔ اس سے پہلے سلطان عبدالعزیز کی پالیسی یہ تھی کہ کسی طرح یورپی ممالک کے اختلاف سے فائدہ اٹھایا جائے مگر آخر کار اسے اندازہ ہو گیا کہ فرانس، برطانیہ اور آسٹریا سمیت تمام مغربی طاقتیں اندرونِ خانہ ترکی کے متعلق منفی رائے ہی رکھتی ہیں۔

اس وقت مغربی دنیا اور یورپ میں کش مکش تیز ہوتی جارہی تھی، اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطان نے طے کر لیا کہ مغرب سے دوری اختیار کر کے، ان کے مقابلے میں روس سے اشتراک بہتر ہے۔ اس فیصلے کے بعد روسی سفیر سے اس کی بکثرت ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ان ملاقاتوں میں زبانی کلامی اس پر اتفاق ہو گیا کہ روس اور ترکی مل کر مشرقی یورپ اور ایشیا سے مغربی ملکوں کی اجارہ داری ختم کر دیں گے جس کے بعد مفتوحہ مسلم علاقے ترکی کے اور نصرانی علاقے روس کے ماتحت سمجھے جائیں گے۔ مگر کسی باقاعدہ معاہدے کی ترمیم سے پہلے ہی مغربی دنیا کو بھنک پڑ گئی اور ان کے ایماء پر دنیا بھر میں سلطان عبدالعزیز کو ایک حواس باختہ، اسراف پسند اور بدعنوان حکمران مشہور کیا جانے لگا۔ عوام وخواص کو سلطان کے خلاف بھڑ کانے کے بعد مئی ۱۸۷۶ء (جمادی الاولی ۱۲۹۳ھ) میں مغربی طاقتوں کے ایجنٹ مدحت پاشا نے شیخ الاسلام حسن خیر اللہ کو استفتاء پیش کیا کہ کیا ہوش سے بے گانہ، سیاست سے لاعلم، فضول خرچ حکمران کو جو مملکت کو تباہ کر رہا ہو، معزول کیا جا سکتا ہے۔ شیخ الاسلام نے اثبات میں فتویٰ دیا جسے بنیاد بنا کر مدحت پاشا نے بغاوت کر دی اور سلطان عبدالعزیز کو معزول کر دیا۔ [2]

سلطان عبدالعزیز کو معزولی کے فوراً بعد ایک کال کوٹھری میں ڈال کر مشہور کر دیا گیا کہ وہ حکومت چھن جانے کے غم سے پاگل ہو گیا ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد یہ خبر پھیلا دی گئی کہ اس نے خودکشی کر لی ہے۔ مگر سلطان عبدالعزیز نے اپنی وفات سے ایک دن پہلے نئے حکمران مراد خامس کو ایک خط لکھا تھا جو بعد میں منظرِ عام پر آیا، اس میں تحریر تھا:

> ”اللہ کے سہارے کے بعد میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں۔ تمہیں تخت نشینی مبارک ہو۔ میں نہایت رنج کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں امت کی اس طرح خدمت نہیں کر سکا جیسا کہ کرنا چاہتا تھا۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم

---

[1] تاریخ الدولة العلية العثمانية از فرید بک محامی: ص ۵۵۳

[2] الدولة العثمانية از الصلابی: ص ۳۹۲؛ تاریخ الدولة العلية العثمانية از فرید بک محامی: ص ۵۲۹

اس ہدف کو حاصل کرو گے۔ تم یہ مت بھولنا کہ میں نے مملکت کی حفاظت اور وقار کے لیے تمام کارگر وسائل اختیار کیے تھے۔ میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں کہ مجھے اس حال تک پہنچانے والی وہی فوج ہے جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے مسلح کیا تھا۔ میرا طرزِ عمل مظلوموں سے نرمی کرنا اور انسانیت کے تقاضے کے مطابق ان سب سے حسنِ سلوک کرنا رہا تھا، میں تم سے امید کرتا ہوں کہ تم مجھے اس تنگ اور اذیت ناک جگہ سے نکال کر کسی مناسب مقام پر منتقل کرو گے۔ میں سلطنت کی آلِ عبدالمجید میں منتقلی پر تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔ عبدالعزیز۔"[1]

اس مکتوب کا حرف حرف ظاہر کرتا ہے کہ سلطان عبدالعزیز آخر تک پورے ہوش و حواس میں تھا اور باغیوں نے اسے قتل کر کے اپنا جرم چھپانے کے لیے اسے خودکشی کا نام دے دیا تھا۔

نہر سوئز کا افتتاح:

سلطان عبدالعزیز کے دور میں ۱۸۶۹ء (۱۲۸۵ھ) کے دوران نہر سوئز کی کھدائی کا عظیم الشان منصوبہ مکمل کر لیا گیا جو تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا۔ اس منصوبے کا بانی مدحت پاشا تھا جس نے حکومتِ مصر کو برطانیہ اور فرانس سے قرض لے کر یہ راہداری تیار کرنے پر آمادہ کیا تھا۔[2]

اس سے پہلے یورپ کے بحری جہازوں کو ایشیا جانے کے لیے پورے افریقہ کا چکر کاٹ کر آنا پڑتا تھا۔ اب ان کا سفر انتہائی مختصر ہو گیا تھا۔ آج بھی ایشیا اور یورپ کے درمیان مختصر ترین سمندری راستہ یہی ہے اور اکثر تجارت اسی سے ہوتی ہے۔ البتہ اس نہر کی کھدائی سے اسلامی ممالک پر یورپی جنگی بیڑوں کا دھاوا بھی بہت آسان ہو گیا۔ خصوصاً برطانیہ اس قابل ہو گیا کہ بہت کم لاگت پر مختصر وقت میں ہندوستان میں قائم اپنے فوجی مراکز کو فوری کمک بھیج سکے۔

ٹیلی گراف اور ریلوے لائن:

سلطان عبدالعزیز اپنے ۱۵ سالہ دور میں مسلسل تعمیرِ وطن کی جدوجہد میں مصروف رہا۔ اس کے دور کے دو اہم کارنامے: ٹیلی گراف لائن اور ریلوے لائن کو دور دراز علاقوں تک پھیلانا تھا۔ یہ کام سابق سلطان عبدالمجید اول نے شروع کیا تھا جسے آگے بڑھاتے ہوئے سلطان عبدالعزیز کے دور میں ۱۸۷۰ء تک ۹۵ ہزار کلومیٹر طویل تاریں سلطنت کے طول و عرض میں بچھائی جا چکی تھیں۔

اسی طرح ۱۸۷۵ء تک ۴ ہزار ۹۳۲ کلومیٹر طویل ریلوے لائن کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ مواصلات اور آمد و رفت کے ان جدید ذرائع کو بعد میں سلطان عبدالحمید ثانی نے مزید ترقی دی۔[3]

+++

---

[1] تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ از فرید بک محامی: ص ۵۸۱

[2] صحوۃ الرجل المریض سلطان عبدالحمید الثانی و الخلافۃ الاسلامیۃ از موفق بنی المرجۃ: ص ۴۳

[3] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۲/۵۵

سلطان مراد خامس بن عبد المجید اوّل

۱۲۹۳ھ

۱۸۷۶ء

مراد خامس سلطان عبد المجید اوّل کا بیٹا تھا۔ وہ چھیالیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ وہ مشرقی و مغربی فنون سے روشناس تھا مگر ''جمعیت الاتحاد والترقی'' کی رکنیت اور مدحت پاشا جیسے سازشی افسران کی تربیت نے اسے نہ صرف لبرل ازم اور سیکولر ازم کا حامی بنا دیا تھا بلکہ فری میسن کی بھرپور حمایت بھی دلوا دی تھی۔ انہی اثرات کی وجہ سے مراد خامس مے نوشی اور دوسرے منکرات سے بالکل احتراز نہیں کرتا تھا۔ سلطان عبد العزیز کو معزول کرتے وقت یہ ہدف طے تھا کہ اسی مغرب نواز شہزادے کو خلافت سونپی جائے گی۔

مگر مراد خامس تخت نشینی کے فوراً بعد کسی دماغی عارضے کا شکار ہو گیا۔ عمائدِ حکومت نے طے کیا کہ اگر تین ماہ تک وہ صحت یاب نہ ہوا تو نیا خلیفہ منتخب کر لیا جائے گا۔[1]

سلطان مراد کی حواس باختگی تین ماہ تک ختم نہ ہوئی تو شیخ الاسلام سے فتویٰ لے کر اسے معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ سلطان عبد الحمید ثانی کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔[2]

✦✦✦

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۹۵، ۳۹۶

② تاریخ الدولة العلية العثمانية از فريد بک محامی: ص ۵۸۶

سلطان عبدالحمید ثانی بن عبدالمجید اوّل

۱۲۹۳ھ تا ۱۳۲۶ھ

۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء

سلطان عبدالمجید اوّل کا بیٹا عبدالحمید ثانی دینی و عصری علوم سے آشنا ایک عالم فاضل، ذہین، غیور اور دوراندیش نوجوان تھا۔ اس کی سگی والدہ اس وقت فوت ہوگئی تھی جب وہ دس سال کا تھا۔ اس کی سوتیلی ماں نے جو لاولد تھی، اسے حقیقی بیٹے کی طرح پالا اور اس کی بہترین تربیت کی۔ سلطان کی کردار سازی میں اس خاتون کی محنت کا بڑا حصہ تھا۔ [1]

شخصیت وصفات:

عبدالحمید ایک علم دوست نوجوان تھا۔ عربی اور فارسی سے خوب واقف تھا۔ ترکی زبان میں شعر بھی کہا کرتا تھا۔ کتب تاریخ اور عالمی ادب کا مطالعہ کرتا تھا۔ تصوف سے بھی اسے بہت دلچسپی تھی۔ صحت مند و توانا تھا۔ حربی ریاضتوں کا عادی اور بہترین شہسوار تھا۔ شمشیرزنی میں ماہر تھا اور پستول سے بے خطا نشانہ لگاتا تھا۔

اکثر خاموش رہتا اور جب لب کھولتا تو نپی تلی بات کرتا تھا۔ وہ اپنے باپ عبدالمجید اوّل اور اپنے بڑے بھائی مراد خامس کو مغربی طور طریقوں کی تقلید کرتا دیکھ کر کڑھتا تھا۔ وہ اپنے چچا سلطان عبدالعزیز سے بہت متاثر تھا اور اسی کی طرح مشرقی اقدار کا پابند، اسلامی ذہنیت کا حامل اور ترکوں کی غیرت وحمیت کا نمائندہ تھا۔ وہ دنیا کے حالات سے واقفیت کو بہت ضروری سمجھتا تھا اور بلاناغہ اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔ [2]

یورپ کا سفر:

دنیا کے حالات پر اس کی گہری نگاہ تھی۔ وہ اپنے چچا سلطان عبدالعزیز کا مقرب تھا۔ ۲۵ سال کی عمر میں وہ اپنے چچا اور صدر اعظم فواد پاشا کے ساتھ یورپ کے دورے پر جا چکا تھا۔ اسے برطانیہ میں ملکہ وکٹوریہ، فرانس میں نپولین سوم اور جرمنی میں شاہ ولیم اوّل سے ملاقات کا موقع ملا۔

اس سفر میں اس نے مغربی دنیا کو بغور دیکھا اور وہاں کے طرز معاشرت، اقتصادیات، جدید ایجادات اور عسکری

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۳۹۵، ۳۹۹

② تاریخ الدولة العثمانية، از یلماز اوزتونا: ۲/ ۹۹، ۱۰۰

نظام کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کیں۔ اُس نے عالمی سیاست کی شطرنج کو بھی سمجھنے کی کوشش کی جس کی بساط سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف بچھائی گئی تھی۔ اُس نے یہ بھی تاڑ لیا کہ اُس کا چچا سلطان عبدالعزیز جو کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ اُس پر کسی بیرونی طاقت کا دباؤ ہے، درحقیقت شاہِ فرانس نپولین سوئم کا دباؤ قبول کرنے پر مجبور ہے۔

نوجوان عبدالحمید نے اس سفر میں یہ اندازہ لگایا کہ فرانس کے لوگ لہو ولعب کے دلدادہ ہیں، برطانوی صنعت و تجارت اور زراعت کے ماہر ہیں جب کہ جرمنی فوجی نظم وضبط میں ڈھلی ہوئی مملکت ہے۔ [1]

مسند نشینی:

عبدالحمید ثانی نے ایک شہزادے کے طور پر زندگی کے ۳۳ سال اس طرح گزارے تھے کہ اس کے حکمران بننے کا کوئی امکان نہ تھا، کیوں کہ اس کا چچا عبدالعزیز کہنہ سالی کے باوجود پوری طرح صحت مند تھا، مگر وہ اس طرح تاج وتخت سے محروم ہوا کہ کسی کو اس کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ اس کے بعد بھی عبدالحمید کے لیے حکمرانی کی راہ مسدود تھی کیوں کہ اس کا بڑا بھائی مراد خامس تخت پر بیٹھ چکا تھا مگر حیرت انگیز طور پر وہ ذہنی توازن کھو کر نااہل ثابت ہوا۔ یوں اللہ نے جس کے نصیب میں تخت لکھا تھا، وہ اسے مل کر رہا۔ [2]

۳۱ اگست ۱۸۷۶ء (۱۱ شعبان ۱۲۹۳ھ) کو سلطان عبدالحمید ثانی نے مسندِ خلافت سنبھالی۔ اس کی عمر اس وقت ۳۴ سال تھی۔ خلافتِ عثمانیہ کے آخری ایام میں اس نے تن من دھن لگا کر اُمتِ مسلمہ کی اس میراث کی حفاظت کی کوشش کی اور یہود ونصاریٰ کی سازشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

اس نے تخت نشینی کے بعد اپنی سوتیلی والدہ کے لیے "ملکہ" کا منصب برقرار رکھا مگر اس کی دست بوسی کے بعد یوں گویا ہوا: "آپ کی شفقت نے مجھے کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ آپ میری نظر میں میری حقیقی ماں سے جدا نہیں۔ آپ ہی سلطنت کی ملکہ اور والدۂ سلطان ہیں۔ قصرِ خلافت میں آپ کا ہی حکم چلے گا۔ لیکن میں آپ سے امید کرتا ہوں اور اس امید پر اصرار بھی کرتا ہوں کہ آپ کسی بھی صورت میں سلطنت کے کسی بھی چھوٹے یا بڑے معاملے میں دخل نہیں دیں گی۔" [3]

سلطان عبدالحمید کو درپیش آزمائشیں:

اس وقت یورپی دنیا خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے پر متفق ہو چکی تھی۔ ترکی میں اسلام دشمن تنظیموں کا نفوذ اور حکومتی محکموں میں ان کا اثر ورسوخ بہت بڑھ چکا تھا۔ یہ لوگ ایک مدت سے خلافت کو آمریت اور استبداد قرار دے کر عثمانی خلفاء سے یورپی طرز کا دستور تشکیل دینے اور اسے نافذ کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض وأسباب السقوط از الصلابي: ص: ۳۹۹، ۴۰۰

② تاریخ الدولة العثمانية، از یلماز اوزتونا: ۲/ ۹۹، ۱۰۰

③ الدولة العثمانية، عوامل النهوض وأسباب السقوط از الصلابي: ص: ۴۲۸

عبدالحمید ثانی ان کے ناپاک عزائم سے واقف تھا اور ان پر قابو پانا چاہتا تھا مگر وہ ان کی قوت اور اثر و رسوخ سے بھی واقف تھا اور جانتا تھا کہ یورپی ممالک ان کے پشت پناہ ہیں اس لیے ان ملک دشمنوں کو یک دم روکنے کی کوشش کی گئی تو یورپی ممالک کا ردِعمل بہت سخت ہوگا جس کے نتیجے میں سلطنت ختم ہو سکتی ہے۔

ان حالات میں عبدالحمید ثانی کی حکمت وتدبیر یہ تھی کہ جہاں کسی کھلبلی کے بغیر مغربی ایجنٹوں کو ٹھکانے لگانا ممکن ہو، وہاں ذرا بھی دریغ نہ کیا جائے اور جہاں کسی کارروائی کے ردِعمل میں رہا سہا اقتدار بھی ہاتھ سے جانے کا خطرہ ہو، وہاں لچک اور مفاہمت سے کام لیتے ہوئے مناسب موقع کا انتظار کیا جائے۔ اس پالیسی کے تحت اس دور میں کئی بڑے بڑے یہودی، نصرانی اور مغربی ایجنٹ کیفرِ کردار کو پہنچائے گئے۔ اسی وجہ سے مغربی میڈیا اور یہودی ذرائع ابلاغ نے سلطان کو "سلطانِ احمر" (خونی سلطان) کا لقب دیا اور اسے عیاش، بدعنوان، فضول خرچ اور ظالم وجابر مشہور کیا۔[1]

سلطان عبدالحمید کی حکمتِ عملی:

خلیفہ عبدالحمید ثانی نے یورپی استعمار اور اس کے تحت پنپنے والے علاقائی ولسانی تعصب کے مقابلے میں اُمت کو ایک نکتے پر متحد کرنے کی تحریک شروع کی جو "الجامعة الاسلامیة" (پان اسلام ازم) کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس نے علمائے کرام کو اپنے قریب کر کے مشوروں میں شریک کیا، شریعت کے مطابق قانون کے نفاذ اور عدل وانصاف کی فراہمی کی پوری کوشش کی۔ محکمہ جات اور حکومتی شعبوں سے رشوت اور بدعنوانی کا خاتمہ کرنے کے لیے اقدامات کیے۔

اس کے دور میں صدارتِ عظمیٰ کے عہدے دار بار بار تبدیل ہوئے۔ ان میں سے سوائے کامل پاشا کے کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو واقعی حکومت کو سنبھال سکتا۔ اس لیے سلطنت کے اکثر معاملات کو سلطان خود دیکھا کرتا تھا۔

اس کی حکمتِ عملی کا ایک پہلو یہ تھا کہ جب بھی اسے کسی یورپی ملک میں سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف فیصلہ کن جنگ کی تیاری کی خبر ملتی، وہ اس ملک سے دوستانہ تعلقات بڑھا لیتا اور کسی ایسے شخص کو صدرِ اعظم مقرر کر دیتا جسے اس ملک کی حکومت اپنا آدمی تصور کرتی ہو۔ اس نے برطانیہ کی تائید حاصل کرنے کے لیے کامل پاشا کو، فرانس کی حمایت پانے کے لیے سعید پاشا کو، ماسکو کا اعتماد حاصل کرنے کی خاطر خلیل پاشا کو اور جرمنی سے تعلقات بحال رکھنے کے لیے توفیق پاشا کو یکے بعد دیگرے صدرِ اعظم کی کرسی پر بٹھایا۔ غرض خلیفہ بین الاقوامی سیاست کی ہوا کا رُخ دیکھ کر اپنے مہرے بدلتا رہا۔ اس نے اقلیتوں کے متعلق خصوصی مراعات پر مشتمل حکمتِ عملی اپنائی تاکہ اغیار انہیں حکومت کے خلاف بھڑکانے میں کامیاب نہ ہوں۔ بعض مواقع پر اس نے مصلحتاً اقلیتوں کی سرکشی اور زیادتی سے چشم پوشی بھی کی۔ بیدار نگاہی اور جرأت کے ساتھ حکمت ومصلحت پر مبنی اس پالیسی کے ذریعے اس نے اندرونی وبیرونی سازشوں کے تسلسل کے باوجود خلافت کی آن بان کو مزید تیس سال تک برقرار رکھا۔[2]

---

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۸۲/۸ [2] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۸۵/۸

مغرب نواز طبقے سے سیاسی کش مکش

عبدالحمید ثانی کے دورِ خلافت کے آغاز میں امورِ حکومت پر مدحت پاشا اور اس کے ہمنوا افسران چھائے ہوئے تھے۔ مدحت پاشا ۱۸۲۲ء (۱۲۳۷ھ) میں استنبول میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے یورپی ممالک میں بھی وقت گزارا تھا اور مغربی افکار سے بہت متاثر تھا۔ ۱۸۶۱ء (۱۲۷۷ھ) میں وہ وزیر کے عہدے پر فائز ہوا اور مرکزی مجلسِ شوریٰ کا رکن بھی رہا۔ ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) میں اسے بغداد (عراق) کا امیر بنا دیا گیا۔ پھر سالونیک کی امارت اور مجلسِ شوریٰ کی سربراہی کا موقع بھی ملا۔ سلطان عبدالعزیز کے خلاف اسی نے بغاوت کرائی تھی، اس وقت وہ ملک کا وزیرِ دفاع تھا۔ وہ یہودی ایجنٹ اور شرابی کبابی انسان تھا مگر اس وقت تک اس نے اپنے اصل چہرے پر حب الوطنی کا نقاب ڈالا ہوا تھا۔[1]

سلطان عبدالحمید اپنی تخت نشینی سے پہلے ڈاڑھی منڈاتا تھا۔ اس کی ظاہری حالت سے مدحت پاشا جیسے لوگوں کو دھوکا ہو گیا تھا کہ وہ مغرب نواز ہے۔ اسی لیے انہوں نے مراد خامس کے بعد سلطان عبدالحمید کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس وقت مدحت پاشا سلطنت کے سیاہ وسپید پر حاوی تھا، اُدھر مغرب نواز طبقے کی طرف سے ملک میں جمہوریت کے نفاذ کا مطالبہ زور پکڑ چکا تھا۔ سلطان نے سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر ۲۳ اکتوبر ۱۸۷۶ء (۴ شوال ۱۲۹۳ھ) کو پارلیمنٹ اور سینٹ کے قیام کی منظوری دے دی اور اعلان کیا کہ پارلیمنٹ کے نمائندے بذریعہ انتخاب مقرر کیے جائیں گے جبکہ سینٹ کے ارکان کو حکومت نامزد کرے گی۔[2]

مدحت پاشا کا عروج:

انہی دنوں صدرِ اعظم رشید پاشا نے عمر رسیدگی کا عذر پیش کر کے استعفیٰ دے دیا۔ مدحت پاشا ایک مدت سے اس عہدے کے لیے پر تول رہا تھا۔ سلطان عبدالحمید نے یہاں بھی مصلحت کا لحاظ کر کے اسے صدرِ اعظم بنا دیا۔[3] اس نے مدحت پاشا سے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ ملک میں نئے آئین و دستور کی منظوری دے گا، اور جدت پسند لیڈروں: نامق کمال اور ضیاء بیگ کو اپنا خصوصی مشیر بنائے گا۔[4]

---

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۸۶،۱۸۵/۸، حاشیہ

② التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۸۵/۸

③ التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۸۵/۸

④ التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۹۷/۸

ملحوظہ: نامق کمال نامور ترک شاعر و ادیب تھا۔ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ سلطان سلیم، بہار دانش اور محاضرات سامترہ اس کی مشہور تصانیف ہیں۔ جلال الدین خوارزم شاہ کے نام سے اس نے ایک اسٹیج ڈرامہ بھی لکھا تھا جس کا اردو ترجمہ سجاد حیدر یلدرم نے کیا تھا۔ نامق سیاست میں مغربی طرزِ فکر کا نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ ترک قومیت کا علم بردار اور مشرقی و مغربی اقدار کے امتزاج کا قائل تھا۔ انقلابی سوچ کے باعث نامق کمال کو ترکی چھوڑ کر لندن جانا پڑا جہاں ۱۸۶۸ء میں اس نے رسالہ "حریت" جاری کیا۔ ۱۸۷۰ء میں اسے وطن واپسی کی اجازت مل گئی۔ اس نے ترکی میں "الوطن" اور "عبرت" نامی رسالے نکالے۔ انقلابی خیالات کا حامل ہونے کے باوجود وہ سلطان عبدالحمید کا حامی تھا۔ سلطان نے بھی اسے قریب کر لیا اور ۱۸۸۸ء میں اسے اپنے اور صدرِ اعظم کے مابین مکاتبت کی ذمہ داری سونپ دی۔ اسی سال نامق کی وفات ہو گئی۔ (صحوۃ الرجل المریض، ص ۹۳ مع حاشیہ)

ترکی کا نیا دستور:

سلطان عبدالحمید ذاتی طور پر اس حق میں نہ تھا کہ ابھی جمہوریت کو فروغ دیا جائے، کیوں کہ ترکی ایک نہایت مشکل دور سے گزر رہا تھا اور دوستوں کے روپ میں جا بجا دشمن ایجنٹ سرگرم تھے، سلطان کے خیال میں اس وقت جمہوریت سے زیادہ ایک مضبوط قیادت اور وفادار معاونین کی ضرورت تھی۔ تاہم اس زمانے میں نہ صرف سلطنتِ عثمانیہ کے یورپی صوبوں میں آباد نصرانی بلکہ ایشیائی صوبوں کے لاکھوں مسلمان شہری بھی مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر جمہوری اصلاحات کے خواہاں تھے۔ سلطان کے اُمراء اور مشیروں خصوصاً مدحت پاشا کا رُجحان بھی اسی طرف تھا۔ بیرونی عالمی طاقتوں سے معاہدوں کے باعث بیرونی دباؤ بھی ایک نئے آئین کی تشکیل کا متقاضی تھا۔

ایسے میں سلطان نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا اور مدحت پاشا کے ساتھ مل کر بڑے غور و خوض کے بعد ایک نیا آئین تیار کیا۔ چوں کہ یہ آئین صدرِ اعظم مدحت پاشا نے پیش کیا تھا، اس لیے مغرب پسند طبقے نے اس اقدام پر مدحت پاشا کو "بابائے دستور" کا لقب دیا۔[1] آئین ۲۳ دسمبر ۱۸۷۶ء (۶ ذوالحجہ ۱۲۹۳ھ) کو پیش کیا گیا جو شہری آزادی اور پارلیمانی حکومت کے خطوط پر مبنی تھا۔ اس کے اہم ترین نکات یہ تھے:

1. سرکاری مذہب اسلام ہوگا۔
2. عثمانی کا اطلاق رعایا کے ہر فرد پر ہوگا۔
3. ریاست کو ایک جسم کی طرح مانا جائے گا جس میں تفریق اور حصے بخرے کرنے کا تصور نہیں کیا جائے گا۔
4. سالانہ بجٹ قومی اسمبلی اور پھر سینٹ سے منظور کرایا جائے گا۔ دونوں کے اتفاقِ رائے کے بعد یہ نافذ ہوگا۔
5. آئین میں ولایات (صوبوں) کے انتظامات اور اُمراء کے اختیارات و ذمہ داریوں کی تفصیل پیش کی گئی۔
6. آئین میں قومی اسمبلی اور سینٹ کے ارکان کی اہلیت کی شرائط اور طریقِ انتخاب کو بھی واضح کیا گیا۔[2]
7. قانون کے لحاظ سے تمام شہریوں کو حریت اور مساوات کا حق حاصل ہوگا۔
8. سب کو تعلیم کا حق حاصل ہوگا۔ عثمانیوں کے لیے تعلیم حاصل کرنا لازمی ہوگی۔

---

① الیهود والماسونیة، از عبدالرحمن الدوسری: ص ۷۰، ط دار السنة

اگرچہ ایک رائے یہ ہے کہ اس آئین کی تشکیل میں سلطان کا کوئی حصہ نہ تھا، یہ فقط مدحت پاشا کا بنایا ہوا تھا اور سلطان نے مصلحتاً چشم پوشی کر کے اسے نافذ ہونے دیا تھا مگر خود سلطان کی بیٹی شہزادی عائشہ عثمان نے قید خانے میں سلطان کی گفتگو نقل کی ہے جس میں سلطان نے دو ٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ اسے آئین کا مخالف مشہور کرنے والے اُن پر تہمت لگا رہے ہیں۔ سلطان کے الفاظ یہ تھے: "میری بیٹی! اچھی طرح جان لو کہ اُمت کو یہ آئین ثانی میں نے محض اپنے ارادے سے دیا تھا۔ اس آئین کی تیاری سے قبل میں نے ہی تمام ممالک کے دستوروں کا ترجمہ کرایا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس مواد میں سے جو چیزیں ہمارے موافق ہوں انہیں لے لیا جائے، تاکہ اس طرح ہم ایک ایسے آئین کے حامل ہوں جو ملک کو زوال سے بچالے۔ پھر اس کے بعد اس آئین کا اعلان کر دیا گیا۔" (والدی سلطان عبدالحمید: ص ۲۷۲)

② تاریخ الدولة العلیة العثمانیة: ص ۵۹۰، ۵۹۱

⑨ پریس آزاد ہوگا۔

⑩ تحقیق و تفتیش کے دوران تشدد برتنا، مالی جرمانہ صادر کرنا اور بے گار لینا ممنوع ہوگا۔

⑪ قاضیوں کو کسی شرعی مجبوری کے بغیر معزول نہیں کیا جائے گا۔[1]

⑫ سلطان کے لیے حق سربراہی برقرار رہے گا۔ وہ بازپرس سے بالاتر ہوگا۔ اسے وزراء کے عزل ونصب، معاہدوں کی توثیق، جنگ اور صلح کے اعلانات کا اختیار ہوگا۔ مسلح افواج کی اعلیٰ کمان اس کے پاس ہوگی۔

⑬ سلطان کو پارلیمان سے رجوع کیے بغیر کوئی بھی قانون طے کرنے کا حق ہوگا۔

⑭ پارلیمان کے ارکان اپنی آراء ظاہر کرنے میں آزاد ہوں گے۔ ان سے اسی صورت میں بازپرس ہوگی جب وہ قانون شکنی کریں۔

⑮ مملکت کی سرکاری زبان ترکی ہوگی اور پارلیمان کے اجلاس کی کارروائی اسی زبان میں ہوگی۔

⑯ شوریٰ کے دو ایوان ہوں گے: ایک مجلس مبعوثین یعنی عوامی نمائندوں کا ایوان (قومی اسمبلی) دوسری مجلس اعیان (سینٹ) یعنی سرکردہ علماء، عمائد اور دانش وروں کا ایوان۔ قومی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے ۷۱، نصرانیوں کے لیے ۴۴ اور یہودیوں کے لیے ۴ نشستیں ہوں گی۔ سینٹ میں ۲۱ سیٹیں مسلمانوں اور باقی اقلیتوں کی ہوں گی۔[2]

مدحت پاشا کے عزائم:

اس آئین میں کوئی ایسی شق نہ تھی جو اسلام کے خلاف ہوتی، اس لیے اسلام پسندوں کو بھی بظاہر اس پر کوئی اعتراض نہ تھا، مگر چوں کہ اس میں خلیفہ کے اختیارات کو پہلے کی بہ نسبت قدرے محدود کر دیا گیا تھا، لہٰذا دستور کے نفاذ کے بعد صدر اعظم مدحت پاشا نے صاف صاف کہا تھا:

''نئے دستور کے اعلان کا مقصد یہ ہے کہ ہم ایوانِ خلافت کو مطلق العنانی سے روک سکیں۔''[3]

اس لیے منصبِ خلافت کا مخالف مغرب نواز طبقہ بہت خوش تھا۔ یہی نہیں بلکہ صدر اعظم مدحت پاشا جو سلطان عبدالحمید کو سادہ لوح تصور کر رہا تھا، اس کامیابی کے بعد ملک کا سربراہ بننے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس نے ایک نجی مجلس میں کہا تھا: ''عن قریب ترکی جمہوریہ بنے گا اور میں پہلے اس کا جمہوری سربراہ اور پھر سلطان بن جاؤں گا۔''[4]

مدحت پاشا کے جرائم:

مدحت پاشا کے برطانیہ سے بڑے گہرے تعلقات تھے، لہٰذا اس کی پالیسی یہ تھی کہ خطے میں برطانوی مفادات پر

---

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/ ۱۸۵، ۱۸۶

② الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۴۰۱ تا ۴۰۵

③ السلطان عبدالحمیدالثانی از محمد حرب: ص ۹۵، ط دار القلم دمشق

④ مذکرات السلطان عبدالحمید، از محمد حرب: ص ۷۷

بھی زوتہ پڑنے دے۔ اس نے صدر اعظم بننے کے بعد صوبوں میں اپنے "۱۱۷" نائبین مقرر کیے تھے جن میں سے ۴۸ نصرانی تھے۔ وزیر اعظم برطانیہ ڈزرائیلی سے اس کے ذاتی مراسم تھے۔[1] اس نے صدر اعظم کی الگ مجلس مشاورت بھی تشکیل دی تھی جس میں "۶۰" نصرانی اور "۱۸۰" مسلمان ارکان تھے۔[2]

سلطان عبدالحمید کو احساس ہو چکا تھا کہ صدر اعظم مدحت پاشا سمیت بڑے بڑے وزراء، یورپ کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ اس وقت قصرِ خلافت کا کوئی گوشہ یورپی ایجنٹوں کی دسترس سے باہر نہ تھا۔ مدحت پاشا سلطان سے سنی ہوئی انتہائی خفیہ نوعیت کی باتیں، اغیار تک پہنچا دیتا تھا۔ سلطان عبدالحمید کہا کرتا تھا:

"ایسی کوئی بھی حکومت پُر امن نہیں رہ سکتی جس میں وزیرِ اعظم جیسے مناصب پر فائز لوگوں سے عالمی طاقتیں اپنے لیے خدمت لے رہی ہوں۔"[3]

جنگِ بلقان

سلطان عبدالحمید کے دورِ حکومت میں بلقان کی جنگ کا باب بہت اہم ہے۔ اس جنگ کا آغاز سلطان کی حکومت کے پہلے سال ہوا، اور کئی سال تک اس کے شعلے بھڑکتے رہے۔

بلقان سے مراد وہ علاقہ ہے جو جنوب مشرقی یورپ میں جبل اسود، رومانیا، بوسنیا ہرزگووینا، سربیا، کروشیا، یوگوسلاویہ اور مقدونیہ کے مجموعے پر مشتمل ہے۔ چار لاکھ ۶۶ ہزار مربع کلومیٹر پر مشتمل یہ علاقہ مشرق میں خلیج باسفورس، مغرب میں بحیرۂ ایڈریاٹک، شمال میں دریائے ڈینوب اور جنوب میں بحیرۂ مار مورا اور درۂ دانیال تک پھیلا ہوا ہے۔

سلطنتِ عثمانیہ نے یورپی طاقتوں کے مسلسل حملوں اور سازشوں کے باوجود، دورِ زوال کی اس حالت میں بھی اس سرزمین کے بیشتر حصے کو سنبھالا ہوا تھا۔ یورپی طاقتوں کی پوری کوشش تھی کہ یہاں کے نصرانیوں کو بغاوت پر ابھار کر انہیں سلطنتِ عثمانیہ سے الگ کر دیں۔

۱۸۷۶ء میں سرب نصرانیوں نے بغاوت کی۔ سلطان عبدالحمید نے یورپی طاقتوں کو اس معاملے میں دخل دینے سے روک دیا اور اپنے جرنیل عثمان پاشا کے ذریعے باغیوں کے خلاف سخت کارروائی کی۔ "آلیک سیناک" کی وادی میں عثمان پاشا نے سرب لشکر کا سامنا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سرب لشکر کی قیادت بھیس بدلے ہوئے وہ روسی جرنیل کر رہے تھے جنہوں نے چند سال پہلے وسطِ ایشیا کی مسلم ریاست تاشقند کو زیرِ نگین کیا تھا۔ عثمان پاشا نے کمال کی عسکری مہارت اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے حریف کو بری طرح روند دیا اور پھر بلغراد کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ لیکن اس

---

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۹۰/۸ مع حاشیہ

[2] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱۰۲/۲

[3] الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۲۰۶

دوران روس کی طرف سے مذاکرات کی پیش کش کردی گئی جس کی وجہ سے جنگ روک دی گئی۔ [1]

مدحت پاشا کی سازشیں:

جنگ روکنے کی اصل وجہ سلطان عبدالحمید کی یہ حکمتِ عملی تھی کہ ترکی کو جہاں تک ہو سکے جنگوں سے بچایا جائے اور اس دوران ملک کو عسکری و اقتصادی طور پر اقوام یورپ کے ہم پلہ بنالیا جائے۔ سلطان عبدالحمید نے دوبارہ خانہ جنگی کے خطرے کو دور کرنے کے لیے اہلِ بلقان کی ہر طرح تسلی کرنے کی کوشش کی۔ انہیں مکمل عدل وانصاف فراہم کرنے کے لیے عدلیہ کو قانون نافذ کرنے والے اداروں (بیوروکریسی) سے الگ کردیا۔ قاضیوں کے انتخاب میں مقامی لوگوں کا مشورہ ضروری قرار دیا۔ مسلمانوں اور نصرانیوں پر ٹیکس کی شرح یکساں کردی گئی۔ [2]

مگر سلطان کے برعکس مدحت پاشا کی پالیسی یہ تھی کہ ترکی کو غیر ضروری جنگوں میں دھکیلا جائے۔ اس نے بلقان میں سلطان کی طرف سے جاری کی گئی ان اصلاحات کی بھی مخالفت کی۔ جنوری ۱۸۷۷ء (ذوالحجہ ۱۲۹۳ھ) میں اس نے اپنی مجلس شوریٰ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے جنگ کے مخالفین کو ملک کا غدار قرار دیا۔ اس نے روس اور یورپی ممالک پر بھی سخت ترین الفاظ میں تنقید کرکے یہ ظاہر کیا کہ اس وقت ترکی کا تیور رجحان وہی ہے۔

مدحت پاشا کے کہنے پر فوج کے بعض اعلیٰ افسران بھی سلطان کو سمجھانے لگے کہ سپاہی جنگ کے لیے آمادہ ہیں اور روس کی شکست آسان ہے۔ نیز برطانیہ بھی ہمارا حامی ہے۔

اس دوران مدحت پاشا نے دینی مدارس کے طلبہ اور عوام میں دراہم تقسیم کرکے انہیں آمادہ کرلیا تھا کہ وہ بلقان میں جنگ جاری رکھنے کے حق میں مظاہرے کریں۔ صحافت بھی مدحت پاشا کے ہم آواز ہوگئی اور حالات اسی سمت جانے لگے جس سے سلطان عبدالحمید ملک کو بچانا چاہتا تھا۔ سلطان نے اپنے خصوصی ذرائع سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ اگر وہ جنگ کا اعلان نہیں کرتا تو فضا اس کے سخت مخالف ہوجائے گی جس سے فائدہ اٹھا کر مدحت پاشا اس کا تختہ الٹ دے گا اور اس کے مخبوط الحواس بھائی مراد خامس کو علامتاً مسندِ خلافت پر بٹھا کر خود سارے اختیارات سنبھال لے گا۔ اس کے بعد مدحت پاشا وہ سب کچھ کرنے کے لیے آزاد ہوگا جو برطانیہ اور یہودی اس سے کرانا چاہتے ہیں۔

سلطان کے نزدیک اس صورتحال میں اتفاقِ رائے حاصل کرنے کی حکمتِ عملی کام نہیں دے سکتی تھی بلکہ اپنے صوابدیدی اختیارات کا استعمال ناگزیر ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے کچھ غیر معمولی اقدامات کرنے کا عزم کرلیا۔ [3]

مدحت پاشا کا زوال:

مدحت پاشا کی مقبولیت دیکھ کر مغرب نواز طبقہ پھولے نہیں سما رہا تھا مگر اس سے پہلے کہ یہ لوگ سلطان کے خلاف

---

[1] تاریخ الدولة العثمانية، یلماز اوزتونا: ۲/۱۰۱، ۱۰۲
[2] الدولة العثمانية فی التاریخ الاسلامی الحدیث، از اسماعیل یاغی: ص ۱۸۹
[3] تاریخ الدولة العثمانية، از یلماز اوزتونا: ۲/۱۰۳

گھیرا مزید تنگ کرتے، سلطان عبدالحمید نے ۵ فروری ۱۸۷۷ء (۲۱ محرم ۱۲۹۴ھ) کو اچانک مدحت پاشا کی برطرفی کا حکم جاری کر دیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ وہ باغی تنظیم "جمعیۃ الترکیا الفتاۃ" (جوانانِ ترک) کا حامی، اس کے افکار کی نشرواشاعت میں ملوث اور دین کو سیاست سے الگ رکھنے کا قائل ہے۔ مدحت پاشا کو صدرِ اعظم کا عہدہ پورے دو ماہ بھی نصیب نہ ہوا۔ اسے معزول کر کے "ازمیر" کا حاکم بنا دیا گیا۔[1]

مدحت پاشا کو سلطان عبدالعزیز یا سلطان عبدالحمید کے دور میں اگر اعلیٰ ترین مناصب حاصل رہے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان کا مقرب یا معتمد تھا۔ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ ملکی و غیر ملکی سیاست دانوں، وزیروں اور صحافیوں سے گہرے تعلقات کی بناء پر وہ ایک غیر معمولی بااثر شخصیت بن گیا تھا۔ جہاں تک ذاتی شخصیت و کردار کا تعلق ہے، وہ ایک انا پسند اور متشدد مزاج آدمی تھا۔ اپنے عالمگیر تعلقات کے بل بوتے پر نہ صرف اپنے ماتحتوں بلکہ خلفاء کو بھی مرعوب کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس کی سیاسی سمجھ بوجھ سطحی نوعیت کی تھی۔ اس نے پالیسیاں طے کرتے وقت کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی (یا جان بوجھ کر اس حقیقت کو ٹھکرایا) کہ سلطنتِ عثمانیہ کوئی ایک ملک نہیں بلکہ مختلف نسلوں اور قوموں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اس کے بہت سے فیصلے ملک و قوم کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے۔[2]

پارلیمان کی تشکیل:

مدحت پاشا کے بعد صدارتِ عظمیٰ ادھم پاشا کو دے دی گئی جس کی سرکردگی میں ۱۹ مارچ ۱۸۷۷ء (۴ ربیع الاول ۱۲۹۴ھ) کو سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ میں پہلی بار عام انتخابات ہوئے۔ یمن، طرابلس الغرب (لیبیا) اور بوسنیا جیسے دور دراز کے صوبوں میں بھی پولنگ ہوئی اور نمائندے منتخب ہو کر ایوانوں میں آئے۔ پارلیمان کے اجلاس میں شریک ہونے والے بعض ممبرانِ اسمبلی پہلی بار استنبول دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بعض ترکی زبان سے بھی ناواقف تھے۔ سلطان عبدالحمید نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ اس کا بھائی محمد رشاد بھی اس کے ہمراہ تھا۔[3]

چونکہ ترکی میں جمہوریت لانے میں مغرب نواز ترک پیش پیش تھے جن کے یہودیوں اور نصرانیوں سے گہرے مراسم تھے، اس لیے اس تبدیلی کے فوراً بعد ترکی میں غیر مسلم اقلیتوں کو طاقت ور اور بااختیار بنانے کی کوشش شروع کر دی گئی۔ سلطان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ بعض ایسے صوبوں کی امارت بھی نصرانیوں کو دے، جہاں مسلمان اکثریت میں آباد ہیں۔ یہ بھی مطالبہ رکھا گیا کہ نصرانی لڑکوں کو اعلیٰ عہدوں کے لیے قائم فوجی تربیت گاہوں (کیڈٹ کالجز) میں داخل کیا جائے۔ انہی دنوں بعض مسائل پر قومی اسمبلی اور سینٹ کے اجلاس بھی ہوئے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔[4]

---

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۸۶/۸، ۱۸۷ء

[2] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱۰۳/۲

[3] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۲/ ۱۰۵

[4] الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۲۰۱ تا ۲۰۵

بلقان میں دوبارہ خونریزی اور یورپی ممالک کی سازش:

کچھ دنوں بعد بوسنیا اور ہرزگوینیا میں دوبارہ بغاوت ہوئی اور پوری یورپی دنیا نے باغیوں کی حمایت کرتے ہوئے سلطان سے اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ سلطان نے ان علاقوں کے لیے مزید مراعات کا اعلان کر دیا۔ اس کے باوجود مقامی نصرانی مطمئن ہوئے نہ انہیں بغاوتوں پر ابھارنے والے یورپی حکمران۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اصلاحات کا مطالبہ محض ایک ڈھونگ تھا، اصل مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی شکل میں سلطنتِ عثمانیہ خانہ جنگی کا شکار رہے۔[1]

کچھ دنوں بعد بلقان میں پیش آنے والے ایک واقعے کو بہانہ بنا کر یورپی ممالک نے سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف برلن میں تحریری معاہدہ کر لیا۔ ہوا یہ کہ سلانیک کی ایک نصرانی لڑکی نے اسلام قبول کر لیا اور اسلام کا اعلان کرنے کے لیے مقامی امیر کے پاس جانے لگی۔ راستے میں نصرانیوں نے اسے قتل کر ڈالا۔ اس پر مسلمانوں نے امیر سے قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ کیا۔ امیر نصرانیوں کی بغاوت کے خدشے سے فوری طور پر کچھ نہ کر سکا جس پر احتجاجی مظاہرہ کرنے والے مسلمانوں نے جرمنی کے سفارت خانے پر دھاوا بول دیا۔

یہ خبر یورپ پہنچی تو برلن میں روس، آسٹریا اور جرمنی کے وزراء نے جمع ہو کر ایک تحریری قرارداد پاس کی جس پر فرانس اور اٹلی کے نمائندوں نے بھی دستخط کیے۔ قرارداد میں بلقان کے باغیوں سے اظہارِ یکجہتی کرتے ہوئے مطالبہ کیا گیا تھا کہ خلیفہ نصرانی شہریوں کے حقوق کا خیال رکھے ورنہ یورپی طاقتیں اس مسئلے کے حل کے لیے طاقت استعمال کرنے پر مجبور ہوں گی۔[2]

بلغاریہ میں بغاوت:

انہی دنوں بلغاریہ میں نصرانیوں کی تنظیموں نے علاقے میں روس کا اثر و رسوخ بڑھانے کی مہم شروع کر دی، روس انہیں اسلحہ بھی فراہم کر رہا تھا جو بوسنیا، سربیا اور ہرزگوینیا کے باغیوں میں بھی تقسیم کیا جا رہا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف فضا بنانے کے لیے بابِ عالی کی زیادتیوں پر مبنی طرح طرح کی افواہیں بھی پھیلائی جا رہی تھیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد روس کی شہ پر بلغاریہ میں بغاوت ہو گئی۔ آسٹریا بھی باغیوں کا معاون تھا۔ تاہم سلطان عبدالحمید نے پوری قوت سے باغیوں کو کچل ڈالا۔ اس خبر سے یورپی طاقتوں میں کہرام مچ گیا۔ بلغاری نصرانیوں نے بغاوت کے دوران مقامی مسلمانوں کا جو قتلِ عام کیا تھا، اسے بالکل نظر انداز کر کے، انہوں نے باغیوں کے خلاف کارروائیوں کو معصوم شہریوں پر ترک افواج کے مظالم کا نام دے کر مشہور کر دیا۔ ان خبروں سے پورے یورپ میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرف سے مطالبہ ہونے لگا کہ سلطنتِ عثمانیہ کے مظالم کی روک تھام کے لیے کوئی لائحہ عمل طے کیا جائے۔ اس لائحہ عمل کے پہلے مرحلے میں یورپ نے سلطان عبدالحمید سے مطالبہ شروع کر دیا کہ بلغاریہ میں کسی نصرانی حاکم کا تقرر کیا جائے۔[3]

---

[1] الدولۃ العثمانیۃ فی التاریخ الاسلامی الحدیث، از اسماعیل یاغی: ص ۱۸۹

[2] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۱۸۷ [3] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۱۸۸

دوسرے مرحلے میں روس، آسٹریا اور جرمنی نے سربیا اور جبل اسود کے نصرانی نوابوں کو ملا کر ایک بار پھر بغاوت کی سازش طے کرلی۔ اس میں بنیادی کردار روس کا تھا۔ روس نے باغیوں سے وعدہ کیا کہ اگر وہ بلقان میں کامیاب ہو گئے تو روسی فوج سیدھا استنبول پر حملہ کر کے خلافتِ عثمانیہ کو جڑ سے مٹا دے گی۔ اور اگر ترک بغاوت کچلنے میں کامیاب ہو گئے تو روسی فوج باغیوں کے دفاع کے لیے بیچ میں آجائے گی۔ آخر سربیا اور جبل اسود کے نصرانی افواج جمع کر کے عثمانی فوج کے مقابل آگئے۔ کئی معرکوں کے بعد ایک بار پھر باغیوں کو پسپائی ہوئی۔ عثمانی افواج ان کا قلع قمع کرنے بلغراد کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں کہ یورپی ممالک پھر بیچ میں آ ٹپکے اور انہوں نے دھمکی دی کہ اگر عثمانیوں نے جنگ بند نہ کی تو یورپ کے تمام سفیر استنبول سے واپس بلا کر جنگ کا اعلان کر دیا جائے گا۔ آخر کار جنگ روک دی گئی۔

جس کے بعد اپریل ۱۸۷۷ء (ربیع الآخر ۱۲۹۴ھ) میں یورپی ممالک نے صلح کے لیے درج ذیل معاہدہ پیش کیا:

1. بلغاریہ کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے گا۔
2. دونوں حصوں کے حاکم نصرانی ہوں گے۔ ترک امراء کے پاس بعض بڑے شہروں کی قلعہ داری ہوگی۔
3. پولیس کے اہلکار نصرانی ہوں گے۔ ان کے افسران میں سے نصف مسلمان اور نصف نصرانی ہوں گے۔
4. یہی انتظامات بوسنیا اور ہرزگوینا میں بھی کیے جائیں گے۔
5. سلطنتِ عثمانیہ، سربیا اور جبل اسود کے بعض علاقوں سے دست بردار ہو جائے گی۔

سلطان عبدالحمید نے اس صلح نامے کو ٹھکرا دیا اور سربوں سے دوبارہ جنگ شروع کر دی اور یورپی طاقتوں کو معاملے سے باہر رکھتے ہوئے سربوں سے خود مذاکرات کیے جن کے مطابق طے ہوا کہ:

1. ترک افواج سربیا سے واپس چلی جائیں گی۔
2. سرب کوئی نیا قلعہ نہیں بنائیں گے۔
3. قلعوں پر سلطنتِ عثمانیہ اور سربیا دونوں کے پرچم لہرائے جائیں گے۔

اس دوران روس اور برطانیہ نے باقی یورپی دنیا کو ساتھ ملا کر لندن میں ایک کانفرنس بلائی جس میں ترکی سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ نصرانی شہریوں کی حالت بہتر بنانے، بلقان میں اصلاحات جاری کرنے، حاکم جبل اسود اور سربیا سے صلح کرنے اور سفیروں کو آزادی دینے کا وعدہ کرے۔ سلطان نے اس مطالبے کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ سلطنتِ عثمانیہ کے داخلی معاملات میں کسی غیر ملک کو دخل دینے کی اجازت نہیں۔ سلطنت میں سب کو بلا امتیاز حقوق دیے جا رہے ہیں، بلقان میں بدامنی کی وجہ یہی غیر ملکی مداخلت ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔[1]

روس کا حملہ، جنگِ کریمیا اور ترکی کی شکست:

سلطان عبدالحمید سے مایوس ہو جانے کے بعد زارِ روس الیگزنڈر دوئم نے رومانیا (افلاق و بغدان) کے نوابوں سے

---

[1] التاریخ الاسلامی، للدکتور محمود شاکر: ۸/۱۹۰

ان علاقوں کو اپنی حدود میں شامل کرنے کا خفیہ سمجھوتہ کر لیا۔ اس کے بعد اعلان کیا کہ لندن کانفرنس کا مطالبہ مسترد کر دینے کی وجہ سے ترکی سے تمام سیاسی روابط ختم کر کے جنگ شروع کی جارہی ہے۔

یوں ۲۴ اپریل ۱۸۷۷ء (۱۰ ربیع الآخر ۱۲۹۴ھ) کو روس اور ترکی کے مابین اس عظیم جنگ کا آغاز ہوا جسے تاریخ کی بڑی جنگوں میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔ روسی فوج کو اس جنگ میں نہ صرف عددی برتری حاصل تھی بلکہ اس کا مواصلاتی نظام بھی ترکی سے بہت بہتر تھا۔ البتہ اسلحے کی ساخت کے اعتبار سے فریقین میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ اعلانِ جنگ کے بعد ۲۱ جون (۹ جمادی الآخرہ) کو روسی افواج دریائے ڈینوب عبور کر کے رومانیا میں داخل ہو گئیں۔ زارِ روس الیگزنڈر دوئم خود لشکر کی کمان کر رہا تھا۔ اس کی افواج کی تعداد اڑھائی لاکھ تھی جن کے پاس ۸۰۰ توپیں تھیں۔

رومانیا کے حکام نے روسیوں کا خیر مقدم کیا اور ایک لاکھ سپاہیوں سمیت روس کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ یوں جنگ کی ابتدا ہی میں روس کا پلہ بھاری ہو گیا اور اس کی افواج رومانیا سے بلغاریہ تک پہنچ گئیں۔ ۷ جولائی (۲۵ جمادی الآخرہ) کو روس نے "تیرنوا" اور ۱۹ جولائی (۵ رجب) کو "نکوپول" پر بھی قبضہ کر لیا۔

روسی حملے کی بروقت معلومات پہنچانا، ویانا میں تعینات عمر رسیدہ ترک افسر عبدی پاشا کی ذمہ داری تھی مگر وہ بروقت صحیح اطلاعات نہ بھیج سکا، جس کی وجہ سے دور دراز کی سرحدوں پر پھیلی ہوئی عثمانی افواج کو مناسب مقامات پر پہنچ کر دشمن کی ناکہ بندی کرنے کا موقع نہیں ملا، بلکہ الٹا روسی افواج نے جگہ جگہ شاہراہوں اور دروں پر قبضہ کر کے ترک افواج کے لیے نقل و حرکت کو مشکل ترین بنا دیا۔ اس صورتحال کی ذمہ داری عبدی پاشا پر تھی جس کی وجہ سے اسے معزول کر دیا گیا۔ اس دوران ترک امیر جنرل عثمان پاشا ۵۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ "پلونہ" پہنچ گیا جہاں کوئی قلعہ نہیں تھا۔

عثمان پاشا نے دن رات ایک کر کے وہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا تاکہ روسی افواج کو بلقان کے پہاڑوں سے جنوب کی طرف بڑھنے سے روکا جائے۔ روسی جنرل شلیڈ، عثمان پاشا کا ارادہ بھانپ کر تیزی سے جنوب کی طرف بڑھا مگر ۲۰ جولائی (۹ رجب) کو عثمان پاشا نے اسے تقریباً تین ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

۳۰ جولائی (۱۹ رجب) کو جنرل کروڈنر نے پچاس ہزار سپاہیوں اور "۱۸۴" توپوں کے ساتھ عثمان پاشا کے خلاف ایک بڑا حملہ کیا مگر عثمان پاشا نے سات ہزار روسیوں کو موت کا جام پلا کر اس حملے کو بھی ناکام بنا دیا۔

عثمان پاشا پلونہ کے محاذ پر جاں توڑ لڑائی لڑتا رہا، پوری دنیا کی نگاہیں اس طرف مرکوز تھیں۔ ٹیلی گراف کے ذریعے پل پل کی خبریں ہر طرف پہنچ رہی تھیں۔ روس اور رومانیا کی مشترکہ ٹڈی دل افواج نے دو سمت سے عثمان پاشا کو گھیرا ہوا تھا۔ عثمان پاشا کو جنگ جیتنے کے لیے کمک کی سخت ضرورت تھی۔

ترک جرنیل سلیمان پاشا جو ۲۵ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اٹلی کے قریب تھا، اپنے بحری بیڑے کا لنگر اٹھا کر تیزی سے محاذ کی طرف آرہا تھا۔ ۷ دنوں میں وہ جنوبی ساحلوں کی آبنائے "شبقا" تک پہنچ گیا جس کے دونوں طرف عمودی پہاڑیاں تھیں۔ ۲۰ اگست ۱۸۷۷ء (۱۰ شعبان ۱۲۹۴ھ) کو جب وہ آبنائے میں داخل ہوا تو حریف دستے اسے روکنے

کے لیے گردونواح کی پہاڑیوں پر آگئے۔سلیمان پاشا ان کی گولیوں کی بوچھاڑ اور اپنے ساتھیوں کی گرتی لاشوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے موت کی اس سرنگ سے دیوانہ وار گزرتا رہا۔اس دوران ایک طرف سلطان عبدالحمید اور دوسری طرف زار الیگزنڈر ٹیلی گراف کے ذریعے مسلسل اس کی نقل وحرکت سے باخبر رہے۔اس سے پہلے کہ سلیمان پاشا آبنائے شبقا عبور کرتا، روسیوں نے آبنائے کی بحری ناکہ بندی کرلی۔

اُدھر شمال میں زار روس کا بھائی گرانڈوف نکولی ایک فوج لیے آرہا تھا۔ترک جرنیل علی پاشا نے ۳۰ اگست (۱۰ شعبان) کو "قبرمان" کی وادی میں اور ۵ ستمبر (۲۶ شعبان) کو قاچیلوفا کے میدانوں میں اسے پسپا کیا۔مگر روسیوں کو مسلسل کمک مل رہی تھی جبکہ ترکوں کی ہر فوج اپنی اپنی جگہ گھری ہوئی تھی۔اس لیے ۲۱ ستمبر (۱۳ رمضان) کی لڑائی میں علی پاشا کو شکست ہوگئی اور اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔

اس کے فوراً بعد زار روس اور اس کے بھائی کی فوجیں مل کر عثمان پاشا کے خلاف "پلونہ" کے محاذ پر جمع ہوگئیں۔اس دوران رومانیا کے ۵۰ ہزار سپاہی بھی ان کے ساتھ مل گئے۔یہ فوجیں ۴۸۰ توپوں کے ساتھ دن رات پلونہ کے قلعے پر گولہ باری کرتی رہیں۔عثمان پاشا کے پاس اس وقت ۳۰ ہزار سپاہی اور ۵۸ توپیں باقی تھیں۔

۱۱ ستمبر (۳ رمضان) کو روسی اور رومانوی افواج نے یہ یقین کرکے کہ اب عثمان پاشا کا دم لبوں پر ہے، پلونہ پر فیصلہ کن حملہ شروع کیا۔۱۲ گھنٹے کی اس جنگ میں ایک لمحے کے توقف کے بغیر توپوں کے دہانوں اور بندوقوں کی نالیوں سے آتش وآہن کی بارش ہوتی رہی۔اس تاریخی جنگ میں عثمان پاشا اور اس کے محصور ساتھیوں نے بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۱۵ ہزار سے زائد حریفوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اس حملے کو ناکام بنادیا۔"پلونہ" کی جنگ میں یہ عثمان پاشا کی تیسری فتح تھی جس پر سلطان عبدالحمید نے اسے "غازی" کا لقب دیا۔

۷ ستمبر (۹ رمضان) کو سلیمان پاشا نے ایک طوفانی حملہ کرکے آبنائے شبقا کا راستہ کھول کر دشمنوں کے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔

اگر عثمان پاشا کو سلیمان پاشا کی کمک مل جاتی تو اس محاذ پر حریف کو شکست دی جاسکتی تھی مگر سلیمان پاشا آبنائے شبقا پر اٹکا ہوا تھا جبکہ محاذ پر ۲۸ اکتوبر (۲۰ شوال) کو روسیوں کو مزید ۳۵ ہزار سپاہیوں کی مدد مل گئی۔نیز پلونہ کا قریبی شہر 'لوفچ' بھی دشمن کے ہاتھ آگیا جس کے بعد پلونہ تین طرف سے گھر گیا۔صرف جنوب مشرق میں صوفیہ کا راستہ کھلا بچ گیا تھا۔عثمان پاشا اس کے باوجود لڑتا رہا۔شہر کے مرد ہی نہیں عورتیں بھی اس جہاد میں شانہ بشانہ شریک تھیں۔بعض مواقع پر انہوں نے دشمن کے تین میں سے دو دفاعی خطوط توڑ ڈالے اور ان کی توپوں پر بھی قبضہ کرلیا۔عثمان پاشا خود حملوں میں شریک ہوتا رہا۔تاہم آخر میں عثمان پاشا کو پلونہ سے انخلاء کا فیصلہ کرنا پڑا۔

مگر جس رات وہ صوفیہ کی طرف نکلنے کی تیاری کررہا تھا، شہر کے ایک یہودی نے جاکر روسیوں کو اطلاع دے دی۔روسیوں نے فوراً پیش قدمی کرکے عثمان پاشا کا راستہ روک لیا۔یہاں ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں یہ مرد مجاہد شدید

زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ ہزاروں ترک سپاہی بھی قیدی بنے جنہیں بعد میں روسیوں نے قتل کر دیا۔ یوں چار ماہ ۲۳ دن کی جنگ کے بعد اس محاذ پر ترکوں کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ روسی جرنیل عثمان پاشا کی شجاعت پر حیران تھے، اس لیے زار روس کے بھائی نے اسے اس کی شمشیر واپس کر دی۔ زار روس نے بھی اس کی بہادری کا اعتراف کیا۔ دسمبر ۱۸۷۷ء (ذوالحجہ ۱۲۹۴ھ) میں اس غازی کو ماسکو بھیج دیا گیا۔

عثمان پاشا کے بعد بلقان کے محاذ پر کوئی ترک جرنیل روسیوں کے سامنے بند نہ باندھ سکا۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ محاذ پر موجود اعلیٰ فوجی افسران خصوصاً سلیمان پاشا اور رفعت پاشا کے درمیان ایک مدت سے شدید اختلافات تھے، جس کی وجہ سے وہ کسی بھی لائحہ عمل پر متفق نہ ہو سکے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ۳ جنوری ۱۸۷۸ء (۲۸ ذوالحجہ ۱۲۹۴ھ) کو روسی فوجیں آگے بڑھ کر بلغاریہ کے اہم شہر صوفیا پر بھی قابض ہو گئیں۔ یوں حریف کو بلقان میں روک لینے کی امیدیں بھی دم توڑ گئیں۔ بلغاریہ کے نصرانیوں نے روس کی مدد پا کر مسلمان شہریوں کا قتل عام شروع کر دیا جس کی وجہ سے بے شمار بلقانی مسلمان استنبول اور اناطولیہ کی طرف نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔

اس دوران اناطولیہ کے ان سرحدی قلعوں پر بھی جنگ ہو رہی تھی جہاں سے آرمینیا، کردستان اور قفقاز کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ اس محاذ پر نوجوان کمانڈر احمد مختار پاشا ۹۰ ہزار سپاہیوں اور ۷۹ توپوں کے ساتھ موجود تھا جس نے چند سال پہلے یمن کو فتح کیا تھا۔ اس نے ۲۱ جون ۱۸۷۷ء (۹ رجب ۱۲۹۴ھ) کو روسی جنرل "ترگوکاسوف" کو "حالیاز" کے میدان میں شکست دی۔ صرف چار دن بعد اس نے جنرل "میلن کوف" کو اسی طرح پسپا کیا۔

زار روس نے عاجز آ کر اپنے سب سے چھوٹے بھائی مارشل میخائل کو اس محاذ پر بھیجا مگر ۲۵ اگست (۱۵ شعبان) کی جنگ میں احمد مختار نے اسے بھی شکست فاش دی جس پر سلطان عبدالحمید نے اسے بھی "غازی" کے لقب سے نوازا۔ ۱۴ اکتوبر (۲۶ رمضان) کو "قفلیر" کے میدان ایک اور گھمسان کا معرکہ ہوا جس میں ۷۳ ہزار روسی سپاہیوں کے مقابلے میں ۳۴ ہزار ترک تھے۔ اس بار بھی نصرت الٰہیہ شامل حال رہی اور روسی دس ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگے۔ جبکہ اڑھائی ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

تاہم کچھ ہی دنوں بعد ماسکو سے بھاری کمک آ گئی اور ۱۵ اکتوبر (۷ شوال) کو روسیوں نے اڑھائی سو توپوں کے ساتھ پیش قدمی کر کے "آلاجاداغ" کی وادی میں احمد مختار کو شکست دے دی اور یکے بعد دیگرے قارص، باطوم اور بلافنا جیسے اہم ترین قلعوں کو سر کر لیا۔ احمد مختار پاشا باقی فوج کے ساتھ "ارضروم" کے ناقابل تسخیر قلعے میں محصور ہو گیا۔ روسیوں نے اسے گھیر کر حملے شروع کیے مگر قلعہ سر نہ ہو سکا۔

اُدھر صوفیا کو فتح کرنے والی روسی فوج تیزی سے ایڈریانوپل کی طرف بڑھی۔ احمد ایوب پاشا نے شہر کو تباہی سے بچانے کے لیے بلا مزاحمت وہاں سے فوج نکال لی اور ۲۰ جنوری ۱۸۷۸ء (۱۶ محرم ۱۲۹۵ھ) کو روسی اس پر بھی قابض

ہوگئے۔ اس کے بعد روسی فوج پیش قدمی کر کے استنبول سے صرف پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر آگئی۔

سلطان عبدالحمید نے ان حالات میں مجبور ہو کر روس کو مذاکرات کا عندیہ دیا اور اس کے لیے بحیرۂ اسود کھول دینے کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ اس جنگ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ روس کو استنبول کے قریب تر دیکھ کر اس نے اپنے بحری بیڑے کو خلیج باسفورس میں داخل کر کے روسی فوج کی راہ میں کھڑا کر دیا تا کہ روس استنبول کا تن تنہا فاتح نہ بن سکے۔ برطانیہ کو خدشہ تھا کہ گرم سمندروں کے اس چوراہے پر اجارہ داری قائم کرنے کے بعد روس دنیا کے کسی بھی ملک پر دھاوا بولنے اور اس کی تجارت مسدود کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

روسی افواج کی ان فتوحات کے دوران سربیا کا نصرانی حاکم ،زار روس سے مل کر ترکی کے خلاف جنگ کا معاہدہ کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نے سربیا میں اعلانِ بغاوت کر دیا اور جبلِ اسود کے نصرانی بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ یونان نے بھی موقع غنیمت سمجھا اور اعلانِ جنگ کیے بغیر ۲ فروری ۱۸۷۸ء (۲۹ محرم ۱۲۹۵ھ) کو اپنی افواج ”تیسالیا“ میں داخل کر دیں۔[1]

پارلیمان کی تعطیل:

روس سے شکست کے باوجود سلطان کسی کمزور معاہدے کے حق میں نہ تھا۔ اسے ضروری محسوس ہوا کہ اس سے پہلے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے جائیں اور ملک کو شخصی حکومت کے طرز پر چلایا جائے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ پارلیمان کے بہت سے ارکان شرعی قوانین کے مخالف ،علاقائیت و لسانیت کے مریض، سطحی سوچ کے حامل اور یورپ کے زیرِ اثر ہیں۔ وہ رموزِ سیاست اور جمہوری اقدار سے بھی ناواقف ہیں۔ نیز ان میں عداوتیں اور اختلافات اس قدر ہیں کہ وہ کسی موثر حکمتِ عملی پر متفق نہیں ہو پاتے۔ لہٰذا سلطان نے ۱۳ فروری ۱۸۷۸ء (۱۰ صفر ۱۲۹۵ھ) کو پارلیمان کو جسے تشکیل پائے تقریباً چودہ ماہ گزرے تھے، غیر معینہ مدت کے لیے معطل کر دیا۔ پارلیمان اس کے بعد تقریباً ساڑھے ۳۰ برس تک معطل رہی۔ اس لیے اکثر صحافی اور مؤرخین اس دور کو ”دورِ استبداد“ کہہ کر یاد کرتے ہیں۔[2]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان نے نیم جان سلطنتِ عثمانیہ کو ۳۰ برس زندگی مزید بخشی تھی۔ اگر سلطان نہ ہوتا تو انیسویں صدی عیسوی ہی میں ترکی کا وہ حشر ہو جاتا جو پہلی عالمی جنگ کے بعد ہوا تھا۔ سلطان پہلا حکمران نہیں جس نے پارلیمان توڑی ہو۔ بلکہ اس سے پہلے اور بعد میں ایسے درجنوں واقعات پیش آئے۔ جرمنی کا حکمران وون بسمارک، جو جرمنی کو متحد کر کے ایک بڑی طاقت بنانے کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے، سلطان عبدالحمید کا معاصر تھا۔ اس نے پارلیمان توڑ کر کہا تھا:

”اگر قومی نمائندے ایک ذہن نہ رکھتے ہوں تو ایسی پارلیمان کا نقصان، اس کے فوائد سے کہیں زیادہ ہے۔“[3]

---

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/ ۱۹۰ تا ۱۹۲؛ الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النھوض و اسباب السقوط للصلابی: ص ۳۱۰، ۳۱۱؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۲/ ۱۱۰ تا ۱۱۵

[2] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/ ۱۹۷، ۱۹۸؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از یلماز اوزتونا: ۲/ ۱۱۶

[3] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۲/ ۱۱۸

سلطان عبدالحمید بنیادی طور پر جمہوری نظام کا مخالف نہیں تھا مگر وہ اس نظام کے ذریعے یورپی ممالک کے معتمد اور حمایت یافتہ لوگوں کے پارلیمان میں پہنچ کر قومی فیصلوں پر حاوی ہو جانے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ میں انتخابات کے ذریعے ملک وملت کے بہی خواہ، اقتدار میں آتے تو سلطان عبدالحمید کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر یورپی ممالک خصوصاً فرانس اور برطانیہ سلطنتِ عثمانیہ پر فکری، نظریاتی وتہذیبی یلغار کر کے جس جمہوریت کی پرورش کر رہے تھے، وہ انہی کے سیاسی واقتصادی وتزویراتی مقاصد کے لیے کار آمد تھی نہ کہ مسلمانوں کے لیے۔

قرارداد وسان اسٹیفانوس اور میثاق برلن:

روس سے جنگ بند ہو چکی تھی اور برطانیہ کے دباؤ پر روس ترکی سے مذاکرات پر بھی آمادہ ہو گیا۔ بحیرہ مارمورا کے ایک شہر سان اسٹیفانوس میں ترکی اور روس کے نمائندے جمع ہوئے۔ روس نے اپنی شرائط پیش کر کے دھمکی دی کہ اگر انہیں من وعن نہ قبول کیا گیا تو وہ استنبول پر حملہ کر دے گا۔ صلح کی اہم شرائط یہ تھیں:

❶ جبل اسود کی حد بندی کر کے اسے مستقل ریاست قرار دیا جائے گا۔ آئندہ اس ریاست کے کسی بھی مسئلے کو روس اور آسٹریا مل کر طے کریں گے۔

❷ سربیا کو مزید علاقے دے کر ایک مستقل ریاست مانا جائے گا۔ اس کی حد بندی روس کی نگرانی میں ہوگی۔

❸ بلغاریہ کو مستقل ریاست تسلیم کیا جائے گا۔ وہ ایک طے شدہ محصول ترکی کو ادا کرے گا۔ اس کے حکومتی عہدے دار اور سپاہی نصرانی ہوں گے۔ ترکی اور روس مل کر اس کی حد بندی کریں گے۔ وہاں کا حاکم مقامی ہوگا۔ ترکی اپنی فوج ہمیشہ کے لیے بلغاریہ سے نکال لے گا۔

❹ رومانیا کو مستقل ریاست مانا جائے گا۔

❺ ترکی، آرمینیا، کردستان اور چرکس کے نصرانیوں کی حمایت کا پابند ہوگا۔

❻ ترکی، جزیرہ کریٹ کے نصرانیوں کی حالت بہتر بنائے گا۔

❼ ترکی جنگ کے تاوان کے طور پر ۲۴ کروڑ ۳۱ لاکھ ہزار طلائی لیرے ادا کرے گا۔

❽ اگر یہ رقم پوری ادا نہ کی جا سکی تو روس اس کی مالیت کے بدلے ترکی کی زمین پر قبضہ کرے گا۔

❾ درۂ دانیال سمیت تمام خلیجی دہانے روس کے لیے جنگ اور امن ہر حال میں کھلے رہیں گے۔

❿ سلطنتِ عثمانیہ سے قطع کیے جانے والے علاقوں کے مسلمان اپنی زمینیں فروخت کر کے ترکی کے کسی بھی حصے میں جا سکتے ہیں۔

۳ مارچ ۱۸۷۸ء (۲۸ صفر ۱۲۹۵ھ) کو سان اسٹیفانوس میں روس نے معاہدے کا مسودہ ترک نمائندوں: صفوت پاشا اور سعد اللہ بیگ کو پیش کیا جنہوں نے اشک آلود نگاہوں سے یہ تحریر پڑھی اور اس پر دستخط کر دیے۔

مگر سلطان عبدالحمید نے اس معاہدے کو سلطنتِ عثمانیہ کے لیے موت کے مترادف سمجھا۔ چونکہ اس کی توثیق سے

قبل معاہدے کو قانونی حیثیت نہیں مل سکتی تھی لہٰذا اس نے معاہدے کی توثیق سے قبل خفیہ طور پر برطانیہ سے رابطہ کیا جو روس کی اس حد تک بالادستی کو اپنے عالمگیر عزائم کے لیے نقصان دہ سمجھتا تھا۔

برطانوی نمائندوں نے ترکی کی مدد کے بدلے جزیرۂ قبرص پر اپنا بحری اڈہ بنانے کی اجازت مانگی۔ سلطان عبدالحمید نے مجبوراً اسے قبول کر لیا مگر ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ جب روس، استنبول کے دفاعی قلعوں باطوم اور قارص سے انخلاء کر دے تو برطانوی بحریہ بھی قبرص خالی کر دے گی۔ اس کے بعد ترکی اور برطانیہ میں یہ خفیہ معاہدہ طے پا گیا کہ اگر روس نے استنبول پر قابض ہونے کی کوشش کی تو برطانوی فوج اسے روکے گی۔

برطانیہ نے ترکی سے یہ خفیہ معاہدہ کر کے باقی یورپی ممالک کو ساتھ ملایا اور سب نے طے کیا کہ دم توڑتے ترکی کی حالت سے سب مل کر فائدہ اٹھائیں۔ تنہا روس کو یہ ضیافت ہڑپ نہ کرنے دیں۔

اس کے بعد برطانیہ نے یورپی دنیا کی ترجمانی کرتے ہوئے روس پر زور دینا شروع کر دیا کہ وہ صلح کی شرائط کو دولِ یورپ کے حسبِ منشا تبدیل کرے۔ اس دوران بلغاریہ کے مسلمانوں نے روسی افواج پر چھاپہ مار حملے شروع کر دیے تھے جس سے روسیوں کا ناطقہ بند ہونے لگا تھا۔ چنانچہ روس نے دوبارہ مذاکرات پر آمادگی ظاہر کر دی جس کے نتیجے میں برلن میں درج ذیل معاہدہ عمل میں آیا:

1. بلغاریہ کو خود مختاری دی جائے گی۔ اس کی شرقاً غرباً حد بندی میں سربوں کی اور شمالاً جنوباً حد بندی میں ترکی کی مصلحتوں کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ چنانچہ بحیرۂ ایجی کا شمالی حصہ ترکی کے پاس رہے گا۔ جنوبی بلقان کو "رومیلی شرقی" کا نام دے کر سیاسی اور عسکری لحاظ سے ترکی کی ماتحت ریاست مانا جائے گا جس کا امیر نصرانی ہوگا جسے معاہدے میں شریک تمام ممالک کے اتفاقِ رائے سے پانچ سال کے لیے چنا جائے گا۔ بلغاریہ میں روس کی پچاس ہزار فوج باقی رہے گی۔
2. بوسنیا اور ہرزگووینا، آسٹریا کی ماتحت ریاستیں قرار پائیں گی۔
3. اگرچہ یونان کا اس قضیے سے کوئی تعلق نہیں مگر شمال کی طرف اسے "تیسالیا" کا علاقہ دیا جائے گا۔
4. "بسارابیا" کو رومانیہ سے الگ کر کے روس کا حصہ مانا جائے گا۔
5. رومانیا کو کچھ جزیرے دے دیے جائیں گے۔
6. آرمینیا کے نصرانیوں کو داخلی آزادی اور تمام مراعات دی جائیں گی، دولِ یورپ اس کا جائزہ لیتی رہیں گی۔

معاہدۂ برلن ۱۳ جولائی ۱۸۷۸ء (۱۲ رجب ۱۲۹۵ھ) کو طے پایا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں ترکی اپنے یورپی مقبوضات میں رومانیا، دوبرجہ، سربیا، نیش، قرہ داغ، تیسالیا اور بوجاق سے محروم ہو گیا۔ یہ مجموعی طور پر دو لاکھ ستر ہزار مربع کلو میٹر سے زائد رقبہ تھا جس میں ۸۷ لاکھ سے زائد نفوس آباد تھے۔[1]

---

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۹۳/۸ تا ۹۵؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از یلماز اوزتونا: ۱۹/۲ تا ۲۵

میثاقِ برلن کے اثرات:

میثاقِ برلن کو ہم ۱۶۹۹ء (۱۱۱۰ھ) کے میثاقِ کارلوفش اور ۱۹۱۳ء کے میثاقِ لندن کی درمیانی کڑی کہہ سکتے ہیں۔ میثاقِ کارلوفش میں پہلی بار ترکی کو یورپ کے بعض حصوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ معاہدۂ برلن میں اسے مزید پسپائی ہوئی اور معاہدۂ لندن نے اسے بلقان سے بالکل محروم کردیا۔ اس کے باوجود اگر دیکھا جائے تو سلطان عبدالحمید نے جو کیا، ان حالات میں اس سے بہتر کچھ اور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے معاہدۂ سان اسٹیفانوس کی جگہ میثاقِ برلن اپنا کر غیر معمولی سیاسی مہارت کا ثبوت دیا تھا اور میدانِ جنگ پر پوری طرح چھائے ہوئے روس کو مذاکرات کی میز پر بڑی حد تک پسپا کردیا تھا کیوں کہ برلن معاہدے کے مطابق بے پناہ جانی ومالی توانائی خرچ کرکے بھی روس کو "بسار بیا" کے علاقے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ ترکی جو نہ صرف پورے بلقان سے محروم ہو چکا تھا بلکہ اس کا دارالحکومت بھی خطرے میں تھا، مرتے مرتے بچ گیا۔ بلقان میں رومانیا، سربیا اور قرہ داغ مکمل طور پر آزاد ہوگئے اور باقی ریاستوں کو بھی داخلی طور پر مزید آزادیاں مل گئیں مگر قانونی لحاظ سے بلقان مزید ۳۵ برس تک ترکی کا حصہ رہا۔

برطانوی ایماء پر استنبول میں بغاوت کی ناکام کوشش:

روس سے جنگ میں بیچ بچاؤ کراتے ہوئے، برطانوی انٹیلی جنس سروس کے اہلکار مختلف شکلوں میں سلطنتِ عثمانیہ کے اندر سرگرم ہو چکے تھے اور مداخلت کے مواقع مسلسل تلاش کر رہے تھے۔ جدت پسند ترک صحافی علی سعاوی ان کا اہم ترین ایجنٹ تھا جس نے لندن کی ایک حسین وجمیل لڑکی ماریہ سے شادی کی تھی۔

ان دنوں بلقان سے بے شمار لوگ نقل مکانی کرکے استنبول میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ برطانوی انٹیلی جنس نے علی سعاوی کو آمادہ کرلیا کہ وہ ان پناہ گزینوں کے ذریعے بغاوت کرادے جس کے بعد سلطان عبدالحمید کی جگہ اس کے بھائی مراد خامس کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔ علی سعاوی نے پناہ گزینوں کو سلطان عبدالحمید کے خلاف بری طرح بھڑکایا اور ان میں رقم تقسیم کرکے انہیں "قصر چراغاں" پر حملے کے لیے تیار کرلیا جہاں مراد خامس نظر بند تھا۔

۲۰ مئی ۱۸۷۸ء (۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۵ھ) کو علی سعاوی پناہ گزینوں کی قیادت کرتا ہوا قصر چراغاں پہنچا۔ محل کے اکثر محافظ پہلے ہی بکے ہوئے تھے اس لیے کسی مزاحمت کے بغیر ہجوم قصر میں داخل ہوگیا تاکہ مراد خامس کو نکال کر اس کی بادشاہت کا اعلان کردیا جائے۔ تاہم سلطان کے بعض وفادار اہلکاروں نے مزاحمت بھی کی۔ اسی دوران ایک لاٹھی علی السعاوی کے سر پر اس زور سے پڑی کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ سرکاری فوج نے دو گھنٹے کی کوشش کے بعد مجمعے کو منتشر کردیا۔ اس دار و گیر میں مزید ۲۳ باغی ہلاک اور ۱۵ زخمی بھی ہوئے۔

سلطان عبدالحمید کو یقین ہو چلا تھا کہ مراد خامس کو آئندہ بھی بغاوتوں کا عنوان بنایا جاتا رہے گا۔ لہٰذا بغاوت پر قابو پانے کے بعد اسے بھی سزائے موت دے دی گئی۔ دنیا نے اس اقدام کو ظلم عظیم قرار دیا مگر اس سے کہیں زیادہ

شور شرابا علی سعاوی کی ہلاکت پر کیا گیا کیوں کہ وہ ایک مشہور صحافی تھا۔ سلطان کے دورِ حکومت کے تیس سالوں میں اس کے خلاف تقریروں اور تحریروں میں اس واقعے کو "سانحہ علی سعاوی" کے نام سے دہرایا جاتا رہا۔

اس واقعے کا آخری منظر یہ تھا کہ سعاوی کی انگریز بیوی ماریا نے بغاوت کی ناکامی کی اطلاع ملتے ہی اپنے شوہر کے تمام خفیہ کاغذات جلا ڈالے اور تیزی سے قریبی بندرگاہ پہنچ گئی جہاں ایک کشتی پہلے سے اس کی منتظر تھی۔

سلطان عبدالحمید نے اسے بہت تلاش کرایا مگر وہ لندن پہنچ چکی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ برطانوی انٹیلی جنس کی جاسوسہ تھی اور اس بغاوت میں اس کا اہم کردار تھا۔ بعد میں تحقیقات سے پتا چلا کہ اس بغاوت میں صدرِ اعظم صادق پاشا کا بھی ہاتھ تھا جسے کچھ ہی عرصے پہلے برطانیہ کی سفارش پر یہ منصب دیا گیا تھا۔ سلطان کو برطانیہ کی سفارش اس لیے قبول کرنا پڑی تھی کہ اس وقت برطانیہ کے بغیر روس سے جنگ بندی کی کوئی صورت ممکن نہیں تھی۔[1]

شعبہ مخابرات کا قیام:

سلطان عبدالحمید نے جب قدم قدم پر دشمنوں کا جال پھیلا دیکھا تو دوست اور دشمن میں پہچان کے لیے ایک خفیہ محکمہ قائم کیا جسے "مخابرات" کا نام دیا گیا۔ اس کا سارا انتظام سلطان کے پاس تھا۔ سلطان نے اس کے ذریعے محل کے اندر و باہر سے لے کر قومی و بین الاقوامی معاملات تک کی خفیہ خبریں حاصل کرنا شروع کردیں جس کی وجہ سے حیرت انگیز حقائق سامنے آنے لگے۔ پتا چلا کہ آوے کا آوا ہی بگڑ چکا ہے۔ اس صورتحال پر سلطان کا تبصرہ یہ تھا:

"میرے دادا سلطان سلیم ثالث فرماتے تھے کہ اغیار کے ہاتھ میرے جگر پر ہیں۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کے ہاتھ میرے جگر کے اندر ہیں، وہ ہمارے صدرِ اعظم اور وزیروں تک کو خرید چکے ہیں۔"[2]

سلطان عبدالحمید کا مقصد ان اطلاعات کی بناء پر ملک کو دشمن کے ایجنٹوں سے پاک کرنا تھا مگر اس کے باوجود وہ سزا دینے میں محتاط تھا، اس کا کہنا تھا: "جاسوسوں میں سے بھی مخلص اور جھوٹے اہلکاروں کی پہچان ضروری ہے۔ اسی لیے میں کسی بھی خبر پر تحقیق و تفتیش کیے بغیر یقین نہیں کرتا۔"

"مخابرات" کے ذریعے سلطان دشمنوں کی کسی بھی سازش کا بروقت تدارک کرنے کے قابل ہوگیا۔ اس نے اپنے باقی دور میں اکثر بغاوتوں کو کچل ڈالا اور کسی خانہ جنگی کو پنپنے نہیں دیا۔ ہاں وہ عالمی طاقتوں کے ذرائع ابلاغ سے پھیلائے جانے والے اس پروپیگنڈے کا توڑ نہیں کرسکا جس میں اس کی مسلسل کردار کشی کی جا رہی تھی۔[3]

مدحت پاشا کا انجام:

سلطان نے سازشوں کی بیخ کنی کے حوالے سے مدحت پاشا کے خلاف بھی ثبوت حاصل کیے۔ ۱۸۸۱ء میں اسے

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از یلماز اوزتونا: ۲/ ۱۲۹ تا ۱۳۱

② الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۲۰۶

③ الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۲۰۷، ۲۰۸

تمام سرکاری ذمہ داریوں سے معزول کر کے حراست میں لے لیا گیا۔ تفتیش کے نتیجے میں اس پر نہ صرف غیر ممالک سے گٹھ جوڑ بلکہ سابق سلطان عبدالعزیز کے قتل کا الزام بھی ثابت ہو گیا۔ عدالت نے ۲۸ جولائی ۱۸۸۱ء (۲۹ شعبان ۱۲۹۸ھ) کو اسے موت کی سزا سنا دی۔

مگر مدحت پاشا کے برطانوی وزیر اعظم ڈزرائیلی سے گہرے مراسم تھے جس نے درمیان میں پڑ کر سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرا دیا۔ اس کے بعد عالمی صحافت مدحت پاشا کی رہائی کے لیے یک زبان ہو گئی۔ اسے "بطل حریت" اور "بابائے جمہوریت" کے القاب سے مشہور کیا گیا اور سلطان عبدالحمید کی مسلسل کردار کشی کی گئی۔

عالمی دباؤ کے نتیجے میں مدحت پاشا کی سزا میں مزید تخفیف کر دی گئی۔ اسے تمام سہولیات فراہم کر کے طائف کے ایک قلعے میں نظر بند کر دیا گیا جہاں وہ اپنی "آپ بیتی" تحریر کرتا رہا۔ ساتھ ہی وہ انقلاب کے لیے سوچ بچار کر رہا تھا۔ دوسری طرف برطانوی انٹیلی جنس اسے رہا کرانے کے لیے سرگرداں تھی۔ ان کی ایک ٹیم عربوں کے بھیس میں طائف پہنچ چکی تھی مگر سلطان کے جاسوسوں نے عین وقت پر ان میں سے ایک انگریز کو پکڑ لیا جس نے سارا منصوبہ اگل دیا۔

چونکہ مدحت پاشا کا زندہ رہنا، اب مملکت کے لیے کسی بہت بڑی بغاوت کا سبب بن سکتا تھا، اس لیے برطانوی جاسوس کی گرفتاری کے فوراً بعد ۶ مئی ۱۸۸۴ء (۱۰ جولائی ۱۳۰۱ھ) کو عثمانی سپاہیوں نے مدحت پاشا کو اس کے کمرے میں گھس کر قتل کر دیا۔[1]

یہ واضح نہیں کہ مدحت پاشا کے قتل کا حکم کس نے دیا تھا؟ بہر کیف یہ حکم سلطان کا نہیں تھا۔ سلطان نے اس الزام کی پرزور نفی کی تھی۔ سلطان کا کہنا تھا: "میری رائے یہی تھی کہ ایسے معروف و مشہور شخص کو سزائے موت نہ دی جائے۔ مدحت پاشا کو شہداء کی صف میں شامل کر کے مجھے کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟"[2]

قطع نظر اس کے کہ مقامی افسران نے اپنے طور پر یہ قدم اٹھایا تھا یا کسی نے انہیں اس کی ہدایت کی تھی؟ بہر کیف یوں فری میسن کا یہ نمائندہ ایک عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا۔

تیونس، مصر اور سوڈان پر استعماری طاقتوں کا قبضہ

اس دور میں فرانس اور جرمنی باہم جنگ میں مشغول ہونے کی وجہ سے اس قضیے سے الگ رہے تھے۔ لہٰذا انہیں اس معاہدے میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ فرانس اس بندر بانٹ میں حصہ داری سے محروم رہ کر سخت برافروختہ تھا۔ چنانچہ اس نے عالم اسلام کی تقسیم و تحلیل کے کھیل میں اپنا حصہ بٹورنے کے لیے عجیب بہانہ گھڑا۔ اس نے اعلان کیا کہ تیونس کے لوگ الجزائر میں فرانسیسی فوجیوں پر حملوں میں ملوث ہیں، لہٰذا قیام امن کے لیے تیونس پر قبضہ کرنا فرانس کا حق

---

① التاریخ الاسلامی للدکتور محمود شاکر: ۱۸۹/۸ تا ۱۹۲ مع حاشیہ، تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱۲۷/۲

② مذکرات سلطان عبدالحمید الثانی از محمد حرب: ص ۷۷، ۷۸

ہے۔اس کے بعد مئی ۱۸۸۱ء (جمادی الآخرہ ۱۲۹۸ھ) میں تیس ہزار فرانسیسی فوج تیونس کے ساحل پر اتر پڑی۔

تیونس کے بائی خانوادے کے حکام کو، جو سلطنتِ عثمانیہ سے الحاق رکھتے تھے، مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے ملک میں فرانسیسی فوج کی تعیناتی کو ایک معاہدے کے ذریعے قانونی شکل دیں۔ یہ معاہدہ ہوتے ہی یورپی ممالک نے بھی اس کی توثیق کر دی۔ یوں الجزائر کے سقوط سے صرف نصف صدی بعد تیونس بھی خلافت کے ہاتھ سے نکل گیا۔

خلیفہ عبدالحمید نے مرکز کی کمزوری کے باوجود تیونس کے دفاع کے لیے بحری اور بری افواج روانہ کر دیں جس کے بعد فرانس اور ترکی میں جنگ چھڑنا یقینی ہو گیا۔ ایسے میں جرمنی نے جس کی فرانس سے سخت دشمنی چل رہی تھی، پہلی بار ترکی سے دوستانہ تعلقات بنائے اور خلیفہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی فوجیں ایک دور دراز کے محاذ پر ضائع کر کے مرکز کو کمزور نہ کرے، بلکہ مذاکرات کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرائے۔ چنانچہ اس بیڑے کو راستے سے واپس بلا لیا گیا۔ اس کے باوجود بابِ عالی نے تیونس پر فرانس کے قبضے کو کبھی قبول نہیں کیا بلکہ اسے غاصبانہ حیثیت ہی دی۔[1]

مصر کا سقوط:

محمد علی پاشا نے اپنی اولاد کو جو عظیم الشان مصر دیا تھا، وہ سوڈان، اریٹیریا اور یوگنڈا تک وسیع تھا۔ یہ ملک معاہدے کے لحاظ سے بابِ عالی سے ملحق تھا مگر بابِ عالی کو اس سے کچھ بھی مدد نہیں مل رہی تھی۔ برطانیہ ترکی سے قبرص ہتھیانے کے بعد اپنی حریصانہ نگاہیں مصر پر جما چکا تھا، جہاں اب محمد علی پاشا کا بیٹا خدیو اسماعیل حکمران تھا۔ الجزائر پر فرانس کے قبضے کے بعد برطانیہ کے نزدیک بحیرۂ روم میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے کے لیے مصر پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔

مصر کو خدیو اسماعیل کی فضول خرچی نے یورپ کا مقروض بنا رکھا تھا۔ خصوصاً نہر سویز کی کھدائی کے لیے برطانیہ سے بے پناہ قرض لیا گیا تھا۔ دس سالوں میں لیے گئے قرضوں کی مقدار مجموعی طور پر ۱۰۰ ملین لیروں سے بڑھ چکی تھی۔ فرانس اور برطانیہ کی طرف سے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ سخت تر ہوا تو خدیو اسماعیل نے نہر سویز کی ملکیت کی فائلیں قرض خواہوں کے حوالے کر دیں۔ اس کے باوجود اس کے قرضے معاف نہیں کیے گئے۔

۲۵ جولائی ۱۸۷۹ء (۵ شعبان ۱۲۹۶ھ) کو برطانیہ کے ایماء پر خدیو اسماعیل کا تخت الٹ دیا گیا اور اس کے بیٹے خدیو توفیق کو تخت پر بٹھایا گیا جس پر برطانیہ اور بابِ عالی دونوں متفق تھے۔ اس دوران برطانیہ کے دباؤ پر مصر کے دو تہائی سپاہیوں اور اڑھائی ہزار فوجی افسران کو فارغ کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ عرب تھے۔ اعلیٰ افسران میں سے احمد اعرابی نے یہ احکام ماننے سے انکار کر دیا۔ ہر طرف یہ نعرہ لگنے لگا کہ مصر مصریوں کا ہے۔ یوں مصر میں ترکوں اور عربوں کی کش مکش بڑھ گئی۔ خلیفہ نے ٹیلی گراف کے ذریعے رابطہ کر کے احمد اعرابی کی سرپرستی قبول کر لی اور اسے "پاشا" کا لقب بخشا مگر مصر میں نسلی منافرت کا اٹھنے والا شعلہ نہ بجھ سکا۔

---

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۹۳/۸؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱۳۳/۲، ۱۳۲
۱۹۲۳ء کے معاہدہ لوزان میں جا کر ترکی نے تیونس سے علیحدگی کو سرکاری طور پر منظور کیا۔

برطانیہ اور فرانس دونوں کے لیے مصر پر قبضے کا یہ بہترین موقع تھا مگر انہوں نے فوجی مداخلت سے اس لیے گریز کیا کہ اس طرح مصر پر قبضے کی کوشش میں دونوں ملک باہم ٹکرا جاتے۔ غیر متوقع طور پر انہوں نے خلیفہ کو پیش کش کی کہ وہ فوج بھیج کر مصر کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ترکی ایک نئے محاذ پر مشغول ہو جائے کیوں کہ مصر میں مصری قومیت کے نعرے نے جو ہیجان پیدا کیا تھا، اس کے بعد ترک فوج کا یہاں ہرگز استقبال نہ ہوتا۔

خلیفہ اس سے واقف تھا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ مصر درحقیقت برطانیہ ہی کے قبضے میں ہے۔ وہاں جو بھی حکومت آئے گی صرف رسمی ہوگی اور ۱۰۰ ملین لیرے قرضہ اسے کبھی مضبوط نہیں ہونے دے گا۔ لہٰذا خلیفہ نے دور اندیشی سے کام لے کر وہاں فوج کشی سے احتراز کیا۔ مصر میں اب تمام کنٹرول احمد اعرابی کے ہاتھ میں تھا۔ برطانیہ نے اسے زیادہ موقع نہیں دیا بلکہ جولائی ۱۸۸۲ء (شعبان ۱۲۹۹ھ) میں اپنی بحری فوج اسکندریہ میں اتار دی۔ پھر ۱۳ ستمبر (۲۸ شوال) کے معرکے میں انگریزوں نے احمد اعرابی کو شکستِ فاش دے کر مصر کو اپنے قبضے میں لے لیا۔[1]

سوڈان:

سوڈان سمیت مشرقی افریقہ کے کئی ممالک سلطنتِ عثمانیہ کے دور میں مصر کے ذیلی صوبے مانے جاتے تھے۔ مصر پر قابض ہونے کے باعث برطانیہ سوڈان اور مشرقی افریقہ کے ان تمام علاقوں کو اپنی جاگیر سمجھ کر وہاں قبضے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ تاہم مہدی سوڈانی نے استعمار کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کر کے تقریباً پورے سوڈان کو بازیاب کرا لیا۔ کچھ عرصے تک مہدی سوڈانی کو فتوحات نصیب ہوتی رہیں۔ مگر آخر میں برطانیہ نے خدیو مصر کی افواج کو ساتھ ملا کر مہدی سوڈانی کو قوت کو پاش پاش کر دیا۔ اس کے بعد مشرقی افریقہ کے ممالک کو برطانیہ، فرانس، اٹلی اور حبشہ نے باہم تقسیم کر لیا۔ یوں تمام یورپی طاقتوں نے سلطنتِ عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہڑپ کرنے کا اہم مرحلہ مکمل کر لیا۔ اس کے بعد یورپی طاقتیں افریقہ کے اسلامی ممالک میں خانہ جنگی کو ہوا دیتی رہیں تاکہ وہ کبھی متحد ہو کر ان کے لیے خطرہ نہ بن سکیں۔[2]

آرمینیا، کردستان اور یمن کی بغاوت:

آرمینیا دس لاکھ نفوس پر مشتمل سلطنتِ عثمانیہ کی اہم ریاست تھی جہاں بیشتر آبادی آرتھوڈکس نصرانیوں کی تھی۔ ان نصرانیوں کو ہر طرح کی سہولیات اور حقوق میسر تھے۔ مذہبی، اقتصادی اور تعلیمی آزادی حاصل تھی۔ مگر روس اور برطانیہ دونوں وہاں پاؤں جمانے کی تگ و دو میں تھے۔

۱۸۸۶ء (۱۳۰۳ھ) میں چند شدت پسند ارمنوں نے سوئزرلینڈ میں ایک دہشت گرد جماعت ''ہنچاک'' کی داغ بیل ڈالی جس کا مقصد ارمنی علاقوں سے مسلمانوں کو بالکل بے دخل کرنا تھا۔ اس تنظیم کے کارکن موقع ملتے ہی

---

① تاريخ الدولة العثمانية للأ يلماز اوزتونا: ۲/۱۳۳ تا ۱۳۶

② التاريخ الاسلامي لدكتور محمود شاكر: ۸/۱۹۳ تا ۱۹۷

مسلمانوں کی آبادیوں میں گھس جاتے، مساجد، مدارس اور خانقاہوں کو نذر آتش کر دیتے۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کرنا، حاملہ خواتین کے شکم چاک کرنا اور زندہ انسانوں کو سلاخوں میں پرو کر لٹکانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

اس دہشت گردی کے پیچھے مغربی ممالک کی ہلہ شیری تھی۔ روس آرمینیا سے عثمانیوں کے قدم اکھاڑ کر وہاں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر کے خلیج بصرہ تک پہنچنا چاہتا تھا جبکہ برطانیہ وہاں اپنی من پسند حکومت بنا کر روس کو خلیج بصرہ سے پہلے روکنا ضروری سمجھتا تھا۔ اسی لیے معاہدۂ برلن میں ایک شق یہ رکھی گئی تھی کہ آرمینیا کو داخلی آزادی دے دی جائے۔

مگر سلطان عبدالحمید نے اس پر عمل درآمد کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ میں اسے ماننے پر موت کو ترجیح دوں گا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آرمینیا کے ہاتھ سے نکلنے کی صورت میں خود اناطولیہ مشرق اور شمال کی طرف سے غیر محفوظ ہو جاتا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ آرمینیا میں آزادی کے بعد وہاں نصرانیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی جان و مال اور عزت پامال ہونا یقینی تھا۔ چنانچہ سلطان نے روس اور برطانیہ کے اصرار کے باوجود، ہنگری اور آسٹریا کو ہمنوا بنا کر اس شق سے استثناء حاصل کر لیا۔

اس کے بعد عالمی طاقتوں نے آرمینیا میں بغاوت کے شعلے مزید بھڑکا کر اسے ترکی سے الگ کرنا چاہا۔ سلطان نے اس بغاوت کی روک تھام کے لیے نہ صرف جنرل زکی پاشا کی قیادت میں "فورتھ آرمی کور" کو، جس کا مرکز اناطولیہ تھا، متحرک کیا بلکہ کردستان کے جنگجو مسلم نوجوانوں کی ایک الگ فوج تیار کی جسے "الخیالۃ الحمیدیۃ" (حمیدی شہ سوار) کا نام دیا گیا۔ اس فوج نے جگہ جگہ ارمن باغیوں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔

برطانیہ اور فرانس کے اخبارات نے ان کارروائیوں کو نصرانیوں کے قتل عام سے تعبیر کیا۔ یورپ میں ایک تہلکہ مچ گیا اور سلطان عبدالحمید کو "السلطان الاحمر" (خونی سلطان) کہہ کر بدنام کیا۔ اسی دوران برطانیہ، فرانس اور روس نے ۱۱ مئی ۱۸۹۵ء (۱۶ ذوالقعدہ ۱۳۱۲ھ) کو مشترکہ طور پر اعلامیہ جاری کیا کہ سلطان معاہدۂ برلن کے مطابق آرمینیا کو بھی آزادی دے اور کردستانی فوج کو کالعدم قرار دے۔

سلطان نے یہاں ایک بار پھر سیاسی تدبیر سے کام لیا اور فرانس کے وزیر خارجہ کو بھاری رشوت دے کر اسے اس مسئلے میں اپنی حمایت پر آمادہ کر لیا۔ جس کے بعد برطانیہ اور روس کے مطالبے کا وزن کم ہو گیا۔

آرمینیوں نے جنگ میں ناکامی کے بعد حکومت کی مذمت میں مظاہرے شروع کر دیے۔ ۲۶ اگست ۱۸۹۶ء (۱۶ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ) کو انہوں نے استنبول میں ایک جلوس نکالا جس کے بہت سے ارکان بندوقوں اور بموں سے لیس تھے۔ ایسے پر تشدد مظاہروں کو منتشر کرنے کے لیے پولیس اور فوج کو بھی حرکت میں آنا پڑا جس میں مظاہرین کی لاشیں بھی گریں۔ بہر کیف آرمینیا کی بغاوت ناکام بنا دی گئی اور نصرانی مظاہرین بھی بیرونی امداد کا انتظار کرنے کے بعد تھک ہار کر بیٹھ گئے۔

آج بھی اگر مشرقی ترکی کا علاقہ ترکی میں شامل ہے، تو اس کی وجہ سلطان کی اس موقف پر ثابت قدمی تھی کہ یہ

علاقے ترکی کا انوٹ انگ ہیں۔ ①

یونان سے جنگ:

یونان نے ترکی روس جنگ سے فائدہ اٹھا کر تیسالیا پر قبضہ کر لیا تھا اور اب اس کی نگاہیں سلطنتِ عثمانیہ کے مزید علاقوں خصوصاً ''یانیا'' اور جزیرۂ کریٹ پر مرکوز تھیں۔ اس نے اپنے کارندے ان علاقوں میں کھڑے کر دیے جنھوں نے ترکوں کو مار بھگانے کا اعلان کر دیا۔ یونان نے ترکی کو یورپی اقوام پر ظلم کا مرتکب قرار دے کر باغیوں کی کھلم کھلا پشت پناہی کی۔

سلطان عبد الحمید کو معلوم تھا کہ کسی بھی علاقے کے باغی نصرانیوں سے جنگ کے وقت دُوَلِ یورپ، باغیوں ہی کا ساتھ دیں گی اور یوں جنگ جیتنے کے امکانات بہت کم رہ جائیں گے۔ اس لیے وہ یورپی مقبوضات میں بغاوتوں کو بزورِ قوت کچلنے سے عموماً احتراز کرتا رہا اور افہام و تفہیم سے کام لے کر ان مقبوضات کو داخلی خود مختاری دیتا رہا۔

تاہم یونان کی سرکشی حد سے بڑھ چکی تھی۔ اس لیے سلطان نے یہاں جنگ کا فیصلہ کیا اور اس سے پہلے تمام یونانیوں کو دو ہفتے کے اندر اندر سلطنتِ عثمانیہ کی حدود سے نکل جانے کا حکم دیا۔ یونانیوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا اور ۱۴ دسمبر ۱۸۹۶ء (۸ رجب ۱۳۱۴ھ) کو اعلانِ جنگ کر دیا۔ سلطان نے جنگ سے پہلے سفارتی محاذ پر کوشش کی کہ دُوَلِ یورپ یونان کے ساتھ اشتراک نہ کرنے پائیں اور وہ اس میں کامیاب رہا۔

اس کے بعد ترک افواج پیش قدمی کر کے تیسالیا پہنچیں اور ۱۸ اپریل ۱۸۹۷ء (۱۵ ذوالقعدہ ۱۳۱۴ھ) کو انہوں نے ''پیرناز'' کے میدان میں یونانیوں کے قدم اکھاڑ دیے۔ اگلے دن ترک افواج ''لوس کانی'' پہنچیں۔ یہاں یونانیوں سے دوسرا معرکہ ہوا۔ اس قہر انگیز لڑائی میں نوجوان یونانی حکمران قسطنطین نے اپنی ساری طاقت لگا دی۔ ترک لشکر کے علم بردار جلال پاشا سمیت بکثرت مسلمان شہید ہوئے تاہم آخر میں لشکرِ اسلام غالب رہا۔

۲۴ اپریل (۲۱ ذوالقعدہ) کو مسلمانوں نے ''ترخالا'' اور اگلے دن ''یئی شہر'' پر بھی عثمانی پرچم لہرا دیے۔ دونوں شہروں میں بکثرت مسلمان آباد تھے جنھوں نے فاتح افواج کا شاندار استقبال کیا۔

اس دوران یونانی سربراہ قسطنطین نے بندرگاہ گولوس کو ترکوں کے لیے بند کرنے کی کوشش کی مگر اسے ناکامی ہوئی اور ۵ مئی (۳ ذوالحجہ) کو ''جتالجہ'' کے میدان میں اسے پھر پسپا ہونا پڑا۔

اس دوران امیر ادھم پاشا ۲۸ ہزار سپاہیوں کے ساتھ یلغار کر کے ''ولیستین'' کو زیرِ نگین کرتے ہوئے ''دومیک'' تک پہنچ گیا۔ ۱۷ مئی (۱۵ ذوالحجہ) کو ادھم پاشا نے ۳۵ ہزار یونانیوں کو ان کے خندق نما مورچوں سے نکل بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ قسطنطین گھوڑے پر زین کس کر رات کی تاریکی میں فرار ہو گیا اور ترک ''دومیک'' میں داخل ہو گئے۔ یوں ترکوں نے جنگ جیت لی۔

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از یلماز اوزتونا: ۲/۱۳۰، ۱۳۳

ترکوں کی سابقہ شجاعت وبسالت کے مظاہرے سے یورپی اقوام بے چین ہو گئیں اور انہوں نے جنگ جاری رہنے کی صورت میں یونان کے ساتھ کھڑے ہونے کا عندیہ دیا۔ چنانچہ ۳۲ دن بعد جبکہ ترک جنوب میں ڈیڑھ سو کلومیٹر تک پیش قدمی کر چکے تھے، جنگ روک دی گئی۔ باب عالی اور دول یورپ کے مابین سفراء کی آمد ورفت کے بعد قیام امن کے عنوان سے استنبول میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی اور ۴ دسمبر ۱۸۹۷ء (۹ رجب ۱۳۱۵ھ) کو معاہدہ استنبول عمل میں آیا جس میں طے پایا کہ:

❶ ''تیسالیا'' یونان کا حصہ ہوگا۔

❷ ''کریٹ'' کو داخلی آزادی دی جائے گی۔ وہاں کا حاکم مقامی لوگوں سے منتخب کیا جائے گا۔ ترک افواج وہاں سے مرحلہ وار انخلاء کریں گی۔

❸ ترکی کو سولہ برس تک جزیرے سے محصولات کی ادائیگی جاری رہے گی۔

❹ یونان جنگ کا تاوان ''۴۱ لاکھ طلائی لیرے'' ترکی کو ادا کرے گا۔

یہ معاہدہ برطانیہ، فرانس، روس اور اٹلی کے دباؤ پر ہوا تھا اور ان ممالک نے اسے نہ ماننے کی صورت میں ترکی کے خلاف مشترکہ محاذ بنا لینے کی دھمکی دی تھی۔ اس لیے سلطان عبدالحمید کے پاس اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس وقت سلطنتِ عثمانیہ کمزور اور محدود ہو چکی تھی جبکہ مذکورہ چار ممالک دنیا کے اکثر حصے پر قابض تھے۔ کسی بھی سلطنت کے لیے ایسے میں یہی بڑی بات تھی کہ اپنی سرحدوں کو بچاتی۔ یہی سلطان عبدالحمید کی سیاسی حکمت عملی تھی۔ شاید اس سے زیادہ کچھ اور ممکن بھی نہ تھا۔[1]

کردستان اور یمن:

برطانیہ گزشتہ پون صدی سے ترکی اور ایران کی سرحدوں پر واقع کردستان کے وسیع علاقے میں قبائلی سرداروں کو زبان، مذہب اور نسل کے نام پر مشتعل کر کے بغاوتیں برپا کرنے کی سازشیں کر رہا تھا۔ انگریز عراق پر تسلط قائم کرنے کے لیے کردستان کو خلافتِ عثمانیہ سے الگ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ یمن کو بھی بغاوت کے ذریعے الگ کرنے کے لیے کوشاں تھے تاکہ بحیرۂ احمر اور بحرِ ہند میں ان کے لیے راستے پوری طرح کھل جائیں۔

سلطان عبدالحمید نے اپنے محکمہ مخابرات کے ذریعے ان سازشوں تک رسائی حاصل کی اور اس کے مقابلے میں کئی اہم اقدامات کیے۔ کردستان کی بغاوت روکنے کے لیے سلطان نے علماء کے وفود بھیجے جنہوں نے قبائلی سرداروں کو اسلامی یک جہتی کی دعوت دی۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور اکثر سردار استعماری عزائم سے آگاہ ہو کر ترکی کے حامی بن گئے۔ سلطان عبدالحمید نے ان سرداروں سے دربار خلافت کے مستقل رابطے کا نظام قائم کیا، نیز کردوں کو فوج میں بھرتی

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۲/۱۳۷ تا ۱۴۰

کر کے استنبول کے مشرق میں ان کی مستقل تربیت گاہ اور چھاؤنی تعمیر کرائی۔ آرمینیا کے نصرانی ایک مدت سے کردستان میں قتل و غارت کر رہے تھے۔ سلطان عبدالحمید نے ان کے خلاف سخت کارروائیاں کر کے کردستان کی سرحدوں کو محفوظ بنا دیا۔[1]

اس نے یمن پر انگریزوں کا تسلط ختم کرنے کے لیے اپنے بہترین جرنیلوں: احمد مختار پاشا، توفیق پاشا اور فوزی پاشا کو بھیجا اور برطانیہ کی پوری کوشش کے باوجود یمن میں خانہ جنگی کی آگ مزید نہ بھڑکنے دی۔ اس نے آئندہ کے لیے یمن میں آٹھ ہزار سپاہیوں کی ایک مستقل فوج تعینات کر دی۔[2]

مقدونیہ کی بغاوت:

سلطنتِ عثمانیہ کا یورپی صوبہ مقدونیہ تین بڑے ضلعوں: سالونیکا (سلانیک)، کرسوفا اور مناستر پر مشتمل تھا جس کا رقبہ ۹۳ ہزار ۲۰۰ مربع کلومیٹر اور آبادی چالیس لاکھ نفوس سے زائد تھی۔ یہاں پچاس فیصد ترک اور البانوی النسل مسلمان تھے جبکہ باقی نصرانی، یہودی، یونانی اور بلغاری ملے جلے تھے۔

بلغاریہ کے نصرانی ایک مدت سے مقدونیہ کو ترکی سے چھیننا چاہتے تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۳ء (۱۳۱۰ھ) میں مقدونیہ میں ایک باغی جماعت تشکیل دی، جو زیر زمین پلتی رہی۔ آخر ۱۹۰۲ء (۱۳۲۰ھ) میں اس نے علانیہ بغاوت کر دی اور آبادیوں میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ تاہم ستمبر ۱۹۰۲ء (جمادی الآخرہ ۱۳۲۰ھ) میں ترک فوج وہاں پہنچ گئی اور ایک ماہ کی کارروائی کے بعد شورش پسندوں کا زور توڑ دیا گیا۔

اگلے سال اگست (جمادی الاولیٰ ۱۳۲۱ھ) میں باغیوں نے دوبارہ سر اٹھایا مگر اس بار بھی انہیں کچل دیا گیا۔ اس جنگ میں ترکی کی تھرڈ آرمی کور بھی شامل تھی جس کے نوجوان افسران آگے چل کر ترکی میں مغربی طرز کا انقلاب لائے۔

یورپی دنیا نے ترک فوج کی کارروائی کو نصرانیوں کے قتل عام سے تعبیر کر کے بہت شور شرابا کیا، حالانکہ باغیوں کی بہیمانہ کارروائیوں میں ان گنت مسلمان قتل ہوئے تھے مگر دنیا میں کون سا مسلم ملک آزاد تھا جو اس بارے میں لب کشائی کرتا؟[3]

مسلم اور غیر مسلم دنیا کا موازنہ

چودہویں صدی ہجری کے اوائل اور انیسویں صدی عیسوی کے اختتام پر عالم اسلام انحطاط کی اس حد پر تھا جس کا ایک صدی پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ دنیائے نصرانیت اس وقت اس عروج پر تھی جس کی کوئی مثال ماضی میں نہیں تھی۔ پوری دنیا میں خود مختار اسلامی ملک صرف تین رہ گئے تھے: ❶ ترکی ❷ ایران ❸ افغانستان۔

---

① سلطان عبدالحمید ثانی از محمد حرب: ص ۱۳۱، ۱۳۲

② سلطان عبدالحمید ثانی از محمد حرب: ص ۲۲۳

③ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۲/۱۹۱

غیر مسلم خود مختار ممالک میں سے صرف تین بدھسٹ تھے: چین۔ جاپان۔ تھائی لینڈ

ان تین مسلم اور تین بدھسٹ ملکوں کو چھوڑ کر باقی دنیا کے نقشے میں جس ملک پر بھی انگلی رکھیں وہ نصرانی یا نصرانیوں کا غلام تھا۔ نصرانی ملکوں میں سے چھ آرتھوڈکس فرقے کے تھے: روس۔ رومانیہ۔ سربیا۔ یونان۔ حبشہ۔ باقی سب کیتھولک یا پروٹسٹنٹ تھے۔

تین آزاد مسلم ممالک میں سے بھی صرف ترکی اور افغانستان اپنے دفاع کا حوصلہ رکھتے تھے جبکہ ایران بیرونی طاقتوں سے دبا ہوا تھا۔ باقی ساری اسلامی دنیا یورپی طاقتوں کے قبضے میں تھی۔

سیاسی اثر ورسوخ اور قوت کے اعتبار سے اس وقت دنیا کی دس بڑی طاقتوں کی درجہ بندی اس طرح تھی:

❶ برطانیہ ❷ جرمنی ❸ فرانس ❹ روس ❺ امریکا

❻ آسٹریا اور ہنگری کا وفاق ❼ ترکی ❽ جاپان ❾ اٹلی ❿ چین

عالمی طاقتوں میں رقبے، معیشت، اور سیاسی اثر ورسوخ کے لحاظ سے برطانیہ سب سے آگے تھا۔ صنعت وحرفت میں بھی اس کا لوہا سب مانتے تھے مگر اس میدان میں جرمنی اور امریکا اس کے قریب آچکے تھے اور لگتا تھا کہ وہ پوری دنیا سے آگے نکل جائیں گے۔ جرمنی کی بری فوج دنیا میں منظم ترین مانی جاتی تھی جبکہ بحری طاقت میں وہ برطانیہ کے بعد دوسرے نمبر پر تھا۔ جرمنی کے بعد فرانس اور پھر روس کی افواج سب سے طاقتور تھیں۔ روس میں مشینی صنعت و حرفت کا ابتدائی دور تھا۔ اس میدان میں مسابقت کے لیے جو معاشی طاقت اور سائنسی مہارت درکار تھی، روس ابھی اس تک نہیں پہنچا تھا۔

جاپان نے جو پہلے ایک غیر معروف ملک تھا، بحری فوج اور بھاری مشینری کی تیاری میں حیرت انگیز ترقی کی تھی اور موجودہ چین کے بڑے حصے پر قابض ہو کر اس نے ایک بڑی طاقت کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اب وہ اس کوشش میں تھا کہ مشرق بعید میں روس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دے۔

امریکا جس نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں خود مختاری حاصل کی تھی، تیزی سے رُو بہ عروج تھا۔ جبکہ اسپین عالمی طاقتوں کی صف سے خارج ہو چکا تھا کیوں کہ اس کی طاقت کا زیادہ تر انحصار نوآبادیات پر تھا۔ جب امریکا نے کیوبا اور فلپائن سمیت اس کی اکثر نوآبادیات چھین لیں تو اسپین اپنی قدیم حدود میں سمٹ کر عالمی سیاست سے خارج ہو گیا۔ اٹلی حبشہ میں شکست کھانے کے باوجود ترکی سے صومالیہ چھین چکا تھا اور اب وہ طرابلس الغرب (لیبیا) اور یمن پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔

ترکی اس گئی گزری حالت میں بھی دنیا کی بڑی طاقتوں میں سے ساتواں تھا۔ جبکہ چین کی حالت ترکی کی بہ نسبت کمزور تھی کیوں کہ یہ ملک جدید ٹیکنالوجی میں بہت پیچھے تھا۔ بڑی طاقتیں چین کو بھی زیر کرنا چاہتی تھیں۔ مگر انہیں اس سے کہیں زیادہ دلچسپی ترکی کو مسخر کرنے اور سلطان عبدالحمید کو ٹھکانے لگانے میں تھی کیوں کہ ترکی اس وقت عالم اسلام کا

آخری حصار تھا اور سلطان عبدالحمید اس کا آخری مسلح سپاہی تھا۔ عالمی طاقتوں کو یقین تھا کہ سلطان کے گرتے ہی ترکی بھی سرنگوں ہو جائے گا اور پھر ساری دنیا ان کی مٹھی میں ہو گی۔

ان حالات میں اگر ترکی کے خلاف کوئی جنگ چھڑتی، جس کا بہانہ پیدا کرنا یورپ کے لیے کوئی مشکل نہ تھا، تو ترکی کی شکست کا قوی اندیشہ تھا۔ لہٰذا سلطان عبدالحمید نے ضروری سمجھا کہ مزید جنگوں سے حتی الامکان گریز کیا جائے اور اس کے لیے اقوامِ یورپ میں سے کسی نہ کسی کو اپنا حلیف بنایا جائے۔

ترکی کا سب سے پرانا حلیف فرانس تھا جس سے سلیمان عالی شان کے دور میں قریبی تعلقات قائم ہوئے تھے اور اڑھائی صدیوں تک برقرار رہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں مصر پر نپولین کے حملے کے بعد یہ دوستی ختم ہو گئی اور فرانس کی جگہ برطانیہ سے تعلقات استوار ہو گئے۔

تاہم سلطان عبدالعزیز کے دور میں برطانیہ کا مکروہ چہرہ بھی کھل کر سامنے آ چکا تھا۔ اس لیے سلطان عبدالعزیز نے برطانیہ کی جگہ روس سے تعلقات بڑھانا شروع کر دیے مگر مدحت پاشا نے اس کا تختہ الٹ دیا۔

سلطان عبدالحمید کسی بھی یورپی طاقت پر اعتماد نہیں کرتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ جرمنی نے کئی صدیوں سے کسی بھی مسلم ملک کے خلاف فوج کشی نہیں کی، جبکہ اسلام دشمنی میں فرانس، برطانیہ، روس اور اٹلی ایک صف میں دکھائی دیتے تھے۔ ادھر جرمنی بھی ترکی کو حلیف بنانا ضروری سمجھتا تھا کیوں کہ استعماری طاقتوں کی اس ٹولی سے جس کا سربراہ برطانیہ تھا، اس کی شدید ناچاقی چل رہی تھی۔ چنانچہ اس ماحول میں جرمنی اور ترکی آہستہ آہستہ قریب آتے گئے۔ پہلی بار نومبر ۱۸۸۹ء (ربیع الاول ۱۳۰۷ھ) میں جرمن شہزادوں نے استنبول کا دورہ کیا اور سلطان سے ملاقات کی۔ اس کے بعد متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ اگلی صدی عیسوی میں جرمنی اور ترکی مضبوط اتحادی ثابت ہوئے۔ [1]

استعمار کا عروج:

مناسب ہوگا کہ یہاں انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں استعماری ممالک کی غاصبانہ پیش قدمی اور اسلامی حکومتوں کے سقوط پر ایک اجمالی نگاہ ڈال لی جائے:

انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں روس نے وسط ایشیا کی طرف پیش قدمی شروع کی اور یکے بعد دیگرے کئی اسلامی ریاستوں پر قبضہ جمالیا۔ غازی محمد، "حمزہ بے" اور امام شامل جیسے مجاہد قائدین سالہا سال تک روس سے جہاد کرتے رہے مگر یہ تحریک آخر کار بیرونی مسلم ممالک کی بے اعتنائی کے باعث ختم ہو گئی۔ جس کے بعد روس بڑی تیزی سے ماوراء النہر کی اسلامی ریاستوں پر قابض ہوتا چلا گیا۔ ۱۸۶۴ء میں قفقاز، ۱۸۶۷ء میں تاشقند، ۱۸۶۸ء میں بخارا، ۱۸۷۳ء میں خیوہ اور ۱۸۸۳ء میں "مرو" روس کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱۳۵/۲ تا ۱۵۰

برطانیہ برصغیر کے ساحلوں سے وسطی صوبوں کی طرف بڑھتا رہا یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر لیا گیا اور ہندوستان براہِ راست تاجِ برطانیہ کی ماتحتی میں چلا گیا۔ ۱۸۸۲ء میں برطانیہ نے مصر پر بھی قبضہ کر لیا۔

فرانس نے ۱۸۳۰ء میں خلافتِ عثمانیہ کے صوبے الجزائر، ۱۸۸۱ء میں تیونس، ۱۸۸۲ء میں سینیگال اور مدغاسکر اور ۱۹۱۲ء میں مراکش کو اپنی ہوسِ ملک گیری کا نشانہ بنایا۔

اٹلی نے افریقہ کے اسلامی ممالک کو اپنا ہدف بنا کر ۱۸۸۷ء میں صومالیہ اور ''اریٹریا'' پر حملہ کیا اور ۱۹۱۱ء میں طرابلس الغرب (لیبیا) پر قبضہ کر لیا۔

سلطان عبدالحمید، قدیم سیاسی نظام کی طرف رجعت اور نئے اہداف:

روس سے شکست اور معاہدہ برلن کے بعد سلطان کی پوری توجہ قوم کو طوفان خیز حالات سے بسلامت نکال لے جانے پر مرکوز ہو گئی۔ فرصت کم تھی اور کام بہت زیادہ۔ وہ مغرب نواز لوگوں کو اعلیٰ عہدے دینے میں بھی بہت احتیاط برتنے لگا، اس نے فوج کو مضبوط، منصبِ خلافت کو مستحکم اور اسلامی برادری کا جذبہ عام کرنے کو ہدف بنا لیا تھا۔ اس نے پارلیمان معطل کر دی تھی لیکن ملکی دستور منسوخ نہیں کیا تھا بلکہ ہر سال حکومت اپنی سالانہ کارکردگی کی اشاعت میں دستور کو باقاعدہ شائع کرتی رہی۔ نیز ایوانِ بالا یعنی سینٹ کو بھی رسمی طور پر باقی رکھا گیا تھا، اگرچہ اس کا اجلاس طلب نہیں کیا جاتا تھا۔ درحقیقت سلطان نے اپنے دادا محمود ثانی کے دور کے شخصی نظامِ حکومت کی طرف رجعت کر لی تھی۔

مگر ظاہر ہے اس وقت دنیا کے سیاسی مزاج کا جو رُخ متعین ہو چکا تھا، اس کی موجودگی میں اس قدیم نظام کو دوبارہ مقبول بنانا انتہائی مشکل تھا۔ ملکی و غیر ملکی صحافت اسے ''آمریت'' کا نام دے کر لوگوں کو با آسانی بابِ عالی سے متنفر کرتی رہی۔ اس کی جگہ اگر سلطان عوامی نمائندگی اور قومی شورائیت کا کوئی متبادل نظام پیش کرتا، یا اسی پارلیمانی نظام کو اس طرح اسلامی سانچے میں ڈھال لیتا کہ اسلام پسندوں کی بالادستی کی راہیں کھل جاتیں تو شاید غیر ملکی ایجنٹ فوج اور تعلیم یافتہ طبقے کو اس کے خلاف برانگیختہ کرنے میں کامیاب نہ ہوتے۔[1]

سلطان عبدالحمید کی تحریک، الجامعة الاسلامیه:

غلامی کی زنجیروں میں جکڑے عالمِ اسلام کے مظلوم مسلمانوں نے سلطان عبدالحمید سے بڑی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطان نے اپنے فرائض نبھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس نے علاقائی و لسانی حدود سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کی قومی یکجہتی اور اسلامی برادری کے نظریے کو عام کرنے کا عزم کیا اور اس خواب کی تکمیل کے لیے ''الجامعة الاسلامیه'' (پان اسلام ازم) جیسی مؤثر تحریک شروع کی۔ بلاشبہ یہ سلطان کے احساسِ ذمہ داری اور دور اندیشی کا کرشمہ تھا۔ اس بارے میں سلطان کی سوچ کی عکاسی اس کے درج ذیل بیانات سے ہوتی ہے:

---

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۱۹۷، ۱۹۸؛ تاریخ الدولة العثمانیة، از یلماز اوزتونا: ۲/۱۱۶

❶ ''خلافتِ عثمانیہ میں ترک، عرب، البانی، بلغاری، یونانی، حبشی اور دیگر نسلیں شامل ہیں مگر اس کے باوجود اسلام نے ہمیں ایک خاندان بنا رکھا ہے۔''

❷ ''لازم ہے کہ ہم باقی مسلمانوں سے رابطے مضبوط کریں چاہے وہ کہیں بھی ہوں۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوں۔ اس وحدت کے بغیر ہمارے مستقبل کی کوئی امید نہیں۔''

❸ ''اسلام اور نصرانیت دو مختلف نظریات ہیں جن کا ایک تہذیب میں جمع ہونا ممکن نہیں۔''

❹ ''انگریز نے مصریوں کا ذہن خراب کر دیا ہے، ان میں سے بعض دین پر قومیت کو ترجیح دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مصری تہذیب کا یورپی تہذیب کے ساتھ اتحاد ممکن ہے۔''

❺ ''مصر کے جدت پسند لوگ انگریز کے ہاتھ میں کھلونا ہیں، اور اسی وجہ سے وہ خلافتِ اسلامیہ کو ڈھانے اور منصبِ خلافت کا اقتدار ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''[1]

اس فکر کے نتیجے میں تحریک الجامعۃ الاسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی جس کا منشور یہ تھا:

① تمام مسلم جماعتوں اور گروہوں کو خلافت کے گرد جمع کرنا

② مرکزِ خلافت اور تمام صوبوں کے مابین روابط مضبوط کرنا

③ مغربی آئین و دستور کا متبادل اسلامی آئین پیش کرنا

④ استعماری طاقتوں کے خلاف، مسلمانوں کی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا اور جہاد کی تیاری کرنا[2]

اسلامی بیداری کے لیے سلطان کی خدمات:

سلطان عبدالحمید نے مسلم دنیا سے رابطے مضبوط کرنے کے لیے اندرون و بیرون ممالک مواصلات کا تیز تر نظام قائم کرنے کے ساتھ ایک انقلابی قدم یہ اٹھایا کہ عربی کو سلطنتِ عثمانیہ کی سرکاری زبان قرار دے کر اس کی زیادہ سے زیادہ ترویج کی کوشش کی۔ عثمانیوں کی تاریخ میں یہ قدم پہلی بار اٹھایا گیا تھا۔ سرکاری افسران اور روساء کی اولاد کو مغرب زدگی سے بچانے اور بہترین تعلیم دلانے کے لیے استنبول میں ایک عظیم الشان مدرسے کی بنیاد ڈالی۔ تیز تعمیرِ کردار و شخصیت کے لیے سلوک و احسان کے سلاسل کو ترویج دینے، خانقاہیں کھولنے اور مشائخ سے استفادہ کرنے کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ نئی مساجد کی تعمیر اور قدیم مساجد کی مرمت و اصلاح پر بھی توجہ دی۔

سلطان نے اسلامی دنیا میں علمی و سیاسی اعتبار سے اثر و رسوخ رکھنے والے علمائے کرام سے رابطے کیے اور انھیں مسلمانوں کے مختلف طبقات اور قبیلوں کو اسلامی یکجہتی کی دعوت دینے، اسلامی علوم کی اشاعت کرنے، دینی درسگاہیں

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۳۱۷، ۳۱۸، نقلاً عن مذكرات السلطان عبدالحميد: ص ۲۳، ۲۴

② صحوة الرجل المريض: ص ۱۳۶

کھولنے اور اسلامی کتب خصوصاً قدیم ماخذ کو طبع کرا کے منظر عام پر لانے کے اہداف سونپے۔ مغرب کی نظریاتی جنگ کے مقابلے میں اسلامی صحافت اور مغرب کے نظریۂ وطنیت کے خلاف مسلم قومیت کا محاذ قائم کیا۔

اس دور کے کئی علماء، دانشور، صحافی اور مورخ سلطان عبدالحمید کی اس تحریک میں شامل ہوئے اور بیسویں صدی عیسوی میں انہوں نے مغربی استعمار اور یورپی تہذیب وتمدن کے مقابلے میں عالم اسلام کے سرکف نظریاتی مجاہدین کا کردار ادا کیا۔ ان میں امیر شکیب ارسلان، محمد عاکف، مصطفیٰ کامل اور شیخ علی یوسف کے نام قابلِ ذکر ہیں۔[1]

برصغیر میں یہی فکر ونظر علامہ شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، لسان العصر اکبرالٰہ آبادی اور علامہ اقبال مرحوم کے کلام میں نظر آتی ہے۔

جمال الدین افغانی اور سلطان کی قربت اور اختلافات:

اس دور کے مشہور مسلم مفکر علامہ جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء تا ۱۸۹۷ء) نے بھی سلطان عبدالحمید کی اس تحریک کی ترجمانی کی۔ علامہ افغانی کو اس دور میں اسلامی بیداری کا بڑا نقیب مانا جاتا ہے۔ انہیں پشتو، فارسی، عربی، ترکی، روسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے علوم دینیہ کے علاوہ مغربی افکار ونظریات کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ وہ گیارہ سال تک افغان دربار سے وابستہ رہے۔ پھر مخالفین کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر وطن چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ہندوستان، برطانیہ اور مصر سمیت متعدد ممالک میں رہے۔ انہیں کئی بار مختلف ممالک سے جلاوطن کیا گیا۔ فروری ۱۸۹۲ء میں لندن میں قیام کے دوران انہوں نے ایک اخبار ''العُروۃُ الوُثقیٰ'' جاری کیا۔ زندگی کے آخری پانچ سال انہوں نے مرکزِ خلافت استنبول میں گزارے اور سلطان عبدالحمید کے بہت قریب رہے۔ انہوں نے ۱۸۹۷ء میں وہیں وفات پائی۔ سلطان عبدالحمید کے بارے میں جمال الدین افغانی کا کہنا تھا:

''اگر سلطان عبدالحمید کو دورِ حاضر کے چار نابغہ روزگار افراد کے ساتھ تولا جائے تو سلطان اپنی ذہانت، ہوشیاری، سیاست دانی اور خصوصاً اپنے ہم مجلس کو قائل کر لینے میں ان پر فائق ہوں گے۔''

علامہ افغانی کا یہ بھی کہنا تھا:

''سلطان کی بیدار مغزی، سمجھداری، احتیاط، مغربی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے تیاری، حسن نیت، اور خلافت کے اس عروج کی کوشش نے جس پر مسلمانوں کا عمومی عروج منحصر ہے، مجھے آمادہ کیا کہ میں ان سے بیعت کر لوں، پس میں نے ان سے خلافت اور سلطنت کی بیعت کر لی، کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ مشرق کے اسلامی ممالک، یورپ کے چنگل، اسلامی دنیا میں اس کے مزید غلبے، مسلمانوں کی تقسیم در تقسیم اور ان کی یکے بعد دیگرے تذلیل سے تبھی بچ سکتے ہیں جب وہ عمومی طور پر بیدار وہوشیار ہو کر خلیفۂ اعظم کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔''[2]

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابي: ص: ۳۱۹، ۳۲۰

② الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابي: ص: ۳۲۲

تاہم اسلامی وحدت کی دعوت میں سلطان عبدالحمید کا ساتھ دینے کے باوجود جمال الدین افغانی پوری طرح سلطان کے ہم فکر نہ تھے۔ اگرچہ وہ وحدتِ اسلامیہ کی آواز لگا رہے تھے مگر شمالی افریقہ پر فرانس کے غاصبانہ قبضے کے خلاف انہوں نے مکمل خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اسی طرح وہ وسطِ ایشیا پر رُوس کے قبضے کے خلاف نہیں تھے بلکہ ان کی طرف سے رُوس کو نصیحت کی جارہی تھی کہ اگر وہ کھلے سمندروں تک رسائی کے لیے ہندوستان پر قبضہ کرے تو اسے چاہیے کہ اس مقصد کے لیے افغانستان اور ایران سے مدد لے اور انہیں فتوحات کے منافع میں شریک کرے۔

بعد میں یہ بھی ظاہر ہوا کہ وہ حُریتِ فکر اور جمہوریت کے عنوان سے ترک قوموں اور عثمانی افسران کو سلطان کی حکمتِ عملی سے برگشتہ کر رہے تھے۔ ان کا موقف تھا کہ اختیارات شخصِ واحد کے ہاتھوں میں نہ دیے جائیں۔

اسی دوران علامہ کے عقائد و نظریات پر استنبول کے قدامت پسند علماء نے اعتراضات شروع کر دیے۔ شیخ خلیل الفوزی نے ''السیوف القواطع'' نامی کتاب میں علامہ کے بہت سے نظریات پر سخت رد کیا۔

سلطان عبدالحمید نے مصلحتِ وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک مدت تک علامہ افغانی کو وحدتِ اُمت کے لیے استعمال کیا مگر جمال الدین افغانی کے نظریات رفتہ رفتہ سلطان سے مختلف ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے برطانوی وزارتِ خارجہ کے افسرِ اعلیٰ مسٹر بلنٹ کے ساتھ مل کر سلطان کا تختہ الٹنے کی سازش شروع کر دی۔ منصوبہ یہ تھا کہ خلافت کو ترکوں سے نکال کر عربوں میں منتقل کر دیا جائے۔ تاہم سازش بروقت طشت از بام ہوگئی اور جمال الدین افغانی کو نظر بند کر دیا گیا۔ آخر استنبول میں بحالتِ نظر بندی ان کا انتقال ہوا۔

علامہ افغانی کو جہاں ایک عظیم مفکر کے طور پر جانا جاتا ہے، وہیں انہیں فری میسنری کا جاسوس اور استعمار کا آلہ کار بھی کہا جاتا ہے۔ اتنی بات تو یقینی ہے کہ مغربی فکر و فلسفے کا مطالعہ کرتے کرتے وہ پوری طرح جدت پسندی کی طرف مائل ہو چکے تھے، اس لیے ان کی بعض آراء حقیقی اسلامی تعلیمات کے خلاف تھیں۔ لہٰذا ان کے متفردانہ افکار کو قبولیتِ عامہ حاصل نہ ہو سکی۔[1]

علامہ افغانی اور سلطان کے اختلاف کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ علامہ افغانی پان اسلام ازم تحریک میں شیعوں کو بھی اس طرح ضم کرنا چاہتے تھے کہ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کا فرق ختم ہو جائے۔ سلطان کے نزدیک شیعہ اور اہلِ سنت کا نظریاتی فاصلہ اور مذہبی امتیاز ایک ناقابلِ تردید حقیقت تھی اور پان اسلام ازم تحریک میں بھی اس کا لحاظ رکھنا لازم تھا۔ سلطان کے نزدیک شیعوں سے اتحاد فقط سیاسی بنیادوں پر ہونا چاہیے تھا نہ کہ مذہبی بنیادوں پر۔[2]

علامہ افغانی کے بارے میں سلطان عبدالحمید کے یہ تاثرات قابلِ غور ہیں:

''میں جمال الدین افغانی کو قریب سے جانتا ہوں۔ وہ مصر میں تھے۔ وہ ایک خطرناک آدمی تھے۔ وہ

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابي، ص: ۳۱۹ تا ۳۲۳

② السلطان عبدالحمید الثانی از محمد حرب، ص ۱۸۱

مہدی ہونے کے دعوے دار بھی تھے۔ ایک بار انہوں نے میرے سامنے تجویز رکھی کہ وہ وسط ایشیا کے تمام مسلمانوں کو روس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر ابھاریں گے۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ انگریز کے کارندے تھے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ انگریزوں نے انہیں میری جاسوسی کے لیے مقرر کیا ہو۔ میں نے افغانی کی پیش کش مسترد کر دی تو انہوں نے ہلمٹ سے سازباز کر لی۔ میں نے ابوالہدیٰ الصیادی حلبی کے ذریعے انہیں استنبول آنے کی دعوت دی اور پھر انہیں نکلنے نہ دیا اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔"[1]

خانقاہوں کا عالمی حلقہ:

سلطان عبدالحمید نے عالم اسلام کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے شریف مکہ اور حرم مکی کے مشائخ کی نگرانی میں تحریک الجامعۃ الاسلامیہ کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا اور اس کے ذریعے دنیا بھر میں پھیلی ہوئی خانقاہوں کو مرکز خلافت سے مربوط کیا۔ اس سلسلے میں حرم مکہ اور حرم مدینہ کے مشائخ کے علاوہ سلسلہ مدنیہ، قادریہ، نقش بندیہ، شاذلیہ اور رفاعیہ کے بزرگوں کا تعاون حاصل کیا گیا۔ ہر سال حج وعمرے اور روضۂ رسول کی زیارت کے لیے لاکھوں مسلمان مکہ اور مدینہ آتے تھے۔ اسی طرح شمالی افریقہ سے ہر سال ہزاروں زائرین حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی رحمہ اللہ کے مزار پر حاضری کے لیے بغداد پہنچتے تھے۔ مکہ، مدینہ اور بغداد میں ان کی ذہن سازی کی جاتی اور وہ واپس جا کر خانقاہوں کی وساطت سے باقی مسلمانوں کو ملی یک جہتی اور خلافت کی حمایت پر ابھارتے۔ اس تحریک کا سلسلہ جنوبی افریقہ سے وسط ایشیا اور چین تک پھیل گیا۔ ہزاروں خانقاہیں اس تحریک کے مراکز بن گئیں۔ چند سالوں میں مسلمان اتنے منظم ہو گئے کہ مرکز خلافت سے اشارہ ملنے پر برطانوی، فرانسیسی واطالوی استعمار کے خلاف کارروائیاں شروع کر سکتے تھے۔ اگرچہ استعماری طاقتوں نے بہت سے مراکز کا سراغ لگا کر بڑی تعداد میں علماء ومشائخ کو شہید اور گرفتار کیا مگر بعض مراکز پھر بھی محفوظ رہے اور کسی نہ کسی انداز میں کام کرتے رہے۔[2]

سلطان نے مشائخ اور صوفیاء کا ایک وفد ہندوستان بھی بھیجا تھا تاکہ برصغیر سے برطانیہ کے قدم اکھاڑے جائیں اور اسے خلافتِ اسلامیہ کے خاتمے کا خواب پورا نہ کرنے دیا جائے۔[3] یہ انیسویں صدی عیسوی کا آخری عشرہ تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب دارالعلوم دیوبند کے اکابر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن، حاجی صاحب ترنگ زئی رحمہ اللہ کو ساتھ لے کر حج کے لیے گئے۔ اس قافلے نے فریضۂ حج کی ادائیگی کے علاوہ مکہ معظمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کی زیارت بھی کی اور ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔[4]

---

① مذکرات السلطان عبدالحمید الثانی از محمد حرب: ص ۱۳۸

② الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۴۲۳ تا ۴۲۵

③ سلطان عبدالحمید ثانی از محمد حرب: ص ۱۹۸

④ حاجی صاحب ترنگ زئی از عزیز جاوید: ص ۱۳۱ ....

ملحوظ: کوئی بعید نہیں کہ سلطان عبدالحمید کی طرف سے ہندوستان کا دورہ کرنے والے وفد کی دعوت پر یہ حضرات حجاز گئے ---- (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یورپی ایجنٹوں کی طرف سے فریضۂ حج کے سقوط کا فتویٰ کیوں دیا گیا؟:

استعماری طاقتوں نے سلطان عبدالحمید کے اس خفیہ نیٹ ورک کے توڑ کی بڑی کوشش کی مگر اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی کیوں کہ اس تحریک کا مرکز مکہ تھا جہاں حج کے لیے مسلمان ہر صورت میں جایا کرتے تھے۔ انہیں اس فریضے کی ادائیگی سے روکنے کا کوئی جواز بھی نہیں نکلتا تھا۔ آخر استعماری طاقتوں نے بعض دنیا پرست گدی نشینوں اور علماء کو مال و دولت اور عہدوں کے ذریعے اپنے ساتھ ملایا، اور ان کے ذریعے یہ فتویٰ مشتہر کرایا کہ اس وقت بدامنی اور وباؤں کی وجہ سے حج کے لیے جانا خودکشی کے مترادف ہے، لہٰذا فریضۂ حج ساقط ہو چکا ہے۔ ①

اس دور میں بہت سے سلاسلِ تصوف اور بے شمار مشائخ بدعات و خرافات میں بھی مبتلا تھے مگر سلطان عبدالحمید نے سیاسی مصلحت کے تحت ان چیزوں سے چشم پوشی کی اور بلاتفریق تمام خانقاہوں اور سلاسل کو تحریک کا حصہ بنانے کی کوشش جاری رکھی مگر رسوم پرست مشائخ زیادہ عرصے تک ایثار و قربانی پر مبنی اس تحریک کا ساتھ نہ دے سکے۔ اس لیے یہ تحریک توقع کے مطابق بارآور نہ ہو سکی۔ ②

مغربی تعلیم و تہذیب کا مقابلہ:

سلطان عبدالحمید نے مغربی نظامِ تعلیم کو من و عن اپنانے کی روک تھام کی اور سرکاری درسگاہوں کے نصاب میں ناگزیر تبدیلیاں کیں۔ فقہ، تفسیر اور اسلامی اخلاق کے مضامین کو لازمی قرار دیا۔ مغربی تہذیب کے بداثرات کو روکنے کی پوری کوشش کی۔ اس زمانے میں سلطنتِ عثمانیہ کے بڑے شہروں خصوصاً استنبول میں بے پردگی عام ہو چکی تھی۔ سلطان نے اکتوبر ۱۸۸۳ء (ذوالحجہ ۱۳۰۰ھ) میں ایک حکم جاری کرتے ہوئے خواتین کو خلافِ شرع لباس پہننے اور بے پردہ باہر پھرنے سے منع کیا اور انہیں پابند کیا کہ وہ سڑکوں پر آتے ہوئے مکمل شرعی پردے کا اہتمام کریں۔ ③

سلطان تعلیمِ نسواں نہیں، لڑکیوں اور لڑکوں کی مخلوط تعلیم کے مخالف تھے۔ انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کا الگ شعبہ قائم کیا اور اس میں کام کرنے والی معلمات کی تربیت کے لیے ایک دارالتربیت کھولا۔

سلطان سیاست میں خواتین کی شرکت کو مسلم معاشرے کے لیے نقصان دہ تصور کرتے تھے۔ سلطان نے اپنی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ......ہوں۔ کیوں کہ حجاز سے ہندوستان واپس آ کر انہوں نے برطانوی استعمار کے خلاف خفیہ طور پر کام جاری رکھا۔ شیخ الہند محمود حسن نے برسوں بعد حجاز کا دوسرا سفر کر کے ترک حکومت سے معاہدے کے ذریعے تحریک ریشمی رومال کی بنیاد رکھی جس کا مقصد ترکی اور افغانستان کی افواج کے بیرونی حملے اور ہندوستان کے عوام کی اندرونی تحریک کے ذریعے انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کرنا تھا۔ اس تحریک کا راز افشا ہونے پر برطانیہ نے شیخ الہند کو گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں قید کر دیا۔ رہائی کے بعد شیخ الہند نے ہندوستان آ کر تحریکِ خلافت کی سرپرستی کی جس کا مقصد ترکی میں منصبِ خلافت کی بقا تھا مگر افسوس کہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔

حاشیہ صفحہ ہٰذا:

① سلطان عبدالحمید ثانی از محمد حرب: ص ۱۹۸

② الدولۃ العثمانیۃ از الصلابی: ص: ۴۲۵　　③ سلطان عبدالحمید ثانی از محمد حرب: ص ۱۰۰

سوتیلی والدہ کو بھی محل سے باہر ملکی سیاسی امور میں مداخلت کی اجازت نہ دی۔ [1]

تعلیم وتربیت کا منفرد نظام:

سلطان نے سلطنت میں ترکوں اور عربوں کے مابین منافرت ختم کرنے کے لیے، عربوں کو برابر کی سطح پر اعلیٰ عہدے دینے کا فیصلہ کیا اور ان کی تربیت کے لیے استنبول میں ایک درسگاہ "مدرسۃ العشائر العربیۃ" بھی قائم کی جس میں عرب صوبوں کے طلبہ کو آمد ورفت اور رہائش سمیت تمام سہولیات فراہم کی گئیں۔ عراق، طرابلس الغرب (لیبیا)، یمن، حجاز اور اُردن کے طلبہ جوق در جوق وہاں داخل ہونے لگے۔

اس درسگاہ کا نصاب پانچ سالہ تھا، جس میں قرآن مجید ناظرہ، تجوید، خوش نویسی، اسلامی تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور فوجی تربیت کے علاوہ علوم دینیہ (ضروری تفسیر، حدیث اور فقہ) بھی شامل تھے۔ عربی صرف ونحو کے ساتھ ترکی، فارسی اور فرانسیسی زبانیں لکھنے پڑھنے اور بولنے کی مشق بھی کرائی جاتی تھی۔ اس پانچ سالہ نصاب کے بعد طلبہ کو اختیار ہوتا کہ وہ اعلیٰ عسکری تربیت لیں یا انتظامی تربیت۔ عسکری تربیتی اداروں میں داخل ہونے والے طلبہ کو فراغت پر اعلیٰ فوجی عہدے دیے جاتے۔ انتظامی تربیت کا ادارہ "المدرسۃ الملکیۃ" (شاہی مدرسہ) کہلاتا تھا جہاں کا ایک سالہ نصاب پورا کر کے فضلا کو مختلف صوبوں میں انتظامی عہدے سپرد کر دیے جاتے تھے۔

جو نوجوان اسلام کی دعوت اور دینی میدان میں قوم کی رہنمائی کا ولولہ رکھتے تھے ان کے لیے "معہد تدریب الوعاظ والمرشدین" قائم کیا گیا تھا جہاں کے فضلا مختلف ممالک میں جا کر مرکزِ خلافت کے ساتھ وابستگی اور اسلامی یک جہتی کی دعوت دیتے۔ سلطان کی اس تحریک کا اثر چین تک ہوا، وہاں کے کروڑوں مسلمانوں نے خلافتِ عثمانیہ سے تعلق استوار کر لیا، بیجنگ کی تین درجن سے زائد مساجد میں سلطان کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ سلطان کی کوششوں سے بیجنگ میں ایک اسلامی درسگاہ "الجامعۃ الحمیدیۃ" قائم کی گئی جس کے دروازے پر ترکی کا پرچم نصب تھا۔ [2]

تیل کی دولت اور سلطان عبدالحمید ثانی کا منصوبہ:

ملک کو معاشی طور پر اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے سلطان نے پہلا اقدام یہ کیا کہ سخت ترین ضروریات سامنے ہوتے ہوئے بھی بیرونی قرضے لینے کا باب بند کر دیا۔ دوسرا اقدام یہ اٹھایا کہ صنعتوں کی ترقی اور تجارت کی بہتری کے ذریعے قرضوں کے بارِ گراں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

تاہم اس حوالے سے سب سے اہم پیش رفت تیل کی دریافت تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ عالمی طاقتیں اگلی صدی کی منصوبہ بندی کر کے تیل کے ذخائر پر قبضے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ انگریزوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اناطولیہ، عراق، جزیرۃ العرب اور مشرقِ وسطیٰ میں پیٹرول کے عظیم ذخائر پوشیدہ ہیں مگر اس کی تصدیق کے لیے وہ ان علاقوں میں

---

[1] الدولۃ العثمانیۃ از الصلابی: ص ۴۲۸ — [2] الدولۃ العثمانیۃ از الصلابی: ص ۴۲۸، ۴۳۰

کھدائی کرانا چاہتے تھے۔ سلطان کے ہوتے ہوئے اس ہدف کا حصول مشکل تھا۔ اس لیے انہوں نے اس مہم کو ''آثارِ قدیمہ کی تلاش'' کا عنوان دیا۔ سلطان نے یہ جاننے کے لیے کہ انگریزوں کے عزائم کیا ہیں، اس کی اجازت دے دی۔ اناطولیہ کے علاقے قیصریہ میں جبکہ عراق کے اضلاع: موصل اور بغداد میں کھدائی کا کام شروع ہوگیا۔ کھدائی میں نکلنے والے قدیم برتن اور سکے وغیرہ من وعن ترک حکام کے حوالے کیے جاتے رہے۔ اس دوران سلطان نے اپنے جاسوس ان کے پیچھے لگا دیے کہ وہ آخر چاہتے کیا ہیں۔

ایک دن برطانوی سفیر سلطان عبدالحمید کی خدمت میں آیا۔ اس نے ایک قدیم وضع کی ٹوٹی ہوئی تلوار ہدیہ کی جس کے دستے پر بیش قیمت موتی جڑے تھے۔ سفیر نے بتایا کہ شمالی عراق سے یہ نہایت قدیم تلوار برآمد ہوئی ہے۔ سلطان نے خاموشی اختیار کی۔ بعد میں جاسوسوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

پھر سلطان نے ایک ماہر تاجر کو وہ تلوار دکھائی۔ اس نے بتایا کہ یہ زیادہ پرانی نہیں۔ سلطان نے اندازہ لگا لیا کہ کھدائی سے انگریزوں کا مقصد کچھ اور ہی ہے۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ برطانوی ان علاقوں میں باقاعدہ کنوؤں کی کھدائی کرنے لگے ہیں۔ سلطان نے اب بھی خاموشی اختیار کیے رکھی کہ آخر دیکھتے برطانیہ کہاں تک دھوکہ دیتا ہے۔

یہ دیکھ کر برطانوی سفیر کو مزید حوصلہ ہوا۔ کچھ عرصے بعد اس نے درخواست کی کہ برطانوی حکومت جزیرۃ العرب اور صحرائے شام (اردن) میں میٹھے پانی کی تلاش کے لیے کنوئیں کھودنا چاہتی ہے تاکہ صحرائی باشندوں کی پانی کے حوالے سے تکالیف کا خاتمہ ہو۔ سفیر نے انسانیت کی خدمت کا واسطہ دے کر سلطان سے اس مہم کی اجازت مانگی۔

اب سلطان کو یقین ہو چکا تھا کہ کنوؤں کی آڑ میں پٹرول کی تلاش ہو رہی ہے۔ چنانچہ سلطان نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا اور حکم دیا کہ عراق اور اناطولیہ میں کھودے گئے کنوئیں بھی پاٹ دیے جائیں۔ اس چال کی ناکامی پر حکومتِ برطانیہ جل بھن کر رہ گئی۔[1] یہ ۱۸۸۵ء کے واقعات ہیں۔ ادھر سلطان نے بعض ماہر معدنیات کو ان زمینوں پر تحقیق کا کام سونپا۔ انہوں نے جائزہ لے کر بتایا کہ وہاں تیل کے بے پناہ ذخائر موجود ہیں۔[2]

سلطان نے اس بارے میں غور وخوض کیا اور اس حقیقت کو سمجھا کہ تیل کے ذخائر کو ریلوے لائن کے ذریعے ہمسایہ ممالک اور یورپ سے متصل کر دیا جائے تو یہ ایک بہت بڑا انقلاب ہوگا۔ چنانچہ عراق میں تیل کی دریافت کے اگلے ہی سال یعنی ۱۸۸۶ء میں سلطان نے رُوس کے ساتھ بغداد سے ایک ریلوے لائن کے آغاز کا معاہدہ کر لیا۔ مگر اس کا علم ہوتے ہی یورپی طاقتوں نے سازشیں شروع کر دیں اور شمالی عراق میں تیل کی اراضی خریدنے پر تل گئیں۔ یوں رُوس سے معاہدہ کھٹائی میں پڑ گیا۔[3]

---

(1) مذکرات سلطان عبدالحمید از محمد حرب: ص ۱۵۴ تا ۱۵۶

(2) ترکیا و نفط العراق، کتبہ خالد ابو هريرة، ویب سائٹ ترکیا الآن بکم مارچ ۲۰۲۰ء

(3) النعماء المنحورة لاجل النفط، عزیز اوصل، ویب سائٹ ترک پرس (TurkPress.co)، نشر بتاریخ: ۷ نومبر ۲۰۱۳ء

بہر کیف سلطان عبدالحمید نے آخر کار ان سازشوں کا توڑ اس طرح کیا کہ ۱۹۰۳ء میں ان علاقوں کو وزارت معدنیات کی جگہ خاص اپنے زیر انتظام علاقوں میں شامل کر لیا جہاں کی اراضی کی خرید و فروخت ممنوع تھی۔

اس کے بعد سلطان نے شاہ جرمنی ولیم ثانی سے ایک معاہدہ کیا جس میں طے کیا گیا کہ ترکی اور جرمنی مل کر برلن سے بغداد تک ریلوے لائن بچھائیں گے جو تیل سے مالا مال علاقوں سے گزرتی ہوئی بغداد پہنچے گی۔ موصل سے بغداد کے درمیان ریلوے لائن کے دونوں اطراف میں بیس کلومیٹر تک کے علاقے میں جرمن ماہرین تیل کے کنوئیں کھودیں گے۔ تیل نہ نکلنے کی صورت میں تمام نقصان ترکی برداشت کرے گا۔[1]

یہ منصوبہ دورِ حاضر کے "سی پیک" سے کم نہ تھا۔ اگر یہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا تو ترکی یورپ کو تیل برآمد کر کے بہت جلد اپنے تمام قرضے چکا دیتا اور ماضی کی سی شان و شوکت کے راستے پر چل پڑتا۔ اس لیے استعماری طاقتوں نے سلطان کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تاکہ اس منصوبے کی کامیابی سے پہلے ہی سلطان کا تختہ الٹ دیا جائے۔

حجاز ریلوے کا منصوبہ:

اس دوران سلطان نے حجاز ریلوے کا منصوبہ شروع کر دیا تاکہ استنبول کو مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ سے ملایا جا سکے۔ دوسرے مرحلے میں اس ریلوے لائن کو یمن تک پہنچانا طے تھا۔ یہ ہمہ جہتی منصوبہ تھا، جس سے سلطنتِ عثمانیہ کی وحدت کو قائم رکھنے، اسلامی یک جہتی کی تحریک کو مقبولِ عام بنانے، حجاج کرام کو سہولتیں دینے، صوبوں پر کنٹرول مستحکم کرنے اور دفاعی نقل و حرکت کو تیز تر بنانے جیسے عظیم الشان مقاصد وابستہ تھے۔ اگلے مرحلے میں یہی ریلوے لائن تیل کی ترسیل میں بھی کام دیتی۔ بیرونی طاقتیں اس کھیل میں بھی اپنی شرائط پر تعاون کرنے کے لیے کوشاں ہوئیں۔ چونکہ سلطنت مقروض تھی، اس لیے بیرونی امداد بظاہر ناگزیر تھی مگر سلطان نے استعماری طاقتوں کی شرائط مسترد کر دیں اور ان کی اغراض پوری نہ ہونے دیں۔ اس کی جگہ سلطان نے دعوتِ عام دی کہ تمام مسلمان اس کارِ خیر میں حصہ ڈالیں۔

سلطان نے اپنی جیب سے پچاس ہزار عثمانی اشرفیاں چندے میں دیں۔ ملکی محصولات کی آمدن سے ایک لاکھ اشرفیاں اس کے لیے مختص کی گئیں۔ دنیا بھر کے مسلمانوں نے بھی اپنی حیثیت کے مطابق چندہ دیا، مسلمانانِ برصغیر نے بھی بڑی دلچسپی لی۔ نواب حیدرآباد دکن نے ایک خطیر رقم بھیجی۔

۱۹۰۰ء (۱۳۱۸ھ) میں اس منصوبے پر کام شروع ہوا، سلطان کے سیکرٹری عزت پاشا اور مشیر خاص شیخ عبدالہدیٰ حلبی نے اس مہم کے لیے ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا۔ رات دن محنت کر کے ۱۹۰۸ء (۱۳۲۶ھ) میں دمشق سے مدینہ منورہ تک ریلوے لائن مکمل کر لی گئی۔ ۸۱۴ میل کا یہ راستہ جو خشکی میں چالیس اور سمندر میں بارہ دن کا تھا، اب تین دن میں طے ہونے لگا۔ یہ پہلی ریلوے لائن تھی جو کسی مسلم ملک نے اپنے بل بوتے پر تیار کی تھی اور معیار کے لحاظ سے کسی یورپی ریلوے لائن سے کم نہیں تھی۔

---

[1] ترکیا و نفط العراق، کتبہ خالد ابو ھریرۃ، ویب سائٹ: ترکیا الآن، یکم مارچ ۲۰۲۰ء

اس منصوبے نے عالم اسلام میں ایک خوشی کی لہر دوڑا دی اور پوری دنیا کے مسلمان سلطان عبدالحمید ثانی کو اپنا قائد ماننے لگے۔ استنبول کے برطانوی سفیر نے ۱۹۰۷ء (۱۳۲۵ھ) میں جبکہ ریلوے لائن کا افتتاح ہونے والا تھا، اس منصوبے کو ایک خطرہ باور کراتے ہوئے ایک اجلاس میں کہا تھا:

''گزشتہ دس سالوں میں ابھرنے والے خطرات میں سے اہم ترین خطرہ سلطان کی وہ مہارت ہے، جس کی بناء پر وہ تین کروڑ مسلمانوں کے سامنے خلیفہ کے روپ میں ہے جو مسلمانوں کا روحانی رہنما ہوتا ہے، سلطان نے ریلوے لائن بچھا کر اپنے دینی شعور اور اسلامی حمیت کو مسلمانوں پر ثابت کر دیا ہے کیوں کہ اس کے ذریعے عن قریب ہر مسلمان کے لیے مدینہ اور مکہ کا راستہ ہموار ہونے والا ہے۔''[1]

یہ پہلا مرحلہ تھا۔ دوسرے مرحلے میں ریلوے لائن مکہ معظمہ تک بچھائی جانی تھی جبکہ تیسرے مرحلے میں اسے یمن تک لے جانا طے تھا۔ مگر شریف مکہ حسین بن علی، کو خطرہ محسوس ہوا کہ مکہ تک ریلوے لائن بچھ جانے سے پورے جزیرۃ العرب پر ترکوں کی گرفت بڑھ جائے گی، لہٰذا وہ اس منصوبے میں رکاوٹیں ڈالنے لگا۔ مدینہ منورہ تک ریلوے لائن مکمل ہوئے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ سلطان عبدالحمید کے خلاف مغرب نواز ترک افسران نے بغاوت کر دی، اس کے بعد جنگِ بلقان اور پھر پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی، نتیجہ یہ نکلا کہ کام مدینہ منورہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ چند سالوں بعد برطانیہ کے ایماء پر شریف مکہ نے ترکی سے بغاوت کی تو اس ریلوے لائن کو خاص طور پر نشانہ بنایا تاکہ ترکوں کا حجاز سے زمینی رابطہ منقطع ہو جائے۔ بعد میں اس پورے نظام کو تباہ کر دیا گیا تاکہ خلیفہ کا یہ کارنامہ اس کی نیک یادگار اور صدقۂ جاریہ کے طور پر باقی نہ رہنے پائے۔[2]

اندرونِ ملک خفیہ باغی تنظیموں کی ریل پیل:

باہر یہ جنگیں جاری تھیں اور اندرونِ خانہ مغرب نواز طبقہ حکومتی ایوان سے خارج ہونے کے بعد خفیہ سازشوں میں مصروف تھا۔ ان لوگوں نے اپنی فکری و نظریاتی جنگ تیز کرتے ہوئے کچھ خفیہ تنظیمیں تشکیل دے ڈالیں۔ سب سے قدیم جماعت ''الشبیبۃ العثمانیۃ'' تھی جو ۱۸۶۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا ہدف سلطنتِ عثمانیہ کو مغربی رنگ میں ڈھالنا تھا۔ شروع کے دو سالوں میں اس کے صرف چار ارکان تھے مگر پھر بڑھتے بڑھتے تعداد اڑھائی سو تک پہنچ گئی۔ وزیر عالی پاشا نے اس کے خلاف کارروائی کی تو تنظیم کے کئی قائدین پیرس فرار ہو گئے۔ عالی پاشا کی وفات کے بعد ۱۸۸۴ء میں ان مفرورین کو معافی دے دی گئی۔ واپس آ کر اس کے ارکان جمعیۃ الاتحاد والترقی میں شامل ہو گئے۔

جمعیۃ الاتحاد والترقی سلطان عبدالحمید کے دور میں قائم ہونے والی سب سے بااثر تنظیم تھی جس کی داغ بیل ۱۸۹۸ء میں پیرس میں ڈالی گئی تھی۔ یہ ''جمعیۃ ترکیا الفتاۃ'' (جوانانِ ترک) کا عسکری ونگ تھی۔ یہ جماعت ترکوں کے اذہان میں قومیت اور لسانیت کا زہر ایسے غیر محسوس انداز میں اتارتی رہی کہ دوسری قوم میں خبردار نہ ہونے پائیں۔

---

[1] صحوۃ الرجل المریض: ۱۱۳، ۱۱۲
[2] صحوۃ الرجل المریض: ص ۱۱۳، ۱۱۲

۱۹۰۵ء میں سلانیک میں جمعیۃ الحریۃ قائم ہوئی۔ بعد میں وہ پیرس میں جمعیۃ الاتحاد والترقی میں شامل ہوگئی اور دونوں کا مشترکہ نام "الجمعیۃ العمومیۃ للاتحاد والترقی" طے ہوا۔ ان کے علاوہ کئی عسکری خفیہ تنظیمیں الگ الگ جرنیلوں کے ناموں سے موسوم تھیں جن میں تنظیم جنرل نیازی بیگ، تنظیم رائف بیگ، تنظیم حسن بیگ، تنظیم صلاح الدین بیگ اور تنظیم جنرل انور بیگ مشہور ہیں۔ ان خفیہ گروہوں کی ہمدردیاں خلافت کی بجائے یورپی طاقتوں کے ساتھ وابستہ تھیں۔ ①

عالمگیر صہیونیت اور سلطان عبدالحمید

سلطان عبدالحمید اس وقت اپنی فوج کو مضبوط کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ یہودیوں کی عالمی سازشوں کا مقابلہ بھی کر رہا تھا۔ یہودی اس وقت فری میسن، یہود الدونمہ اور غیر ملکی یہودی سرمایہ داروں کی شکلوں میں سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف مصروفِ پیکار تھے۔

اس دوران یہودیوں نے اپنی عالمگیر صہیونی تحریک کا آغاز بھی کر دیا تھا، جس کا بانی آسٹریا کا ایک صحافی "تھیوڈور ہرتزل" (۱۸۶۰ء تا ۱۹۰۴ء) تھا۔ اس نے اپنی تصنیف "الدولۃ الیہودیۃ" میں دریائے نیل سے لے کر دریائے فرات تک ایک عظیم یہودی ریاست قائم کرنے، فلسطین کو مرکز بنانے اور عالمگیر یہودی بادشاہ (دجال) کے اقتدار کی راہ ہموار کرنے کا منصوبہ پیش کیا۔ اس تصنیف نے یہودیوں کو عالمگیر صہیونی تحریک کے لیے کھڑا کر دیا تھا۔

۱۸۹۶ء (۱۳۱۴ھ) میں ہرتزل نے سوئٹزرلینڈ کے شہر "باسل" میں صہیونیوں کی پہلی سالانہ کانفرنس منعقد کی جس میں تین سو ایسے یہودی رہنماؤں کو بلایا گیا تھا جو دنیا بھر میں یہود کے غلبے کے لیے سرگرم تھے۔ ہرتزل نے اعلان کیا کہ ہم نے یہودیت کے غلبے کا پہلا پتھر نصب کر دیا ہے، اور عن قریب دنیا ہمارے تابع ہوگی۔ اسی کانفرنس میں پہلی بار "حکمائے صہیون کے پروٹوکولز" پیش کیے گئے اور نہایت اہم قراردادیں منظور کی گئیں جن کا خلاصہ تین نکات تھے:

① ہم فلسطین میں آزاد یہود مملکت قائم کریں گے۔
② ہم دنیا کی اقتصادیات میں یہود کو غالب کریں گے یعنی دولت کے تمام سرچشمے ہمارے ہاتھ میں ہوں گے۔
③ قدیم عبرانی زبان وثقافت جو دنیا میں ناپید ہوگئی تھی، پھر سے زندہ کی جائے گی۔

اسی کانفرنس میں اقوام متحدہ سے ملتے جلتے ایک عالمی ادارے کا تصور بھی زیرِ بحث آیا۔

ہرتزل نے جرمنی، آسٹریا، روس، اٹلی اور برطانیہ کے اعلیٰ عہدے داروں کو بھی اپنے منصوبے کا حامی بنالیا اور پھر اپنے معتقد نیولنسکی کو جس کے دربارِ خلافت سے مراسم تھے، سلطان عبدالحمید کے پاس بھیج کر درخواست کی کہ یہودیوں کو آبادکاری کے لیے فلسطین میں اراضی دے دی جائیں جس کا معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ ②

---

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۹۸/۸ تا ۱۹۹
② التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۹۹/۸

ہرتزل کی پیش کش تھی: ''ہم سلطنتِ عثمانیہ کی مالی حالت بہتر بنانے کے لیے ۲ کروڑ لیرے دیں گے، جن میں سے ۳۰ لاکھ فلسطین کا عوض ہوں گے، اور باقی کے ذریعے ترکی اپنے قرضے ادا کر کے یورپی تسلط سے نجات کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔ ہم اس کے بعد بھی سلطان کو حسبِ طلب قرضے دیتے رہیں گے۔''

نیولنسکی نے قصرِ یلدز میں سلطان سے مل کر ہرتزل کا پیغام دیا تو سلطان نے کہا:

''کیا یہ ممکن ہے کہ ہم یہودیوں کو فلسطین کے سوا دیگر علاقوں میں زمینیں دے دیں۔''

نیولنسکی نے کہا: ''فلسطین یہودیوں کا اولین مرکز ہے۔ یہودی وہیں واپسی کے خواہش مند ہیں۔''

سلطان نے اس موقف کو مسترد کرتے ہوئے کہا: ''فلسطین صرف یہودیوں کا نہیں، باقی سب مذاہب کے لیے بھی مقدس مقام ہے۔''[1]

سلطان عبدالحمید کا دنیائے یہودیت کو دوٹوک جواب:

نیولنسکی نے کچھ مزید معروضات پیش کیں مگر آخر میں سلطان نے دنیائے یہودیت کی پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے نیولنسکی کو صاف صاف جواب دے دیا۔ سلطان کے یہ الفاظ تاریخ میں محفوظ ہیں:

''اپنے دوست ہرتزل کو سمجھا دو کہ اس معاملے میں بے سود کوشش نہ کرے۔ میں فلسطین کی بالشت بھر زمین دینے کا بھی روادار نہیں ہوں۔ یہ زمین میری ملکیت نہیں، ملتِ مسلمہ کی امانت ہے۔ میری قوم نے اس سرزمین کو حاصل کرنے کے لیے جہاد کیا اور اسے اپنے لہو سے سیراب کیا۔ یہودی اپنے کروڑوں ڈالر اپنے پاس سنبھال کر رکھیں۔ ہاں اگر خلافت مٹ گئی تو پھر یہودی اس زمین کو بلاقیمت لے لیں گے۔ مگر جب تک میں زندہ ہوں تو مجھے اپنے بدن کا پارہ پارہ ہونا منظور ہوگا مگر مجھ سے یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ فلسطین، خلافت سے الگ ہو جائے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں جیتے جی کبھی بھی اپنے وجود کو پاش پاش کرنے کی حمایت نہیں کر سکتا۔''[2]

اس ناکامی کے بعد ہرتزل جرمنی جا کر شاہ ولیم ثانی سے ملا جس کے ترکی سے حلیفانہ تعلقات تھے۔ ہرتزل نے کوشش کی کہ جرمنی دباؤ ڈال کر سلطان عبدالحمید سے یہود کا مطالبہ منوالے مگر اس میں بھی اسے ناکامی ہوئی۔[3]

ہرتزل کی سلطان سے ملاقات:

۱۸۹۹ء (۱۳۱۷ھ) میں ہرتزل نے سلطان سے خود ملنے کی کوشش کی اور استنبول پہنچا مگر اسے قصرِ یلدز میں داخلے سے روک دیا گیا۔ مگر دو سال تک کوشش کے بعد آخر ۱۹۰۱ء (۱۳۱۹ھ) میں ''صہیونیت جدیدہ'' کا بانی سلطان سے ملاقات کا وقت لینے میں کامیاب ہو گیا۔ قصرِ یلدز میں ہونے والی دو گھنٹے کی اس ملاقات میں ہرتزل نے سلطان

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۴۳۵، نقلاً عن "اليهود والدولة العثمانية: ص ۱۲۶ تا ۲۱۱"
② صحوة الرجل المريض: ص ۹
③ الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۴۳۶

کو یقین دلایا کہ اس کی پیش کش ماننے کے نتیجے میں سلطنتِ عثمانیہ کے ان قرضوں کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے گا جو گزشتہ بیس سال میں لیے گئے ہیں۔ سلطان عبدالحمید خاموشی سے ہرزل کی طویل تقریر سنتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ سلطان اس سے متفق ہو چکا ہے مگر جب آخر میں سلطان نے زبان کھولی تو اس کا فیصلہ وہی تھا، جو پہلے تھا۔[1]

سلطان صیہونی تحریک کے عزائم پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس نے ہرزل سے ملاقات پر درج ذیل تبصرہ کیا:

''صیہونی پیشوا ہرزل مجھے اپنے خیالات سے متفق کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ ہرزل کا کہنا تھا کہ جس دن یہودی اپنی زمینیں خود کاشت کرنے لگیں گے، اس دن یہودیوں کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس کی رائے درست ہے اسی لیے وہ اپنے یہودی بھائیوں کو زمینوں کا مالک بنانے کی کوشش کر رہا ہے، مگر فقط ذہانت سے تمام مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ صیہونی فلسطین میں صرف زراعت نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ ایک باقاعدہ حکومت بنانے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔ میں ان کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ یہ یہودیوں کی خوش فہمی ہے کہ میں ان کی باتیں مان لوں گا۔ اگرچہ میں اپنے یہودی شہریوں کی خدمات کی قدر کرتا ہوں مگر فلسطین کے بارے میں ان کی آرزوؤں کا سخت مخالف ہوں۔''[2]

سلطان واضح طور پر کہتا تھا:

''ہم بیت المقدس سے کیوں دست کش ہوں۔ یہ ہر وقت اور ہر دور میں ہماری سرزمین رہی ہے اور رہے گی۔ یہ ہمارے مقاماتِ مقدسہ میں سے ہے، اسلامی دنیا میں واقع ہے۔ ضروری ہے کہ ارض القدس ہماری ہی رہے۔''[3]

سلطان عبدالحمید کے خلاف یہودیوں کی سازشیں:

اس کے بعد جیسا کہ سلطان عبدالحمید کو توقع تھی، ہرزل نے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اس کا کہنا تھا: ''سلطان عبدالحمید سے گفتگو کی روشنی میں یہ واضح ہو گیا ہے کہ ترکی سے فائدہ اٹھانا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کی سیاسی حالت نہ بدل دی جائے یا اسے ایسی جنگ میں دھکیلا جائے جس میں اسے شکست ہو جائے یا یہ دونوں باتیں ایک ساتھ واقع ہوں۔''[4]

سلطان نے خلافت اور ارضِ مقدس کے بارے میں صیہونی سازشوں کی روک تھام کے لیے سر توڑ کوشش کی، یہودیوں کے ہاتھ فلسطین کی کوئی بھی زمین فروخت کرنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا۔ جاسوسوں کے ذریعے اندرون اور بیرون ملک یہودیوں کی سرگرمیوں کی فوری خبریں حاصل کرنے کا نظام بنایا۔ ۱۸۹۰ء میں اس نے سلطنتِ عثمانیہ کی حدود میں نئے یہودیوں کا داخلہ بند کرنے اور ان کی سازشوں کی بیخ کنی کے لیے دو مستقل ادارے قائم کیے۔[5]

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابي: ص: ۴۳۷، ۴۳۸
② الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابي: ص: ۴۳۹
③ الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابي: ص: ۴۳۹
④ الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابي: ص: ۴۳۹
⑤ سلطان عبدالحمید ثانی از محمد حرب: ص ۸۸

یوں ہرتزل کا یہ کہنا درست ثابت ہوا کہ "جب تک سلطان عبدالحمید کی حکومت باقی ہے، یہودی اپنی ارض موعودہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔"[1]

قاتلانہ حملہ:

سلطان عبدالحمید ثانی دنیائے کفر کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ آخر کار دشمنوں نے سلطان کو قتل کرنے کی ایک گھناؤنی سازش ترتیب دی۔ بلجیم کے ایک جاسوس "جوریس" کو، جو بم سازی کا ماہر تھا، اس مقصد کے لیے تیار کیا گیا۔ وہ ۱۹۰۵ء میں استنبول پہنچا اور سلطان کی نقل و حرکت دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

سلطان کے محل میں حفاظتی انتظامات اتنے سخت تھے کہ اسے اندر گھسنے کی کوئی راہ نہ ملی۔ آخر اس نے دیکھا کہ سلطان نماز جمعہ کے لیے جامع مسجد یلدز جاتا ہے اور واپسی میں مسجد کے دروازے کے باہر چند سیکنڈ کے لیے رک کر لوگوں کو دیدار کراتا ہے اور پھر اپنی بگھی میں سوار ہو جاتا ہے۔ سلطان وقت کا اتنا پابند تھا کہ مسجد سے نکلنے اور بگھی میں بیٹھنے کا وقت کبھی آگے پیچھے نہیں ہوتا تھا۔ یہ ہمیشہ ۴۲ سیکنڈ کا وقفہ ہوتا تھا۔ جوریس نے انہی لمحات سے فائدہ اٹھانا طے کر لیا۔ یورپ سے ایک خصوصی قسم کی گھوڑا گاڑی بھیجی گئی، جوریس نے اس کے خفیہ حصوں میں ایک سو کلوگرام دھماکہ خیز مواد کا ٹائم بم نصب کر دیا۔ ۲۱ جولائی ۱۹۰۵ء (۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ) کو یہ گھوڑا گاڑی جامع مسجد کے دروازے کے پاس اس جگہ لگا دی گئی جہاں نماز جمعہ کے وقت بگھیاں کھڑی کی جاتی تھیں۔

سلطان نماز سے فارغ ہو کر مسجد کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ اچانک شیخ الاسلام جمال الدین سامنے آگئے اور ان سے کسی مسئلے پر بات چیت شروع کر دی۔ اسی دوران اچانک کان پھاڑنے والا دھماکہ ہوا، کچھ دیر کے لیے سب کچھ دھوئیں اور گرد و غبار میں چھپ گیا۔ جب مطلع صاف ہوا تو لوگوں نے سلطان کو انسانی لاشوں اور مرے ہوئے گھوڑوں کے بیچ سے اٹھتے دیکھا۔ اس کا چہرہ حسب معمول بالکل پرسکون تھا۔ اللہ نے اسے بال بال بچا لیا تھا۔

سلطان اپنی گھوڑا گاڑی خود چلاتا ہوا، حسب معمول پورے وقار سے محل پہنچا۔ لوگ گھبرائے ہوئے تھے۔ سلطان نے انہیں تسلی دی۔ سلطان کے محکمہ مخابرات نے جلد ہی مجرم کو ڈھونڈ نکالا۔ اس سے اصل کہانی کی تفتیش کے بعد سلطان نے اسے اس شرط پر معاف کر دیا کہ وہ اس کے لیے جاسوسی کرے۔ جوریس، کرائے کا قاتل تھا، لہٰذا اس پر رضامند ہو گیا۔ اگلے سالوں میں وہ سلطان کو یورپی دنیا سے مفید معلومات لے کر دیتا رہا۔ اس نے قاتلانہ کارروائی کے متعلق جو کچھ بتایا، اس کی تفصیل کسی پر ظاہر نہیں کی گئی، اس لیے مؤرخین لاعلم ہیں کہ یہ سازش کس کی تھی؟ اتنی بات طے ہے کہ مجرم کا مقدونیہ یا آرمینیا وغیرہ کی باغی تنظیموں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی لیے بعض ترک مؤرخین کا یہ خیال وزن رکھتا ہے کہ یہ سازش صیہونیوں کی تھی، جنہیں فلسطین کے متعلق سلطان کے اٹل موقف پر شدید غصہ تھا۔[2]

---

① الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابي: ص: ۴۵۰

② تاریخ الدولة العثمانية از یلماز اوزتونا: ۲/۲۳، ۱۳۰

صہیونی عزائم کی تکمیل کے لیے ترقی پسندوں کی خدمات:

اس سے پہلے سلطان عبدالحمید جدت پسند ترکوں کو لگام دینے کی پوری کوشش کرتا آرہا تھا۔ صدراعظم مدحت پاشا کو معزول اور جلاوطن کرنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس کے بعد برطانیہ کی سرپرستی میں علی سعاوی اور پھر فری میسن کے بعض ایجنٹوں نے سلطان کا تختہ الٹنے کی سازش کی مگر یہ دونوں کوششیں بھی ناکام بنادی گئیں۔

مگر اس کے باوجود سیاسی اور عسکری میدان میں حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ذہن سازی کا کام جاری رہا۔ احمد رضا بیگ نامی ایک نامور ترک عہدے دار سیاسی محاذ پر یہودیوں کا آلۂ کار بنا۔ بعد میں وہ پیرس چلا گیا اور ''المنشورات'' نامی رسالہ جاری کر کے ترکوں کو جدت پسندی کی طرف مائل کرتا رہا۔

فوج میں باغیانہ ذہنیت عام کرنے میں استنبول کی عسکری درسگاہ کے بعض اساتذہ پیش پیش تھے۔ ان حکومت مخالف سپاہیوں کی پہلی تنظیم ''الاتحاد العثمانی'' ۱۸۸۹ء میں قائم ہوئی جس کا بانی فری میسن ایجنٹ ابراہیم تیمو الرومانی تھا۔ اس تنظیم کے رکن زیر تربیت نوجوان سپاہی اگلے دس برسوں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے۔

نوجوان ترک افسران میں ملے جلے ذہن کے لوگ تھے، جنہیں مختلف عنوانات سے بہلا کر ہم نوا بنایا گیا تھا۔ چونکہ اکثر ترک سپاہی بنیادی طور پر اسلام پسند تھے، اس لیے ان پر یہی ظاہر کیا گیا کہ اس تحریک کا مقصد اسی عدل وانصاف، حریت اور مساوات کا تحفظ ہے جس کی تعلیم اسلام دیتا ہے۔ اس قسم کے افسران خلافت یا اسلام کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ سلطان عبدالحمید کو ایک جابر اور دقیانوسی حکمران تصور کر کے اس کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ انور پاشا، جمال پاشا اور ایوب صبری اسی قسم کے افراد تھے۔

دوسری قسم کے افسران وہ تھے جو مغربی افکار سے بری طرح متاثر تھے اور اسلامی سیاست اور شرعی پابندیوں ہی کو لغو تصور کرتے تھے۔ جدت پسندی اور قوم پرستی کے شیدائی اور اسلام سے بیزار تھے۔ یہ لوگ تہذیب وتمدن میں اگر مغرب کو مقتدا مانتے تھے تو دوسری طرف چنگیز خان اور تیمور لنگ کو بھی فقط اس لیے مثالی رہنما قرار دیتے تھے کہ وہ ترک تھے۔ ان میں سے بعض کا کہنا تھا کہ ہمارا قبلہ ''توران'' (ترکستان) ہے۔ ان کے نزدیک قدیم غیر مسلم ترکوں کی مشرکانہ عبادات ورسومات ادا کرنا بھی قابلِ تحسین تھا۔

بہرصورت سلطنتِ عثمانیہ کے لیے سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ سرکاری فوج مغربی افکار سے متاثر اور سلطنت سے غداری کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اگر فوج دین دار اور وفادار رہتی تو یہودی اور ان کے تربیت یافتہ سیاست دان اور جدت پسند صحافی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی خلافتِ عثمانیہ کو جنبش نہیں دے سکتے تھے۔

جب سلطان عبدالحمید کے صہیونیوں سے فلسطین کے متعلق مذاکرات ناکام ہوئے اور یہودیوں نے خلافت کے خاتمے کا حتمی فیصلہ کیا تو یہی فوجی افسران صہیونیوں کا ہراول دستہ ثابت ہوئے۔

اگرچہ صیہونیت جدیدہ کا بانی ہرزل ۱۹۰۴ء میں فوت ہو گیا مگر یہودی زعماء اس کے منصوبے پر کار بند رہے۔ وہ اپنی بے پناہ دولت، عالمی تجارت پر اپنے اثر و رسوخ اور ذرائع ابلاغ پر تسلط کے ذریعے دنیا میں کسی کو نیک نام یا بدنام کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے نہایت مربوط منصوبہ بندی کے ساتھ اپنی تمام طاقتوں کو استعمال کیا۔ اپنے ہم نوا ترک صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کی ایک کھیپ وہ پہلے ہی تیار کر چکے تھے۔ اب انہوں نے خلافتِ عثمانیہ کے مخالف عناصر کو متحد کیا۔ غدار فوجی افسران کی جماعت "الاتحاد العثمانی" اور سیاسی محاذ پر کام کرنے والے احمد رضا بیگ جیسے لوگوں کو مربوط کر کے "جمعیة الاتحاد والترقی" کے عنوان سے یکجا کر دیا گیا۔ پھر آرمینیا اور بلقان کے باغی نصرانیوں کو منظم کیا گیا اور جمعیت الاتحاد والترقی کے غدار فوجی افسران کو ان کا حامی بنا دیا گیا۔ فوج میں غداروں کی ریل پیل کے باعث سلطان عبدالحمید رفتہ رفتہ بے بس ہوتا چلا گیا۔[1]

باغی افسران اور مرکزِ خلافت میں کشمکش:

اس وقت سلطنت عثمانیہ کی چار بڑی فوجی چھاؤنیاں: استنبول، ارضِ روم (اناطولیہ) سلانیک اور بلقان میں تھیں۔ استنبول کی فرسٹ آرمی کور میں سلطنت کے وفادار اور غدار ملے جلے تھے، اناطولیہ کی فورتھ آرمی کور میں وفادار غالب تھے۔ جبکہ مقدونیہ اور سلانیک کی سیکنڈ اور تھرڈ آرمی کورز میں باغی افسران و سپاہ کی واضح اکثریت تھی۔

سلطان عبدالحمید کو جاسوسوں کے ذریعے غدار افسران کی خبریں مل چکی تھیں۔ اس نے تھرڈ آرمی کور کے کمانڈر شمسی پاشا کو حکم دیا کہ وہ باغیوں کے سرغنہ جنرل نیازی بیگ کو گرفتار کرلے مگر اس سے پہلے ہی شمسی پاشا قتل کر دیا گیا۔ سلطان نے استنبول سے ایک فوج بھیجی مگر وہ بھی جا کر غداروں سے مل گئی۔ یوں باغیوں کا پلہ واضح طور پر بھاری ہو گیا۔[2]

قصرِ خلافت کا محاصرہ۔ خلیفہ کے اختیارات سلب:

۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء اسلامی تاریخ کا وہ نامبارک دن تھا جب ان فوجی افسران نے سالونیکا (سلانیک) میں اپنے ہم نوا سیاست دانوں کے ساتھ ایک مشترکہ کانفرنس کی جس میں سلطان عبدالحمید سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر، جمہوری دستور کو نافذ کرنے کا اعلان کر دے۔ بصورتِ دیگر فوج دارالحکومت پر دھاوا بول دے گی۔

ٹیلی گراف کے ذریعے یہ پیغام استنبول پہنچا دیا گیا۔ سلطان عبدالحمید نے مہلت حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ اس دوران اپنے وفادار افسران کو تیار کر سکے۔ اس نے تار بھیج کر محکمہ سراغ رسانی کے افسر اعلیٰ حسین حلمی پاشا سے پوچھا: "کیا باغیوں سے مزاحمت میں کامیابی کا امکان ہے یا نہیں؟"

حلمی پاشا نے اثبات میں جواب دیا۔ جس کے بعد سلطان نے سلانیک میں اپنے وفادار جنرل خیری پاشا کو حکم بھیجا کہ وہ باغیوں کا مقابلہ کرے مگر خیری پاشا نے بزدلی دکھاتے ہوئے یہ کام ایک اور افسر ابراہیم پاشا کے سپرد کر دیا جس

---

[1] الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۳۵۰ تا ۳۵۶

[2] التاريخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۲۰۲، ۲۰۳

نے ذمہ داری قبول تو کر لی مگر عملاً کچھ بھی نہ کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باغیوں کی طاقت کا اندازہ لگانے میں سلطان اور اس کے محکمہ خبر رسانی سے غلطی ہو گئی تھی اور وہ کسی انقلاب سے نمٹنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اس کے بعد جب باغی افواج نے سالونیکا سے استنبول پہنچ کر قصرِ یلدز کا محاصرہ کیا تو سلطان مجبور ہو گیا۔ باغی افسران نے شیخ الاسلام کو ساتھ لے کر سلطان سے جمہوری دستور پر دستخط کرا لیے۔

باغی فوجی افسران سلطان کو معزول کر دینا چاہتے تھے مگر انہوں نے اس کے لیے تدریجی راستہ اختیار کیا۔ کیوں کہ ابھی فوج کا ایک حصہ سلطان کا وفادار تھا۔ اگر باغی سلطان کی معزولی پر زور دیتے تو خانہ جنگی شروع ہو جاتی۔ ویسے بھی سلطان نے ان کے مطالبے مان کر اپنی برطرفی کا کوئی جواز نہیں رہنے دیا تھا۔ اس لیے باغیوں نے بھی فی الحال جمہوری دستور کے نفاذ پر اکتفا کیا۔

اس کے بعد انتخابات ہوئے اور دسمبر میں پارلیمان وجود میں آ گئی جس میں ترقی پسندوں کی اکثریت تھی۔ استنبول میں فتح کا جشن منایا گیا اور کامیاب لیڈروں کا شاندار استقبال ہوا۔ صدر اعظم فرید پاشا کو معزول کر کے سعید پاشا کو اس کی جگہ بٹھا دیا گیا۔ ''جمعیۃ نوجوانان ترکی پیرس'' کے بانی احمد رضا بیگ کو پارلیمان کا رئیس مقرر کر دیا گیا۔

عام معافی کا اعلان کر کے جیلوں کے دروازے کھول دیے گئے، یوں سلطنتِ عثمانیہ کے غدار تمام مجرم رہا ہو گئے، مگر دوسری طرف جمعیت اتحاد و ترقی پر ہاتھ ڈالنے والے افسران اور سپاہیوں کو چن چن کر قتل کیا جانے لگا۔①

ترقی پسندوں کی حکومت اور استنبول میں ہنگامے:

ترقی پسندوں اور قوم پرستوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ جب تک سلطان عبدالحمید مسندِ خلافت پر ہے، ان کے اہداف پورے نہیں ہو سکتے۔ اس لیے انہوں نے طے کیا کہ استنبول میں امن قائم نہ ہونے دیا جائے اور بدامنی کی ذمہ داری سلطان پر ڈالی جائے۔ اس طرح وہ سلطان عبدالحمید کو شورش پسندوں کا حامی اور آئین و دستور کا باغی ثابت کر کے اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان چھڑانا چاہتے تھے۔

اُدھر ترکی میں اس انقلاب سے مذہبی طبقہ سخت مضطرب تھا۔ خود استنبول میں ایسے لوگ کم نہیں تھے جنہیں جدت پسندوں کی اجارہ داری برداشت نہیں تھی۔ انہوں نے ''الجمعیۃ المحمدیہ'' کے نام سے قوم پرست انقلاب کو مسترد کرنے کے لیے منظم ہونا شروع کر دیا تھا۔ ان کے سربراہ روزنامہ ''وولکن'' کے مدیر حافظ درویش وحدتی تھے جو ایک نقشبندی صوفی بزرگ تھے۔ انہوں نے سلطان کی حمایت میں آواز بلند کی اور اپنے اخبار میں موجودہ سیاسی فضا کے خلاف مضامین اور مقالات کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۳ فروری ۱۹۰۹ء (۲۲ محرم ۱۳۲۷ھ) میں یہ مضامین چھپنا شروع ہوئے تو بہت سے لوگ سلطان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے مطالبات یہ تھے:

---

① التاریخ الاسلامی للدکتور محمود شاکر: ۸/۲۰۳، ۲۰۲

❶ شرعی قوانین کو دوبارہ نافذ کیا جائے۔

❷ عام معافی کے اعلان پر عمل کیا جائے اور سلطان کے وفادار سپاہیوں کو سزائیں نہ دی جائیں۔

❸ صدر اعظم، بحری و بری افواج کے سربراہوں اور درج ذیل اعلیٰ عہدے داروں کو جلاوطن یا معزول کیا جائے۔ "احمد رضا بیگ، حسین جاہد بیگ، جاوید بیگ، رحمی بیگ، طلعت بیگ، اسماعیل حقی، محمود مختار پاشا۔"

ترقی پسند اس کش مکش کو بڑھا کر معاملہ خانہ جنگی اور سلطان کی برطرفی تک لے جانا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے اشتعال انگیزی کو ہوا دی، چنانچہ استنبول میں دو طرفہ احتجاجی مظاہروں اور ہنگاموں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔[1]

نوشتۂ دیوار پڑھ لیا:

سلطان نے نوشتۂ دیوار پڑھ لیا تھا اور اندازہ لگا لیا تھا کہ مغربی ذرائع ابلاغ سے بہکے ہوئے فوجی جرنیل اور مغربی آزادی کی شراب سے مدہوش لوگ اب آپے سے باہر ہو چکے ہیں۔ انہیں کوئی قیامت ہی ہوش میں لائے گی۔ وہ بہت جلد اس ہنگامے کو بنیاد بنا کر منصب خلافت کے بال و پر کاٹ ڈالیں گے۔ دوسری طرف جو لوگ سلطان کی حمایت میں گلیوں اور سڑکوں پر نکل آئے تھے، انہیں اکسانے والے بھی اکثر بیرونی آلۂ کار تھے۔ یہ سادہ لوح لوگ سڑکوں پر آ کر سلطان کے حق میں نعرے لگا رہے تھے، مغربی ذرائع ابلاغ کے ہاتھوں میں استعمال ہو رہے تھے۔ دنیا مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑا کر تماشا دیکھنا چاہتی تھی۔

سلطان نے ان دنوں اخبارات کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے حامیوں اور مخالفین کو جوش کی انتہا پر دیکھ کر بارہا کہا تھا:

"نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ ایک سازشوں میں لپٹا ہوا معرکہ ہونے کو ہے کہ جس میں ٹکرانے والوں کو فائدہ ہوگا اور بیچ کا (غیر متعلق) شخص نقصان اٹھائے گا۔"

۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء (۲۲ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ) کو استنبول میں ایک بپھرا ہوا جلوس نکلا جس میں بیس ہزار افراد نے انجمن اتحاد و ترقی کے خلاف نعرے بازی کی اور دستوری حکومت توڑنے کا مطالبہ کیا۔[2]

مظاہرین نعرے لگا رہے تھے: "ہم سلطان کو چاہتے ہیں...... ہم شریعت کو چاہتے ہیں۔"

دوسری جانب سے مخالفین بھی نکل آئے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پھر گولیاں بھی چلنے لگیں۔[3]

سلطان کی بیٹی شہزادی عائشہ عثمان تحریر کرتی ہیں:

"ہم نے گولیاں چلنے کی آوازیں سنیں۔ ہم پر خوف طاری ہو گیا۔ میرے والد حرم سرا اور شاہی سرا کے درمیان چلتے ہوئے اپنے کاتب جواد بیگ اور رضا بیگ کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے اور سمجھنے کی کوشش

---

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۲۰۳، ۲۰۵؛ خلافت اسلامیہ سقوط و احیاء از حق نواز: ص ۸۴، ۸۵، ط زمزم پبلیکیشنز پاکستان؛ والدی السلطان عبدالحمید الثانی: ص ۲۳۰

② بحوالہ جات بالا ③ والدی السلطان عبدالحمید الثانی: ص ۲۳۰

کر رہے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ جب وہ حرم سرا میں آئے تو بولے: وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں نے تمہیں کہا نہ تھا کہ ایک سازشوں میں لپٹا ہوا معرکہ ہوگا۔ لو اب وہ شروع ہو چکا ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ سخت رنجیدہ تھے۔"[۲]

اس دوران ایک ہجوم "ہم سلطان کو چاہتے ہیں۔" کے نعرے لگاتا ہوا شاہی محل کے سامنے آگیا۔ ان میں سلطان کے حامی سپاہی بھی تھے۔ وہ "علی قبولی بیگ" نامی ایک شخص کو سلطان کا مخالف کہہ کر گھسیٹتے ہوئے لائے تھے جس پر غشی طاری تھی اور تشدد کے آثار واضح تھے۔ سلطان نے یہ منظر دیکھا تو کرب سے بے حال ہو کر محل کی کھڑکی سے ہجوم کو مخاطب کیا اور کہا: "میرے بچو! اسے چھوڑ دو۔ میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ اس شخص کو میری خاطر معاف کر دو۔"

سلطان کا مصاحب شہر الدین آغا پانی کا پیالہ لے کر دوڑ کر گیا تاکہ بے چارے علی قبولی کو پلائے مگر بپھرے ہوئے ہجوم نے اسے آگے نہ بڑھنے دیا اور وہیں علی قبولی کو قتل کر دیا۔ اس حادثے نے سلطان پر شدید اثر ڈالا۔[۳]

سلطان کی بیٹی شہزادی عائشہ عثمان تحریر کرتی ہیں:

"والد صاحب جب حرم سرا واپس آئے تو پسینہ پسینہ تھے۔ رنج و غم سے ان کے کندھے جھک گئے تھے۔ انہوں نے سر پکڑ کر کہا: آج کے بعد نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ فوج سرکش ہو کر بے چھری بن گئی ہے۔ ہائے تباہی۔ سلطان کے چہرے سے رنج والم ٹپک رہا تھا۔ اتنے رنجیدہ اور غم زدہ وہ اس دن بھی نہ تھے جب انہیں تخت سے اتارا گیا۔ اس دن کے بعد میرے والد کے چہرے پر ان کی پرانی بشاشت کا ایک ذرہ بھی واپس نہ آسکا۔ وہ کہتے تھے: "میرے دشمنوں کی تمنائیں پوری ہوگئی ہیں۔"[۴]

سلطان عبدالحمید استعفے کے لیے تیار:

اس دوران سلطان نے جواد بیگ کو بھیجا کہ وہ سرکشوں کو عقل سے کام لینے کی تلقین کریں۔ جواد بیگ نے واپس آکر اطمینان دلایا کہ مظاہرین مطمئن ہو گئے ہیں مگر درحقیقت ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ چنانچہ اگلے دن پھر ہنگامے پھوٹ پڑے۔ سلطان نے جنگِ یونان کے فاتح ادھم پاشا کو بھیجا مگر سب کچھ بے سود رہا۔ سلطان کو یقین ہو گیا کہ یہ معاملہ تخت سے برطرفی پر ہی منتج ہوگا۔ سلطان نے صدر اعظم توفیق پاشا کو اپنے مستعفی ہونے اور اپنے بھائی محمد رشاد کو جانشین بنانے کے ارادے سے آگاہ کر دیا۔ سلطان نے کہا:

"مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ مجھے حکمران نہیں دیکھنا چاہتے۔ بلاشبہ میں دستبرداری کے لیے تیار ہوں۔ مگر یہ واضح رہنا چاہیے کہ ۱۳ اپریل کے ہنگاموں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔"[۱]

ترقی پسندوں کا مکر و فریب:

ادھر ۱۳ اپریل کے ہنگاموں کے فوراً بعد ترقی پسندوں نے پارلیمان کا اجلاس بلایا اور مظاہرین کے بعض مطالبات

---

① والدی السلطان عبدالحمید الثانی: ص ۲۳۲، ۲۳۳ ② والدی السلطان عبدالحمید الثانی: ص ۲۳۱، ۲۳۲
③ والدی السلطان عبدالحمید الثانی: ص ۲۳۲، ۲۳۳ ④ والدی السلطان عبدالحمید الثانی: ص ۲۳۳

تسلیم کر لیے۔ چنانچہ پارلیمان کے سربراہ احمد رضا بیگ سمیت بعض اعلیٰ عہدے داروں کو معزول کر دیا گیا اور اسماعیل حقی کے سوا باقی فوجی جرنیلوں کو استنبول سے باہر بھیج دیا گیا۔ سیکولر صحافیوں نے ان واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا بلکہ ایک سازش کے تحت یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ سلطان کے حامی جیت گئے ہیں اور سلطان نے اپنا سابقہ مقام واپس حاصل کر لیا ہے اور پارلیمان اب محض ایک مہرہ ہے۔ یہ فضا بنا دینے کے بعد ترقی پسندوں نے سلطان عبدالحمید کو ہنگاموں کا ذمہ دار قرار دیا اور کہا کہ اسی کے اشارے پر آئین کو معطل اور فرسودہ نظام کو دوبارہ مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ سلطان عبدالحمید نے شورش سے مکمل لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے ان الزامات کی تردید کی۔ ①

استنبول پر فوج کا قبضہ:

اگرچہ اس ہنگامہ آرائی میں سلطان کا کوئی ہاتھ نہ تھا بلکہ یہ سلطان کی ساکھ برباد کرنے کی ایک سازش تھی، تاہم فوری طور پر باغی جرنیلوں نے ان واقعات کو سلطان عبدالحمید کی برطرفی کا جواز بنالیا اور طے کیا کہ استنبول میں آئین اور پارلیمان کی بقا خطرے میں ہے جس کی حفاظت کے لیے فوجی کارروائی ضروری ہے۔ چنانچہ ۲۱ اپریل کو کور کمانڈر جنرل محمود شوکت پاشا (۱۸۶۰ء تا ۱۹۱۳ء) تھرڈ آرمی کور کو لے کر سلانیک سے استنبول روانہ ہو گیا۔ ② تاہم اس پیش قدمی کو سلطان کی حمایت کا نام دیا گیا اور محمود شوکت نے اعلان کیا کہ وہ سلطان کو سرکشوں کے نرغے سے نکالنے کے لیے آرہا ہے۔ اس لشکر میں محمود شوکت کے نوجوان افسران میں مصطفیٰ کمال پاشا بھی تھا۔ ③ سلطان کو معلوم تھا کہ لشکر کس لیے آرہا ہے، تاہم اس نے اپنی وفادار فوج کو حکم دیا کہ وہ حملہ آوروں کا راستہ نہ روکے۔ سلطان کا فرمان تھا:

''تھرڈ آرمی بھی آپ کی طرح مسلمان سپاہیوں اور ملازمین پر مشتمل ہے۔ آپ اسے نہ روکیں۔ اسے بے گانگی کی نگاہ سے مت دیکھیں۔ ہاں مگر تھرڈ آرمی کے افسران کو چاہیے کہ وہ ہمارے خلاف افواہوں کی تصدیق نہ کریں اور اپنی چھاؤنی میں رہیں تا کہ ہمارے ملک کے دشمن کو سرحدیں خالی نہ ملیں۔''

غرض سلطان نے باغیوں کے پاس کوئی قانونی ذریعہ نہ رہنے دیا جس سے اس کے خلاف کارروائی کا جواز نکلتا۔ ④

سلطان کی طرف سے ہتھیار اٹھانے کی ممانعت:

استنبول میں سلطان کے پاس وفادار سپاہیوں کا ایک جم غفیر تھا جو جان دینے کے لیے تیار تھا مگر سلطان نے لڑائی کی اجازت نہ دی۔ ان حوادث کی چشم دید شاہد سلطان کی بیٹی شہزادی عائشہ عثمان کا بیان ہے:

''لشکر حریت استنبول کے قریب آگیا۔ میرے والد نے اپنی معزولی تک یہ دن انتظار میں گزار دیے۔ ہم ماتم کی حالت میں تھے۔ صبح و شام ان کے پاس جاتے جبکہ ہم اللہ کی رضا پر راضی تھے۔ سلطان کے مخلص پاشا

---

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۲۰۳، ۲۰۵ ؛ خلافت اسلامیہ سقوط و احیاء از حق نواز: ص ۸۳، ۸۵، ط
② التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۲۰۵ ③ سلطان عبدالحمید ثانی از محمد حرب: ص ۳۷، ۳۸
④ التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۲۰۵

حضرات ان کے پاس بار بار آتے اور ہتھیار اٹھا کر مقابلے کی اجازت طلب کرتے۔ مگر والد جواب دیتے: "یہ جائز نہیں کہ ایک شخص کی خاطر ایک ہزار شخص قتل ہو جائیں اور بھائی بھائی پر حملہ کرے۔ لازم ہے کہ فوج سے اسلحہ جمع کر لیا جائے اور گولی نہ چلائی جائے۔ ایک شخص کی نکسیر بھی نہیں پھوٹنی چاہیے۔ باقی جو چاہیں کریں۔"[1]

شہزادی کا کہنا ہے:

"اس دن یہ ثابت ہو گیا کہ میرے والد ایک ایسے انسان تھے جو خون خرابے سے انتہائی احتراز کرتے تھے، چاہے اس کے بدلے انہیں اپنا تخت دینا پڑتا۔"[2]

۲۴ اپریل ۱۹۰۹ء کو باغی فوج نے جسے "لشکرِ حریت" کا نام دیا گیا تھا، کسی خاص مزاحمت کا سامنا کیے بغیر استنبول پر قبضہ کر لیا۔ اس کے فوراً بعد سلطان کے خلاف عوامی جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے دینی تعبیرات کا سہارا لیا گیا اور شہر میں درج ذیل مضمون کی اشاعت کی گئی:

"اے مسلمانو! ہم نے ظالم، بے ایمان، قرآن کو پامال کرنے والے، ایمان اور ضمیر کو روندنے والے سلطان کے اقتدار سے تمہیں نجات دلا دی ہے۔ اے امتِ محمدیہ! بیدار ہو جاؤ۔ دلیری اور شجاعت کا مظاہرہ کرو۔ اللہ مدد کرے گا۔ اے توحید پرست مسلمان اٹھ کھڑا ہو، اور اپنے دین کو ظالموں سے بچا۔ یہاں ایک ظالم شیطان سر پر تاج آراستہ کیے بیٹھا ہے۔ سلطان عبدالحمید شریعت کے لحاظ سے سلطان ہے نہ خلیفہ۔ اس کے خلاف اسلحہ اٹھانا لازم ہے۔ جو اس میں کوتاہی کرے گا، سلطان کے گناہوں کی ذمہ داری اسی پر ہوگی۔"[3]

جھوٹے الزامات اور جعلی استفتاء:

اس کمیٹی نے اپنے ناپاک مقاصد کے لیے علماء کو بھی استعمال کیا۔ سلطان کے خلاف استفتاء تیار کیا گیا جس میں درج ذیل جھوٹے الزامات عائد کیے گئے تھے: ❶ ۱۳ اپریل کے باغیانہ مظاہرے کی منصوبہ بندی کرنا ❷ قرآن مجید کے نسخوں کو نذرِ آتش کرنا ❸ فضول خرچی و اسراف ❹ ظلم و ستم اور خونریزی

حالانکہ یہ تمام الزامات بالکل بے بنیاد تھے۔ سلطان کے مخالفین کے پاس ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی کوئی ثبوت نہ تھا۔ سلطان جیسے پابند صوم و صلوٰۃ اور دین دار آدمی پر قرآن مجید کی توہین و تحریق کا الزام نہایت ناپاک پروپیگنڈا تھا جس کا مقصد صرف عوامی جذبات کو بھڑکانا تھا۔ سلطان فضول خرچ نہیں بلکہ کفایت شعار انسان تھا جس نے اس گئی گزری حالت میں بھی ایک طرف ملکی خزانے کو توانا رکھا تو دوسری طرف سلطنت میں عظیم الشان تعمیری و ترقیاتی کام کرائے اور رفاہی کاموں کے لیے اپنی جیب سے بھی ہمیشہ گراں قدر عطیات دیتا رہا۔

---

① والدي السلطان عبدالحميد الثاني: ص ۲۳۳

② والدي السلطان عبدالحميد الثاني: ص ۲۳۳

③ الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابي: ص ۳۵۹

سلطان پر ظلم وستم کے الزام کی حقیقت بھی اتنی تھی کہ اس نے بعض باغیوں کو معاف نہیں کیا بلکہ جب ان پر الزام ثابت ہوا تو انہیں قتل، ملک بدری یا معزولی کی سزائیں دیں۔ یہ سیاسی ضرورت تھی جس سے کسی حکمران کو مفر نہیں مگر سازشی عناصر نے خود افواہیں پھیلائیں اور پھر انہی کو یقینی شہادتوں کا درجہ دے کر استفتاء مرتب کر دیا جس میں یہ جرائم گنوا کر آخر میں پوچھا گیا تھا کہ ان جرائم کے مرتکب حکمران کو معزول کرنا واجب ہے یا نہیں۔ نیچے شیخ الاسلام ضیاء الدین آفندی کا جواب تحریر ہوا: ”جی ہاں واجب ہے۔“

مگر کیا شیخ الاسلام نے واقعی یہ جواب دیا تھا؟ دار الافتاء کے امین، نوری آفندی نے اس فتوے کو مسترد کر دیا تھا۔ اگرچہ اس پر انہیں عہدے سے برطرف کر دیے جانے کی دھمکی بھی دی گئی۔ بہر کیف پارلیمان میں جہاں پہلے ہی ترقی پسندوں کی اکثریت تھی، جب یہ فتویٰ سنا کر سلطان کی معزولی کے متعلق استصوابِ رائے کیا گیا تو اکثریت نے تائید کی۔ یوں سلطان عبدالحمید ثانی کی رسمی طور پر معزولی کا اعلان کر دیا گیا۔[1]

فری میسن گرینڈ ماسٹر کے ہاتھوں سلطان عبدالحمید کی معزولی:

۲۷ اپریل کو باغی لشکر نے قصر یلدز کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور ایک اہم مورچے ”طاش قشلہ“ کو توپوں سے اڑا دیا۔ عین اسی وقت روسی سفیر نے سلطان کو پیغام بھیجا جس میں زارِ روس کی طرف سے پیش کش تھی کہ اگر سلطان کی طرف سے اجازت ہو تو رُوس تحفظ دینے کے لیے تیار ہے۔ (یعنی رُوسی انہیں بحفاظت ماسکو لے جائیں گے۔)

سلطان نے پیغام سن کر کہا: ”میں اپنے سر پر ٹوٹنے والی ہر مصیبت پر راضی ہوں۔ میری قبر میرے اجداد کی قبر کے ساتھ ہی بنے گی۔ میں اس ذلت پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر سلطان نے زار کو جوابی پیغام بھیج دیا جس میں شکریہ کے ساتھ اس پیش کش کو قبول کرنے سے معذرت کر لی گئی۔[2]

چند گھنٹوں بعد باغی لشکر قصر یلدز کا محاصرہ کر کے اس کا باہر کی دُنیا سے رابطہ منقطع کر چکا تھا۔ سلطان نے اپنے وفاداروں کو حکم دیا کہ وہ محل کی چھت پر ہتھیار ڈالنے کا علامتی پرچم لہرا دیں۔ سلطان کے بار بار کہنے پر بھی کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی۔ آخر محمد علی بیگ نے یہ اعصاب شکن کام انجام دیا۔[3]

باغی لشکر میں سے چار اَفراد محل میں داخل ہوئے اور سلطان کے سر پر آ کھڑے ہوئے۔ یہ چاروں جمعیت اتحاد وترقی کے لیڈر تھے۔ دو ترک مسلمان تھے یعنی اسعد طوبتانی اور عارف حکمت پاشا۔ آرم آفندی آرمنی نسل کا نصرانی تھا۔ چوتھا شخص جو ان چاروں کی قیادت کر رہا تھا جمعیت اتحاد والترقی کا عہدے دار ”عمانوئیل قرہ صوہ“ تھا۔[4]

---

① سلطان عبدالحمید ثانی از محمد حرب: ص ۲۸۱ تا ۲۸۳، العثمانیون فی التاریخ والحضارة از محمد حرب: ص ۳۲۱ تا ۳۲۵، صحوة الرجل المریض: ص ۳۱۰، الدولة العثمانیة عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۳۶۰، ۳۶۱

② والدی السلطان عبدالحمید الثانی: ص ۲۳۳، ۲۳۵

③ والدی السلطان عبدالحمید الثانی: ص ۲۳۵ ④ والدی السلطان عبدالحمید الثانی: ص ۲۴۰

یہ یہودی قرہ صواس فری میسن لاج کا گرینڈ ماسٹر تھا جو مقدونیہ میں تھا۔ یہ سلطنت عثمانیہ کی حدود میں قائم ہونے والا سب سے پہلا لاج تھا۔

سلطان نے وفد میں اس بدبخت قراہ صو کو سب سے آگے دیکھا تو حیران ہو کر اسعد طوپتانی کو کہا:

''میں آپ کو کہہ چکا ہوں کہ میں قانون اور پارلیمان کے فیصلے کا پابند ہوں۔ اللہ عزیز وقدیر کی تقدیر یہی ہے۔ میں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ ۱۳ اپریل کے مظاہرے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ اب آپ جو فیصلہ کرنے جارہے ہیں وہ بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔ مگر اس یہودی کا خلافت کے معاملے سے کیا لینا دینا۔ آپ نے میرے سامنے اسے کیوں لاکھڑا کیا ہے۔''[1]

اصل بات یہ تھی کہ سلطنت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کے پیچھے اول تا آخر یہودیوں کی منصوبہ بندی کارفرما تھی۔ وہ فلسطین کے مسئلے پر نہ جھکنے والے سلطان کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ آج یہودی اس کے مستقبل کے مجاز ہیں۔ اسی لیے سلطان کو معزول کرنے والی کمیٹی میں اس یہودی کو نمایاں رکھا گیا تاکہ سلطان کی ذہنی اذیت کی کوئی انتہا نہ رہے۔

اسعد طوپتانی نے سلطان کو کہا: ''امت نے آپ کو معزول کر دیا ہے۔''

سلطان نے وقار و تمکنت کے ساتھ بلند آواز میں کہا: ''اچھی بات ہے! مگر اس کا سبب کیا ہے؟''

یہ سن کر عارف حکمت پاشا فتویٰ لیے ہوئے آگے بڑھا اور اس کا متن سنانے لگا جس میں سلطان پر شریعت کے بعض احکام کو معطل کرنے اور شرعی کتب کو جلانے کے الزامات تھے۔ جب عارف حکمت اوراق مقدسہ کو جلانے کے الفاظ پڑھنے لگا تو سلطان نے چیخ کر کہا: ''میں نے کون سی شرعی کتب جلائی ہیں؟ حَسْبُنَا اللّٰهُ''

عارف حکمت فتویٰ سنا چکا تو سلطان نے پوچھا: ''یہ حکم نامہ کس منصب کی طرف سے جاری ہوا ہے؟''

عارف حکمت نے کہا: ''پارلیمان سے۔'' سلطان نے کہا: ''کیا واقعی! اور اس کا سربراہ کون ہے؟''

جواب ملا: ''سعید پاشا۔'' یہ سن کر سلطان کو ایک جھٹکا لگا۔ ''کیا واقعی سعید پاشا نے یہ حکم جاری کیا ہے۔''[2]

چند لمحوں کے توقف کے بعد سلطان نے کہا:

''میں نے ۳۳ سال اُمت اور سلطنت کی خاطر جدوجہد کی، اپنے ملک کی سلامتی کی کوشش کی، اپنی طاقت کے بقدر کام کیا۔ میں ایسا حاکم تھا کہ جس پر اللہ اور اس کے رسول کی حکومت تھی۔ اب میں یہ ملک یوں کا توں تمہارے حوالے کر رہا ہوں جیسا کہ میں نے اُسے لیا تھا۔ میں نے اس کی چپہ بھر زمین بھی خیانت کر کے کسی کو نہیں دی۔ اپنی خدمت کا اجر میں نے اللہ کے حوالے کر رکھا ہے۔ البتہ میری کوشش تھی کہ اللہ کے حکم سے اپنے دشمنوں کو یہ موقع نہ دوں کہ وہ میری خدمات پر سیاہ پردے لپیٹ سکیں۔ مگر تعجب ہے کہ وہ لوگ اس میں بھی کامیاب ہو گئے۔''[3]

---

① التاریخ الإسلامی لدکتور محمود شاکر: ۲۰۷،۲۰۶/۸ ؛ الدولة العثمانیة از الصلابی: ص: ۳۹۱،۳۹۰

② سعید پاشا سلطان کے ان اعلیٰ افسران میں سے تھا جن پر سلطان کو آخری وقت تک اعتماد تھا۔ سلطان کے نزدیک اس کے بارے میں غداری کا تصور مشکل تھا۔ بعد میں سلطان نے اسارت کے دوران اپنی بیٹی عائشہ عثمان کو کہا تھا کہ سعید پاشا غدار نہیں مگر میرا خیال ہے کہ اس نے ڈر اور خوف کی وجہ سے دشمنوں کا ساتھ دیا ہے۔ (والدی سلطان عبدالحمید: ص ۲۷۳)

③ والدی السلطان عبدالحمید الثانی: ص ۲۳۱،۲۳۰

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت [1]

سلطان کی گرفتاری، قید و بند اور وفات:

سلطان کو اہل وعیال سمیت گرفتار کر کے ٹرین میں بٹھا کر رومانیہ کے شہر سلانیک روانہ کر دیا گیا۔[2] یہ سفر شام سات بجے سے اگلی شب دس بجے تک جاری رہا۔ راستے میں مختلف ریلوے اسٹیشنوں پر مشتعل عوام نے ٹرین پر سنگ باری بھی کی۔ سلانیک پہنچا کر سلطان کو مع اہل خانہ ایک حویلی "قصرِ علاتینی" میں نظر بند کر دیا گیا جہاں کڑا پہرہ لگا رہتا تھا۔[3] جب جنگِ بلقان برپا ہوئی تو سلطان کو استنبول کے قصرِ بلگربیگی میں منتقل کر دیا گیا۔ سلطان کے اہل خانہ بھی اس کے ساتھ تھے۔ نو سال قید و بند کی زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۱ فروری ۱۹۱۸ء (۳۰ ربیع الآخر ۱۳۳۶ھ) کو سلطان عبد الحمید کی وفات ہوگئی۔[4] قید کے ایام میں سلطان نے جو قیمتی یادداشتیں لکھی ہیں، ان میں رہنمائی کا بڑا سامان ہے۔

سلطان عبد الحمید ثانی دورِ زوال کا وہ رجلِ رشید تھا جس نے نہایت ناسازگار حالات میں بھی امت کی ناؤ پار لگانے کی پوری کوشش کی تھی مگر افسوس کہ خود ابنائے وطن اس کی فکر و نظر کو سمجھنے سے قاصر رہے اور اسے زندہ درگور کر دیا۔

خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے
اب نہ وہ مے کش رہے باقی، نہ پیمانے رہے
رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اُسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے
آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلیٰ رہی، لیلیٰ کے دیوانے رہے
وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا [5]

---

① فیض احمد فیض

② سلانیک یورپی ملک رومانیہ کا ایک شہر ہے۔ استنبول سے شمال کی جانب ۹۲ے کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ریلوے لائن بلقان اور بلغاریہ سے گزر کر رومانیہ میں داخل ہوتی ہے۔ اس وقت یہ تمام ممالک معاہدوں کے تحت سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھے اور وہاں عثمانی افواج تعینات تھیں۔

③ والدی السلطان عبدالحمید الثانی: ص ۲۳۶ تا ۲۹۰

④ التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۲۰۷/۸

⑤ علامہ محمد اقبال

سلطان کے عہد پر تبصرہ

اس عظیم حکمران نے ۳۳ سالہ دورِ حکومت میں خلافت کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کی اور مغربی وصیہونی سازشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ روس سے شکست کے بعد خستہ وشکستہ سلطنتِ عثمانیہ کا دم لبوں پر تھا مگر سلطان نے سیاسی حکمتِ عملی سے کام لے کر اسے بچایا اور فوج کو جرمنی کے جدید طریق حرب سے روشناس کرا کے مضبوط بنایا۔ اس دورِ زوال میں بھی اس نے کریٹ اور یونان کے محاذوں پر نصرانیوں کو شکستیں دیں۔

اس قدر پُرفتن دور سے پالا پڑنے کے باوجود سلطان نے جو تعمیری وترقیاتی کام کیے وہ حیرت انگیز ہیں۔ اس نے دینی درسگاہیں، تربیتِ اساتذہ کے ادارے، جامعات، کالجز، خواتین کی خصوصی تعلیم گاہیں، عجائب گھر، بچوں کے لیے مستقل ہسپتال اور معذور افراد کے لیے دارالامان قائم کیے۔ محکمہ ڈاک اور ٹیلی گراف کے علاوہ حجاز ریلوے کو بھی اس کے عظیم کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسلامی یکجہتی کی تحریک کا پودا بھی اسی نے لگایا تھا جس نے بیسویں صدی کی ہر اسلامی تحریک کو فکری مواد فراہم کیا اور رجال کار بھی دیے۔[1]

بیرونی قرضوں سے نجات:

سلطان کی تخت نشینی کے وقت سلطنتِ عثمانیہ ۳۰۰ ملین لیرے کی مقروض تھی۔ سلطان نے مسلسل کوشش اور منصوبہ بندی کے ذریعے ترکی کی اقتصادی حالت کو مسلسل بہتر بنایا اور قرضوں کی ادائیگی جاری رکھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان کے آخری ایام میں سلطنتِ عثمانیہ پر بیرونی قرضے صرف ۳۰ ملین لیرے رہ گئے تھے۔[2]

سلطان کی تحریری خدمات:

سلطان ایک اچھا ادیب وشاعر ہونے کے علاوہ ایک بہت عظیم مفکر اور دانشور بھی تھا۔ وہ عالمی حالات پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ اس نے قید میں جو یادداشتیں تحریر کی ہیں، وہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے پس پردہ ان صیہونی سازشوں کا پردہ فاش کرتی ہیں جن سے عام لوگ قطعاً ناواقف تھے مگر سلطان اپنے شعبۂ مخابرات کے ذریعے ان پوشیدہ حقائق سے آگاہ تھا۔ یہ یادداشتیں جو ''مذکرات سلطان عبدالحمید'' کے نام سے طبع ہو چکی ہیں، اس دور کی تاریخ کی مستند ترین دستاویز ہیں۔ سلطان کا وہ مراسلہ بھی بہت اہم ہے جو شاذلی سلسلے کے بزرگ شیخ محمود ابوالشامات رحمہ اللہ کے نام لکھا گیا تھا۔ سلطان نے اس میں اپنے معزولی کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اتحادیوں نے مجھ پر زور دیا کہ میں ارضِ مقدس فلسطین میں ایک یہودی وطن کی تاسیس کی حمایت کروں۔ مگر ان کے اصرار کے باوجود میں نے اسے منظور نہیں کیا۔ انہوں نے آخر میں مجھے پندرہ کروڑ

---

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۲۰۷/۸

[2] مذکرات السلطان عبدالحمید الثانی از محمد حرب: ص ۶۸

برطانوی پاؤنڈز کی پیش کش کی مگر میں نے اسے بھی مسترد کر دیا۔ اور صاف جواب دے دیا: اگر تم ساری دنیا کے ہم وزن سونا بھی پیش کر دو تو میں اس کی حمایت نہیں کروں گا۔ تیس سال سے زائد امت محمدیہ کی خدمت کرنے کے بعد میں مسلمانوں کی تاریخ کو سیاہ نہیں کروں گا۔ میرے اس جواب کے بعد انہوں نے معزول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے آگاہ کر دیا کہ وہ مجھے سلانیک بھیج دیں گے۔ میں نے اس مشقت کو قبول کر لیا۔ میں اللہ کی تعریف کرتا ہوں کہ میں نے اسلامی دنیا کو اس ہمیشہ کی عار سے آلودہ نہیں ہونے دیا جو ارض مقدس فلسطین میں ایک یہودی مملکت کے قیام سے لاحق ہو سکتی تھی۔"[1]

اصلاحات کیوں کامیاب نہ ہوئیں:

سلطان عبدالحمید کی ان مساعی جمیلہ کے باوجود خلافتِ عثمانیہ بچ نہیں سکی اور سلطان کی زندگی میں ہی اس کے بال و پر کاٹ دیے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اصلاحات کا یہ کام بہت تاخیر سے شروع ہوا تھا اور اس وقت تک مغربی تہذیب و تمدن کا نشہ نسل نو پر چھا چکا تھا، استعماری طاقتیں اسلامی دنیا کے بڑے حصے پر قابض ہو چکی تھیں، ان کی مالی، سیاسی، تمدنی و ابلاغی طاقت مسلم دنیا میں پوری طرح نفوذ کر چکی تھی، یوں حالات کا رُخ اس حد تک متعین ہو چکا تھا کہ اسے بدلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ سلطان عبدالحمید کی کوششیں بالکل درست سمت میں تھیں لیکن ملت کے اس ملاح کو کشتی بنانے کا موقع اس وقت ملا جب سیلاب گھروں میں داخل ہو چکا تھا۔ اگر سلطان عبدالحمید جیسا کوئی حکمران ایک صدی پہلے برسر اقتدار آ جاتا اور وہ انہی اصلاحات کو اسی وقت اپنا لیتا تو نہ صرف مغربی تہذیب و تمدن کے طوفان سے قوم کو بچایا جا سکتا تھا بلکہ مصر اور شمالی افریقہ سے لے کر یورپی مقبوضات تک سلطنتِ عثمانیہ کے قدم مضبوطی سے جمے رہتے۔

بہر کیف سلطان عبدالحمید نے اس آخری دور میں جو کچھ کیا، اس سے کم از کم بعد والوں کے لیے ایک راہ متعین ہو گئی۔ آج بھی سلطان کے قائم کردہ انقلابی و اصلاحی خطوط سے استفادہ کر کے مسلم حکمران مغربی دنیا کے تسلط سے نجات پا سکتے ہیں۔

اب پچھتائے کیا ہووت:

سلطان عبدالحمید کے بعد ترکی کی تباہی اور مسلمانوں کی شکست در شکست مقدر بن گئی۔ جمعیت اتحاد و ترقی کے قائدین جن میں سے اکثر نوجوان تھے، حکومت چلانے کی اہلیت سے بالکل عاری تھے۔ ان میں سے بہت سے وطن کی خدمت کی نیت میں مخلص تھے مگر انجانے میں وہ صیہونیوں اور برطانوی خفیہ اداروں کے طے کردہ نقشے پر چل کر یہاں تک پہنچے تھے۔ ان کی بڑی تعداد ہوسِ اقتدار میں مبتلا ہو کر میدان میں کودی تھی۔ وہ سلطان عبدالحمید کی فکر و نظر کو سمجھ نہ سکے اور مغربی ذرائع ابلاغ اور فری میسن کے جال میں پھنس گئے۔

---

[1] صحوة الرجل المريض: ص ۲۱۲

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے
وہ نظر بہم نہ پہنچی کہ محیط حسن کرتے
تری دید کے وسیلے خد و خال تک نہ پہنچے
کوئی یار جاں سے گزرا کوئی ہوش سے نہ گزرا
یہ ندیم یک دو ساغر مرے حال تک نہ پہنچے [1]

مگر بعد کے حالات دیکھنے کے بعد جمعیت اتحاد وترقی کے کئی جرنیلوں نے اصل حقیقت کو سمجھ لیا تھا اور وہ برملا اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے تھے۔ ترقی پسند جرنیل ایوب صبری افسوس کرتے ہوئے کہتا تھا:

''ہم یہودیوں کے جال میں آگئے۔ ہم نے یہودیوں کی ان آرزوؤں کو پورا کر دیا، جس کے لیے فری میسن نے سلطان عبدالحمید کو تیس ملین طلائی لیرے پیش کیے تھے تاکہ وہ ان کا مطالبہ پورا کر دے مگر سلطان نے اسے قبول نہ کیا۔'' [2]

سلطان کا تختہ الٹنے میں پیش پیش انور پاشا جمعیت اتحاد والترقی کے ایک اور اعلیٰ عہدے دار جمال پاشا سے کہتا تھا:

''جمال تمہیں معلوم ہے ہم نے کیا غلطی کی؟ ہم نے سلطان عبدالحمید کو نہیں پہچانا۔ پس ہم صہیونیوں کے آلہ کار بن گئے۔ عالمگیر فری میسن نے ہمارے ذریعے اپنے مفادات حاصل کر لیے۔ ہم نے اپنی جد وجہد صہیونیت پر لگا دی۔ یہ ہمارا اصل گناہ ہے۔'' [3]

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا [4]

دورِ حاضر کے امریکی مستشرق برنارڈ لوئیس نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فری میسن کے کارکن اور یہودی خفیہ طور پر سلطان عبدالحمید کو ہٹانے کے لیے باہم تعاون کرتے رہے کیوں کہ وہ یہودیوں کا مضبوط حریف تھا، اس نے بڑی سختی سے فلسطین کی ایک بالشت زمین بھی یہود کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔'' [5]

◆◆◆

---

① فیض احمد فیض

② الدولۃ العثمانیۃ عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۴۹۲، ۴۹۳

③ الدولۃ العثمانیۃ عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۴۹۳

یاد رہے کہ جنرل انور پاشا نے کئی معرکوں میں اپنی بہادری کے سبب بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ بلقان کی دوسری جنگ میں ایڈریانوپل کو بلغاریہ کے قبضے سے چھڑا لیا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب ترکی کے حصے بخرے ہوئے تو وہ اپنی غلطی کی تلافی کے لیے وسط ایشیا چلا گیا اور سمرقند، بخارا کو کمیونسٹ انقلاب سے بچانے کے لیے جہاد شروع کر دیا۔ کئی سال کی جنگ کے بعد ۱۹۲۲ء میں اس نے روسیوں کے ایک حملے میں شہادت پائی۔ اس کی عمر ۴۲ سال تھی۔

④ غالب ⑤ الدولۃ العثمانیۃ عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص: ۴۹۳

خلافتِ عثمانیہ

چوتھا مرحلہ

ترقی پسندوں کے تسلط کا دور

سلطان محمد رشاد تا سلطان عبدالمجید ثانی

۱۳۲۷ھ تا ۱۳۴۲ھ

(۱۹۰۹ء تا ۱۹۲۴ء)

۱۴ سال

سلطان رشاد، محمد خامس بن عبد المجید اوّل

۱۳۲۷ھ تا ۱۳۳۶ھ
(۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۸ء)

سلطان عبد الحمید کی گرفتاری سے ایک دن پہلے ۲۷ اپریل ۱۹۰۹ء (۷ ربیع الآخر ۱۳۲۷ھ) کو باغیوں نے اس کے ۶۸ سالہ بھائی محمد رشاد کو خلیفہ مان لیا تھا۔ وہ محمد خامس کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ وہ دوراندیشی، عزم و ہمت اور سیاسی مہارت میں اپنے بھائی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا۔ عثمانی سلاطین میں تخت نشینی کے وقت سب سے زیادہ عمر اسی کی تھی۔ وہ تنہائی پسند انسان تھا اور سلطان عبد الحمید کے انجام نے اسے مزید خوفزدہ کر دیا تھا۔ [1]

جمعیت اتحاد و ترقی کا انتقام:

اس کے دور میں ملک کی باگ ڈور زیادہ تر جمعیت اتحاد و ترقی کے قائدین کے ہاتھوں میں رہی۔ یہ لوگ فری میسن کے کارکن تھے، اس لیے انہوں نے جو نیا سکہ جاری کیا، اس پر فری میسن کی خاص علامات اور اس کے خاص نعرے یعنی: ''حریت، مساوات اور عدل'' بہت نمایاں تھے۔ [2] حلمی پاشا صدر اعظم کے منصب پر رہا مگر اس کی حیثیت بھی کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔ اتحاد و ترقی کی قیادت نے اپنے مخالفین سے چن چن کر بدلہ لیا۔ جمعیت اتحاد محمدی کے سربراہ حافظ درویش وحدتی کو ان کے متعدد رفقاء سمیت گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔ [3]

درحقیقت یہ کھلی آمریت کا دور تھا جس میں اسلام پسندوں کے لیے زندگی اجیرن کر دی گئی تھی۔ ہاں اس دور میں لبرل صحافت ضرور آزاد تھی جو اسلامی شعائر اور شرعی احکام کا مذاق اڑاتی تھی۔ جبکہ علماء کی پکڑ دھکڑ جاری تھی اور کتنے ہی علمائے دین کو گرفتار کر کے جیلوں میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ [4]

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۲/۲۰۸؛ خلافت اسلامیہ سقوط و احیاء از حق نواز: ص۸۵، ۸۶، ط زمزم پبلیکیشنز پاکستان

② موقف الدولۃ العثمانیۃ من الحرکۃ الصھیونیۃ از حسن علی حلاق: ص۳۶۳
یاد رہے کہ مصطفیٰ کمال کے نائب وزیر خارجہ ڈاکٹر رضا نور کی یادداشتوں کے مطابق خلیفہ سلطان رشاد خود بھی فری میسن کی رکنیت حاصل کر چکا تھا۔

③ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۲/۲۰۸؛ خلافت اسلامیہ سقوط و احیاء از حق نواز: ص۸۶، ۸۷، ط

④ موقف الدولۃ العثمانیۃ من الحرکۃ الصھیونیۃ از حسان علی حلاق: ص۳۳۱، ۳۳۲، ط بیروت

عمامے کو نہ صرف استہزاء کا ذریعہ بنا دیا گیا تھا بلکہ ایسے ہر آدمی کو مشکوک سمجھا جاتا تھا۔ اس کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا تھا جب سلطان عبدالحمید کا تختہ الٹنے سلانیک سے آنے والا ''جیشِ حریت'' جنرل محمود شوکت کی قیادت میں استنبول میں داخل ہوا تھا۔ اس فوج نے سڑکوں پر دکھائی دینے والے ہر عمامہ پوش، طالب علم اور عالم کو بلا تحقیق گرفتار کر لیا۔ ایسے معزز لوگوں کو بے عزت کرنے کے لیے ''عمامہ پوش گروہ'' (اَلطَّائِفَةُ الْمُعَمَّمَة) کا نام دیا گیا۔ ①

کیں خوش تھے کہ جب تھے بند مکانوں میں
کھلے کواڑ تو تالے پڑے زبانوں میں ②

حکومت کی پشت پناہی سے چلنے والی لبرل صحافت نے عورت کی بے حجابی اور آزادی کو بھی فروغ دیا۔ یہود الدونمہ کا گروہ اس میں پیش پیش تھا۔ ان صحافیوں نے دعویٰ کیا کہ عورت کا پردہ اسلام کا حکم نہیں بلکہ یہ رومیوں کی رسم ہے۔ انہوں نے کانفرنسوں اور تنظیموں کے ذریعے مرد و زن میں اختلاط کو عام کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہ پرچار بھی کیا گیا کہ اسلام ایک فرسودہ مذہب ہے جو عصرِ حاضر کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ③

فری میسن لاجز کی کثرت:

جمعیت اتحاد و ترقی کی حکومت آتے ہی سلطنتِ عثمانیہ میں یہودیوں کو کھلی چھٹی مل گئی۔ جگہ جگہ فری میسن کے لاجز کھل گئے۔ صرف ایک سال میں ان کے کھلنے والے مراکز کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

① محفل الهلال العثمانی (بیروت): ۱۳ فروری ۱۹۱۰ء
② محفل الوحدة العثمانية (حمص) ۱۶ اگست ۱۹۱۰ء
③ محفل الاتحاد والخلد (بیت المقدس) ۱۹ اگست ۱۹۱۰ء
④ محفل المرج العیون العثمانی (مرج عیون، شام) ۱۰ اگست ۱۹۱۰ء
⑤ محفل معبد سليمان (بیت المقدس) ۱۴ دسمبر ۱۹۱۰ء
⑥ محفل الجبل (بیروت) ۱۷ فروری ۱۹۱۱ء ④

البانیہ کا دورہ:

جون ۱۹۱۱ء میں سلطان رشاد نے البانیہ کا دورہ کیا جس کا مقصد بلقان کی ریاستوں کا اعتماد حاصل کرنا تھا جہاں علیحدگی پسندی کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ اس نے کوسوو میں نماز جمعہ ادا کی۔ سلطان کو دیکھنے کے لیے عوام کا جم غفیر جمع تھا کیوں کہ سلیمان القانونی کے بعد اس سرزمین میں گزشتہ ۵۲۲ سالوں سے کسی عثمانی سلطان

---

① كيف سقطت الدولة العثمانية از سلیمان بن صالح الخراشی: ص ۱۷
② احمد فراز
③ كيف سقطت الدولة العثمانية از سلیمان بن صالح الخراشی: ص ۱۷، ۲۰
④ صحوة الرجل المريض: ص ۲۳۲

نے قدم نہیں رکھا تھا۔[1]

انتخابات اور نئی پارلیمان:

۱۹۱۲ء میں پارلیمانی انتخابات ہوئے، جس میں جمعیت اتحاد وترقی کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ کامل پاشا کو وزیر اعظم بنادیا گیا۔ فاتح پارٹی نے حکومت بنانے کے بعد اپنے منشور کے بنیادی نکتے ''مساوات'' کو خود ہی پامال کر ڈالا اور ترکوں کو سلطنت عثمانیہ کی باقی قوموں (عربوں، کردوں، افریقیوں وغیرہ) پر واضح فوقیت دی۔ ان جدت پسند قائدین نے عربی کی بجائے ترکی کو سرکاری زبان بنادیا اور ''ترک قومیت'' کا نعرہ لگا کر خلافت عثمانیہ سے وابستہ دیگر قوموں کو بددل کر دیا۔[2] جمعیت الاتحاد والترقی کے یہ قائدین ''مرکزیت'' کے قائل تھے یعنی ترکی کو عراق، شام، یمن اور جزیرۃ العرب کا سیاسی مرکز بنائے رکھنا چاہتے تھے۔

مگر اسی دوران جمعیت اتحاد والترقی کے مقابلے میں ''جمعیت حریت وائتلاف (Freedom and Accord Party)'' کے نام سے ایک زیادہ آزاد خیال سیاسی پارٹی بھی کھڑی ہو چکی تھی جو اس کے برعکس ''لامرکزیت'' کی علم بردار تھی۔ اس کے نزدیک صوبوں کو خودمختاری ملنا ان کا حق تھا اور ترکوں کو صرف ترکی تک محدود رہنا چاہیے تھا۔[3]

علاقائی خودمختاری کی تحریکیں:

ترکی میں سیاسی آراء اور نظریات کا ایک ہجوم درآیا تھا۔ عبدالکریم خلیل اور جنرل عزیز مصری نے ''جمعیت قحطانیہ'' قائم کی جس کا منشور یہ تھا کہ عراق، شام، اردن، فلسطین اور جزیرۃ العرب کو ملا کر ایک خودمختار عرب مملکت تشکیل دی جائے جو ترکی کے ساتھ اتحاد رکھے اور خلیفہ کی سرپرستی میں رہے۔

مگر عالمی سازش یہ تھی کہ عثمانی سلطنت صرف ایشیائے کوچک تک محدود رہ جائے اور تمام عرب ولایات، خلافت کی وحدت سے الگ ہو کر ٹکڑوں میں بٹ جائیں۔ اس مقصد کے لیے ۱۹۱۱ء کے دوران پیرس میں ''جمعیت جوانان عرب'' (الجمعیۃ العربیۃ الفتاۃ) تشکیل دی جا چکی تھی جس کا منشور یہ تھا کہ عرب صوبے، ترکی سے بالکل الگ ہو جائیں اور خلافت سے ان کا رسمی تعلق بھی نہ ہو۔

ان جماعتوں میں نصرانی عرب بھی پورے جوش وخروش سے شامل تھے۔ علاقائی سطح پر بھی مستقل جماعتیں کھڑی ہوگئیں۔ عراق کے سیاسی لیڈروں نے برطانیہ سے رابطے کیے تاکہ وہ اپنے اثر ورسوخ اور تسلط سے عراق کو ایک جدید مملکت بنادے۔ شام اور لبنان پر فرانس کا قبضہ تھا، وہاں کی ''الجمعیۃ الاصلاحیۃ'' اور ''النہضۃ اللبنانیۃ'' نے فرانس سے

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ لایلماز اوزتونا: ۲/۳۰۸ ؛ خلافت اسلامیہ سقوط واحیاء از حق نواز: ص ۸۶، ۸۷، ط زهیر پبلیکیشنز ملتان

[2] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ لعلی حسون: ص ۲۴۳، ۲۷۵ ؛ التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/ ۲۱۰، ۲۱۱

[3] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۲۱۲

مطالبہ کیا کہ وہ شام اور لبنان کو خود مختاری دے۔ فرانس نے ان لیڈروں کو پیرس میں جمع کیا اور عبدالحمید زہراوی کی قیادت میں ایک جماعت تشکیل دی جس کے منشور میں طے تھا کہ تحریک سیکولر ہوگی، یہ عرب قومیت کے لیے کام کرے گی، عرب علاقوں میں عربی ہی کو سرکاری زبان بنائے گی۔ اس کے قائدین میں مسلم اور نصرانیوں کا تناسب برابر ہوگا۔[1]

الغرض چند مہینوں میں جمہوریت کے نام پر سلطنتِ عثمانیہ میں ایسا زبردست انتشار پھیلا دیا گیا کہ یک جہتی بالکل عنقا ہوگئی اور ترکی مغربی طاقتوں کے لیے ایک آسان ہدف بن گیا۔ یہی وہ خطرہ تھا جس کی بناء پر سلطان عبدالحمید نے جمہوریت کا تجربہ کچھ مدت بعد منسوخ کر دیا تھا۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس، الاماں!
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو[2]

ان عرب لیڈروں میں بہت سے ایسے تھے جو عربی زبان وثقافت کو بچانا، اپنے اپنے ممالک کا انتظام بہتر بنانا، انہیں ترقی دینا اور عسکری لحاظ سے مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ وہ خلافتِ عثمانیہ سے لاتعلقی یا مخاصمت کے حق میں نہیں تھے۔ مگر قومیت اور علاقائیت ولسانیت میں تشدد اختیار کرنے والے عناصر ان پر غالب آگئے اور یورپی تہذیب وافکار کے بڑھتے ہوئے اثرات نے انہیں رخ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں سے بعض اسلام پسند اور بعض پختہ دینی مزاج رکھنے والے لوگ بھی تھے جو مسلمانوں کے لیے مخلص تھے مگر اپنے مقاصد کے لیے وہ مغربی ممالک پر اعتماد کرنے لگے اور آسانی سے بیرونی سازشوں کا شکار ہوگئے، فری میسن جیسی یہودی تنظیموں نے انہیں اپنے لیے استعمال کر لیا۔ پس اگر یہ ان کی لاعلمی، سفاہت اور حماقت تھی تو اسے ہرگز قابلِ معافی نہیں کہا جاسکتا۔

---

① اقبال

② الدولة العثمانية عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی ص: ۳۶۵، ۳۶۶؛ التاريخ الاسلامی لدکتور محمود شاكر: ۸/۲۲۱، ۲۲۲

جنگِ بلقان اوّل:

سلطان محمد رشاد کے دور میں اندرونی خلفشار کے باعث سلطنتِ عثمانیہ تیزی سے کمزور پڑنے لگی۔ مغربی دنیا جو کب سے اس وقت کا انتظار کر رہی تھی، فوراً ترکی پر کاری ضربیں لگانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سلطان عبدالحمید کی معزولی کے چند ماہ بعد، ۱۹۰۹ء ہی میں بلقان کا تنازعہ پوری شدت سے ابھر آیا۔ بوسنیا اور ہرزیگوینا کی ریاستیں رسمی طور پر اب بھی ترکی کے ساتھ ملحق تھیں مگر آسٹریا کے ایما پر ان کے مندوبین نے استنبول کی مجلس نائبین میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی دوران آسٹریا نے روس کو رضامند کر لیا کہ وہ بوسنیا اور ہرزیگوینا کے آسٹریا سے الحاق میں رکاوٹ نہ ڈالے، اس کے بدلے آسٹریا درۂ دانیال اور خلیج باسفورس پر قبضے کے بعد انہیں ہمیشہ روس کے لیے کھلا رکھے گا۔ روس سے بات چیت کے بعد آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزیگوینا کا اپنے ساتھ الحاق کر لیا۔

اس واقعے سے عالمی طاقتوں میں ایک نیا تنازعہ پیدا ہو گیا۔ سربیا اور اٹلی جو ایک مدت سے بوسنیا اور ہرزیگوینا کو اپنی جاگیر بنانا چاہتے تھے، آسٹریا کی اس حرکت پر سیخ پا ہو گئے۔ اٹلی نے فوراً روس سے معاہدہ کر لیا کہ اگر آسٹریا بلقان میں مزید فوج کشی کرے تو دونوں مل کر اسے روکیں گے۔

ادھر جبل اسود کے علاقے میں بھی بغاوت ہو گئی۔ ساتھ ہی بلقان کی ریاستوں سربیا، بلغاریہ اور یونان تینوں نے مل کر ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور یونانی افواج جزیرہ کریٹ میں گھس گئیں۔

اس جنگ میں جسے "جنگِ بلقان اوّل" کہا جاتا ہے، پہلی بار ترکی کے خلاف ہوائی جہاز استعمال ہوئے جنھوں نے ادرنہ (ایڈریانوپل) پر بمباری کی۔ جدت پسندوں کی حکومت ان بغاوتوں کو کچلنے میں بالکل ناکام رہی۔

سلانیک بھی بلقان کی باغی ریاستوں کی زد میں تھا۔ لہٰذا وہاں نظر بند سابق سلطان عبدالحمید کو کشتی میں بٹھا کر استنبول لایا گیا۔ سابق سلطان نے کشتی میں بیٹھتے ہوئے جمعیت اتحاد و ترقی کی حکومت کو یوں بد دعا دی:

> "اللہ اپنے اسم قہار کے ذریعے ان لوگوں پر قہر نازل کرے جو ان حالات کا سبب بنے۔ انہوں نے سلطنت کو تباہ کر دیا۔"

سابق سلطان کو استنبول لا کر قصرِ بیگلر بیگی میں نظر بند کر دیا گیا۔ ان نازک حالات میں بھی اس کے تجربات سے فائدہ اٹھانے اور سیاسی رہنمائی لینے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ سابق سلطان کی منتقلی کے ایک ہفتے بعد سلانیک کا سقوط ہو گیا۔

ضروری تھا کہ سیاسی داؤ پیچ آزما کر بلقان میں مزید نقصانات سے بچا جاتا۔ سلطان رشاد چاہتا تھا کہ جمعیت اتحاد و ترقی کو بالکل بے دخل کر دے اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر صائب فیصلے کرے مگر وہ کابینہ کو برطرف کر کے نئے وزراء کی تشکیل کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ کیوں کہ اسے سلطان عبدالحمید جیسے انجام سے دوچار ہونے کا یقین تھا۔

جمعیت اتحاد و ترقی نے جنگ بندی کے لیے یورپی و بلقانی ریاستوں کی شرائط تسلیم کر لیں۔ ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء کو لندن

میں ہونے والے معاہدے کے نتیجے میں ترکی ادرنہ سمیت یورپ میں اپنے تقریباً تمام یورپی مقبوضات سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ البانیا کو بھی آزاد ریاست مان لیا گیا۔[1]

ہوگئی رُسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ،ہیں آج مجبورِ نیاز
حکمتِ مغرب سے ملّت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز[2]

مسلمانانِ ہند کی قربانیاں:

جنگِ بلقان کے دوران ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی محکومی کے باوجود غیر معمولی دینی اخوت کا مظاہرہ کیا۔ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کی ترغیب پر مسلمان متحرک ہوئے۔ مولانا محمد علی جوہر کی اپیل پر ترکوں کے لیے چندہ جمع کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء کے اواخر میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ۱۳۵ افراد پر مشتمل ایک طبی وفد ترکی پہنچا تاکہ زخمی ترکوں کو طبی سہولیات بہم پہنچائے۔ یہ وفد آٹھ ماہ تک وہاں خدمات انجام دیتا رہا۔[3]

ترکی کے نقصانات:

ساڑھے سات ماہ تک جاری اس جنگ میں ترکی نے جو نقصانات اٹھائے ،وہ ماضی کی چھ صدیوں کے مجموعی نقصانات سے بھی زیادہ تھے۔ ترکی آن کی آن میں ایک لاکھ ۷۳ ہزار مربع کلومیٹر رقبے اور ۴۵ لاکھ ۸۲ ہزار آبادی سے محروم ہوگیا۔ ۷ صوبے (سلانیک ،مناسطر ،کوسوو ،اسکب ،اشقودرا ،یانیا ،جزائرِ بحرِ ابیض اور کریٹ) اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ان سات صوبوں میں ۳۳ ضلعے اور ۱۵۸ شہر تھے جن سے سلطنتِ عثمانیہ محروم ہوگئی۔

نصرانیوں کے دہشت گرد گروہ خصوصاً بلغاریہ کے جنونی نصرانی ،مسلم آبادیوں پر ٹوٹ پڑے اور ایک ایک شہر میں عورتوں ،بچوں اور بوڑھوں کا فرق کیے بغیر ہزاروں مسلمانوں کو اجتماعی طور پر قتل کیا گیا۔ لاکھوں مسلمان ان ریاستوں سے ہجرت کر کے استنبول اور ایشیائے کوچک کے شہروں کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۳ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یونان سلانیک سمیت جنوبی مقدونیہ پر قابض ہوگیا۔ سربیا نے کوسوو سمیت شمالی مقدونیہ کو غصب کر لیا۔

البانیہ کو جہاں ۷۰ فی صد آبادی مسلمان تھی ،خود مختاری دیتے ہوئے طے کیا گیا تھا کہ وہاں کا حکمران کوئی عثمانی شہزادہ ہوگا مگر یورپی طاقتوں نے اس معاہدے کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ،البانیا کا نصف حصہ سربیا کو بخش دیا اور باقی ماندہ حصے پر جرمنی کے ایک کم عمر شہزادے کو تخت پر بٹھا دیا۔ یوں مسلم اکثریت کو پوری طرح نصرانیوں کے چنگل میں

---

[1] التاریخ الاسلامی للدکتور محمود شاکر: ۸/۲۱۲ ؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ لیلماز اوزتونا: ۱/۲۱۵، ۲۱۸
[2] اقبال
[3] خلافت اسلامیہ سقوط و احیاء: ص ۸۶، ۸۷

دے دیا گیا۔[1]

طرابلس الغرب (لیبیا) کا سقوط:

شمالی افریقہ میں طرابلس الغرب (لیبیا) وہ واحد ملک تھا، جو اس گئے گزرے دور میں بھی خلافت عثمانیہ سے وابستہ تھا۔ رقبے میں یہ موجودہ ترکی سے دوگنا علاقہ تھا جس میں نائیجیریا اور چاڈ بھی شامل تھے۔ اکثر زمین نخلستانی اور صحرائی تھی۔ سلطان عبدالحمید کو اس خطے کی اہمیت معلوم تھی، اس لیے اس کے دور میں یہاں فوج کی ایک بٹالین تعینات تھی۔ مگر اس کے بعد یہاں ترک فوج رہی نہ کوئی جرنیل۔

اُدھر اٹلی جو پاپائے روم کا قدیم مرکز تھا فرانس کو الجزائر اور برطانیہ کو مشرق وسطیٰ سے برصغیر تک قابض دیکھنے کے بعد شمالی افریقہ میں مہم جوئی کے لیے پر تول رہا تھا۔ جدید اٹلی کا بانی مارٹینی واضح الفاظ میں اعلان کر گیا تھا کہ لیبیا اٹلی کی میراث ہے۔ طرابلس الغرب کے علاوہ اٹلی بحیرۂ روم کی اہم عثمانی بندرگاہوں: ازمیر، اسکندرونہ اور انطاکیہ، نیز مشرقی یورپ کی مسلم ریاست البانیہ پر بھی قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ اٹلی نے شروع میں طرابلس الغرب میں اسکول اور بینک قائم کر کے وہاں سیاسی، تعلیمی اور معاشی اثر و رسوخ بڑھایا۔ دوسرے مرحلے میں اس نے سفارت کاری اور لین دین کی سیاست کے ذریعے یورپی ممالک کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ طرابلس الغرب پر اٹلی کے تسلط میں کوئی دخل نہ دیں اور اسے اٹلی کی نوآبادیات بننے دیں۔

طرابلس الغرب کے حالات اتنے نازک تھے مگر استنبول کی حکومت کے صدر اعظم حقی پاشا نے اس پر پردہ ڈالے رکھا۔ یاد رہے کہ حقی پاشا، اطالوی تہذیب و تمدن کا شیدائی تھا اور استنبول میں واقع اطالوی سفارت خانے میں اس کی آمد و رفت بکثرت تھی۔ اس نے طرابلس الغرب میں اٹلی کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔ اٹلی میں تعینات ترک سفیر نے طرابلس الغرب کے سقوط کے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے جو مراسلے، استنبول بھیجے، حقی پاشا نے انہیں کبھی کسی کے سامنے نہ آنے دیا۔

حملے سے پہلے اٹلی نے ترکی پر طرابلس الغرب کے عوام کے حقوق غصب کرنے کا الزام لگایا اور خلیفہ کو الٹی میٹم بھیجا کہ طرابلس میں بسنے والے اطالوی باشندوں کی شکایات رفع کر دو یا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

ابھی خلیفہ کی طرف سے اس کا جواب بھی نہیں دیا گیا تھا کہ اٹلی نے تمام بین الاقوامی ضوابط کو پامال کرتے ہوئے اعلانِ جنگ کے بغیر اچانک اپنی افواج طرابلس الغرب کے ساحلوں پر اتار دیں۔ خلیفہ محمد رشاد نے یورپی ممالک سے احتجاج کیا مگر اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اٹلی کی افواج نے طرابلس الغرب کے بڑے ساحلی شہروں: طرابلس اور بن غازی کو گھیر لیا۔ ۱۴ اکتوبر کو حملہ آور طرابلس میں گھس گئے۔ ۱۹ اکتوبر کو انہوں نے بن غازی پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس حملے میں اطالوی سپاہیوں نے عربوں پر بڑے بہیمانہ مظالم ڈھائے۔ گھروں میں گھس کر عورتوں کی عصمت دری

---

[1] تاریخ الدولة العثمانیة، از یلماز اوزتونا: ۲/۲۱۸ تا ۲۲۰

کی اور بچوں تک کو بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کیا۔

یہ اطلاعات ملنے پر ترک حکومت نے برطانیہ سے درخواست کی کہ انہیں مصر کے راستے اپنی فوجیں طرابلس بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ انگریز مدت دراز تک سلطنتِ عثمانیہ سے دوستی کی پینگیں بھی ڈالتے آئے تھے اور اسی آڑ میں انہوں نے مصر پر جو اصولاً سلطنتِ عثمانیہ کا صوبہ تھا، ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ مگر اب شدید ضرورت کے وقت انہوں نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں اور راستہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔

آخر کار ترکی سے جنرل عزیز مصری، جنرل انور پاشا اور جنرل نوری سمندری راستے سے طرابلس الغرب کے دفاع کے لیے پہنچے۔ معاون جرنیلوں میں مصطفیٰ کمال بھی تھا۔ طرابلس الغرب کے مقامی علماء و مشائخ کی روحانی و جہادی تنظیم ''الحرکۃ السنوسیۃ'' کے کارکن بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان کی جان توڑ کوششوں سے، اٹلی کی فوج ساحل سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مجاہدین طرابلس تک پہنچ گئے اور انہوں نے بن غازی کے محاذ پر بھی حریف کو شکست دی۔

ان معرکوں میں مسلمانوں نے ایمانی غیرت اور حمیت و شجاعت کی ان کہی ان سنی داستانیں رقم کیں۔ اسلامی سرحدوں کے دفاع کے لیے عورتیں، بچے اور بچیاں تک اپنی جانوں پر کھیل گئے۔ ان معصوموں میں سے ایک بارہ سالہ بچی فاطمہ بنت عبداللہ تھی جو توپوں کی گھن گرج، امنڈتے شعلوں، دھوئیں کے بادلوں اور بارود کے بگولوں کے درمیان پانی کی بوتل ہاتھ میں لیے، زخمی مجاہدین کو پانی پلانے دوڑتی دکھائی دیتی تھی۔ جب ایک معرکے میں یہ معصوم بچی شہید ہوئی تو شاعرِ مشرق علامہ اقبال بھی اسے یہ خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہوئے ۔

فاطمہ تو آبروئے ملتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

مجاہدین کے متواتر حملوں سے تلملا کر اٹلی نے ترکی کو دھمکی دی کہ وہ استنبول پر قبضہ کر لے گا۔ مگر خلیفہ محمد رشاد نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ اس پر اٹلی کی بحری فوج نے بحیرۂ روم کے مشرق کی طرف بڑھ کر روڈس سمیت ترکی کے بارہ جزیروں پر قبضہ کر لیا اور بیروت کی بندرگاہ کو بھی سخت نقصان پہنچایا۔

۱۹۱۲ء میں اطالوی افواج طرابلس الغرب (لیبیا) کے اہم شہروں: طرابلس، برقہ اور فزان پر قابض ہو گئیں اور ترک افواج نرغے میں آ گئیں۔ خلیفہ نے مجبور ہو کر اٹلی سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت ترک فوج کو بحفاظت واپسی کی ضمانت دی گئی۔ جنرل انور پاشا واپس نہیں جانا چاہتا تھا مگر اسے مجبور کر دیا گیا۔ البتہ جنرل عزیز وہیں رہ گیا اور سنوسی مجاہدین کے ساتھ مل کر اطالوی استعمار سے نبرد آزما رہا۔ اطالوی حکام نے طرابلس الغرب کا نام بدل کر ''لیبیا'' رکھ دیا جو آج تک رائج چلا آ رہا ہے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو خلیفہ کی منظوری سے معاہدہ لوزان عمل میں آیا جس میں لیبیا پر اٹلی کا تسلط قبول کر لیا گیا۔ ساتھ ہی یہ طے ہوا کہ ترکی کا ایک اعلیٰ عہدے دار اٹلی کے نائب السلطنت کے طور پر لیبیا میں تعینات ہوگا۔ شرعی عہدے داروں

کا تقرر استنبول سے ہوگا۔ روڈس اور بارہ جزیرے ترکی کو واپس کر دیے جائیں گے۔ [1]

سنوسی مجاہدین کی تحریکِ جہاد اور عمر مختار شہید:

لیبیا میں اٹلی کی غاصبانہ مہمات جاری تھیں کہ پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی، جس میں اٹلی نے فرانس، برطانیہ اور روس کا ساتھ دیا جبکہ ترکی، جرمنی کے شانہ بشانہ تھا۔ اس طرح اٹلی اور ترکی دوبارہ مقابل آ گئے۔ ترکی نے اس دوران سنوسی مجاہدین کی حتی المقدور مالی مدد کی، یوں ان جانبازوں کو مزید کئی سالوں تک لڑنے کا موقع مل گیا۔ مگر جب جنگِ عظیم میں ترکی کو شکست ہوئی تو وہ کسی کی مدد کے قابل نہ رہا۔ اس کے باوجود سنوسی مجاہدین ایک مدت تک اس خطے کو اپنے خون سے گل رنگ کرتے رہے۔ ان کے روحانی قائد مدینہ منورہ میں جا ٹھہرے جبکہ میدانی قائد عمر مختار نے دو عشروں تک چھاپہ مار جنگ جاری رکھی اور اطالوی افواج کو جگہ جگہ ہزیمتیں دیں۔ ۱۹۳۱ء میں عمر مختار کی گرفتاری اور شہادت کے بعد اٹلی اس ملک پر پوری طرح قابض ہو سکا۔ [2]

جب پرچم جاں لے کر نکلے، ہم خاک نشیں مقتل مقتل
اس وقت سے لے کر آج تک، جلاد پہ ہیبت طاری ہے
زخموں سے بدن گلزار سہی، پر اُن کے شکستہ تیر گِنو
خود ترکش والے کہہ دیں گے، یہ بازی کس نے ہاری ہے [3]

جمعیت حریت وائتلاف کی کامیابی، کامل پاشا کی حکومت:

طرابلس الغرب کے سقوط اور بلقان کی شکست نے پورے ترکی کو سوگوار کر دیا تھا۔ ترکی کا دایاں بازو کٹ گیا تھا۔ افریقہ میں اس کے پاس چپہ بھر زمین بھی نہ رہی تھی۔ برطانوی بحری بیڑا خلیج بصرہ پہنچ چکا تھا اور ترکی سے مطالبہ کر رہا تھا کہ وہ کویت، قطر اور حضر موت کی بندرگاہیں اس کے حوالے کر دے۔ ترکی کے عوام اور فوجی افسران شدید صدمے کی کیفیت سے دوچار تھے۔ جمعیت اتحاد والترقی کی مقبولیت خاک میں مل گئی اور حزبِ اختلاف "جمعیت حریت و ائتلاف" (Freedom and Accord Party) کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ [4]

چوں کہ جمعیت اتحاد وترقی کو انتخابات میں شکست کا یقین تھا، لہٰذا سب سے پہلے اس نے آئین کی شق نمبر ۳۵ کو

---

[1] تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوزتونا: ۲/۲۰۹ تا ۲۱۱؛ الدولة العثمانیة، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی، ص: ۴۳۶؛ الموسوعة العربیة العالمیة: مادہ لیبیا، عمر مختار

اس جنگ کی سب سے زیادہ تفصیل شیخ طاہر احمد طرابلسی کی تصنیف "جہاد الابطال فی طرابلس الغرب، ص ۴۳ تا ۹۸" میں ملے گی۔

ملحوظہ: مگر اٹلی نے روڈس اور بارہ جزائر ترکی کے حوالے کرنے کا وعدہ ایفا نہ کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۴۵ء میں جرمنی نے جب ان جزائر پر قبضہ کیا تو انہیں ترکی کو لوٹانے کی پیش کش کی مگر ترکی نے اسے قبول نہ کیا جس کے بعد یہ جزیرے یونان کے قبضے میں چلے گئے۔

[2] الدولة العثمانیة، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی، ص: ۴۳۷؛ الموسوعة العربیة العالمیة: مادہ لیبیا، عمر مختار

[3] احمد فراز

[4] یہ پارٹی ۲۱ نومبر ۱۹۱۱ء کو قائم ہوئی تھی اور ۱۹۱۹ء میں اسے کالعدم قرار دے دیا گیا تھا۔

تبدیل کرادیا تا کہ نئی حکومت جلد توڑی جا سکے۔ آئین کا اصل مسودہ جو ۱۸۷۶ء میں مدحت پاشا نے سلطان عبدالحمید ثانی سے منظور کرایا تھا، اپنی شق ۳۵ میں سلطان کو کسی بھی وجہ سے پارلیمان اور کابینہ توڑنے کا حق دیتا تھا۔ سلطان عبدالحمید کو اپنے دور میں یہ اختیار حاصل رہا اور اسی سے کام لے کر اس نے پارلیمان کو معطل کیا۔ جمعیت اتحاد وترقی نے حکومت سنبھال کر سلطان کے اس اختیار کو مشروط کر دیا، جن میں اہم ترین شرط یہ تھی کہ سلطان سینٹ سے مشورہ کر کے ہی پارلیمان کو معطل کر سکتا ہے۔ مگر جب جمعیت نے حزب اختلاف کو غالب آتا دیکھا تو آئین کی اس شق میں ایک بار پھر ترمیم کرا کے سلطان کو پارلیمان توڑنے کا مطلق اختیار دے دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر حزب اختلاف حکومت بنا بھی لے تو سلطان پر دباؤ ڈال کر اسے کسی بھی وقت ختم کیا جا سکے۔

بہرکیف حزب اختلاف کو خاصی عوامی حمایت حاصل ہو چکی تھی۔ اس لیے جب اپریل ۱۹۱۲ء (۱۳۳۰ھ) میں سلطنت عثمانیہ کی تاریخ میں دوسری بار عام انتخابات ہوئے تو ''جمعیت حریت واتحاف'' (Freedom and Accord Party) قومی اسمبلی کی ۲۷۵ میں سے ۲۶۹ نشستوں پر بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ جمعیت اتحاد وترقی کے لیڈر عوامی حمایت سے بالکل محروم تھے۔ چنانچہ جمعیت اتحاد وترقی کو حکومت سے دست بردار ہونا پڑا، اور محمد کامل پاشا کی صدارت میں نئی مجلس وزراء تشکیل دے دی گئی۔ [1]

فوجی انقلاب۔ کامل پاشا معزول۔ محمود شوکت پاشا کا قتل:

مگر جمعیت اتحاد وترقی کے جرنیلوں نے اس منتخب حکومت کو ایک سال بھی نہ چلنے دیا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۱۳ء کو حزب 'الحریہ والائتلاف' کا تختہ الٹ دیا گیا۔ جمعیت اتحاد وترقی سے تعلق رکھنے والا ترک جرنیل انور پاشا سپاہیوں کو لے کر وزیر اعظم محمد کامل پاشا کے محل میں گھس گیا اور اس سے جبراً استعفیٰ لے لیا۔

جنرل محمود شوکت کی قیادت میں ایک نئی مجلس وزراء تشکیل دی گئی۔ یہ وہی محمود شوکت تھا جس نے سلطان عبدالحمید کا تختہ الٹا تھا اور ۱۹۰۸ء سے اب تک سنگین سیاسی وقومی جرائم کا مرتکب چلا آرہا تھا۔

مگر محمود شوکت نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر کچھ ایسے اقدامات کیے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہو چکا ہے۔ وہ عربوں کی دلجوئی کر کے ان کا ترکی سے رشتہ مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ مگر گیارہ جون ۱۹۱۳ء کی صبح اسے قتل کر دیا گیا۔ وہ سرکاری موٹر میں اپنی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا کہ اسے روک کر اس پر پانچ فائر کیے گئے۔ [2]

عسکری تکون (ملٹری ٹرائی اینگل) کی اجارہ داری:

اس کے قتل کے بعد طلعت پاشا، انور پاشا اور جمال پاشا نے سلطان رشاد کو مجبور کر کے اپنے من پسند عہدوں کی منظوری لے لی۔ طلعت پاشا کو وزارت عظمیٰ، انور پاشا کو وزارت دفاع اور جمال پاشا کو امارت البحر کے مناصب مل

---

① التاريخ الاسلامي لدكتور محمود شاكر: ۸/ ۲۱۲

② تاريخ الدولة العثمانية، از يلماز اوزتونا: ۲/ ۲۲۱، ۲۲۲؛ التاريخ الاسلامي لدكتور محمود شاكر: ۸/ ۲۱۳، ۲۱۴

گئے۔ سعید حلیم پاشا کو صدر اعظم بنادیا مگر اس کی حیثیت محض رسمی تھی۔ مشترکہ طور پر ملک کی باگ ڈور ٹرائی اینگل کے ہاتھ میں تھی۔ مگر یہ خود مختلف الآرا تھے۔ ان کی صورتحال کچھ یوں تھی:

1. طلعت پاشا وطنی حمیت کا علمبردار، ذہین اور مکار مگر دینی شعور سے بے بہرہ اور علم وفضل سے محروم تھا۔ وہ "مرکزیت" کا قائل تھا اور تمام صوبوں کو ترکی سے متصل رکھنا اور "عثمانیت" کو چمکانا چاہتا تھا۔
2. جمال پاشا ترک قومیت کا ترجمان اور خارجی سیاست میں فرانس سے تعلقات بڑھانے کا قائل تھا۔
3. انور پاشا کی عمر اس وقت صرف ۳۲ سال تھی۔ وہ درمیانے درجے کی افسری سے یکدم چیف آف آرمی اسٹاف پر پہنچ گیا تھا۔ ۳ جنوری ۱۹۱۴ء کو وہ وزیرِ دفاع بھی بن گیا اور پورے ملک کی فوج اس فردِ واحد کے ہاتھ میں آگئی۔ اس عروج میں جمعیت اتحاد وترقی کے علاوہ شاہی خاندان سے رشتے کا دخل بھی تھا کیوں کہ اس کی بیوی خلیفہ رشاد کی بھتیجی تھی۔ انور پاشا دیگر قوم پرست لیڈروں کے برخلاف اسلام پسند، دین دار اور پاک کردار تھا۔ اس کی غیرت وشجاعت میں بھی کوئی کلام نہ تھا مگر خودرائی اور تنگ نگاہی نے اس کی بہت سی خوبیوں پر پانی پھیر رکھا تھا۔ اس نے محض تعصب کی وجہ سے ان اکثر افسران کو معزول کردیا تھا جن کی تربیت پر سابق سلطان عبدالحمید نے بے پناہ دولت خرچ کی تھی اور وہ اسلامی حمیت اور جنگی تجربے کے سبب آئندہ ترکی کے دفاع میں اہم ترین کردار ادا کرسکتے تھے۔

تاہم انور پاشا نے نئے افسران اور فوجی بھرتی کرکے انہیں مختصر وقت میں کڑی تربیت دلائی اور جنگِ بلقان اول کی شکست کھائی ہوئی ترک فوج کو ایک مختصر عرصے میں دوبارہ منظم، مضبوط اور زورآور بنا کر دکھادیا جس نے بلقان کی دوسری جنگ اور پہلی جنگِ عظیم میں جگہ جگہ اپنی قوت کا لوہا منوایا۔[1]

جنگِ بلقان دوئم:

بلقانی اتحاد، ترکی سے یورپی مقبوضات چھیننے کے چند ماہ بعد آپس میں لڑ پڑا۔ بلغاریا نے مقدونیہ کی حکومت سنبھالی تو رومانیا، سربیا اور یونان اسے ناقابل برداشت تصور کرکے بلغاریہ سے آمادۂ پیکار ہوگئے۔

۲۹ جون کو اس جنگ کا آغاز ہوا۔ اس موقع پر ترکی نے بھی بلغاریا کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور محاذ پر متعدد کامیابیاں حاصل کیں۔ آخر ۱۹۱۴ء میں لندن میں متحارب قوتیں مذاکرات کے لیے بیٹھیں جس کے نتیجے میں ترکی جنگِ بلقان اول میں چھینے گئے کچھ علاقے واپس لینے میں کامیاب ہوگیا جن میں "اورنہ" (ایڈریانوپل) بہت اہم تھا۔[2]

◆◆◆

---

1. تاريخ الدولة العثمانية، از يلماز اوزتونا: ۲/۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۸؛ التاريخ الاسلامي لدكتور محمود شاكر: ۸/۲۱۳
2. التاريخ الاسلامي لدكتور محمود شاكر: ۸/۲۱۳

پہلی عالمی جنگ کیسے چھڑی؟

۱۹۰۷ء ہی سے یورپی قوموں کے گروہوں میں عسکری طاقت کے بل بوتے پر محاذ آرائی کی فضا بن چکی تھی۔ جرمنی کا آسٹریا اور ہنگری کی مشترکہ سلطنت سے معاہدہ ہو گیا تھا اور انہیں ''مرکزی قوتیں'' کہا جاتا تھا۔

دوسری سمت برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان سہ طرفہ معاہدہ ہو چکا تھا اور انہیں ''اتحادی طاقتیں'' کہا جاتا تھا۔

تیسری طرف ترکی غیر جانبدار تھا مگر سلطان عبدالحمید کے زمانے میں ریلوے لائن منصوبے میں شراکت کے باعث ترکی اور جرمنی بہت قریب ہو چکے تھے۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں یکا یک یورپی ممالک میں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ کو دنیا کی تاریخ کا بدترین حادثہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس نے دنیا کا نقشہ جس طرح بدلا، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ صفحۂ ہستی سے فنا ہو گیا۔ شہر کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے۔ قحط، افلاس اور وبائی امراض نے شکست خوردہ ملکوں کو لپیٹ میں لے لیا۔ طاقت کے مراکز تبدیل ہو گئے۔ عالمی دولت و ثروت کے مالکان بدل گئے۔ بڑے بڑے شاہی خانوادے جن کے تصرف میں اربوں کھربوں کے خزانے اور جائدادیں تھیں، کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔ ناقابلِ بیان حد تک دولت و ثروت، چند فاتحین کے ہاتھ میں آ گئی۔

فاتح قوتوں نے شکست خوردہ ممالک سے بھیانک انتقام لیا اور انہیں نہ صرف سیاسی، عسکری اور اقتصادی لحاظ سے مفلوج کر دیا بلکہ ان کی قدیم بادشاہتوں تک کا خاتمہ کر ڈالا تاکہ ان کا اپنے ماضی سے رشتہ منقطع کر دیا جائے۔ ترکی سے بنو عثمان کی ساڑھے سات سو سالہ حکومت ختم ہو گئی۔ جرمنی سے ہوہینزولیرن (Hohenzollern) اور آسٹریا سے ہابزبرگ (Habsburg) خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ حد یہ ہے اس جنگ کے اثرات نے فاتح قوموں کو بھی نہ چھوڑا۔ روس جس نے بڑے طمطراق سے یہ جنگ چھیڑی تھی، سیاسی خودکشی پر مجبور ہو گیا اور وہاں لینن نے زار شاہی کا تختہ الٹ دیا۔

جنگ سے پہلے دنیا میں طاقت کا تناسب:

عالمی جنگ چھڑنے سے پہلے دنیا میں طاقت کا تناسب یورپ میں مرکوز تھا۔ برطانیہ نوآبادیاتی رقبے و آبادی اور دولت و ثروت کے لحاظ سے دنیا میں سب سے آگے تھا۔ اس کے بعد جرمنی تھا جو عسکری طاقت میں برطانیہ کے قریب قریب ہم پلہ اور صنعت اور ایجادات میں اس پر فائق تھا۔ اس کی بری فوج دنیا کی سب سے بڑی اور منظم فوج تھی۔

نوآبادیاتی رقبے اور عسکری طاقت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر فرانس تھا۔ برطانیہ اور فرانس دونوں جرمنی سے خائف تھے اور اس کی طاقت ختم کرنا چاہتے تھے۔

چوتھا نمبر روس کا تھا جو ایجادات، صنعت وحرفت اور معیشت میں برطانیہ اور فرانس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کی بری فوج دنیا کی تیسری بڑی فوج تھی۔ طاقت کے اعتبار سے امریکا پانچویں نمبر پر تھا مگر اس کی بری فوج اتنی نہ تھی کہ بیرونی مہمات میں کام آتی۔ ہاں صنعت وایجادات میں وہ پوری دنیا سے آگے نکل چکا تھا۔

جاپان نے فوجی اور صنعتی لحاظ سے دنیا میں غیر معمولی مقام حاصل کر لیا تھا۔ خاص کر اس کا بحری بیڑہ نہایت تباہ کن تھا جس کے باعث وہ نہ صرف مشرقِ بعید کی متعدد یورپی نوآبادیات پر قابض ہو چکا تھا بلکہ چین میں بھی کھلی مداخلت کر رہا تھا۔ چین کے لیڈروں نے ۱۹۱۲ء میں اپنی کئی ہزار سالہ قدیم شہنشاہیت کا خاتمہ کر کے وہاں جمہوریت رائج کر دی تھی مگر اس کے باوجود یہ ملک اس وقت یورپی استعمار اور جاپانی شہنشاہیت کے شکنجے میں تھا۔

آسٹریا اور ہنگری کا وفاق بھی یورپ کی اہم طاقتوں میں شمار ہوتا تھا جو روس سے سرحدی ارتباط کی وجہ سے خوفزدہ تھا۔ یہ یورپ کی واحد طاقت تھی جو جرمنی کی حلیف تھی۔

جنگ کی فوری وجہ:

یورپی ممالک میں سے ہر ایک بلقان کی ان ریاستوں میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانا چاہتا تھا جو سلطنتِ عثمانیہ سے آزاد ہوئی تھیں۔ اسی سلسلے میں آسٹریا اور ہنگری کی مشترکہ سلطنت کا ولی عہد فرانس فرڈی ننڈ اپنی بیوی صوفیا کے ساتھ بوسنیا کے دورے پر نکلا۔ ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو سرائیو میں اس پر قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ اپنی بیوی سمیت مارا گیا۔ قاتل کا تعلق ایک سرب دہشت گرد تنظیم سے تھا جو اس خطے میں آسٹریا کے اثر ورسوخ کی مخالف تھی۔

آسٹریا نے اس سانحے کو ناقابلِ برداشت قرار دیا۔ شاہِ جرمنی ولیم دوئم نے اعلان کر دیا کہ اگر آسٹریا اس قتل کا بدلہ لینا چاہے تو جرمنی اس کی مدد کرے گا۔ آسٹریا ایک مدت سے سربیا کو کچلنے کے درپے تھا۔ اس قتل کو وجہ بنا کر اس نے ۲۸ جولائی کو سربوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

روس سربوں کا حامی تھا اور انہیں اس خطے میں اپنے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اس نے سربوں کو بچانے کے لیے آسٹریا کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ جرمنی چونکہ آسٹریا کا صلح وجنگ میں حلیف تھا لہٰذا آسٹریا پر روس کا غلبہ اس کے لیے بھی مہلک تھا، لہٰذا اس نے آسٹریا کے ساتھ جنگ میں شراکت کا اعلان کر دیا۔

جرمنی کی طوفان خیز افواج کے سامنے روس کی شکست کوئی بعید نہ تھی، اس لیے فرانس جو جرمنی کا سخت دشمن تھا، روس کی حمایت میں کھڑا ہو گیا۔ برطانیہ کو خدشہ ہوا کہ فرانس اور روس مل کر بھی جرمنی سے شکست کھا جائیں گے جس کے بعد جرمنی کے مقابلے میں برطانیہ تنہا رہ جائے گا۔ لہٰذا وہ بھی فرانس اور روس کے ساتھ مل گیا۔

اس دورانِ جنگ روکنے کے لیے دُوَلِ یورپ کی کانفرنس منعقد ہوئی مگر آسٹریا اور جرمنی نے یہ کہہ کر کانفرنس کی

سفارشات کو مسترد کر دیا کہ یہ آسٹریا، جرمنی اور سربیا کا داخلی تنازعہ ہے، جس میں کسی اور کو دخل دینے کا حق نہیں۔ اس پر کانفرنس میں شریک ممالک بھی برطانیہ اور فرانس سے مل گئے۔

یوں اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی جس میں ابتداءً ایک طرف جرمنی اور "متحدہ آسٹریا و ہنگری" تھے جبکہ دوسری جانب سرب دہشت گرد اور ان کا حامی روس۔ مگر ہر فریق سفارتی کوششوں اور سابقہ معاہدوں کا زور ڈال کر اپنے حلیفوں کو بھی اس جنگ میں شامل کرتا گیا۔ فرانس اور برطانیہ نے بلجیم، روس، پرتگال، یونان اور امریکا کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یورپ میں صرف اسپین، سوئزرلینڈ، ہالینڈ، سویڈن اور ڈنمارک غیر جانب دار رہے۔

مغربی محاذ پر جرمنی نے بلجیم کو تاراج کرتے ہوئے فرانس اور برطانیہ کی مشترکہ فوجوں کو شکست دے دی اور فرانس کے بیشتر حصے پر قابض ہو گیا۔ مشرقی محاذ پر جرمنی اور آسٹریا کی متحدہ فوجیں روس کے کئی سرحدی شہروں میں گھس گئیں۔

۲۳ اگست ۱۹۱۴ء کو جاپان بھی اتحادیوں کے ساتھ شامل ہو گیا اور اس نے بحرالکاہل کے جزائر سے جرمنوں کو بے دخل کر کے چین کی جرمن آبادی "سنگ تاؤ" پر قبضہ کر لیا۔

مغربی محاذ پر برطانیہ نے ۱۹۱۴ء کے اواخر تک سمندر کی جانب سے جرمنی کی سخت ناکہ بندی کر لی تھی کہ جرمنی کے کسی بحری جہاز کا اپنی بندرگاہ سے نکلنا یا کوئی بیرونی مدد وہاں تک پہنچنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس محاصرے نے جرمنوں کو بھوکا مرنے پر مجبور کر دیا۔ ایسے میں جرمنی اسلحہ سازوں نے دن رات تجربات کر کے آبدوز ایجاد کی اور ۷ مئی ۱۹۱۵ء کو دنیا کی پہلی آبدوز نے حملے کا تجربہ کرتے ہوئے آئرلینڈ کے ساحل پر برطانیہ کا ایک جہاز ڈبو دیا جس میں ۱۱۹۸ افراد سوار تھے۔ ان میں ۱۲۸ افراد امریکی تھے جن کا انتقام لینے کے لیے امریکا بھی اس جنگ میں شامل ہو گیا۔ مئی ۱۹۱۷ء کو امریکا نے اپنی افواج فرانس میں اتار دیں تاکہ وہ جرمنی کے خلاف لڑیں۔

جیسے جیسے جنگ کا دائرہ پھیلتا گیا، مختلف ممالک اس میں شامل ہوتے گئے۔ ۲۳ مئی ۱۹۱۵ء کو اٹلی نے بھی اتحادیوں کی صف میں شامل ہو کر آسٹریا پر چڑھائی شروع کر دی۔ جنگ کو تین سال سے زائد مدت گزرنے پر بھی فتح و شکست کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس دوران، روس میں لینن نے کمیونسٹ انقلاب برپا کر دیا اور زار روس کی حکومت ختم کر کے دسمبر ۱۹۱۷ء میں جرمنی سے جنگ بندی کر لی۔

۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو امریکی صدر ولسن نے چودہ نکاتی امن فارمولا پیش کر دیا۔ اس کے باوجود جرمن نہ جھکے اور جنگ مزید کئی ماہ تک جاری رہی۔ آخر میں اتحادی جرمنی کو مغربی محاذ پر شکستِ فاش دینے میں کامیاب ہو گئے، جس کے بعد جرمنی مجبور ہو کر مذاکرات کی میز پر آ گیا۔[1]

عالمی جنگ میں ترکی کا کردار:

جرمنی کا ترکی سے معاہدہ تھا، اس لیے جنگ چھڑتے ہی ترکی کے سامنے یہ سوال آ کھڑا ہوا تھا کہ جرمنی سے معاہدہ

---

[1] الموسوعة العربية العالمية: مادة، الحرب العالمية الاولى؛ تاریخ الدولة العثمانية از یلماز اوزتونا: ۲/۲۳۲، ۲۳۰

باقی رکھنے اور جنگ میں شرکت کرنے میں فائدہ ہے یا غیر جانب دار رہنا بہتر ہوگا۔ سلطان محمد رشاد، اس کا ولی عہد یوسف عزالدین اور طلعت پاشا سمیت اکثر وزراء اس جنگ میں شرکت بے سود سمجھتے تھے اور یہی صحیح رائے تھی۔

ترکی کا یورپی قضیے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ ہی کوئی ایسی مصیبت سر پر آ کھڑی ہوئی تھی جو ترکی کو اس بلا میں گھسیٹ لے جاتی۔ ترکی کو تباہی کی اس دلدل میں دھکیلنا ۳۲ سالہ وزیر دفاع انور پاشا کی ذاتی رائے کا کرشمہ تھا۔

تلاشِ منزل کے مرحلوں میں یہ حادثہ ایک عجیب دیکھا
فریب راہوں میں بیٹھ جاتا ہے صورتِ اعتبار بن کر
غرورِ مستی نے مار ڈالا وگرنہ ہم لوگ جی ہی لیتے
کسی کی آنکھوں کا نور بن کر کسی کے دل کا قرار بن کر

انور پاشا اپنے طبعی جوش، قومی غیرت اور اسلام پسندانہ نظریات کے باعث یہ ولولہ رکھتا تھا کہ ترکی کو دوبارہ سپر پاور بنا کر دکھائے۔ یہ اس کا سب سے بڑا خواب تھا جس کے لیے وہ ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھا۔ اس نے ایک مدت پہلے زیر تربیت افسر کے طور پر جرمنی کا سفر کیا تھا اور اس دوران اس قوم کی فوجی تیاریاں دیکھنے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت جرمنی کو شکست نہیں دے سکتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اس یقین میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ترک فوج کو مضبوط کر کے بلقان کی دوسری جنگ جیتنے کے بعد انور پاشا کو اطمینان تھا کہ اگر وہ اور جرمنی متحد ہو جائیں تو روس، فرانس اور برطانیہ سے دو صدیوں کا بدلہ لیا جا سکتا ہے۔ حالات گواہی دیتے ہیں کہ جرمنی کو روس اور دول یورپ کے مقابل کھڑا دیکھتے ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ترکی یہ جنگ لڑے گا۔ اس کی یہ رائے بنانے میں اہم ترین کردار ان جرمن جرنیلوں نے ادا کیا، جو ترک فوج میں بطور مشیر شامل تھے۔[1]

انور پاشا نے جب جنگ کی ٹھانی تو دوسری صف کے کئی ترک جرنیلوں نے جن میں عصمت انونو، مصطفیٰ کمال پاشا اور کاظم قرہ بکر قابلِ ذکر ہیں، انور پاشا کو جنگ میں شرکت سے روکنے کی کوشش کی مگر انور پاشا نہ مانا۔[2]

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از یلماز اوزتونا: ۲/۲۳۲، ۲۳۶
یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ عالمی جنگ چھیڑنے میں اصل کردار صیہونی رہنماؤں کا تھا جس کی تفصیل ہم آگے بتائیں گے۔ مگر یہاں انور پاشا کو جنگ پر تلا دیکھ کر یہ امکان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ صیہونیوں نے اسے ورغلانے کا پورا انتظام کر رکھا ہو کیوں کہ انور پاشا فری میسن کی تیار کردہ جمعیت اتحاد و ترقی کا رہنما تھا جس میں وہ پہلے سے یہودیوں کا ڈسا ہوا تھا۔ زر خرید مشیروں کے ذریعے اسے دوبارہ ایک تباہ کن فیصلے پر آمادہ کرنا یہودیوں کے لیے کوئی ناممکن بات نہ تھی۔ بلکہ یہ بھی بعید نہیں کہ جن جرمن جرنیلوں نے انور پاشا کو یہ راہ دکھائی ہو، وہ بھی یہودی لابی کے زیر اثر ہوں۔
کہا جاتا ہے کہ ہٹلر یہودیوں کا اسی لیے حد درجہ دشمن تھا کہ وہ جرمنی کے یہودی جرنیلوں کو پہلی عالمی جنگ کے اسباب پیدا کر کے جرمنی کی تباہی کا باعث مانتا تھا۔ ہٹلر نے اپنی آپ بیتی "میری جدوجہد" میں نہ صرف جرمنوں کے زوال بلکہ عالمی امن کی بربادی کا ذمہ دار یہودیوں کو قرار دیا ہے۔
② تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از یلماز اوزتونا: ۲/۲۳۲، ۲۳۶
مصطفیٰ کمال کا انور پاشا کو جنگ میں شرکت سے روکنا ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت تک یہودی اسے استعمال کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہ تھے اور ان کے باہمی روابط کچھ خاص نہ تھے۔ البتہ عالمی جنگ کے دوران برطانوی اعلیٰ افسران نے اسے مہرہ بنانے کا فیصلہ کیا جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

ترکی کے پاس جنگ میں شرکت کی کیا وجہ تھی؟

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ترکی کے پاس جنگ میں شریک ہونے کی تین بڑی وجوہ تھیں:

① برطانیہ نے بلاوجہ ترکی کے ان دو جہازوں کو غصب کر لیا تھا جو برطانوی جہاز سازی کے کارخانوں میں تیار کیے گئے تھے اور ان کی پیشگی قیمت دی جا چکی تھی۔

② جمال پاشا خلیفہ کا سفیر بن کر فرانس گیا تو فرانسیسی حکام نے اصرار کیا تھا کہ ترکی شام کو خود مختاری دے دے۔

③ جرمنی کے دو جہاز، برطانوی بحری بیڑے سے بچنے کے لیے درۂ دانیال میں داخل ہوئے تھے اور برطانیہ ترکی پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ جرمن جہازوں کو برطانیہ کے حوالے کر دے، جبکہ جرمنی ترکی کا حلیف تھا۔

مگر حقیقت بین نگاہ سے دیکھا جائے، تو ان میں سے ایک وجہ بھی ایسی نہیں تھی جو ایک بڑی جنگ شروع کرنے کے لیے کافی ہوتی۔ ان وجوہ کی حیثیت بہانوں سے زیادہ نہیں تھی جنہیں کوئی ایسی طاقت، اس وقت اختیار کرتی ہے جب وہ فریق مخالف پر ہر طرح برتری رکھتی ہو، اور اسے کسی بڑے نقصان کے اندیشے کے بغیر کامل فتح کا یقین ہو۔ مگر کیا ترکی کی حیثیت اس وقت ایسی تھی کہ وہ دنیا کی بڑی طاقتوں کو آسانی سے زیر کرنے کی طمع کرتا اور کسی نقصان کے اندیشے کے بغیر ایک ہولناک ترین جنگ میں کود جاتا؟

عالمی جنگ میں ترکی کے حصہ لینے کی پُر اسرار کہانی:

حقیقت یہ ہے کہ اتنی بڑی لڑائی جس کی مثال دنیا کی قدیم و جدید تاریخ میں ناپید ہے، کسی مشاورت اور منصوبہ بندی کے بغیر فردِ واحد کی رائے پر شروع کی گئی تھی۔ کس طرح؟ اس پُر اسرار کہانی کی اصل رُوداد پیش خدمت ہے۔

عالمی جنگ چھڑنے کے کچھ عرصے بعد جرمنی کے دو بحری جہاز، درۂ دانیال کے دہانے پر آئے۔ انہوں نے خلیج باسفورس عبور کی اور بحیرۂ اسود میں داخل ہو کر روسی بحری جہازوں پر حملہ کر دیا۔ اس وقت تک ترکی غیر جانبدار تھا۔

جمعیت اتحاد و ترقی کی حکومت نے اس موقع پر یہ خبر نشر کی کہ جرمن جہاز ترک حکومت کو اطلاع دیے بغیر خلیج میں داخل ہوئے تھے۔ حالانکہ غور کیا جائے تو اس دعوے پر یقین کرنا مشکل ہے۔ درۂ دانیال پر ہمیشہ سخت پہرا رہتا تھا اور کوئی غیر ملکی جہاز بلا اجازت وہاں سے نہیں گزر سکتا تھا۔ نیز ہر جہاز تلاشی دے کر اور اسلحہ رکھوا کر ہی داخل ہوتا تھا۔

ایسے میں یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ انور پاشا نے خود جرمن جہازوں سے چشم پوشی کی اور انہیں خلیج سے گزار کر روسی بحریہ پر حملے کا موقع دیا تا کہ ایک طرف دولِ یورپ کو اپنے خلاف لڑائی چھیڑنے کا کوئی بہانہ دیا جائے اور دوسری طرف خلیفہ اور وزراء کو یہ یقین دلایا جا سکے کہ یورپ ہمارے خلاف لڑنے پر تلا ہوا ہے۔ یوں ترکی کے خلاف فضا بننے کا فائدہ اٹھا کر جنگ میں اترنے کا ماحول پیدا کیا جائے۔

انور پاشا کی توقع کے عین مطابق یہی ہوا۔ جب برطانیہ نے ترکی سے مطالبہ کیا کہ وہ جرمن جہازوں کو اس کے حوالے کر دے تو اس مطالبے کو مسترد کر دیا گیا۔ کیوں کہ انور پاشا کے خیال میں جنگ ناگزیر تھی۔ اس فیصلے کے لیے

اس نے اپنے تجزیے اور زاویۂ نگاہ پر انحصار کیا اور کابینہ بلکہ خلیفہ رشاد کو بھی اپنی پختہ ویز کی بھنک تک نہ پڑنے دی۔

اس دوران برطانیہ نے ترکی کو یورپی اتحاد میں شمولیت کی دعوت دے ڈالی تاکہ جرمنی کے خلاف جنگ جلد از جلد جیتی جاسکے۔ مگر برطانیہ کے حلیف فرانس اور روس ترکی کو اپنی صف میں شامل کرنے سے گریزاں تھے کیوں کہ روس استنبول اور درۂ دانیال پر قبضے کا خواہش مند تھا جبکہ فرانس شام کو زیرِ نگیں کرنا چاہتا تھا۔ ان دونوں ملکوں کا خیال تھا کہ اگر ترکی ان کے ساتھ شامل ہو گیا تو فتح کے بعد اتحادیوں کے لیے ترکی کے کسی حصے پر قبضے کا کوئی جواز نہیں رہے گا۔

روس اور فرانس کی اس سوچ کو مدنظر رکھتے ہوئے یورپی اتحاد نے ترکی کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی بجائے غیر جانبدار رہنے کی پیش کش کی اور اس کے بدلے اسے قرضے اور کچھ مراعات دینے کا وعدہ کیا مگر ترک حکومت نے اسے ٹھکرا دیا اور اس کی جگہ اپنی غیر جانبداری کے لیے یورپی اتحاد سے درج ذیل مطالبات کیے:

1. برطانیہ مصر سے نکل جائے۔
2. بحیرۂ ایجی کے جزیرے ترکی کو واپس کیے جائیں۔
3. روس کو ترکی کے داخلی معاملات میں مداخلت سے روکا جائے۔

یورپی اتحاد کی نیت فتح کے بعد ترکی کے حصے بخرے کی تھی، اس لیے اس نے ان مطالبات کا کوئی جواب نہ دیا، یوں باہمی تعلقات منقطع ہو گئے۔ اُدھر جرمن فوج فرانس میں داخل ہو چکی تھی مگر پیرس سے گزرنے والے دریائے سین کی ایک نہر "مارن" کے کنارے اتحادیوں نے بہت بڑی قوت جمع کر لی تھی اس لیے وہاں پہنچ کر جرمنی کی پیش قدمی رک گئی۔ ایسے میں جرمنی نے ترکی پر زور دیا کہ وہ جنگ میں شریک ہو کر روس کے مقابلے پر کھڑا ہو جائے تاکہ جرمنی پر جنگ کا بوجھ کم ہو اور وہ نہر مارن عبور کر کے فرانس کے مزید علاقوں پر قبضہ کر سکے۔ اس کے بدلے جرمنی نے نہ صرف ترکی کو پچاس لاکھ طلائی لیرے قرض دینے کی پیش کش کی بلکہ یہ خفیہ معاہدہ بھی کیا کہ فتح کے بعد مصر، طرابلس الغرب (لیبیا)، تیونس، الجزائر اور روسی ترکستان کے علاقے ترکی میں شامل کر دیے جائیں گے۔

وزیرِ دفاع انور پاشا پہلے ہی میدانِ جنگ میں اترنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے امیر البحر جمال پاشا کو حکم دیا کہ وہ بحیرۂ اسود میں روسی بحیرہ پر حملہ کر دے۔ اس وقت تک جمال پاشا بھی جنگ میں شرکت کی رائے سے متفق نہیں تھا مگر انور پاشا نے کسی نہ کسی طرح اسے ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا۔ غالباً وسطِ ایشیا پر قبضے اور مصر و تیونس کی بازیابی کی امید سامنے رکھ کر جمال پاشا نے یہ حکم مانا۔ اس نے بحیرۂ اسود کی بندرگاہ 'اوڈیسہ' پر روس کا ایک جنگی جہاز ڈبو دیا۔ اُدھر جرمنی کے ایک بحری جہاز نے روسی بندرگاہ "سیواستپول" پر حملہ کر کے ایک دخانی جہاز کو غرق کر دیا۔

یہ تھا دنیا کی سب سے بڑی جنگ میں ترکی کا پہلا قدم جس کے لیے خلیفہ سے اجازت تک نہیں لی گئی۔ بلکہ خلیفہ اور صدرِ اعظم تک کو کانوں کان اطلاع نہیں تھی کہ ترکی جنگ چھیڑ چکا ہے۔ تاہم روسی جہازوں کی غرقابی کے بعد ایسا ماحول بن گیا کہ خلیفہ نے اپنی ذاتی رائے کے خلاف جنگ جاری رکھنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ یوں ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۴ء (۱۰ ذوالحجہ

۱۳۳۲ھ) کو ترکی نے باقاعدہ اعلانِ جنگ کر دیا۔

چونکہ اسلامی جذبۂ جہاد کے بغیر اتنی بڑی لڑائی جیتنا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ اس لیے جمعیت اتحاد و ترقی کے لیڈروں کو پہلی بار "پان اسلام ازم" (الجامعۃ الاسلامیۃ) تحریک کو زندہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کی بنیاد سلطان عبدالحمید ثانی نے رکھی تھی اور قوم پرست حکومت اب تک اس کے آثارِ جمیلہ کھرچ کھرچ کر مٹاتی رہی تھی۔

اب وقتی مصلحت کے تحت اعلانِ جنگ کے بعد سلطنت میں جہاد کی منادی کرادی گئی اور پان اسلام ازم کی تحریک کا احیاء کر دیا گیا۔ خلیفہ رشاد، شیخ الاسلام اور اکابر علماء کی جانب سے تین مراسلے جن کی حیثیت فتاویٰ کی تھی، مرتب کیے گئے۔ ان کا مضمون یہ تھا:

"یہ جنگ جس میں دولتِ عثمانیہ شریک ہو رہی ہے، بلاشبہ ایک دینی لڑائی ہے جس کا مقصد مسلمانوں کے غلام ملکوں کو آزادی دلانا نیز اسلام، سلطنتِ عثمانیہ اور مقاماتِ مقدسہ، مکہ، مدینہ اور القدس کا دفاع کرنا ہے۔ اس جنگ میں شرکت جہاد ہے جو دینی لحاظ سے ہر بالغ اور صاحبِ استطاعت مسلمان پر فرضِ عین ہے۔"

اس کے ساتھ ہی مختلف اخبار و جرائد اور رسائل میں جہاد کی ترغیب پر مضامین شائع کیے جانے لگے، عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں میں سفارتی وفود بھیجے گئے۔[1]

بیگلر بیگ کے قلعے میں نظر بند سلطان عبدالحمید کو جب نفیرِ جہاد کی اطلاع ملی تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

"یہ بڑا جنگی ہتھیار ہے۔ ایسے اسلحے کے استعمال کو اس وقت تک مؤخر کر دینا زیادہ مؤثر ہوتا ہے، جب تک وہ ناگزیر نہ ہو جائے۔"[2]

مسلم دنیا نے ترکی کا ساتھ کیوں نہ دیا؟

ترک حکومت کو امید تھی کہ روسی ترکستان سے مصر اور لیبیا تک تمام مسلمان ترکی کا ساتھ دیں گے اور قابض مغربی طاقتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ مگر نفیرِ جہاد پر عالمِ اسلام کا ردِ عمل مایوس کن رہا۔ جس کی اہم وجوہ یہ تھیں:

① ترکی میں اصل حکمران خلیفہ نہیں بلکہ جمعیت اتحاد و ترقی کے قائدین تھے اور ان میں دینی غیرت و حمیت کی جگہ وطنیت اور قومیت کا عنصر نمایاں تھا۔ اس لیے دنیائے اسلام ان پر اعتماد نہیں کرتی تھی۔

② مسلمان ضعف و انحطاط کے انتہائی درجے پر پہنچ چکے تھے، اس لیے کسی انقلاب کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔

③ اکثر مسلم ممالک پہلے ہی عالمی طاقتوں کے قبضے میں تھے۔ وہ بھلا کسی کی مدد کیا کرتے۔

④ مسلمانوں کی بڑی تعداد عالمی حالات سے ناواقف اور صحیح یا غلط کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھی۔ ان کے باشعور طبقے کے پاس بھی زیادہ تر وہی معلومات و اطلاعات پہنچتی تھیں جو عالمی ذرائع ابلاغ پہنچانا چاہتے تھے۔ کوئی واضح سمت

---

① كيف سقطت الدولة العثمانية از سليمان بن صالح الخراشي: ص ٧٣، دار القاسم الرياض

② تاريخ الدولة العثمانية از يلماز اوزتونا: ٢/٢٣٨

سامنے نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے سکوت اور جمود ہی کو بہتر سمجھا۔

⑤رائے عامہ یہ بن چکی تھی کہ یہ جہاد نہیں عالمی طاقتوں کی باہمی لڑائی ہے جس میں ترکی کو استعمال کیا جارہا ہے۔[1]

مسلمانانِ ہند اور اکابرِ دیوبند کی قربانیاں:

البتہ عالم اسلام میں ہندوستان واحد خطہ تھا جہاں کے مسلمان برطانوی استعمار کے ماتحت ہوتے ہوئے بھی ترکی کے حق میں آواز بلند کرتے رہے۔ ہندوستانی علماء میں سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ نے اس موقع پر جان خطرے میں ڈال کر حجاز کا سفر بھی کیا اور اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر ریشمی رومال تحریک چلائی جس کا مقصد خلافت عثمانیہ کو قائم ودائم رکھنا اور مسلمانوں کو استعماری طاقتوں کی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ترک افواج، ایران و افغانستان کے راستے ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں سے یلغار کریں اور اسی وقت ہندوستان کے عوام اندرونی طور پر انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ مگر بعض غداروں نے یہ راز فاش کر دیا جس کی بناء پر شیخ الہند رحمہ اللہ اپنے رفقاء حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا عزیر گل رحمہ اللہ سمیت گرفتار کر لیے گئے اور انہیں مالٹا کے جزیرے میں قید رکھا گیا۔ عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد ان حضرات کو رہائی ملی تب بھی یہ چین سے نہیں بیٹھے بلکہ خلافت کے تحفظ کے لیے ہندوستان میں تحریک خلافت کا پرچم لے کر کھڑے ہوگئے۔

مرا دل شورِ شیون سے در باغِ جناں تک ہے
فغانِ بلبلِ نالاں، بہار بے خزاں تک ہے
نہیں پالا پڑا قاتل! تجھے ہم سخت جانوں سے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلادی کہاں تک ہے[2]

نفیرِ جہاد سے چاہے عالمی پیمانے پر کوئی ہل چل نہ مچی ہو مگر خود ترک مسلمانوں میں جو ولولہ اور شوقِ شہادت بیدار ہوا، اس کا اثر ساری دنیا نے دیکھا۔ جنگ کے پہلے سالوں میں ترکی اور جرمنی کا پلہ بھاری تھا۔ اکثر محاذوں پر اتحادی ان کا زور توڑنے میں بالکل ناکام رہے۔[3]

◆◆◆

---

① التاريخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۲۱۳/۸

② جوہر

③ کیف سقطت الدولة العثمانیة از سلیمان بن صالح الخراشی: ص ۷۳، ۷۳

عالمی جنگ کی ہولناکیاں

عالمی جنگ کے فریقین میں سے ہر ایک کو پہلے پہل یہ یقین تھا کہ اسے بہت جلد فتح نصیب ہوگی اور وہ وسیع نو آبادیات کا مالک بن کر خوشحالی اور ثروت سے ہمکنار ہو جائے گا۔ مگر جنگ طول کھینچتی گئی۔ اس جنگ میں پہلی بار طیاروں، ٹینکوں اور مشین گن کا استعمال ہوا۔

ترکی نے ایک نئے مستقبل کے خواب دیکھتے ہوئے اپنی ساری طاقت اس جنگ میں جھونک دی۔ لاکھوں سپاہی فراہم کیے گئے جن میں سے دو لاکھ استنبول اور درہ دانیال جبکہ ایک لاکھ اشیائے کوچک کی چھاؤنی ارض روم میں روسی سرحد کے قریب تعینات کیے گئے۔ ایک لاکھ سپاہی مختلف بٹالینوں کی شکل میں شام اور قفقاز کی سرحدوں پر لگا دیے گئے۔ چالیس ہزار کو فلسطین بھیجا گیا۔ نیز اڑھائی لاکھ نوجوانوں کی عسکری تربیت شروع کر دی گئی۔ ①

مشرقی محاذ:

ترکی تین براعظموں کے سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے کئی محاذوں پر اتحادیوں کے لیے مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ مشرقی محاذ پر انور "ارض روم" کی تھرڈ آرمی کور کے ایک لاکھ سپاہیوں کو لے کر خود سخت برفباری کے دوران روسی سرحدوں پر حملے کے لیے نکلا اور قفقاز کے برف پوش پہاڑوں تک جا پہنچا۔ مگر روسیوں کی سخت مزاحمت اور موسم کی قہر انگیزی نے یہ حملہ کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس مہم میں ۹۰ ہزار سپاہی جاں بحق ہو گئے اور باقی دس ہزار سخت ابتر حالت میں پسپا ہو کر واپس ارض روم آ گئے۔ ②

عدن کا محاذ:

ترکی کے لیے برطانیہ کا ہندوستان سے رابطہ منقطع کرنا ضروری تھا جس کا طریقہ یہ تھا کہ عدن پر انگریزوں کا تسلط ختم کر دیا جائے۔ برطانیہ ۱۸۳۹ء سے اس اہم ترین بندرگاہ پر قابض تھا۔ اگلے عشروں میں اس نے یمن کے زیدی ائمہ اور عثمانیوں کی کش مکش سے فائدہ اٹھا کر جنوبی یمن کے مزید علاقے غصب کر لیے تھے جنہیں ہندوستان کی برطانوی نو آبادیات کا حصہ مان لیا گیا تھا۔

یمن کے زیدی اماموں اور عثمانیوں کے مابین کئی صدیوں سے کش مکش چلی آ رہی تھی۔ عثمانی خلفاء یمن پر تسلط کے

---

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۲۱۳ تا ۲۱۷؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ ،از یلماز اوزتونا: ۲/۲۳۲ تا ۲۳۳

② التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۲۱۷؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ ،از یلماز اوزتونا: ۲/۲۳۸

لیے کوشاں رہے اور یمانی ائمہ ان کے خلاف شورشیں کھڑی کرتے رہے۔ عثمانیوں اور یمانی ائمہ میں آخری کش مکش ۱۹۱۱ء میں ہوئی تھی جس کا اختتام ترک امیر عزت پاشا اور زیدی امام یحییٰ حمید الدین کے مابین ایک معاہدے پر ہوا تھا۔ ترک افواج نے عالمی جنگ کے دوران ہندوستان اور برطانیہ کا رابطہ مسدود کرنے کے لیے یمن پر چڑھائی کی اور اس بار زیدی اماموں نے سابقہ اختلافات بھلا کر ان کا ساتھ دیا۔ مگر اس دوران بحیرۂ احمر کے ساحلی علاقے ''تہامہ عسیر'' کا قبائلی امیر الادریسی انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ جس کی وجہ سے یمن کو آزاد کرانے کی یہ کوشش ناکام ہوگئی اور ترک افواج کو پسپا ہونا پڑا۔[1]

آرمینیا میں مسلمانوں کی نسل کشی:

عالمی جنگ کا ایک اہم نقطہ آرمینیا تھا۔ ترکی اور روس کے مابین واقع سلطنتِ عثمانیہ کے اس صوبے میں تیرہ لاکھ ارمن نصرانی آباد تھے۔ عالمی طاقتوں کی سازشوں کے تحت ارمنوں نے کئی تنظیمیں بنا کر سلطنت عثمانیہ سے گلوخلاصی کی تگ ودو شروع کر رکھی تھی مگر انہیں کبھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

عالمی جنگ کے شروع میں انور پاشا، روس سے لڑنے کے لیے آرمینیا سے گزر کر قفقاز پہنچا تھا مگر اس کی تباہ حال پسپائی کے بعد آرمینیا کا علاقہ، ترک سپاہیوں سے خالی ہوگیا جس کے بعد روس کی شہ پر یہاں کے متعصب نصرانیوں نے متعدد نیم عسکری گروہ بنالیے اور مسلمانوں کی آبادیوں کو بُری طرح تاراج کرنا شروع کر دیا۔ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں تک کو بلا دریغ قتل کر دیا جاتا تھا۔ آرمینیوں کی درندگی کا یہ عالم تھا کہ وہ مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے گولیاں استعمال کرنا فضول خرچی سمجھتے تھے۔ اس کی جگہ وہ لوگوں کو آگ میں پھینک دیتے یا ان کے اعضاء کاٹتے اور انہیں تڑپتا ہوا چھوڑ کر چلے جاتے۔ عورتوں کو آبروریزی کر کے مار ڈالتے۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ آرمینیا مسلمانوں سے خالی ہو جائے تاکہ اسے ایک نصرانی مملکت بنانے کا خواب پورا کیا جاسکے۔

۱۹ مئی ۱۹۱۵ء کو جب روسی فوج آرمینیا کے شہر ''وان'' میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہاں ایک بھی مسلمان زندہ نہیں بچا تھا۔ لاشوں کے ڈھیر ٹیلوں کی شکل میں دکھائی دے رہے تھے۔ مساجد خاکستر تھیں اور مکانات پیوند زمین۔ اس قتل عام کے باعث لاکھوں مسلمان جو صدیوں سے اس خطے میں مقیم تھے، ہجرت کر کے مشرقی اناطولیہ اور دیگر علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ ترکی اگر جنگ جیت جاتا تو ان مہاجرین کی آرمینیا میں دوبارہ بحالی ممکن تھی مگر افسوس کہ ترکی کی شکست سے آرمینیا بھی عالم اسلام سے جدا ہو کر ایک نصرانی ریاست میں تبدیل ہوگیا۔[2]

درۂ دانیال:

ترکی کا درۂ دانیال اس جنگ میں بے حد اہمیت رکھتا تھا جو روس اور یورپ کے درمیان واحد بحری راستہ تھا۔ یورپی

---

① الموسوعة العربية العالمية: مادہ یمن؛ التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۲۱۹/۸

② تاریخ الدولة العثمانیة، از یلماز اوزتونا: ۲/ ۲۳۰ تا ۲۳۲

اتحادِ روس کو بحری کمک پہنچانا چاہتا تھا مگر ترکی نے درۂ دانیال بند کر دینے کا اعلان کر کے اس کے ایشیائی اور یورپی ساحلوں پر بھاری تعداد میں سپاہی تعینات کر دیے۔ برطانیہ نے اس کے جواب میں ۱۹۱۴ء کے اواخر میں سلطنتِ عثمانیہ کے زیرِ انتظام جزیرۂ قبرص پر قبضہ کر لیا۔

درۂ دانیال کو کھلوانے کے لیے ۱۹۱۵ء کے آغاز میں روس، فرانس اور برطانیہ نے مل کر حملہ کیا۔ فروری اور مارچ میں گھمسان کی جنگ جاری رہی۔ درے کے ایشیائی ساحل پر "تشان قلعہ" اور یورپی ساحل پر "گیلی پولی" اہم ترین محاذ رہے۔ اپریل میں نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کی افواج بھی اس محاذ پر اتحادیوں کے ساتھ شامل ہو گئیں۔

ترکوں نے نہایت جانبازی سے درۂ دانیال کا دفاع کیا اور اتحادی سر توڑ کوشش کر کے بھی خلیج باسفورس میں داخل نہ ہو سکے۔ ترک توپوں کی گولہ باری سے انگلستان کے بہترین جہاز غرق ہو گئے۔ برطانیہ کے جنرل ہملٹن نے جو محاذ پر اتحادیوں کا عمومی کمانڈر تھا، درۂ دانیال میں گھسنا ناممکن محسوس کر کے خشکی کے راستے استنبول تک پہنچنے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے فرانسیسی فوج کو حکم دیا کہ وہ درّے کے ایشیائی ساحل پر اترنے کی کوشش کرے، جبکہ یورپی ساحل پر قبضے کی ذمہ داری انگریز فوج کو دی گئی۔ ایک سخت جنگ کے بعد اتحادیوں نے جزیرہ نما "گیلی پولی" میں بیس ہزار سپاہی اتار کر وہاں قبضہ کر لیا اور بری راستے سے استنبول کی طرف بڑھنے کی کوشش کی مگر ترکوں نے جانوں پر کھیل کر انہے استنبول تک نہ پہنچنے دیا۔ درۂ دانیال کی ترک فوج چنا قلعہ سے پیچھے نہ ہٹی اور حتی الامکان مزاحمت کرتی رہی۔

دو سال تک یہاں اس قدر سخت جنگ ہوئی کہ خود یورپ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس محاذ پر اڑھائی لاکھ ترک سپاہی شہید ہوئے جبکہ اتحادیوں کے بھی لگ بھگ اسی قدر افراد قتل ہوئے۔ زخمیوں، مریضوں اور لاپتا ہونے والوں کی تعداد بیش از بیش تھی۔[1] حقیقت یہ ہے کہ درۂ دانیال اور استنبول پر قبضہ کر کے ترکی کو پوری طرح زیر کرنا، برطانیہ اور یہودی زعماء کی ضد تھی جس کی وجہ سے عالمی جنگ نے مزید دو سال طول کھینچا۔ برطانوی وزیرِ اعظم لائڈ جارج جو اسلام اور سلطنتِ عثمانیہ کا بدترین دشمن اور یہودی سرمایہ داروں کا شریکِ کار تھا، اس پر مصر تھا کہ جب تک ترکی گھٹنے نہ ٹیک دے جنگ جاری رہے گی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم ترکی کو مذاکرات کی میز پر لا کر اس کا احتساب کریں گے۔

نہر سوئز کا محاذ:

اس دوران ترکی نے نہر سوئز پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جہاں سے گزر کر برطانوی بحری جہاز ہندوستان پہنچتے تھے۔ ترکی کا منصوبہ تھا کہ نہر سوئز پر قبضے کے بعد ترک افواج مصر میں داخل ہو جائیں گی اور انگریزوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گی۔ ترک حکام کو پوری توقع تھی کہ اس جنگ میں شام اور مصر کے مسلمان ان کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ اس لیے اس محاذ پر زیادہ بڑی اور مضبوط فوج بھیجنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔

---

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۳۱۹/۸؛ الموسوعۃ العربیۃ العالمیۃ: مادۃ الحرب العالمیۃ الاولیٰ؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از یلماز اوزتونا: ۲۳۷/۲

ترک فوج جب صحرائے سینا میں داخل ہوئی تو بارش کی وجہ سے صحرا کی ریت جم گئی اور پیادہ فوج کے لیے پیش قدمی آسان ہوگئی مگر اس کے باوجود بھاری توپوں کو صحراسے گزار کر محاذ تک لے جانا مشکل عمل تھا۔مزید یہ کہ دمشق کی چھاؤنی کے بہت سے سپاہی لڑائی سے جان بچا کر بھاگ گئے۔اس لیے حملے کی تیاری میں تاخیر ہوتی گئی۔آخر استنبول سے جمال پاشا فورتھ آرمی کور لے کر آیا۔اس نے فوج کا ایک حصہ شام میں چھوڑ دیا تاکہ شام پر اتحادیوں کے ممکنہ حملے اور نصرانیوں کی اندرونی بغاوت کا مقابلہ کرسکے۔

باقی فوج کو لے کر وہ صحرائے سینا عبور کرتا ہوا نومبر ۱۹۱۵ء میں نہر سوئز کے کنارے تک پہنچ گیا جہاں برطانیہ نے ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل فوج تعینات کر رکھی تھی۔ترک افسران نے مصری عمائد سے خفیہ طور پر طے کر رکھا تھا ایک مخصوص دن میں ترک فوج نہر سوئز پر حملہ کرے گی اور اسی دن مصری عوام انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

مگر اس کے بعد ترکوں کی خوراک کے ذخائر کم پڑ گئے جس کی وجہ سے انہوں نے طے شدہ دن سے پہلے ہی نہر سوئز پر حملہ کر دیا۔دو ہفتوں تک یہاں برطانیہ کے ہندوستانی سپاہیوں اور ترکوں کے مابین لڑائی ہوتی رہی۔آخر میں خوراک ختم ہونے کا خطرہ دیکھ کر ترکوں کو غزہ کی طرف پسپا ہونا پڑا۔اس حملے کی ناکامی کے باعث جمال پاشا سے فوج کی کمان واپس لے لی گئی اور دو تین ماہ تک لڑائی رکی رہی۔تاہم لیبیا کے مجاہدین مغرب کی طرف سے اور شام کے اعرابی مشرق کی طرف سے برطانوی فوج پر حملے کرتے رہے۔مگر ایک عالمگیر جنگ کے تناظر میں ان حملوں کا اثر اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا تھا کہ برطانوی فوج کی نقل وحرکت کمزور پڑ جائے۔

جمال پاشا کی جگہ سوئز کے محاذ کی کمان جرمن کمانڈروں کو سونپ دی گئی جنہوں نے مارچ اور جولائی ۱۹۱۶ء میں سوئز پر مزید دو بڑے حملے کیے مگر دونوں بے سود رہے۔[1]

عراق کا محاذ:

عراق کا اہم شہر بصرہ جنگ شروع ہوتے ہی نومبر ۱۹۱۴ء میں برطانیہ کے قبضے میں آگیا تھا۔عراق کے باقی شہروں میں کئی محاذوں پر جنگ ہوئی۔ترکوں نے سلمان بیگ کے مقام پر انگریزوں کو شکستِ فاش دی اور ان کے پانچ اعلیٰ افسران سمیت تیرہ ہزار سپاہی گرفتار کر لیے۔لیکن عالمی جنگ کے بدلتے منظر نامے کے ساتھ ساتھ عراق کا دفاع بھی کمزور پڑتا چلا گیا۔آخرکار ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو بغداد پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔یوں پورا عراق ترکی کے ہاتھ سے نکل گیا۔[2]

جزیرۃ العرب:

ترکی کے اعلان جنگ کے فوراً بعد برطانیہ نے فلسطین، شام اور جزیرۃ العرب میں اپنی خفیہ ایجنسی ''BIS'' کے ایجنٹوں کو متحرک کر دیا تھا۔یہ جاسوس عربی زبان اور لب ولہجے میں مہارت رکھتے تھے اور کیمیائی طریقے استعمال کر کے

---

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/ ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۱، ۲۲۲

② تاریخ الدولۃ العثمانیۃ ،از یلماز اوزتونا: ۲/ ۲۳۸، ۲۳۹

اپنی سفید رنگت کو گندمی بنالیتے تھے۔ یہ عرب بن کر عربوں کی بستیوں بلکہ مدرسوں اور خانقاہوں تک میں رہائش پذیر تھے اور انہیں ترک خلافت سے متنفر کرتے رہتے تھے۔ ان میں کرنل لارنس (لارنس آف عربیا، ۱۸۸۸ء تا ۱۹۳۵ء) کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں آثارِ قدیمہ اور مشرقی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ عربی زبان وبیان کا ماہر، ایک آتش قلم ادیب اور ایک شعلہ بیان خطیب تھا۔ جنگِ عظیم میں ''ترکوں کے خلاف عربوں کی بغاوت'' کے منصوبے کی کمان اسے سونپ دی گئی۔ کرنل لارنس نے عربوں کو ترکوں کے خلاف اس قدر مشتعل کر دیا کہ جنگ کے دوران عرب اس کے کہنے پر ترک عملے کو قتل کرتے تھے اور وہ ہر ترک کے قتل پر عربوں کو انعام دیتا تھا۔

جمعیت اتحاد وترقی کی حکومت میں حجاز کا امیر حسین پاشا تھا جسے ''شریف مکہ'' کہا جاتا تھا۔ وہ نسلاً ہاشمی تھا۔ سابق خلیفہ سلطان عبدالحمید ثانی نے اس میں ہوسِ اقتدار کے جراثیم محسوس کر لیے تھے، اس لیے اسے خاندان سمیت ربع صدی تک جبراً استنبول میں رہائش پذیر رکھا۔ جمعیت اتحاد وترقی کی حکومت، سلطان عبدالحمید کے ہر معتوب کو معزز دیکھنا چاہتی تھی لہٰذا اس نے حسین پاشا کو مکہ کا والی بنادیا۔

عالمی جنگ چھڑنے سے پہلے ہی حسین پاشا نے برطانیہ سے رابطے کر لیے تھے اور برطانیہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ترکی سے بغاوت کرے تو اسے عراق وشام سمیت پورے جزیرۃ العرب کا بادشاہ مان لیا جائے گا۔ ان روابط کی کامیابی میں کرنل لارنس کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے حسین پاشا اور اس کے بیٹوں: امیر فیصل اور امیر عبداللہ کو ترکوں کے خلاف کھلی بغاوت پر ابھارا اور انہیں یقین دلایا کہ حسین کو جزیرۃ العرب کا، فیصل کو شام کا اور عبداللہ کو فلسطین کا حکمران بنادیا جائے گا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۱۶ء (۲۵ صفر ۱۳۳۴ھ) کو یہ معاہدہ طے پاگیا اور ۷ جون ۱۹۱۶ء (۷ شعبان ۱۳۳۴ھ) کو جب عالمی جنگ نقطۂ عروج پر تھی اور ترکی اپنی ساری عسکری اور اقتصادی توانائی جنگ میں جھونک چکا تھا، شریف مکہ اور اس کے بیٹوں نے یکا یک ترکی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ تین دن کی جھڑپوں کے بعد ۱۰ جون کو مکہ میں تعینات مختصری ترک فوج پسپا ہوگئی۔ اس کے بعد طائف اور جدہ بھی معمولی جھڑپوں کے بعد قبضے میں آگئے۔[1]

اس پر ظفر علی خان نے کہا:

کیا انقلاب ہے کہ عرب کے شریف بھی
تہذیبِ مغربی کے پرستار ہوگئے
نصرانیوں سے رشتۂ اُخوت کا جوڑ کر
عثمانیوں سے برسرِ پیکار ہوگئے
قطعِ رگِ خلافتِ کبریٰ کے واسطے
برطانیہ کے ہاتھ میں تلوار ہوگئے

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از یلماز اوزتونا: ۲/ ۲۳۳، ۲۳۵

ناموسِ کعبہ بیچ کے گو فیصل و حسین
عقبیٰ کی ذلتوں کے سزاوار ہوگئے

اور علامہ اقبال نے کہا تھا:

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

نجد کی حکومت اور سلطان عبدالعزیز بن سعود:

نجد کے علاقے میں امیر عبدالعزیز بن سعود کی حکومت تھی۔ وہ ۱۹۱۶ء تک خلافتِ عثمانیہ سے مرتبط رہا۔ ترکوں کی شکست سامنے دیکھ کر اس نے برطانیہ سے یہ معاہدہ کیا کہ آلِ سعود نجد کے آزاد حکمران رہیں گے۔ ساتھ ہی اس نے برطانیہ پر یہ واضح کر دیا کہ آلِ سعود اس جنگ میں نہ ہی برطانیہ کی حمایت کریں گے اور نہ ہی ترکوں کے خلاف ہتھیار اٹھائیں گے۔[1]

شام اور فلسطین:

اس دوران نہرِ سوئز کے محاذ پر ترک سپاہی، برطانیہ کے مقابلے میں کھڑے تھے۔ شریف مکہ کے بیٹے فیصل نے عرب چھاپہ ماروں کی قیادت کرتے ہوئے جبالِ دروز اور بعلبک میں مورچے بنالیے اور ترکوں کی سپلائی لائن پر متواتر حملے شروع کر دیے۔ رسد کو منقطع کرنے کے لیے انہوں نے مدینہ سے شام تک سلطان عبدالحمید کی تعمیر کردہ ریلوے لائن کو جگہ جگہ سے ناکارہ بنا دیا۔ اس طرح سوئز اور شام میں تعینات ترک افواج کو کمک و رسد ملنا سخت مشکل ہوگیا۔

اس وقت جنوبی شام میں ترک افواج میں سے فورتھ آرمی کور، سیونتھ آرمی کور اور ایٹتھ آرمی کور تعینات تھیں۔ فورتھ آرمی کور "بلقاء" (اردن) میں تھی۔ سیونتھ آرمی کور، وسطی علاقوں میں جنرل مصطفیٰ کمال پاشا کی کمان میں تھی۔ ایٹتھ آرمی کور مغربی ساحلوں پر مقرر تھی۔ ان تینوں فوجوں کی عمومی کمان جرمنی کے جنرل ساندرس کے ہاتھ میں تھی۔

عربوں کی غداری اور خوراک و رسد کے انقطاع کے باعث ان تینوں فوجوں کے حوصلے ٹوٹ گئے اور سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برطانیہ کے مقابلے میں یہاں بھی ترکی کی شکست سامنے دکھائی دینے لگی۔

۱۲ دسمبر ۱۹۱۶ء کو انگریز غزہ میں داخل ہوگئے۔ ترکوں نے ان پر جوابی حملے کیے۔ ۲۷ مارچ اور ۱۹ جون کے دو اہم معرکوں میں انہوں نے انگریزوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اس پر ۲۸ جون ۱۹۱۶ء کو برطانوی فوج کی قیادت جنرل لینبی (Allenby) کو سونپ دی گئی جس نے افواج کو از سرِ نو منظم کیا اور پیش قدمی کرتے ہوئے فلسطین میں داخل

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، از یلماز اوزتونا: ۲/۲۳۶

ہو گیا۔ ترکوں نے یہاں بھی جاں توڑ مزاحمت کی اور قدم قدم پر جانوں کے نذرانے پیش کیے مگر شام وفلسطین کے یہودی اتحادیوں کے لیے جاسوسی کر رہے تھے۔ وہ ترکوں کی نقل وحرکت کی ہر خبر فوراً اتحادیوں تک پہنچا دیتے تھے جس سے فائدہ اٹھا کر اتحادی بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ پیش قدمی کرتے رہے۔ آخر کار ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء (۲۵ صفر ۱۳۳۶ھ) کو انگریز بیت المقدس پر بھی قابض ہو گئے۔ جنرل لینبی نے القدس میں قدم رکھتے ہوئے کہا:

”صلیبی جنگ آج ہماری فتح پر انجام پذیر ہوئی۔“

۱۹۱۸ء میں برطانوی فوج نابلس پہنچ گئی اور وہاں سے ناصرہ کی طرف بڑھی جہاں جرمن قیادت کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس حملے میں جرمن کمانڈر انچیف جنرل سانڈرس گرفتار ہوتے ہوتے بال بال بچا۔ ترک افواج کی شکست اب واضح ہو چکی تھی۔ فرانسیسی لشکر بھی برطانیہ کی مدد سے شام پر حملہ کر چکا تھا۔ کئی معرکوں کے بعد ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۸ء (۲۷ ذوالحجہ ۱۳۳۶ھ) کو شام میں ترکوں کو حتمی شکست ہو گئی اور وہ مصطفی کمال کی قیادت میں شمال کی طرف پسپا ہو گئے۔

اس کے بعد اتحادی لبنان کی طرف بڑھے۔ ۷ اکتوبر کو بیروت اور ۲۶ اکتوبر کو حلب پر قبضے کے بعد پورا شام، فلسطین اور اُردن اتحادیوں کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۲ نومبر کو موصل پر قبضے کے ذریعے الجزیرہ بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی دوران فیصل بن حسین، کرنل لارنس کی مدد سے عربوں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے ”معان“ پہنچ گیا۔ یہاں سے اس نے دمشق کا رخ کیا جہاں برطانوی افسران کیم اکتوبر کو قابض ہو کر کٹھ پتلی حکومت کی مسند اس کے سپرد کرنے کے منتظر تھے۔ ①

درّہ دانیال اور قفقاز:

درّہ دانیال پر ابھی تک جنگ ہو رہی تھی۔ یہاں جرمن اور ترک فوج کی قیادت مصطفی کمال کو سونپ دی گئی۔ اتحادی افواج میں سے آسٹریلیا نے درے پر قبضے کے لیے سخت ترین حملے کیے مگر ترکوں نے ہر حملہ ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد جرمنوں اور ترکوں نے مل کر اتحادیوں پر جارحانہ حملے شروع کیے مگر اتحادیوں کو بھی پیچھے دھکیلنا ممکن نہ ہو سکا۔ ②

روس کے محاذ پر عثمانی فوج ایک بار پھر قفقاز کی طرف بڑھی اور کئی مقامات پر روسیوں کو پسپا کیا۔ اس دوران وہاں لینن زار شاہی کی حکومت ختم کر کے، کمیونسٹ انقلاب لا چکا تھا اور فی الحال کسی بیرونی جنگ کو طول دینے کے حق میں نہیں تھا، اس لیے روس کی اس نئی حکومت نے ۲۲ جنوری ۱۹۱۸ء کو ترکی سے صلح کر لی۔

مدینہ منورہ کی حالت:

جزیرۃ العرب میں صرف مدینہ منورہ ترکی کے پاس رہ گیا تھا جہاں غیور ترک کمانڈر فخر الدین پاشا غیر معمولی

---

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/ ۲۲۰، ۱۲/ ۱۹، ۲۰؛ تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، لابلماز: ۲/ ۲۳۸، ۲۳۶،۲۳۵

② التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/ ۲۱۹؛ الموسوعۃ العربیۃ العالمیۃ: مادۃ الحرب العالمیۃ الاولیٰ

استقلال اور ہمت کے ساتھ مقابلے پر جما رہا تاکہ کفار کے ناپاک قدم نبی مطہر ﷺ کے شہر پر پڑنے نہ پائیں۔ دنیا کے اطراف و اکناف سے عالمی جنگ ٹھنڈی پڑ جانے کے بھی کئی ماہ بعد تک فخرالدین پاشا نے اتحادیوں اور ان کے ایجنٹوں کو حرم مدینہ میں داخل نہ ہونے دیا۔ تاہم ۱۳ جنوری ۱۹۱۹ء (۱۲ ربیع الآخر ۱۳۳۷ھ) کو اس کی مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔ ①

جنگ کے نقصانات:

جنگ میں شریک افواج اور مقتولین کے اعداد و شمار درج ذیل ہیں:

	مرکزی قوتیں	شریک افواج	فقط جنگ کے مقتولین	جنگ، قحط و امراض کے مجموعی مقتولین
۱	جرمنی	ایک کروڑ دس لاکھ	۱۹ لاکھ ۵۰ ہزار	۳۷ لاکھ
۲	آسٹریا و ہنگری	۷۰ لاکھ	۱۲ لاکھ	۷۰ لاکھ
۳	ترکی	۳۰ لاکھ ۹۰ ہزار	۳ لاکھ	۱۰ لاکھ ۵۰ ہزار
۴	بلغاریہ	۱۰ لاکھ	۹۰ ہزار	۲ لاکھ ۷۰ ہزار
	میزان	۲ کروڑ ۱۰ لاکھ	۳۶ لاکھ ۴۰ ہزار	ایک کروڑ ۱۵۶ لاکھ ۲۰ ہزار

◆◆◆

	یورپی اتحاد	شریک افواج	فقط جنگ کے مقتولین	جنگ و قحط و امراض کے مجموعی مقتولین
۱	روس	ایک کروڑ ۲۰ لاکھ	۱۷ لاکھ	۹۱ لاکھ ۵۰ ہزار
۲	برطانیہ	۸۰ لاکھ ۹۰ ہزار	۹ لاکھ ۱۰ ہزار	۳۱ لاکھ ۹۰ ہزار
۳	فرانس	۸۰ لاکھ ۴۰ ہزار	۱۳ لاکھ ۹۰ ہزار	۶۳ لاکھ
۴	اٹلی	۵۰ لاکھ ۶۰ ہزار	۶ لاکھ ۵۰ ہزار	۲۳ لاکھ ۵۰ ہزار
۵	امریکا	۴۰ لاکھ ۵۷ ہزار	ایک لاکھ ۲۰ ہزار	۳ لاکھ ۴۰ ہزار
	میزان	۳ کروڑ ۴۷ لاکھ ۶۵ ہزار	۴۷ لاکھ ۷۰ ہزار	۲ کروڑ ۱۳ لاکھ دس ہزار

ان کے علاوہ پرتگال، جاپان، بلجیم، رومانیا، سربیا، یونان اور دیگر یورپی ممالک اور بلقان کی نصرانی ریاستوں کے

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۲۲۰/۸؛ تاریخ الدولة العثمانیة از یلماز اوزتونا: ۲۳۵/۲، ۲۳۶

اعداد و شمار بھی ملا لیے جائیں تو یورپی اتحاد کی جانب سے جنگ میں شریک سپاہیوں کی مجموعی تعداد ۴ کروڑ ۲۷ لاکھ سے متجاوز تھی جن میں سے ۵۶ لاکھ ۸۳ ہزار مارے گئے جبکہ قحط، بمباری اور امراض سے مرنے والوں کو بھی شامل کیا جائے تو یہ تعداد ۲ کروڑ ۲۸ لاکھ ۶۱ ہزار بن جاتی ہے۔

فریقین کے اعداد و شمار کو جمع کیا جائے تو ساڑھے چھ کروڑ انسان لڑائی میں شریک ہوئے۔ چار سال جنگ میں فریقین کے سپاہی و شہری ملا کر ۳ کروڑ ۲۸ لاکھ ۸۱ ہزار افراد مارے گئے۔ ان میں ۹۳ لاکھ ۲۳ ہزار سپاہی تھے۔ دو کروڑ سے زائد افراد زخمی اور معذور ہوئے۔ مالی نقصانات کا اندازہ ۳۳۷ بلین ڈالر لگایا گیا۔[1]

معاہدہ سائیکس بیکو۔ اعلانِ بالفور:

جنگ کے دوران ۱۹۱۶ء میں اتحادیوں نے آپس میں ترکی کو تقسیم کرنے کا خفیہ معاہدہ کر لیا تھا جو "معاہدہ سائیکس بیکو" کہلاتا ہے۔ اس معاہدے کے اہم نکات یہ تھے:

1. جنوبی عراق برطانیہ کو دے دیا جائے گا۔
2. لبنان سمیت شمالی شام کا ساحل، فرانس کا ہوگا۔
3. دو عرب ریاستیں قائم کی جائیں گی۔
4. ایک عرب ریاست شمالی عراق اور مشرقی اردن پر مشتمل ہوگی۔ یہ برطانیہ کے ماتحت ہوگی۔
5. دوسری ریاست شام کے وسطی علاقے اور الجزیرہ پر مشتمل ہوگی جس پر فرانس کا تسلط ہوگا۔
6. استنبول اور درۂ دانیال پر روس کا تسلط ہوگا۔

جنگ کے دوران ۲ فروری ۱۹۱۷ء کو برطانیہ نے یہ بھی اعلان کیا کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن مان لیا جائے گا۔ اسے "اعلان بالفور" کہا جاتا ہے۔[2]

سلطنتِ عثمانیہ، عالمی جنگ کے بعد

خلیفہ محمد رشاد نے اپنی وفات تک اتحادیوں سے کسی معاہدے کی توثیق نہیں کی۔ جولائی ۱۹۱۸ء (اکتوبر ۱۳۳۷ھ) میں اس کی وفات ہوگئی۔ اس وقت تک عسکری اعتبار سے ترکی کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور ترکی کی شکست بالکل سامنے تھی۔

صورتحال کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ جرمنی جو جنگ کا اصل فریق تھا، شکست کھا کر بھی اپنی نوآبادیات کے سوا

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۲/۲۳۳، ۲۳۴ ؛ الموسوعۃ العربیۃ العالمیۃ: مادہ الحرب العالمیۃ الاولی؛ التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۲۱۳

[2] الدولۃ العثمانیۃ عوامل النہوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۲۶۶، ۲۶۷

کسی علاقے سے محروم نہیں ہوا۔ جرمنی کے شہروں میں سے کوئی شہر بھی اتحادیوں کے قبضے میں نہیں گیا۔ مگر ترکی جو ثانوی طور پر جنگ کا حصہ بنا تھا، اناطولیہ اور یورپ کے چند شہروں کو چھوڑ کر، اپنے تمام تر رقبے سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ الغرض جنگِ عظیم میں شرکت کے فیصلے نے ترکی کو بالکل تباہ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکی کو یورپی ممالک کے باہمی تنازعے میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، خصوصاً اس لیے کہ شکست کی صورت میں ترکی کا کوئی مستقبل نہ تھا۔ یورپی طاقتیں اپنے تنازعات تو کسی طور سلجھا لیتیں مگر ترکی کا بدترین انتقام کے لیے تختۂ مشق بننا لازمی تھا۔ یہ خدشہ کوئی خاص وزن نہیں رکھتا تھا کہ اگر ترکی جنگ میں غیر جانب دار رہتا تو یورپی اتحاد، جرمنی پر قابو پانے کے بعد ترکی کو گھیر لیتا۔ کیوں کہ:

❶ یورپ کے کسی ملک کے پاس کوئی ایسی وجہ نہ تھی جس کی بناء پر وہ ترکی پر براہِ راست حملے کا جواز پیدا کرتا۔

❷ اگر بالفرض کوئی یورپی طاقت یا ان کا کوئی اتحادی ایسی جرأت کرتا بھی، تو ترکی اپنا دفاع اچھی طرح کر سکتا تھا کیوں کہ جنگ نے دولِ یورپ کو نہایت مضمحل کر دیا تھا۔

❸ حقیقت یہ ہے کہ غالب فریق بھی فتح کے بعد ترکی سے کوئی نئی جنگ چھیڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ ترکی نے جنگِ بلقان اوّل کے بعد بکثرت تازہ دم لشکر تیار کر لیے تھے۔ اگر یہ لشکر جنگِ عظیم کا لقمہ نہ بن جاتے تو ترکی مزید کئی عشروں تک عالمِ اسلام کے مرکزِ وحدت کے طور پر باقی رہ سکتا تھا۔ امریکا اور سوویت روس جیسی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے مقابلے میں دنیا میں ایک اسلامی سپر پاور بہر حال موجود رہتی۔

اس سے بھی بڑھ کر الم ناک ترین سچائی یہ ہے کہ ترکی اگر جنگ میں شریک نہ ہوتا تو جنگ کے خاتمے پر تھکے ماندے یورپ کے مقابلے میں اپنی محفوظ افواج کے ساتھ، وہ دنیا کی دوسری یا تیسری طاقت کے طور پر ابھر سکتا تھا۔

سلطان عبدالحمید ثانی نے نظر بندی کے ایام میں اپنی وفات سے کچھ مدت پہلے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے:

"میں اپنے وطن کے انجام کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ یہ کہاں سے کہاں آن پہنچا؟ ایک بڑا ملک، جس نے دنیا فتح کی تھی اور تین براعظموں تک پھیلا ہوا تھا، فقط دس سال کے اندر اندر وہ ایک مشت خاک بن گیا۔ اس تباہی کا سبب کیا ہے؟ اور اسے جان کر اب بھلا کیا حاصل؟ اپنے وطن سے محرومی کے بعد ہم کیا پا سکتے ہیں؟ چالیس سال سے میں منتظر تھا کہ عالمی طاقتیں آپس میں کب ٹکراتی ہیں؟ یہ میری حتمی امید تھی۔ میری رائے یہ تھی کہ سلطنتِ عثمانیہ کی نیک بختی اس سے مربوط ہے۔ پھر وہ دن آ گیا جس کا مجھے انتظار تھا مگر...... افسوس کہ یہ لوگ مجھے تخت سے اتار چکے تھے۔ اور جو لوگ میرے بعد ملک کے حاکم بنے، وہ عقل اور بصیرت سے دور ہو گئے۔

وہ عظیم موقع جس کا میں نے چالیس سال تک انتظار کیا، آ کر چلا گیا اور دولتِ عثمانیہ کے ہاتھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ میں نے تیس سال تک جو کوشش کی کہ مجھے تخت سے نہ ہٹایا جائے، وہ کوشش اسی موقع کے لیے تھی۔ میں نے اپنے بحری بیڑے کو (ہمیشہ) خلیج کے اندر رکھا اور اسے جنگی مشقوں کے لیے بھی باہر نہ نکلنے دیا۔

میں نے بحری بیڑے کو اسی دن کے لیے محفوظ رکھا تھا۔ میں جان بوجھ کر یونان کی جنگ سے انجان بنا رہا تا کہ انگریز اسے کریٹ پر قبضے کا جواز نہ بنالے۔ یہ تغافل اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ الغرض تقریباً تیس سال تک میرے فیصلے، چاہے وہ غلط تھے یا درست، اسی موقع کے انتظار میں کیے گئے تھے۔ میں نے اس راز کو چالیس سال اپنے دل میں چھپا کر رکھا، مگر اب اسے اپنی اولاد کے لیے افشاء کر رہا ہوں تا کہ وہ مجھے پہچان لیں۔ میں نے یہ بات کبھی کسی کو نہیں بتائی، کیوں کہ میں نے تجربات سے سیکھا ہے کہ جس بات کو دو شخص جان لیں وہ راز نہیں رہتی۔ اسی لیے میں سب سے زیادہ اہتمام اسی بات کا کرتا رہا کہ میرا یہ مقصد کسی کو معلوم نہ ہونے پائے اور غیر ممالک کو اس کی بھنک نہ پڑ جائے۔ میرا اندازہ تھا کہ عثمانیوں کا اس جیسے موقع سے بروقت اور بصیرت کے ساتھ فائدہ اٹھانا انہیں بچانے کے لیے کافی ہوگا۔ پھر وہ اپنی مملکت کو دوبارہ عالمی طاقتوں کی صف میں لے جاسکیں گے۔'' [1]

کاش کہ ترکوں کی نئی حکومت اس موقع سے فائدہ اٹھا پاتی۔ کاش کہ یہ لوگ کم از کم اس وقت سلطان عبدالحمید سے مشورہ ہی کر لیتے اور اس جہاں دیدہ سیاست دان کے تجربات سے فائدہ اٹھا لیتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو طلعت پاشا، انور پاشا اور جمال پاشا کا ٹرائی اینگل، خلیفہ رشاد کے زیر سایہ طویل عرصے تک راج کر سکتا تھا۔ ایسے میں مصطفیٰ کمال پاشا جیسے لبرل آدمی کے اوپر آنے کا کوئی امکان نہ ہوتا۔ یورپی طاقتوں کو ترکی کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا کبھی موقع نہ ملتا اور خلافت عثمانیہ کے خاتمے کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا۔ مگر جو کچھ ہوا، شاید جمعیت اتحاد و ترقی کی حکومت میں وہی ہو سکتا تھا، کیوں کہ یہ دور جسے یہ لوگ ''عہدِ حریت'' کا نام دیتے تھے، حقیقی آمریت کا دور تھا۔

اُڑا کر لے گئیں ان موسموں میں
ہوائیں بے نواؤں کی ردا تک
وفا کے نام پر کچھ شعبدہ گر
چُرا لیتے ہیں ہاتھوں کی حنا تک [2]

جمعیت کے نعرے، حریت، عدل اور مساوات، بالکل کھوکھلے تھے جن کے ذریعے قوم کو دھوکا دیا گیا تھا۔ انہوں نے حریت کے نام پر آزادی سلب کی، عدل کے نام پر مظالم کیے اور مساوات کے نام پر اسلامی اخوت کو پارہ پارہ کیا۔ ان کا ٹرائی اینگل کسی سے رائے لیتا تھا نہ مشورہ قبول کرتا تھا۔ انہوں نے ماورائے عدالت قتل کے اقدامات کیے اور محمود شوکت کا خون کر کے، اقتدار پوری طرح اپنی مٹھی میں لے لیا۔ انہوں نے رسائل و جرائد اور صحافت کو اپنی مدح وستائش اور اپنے مخالفین کی کردار کشی کے لیے وقف کر دیا۔ انتخابات کو انہوں نے کھیل بنا لیا اور منتخب حکومت کا تختہ الٹنے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔ انتخابات میں اپنی کامیابی کا راستہ ہموار کرنے کے لیے انہوں نے نہ صرف آئین میں تبدیلی کرائی بلکہ ان کی انتخابی فتح کے پیچھے اصل قوت فوج کی تھی نہ کہ عوام کی۔

---

[1] مذکرات السلطان عبدالحمید الثانی: ص ۱۳۶، ۱۳۷ [2] احمد فراز

ان کے خود ساختہ عہدِ حریت کے بارے میں ان کے معاصر جنرل جواد رفعت [1] کا کہنا تھا:

''جمعیت اتحاد وترقی نے سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے اس کے بعد استبدادی نظام استوار کیا۔ اس کی گواہی ان کے دور میں پیش آنے والے وہ ملکی المیے دے رہے ہیں جو سلطان عبدالحمید کے ۳۳ سالوں میں واقع نہ ہوئے تھے۔''

اسی طرح مصطفیٰ توران کا کہنا تھا:

''ہماری نسل نے دیکھ لیا کہ یہ حریت کیا چیز ہے؟ اس نسل نے وہ مصائب اور المیے دیکھے کہ انسانوں کو کتوں کی طرح پھانسیوں پر لٹکایا گیا اور قومی رہنماؤں کے سینوں میں نیزے گھونپے گئے۔ وہ سرزمین جس نے اپنی فوج اس حریت کے لیے ضائع کردی، خون کے تالابوں کی شکل میں اجتماعی بربادی کا مشاہدہ کر چکی۔ یہ سب عہدِ حریت میں ہوا۔'' [2]

سلطان عبدالحمید ثانی نے سلطنتِ عثمانیہ کے قرضے تین سو ملین لیرا سے کم کر کے تیس ملین کر دیے تھے مگر جمعیت اتحاد وترقی کی حکومت نے چند سالوں میں قرضوں کا بوجھ چار سو ملین لیرے تک پہنچا دیا۔ یوں ملک معاشی طور پر بھی تباہ و برباد ہو گیا۔ [3]

ترک قومیت کا ناکام نعرہ:

جنگ میں شکست کی ایک اہم ترین وجہ، پان اسلام ازم تحریک کو ترک کر کے دوبارہ تورانیت اور پان ترک ازم کو زندہ کرنے کی کوشش تھی۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ جنگ کے آغاز میں ان جدت پسند لیڈروں نے پان اسلام ازم تحریک کا احیاء کیا تھا اور جہادی روح سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر دو سالہ جنگ کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی فتح یقینی ہے تو انہوں نے اسلام پسندی کا وہ لبادہ اتار پھینکا جسے مصلحتاً اوڑھ لیا گیا تھا۔ پان اسلام ازم تحریک ختم کر دی گئی اور ایک بار پھر ترک قوم پرستی کا نعرہ لگایا جانے لگا۔ اس دوغلی پالیسی سے مسلمانوں میں سخت برہمی پھیلی جس کا نتیجہ لڑائی سے بددلی، ترک حکومت پر عدم اعتماد اور انجام کار شکست کی صورت میں نکلا۔ [4]

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اُڑ گیا دُنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر

---

[1] جواد رفعت کی ولادت ۱۸۹۲ء میں استنبول میں ہوئی۔ ان کے والد دمشق کے حاکم تھے۔ جواد نے عسکری درسگاہ سے تربیت لی اور جمعیت اتحاد وترقی کی حکومت میں اعلیٰ عسکری عہدوں پر رہے اور عالمی جنگ میں شرکت کی۔ بعد میں فوج کی ملازمت چھوڑ کر صحافت اور تصنیف وتالیف کو مشغلہ بنالیا اور صدہا مضامین لکھے۔ جواد کو حق گوئی کی پاداش میں دو بار جیل جانا پڑا۔ ان کے مضامین اور تصانیف نے سیکولر ترکی میں از سرِ نو اسلامی جذبہ بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جواد رفعت نے ۱۹۶۷ء میں وفات پائی۔

[2] کیف سقطت الدولة العثمانیة از سلیمان بن صالح الخراشی: ص ۶۰

[3] مذکرات السلطان عبدالحمید الثانی از محمد حرب: ص ۶۸

[4] کیف سقطت الدولة العثمانیة: ص ۷۳، ۷۴

قوم پرست لیڈروں نے پان ترک ازم تحریک کو تین بار استعمال کیا اور ہر بار نامراد رہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ پان ترک ازم یا عثمانیت کا پرچم اٹھا کر وہ ایک مضبوط حصار قائم کر رہے ہیں جو سلطنت کی بقاء اور اتحاد کا ضامن ہوگا۔ پہلی بار سلطان عبدالعزیز کے دور میں ان کے پیشوا مدحت پاشا نے اسے آزمایا اور ناکام رہا۔ اسی لیے سلطان عبدالحمید نے اس کی جگہ پان اسلام ازم تحریک کا پودا لگایا۔

سلطان عبدالحمید کو معزول کرنے کے بعد ترقی پسند لیڈروں نے دوسری بار پان ترک ازم تحریک کو تقویت دی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اس طرح سلطنت کے تمام نسلی و مذہبی عناصر کو متحد کیا جاسکے گا مگر جنگ بلقان کے ہنگامے نے ان کا سہانا سپنا توڑ دیا۔ مقدونیہ کی بغاوت نے ثابت کر دیا کہ مختلف طبقات کی اس قوم پرستی کو جسے یورپی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل تھی، ترک ازم کی کمزور دیوار میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔

اس ناکامی سے سبق سیکھ کر انہوں نے عالمی جنگ کے ابتدائی سالوں میں پان اسلام ازم کو آزمایا اور مثبت نتائج بھی حاصل کیے مگر چونکہ یہ اسلام پسندی دل سے نہ تھی، اس لیے ضرورت پوری ہونے کا یقین ہوتے ہی انہوں نے تیسری بار پان ترک ازم کے نفاذ کی کوشش کی جس کا نتیجہ عالمی جنگ میں ایسی عبرت ناک شکست کی صورت میں نکلا کہ ترکی بالکل تباہ ہوگیا۔ یہ ثابت ہوگیا کہ جمعیت اتحاد و ترقی کے لیڈر ایک سراب کی طرف بھاگ رہے تھے۔

❖❖❖

جنگِ عظیم کے پسِ پردہ صہیونی سازش

اتنی بڑی تباہ کن جنگ کیا محض ایک حادثہ و اتفاق تھی یا اس کے پیچھے کوئی منصوبہ بندی تھی؟ ایک طویل مدت تک دنیا یہی سوچتی، سمجھتی اور نشر کرتی رہی کہ اس جنگ کا سبب آسٹریا کے ولی عہد کا قتل تھا، اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اتفاقیہ طور پر ہوتا چلا گیا۔ بعض اہل خرد نے اس خیال کو کمزور محسوس کیا تو اتنا کہہ دیا کہ دنیا کے بڑے حصے کو زیر کرنے کے بعد استعماری طاقتوں کی جولان گاہ تنگ ہو چکی تھی۔ ان میں سے ہر ملک پوری دنیا کا تنہا مالک بننا چاہتا تھا جو زمینی حقائق کے تحت ممکن نہ تھا۔ اس لیے مفادات کی امیدوں اور معاہدوں نے ان کے دو گروہ بنا دیے جو آپس میں لڑ پڑے۔

مذکورہ تجزیہ اپنی جگہ درست سہی، مگر سب حقائق سے ماوراء حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ کے اصل کھلاڑی وہ یہودی سرمایہ دار اور سیاست دان تھے، جو عالمگیر صیہونیت کے لیے سرگرم تھے۔ جنگ کی آگ انہی نے بھڑکائی تھی اور پھر اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے لیگ آف نیشنز کا قیام بھی انہی کا کارنامہ تھا۔ یہود نے اس کی منصوبہ بندی بہت پہلے کر لی تھی۔

جنگ کے کئی سالوں بعد یہودیوں کے یہ راز افشاء ہونے شروع ہوئے۔ صہیونی خفیہ پروٹوکولز اور تلمود کے تشریحی مندرجات کے ذریعے یہ حقائق پہلی بار منظر عام پر آئے مگر چونکہ ذرائع ابلاغ پر یہود کی اجارہ داری چلی آرہی ہے، اس لیے یہ حقائق چھپائے جاتے رہے۔ آج بھی انہیں سامنے لانے کی جرأت کم لوگ کرتے ہیں۔

اس جنگ کے پیچھے صیہونی لابی کی وہ خاص ذہنیت کام کر رہی تھی جو ان کی مذہبی کتاب "تلمود" نے انہیں دی ہے۔اس کے مطابق بنی اسرائیل کے سوا، تمام لوگ (چاہے وہ مسلم ہوں یا نصرانی، ہندو ہوں یا بدھسٹ) بھیڑ بکریوں بلکہ کیڑے مکوڑوں سے زیادہ کچھ نہیں، اس لیے یہودی اپنی اغراض کے لیے جنگیں بھڑکانے، حکومتیں گرانے اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کو مروانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ان تمام معاملات کو وہ "بزنس" تصور کرتے ہیں۔اپنی کسی معمولی غرض کے لیے وہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کی بھینٹ دینے میں دریغ نہیں کرتے۔ان کے نزدیک دوسری قوموں کے جانی ومالی نقصانات کی حیثیت صفر ہے۔ہاں اپنے مفاد پر زد پڑنا وہ برداشت نہیں کرتے۔

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں عالمی صیہونی تحریک پوری دنیا میں سرگرم تھی۔برطانیہ، امریکا اور یورپی ممالک کی تجارت، سیاست اور معیشت میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ان کے افراد نہ صرف سرکاری اعلیٰ ترین مناصب پر فائز تھے بلکہ کلیسا میں بھی ان کے نمائندے گھس چکے تھے۔امریکن ارکان کانگریس، ارکان کابینہ اور مشیران صدر میں یہودیوں یا یہودیوں کے لیے کام کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔

یہودی کی ہزار ہا برس قدیم آرزو محض ایک آزاد وطن حاصل کرنا نہیں تھی۔بلکہ انہیں فلسطین چاہیے تھا جسے مرکز بنا کر وہ پوری دنیا پر راج کرنے کا خواب دیکھتے آئے تھے۔ان کا عقیدہ ہے کہ ایک عالمگیر یہودی بادشاہ کے ظہور کے بعد پوری دنیا ان کی غلام ہوگی مگر اس بادشاہ کا ظہور تب ہوگا جب وہ بیت المقدس فتح کر کے وہاں ہیکل سلیمانی تعمیر کرلیں گے۔

یہودیوں کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ بار بار کی نقل مکانی کا تھا۔اس کی وجہ بھی وہ خود تھے۔وہ دنیا کے جس ملک میں آباد ہوتے، وہاں کی معیشت وتجارت ہی نہیں بلکہ سیاسی تانے بانے پر بھی اثر انداز ہونے لگتے تھے اور حکومتوں کو بنانے اور گرانے میں خفیہ سازشوں کے ذریعے اہم کردار ادا کرتے تھے، اس لیے دنیا کی مختلف حکومتیں انہیں جلاوطن کرتی رہیں۔انیسویں صدی کے اواخر میں روس کا بادشاہ مقامی یہودیوں کی ایسی ہی ایک سازش کا شکار ہو کر قتل ہوا اور روس میں یہودیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔اس لیے بہت سے یہودی روس سے بھاگ کر در بدر ہو گئے۔

ایسے میں یہودیوں کا ایک مہرہ ان کے بہت کام آیا جسے دنیا "ڈزرائیلی" (بنیامین ڈزرائیلی) کے نام سے جانتی ہے۔یہ یہودی دو مرتبہ منتخب ہو کر برطانیہ کا وزیر اعظم بنا۔وہ ایک مفکر، ادیب اور سیاست دان تھا۔۱۸۰۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۱ء میں وفات پائی۔اس کا ناول "کونگزبی" (Commimgsby) دنیا کے مشہور ترین ناولوں میں سے ایک ہے۔وہ ملکہ وکٹوریہ کا چہیتا تھا، ملکہ ہی نے اسے "لارڈ بیکنز فیلڈ" کا خطاب دیا تھا۔وہ ۱۸۳۷ء میں پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا۔۱۸۶۷ء میں برطانوی وزیر اعظم مقرر ہوا۔دوسری مرتبہ اس کی وزارت عظمیٰ ۱۸۷۴ء سے ۱۸۸۰ء تک رہی۔اس نے بظاہر نصرانیت قبول کرلی تھی مگر شواہد موجود ہیں کہ وہ حقیقت میں آخر تک کٹر یہودی ہی رہا۔

ڈزرائیلی نے امریکہ کے دو مشہور ترین یہودی سرمایہ داروں: مونٹیفوری اور روتھ شیلڈ کے ساتھ مل کر فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کی سرتوڑ کوشش کی۔ڈزرائیلی نے اپنا سیاسی اثر ورسوخ پوری طرح استعمال کیا اور یہودی سرمایہ

داروں نے پانی کی طرح دولت بہائی مگر اس وقت یہود کی فلسطین میں آبادکاری کا خواب پورا نہ ہو سکا۔

۱۸۹۶ء میں عالمگیر صیہونی تحریک کا بانی آسٹریا کا صحافی ''تھیوڈور ہرٹزل'' (۱۸۶۰ء تا ۱۹۰۴ء) ابھر کر سامنے آیا۔ اس نے اپنی تصنیف ''الدولة اليهودية'' میں دریائے نیل سے لے کر دریائے فرات تک ایک عظیم یہودی ریاست قائم کرنے، فلسطین کو مرکز بنانے اور عالمگیر یہودی بادشاہ کے اقتدار کی راہیں ہموار کرنے کا تفصیلی منصوبہ پیش کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے سے بنی اسرائیل جن جن علاقوں میں آباد ہوئے تھے وہ سب یہود کی جاگیر قرار دی گئیں۔ اس تصنیف نے دنیا بھر کے یہودیوں کو عالمگیر صیہونی تحریک کے لیے کھڑا کر دیا۔ ہرٹزل ہی نے صیہونیوں کی سالانہ کانفرنس کی داغ بیل ڈالی۔ پہلی مشہور کانفرنس ۱۸۹۷ء میں سوئزرلینڈ کے شہر باسل میں منعقد ہوئی۔ اس میں تین سو اپنے منتخب یہودی رہنماؤں کو بلایا گیا جو دنیا بھر میں یہود کے غلبے کے لیے سرگرم تھے۔

اس کانفرنس میں ہرٹزل نے اعلان کیا کہ ہم نے یہودیت کے غلبے کا پہلا پتھر نصب کر دیا ہے، اور عن قریب دنیا ہمارے تابع ہوگی۔ اسی کانفرنس میں پہلی بار ''حکمائے صیہون کے پروٹوکولز'' پیش کیے گئے اور نہایت اہم قراردادیں منظور کی گئیں جن کا خلاصہ تین نکات تھے:

❶ ہم فلسطین میں آزاد یہود مملکت قائم کریں گے۔

❷ ہم دنیا کی اقتصادیات میں یہود کو غالب کریں گے یعنی دولت کے تمام سرچشمے ہمارے ہاتھ میں ہوں گے۔

❸ قدیم عبرانی زبان و ثقافت جو دنیا میں ناپید ہوگئی تھی، پھر سے زندہ کی جائے گی۔

اسی کانفرنس میں اقوام متحدہ سے ملتے جلتے ایک عالمی ادارے کا تصور بھی زیر بحث آیا۔

کانفرنس کے تین سال بعد ۱۹۰۱ء میں ہرٹزل خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید ثانی سے ملا اور بھاری رقم کی پیش کش کے بدلے فلسطین کی زمین طلب کی، لیکن سلطان نے صاف انکار کر دیا۔ آخر کار صیہونیوں نے براہ راست عثمانی خلافت کو سبوتاژ کر کے فلسطین پر قبضے کا منصوبہ بنایا اور اس مقصد کے لیے دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن برطانیہ سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۰۳ء کی چھٹی عالمی یہودی کانفرنس میں یہودی رہنما ماکس نورڈ نے اعلان کیا تھا:

''عنقریب ہم ایک عالمی اجتماع کی دعوت دیں گے۔ میں آپ کو ایک سیڑھی کے پائے دکھا رہا ہوں جو ہمیں یک دم بلندی پہ لے جائے گی۔ برطانیہ کی مدد سے فلسطین میں ایک آزاد یہودی مملکت کا وجود ہوگا۔''

اس دوران یہودی تسخیر عالم کے عالمی منصوبے پر ایک اور رخ سے بھی کام شروع کر چکے تھے۔ وہ ایک ایسی لادینی حکومت قائم کرنے کی تیاریاں کرنے لگے تھے جو بظاہر دہریہ اور اندرون خانہ یہود نواز رہے۔ اس مقصد کے لیے یہودی مفکرین نے لادینیت اور لامذہبیت کو کمیونزم اور سوشلزم کا جامہ پہنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ ان میں سب سے بڑا مفکر مارکس تھا جس نے The Capital نامی کتاب لکھ کر اشتراکی نظام کا خاکہ پیش کیا۔

مارکس، اپنے منصوبے کی عملی شکل دیکھنے سے پہلے مرگیا البتہ بعض یہودیوں نے اپنی آبادیوں کو تجرباتی طور پر مارکسی افکار سے مستفاد ایک نظام کے تحت چلانا شروع کیا جسے کبوتز (kibbutz) کہا جاتا تھا، اس میں زمین اور جائدادیں کسی فرد کی ملکیت میں نہیں ہوتی تھیں۔ انتظامیہ ہی اصل مالک ہوتی تھی۔ تمام لوگ مل کر کام کرتے تھے اور انتظامیہ ملنے والی آمدن سے ان کی ضروریات پوری کرتی تھی۔ گویا یہ ایک محدود جگہ پر سوشلزم کا ابتدائی تجربہ تھا۔ آبادی کی حفاظت کے لیے ایک پہرے دار فوج بھی بنائی گئی۔

اس محدود تجربے کے بعد ایک اور یہودی سیاست دان لینن نے اسے روس میں نافذ کرنے کی مہم شروع کی۔ زار نے اس کے انقلابی خیالات سے خطرہ محسوس کر کے اسے ۱۹۰۰ء میں سائبیریا جلاوطن کر دیا مگر وہ فرار ہو کر یورپ چلا گیا اور صحافت کے ذریعے اپنے انقلابی نظریات کا پرچار کرتا رہا۔ چونکہ روس کے عوام ''زار'' کے ظلم وستم سے تنگ آئے ہوئے تھے، اس لیے ''لینن'' کو اپنا نجات دہندہ تصور کر کے وہ اس کے خیالات سے متاثر ہونے لگے۔

یہودی اپنی قدیم منصوبہ بندی کے مطابق زار روس کا تختہ الٹ کر وہاں سوشلزم کا تجربہ کرنا چاہتے تھے، اس لیے ۱۹۰۴ء میں انہوں نے ایک بار پھر زار کے قتل کی سازش کی جو ناکام رہی۔ اس بار روسی حکومت نے یہودیوں سے زیادہ سختی برتی جس کی وجہ سے یہودیوں کی بڑی تعداد کو روس سے بھاگنا پڑا۔ یوں روسی شاہی خاندان سے یہودیوں کی دشمنی مزید پختہ ہوگئی۔ ادھر لینن نے ۱۹۱۰ء میں سوشلسٹ پارٹی تشکیل دے دی اور پیرس منتقل ہوگیا۔ ۱۹۱۳ء میں لینن نے ''بالشویک کانفرنس'' کا پہلا اجلاس ''پراگ'' میں طلب کیا۔ یہ کانفرنس خدا کی زمین پر خدا کے تصور کے خلاف ایک اعلانِ جنگ کی تمہید تھی۔

اس سیاسی منظرنامے کو سامنے رکھنے کے بعد ہمیں یہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ بیسویں صدی کے اس دوسرے عشرے میں یہودیوں کے تین بڑے دشمن تھے: پہلا دشمن زار روس تھا۔ یہودی لینن کی قیادت میں سوشلزم کی تحریک چلا کر زار شاہی کی حکومت کا خاتمہ کرنا اور وہاں ایک بظاہر لادینی اور درونِ خانہ صہیونیت نواز حکومت بنانا چاہتے تھے۔

دوسرا دشمن جرمنی کا شاہی خانوادہ تھا جس نے یہودیوں کی سازشوں سے تنگ آ کر انہیں سزائیں دی تھیں اور بڑی تعداد میں جلاوطن کیا تھا۔ یہ خاندان دنیا کی عظیم ترین طاقت بننے والا تھا جو یہودیوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

تیسرا دشمن ترکی تھا جہاں جمہوری حکومت قائم ہونے کے بعد بھی خلافت باقی تھی جو فلسطین کے متعلق صہیونی عزائم کی تکمیل میں رکاوٹ تھی۔

یہ تینوں بڑی مہیب طاقتیں تھیں جنہیں آسانی سے ہلایا نہیں جاسکتا تھا۔ جبکہ یہودی نہ صرف ان کے سیاسی نظام کو بلکہ ان کی تہذیب وتمدن اور نظریات کو بھی مٹا دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ یہ مقاصد کسی ایسی بہت بڑی جنگ کے بغیر پورے نہیں ہوسکتے تھے جس میں یہ تینوں طاقتیں پوری قوت سے شریک ہو کر تھک ہار جائیں۔

ایک بڑی جنگ کی آگ لگانے کے لیے بلقان سب سے مناسب جگہ تھی جہاں چند سالوں میں دو جنگیں ہو چکی تھیں

اور وہاں کی ریاستوں پر اجارہ داری قائم کرنے میں روس کی آسٹریا سے چپقلش چل رہی تھی۔

سلطان عبدالحمید کی معزولی، جمعیت اتحاد وترقی کے اقتدار اور بلقان اور لیبیا کے سقوط کے بعد ترکی بیرونی دنیا میں سابقہ آن بان کھو چکا تھا اور اندرونی طور پر اس کے مختلف صوبوں میں علیحدگی پسندی کی تحریکیں چل رہی تھیں۔

جنگ سے پہلے ۱۹۱۳ء تک یہودی سرمایہ داروں، صہیونی زعماء اور ان کے حلیف برطانوی سیاست دانوں نے دنیا کی حالت اس عمارت جیسی کر دی تھی جس میں جگہ جگہ بارود کے ڈھیر چھپا دیے گئے ہوں، بس انہیں تاروں کے ذریعے آپس میں جوڑنا اور شعلہ دکھانا باقی ہو۔

روس کو ترکی کے مقابلے میں لانے یا جرمنی اور روس کو باہم جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے کوئی بہانہ پیدا کرنا مشکل تھا۔ البتہ آسٹریا اور روس، بلقان کے مسئلے پر کسی بھی وقت لڑ سکتے تھے۔ آسٹریا کی حمایت میں جرمنی کا شریکِ جنگ ہونا یقینی تھا۔ جرمنی کی خاطر ترکی کا جنگ میں کودنا مشکل ضرور تھا مگر امکان سے باہر نہیں، کیوں کہ وہاں خلیفہ کا نہیں جمعیت اتحاد وترقی کے ان جرنیلوں کا حکم چلتا تھا، جن کی تربیت میں فری میسن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ بھرپور کردار رہا تھا۔ وہ سیاسی تجربے اور دور اندیشی سے عاری اور جوش وجذبات سے بھرپور تھے۔ انہیں غلط معلومات دے کر اور سبز باغ دکھا کر مستقبل کے متعلق گمراہ کرنا فری میسن کارندوں اور صہیونی ذرائع ابلاغ کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ یہ بھی بعید نہیں کہ ترکی کا وزیرِ دفاع انور پاشا جس نے ترکی کو جنگ کی آگ میں دھکیلا تھا، فری میسن یا اسی قسم کی کسی خفیہ یہودی تنظیم کے زیرِ اثر آ کر دھوکے کا شکار ہوا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ انہی کا کارندہ ہو، اگرچہ اس کا ثبوت کہیں نہیں ملتا اور اس کا ظاہری کردار بھی یہ گواہی دیتا ہے کہ وہ مخلص، اسلام پسند اور محبِ وطن تھا مگر فریبِ فکر ونظر میں مبتلا ہو گیا تھا۔

صہیونی لابی کے لیے جنگ میں برطانیہ اور فرانس اور امریکا کو شامل کرنا بہت آسان تھا کیوں کہ وہاں یہودی سرمایہ داروں اور سیاست دانوں کے وزرائے اعظم، صدور اور افواج کے سربراہوں تک سے گہرے روابط تھے۔ حتیٰ کہ جرمنی میں بھی جہاں سے یہودیوں کو نکالا گیا تھا، صہیونی لابی خفیہ طور پر فوج کے اعلیٰ افسران کو استعمال کرنے کے قابل تھی۔

یہودیوں نے اس جنگ سے درج ذیل اغراض وابستہ کر رکھی تھیں:

۱. اپنے دشمن روس کی زار شہنشاہیت کا خاتمہ
۲. اپنے دشمن جرمنی کی شکست وریخت
۳. خلافت کا سقوط اور سلطنتِ عثمانیہ کی تقسیم وتحلیل
۴. فلسطین میں اپنے لیے وطن کی راہ ہموار کرنا
۵. قیامِ امن کے نام پر ایک ایسا عالمی ادارہ قائم کرنا جو پوری دنیا پر بالادست ہو۔

یہ آخری مقصد بہت اہم تھا۔ ۱۹۲۸ء میں امریکہ کی ایک ریاست کے جج مسٹر سٹرونگ نے "خیانت کے علمبردار"

کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے انکشاف کیا کہ ۱۸۹۷ء میں ہونے والی پہلی عالمی صیہونی کانفرنس میں لیگ آف نیشنز کا تصور ایک باقاعدہ زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا تھا کہ بالترتیب چند طے شدہ اقدامات کے بعد عالمی ادارہ وجود میں لایا جائے گا۔ اس کانفرنس میں یہ بھی اعلان کر دیا گیا تھا کہ ایسے ادارے کے قیام کے بعد یہودی مملکت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے دیر نہیں لگے گی۔

چونکہ یہ تمام امور جرمنی اور ترکی کی شکست اور زار شاہی کی طاقت مضمحل ہونے پر منحصر تھے۔ اس لیے یہ بھی طے تھا کہ پہلے جرمنی کو کھل کر لڑنے دیا جائے گا تاکہ روس کمزور تر ہو جائے اور لینن وہاں کامیاب بغاوت کر سکے۔ یہ بھی طے تھا کہ جرمنی کو آخر میں شکست دلوانا ہوگی۔ اس کے لیے جرمنی کے کچھ کمانڈر خرید لیے گئے تھے جن سے جنگ کے آخری مرحلے میں کام لیا گیا جبکہ جرمنی بظاہر فتح حاصل کرنے والا تھا۔

ترکی سے جنگ کو اس حد تک طول دینے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ اس کی طاقت بالکل فنا ہو جائے اور وہ اتحادیوں کے ہر فیصلے کے سامنے سر جھکا دے، چاہے اس طرح انسانی جانوں کا ضیاع کئی گنا بڑھ جائے۔

جنگ کے تیسرے سال اس کے نتائج سامنے آ گئے۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں لینن جلاوطنی ترک کر کے ماسکو پہنچا اور انقلابی تحریک چلا کر نومبر میں زار شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں ''کریملین'' کو مرکز بنا کر سوویت حکومت تشکیل دے دی گئی۔ یہ دراصل یہودیوں کی فتح تھی۔ جو اس تحریک کے قائد بھی تھے اور اس کے لیے مالی وسائل بھی مہیا کرتے رہے تھے۔ لینن کا قریبی دوست اور مشہور امریکی مصنف لوئی فشر اپنی تصنیف ''لائف آف لینن'' میں انکشاف کرتا ہے کہ لینن یہودی تھا۔ یہودی اسے اس حیثیت سے خوب جانتے ہیں۔ اس کی بیوی بھی یہودن تھی۔

ماسکو کے سرخ انقلاب سے چند ماہ پہلے جون ۱۹۱۷ء میں جب کہ جنگ کے نتائج کا اندازہ ہو چکا تھا، یہود کی عالمی کانفرنس میں کہا گیا:

> ''ہم نے ظالم عسکری طاقتوں کو لڑوا کر ان کی طاقتوں کو توڑ دیا ہے (ظالم عسکری طاقتوں سے مراد مسلمانوں کی خلافتِ عثمانیہ، روس اور جرمنی ہیں) ہم نے قیصری طاقتوں کو توڑ دیا ہے، اور چند بقیہ حکومتوں کو بھی اُکھاڑ دیں گے، یعنی پوری دنیا میں نو آبادیات قائم ہوں گی، دنیا کا نقشہ اور جغرافیہ تبدیل ہو جائے گا، اب ایک بالادست عالمی اقتدار وجود میں لایا جا سکتا ہے''۔

ایسا ہی ہوا۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد دنیا میں بڑے بڑے انقلابات آئے۔ صیہونیوں نے حسب منصوبہ پوری دنیا کو ''لیگ آف نیشنز'' پر متفق کیا جس کا ڈھانچہ امریکی صدر ''ولسن'' کے سیاسی مشیر ''کرنل مانڈیل ہاؤس'' نے اپنے رفقاء کی مدد سے تیار کیا۔ پہلی عالمی جنگ کے اختتام پر لیگ آف نیشنز (League of Nations) کے ذریعے ہی دو معاہدے ہوئے، جن کے ذریعے خلافتِ عثمانیہ ختم ہوئی، خلافت کے وسیع علاقے کی بندر بانٹ ہوئی۔ اس طرح شام اور عرب ممالک پر جو افراد مسلط ہوئے ان میں سے اکثر برطانوی اور یہودی ایجنٹ تھے، اُن کی موجودگی میں یہود

کو شرق وسطیٰ لے جا کر بسانا کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ جدید ترکی وجود میں آیا، نوآبادیات اور نئی اقتصادیات کا نظام قائم ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں فری میسنری رکن "لین ہوف" نے "واسٹر فری موررز ائمنگ" نامی رسالے کے شمارے میں انکشاف کیا تھا:

"جو لوگ فری میسن اور لیگ آف نیشنز میں رابطہ ظاہر کرتے ہیں وہ درست کہتے ہیں۔ لیگ آف نیشنز فری میسن افکار ہی سے ماخوذ ہے۔"

لیگ آف نیشنز تین عشروں تک قائم رہی۔ بعد میں جب اس کا حسب منشا فعال رہنا مشکل ہو گیا تو اسے توڑ کر "اقوام متحدہ" کو وجود بخشا گیا۔[1]

+++

---

[1] عالمی جنگ کے پس پردہ صہیونی سازشوں کے لیے مذکورہ تمام معلومات درج ذیل کتب سے لی گئی ہیں:

☆ دور الیہود فی اسقاط الخلافة العثمانیة: للدکتورة هیلة بنت سعد بن محمد السلیمی، ط جامعة ام القری بمکة المکرمة، ۱۴۲۲ھ، ۲۰۰۱ء

☆ موجز تاریخ الیہود: محمود بن عبدالرحمن قدح

☆ التاریخ الیہودی العام: ڈاکٹر صابر طعیمه

☆ ہامرات من الحي الیہودی: تالیف: واکیم بیرنز، تعریب خالد اسعد، ط دار حسان للنشر والتوزیع، دمشق، ۱۹۸۳ء، ۱۴۰۳ھ

Hidden Menace to World Peace

"امن عالم کے لیے پوشیدہ خطرہ" میجر گب سٹورات کے قلم سے

محمد سادس، وحید الدین

۱۳۳۷ھ تا ۱۳۴۰ھ
(۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۲ء)

۱۱ فروری ۱۹۱۸ء (۲۹ ربیع الآخر ۱۳۳۶ء) کو سابق خلیفہ سلطان عبد الحمید ثانی کا بحالت قید وبند انتقال ہو گیا۔ چار ماہ بعد ۳ جولائی ۱۹۱۸ء کو خلیفہ رشاد (محمد خامس) کی بھی وفات ہو گئی۔ ولی عہد سلطنت یوسف عزالدین بن سلطان عبد العزیز پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جمعیت اتحاد وترقی کے قائدین نے جو ولی عہد کے سخت مخالف تھے، اسے زہر دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔[۱]

ایسے میں مرحوم خلیفہ رشاد کے بھائی محمد سادس وحید الدین کو مسند خلافت پر بٹھایا گیا۔ وہ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ وہ علم وفضل اور عسکری تجربے کا حامل انسان تھا[۲] مگر مغربی سازشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مسند نشینی کے وقت اس کی عمر ۵۹ سال ہو چکی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے ترکی دم توڑ رہا تھا۔ جرمنی کو شکست ہو گئی تھی۔ عرب، شام اور عراق ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ شمالی شام اور جنوبی اناطولیہ کے ساحل کالیکیا پر فرانس کی فوجیں قابض ہو گئی تھیں۔ اناطولیہ کے بعض مغربی شہروں پر یونان اور بعض جنوبی علاقوں پر اٹلی قبضہ کر چکا تھا۔ اناطولیہ کے وسطی اور مشرقی حصوں کے علاوہ ترکوں سے سب کچھ چھن گیا تھا۔ جس کے بعد ترکی کے پاس بھی ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔[۳]

خلیفہ وحید الدین نے جنگ بندی کا فیصلہ کرنے سے قبل انور پاشا، طلعت پاشا اور جمال پاشا کے ٹرائی اینگل سمیت جمعیت اتحاد وترقی کے تمام وزراء کو معزول کر دیا جن کی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے ترکی کا یہ حشر ہوا تھا۔

اس نے احمد عزت پاشا کو صدر اعظم بنا کر اسے اتحادیوں سے صلح کی بات چیت کی ذمہ داری دے دی۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو بحیرۂ ایجی کے جزیرے "لیمنوس" کے شہر "مودروس" میں ترکی اور برطانیہ کے نمائندوں میں عبوری جنگ بندی کی شرائط طے پا گئیں۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۸ء کو ان شرائط کے مطابق، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی فوجیں درۂ دانیال

---

[۱] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۲/۱۳ [۲] الدولة العثمانية المجهولة: ص ۴۷۹

[۳] اناطولیہ کے مشرقی علاقے اور روس سے ملحق صوبے اس لیے بچ گئے تھے کہ روس کمیونسٹ انقلاب کے عبوری دور سے گزرنے کے باعث کسی بیرونی چپقلش میں پڑنے کے قابل نہ تھا۔

خلیج باسفورس اور استنبول سمیت ترکی کی اہم ترین بندرگاہوں اور عسکری نقاط پر تعینات ہو گئیں۔ یوں ترکی کا مرکز بھی اتحادیوں کی گرفت میں آگیا۔ یہ ایسی کامیابی تھی جو اتحادی، جنگ لڑ کر بھی حاصل نہیں کر پائے تھے۔ [1]

ٹرائی اینگل کا فرار اور انجام:

جنگ میں شکست اور معزولی کے باعث طلعت پاشا، انور پاشا اور جمال پاشا کی نہ صرف عزت خاک میں مل گئی تھی بلکہ انہیں یقین تھا کہ جنگ بندی کے معاہدے میں ان کی حیثیت جنگی مجرموں کی سی ہوگی۔ اور جنگ چھیڑنے کے جرم میں یورپی اتحاد انہیں سخت ترین انتقام کا نشانہ بنائے گا۔ [2]

چنانچہ معاہدۂ مودروس کے دو دن بعد انجمن اتحاد و ترقی کے بڑے بڑے عہدے دار روپوش ہو گئے۔ تینوں بڑے قائدین ایک جرمن جہاز میں بیٹھ کر خفیہ طور پر جرمنی چلے گئے تاکہ حالات سازگار ہونے تک وہاں پناہ لیے رہیں۔ مگر ان کے نصیب میں ترکی واپس لوٹنا نہیں تھا۔ طلعت پاشا کو برلن میں قتل کر دیا گیا، جمال پاشا نے شاہِ افغانستان امان اللہ خان کا دامن تھاما اور کچھ عرصے تک افغان فوج کو تربیت دی۔ اس کے بعد وہ روس سے ہوتے ہوئے واپس ترکی روانہ ہوا مگر راستے میں تفلیس میں اسے بھی قتل کر دیا گیا۔ انور پاشا ایک نئی ترک مملکت قائم کرنے کا عزم کر کے ترکستان چلا گیا اور روسی استعمار سے نبرد آزما ہو کر اسی کش مکش میں جان دے دی۔ [3]

ایک تبصرہ:

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمعیت اتحاد و ترقی کے یہ لیڈر مجرم تھے اور مکافاتِ عمل نے انہیں اس حال تک پہنچایا جس کے وہ مستحق تھے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ صلیبی طاقتیں اور یہودی زعماء ان کی سیاست سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ یہود کے لیے نرم گوشہ رکھنے کے باوجود یہ لوگ آزادی پسند اور محبِ وطن تھے اور کبھی کبھار ان میں اسلامی جذبہ بھی ابھر آتا تھا۔ یہ لوگ حماقت اور جہالت کے باعث سلطان عبدالحمید ثانی کے خلاف استعمال ہوئے تھے۔ وہ مغربیت پسند تھے اور مغربی طاقتوں نے انہیں ایک مہرے کی طرح استعمال کیا تھا مگر یہ جرنیل کم از کم ترکی کے دفاع سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ خاص کر انور پاشا اور جمال پاشا اپنے علاقوں پر اغیار کا قبضہ برداشت نہیں کر سکتے تھے، جیسا کہ لیبیا، بلقان، آرمینیا اور روس سے جنگوں میں ان کی ہمت اور جنگجوئی کے واقعات سے ثابت ہے۔ یہ لوگ بااختیار خلیفہ کے قائل نہ تھے مگر خلافت کو رسماً ضرور باقی رکھنا چاہتے تھے۔ پھر عالمی جنگ نے ان کے کئی

---

① الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث از اسماعيل ياغي: ص ۲۲۵ ؛ الموسوعة العربية العالمية: مادة الحرب العالمية الاولى؛ التاريخ الاسلامي لدكتور محمود شاكر: ۸/۲۱۳، ۲۲۶

② اس بات کا خاصا امکان ہے کہ ترک قیادت کے اس ٹرائی اینگل کا ترکی میں رہنا اسی لیے دوبھر کیا گیا ہو تا کہ مصطفی کمال پاشا کو آگے لایا جائے، جس کے ہاتھوں ترکی سے نہ صرف خلافت کا خاتمہ کرایا گیا بلکہ اس کی اسلامی پہچان بھی مٹا دی گئی۔ اگر طلعت پاشا اور انور پاشا برسرِ اقتدار رہتے تو وہ کبھی بھی خلافت کے خاتمے پر تیار نہ ہوتے۔ بلکہ ان جیسے قد آور سیاست دانوں کی موجودگی میں مصطفی کمال کا اوپر آنا بھی ممکن نہ تھا۔

③ التاريخ الاسلامي لدكتور محمود شاكر: ۸/۲۲۶ تا ۲۲۸

تصورات کو غلط ثابت کر دیا تھا اور مغرب کے بارے میں ان کی خوش گمانیوں کا تاج محل کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ اس لیے مغرب کے بارے میں ان کے خیالات بھی کچھ نہ کچھ ضرور بدل گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مغربی طاقتیں اب انہیں پہلے جیسا قابلِ اعتماد آلۂ کار نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ یہ جانتی تھیں کہ ان جرنیلوں کے ہوتے ہوئے وہ ترکی کے معاملات میں حسبِ منشاء مکمل کر مداخلت نہیں کر سکتیں۔ ہاں ان کی یہ کوشش ضرور تھی کہ سیاسی مکر وفریب، اندرونی شورشوں اور جنگوں کے ذریعے ترکی کو اتنا کمزور کر دیا جائے کہ اس سے ہر مطالبہ منوایا جاسکے۔ ان مطالبات کے ذریعے وہ نہ صرف ترکی کے سیاسی اثر ورسوخ اور عسکری قوت کا خاتمہ چاہتی تھیں بلکہ وہاں سے اسلام کا نام ونشان تک مٹا دینا ان کا ہدف تھا۔ لہٰذا ان کی پوری کوشش تھی کہ:

1. ترکی کو اتنا کمزور کر دیا جائے کہ اس پر اپنی ہر ضد مسلط کرنا ممکن ہو۔
2. ترکی میں انہیں ایسا آلۂ کار میسر آ جائے جو ان کے ایجنڈے کے مطابق چلے۔

جب تک ترکی میں دم خم تھا، تب تک جمعیت اتحاد وترقی کے جدت پسند لوگوں کے برسر اقتدار ہوتے ہوئے بھی عالمی طاقتیں، اپنے ہدف کو نہیں پاسکتی تھیں۔ عالمی جنگ کے ذریعے انہوں نے سلطنتِ عثمانیہ کی عسکریت ختم کر کے اسے بے بس اور لاچار کر دیا تھا۔ یوں ان کا پہلا ہدف پورا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد انہیں اصل ہدف کی طرف جانا تھا، یعنی ترکی کے اسلامی تشخص کا خاتمہ کرنا۔ جمعیت اتحاد وترقی کی دوسری اور تیسری صف میں ایسے لوگ موجود تھے جو صرف جدت پسند اور قوم پرست ہی نہیں تھے بلکہ دین سے بے زار اور کٹر ملحد تھے۔ وہ اسلام کو ایک فرسودہ نظام اور خلافت کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ شمار کرتے تھے۔ عالمی طاقتیں ان میں سے ایسے فرد کو تلاش کر رہی تھیں جو ان کی مقصد برآری کر سکے۔ ایسے فرد میں انہیں درج ذیل صفات مطلوب تھیں:

1. جو سیاسی اور عسکری اثر ورسوخ رکھتا ہو۔
2. جو مسلمانوں کے موجودہ سیاسی نظام اور تہذیب وثقافت کا سخت ناقد اور مخالف ہو۔
3. اسلامی احکام کا باغی ہو، حلال وحرام سے بے پروا اور آزاد خیال ہو۔
4. جو طبعاً بے باک، متشدد مزاج اور دلیر ہو، نتائج کی پروا کیے بغیر، اپنے ہدف کی طرف بڑھ جاتا ہو۔

مغربی طاقتوں کو یہ تمام چیزیں جس شخص میں یکجا ملیں، اسے دنیا مصطفیٰ کمال پاشا کے نام سے جانتی ہے۔ یہی وہ شخص تھا، جس نے پورے عالم اسلام کی مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے مغربی ایجنڈے کی تکمیل کر کے دکھائی۔

❖❖❖

مصطفیٰ کمال پاشا

ٹرائی اینگل کی معزولی اور فرار کے بعد جمعیت اتحاد و ترقی کی دوسری صف کے لیڈروں کو آگے جگہ مل گئی جن میں سے مصطفیٰ کمال بعض محاذوں پر جنگ کی قیادت کر کے خاصی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ خلیفہ وحید الدین مصطفیٰ کمال کی ہوشیاری کا اُس وقت سے معترف تھا جب وہ ولی عہد تھا اور مصطفیٰ کمال کو ساتھ لے کر برلن کے دورے پر گیا تھا۔ ①

مصطفیٰ کمال جسے جدید ترکی کا بانی اور ''اتاترک'' (ترکوں کا باپ) کہا جاتا ہے، تاریخ کی متنازعہ ترین شخصیات میں سے ایک ہے۔ ایک طبقہ اسے ترکوں کا نجات دہندہ سمجھتا ہے، تو دوسرے کے نزدیک وہ اسلام کا بدترین دشمن اور یہودی ایجنٹ تھا۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہم دستیاب پختہ حقائق کی روشنی میں غیر جانبداری کے ساتھ مصطفیٰ کمال کی شخصیت اور اس کے عہد کو سامنے لائیں۔

مصطفیٰ کمال ۱۸۸۱ء میں سالونیکا (سلانیک) میں پیدا ہوا تھا۔ ڈاکٹر رضا نور کے مطابق مصطفیٰ کمال، سالونیکا کی ایک بد اطوار اور آزاد طبع عورت زبیدہ کی ناجائز اولاد تھا۔ بعد میں اس عورت نے ایک سپاہی علی رضا آفندی سے نکاح کر لیا اور بچے کو اسی سے منسوب کر دیا۔ ڈاکٹر رضا نور کے مطابق کمال کی رنگت، اس کی کھوپڑی کی ساخت اور نیلی آنکھیں دیکھنے کے بعد اس کے ماں باپ کو ترک مان لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ مصطفیٰ کمال ہمیشہ اپنے والدین کے بارے میں کچھ کہنے سے کتراتا رہا۔ اس بارے میں وہ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا کرتا تھا: ''میں بھی دوسروں کی طرح پیدا اور بڑا ہوا ہوں۔ اگر میری ولادت میں کوئی الگ بات ہے تو بھی میں ایک ترک ہی ہوں۔''

علی رضا آفندی کی موت کے بعد زبیدہ نے جس کی عمر اس وقت ۳۵ سال تھی، روڈس کے ایک خوشحال شخص سے دوسری شادی کر لی۔ مصطفیٰ کمال کی عمر اس وقت آٹھ سال تھی۔ وہ ماں کی اس حرکت سے خفا ہو کر گھر سے بھاگ گیا اور اپنی پھوپھی کے ہاں رہنے لگا۔ اس نے سلانیک اور مناستر کے فوجی اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ ②

مصطفیٰ کمال کے بارے میں آرم اسٹرونگ کا بیان:

آرم اسٹرونگ لکھتا ہے کہ وہ مقدونیہ کے کچھ نصرانی راہبوں کے پاس رہنے لگا تھا۔ انہی سے اس نے فرنچ زبان سیکھی جس کے بعد وہ والیٹر، روسو، جان جیک اور وکٹر ہیگو جیسے فرانسیسی مفکرین کی ان کتب کا رسیا بن گیا جو سلطنت عثمانیہ میں ممنوع تھیں۔ پھر وہ قومیت اور وطن پرستی کی حمایت میں شعلہ بار نظمیں کہنے لگا۔ بیس سال کی عمر میں وہ عسکری

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۲۲۸/۸　② التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۶/۱۲، ۱۷

کالج کے ساتھیوں کے سامنے سلطان عبدالحمید کے خلاف تقریروں اور نظموں کے ذریعے خاصا مقبول ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ استنبول منتقل ہو گیا جہاں وہ مے نوشی، جوئے اور عشق بازی میں منہمک رہا۔ اسی دوران اس کا تعلق جمعیۃ الوطن سے ہو گیا جس کی رکنیت کی پاداش میں اسے جیل بھی جانا پڑا۔

آرم اسٹرونگ لکھتا ہے کہ جمعیت اتحاد وترقی کا فری میسن اور یہود الدونمہ سے گہرا تعلق تھا۔ بارہا اس کے اجلاس یہودیوں کی کوٹھیوں میں منعقد ہوتے تھے۔ کمال کا پرانا دوست فتحی مقدونی، فری میسن کا رکن بن گیا تھا۔ انہوں نے جمعیت اتحاد وترقی کو بھی فری میسن کی طرز پر چلایا۔ انہیں بھاری مقدار میں مالی تعاون وصول ہوتا تھا۔ وہ ایسے لوگوں کو تلاش کرتے تھے جنہیں سیاسی جرائم کی وجہ سے ملک بدر کیا گیا ہو۔[1]

تعلیم وترقی، کارکردگی اور شہرت:

۱۹۰۰ء میں کمال استنبول کے کیڈٹ کالج میں داخل ہوا اور چار سالہ تربیت کے بعد افسر بنا۔ اسے یافا (شام) میں تعینات کیا گیا جہاں وہ ففتھ آرمی کور میں تیں گھڑ سواروں کی پلٹن کا کیپٹن بنا۔ مگر وہ یافا سے بھاگ کر مصر پہنچ گیا اور وہاں سے اپنے آبائی علاقے سلانیک واپس چلا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں اس نے اعلیٰ تربیت کی تکمیل کی اور اسے سلانیک میں تھرڈ آرمی کور کا افسر مقرر کر دیا گیا۔ اس نے جزیرہ کریٹ پر یونان کے ایک حملے کو پسپا کرنے میں حصہ لیا۔

نامق کمال کے رسالے ''الوطن'' نے اس کے جذبات کو متاثر کیا۔ اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے اس نے ایک مجلّہ ''حریت'' جاری کیا۔ پھر جمعیت اتحاد وترقی کی دیکھا دیکھی اس نے ایک جماعت ''جمعیۃ الوطن'' قائم کی۔ کچھ عرصے بعد اس نے اپنی جماعت کا اتحاد وترقی کے ساتھ انضمام کر کے اوپر آنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ کیوں کہ اس کی تیز مزاجی اور خودسری کی وجہ سے قائدین اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی حد سے زیادہ مے نوشی اور عیاشی بھی اس کی بدنامی کا سبب تھی۔ وہ اقتدار اور شہرت کا حریص تھا اور بعض اوقات نشے کی حالت میں شاہانہ احکامات جاری کرتا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے اپنے دوست نوری سے کہا: میں تمہیں وزیراعظم بنا دوں گا؟''

نوری نے ہنس کر کہا: ''برادر! مجھے وزیراعظم بناؤ گے تو تم خود کس منصب پر ہو گے؟''

---

[1] صحوۃ الرجل المریض: ۲۶۸ تا ۲۷۱
مصطفیٰ کمال کے حسب نسب اور فری میسن سے اس کے تعلق کے بارے میں یہ معلومات ہم نے ڈاکٹر موفق بنی المرجہ کی محققانہ تصنیف ''صحوۃ الرجل المریض، سلطان عبدالحمید ثانی'' سے نقل کی ہیں، جو پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے یہ مواد ڈاکٹر رضا نور اور مستشرق آرم اسٹرونگ کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر رضا نور (م ۱۹۴۳ء) مصطفیٰ کمال کے دور میں نائب وزیر خارجہ اور نامور مؤرخ تھا۔ اس نے کئی جلدوں میں ترکی کی تاریخ ''التاریخ الترکی المفصل والمصور'' پیش کر کے علمی حلقوں سے بڑی داد وصول کی تھی۔ اس نے اپنی ذاتی یادداشتیں مرتب کر کے انہیں اس شرط پر فرانس اور برطانیہ کے حوالے کر دیا تھا کہ انہیں ۱۹۶۰ء سے پہلے شائع نہ کیا جائے۔ یہ یادداشتیں ۱۹۶۸ء میں پہلی بار ترکی میں شائع ہوئیں جس سے وہاں ایک ہل چل مچ گئی اور پہلی بار مصطفیٰ کمال کے چہرے سے نقاب اترا۔ مستشرق ''آرم اسٹرونگ'' نے بھی مصطفیٰ کمال کی سوانح لکھی اور ۱۹۷۷ء اس کا ترجمہ عبداللہ عبدالرحمٰن نے ''الرجل الصنم اتاترک'' کے نام سے عربی میں کیا جو ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔

کمال نے کہا: ''اس مقام پر جو وزیر اعظم کی تعیناتی کرتا ہے۔''

سلطان عبدالحمید کے آخری دور میں انتخابات کے ذریعے اتحاد و ترقی کی حکومت قائم ہوئی تو انور پاشا نے، جو کمال کی عادات سے سخت نالاں تھا، اسے طرابلس الغرب بھیج دیا۔ مگر وہ دو ماہ بعد بلا اجازت اپنے آبائی شہر سلانیک واپس لوٹ آیا۔ جب خلیفہ عبدالحمید کے خلاف بغاوت ہوئی اور جنرل محمود شوکت سلانیک سے فوج لے کر نکلا تو کمال اس فوج کا ایک افسر تھا۔

خلیفہ محمد رشاد کے دور میں وہ ۱۹۱۰ء میں ایک بار پھر سلانیک میں افسر کے طور پر تعینات ہوا۔ اسی دوران اس نے فرانس کا دورہ کیا۔ ۱۹۱۱ء میں لیبیا پر اٹلی کے حملے کے دوران وہ اطالوی افواج کے خلاف نبرد آزما ہوا۔ مگر کچھ عرصے بعد وہاں سے فرار ہو کر استنبول واپس آ گیا۔ اس نے جنگِ بلقان اوّل میں بھی شرکت کی مگر شکست کھا کر واپس آ گیا۔ اسے بلغاریہ میں اتاشی کے طور پر بھیجا گیا مگر وہ زیادہ وقت شراب خانے میں گزارتا رہا۔

کچھ مدت بعد اسے جزیرہ گیلی پولی کا نگران بنا دیا گیا۔ جنگِ بلقان دوم میں اس نے اعلیٰ کمان کا حکم ملنے سے پہلے ہی حریف پر حملہ کر دیا مگر شکست کھا کر پسپا ہوا۔ اس کے بعد اسے صوفیا میں معمولی عہدے پر تعینات کر دیا گیا۔

پہلی عالمی جنگ چھڑنے پر اس نے انور پاشا سے مطالبہ کیا کہ اسے کسی اہم محاذ پر تعینات کیا جائے۔ انور پاشا اس پر اعتماد نہیں کرتا تھا، مگر بادلِ نخواستہ اس سے درۂ دانیال کے چناقلعہ، گیلی پولی، دیار بکر، حجاز اور شام کے محاذ پر کام لیا۔ یورپی طاقتیں اس کے سامنے جزیرہ گیلی پولی سے پسپا ہوئیں تو اسے ترقی ملی اور وہ سولہویں آرمی کور کا کمانڈر بنا دیا گیا جو دیار بکر میں روس کے مقابلے میں تعینات تھی۔ مگر اس دوران وہ ایک بار پھر لہو و لعب اور عیاشی میں لگ گیا۔

۱۹۱۶ء میں اسے سیکنڈ آرمی کور کا نائب کمانڈر بنا دیا گیا۔ اسی وقت اسے ''پاشا'' کا اعزاز ملا جو اعلیٰ افسران کو دیا جاتا تھا۔ دو سال گزرنے نہ پائے تھے کہ اسے مشرقی شہروں کا نائب سپہ سالار بنا دیا گیا۔

پھر اسے برطانیہ کے مقابلے میں مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے اس فوج کے ساتھ حجاز بھیجا گیا جس کا عمومی قائد فواد پاشا تھا۔ اس وقت ترکی کی شکست کے آثار واضح ہو رہے تھے اور ہائی کمان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح ترکی کو بچا لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے بچی کھچی افواج کو پیچھے ہٹا کر ترکی کے اہم مقامات پر تعینات کرنا ضروری تھا۔ سوال یہ تھا کہ کہاں کہاں سے فوج ہٹائی جائے اور کس حکمتِ عملی کے ساتھ تاکہ نقصان کم سے کم ہو۔

مکہ میں حسین پاشا کی بغاوت کے بعد حجاز کے دفاع کا معاملہ نہایت نازک شکل اختیار کر گیا تھا۔ خلیفہ رشاد نے حجاز کے دفاع میں کوتاہی کو ناقابلِ برداشت قرار دیا تھا اور وزراء پر واضح کر دیا تھا کہ اگر حجاز سے فوج ہٹائی گئی تو وہ مسندِ خلافت چھوڑ دے گا۔ معاملے کی نزاکت کے باعث وزیرِ دفاع انور پاشا خود دمشق پہنچا تھا تاکہ حجاز کے دفاع کی مہم کی منصوبہ بندی خود کرے۔ فواد پاشا بھی حرمین شریفین کی حفاظت کو بنیادی مقصد تصور کرتا تھا مگر مصطفیٰ کمال کی رائے یہ تھی کہ حجاز سے فوج کو نکال لیا جائے، اسی لیے اس نے حجاز کی مہم میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ اس کے بعد اسے سیونتھ آرمی کور کا

کمانڈر مقرر کر کے شام بھیج دیا گیا۔ اس وقت تک شام سے بھی پسپائی کی حکمت عملی کا سوال سامنے آ چکا تھا۔ اس بارے میں مصطفیٰ کمال کو ذمہ دار بنایا گیا کہ وہ اس فوج کو بچا کر نکال لائے جس کی قیادت عصمت انونو، فواد پاشا اور جرمن کمانڈر جنرل سانڈرس کر رہے تھے۔

مصطفیٰ کمال نے شام پہنچ کر تمام افواج کے امور اپنے ہاتھ میں لے لیے اور برطانوی جنرل لیبنی سے خفیہ رابطے قائم کر کے ساز باز شروع کر دی۔ جرمن کمانڈر سانڈرس نے مصطفیٰ کمال کی خیانت کو تاڑ لیا اور فرار ہو کر جرمنی چلا گیا۔

مصطفیٰ کمال اور جنرل لیبنی کے درمیان رابطوں کے دوران مغربی سیاست دانوں نے اسے اپنے لیے مفید مطلب محسوس کر لیا اور اسے خلیفہ کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی۔ کمال نے اس کی حامی بھر لی مگر فوج میں بقدر ضرورت ہم خیال افسران نہ مل سکنے کے باعث وہ اس منصوبے پر عمل نہ کر سکا۔

بہر حال کمال اور جنرل لیبنی کے خفیہ معاہدے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک لاکھ ترک سپاہی ہتھیار ڈال کر برطانیہ کے قیدی بن گئے، جبکہ ہزاروں کو دروز ملیشیا اور ارمن نصرانیوں نے جگہ جگہ چھاپہ مار حملوں کے ذریعے قتل کیا۔ یہ پسپائی ۲۰ ستمبر ۱۹۱۸ء کو شروع ہوئی۔ باقی ماندہ سپاہی نہایت ابتر حالت میں مصطفیٰ کمال کے ساتھ ترکی واپس پہنچ سکے۔

یہ تھیں کمال پاشا کی وہ کارستانیاں جنہیں عالمی ذرائع ابلاغ نے سنہرے رنگ میں اس طرح پیش کیا کہ دنیا بھر کے مسلمان شعراء، ادباء، صحافی اور علماء و خطباء اس کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔

اس دوران خلیفہ رشاد کا انتقال ہو چکا تھا اور نئے خلیفہ وحید الدین نے جمعیت اتحاد و ترقی کی حکومت توڑ دی تھی۔ کمال نے وحید الدین سے پرانے تعلق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وزیر دفاع بننے کی پوری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے خلیفہ وحید الدین کی بیٹی صبیحہ خاتون سے نکاح کر کے وجاہت میں اضافہ کرنا چاہا مگر اس کا رشتہ قبول نہ کیا گیا۔ اس نے حزب اختلاف "جمعیت الحریۃ" کو ساتھ ملا کر بھی اپنا سیاسی قد اونچا کرنے کی سعی کی جو بے سود رہی۔

اس کا برطانوی خفیہ اداروں سے مسلسل خفیہ رابطہ رہتا تھا۔ عام زندگی میں وہ ایک عیاش، شرابی اور بدکردار آدمی تھا جسے اسلامی تعلیمات سے سخت ضد تھی۔ اسی لیے برطانوی اداروں نے جان لیا کہ یہی شخص ترکی کی اسلامی شناخت مٹانے کا کام کر سکتا ہے۔ پس برطانوی اور یہودی ادارے اس کے پشت پناہ بن گئے اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس کی ایسی تعریف و توصیف کی کہ مسلمان اسی کو اپنا سب سے بہادر لیڈر سمجھنے لگے۔[1]

معاہدہ مودروس اور خلیفہ کی حکمت عملی:

اس دوران ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو "مودروس" میں عارضی جنگ بندی طے ہوگئی اور اتحادی افواج درہ دانیال اور استنبول کی بندرگاہ میں داخل ہوگئیں۔ ایسے میں جنرل لیبنی استنبول پہنچا اور ترک حکومت سے گفتگو کے دوران مصطفیٰ کمال پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ موصل میں جسے برطانیہ حساس علاقہ تصور کرتا ہے، چھٹی آرمی کور کی کمان

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۸/۲۲۲ تا ۲۳۰، ۱۷/۶/۱۶ ۲۲

مصطفیٰ کمال کو دی جائے۔

خلیفہ کے سامنے اس وقت سب سے بڑی آزمائش کسی طرح ترکی کو بچانا تھا جس کے اہم ترین ساحلی نقاط حتی کہ دارالخلافہ پر بھی اتحادی افواج کھڑی تھیں، بصرف مشرقی اور وسطی اناطولیہ آزاد تھا۔ خلیفہ نے جب دیکھا کہ اتحادی بھی مصطفیٰ کمال پر اعتماد کرتے ہیں تو اس بحران سے نکلنے کے لیے اسے ایک عجیب تدبیر سوجھی۔ اس نے سوچا کہ وہ خود وقت گزاری کے لیے یورپی طاقتوں کے مطالبات مانتا رہے، تاکہ منصب خلافت ہاتھ سے نہ جائے۔ مگر دوسری طرف مصطفیٰ کمال سے خفیہ طور پر یہ طے کرلے کہ وہ ترکی کے آزاد علاقے میں جا کر باب عالی کے خلاف نمائشی بغاوت کردے۔ چونکہ اس طرح قائم ہونے والی باغی حکومت کا یورپی اتحاد سے کوئی معاہدہ نہیں ہوگا، اس لیے وہ ایک آزاد ترکی کے لیے جدوجہد کرسکے گی۔ یورپی اتحاد اس تحریک کو نظر انداز نہیں کرسکے گا اور اسے مجبور ہو کر صلح کی شرائط نرم کرنا پڑیں گی۔ یوں اتحادیوں سے جان چھڑائی جاسکے گی۔

چنانچہ خلیفہ نے مصطفیٰ کمال پر بھروسہ کرتے ہوئے اسے یہ مہم سونپ دی اور اس کے ذمے لگایا کہ اناطولیہ جا کر سیاسی زعماء اور فوجی افسران کو ساتھ ملا کر ایک باغیانہ تحریک کھڑی کرے جو مغربی طاقتوں سے صلح کو مسترد کر کے اپنی سرزمین کی مکمل آزادی کا مطالبہ کرے۔ بظاہر وہ تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لیے رکھے مگر اندرون خانہ وہ خلافت کا وفادار رہے۔ مصطفیٰ کمال نے اس ذمہ داری کو نہایت مسرت کے ساتھ قبول کیا، کیوں کہ جس کامیابی کے وہ خواب دیکھا کرتا تھا، اس کے دروازے کی چابی خلیفہ نے اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔

چونکہ خلیفہ مصطفیٰ کمال کو اناطولیہ بھیجنے کا مقصد یورپی طاقتوں سے خفیہ رکھنا چاہتا تھا، جن کے جاسوس قدم قدم پر پھیلے ہوئے تھے، اس لیے ظاہر یہ کیا گیا کہ اسے نائنتھ آرمی کور کا کمانڈر بنا کر مشرقی اناطولیہ بھیجا جا رہا ہے۔ خلیفہ نے کمال کو بیس ہزار طلائی لیرے دیے جو اس بدحالی میں حکومت کی طرف سے ایک بہت بڑی رقم تھی۔

حالات کے اس رُخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفہ وحید الدین کو مصطفیٰ کمال پر غیر معمولی اعتماد تھا، یا کم از کم ان حالات میں اسے اس سے بہتر آدمی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر افسوس کہ خلیفہ کی فراست نے سخت دھوکا کھایا۔ ایک حد درجے خطرناک معاملے کے لیے جس میں انتہائی قابل اعتماد اور دیانت دار آدمی کی ضرورت تھی، اس نے ایسے فرد کا انتخاب کرلیا جو قطعاً بھروسے کے قابل نہیں تھا اور کسی بھی طرح اقتدار میں آنا چاہتا تھا۔

۱۴ مئی ۱۹۱۹ء کو برطانیہ، فرانس، اٹلی اور یونان نے ایک قرارداد منظور کی جس میں طے کیا گیا کہ ایشیائے کوچک کے علاقے ''ازمیر'' پر یونان کا حق ہے۔ اس کانفرنس نے باب عالی کو متنبہ کیا کہ یونان کی فوجیں ازمیر میں اتریں گی جن پر کوئی روک ٹوک نہ کی جائے۔ اگر باب عالی نے ازمیر پر یونان کا حق تسلیم نہ کیا تو اس کے خلاف دوبارہ جنگ چھیڑ دی جائے گی۔ اس اعلان کے اگلے دن یونانی افواج ازمیر میں داخل ہوگئیں۔ یوں معاملہ مزید سنگین ہوگیا۔

خلیفہ کی نگاہ میں اب مصطفیٰ کمال کی مہم کی اہمیت مزید بڑھ گئی تھی کیوں کہ اس کے ذریعے، یونانیوں کو بھی روکا جا

سکتا تھا۔ چنانچہ ازمیر پر یونانیوں کے قبضے کے صرف دو دن بعد ۱۹ مئی کو مصطفیٰ کمال استنبول سے روانہ ہوگیا۔

وہ خلیفہ کا خفیہ لائحہ عمل لے کر اناطولیہ پہنچا۔ بظاہر وہ ارض روم چھاؤنی کا انسپکٹر اور نگران تھا اور اس کا کام فوجی نظم ونسق میں اصلاحات کرنا تھا۔ اناطولیہ میں فوجی یونٹوں کو احکام بھیجنے کے علاوہ سول انتظامیہ کو بھی احکام جاری کرنے کا اختیار اسی کے پاس تھا۔ یوں مصطفیٰ کمال ترکی کی ایک بااثر شخصیت بن گیا۔

مئی ۱۹۱۹ء میں اس نے ملک کی بقا و ترقی کے نام پر ترک جوانوں کو جمع کرکے درج ذیل قرارداد پاس کی:

1. ترک عوام غیر ملکی تسلط برداشت نہیں کریں گے۔
2. ازمیر ترکی کا حصہ ہے۔ ہم اس پر یونانیوں کا قبضہ قبول نہیں کریں گے۔
3. قوم اپنے اقتدار کی بحالی کا عزم کرتی ہے۔[1]

خلیفہ کی چال الٹی ہوگئی:

مغربی طاقتوں سے یہ حقیقت مخفی نہ رہی کہ مصطفیٰ کمال کو خلیفہ نے کس مقصد کے لیے اناطولیہ بھیجا ہے۔ ایسے میں مغربی سیاست دانوں نے ایسا عجیب ترین کھیل کھیلا کہ خلیفہ کی چال الٹی پڑ گئی۔ برطانوی سامراج کی تاریخ سے واقف لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انگریزی سیاست ''ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ'' کی طرح ہے۔ خلیفہ کی چال کو برطانوی انٹیلی جنس نے نہایت ہوشیاری سے اسی کے خلاف الٹ دیا۔ اس سلسلے میں برطانیہ کی حکمت عملی دو نکات پر مشتمل تھی:

1. مصطفیٰ کمال کو صورتاً نہیں، حقیقتاً باغی بنا دیا جائے اور اس بغاوت کو کامیاب کرایا جائے۔
2. ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے خلیفہ کی اتحادیوں سے دوستی، اور ان کے سامنے عاجزی و بے بسی ظاہر ہو، جبکہ یورپی طاقتوں کی طرف سے مصطفیٰ کمال کی مخالفت اور اس کے جواب میں کمال کی ''جرأت وبسالت'' کا تاثر نمایاں ہو جائے۔ چنانچہ یورپی اتحاد نے اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال کے تقرر پر ناراضی کا اظہار کیا اور استنبول میں قائم عبوری مجلسِ وزارت کے صدر فرید پاشا پر زور دیا کہ اس کے اختیارات سلب کرکے اسے استنبول واپس بلایا جائے۔

ادھر مصطفیٰ کمال حقیقتاً اس قابل ہوگیا تھا کہ سچ مچ خلیفہ کا تختہ الٹ سکے۔ اگرچہ خلیفہ کی طرف سے دیے گئے منصوبے میں یہ شامل نہ تھا۔ مگر ایک مقتدر شخصیت بننے کے بعد اس نے خلیفہ کی مرضی کو اپنی حکمت عملی سے خارج کردیا۔ خلیفہ نے اس کے عزائم بھانپ کر اسے واپس استنبول آنے کا حکم دیا مگر اس نے انکار کردیا۔ یہ دیکھ کر مجلسِ وزارت نے مصطفیٰ کمال کو معزول کرنے کا فیصلہ کرلیا مگر سلطان وحید الدین کو اب بھی مصطفیٰ کمال پر کچھ نہ کچھ بھروسہ تھا۔ اس لیے اس نے شروع میں معزولی کے حکم نامے پر دستخط نہ کیے۔ مگر کچھ دنوں بعد جب اسے یقین ہوگیا کہ مصطفیٰ

---

[1] کیف سقطت الدولۃ العثمانیۃ: ص ۷۷ تا ۸۰؛ التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۷/۱۹ تا ۲۲؛ اعثمانی ترک از ڈاکٹر ایس این علی: ۱۲۰ تا ۱۲۲

کمال، در حقیقت باغی ہو چکا ہے تو ۸ جولائی ۱۹۱۹ء کو اس نے بادلِ نخواستہ کمال کی معزولی کے پروانے پر مہر لگادی۔[1]

مصطفیٰ کمال قومی لیڈر کے روپ میں:

مگر مصطفیٰ کمال نے برطرفی کے حکم نامے کی کوئی پروانہ کی۔ اس نے اناطولیہ کے علاوہ استنبول کے فوجی افسران سے بھی رابطے کیے اور انہیں متحد اور مضبوط ترکی کا خواب دکھا کر حامی بنالیا۔ اس نے قوم کو پیغام دیا: ''عوام پر اور فوج پر یہ فرض ہے کہ وہ سلطنتِ عثمانیہ، عثمانی سلطان اور خلیفہ کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کرے۔''

مگر ساتھ ہی وہ منصبِ خلافت کا احترام باقی رکھ کر یہ ظاہر کرتا رہا کہ اس کی لڑائی موجودہ خلیفہ سے ہے۔ اس نے اپنی ایک تقریر میں کہا: ''عوام اور فوج خلافتِ عالیہ کے مقام کو باقی رکھنا، اپنی بقا سے بھی زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ جو شخص اس کے خلاف سوچے، اس کے لیے تباہی ہے۔ ایسا شخص خائن، کافر اور مرتد ہے۔''[2]

اس دوران مصطفیٰ کمال نے برطانوی نمائندے ''راولنسن'' سے خفیہ ملاقات کی جو برطانوی وزیرِ خارجہ لارڈ کرزن کا بھتیجا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے دو ہم فکر لیڈروں، علی فواد پاشا اور رؤف بیگ کے ساتھ مل کر طے کیا کہ عوامی نمائندوں کا ایک اجلاس بلا کر ملک کے دفاع واستحکام اور جمہوریت کی بازیابی کا لائحہ عمل طے کیا جائے۔

چنانچہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۹ء کو ارضِ روم میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ۵۴ ارکان منتخب کر کے ایک کانگریس تشکیل دی گئی جس کا صدر مصطفیٰ کمال تھا۔ خلیفہ نے کمال کی گرفتاری کے احکام جاری کیے مگر اس پر قابو پانا اب ناممکن ہو چکا تھا۔ ۴ ستمبر ۱۹۱۹ء کو سیواس میں ایک سات روزہ اجلاس منعقد ہوا جسے ''سیواس کانفرنس'' کا نام دیا گیا۔

اس میں درج ذیل قرارداد منظور کی گئی:

1. جن علاقوں میں ترک آباد ہیں، ان کا کوئی حصہ بیرونی قبضے میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔
2. ملک کی حفاظت میں خلافت کی ناکامی یا کوتاہی کی صورت میں عبوری جمہوری حکومت قائم کی جائے گی جس کا انتخاب قومی مجلس کرے گی۔
3. سلطنتِ عثمانیہ کے سقوط کی صورت میں، قوم کسی بھی طرح اپنا دفاع خود کرے گی۔
4. ایک قومی مجلس قائم کر کے، قومی آئین مرتب کیا جائے گا۔
5. غیر ملکی سرپرستی قبول نہیں کی جائے گی۔

اس اجلاس میں ۱۶ ارکان کی ایک نمائندہ کونسل بھی قائم کر دی گئی اور مصطفیٰ کمال کو اس کا صدر مان لیا گیا۔ مصطفیٰ کمال کو چیف آف آرمی اسٹاف مقرر کر کے دشمن سے جنگ کا اختیار بھی دے دیا گیا۔ سیواس کانفرنس کے ان فیصلوں کو شائع کرایا گیا جسے ''میثاقِ ملی'' کا نام دیا گیا۔ اس میں خلیفہ کی حیثیت برقرار رکھنے کا بھی عندیہ دیا گیا تھا۔

---

[1] كيف سقطت الدولة العثمانية: ص ۷۹ تا ۸۱ ؛ التاريخ الاسلامى لدكتور محمود شاكر: ۲۲/۱۷ تا ۲۳

[2] التاريخ الاسلامى لدكتور محمود شاكر: ۲۲/۱۷

فوج کے تمام یونٹوں نے مصطفیٰ کمال کو یقین دلایا کہ ان کا استنبول سے کوئی تعلق نہیں اور وہ "سیواس کانفرنس" کے حق میں ہیں۔ اس طرح مصطفیٰ کمال کی قوت مزید بڑھ گئی۔ ①

انتخابات میں کمال کی فتح۔ خلیفہ سے کش مکش:

کانفرنس نے خلیفہ وحید الدین سے یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ وہ فرید پاشا کی کابینہ توڑے مگر خلیفہ نے کابینہ توڑ دی اور از سرِ نو انتخابات کا اعلان کر دیا۔ ۷ نومبر ۱۹۱۹ء کو انتخابات ہوئے جن میں قوم پرست غالب آئے۔ مصطفیٰ کمال ارض روم اور انقرہ سے انتخاب لڑ کر دونوں حلقوں میں جیت گیا۔ اس کے بعد استنبول میں پارلیمان کا اجلاس ہوا۔ رؤف بیگ وزیر اعظم منتخب ہوا اور علی رضا پاشا نے وزارتیں تشکیل دیں۔ مصطفیٰ کمال اجلاس میں شریک نہ ہوا۔ اس نے انقرہ میں رہ کر وزیر اعظم کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک چلائی مگر ارکان پارلیمان نے اس کا ساتھ نہ دیا اور وزیر اعظم پر اعتماد کا اظہار کر دیا۔

استنبول میں سلطان وحید الدین خان کے حامیوں اور قوم پرستوں میں کش مکش بڑھنے کا خطرہ تھا، اس لیے قوم پرستوں کی نمائندہ کونسل نے پارلیمنٹ کا اجلاس انقرہ میں بلا لیا۔ جو ارکان شریک نہ ہوئے، ان کی جگہ نئے ارکان چن لیے گئے۔ نئی اسمبلی تشکیل دینے کے ساتھ نیا آئین بھی مرتب کرا لیا گیا۔ اس کے بعد انقرہ میں ہی نئی قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا جس میں سلطنت عثمانیہ کا نام بدل کر "ترکیا" رکھ دیا گیا۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں قومی اسمبلی نے ایک عبوری انتظامی کمیٹی تشکیل دے کر مصطفیٰ کمال کو اس کا صدر منتخب کر لیا۔ یوں مصطفیٰ کمال ترکی کا سربراہِ حکومت بن گیا۔

اس طرح ایک ہی وقت میں ایک مملکت میں دو حکومتیں وجود میں آ گئیں: ایک طرف استنبول میں خلیفہ کی حکمرانی تھی اور دوسری طرف انقرہ میں مصطفیٰ کمال کی جمہوری حکومت۔ ②

خلیفہ، صدر اعظم فرید پاشا اور شیخ الاسلام نے مصطفیٰ کمال کی حکومت کو مسترد کر دیا۔ صدر اعظم نے انتخابات کے نتائج کو کالعدم قرار دے دیا جبکہ شیخ الاسلام نے مجلس وطنی (پارلیمان) کے ارکان اور ان کے حامی فوجی افسران کے باغی و منافق ہونے اور ان کے قتل کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔

مصطفیٰ کمال نے ۳ مئی ۱۹۲۰ء کو ملک کی نئی وزارتیں تشکیل دے دیں، ایک نئے مفتی کا تقرر بھی کر دیا۔ مجلس وطنی نے خلیفہ، صدر اعظم اور شیخ الاسلام کو ملک و قوم سے خیانت کا مرتکب قرار دے دیا۔ یہ الزام اس قدر سخت تھا کہ عوام بھڑک اٹھے اور مصطفیٰ کمال کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا مگر کچھ دنوں بعد جب "معاہدہ سیورے" کی گونج سنی گئی تو عوامی حمایت دوبارہ مصطفیٰ کمال کے ساتھ ہو گئی۔ ③

---

① التاریخ الاسلامی للدکتور محمود شاکر: ۱۷/۲۳، ۲۵؛ عثمانی ترک از ڈاکٹر ایس ایم علی: ۱۳۰ تا ۱۳۵؛ الدولۃ العثمانیۃ فی التاریخ الاسلامی الحدیث از اسماعیل یاغی: ص ۲۲۶ تا ۲۲۷

② عثمانی ترک از ڈاکٹر ایس ایم علی: ص ۱۲۹ تا ۱۳۱؛ الدولۃ العثمانیۃ فی التاریخ الاسلامی الحدیث لدکتور اسماعیل یاغی: ص ۲۲۸

③ الدولۃ العثمانیۃ فی التاریخ الاسلامی الحدیث: ص ۲۲۸، ۲۲۹

مصطفیٰ کمال کے بارے میں خلاصہ:

ہمیں مصطفیٰ کمال کے بارے میں غیر جانبداری کے ساتھ چند حقائق ماننا پڑتے ہیں:

❶ وہ اپنے اقتدار کے لیے انتہائی پرجوش تھا۔

❷ وہ ایک آزاد وطن کے حصول کا زبردست ولولہ رکھتا تھا۔

❸ اسلام اور مذہب کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہ تھی۔

❹ باقی عالم اسلام کے مفادات سے بھی اسے کوئی تعلق نہ تھا۔

❺ یورپی طاقتوں سے روابط میں اس کا ہدف یہ تھا کہ وہ ترکوں کو بہر حال آزاد کریں چاہے اسلام کو برباد کردیں۔

ان دنوں روس میں سوشلسٹ انقلاب آچکا تھا جو یورپ پر طاری سرمایہ دارانہ نظام سے متصادم تھا، اس لیے عالمی جنگ کے دوران روس کا یورپی طاقتوں سے قائم اتحاد ختم ہو گیا تھا اور اب یورپی طاقتیں، روس سے خطرہ محسوس کررہی تھیں۔ روس کی ترکی سے متصل سرحدوں پر صورتحال یہ تھی کہ قفقاز کے مسلمانوں نے سوشلسٹ انقلاب کو مسترد کرکے اس کے خلاف جہاد شروع کردیا تھا اور سوویت فوجیں وہاں قابض ہونے سے اب تک قاصر تھیں۔ مصطفیٰ کمال نے ایسے میں یہ محسوس کیا کہ اگر روس کو قفقاز میں قدم جمانے کا موقع دیا جائے تو یورپی طاقتیں مزید خوفزدہ ہو جائیں گی۔ چونکہ وہ ہرگز نہیں چاہتیں کہ روس خلیج باسفورس اور گرم سمندروں تک پہنچ سکے لہٰذا وہ ترکی کے حصے بخرے کرنے کی بجائے روس کے راستے میں ایک مضبوط ترکی کی ضرورت محسوس کرنے لگیں گی۔ چنانچہ مصطفیٰ کمال نے قفقاز کی تحریک جہاد کو کمزور کرکے، روس کو موقع دیا کہ وہ پیش قدمی کرکے قفقاز پر قابض ہو جائے۔

ملتِ اسلامیہ کے نقطۂ نظر سے یہ ناقابلِ معافی جرم تھا مگر مصطفیٰ کمال کو اس پر فخر تھا کہ اس نے یورپ کو مضبوط ترکی کی ضرورت محسوس کرادی ہے۔[1]

برطانوی فوج استنبول میں:

۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو برطانوی فوجیں باقاعدہ استنبول میں داخل ہو گئیں۔ ان کے دباؤ پر صالح پاشا کی قیادت میں ایک نئی حکومت تشکیل دی گئی جس نے گھر گھر تلاشی لے کر اور جیل خانوں تک کو کھنگال کر مصطفیٰ کمال پاشا کے حامیوں کو گرفتار کیا۔ خلیفہ نے جدت پسندوں کا قلع قمع کرنے اور عثمانیوں کے قدیم طرز سیاست کو اپنانے کی آخری کوشش کر ڈالی۔ جمعیت اتحاد و ترقی کے کئی لیڈروں کو گرفتار کرکے مالٹا بھیج دیا گیا۔ اخبارات و جرائد پر سنسر شپ لگادی۔ ڈاک، تار اور ٹیلی فون کی نگرانی ہونے لگی۔ قوم پرست جماعتوں کو کالعدم قرار دے دیا گیا اور سلطنت میں علماء کا اثر ورسوخ بڑھا دیا گیا۔ برطانیہ نے اس نئی حکومت پر اپنے نگران مقرر کرکے اعلان کرایا کہ لوگ خلیفہ کی اطاعت کریں۔

مگر ان کوششوں کا اس کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا کہ لوگ خلیفہ کو برطانیہ کا آلۂ کار سمجھنے لگے۔ ان میں ترک قومیت کا

---

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۲۶/۱۷

جذبہ مزید پختہ ہونے لگا۔ ۱۵ اپریل کو برطانیہ کے دباؤ پر یہ حکومت تحلیل کر کے فرید پاشا کی قیادت میں دوبارہ نئی حکومت بنائی گئی۔ اس طرح یہ تاثر عام ہو گیا کہ خلیفہ سامراج کا ایجنٹ ہے، جس کے بس میں کچھ بھی نہیں، جبکہ مصطفیٰ کمال سامراجیت کے خلاف شمشیرِ بے نیام ہے۔ لوگ ملک کے دفاع کے لیے مصطفیٰ کمال کے گرد جمع ہونے لگے۔ استنبول اور اس کے مضافات میں نوجوان رضاکاروں کی بھرتی شروع ہو گئی تاکہ اتحادی طاقتوں سے ایک اور جنگ لڑی جا سکے۔ یوں کمال نے آناً فاناً ایک قومی لیڈر کا روپ دھار لیا۔[1]

انتخابات میں مصطفیٰ کمال کی جیت:

حالات مصطفیٰ کمال کو مزید مقبولیت بخش رہے تھے۔ انتخابات ہوئے تو وہ ایک بار پھر جیت گیا۔ مگر اس نے استنبول جا کر اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے کی بجائے، اناطولیہ کے کامیاب ممبران کو جمع کر کے انقرہ میں ایک الگ "مجلسِ تنفیذیہ" قائم کر دی جس نے ۳ مئی ۱۹۲۰ء کو اناطولیہ کا انتظام سنبھال لیا۔ اس میں مصطفیٰ کمال سربراہ، سامی بکر وزیرِ خارجہ، جامی بیکوت وزیرِ داخلہ اور عارف جلال الدین وزیرِ عدلیہ تھا۔ اس طرح ایک ہی ملک میں دو حکومتیں قائم ہو گئیں: ایک انقرہ کی جمہوری حکومت، دوسری استنبول کی سلطنتِ عثمانیہ۔

کمال نے اس موقع پر ایک دین دار مسلمان ہونے کا اظہار کیا۔ مجلسِ تنفیذیہ کا پہلا اجلاس نمازِ جمعہ کے بعد مسجد میں منعقد کیا۔ اس موقع پر قرآن مجید کا ختم اور بخاری شریف کی قرأت بھی کی گئی۔ کمال نے اپنے خطاب میں یہ اعلان کیا کہ وہ حکومت اور خلافت میں جدائی کا قائل نہیں۔ اس موقع پر اس نے عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے اپنے اور خلیفہ کے مابین خفیہ معاہدے کو بھی فاش کر دیا اور کہا کہ وہ خلیفہ کی اجازت ہی سے اناطولیہ آیا ہے اور اس کا مقصد خلیفہ کے احکام کی تعمیل کے سوا کچھ نہیں۔[2]

یورپی اتحاد ایک ملک میں قائم ان دونوں حکومتوں کی کارکردگی کو بغور دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے کس کا غلبہ ان کے مقاصد کے لیے زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ انہوں نے خلیفہ کو کچھ اختیارات دے دیے جن سے فائدہ اٹھا کر خلیفہ نے فوجی کارروائی کے ذریعے کردستان کے سارے علاقے کا استنبول سے الحاق کر لیا۔

خلیفہ کو طاقت پکڑتا دیکھ کر اناطولیہ کے مختلف صوبوں کے حکام بھی یکے بعد دیگرے بابِ عالی سے تجدیدِ اطاعت کرنے لگے اور مصطفیٰ کمال کے پاس صرف انقرہ رہ گیا۔

اس کے بعد خلیفہ کی فوج انقرہ کی طرف روانہ ہوئی تاکہ مصطفیٰ کمال کی بغاوت کو کچلا جا سکے۔ اگر لڑائی ہوتی تو خلیفہ کی فتح اور کمال کی شکست کے امکانات غالب تھے کیوں کہ فوجی کمانڈروں کا میلان خلیفہ کی طرف ہو چکا تھا۔

مگر اسی دوران کمال کے حامیوں کو خلیفہ اور یورپی اتحاد کے درمیان معاہدۂ سیورے کی تفصیلات کا پتا چل گیا اور

---

① الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث از اسماعيل یاغی: ص ۲۲۷؛ التاريخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۷/۲۶، ۲۷

② التاريخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۷/۲۷، ۲۸

انہوں نے فوری طور پر انہیں نشر کر کے یہ ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ خلیفہ نے ترکوں کی آزادی کا سودا کر لیا ہے۔ اس سے پانسا یکدم پلٹ گیا۔ عوام اور فوج کی حمایت دوبارہ کمال کے ساتھ ہو گئی۔ ①

معاہدۂ سیورے کیا تھا؟:

یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ آخر معاہدۂ سیورے کیا تھا؟ اس کی تشہیر ہوتے ہی خلیفہ کو غدار کیوں تصور کر لیا گیا؟ اتحادی خلیفہ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ ان کی من پسند شرائط پر صلح کرلے ورنہ اتحادی فوجیں خلافت کا خاتمہ کر دیں گی۔ خلیفہ پر مزید دباؤ ڈالنے کے لیے اتحادیوں کی شہ پر مئی ۱۹۲۰ء میں یونان نے پہلے ازمیر اور پھر سمرنا پر بھی قبضہ کر لیا جس کے باعث مجبور ہو کر خلیفہ نے اپنے نمائندوں کو مذاکرات کے لیے بھیج دیا جنہوں نے اتحادیوں کی شرائط منظور کر لیں۔

یوں ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو معاہدۂ سیورے تحریر ہوا، جس کا خلاصہ یہ تھا:

① استنبول اور بحیرۂ مرمرہ کے سوا، ترکی کے باقی تمام علاقے، اتحادیوں کے قبضے میں دے دیے جائیں گے۔

② مغربی اناطولیہ میں ازمیر اور اس کے آس پاس کے پانچ اضلاع، پانچ سال تک یونان کے قبضے میں رہیں گے۔ اس کے بعد وہاں کے شہریوں کی رائے ہوئی تو، یونان کو مستقل حکومت بنانے کا حق ہوگا۔

③ بحیرۂ ایجی کے جزائر یونان کے، جبکہ روڈس اور اس کے آس پاس کے جزائر اٹلی کے قبضے میں جائیں گے۔

④ ترکی ان تمام مقبوضات سے باضابطہ طور پر دست برداری کا اعلان کرے گا جو عالمی جنگ میں اس سے الگ ہوئے ہیں۔ کردستان، آرمینیا اور حجاز کو الگ آزاد ممالک مانا جائے گا۔ ترکی افریقہ اور بحیرۂ ایجی کے تمام مقبوضات سے دست بردار ہو جائے گا۔ قبرص اور مصر برطانیہ کے اور باقی جزائر اٹلی کے نام کر دے گا۔

⑤ ترکی کی فوج صرف پچاس ہزار ہوگی جس کے افسران غیر ملکی ہوں گے۔

مجلسِ وطنی اور مصطفیٰ کمال نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف خلیفہ کے نمائندوں نے اسے قبول کر لیا تھا مگر معاہدے کو خلیفہ کی منظوری کے بغیر قانونی حیثیت نہیں مل سکتی تھی۔ خلیفہ غور وفکر کے بہانے اس پر دستخط کرنے کو ملتوی کرتا رہا، یوں اس نے آخر تک اس معاہدے کی توثیق کی نوبت نہیں آنے دی اور اس کی حیثیت محض ایک تحریر کی رہی جس پر کبھی بھی عمل نہیں ہوا۔ ②

مگر چونکہ معاہدۂ سیورے یورپی اتحاد اور استنبول کی سلطنتِ عثمانیہ کے مابین دائر تھا، اس لیے اس کے مندرجات کو شائع کر کے مصطفیٰ کمال نے حالات کا رخ بدل دیا۔ کوئی بعید نہیں کہ معاہدے کی نقل برطانوی خفیہ اداروں نے ہی اسے بھیج دی ہو۔ ملکی فضا جو خلیفہ کے ساتھ ہو چکی تھی، اب یکدم خلیفہ کے مخالف اور انقرہ حکومت کی حمایت میں بن گئی،

---

① التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۷/ ۳۸

② الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث از اسماعیل یاغی: ص ۲۲۶

جس کی وجہ سے انقرہ پر خلیفہ کی وفادار فوج کا حملہ ناکام ہوگیا۔ فوج اور عوام دوبارہ مصطفیٰ کمال کے ساتھ ہوگئے جن کی مدد سے کمال استنبول پر حملے کے قابل ہوگیا۔ [1]

یہاں ہمیں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ اگر واقعی خلیفہ انگریزوں سے ملا ہوا تھا اور مصطفیٰ کمال ہی سامراجیت کا اصل مدمقابل تھا، تو برطانوی فوجوں نے انقرہ کی جگہ استنبول پر قبضہ کیوں ضروری سمجھا؟ مصطفیٰ کمال کو انہوں نے آزاد کیوں چھوڑے رکھا؟ مصطفیٰ کمال اگر برطانیہ کا مہرہ نہیں تھا، تو اس نے انگریزوں کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہ کی؟

انقرہ کی فوجیں فرانسیسیوں، اطالویوں اور یونانیوں کے مقابلے میں ضرور کھڑی ہوئیں جس سے مصطفیٰ کمال کی حب الوطنی اور جرأت و بسالت کا چرچا ہوا اور اسے عوامی اعتماد نصیب ہوا، مگر اس نے برطانیہ سے نبرد آزما ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی جبکہ استنبول پر جو ترکوں کا سب سے اہم مقام تھا، صرف برطانوی فوجیں حملہ آور ہوئی تھیں۔ کمال نے وہاں حملہ کر کے انگریزوں کو بے دخل کیوں نہ کیا؟ اگر وہ سلطنتِ عثمانیہ کا مخلص تھا، تو خلیفہ کو برطانیہ کے تصرف سے نکالنا بھی اسی کی ذمہ داری تھی کیوں کہ قوم اور فوج اس کے ساتھ ہو چکی تھی۔ مگر اس نے ایسا کچھ بھی نہ کیا۔ آخر کیوں؟

یہ سوال بھی سامنے ہے کہ اگر اتحادی طاقتیں چاہتیں تو کمال سے نجات حاصل کرنا ان کے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ وہ اس کا سر شروع ہی میں کچلنے کے لیے متحرک کیوں نہ ہوئیں؟

اس صورتحال سے صاف پتا چلتا ہے کہ عالمی طاقتیں مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں خلافت کو ختم کرانے کے لیے اسے ایک زبردست لیڈر کی حیثیت دلوانے میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ اتحادی خصوصاً برطانیہ حالات کو اپنے رُخ پر لے جانے میں کامیاب تھے۔ کمال کی مقبولیت اور عروج سے انہیں ذرہ برابر نقصان نہ ہوا، بلکہ ان کے مطالب کی راہ آسان ہوگئی۔

ایک ملک، دو حکومتیں:

ترکی کی صورتحال اب نہایت عجیب تھی۔ ایک طرف استنبول میں سلطان وحید الدین تھا جو قانوناً و شرعاً مسلمانوں کا خلیفہ تھا۔ دوسری طرف انقرہ میں مصطفیٰ کمال تھا جس کے ہاتھ میں ملک کی بچی کھچی تمام طاقت تھی۔

اس صورتحال پر غور کر کے ۱۹۲۱ء میں انقرہ حکومت نے ایک نیا دستور و آئین مرتب کیا جس نے استنبول میں وضع کیے گئے تمام دساتیر اور معاہدوں کو منسوخ کر دیا۔ اس دستور میں یہ وضاحت بھی کی گئی کہ حکومت کی دو قسمیں ہیں:

❶ تشریعی ❷ تنفیذی۔ تشریعی حکومت استنبول کے خلیفہ کی ہے جبکہ تنفیذی حکومت مجلس وطنی کی ہے۔

اُدھر برطانیہ نے فروری ۱۹۲۱ء میں معاہدہ سیورے پر نظر ثانی کے لیے لندن میں ایک کانفرنس طلب کی اور استنبول و انقرہ دونوں حکومتوں کے نمائندوں کو اس میں طلب کیا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ برطانیہ خود انقرہ کو استنبول کے برابر باور کرانا چاہتا ہے۔ حالانکہ ساری دنیا جانتی تھی جنگِ عظیم کا فریق سلطنتِ عثمانیہ تھی اور اتحادیوں کے ساتھ صلح کے

---

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۷/ ۲۱،۳۰

معاملات طے کرنا بھی اس کا حق تھا۔ انقرہ کو برابر کی حیثیت دے کر در حقیقت عالمی طاقتوں نے سلطنتِ عثمانیہ کی حیثیت مزید گرادی تھی۔ اس کانفرنس میں خلیفہ کے وفد نے مزید ایثار کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا موقف بیان کرنے کی بجائے انقرہ کے وفد ہی کو بات چیت کا موقع دیا تاکہ دنیا کے سامنے ترکی سے ایک ہی آواز بلند ہو۔

کانفرنس میں ازمیر پر یونان کا قبضہ زیرِ بحث آیا تو انقرہ کے وفد نے وہاں ایک نصرانی حاکم کے تقرر پر رضامندی ظاہر کردی مگر اتحادی وہاں یونان کے قبضے کو قانونی طور پر منوانا چاہتے تھے جس پر اتفاق نہ ہو سکا۔

البتہ مصطفیٰ کمال فرانس کے حق میں شمالی شام سے دست برداری پر آمادہ ہو گیا جس کے جواب میں فرانس نے اناطولیہ کے ساحل کیلیکیا سے فوجیں ہٹالیں اور انقرہ حکومت کو تسلیم کرلیا۔ اسی طرح اٹلی سے بھی مفاہمت کر کے اسے انطاکیہ سے فوجیں ہٹانے پر رضامند کرلیا۔ ۳ مارچ کو کمال نے "باطوم" کے سرحدی علاقے پر روس کا حق مان لیا۔ جواباً روس نے بھی جدید ترک حکومت کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔

یوں کمال نے عالمی سطح پر ایک قانونی حکمران کی حیثیت حاصل کرلی جبکہ استنبول کی ساکھ مزید گر گئی۔ [1]

ترکی یونان جنگ اور پوشیدہ حقائق:

عالمی طاقتوں سے معاملات طے کرنے کے بعد صرف یونان سے ازمیر کے مسئلے پر تنازعہ باقی رہ گیا تھا۔ یہ واحد یورپی ملک تھا جس سے مصطفیٰ کمال نے مذاکرات کی جگہ طاقت سے مسئلہ طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر دیکھا جائے تو یہ اتنا مشکل بھی نہ تھا کیوں کہ یونان ایک چھوٹی طاقت تھا جو عالمی جنگ میں بھی اتحادیوں کی مدد ہی سے کچھ کامیابیاں حاصل کرپایا تھا۔ انقرہ اور یونان کی جنگ میں اگر یہ طاقتیں غیر جانب دار رہتیں تو یونان کی فتح مشکل تھی۔

یورپی اتحاد نے یونان اور انقرہ کے قضیے میں غیر جانب دار رہنے کی حکمتِ عملی اپنائی۔ دوسری طرف روس نے انقرہ کو ان راستوں سے اسلحے کی سپلائی شروع کردی جو انگریزوں کے قبضے میں تھے۔ برطانیہ اس پر دم سادھے رہا۔

اب ہم یونان سے مصطفیٰ کمال کی اس لڑائی کا احوال پیش کرتے ہیں جس کی بُنیاد پر ملتِ اسلامیہ کے اس غدار کو ایک عظیم فوجی جرنیل، ایک فاتح اور قومی نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

برطانوی خفیہ ایجنسیوں اور یہودی ذرائع ابلاغ نے اس نمائشی جنگ کے دوران مصطفیٰ کمال پاشا کی شجاعت و بسالت کا صور اس زور سے پھونکا کہ دنیا بھر کے محکوم مسلمان، اس نئے چہرے کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔ لندن اور امریکا کے اخبارات سے لے کر برصغیر کے مسلم اخبارات و جرائد تک ہر جگہ "غازی مصطفیٰ" کا ڈنکا بجنے لگا۔

عرب شاعر احمد شوقی نے اپنے شہرہ آفاق قصیدے میں مصطفیٰ کمال کو خالد بن ولید اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہم پلہ قرار دے دیا۔ پوری دنیا کے مسلمان، ڈیڑھ دو صدیوں سے شکست در شکست کے مناظر دیکھ رہے تھے اور اس وقت افغانستان اور ترکی کے سوا، دنیا میں کوئی آزاد اسلامی مملکت نہیں بچی تھی۔ غلامی کی ذلت میں لپٹے ہوئے ان

[1] التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۷/ ۳۲، ۳۳

مسلمانوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کو ایک ایسے جری قائد کے طور پر دیکھا جو خلافت کی شان و شوکت کو دوبارہ قائم کرنے کی تگ و دو کر رہا ہو، جبکہ خلیفہ وحید الدین کو وہ ایک بزدل اور نااہل شخص سمجھنے لگے تھے۔ ①

ہم سادہ ہی ایسے تھے، کی یوں ہی پذیرائی
جس بار خزاں آئی، سمجھے کہ بہار آئی
آشوبِ نظر سے کی، ہم نے چمن آرائی
جو شے بھی نظر آئی، گل رنگ نظر آئی ②

قارئین مصطفیٰ کمال کے حالاتِ زندگی اور اس کے فوجی کیریئر میں یہ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ خود کو ''اتاترک'' سے موسوم کرنے والے اس ''بطلِ حریت'' کے نامۂ اعمال میں کوئی ایک بھی ایسا کارنامہ نہیں ہے جس پر اسلامی تاریخ فخر کر سکے۔ اسے جہاں بھی بھیجا گیا، وہاں یہ کوئی نہ کوئی عجیب گل کھلا کر لوٹا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان حقائق کو صیہونی لابی نے چھپا دیا اور کمال کی پسپائی اور بھگوڑے پن پر ''بے مثال قیادت'' اور ''شہامت و بسالت'' کے چمک دار لیبل لگا دیے۔ جو لوگ مصطفیٰ کمال کی کسی اور خوبی کے قائل نہیں، وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ کم از کم یونان کے مقابلے میں اس نے زبردست استقامت دکھائی اور ترکی کو ان کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچالیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یونان سے جنگ کے حالات، اکثر تواریخ میں نہایت مختصر ملتے ہیں۔ شروع میں انہیں جان بوجھ کر سمیٹا اور لپیٹا گیا تاکہ حقیقت چھپی رہے۔ بس اتنا ظاہر ہو کہ جنگ ہوئی اور یونان شکست کھا کر بھاگ گیا جس کا سہرا مصطفیٰ کمال کے سر ہے۔ بعد والے اسی اختصار کو نقل کرتے گئے۔ اسی لیے ہم جنگِ یونان کو قدرے ضروری تفصیل سے پیش کر رہے ہیں تاکہ پتا چلے کہ اس میں کمال کی کتنی بہادری تھی اور یونانیوں کو کہاں کہاں شکست دے کر بھگایا گیا۔

۱۹۲۱ء کے موسم بہار میں مصطفیٰ کمال نے ترک افواج کو روسی اسلحے سے آراستہ کر کے محاذ کی طرف بھیج دیا۔ یونانیوں نے ترکوں کو محاذ پر پہنچنے سے پہلے بے دم کرنے کے لیے چھاپہ مار کارروائیاں شروع کر دیں۔ یونان کو یقین تھا کہ عن قریب برطانیہ، فرانس اور اٹلی اس کی مدد کے لیے آجائیں گے اور وہ جنگ جیت جائے گا کیوں کہ ایک طویل زمانے سے انہی طاقتوں کی شہ پر یونانی عثمانی ترکوں کے خلاف بار بار شورشیں کرتے آرہے تھے۔ مگر برطانیہ، اس کے اتحادی اور یہودی زعماء کا منصوبہ کچھ اور تھا۔ برطانیہ نے صاف اعلان کر دیا کہ وہ اور اس کے اتحادی اس قضیے میں دخل نہیں دیں گے۔

۶ مارچ ۱۹۲۱ء (۲۷ جمادی الآخرہ ۱۳۳۹ھ) کو یونانیوں کا حملہ شروع ہوا اور انہوں نے جنگ کے پہلے معرکے میں ترک جرنیل عصمت انونو کو پسپا کر دیا۔ یونانی پیش قدمی کرتے ہوئے عثمانیوں کے اولین پایۂ تخت بروصہ تک پہنچ

① فیض احمد فیض
② الدولة العثمانية، عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابي: ص ۳۶۸

گئے جہاں سے انہوں نے استنبول پر حملے کی تیاری شروع کر دی۔ مگر برطانوی فوجیں ان کی راہ میں حائل ہو گئیں۔
یونانی یہاں سے پلٹ کر "کوتاہیہ" پہنچے جہاں عصمت انونو دوبارہ افواج مرتب کر رہا تھا۔ یونانیوں نے جنوب میں قرہ حصار پر قبضہ کر کے شمال کی طرف یلغار کی۔ اُدھر مصطفیٰ کمال انقرہ سے اپنی کمان میں فوجیں لے کر اس محاذ پر آن پہنچا مگر یونانیوں پر حملے کی بجائے اس نے افواج کو جنگ روک کر مشرق کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ اس پسپائی میں ترکوں کو سخت نقصانات اٹھانا پڑے مگر کمال نے پروانہ کی اور فوج کو دریائے سقاریا کے پار لے جا کر وہاں دفاعی لائن بنانے کا حکم دیا۔ ترکی کی تمام دستیاب فوج یہاں جمع ہو گئی جس کی تعداد ۷۰ ہزار تھی۔
کمال اس کے بعد ٹرین کے ذریعے انقرہ پہنچا جہاں ارکان پارلیمان محاذ سے مسلسل پسپائی پر سخت برافروختہ تھے۔ کمال نے پارلیمان کا اجلاس طلب کر کے ارکان کو یقین دلایا کہ ترک فوج اب تک توانا اور مضبوط ہے۔
ترک فوج دریائے سقاریا کے کنارے مورچے بنائے ہوئے تھی کہ مئی ۱۹۲۱ء میں یونانی آگے بڑھتے ہوئے دریا کے مغربی کنارے پر پہنچے، جب ان کی جانب سے حملہ شروع ہوا تو ترک بڑی دلیری سے لڑے مگر آخر کار وہ یہاں بھی قدم نہ جما سکے اور اندھا دھند فرار ہونے لگے۔ صرف فدائی سپاہیوں نے ثابت قدمی دکھائی اور خنجروں سے لڑتے لڑتے کٹ گئے۔ باقی اس ابتری کی حالت میں فرار ہوئے کہ ۷۰ ہزار میں سے صرف ۳۰ ہزار انقرہ پہنچ سکے۔ اکثر یونانیوں کے حملے کی نذر ہو گئے یا ادھر اُدھر بکھر گئے۔ اس شکست کے بعد انقرہ کے سقوط کا خطرہ پیدا ہو گیا اور وزراء مشورے کرنے لگے کہ دار الحکومت قیصریہ منتقل کر دیا جائے۔ خوفزدہ شہریوں نے نقل مکانی شروع کر دی۔
مگر اس دوران ایک ناقابلِ یقین بات ہوئی۔ وہ یہ کہ فاتح یونان نے میدان میں کسی شکست، کسی مزاحمت اور کسی رکاوٹ کا سامنا کیے بغیر اچانک واپسی اختیار کر لی اور استنبول کے شہریوں نے چین کا سانس لیا۔
یہ تھی یونان کی وہ شکست اور پسپائی جسے کمال پاشا کے مداح آج تک دلیری اور اولوالعزمی کی ناقابلِ فراموش داستان شمار کرتے ہیں۔ مگر حقیقت بین نگاہوں سے یہ مخفی نہیں رہ سکتا کہ فتح مند یونان کی اس واپسی کی وجہ برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے دباؤ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی، کیوں کہ یہ طاقتیں ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی مقصد بر آری کرنے والا مستقبل کا "عظیم ترک لیڈر" ابتداء ہی میں سیاسی موت کا شکار ہو جائے۔
یونانیوں کا انقرہ کے قریب سے لوٹ جانا، در حقیقت پسپائی نہیں، واپسی تھی، اسی لیے وہ پورے اطمینان سے سفر کرتے رہے۔ انہیں کسی تعاقب کا اندیشہ نہ تھا۔ وہ راستے کے ہر دیہات کو نذر آتش کر کے مسلمان مرد و زن کا قتل عام کرتے رہے۔ کنوؤں اور پانی کے ذخائر کو تباہ کر کے مال مویشی سمیٹ کر ساتھ لے جاتے رہے۔ اس طرح کسی تعاقب کے خدشے کے بغیر وہ ۲۸ فروری ۱۹۲۲ء (۲ رجب ۱۳۴۰ھ) کو واپس "ازمیر" پہنچے۔ اپنے اس مفتوحہ شہر کو انہوں نے خود خالی کر دیا اور مغربی ساحل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے نکل جانے کے چھ ماہ بعد ستمبر کے آغاز میں ترک فوج ازمیر پہنچی اور ایک گولہ داغے یا ایک گولی چلائے بغیر شہر پر قابض ہو گئی، جہاں اب کوئی یونانی نہیں تھا۔

یونانی افواج ”تراقیا“ سے بھی نکل گئیں اور انہوں نے بہت جلد انقرہ حکومت سے جنگ بندی کا معاہدہ کرلیا جس کے صرف پانچ دن بعد استنبول پر قابض برطانوی افسران واہلکاروں نے خلیفہ وحید الدین کو معزول کر دیا۔ [1]

اس کارروائی میں کمال کے حامی پیش پیش شامل تھے۔ خلیفہ وحید الدین کو گرفتار کر کے ایک رسمی خلیفہ بنانے کی پیش کش کی گئی مگر اس نے ایک بے اختیار خلافت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر اسے معزول کر دیا گیا۔ [2]

معزول خلیفہ اور اس کے بیٹے کو ایک بحری جہاز میں بٹھا کر جزیرہ مالٹا بھیجنے کے احکام سنا دیے گئے۔ خلیفہ کو تمام مال و دولت سے محروم کر دیا گیا۔ عالم اسلام کا کچھ نہ کچھ اختیارات رکھنے والا یہ آخری خلیفہ اس حال میں استنبول سے نکلا کہ اس کے پاس ضروری سامان کا صرف ایک صندوق تھا جسے ایک نوکر اٹھائے ہوئے تھا۔ [3]

قرضِ نگاہِ یار ادا کر چکے ہیں ہم
سب کچھ نثارِ راہِ وفا کر چکے ہیں ہم
کچھ امتحانِ دستِ جفا کر چکے ہیں ہم
قاتل کی دسترس کا پتا کر چکے ہیں ہم [4]

◆◆◆

---

① التاریخ الاسلامی للدکتور محمود شاکر: ۱۷/۳۳تا۳۷

قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہی دنوں (فروری ۱۹۲۲ء) میں ہندوستان میں گاندھی جی نے ایک معمولی واقعے کو بنیاد بنا کر انگریزوں کے خلاف چلائی گئی تحریک عدم تعاون اچانک ختم کر دی۔ اس وقت ہندو مسلمان دونوں اس تحریک میں مشترکہ طور پر شامل تھے جس میں مسلمانوں کا سب سے بڑا ہدف خلافت کو باقی رکھنا تھا اسی لیے وہ ساتھ ساتھ تحریک خلافت بھی چلا رہے تھے مگر ہندو اکثریت کے بیٹھ جانے کے سبب مسلمانوں کی تحریک خلافت بھی ضائع ہو گئی اور یوں برطانیہ پر خلافت کو باقی رکھنے کے متعلق بہت بڑا دباؤ ختم ہو گیا۔

② الدولۃ العثمانیۃ فی التاریخ الاسلامی الحدیث از اسماعیل یاغی: ص ۲۳۰

③ التاریخ الاسلامی لدکتور محمود شاکر: ۱۷/۳۷

④ فیض احمد فیض

آخری خلیفہ۔ عبدالمجید ثانی اور سقوطِ خلافت

۱۳۴۰ھ تا ۱۳۴۲ھ
(۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۴ء)

۱۷ نومبر ۱۹۲۲ء (۲۸ صفر ۱۳۴۱ھ) کو وحید الدین کی جگہ اس کے چچازاد بھائی عبدالمجید ثانی بن عبدالعزیز کو اس عہد و پیمان کے ساتھ مسندِ خلافت پر بٹھا دیا گیا کہ وہ صرف علامتی خلیفہ ہوگا۔

عبدالمجید ثانی کی تخت نشینی کے تین دن بعد لوزان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں صرف انقرہ کے نمائندوں نے شرکت کی کیوں کہ استنبول کی سیاسی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ ①

میثاقِ لوزان۔ ترکوں کی اسلامی شناخت کا خاتمہ:

اس سے قبل یکم نومبر ۱۹۲۲ء (۱۲ صفر ۱۳۴۱ھ) کو مصطفیٰ کمال حکومتِ انقرہ کی خلافت سے علیحدگی کا اعلان کر چکا تھا۔ اگرچہ پارلیمان نے اسے قبول نہیں کیا تھا مگر کمال نے اپنے طور پر یہ خبر نشر کرا دی تھی کہ ممبرانِ پارلیمان نے حکومت اور خلافت میں انفصال کی منظوری دے دی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ خلیفہ کی حیثیت آئندہ محض رسمی ہوگی اور اس کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ کمال نے ایک آمر کا کردار ادا کرتے ہوئے ممبرانِ پارلیمان کو دھمکی دی کہ اگر کسی نے اس اعلان سے اختلاف ظاہر کیا تو اسے قتل کرا دیا جائے گا۔ ②

اسی بناء پر نئے خلیفہ عبدالمجید ثانی کے پاس کوئی اختیار نہیں تھا۔ یہ صورتحال عالمی طاقتوں کے لیے نہایت مسرت کا باعث تھی، اس لیے خلافت کے بے اختیار ہونے کے صرف تین دن بعد ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء (یکم ربیع الآخر ۱۳۴۱ھ) کو انہوں نے لوزان کانفرنس طلب کر لی۔ بظاہر اس کا مقصد معاہدۂ سیورے پر نظرِ ثانی کرنا تھا مگر اصل ہدف ترکی کی ''اسلامیت'' کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس معاہدے میں خلیفہ کا کوئی کردار سرے سے نہیں تھا۔ دراصل خلیفہ کو بے اختیار اسی لیے بنایا گیا تھا تاکہ ترکی کو خودکشی کی دعوت دیتے وقت، اسلام پسندی کی کوئی رمق اس مکروہ سازش کی تکمیل میں رکاوٹ نہ بننے پائے۔

---

① الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث از اسماعيل ياغی: ص ۲۳۰

② الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث از اسماعيل ياغی: ص ۲۳۰؛ التاريخ الاسلامي از محمود شاكر: ۱۷/۳۴

لوزان کانفرنس، اتنی اہم تھی کہ اس میں برطانیہ کے علاوہ، فرانس، اٹلی، امریکا، یونان اور جاپان کے نمائندے بھی شریک تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ سے تعلق رکھنے والے دو غدار یہودی: ماتھر سالم اور عمانوئیل قرہ صو (فری میسنری گرینڈ ماسٹر) بھی موجود تھے۔ اختیارات برطانیہ کے ہاتھ میں تھے۔ باقی سب تماشائی اور حمایتی تھے۔

اس کانفرنس میں برطانوی وزیرِ خارجہ لارڈ کرزن نے ترکی کو خود مختار ملک کی حیثیت دینے اور استنبول سے اتحادی افواج کے انخلاء کے لیے درج ذیل چار شرائط پیش کیں:

❶ ترکی کا اسلام سے تعلق قطع کر کے اسے سیکولر مملکت بنا دیا جائے۔

❷ خلافت اسلامیہ کو بالکل ختم کر دیا جائے۔

❸ خلیفہ اور خلافت کے مددگاروں کو ترکی سے نکال دیا جائے۔ خلیفہ کا مالی احتساب کر کے اس پر تاوان عائد کیا جائے۔

❹ ترکی، عثمانیوں کے دور کا شریعت اسلامیہ پر مبنی دستور ختم کر کے ایک جدید شہری دستور وضع کرے۔[1]

برطانوی وزیرِ خارجہ کی پیش کردہ یہ شرائط، مغربی طاقتوں کے اس مشترکہ ایجنڈے کی تکمیل کے لیے تھیں جس کا مقصد ترکی کا اسلامی تشخص ختم کرنا تھا۔ یہ محض کوئی وقتی ضد نہ تھی بلکہ صلیبی دنیا اس ہدف کو سامنے رکھ کر صدیوں سے عالم اسلام پر جنگیں مسلط کر رہی تھی۔ نصرانی چاہے، روس اور یونان کے آرتھوڈکس ہوں یا برطانیہ، فرانس اور امریکا کے کیتھولک، ان کی اصل دشمنی اسلام سے تھی۔ اپنے باہمی تنازعات کے باوجود وہ اسلام کو مٹانے کے لیے ایک ذہن رکھتے تھے۔ جب تک خلافتِ اسلامیہ توانا تھی، وہ اس مذموم خواہش کو پورا نہیں کر سکتے تھے مگر اب وقت کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی، اس لیے انہوں نے ترک قیادت کو مجبور کرنے کی کوشش کی کہ وہ خلافت سمیت اسلام سے وابستہ ہر علامت سے دست بردار ہو جائیں۔

لوزان جانے والا ترک وفد عصمت انونو کی قیادت میں تھا، جس میں کسی حد تک اسلام پسندی کا عنصر باقی تھا، اس لیے یہ وفد مطالبات قبول کیے بغیر واپس آ گیا۔ پارلیمان نے بھی ان شرائط پر صلح سے انکار کر دیا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ جدت پسند ترک مسلمان بھی اتنے گئے گزرے نہیں تھے کہ اسلام سے بغاوت کے لیے تیار ہوتے۔ اسی لیے وہ خلافت کے خاتمے اور لادینی حکومت کے قیام پر راضی نہ ہوئے۔

مگر مصطفیٰ کمال پرلے درجے کا سیکولر تھا اور اسلامی شعائر و احکام سے اسے کوئی مطلب نہ تھا۔ اسے پارلیمان کی مخالفت کا بھی ڈر نہیں تھا کیوں کہ وہ فوجی طاقت کے ذریعے ہر کسی کو دبانے کی طاقت رکھتا تھا۔ اسے شہ دینے میں یہودی زعماء کا بھی اہم کردار تھا جن میں سے ایک استنبول کا حاخام (فری میسنری سربراہ) حاییم ناعوم تھا۔ دوسرا ماتھر سالم تھا جس کے پاس اٹلی اور ترکی کی دوہری شہریت تھی اور وہ سلانیک کے عثمانی بینک کا نگران تھا۔

---

[1] صحوة الرجل المريض: ص ۲۶۸؛ الدولة العثمانية عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۴۷۴

عصمت انونو کے وفد کی ناکام واپسی کے بعد یہ یہودی زعماء انقرہ پہنچے۔ ان کی سرگرمیاں خفیہ رہیں، اتنا معلوم ہے کہ وہ وفد کے ارکان سے ملتے رہے۔ اس کے بعد ترکی اور اتحادیوں کے وفود کو دوبارہ لوزان میں جمع ہونے کی دعوت دی گئی۔ گویا اندرونِ خانہ سارے معاملات طے کر لیے گئے۔ اب لوزان بلا کر صرف دستخط کرانا باقی تھا۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۲۳ء (۲۰ صفر ۱۳۴۲ھ) کو انقرہ میں مصطفیٰ کمال نے پارلیمان کا اجلاس بلایا جس میں ۱۸۵ ارکان کی حمایت سے وہ ملک کا سربراہ بن گیا۔ اسی مجلس میں خلافت کے خاتمے اور ملک کو جمہوریہ قرار دینے کا بل بھی پاس کر لیا گیا۔ (اگرچہ اس کی قانونی توثیق بعد میں ہوئی۔) اس کے صرف دو دن بعد یکم نومبر ۱۹۲۳ء (۲۲ صفر ۱۳۴۲ھ) کو معاہدۂ لوزان پر دستخط کر دیے گئے۔ اس معاہدے کے مطابق ترکی کو زمین تو واپس مل گئی جس پر آج کا ترکی مشتمل ہے، مگر ترکی کی روح ختم ہو گئی اور اس کی اسلامی شناخت مٹ گئی۔[1]

ہے ظلم بہت عام ترا، پھر بھی ستم گر!
مخصوص یہ اندازِ جفا میرے لیے ہے [2]

معاہدۂ لوزان کے بعد:

معاہدۂ لوزان کے بعد ترکی میں درج ذیل اہم تبدیلیاں آئیں:

1. مغربی ممالک کی افواج استنبول سے نکل گئیں اور ان کی جگہ ترک افواج وہاں تعینات ہو گئیں۔
2. استنبول کی جگہ انقرہ کو دارالحکومت بنا دیا گیا۔
3. مصطفیٰ کمال کی سربراہی میں ترکی کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔
4. عصمت انونو کو ترکی کا پہلا وزیرِ اعظم بنا دیا گیا۔
5. ۳ مارچ ۱۹۲۴ء (۲۷ رجب ۱۳۴۲ھ) کو خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔
6. اس کے فوراً بعد آخری خلیفہ عبدالمجید ثانی کو ملک بدر کر دیا گیا۔
7. وزارتِ اوقاف ختم کر دی گئی۔ عثمانی خلفاء کی جاری کردہ تمام اوقاف حکومتی تحویل میں لے لی گئیں۔
8. مصطفیٰ کمال نے مطلق العنانی اور بے دینی کی انتہا کرتے ہوئے اسلامی قانون کو معطل کر دیا۔
9. عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی حروف کو رائج کر دیا۔
10. ہجری تقویم کی جگہ عیسوی تقویم جاری کر دی۔
11. عورتوں کے لیے حجاب غیر قانونی قرار پایا اور بے پردگی لازمی۔
12. مشرقی لباس ممنوع اور مغربی لباس کو لازم کر دیا گیا۔ اس سے علماء اور ائمہ مساجد بھی مستثنیٰ نہیں تھے۔

---

[1] التاریخ الاسلامی از محمود شاکر: ۲۰۷/۱۷/۳؛ الدولۃ العثمانیۃ فی التاریخ الاسلامی الحدیث از اسماعیل یاغی، ص ۲۳۱

[2] جوہر

⑬ شیخ الاسلام کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔

⑭ دینی مدارس کو جدید اسکولوں اور کالجوں کی شکل دے دی گئی۔

⑮ خانقاہیں بند کر دی گئیں اور سلاسلِ صوفیہ کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔

⑯ مساجد کی تعداد محدود کر دی گئی، ان میں سرکاری ملازمین کو امام مقرر کر دیا گیا۔

⑰ جامع مسجد آیا صوفیا کو عجائب گھر بنا دیا گیا۔

⑱ جامع مسجد سلطان محمد فاتح کو گودام میں تبدیل کر دیا گیا۔

⑲ اذان کے الفاظ ترکی میں کہنا لازم کر دیا گیا۔

⑳ ۱۹۲۸ء میں دستور کے وہ الفاظ بھی حذف کر دیے گئے جو اسلام کو ملک کا سرکاری دین قرار دیتے تھے۔

㉑ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ طلاق کے لیے حکومت کی اجازت ضروری قرار دی گئی۔

مصطفی کمال کے ان اقدامات سے تنگ آ کر کردستان کے لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے سلطان عبدالحمید ثانی کے فرزند سلیم خان کو خلیفہ بنانے کا اعلان کر دیا مگر مصطفی کمال نے پوری قوت سے اس تحریک کو کچل ڈالا اور اس کے قائدین کو قتل کرا دیا۔ مصطفی کمال ۱۹۳۸ء میں فوت ہوا۔ اس کی جگہ وزیر اعظم عصمت انونو نے ملک کی سربراہی کی ذمہ داری سنبھالی۔[1] قصہ مختصر کہ مغربی طاقتوں کی خواہش کے عین مطابق خلافتِ اسلامیہ کا خاتمہ ہو گیا اور ترکی اپنی اسلامی پہچان سے محروم ہو کر ایک سیکولر اور مغرب زدہ ملک بن گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ مصطفی کمال کے ہاتھوں خلافت کے خاتمے اور اسلامی شعائر کے قتل سے بھی دُنیائے اسلام کی آنکھیں نہ کھل سکیں۔ عوام تو عوام اکثر خواص بھی حقائق سے لاعلم تھے۔ وہ ذرائع ابلاغ سے مسحور ہو کر سالہا سال مصطفی کمال کی شان میں ترانے پڑھتے رہے۔[2] تاہم جو اہلِ نظر تلخ حقائق سے واقف تھے، وہ مصطفی کمال پر تنقید کرتے رہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے کہا:

---

① الدولة العثمانية في التاريخ الاسلامي الحديث از اسماعيل ياغي: ص ۲۳۱ تا ۲۳۳

② چنانچہ ۱۹۳۸ء میں مولانا ظفر علی خان نے مصطفی کمال کی وفات پر ظفر بے کو عنوان دیا "اتاترک مصطفی کمال نور اللہ مرقدہٗ" اور مرثیے میں کہا:

دُنیا سے وہ مجاہدِ اعظم گزر گیا ۔۔۔ ڈھونڈے سے بھی ملے گی نہ جس کی تمھیں مثال
ملت کی مشکلات کو آسان کر دیا ۔۔۔ اس کی عزیمتوں نے بتائید ذوالجلال
گزرے تھے جس کو رستے ہوئے تین سو برس ۔۔۔ اس زخم کے لیے بنا وہ وہی اندمال
قائم کمال کر کے چلا جس نظام کو ۔۔۔ اے رب کعبہ اب نہ ہو شرمندۂ زوال
(چمنستان، ص ۳۰۶)

اسی طرح مصطفی کمال پاشا کی موت کے "سانحے" پر جمعیت علمائے ہند کے اجلاس میں یوں اظہارِ تعزیت کیا گیا:

"جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاس مجاہدِ اعظم، غازی مصطفی کمال پاشا جو ترکی کے استخلاص اور استقلال تام کی روح رواں تھے، کی وفات حسرت آیات پر دلی صدمے کا اظہار کرتا ہے۔ ان کی وفات سے ملت اسلامیہ کا ایک مفکرِ اعظم اور مجاہدِ اکبر مسلمانوں سے جدا ہو گیا۔ خدا تعالیٰ غازی موصوف کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ملت ترکیہ کو احیائے قوائے ملت میں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔" (خطبات جمعیت علمائے ہند، ص ۹۳۲)

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا ...... سادگی اپنوں کی دیکھ، غیروں کی عیاری بھی دیکھ

شاعر احمد شوقی جو پہلے مصطفیٰ کمال کو صلاح الدین ایوبی کا ہمسر کہتا تھا، خلافت کے لیے یہ مرثیہ کہنے پر مجبور ہوا:

ضَجَّتْ عَلَيْكَ مَآذِنٌ وَمَنَابِرٌ ...... وَبَكَتْ عَلَيْكَ مَمَالِكٌ وَنَوَاحُ

''تجھ پر مساجد کے مینار اور منبر نوحہ کناں ہیں ...... تجھ پر یہ ممالک اور ان کے اطراف واکناف گریہ زار ہیں۔''

اَلْهِنْدُ وَالِهَةٌ وَمِصْرُ حَزِيْنَةٌ ...... تَبْكِيْ عَلَيْكَ بِمَدْمَعٍ سَحَّاحِ

''ہندوستان بے قرار ہے، اور مصر غمگین ...... یہ سب تجھ پر آنسو بہا رہے ہیں جو رکنے والے نہیں۔''

وَالشَّامُ تَسْأَلُ وَالْعِرَاقُ وَفَارِسٌ ...... اَمَحَا مِنَ الْأَرْضِ الْخِلَافَةَ مَاحِ

''شام پوچھ رہا ہے اور عراق وفارس بھی ...... کیا کسی مٹانے والے نے واقعی زمین سے خلافت کو مٹا دیا ہے۔''

يَا لَلرِّجَالِ لِحُرَّةٍ مَوْؤُدَةٍ ...... قُتِلَتْ بِغَيْرِ جَرِيْرَةٍ وَجُنَاحِ

''لوگو! تعجب ہے اس شریف اور زندہ در گور ہستی پر ...... جو کسی جرم اور گناہ کے بغیر قتل کر دی گئی ہے۔''[1]

✦✦✦

ترکوں کے ساتھ یہ جو کچھ ہوا، یہ انہی کے اعمال کا پھل تھا۔ انہیں سلطان عبدالحمید ثانی اور ان کے اجداد کی خلافت ایک قید محسوس ہونے لگی تھی اور وہ اس ''دورِ غلامی'' سے نجات پا کر اہلِ یورپ جیسی ''آزادی'' چاہتے تھے۔ ہاں! وہ آزادی انہیں جمعیت اتحاد وترقی اور کمال ازم کے ہاتھوں مل ہی گئی۔ مگر یہ ''آزادی'' کیا تھی اور وہ ''غلامی'' کیسی تھی؟

سلطان عبدالحمید ثانی کے ''دورِ غلامی'' میں تین براعظموں میں مسلم، نصرانی اور یہودیوں سمیت ہر مذہب کے لوگ اپنی مذہبی رسومات میں آزاد تھے۔ اب ''دورِ آزادی'' میں خود ترک اپنی اذان اور نماز میں بھی آزاد نہ تھے۔

''دورِ غلامی'' میں پریس بالکل آزاد تھا اور نہ صرف سلطان عبدالحمید کی سیاست بلکہ ان کی شخصیت پر بھی مسلسل حملے ہوتے تھے، حتیٰ کہ آئے دن ان کے کارٹون شایع کیے جاتے تھے جنہیں دیکھ کر جوانانِ ترک کو تسکین ملتی تھی۔

مگر اب ''دورِ آزادی'' میں مصطفیٰ کمال اور کمال ازم کے خلاف ایک سطر شایع نہیں ہو سکتی تھی۔ پریس سخت ترین سنسر کی زد میں تھا۔ زبانوں پر قفل لگا دیے گئے تھے اور تصویر کا دوسرا رُخ دکھانے والے پابندِ سلاسل تھے۔

''دورِ غلامی'' میں ہر قسم کے تعلیمی ادارے بالکل آزاد تھے۔ چاہے وہ دینی تعلیم ہو یا عصری۔ مسلمانوں کے ہوں یا غیر مسلموں کے، ہر قسم کی تعلیم کے دروازے کھلے تھے۔ مگر اب ''دورِ آزادی'' میں ترک مسلمانوں کے لیے مذہبی تعلیم تک اجنبی بنا دی گئی تھی۔ بلاشبہ مصطفیٰ کمال کی حکومت ایک تازیانہ اور طمانچہ تھی جسے سہے بغیر شاید ترک مسلمانوں کو اسلام اور خلافت کی قدر سمجھ نہ آتی۔ مقامِ شکر ہے کہ اس طمانچے نے ترکوں کا رُخ دوبارہ اسلام کی طرف پھیر دیا۔

---

[1] الدولة العثمانية عوامل النهوض واسباب السقوط از الصلابی: ص ۴۷۳

فہرست ترکانِ عثمان

نمبر	حکمران	حکومت	کردار	خاص بات
		امیر کے لقب سے حکمرانی کرنے والے		
۱	عثمان خان بن اور خان	۶۸۷ھ تا ۷۲۶ھ (۱۲۹۹ء تا ۱۳۲۶ء)	نیک سیرت	بانی سلطنت
۲	اور خان بن عثمان خان	۷۲۶ھ تا ۷۶۱ھ (۱۳۲۶ء تا ۱۳۶۰ء)	نیک سیرت	سلطنت کو استحکام بخشا
۳	مراد خان اوّل بن اور خان	۷۶۱ھ تا ۷۹۱ھ (۱۳۶۰ء تا ۱۳۸۹ء)	نیک اور بہادر	سلطنت کو وسعت دی
۴	بایزید یلدرم بن مراد اوّل	۷۹۱ھ تا ۸۰۵ھ (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۳ء)	عیش پسند، بہادر، تیز مزاج	سلطنت کو وسیع کیا مگر تیمور سے شکست کھا کر سلطنت کھودی
		سلطان کے لقب سے حکمرانی کرنے والے		
۵	محمد چلبی بن بایزید یلدرم	۸۱۶ھ تا ۸۲۴ھ (۱۴۰۳ء تا ۱۴۲۱ء)	متوسط۔ رفاہی کاموں کا شوقین	بھائیوں سے خانہ جنگی۔ سلطنت کی از سر نو شیرازہ بندی
۶	مراد خان ثانی بن محمد چلبی	۸۲۴ھ تا ۸۵۵ھ (۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء)	نہایت نیک سیرت	سلطنت کا از سر نو استحکام
۷	محمد خان فاتح بن مراد ثانی	۸۵۵ھ تا ۸۸۶ھ (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء)	نیک سیرت	قسطنطنیہ کی فتح
۸	بایزید ثانی بن محمد فاتح	۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ (۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء)	نیک سیرت	انحطاط کے آثار، بادشاہ اپنے بیٹے سلیم کے حق میں مستعفی

خلافتِ عثمانیہ۔ دورِ عروج

۹	سلیم اوّل بن بایزید ثانی	۹۱۸ھ تا ۹۲۶ھ (۱۵۱۲ء تا ۱۵۲۰ء)	سخت گیر۔ غیر متشرع	آلِ عثمان کا پہلا خلیفہ، مصر کی فتح، صفوی سلطنت سے جنگ
۱۰	سلیمان قانونی بن سلیم اوّل	۹۲۶ھ تا ۹۷۳ھ (۱۵۱۲ء تا ۱۵۶۶ء)	نیک سیرت۔ سخت گیر	دورِ عروج، اسپین سے ٹکر، بحری فتوحات،
۱۱	سلیم ثانی بن سلیمان قانونی	۹۷۳ھ تا ۹۸۲ھ (۱۵۶۶ء تا ۱۵۷۴ء)	دینی اور سیاسی لحاظ سے کمزور۔	عثمانی امراء میں مے نوشی عام ہوئی۔ آسٹریا سے صلح

خلافتِ عثمانیہ۔ دورِ زوال

۱۲	مراد ثالث بن سلیم ثانی	۹۸۳ھ تا ۱۰۰۳ھ (۱۵۷۴ء تا ۱۵۹۵ء)	نیک سیرت۔ کمزور	روس کے سرحدی علاقوں کی فتح
۱۳	محمد ثالث بن مراد ثالث	۱۰۰۳ھ تا ۱۰۱۲ھ (۱۵۹۵ء تا ۱۶۰۳ء)	کمزور	استنبول میں بغاوت
۱۴	احمد خان اوّل بن محمد ثالث	۱۰۱۲ھ تا ۱۰۲۶ھ (۱۶۰۳ء تا ۱۶۱۷ء)	ذاتی طور پر نیک سیرت مگر کمزور	تمباکو نوشی عام ہوئی۔ ایران سے شکست
۱۵	مصطفیٰ خان اوّل بن محمد ثالث	۱۰۲۶ھ۔ چند ماہ (۱۶۱۷ء تا ۱۶۱۸ء)	عیش پسند، نااہل	ینی چری کا اقتدار
۱۶	عثمان خان ثانی بن محمد ثالث	۱۰۲۶ھ تا ۱۰۳۱ھ (۱۶۱۸ء تا ۱۶۲۲ء)	قابل مگر غیر متشرع	ہنگاموں کا دور، خلیفہ کو معزول کر کے قتل کر دیا گیا۔
	مصطفیٰ اوّل، دوبارہ	۱۰۳۱ھ تا ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۲ء تا ۱۶۲۳ء)		دوبارہ معزول کیا گیا
۱۷	مراد رابع بن احمد اوّل	۱۰۳۲ھ تا ۱۰۳۹ھ (۱۶۲۳ء تا ۱۶۴۰ء)		
۱۸	ابراہیم خان اوّل بن احمد اوّل	۱۰۳۹ھ تا ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۰ء تا ۱۶۴۸ء)	بے اختیار	کریٹ کی فتح، سلطان کو معزول کر کے قتل کر دیا گیا

۱۹	محمد رابع بن ابراہیم اوّل	۱۰۵۸ھ تا ۱۰۹۹ھ (۱۶۴۸ء تا ۱۶۸۷ء)	چالیس سالہ حکومت، مگر بے اختیار	نصف ہنگری آسٹریا کے سپرد، سلطان کو معزول کیا گیا
۲۰	سلیمان خان ثانی بن ابراہیم اوّل	۱۰۹۹ھ تا ۱۱۰۲ھ (۱۶۸۷ء تا ۱۶۹۱ء)	بے اختیار	
۲۱	احمد ثانی بن ابراہیم اوّل	۱۱۰۲ھ تا ۱۱۰۶ھ (۱۶۹۱ء تا ۱۶۹۵ء)	بے اختیار	
۲۲	مصطفیٰ ثانی بن محمد رابع	۱۱۰۶ھ تا ۱۱۱۵ھ (۱۶۹۵ء تا ۱۷۰۳ء)	بے اختیار	ترکی ہنگری سے محروم
۲۳	احمد ثالث بن محمد رابع	۱۱۱۵ھ تا ۱۱۴۳ھ (۱۷۰۳ء تا ۱۷۳۰ء)	کمزور	سربیا ہاتھ سے نکل گیا۔

خلافتِ عثمانیہ۔ جدّت اور جدوجہد کا دور

۲۴	محمود خان اوّل بن مصطفیٰ ثانی	۱۱۴۳ھ تا ۱۱۶۸ھ (۱۷۳۰ء تا ۱۷۵۴ء)	ہوشیار۔ جدت پسند	نادر شاہ درانی سے شکست
۲۵	عثمان ثالث	۱۱۶۸ھ تا ۱۱۷۱ھ (۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۷ء)	نیک سیرت	
۲۶	مصطفیٰ ثالث بن احمد ثالث	۱۱۷۱ھ تا ۱۱۸۷ھ (۱۷۵۷ء تا ۱۷۷۴ء)	نیک سیرت۔ بہادر	مصر میں محمد علی پاشا کی خودمختاری
۲۷	عبدالحمید اوّل بن احمد ثالث	۱۱۸۷ھ تا ۱۲۰۳ھ (۱۷۷۴ء تا ۱۷۸۹ء)	متوسط	روس کا قرم پر قبضہ
۲۸	سلیم ثالث بن مصطفیٰ ثالث	۱۲۰۳ھ تا ۱۲۲۲ھ (۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۷ء)	دور اندیش۔ عادل	مصر پر نپولین کا قبضہ، سلطان کو معزول کیا گیا
۲۹	مصطفیٰ رابع بن عبدالحمید اوّل	۱۲۲۲ھ تا ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۷ء تا ۱۸۰۸ء)	بے اختیار	سلطنت کو وسعت دی

۳۰	محمود ثانی بن عبدالحمید اول	۱۲۲۳ھ تا ۱۲۵۵ھ (۱۸۰۸ء تا ۱۸۳۹ء)	اصلاح کے لیے کوشاں	سعودی حکومت کا سقوط۔ ینی چری کا خاتمہ۔ فرانس کا الجزائر پر قبضہ۔ محمد علی پاشا کا شام پر حملہ
۳۱	عبدالمجید اول بن محمود ثانی	۱۲۵۵ھ تا ۱۲۷۷ھ (۱۸۳۹ء تا ۱۸۶۱ء)	متوسط	محمد علی پاشا کو شام میں شکست
۳۲	عبدالعزیز بن محمود ثانی	۱۲۷۷ھ تا ۱۲۹۳ھ (۱۸۶۱ء تا ۱۸۷۶ء)	متوسط	نہر سویز کی کھدائی
۳۳	مراد خامس بن عبدالمجید اول	۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء)	بے ہوش، بے اختیار	جنون کے باعث معزول
۳۴	عبدالحمید ثانی بن عبدالمجید اول	۱۲۹۳ھ تا ۱۳۲۷ھ (۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء)	نیک سیرت اور باہمت سلطان،	حجاز ریلوے کا قیام، فلسطین کو یہود کے حوالے کرنے سے انکار۔ بغاوت اور معزولی
		ترقی پسندوں کے تسلط کا دور		
۳۵	محمد خامس، رشاد بن عبدالمجید اول	۱۳۲۷ھ تا ۱۳۳۶ھ (۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۸ء)	کمزور	عام انتخابات، جنگ بلقان، پہلی عالمی جنگ
۳۶	محمد سادس، وحید الدین بن مراد خامس	۱۳۳۶ھ تا ۱۳۴۰ھ (۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۲ء)	کمزور	ترکی کے حصے بخرے، مصطفی کمال پاشا کا عروج
۳۷	عبدالمجید ثانی بن عبدالعزیز	۱۳۴۰ھ تا ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۴ء)	برائے نام خلیفہ	خلافت کا خاتمہ

سلطنتِ عثمانیہ کے ضعف اور سقوط کے اسباب

سلطنت عثمانیہ کا سقوط عالم اسلام کی تاریخ کے الم ناک ترین حوادث میں سے ایک ہے۔ تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد اور نصرانیوں کے ہاتھوں اسپین کی تباہی کی بہ نسبت اس کا زخم کہیں زیادہ گہرا ہے۔ بغداد میں خلافتِ عباسیہ ختم ہوئی تو مصر اسلام کا مرکز وحدت بن گیا۔ اسپین سے مسلمانوں کا پرچم اترا تب بھی عالمی سطح پر مسلمان مضبوط بلکہ بالادست تھے۔ مگر آل عثمان سے مسندِ حکومت چھن جانے کے بعد مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کا بالکل خاتمہ ہو گیا اور یہ خلاء آج لگ بھگ ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی پر نہیں ہوا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے سقوط اور ضعف کے متعدد اسباب تھے جو اس گزشتہ اوراق کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والے قارئین سے یقیناً مخفی نہیں۔ پھر بھی اہم ترین اسباب کو ذہن میں تازہ کرنے کے لیے یہاں ایک ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

① ایمانی انحطاط اور اسلامی تعلیمات سے اعراض:

ہمارا ایمان ہے کہ کسی بھی فرد یا قوم کی دنیوی واخروی کامیابی ایمان کی پختگی اور اسلامی تعلیمات پر کاربند رہنے میں ہے۔ یہ اصل الاصول ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ ہو یا کوئی اور حکومت، سب کی ترقی کے پیچھے، اس اصول کا لحاظ اور سب کے زوال کے پس پردہ اس اصول سے بے اعتنائی کارفرما دکھائی دے گی۔

② روحِ جہاد کی کمزوری:

جہاد فی سبیل اللہ عثمانیوں کا سرمایہ امتیاز تھا اور اسی جذبے سے سرشار ہو کر عثمانی سلاطین خود جہاد کے لیے نکلتے اور بے مثال فتوحات حاصل کرتے رہے۔ مگر پھر سلاطین خود آرام پسند ہو گئے۔ انہوں نے خود جہادی مہمات کی قیادت چھوڑ دی اور یہ ذمہ داری صدر اعظم کے ذمے ڈال دی گئی۔ اس کے باعث افواج میں پہلے جیسا جوش وخروش باقی نہ رہا اور عثمانیوں کی فتوحات کا دائرہ آسٹریا تک پہنچ کر رک گیا۔ اس کے بعد ان کی رجعت شروع ہوئی۔ جس نے انہیں کمزور کرتے کرتے بالکل ختم کر ڈالا۔

③ طاقت کی سیاست:

اسلام نے امور سیاست کو شورائیت کے تابع کیا ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ میں شورائی سیاست کا ماحول کم اور عسکری سیاست کا ماحول زیادہ تھا۔ خلفاء، شہزادے، امرائے دربار، افسران اور ینی چری سالار، سب فوجی درسگاہوں میں تعلیم وتربیت حاصل کرتے تھے۔ پیشہ ور فوجی ہی ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ ترین مناصب تک پہنچا کرتے تھے۔

اگر چہ ان کی تربیت اسلامی تعلیمات کے مطابق مجاہدانہ انداز میں ہوتی تھی مگر اس طرح ، انسان کا ذہن صرف حربی امور میں طاق ہو پاتا ہے ، اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ معدودے چند کو مستثنیٰ کرکے ، اکثریت کا ذہن محدود ہو جاتا ہے ۔ ہر معاملے کا انہیں ایک ہی حل سمجھ آتا ہے ، وہ یہ کہ طاقت استعمال کی جائے ، بہادری کا مظاہرہ کیا جائے اور رکاوٹ کو تہس نہس کر دیا جائے ۔ وسعتِ نگاہی کا وہ جوہر دب جاتا ہے جو سیاست کے لیے ضروری ہے ۔

ایک معمولی فوجی یا عام مجاہد کو اس ذہنیت میں معذور سمجھا جا سکتا ہے اور اس میں کوئی اجتماعی نقصان بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ اسے صرف اوپر کے احکام پر عمل کرنا ہوتا ہے ۔ مگر ایک قائد اور حکمران کا ذہن بھی ایسا ہی محدود ہو تو قوم کی تباہی کا راستہ کھل جاتا ہے ۔ کیوں کہ اس ذہنیت کے ساتھ اگر اسلامی عدل وانصاف کے تقاضے اور حقوق العباد ملحوظ نہ ہوں تو انسان ، محض قاتل اور خونی بن کر رہ جاتا ہے ۔

سلطنتِ عثمانیہ کے دورِ آغاز سے دورِ عروج تک ایمان مضبوط تھا اور شرعی حدود کا خیال رکھا جاتا تھا ، اس لیے فوجی ذہنیت کا اثر بھی ایک حد میں رہا ۔ مگر جوں ہی ایمانی انحطاط شروع ہوا ، عسکریت پسندانہ ذہن کے نقصانات تیزی سے سامنے آنا شروع ہو گئے ۔ طاقت کے ذریعے تخت تک پہنچنا ہی شہزادوں کا مقصدِ حیات بن گیا ۔ اسی بناء پر سلاطین کے جانشینوں میں جنگیں ہوئیں ، بغاوت کے شبہے بلکہ وہم کی بناء پر بھی سگے بھائیوں کے قتل کی قبیح رسم جاری ہوئی ۔ جس سے سلطنت بدنام بھی ہوئی اور کمزور بھی ۔

④ ینی چری فوج کا بگاڑ :

ینی چری فوج میں لڑکوں کو فوجی تربیت دے کر بادشاہ کا خاص جاں نثار بنایا جاتا تھا ۔ جب تک اس کی اسلامی تربیت پر توجہ دی جاتی رہی ، یہ فوج ایک مجاہدانہ رنگ میں بڑی بڑی فتوحات کا باعث بنی ۔ مگر جب ایمانی روح رخصت ہوئی ، تو جہاد کی جگہ صرف عسکریت پسندی رہ گئی ۔ اپنی طاقت کے بلاوجہ مظاہرے ینی چری سپاہ کا مقصد بن گئے ، جس نے پایۂ تخت میں ایک طویل عرصے تک اودھم مچائے رکھا ۔ عثمانی سلاطین ان کے یرغمال بن گئے اور ان میں سے کئی انہی ینی چری افسران کے ہاتھوں قتل ہوئے ۔

ینی چری سپاہ ہمیشہ سلطان کے ساتھ مہمات پر جاتی تھی ۔ جب انہیں بالادستی مل گئی تو انہوں نے مہمات پر نہ جانے کا یہ بہانہ گھڑ لیا کہ جب تک سلطان جنگ کے لیے نہیں جائے گا ، ہم بھی نہیں جائیں گے ۔ اس کے بعد ینی چری فوج استنبول کی چھاؤنی میں مفت کی تنخواہیں پاتی رہی ۔ اس فارغ البالی نے عالم اسلام کی اس بہترین فوج کو نہ صرف آرام پسند بلکہ عیاش بنا دیا ۔ سپاہی مے نوشی اور فسق وفجور کے عادی ہو گئے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کی مدد شاملِ حال نہ رہی اور عثمانیوں کو مسلسل شکستیں ہونے لگیں ۔

⑤ شہزادوں کا قتل :

عثمانی سلاطین کی تاریخ میں بھائیوں اور بیٹوں کے قتل کے کئی افسوس ناک واقعات ملتے ہیں ۔ اس بارے میں

کچھ تو پروپیگنڈہ ہے۔ (جس پر ہم آگے الگ عنوان کے تحت روشنی ڈالیں گے۔) اور کچھ حقیقت بھی ہے۔ چنانچہ سلطان مراد ثالث کا پانچ بھائیوں اور سلطان محمد خان ثالث کا اپنے "۱۹" بھائیوں کو محض اس امکان کی بناء پر کہ وہ بھی بغاوت کر سکتے ہیں، قتل کرادینا ثابت ہے۔ اس صورتحال سے چاہے سلطنت شہزادوں کی بغاوتوں کے امکان سے محفوظ ہوگئی مگر اگلے عشروں میں اس کا مضرترین اثر یہ ہوا کہ قابل شہزادوں کا فقدان ہو گیا اور سلطنت نااہلوں کے سپرد ہوگئی۔

⑥ صدور اعظم اور وزراء کے لیے موت اور عمر قید کی سزائیں:

عثمانی سلاطین کے ہاں ہمیں وزراء اور صدور اعظم کو سزائے موت یا عمر قید کی سزائیں دینے کے واقعات بھی جا بجا ملتے ہیں۔ چنانچہ سلیمان عالی شان کے دور میں ابراہیم پاشا اور احمد پاشا، سلطان محمد ثالث کے دور میں فرہاد پاشا، حسن پاشا خادم اور حسن پاشا یمش جی، سلطان احمد اوّل کے دور میں درویش پاشا اور نصوح پاشا، سلطان عثمان ثانی کے دور میں حسین پاشا اور دلاور پاشا، سلطان مصطفیٰ اوّل کے دور میں حسین پاشا ارنودی اور محمد پاشا گرجی، مراد رابع کے دور میں رجب پاشا اور محمد پاشا طباخی، سلطان ابراہیم خان اوّل کے دور میں قرہ مصطفیٰ پاشا اور صالح پاشا قتل کیے گئے۔[1]

بعد کے سلاطین کے دور میں قتل کی جگہ قید و بند کی سزاؤں کے واقعات زیادہ ملتے ہیں۔ اگرچہ ان وزراء میں سے سارے بے قصور نہیں تھے بلکہ بہت سوں کو باغیانہ سرگرمیوں، قبیح کردار، عوام پر مظالم، بدعنوانیوں اور دیگر جرائم کی بناء پر نشان عبرت بنایا گیا تھا۔ مگر ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں ایک اچھے بھلے وزیر کو محض شکایات پر یقین کر کے سزائے موت سنادی گئی۔ چنانچہ اس بے احتیاطی کا نتیجہ یہی نکلا کہ امور سلطنت میں کام کے آدمیوں کا قحط پڑنے لگا۔ نیز قابل امراء صدر اعظم کا منصب سنبھالنے سے گھبرانے لگے کیوں کہ بہت سے صدور کا انجام موت یا عمر قید کی شکل میں ان کے سامنے تھا۔ چنانچہ لائق افراد کی جگہ اب نااہل لوگوں کی کثرت ہونے لگی۔

⑦ اغیار سے معاہدے اور تعلقات:

بیرونی ممالک سے تعلقات، ایک ناگزیر ضرورت ہیں جس کے لیے معاہدے بھی کرنا پڑتے ہیں۔ ان معاہدوں کا مقصد کبھی جلب منفعت ہوتا ہے اور کبھی دفع مضرت۔ یہاں ہم معاہدوں کی ضرورت کا انکار نہیں کر رہے بلکہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اغیار سے تعلقات کے ہر قدم اور معاہدوں کی ہر شق کو بنظر غائر دیکھنا بھالنا بہت ضروری ہے۔ انہیں سطحی نگاہ سے دیکھنا اور وقتی منفعت یا وقتی دفع مضرت سے آگے نہ سوچنا بعض اوقات بھیانک نقصانات کا باعث ہوتا ہے۔ سلطنت عثمانیہ سے بھی بعض مواقع پر ان تعلقات کی حدود و قیود قائم رکھنے میں کوتاہی ہوگئی جس کا ضرر لاحق ہو کر رہا۔ یورپی ممالک سے سلطنت عثمانیہ کے دوستانہ تعلقات کا آغاز سلیمان قانونی کے دور میں ہوا جب سلطان نے اسپین کی طاقت توڑنے کے لیے فرانس کو حلیف بنایا اور وینس سے بھی تجارتی تعلقات قائم کیے۔ نیز ان ممالک کو کھلی

---

[1] جامع الدول از منجم باشی: ص ۳۱۰، ۳۱۲؛ ص ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳؛ ص ۳۹۱، ۳۹۳؛ ص ۴۷۷؛ ص ۳۸۲، ۳۸۳؛ ص ۵۰۹، ۵۱۰؛ ص ۵۲۷، ۵۲۸

مراعات بھی فراہم کیں جن کے باعث انھیں ترکی کے زیرِ دست سمندروں میں جہاز رانی کی پوری اجازت مل گئی۔

سلیمان کو اطمینان تھا کہ ترک غالب قوت ہیں اس لیے ان معاہدوں کو جب چاہے منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے بعد ترکوں کی طاقت کم پڑتی گئی اور یہ معاہدے ان کے گلے پڑ گئے۔ انھی سے فائدہ اٹھا کر معاہدوں میں شامل یورپی طاقتوں نے زبردست تجارتی واقتصادی فوائد اٹھائے اور عسکریت ومعیشت میں مسلمانوں کے برابر آ گئیں۔

بعد کی چند جنگوں میں شکستوں نے عثمانی سلاطین کو ایسے مزید معاہدوں پر مجبور کیا۔ اس طرح نہ صرف سلطنتِ عثمانیہ میں یورپ کا سیاسی واقتصادی اثر ورسوخ بڑھنے لگا بلکہ اس کے پردے میں یورپ کے فکری، تعلیمی اور تہذیبی وثقافتی اثرات بھی ترکوں پر پڑنے لگے۔ رفتہ رفتہ یورپی طاقتوں نے ان مراعات سے فائدہ اٹھا کر ترکی میں صحافت، ادب اور تعلیم کے نام پر ایسے ادارے اور تنظیمیں قائم کر لیں جنھوں نے آگے چل کر علیحدگی پسند لیڈروں کو جنم دیا۔

⑧ عیش پسندی:

فتوحات اور پیداوار کی کثرت نے سلطنتِ عثمانیہ کو جو قابلِ رشک خوشحالی نصیب کی، اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ سلاطین، شہزادے، امراء اور افسران نے دنیا کی لذتوں اور نعمتوں ہی کو مقصد بنا لیا اور انھی میں منہمک ہو گئے۔ ان کے سامنے جینے کا کوئی اعلیٰ مقصد نہ رہا۔

سلیمان قانونی نے اپنے دور تک سخت کوشی، جہادی اسفار، سادگی اور جفاکشی کی روایت کو زندہ رکھا۔ مگر اسی نے ینی چری فوج کا وہ ضابطہ تبدیل کر دیا جس کے تحت اسے صرف سلطان اپنے ساتھ مہمات میں ساتھ لے جا سکتا تھا۔ سلیمان قانونی نے افسران کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ ینی چری کی قیادت کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد نہ صرف سلاطین کا جہاد کے لیے نکلنا بند ہو گیا بلکہ انھیں محل کی آسائشوں اور عیش وتفریح سے لطف اٹھانے کا پورا موقع مل گیا۔ اس تبدیلی نے آرام پسند خلفاء کو جنم دیا جس کا نتیجہ سلطنت کے ضعف کی شکل میں ظاہر ہوا۔

⑨ غیر ملکی خواتین سے رشتے:

شریعت میں یقیناً ایسی نصرانی یا یہودی عورتوں سے نکاح کی اجازت ہے جو اپنے دین پر قائم ہوں مگر اس میں کئی طرح کی احتیاط بہر حال لازم ہے۔ مثلاً عام آدمی کو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کہیں یہ عورتیں اولاد کی بے دینی کا باعث نہ بن جائیں۔ اسی طرح حکمرانوں کو یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ کہیں یہ عورتیں سلطنت پر اثر انداز نہ ہوں، ان کے ذریعے سلطنت کے راز باہر منتقل نہ ہونے لگیں، اور کہیں انھیں کسی غیر ملکی ایجنڈے کے تحت حرم شاہی تک نہ پہنچایا گیا ہو۔

عثمانی سلاطین نے یورپ اور روس کی متعدد نصرانی اور یہودی خواتین سے شادیاں کیں۔ کبھی اس کے پیچھے کوئی سیاسی مصلحت کارفرما ہوتی (مثلاً اقلیتوں سے اظہارِ رواداری یا کسی مملکت سے حلیفانہ تعلقات مضبوط کرنا) اور کبھی ان خواتین کا حسن وجمال ہی شادی کا محرک بن جاتا۔ ایسی بعض خواتین نکاح کے بعد اسلام قبول کر لیتیں اور بعض اپنے آبائی مذہب پر قائم رہتیں۔ سلطان مراد ثانی کی بیوی جو سربیا کے بادشاہ کی بیٹی تھی، آخر تک نصرانی رہی جسے سلطان مراد

کی موت کے بعد سربیا واپس بھیج دیا گیا تھا۔ سلطان محمد فاتح کی ماں بھی نصرانی تھی۔

ایسی خواتین کے روابط اپنی قوم اور برادری سے برقرار رہتے۔ ان میں جو کسی شاہی خاندان کی ہوتی تھیں، ان کا اپنے خاندان کے بادشاہوں اور امراء سے رابطہ رہتا۔ سلطنتِ عثمانیہ میں بھی بڑی تعداد میں نصرانی آباد تھے۔ یہ خواتین طبعی طور پر انہی نصرانی گھرانوں کی خواتین سے زیادہ مانوس ہوتیں۔ یہ تعلقات بعض اوقات بڑی گہری محلاتی سازشوں کے پنپنے کا باعث بنتے تھے۔

ان خواتین کے اثرات اپنی اولاد پر بھی پڑتے تھے۔ وہ انہیں اگر نصرانی نہ بنا سکتیں پھر بھی انہیں مسلم و نصرانی کی تمیز سے بے پروا کرنے کی کوشش ضرور کرتیں اور اسے رواداری یا انسانیت کا سبق باور کراتیں۔ چونکہ وہ نسلاً آدھے ترک اور آدھے یورپی ہوتے، اس لیے ان میں قومی غیرت وحمیت کا مادہ ویسا نہیں ہوتا تھا جس کی قوم کو توقع ہوتی تھی۔

یہ خواتین اس کی بھی پوری کوشش کرتیں کہ خالص ترک اور مسلم نسل کی بجائے، ان کی مخلوط النسل اولاد بادشاہ بنے چاہے وہ قابلیت میں کم ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح محلات میں جو کش مکش شروع ہوتی، وہ بعض اوقات سلطنت میں سیاسی بحران کا باعث بن جاتی تھی۔ اس سلسلے میں سلیمان قانونی کی بیگم خرم کی مثال دیکھ لینا کافی ہے، جس نے اپنے بیٹے سلیم ثانی کو تخت دلوانے کے لیے ولی عہد شہزادہ مصطفیٰ کو قتل کرایا۔

بعض اوقات نصرانی بیگمات کی آرزو پوری نہیں ہوتی تھی اور مخلوط النسل بادشاہ بھی، اپنے باپ کی توجہ اور اساتذہ کی تعلیم وتربیت کی وجہ سے اسلام کا بہترین محافظ ثابت ہوتا۔ جیسا کہ نصرانی ماں کے بیٹے سلطان محمد خان فاتح، کے ہاتھ پر نصرانیت کا سب سے بڑا مرکز قسطنطنیہ فتح ہوا۔

⑩ اعلیٰ مقاصد کا سامنے نہ رہنا:

سلیمان القانونی کے دور میں بنوعثمان اس عروج پر پہنچ گئے تھے کہ ان کے سامنے اب کوئی اور چوٹی نہیں رہی تھی جو ان کی ہمت کو للکارتی۔ قسطنطنیہ فتح کرلیا گیا تھا۔ صفویوں کو سبق دیا جاچکا تھا۔ اسپین کا غرور توڑ دیا گیا تھا۔ ان کا مدمقابل اب کوئی نہ تھا۔ ایسے میں عثمانی سلاطین نے خود کو فارغ سمجھا اور ان مشاغل میں لگ گئے جو فارغ الوقتی کے لیے ہوتے ہیں۔ ان پر کوئی فکر سوار نہ تھی جو انہیں مستقبل کی کسی منصوبہ بندی کے لیے آمادہ کرتی۔

⑪ رقبے کی وسعت، نظام کا جمود:

سلطنتِ عثمانیہ کا رقبہ وسیع ہوتے ہوتے تین براعظموں کے بہت بڑے حصے کو محیط ہو چکا تھا۔ ماضی کے درجنوں ممالک اس کے صوبے بن چکے تھے۔ اتنی بڑی سلطنت کو مستحکم رکھنے کے لیے، نظام حکومت کو بہتر سے بہتر بناتے رہنا ازحد ضروری تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ عالم اسلام کی فقط دیوار نہیں، سیلاب کا مضبوط بند تھی۔ دیوار شکستہ ہونے لگے تو اس کی مرمت اتنی مشکل نہیں ہوتی مگر بند ٹوٹنے لگے تو اسے باقی رکھنا اکثر ناممکن ہو جاتا ہے۔

عثمانیوں نے نظام حکومت کی ترقی کو اسی جگہ روک دیا جہاں تک سلطان سلیمان القانونی نے اسے پہنچایا تھا۔

حالانکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں جدید اصلاحات کی سخت ضرورت تھی۔ نظام کے جمود سے صوبوں اور مرکز کے مابین رخنے پیدا ہونے لگے، نئی ضروریات کی تکمیل کی شکلیں پیدا نہ ہوئیں اور مسائل نے بڑھتے بڑھتے بحرانوں کی شکل اختیار کر لی۔

⑫ بعض خلفاء کی نا اہلی:

سلطنتِ عثمانیہ نے سلیم اوّل کے دور میں خلافت کی باگ ڈور بھی سنبھال لی تھی۔ یوں بنو عثمان نے صرف تین براعظموں کی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کی ذمہ داری سر پر لے لی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ متعدد سلاطین نے اس فریضے کو اچھی طرح نبھایا مگر اتنی بڑی خلافت کا حق ادا کرنے کے لیے حکمران کا غیر معمولی حد تک قابل، متحرک اور مستعد ہونا ضروری تھا۔ ظاہر ہے ایسی اعلیٰ قابلیت، محض وراثت کے ذریعے قائم نہیں رکھی جا سکتی کیوں کہ نسلی جانشینوں میں اہل اور نا اہل ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ خلافتِ عثمانیہ کو جب تک لگاتار قابل حکمران ملے، اس کا سورج نصف النہار پر رہا مگر بیچ میں جونہی چند نا اہل حکمران آئے، اس کا توازن، بگڑنا شروع ہو گیا۔ اس کے بعد کئی اچھے حکمرانوں کی سرتوڑ کوششیں بھی اسے دوبارہ، پہلے کی طرح مضبوط نہ کر سکیں۔

⑬ صلیبی بغض وحسد:

سلطنتِ عثمانیہ کے دوست کم تھے اور دشمن بے شمار۔ دنیائے نصرانیت ویہودیت کا وہ اوّلین ہدف تھی۔ صلیبی استعمار اسے برباد کرنا چاہتا تھا۔ پاپائے روم اور فری میسن حاخام اس کے خلاف ہمیشہ سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ یہودی زعماء خفیہ طور پر اس کے خلاف مستعد رہے جبکہ پوپ کے ایماء پر نصرانی ممالک سلطنتِ عثمانیہ کی سرحدوں پر نبرد آزما رہے۔ امن کے چند مختصر وقفوں کے سوا، ہم اکثر وبیشتر تاریخ کے ان صفحات پر جنگ ہی جنگ لکھی دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے نے سلطنت کو کمزور کیا اور آخر کار صلیبیوں کے بغض وحسد کی آگ اسے ختم کر کے ہی ٹھنڈی ہوئی۔

⑭ علمی وفنی کمزوری:

سلطنتِ عثمانیہ کو یورپ سے برابر کی ٹکر لینے کے لیے جس علمی وفنی مہارت کی ضرورت تھی، اس کی طرف بروقت توجہ نہیں دی گئی۔ سلطان سلیم ثالث کو کچھ تاخیر سے یہ خیال آیا اور اس نے فرانس کی مدد سے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی مگر قدامت پسندی ترکوں کی گھٹی میں اس طرح پڑ چکی تھی کہ وہ اس وقت، اپنی روش بدلنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگلی صدی میں جب سلطان محمود ثانی اور سلطان عبدالمجید اوّل نے جدید علوم وفنون کی طرف توجہ دی، تب تک یورپ بہت آگے نکل چکا تھا اور تلافی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اب مسلمان علوم وفنون میں تقلیدی راستہ اپنانے پر مجبور ہوئے جس نے انہیں نظریاتی وفکری طور پر بھی اپاہج کر دیا۔

⑮ قحط الرجال:

بنو عباس کے زوال اور سقوطِ بغداد سمیت، تنزل کے ہر دور میں اور ہر عظیم حادثے کے بعد ہمیں مسلمانوں کی نشأة

ثانیہ ایسے رجال کار کی مرہون منت دکھائی دیتی ہے جن میں سے کچھ دینی وفکری اعتبار سے مقتدا اور پیشوا تھے اور کچھ سیاسی لحاظ سے۔ ہم تاریخ کے ہر باب میں ایسے مشاہیر کا ذکر کرتے چلے آئے ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ بنو عثمان کا آخری دور، ایسی عبقری شخصیات سے محرومی کا دور تھا۔ دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلنے والی اور مغربی افکار کے سامنے بند باندھنے والی کوئی قد آور شخصیت اس دور میں نہیں ابھری۔ جبکہ مغرب میں یہی دور عظیم مشاہیر کے سامنے آنے کا تھا جنہوں نے قوموں کو (چاہے غلط طور پر) اپنے ساتھ لے لیا اور دنیا میں انقلاب لانے میں کامیابی حاصل کی۔

⑯ ایک ایمانی اور اخلاقی دعوت اور اسلامی تحریک کی کمی:

سلطنتِ عثمانیہ کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے آخری دو صدیوں میں ایک ہمہ وقتی ایمانی، اخلاقی، علمی وفکری اور دعوتی تحریک کی ضرورت تھی۔ اس تحریک کے ذریعے سلطنت کے ان مسلم صوبوں کو آپس میں مربوط و متحد کرنا ممکن تھا جہاں علیحدگی پسندی کے جراثیم پنپ رہے تھے۔ نیز غیر مسلم صوبوں میں بھی اسلام کی دعوت کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا تھا۔ مگر ایسی کوئی تحریک ہمیں اس دور میں دکھائی نہیں دیتی۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے پان اسلام ازم کی تحریک شروع کر کے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی تھی مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

⑰ باغیانہ تحریکیں:

یورپ نے سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف جن باغیانہ تحریکوں کو فروغ دیا، وہ سلطنت کو زوال کی انتہا تک پہنچانے کا بہت بڑا سبب تھیں۔ ان میں بلقان اور آرمینیا کی بغاوتیں سب سے خطرناک تھیں۔ سلاطین کی ساری توجہ اور طاقت انہی سے نمٹنے پر صرف ہوتی رہی اور دیگر انتہائی ضروری امور نظر انداز ہوتے چلے گئے۔

⑱ خفیہ جماعتیں اور تنظیمات:

سلطنت کے آخری چند عشروں میں یورپ کی سرپرستی میں قائم ہونے والی خفیہ جماعتوں نے سلطنت کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیا۔ ان جماعتوں نے جدت پسند ترکوں کو وجود بخشا، قوم پرستی اور وطن پرستی کے جذبات کو فروغ دیا اور انجام کار فوج کو بھی اپنا ہم نوا بنا کر سلطان عبدالحمید ثانی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جو یورپی طاغوت کی راہ میں حائل آخری فردِ فرید تھا۔

⑲ پریس کی آزادی اور اسلامی صحافت کی کمزوری:

سلطنتِ عثمانیہ نے دورِ زوال میں مغربی دنیا سے طے کردہ معاہدوں کے مطابق رفتہ رفتہ پریس کو مکمل آزادی دے دی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر درجنوں اخبارات، رسائل، مجلات اور تصنیفی ادارے تصورِ خلافت کو دلوں سے مٹانے، عثمانیوں کی تاریخ کو مسخ کرنے اور موجودہ سلاطین کی کردار کشی میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے جدت پسندانہ رجحانات اور تقلیدِ مغرب کو قوم کے لیے مرغوب بنا دیا۔ نیز مسلم قومیت کی جگہ وطنیت کا سحر پھونکا اور ترکوں اور عربوں کے درمیان منافرت کی آگ لگائی۔

اس ملحد اور مغرب زدہ پریس کی مقابلے میں فکرِ اسلامی کے محاذ پر اگرچہ متعدد قابل صحافی کام کر رہے تھے مگر اس ہمہ گیر سیلاب کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنتِ عثمانیہ مختلف اور متضاد افکار سے متاثر ہو کر اپنی ذہنی یک جہتی کھو بیٹھی اور دن بدن انتشار اور سقوط کی طرف جانے لگی۔

⑳ عربی کو سرکاری وعلمی زبان نہ بنانا:

سلطنتِ عثمانیہ میں بالعموم ترکی زبان ہی رائج رہی۔ علمی کام بھی اکثر و بیشتر ترکی میں ہی ہوتا رہا۔ عربی کو ثانوی درجے پر رکھا گیا۔ اس بناء پر ترکانِ عثمان اور ان سے متعلقہ اہل علم وفضل کے علمی روابط عالم اسلام سے بہت کم رہے۔ صرف مصر کے ممالیک کے ہاں دو صدیوں میں جو علمی کام ہوا تھا، وہ سلطنتِ عثمانیہ کی چھ صدیوں سے کہیں زیادہ معلوم ہوتا ہے کیوں کہ وہ عربی میں ہے اور صدیوں سے اُمت اس سے مستفید ہو رہی ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ میں معاملہ برعکس رہا۔ سلطان عبدالحمید خان ثانی نے اس صورتحال کا ازالہ کرنے کی کوشش کی مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

آج بھی ترکوں کا اکثر علمی ذخیرہ مخطوطات کی شکل میں اہل علم کی توجہ کا منتظر ہے۔ اس ذخیرے میں حدیث، تفسیر، فقہ خصوصاً فقہ حنفی اور سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ پر نہایت گراں قدر مواد موجود ہے جسے عربی میں منتقل کیا جائے تو ایک پورا کتب خانہ تیار ہو جائے گا۔

㉑ عالمی جنگ میں شرکت:

عالمی جنگ میں شرکت نے سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے پر مہر لگا دی۔ جنگ میں شکست نے سلطنت کے تارو پود بکھیر کر رکھ دیے اور عالمی طاقتوں نے حسب منشاء خلافت کو خود ترکوں کے ہاتھوں ختم کرا دیا۔[①]

یہ کچھ ظاہری اسباب ہیں جو بطورِ عبرت لکھ دیے گئے۔ باقی اسباب کا سارا سلسلہ مسبب الاسباب کی مشیت پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس نے جب تک چاہا، مسلمانوں کو عزت وحکومت دیے رکھی۔ جب اس کی مرضی نہ رہی، سلسلۂ اسباب وحالات ہمارے خلاف ہو گئے اور ہم ثریا سے تحت الثریٰ میں جا پہنچے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ؗ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِیَدِكَ الْخَیْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

''کہہ دیجیے...... اے اللہ! کل بادشاہت کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے بادشاہت عطا فرماتا ہے، اور تو جس سے چاہتا ہے بادشاہت چھین لیتا ہے، اور تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے، اور تیرے ہی ہاتھ میں خیر ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''[②]

◆◆◆

---

① یہ اسبابِ زوال زیادہ تر ''تاریخ الدولۃ العثمانیۃ، النشأۃ والازدھار از سید محمد'' اور ''قراءۃ جدیدۃ فی تاریخ العثمانیین از زکریا سلیمان'' سے ماخوذ ہیں۔ ② سورۃ آل عمران: آیت ۲۶۔

عثمانی سلاطین اور برادر کشی

آج کل کی مغرب زدہ صحافت بنیادی طور پر عثمانی سلاطین کی مخالف ہے اور ان کی تمام خوبیوں کو نظر انداز کر کے فقط اس اَمر پر نگاہ مرکوز رکھتی ہے کہ کس طرح مسلمانوں کو سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف زیادہ سے زیادہ بھڑکایا جاسکتا ہے؟

اس حوالے سے ان سلاطین پر سب سے زیادہ شدت سے جو الزام عائد کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے ہاں بھائیوں کا قتل معمولی بات تھی اور سلطان محمد فاتح نے اسے باقاعدہ ایک قانون کی شکل دے دی تھی جس کے مطابق کوئی بھی بادشاہ اپنے تاج وتخت کو محفوظ بنانے کے لیے شہزادوں کو قتل کراسکتا تھا۔ چنانچہ (دو چار کو مستثنیٰ کر کے) سبھی عثمانی سلاطین اپنے بھائیوں بلکہ بھتیجوں اور بعض اوقات اپنے بیٹوں تک کو بلادریغ قتل کرتے رہے اور خود سلطان محمد فاتح نے بھی اپنے بھائیوں کو حتیٰ کہ ایک شیر خوار بھائی کو بھی اسی قانون کے تحت قتل کرادیا تھا۔

اس مسئلے کی تحقیق یہ ہے کہ:

سلطان محمد فاتح نے اپنے کسی بھائی کو قتل نہیں کرایا تھا۔ اس کے تمام بھائی اس کی تخت نشینی سے قبل وفات پاچکے تھے اور شیر خوار بھائی کے قتل کا قصہ محض من گھڑت ہے۔[1]

رہا سلطان محمد فاتح کا بنایا ہوا قانون تو اس میں کہا گیا تھا:

"اذا تیسرت السلطنة لای ولد من اولادی فیکون مناسبا قتل اخوته فی سبیل تأسیس نظام العالم ،وقد اجازهذا معظم العلماء ،فیجب العمل به"[2]

ڈاکٹر محمد عزیر نے اپنی تاریخ میں یہ شق مغربی مآخذ سے لی ہے اور اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''میرے فقہاء کی اکثریت نے یہ فتویٰ صادر کیا ہے کہ میرے جانشینوں میں سے جو تخت پر بیٹھیں، وہ دنیا کے امن وامان کی غرض سے اپنے بھائیوں کو قتل کر سکتے ہیں۔ ان کا فرض ہوگا کہ اس پر کاربند ہوں۔''[3]

ہمارے سامنے قانون کی اصل عبارت جو ترکی میں تھی، موجود نہیں کہ ہم یہاں لفظی مناقشہ کریں۔ مگر اصل سمجھنے کی بات یہ ہے کہ سلطان کے قوانین بہت سی شقوں پر مشتمل تھے جنہیں علماء وفقہاء کی نگرانی میں تیار کیا گیا تھا۔ قوانین کی

---

① اس کی تفصیل ہم سلطان محمد فاتح کے حالات میں بیان کر چکے ہیں۔ وہاں دیکھ لی جائے۔

② الدولة العثمانية المجهولة: ص ۱۳۱

③ دولتِ عثمانیہ از ڈاکٹر عزیر: ۱/۱۳۰، منقول از فقان ہمر بحوالہ کریسی: ۱/۱۸۲

تشریح ایک حساس اور نازک معاملہ ہے۔ ہر کسی کو حق نہیں کہ کسی قانون کی عبارت یا اس کا ترجمہ پڑھ کر اس کی جو چاہے تشریح کر دے، بلکہ یہ کام ماہر قانون کا ہے اور بہت سے اُمور کو پیش نظر رکھ کر انجام دیا جاتا ہے۔

نامور ترک محققین جناب ڈاکٹر احمد آق کوندوز اور جناب ڈاکٹر سعید اوز تورک نے بہت سے حقائق وشواہد کی روشنی میں مذکورہ قانون کی مفصل تشریح پیش کی ہے جو قابلِ مطالعہ ہے۔[1]

ان کے کلام کا لب لباب یہ ہے کہ سلطان محمد فاتح کے مرتب کردہ قوانین میں بھائیوں کے قتل سے متعلق مذکورہ شق کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ کوئی سلطان شرعی حدود کو پامال کرتے ہوئے محض بدامنی کے امکان یا شبہ کی بناء پر کسی کو قتل کر سکتا ہے۔ بلکہ مراد یہ تھی کہ اگر بغاوت سے پالا پڑے تو قیامِ امن کے لیے باغی کو قتل کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص حقیقت میں سلطنت کے لیے خطرہ بن گیا ہو اور ملک دشمن سرگرمیوں میں (خفیہ یا علانیہ) ملوث ہو تو اسے تعزیراً قتل کیا جاسکتا ہے۔ تعزیر سے مراد وہ سزا ہے جو شریعت نے مقرر نہیں کی بلکہ اس کا دارومدار اربابِ حل وعقد پر رکھ دیا ہے۔ کہیں تعزیر میں ڈانٹ ڈپٹ بھی کافی ہوتی ہے اور کہیں تعزیر سزائے موت تک بھی چلی جاتی ہے جیسا کہ ہم جنس پرستی کی تعزیر اس کی ایک واضح مثال ہے۔ صرف ہماری کتبِ فقہ میں نہیں بلکہ دُنیا کے اکثر ممالک کے قوانین میں ملکی سلامتی اور امن وامان کو لاحق خطرات سے بچنے کے لیے سزائے موت کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

پس عثمانی قوانین میں بھائیوں کے قتل سے مراد ایک عام مسئلے کی خاص صورت کی وضاحت ہے یعنی اگر کسی شخص سے ملکی امن وامان کو خطرہ ہو تو اُسے سیاسۃً اور تعزیراً قتل کیا جاسکتا ہے اور اس اَمر میں قریبی رشتوں یہاں تک کہ بیٹوں اور بھائیوں پر بھی یہ انتہائی سزا جاری کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ملک تین براعظموں میں پھیلا ہوا ہو، اور جو وقت بیرونی ممالک اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے، شہزادوں کو ورغلانے اور اُمراء وافسران کو خریدنے کے لیے کوشاں ہوں اور وہاں کے سلاطین بار بار اپنوں سے بغاوتوں کے تلخ تجربات سے گزرے ہوں اور کسی مقصد کے بغیر بار بار ہزار ہا جانوں کے ضیاع کے مناظر دیکھے جاتے رہے ہوں، تو وہ اس [فتنے] کو بند کرنے کے لیے قانون سازی کو سخت کرنے میں معذور سمجھے جاسکتے ہیں۔ اسی بناء پر دُنیا کی تمام ریاستوں کے آئین میں ملکی سلامتی کو چند افراد کی جانوں پر ترجیح دیتے ہوئے ایسی سزاؤں کو قانونی حیثیت دی گئی ہے۔[1] خود خلافت کو سبوتاژ کر کے جدید ترکی قائم کرنے والوں نے نئے آئین میں ارضِ وطن کی سلامتی سے متصادم افعال پر سزائے موت طے کی ہے۔[2]

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تعزیراً قتل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں اور عثمانی قوانین کی یہ شق غیر شرعی ہے یا عقل وعرف کے لحاظ سے اس کا کوئی جواز نہیں، انہی کے ذمے ہے کہ شواہد کے ساتھ اپنے دعوے کو ثابت کریں۔

---

① ملاحظہ ہو: الدولۃ العثمانیۃ المجہولۃ، ۳۰۳ سوال و جواب توضح حقائق غائبۃ عن الدولۃ العثمانیۃ: ص ۱۲۹ تا ۱۳۲؛ ص ۲۶۸، ط مکتبۃ امرو تورز۔

② دیکھیے قوانین جدید ترکی شق: ۱۳۵ سے ۱۶۳

یہ تو سلطان محمد فاتح کے قانون کی وضاحت تھی جسے مخالفین نے بالکل غلط مفہوم میں مشہور کر دیا ہے۔ جہاں تک اس قانون پر عمل کا تعلق ہے تو یہ بات سب جانتے ہیں کہ عملی تطبیق ہمیشہ قانون کی رُوح کے مطابق نہیں ہوتی۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حاکم یا قاضی کسی سے دشمنی نکالنے کے لیے قانون کو قصداً غلط استعمال کرتا ہے۔ کبھی وہ غلط فہمی کا شکار بھی ہو جاتا ہے جس کی بنیاد غلط معلومات اور مشکوک اطلاعات ہوتی ہیں۔

عثمانیوں کی تاریخ میں بایزید یلدرم پہلی مثال ہے جس نے دوسروں کے بہکانے پر شکوک وشبہات میں مبتلا ہو کر اپنے بھائی یعقوب کو قتل کرایا تھا۔[1] دوسری مثال سلطان سلیمان عالی شان کی ہے جس نے اگرچہ اپنے بیٹے مصطفیٰ کو باغی قرار دے کر فقہاء کے فتوے کے بعد سزائے موت دی تھی مگر مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ سلطان کو اس کی زوجہ خرم سلطان نے بہکایا تھا جبکہ مصطفیٰ بے قصور تھا۔ یہاں سلطان اور فقہاء بھی غلط فہمی کا شکار ہوئے۔[2]

بعض مثالیں ایسی بھی ہیں جہاں غلط فہمی یا غلط معلومات کا مسئلہ نہ تھا بلکہ وہ ذہنی فتور اور نفسانی غرور تھا۔ چنانچہ مراد ثالث کا اپنے پانچ بھائیوں کو اور محمد خان ثالث کا انیس بھائیوں کو قتل کرانا سراسر ظلم تھا۔ اس کا جواز اسلامی شرع میں تھا نہ عثمانی قوانین میں۔ لیکن چوں کہ بادشاہوں کے پاس قوت ہوتی تھی، اس لیے ان کا ظلم روکنا کسی کے بس میں نہ تھا۔

مگر بہت سی مثالیں ایسی ہیں جہاں ظلم وزیادتی کا اطلاق کرنا درست نہ ہوگا۔ چنانچہ سلطان محمد چلپی کے بھائی عیسیٰ اور موسیٰ سیاسی کش مکش اور بغاوتوں میں قتل ہوئے۔ سلطان مراد ثانی کا اپنے بھائی مصطفیٰ کو قتل کرانا بھی اسی نوع سے ہے۔ بایزید ثانی کا اپنے بھائی شہزادہ جمشید کو زہر دلوانا جن حالات میں ہوا، وہ اپنے موقع پر تفصیل سے گزر چکے ہیں۔ سلطان سلیم ثانی نے اپنے دو بھائیوں: احمد اور قرقود کو باغیانہ کش مکش ہی کے باعث قتل کرایا تھا۔

الغرض جن سلاطین نے ظلم کیا، ہم ہرگز ان کا دفاع نہیں کرتے مگر جن سلاطین نے یہ کام دفع فتنہ اور ملکی سلامتی کی ناگزیر ضرورت کے تحت کیا، انہیں مورد الزام ٹھہرانا بھی قطعاً درست نہیں۔ دنیا کی کونسی ایسی سلطنت ہے جس کے ایوانوں میں جائز و ناجائز فیصلوں کی مثالیں نہ ملتی ہوں۔ مگر عثمانی سلاطین کو زیادہ نشانہ اس لیے بنایا جاتا ہے کہ وہ آخری دور میں عالم اسلام کی سرحدوں کے واحد نگہبان تھے۔

◆◆◆

---

① اخبار الدول: ۳/۱۵

② اس کی تفصیل سلطان سلیمان عالی شان کے حالات میں گزر چکی ہے۔

عثمانی دور کے مشاہیر اہل علم وادب

شیخ الاسلام زکریا بن محمد انصاری رحمہ اللہ: ۸۲۳ھ تا ۹۲۶ھ (۱۴۲۰ء تا ۱۵۲۰ء)

شیخ الاسلام زکریا بن محمد انصاری رحمہ اللہ مصر کے مشرقی علاقے سُنیکہ میں پیدا ہوئے۔ نامور شافعی فقیہ اور محدث تھے۔ جامعۃ الازہر میں تعلیم حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ سب سے نمایاں ہیں۔ شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمہ اللہ فقہ، تفسیر، حدیث، تجوید، فرائض، تاریخ وسیرت سمیت اکثر علوم وفنون کے ماہر تھے۔ ۱۰۲ سال طویل عمر پائی۔ آخر میں نابینا ہوگئے تھے۔ عمر کے آخری بیس سال اسی طرح گزرے۔

شروع میں آپ کی تنگ دستی کا یہ حال تھا کہ رات کی تاریکی میں گلیوں سے تربوز کے چھلکے اٹھا کر دھوتے اور بچے ہوئے گودے سے بھوک مٹاتے۔ آخر ایک آٹا چکی والے کو پتہ چل گیا اور اس نے آپ کے لیے اناج، لباس اور کتابیں وغیرہ فراہم کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ پھر وہ دور آیا کہ آپ علماء کے سرتاج ہوگئے۔ سلطان قایتبائی (۸۲۶ھ۔ ۹۰۱ھ) کے مسلسل اصرار پر آپ قاہرہ کے قاضی القضاۃ بنے۔ اب دولت وشہرت پاؤں کی دھول تھی۔ تین ہزار درہم یومیہ آمدن تھی جس سے آپ نے بے شمار کتب جمع کیں۔ آپ نے قاضی بن کر بڑے انصاف سے فیصلے کیے۔ آپ کو سلطان کے بعض اقدامات عدل کے خلاف محسوس ہوئے تو آپ نے اسے خط لکھ کر منع کیا۔ سلطان نے ناراض ہوکر آپ کو معزول کردیا۔ یہ ۹۰۶ھ کا واقعہ ہے۔ کچھ عرصے بعد آپ آنکھوں کی بیماری میں مبتلا ہوکر نابینا ہوگئے۔ اس کے باوجود یہ معذوری آپ کی علمی خدمات میں رکاوٹ نہ بن سکی کیونکہ آپ کے علوم آپ کے سینے میں محفوظ تھے۔ آپ بیس برس تک اسی حالت میں تصنیف وتالیف کا کام کرتے رہے اور نہایت گراں قدر تصانیف سے اسلام کی بے بہا خدمت کی۔ خاص کر آپ کا تشریحی کام لاجواب ہے۔ بخاری کی شرح **تحفۃ الباری**، **الفیۃ العراقی** کی شرح **فتح الباقی**، **البھجۃ الوردیہ** کی شرح **الغرر البھیہ** (۵ جلدیں) اور **روض الطالب** کی شرح **اسنیٰ المطالب** (۴ جلدیں) آپ کی علمی عبقریت، دقتِ نگاہ اور وسعتِ مطالعہ کا ثبوت ہیں۔ آخری دونوں کتب فقہ شافعی کی ہیں۔ اصول فقہ میں **غایۃ الوصول** بھی آپ کی عمدہ تصانیف میں سے ایک ہے۔[1]

آپ اپنی صحت کی بہت حفاظت کرتے تھے اور اپنی قوتوں کو فضول چیزوں میں کبھی ضایع نہیں کرتے تھے، اس لیے آپ کی صحت آخر تک بہت اچھی تھی۔ ایک سو سال سے متجاوز ہوکر بھی کھڑے ہوکر نماز ادا کیا کرتے تھے۔

[1] الاعلام للزرکلی: ۳/ ۴۶

اگرچہ آپ سلطنتِ عثمانیہ سے وابستہ نہ تھے بلکہ آپ کی اکثر زندگی مملوک سلاطین کی قلمرو میں گزری ہے اور آپ کو سرکاری عہدے بھی انہی کی طرف سے ملے تھے مگر آپ کی زندگی کے آخری سالوں میں مصر سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ بن گیا تھا۔ اس لیے آپ کا ذکر آلِ عثمان کے دور کے علماء میں کر دیا گیا۔

◆◆◆

قاضی ابن کمال پاشا رحمہ اللہ: م ۹۴۰ھ (۱۵۳۴ء)

احمد بن سلیمان ابن کمال پاشا رحمہ اللہ سلطنتِ عثمانیہ کے نامور علماء میں سے ایک تھے۔ ترکی النسل تھے۔ ادرنہ میں تعلیم حاصل کی اور وہاں کے قاضی مقرر ہوئے۔ بعد میں ترقی کر کے استنبول کے صدر مفتی بنا دیے گئے۔ ہر موضوع پر تصانیف پیش کیں۔ فقہ میں ایضاح الاصلاح، اصول فقہ میں تغییر التنقیح، تاریخ میں تاریخ آلِ عثمان اور عقائد میں "رسالۃ فی الجبر والقدر" ان کی علمی یادگاریں ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر چالیس کے لگ بھگ چھوٹے چھوٹے رسائل ہیں جن کا مجموعہ مشہور ہے۔[1]

◆◆◆

شیخ علاء الدین متقی ہندی رحمہ اللہ: ۸۸۵ھ تا ۹۷۵ھ (۱۴۸۳ تا ۱۵۶۷ء)

علامہ علی بن حسام الدین متقی رحمہ اللہ کے آباء کا تعلق جونپور سے تھا۔ دکن کے شہر برہان پور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ علوم دینیہ کے ساتھ تصوف کے بھی امام تھے۔ دکن میں تحصیل علم اور مشائخ سے استفادے کے بعد آپ مختلف شہروں میں سفر کر کے شیخ کامل کی تلاش میں رہے۔ آخر شیخ حسام الدین ملتانی رحمہ اللہ کے حلقے میں شامل ہو گئے (آپ کے شیخ آپ کے والد کے ہم نام تھے) دو سال ان سے خوب استفادہ کیا۔

آپ مساجد یا خانقاہ میں قیام نہیں کرتے تھے۔ جہاں جاتے کرائے پر مکان لے کر اس میں رہتے۔ آپ کے پاس سفر میں دو تھیلے ہوتے تھے: ایک میں کتابیں، دوسرے میں آٹا، دال، نمک، مرچ اور تیل۔ جنگل سے لکڑیاں خود ہی جمع کرتے، اپنا کھانا خود پکاتے، کسی سے ناگزیر خدمت لینا پڑتی تو اسے معاوضہ دیتے۔

کچھ مدت بعد آپ کو حرمین شریفین کے سفر کا شوق ہوا۔ حجاز پہنچ کر چوٹی کے محدثین اور مشائخ سلوک سے استفادہ کیا۔ شیخ ابن حجر مکی ہیتمی رحمہ اللہ سے بھی حدیث پڑھی جو عمر میں آپ سے چھوٹے تھے۔ مگر آپ کے یہ استاذ باطنی دولت حاصل کرنے کے لیے آپ سے بیعت ہوئے اور اجازت وخلافت حاصل کی۔

آپ مکہ میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے تھے مگر ایک مدت بعد آپ نے ہندوستان کا سفر بھی کیا۔ وہاں لوگ آپ کی زیارت کے لیے اس طرح ٹوٹنے لگے کہ آپ کو دروازہ بند کر کے بیٹھنا پڑتا تھا۔ شاہِ گجرات شاہ محمود آپ کے کمالات کا بڑا قدردان تھا۔ جب اسے آپ کی ساحلِ ہند پر تشریف آوری کی اطلاع ملی تو حاضری کی اجازت طلب کی۔ آپ نے

---

[1] الاعلام للزرکلی: ۱/۱۳۳، ۱۳۲

منع کر دیا۔ ایک خادم قاضی عبداللہ سندھی نے سفارش کی تو فرمایا: سلطان کی وضع قطع میں کچھ خلاف شرع باتیں ہیں، جو دیکھ کر میں چپ نہیں رہ سکوں گا۔"

انہوں نے کہا کہ آپ اسی شرط پر اجازت دے دیں کہ وہ خلاف شرع صورت میں نہ ملیں۔

شیخ نے اس کی اجازت دے دی۔ شاہ گجرات نے آ کر زیارت کی اور واپس جا کر ایک کروڑ تنکہ ہدیہ بھیجے۔ شیخ نے ساری رقم قاضی عبداللہ سندھی کو دے دی کہ تمہاری وجہ سے یہ ملی ہے، تمہی کو مبارک ہو۔

شاہ محمود گجراتی اس کے بعد اکثر حاضر خدمت ہونے لگا۔ آپ جو بات خلاف شرع دیکھتے، اس پر ٹوک دیتے اور وہ فوراً مان لیتا۔ شاہ محمود نے آپ کو اتنے ہدایا دیے کہ جب آپ واپس لوٹے تو مال دار ہو چکے تھے۔ آپ نے اس رقم سے حرم کے قریب ایک حویلی خریدی جس میں حدیث کا حلقہ لگتا تھا۔ آپ کا زیادہ وقت یہاں درس و تدریس، کتابیں لکھنے اور نایاب کتب کو نقل کرنے کرانے میں صرف ہوتا۔ طلبہ کے لیے روشنائی خود تیار کرتے، یہ کام اکثر درس کے دوران ہوتا۔ زبان اور ذہن درس کی طرف متوجہ رہتے اور ہاتھ سے روشنائی گھوٹتے رہتے۔ فرماتے تھے کہ ہاتھ کو بھی کام سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کی حویلی میں سالکین کے لیے بہت سے جھونپڑے تھے۔ اس خانقاہ میں سالکین ذکر و عبادت میں مشغول رہتے۔ اکثر مریدین ہندوستان خصوصاً گجرات اور سندھ کے ہوتے تھے۔

اپنے قلم سے کتابیں لکھ کر فروخت کرنا آپ کا ذریعۂ معاش تھا۔ مال داروں کے تحائف اور تعاون سے متنفر تھے۔ ہدیہ صرف غریبوں کا قبول کرتے تھے، وہ بھی اس وقت جب اس کے حلال ہونے کا یقین ہوتا۔

سلطان سلیمان عالی شان نے بھی آپ کی شہرت سنی اور دعا کی درخواست کی۔

ایک بار سلطنتِ عثمانیہ کے کسی وزیر نے بہت اصرار کر کے آپ کو ضیافت پر بلایا۔ آپ پہلے پہل انکار کرتے رہے مگر جب کچھ قریبی احباب نے سفارش کی تو آپ نے دعوت میں شرکت کی تین شرطیں رکھیں: جہاں چاہوں گا بیٹھوں گا۔ جو چاہوں گا کھاؤں گا۔ جب دل چاہے گا اٹھ کر چل دوں گا۔ وزیر نے اسی کو غنیمت سمجھا اور حامی بھر لی۔ آپ وزیر کی حویلی تشریف لے گئے اور شاہانہ قالینوں کو چھوڑ کر دروازے کے پاس زمین پر بیٹھ گئے۔ کھانا چنا گیا تو اپنی جیب سے گھر کی روٹی نکال کر کھانے لگے۔ کچھ دیر بعد السلام علیکم کہہ کر واپس تشریف لے گئے۔

امراء اور حکام سے اس قدر ذہنی فاصلوں کے باوجود آپ دوسری بار گجرات گئے اور شاہ محمود کو بتایا کہ میں صرف اس لیے آیا ہوں کہ مملکت کے نظام کو شریعت کی کسوٹی پر جانچوں، جو چیز خلاف شرع ہو اسے ختم کرا دوں۔

شاہ نے آپ کو پورا اختیار دے دیا۔ آپ خود حکومتی ایوانوں میں جانا پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے اپنے مقرب شاگرد شیخ جیلہ کو اپنے وکیل کے طور پر یہ مہم سونپ دی۔ مملکت میں اسلامی قوانین کے نفاذ سے رشوت ستانی اور ناانصافی کے راستے بند ہوئے تو امراء اور حکام میں سے بہت سوں کو یہ ناگوار گزرا۔ انہوں نے اس اصلاحی مہم کے خلاف سازش شروع کر دی۔ شیخ جیلہ سے دوستی گانٹھ کر اسے اپنے ڈھب پر لے آئے۔ خود کو گرفت سے بچانے کے لیے اسے بڑی

بڑی رشوتیں پیش کرنے لگے۔ یوں شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ وکیل کچھ عرصے میں خود بد عنوان بن گیا۔ وزیر سلطنت نے آخری وار کیا اور ایک عورت کو شیخ جیلہ کے پاس کسی کام کے لیے رشوت دے کر بھیجا۔ شیخ جیلہ نے حسب معمول یہ رقم قبول کرلی۔ اب وزیر نے سلطان کو خبر دی کہ شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کے وکیل لوگوں سے رشوت لیتے ہیں۔ سلطان کو یقین نہ آیا تو وزیر نے اس عورت کو گواہ کے طور پر پیش کردیا۔ عورت سے ماجرا سن کر سلطان نے شیخ جیلہ کو بلوایا۔ وہ مبہوت رہ گیا۔ سلطان نے بددل ہوکر سلطنت کے معاملات دوبارہ وزیر کے سپرد کردیے۔

شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کو اس واقعے سے بڑا صدمہ ہوا۔ آپ نے حجاز واپسی کا فیصلہ کرلیا۔ شاہِ گجرات نے امراء کا ایک وفد بھیج کر عاجزانہ التجا کی کہ آپ یہیں رہیں مگر آپ نہ مانے۔ آخر شاہِ گجرات خود حاضر ہوا اور یہی درخواست دہرائی۔

آپ نے فرمایا: ''دین اور دنیا دو سوکنیں ہیں۔ ایک کو راضی کرو تو دوسری ناراض ہوجاتی ہے۔''

پھر فرمایا: ''مکہ میں دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں۔ میں وہاں رہ کر آپ کے لیے دعا کروں تو یہ زیادہ مؤثر ہوگا۔''

آپ اپنی جگہ شیخ عبدالصمد رحمۃ اللہ علیہ کو سلطان کا شرعی مشیر بنا کر واپس مکہ تشریف لے آئے۔

آپ خود برائے نام غذا کھاتے، اکثر خاموش رہتے۔ بدن نہایت نحیف تھا۔ تصنیف و تالیف اور درسِ حدیث آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ نماز کے لیے مسجد الحرام جاتے اور آخری صفوں میں نماز ادا کرکے جلد خانقاہ لوٹ آتے۔ ایک دنیا نے آپ سے علم حدیث حاصل کیا۔ یہ حلقہ درس طویل مدت تک جاری رہا اور آپ کے شاگردوں کا دائرہ مختلف ممالک میں پھیل گیا۔ آپ کی تالیفات اور تصانیف کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے۔ آپ کا عظیم ترین کارنامہ حدیث نبوی کا عظیم الشان ذخیرہ ''کنز العمال'' ہے جس میں ساڑھے ۴۶ ہزار احادیث کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ سولہ جلدوں میں ہے۔

آپ سنت کے بڑے پابند تھے۔ اکثر باوضو رہتے۔ ہر وضو کے بعد دو رکعت تحیۃ الوضو ضرور ادا کرتے۔ آخری عمر میں ضعف اور امراض کی وجہ سے چلنا پھرنا دشوار ہوگیا تھا مگر آپ کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ مثانہ ضعیف ہوگیا تھا، رات کو دس مرتبہ فراغت کے لیے جانا پڑتا۔ ہر بار فارغ ہوکر وضو کرتے اور دوگانہ نفل ادا فرماتے۔

آپ مکہ میں فوت ہوئے اور وہیں تدفین ہوئی۔ آپ کے تلامذہ میں شیخ عبدالوہاب متقی رحمۃ اللہ علیہ بہت مشہور ہیں جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھی استاد ہوئے۔ ①

✦✦✦

علامہ طاش کبری زادہ رحمۃ اللہ علیہ: ۹۰۱ھ تا ۹۶۸ھ (۱۴۹۵ تا ۱۵۶۱ء)

احمد بن مصطفی رحمۃ اللہ علیہ نامور ترک مؤرخ تھے جو طاش کبری زادہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ بروصہ میں پیدا ہوئے، انقرہ میں پلے بڑھے اور تعلیم حاصل کی۔ ترکی کے مختلف شہروں میں مدرس رہے۔ ۹۵۸ھ میں دارالخلافہ استنبول میں قاضی بنے۔ اس کے دو برس بعد نابینا ہوگئے۔ اسی حالت میں اپنی مشہور ترین تالیف ''الشقائق النعمانیہ فی علماء

① الاعلام للزرکلی: ۲/۳۰۹، ۳۱۰؛ نزھۃ الخواطر: ۲/۳۸۰ تا ۳۸۸

الدولۃ العثمانیۃ' املاء کرائی۔نوادر الاخبار، مفتاح السعادۃ اور معجم تراجم بھی ان کی عمدہ تصانیف ہیں۔ [1]

✦✦✦

علامہ ابن نُجیم رحمہ اللہ: م ۹۷۰ھ (۱۵۶۳ء)

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ سلطنت عثمانیہ کے دور میں مصر کے سب سے بڑے حنفی عالم تھے۔انہوں نے احناف کے قدیم فقہی متن "کنز الدقائق" کی شرح "البحر الرائق" کے نام سے لکھی اور اس موضوع کا حق ادا کر دیا۔اصول فقہ میں "الاشباہ والنظائر" ان کی دوسری بے مثال تالیف ہے۔ [2]

✦✦✦

شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ: ۸۹۸ھ تا ۹۷۳ھ (۱۴۹۳ء تا ۱۵۶۶ء)

عبدالوہاب الشعرانی رحمہ اللہ حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کی اولاد میں سے ایک نامور صوفی بزرگ اور عالم تھے۔مصر کے علاقے قلقشندہ میں پیدا ہوئے۔قاہرہ میں وفات پائی۔ان کی تصانیف بکثرت ہیں جن میں لوامع الانوار (الطبقات الکبریٰ) زیادہ مشہور ہے۔اس میں ایک ہزار سال کے نامور اولیاء کے سبق آموز حالات جمع کر دیے گئے ہیں۔تصوف اس کے دفاع میں ان کا کام بڑا وقیع ہے۔اس حوالے سے الاجوبۃ المرضیۃ عن ائمۃ الفقہاء الصوفیۃ، ارشاد الطالبین اور بھجۃ النفوس ان کی شہرۂ آفاق تصانیف ہیں۔ [3]

✦✦✦

علامہ ابن حجر مکی ہیثمی رحمہ اللہ: ۹۰۹ھ تا ۹۷۴ھ (۱۵۰۴ء تا ۱۵۶۷ء)

احمد بن محمد بن حجر ہیثمی رحمہ اللہ مصر کے نامور محقق عالم تھے۔جامعۃ الازہر سے تعلیم حاصل کی۔مکہ میں قیام پذیر رہنے کی وجہ سے مکی بھی کہلاتے تھے۔آپ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے مثیل سمجھے جاتے تھے۔اہل بدعت اور روافض کی تردید میں تطہیر الجنان اور الصواعق المحرقہ جیسی کتب آپ کے قلم سے نکلیں۔آپ نے امام نووی کے فقہی متن "المنہاج" کی عظیم الشان شرح "تحفۃ المحتاج" دس جلدوں میں تحریر فرمائی جو فقہ شافعی کا گراں قدر ماخذ شمار ہوتا ہے۔

آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ "الفتاویٰ الحدیثیۃ" چار جلدوں میں ہے۔شافعی ہونے کے باوجود آپ فقہائے احناف کا بڑا ادب کرتے تھے۔امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حالات پر آپ کی تالیف "الخیرات الحسان فی مناقب ابی حنیفۃ النعمان" آپ کی وسعت نگاہ کی گواہ ہے۔ [4]

✦✦✦

---

[1] معجم المفسرین من صدر الاسلام حتی العہد الحاضر از عادل نویہض: ۱/۸۹، ط مؤسسۃ نویہض، بیروت

[2] الاعلام زرکلی: ۳/۶۴

[3] الاعلام زرکلی: ۳/۱۸۰، ۱۸۱

[4] الاعلام زرکلی: ۱/۲۳۴

ملا علی قاری رحمہ اللہ: م ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۶ء)

ہرات میں پیدا ہوئے، مکہ میں قیام پذیر رہے اور وہیں وفات پائی۔ تصانیف کی کثرت کے باعث اپنے دور کے علماء میں ممتاز تھے۔ آپ نے علم حدیث کی بڑی خدمت کی اور ایسی تصانیف چھوڑیں جن سے اُمت آج تک بھرپور استفادہ کر رہی ہے۔ مشکوٰۃ کی شرح مرقاۃ المفاتیح آپ کے علمی کمال کا ثبوت ہے۔ شرح مسند ابی حنیفہ اور شرح الشفا بھی آپ کے علمی شاہ کار ہیں۔ خانہ ساز روایات کی تحقیق کے لیے آپ نے الاسرار المرفوعة فی الاخبار الموضوعہ اور المصنوع فی معرفة الحدیث الموضوع جیسی عمدہ کتب لکھیں۔[1]

+++

شیخ مصطفیٰ صبری رحمہ اللہ: ۱۲۸۶ھ تا ۱۳۷۷ھ (۱۸۶۹ء تا ۱۹۵۷ء)

۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں اناطولیہ کے قصبے توقاد میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ جامع سلطان محمد فاتح میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور شیخ محمد عاطف استنبولی رحمہ اللہ اور شیخ احمد عاصم آفندی رحمہ اللہ کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہوئے۔ صرف ۲۳ سال کی عمر میں تین سو علماء کے درمیان مقابلے کا امتحان جیت کر اس مدرسے میں استاذ مقرر ہوئے۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے ان کی شہرت سن کر انہیں قصر یلدز کے کتب خانے کا نگران بنا دیا جہاں دنیا جہان کی بیش قیمت اور نادر کتب جمع تھیں۔

شیخ مصطفیٰ صبری رحمہ اللہ ان علماء میں سے تھے جنہوں نے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر ایک بہتر حکومت کی اُمید میں سلطان عبدالحمید کی معزولی کے فتوے پر دستخط کیے تھے۔ بعد میں شیخ پر حقیقت آشکار ہوئی اور وہ سخت نادم ہوئے۔

ان کا کہنا تھا: ''سلطان کی معزولی کے چھ ماہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ سلطان کا سیاسی وزن پارلیمان کے تمام ارکان کے سیاسی وزن کے برابر بلکہ اس سے زیادہ تھا۔''

شیخ مصطفیٰ صبری رحمہ اللہ سلطان وحید الدین خان کے دور میں کچھ مدت کے لیے شیخ الاسلام اور چھ ماہ کے لیے صدرِ اعظم بھی رہے۔ مگر جلد ہی مصطفیٰ کمال پاشا کا دورِ حکومت آ گیا اور حق گو علماء کے لیے ترکی میں زندگی اجیرن کر دی گئی۔ ایسے میں شیخ مصطفیٰ صبری رحمہ اللہ وطن چھوڑ کر یونان چلے گئے اور وہاں سے ترکی زبان میں ایک جریدہ جاری کر کے مصطفیٰ کمال کی اسلام دشمنی اور ملت سے غداری کے ثبوت فراہم کرنے لگے۔ مصطفیٰ کمال کی حکومت یہ برداشت نہ کر سکی اور اس کے دباؤ پر یونان نے شیخ کو ملک بدر کر دیا۔

شیخ قاہرہ آ گئے۔ یہاں بھی حالات ان کے لیے سازگار نہ تھے کیوں کہ جدت پسندوں کا یہاں زور تھا جو مصطفیٰ کمال کو میڈیا کے زور پر ایک ہیرو کی طرح پیش کر رہے تھے۔ شیخ نے یہاں اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''النکیر علیٰ منکری النعمة من الدین والخلافة والامة'' لکھی۔ اس کتاب نے پہلی بار جمعیت اتحاد و ترقی کے قائدین، خلافت کے دشمن زعماء اور خصوصاً مصطفیٰ کمال کے آمر وجابر ٹولے کی حقیقت کو طشت از بام کیا۔ شیخ نے اس کتاب میں

[1] الاعلام زرکلی: ۱۲/۵، ۱۳

کھل کر لکھا کہ اگرچہ کمالی (مصطفیٰ کمال پاشا کے حامی) جمعیت اتحاد وترقی کے مقابلے میں زیادہ بڑا فتنہ ہیں مگر درحقیقت یہ ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ جمعیت اتحاد وترقی نے ترکی میں وزارت کو غصب کیا اور کمالیوں نے سلطنت کو۔ جمعیت اتحاد وترقی والے سیکولر ہیں جبکہ کمالی کھلم کھلا ملحد ہیں۔

شیخ نے اس کتاب میں ان مصائب، شکستوں اور تباہیوں کا ذکر کیا جو جمعیت اتحاد وترقی کے ہاتھوں ترکی پر نازل ہوئیں۔ شیخ نے بتایا کہ قائدین اتحاد وترقی نے سلطان عبدالحمید سے اقتدار چھین کر مختلف اغراض کے لیے من مانے فیصلے کیے۔ ترکوں، عربوں، کردوں اور دیگر نسلوں کے مابین منافرت کی آگ بھڑکا دی۔ خارجی سیاست میں مہلک راستہ اختیار کیا اور بلاضرورت عالمی جنگ میں کود پڑے اور شکست کھا کر آخر میں پایۂ تخت استنبول تک استعماری طاقتوں کے سپرد کر دیا۔

شیخ رحمہ اللہ نے مصطفیٰ کمال کے یہود سے تعلق کے ثبوت بھی پیش کیے اور بتایا کہ دولتِ عثمانیہ میں رہنے والی مختلف نسلوں میں سے مصطفیٰ کمال کا شروع سے گہرا تعلق صرف یہودیوں سے رہا تھا۔ شیخ نے یہ بھی بتایا کہ جمعیت اتحاد وترقی کے خفیہ اجلاس یہودیوں کے گھروں میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان کی حکومت آئی تو وزیر مالیات جاوید پاشا یہودی تھا۔ اسی طرح کمال کے دور کے وزیر معارف خالد ضیاء کا تعلق بھی یہود سے ہے۔ شیخ کی اس کتاب کو شائع ہوئے ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ مصطفیٰ کمال نے خلافت کو ساقط کر کے اور اسلامی شعائر کو کچل کر شیخ کے بیان کی تصدیق کر دی۔

شیخ رحمہ اللہ کی باقی زندگی مصر میں جدت پسندوں سے مباحثوں، مغرب کی فکری یلغار کے مقابلے اور دینِ خالص کے دفاع میں قلمی جہاد کرتے ہوئے گزری۔ ان کی تصانیف میں "موقف العقل والعلم والدین من رب العالمین" باطل نظریات کے خلاف ایک شاندار، لاجواب اور ضخیم کام ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔[1]

شیخ نے قاہرہ میں ۱۹۵۷ء (۱۳۷۷ھ) میں وفات پائی۔

◆◆◆

علامہ بدیع الزمان سعید نورسی رحمہ اللہ: ۱۲۹۴ھ تا ۱۳۸۰ھ (۱۸۷۷ء تا ۱۹۶۰ء)

علامہ بدیع الزمان سعید نورسی رحمہ اللہ ۱۸۷۷ء (۱۲۹۴ھ) میں مشرقی اناطولیہ کے گاؤں نورس کے ایک انتہائی دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ نسلاً کرد تھے۔ ان کا حافظہ کمال کا تھا۔ قرآن مجید کے ساتھ انہیں عربی کی بہت سی کتب زبانی یاد تھیں۔ وہ دینی وعصری علوم میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ تاریخ، فلسفہ، ریاضی، فلکیات، کیمیا، طبعیات اور جغرافیہ میں بھی یکتا تھے۔ وہ چند رو سال تک "وان" شہر میں مدرس رہے۔

علامہ نورسی رحمہ اللہ کو سلطان عبدالحمید ثانی کے شخصی طرزِ سیاست سے اختلاف تھا۔ وہ ۱۹۰۷ء میں استنبول گئے اور اپنا موقف پیش کیا۔ سلطان کے بعض خدام نے اس تنقید کو برداشت نہ کیا اور علامہ کو حراست میں لے لیا مگر جلد ہی

---

① المصلحون في تركيا: ص ۱ تا ۴۳ ؛ مصطفى صبري المفكر الإسلامي از دكتور مفرح بن سليمان القوسي، ط دار القلم

انہیں علامہ کے اخلاص کا اندازہ ہو گیا، لہٰذا انہیں چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد علامہ سلانیک جا کر جمعیت اتحاد و ترقی کے قائدین اور فری میسن کے گرینڈ ماسٹر عمانوئیل قرہ صو سے بھی ملے اور بحث و مباحثہ کیا۔ قرہ صو کا خیال تھا کہ وہ علامہ کو اپنا ہم خیال بنالے گا مگر اسے ناکامی ہوئی۔ جلد ہی وہ علامہ سے مباحثہ ترک کر کے اٹھ گیا۔ بعد میں اس نے کہا:

''قریب تھا کہ یہ عجیب شخص مجھے مسلمان کر دیتا۔''

جمعیت اتحاد و ترقی کے رہنماؤں نے سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے ۱۹۰۹ء میں اپنی سیکولر حکومت قائم کی تو نفاذِ شریعت کی آواز لگانے والے علماء کو چن چن کر پھانسیاں دیں۔ علامہ کو بھی پھانسی گھاٹ پر لے جا کر ان سے اپنی مرضی کا بیان لینے کی کوشش کی گئی مگر علامہ نے وہاں ایسی دوٹوک تقریر کی کہ سب گنگ رہ گئے۔ آخر انہیں چھوڑ دیا گیا۔

اسی سال انہوں نے ''الاتحاد المحمدی'' کے نام سے ایک سیاسی و نیم عسکری جماعت قائم کی جو جمعیت اتحاد و ترقی کی نسل پرست سیاست کے برعکس اسلامی اُخوت کی داعی تھی۔ اس جماعت کو خفیہ طور پر خلیفہ سلطان محمد رشاد کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس جماعت کی رکنیت سازی کے لیے علامہ نے ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۳ء میں سلطنتِ عثمانیہ کے مختلف صوبوں کے دورے کیے اور وہاں مجاہدین کے جتھے بھی تیار کیے۔

جب عالمی جنگ چھڑی تو علامہ ان مجاہدین کے ساتھ ارضِ روم کے سخت ترین محاذِ جنگ پر شانہ بشانہ جنگ میں شریک رہے۔ ۱۹۱۶ء میں جب روس نے ارضِ روم پر قبضہ کیا تو علامہ شدید زخمی حالت میں گرفتار ہو گئے۔ دو سال چار ماہ تک وہ سائبیریا میں قید رہے۔ روس میں بالشویک انقلاب آیا تو علامہ کو جیل سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔

وہ دوبارہ ترکی پہنچے تو ۱۹۱۸ء میں انہیں دار الحکمۃ الاسلامیہ نامی ادارے کا رکن بنا لیا گیا جس میں نامور علمائے ترکی شامل تھے۔ علامہ ادارے کی تنخواہ میں سے کچھ حصہ اپنی ذات پر اور باقی اپنی کتب کی طباعت پر خرچ کر دیتے جنہیں وہ مفت تقسیم کیا کرتے تھے۔ جب عالمی جنگ میں شکست کے بعد ایک معاہدے کے تحت برطانوی اور فرانسیسی افواج استنبول میں تعینات ہوئیں تو علامہ نے اس صورتحال پر ایک رسالہ ''الخطوات الست'' لکھا۔ برطانوی حکومت اس کے مندرجات کو برداشت نہ کر پائی اور اس رسالہ کو ضبط اور تلف کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

۱۹۲۲ء میں انہیں پارلیمان کے اجلاس میں شرکت کے لیے بلایا گیا۔ انہیں یہ دیکھ کر سخت تکلیف ہوئی کہ اکثر ارکانِ پارلیمان نماز سے بالکل غافل تھے۔ علامہ نے ارکانِ پارلیمان کے سامنے نماز کی اہمیت ایسے مؤثر انداز میں بیان کی کہ ساٹھ ارکان نے نماز کی پابندی کا عہد کر لیا۔ یہ دیکھ کر مصطفیٰ کمال کو سخت غصہ آیا اور اس نے علامہ کو کہا: ''آپ نے نماز کی ترغیب دے کر ارکانِ پارلیمان میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔'' علامہ نے جواب دیا: ''بے نمازی خائن ہوتا ہے اور خائن کی حکمرانی ناجائز ہے۔'' مصطفیٰ کمال نے یہ دیکھ کر علامہ سے جان چھڑانا بہتر سمجھا اور انہیں مشرقی اضلاع میں وعظ و ارشاد کی ذمہ داری سونپنا چاہی مگر علامہ نے اسے قبول نہ کیا اور ۱۹۲۳ء میں ''وان'' جا کر ذکر و عبادت میں مشغول

ہو گئے۔ مگر مصطفیٰ کمال کی حکومت انہیں شک وشبے کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی، لہٰذا کچھ مدت بعد انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ مختلف جیلوں میں رہے۔ ۱۹۲۶ء میں انہیں "بارلا" کے سرد ترین علاقے میں منتقل کر دیا گیا جہاں انہوں نے سخت اذیت کی حالت میں آٹھ سال گزارے۔ اس کے بعد بھی وہ مختلف جیل خانوں میں رہے۔ اس دوران وہ اسلام کے دفاع اور تشریح سے متعلق مختلف مضامین بیان کیا کرتے تھے، ان کے عقیدت مند انہیں نقل کر کے باہر منتقل کر دیتے تھے۔ ان مضامین کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ انہیں "رسائل النور" کہا جاتا تھا۔ انہیں نقل کرنے اور پھیلانے میں خواتین نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ تاہم احتیاطاً انہیں علامہ نورسی کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا تھا۔

علامہ نورسی رحمہ اللہ لگ بھگ بیس سال قید رہنے کے بعد ۱۹۵۴ء میں رہا ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۷ سال ہو چکی تھی۔ ۱۹۶۰ء میں وہ وفات پا گئے۔ ان کی جرأت وعزیمت اور رسائل نور کی شکل میں رہنمائی نے ترک قوم کو اسلام کی طرف واپس لانے میں اہم کردار ادا کیا۔[1]

+++

شیخ محمد زاہد الکوثری رحمہ اللہ: ۱۸۷۹ء تا ۱۹۷۰ء (۱۲۹۶ھ تا ۱۳۹۰ھ)

شیخ محمد زاہد الکوثری رحمہ اللہ ۱۸۷۹ء (۱۲۹۶ھ) میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق چرکس نسل سے تھا۔ انہوں نے استنبول کے مدرسہ جامع محمد فاتح میں تعلیم حاصل کی اور وہیں استاذ اور پھر صدر مدرس ہوئے۔

جب جمعیت اتحاد وترقی کی حکومت آئی تو اس نے جامعہ کے نصاب میں دینی مضامین کو کم کر کے زیادہ تر عصری علوم داخل کرنے کی کوشش کی۔ شیخ زاہد الکوثری رحمہ اللہ نے اسے قبول نہ کیا تو انہیں برطرف کر دیا گیا۔

مصطفیٰ کمال پاشا کی حکومت میں ۱۹۲۲ء میں شیخ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی، تاہم وہ ایک بحری جہاز میں بیٹھ کر اسکندریہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ زمانہ ایسا گزارا کہ کبھی مصر میں رہے اور کبھی شام میں۔ آخر میں قاہرہ میں مستقل قیام کر لیا۔ وہاں سرکاری کتب خانے میں ترکی مخطوطات کو عربی میں منتقل کرنے کا کام کرتے رہے۔

وہ فقہ حنفی کے بہترین وکلاء میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ پر شاندار کام کیا اور ان کے دفاع کے حوالے سے متعدد کتب لکھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کم وبیش ایک سو علمی مقالات لکھے جو "مقالات الکوثری" کے نام سے شائع ہوئے۔ شیخ رحمہ اللہ ۱۹۷۰ء (۱۳۹۰ھ) میں قاہرہ میں فوت ہوئے۔[2]

+++

شیخ ابوالہدیٰ الصیادی رحمہ اللہ: ۱۲۶۶ھ تا ۱۳۲۸ھ (۱۸۴۹ء تا ۱۹۰۹ء)

شیخ ابوالہدیٰ صیادی ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) میں شام کے ضلع معرہ کے قریب "خان شیخون" میں پیدا ہوئے۔ ان کا

---

① بدیع الزمان سعید نورسی، حیات وواقعات، از زیر کوندوز الپ، مصطفیٰ صونغور، دار بیت السلام، ۲۰۱۹ء؛ المصلحون فی ترکیا: ص ۲۳ تا ۳۳؛ الاعلام للزرکلی: ۷/۲۳۶

② الاعلام للزرکلی: ۶/۱۲۹ تا ۱۳۱

اصل نام محمد بن حسن تھا۔ وہ نسلاً حسینی تھے۔ انہوں نے حلب میں دینی تعلیم حاصل کی اور چند سالوں بعد ممتاز علماء میں شمار ہونے لگے۔ سلطان عبدالحمید ثانی نے انہیں ''شیخ المشائخ'' کا منصب تفویض کیا اور اپنا مشیر بنالیا۔ ان کے مخلصانہ مشوروں اور نصائح سے سلطان نے بہت استفادہ کیا اور انہیں ''مُسْتَشَارُ الْمُلْک'' کا لقب دیا۔

شیخ صیادی رحمہ اللہ ''الجامعۃ الاسلامیۃ'' (پان اسلام ازم) کے زبردست نقیب تھے۔ وہ اپنی تحریروں اور خطبات کے ذریعے اُمت کو پرچمِ خلافت تلے متحد ہونے کی دعوت دیتے رہے۔ انہوں نے تیس سال سلطنتِ عثمانیہ کی خدمت کی۔ وہ ایک شاعر، ادیب اور مصنف بھی تھے۔ سلطان عبدالحمید ثانی کی معزولی کے فوراً بعد شیخ کو سلطنتِ عثمانیہ سے وفاداری کی پاداش میں ملک بدر کر دیا گیا اور انہوں نے چند ماہ بعد اسی حالت میں وفات پائی۔ [1]

◆◆◆

امیر شکیب ارسلان: ۱۲۸۶ھ تا ۱۳۶۶ھ (۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۶ء)

مشہور ادیب، شاعر اور سیاست دان امیر شکیب ارسلان شاہانِ حیرہ کی نسل سے تھے۔ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں لبنان میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر بیروت کے مختلف عصری تعلیمی اداروں میں پڑھتے رہے۔ وہ عربی، انگریزی، ترکی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ فکرِ اسلامی میں ان کی تربیت شیخ محمد عبدہٗ کے دروس میں شرکت اور ان کی صحبت سے ہوئی۔ نیز وہ علامہ جمال الدین افغانی سے بھی خاصے متاثر تھے۔

وہ اتحادِ اسلامی کے داعی، مغربی نظریۂ حیات کے ناقد، استعمار کے سخت مخالف اور خلافتِ عثمانیہ کا دفاع کرنے میں پیش پیش تھے۔ وہ اپنے مضامین اور شاعری سے مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی یاد دلانے، ان کے حالیہ زوال کے اسباب سے آگاہ کرنے اور اسلام سے رہنمائی لینے کا سبق دیتے رہے۔ وہ عالمِ عرب کو افتراق اور بے مقصدیت سے نکالنے اور عرب جوانوں کو فکر ونظر کی بلندی اور سیاسی و دینی شعور سے مالا مال کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی تصانیف میں ان کے شاندار دیوان کے علاوہ ''الحلل السندسیۃ، عروۃ الاتحاد، لماذا تأخر المسلمون و تقدم غیرھم، تاریخ غزوات العرب اور حاضر العالم الاسلامی کو بہت شہرت ملی۔

انہوں نے چالیس سال تک لگاتار کام کیا اور ہزارہا مضامین کے ساتھ ساتھ کئی بہترین کتب تحریر کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ نظم ونثر میں اعلیٰ معیار کے بکثرت کام کے باعث انہیں ''امیر البیان'' کا لقب ملا اور اسی لیے عموماً انہیں ''امیر شکیب ارسلان'' کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے حجاز، یمن، مصر، لیبیا، مراکش، اسپین، سوئزرلینڈ، اٹلی اور امریکا سمیت دنیا کے بہت سے ممالک کا سفر کیا اور نامور ادیبوں، صحافیوں اور سیاست دانوں سے ملتے رہے۔ وہ تقریباً ۷۷ سال کی عمر میں دسمبر ۱۹۴۶ء میں فوت ہوئے۔ [2]

---

① الاعلام للزرکلی: ۹۳/۱، سلطان عبدالحمید الثانی از محمد حرب: ص ۱۸۸ تا ۱۹۱

② الاعلام للزرکلی: ۱۷۳/۳، ۱۷۳، امیر البیان شکیب ارسلان از احمد شرباصی ط دار الکتاب العربی بمصر

+++

مصطفیٰ کامل: ۱۲۹۱ھ تا ۱۳۲۶ھ (۱۸۷۴ء تا ۱۹۰۸ء)

نامور قانون دان اور صحافی مصطفیٰ کامل ۱۸۷۴ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد توپ خانے کے انجینئر تھے۔ مصطفیٰ کامل نے فقط تیرہ برس کی عمر میں ماسٹر کی ڈگری لی اور ۱۹ برس کی عمر میں تولوز یونی ورسٹی پیرس سے قانون کی اعلیٰ تعلیم کی سند حاصل کر لی اور ان کی قابلیت کا اسی وقت سے شہرہ ہو گیا۔ اگلے برس ۱۸۹۶ء میں سلطان عبدالحمید ثانی نے انہیں استنبول بلوا کر استعمار کے خلاف مسلمانوں کو بیدار کرنے کی ذمہ داری سونپی۔

اس زمانے میں مصر برطانوی استعمار کے شکنجے میں تھا۔ مصطفیٰ کامل کے دل میں استعمار کے خلاف نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ انہوں نے ملک کی آزادی کے لیے عمر بھر قلم کی جنگ لڑی۔ وہ کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ انہوں نے ''اللواء'' کے نام سے عربی، انگریزی اور فرنچ میں اخبار جاری کیا جو استعماری افکار اور مغربی نظریات پر کاری ضرب لگاتا رہا۔ مصطفیٰ اپنے قلم کے ذریعے استعماری عزائم کو بے نقاب کرتے رہے۔ بہترین خدمات کے صلے میں انہیں سلطان عبدالحمید کی طرف سے خلافتِ عثمانیہ کے اعلیٰ اعزازات سے نوازا گیا۔ انہیں ۱۹۰۰ء میں ''نشانِ مجیدی سوئم'' اور ۱۹۰۴ء میں نشان ''میرِ میران'' دیا گیا۔ مصطفیٰ کامل کی مختصر زندگی کا بڑا وقت اسفار میں گزرا۔ ان کا قیام کبھی مصر میں ہوتا، کبھی فرانس اور کبھی برطانیہ میں۔ ۱۹۰۷ء میں مصطفیٰ کامل نے ایک سیاسی تنظیم ''الحزب الوطنی'' کی بنیاد رکھی مگر اس کے اگلے برس ان کی وفات ہو گئی۔ ان کی عمر فقط ۳۴ برس تھی۔ ①

+++

علامہ جمال الدین افغانی: ۱۲۵۴ھ تا ۱۳۱۵ھ (۱۸۳۸ء تا ۱۸۹۷ء)

انیسویں صدی عیسوی کے نامور ادیب، صحافی اور مفکر تھے۔ ان کا تعلق افغانستان سے تھا۔ کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ مصر، ہندوستان، ایران، لندن اور پیرس میں رہے اور آخر میں استنبول آ گئے۔ انہوں نے بے شمار مقالات اور مضامین لکھے جن کا مقصد مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنا اور جدید اسلوب میں اسلام کا تعارف کرانا تھا۔ ②

+++

---

① الاعلام للزرکلی: ۲۳۸/۷، سلطان عبدالحمید الثانی از محمد حرب: ص ۱۸۳ تا ۱۸۸؛ مصطفیٰ کامل فی محکمۃ التاریخ للدکتور عبدالعظیم رمضان: ص ۱۱ تا ص ۳۳، ط مکتبۃ الاسکندریۃ

نوٹ: مصطفیٰ کامل اور صیہونی صحافی ہرزل (۱۸۶۰ء تا ۱۹۰۴ء) ذہنی پختگی، تجربہ نگاری اور سحر بیانی میں ہم پلہ تھے۔ دونوں کا دور بھی ایک تھا اور وقات میں بھی فقط چار سال کا فرق تھا۔ دنیا ہرزل کی ذہانت وفطانت اور دور اندیشی پر حیرت کرتی ہے، جبکہ عالمِ اسلام میں مصطفیٰ کامل جیسا جری ادیب وصحافی اس حقیقت کا زندہ ثبوت تھا کہ مسلم دنیا اس دورِ انحطاط میں بھی بانجھ نہ تھی اور اس کے دامن میں اس وقت بھی بڑے انمول ہیرے موجود تھے۔

② الاعلام للزرکلی: ۱۶۹/۶

سلطان عبدالحمید ثانی کے حالات میں علامہ جمال الدین افغانی کا تذکرہ وتعارف گزر چکا ہے اس لیے یہاں اشارے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

شیخ محمد عبدہ: ۱۲۶۶ھ تا ۱۳۲۳ھ (۱۸۴۹ء تا ۱۹۰۵ء)

شیخ محمد عبدہ انیسویں صدی عیسوی کے مشہور مسلم مفکرین میں سے ایک تھے۔ ترکمان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مصر میں پیدا ہوئے اور جامعۃ الازہر سے اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی۔ آپ مصر میں عہدۂ قضا اور منصب افتاء پر بھی فائز رہے۔ آپ نے فرانسیسی زبان میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ آپ کے مضامین عالم عرب سمیت دُنیا بھر کے بہترین مجلات میں شایع ہوتے تھے۔ آپ اُمتِ مسلمہ کے اتحاد اور مسلم قومیت کے داعی تھے اور خلافت کی ضرورت پر زور دیا کرتے تھے۔ آپ نے اسلامی تعلیمات اور اُمتِ مسلمہ کے فکری ونظریاتی مسائل پر بہت کچھ لکھا۔ آپ جمال الدین افغانی کے افکار سے متاثر تھے، اس لیے آپ کی تحریروں میں جدت پسندی کا رنگ واضح دکھائی دیتا ہے۔[1]

+++

محمد رشید رضا: ۱۲۸۲ھ تا ۱۳۵۴ھ (۱۸۶۵ء تا ۱۹۳۵ء)

محمد رشید رضا الحسینی ۱۸۶۵ء (۱۲۸۲ھ) میں شمالی شام کے ساحلی شہر طرابلس میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک ماہر صحافی، نامور ادیب اور عمدہ مؤرخ تھے۔ ۱۸۹۷ء میں وہ مصر آگئے اور شیخ محمد عبدہ کے حلقے سے وابستہ ہو گئے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا تاہم وہ جدت پسندی کی طرف مائل تھے۔ اس حوالے سے انہوں نے مصر میں "مدرسۃ الدعوۃ والارشاد" قائم کیا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد وہ شام میں شاہ فیصل بن حسین کے دور میں "المؤتمر السوری" کے رئیس بھی رہے۔ تاہم جب ۱۹۲۰ء میں دوبارہ مصر آگئے۔ مسلم دُنیا میں ان کے تعلقات بڑے وسیع تھے۔ وہ حجاز، ہندوستان اور یورپ بھی گئے اور ہر جگہ کے تجربات سے استفادہ کیا۔ انہوں نے تاریخ، ادب، حالاتِ حاضرہ اور فکری مسائل پر خوب لکھا۔

ان کا سب سے بڑا کام "مجلۃ المنار" ہے، جس کی ۳۴ جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔ وہ قرآن مجید کی تفسیر لکھ رہے تھے جس کی بارہ جلدیں ہو چکی تھیں۔ وہ ۱۹۳۵ء (۱۳۵۴ھ) میں مصر میں ایک کار حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔[2]

+++

---

① الاعلام للزرکلی: ۲۵۲/۶

② الاعلام للزرکلی: ۱۲۶/۶، ۱۲۷

نوٹ: علامہ جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ اور شیخ رشید رضا تینوں جدت پسندانہ ذہن رکھتے تھے اور متعدد مسائل میں جمہور علمائے اُمت سے الگ تھے۔ جمال الدین افغانی اور رشید رضا ادیبانہ صلاحیت، وسعتِ مطالعہ اور جدید فکرِ اسلامی کے لیے مشہور تھے مگر فقیہ یا محدث نہیں تھے۔ شیخ محمد عبدہ استاذ حدیث، محقق اور جید عالم تھے مگر جدت پسندی کے باعث ان کی بھی کئی آراء جمہور علماء وفقہاء سے مختلف تھیں اور متعدد مقامات پر ان کے اپنے افکار میں بھی تضاد نظر آتا ہے، کہیں وہ اشعری دکھائی دیتے ہیں اور کہیں معتزلی۔ بعض اوقات وہ لبرل بھی محسوس ہوتے ہیں۔ اسی قسم کا تضاد ہمیں علامہ جمال الدین افغانی کے افکار میں بھی دکھائی دیتا ہے اور غالباً علامہ افغانی کے سلطان عبدالحمید ثانی سے اختلاف کی بڑی اور بنیادی وجہ یہی تھی۔

یہاں مشاہیر علم وادب کے ذیل میں ان تینوں حضرات کا ذکر کرنے کا مطلب ان کی فکر ونظر سے اتفاق کرنا ہرگز نہیں۔ صرف ایسی اہم شخصیات کا تعارف مقصود تھا جو اس زمانے میں اسلامی محاذ پر کام کرتے رہے اور انہوں نے عالم اسلام پر گہرے اثرات چھوڑے۔ ان جدت پسند حضرات نے جہاں جہاں جمہور علماء سے اصولی یا فروعی اختلاف کیا ہے وہاں وہ قابل نکیر ہیں اور ان کی خود ساختہ آراء کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جائے گا۔

دوسرا باب

تاریخِ اَندَلُس

مسلمانوں کی آمد

سے

سقوطِ اَندَلُس تک

۹۲ھ تا ۸۹۷ھ

۷۱۱ء تا ۱۴۹۲ء

اندلس کا جغرافیہ

اندلس کے جغرافیے سے آگاہ ہوئے بغیر اس کی تاریخ پڑھنا یا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اسلامی اندلس کے سقوط کے بعد اسپین میں علاقوں کے نام بھی اس حد تک تبدیل ہو چکے ہیں کہ ان کی پہچان آسان نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ایک نظر یہاں کے جغرافیے پر ڈال لیں۔ جو قارئین اسپین کے جغرافیے سے آگاہ ہوں وہ ان اوراق کو چھوڑ کر براہ راست اس ملک کی تاریخ کا مطالعہ شروع کر سکتے ہیں۔

اسپین یا اندلس براعظم یورپ کا ایک مثلث جزیرہ نما ہے جو مغرب میں پرتگال اور شمال میں فرانس کے ساتھ لگتا ہے۔ اہل یورپ اس ملک کو اسپین یا ہسپانیہ اور عرب "اندلس" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لمبائی تقریباً گیارہ سو اور چوڑائی لگ بھگ چھ سو میل ہے۔

بحیرۂ روم (بحر متوسط) اسے مشرق اور جنوب سے گھیرے ہوئے ہے۔ جبکہ بحر اوقیانوس (اٹلانٹک) اس کے مغرب اور شمال میں ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ ملک کے جنوبی ساحل پر بحیرۂ روم تنگ ہو کر ایک چھوٹی سی خلیج میں تبدیل ہو کر بحر اوقیانوس سے مل جاتا ہے۔ اسے آبنائے جبل الطارق (Strait of Gibraltor) کہا جاتا ہے۔

ملک کے شمال میں نصف حصہ خلیج بسکی کے ساتھ لگتا ہے۔ نصف حصہ خشکی کا ہے جو جبل البرتات (Pyrenees) کے دشوار گزار سلسلے پر مشتمل ہے اور فرانس سے جا ملتا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ "کوہ برانس" بھی کہلاتا ہے۔

جنوبی ساحل:

اندلس کے جنوبی ساحلوں پر طریف اور الخضراء جیسے جزیروں کی سرسبزی و شادابی انسان کو مسحور کر دیتی ہے۔ یہیں قادس، شلب اور ولبہ کی خوبصورت ساحلی آبادیاں ہیں۔ جنوبی ساحل پر سب سے بڑا شہر مالقہ ہے جس کے اضلاع میں ریہ، ارشذونہ اور مربلہ شامل ہیں۔

بحیرۂ روم سے ۹۶ کلومیٹر دور، مالقہ کے شمال مغرب میں دریائے وادی الکبیر کے کنارے "اشبیلیہ" (Seville) دکھائی دیتا ہے۔ صوبہ اشبیلیہ کے تحت قرمونہ (Carmona)، اشونہ اور حصن الفرج کی آبادیاں بھی ہیں۔

جنوبی ساحل سے ۵۲ کلومیٹر دور پہاڑی شہر "غرناطہ" (Granada) ہے جو دریائے شنیل (Genil) کے کنارے

واقع ہے۔ یہ علاقہ پہلے "البیرہ" کہلاتا تھا، چوتھی صدی ہجری میں "غرناطہ" آباد ہوا تو "البیرہ" اس میں ضم ہوگیا۔
غرناطہ سے ۲۵ میل مغرب میں "لوشہ" (Loja) ہے جبکہ جنوب مشرق میں کوہ سیرا نویدا (Sierra nevada) کی برف پوش چوٹیاں ہیں۔ اسے جبل الثلج بھی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کوہ کا ایک حصہ "جبل شلیر" ہے جو اندلس کے جنوب مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ تقریباً ۳۰۰ کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ کوہ سیرا نویدا کی ڈھلوان پر غرناطہ کا مشہور قصبہ وادی آش (Guadix) ہے جس کے دامن میں دریائے آش بہتا ہے۔ سیرا نویدا کی چوٹیوں کے مشرق میں "جبل البشرات" ہے جس کے قریب بحیرۂ روم کی بندرگاہ "المریّہ" ہے۔

مشرقی علاقے:

مشرقی ساحل پر مشہور تجارتی شہر "بلنسیہ" (Valencia) ہے۔ شاطبہ (Jativa)، شقر (Alcira)، بندرگاہ دانیہ (Danie)، شقورہ (Segura) اور "لقنت" (Alicante) بلنسیہ کے ذیلی اضلاع ہیں۔
مشرقی ساحل پر ہی "قرطاجنہ" کی بندرگاہ ہے۔ یہاں دوسرا بڑا شہر "مرسیہ" ہے جو ساحل سے ۳۶ کلومیٹر دور ہے۔ دریائے شقورہ کے کنارے واقع یہ انتہائی زرخیز علاقہ اپنے باغات کی وجہ سے مشہور ہے۔ مرسیہ سے ۲۵ کلومیٹر جنوب مغرب میں "الحمہ" (Alhama) ہے۔ تدمیر اور لورقہ (Lorca) بھی اسی ضلع میں شمار ہوتے ہیں۔

وسطی علاقے:

اندلس کے وسطی حصے میں سب سے بڑا شہر "قرطبہ" (Cordoba) ہے جو کئی صدیوں تک یہاں کا سیاسی مرکز اور اسلامی تہذیب وثقافت کا اہم ترین منبع رہا۔ یہ دریائے وادی الکبیر کے کنارے واقع ہے۔
قرطبہ کے شمال میں ۲۹۲ کلومیٹر دور قدیم گاتھ حکمرانوں کا پایۂ تخت "طلیطلہ" (Madrid) ہے جو جزیرہ نما کے بالکل وسط میں ہے۔ یہ موجودہ اسپین کا بھی دارالحکومت ہے۔ اس کے اردگرد باغات اور نہروں کا جال بچھا ہے۔
طلیطلہ کے شمال میں "الشارات" (Mont des Sierra) کا عظیم سلسلۂ کوہ ہے جو اپنی سرسبزی وشادابی کے باعث بھیڑ بکریوں کی بہت بڑی چراگاہ ہے۔ یہ مدینہ سالم (Medinaceli) سے شروع ہو کر مغرب میں پرتگال کی سرحد تک چلا جاتا ہے۔ طلیطلہ کے علاوہ اس ضلع میں طلبیرہ (Talavera)، "الفمین" (Alafmin) اور "وادی الحجارۃ" (Guadalajarra) کے علاقے بھی آتے ہیں۔
جبل الشارات کے شمال میں نہ ختم ہونے والے پہاڑی سلسلے ہیں جن میں کٹر نصرانی باشندوں کی ریاستیں قسطلیہ، لیون اور آسٹریاس قائم ہوئی تھیں۔ یہ نصرانی "اندلس" کا اطلاق ان مسلم شہروں پر کرتے تھے جو "جبل الشارات" کے جنوب میں تھے۔ آج بھی اسپین میں غرناطہ، مالقہ، اشبیلیہ اور قرطبہ پر مشتمل جنوبی خطہ "اندلوسیا" کہلاتا ہے۔
طلیطلہ سے لگ بھگ ۲۰۰ کلومیٹر جنوب مغرب میں دریائے آنہ کے کنارے "ماردہ" کا مستحکم شہر ہے اور اس سے ۳۰ میل مغرب میں پرتگال کی سرحد پر "بطلیوس" (Badtoz) ہے۔ اس سے مزید مغرب میں جائیں تو دریائے

تاجہ کے کنارے ''القنطرہ'' نامی شہر ملے گا جہاں سے پرتگال کی سرحد صرف سات میل رہ جاتی ہے۔

شمال مشرقی علاقے:

ملک کے شمال مشرقی ساحل پر ''برشلونہ'' اہم ترین بندرگاہ ہے جبکہ جبل البرتات ((Pyrenees)) کی جنوبی ڈھلوانوں پر گنجان ترین شہر ''سرقسطہ'' ہے جو دریائے ابرہ کے کنارے واقع ہے۔ اسی دریا کے کنارے بحیرۂ روم کے قریب سنگ مرمر کی کانوں کے لیے مشہور شہر ''طرطوشہ'' (Tortosa) ہے۔ سرقسطہ کے شمال میں ۳۵ میل دور ایک شہر ''وشقہ'' (Osea) ہے جبکہ شمال مشرق میں ناقابل عبور چوٹیوں پر ''بربشتر'' (بارباسترو) نامی قلعہ ہے۔

شمالی علاقے:

شمالی اسپین کے پانچ مشہور صوبے ہیں:

(۱) لیون (Leon):

اس کا صدر مقام سمورہ (Zamora) ہے جو دریائے ڈویرہ کے کنارے آباد ہے۔ دوسرا اہم شہر ''شلمنقہ'' (Salamanca) ہے جو دریائے تاُمس کے ساحل پر ہے۔

(۲) قسطالیہ (Castilla):

اس میں قسطالیہ کے علاوہ شقوبیہ، برغوش، شنت اشتیبن اور غرماج کے قلعے مشہور ہے۔

(۳) بشکنس (Bosques):

بشکنس شہر، خلیج بسکی کے ساحل پر ہے۔ اس خلیج کو انگلش چینل بھی کہا جاتا ہے۔ بشکنس کا سارا علاقہ کوہستانی اور ساحلی ہے۔ صخرہ بلائی (Compostela)، الیسٹریاس، کانٹابریا اور ''البہ'' (Alava) یہاں کے مشہور شہر ہیں۔

(۴) جلیقیہ (Galacia):

یہ شمال مغربی اسپین کا ایک کوہستانی صوبہ ہے جو سطح سمندر سے بہت بلند ہے، اس کے مغربی پہاڑ سمندر تک چلے گئے ہیں۔ کرونہ، شنت مانکش، شنت بلایا، دیر قسطان، لکرونیا اور سینٹ یاقوب (سانتیا گو) اس کی اہم بستیاں ہیں۔

(۵) نبرہ یا ریاست نوار (Navarra):

اسپین کے انتہائی شمال میں واقع یہ ریاست کوہ البرتات ((Pyrenees)) کے مشرقی اور مغربی سلسلوں کے بیچ میں ہے۔ یہاں سے فرانس کے لیے تین شاہراہیں نکلتی ہیں اس لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

ریاست نوار کا صدر مقام ''بنبلونہ'' (Pampplona) ہے جسے مشہور رومی حکمران پومپئی نے از سرِ نو تعمیر کرایا تھا۔ بقیرہ (Vigvera)، ناجرہ (Natera) اور بیونہ (Bayonne) بھی اس کے شہر ہیں۔ بیونہ فرانس کے مغربی ساحل سے جا لگتا ہے اور فرانس کے لیے ایک شاہراہ یہاں سے نکلتی ہے۔

+++

اسپین سے فرانس کے راستے:

قدیم دور میں اسپین سے فرانس میں داخل ہونا نہایت مشکل تھا۔ بیچ میں کوہ البرتات (Pyrenees) پڑتا ہے جس میں اس وقت میں صرف چار یا پانچ گھاٹیاں تھیں جن میں بیک وقت ایک گھڑسوار گھس سکتا تھا۔ ہر گھاٹی میلوں لمبی تھی اور اس کے دائیں، بائیں پہاڑوں پر نصرانیوں کی آبادیاں تھیں۔ ان گھاٹیوں کو عرب مورخین "ابواب" کہتے تھے۔ بُرتات، بُرت کی جمع ہے، اصل میں یہ لاطینی لفظ "پورٹ" (port) ہے جس کا مطلب گزرگاہ یا بندرگاہ ہے۔

ان ابواب میں پہلی گھاٹی برشلونہ کے شمال میں "جاقہ" (Jaca) شہر کے پاس تھی جسے "بُرت جاقہ" کہتے تھے۔ آج کل اسے (Perpignan) کہا جاتا ہے۔ یہاں سے فرانس کے شہروں: جیرونہ (Gerona) اور "اربونہ" تک سڑک جاتی ہے۔

اس سے کچھ فاصلے پر دوسری گھاٹی "بُرت اشبرہ" تھی جو (Port Asperi) یا (Somport) کہلاتی ہے۔

تیسری گھاٹی "بُرت شیزرو" (Port Cisereus) بنبلونہ کے پاس تھی۔ یہ ۳۵ میل لمبی تھی۔ اسے "رُنشفالہ" بھی کہا جاتا تھا۔ یہ فرانس کے شہر "شنت جوان" (saint jean) تک جاتی ہے۔ عبدالرحمٰن الغافقی نے ۱۱۴ھ میں اسی راستے سے فرانس پر حملہ کیا تھا۔ نیز شاہ فرانس شارلیمین نے ۱۹۱ھ میں یہیں سے اسپین پر فوج کشی کی تھی۔

چوتھی گھاٹی "بُرت بیُونہ" (Bayonne) تھی۔ بیونہ فرانس کے جنوب مغربی ساحل کا ایک شہر ہے۔ اسپین کے شمالی شہر طلوشہ (Tolosa) سے سڑک یہاں تک جاتی ہے۔

پانچویں گھاٹی "بوئیگردا" (Puigcerda) ہے جو "شرطانیہ" (Cerdana) کے قریب ہے۔

مغربی علاقے:

اسپین کے مغرب میں پرتگال واقع ہے، پہلے یہ بھی اسپین کا ایک صوبہ تھا۔ لشبونہ (لزبن) اس کا صدر مقام ہے جس سے ۱۲ میل شمال میں "شنترہ" ہے۔ اسی علاقے میں دریائے تاجہ کے ساحل پر "شنترین" ہے۔ پرتگال میں ساحل سمندر پر شنت ماریہ (سانٹا ماریا) کی قدیم بندرگاہ ہے۔ قُلُمریہ بھی اسی صوبے میں ہے۔

اسلامی اندلس کے مختلف ادوار

اسلامی اندلس کی اسلامی تاریخ آٹھ صدیوں پر محیط ہے۔ اس دوران اس ملک پر کئی ادوار گزرے۔ کئی بار ایسا لگا کہ اب یہاں سے اسلامی حکمرانی کا خاتمہ ہونے کو ہے۔ مگر ہر بار قدرتِ الٰہیہ نے کسی متبادل قوت کو بھیج کر یہاں کے مسلمانوں کو نئی زندگی دی۔ مسلمانوں نے آٹھ صدیوں تک یہاں بڑی شان و شوکت سے حکومت کی مگر اتنے طویل زمانے میں بھی وہ اسے کبھی مکمل اسلامی ملک بنانے میں کامیاب نہیں ہو پائے۔ شمالی اندلس کا علاقہ اکثر ادوار میں آزاد رہا اور وہاں مسلمانوں کے خلاف نصرانی طاقتیں مجتمع ہوتی رہیں۔

اندلس کی تاریخ سبق آموز بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ اس کے ساتھ یہ خاصی پیچیدہ اور الجھی ہوئی بھی ہے۔ ہم یہاں اس کے الگ الگ ادوار کا مختصر سا تعارف پیش کرتے ہیں تاکہ بعد میں ہر دور کا مطالعہ آسان محسوس ہو۔

پہلا دور۔ دورِ ولایت: ۹۵ تا ۱۳۲ھ (۷۱۳ء تا ۷۵۰ء)

یہ دور اندلس کی فتح کی تکمیل کے بعد شروع ہوتا ہے اور ۱۳۲ھ تک رہتا ہے۔ اس دور میں یہاں کا انتظام شام کے اُموی خلفاء کے ماتحت اُمراء کے پاس تھا جنہیں والی کہا جاتا تھا۔ ان میں سے پہلا والی عبدالعزیز بن موسیٰ تھا اور آخری یوسف بن عبدالرحمٰن فہری۔ ۱۳۲ھ میں شام کی اُموی خلافت ختم ہوتے ہی یہاں ولایت کی قانونی حیثیت بھی ختم ہوگئی اور سیاسی انتشار پیدا ہوگیا جو چھ سال تک جاری رہا۔

دوسرا دور۔ امارتِ بنواُمیّہ: ۱۳۸ھ تا ۴۲۳ھ (۷۵۶ء تا ۱۰۳۱ء)

اس دور کا آغاز بنواُمیّہ کے شہزادے امیر عبدالرحمٰن الداخل کے اندلس پر غلبے سے ہوا اور اختتام ہشام المعتد پر۔ عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس آکر اس ملک کو متحد کیا اور آزاد اُموی حکومت قائم کی جو ۲۸۵ سال تک باقی رہی۔ اس خاندان کے آٹھویں حکمران امیر عبدالرحمٰن ثالث نے خلیفہ کا لقب اختیار کر لیا تھا جس کے بعد یہاں کے ہر حکمران کو خلیفہ کہا جانے لگا۔

۳۶۶ھ میں دسویں حکمران ہشام مؤید باللہ کی تخت نشینی کے ساتھ ہی ایک طاقتور امیر ابن ابی عامر نے عملی طور پر حکومت خود سنبھال لی جس کے بعد اُموی خلیفہ کی حیثیت برائے نام رہ گئی۔ کچھ عرصے ابن ابی عامر کی اولاد خلفاء کی سرپرست اور عملاً حکمران رہی۔ پھر بنوحمود ان پر مسلط ہوگئے۔ یوں خلفائے اندلس نے تقریباً ۵۷ سال عضوِ معطل بن کر گزارے۔

تیسرا دور۔ ملوک الطوائف: ۴۰۰ھ تا ۴۸۴ھ (۱۰۱۰ء تا ۱۰۹۱ء)

اُمویانِ اندلس کے زوال کے ساتھ ہی اندلس میں مسلم امراء نے جگہ جگہ خود مختار حکومتیں قائم کرنا شروع کر دیں۔ یہ حکمران ملوک الطوائف کہلائے۔ ان میں بنوجہور، بنوزیری، بنوہود، بنوافطس، بنوذی النون اور بنوعباد مشہور تھے۔ پون صدی سے زائد مدت تک ان کی باہمی کش مکش جاری رہی۔ ان کے انتشار اور ناعاقبت اندیشی نے اندلس میں نصرانیوں کو بالادستی کا بھرپور موقع دیا جس سے یہاں مسلمانوں کے خاتمے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔

چوتھا دور۔ مرابطین: ۴۸۴ھ تا ۵۴۱ھ (۱۰۹۱ء تا ۱۱۴۷ء)

مسلمانانِ اندلس کا دم لبوں پر دیکھ کر مراکش کے حکمران یوسف بن تاشفین نے اندلس میں مداخلت کی اور یہاں اپنی حکومت قائم کر کے مسلمانوں کو ایک نئی زندگی بخش دی۔ یہ حکومت ۵۶ سال چلی۔ اس کا آخری حکمران تاشفین بن علی مؤحدین کے ہاتھوں مارا گیا۔

پانچواں دور۔ مؤحدین: ۵۴۱ھ تا ۶۲۹ھ (۱۱۴۷ء تا ۱۲۳۲ء)

مؤحدین نے چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں افریقہ میں قوت پکڑی اور رفتہ رفتہ مرابطین پر بھی غالب آگئے۔

موحدین کا پہلا حکمران عبدالمومن تھا اور آخری محمد الناصر۔ اندلس میں ان کی حکومت ۸۴ سال برقرار رہی۔ موحدین کے بعد اندلس میں مسلمانوں کے پاس صرف چند جنوبی شہر رہ گئے جن کے مجموعے کو 'اندلس صغریٰ' کہا گیا۔

چھٹا دور۔ اندلس صغریٰ۔ غرناطہ کے بنو نصر: ۶۲۹ھ تا ۸۹۸ھ (۱۲۳۲ء تا ۱۴۹۲ء)

اندلس صغریٰ میں مسلمانوں کا آخری مورچہ غرناطہ تھا جہاں خاندان بنو نصر کی حکومت تھی۔ اس حکومت کا بانی محمد بن یوسف عرف ابن الاحمر جبکہ آخری حکمران ابوعبداللہ تھا۔ یہ حکومت ۲۶۹ سال تک قائم رہی۔ آخر میں نصرانیوں نے اس پر بھی قبضہ کر کے اندلس کی آٹھ سو سالہ اسلامی تاریخ کا باب بند کر دیا۔

اندلس کی تاریخ کے اس اجمالی ذکر کے بعد اب ہم اس خطے کی تاریخ کا باقاعدہ مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

♦♦♦

اندلس کی قدیم تاریخ

اندلس کے قدیم باشندوں کا تعلق "سلت" نامی ایک قوم سے تھا جو فرانس سے آئی تھی۔ ان کے علاوہ دو مزید اقوام یعنی آئی بیرتی اور لگوری بھی یہاں آباد تھیں۔ یہاں فنیقی، یونانی اور قرطاجنی اقوام بیرونی حملہ آوروں کے طور پر یکے بعد دیگرے قابض رہیں۔ تقریباً اڑھائی سو سال قبل از مسیح میں رومیوں نے یہاں قبضے کی کوشش شروع کردی۔ ان کی قرطاجنیوں سے جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جنہیں "پیونک کی جنگیں" کہا جاتا ہے۔ ان میں سے تیسری اور آخری جنگ میں جو دو سو سال قبل از مسیح ہوئی، قرطاجنی بالکل تباہ ہو گئے اور رومی اس ملک پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے پانچ صدیوں تک یہاں حکومت کی۔ اس دور میں اندلس ایک خوشحال ملک شمار ہوتا تھا۔ سلطنتِ روما کے چار مشہور شہنشاہ: ٹریجان، ہیڈرین، مارکس آریلیس اور تھوڈوسیس اندلس میں پیدا ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں کئی نامور شخصیات پیدا ہوئیں، مثلاً: نامور مفکر سینیکا جو رومی بادشاہ نیرو کا اُستاذ تھا اور ۶۵ سال قبل از مسیح فوت ہوا تھا۔ نامور ادیب لوشن جس کے خیالی مکالمات کو بڑی شہرت ملی۔ اسی طرح رومی شاعر مارشل بھی اندلس میں پیدا ہوا تھا۔

جب سلطنتِ بازنطینی روما زوال پذیر ہوئی تو اندلس پر بھی اس کی گرفت مضبوط نہ رہی اور شمالی یورپ کی وحشی اقوام نے اندلس پر حملے شروع کر دیے۔ انہی میں سے ایک قوم "گاتھ" (جسے عربی میں قوط کہا جاتا ہے) نے چھٹی صدی ہجری میں اس ملک کو پوری طرح مسخر کر لیا۔ حضور نبی کریم ﷺ اور حضرات خلفائے راشدین کے دور میں یہی قوم اندلس پر قابض تھی۔

اندلس پر قبضے کے بعد گاتھ قوم نے اُن لاطینی اقوام میں خلط ملط ہو کر جو پہلے سے یہاں آباد تھیں، لاطینی زبان اختیار کرلی۔ پھر انہی کے اثر سے نصرانی مذہب قبول کرلیا۔ مگر یہ میل ملاپ نوابوں، سرکاری افسران اور سرمایہ داروں کے بالادست طبقات ہی میں ہوا تھا۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے، وہ مسلسل غلامی کی حالت میں تھے اور شاہی خاندانوں یا حکمران قوم کی تبدیلی سے ان کی حالت میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ اس کس مپرسی میں وہ ہر غالب طاقت کی اطاعت پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

ساتویں صدی عیسوی میں جب دنیائے اسلام پر بنو اُمیہ کی حکمرانی تھی، اندلس میں خود گاتھ قوم کا یہ حال تھا کہ اس کے نواب اور رؤساء ہر وقت باہم دست و گریبان رہتے تھے اور بیک وقت درجنوں اُمراء بادشاہت کے امیدوار ہوتے

تھے۔ یک جہتی مفقود تھی اور عوام کا جو مزدوری کرنے اور زمینیں کاشت کرنے پر مامور تھے، کوئی پرسان حال نہ تھا۔ [1]

اس دور حکومت میں پادریوں کے پاس بے پناہ اختیارات آگئے تھے۔ اہل شمشیر اور اہل کلیسا کے باہمی گٹھ جوڑ سے ملک کے تمام تر وسائل چند خاندانوں کے ہاتھ میں محدود ہو چکے تھے۔ اندلس کے عوام پادریوں کے جابرانہ نظام کے تحت سخت جبر و مشقت کی زندگی گزار رہے تھے۔ کسانوں کی حیثیت غلاموں سے بھی بدتر تھی اور جاگیرداران کی زندگی اور موت کے مالک تھے۔ پادریوں کی اجارہ داری کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ انتظامی قوانین بھی ان کی مرضی کے مطابق طے کیا کرتے تھے۔ زراعت، تجارت، ملکیت اراضی اور غلامی سے متعلقہ تمام اُمور میں پادری دخیل تھے۔

یہاں سب سے بُری حالت یہودیوں کی تھی۔ وہ ایک طرف عوام اور دوسری طرف حکام کے بغض اور نفرت کا نشانہ تھے۔ انہیں ہر طرح کی ذلتوں اور اذیتوں کا تختۂ مشق بنایا جاتا تھا۔ ملک میں پادریوں کی اجارہ داری ہو چکی تھی اور وہ یہودیوں کو جبراً نصرانیت قبول کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ بہت سے یہودی تنگ آکر ملک سے بھاگ گئے اور بہت سوں نے جان بچانے کے لیے ظاہری طور پر نصرانیت قبول کر لی مگر انہیں شک وشبہ کی نگاہ سے ہی دیکھا جاتا تھا۔

شاہ اِجیکا کے دور میں ۶۹۴ء (۷۵ھ) میں کلیسا کے ارباب اختیار نے فیصلہ سنایا کہ اندلس کے یہودیوں کی تمام املاک ضبط کر لی جائیں اور انہیں مقامی نصرانیوں کا غلام بنا دیا جائے اور ان کے بچے جب سات برس کے ہوں تو انہیں چھین کر پادریوں کے حوالے کر دیا جائے تاکہ ان کی پرورش اور تربیت نصرانی مذہب پر ہو۔ [2]

اِجیکا کا بیٹا وِتیزا (جو گاتھ قوم کا آخری بادشاہ تھا) کلیسا کے غیر محدود اختیارات کے خلاف تھا۔ اس نے یہودیوں کے خلاف کلیسا کے فیصلوں کو کالعدم قرار دے دیا۔ اس اقدام پر پادری اس کے خلاف ہو گئے۔ انہوں نے سازشیں کر کے اُسے معزول کرا دیا اور اس کی جگہ ایک سخت گیر افسر راڈرک کو تخت پر بٹھا دیا جس نے ظلم وتشدد سے ملک میں ایسا اندھیر مچایا کہ ہر طرف آہ و بکا کی صدائیں گونجنے لگیں۔ [3]

اس دوران عرب میں اسلام کی روشنی پھیل چکی تھی اور اہل ایمان کے لشکر افریقہ تک پہنچ چکے تھے۔ ۲۷ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فرمان پر ایک لشکر نے پہلی بار اندلس پر آزمائشی حملہ کیا۔ پھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں اندلس پر دوسرا آزمائشی چھاپہ مارا گیا۔ آخر میں ولید بن عبدالملک کے دور میں افریقہ کے امیر موسیٰ بن نصیر اور مسلم فاتح طارق بن زیاد نے یہاں کامیاب یلغار کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو افریقہ فتح کرنے اور خاص کر وہاں کے جنگجو بربروں پر قابو پانے میں تقریباً پچاس برس لگ گئے مگر پورے اسپین پر قبضے میں انہیں ایک سال بھی نہیں لگا۔

۵ رجب ۹۲ھ (۷۱۱ء) کو طارق کا لشکر اندلس کے ساحل پر جبل الطارق کے سامنے لنگر انداز ہوا۔ ابتدائی معرکوں

---

(1) یہ تمام تر بیان فرانسیسی مؤرخ گستاؤلی لیبان کا ہے۔ ملاحظہ ہو: "تمدن عرب" مترجم سید علی بلگرامی، ص ۲۳۵، ب ۳، ج ۲، مطبوعہ حیدر آباد دکن

(2) دولة الاسلام فی الاندلس: ۱/۳۰ تا ۳۲، نفح الطیب: ۱/۹۹، الکامل فی التاریخ: سنة ۹۲ھ

(3) دولة الاسلام فی الاندلس: ۱/۳۲، ۳۳، نفح الطیب: ۱/۹۹، الکامل فی التاریخ: سنة ۹۲ھ

کے بعد ۲۷ رمضان المبارک ۹۲ھ (۱۹ جولائی ۷۱۱ء) کو بارہ ہزار افراد پر مشتمل اسلامی لشکر اور راڈرک کی ٹڈی دل فوج کا آمنا سامنا ہوا۔ کئی دنوں تک جنگ کے بعد آخر ۵ شوال کو نصرانی پسپا ہو گئے اور راڈرک دریائے گواڈالیٹ میں غرق ہو گیا۔ اس کے بعد مسلمان راستے کے شہروں کو چھوڑتے ہوئے استجہ (Ecija) پہنچے۔

یہاں سے طارق بن زیاد نے الگ الگ سمتوں میں کئی افواج روانہ کیں۔ سات سو سپاہیوں نے ولید بن عبدالملک کے غلام مغیث کی قیادت میں شوال ۹۲ھ میں قرطبہ فتح کر لیا۔ دوسری افواج نے مالقہ، البیرہ یعنی غرناطہ، تدمیر اور جیان پر قبضہ کیا۔ کئی شہر بغیر جنگ کے فتح ہو گئے۔ ربیع الآخر ۹۳ھ میں طارق نے گاتھ بادشاہوں کا پایہ تخت طلیطلہ بھی فتح کر لیا۔

رمضان ۹۳ھ میں موسیٰ بن نصیر نے بھی ایک فوج لے کر آبنائے کو عبور کر لیا اور اپنا پڑاؤ الجزیرۃ الخضراء پر لشکر انداز کر کے یہاں ایک مسجد تعمیر کی جو "مسجد الرایات" کہلائی۔ اس لشکر نے پہلے شذونہ اور پھر اسپین کا نہایت مستحکم شہر قرمونہ فتح کیا۔ اس کے بعد اشبیلیہ پر حملہ کیا جو گاتھ حکمرانوں سے قبل اسپین کا دارالحکومت تھا۔ کئی ماہ کے محاصرے کے بعد یہ شہر بھی سرنگوں ہو گیا۔

اگلا حملہ "ماردہ" پر ہوا جس کی فصیل ۲۷ فٹ اونچی اور ۱۸ فٹ موٹی تھی۔ آخر شوال ۹۴ھ میں اسے بھی مسخر کر لیا گیا۔ اسی سال موسیٰ کے بیٹے عبدالعزیز کی قیادت میں ایک فوج نے جنوب مشرقی ساحل کا رخ کر کے "تدمیر" اور اس کے نواحی علاقے بھی فتح کر لیے جن میں قرطاجنہ اور مُرسیہ شامل تھے۔

ذوالقعدہ ۹۴ھ میں موسیٰ نے طلیطلہ کی سمت کوچ کیا۔ شہر سے ۱۵۰ کلومیٹر مغرب میں طلبیرہ (Talavera) میں دونوں فاتحین کی ملاقات ہوئی اور دونوں ایک ساتھ طلیطلہ پہنچے اور شمالی اسپین کی فتح کا نقشہ طے کیا۔

اب لشکر کشی اس طرح شروع ہوئی کہ پہلے طارق کا لشکر کسی شہر کا محاصرہ کرتا، پیچھے موسیٰ بن نصیر کی افواج کمک اور شہر کا انتظام سنبھالنے کے لیے آن پہنچتیں۔ پہلے شمال مشرق میں سرقسطہ کا شہر کسی بڑی لڑائی کے بغیر لے لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی برشلونہ اور "وشقہ" جیسے نواحی شہر بھی سر کر لیے گئے۔ مشرقی ساحلی شہر بلنسیہ، شاطبہ اور دانیہ بھی اسی مہم میں فتح ہو گئے۔ اس کے بعد طارق اور موسیٰ نے دو الگ الگ خطوط پر یلغار کی۔

طارق نے سرقسطہ سے شمال مغرب کی طرف پیش قدمی کی اور "کوہ کانٹ باریا" سے گزر کر "جلیقیہ" کے شہر امایہ (Amaya)، استرقہ (Astorga) اور "لیون" فتح کر لیے۔ جبکہ موسیٰ بن نصیر نے شمال مشرق کا رخ کر کے بنبلونہ، نوارہ، وادی ابرو، البہ اور قسطلیہ کو سرنگوں کر لیا۔ اس کے بعد "استرقہ" میں دونوں قائدین ایک بار پھر آپس میں آن ملے۔ ان دونوں فاتحین کی کوششوں سے ذوالحجہ ۹۵ھ تک پورا اندلس فتح ہو گیا۔

اس کے بعد موسیٰ بن نصیر نے فرانس کی فوجی طاقت کا اندازہ لگانے اور وہاں کے راستے دیکھنے بھالنے کے لیے کچھ دستے کوہ البرتات ((Pyrenees)) میں داخل کیے جو فرانس کی سرحدوں پر چھاپے مار کر واپس آ گئے۔

یہ مہمات جاری تھیں کہ نئے اُموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کو واپس بلا لیا۔[1]

مسلمانوں کی حکومت کا اس ملک پر اثر:

اندلس میں مسلمانوں کی حکومت یہاں ایک نئے دور کا آغاز تھا جس نے یہاں کے لوگوں کو صدیوں بعد حقیقی آزادی عطا کی اور انہیں عدل وانصاف اور انسانی سلوک جیسی نعمتوں سے بہرہ ور کیا۔ کفر اور جہالت کے اندھیرے دور ہوگئے اور یہاں ایمان کی روشنی پھیلنے لگی۔ اخلاق وآداب عام ہوئے۔ علوم وفنون کے دروازے کھل گئے اور زراعت وحرفت اور صنعت وتجارت کو خوب ترقی ملی جس کے باعث عام شہری بھی خوشحال اور مالا مال ہونے لگے۔

مستشرق ڈوزی لکھتا ہے:

''اسلامی حکومت میں نصرانیوں کا حال ایسا نہ تھا کہ انہیں کوئی شکایت ہوتی کیوں کہ وہ سابقہ دور سے بہتر حالت میں تھے۔ عرب ان سے رعایت برتتے تھے۔ ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ حکومت جو کہ زیادہ مذہب پسند نہ تھی، انہیں اسلام قبول کرنے کی ترغیب نہیں دیتی تھی، کیوں کہ اس طرح اس کی آمدن میں بہت کمی ہوسکتی تھی۔ نصرانی عربوں کے اس حسن سلوک کی ناقدری نہیں کرتے تھے۔ بلکہ فاتحین کی طرف سے رعایت اور انصاف کی تعریف کیا کرتے تھے۔''[2]

گستاؤلی بان لکھتا ہے:

''عربوں نے اندلس کے باشندوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا، جو انہوں نے شام اور مصر میں کیا تھا۔ ان کا مال، اُن کے کلیسے، اُن کے قوانین اُنہیں دیے اور اپنے ہم قوم حکام کے زیر انصاف رہنے کے حقوق انہیں عطا کیے گئے۔ ایک سالانہ جزیہ چند شروط کے ساتھ ان پر لگایا گیا جو اُن کے اُمراء کے لیے ایک سرخ دینار اور عوام کے لیے نصف دینار تھا۔ یہ شرائط اس قدر نرم تھیں کہ رعایا نے بلا تکرار انہیں قبول کر لیا۔''[3]

◆◆◆

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۱/ ۲۳۸ تا ۲۴۰؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۹۲ تا ۹۵ھ؛ التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، عبدالرحمن علی: ص ۶۰ تا ۹۹
ملحوظہ: ان فتوحات کی تفصیل تاریخ اُمت مسلمہ جلد سوم میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے حالات کے تحت آچکی ہے، اس لیے یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

② دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۶۳

③ ''تمدن عرب'' مترجم سید علی بلگرامی: ص ۲۲۸، ۲۲۹؛ طبع حیدرآباد دکن

اَندُلس کا دورِ ولایت

عبدالعزیز بن موسیٰ سے یوسف بن عبدالرحمٰن فہری تک

۹۵ھ تا ۱۳۲ھ

(۷۱۳ء تا ۷۵۰ء)
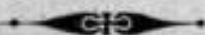
۳۷ سال

اَندلُس میں اُمراء کا تانتا

موسیٰ بن نصیر نے دارالخلافہ دمشق جاتے ہوئے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اندلس کا حاکم اور عقبہ بن نافع کے پوتے حبیب کو اس کا وزیر مقرر کر دیا تھا۔ اس کے بعد موسیٰ بن نصیر کو سلیمان بن عبدالملک کے عتاب کا نشانہ بننے کی وجہ سے اندلس واپس جانے کا موقع نہ مل سکا۔

عبدالعزیز بن موسیٰ: (۹۵ھ تا ۹۷ھ)

عبدالعزیز بن موسیٰ اندلس میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالے رہا۔ یوں اسے اندلس کا پہلا والی ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ابھی دو برس گذرنے نہ پائے تھے کہ فوج میں عبدالعزیز کے متعلق نفرت انگیز قصے مشہور ہو گئے۔ عبدالعزیز نے اسپین کے سابق بادشاہ راڈرک کی ملکہ ''اجیلونا'' سے شادی کر لی تھی۔ مشہور ہو گیا کہ عبدالعزیز اس کی خوشنودی کے لیے خلوت کدے میں ہیرے جواہرات سے مرصع تاج پہننے لگا ہے۔ عرب اور بربر امراء ان تکلفات کو شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس الزام کی شہرت نے عبدالعزیز کی ساکھ کو بہت نقصان پہنچایا۔

پھر یہ افواہ بھی پھیلی کہ وہ نصرانی مذہب کی طرف مائل ہو چکا ہے۔ اس پر فوج کے چند امراء نے مشتعل ہو کر اس کے قتل کا منصوبہ بنا لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ حکم خود خلیفہ سلیمان کا تھا کیوں کہ اسے خدشہ تھا کہ کہیں موسیٰ بن نصیر کی اولاد اندلس پر اپنی بادشاہت قائم نہ کر لے۔ رجب ۹۷ھ (مارچ ۷۱۶ء) میں ایک دن عبدالعزیز مسجد میں فجر کی نماز پڑھا رہا تھا، سورۂ فاتحہ ختم کر کے سورۂ واقعہ کی تلاوت شروع کی تھی کہ اچانک باغی امراء تلواریں سونت کر اس پر حملہ آور ہو گئے۔ اس کا سر دھڑ سے جدا کر کے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے پاس بھیج دیا گیا۔ موسیٰ بن نصیر کو بیٹے کے قتل کی خبر ملی تو اس پر لگائے گئے الزامات کو مسترد کرتے ہوئے کہا: ''اسے شہادت مبارک ہو۔ وہ روزہ دار اور تہجد گزار تھا۔''[1]

ایوب بن حبیب: (۹۷ھ)

عبدالعزیز کے قتل کے بعد امرائے لشکر نے ایوب بن حبیب کو عارضی طور پر اپنا نیا والی چن لیا۔ ایوب موسیٰ بن نصیر کا بھانجا تھا اور ایک نیک و صالح انسان تھا۔ اس نے قُرطُبہ کو اسلامی اندلس کا دارالحکومت بنا دیا۔ موسیٰ بن نصیر سے رشتہ داری کے باعث اسے جلد معزول کر دیا گیا۔

حُر بن عبدالرحمٰن: (۹۸ھ تا ۱۰۰ھ)

اب خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی طرف سے مقرر کیے گئے افریقہ کے حاکم نے حر بن عبدالرحمٰن ثقفی کو اندلس کا نیا

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۹۷ھ؛ البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۳ تا ۲۵

والی بنا کر بھیج دیا۔ اس نے ۹۸ھ سے ۱۰۰ھ تک حکومت کی۔ اس نے اشبیلیہ کو اپنا دار الحکومت بنالیا۔ [1]

سمح بن مالک خولانی: (۱۰۰ھ تا ۱۰۲ھ)

اب تک اندلس کا صوبہ افریقہ کے ماتحت تھا اور یہاں کے والی کا تقرر افریقہ کا حاکم کیا کرتا تھا مگر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اندلس کو ایک مستقل صوبے کا درجہ دیتے ہوئے افریقہ سے الگ کر دیا اور یہاں کے حاکم کا تقرر خلیفہ سے متعلق کر دیا۔ انہوں نے سمح بن مالک خولانی کو اندلس کا امیر مقرر کر کے بھیجا اور انہیں تاکید کی کہ وہ عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کریں اور وہاں شریعت کا نفاذ کریں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی ہدایت پر سمح بن مالک نے قرطبہ کے قریب دریائے وادی الکبیر پر ایک عظیم الشان پل بھی تعمیر کرایا تھا۔ سمح بن مالک نے اپنے فرائض نہایت خیر وخوبی سے انجام دیے۔ [2]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی وفات کے بعد نئے خلیفہ یزید بن عبدالملک کے دور میں سمح بن مالک نے فرانس کی جانب پیش قدمی کی اور جبل برانس (پرینیز) سے گزر کر ریاست نار من کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد اسلامی لشکر ریاست ایکی ٹن پر حملہ آور ہوا اور اس کے دار الحکومت ٹولوس کو گھیر لیا۔ یہاں بڑی خونریز جنگ ہوئی جس میں امیر سمح بن مالک نے بہت سے مجاہدین سمیت شہادت پائی۔ باقی لشکر نائب سالار عبدالرحمن غافقی کی قیادت میں پیچھے ہٹ کر کوہ برانس کے دامن میں آ گیا۔ [3]

امرائے اندلس نے عبدالرحمن بن عبداللہ الغافقی کو اپنا حاکم منتخب کر لیا۔ مگر اس دوران یزید بن عبدالملک نے اندلس کو دوبارہ افریقہ کی ولایت کے ماتحت کر دیا تھا، لہٰذا افریقہ کے حاکم یزید بن ابی مسلم کی طرف سے عبدالرحمن الغافقی کو جلد معزول کر دیا گیا اور بنوکلب کے عَنبَسہ بن سُحَیم کا تقرر کر دیا گیا۔ [4]

عَنبَسہ بن سُحَیم کلبی: (۱۰۳ھ تا ۱۰۷ھ)

عَنبَسہ بن سُحَیم نے چار سال آٹھ ماہ اندلس پر حکومت کی۔ ۱۰۵ھ میں عَنبَسہ بن سُحَیم نے فرانس پر فوج کشی کی اور ضلع ''کرسون'' کے کچھ حصے کے علاوہ صوبہ ''سپٹی مینیا'' کو بھی مسخر کر لیا۔ پھر وسطی فرانس کا رخ کیا اور دریائے رہون عبور کر کے ''لیانس''، ''برگنڈی'' اور ''اوٹن'' کو بھی فتح کر لیا۔ فرانسیسیوں نے مسلمانوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے چھاپہ مار حملے شروع کر دیے جن سے مسلمانوں کو خاصی مشکلات پیش آنے لگیں۔ ایسے ایک حملے کو پسپا کرنے کی کوشش کے دوران امیر عَنبَسہ نے شدید زخمی ہو کر شہادت پائی۔ مسلمان پیچھے ہٹ کر ''ناربونہ'' آ گئے۔ [5]

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۵

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۶

③ التاریخ الاسلامی العام لدکتور علی ابراهیم حسن: ص ۳۱۶

④ البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۶

⑤ البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۷

۱۰۷ھ تا ۱۱۲ھ کے حکام:

امرائے اندلس نے وقتی طور پر بنوفہر کے ایک عرب سردار عذرہ بن عبداللہ کو عارضی طور پر اپنا حاکم بنالیا۔ اس کے بعد حاکم افریقہ نے نیا والی بھیج دیا۔ بہر کیف خاصے دنوں تک یہاں کوئی ایسا حاکم نہیں آیا جس کی کارکردگی قابل ذکر ہو۔ حکام کا عزل ونصب بار بار ہوتا رہا۔

عبدالرحمن بن عبداللہ غافقی: (۱۱۲ھ تا ۱۱۴ھ)

۱۱۲ھ میں یہاں نامور مسلم جرنیل عبدالرحمن بن عبداللہ الغافقی کا تقرر ہوا۔ غافقی نے اندلس کے انتظامات کو بہتر بنایا اور تمام معاملات کو سدھار دیا۔ ۱۱۴ھ میں بھرپور تیاریوں کے ساتھ آٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر اسلام ایک بار پھر فرانس روانہ ہوا۔ اس نے فرانس کی بندرگاہ بورڈو پر قبضہ کیا اور پھر دریائے ڈاردون کے کنارے جنوبی فرانس کے حکمران ڈیوک آف ایکی ٹن کو شکست دے کر "پائی ٹیرس" فتح کرلیا اور "تورس" (طلوشہ) کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ اس صورتحال میں ڈیوک آف ایکی ٹن نے وسطی فرانس کے حکمران چارلس مارٹل سے مدد طلب کی۔ جرمنی اور پرتگال کی افواج بھی فرانس کو بچانے کے لیے آگئیں۔ آخر تورس کی وادی میں آٹھ ہزار مسلمانوں کا تین ممالک کے ٹڈی دل لشکر سے سامنا ہوا۔ ۱۵ شعبان ۱۱۴ھ (۱۹ اکتوبر ۷۳۲ء) کو گھمسان کی جنگ ہوئی۔ مسلمانوں نے شجاعت کی نئی داستانیں رقم کردیں مگر دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، چنانچہ عبدالرحمن الغافقی اسی جنگ میں ہزارہا مسلمانوں سمیت شہید ہوگئے۔ یہ شہادت گاہ "بلاط الشہداء" کے نام سے مشہور ہے۔[1]

اس شکست کے بعد بھی جنوبی فرانس کا ایک وسیع علاقہ مسلمانوں کے پاس رہا۔ عقبہ بن حجاج کی جگہ عبدالملک بن قطن نے حکومت سنبھال لی اور دو سال تک اس عہدے پر رہا۔

عقبہ بن حجاج سلولی: (۱۱۶ھ تا ۱۲۱ھ)

۱۱۶ھ میں عقبہ بن حجاج کو اندلس کا حاکم بنایا گیا۔ یہ بڑا زبردست منتظم تھا۔ اس نے اندلس کی تمام انتظامی کمزوریوں کو دور کردیا۔ بددیانت اور خائن افسران کو کسی رعایت کے بغیر برطرف کردیا اور تمام شعبوں کو بہت بہتر بنادیا۔ اس نے شاہراہوں کی حفاظت کے لیے گھڑسوار سپاہیوں کا الگ محکمہ قائم کیا۔ ہر بستی میں عدالتیں قائم کیں اور نئی مساجد اور مدارس کی بنیاد رکھی۔ اس طرح اندلس کا شمار امن وامان اور ترقی کے لحاظ سے عالم اسلام کے مثالی صوبوں میں ہونے لگا۔

عقبہ بن حجاج کے دور میں شمالی اندلس کے قلعوں پر کئی حملے کیے گئے۔ جبلونہ، جلیقیہ اور اربونہ فتح ہوئے اور وہاں مسلمانوں کو بسایا گیا۔ عقبہ بن حجاج کی عادت تھی کہ جب اس کے پاس فرنگی قیدی لائے جاتے تو وہ انہیں قتل نہیں کراتا تھا بلکہ اسلام کی دعوت دیتا اور کفر وشرک کی برائیاں ان پر واضح کرتا۔ اس طرح کم وبیش ایک ہزار فرنگی اس کے

---

[1] التاریخ الاندلسی، ص ۱۹۳ تا ۲۰۳؛ نفح الطیب: ۲۸۶/۱ تا ۲۹۰؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس للشیخ عبداللہ عنان: ۱۹۲/۱ تا ۱۱۱

ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔[1]

عبدالملک بن قطن فہری: (پہلی بار: ۱۱۴ھ تا ۱۱۶ھ..... دوبارہ: ۱۲۱ھ تا ۱۲۳ھ)

اس زمانے میں اندلس کے عمر رسیدہ اُمراء میں عبدالملک بن قطن بہت نمایاں تھا۔ اس کی عمر کم وبیش ۹۰ سال تھی۔ وہ جنگِ حرہ میں اہلِ مدینہ پر ظلم کرنے والی یزیدی فوج میں شامل رہا تھا۔ بعد میں افریقہ اور پھر اندلس آ گیا تھا۔ ۱۱۴ھ سے ۱۱۶ھ تک وہ یہاں کا حاکم بھی رہا تھا۔[2] وہ ایک ظالم اور بدسیرت انسان تھا۔[3] اس نے ۱۲۱ھ میں عقبہ بن حجاج کو قتل کر دیا اور اس کی جگہ حکومت سنبھال لی۔[4]

عبدالملک بن قطن کا دوسرا دور تین سال تک رہا مگر یہ بھی کسی کارکردگی کے لحاظ سے نمایاں نہیں رہا۔

اس دوران شمالی افریقہ میں خوارج کے نظریات اختیار کرنے والے بربروں کا فتنہ اٹھا جس کے اثرات اندلس پر بھی پڑے۔ ان بربروں نے ۱۲۲ھ میں طنجہ پر قبضہ کر کے بڑی بے دردی سے عربوں کا قتلِ عام کیا۔ اندلس میں بھی بربر قبائل کی بڑی تعداد تھی۔ انہیں مراکش میں بربروں کی شورش کی خبر ملی تو وہ بھی اندلس میں حکومت کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ اس دوران ہشام بن عبدالملک نے ۱۲۳ھ میں کلثوم بن عیاض کو تیس ہزار عرب سپاہی دے کر مراکش اور اندلس کے بربروں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ اس لشکر میں دس ہزار سپاہی خالص اُموی نسل کے تھے۔ مگر اسے بربروں کے ہاتھوں شکستِ فاش ہوئی اور کلثوم بن عیاض سمیت اکثر سپاہی قتل ہو گئے۔[5]

بلج بن بشر: (۱۲۴ھ)

اس فوج کے نائب سالار بلج بن بشر نے چند ہزار سپاہیوں کے ساتھ نہایت بدحالی کے عالم میں جنگلوں میں پناہ لی اور عبدالملک بن قطن کے پاس درخواست بھیجی کہ وہ اس کی فوج کو اندلس میں پناہ دے دے۔ عبدالملک کو خطرہ تھا کہ یہ لوگ کہیں اندلس پر قبضہ نہ کر لیں، اس لیے شرط رکھی کہ وہ ایک سال گزرنے پر واپس چلے جائیں گے۔

بلج نے یہ معاہدہ کر لیا اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ اندلس آ گیا۔ یہاں انہوں نے عبدالملک کے ساتھ مل کر اندلس میں بغاوت کرنے والے بربروں کو پے در پے شکستیں دیں۔ ایک سال پورا ہونے پر عبدالملک نے بلج کو اس کی فوج سمیت واپس جانے کا حکم دیا۔ بلج اور اس کے ساتھیوں نے واپسی سے انکار کر دیا اور عبدالملک کو قتل کر دیا۔[6]

---

① الکامل فی التاریخ: ۳۲۳/۲ ، البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۲۹/۲

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۳۲/۲

③ وکان ظلوماً جائراً فی سیرتہ. (نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۲۳۹/۱)

④ ثم وثب علیہ عبدالملک بن قطن الفھری سنۃ احدیٰ وعشرین، فخلعہ وقتلہ، ویقال: اخرجہ من الاندلس. (نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۲۳۶/۱)

⑤ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۳۵۳ تا ۳۵۶؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۲۷ھ؛ الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ: ۱۶۳/۱ تا ۱۷۰

⑥ البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۳۱/۲، ۳۲

مگر بلج بن بشر کو حکومت راس نہ آئی۔ چند ماہ بعد وہ عبدالملک کے وفاداروں سے ایک جنگ میں زخمی ہو گیا اور یہی زخم جان لیوا ثابت ہوا۔[1]

ثعلبہ بن سلامہ: ۱۲۴ھ

۱۲۴ھ میں اُموی حکومت کی طرف سے ثعلبہ بن سلامہ عجلی نے آکر اندلس کی حکومت سنبھال لی۔ وہ ایک اچھا اور مہربان حاکم تھا مگر عبدالملک بن قطن کے حامیوں یعنی بنوفہر نے اس کی اطاعت قبول نہ کی۔ اُدھر سے بربر بھی باغی ہو گئے تاہم اس نے بربروں کی بغاوت کو پوری قوت سے کچل دیا۔ مگر اسی زمانے میں اندلس میں خود عربوں میں مضری اور یمانی کا تعصب پھیل گیا اور یمانی قبائل ثعلبہ کے مخالف ہو گئے۔ آخر ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ ثعلبہ کو معزول ہونا پڑا۔[2]

حسام بن ضرار ابوخطار: ۱۲۵ھ تا ۱۲۸ھ

اب حسام بن ضرار کلبی عرف ابوخطار نے حکومت سنبھال لی۔ اسے تقریباً تین برس (۱۲۵ھ تا ۱۲۸ھ) ملے۔ وہ ایک دلیر، سخی اور نیک سیرت حاکم تھا۔ اندلس میں عربوں کے تمام قبائل نے اس کی بیعت کر لی۔ عرب قبائل قرطبہ میں رہنا چاہتے تھے مگر ان کی کثرت کے باعث یہ شہر ان کے لیے ناکافی تھا۔ حسام بن ضرار نے غور کیا تو اسے "البیرہ" اپنے محل وقوع اور آب و ہوا میں دمشق کے مشابہ نظر آیا۔ چنانچہ اس نے ایک عجیب کام یہ کیا کہ "البیرہ" کا سرکاری نام "دمشق" رکھ دیا اور دمشق کے عربوں کو وہاں آباد کر دیا۔ اس کے بعد اس نے یہ سلسلہ جاری رکھا اور اندلس کے ہر اُس شہر کو جو شام کے کسی شہر کے تھوڑا بہت مشابہ تھا، وہی نام دیتا گیا اور شامی عربوں کو وہاں بساتا گیا۔

چنانچہ حمص والوں کو اشبیلیہ بھیج دیا گیا اور اس کا نام حمص رکھ دیا گیا۔ قنسرین والوں کو جیان بھیج کر اس کا نام قنسرین رکھ دیا گیا۔ اہل اُردن کو مالقہ بھیج کر اسے اُردن کہا جانے لگا۔ اہل فلسطین کو شذونہ میں بسا کر کہا گیا کہ اسی کو فلسطین کہا کریں۔ مصر والوں کو تدمیر میں آباد کر کے اسے مصر کا نام دے دیا گیا۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا جس کے باعث لوگوں نے نئے شہروں میں منتقلی کو قبول کر لیا مگر یہ الگ بات ہے کہ شہروں کے یہ نئے نام رائج نہ ہو سکے۔[3]

خانہ جنگی کا دور اور یوسف بن عبدالرحمٰن فہری:

ابوخطار نے شروع میں تمام عرب قبائل سے یکساں سلوک کیا تاہم بعد میں اس کا جھکاؤ یمانی قبائل کی طرف ہو گیا اور بنوقیس پر اس کا اعتماد کم ہو گیا۔ ایسے میں صمیل بن حاتم نامی ایک سردار نے (جو شمر بن ذی الجوشن کا پوتا تھا) نے قبائلی تعصب کی آگ لگا کر ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ یہاں سے اندلس میں خانہ جنگی کا دور شروع ہو گیا اور ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۳۲/۲ ② البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۳۲/۲
نوٹ: یمانی سے مراد وہ عرب قبائل ہیں جن کی اصل نشوونما یمن میں ہوئی۔ مثلاً ازد، غسان، لخم، کندہ، حمیر، مذحج، جذام، طے وغیرہ
③ نفح الطیب: ۲۳۷/۱ و البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۳۳،۳۲/۲

نئے حاکم ثوابہ بن سلمہ حدانی (۱۲۸ھ۔۱۲۹ھ) نے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ادھر دارالخلافہ دمشق میں حالات دگرگوں تھے اور خود بنوامیہ کا اقتدار ہچکولے کھا رہا تھا۔ ایسے میں اندلس پر بھلا کون توجہ دیتا۔

آخر ۱۲۹ھ میں متحارب قبائل مضری اور یمانی نے باہم معاہدہ کیا کہ شہران کے درمیان تقسیم کر لیے جائیں اور ہر سال دونوں قبائل سے باری باری ایک امیر کو تختِ قرطبہ پر بٹھایا جائے گا۔

اس معاہدے کے تحت قبیلہ مضر نے یوسف بن عبدالرحمن فہری کو حکمران کے طور پر پیش کیا اور یمانی اس کے مطیع ہو گئے۔ تاہم اس کے بعد یوسف بن عبدالرحمن نے مستقل طور پر قرطبہ کو اپنا مرکز بنالیا اور جب ایک سال بعد حکمران بدلنے کی باری آئی تو اس نے یمانیوں کے لیے تخت خالی نہ کیا۔ یوں خانہ جنگی جاری رہی۔

اسی دوران اندلس میں ایسی خطرناک وبا پھیلی کہ بے شمار لوگ جاں بحق ہو گئے۔ جب وبا ختم ہوئی تو لڑائیاں پھر شروع ہو گئیں۔ یوسف بہادر، ہوشیار اور جنگجو انسان تھا۔ اس فتنے کے زمانے میں اس نے لگ بھگ نو سال حکومت کر لی۔ اگرچہ اس دوران جگہ جگہ بار بار بغاوتیں ہوتی رہیں مگر اس نے قرطبہ میں اپنی حکومت کو بہر حال محفوظ رکھا۔[1]

دورِ ولایت کے آخر میں مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے باعث جنوبی فرانس کے علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ یہ ایسا نقصان تھا کہ جس کی پھر کبھی تلافی نہ ہو سکی۔

دورِ ولایت ایک نظر میں:

دورِ ولایت اسلامی اندلس کی تاریخ کی خشتِ اوّل تھا۔ اس زمانے میں اچھے حکام بھی آئے اور بعض بُرے بھی۔ اکثر حکام کو زیادہ وقت نصیب نہیں ہوا اور انہیں اپنے جوہر دکھانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ بار بار تبادلوں نے یہاں حقیقی استحکام پیدا نہیں ہونے دیا۔ ان تبادلوں میں جہاں اندرونی بغاوتوں اور دیگر عوامل کا دخل رہا، وہاں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ مروانی خلفاء اندلس میں کسی حاکم کو زیادہ مدت تک رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ شاید انہیں یہ خدشہ تھا کہ سمندر پار کے اس صوبے میں کہیں کوئی حاکم زیادہ مؤثر اور مقبول ہو کر خود مختار نہ ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اندلس جیسے وسیع ملک کو ایک صوبے کی نہیں بلکہ ضلعے کی حیثیت دی اور افریقہ کے حاکم کو ہمیشہ اندلس کے حاکم پر بالادست رکھا۔ صرف حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور اس سے مستثنیٰ ہے اور ان کے مختصر دور میں اندلس میں جو خیر و خوبی ظاہر ہوئی، وہ تاریخ کے صفحات میں واضح ہے۔

بہر کیف دورِ ولایت اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس زمانے میں سمح بن مالک، عبدالرحمن الغافقی، عنبسہ بن سحیم اور عقبہ بن حجاج جیسے قابل حکام کی کوششوں سے بے شمار مساجد اور مدارس کی بنیاد رکھی گئی۔ قلعے، پل اور شہر تعمیر ہوئے اور اسلامی اندلس کی تشکیل کے اوّلین خطوط کھینچ دیے گئے۔ مسلمانوں نے مقامی لوگوں سے بہت اچھا سلوک کیا۔ گاتھ بادشاہوں کے دور میں پادریوں کی سختیوں سے خود نصرانی سخت ضیق میں تھے۔ مسلمان حکام کی طرف

---

[1] نفح الطیب: ۱/۲۳۷، ۲۳۸؛ البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۲/۳۹ تا ۳۹

سے وہ سختیاں ہٹالی گئیں۔ شہریوں کو مذہبی آزادی دی گئی۔ بھاری ٹیکس ساقط کر دیے گئے۔ خود مغربی مؤرخین کو مسلم حکام کی طرف سے ان رعایتوں کا اعتراف ہے۔ اس ماحول میں بے شمار مقامی لوگ اسلام میں داخل ہوتے رہے اور ان میں سے بہت سوں کی اولاد آگے چل کر اندلس کے نامور علماء اور اصحاب علم وفضل میں شمار ہوئی۔ گر ہم ان چیزوں کی تفصیل بیان کرنے لگیں تو ہمارا سفر خاصا طویل ہو جائے گا۔ لہٰذا ہم اختصاراً اسی پر اکتفا کر رہے ہیں۔[1]

اندلس کی نئی نصرانی ریاست۔ آسٹریاس

اسپین میں اسلام کی آمد کو ابھی نصف صدی بھی نہیں گذری تھی، یہاں کی اکثریت نصرانی تھی۔ وہ لوگ کچھ علاقہ آزاد کرا کے وہاں اپنی طاقت مجتمع کر رہے تھے۔ باقی عالم اسلام سے اندلس کا رابطہ عملی طور پر منقطع تھا۔ اس صورتحال نے نصرانیوں کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب و دبدبہ کم کر دیا۔ اُدھر ایشیا میں بنواُمیہ اور بنوعباس کے درمیان کشمکش شروع ہو چکی تھی جبکہ اندلس میں عربوں اور بربروں میں کشیدگی پھیل گئی تھی۔ خود عربوں میں بھی یمانی اور مضری ایک دوسرے سے لڑنے پر تیار تھے اور محلاتی سازشوں کا دور دورہ تھا۔ ہر ڈیڑھ دو سال بعد ایک نیا حکمران مسند نشین ہوتا۔[2]

مسلمانوں کو منتشر دیکھ کر نصرانیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے ۱۰۳ھ (۷۲۲ء) میں شمالی اسپین کے کوہستانی علاقے میں ایک چھوٹی سی آزاد نصرانی ریاست "آسٹریاس" (Asturias) قائم کر لی جس کا بانی ایک گاتھ لیڈر "پلائیو" (۷۲۲ء تا ۷۳۷ء) تھا۔ اس کے جانشین "الفانسو اوّل" (۷۳۹ء تا ۷۵۷ء) نے 'جلیقیہ' (Galicia) کو بھی اپنی ریاست میں ضم کر کے جبل البرتات (Pyrenees) کے جنوبی دامن سے لے کر شمالی چوٹیوں تک تمام علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہی نصرانی ریاست آگے چل کر اندلس کے مسلمانوں کی سب سے بڑی حریف ثابت ہوئی۔

اندلس کے مسلمان امراء اگر اس نصرانی ریاست کی سرکوبی کی طرف سنجیدگی سے توجہ دیتے تو ان میں سے ایک امیر بھی یہ مہم سرانجام دے سکتا تھا مگر ان کی غفلت کے باعث "الفانسو اوّل" کی قوت روز بروز بڑھتی گئی حتیٰ کہ بعد میں اس فتنے کی روک تھام مشکل ہو گئی۔[3]

✦✦✦

---

① التاریخ الأندلسی لدکتور عبدالرحمن علی: ص ۲۱۱، ۲۱۲؛ دولة الاسلام فی الأندلس: ۱/۶۳ تا ۷۳

② التاریخ الاسلامی از احمد شلبی: ۴/۳۷، ۳۸

ملحوظہ: یمانی سے مراد وہ عرب قبائل ہیں جن کی اصل نشوونما یمن میں ہوئی، مثلاً ازد، غسان، لخم، کندہ، حمیر، مذحج، جذام، طے وغیرہ۔ اموی دور میں ان میں سے زیادہ تر قبائل جنوبی شام کے صوبوں حمص، مقدمہ، فلسطین وغیرہ کے کھلے علاقوں میں آباد ہو گئے۔ بعض یمانی قبائل زمانہ جاہلیت سے شام میں آ بسے تھے مثلاً کلب، مذحج، جذام اور طے۔ مضری کی نسبت مضر کی طرف ہے جس کی دو بڑی شاخیں تھیں: بنوقیس بن عیلان اور بنوالیاس بن مدرکہ۔ بنوقیس کی شاخوں میں غطفان، ہوازن، کلاب وغیرہ مشہور ہیں جبکہ بنوالیاس کی شاخوں میں ہذیل، اسد، تمیم، کنانہ وغیرہ مشہور ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا تعلق بنوالیاس کی شاخ نضر بن کنانہ سے ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ان قبائل کے مابین رقابتیں اور جنگیں بھی ہوئیں۔

③ البیان المغرب: ۲/۳۰، السائکلو پیڈیا برٹانیکا Spain

فہرست والیان اندلس

نمبر	نام	دور حکومت	خاص بات
۱	عبدالعزیز بن موسیٰ	۹۵ھ تا ۹۷ھ (۷۱۳ء تا ۷۱۵ء)	فوج کے ہاتھوں قتل
۲	ایوب بن حبیب لخمی	۹۷ھ (۷۱۶ء)	موسیٰ بن نصیر کا بھانجا ہونے کے باعث جلد معزول کر دیا گیا۔
۳	حر بن عبدالرحمٰن ثقفی	۹۸ھ تا ۱۰۰ھ (۷۱۶ء تا ۷۱۸ء)	
۴	سمح بن مالک خولانی	۱۰۰ھ تا ۱۰۳ھ (۷۱۸ء تا ۷۲۱ء)	عدل وانصاف، تعمیری وترقیاتی کام فرانس پر چڑھائی، اربونہ کی فتح
۵	عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی	۱۰۳ھ (۷۲۱ء)	فوج نے عارضی طور پر منتخب کر لیا
۶	عنبسہ بن سحیم کلبی	۱۰۳ھ تا ۱۰۷ھ (۷۲۱ء تا ۷۲۵ء)	فرانس پر حملہ، قرقشونہ کی فتح۔ شمالی اندلس میں "آستریاس" کی بنیاد پڑی
۷	عذرہ بن عبداللہ فہری	۱۰۷ھ (۷۲۵ء)	فوج نے عارضی طور پر منتخب کر لیا
۸	یحییٰ بن سلمہ کلبی	۱۰۷ھ (۷۲۵ء)	نااہلیت کی بناء پر جلد معزول
۹	عثمان بن علی عبیدہ	۱۰۹ھ (۷۲۶ء)	فوج نے عارضی طور پر منتخب کر لیا
۱۰	عثمان بن ابی نسعہ خثعمی	۱۱۰ھ (۷۲۷ء)	جلد معزول
۱۱	حذیفہ بن احوص قیسی	۱۱۱ھ (۷۲۸ء)	مقوقشہ کی فتح۔ جلد معزول
۱۲	ہیثم بن عبید کلابی	ذوالقعدہ ۱۱۱ھ (۷۲۹ء)	بنو کلب سے دشمنی مول لے کر قتل ہوا
۱۳	محمد بن عبداللہ اشجعی	۱۱۱ھ (۷۲۹ء)	فوج نے عارضی طور پر منتخب کر لیا
۱۴	عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی۔ (دوبارہ)	۱۱۲ھ تا ۱۱۴ھ (۷۳۰ء تا ۷۳۲ء)	بہترین دور حکومت۔ اصلاحات ملکی پر توجہ، فرانس پر چڑھائی میں بورڈو اور پائیٹرس کی فتح۔ فرنچ جنرل چارلس مائل کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید

۱۵	عبدالملک بن قطن فہری	۱۱۴ھ تا ۱۱۶ھ (۷۳۲ء تا ۷۳۴ء)	ظالم اور بدسیرت
۱۶	عقبہ بن حجاج سلولی	۱۱۶ھ تا ۱۲۱ھ (۷۳۴ء تا ۷۳۹ء)	عمدہ حکومت۔ متعدد قلعے فتح کیے۔ نظم و ضبط بہتر بنایا۔ اسلام کی تبلیغ کی۔
۱۷	عبدالملک بن قطن۔ دوبارہ	۱۲۱ھ تا ۱۲۴ھ (۷۳۹ء تا ۷۴۲ء)	بربروں اور شامی عربوں میں کش مکش
۱۸	بلج بن بشر قسیری	۱۲۴ھ (۷۴۲ء)	شامیوں کی حمایت سے اقتدار پر قبضہ کیا
۱۹	ثعلبہ بن سلامہ عجلی	۱۲۵ھ (۷۴۳ء)	عربوں اور بربروں میں زبردست خونریزی
۲۰	حسام بن ضرار کلبی	۱۲۵ھ تا ۱۲۸ھ (۷۴۳ء تا ۷۴۵ء)	وقتی طور پر امن وامان بحال کرنے میں کامیاب۔ آخر میں باغیوں کے ہاتھوں قتل
۲۱	ثوابہ بن سلمہ حدانی	۱۲۸ھ تا ۱۲۹ھ (۷۴۶ء تا ۷۴۷ء)	جبراً اقتدار پر قبضہ کیا۔ جلد ہی فوت ہوگیا
۲۲	یوسف بن عبدالرحمن فہری	۱۲۹ھ تا ۱۳۸ھ (۷۴۷ء تا ۷۵۶ء)	آخری والی۔ یمانی اور مضری عربوں میں شدید کشیدگی، قحط سالی۔ فرانس کے اکثر مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے۔

✦✦✦

اندلس کے اُموی حکمران

۱۳۸ھ تا ۴۲۲ھ

(۷۵۵ء تا ۱۰۳۱ء)

۲۸۴ سال

عبدالرحمٰن اوّل

۱۳۸ھ تا ۱۷۲ھ (۷۵۵ء تا ۷۸۸ء)

اس نازک موقع پر مشیت الٰہیہ نے جس عظیم انسان کو اندلس کی اسلامی حکومت کی نگہبانی کے لیے منتخب کیا اُسے تاریخ ''عبدالرحمٰن بن معاویہ''، ''عبدالرحمٰن الداخل'' اور ''عبدالرحمٰن اوّل'' کے ناموں سے یاد کرتی ہے۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ کے بچپن کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ وہ اپنے دادا خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دربار میں حاضر تھا کہ مسلمہ بن عبدالملک نے اسے غور سے دیکھا اور بے اختیار اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر خلیفہ سے مخاطب ہو کر کہا:

''میں اس ہونہار بچے کی پیشانی اور گردن میں حکمرانی کی علامات دیکھ رہا ہوں۔''①

بنواُمیہ کا زوال اور عباسی خلافت کا قیام:

بنواُمیہ کی خلافت کے آخری برسوں میں اُمویوں اور عباسیوں کے مابین زبردست کشمکش جاری تھی، آخر کار بنو اُمیہ کو ہر جگہ شکست ہوئی۔ ۱۳۲ھ (۷۵۰ء) میں آخری اُموی خلیفہ مروان بن محمد کو قتل کر دیا گیا اور پہلے عباسی خلیفہ ابو العباس سفاح نے عالم اسلام کی مسند اقتدار سنبھال لی۔ دمشق میں جو کہ بنواُمیہ کا دارالخلافہ تھا، سینکڑوں اُموی مارے گئے۔ ہزاروں گھر سے بے گھر ہو کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے اور روپوشی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

خوش قسمتی سے عبدالرحمٰن بن معاویہ ان دنوں دمشق میں نہ تھا لہٰذا اس قتل و غارت سے محفوظ رہا۔ اس نے اپنے کنبے کے ساتھ شام کے گھنے جنگلات کے درمیان واقع ایک گاؤں میں ڈیرے ڈال دیے۔ اس کا ارادہ تھا کہ موقع ملتے ہی افریقہ کی جانب نکل جائے گا جہاں کا امیر عبدالرحمٰن بن حبیب بنواُمیہ کا ہمدرد تھا۔

کچھ دن گزرے تھے کہ اسے آشوب چشم نے آ لیا۔ ایک دن وہ اپنی دکھتی آنکھوں سے بہنے والا پانی ایک کپڑے سے پونچھ رہا تھا کہ اچانک اس کا چار سالہ بیٹا سلیمان دہشت زدہ حالت میں دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور اس کے سینے سے چمٹ گیا۔ عبدالرحمٰن پریشان ہو کر باہر نکلا تو دیکھا گھڑسواروں کا ایک دستہ تیزی سے گاؤں کی طرف آ رہا ہے۔ آگے آگے عبدالرحمٰن کا تیرہ سالہ بھائی دوڑتا ہوا آیا اور چلایا:

''سرکاری سپاہی آ رہے ہیں، جلدی بھاگنے کی کوشش کرو۔''

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۳/۵۳

عبدالرحمٰن بن معاویہ نے جلدی سے کچھ دینار ساتھ لیے، اپنے بچوں اور بہنوں کو اپنے وفادار غلام بدر کے ساتھ کسی خفیہ ٹھکانے کی طرف بھیج دیا اور خود گاؤں کے قریب ایک دوست کے مکان میں چلا گیا۔ سرکاری سوار اُسے تلاش نہ کر سکے۔ عبدالرحمٰن بن معاویہ اپنے میزبان کے پاس ٹھہرا رہا۔

پھر اس کا غلام بدر اس کے اہل وعیال کو لے کر وہیں آ گیا چونکہ اس علاقے میں زیادہ دیر ٹھہرنا خطرناک تھا اس لیے اس نے اپنے میزبان کو کچھ دینار دے کر سامان سفر اور گھوڑے فراہم کرنے کا کہا۔

میزبان سے یہ غلطی ہوگئی کہ یہ اہم کام خود انجام دینے کی بجائے اپنے غلام کو اس راز سے آگاہ کر کے اس کام کے لیے بھیج دیا۔ غلام پر سرکاری انعام کا لالچ غالب آ گیا اور اس نے حکومتی کارندوں کو اپنے آقا کے گھر عبدالرحمٰن کی روپوشی کی اطلاع دے دی۔ مگر اس سے پہلے کہ ان کے ٹھکانے پر چھاپہ پڑتا، عبدالرحمٰن نے خطرے کی بو سونگھ لی اور چھوٹے بھائی کو لے کر پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ سرکاری فوجیوں نے تعاقب کیا اور جلد ہی قریب پہنچ گئے۔

آگے دریا تھا۔ کوئی راستہ نہ دیکھ کر عبدالرحمٰن نے اپنے بھائی سمیت دریا میں چھلانگ لگا دی۔ سپاہیوں نے یہ دیکھا تو پکارنے لگے۔ ''لوٹ آؤ...... تمہیں جان کی امان دی جاتی ہے۔''

عبدالرحمٰن نے سنی ان سنی کر دی اور دوسرے کنارے کی جانب بڑھتا رہا مگر چھوٹا بھائی تیرتے تیرتے تھک چکا تھا۔ عبدالرحمٰن کے بار بار منع کرنے کے باوجود وہ جان بچ جانے کی امید پر واپس ہو گیا۔ سپاہیوں نے اسے پکڑ کر فوراً قتل کر دیا۔ [1]

افریقہ میں روپوشی:

عبدالرحمٰن کچھ دنوں تک فلسطین کے ایک گاؤں میں چھپا رہا۔ پھر مصر سے ہوتے ہوئے افریقہ کے صحرا میں پہنچ گیا جہاں عبدالرحمٰن بن حبیب کی خود مختار حکومت تھی۔ اس نے عبدالرحمٰن بن معاویہ کا خیر مقدم کیا اور ٹھکانہ فراہم کر دیا۔ عبدالرحمٰن بن معاویہ کے دو وفادار غلام بدر اور ابوالشجاع السالم افریقہ میں ان کو محفوظ ٹھکانہ ملنے کی اطلاع پا کر بقدر ضرورت دینار اور جواہرات کے ساتھ ان سے آ ملے۔ کچھ دن اطمینان سے گزرے مگر پھر حاکمِ افریقہ کو عبدالرحمٰن کی غیر معمولی صلاحیت سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اس کی نیت بدل گئی اور وہ اُسے عباسیوں کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ کو بروقت خبر مل گئی اور وہ اپنے بیٹے اور غلام کو ساتھ لے کر افریقہ کے جنگلات میں چلا گیا۔ یہ لوگ دیہاتوں میں پناہ لیتے اور کبھی صحراؤں میں بھوک اور پیاس برداشت کرتے۔ آخر وہ شمالی افریقہ کے بربر قبائل کے پاس پہنچ گئے۔ عبدالرحمٰن کی ماں بربری تھی اس لیے بربریوں کے قبیلہ نفزاوہ نے اُسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔

مگر یہاں بھی مخبری ہوگئی اور سرکاری سواروں نے بستی پر چھاپہ مارا۔ ایک بوڑھی عورت نے اُسے کپڑوں کے ایک ڈھیر میں چھپا دیا۔ عبدالرحمٰن بن معاویہ کی قسمت میں اندلس کے مسلمانوں کی پاسبانی لکھی تھی اس لیے سپاہی اُس کو

---

① الكامل في التاريخ: سنة ۱۳۹ھ، نهاية الارب للنويري: ۳۳۵/۲۳، ط دار الكتب والوثائق القومية

تلاش کرنے میں اس بار بھی ناکام رہے۔[1]

امرائے اندلس سے رابطے:

آخر میں عبدالرحمن مراکش کے ساحلی علاقے ''سبتہ'' میں مقیم ہوگیا۔ اُسے معلوم تھا کہ اندلس عباسی خلافت کے اثرات سے بہت دور ہے اور وہاں بنوامیہ کے حامیوں کی تعداد بھی کم نہیں۔ نیز وہاں نصرانیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور مسلمانوں کا انتشار بھی اُسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اندلس کے مسلم امراء کی شیرازہ بندی نہ کی گئی تو وہاں مسلمانوں کا مستقبل ہمیشہ کے لیے تاریک ہوجائے گا۔ لہٰذا اُس نے اپنے وفادار غلام بدر کو بھیج کر اندلس کے بعض امراء سے خفیہ خط و کتابت کی تاکہ وہاں ایک نئی مستحکم حکومت تشکیل دی جائے۔

یہ کوشش کامیاب ہوئی اور ان کا غلام بدر اندلس کے امراء کا پیغام لے کر ان کے چند عمائد کے ساتھ ایک بحری جہاز میں سبتہ کے ساحل پر اترا۔ عبدالرحمن بن معاویہ اس وقت نماز میں مشغول تھا۔ سلام پھیرا تو بدر نے آگے بڑھ کر اندلس کے امراء کی حمایت کی خوشخبری سنائی۔ عبدالرحمن بن معاویہ نے ساتھ آنے والے اندلسی معززین میں سے ایک کا نام پوچھا۔ اس نے کہا: ''کنیت ہے ابوغالب، اور نام ہے تمام۔''

عبدالرحمن بن معاویہ نے نیک فال لے کر کہا:

''ان شاء اللہ ہم ہوں گے غالب اور ہمارا مقصد ہوگا تمام۔''[2]

اندلس میں داخلہ، امارت کا اعلان:

ربیع الاول ۱۳۸ھ (اگست ۷۵۵ء) میں عبدالرحمن بن معاویہ کا سفینہ اندلس کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ اندلسی امراء ساحل پر چشم براہ تھے۔ قبائلی عمائد یکے بعد دیگرے اس سے بیعت کے لیے آنے لگے۔ یکم شوال ۱۳۸ھ (۸ مارچ ۷۵۵ء) کو اندلسی امراء کی تائید کے ساتھ عبدالرحمن بن معاویہ کی امارت کا اعلان کر کے خطبے میں اس کا نام لیا شامل کر دیا گیا۔[3]

یوسف بن عبدالرحمن سے تصادم:

اس وقت یوسف بن عبدالرحمن الفہری اندلس کے اہم ترین شہروں: قُرطُبہ، طُلَیطُلہ اور اشبیلیہ کا حکمران تھا۔ وہ عبدالرحمن کے مقابلے پر نکل آیا۔ قُرطُبہ کے باہر دریائے وادی الکبیر کے کنارے فریقین کا آمنا سامنا ہوا۔ عبدالرحمن بن معاویہ نے یوسف بن عبدالرحمن کو صلح کا جھانسا دیا اور مذاکرات شروع کر دیے۔ یوسف دھوکے میں آگیا اور سمجھا کہ اب صلح ہوہی جائے گی۔ ۹ ذوالحجہ ۱۳۸ھ (۱۵ مئی ۷۵۶ء) کی شام یوسف اور اس کے حشم و خدم ایک بڑی ضیافت

---

① سیر اعلام النبلاء: ۸/۲۴۴، ۲۴۵، ط الرسالۃ

② نفح الطیب: ۳/۵۰۔ البیان المُغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۴۰، ۴۱۔

③ البیان المُغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۴۴

کی تیاری میں مصروف تھے، جبکہ عبدالرحمٰن حملے کی تیاری کررہا تھا۔ رات کے کسی پہر اس نے اچانک دھاوا بولا تو یوسف کے سپاہی لڑنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے بھرپور جنگ کی جو اگلے دن عید الاضحیٰ کو بھی زوالِ آفتاب تک جاری رہی۔ بہر کیف عبدالرحمٰن کی چال کامیاب رہی اور یوسف کے لشکر کو شکست ہوگئی۔

قرطبہ کی لڑائی کے بعد فریقین میں مختلف مقامات پر چند چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں مگر آخر کار صفر ۱۳۹ھ (جولائی ۷۵۶ء) میں یوسف بن عبدالرحمٰن الفہری نے چند شرائط کے ساتھ عبدالرحمٰن بن معاویہ کے حق میں حکومت کے دعوے سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔ اندلس پر قبضے کے بعد عبدالرحمٰن نے قرطبہ کو دارالحکومت بنایا اور اس کے بعد کئی صدیوں تک یہی شہر ملک کا سیاسی مرکز رہا۔[1]

عبدالرحمٰن اوّل نے نہ صرف مقامی مسلمانوں بلکہ نصرانیوں سے بھی بہت اچھا سلوک کیا۔ اس کی طرف سے غیر مسلم آبادی کے لیے جو امان نامہ لکھا گیا اس میں تحریر تھا:

"یہ سارے ملک کے پادریوں، راہبوں اور ان کے ہم مذہبوں کے لیے امن اور رحمت کی دستاویز ہے، جان اور ناموس کی حفاظت کا عہد ہے جسے محترم امیر عظیم حاکم، عبدالرحمٰن بن معاویہ نے طے کیا ہے۔ جب تک کہ وہ ان چیزوں کی پاسداری پر قائم رہیں جو ان پر لازم کی گئی ہیں۔"

اس عہد نامے پر یکم صفر ۱۴۲ھ کی تاریخ تحریر تھی۔[2]

عباسیوں سے ملک کا دفاع:

عبدالرحمٰن بن معاویہ نے صرف ۱۶ ماہ کی جدوجہد سے اندلس پر قبضہ کر لیا تھا مگر اس کے بعد بھی چھوٹی چھوٹی اندرونی شورشیں جاری رہیں اور انہیں کبھی ان باغیوں کی جانب سے بے خطر ہونے کا موقع نہ ملا۔ یوسف بن عبدالرحمٰن فہری نے بھی بغاوت کی اور ناکام ہو کر مارا گیا۔ مؤرخین کے مطابق بغاوتوں کی یہ آگ بھڑکانے میں عباسی خلفاء کا ہاتھ تھا جو اندلس میں ایک اُموی کو برسرِاقتدار نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ان کوششوں میں ناکامی کے بعد ۱۴۶ھ (۷۶۳ء) میں عباسی خلیفہ منصور نے افریقہ کے حاکم علاء بن مغیث کو ایک زبردست لشکر لے کر اندلس بھیجا تاکہ عبدالرحمٰن کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس دوران عباسیوں کے حامی ایک اندلسی سردار ہاشم بن عبدربہ نے بھی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ اندلس میں بغاوت کا علم بلند کر دیا اور طلیطلہ پر خودمختار حکومت قائم کر لی۔ عبدالرحمٰن بن معاویہ کو صرف سات سو سپاہیوں کے ساتھ "قرمونہ" کے قلعے میں محصور ہونا پڑا۔ حریف فوج نے دو ماہ تک قلعے کا محاصرہ کیے رکھا۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ نے جب موت کو سامنے دیکھا تو ایک رات اپنے سپاہیوں کو تلواروں کی نیام میں جلانے کا حکم

---

(1) نهاية الأرب: ۲۳/۳۳۸، ط دار الكتب والوثائق القومية؛ تاريخ ابن خلدون: ۴/۱۵۵، ط دار الفكر

(2) سير اعلام النبلاء: ۸/۲۰۵، ط الرسالة

دیا اور پھر ان مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ کئی گنا بڑی مخالف فوج پر جارحانہ حملہ کر دیا۔ حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ عباسیوں کا لشکر عددی کثرت کے باوجود بوکھلا کر رہ گیا۔ سات ہزار عباسی سپاہی میدان میں قتل ہوئے اور باقی پسپا ہو کر اندلس سے نکل گئے۔ عبدالرحمٰن نے اس غیر متوقع شاندار فتح کے بعد علاء بن مغیث اور دیگر عباسی افسران کے کٹے ہوئے سر عباسی خلیفہ منصور کے پاس بھیج دیے۔ یہ منظر دیکھ کر منصور کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

''خدا کا شکر ہے کہ میرے اور عبدالرحمٰن کے درمیان سمندر حائل ہے۔''

اس کے بعد عباسی لشکروں کو سمندر عبور کر کے اندلس پر حملے کی جرأت کبھی نہیں ہوئی۔[1]

عبدالرحمٰن بن معاویہ کی کوشش تھی کہ عباسیوں سے اختلاف بڑھنے نہ پائے۔ وہ اس کے لیے بھی تیار تھے کہ اندلس کو عباسیوں کے باج گزار ملک کی حیثیت مل جائے جہاں عباسی خلفاء کا خطبہ پڑھا جائے مگر جب عباسیوں کا رویہ معاندانہ رہا تو عبدالرحمٰن نے بھی مستقل حکومت کی شکل کو اختیار کر لیا۔ تاہم یہ ان کی معتدل مزاجی تھی کہ اپنی خلافت کا اعلان نہیں کیا بلکہ اندلس کی حکومت کو ''امارت'' اور خود کو ''امیر'' کہلوانے پر اکتفا کیا۔ ان کے اکثر جانشینوں نے بھی یہی طرزِ سیاست اپنایا اور خود کو خلیفہ کہلوانے سے احتراز کیا۔[2]

شاہ فرانس کا حملہ اور پسپائی:

مسلمانوں کے درمیان اس خانہ جنگی کے دوران شمالی اندلس اور جنوبی فرانس میں نصرانیوں کی طاقت مستحکم ہوتی رہی۔ جنوبی فرانس جو ہشام بن عبدالملک کے دور میں اسلامی خلافت کا حصہ بن گیا تھا، اندلس میں خانہ جنگی کے دوران دوبارہ نصرانیوں کے قبضے میں جا چکا تھا اور اب فرانس کا حکمران شارلیمین اندلس پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ عباسی خلفاء نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی تاکہ وہ اندلس سے عبدالرحمٰن کی حکومت کو ختم کر دے۔

شارلیمین نے حملے سے قبل اندلس کے ان امراء کو جو عبدالرحمٰن سے ناراض تھے، نامہ و پیام بھیج کر ساتھ ملا لیا۔ ابو الاسود نامی ایک سردار اندلس کے قید خانے سے فرار ہو کر اس سے جا ملا، سرقسطہ کے حاکم نے اس کے اشارے پر اعلانِ بغاوت کر دیا۔ خانہ جنگی شروع کرا کے شارلیمین لاکھوں نصرانیوں کے ساتھ اندلس کی طرف بڑھا۔

عبدالرحمٰن نے نہایت عالی ہمتی سے اندرونی و بیرونی خطرات کا مقابلہ کیا۔ سَرَقُسطہ کے باغیوں سے نمٹنے کیلئے اپنے سالار ثعلب بن عبید کو روانہ کیا، مگر کئی جنگوں کے بعد سَرَقُسطہ کے باغی غالب آ گئے، باغیوں نے ثعلب کو گرفتار کر کے شاہ فرانس کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد شارلیمین جبل البرتات (Pyrenees) سے گزرتا ہوا اندلس میں داخل ہونے لگا۔ فوج کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ راستے ناکافی پڑ گئے۔ فوج کو تقسیم کر کے کئی راستوں سے لایا جا رہا تھا۔

نصرانیوں کا یہ سیلاب دیکھ کر اہلِ اندلس کو ہوش آ گیا، باغیوں کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ اندلس نصرانیوں کے ہاتھ

---

[1] البیان المغرب: ۲/۵۱، ۵۲؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/۱۵۷، ط دار الفکر
[2] التاریخ الاسلامی از احمد شلبی: ۳/۵۵؛ سیر اعلام النبلاء: ۷/۲۵۴

میں دے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی غلطی کا تدارک کیا اور نصرانی لشکر جب سَرَقُسطہ پہنچا تو وہاں کے مسلمانوں نے استقبال کی بجائے شہر کے دروازے بند کر لیے۔ ادھر عبدالرحمن بن معاویہ نے بھی تیزی سے سَرَقُسطہ کا رخ کر لیا تھا۔ شارلیمین نے اہل سَرَقُسطہ کو مخالفت پر کمر بستہ اور عبدالرحمن کو پیش قدمی کرتے دیکھا تو بدحواس ہو کر واپسی اختیار کر لی۔ عبدالرحمن بن معاویہ نے سَرَقُسطہ پہنچ کر مقامی حاکم حسین بن عاصی سے اتحاد کر لیا پھر شارلیمین کے تعاقب میں فرانس میں قدم رکھ دیا۔ یہ فوج جنوبی فرانس کے بہت سے شہروں کی فصیلوں، قلعوں اور مورچوں کو تہہ و بالا کر کے لوٹی تا کہ آئندہ نصرانی آسانی سے انہیں اپنا مستقر نہ بنا سکیں۔ شارلیمین نے یہ صورتحال دیکھ کر عبدالرحمن سے صلح کر لی اور وعدہ کیا کہ آئندہ فرانسیسی افواج اندلس میں مداخلت نہیں کریں گی۔[1]

وفات:

عبدالرحمن کی ولادت ۱۱۳ھ میں ہوئی تھی۔ اندلس کی اسلامی حکومت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے بعد یکم ربیع الآخر ۱۷۲ھ (۶ نومبر ۷۸۸ء) کو اس کی وفات ہو گئی۔ ۳۳ سال حکومت کی اور ۵۹ سال عمر پائی۔[2]

اس کی تدفین قُرطبہ کے قصرِ خلافت کے ایک گوشے میں کی گئی۔[3]

شخصیت و کردار:

اندلس کی تاریخ میں عبدالرحمن بن معاویہ کو عبدالرحمن الداخل اور عبدالرحمن الاول کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک ایسا حکمران تھا جس نے ساری زندگی خطرات کا مقابلہ کیا۔ اندلس میں اسلامی حکومت کے قیام کے دوران اس کا کوئی دن مہمات سے خالی نہیں رہا۔ اس جدوجہد کے ساتھ اس نے سرزمین اندلس میں ایک شاندار حکومت قائم کر دکھائی۔ عبدالرحمن بن معاویہ کے سخت حریف خلیفہ ابوجعفر منصور نے ایک مرتبہ رفقائے مجلس سے پوچھا:

"صقر قریش یعنی قریش کا شہباز کون ہے؟"

درباری بولے: آپ ہیں جنہوں نے سلطنت کو مطیع بنایا، فتنوں کو ختم کیا، فساد کو دور کیا اور دلوں پر حکمرانی کی۔"

منصور نے کہا: غلط کہا۔ قریش کا شہباز عبدالرحمن بن معاویہ ہے جو نیزوں کی انیوں اور تلواروں کی دھاروں کے بیچ سے اپنی ہوشیاری کے ذریعے بچ کر نکل گیا، بے آب و گیاہ میدانوں کو عبور کیا، سمندر پار کیا، یہاں تک کہ تنہا ایک اجنبی ملک میں داخل ہوا اور شہروں پر شہر فتح کیے۔ فوجیں ترتیب دیں اور حسن تدبیر اور اولوالعزمی سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ قائم کر لی۔"[4]

ایک حریف کی جانب سے عبدالرحمن الداخل کے لیے اس سے بڑھ کر خراج تحسین کیا ہو سکتا ہے!

---

① التاریخ الاسلامی از احمد شلبی: ۴/۵۵تا۵۷

② سیر اعلام النبلاء: ۸/۲۵۲، ۲۵۳، ط الرسالۃ

③ البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۶۵

④ البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۵۹

ترقیاتی کام:

عبدالرحمٰن بن معاویہ نے اندلس کی تمام سڑکوں کو جو خستہ اور ناکارہ ہو رہی تھیں، مرمت کرا کر قابل استعمال بنوایا۔ چند نئی سڑکیں بھی تعمیر کروائیں، جگہ جگہ فوجی چوکیاں قائم کرا کے لوٹ مار اور راہزنی کا قلع قمع کر دیا۔ ہر چوکی پر ڈاک کے لیے تیز رفتار گھوڑے رکھوائے۔ عدالتوں میں شریعت کے مطابق انصاف کا بول بالا کیا اور عوام کو خوشحال بنانے کے لیے ضروری قوانین وضع کیے۔ وہ عمارتیں بنوانے کا عمدہ ذوق رکھتا تھا۔ قرطبہ کے مغرب میں اس نے پھلدار درختوں اور پھولوں سے آراستہ ایک نہایت خوشنما باغ لگوایا تھا جسے "رصافہ" کہا جاتا ہے۔ قرطبہ کی بلند و بالا فصیل جس میں آٹھ دروازے ہیں، اسی کا کارنامہ ہے۔[1]

۱۷۰ھ میں اس کے حکم، منصوبے اور نقشے کے مطابق قرطبہ کی شہرۂ آفاق جامع مسجد کی تعمیر شروع کی گئی۔ امیر عبدالرحمٰن مسجد کی تعمیر کی خود نگرانی کرتا تھا اور کبھی کبھی مزدوروں کے ساتھ مل کر کام میں حصہ بھی لیا کرتا تھا۔ مسجد کی آرائش کے لیے اس نے سنگ مرمر کی سلیں منگوائیں، دیواروں پر نقش و نگار بنوائے، انہیں کشادہ اور بلند دروازے بنوائے۔ مسجد کا فرش مکمل طور پر سنگ مرمر سے بنوایا۔ تعمیری کام کا آغاز ۱۶۸ھ (۷۸۳ء) میں ہوا اور دو سال کے عرصے میں ایک وسیع رقبے پر نہایت خوشنما نقشے کے مطابق یہ مسجد اس حد تک تیار ہو گئی کہ اس میں نماز ادا کی جانے لگی۔ اس وقت تک اس پر ۸۰ ہزار دینار خرچ کیے جا چکے تھے۔[2]

علم و ادب اور شاعری:

امیر عبدالرحمٰن کو علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ میدان جنگ اور امور سیاست سے ہٹ کر وہ سوز و گداز سے بھرپور طبیعت کا حامل لگتا تھا۔ خود عمدہ اشعار کہا کرتا تھا۔ اس نے بڑے اہتمام کے ساتھ شام سے کھجور کا ایک پودا منگوا کر باغ رصافہ میں کاشت کیا تھا۔ یہ اندلس میں کھجور کا پہلا پودا تھا۔ بعد میں اسی کی گٹھلیوں سے اندلس کے باقی نخلستان کاشت ہوئے۔ امیر عبدالرحمٰن اس درخت کو بڑی محبت سے دیکھا کرتا تھا۔ ایسے میں اپنے وطن اور بچھڑے ہوئے اعزہ و اقارب کی یاد اس کی روح کی تاروں کو چھیڑ دیتی اور زبان پر پرسوز اشعار جاری ہو جاتے۔ ایک دن اپنے اس منظور نظر کو دیکھ کر کہا:

تَبَدَّتْ لَنَا وَسْطَ الرُّصَافَةِ نَخْلَةٌ
تَنَاءَتْ بِأَرْضِ الْغَرْبِ عَنْ بَلَدِ النَّخْلِ

"گلستان رصافہ کے درمیان ایک کھجور کا درخت نظر آیا، جو کھجوروں کی سرزمین (عرب) سے دور ہو کر سرزمین مغرب (یورپ) میں آ گیا ہے۔"

---

[1] التاریخ الاسلامی از احمد شلبی: ۷۸/۴، ۷۹
[2] سیر اعلام النبلاء: ۲۴۶/۸، ۲۴۷

فَقُلْتُ شَبِيْهِيْ بِالتَّغَرُّبِ وَالنَّوىٰ
وَطُوْلِ التَّنَائِيْ عَنْ بَنِيَّ وَعَنْ اَهْلِيْ

''اسے دیکھ کر میں نے کہا: ''تو بھی غریب الوطنی، فراق اور آل و اولاد سے طویل دوری میں میری طرح ہے۔''

نَشَاْتِ بِاَرْضٍ اَنْتِ فِيْهِ غَرِيْبَةٌ
فَمِثْلُكِ فِي الْاِقْصَاءِ وَالْمُنْتَاءِ مِثْلِيْ

''تو نے بھی بیگانی سرزمین میں پرورش پائی ہے۔ پس غریب الوطنی اور جدائی میں تو بھی میری مانند ہے۔''

سَقَتْكِ غَوَادِي الْمُزْنِ مِنْ صَوْبِهَا الَّذِيْ
يَسُحُّ وَيَسْتَمْرِي السِّمَا كَيْنِ بِالْوَبْلِ

''صبح کے بادل تجھے ایسی موسلا دھار بارش سے سیراب کرتے رہیں جو سماکین نامی دو ستاروں سے پانی لے کر مسلسل نیچے گرائے۔''

ایک بار اسی درخت کو مخاطب کر کے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا:

يَا نَخْلُ اَنْتِ فَرِيْدَةٌ مِثْلِيْ
فِي الْغَرْبِ نَائِيَةٌ عَنِ الْاَصْلِ

''اے شجرِ کھجور! تو بھی میری طرح تنہا ہے جو اپنی جڑ سے الگ ہو کر مغرب میں آ چکا ہے۔''

فَابْكِيْ وَهَلْ تَبْكِيْ مُكَمَّمَةٌ
عَجْمَاءُ لَمْ تُطْبَعْ عَلٰى خَبَلٍ

''پس میں روتا ہوں مگر کیا خوشوں سے ڈھکا بے زبان شجرِ کھجور بھی رو سکتا ہے جبکہ خیال آرائی اس کی فطرت نہیں۔''[1]

وَلَوْ اَنَّهَا تَبْكِيْ اِذًا لَبَكَتْ
مَاءُ الْفُرَاتِ وَمَنْبَتُ النَّخْلِ

''اگر وہ رو سکتا تو پھر (اسے سیراب کرنے والا) آبِ فرات اور (اس کا وطن) نخلستان بھی روتا۔''

لَكِنَّهَا حُرِمَتْ وَاَخْرَجَنِيْ
بُغْضِيْ بَنِي الْعَبَّاسِ عَنْ اَهْلِيْ

''مگر یہ بھی محروم ہوا اور مجھے بھی بنو عباس کے بغض نے اپنوں سے نکال پھینکا۔''[2]

---

[1] تاریخ الاسلام للذہبی میں مُكَمَّمَةٌ کی جگہ مُكَنَّسَةٌ درج ہے مگر نفح الطیب (۳/ص ۲۰) میں مُكَمَّمَةٌ ہی ہے جس کا لفظی مطلب ''چادر پوش'' یا ''خوشوں سے ڈھکا'' ہے۔ مُكَنَّسَةٌ کا مطلب ''عقل مند اولاد پیدا کرنے والی'' ہے جسے اختیار کرنا معنی کے لحاظ سے درست ہے نہ وزنِ شعری کے۔

[2] تاریخ الاسلام للذہبی: ۱۱/۲۳۱، ت تدمری

علامہ اقبال مرحوم نے امیر عبدالرحمن اول کے ان اشعار کے مفہوم کو اپنی نظم میں یوں دُہرایا ہے۔

میری آنکھوں کا نور ہے تو
میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں
میرے لئے نخلِ طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا
صحرائے عرب کی حور ہے تو
پردیس میں ناصبور ہوں میں
پردیس میں ناصبور ہے تو
غربت کی ہوا میں بار ور ہو
ساقی ترا نمِ سحر ہو[1]

***

① بالِ جبریل، حصہ منظومات

ہشام اوّل الرضی

۱۷۲ھ تا ۱۸۰ھ (۷۸۸ء تا ۷۹۶ء)

عبدالرحمٰن الداخل نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے ہشام کی جانشینی کا اعلان کر دیا تھا، اس لئے ان کی وفات کے بعد یکم جمادی الاخریٰ ۱۷۱ھ میں ہشام بن عبدالرحمٰن اندلس کے دوسرے اُموی حکمران کی حیثیت سے تخت نشین ہوا۔ اُسے تاریخ میں ہشام اوّل، ہشام الرضی اور عادل کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ہشام اوّل بچپن ہی سے اندلس کے نامی گرامی علما، فقہا، اور مشائخ کی مجالس میں حاضری دیتا اور ان سے استفادہ کرتا تھا۔ وہ علم کا پیاسا اور عمل کا خوگر تھا، شریعت کی سختی سے پابندی کرتا تھا، نماز، روزہ اور دیگر عبادات بڑے اہتمام سے بجالاتا تھا۔ بلند ہمتی، بیدار مغزی اور شجاعت میں وہ اپنے باپ جیسا تھا۔ خوش اخلاقی، رحم دلی، سخاوت اور خدا ترسی اس کے امتیازی اوصاف تھے۔ اسے اپنے باپ کی طرح مختلف علوم میں قابلِ رشک مہارت حاصل تھی۔ ادبی اور شعری ذوق بھی ورثے میں ملا تھا۔ اس کا بڑے بھائی سلیمان دامن ان خوبیوں سے عاری تھا۔

یہی وجہ تھی کہ عبدالرحمٰن الداخل نے عام دستور سے ہٹ کر بڑے بیٹے کی بجائے اسے اپنا وارث منتخب کیا۔[1]

اس انتخاب سے قبل عبدالرحمٰن نے بار بار ان دونوں بھائیوں کا امتحان لیا تھا اور ہر امتحان میں ہشام کو سلیمان پر فوقیت حاصل رہی تھی۔ اس بارے میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ امیر عبدالرحمٰن الداخل یہ اشعار گنگنا رہا تھا:

وَتَعْرِفُ مِنْ اَبِیْهِ شَمَائِلًا ۔۔۔ مِنْ خَالِهٖ اَوْ مِنْ یَزِیْدَ وَمِنْ حُجُر

سَمَاحَةَ ذَا وَبِرَّ ذَا وَوَفَاءَ ذَا ۔۔۔ وَنَائِلَ ذَا اِذَا صَحَا وَاِذَا سَکِر

''اس کے باپ اور اس کے ماموں کی یا یزید اور حجر کی شکل دیکھ کر تم اس (ممدوح) کی سخاوت، اس کی نیکی، اس کی وفاداری، اور اس کی بخشش کو پہچان سکتے ہو، چاہے وہ ہوش میں ہو یا مدہوش ہو۔''

ہشام حاضر خدمت تھا، امیر عبدالرحمٰن نے اچانک پوچھ لیا: ''معلوم ہے یہ اشعار کس کے ہیں؟''

ہشام نے باادب انداز میں جواب دیا: ''حضور! یہ کندہ کے بادشاہ امرؤالقیس کے اشعار ہیں اور یوں محسوس ہوتا

---

[1] البیان المغرب: ۶۵/۲؛ سیر اعلام النبلاء: ۲۵۳/۸، ط الرسالۃ

ہے کہ امیر المسلمین ہی کی شان میں کہے گئے ہیں۔"

ہشام کا یہ برمحل جواب سن کر امیر عبدالرحمٰن نے اسے گلے سے لگا لیا اور انعام سے نوازا۔

کسی دوسرے موقع پر امیر نے یہی اشعار بڑے صاحبزادے سلیمان کے سامنے پڑھے اور شاعر کا نام پوچھا۔ سلیمان نے لاپرواہی سے کہا: "معلوم نہیں کس کے اشعار ہیں، لگتا ہے اہل عرب کے کسی تنگ ظرف آدمی نے کہے ہیں، خیر جس کے بھی ہوں مجھے ان بدوؤں کے اشعار یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

امیر عبدالرحمٰن نے یہ جواب سن کر خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اسی قسم کے چند امتحانات کے بعد اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اندلس کی حکومت کا وارث ہشام ہی کو بنانا چاہیے۔[1]

بھائیوں سے جھڑپ اور حسنِ سلوک:

تخت نشینی کے وقت ہشام اوّل کی عمر تقریباً ۳۲ سال تھی۔ اس کا بڑا بھائی سلیمان ان کی تخت نشینی سے خوش نہیں تھا، اس لئے وہ ان کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گیا، سلیمان نے قرطبہ کے شاہی محل پر قبضہ کر کے اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا، مگر عوام ہشام سے محبت کرتے تھے، انہوں نے شاہی محل کا محاصرہ کر کے سلیمان کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد ایک عرصے تک سلیمان نے اپنے دوسرے بھائی عبداللہ کے ساتھ مل کر ہشام کے خلاف سرگرمیاں جاری رکھیں مگر ان دونوں کو ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر کار دونوں نے ہشام سے معافی کی درخواست کی، ہشام نے اسے قبول کر کے ان دونوں کا غیر معمولی اعزاز و اکرام کیا۔

عبداللہ کو طلیطلہ میں ایک وسیع جاگیر عطا کی جبکہ سلیمان کو اس کی خواہش کے مطابق بھرپور مراعات کے ساتھ افریقہ بھجوا دیا۔[2]

شرعی احکام کا اجراء:

ہشام اوّل نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے والد سے زیادہ عزیمت اور پختگی کے ساتھ شرعی احکام کا نفاذ کیا، شرعی محاصل کے سوا تمام ٹیکس معاف کر دیئے اور قرآن و سنت کے مطابق صدقات، زکوۃ اور عشر وصول کرنے کا حکم دیا اور اس کے لئے عامل مقرر کئے۔ علامہ ابن اثیر اور صاحب نفح الطیب نے زکوۃ و عشر کے نظام کے قیام کو ہشام کے اہم کارناموں کے طور پر بیان کیا ہے۔[3]

نصرانیوں سے جہاد:

ہشام اوّل کفار سے جہاد کا غیر معمولی ولولہ رکھتا تھا، مگر ایک عرصے تک باغی رشتہ داروں اور شورش پسند سرداروں

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۱/ ۳۳۲

② تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۱۵۹، ط دار الفکر؛ البیان المغرب: ۲/ ۶۲تا۶۳

③ نہایۃ الارب للنویری: ۲۳/ ۵۹؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۸۰ھ، ذکر وفاۃ ہشام

ے مزاحمت کے باعث وہ اپنے جذبۂ جہاد کی تسکین سے محروم رہا۔ جب مقامی بغاوتوں اور خانگی جھگڑوں کے شعلے سرد ہوئے تو ہشام نے اندلس کی اسلامی حکومت کے بدترین دشمن نصرانی حکمرانوں سے ٹکر لینے کی تیاری کی۔ اس مقصد کے لئے اس نے اعلانِ جہاد کر کے اندلس کے مسلمانوں میں کفار سے مقابلے کا زبردست جوش و جذبہ بیدار کر دیا۔

۱۷۵ھ (۷۹۱ء) میں اس نے ابوعثمان کی قیادت میں چالیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج نصرانی ریاستوں کی جانب روانہ کی۔ شمالی اندلس کے کئی علاقے ایک عرصے تک اندلس کی اسلامی سلطنت میں شامل رہنے کے بعد پھر نصرانیوں کے قبضے میں چلے گئے تھے، ہشام کی افواج نے ان علاقوں کو دوبارہ اسلامی سلطنت کا حصہ بنا دیا۔

جلیقیہ کی نصرانی ریاست اور آسٹریاس (Asturias) کے کوہستانی نصرانی ایک عرصے سے اندلس کے مسلمانوں کے لئے سخت خطرہ بن چکے تھے، ہشام نے اپنے سالار یوسف بن بخت کو اس دشوار مہم پر روانہ کیا۔ یوسف بن بخت نے دشوار گزار کہساروں میں گھس کر نصرانیوں کی اس سرکش ریاست کی طاقت کو کچل کر رکھ دیا اور ان کا فتنہ پرداز حاکم برمیوذر گرفتار کر لیا گیا۔ نصرانی ریاستوں اور جنوبی فرانس کی ان مہمات کے دوران مسلمانوں کو بکثرت مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ اربونہ سے جو مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا اس کا خمس ۴۵ ہزار اشرفیاں تھیں۔ امیر ہشام نے یہ تمام رقم جامع مسجد قرطبہ کی تکمیل پر خرچ کرنے کا حکم دیا۔

۱۷۶ھ میں ہشام نے اپنے نہایت قابل سپہ سالار عبدالملک کو ایک لشکرِ جرار دے کر "سپٹی مینیا" اور "الیہ" کی جانب روانہ کیا۔ یہ علاقے خودمختار ہو چکے تھے، ان کا اہم شہر ناربون (NARBONNE) ایک عرصے تک جنوبی فرانس کے اسلامی مقبوضات کا مرکز رہا تھا، مگر گزشتہ تقریباً ۳۰ سال سے یہاں فرانسیسی قابض تھے، اسلامی لشکر نے قلعہ "الیہ" پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔

گیرونا کا قلعہ کچھ عرصہ قبل فرانسیسیوں نے مسلمانوں سے چھین لیا تھا، یہ نہایت اہم جنگی مرکز تھا اور یہاں کئی سمتوں کے راستے باہم ملتے تھے، اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ۱۷۷ھ میں ہشام کے حکم پر اسلامی فوج نے گہری منصوبہ بندی کے بعد اس قلعے پر اچانک دھاوا بول دیا۔ ایک مختصر مگر تند و تیز مقابلے کے نتیجے میں قلعہ فتح ہو گیا اور اسلامی لشکر کو کئی سمتوں میں پیش قدمی کے راستے مل گئے۔

اسلامی لشکر آگے بڑھ کر "وادیٔ راہول" پر بلا مزاحمت قابض ہو گیا۔ فرانسیسی بادشاہ شارلیمین اس وقت جرمنی سے نبرد آزما تھا، اس کی مصروفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندلسی سپاہیوں نے آسانی سے ناربون کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا۔[1]

سپٹی مینیا اور گرد و نواح کے علاقوں سے مسلمانوں کو سونے، چاندی، جواہر اور زیور کے بے شمار ذخائر حاصل ہوئے۔ ناربون کی فصیلیں بیش قیمت مضبوط پتھروں اور سلوں سے تیار کی گئی تھیں۔ عبدالملک نے جنگی قیدیوں کو حکم

---

① نہایۃ الارب: ۲۳ / ۳۵۶؛ البیان المغرب: ۲ / ۶۳ تا ۶۵

دیا کہ فصیل کو توڑ کر اس کے پتھر علیحدہ کر لئے جائیں۔ حکم پر عمل ہوا عبدالملک نے ہر قیدی کو ایک پتھر اٹھا کر قرطبہ کی جامع مسجد تک لے جانے پر آزادی دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ہزاروں قیدی فصیل کے پتھر کاندھوں پر لاد کر قرطبہ روانہ ہوئے، بڑے پتھروں کو کئی کئی قیدیوں نے مل کر اٹھایا ہوا تھا۔ قرطبہ پہنچنے پر عبدالملک نے حسب وعدہ تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ ان پتھروں سے قرطبہ کی جامع مسجد کی مغربی دیوار تعمیر کی گئی۔ ایک دیوار کو تقسیم کر کے سینکڑوں میل دور منتقل کرانا عبدالملک کا دلچسپ و عجیب کارنامہ تھا۔ (۱)

جہاد کی دوسری مہم:

۱۷۸ھ (۷۹۵ء) میں ہشام نے اپنے معتمد امیر عبدالملک اور اس کے بھائی عبدالکریم کو نصرانیوں سے جہاد کی مہم کی تکمیل کے لئے روانہ کیا۔ عبدالکریم برق رفتاری سے یلغار کرتے ہوئے جنوبی فرانس کے علاقے سپٹی مینیا میں داخل ہو گیا۔ جنوبی فرانس کے شہر جرندہ اور ناربون (اربونہ) پہلے ہی سر کر لئے گئے تھے، اس لئے عبدالکریم کسی مزاحمت کے بغیر آگے بڑھتا گیا۔ یہاں فرانسیسی جرنیل ولیم ڈیوک آف ٹولوس ایک بڑی فوج لے کر اس مجاہد کے مقابلے میں آیا مگر اسے بری طرح شکست فاش ہوئی اور وہ جان بچا کر بھاگ نکلا۔ (۲)

تیسری مہم:

عبدالملک کی سرکردگی میں جانے والے لشکر نے جلیقیہ کی نصرانی ریاست پر چڑھائی کی، الفانسو دوم مقابلے میں زبردست لشکر لے کر آگے بڑھا مگر آمنا سامنا ہوتے ہی نصرانیوں پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اسلامی لشکر نے پوری ریاست پر قبضہ کر لیا، تاہم چونکہ یہ علاقہ انتہائی سرد اور قیام کے لئے ناموزوں تھا لہٰذا مسلمانوں نے یہاں آباد رہنے کا فیصلہ نہ کیا۔

ہشام اوّل کی ان جہادی مہمات کے باعث دور دراز تک کے نصرانی حکمرانوں پر مسلمانوں کا رعب طاری ہو گیا اور ایک طویل عرصے تک انہیں اندلس کی اسلامی سلطنت کی طرف بری نگاہ ڈالنے کی جراءت نہ ہو سکی۔ ہشام اوّل کے مجاہدانہ کارناموں کے باعث اندلس کی تاریخ میں اسے "کثیر الغزو والجہاد" (بکثرت جہاد کرنے والا) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (۳)

ہشام اوّل کی ہیبت سے نصرانی اتنے لرزہ براندام تھے کہ اس دور میں کوئی نصرانی بادشاہ یا رئیس کسی مسلمان کو گرفتار یا قید کرنے کی جراءت نہیں کر سکتا تھا۔ علامہ ابن اثیر تحریر فرماتے ہیں:

"ہشام کے دور میں اسلام کو اتنی عزت ملی اور کفر اتنا ذلیل ہوا کہ ان دنوں ایک آدمی نے مرتے ہوئے

---

(۱) نفح الطيب من غصن الاندلس الرطيب، للمقری التلمسانی: ۱/۳۳۷

(۲) نهاية الارب للنويری: ۲۳/ ۳۵۵ تا ۳۵۷، ط دار الكتب والوثائق القومية، نفح الطيب: ۱/۳۳۷

(۳) تاريخ ابن خلدون: ۴/۱۲۰، ط دار الفكر، نفح الطيب من غصن الاندلس الرطيب، للمقری التلمسانی: ۱/۳۳۷

وصیت کی کہ اس کے مال کا ایک حصہ کسی مسلمان قیدی کو آزاد کرانے کے لئے فدیے میں خرچ کر دیا جائے۔ جب اس شخص کی وصیت پوری کرنے کے لئے کفار کے ممالک میں کسی مسلمان قیدی کی تلاش شروع کی گئی تو معلوم ہوا کہ کہیں بھی کوئی مسلمان قیدی موجود نہیں ہے کہ جسے فدیہ دے کر آزاد کرایا جاسکے اور یہ کفار کی کمزوری اور مسلمانوں کی قوت کے باعث ہوا تھا۔''[①]

امام مالک رحمہ اللہ کی ہشام سے غائبانہ محبت:

ہشام کے زمانے میں عالم اسلام کے عظیم مجتہد، حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے علمی کمالات اور فقہی مہارت کا شہرہ دنیا کے کونے کونے میں پھیل رہا تھا، ہشام امام مالک رحمہ اللہ کی علمی مقام سے بہت متاثر تھا۔ اُدھر حضرت امام مالک رحمہ اللہ بھی ہزاروں میل کی مسافت کے باوجود اندلس کے اس مردِ مجاہد کے حالات سن کر مسرور ہوتے۔ ایک بار آپ رحمہ اللہ نے اندلس کے مشہور عالم زیاد بن عبد الرحمٰن لخمی رحمہ اللہ کی زبان سے ہشام کے کارنامے سنے تو فرمایا:

''کاش! اللہ تعالیٰ ہمارے حج کو ایسے لوگوں کی شرکت سے رونق عطا فرمائے۔''[②]

اندلس میں فقہ مالکی کی ترویج:

ہشام کے دور میں اندلس کے طلبہ نے بکثرت مدینہ منورہ کا سفر کر کے امام مالک رحمہ اللہ سے فیض حاصل کیا اور پھر اندلس آ کر مالکی مسلک کی اشاعت کی۔ خود امیر ہشام نے یحییٰ بن یحییٰ اور دیگر باصلاحیت افراد کو امام مالک رحمہ اللہ کی خدمت میں علم دین اور اصول فقہ کی تحصیل کے لئے روانہ کیا۔

ان حضرات نے امام مالک رحمہ اللہ کے پاس رہ کر دن رات ایک کر کے فقہ مالکی سیکھا اور مؤطا امام مالک پڑھی۔ جب یہ واپس آئے تو ہشام نے انہیں حکومت اور شرعی عدالتوں کے اعلیٰ عہدے عطا کئے۔ یہی وجہ ہے کہ اندلس میں مالکی مذہب کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ امام مالک رحمہ اللہ سے عقیدت کی بناء پر ہشام اور ان کے ارکان حکومت اختلافی مسائل میں امام مالک رحمہ اللہ کے اجتہاد پر عمل کیا کرتے تھے۔ امیر ہشام کے نزدیک مؤطا امام مالک رحمہ اللہ حدیث اور اسلامی فقہ کی سب سے عمدہ کتاب تھی۔ بعد میں بھی طویل عرصے تک اندلس کی عدالتوں اور افتاء کے مراکز میں قرآن مجید کے بعد مؤطا امام مالک کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔[③]

تعلیم اور اشاعتِ اسلام:

امیر ہشام اوّل کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے پورے اندلس میں اسلامی تعلیمات کے مراکز کا جال بچھوا دیا، ہر شہر میں بڑی بڑی جامعات اور ہر بستی اور گاؤں میں مدارس و مکاتب قائم کروائے، عصری علوم کی درس گاہیں بھی

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۱۸۰ھ، ذکر وفاة ہشام

② نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۱/ ۳۳۷

③ التاریخ الاسلامی از احمد شلبی: ۴/ ۸۳، نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۳/ ۲۳۰، تاریخ العرب وحضارتهم فی الاندلس: ۱/ ۱۱۱، ۱۱۲

جگہ جگہ کھلوائیں۔ان سب اداروں میں تعلیم سرکاری خرچ پر تھی۔

اسی دور میں عربی زبان کی ترویج پر خاص توجہ دی گئی اور اسے اندلس کی سرکاری زبان قرار دیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اندلس میں عربی کی خاطر خواہ اشاعت ہوئی۔مقامی غیر مسلم قومیں اور ان کی نسلیں جب عربی سے آشنا ہوئیں تو انہیں اسلامی تعلیمات کو قریب سے جاننے کا موقع ملا۔اس طرح نصرانیوں اور یہودیوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے راستے کھل گئے۔ ①

عدل وانصاف:

ہشام نے ملک میں عدل وانصاف کا بول بالا کیا اور ہر شخص کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھے،ان کے دور میں اندلس کا امن وامان مثالی تھا۔اپنے عاملوں اور افسران کی زیادتیوں پر وہ سخت کارروائی کیا کرتا تھا اور ایسے افسران کو برطرف کر کے آیندہ کسی بھی عہدے کے لئے نااہل قرار دے دیتا تھا۔

ایک بار کسی سرکاری اہلکار نے ایک شخص کو مارا پیٹا۔وہ شخص امیر ہشام کی سواری کے راستے میں کھڑا ہو گیا تاکہ اپنی فریاد براہ راست امیر کو سنائے۔وہاں موجود ایک افسر کا اس ظالم اہلکار سے گہرا تعلق تھا،اس نے چاہا کہ بادشاہ تک ظالم اہلکار کی شکایت بھی نہ پہنچے اور مظلوم کی دادرسی بھی ہو جائے۔

اس نے فریادی کو اپنے ساتھ لیا اور ایک خیمے میں لا کر بٹھا دیا،پھر ظالم اہلکار کو معافی مانگنے کے لئے وہاں بلوایا اور دونوں کو باہم راضی کروا دیا...... بعد میں اس افسر کی یہ حرکت ہشام کو معلوم ہو گئی،وہ اس بات پر نہایت برہم ہوا، مصاحبین نے عرض کیا:"حضور فریادی کو راضی کرلیا گیا ہے۔"

مگر ہشام کو اطمینان نہ ہوا۔کہا:"جب تک ظالم کو سزا نہ ملے،مظلوم سے انصاف نہیں کیا جاسکتا۔"فریادی کو بلوایا اور کہا اگر اس اہلکار نے حد شرعی کے سوا تمہیں مارا پیٹا ہے تو اس کی تفصیل حلفیہ بیان کرو۔" چنانچہ بادشاہ کے سامنے فریادی نے حلفیہ بیان دیا اور ظالم اہلکار سے اس کا بدلہ لیا۔ ②

بدگمانی کا قلع قمع کرنے کے لیے اپنے نفس پر سختی:

ہشام نے قرطبہ کے قریب وادی الکبیر کا پل از سر نو تعمیر کرایا۔نئی تعمیر نہایت مستحکم اور دلکش تھی۔پل تیار ہوا، ہزاروں لوگ اس کا نظارہ کرنے آئے،کسی کے منہ سے نکل گیا۔"بادشاہ نے سرکاری مال سے یہ پل اس لئے تعمیر کرایا ہے تاکہ خود ان کو آنے جانے میں سہولت رہے۔" یہ بات ہشام کے کانوں تک پہنچی تو زندگی بھر اس پل پر قدم نہیں رکھا تاکہ عوام کو بدگمانی نہ ہو۔ ③

---

① تاریخ العرب وحضارتهم في الأندلس: ١/١٢١،١٢٣،١٣٩،١٨٥،٣٢٥

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ٢/٩٩

③ البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ٢/٩٩

اس نیک سیرت حکمران نے تقریباً سات برس حکومت کر کے یکم رجب ۱۸۰ھ (۹ ستمبر ۷۹۶ء) کو وفات پائی۔ عمر صرف اُنتالیس (۳۹) سال چار ماہ تھی۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے عبدالملک کی جگہ چھوٹے لڑکے الحکم کو جانشین نامزد کر دیا تھا جو بڑا ہوشیار، جنگجو اور قابل نوجوان تھا۔

اندلس کے عوام کو ہشام الرضی سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ اسے امیر عادل کہہ کر یاد کرتے تھے۔ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس کے فضائل کے بیان میں اہل اندلس یہاں تک کہتے تھے کہ وہ اپنی سیرت و کردار میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے مشابہ تھے۔''[1]

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اندلس کی اُموی حکومت کی بنیاد عبدالرحمٰن الداخل نے رکھی تھی مگر اسے صحیح معنوں میں استحکام ہشام اوّل نے بخشا۔ اس کا دورِ اقتدار صرف سات سال رہا مگر فتوحات و استحکام کے لحاظ سے یہ زمانہ اتنا کامیاب تھا کہ یہ حکومت تین صدیوں تک قائم رہی۔ اس دوران اسے بارہا داخلی فتنہ انگیزیوں اور بیرونی خطرات کا سامنا کرنا پڑا مگر سلطنت کے ابتدائی دو معماروں نے اس کا ڈھانچہ اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم کیا تھا کہ بادِ مخالف کے متواتر تھپیڑوں کے باوجود اس خاندان کے تاجدار ۳۰۰ سال تک اندلس پر حکومت کرتے رہے۔

◆◆◆

[1] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۸۰ھ، ذکر وفاۃ ھشام

الحکم الاوّل، الربضی

(۱۸۰ھ تا ۲۰۶ھ............۷۹۶ء تا ۸۲۲ء)

ہشام اوّل کے بعد صفر ۱۸۰ھ میں اس کے ۲۶ سالہ بیٹے الحکم بن ہشام نے حکومت سنبھالی۔ وہ ایک سپاہی پیشہ آدمی تھا۔ جنگجوئی، ہوشیاری اور رعب و دبدبے میں یکتا تھا۔ اسے الحکم اوّل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مگر ان خوبیوں کے باوجود اسے اپنے طویل دورِ حکومت میں مسلسل شورشوں کا سامنا رہا جس کے باعث وہ سخت گیر بنتا چلا گیا اور بعض مواقع پر اس کی غیر معمولی سختی ظلم کی حد تک پہنچ گئی اس لیے اسے تاریخ میں اپنے باپ دادا جیسا قابلِ تعریف مقام نہ مل سکا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اندلس کو غیر ملکی طالع آزماؤں سے بچانے اور عسکری لحاظ سے مستحکم کرنے میں اس کا بہت بڑا کردار ہے۔

چچاؤں کی بغاوت:

الحکم کو حکومت سنبھالتے ہی ۱۸۲ھ میں ایک بہت بڑی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہوا یوں کہ اس کے چچا عبداللہ اور سلیمان جو گزشتہ دورِ حکومت میں جلاوطن کر دیے گئے تھے، واپس آکر اس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ انہوں نے شاہِ فرانس شارلیمن سے مل کر ساز باز کی کہ وہ ان کی بغاوت کا اعلان سنتے ہی شمال سے حملہ کر دے۔ اس کے علاوہ شمالی سرحدی ریاست 'ایکویٹین' کا نصرانی نواب بھی سازش میں شریک ہو گیا۔

عبداللہ نے طُلَیطلہ پہنچ کر مقامی نصرانیوں اور مسلمانوں کو ہمنوا بنایا۔ سلیمان نے بَلَنسِیہ میں بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی شارلیمن پیش قدمی کرتے ہوئے برشلونہ پہنچ گیا اور ایکویٹین کے حاکم نے شمالی اندلس کے دیگر کئی شہروں پر قبضہ کر لیا۔

الحکم اوّل عبداللہ کی بغاوت کی اطلاع سنتے ہی طُلَیطلہ پہنچ چکا تھا مگر جب شارلیمن کو بھی شمال سے بڑھتے دیکھا تو طُلَیطلہ کا محاصرہ ترک کر کے شمالی سرحد کا رخ کیا۔ اس کی طوفان خیز یلغار کو دیکھ کر ایکویٹین کا حاکم سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور اپنی ریاست میں محصور ہو گیا۔ شارلیمن بھی برشلونہ کا محاصرہ چھوڑ کر الٹے پاؤں واپس ہوا مگر الحکم اس کا تعاقب کرتے ہوئے فرانس میں داخل ہو گیا اور کوہِ بُرتات (Pyrenees) اور "ناربون" کو دیکھتے ہی دیکھتے فتح کر ڈالا۔

اس دوران اس کے باقی چچا عبداللہ اور سلیمان موقع پا کر اندلس کے بیشتر شہروں پر قابض ہو گئے۔ انہیں توقع تھی

کہ الحکم اوّل کو فرانس میں شکست ہوگی اور پیچھے ان کے لیے اقتدار کا راستہ بالکل صاف ہوگا مگر ان کی توقع کے برخلاف الحکم نے فرانسیسیوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔ اگر پیچھے باغیوں کے تسلط کی خبریں نہ آتیں تو وہ وسطی فرانس تک آسانی سے پہنچ جاتا مگر اسے چند فتوحات کے بعد فوراً واپس آنا پڑا تاکہ بغاوت کو انجام تک پہنچایا جاسکے۔

اس کی فاتحانہ آمد نے باغیوں کو حواس باختہ کر دیا اور شہروں سے ان کا تسلط ختم ہوگیا۔ البتہ پہاڑوں میں دو تین سال تک ان کا تعاقب جاری رہا۔ آخر ۱۸۵ھ کی ایک جھڑپ میں سلیمان مارا گیا۔

۱۸۷ھ میں عبداللہ نے بھی ہار مان کر معافی کی درخواست بھیج دی جو الحکم نے قبول کرلی۔ اسے عزت و احترام کے ساتھ مراکش کے شہر "طنجہ" بھیج کر اس کے اخراجات کے لیے ماہانہ ایک ہزار دینار جاری کر دیے۔ الحکم نے مزید کشادہ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے عبداللہ کے بیٹے قاسم کو اپنا داماد بنالیا۔ ①

دولتِ ادارسہ سے تعلقات:

الحکم کے دور میں مراکش میں علویوں کی آزاد ریاست دولتِ ادارسہ قائم ہوئی۔ اندلس کے لیے یہ ایک بہت بڑی نعمت تھی کیوں کہ یہ حکومت بنو عباس کی حریف تھی لہٰذا اس کے قیام کے بعد اندلس پر عباسیوں کے براہِ راست حملے کا خطرہ ٹل گیا۔ الحکم نے دانائی کا ثبوت دیتے ہوئے دولتِ ادارسہ سے دوستانہ تعلقات قائم کرلیے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود بنو عباس کے دل سے اندلس پر حملے کا خیال نکل گیا، اس کی جگہ خود ان کو خطرہ لاحق ہوگیا کہ کبھی بنو امیہ دولتِ ادارسہ کو ساتھ ملا کر دولتِ بنو عباس کے خلاف لشکر کشی شروع نہ کر دیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب تیونس میں بنو عباس سے الگ ہو کر ایک اور آزاد حکومت "دولتِ اغالبہ" قائم ہوئی تو ہارون الرشید نے اسے ختم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی کیوں کہ اس طرح خود بخود بنو عباس کو ایک حدِ فاصل مل رہی تھی جو دولتِ ادارسہ اور امویانِ اندلس کو مشرق کی طرف بڑھنے سے روک سکتی تھی۔

اندلس کے خلاف نصرانی طاقتوں کا گٹھ جوڑ:

شارلیمین فرانس کا وہ تجربہ کار، ہوشیار، زیرک اور عیار حکمران گزرا ہے جس نے اموی اسلامی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی اندلس میں دخل اندازی شروع کر دی، تاہم عبدالرحمٰن اوّل، ہشام اوّل اور الحکم اوّل کے ہاتھوں متواتر شکست کھانے کے بعد اس نے اندلس میں براہِ راست مداخلت کی پالیسی ترک کر دی۔

اس کی بجائے اس نے شمالی اندلس کے نصرانی حکمرانوں کے تعاون سے اندلس سے ملحق ایک ایسی خودمختار نصرانی سلطنت کے قیام کا منصوبہ بنایا جو مستقل طور پر اندلس کے حکمرانوں کے لیے دردِ سر بنی رہے۔

شمالی اندلس میں فرانس کی سرحد کے قریب اس وقت نصرانیوں کی چند چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک "آسٹریاس" تھی جس کا حاکم الفانسو اوّل تھا۔ دوسری "ایکوٹین" تھی جس کا بادشاہ لوئیس تھا۔

---

① نفح الطیب: ۱/۳۳۸ تا ۳۴۰، ط دار صادر؛ تاریخ ابن خلدون: ۴/۱۶۰، ۱۶۱، ط دار الفکر؛ البیان المغرب: ۲/۷۰

شارلیمین نے "ٹولوز" میں الفانسو، لوئیس اور دیگر مقامی نوابوں کو جمع کر کے اس پر متفق کر لیا کہ کوہ برتات (Pyrenees) اور اندلس کے مسلم مقبوضات کے درمیان دشوار گزار پہاڑیوں کے بے آباد علاقے میں ایک نئی نصرانی ریاست قائم کی جائے جس کی فوج اندلس کی اسلامی آبادیوں کو وقتاً فوقتاً نقصانات پہنچاتی رہے اور چھاپہ مار کارروائیوں کے ذریعے اسلامی لشکر کے لیے کوہ برتات کو عبور کر کے یورپ تک رسائی ناممکن بنائے رکھے۔

ان حکمرانوں کو متفق کر کے (۷۹۸ء) میں شمالی اندلس میں دریائے ابرو کے ساحل سے برشلونہ تک وسیع ایک نئی ریاست قائم کی گئی جس کا نام "گاتھک مارچ" رکھا گیا۔ یہ ریاست "اسپینش مارچ" بھی کہلاتی رہی۔

"بوریل" نامی ایک نصرانی رئیس کو نصرانیت کے اس نئے مورچے کا حاکم بنادیا گیا اور اس علاقے کو مکمل طور پر ایک فوجی چھاؤنی بنادیا گیا۔ جگہ جگہ قلعے تعمیر کئے اور فوج متعین کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ریاست یورپی بادشاہوں کے لئے ایک حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی آڑ میں نہ صرف وہ خود کو مسلمانوں کے حملے سے بچا سکتے تھے بلکہ جب چاہے اپنے اوپر کوئی الزام لیے بغیر اندلس کو تاراج کر سکتے تھے۔

اس ریاست کے قیام نے الحکم کے لیے مستقل دردِ سر پیدا کر دیا۔ طرہ یہ کہ انہی دنوں الحکم کے بارے میں یہ خبریں عام ہو گئیں کہ وہ فسق و فجور کا عادی ہے۔ یہ افواہیں تھیں یا حقیقت۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ الحکم سپاہی پیشہ آدمی ہونے کی وجہ سے کھیل کود، سیر و شکار اور تفریحات کا عادی تھا۔ اپنے باپ کی طرح عابد و زاہد نہ تھا۔ علماء کی عزت و توقیر ضرور کرتا تھا مگر اس کا طبعی رجحان ان کی صحبت سے کہیں زیادہ جنگ اور سیاست کی طرف تھا۔ ہشام الرضی کا زمانہ دیکھنے والوں کو الحکم میں یہ کمی بہت ناگوار گزرتی تھی۔ خاص کر قرطبہ جہاں قدم قدم پر علم و فضل کی محفلیں جمتی تھیں وہاں حکمران کی ایسی مصروفیات اور رجحانات کو ناپسند کیا جانے لگا۔

مزید یہ کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید اور شاہ فرانس شارلیمین میں دوستی کا معاہدہ ہو گیا اور اندلس کی اُموی حکومت کے خلاف وہ دونوں اتحادی بن گئے۔ عباسیوں کے حامیوں نے اندلس کے شہریوں میں یہ خیال عام کر دیا کہ الحکم خلافت اسلامیہ کا باغی ہے۔ اسے معزول کرنا واجب اور اس کی جگہ عباسی خلیفہ کے اتحادی شاہ فرانس کی حکمرانی قبول کرنا بہتر ہے۔

ان سب چیزوں نے مل کر الحکم کے خلاف باغیانہ خیالات کو تحریک دی اور شمالی اندلس کے شہروں سرقسطہ اور جلیقیہ کے مسلم حکام نے شاہ فرانس کی اطاعت کا اعلان کر دیا۔ ان باغیوں کی طلب پر ان کی مدد کے لیے ۱۸۸ھ کے اواخر میں فرانس اور شمالی نصرانی ریاستوں کی افواج بھی آن پہنچیں۔ جن میں سے ایکوٹین کے نواب نے برشلونہ کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ سرقسطہ اور جلیقیہ پر بھی نصرانیوں کا تسلط مستحکم ہو گیا۔

الحکم نے اپنے سپہ سالار ابراہیم کو بھیج کر سرقسطہ اور جلیقیہ کو سخت جنگوں کے بعد نصرانیوں سے بازیاب کرا لیا مگر نصرانیوں نے محاذ کو بہت پھیلا دیا تھا اس لیے قرطبہ کی افواج دیگر سمتوں میں پیش قدمی نہ کر سکیں۔ اس دوران ۱۸۹ھ میں برشلونہ کی نصرانی افواج پیش قدمی کر کے طلیطلہ (میڈرڈ) پہنچ گئیں جو سابق گاتھک نصرانی بادشاہوں کا پایہ تخت

تھا۔ مقامی غدار مسلمانوں اور نصرانیوں کی مدد سے حملہ آوروں نے یہ شہر بہت جلد چھین لیا۔

تاہم الحکم نے عمروس بن یوسف کو بھیج کر جوابی کارروائی کی اور ایک سخت معرکے کے بعد یہ شہر واپس لے لیا گیا۔ فتح کے بعد مقامی غدار نصرانیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا گیا اور انہیں تلافی کا موقع دیا گیا۔ ان کامیابیوں کے بعد الحکم کو اطمینان سے حکومت کا موقع ملا۔ تاہم بڑے بڑے دشمنوں پر فتح نے اسے مغرور کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے کھلم کھلا فسق وفجور کے کام بھی شروع کر دیے۔[1]

مالکی علماء کا خروج اور سزائے موت:

یہ دیکھ کر مالکی فقہاء، جن کا قرطبہ میں بڑا اثر ورسوخ تھا، اس کے خلاف ہو گئے۔ ان میں موطا مالک کے راوی قاضی یحییٰ بن یحییٰ مالکی رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے بنوامیہ کے ایک معزز رئیس محمد بن قاسم مروانی کو حکمران بنانا طے کر لیا۔ محمد بن قاسم نے بظاہر ان کی تجویز قبول کر لی مگر پھر الحکم کو جا کر سارا ماجرا سنا دیا۔ چنانچہ بغاوت کی پاداش میں "۷۲" علماء وفقہاء گرفتار کر لیے گئے۔ الحکم نے قاضی یحییٰ رحمہ اللہ کو مستثنیٰ کر کے باقی سب کو سر عام پھانسی دے دی۔ سزائے موت پانے والوں میں بڑے نامور علماء اور امراء شامل تھے اس لیے اہل قرطبہ الحکم سے نفرت کرنے لگے۔[2]

اہل طُلَیْطلہ سے سلوک:

الحکم کو اہل طُلَیْطلہ سے بغاوت کا مستقل خدشہ لاحق رہتا تھا۔ یہ نصرانیوں کا سابقہ پایۂ تخت تھا اور وہاں اب تک اکثر آبادی غیر مسلم تھی۔ یہ لوگ اُمراء کو تنگ کر کے تبدیل کراتے رہتے تھے۔ الحکم نے انہیں مزا چکھانے کے لیے اپنے ایک معتمد امیر عمروس بن یوسف سے کام لیا۔ یہ شخص عربوں اور ہسپانویوں کی ملی جلی نسل سے تعلق رکھتا تھا، ایسے لوگ 'مولّدین' کہلاتے تھے اور ہسپانیہ کے لوگ خالص عربوں کی بہ نسبت ان پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔

الحکم نے عمروس بن یوسف کو طُلَیْطلہ کا نیا حاکم بنا کر بھیج دیا اور اسے تاکید کی کہ وہ شہر کے مسلم ونصرانی عمائد پر غیر معمولی مہربانیاں کرے اور ان کے سامنے حکومت کے خلاف باغیانہ خیالات ظاہر کرے، پھر جو لوگ اس سے اتفاق کریں انہیں اپنا مقرب بنا لے۔ اس طرح سارے باغی سامنے آ جائیں گے جنہیں ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔

عمروس بن یوسف امیر بن کر طُلَیْطلہ پہنچا۔ اس نے حکومت سے متنفر عمائد کو باغیانہ گفتگو کے ذریعے اعتماد میں لے لیا اور انہیں یقین دلایا کہ وہ عنقریب الحکم کے خلاف بغاوت کرنے والا ہے۔ اہل شہر سے مشورہ کر کے اس نے شہر میں ایک نیا قلعہ بھی تعمیر کر لیا۔

کچھ مدت بعد الحکم نے اپنے بیٹے شہزادہ عبدالرحمٰن کو ایک فوج دے کر روانہ کیا۔ دنیا پر یہ ظاہر کیا گیا کہ یہ فوج

---

[1] جمہرة انساب العرب از علامہ ابن حزم: ۹۵، ۹۶؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۱۳/ ۲۲ ترجمۃ الحکم بن هشام،ت تدمری؛ الکامل فی التاریخ سنۃ ۱۸۰ھ

[2] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۸۰ھ

شمال کی کسی مہم پر جا رہی ہے مگر اس کا اصل ہدف طُلَیْطِلَه ہی تھا۔ شہزادہ عبدالرحمن نے طُلَیْطِلَه کے باہر یوں پڑاؤ ڈالا جیسے اس کی منزل آگے کہیں ہو۔

عمروس بن یوسف نے شہزادے کو نئے قلعے میں بلایا اور غدار گروہ کے تمام عمائد کو جمع کر کے انہیں شہزادے کی خدمت میں حاضری کی ترغیب دیتے ہوئے سمجھایا کہ شہزادے کا اعزاز و اکرام اور خاطر مدارات بہت ضروری ہے تاکہ حکومت اہلِ طُلَیْطِلَه سے بے فکر رہے، ورنہ شہزادے کو قبل از وقت بغاوت کی بھنک پڑ جائے گی۔

عمائدِ شہر نے اس بات کا وزن محسوس کیا اور نئے قلعے میں چلے گئے۔ شہزادہ ایک کمرے میں بیٹھا تھا جس کا ایک دروازہ سامنے اور ایک عقب میں تھا۔ لوگوں کو کہا گیا کہ وہ قطار بنائیں اور ایک ایک کر کے شہزادے کو سلامی دینے کمرے میں جائیں اور عقبی دروازے سے باہر نکلتے جائیں۔ لوگ اندر جانا شروع ہوئے۔

جو بھی کوئی سلامی دے کر پچھلے دروازے سے باہر نکلتا، وہاں تعینات سپاہی اسے دبوچ لیتے اور سر قلم کر کے ایک خندق میں پھینک دیتے۔ اس طرح سات سو افراد دفن کیے گئے اور دیر تک کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ بعد میں جب گم شدہ عمائد کی تلاش شروع ہوئی تو یہ حقیقت کھلی۔ سب کانپ اٹھے اور پھر مدتوں تک انہوں نے بغاوت پر مائل کرنے والے کسی سیاست دان کی باتوں پر یقین نہ کیا۔[1]

اس واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ الحکم نہایت شاطر آدمی تھا اور یہ کہ وہ سیاستِ زمانہ کے لحاظ سے بقائے اقتدار اور قیامِ امن کے لیے ہر تدبیر اور کارروائی کو درست سمجھتا تھا چاہے وہ شرعاً اور اخلاقاً صحیح نہ سمجھی جاتی ہو۔ اس کارروائی سے امن تو قائم ہو گیا مگر دوسری طرف الحکم نے سخت بدنامی بھی مول لے لی۔ یہی وجہ ہے کہ مؤرخین نے اس واقعے کا ذکر ناپسندیدہ انداز میں کیا ہے۔

ماردہ کی بغاوت:

۱۹۰ھ میں مغربی اندلس کے شہر ''ماردہ'' میں ایک مسلمان امیر اصبغ بن عبداللہ نے بغاوت کر دی۔ الحکم نے فوراً اس کا زور توڑنے کا حکم دیا اور پہلے لشکر کی کمان خود کی لیکن سرحد پر پہنچتے ہی اسے قرطبہ میں باغیانہ سرگرمیوں کی خبر ملی لہٰذا اسے واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد وہ ماردہ میں بار بار فوج بھیجتا رہا۔ سات سال تک یہ مہم وقفے وقفے سے جاری رہی۔ آخر اصبغ نے ہتھیار ڈال دیے، الحکم نے اسے معاف کر کے قرطبہ کی نگران فوج میں اعلیٰ عہدہ دے دیا۔[2]

جہادی مہمات:

ان سالوں میں مسلمانوں کو نصرانیوں کی بھی مسلسل تاخت و تاراج کا سامنا رہا۔ ۱۹۲ھ میں یورپ سے ایک بحری فوج نے آ کر شمال مشرقی ساحلی شہر طرطوشہ پر حملہ کیا۔ شہزادہ عبدالرحمن ایک بڑا لشکر لے کر اس کے مقابلے کے لیے

---

[1] البیان المغرب: ۲/ ۷۰، الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۹۱ھ، ابن اثیر نے مقتولین کی تعداد پانچ ہزار نقل کی ہے مگر شاید یہ بات مبالغے سے خالی نہیں۔ [2] البیان المغرب: ۲/ ۷۳

پہنچا اور کئی خونریز جنگوں کے بعد اسے مار بھگایا۔[1]

۱۹۴ھ میں نصرانی لٹیروں نے سرحدی شہر ''الفرج'' کے قصبے ''وادی الحجارۃ'' میں لوٹ مار کی۔ ایک مسلمان عورت نے ایسے میں دہائی دی: ''الحکم! تو نے بے فکر رہ کر ہمیں ضائع کردیا۔ ہمیں دشمنوں کے سپرد کردیا۔''

ایک مقامی امیر عباس بن ناصح نے جا کر الحکم کو اس عورت کی فریاد سنائی تو اس نے فوراً اپنی کمان میں لشکر تیار کر کے سرحد کا رخ کیا۔ نصرانیوں کے کئی قلعے فتح کیے، بہت سوں کو قتل اور گرفتار کیا۔ اس کے بعد اس خاتون کو تلاش کرایا۔ اسے اور اس کے گھر والوں کو مخاطب کر کے کہا: ''کیا الحکم نے تمہاری فریاد رسی کر دی۔''

سب نے کہا: ''اللہ کی قسم! الحکم نے دل ٹھنڈے کر دیے۔ دشمن کو مزا چکھا دیا۔ اس نے خبر ملنے پر لاپرواہی نہیں برتی۔'' دو سال بعد الحکم دوبارہ فوج لے کر سرحد پر آیا اور نصرانیوں کے علاقے میں دور تک کارروائیاں کر کے لوٹا۔[2]

عبدالکریم کا شمالی اسپین پر حملہ:

۲۰۰ھ میں الحکم نے اپنے سپہ سالار عبدالکریم کو شمالی علاقوں کی طرف بھیجا۔ یہ مہم تین سال تک جاری رہی یہاں تک کہ عبدالکریم قبائلی چھاپہ ماروں کو تتر بتر کرتا اور ان کے قلعے فتح کرتا ہوا ایک دریا تک پہنچ گیا۔ مسلمان دریا عبور کرنا چاہتے تھے مگر نصرانی انہیں روک کر خود دریا کے پار آگئے۔ یہاں نصرانیوں کی متحدہ افواج سے بہت بڑی جنگ ہوئی جو تیرہ دن تک جاری رہی۔ آخر نصرانی شکست کھا کر بھاگ نکلے۔

نصرانیوں پر دھاک بٹھانے اور خراج وصول کرنے کے بعد ۲۰۳ھ میں وہ مال غنیمت کے انبار لادے قرطبہ واپس آگیا۔ تاہم ایسٹریاس، گاتھک مارچ اور ایکوٹین کی ریاستیں مکمل طور پر زیر نہ کی جاسکیں۔ مسلمان برشلونہ کی بندرگاہ کو بھی ریاست ''گاتھک مارچ'' کے قبضے سے آزاد نہ کرا سکے۔[3]

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی مسلسل مہمات کے باوجود نصرانیوں کا زور کم ہونے کی بجائے بڑھتا گیا، کیوں کہ مسلسل حالتِ جنگ میں رہنے سے ان چھاپہ ماروں کی جنگجوئی، جفاکشی اور مشق میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ الحکم اور بعد والے مسلم حکمران ان ریاستوں سے خراج لینا ہی کافی سمجھتے رہے۔ انہوں نے شمال کے سرد ترین موسم کے پیش نظر جبل البرتات (Pyrenees) میں ڈیرے ڈالنے یا فرانس میں گھس کر اپنے قلعے بنانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ مسلم امرا وہاں مستقل قیام کرنے کی بجائے ہمیشہ جنوب کے معتدل آب و ہوا کے شہروں میں تقرر کو ترجیح دیتے تھے۔

قحط سالی:

۲۰۳ھ میں اندلس میں شدید قحط پڑا۔ ساتھ ہی اناج کے لیے لوٹ مار بھی شروع ہوگئی۔ الحکم نے اس موقع پر باہر

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۷۲،۷۳

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۷۳

③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۰۰ھ

سے غلہ منگوا کر لوگوں میں تقسیم کیا اور لوٹ مار کی روک تھام کے لیے راستوں پر حفاظتی دستے مقرر کیے۔ اس طرح امن وامان بحال ہو گیا۔[1]

افریقی غلاموں کی بھرتی:

ان تمام مہمات کے باوجود الحکم اب تک اس قابل نہیں ہو سکا تھا کہ کوئی بڑی فوج مرتب کرتا اور اسے شمال میں مستقل طور پر تعینات کر کے نصرانیوں کی ریاستوں پر پوری طرح قابض ہو سکتا کیوں کہ اسے اندلس کے باشندوں پر اعتماد نہیں رہا تھا اور وہ ہر وقت اندرونی بغاوتوں کا خطرہ محسوس کرتا رہتا تھا۔

آخر اس نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک نئی فوج تیار کرنا شروع کی جس میں جنوبی اندلس کے صرف ان پر امن اور خوشحال علاقوں کے لوگ لیے گئے جہاں ماضی میں کبھی کوئی بغاوت نہیں ہوئی۔ ان کے علاوہ افریقہ سے ہزاروں غلام منگوا کر بھرتی کیے گئے جو اندلس کی مقامی زبانوں سے بالکل ناواقف تھے۔ اس طرح وہ مقامی سیاست، گروہ بندی یا کسی سازش کا حصہ بننے کے قابل نہیں تھے۔ الحکم نے ان کی فوجی تربیت میں خود دلچسپی لی اور انہیں سخت جنگی مشقوں کے ذریعے ماہر سپاہیوں میں بدل دیا۔

اہل قُرطبہ کا خروج:

پایہ تخت قرطبہ میں ان افریقی غلاموں کی موجودگی اہل شہر کے لیے طرح طرح کے مسائل کا باعث بن گئی۔ یہ لوگ عربوں کے شائستہ اخلاق وتہذیب سے بالکل عاری تھے، اس لیے بات بات پر اہل شہر سے جھگڑ پڑتے۔

رمضان ۱۹۸ھ میں ایک دن ایک افریقی فوجی کسی لوہار کے پاس گیا اور اسے تلوار تیز کرنے کہا۔ لوہار نے دیر کی تو افریقی کو غصہ آ گیا۔ اس نے وہی تلوار سونت کر لوہار کو مار ڈالا۔ یہ دیکھ کر بازار کے لوگ بپھر گئے۔ بہت سے لوگ جو پہلے ہی الحکم سے نالاں تھے، مسلح ہو کر سڑکوں پر آ گئے اور الحکم کی معزولی کے نعرے لگاتے ہوئے اس کے محل پر چڑھ دوڑے۔ شہر کے مالکی علماء وفقہاء بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ قاضی یحییٰ بن یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کے حامی تھے۔

الحکم نے یہ دیکھ کر اپنے افسران کو حکم دیا کہ وہ قرطبہ کے جنوبی محلے کو نذرِ آتش کر دیں کیوں کہ زیادہ تر حملہ آور وہیں کے تھے۔ اس حکم پر عمل ہوا اور حملہ آور اپنے گھروں کو بچانے کے لیے واپس دوڑے۔ الحکم نے سرکاری فوج کو ان کے تعاقب میں بھیج دیا۔ تین دن تک فوج اور باغیوں میں دست بدست جھڑپیں ہوتی رہی۔ آخر بغاوت کا زور ٹوٹ گیا۔ اس کارروائی میں ہزاروں باغی گرفتار ہوئے۔

الحکم نے تین سو عمائد شہر کو دریائے وادی الکبیر کے کنارے پھانسی دے دی گئی۔ باقی سب کی جان بخشی تو کر دی مگر حکم دیا کہ تین دن کے اندر اندر اپنے قصبے خالی کر دیں اور قرطبہ سے نکل جائیں۔ اس کے بعد الحکم نے ان تمام قصبوں کو جن میں سے زیادہ تر قرطبہ کے جنوب میں اور کچھ شاہی محل کے قریب واقع تھے، منہدم کرا دیا۔

---

[1] البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۷۳

اس سخت کارروائی کی بناء پر الحکم، عوام وخواص سب میں بدنام ہوگیا۔ اس نے اپنے باپ کے لقب "الرضی" سے متاثر ہوکر خودکو "المرتضیٰ" مشہور کرنے کی کوشش کی مگر لوگ اسے "الربضی" کہہ کر یاد کرتے رہے۔[1]

ملک بدر کیے جانے والوں میں سے آٹھ ہزار افراد مراکش کے شہر طنجہ میں اور چندرہ ہزار مصر کے شہر اسکندریہ میں جاکر آباد ہوگئے۔ ان میں نامور مالکی علماء اور ان کے پیروکار شامل تھے۔ بعد میں یہ اسکندریہ سے بھی نقل مکانی کرکے بحیرۂ روم کے جزیرے کریٹ پر قابض ہوگئے اور وہاں ایک مدت تک حکومت کرتے رہے۔[2]

مؤرخین نے ربض کا یہ واقعہ الحکم کی سخت گیری اور زیادتی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے مگر دوسری طرف ایسے مؤرخین بھی ہیں جو اس معاملے میں عوام اور ان کی حمایت کرنے والے علماء کو غلط بتاتے ہیں۔ ابن عذاری المراکشی (م ۶۹۵ھ) جو تاریخ اندلس پر وسیع نگاہ رکھتے تھے، لکھتے ہیں:

"بغاوت کی وجہ کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا سبب غصہ اور حماقت تھا کیوں کہ نہ تو لوگ مالی طور پر تنگ کیے گئے تھے، نہ عصمتیں لوٹی جارہی تھیں، نہ املاک پر تسلط جمایا جارہا تھا۔ حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات صحیح ہے۔ بلاشبہ نہ تو لوگوں پر ٹیکس عائد تھے، نہ بیگار لی جارہی تھی۔ کوئی بات ایسی نہ تھی جو خروج کا سبب بنتی۔ بلکہ یہ اشتعال انگیزی، عاقبت نااندیشی، تندمزاجی اور خودکشی تھی۔"[3]

وفات:

الحکم ۲۰۶ھ میں شدید بیمار پڑگیا اور آخرے ۲ سال حکومت کرکے ۲۵ ذوالقعدہ ۲۰۶ھ کو فوت ہوا۔ اس کی عمر ۵۲ سال تھی۔ اگرچہ وہ بذات خود علم وادب سے آشنا اور اچھا شاعر بھی تھا مگر علمی یا تعمیری وترقیاتی کاموں میں اس کی کوئی خاص شہرت نہیں کیوں کہ اس کا سارا دور ہنگاموں، بغاوتوں، سرحدوں کے دفاع اور بیرونی مہمات میں گزرا۔

الحکم کے کردار پر ایک نگاہ:

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ معاملات کو بذات خود انجام دیا کرتا تھا چاہے وہ قریب کے ہوں یا دور کے۔ اس کے پاس معتمد اہلکار تھے جو اسے لوگوں کے حالات بتاتے تھے، چنانچہ وہ ان سے زیادتیوں کی تلافی کرتا اور مظلوم کو انصاف دلاتا تھا۔ وہ بہادر، جنگجو اور بارعب تھا۔ اندلس کو اسی نے اپنے جانشینوں کے لیے ہموار کیا۔ وہ علماء وفقہاء کو قریب رکھتا تھا۔"[4]

الحکم کی زیادہ توجہ فوج پر تھی۔ وہ اندلس کا پہلا حکمران تھا جس نے فوج کو پیشہ ورانہ بنیادوں پر مستحکم کیا اور تنخواہ دار

---

[1] شہر سے متصل قصبے، محلے یا مویشیوں کے باڑے کو "ربض" کہا جاتا ہے، جس کی جمع "ارباض" ہے۔ الحکم کے منہدم کردہ محلے بھی "ربض" کہلاتے تھے، اس لیے لوگ ان کی یاد میں اسے "الربضی" کہنے لگے۔

[2] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۹۸ھ۔ ابن اثیر اور کئی مؤرخین نے یہ واقعہ ۱۹۸ھ کے تحت نقل کیا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ ۲۰۲ھ کا واقعہ ہے جیسا کہ البیان المغرب میں ابن عذاری مراکشی نے بیان کیا ہے۔

[3] البیان المغرب: ۲/۷۵، ۷۶ [4] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۰۶ھ

سپاہی بھرتی کیے۔ اس کے زرخرید جنگجو غلاموں کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ ①

اس کے قلعے کے دروازے پر سوسائیس ایک ہزار گھوڑے لے کر ہر وقت تیار کھڑے رہتے تھے تاکہ جوں ہی کسی بغاوت یا بیرونی حملے کی اطلاع ملے، اس کی سرکوبی کا انتظام کر دیا جائے۔

قاضی مصعب بن عمران اور علامہ محمد بن بشیر اس کے دور میں قرطبہ کے قاضی رہے جو علم و فضل اور عدل و انصاف کے حوالے سے مشہور ہیں۔ یہ حضرات انصاف میں الحکم کو بھی کٹہرے میں لے آتے تھے۔ ایک شخص نے عدالت میں دعویٰ کیا کہ اس کی باندی الحکم کے قبضے میں ہے۔ قاضی محمد بن بشیر نے الحکم کو عدالت میں طلب کیا اور کہا: ''جب تک خواص پر انصاف کا قانون نافذ نہ ہو، عوام پر نافذ نہیں ہو سکتا۔'' یہ کہہ کر الحکم کو مدعی کے دعوے سے آگاہ کیا۔

الحکم نے کہا: ''ایک صورت اور ہے۔ وہ یہ کہ میں مدعی کو اس باندی کی منہ مانگی قیمت دے دوں۔''

مگر قاضی صاحب نے کہا کہ یہ تو جبری خرید و فروخت ہوگی۔ اس کے بعد باندی کو عدالت میں لا گیا اور مقدمے کی سماعت ہوئی۔ قاضی صاحب نے گواہیوں اور شہادتوں کے مطابق مدعی کے حق میں فیصلہ کر کے باندی اس کے حوالے کر دی۔ ②

عام طور پر الحکم کو ظالم اور بے رحم کہا گیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بغاوتیں فرو کرنے کے سوا، وہ کہیں بھی خوں ریزی کا حامی نہیں دکھائی دیا۔ اپنے چچا، چچازادوں اور کئی باغیوں کو اس نے قابو پانے کے بعد نہ صرف معاف کر دیا بلکہ ان کے ساتھ طرح طرح کے احسانات بھی کیے۔ وہ عدل و انصاف کو پسند کرتا تھا اور کہا کرتا تھا:

''حکمرانوں کا بہترین زیور عدل ہے۔'' ③

❖❖❖

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۲۰۶ھ

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۷۸/۲، ۷۹

③ البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۷۹/۲

عبدالرحمٰن الثانی

۲۰۶ھ تا ۲۳۸ھ
(۸۲۲ء تا ۸۵۲ء)

عبدالرحمٰن ثانی ۲۰۶ھ میں تخت نشین ہوا۔ اسے بھی حکومت سنبھالتے ہی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی بغاوت اس کے دادا عبدالرحمٰن اول کے بھائی عبداللہ نے کی۔ اس عمر رسیدہ سیاست دان کے تین بیٹے پہلے سے اندلس کے مختلف صوبوں کے نائبین تھے۔ لہٰذا اسے خیال ہوا کہ میں آسانی سے تخت پر قابض ہو جاؤں گا۔ تاہم یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ اس کے بیٹوں نے اس کا ساتھ نہ دیا بلکہ اسے بمشکل سمجھا بجھا کر بغاوت سے منع کیا۔ عبداللہ کو مانتے ہی بنی۔ اس نے نئے حکمران سے معافی مانگ لی۔ عبدالرحمٰن ثانی نے درگزر سے کام لیا اور اسے مُرسیہ کا امیر مقرر کر دیا۔ عبداللہ مزید تین سال زندہ رہا اور اسی عہدے پر رہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوا۔[1]

عبدالرحمٰن ثانی کی تخت نشینی کے دوسرے سال اندلس کے جنوب مشرقی شہر "تدمیر" میں جہاں زیادہ تر عرب قبائل آباد تھے، خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ مضری اور یمانی قبائل آپس میں نبرد آزما ہوئے اور سات سال تک باہمی لڑائیوں اور جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا۔ قرطبہ سے اس خانہ جنگی کو روکنے کے لیے کئی بار سرکاری فوج گئی مگر اس کی واپسی کے بعد قبائل دوبارہ لڑنے لگتے۔ اس خانہ جنگی کا سب سے بڑا معرکہ ۲۰۹ھ میں ہوا جس میں یمانی قبائلیوں کی بڑی تعداد موت کے گھاٹ اتر گئی۔[2]

ریاست قسطالیہ کی داغ بیل:

عبدالرحمٰن ثانی کی تخت نشینی سے پہلے شمالی اندلس میں نصرانیوں کا ایک اور قلعہ بند شہر آباد ہو چکا تھا۔ آسٹریاس کے ایک پادری نے دعویٰ کیا تھا کہ اسے خواب میں ایک فرشتے نے آسٹریاس کے اس سرحدی جنگل میں جو ریاست "جلیقیہ" سے جا ملتا ہے، ایک قبر کی نشاندہی کرائی ہے جو حضرت مسیح کے حواری سینٹ جیمز کی آرام گاہ ہے۔

آسٹریاس کے حاکم نے اس دعوے پر یقین کر کے وہاں ایک مزار اور گرجا تعمیر کرا دیا۔ لوگ جوق در جوق وہاں

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۸۵/۲

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۸۱/۲

آنے اور آباد ہونے لگے۔ یہ بستی پہلے ایک قلعے اور پھر ایک شہر میں تبدیل ہوگئی۔ قلعے کی مناسبت سے اسے 'کیسٹل' یا "قسطالیہ" کہا جانے لگا۔

عبدالرحمن ثانی کے دور میں جب کہ اندلس کے مسلمان خانہ جنگی اور عیش وعشرت میں مشغول تھے، ریاست آسٹریاس مزید پھیل گئی۔ دو مزید نصرانی ریاستیں: لیون اور جلیقیہ بھی اس میں ضم ہوگئیں۔ چونکہ "قسطالیہ" ان کے وسط میں آتا تھا، اس لیے آسٹریاس کی توسیع کے بعد یہی شہر ریاست کا پایہ تخت بن گیا۔ اگلی صدیوں میں ریاست کا نام بھی 'قسطالیہ' مشہور ہوگیا۔ یہی وہ ریاست تھی جو آخر میں مسلمانانِ اندلس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوئی۔

شمالی اندلس کی مہمات:

الحکم اوّل کے دور میں شمالی اندلس کی نصرانی ریاستوں کو متعدد مہمات کے ذریعے از سر نو باج گزار بنایا جا چکا تھا مگر عبدالرحمن ثانی کے دور میں ان کی طرف سے خراج کی ادائیگی بند کرنے اور آمادۂ پیکار ہونے کے واقعات پیش آتے رہے۔ لہٰذا قرطبہ سے شمالی اندلس کی طرف وقتاً فوقتاً فوجی مہمات بھیجی جاتی رہیں۔ ۲۰۸ھ میں عبدالکریم "البہ" کی گھاٹی عبور کر کے نصرانی ریاستوں: جلیقیہ اور آسٹریاس میں گھسا اور کئی جنگوں کے بعد انہیں دوبارہ باج گزار بنا کر بے پناہ مال غنیمت سمیت لوٹا۔ اگلے برس بنوامیہ کا یہ عظیم سپہ سالار ایک بار پھر جہاد کے لیے جا رہا تھا کہ بیمار پڑ کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کی جگہ اُمیہ بن ہشام نے کمان سنبھالی اور مہم پوری کر کے لوٹا۔

۲۱۳ھ میں عبدالرحمن ثانی کے چچا عبیداللہ بن عبداللہ نے برشلونہ تک یلغار کی۔ تاہم یہ مہمات صرف دشمن کو مرعوب کرنے کے لیے تھیں۔ ان کا مقصد علاقوں پر قبضہ کرنا نہیں تھا۔ اس لیے ہر بار مسلمان موسم گرما کے چار پانچ ماہ جہاد میں گزار کر برف باری سے پہلے واپس آجاتے تھے۔[1]

ماردہ اور طُلَیطُلَہ کی بغاوتیں:

عبدالرحمن ثانی کے دور میں نصرانی پادریوں اور سیاست دان مسلسل کوشش میں لگے رہے کہ خود مسلمانوں کو بار بار بغاوت پر آمادہ کریں۔ یہ کام ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اندلس کے مسلمانوں کے ہاں نصرانی بیویاں کثرت سے تھیں۔ اس کے علاوہ شمالی اندلس کے مسلم شہروں میں نصرانی آبادی کا تناسب مسلمانوں سے کچھ بڑھ کر ہی تھا۔ یہاں کے نصرانی شیریں کلامی اور محبت ومودت کا اظہار کر کے مقامی مسلم عوام وخواص کے مزاج اور رجحانات پر حاوی رہتے تھے۔ وہ معمولی باتوں کو لے کر انہیں جنوبی اندلس کے مسلمانوں اور مرکزی حکومت کے خلاف بھڑکا دیتے تھے۔ ریاست آسٹریاس "ماردہ" میں اور ریاست "کا تھک مارچ" "طُلَیطُلَہ" میں بغاوتیں برپا کرنے میں ملوث رہیں۔

ماردہ (پرتگال) میں بغاوت کا آغاز ۲۱۰ھ ہوا۔ جب یہاں کے حاکم محمود بن عبدالجبار نے خود مختاری کا اعلان کیا۔ سرکاری فوج نے ۲۱۰ھ، ۲۱۳ھ، ۲۱۷ھ، ۲۱۸ھ اور ۲۲۰ھ میں یہاں یکے بعد دیگرے لشکر کشی کی۔ آخر ۲۲۰ھ میں باغی

---

[1] البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۸۱، ۸۲

سرنگوں ہوئے اور یہ علاقہ مکمل طور پر فتح ہوا۔ باغی سردار محمود بن عبدالجبار فرار ہو کر آسٹریاس پہنچ گیا جہاں اسے ایک قلعے کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔

اسی دوران ریاست ''گاتھک مارچ'' کی سازش کے باعث ۲۱۴ھ میں نصرانی اکثریتی شہر طُلَیطُلہ میں ہاشم ضراب نامی ایک سردار علمِ بغاوت بلند کر چکا۔ ۲۱۶ھ سے ۲۲۲ھ تک یہاں سرکاری افواج اور باغیوں میں جنگیں جاری رہیں۔ ۲۲۰ھ میں قُرطُبہ سے عبدالرحمٰن ثانی کا بیٹا اُمیہ یہاں آیا مگر اسے بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ ۲۲۲ھ میں عبدالرحمٰن کا بھائی ولید ایک لشکرِ جرار لے کر پہنچا اور سال بھر کی لڑائیوں کے بعد ایک حملے میں ہاشم ضراب کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کامیاب ہو گیا مگر اس کے دستِ راست محمد بن وسیم نے باغیوں کی قیادت سنبھال لی۔ آخر کار ۲۲۲ھ میں عبدالرحمٰن ثانی خود چالیس ہزار فوج لے کر یہاں پہنچا اور بڑے کشت وخوں کے بعد طُلَیطُلہ فتح کر لیا۔[1]

شمالی اندلس میں سالانہ مہمات:

اندرونی بغاوتیں فرو کرنے کے بعد عبدالرحمٰن نے ہر سال نصرانیوں کے خلاف جہادی مہمات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ۲۲۳ھ میں اپنے بھائی ولید کو آسٹریاس اور جلیقیہ بھیجا اور سرکش نصرانی حکام سے خراج وصول کیا۔ اگلے سال اس نے اپنے لڑکے الحکم کو پیش قدمی کا حکم دیا جو متعدد قلعے فتح کر کے بھاری مقدار میں مالِ غنیمت لے کر واپس آیا۔ ۲۲۵ھ میں عبدالرحمٰن نے خود یلغار کی اور کئی قلعے زیرِ نگین کیے۔ اگلے برس مطرف بن عبدالرحمٰن کو بھیجا۔

۲۲۷ھ میں عبیداللہ بن عبداللہ ''اربونہ'' اور ''سرطانیہ'' تک جا پہنچا جہاں نصرانیوں نے ایک شب اچانک لشکرِ اسلام کو گھیر لیا۔ مسلمانوں نے بڑی پامردی سے مزاحمت کی اور نصرانیوں کا گھیرا توڑ کر نکل آئے۔ اگلے برس عبدالرحمٰن ۲۱ شعبان کو ایک بڑا لشکر لے کر اپنے بیٹوں سمیت خود نکلا اور حریف کو متعدد ہزیمتیں دینے کے بعد ۱۵ شوال کو قُرطُبہ واپس پہنچا۔ ۲۲۹ھ میں پھر خود فوج کی کمان کرتے ہوئے تطلونہ کے محاذ پر پہنچا۔ یہاں نصرانی سرحد کے مسلم سپہ سالار موسیٰ بن موسیٰ کو جس نے حال ہی بغاوت کی تھی، ساتھ ملا کر مقابلے میں نکلے تھے۔ عبدالرحمٰن نے ان نصرانیوں کو شکستِ فاش دے ڈالی۔ ۲۳۱ھ میں شہزادہ محمد بن عبدالرحمٰن نے جلیقیہ اور لیون پر لشکر کشی کی۔ اس حملے میں لیون کی فصیل منہدم کر دی گئی۔[2]

نارمنوں کا حملہ:

۲۳۰ھ کے آغاز میں شمالی یورپ کی نارمن قوم کا ایک بحری بیڑہ جو ۸۰ کشتیوں پر مشتمل تھا، اچانک اندلس کے جنوب مغربی ساحلوں پر لنگر انداز ہوا۔ یہ لوگ جرمنی اور اسکنڈے نیویا سے آئے تھے۔ ان کا مذہب آتش پرستی تھا اس لیے مسلم مؤرخین نے انہیں ''مجوس'' کہہ کر یاد کیا ہے۔ یہ لوگ قادس اور اشبونہ کو تاراج کرتے ہوئے ۱۴ محرم کو اشبیلیہ

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۸۳ تا ۸۵
② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۸۵، ۸۶

پہنچ گئے۔ سینکڑوں مسلمان مرد و زن اور بچے قتل یا گرفتار ہوئے۔ اشبیلیہ کو مرکز بنا کر یہ بدبخت مختلف شہروں اور قصبوں میں غارت گری کرتے رہے۔ ۴۲ دن تک قیامت برپا رہی۔

عبدالرحمٰن اس وقت شمالی محاذ پر مصروف تھا، اس نے اطلاع ملتے ہی بحری اور بری فوجیں بھجوائیں۔ نارمن سرکاری افواج کو آتا دیکھ کر ساحلوں کی طرف فرار ہونے لگے۔ مسلمانوں نے تعاقب کے دوران ان کے پانچ سو آدمی مار گرائے۔ ۵ صفر کو اشبیلیہ سے دو میل دور طلیاطہ میں ان سے زوردار معرکہ ہوا جس میں نارمنوں کے سردار سمیت مزید سینکڑوں حملہ آور مارے گئے۔ باقی ماندہ ساحل تک پہنچ گئے۔

جب وہ اپنی کشتیوں پر بیٹھ کر بھاگے تو منجنیقوں سے ان پر آتش باری کی گئی۔ ان کی تیس کشتیاں جل کر غرق ہو گئیں جبکہ چار پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں نے ان کی لاشیں اشبیلیہ کے بازاروں میں کھجور کے درختوں پر لٹکا دیں۔ اس کے بعد کئی برسوں تک نارمنوں کو اندلس کا رخ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ①

بحری فوج پر توجہ:

نارمنوں کے حملے تک اندلس کے مسلمانوں کے پاس کوئی خاص بحری طاقت نہیں تھی۔ اس حملے نے انہیں بحری فوج تیار کرنے پر مجبور کیا تا کہ آئندہ اس قسم کے حملوں سے ساحلی شہروں کی حفاظت ہو سکے۔ بحری ماہرین کو اشبیلیہ طلب کر کے جہاز سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا اور بہت جلد اندلس کی بحریہ مضبوط ہو گئی۔ ②

۲۳۴ھ میں اندلس کی یہ نئی بحری فوج پہلی بار سمندر میں کسی مہم پر نکلی۔ اس کا ہدف جزیرہ "میُوزقَہ" تھا جہاں کے نصرانی مسلمانوں کے بحری قافلوں کو لوٹنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ایک سال تک یہ مہم جاری رہی۔ آخر یہاں کے حاکم نے امیر عبدالرحمٰن کو مراسلہ بھیج کر رحم کی درخواست کی۔ امیر نے پُرامن رہنے اور جزیہ ادا کرنے کی شرط پر انہیں امن دے دیا۔ ③

قیصر کی سفارتیں:

عبدالرحمٰن ثانی کے زمانے تک اندلس کی اسلامی حکومت کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا۔ قیصر قسطنطنیہ کو اس زمانے میں خلیفہ مامون الرشید کی سطوت سے خطرہ لاحق تھا۔ رومیوں اور عباسیوں کے درمیان سرحدی جھڑپیں بھی جاری تھیں۔ قیصر میکائیل نے جب دیکھا کہ اہلِ بغداد نے اندلس کے خلاف فرانس سے دوستی اختیار کر رکھی ہے، تو اس نے موقع غنیمت جان کر اندلس میں اپنا سفارتی وفد بھیجا اور عبدالرحمٰن ثانی کو اپنا اتحادی بنانے کی پوری کوشش کی۔ تاہم عبدالرحمٰن ثانی نے دینی حمیت کا ثبوت دیتے ہوئے عباسیوں کے خلاف کسی اتحاد کا حصہ بننے کا

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۸۶/۲ تا ۸۸

② التاریخ الاسلامی از احمد شلبی: ۹۳/۴ ؛ تاریخ افتتاح الاندلس از ابن قوطیہ: ص ۸۰، ۸۱، دار الکتاب المصری، قاہرۃ

③ البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۸۶ تا ۹۰

فیصلہ کیا اور قیصر کی سفارت کو یہ جواب دے کر واپس بھیج دیا کہ ہمیں اپنے ملک میں بڑی دشوار مہمات درپیش ہیں، ان سے فارغ ہو کر ہم قیصر کی امداد کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔

۲۲۵ھ میں نئے قیصر طوفیلس نے ایک اور سفارت بھیجی۔ اس بار بھی یہی درخواست تھی کہ بغداد کے مقابلے میں ہمارے ساتھ اتحاد کیا جائے۔ مگر عبدالرحمٰن ثانی نے اس بار بھی عملی طور پر کوئی مدد نہ کی۔ البتہ دوستی کی حامی بھرلی۔ [1]

مالکی مذہب کا فروغ:

امیر عبدالرحمٰن ثانی کے دور میں قاضی یحییٰ بن یحییٰ رحمہ اللہ کے ذریعے اندلس میں فقہ مالکی کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ قاضی یحییٰ رحمہ اللہ بربری تھے۔ ۱۵۲ھ میں پیدا ہوئے۔ حجاز جا کر امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ سے حدیث اور فقہ سیکھی۔ وہ امام مالک رحمہ اللہ کے مایہ ناز شاگرد تھے۔ مؤطا امام کی روایت نے انہیں شہرۂ آفاق بنادیا۔

انہیں علم کا اتنا شوق تھا کہ ایک بار امام مالک کے حلقے کے باہر سے ہاتھی گزرا۔ سب طلبہ اٹھ کر یہ عجیب جانور دیکھنے چلے گئے۔ مگر یحییٰ یہ سوچ کر وہیں بیٹھے رہے کہ میں علم حاصل کرنے آیا ہوں، ہاتھی دیکھنے نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ اس ادب اور شوق پر بڑے حیران اور مسرور ہوئے اور انہیں مقرب بنالیا۔ امام مالک رحمہ اللہ کی وفات تک مدینہ منورہ میں رہے۔ اس کے بعد قرطبہ لوٹے اور اپنے علم سے پورے اندلس کو جگمگا دیا۔ [2]

حکم اوّل کے دور میں وہ نوجوان تھے۔ اس لیے ان کے سیاسی شعور اور تجربے میں کمی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حکم اول کے خلاف بغاوت میں ملوث ہو گئے تھے۔ بغاوت کی ناکامی پر وہ فرار ہو کر طلیطلہ چلے گئے تھے۔ حکم نے جان کی امان دی تو واپس آگئے۔ اس کے بعد انہوں نے سیاسی فتنوں سے گریز کی روش اپنائی۔ [3]

اس طرزِ عمل نے انہیں مزید عزت بخشی۔ یہاں تک کہ امیر عبدالرحمٰن ثانی کے دور میں انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا گیا مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ اس سے امیر عبدالرحمٰن ثانی مزید متاثر ہوا اور انہیں محکمہ قضا کا نگران بنادیا۔ اندلس کے تمام قاضی انہی کے حکم سے مقرر ہونے لگے۔ اس طرح عدالتوں میں مالکی فقہاء کا اثر و رسوخ بڑھ گیا اور پورے ملک میں مالکی مذہب کو خوب فروغ ملا۔ [4]

قاضی یحییٰ بن یحییٰ رحمہ اللہ حق گوئی میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔ حکمرانوں کی خاطر کبھی شرعی مسائل نہیں چھپائے بلکہ انہیں کوئی ایسی گنجائش دینے کے لیے کبھی تیار نہ ہوئے جو شرعاً موجود ہو مگر اس سے حکمرانوں کے بگڑنے کا اندیشہ ہو۔ ایک بار امیر عبدالرحمٰن ثانی نے بلاوجہ جان بوجھ کر رمضان کا روزہ توڑ دیا۔ بعد میں فقہاء سے پوچھا تو یحییٰ بن یحییٰ رحمہ اللہ نے فرمایا: "دو ماہ کے مسلسل روزے رکھیے۔"

---

① تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۱۳۰، ط دار الفکر؛ التاریخ الاسلامی از احمد شلبی: ۴/ ۹۱

② سیر اعلام النبلاء: ۱۰/ ۵۲۱، ط الرسالة

③ تاریخ علماء الأندلس لابن الفرضي: ۲/ ۱۷۷

④ وفیات الاعیان: ۶/ ۱۴۶، ط دار صادر؛ البیان المغرب: ۲/ ۸۱

بعد میں علماء نے ان سے پوچھا: ”آپ نے امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کے مطابق مسئلہ کیوں نہ بتایا کہ غلام آزاد کرنے، ساٹھ روزے رکھنے یا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانے کا یکساں اختیار ہے۔“

فرمایا: ”حکمران کے لیے روزانہ روزہ توڑ کر غلام آزاد کرنا یا کھانا کھلانا بہت آسان ہے۔ میں نے اسے مشکل مسئلہ بتایا تاکہ وہ آئندہ ایسا نہ کرے۔

قاضی یحییٰ بن یحییٰ رحمہ اللہ کی وفات رجب ۲۳۷ھ میں ہوئی۔[1]

زریاب۔ علی بن نافع:

امیر عبدالرحمن ثانی کی تخت نشینی کے پہلے سال ۲۰۶ھ میں مشرق سے ایک ایسا شخص اندلس پہنچا جس نے یہاں کی تہذیب وثقافت کو بدل ڈالا اور عربوں کے سادہ طرزِ حیات کو عجمی تکلفات سے رنگ دیا۔

اس کا نام علی بن نافع تھا مگر تاریخ میں اسے ”زریاب“ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ حکمت، فلسفے اور فنونِ لطیفہ کا فقید المثال ماہر تھا۔ وہ عراق کے مشہور گلوکار و موسیقار ابواسحق موصلی کا شاگرد تھا مگر اس کی علمی وفنی قابلیت موصلی سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اسے بیک وقت درجنوں متنوع فنون پر عبور تھا۔ مزید یہ کہ ہر فن میں اختراعات اور جدت طرازیاں اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھیں۔ جب وہ اندلس پہنچا تو شہر شہر اس کا شاندار استقبال ہوا اور قرطبہ پہنچ کر اسے ندیمِ خاص کا مقام مل گیا۔ اس نے اندلس کی معاشرت اور رہن سہن پر غیر معمولی اثرات ڈالے۔ ملبوسات، بناؤ سنگھار، آرائش وزیبائش اور طرزِ رہائش سے لے کر کھانے پینے تک، ہر شعبۂ زندگی میں اس نے جدتیں پیدا کیں۔ اندلس کے لوگ خوشحال اور فارغ البال تھے لہٰذا ان نئی دلچسپ اور مزے دار تبدیلیوں کی طرف تیزی سے متوجہ ہونے لگے۔

زریاب نے نالیوں کی جگہ پائپ لائن سے پانی کی فراہمی کا طریقہ نکالا جس کی ابتداء قرطبہ سے ہوئی۔ پھر پورے اندلس میں اس کا رواج ہوگیا۔ اس نے کھانے پینے کے طرز کو بدلا۔ چمچ اور چھری کانٹے کا استعمال اسی کی ایجاد ہے۔ اس نے شاہی کباب جیسے لذیذ اور پرتکلف پکوانوں کو رواج دیا۔ شیشے کے برتن، چمڑے کے بستر اور چمڑے کے دسترخوان متعارف کرائے۔ ہر موسم کے لیے الگ الگ وضع کی پوشاکوں کو عام کیا۔ اندلس کے لوگوں کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جب زریاب نے تکلفات اور لذات کے ذریعے دنیا کو مثلِ جنت بنانے کا ذوق پیدا کیا تو یہی چیزیں دولت کا مصرف بن گئیں۔ وہ موسیقی اور گلوکاری کا بہت بڑا ماہر تھا۔ ایک ہزار سے زائد گیت اسے نوکِ زبان تھے اور ہر گیت کو کئی سروں اور راگنیوں میں گا سکتا تھا۔ اس نے قدیم آلاتِ طرب میں کئی جدتیں پیدا کردیں۔ اس سے متاثر ہوکر بہت سے لوگوں نے ان فنون میں دلچسپی لی جنہیں آج کل فنونِ لطیفہ کہا جاتا ہے۔[2]

---

[1] وفیات الاعیان: ۱۳۵/۹، ۱۳۶، ط دار صادر؛ سیر اعلام النبلاء: ۵۲۵/۱۰، ط الرسالۃ

[2] نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب للمقری التلمسانی: ۱۲۲/۳ تا ۱۳۳؛ التاریخ الاسلامی از احمد شلبی: ۸۹/۴.
Moors in Spain, by stanly lane poole.p81,82

اندلس میں زریاب کی متعارف کردہ بعض چیزیں لوگوں کی سہولت اور زندگی کو آسان کرنے کا باعث بنیں مگر بعض وہ چیزیں جن کی شریعت اجازت نہیں دیتی، یہاں کے باشندوں کے لیے روگ بن گئیں۔ اندلس کے مسلمان جو پہلی صدی میں سپاہی پیشہ تھے، اگلی صدیوں میں جفاکشی، بیدار نگاہی اور عالی ہمتی سے عاری ہو کر نازک بدن، عاشق مزاج اور آرام پسند بنتے گئے۔ اس طرح نصرانیوں کو ان پر غالب آنے کے مواقع ملتے چلے گئے۔ اسی کو اقبال نے کہا:

آ تجھ کو بتاؤں میں، تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

توہینِ رسالت کی ناپاک مہم:

عبدالرحمن ثانی کے دور میں اندلس کے دارالحکومت قرطبہ میں آباد نصرانیوں میں ایک ناپاک تحریک کا آغاز ہوا، جس نے اندلس کے مسلمانوں اور نصرانیوں کے درمیان باہم نفرت کا ایسا شعلہ بھڑکایا جو صدیوں تک نہ بجھ سکا۔

مغربی مؤرخ لین پول کے بیان کے مطابق اس تحریک کا آغاز کچھ اس طرح ہوا کہ قرطبہ کے ایک بدفطرت پادری یولوجیس نے نصرانی نوجوانوں کے سامنے ایک نیا فلسفہ پیش کیا، جس کے مطابق:

"مذہب کی اصل روح تکلیفیں اٹھانے سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے نصرانیوں کو چاہیے کہ وہ حکمرانوں کو اشتعال دلا کر ان کی سزائیں برداشت کریں۔ اس کا اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر حضرت محمد (ﷺ) کو سرعام گالیاں دی جائیں (نعوذ باللہ)، تاکہ بادشاہ اور قاضی مشتعل ہوں اور تمہیں قتل کرا دیں اس طرح تکالیف سہہ کر تمہاری روح کا بہترین تزکیہ ہوگا اور تم خدا کے اولیاء میں شامل ہو جاؤ گے۔"

یولوجیس کی اس ناپاک تحریک نے سادہ لوح، کم عقل اور جذباتی نصرانی نوجوانوں میں ایک آگ لگا دی اور وہ سرعام نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخانہ نعرے لگاتے نظر آنے لگے۔ مسلمان اس صورتحال کو کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ جگہ جگہ مسلمانوں اور نصرانیوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ کئی مقدمات عدالت میں گئے اور اسلامی شریعت کی رو سے ملزمان کو سزائے موت سنا دی گئی۔

صرف ۲۳۷ھ میں گیارہ نصرانیوں کو اس گھناؤنے جرم کے ارتکاب میں قتل کیا گیا۔ یہ تحریک ایک عرصے تک جاری رہی۔ قاضی مجرموں کے خلاف ثبوت مہیا ہونے پر انہیں کیفرِ کردار تک پہنچاتے رہے۔[1]

عبدالرحمن ثانی کی وفات:

ربیع الآخر ۲۳۸ھ میں عبدالرحمن ثانی کی وفات ہوگئی۔ اس کی عمر ۶۲ سال تھی۔ اس نے ۳۱ سال تین ماہ حکومت کی۔ وہ سانولی رنگت والا، بلند قامت اور دراز ریش آدمی تھا۔ نہ صرف علوم شرعیہ سے واقف تھا بلکہ حکمت اور فلسفے کی

---

[1] Moors in Spain, by stanly lane poole.p:118,119,121
Hitti:History of Arabs:615—Dozy:The Muslims in spain:279,290

تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ بہترین ادیب اور شاعر تھا۔ اس کے دور میں فتوحات اور مہمات جاری رہیں اور اس قدر مالِ غنیمت ہاتھ آیا کہ کثرت سے خرچ کرنے کے باوجود خزانے بھرے رہتے تھے۔

وہ تعمیرات کا شوقین تھا۔ کئی مساجد اور کئی سیرگاہیں بنوائیں۔ نئے محلات اور قلعے تعمیر کرائے۔ سڑکیں نکلوائیں۔ جامع قرطبہ کی تعمیر میں بھی اضافے کیے اور اس پر نئی چھت ڈالی۔ [1]

اندلس کے مشہور شہر "مُرسِیہ" کی تعمیر اسی کا کارنامہ ہے جس کی داغ بیل ۲۰۱ھ میں ڈالی گئی۔ [2]

✦✦✦

---

① الکامل فی التاریخ، سنة ۲۳۸ھ

② البیان المغرب: ۲/ ۸۲. الروض المعطار فی خبر الاقطار از ابوعبداللہ محمد بن عبدالمنعم الحمیری (م ۹۰۰ھ)، ص ۱۸۱، مؤسسة الناصر للثقافة، بیروت

محمد اوّل

۲۳۸ھ تا ۲۷۳ھ
(۸۵۲ء تا ۸۸۶ء)

عبدالرحمٰن ثانی کا بیٹا محمد بن عبدالرحمٰن، ۳ ربیع الآخر ۲۳۸ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۰ سال تھی۔ اس کا دور تقریباً ۳۵ سال طویل تھا۔ اس دوران نصرانیوں کی دسیسہ کاریاں، مسلمان اُمراء کی غداریاں اور بغاوتیں جاری رہیں۔ ہم یہاں محمد بن عبدالرحمٰن کے زمانے کے چند اہم ترین واقعات کا جائزہ لیں گے۔

سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کی بھرتی:

محمد بن عبدالرحمٰن سے پہلے سرکاری دفاتر میں لکھت پڑھت اور حساب کتاب کے امور پر نصرانی چھائے ہوئے تھے اور تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کی صلاحیتوں کو بیٹھے بیٹھے زنگ لگ رہا تھا۔ محمد بن عبدالرحمٰن نے نصرانیوں کی جگہ سرکاری دفاتر میں انہیں جگہ دینا شروع کی۔ اس اقدام سے اندلس کے مسلمان مطمئن ہوئے مگر نصرانیوں میں نفرت کی لہر دوڑ گئی۔

توہینِ رسالت کی مہم کا انجام:

محمد بن عبدالرحمٰن کے ابتدائی ایام میں توہینِ رسالت کی تحریک جاری تھی۔ محمد بن عبدالرحمٰن نے تحقیق کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے بہت سے گستاخوں کو سزائے موت دی تو پادری سوچ بچار پر مجبور ہو گئے۔ آخر انہوں نے خود مداخلت کر کے گستاخانہ تحریک کو روکا اور کہا کہ آیندہ جو توہینِ رسالت کرے گا وہ گنہگار ہوگا، مگر جو نصرانی اس طرح قربانی دے کر قتل ہو چکے ہیں۔ وہ بہر حال اولیاء ہیں۔[1]

اس نئی ذہن سازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ منحوس تحریک وقتی طور پر تو رک گئی، مگر نصرانی نسل میں گستاخانِ رسالت کے احترام کا تصور باقی رہا لہٰذا مسلمانوں اور نصرانیوں میں نفرت کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اندلس کے نصرانیوں کے مشرف باسلام ہونے کی رفتار نہ ہونے کے برابر رہ گئی اور اگلی صدیوں میں مسلمانوں

---

[1] Moors in Spain, by stanly lane poqle.p:118,119,121
Hitti:History of Arabs:615 --Dozy:The Muslims in spain:279,280

کے مقابلے میں ان کی آبادی کا تناسب زیادہ ہو گیا۔

نارمنوں کا حملہ:

۲۳۵ھ میں یورپ کے آتش پرست نارمنوں نے ۶۲ کشتیوں کے ساتھ حملہ کیا اور دریائے اشبیلیہ کے ڈیلٹا سے ہو کر جزیرۃ الخضراء تک پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے مار دھاڑ کی اور جامع مسجد کو نذر آتش کر دیا۔ کئی دنوں تک وہ آبادیوں کو تاراج کرتے رہے۔ آخر سرکاری افواج وہاں پہنچیں اور یہ لٹیرے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی چالیس کشتیاں مسلمانوں کے ہاتھ آگئیں۔[1]

اندلس میں مختلف نسلی اور مذہبی گروہ:

طارق بن زیاد کے ہاتھوں اندلس کی فتح کو ڈیڑھ صدی بیت چکی تھی اور اس دوران اندلس کے باشندوں میں متعدد گروہ پیدا ہو چکے تھے۔ محمد بن عبدالرحمٰن کے دور تک ان گروہوں کے اختلافات بہت ابھر آئے تھے اس لیے ان گروہوں کا تعارف ضروری ہے۔

❶ **عرب خالص:** یہ ملک کے فاتح اور حکمران تھے۔ بالادست طبقہ یہی تھے۔ ان میں کئی نسلیں اور گروہ تھے مثلاً حجازی، شامی، یمانی، مضری۔

❷ **مولّدین:** عربوں اور مقامی نصرانی خواتین کے رشتوں سے پیدا ہونے والے مسلمان، مولّدین کہلاتے تھے۔ یہ عربوں کے برابر درجہ پانا چاہتے تھے مگر عرب انہیں یہ مقام دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس احساسِ محرومی کے باعث یہ عربوں کی موجودہ قیادت سے نفرت کرتے تھے اور خود اقتدار حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔

❸ **مسالمہ (نومسلم):** یہ لوگ نصرانیت سے اسلام کی آغوش میں آئے تھے، اور اپنی الگ پہچان رکھتے تھے۔

❹ **بربر (افریقی):** یہ بہت بڑا اور نہایت جنگجو افریقی قبیلہ تھا جس کی کئی شاخیں تھیں۔ اندلس کی فوج میں اس کا اہم کردار تھا۔

❺ **صقالبہ:** جہاد کے دوران جو کم عمر لڑکے اور لڑکیاں نصرانی ریاستوں سے قیدی بن کر آتے تھے، ان کی اسلامی تربیت کی جاتی تھی۔ حکم اوّل نے ان کی تربیت پر خاص توجہ دی تھی۔ کچھ عرصے بعد یہ حکومتی اداروں خصوصاً فوج کا اہم عنصر بن گئے۔ انہیں صقالبہ یا صقلبی کہا جاتا تھا۔

❻ **ذمّی:** یہ وہ یہودی و نصرانی تھے جو مسلم معاشرے میں تمام حقوق کے ساتھ رہتے تھے۔ ان میں سے بہت سے مسلم معاشرے میں گھل مل کر عربی زبان و ثقافت اختیار کر چکے تھے۔ انہیں ''مستعرب'' کہا جاتا تھا۔ جنوبی اندلس میں ان کی تعداد مسلمانوں کے قریب قریب تھی، یہ مہذب، امن پسند اور نرم مزاج تھے۔ شمالی اندلس میں نصرانی اکثریت میں تھے، یہ جنگجو اور شورش پسند تھے۔

---

[1] الکامل فی التاریخ سنۃ ۲۳۵ھ

مولدین کی بغاوتیں اور ان کے اسباب:

محمد بن عبدالرحمٰن کے زمانے میں کئی گروہ مسلسل بغاوتیں کرتے رہے جن میں مولدین پیش پیش تھے۔ اس عدم اعتماد اور کشیدگی کی درج ذیل اہم وجوہات تھیں:

❶ شمالی نصرانی ریاستوں کے سربراہ مسلم اندلس میں علیحدگی کی تحریکوں کی حمایت کر رہے تھے۔ مرکز گریز رجحانات عام کرنے کے لیے انہوں نے اپنے گماشتوں کو متحرک کر رکھا تھا۔

❷ اس صورتحال کو تقویت دینے میں خود عربوں کا بھی حصہ تھا جو امور سیاست پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ اگرچہ قانوناً نہ صرف مولدین بلکہ ذمیوں کو بھی مکمل حقوق حاصل تھے اور عدالتوں میں عدل وانصاف کا چلن باقی تھا مگر ایوان اقتدار میں اسلام کی فطری وسعت اور کشادگی کا ماحول کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔

❸ اندلس کی فتح میں بربر قبائل کا بڑا ہاتھ تھا۔ عبدالرحمٰن اول نے انہیں عہدوں میں آگے رکھا تھا۔ مگر اب بربروں کو حکومت سے شکایات پیدا ہو گئی تھیں کہ ان کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہو رہی۔ مولدین کو یہ شکایت کہیں بڑھ کر تھی کہ ان کی قابلیت کے باوجود ان پر ویسا اعتماد نہیں کیا جاتا جیسا عربوں پر۔

❹ حکومت کے موروثی ہونے اور تخت شاہی پر عربوں میں سے ایک ہی خاندان کے براجمان رہنے نے خود کئی عرب خاندانوں کو بھی رنج اور حسد میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس لیے عرب افسران بھی جگہ جگہ بغاوتیں کرتے آ رہے تھے۔ جب مولدین اور بربر یہ دیکھتے کہ عرب خود متحد نہیں ہیں تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ ہم اقتدار کو بہتر طور پر سنبھال سکتے ہیں۔

مولدین کی بغاوتوں میں اہل طُلَیطلہ، ابن مروان اور عمر بن حفصون کی کش مکش اہم ترین ہیں۔ لہٰذا ہم بالترتیب ان کا ذکر کریں گے۔

طُلَیطلہ کی مہمات:

طُلَیطلہ میں جہاں نصرانی آبادی کا تناسب زیادہ تھا، مسلسل بغاوتیں ہوتی رہیں۔ یہاں کے رئیسوں نے نصرانی ریاستوں سے گہرے تعلقات استوار کر لیے تھے۔ اس لیے قُرطُبہ سے بار بار لشکر کشی بھی ان کا زور نہ توڑ سکی۔

محمد بن عبدالرحمٰن نے ۲۳۹ھ اور ۲۴۰ھ میں اہل طُلَیطلہ کو زیر کرنے کے لیے دو بار خود چڑھائی کی۔ ۲۴۲ھ میں اپنے بیٹے شہزادہ منذر کو بھیجا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ الٹا طُلَیطلہ کے باغی ۲۴۳ھ میں گرد ونواح کی مسلم آبادیوں پر چڑھائی کرنے لگے۔ اگرچہ انہیں جلد پسپا ہونا پڑا مگر یہ ثابت ہو گیا کہ ان کے حوصلے بہت بڑھ چکے ہیں۔

یہ دیکھ کر ۲۴۴ھ میں محمد بن عبدالرحمٰن نے ایک بار پھر یہاں لشکر کشی کی۔ ۲۴۵ھ میں اہل طُلَیطلہ نے حکومت سے چند شرائط پر صلح کر لی۔[1]

---

[1] البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۹۲/۲ تا ۹۴

شمالی نصرانی ریاستوں سے معرکے:

اہل طُلَیْطلہ سے جنگ بندی سے محمد بن عبدالرحمن کا مقصد یہ تھا کہ شمالی نصرانی ریاستوں کی گوشمالی کے لیے یکسوئی مل سکے، کیوں کہ ہر بغاوت کے پیچھے اصل ہاتھ انہی ریاستوں کا تھا۔

اس لیے اہل طُلَیْطلہ سے جنگ بندی کے بعد امیر نے نصرانی ریاستوں پر حملے شروع کیے جو کئی سال تک جاری رہے۔ امیر کبھی فوج کو اپنی کمان میں لے کر اور کبھی شہزادوں کو قیادت سونپ کر سرحدوں پر لشکر کشی کرتا رہا۔ ۲۴۶ھ میں اس نے خود جا کر بنبلونہ، قلعہ فیروس اور قلعہ قشتل فتح کیے۔ ۲۴۹ھ، ۲۵۱ھ اور ۲۵۲ھ میں شہزادہ عبدالرحمن بن محمد نے البہ میں جہادی مہم کی قیادت کی اور نصرانیوں کو دو بڑے معرکوں میں شکست دی۔ ۲۵۳ھ، ۲۵۴ھ اور ۲۵۵ھ میں شہزادہ محمد کو جہادی مہمات پر بھیجا گیا۔ [1]

طُلَیْطلہ کی نیم خود مختاری منظور:

اُدھر اہل طُلَیْطلہ کی دسیسہ کاریاں ایک بار پھر زوروں پر تھیں اور مملکت کے عین وسط میں اس صوبے کی بغاوتیں مرکز کو کسی مہم کے لیے یکسو نہیں ہونے دیتی تھیں۔ آخر کار ۲۵۹ھ محمد بن عبدالرحمن نے اس مسئلے سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور لشکر سمیت طُلَیْطلہ جا کر وہاں کے رئیسوں سے مذاکرات کیے جن کے نتیجے میں طُلَیْطلہ کو نیم خود مختاری دے دی گئی۔ طے یہ ہوا کہ وہ اپنی پسند کا حاکم خود مقرر کریں گے، داخلی معاملات میں آزاد ہوں گے۔ صرف حکومت کو سالانہ ٹیکس ادا کرنے کے پابند ہوں گے۔

اگرچہ اس وقت قیامِ امن کے لیے یہ قدم شاید ناگزیر تھا مگر حقیقت میں اس طرح نصرانیوں کے قدیم پایہ تخت کو خود مختاری دے کر ایک بار پھر اندلس کے عین وسط میں نصرانی ریاست کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔

اس کے بعد اہل طُلَیْطلہ بالکل آزاد ہو کر اپنی من مانی کرنے لگے۔ شمال کی نصرانی ریاستوں کے پادری اور ہزاروں لوگ اس عظیم الشان شہر کے گرد و نواح میں تیزی سے آباد ہونے لگے۔ مسلمان ان کی بالادستی دیکھ کر رفتہ رفتہ جنوبی اندلس کی طرف نقل مکانی کرنے لگے۔ یوں چند عشروں میں طُلَیْطلہ اور اس کے مضافات شمالی نصرانی ریاستوں کا تھہ مارچ اور آسٹریاس کی مانند دکھائی دینے لگے۔ [2]

ابن مروان کی بغاوت:

طُلَیْطلہ کی آزادی سے دوسرے باغیوں کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔ سرقسطہ میں موسیٰ بن موسیٰ اور ماردہ میں عبدالرحمن ابن مروان نے مرکز سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ابن مروان بھی ان باغی مولدین میں سے ایک تھا جس کا فتنہ بہت تیزی سے پھیلا۔ اس نے اسلام اور نصرانیت کے اصول اور عقائد کو ملا جلا کر ایک نیا مذہب ایجاد کر لیا تھا

---

(1) البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۹۵ تا ۱۰۰

(2) البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۱۰۱

شورش پسند جاہل مسلمانوں اور نصرانیوں میں بڑی مقبولیت ملی۔ ہزاروں لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ابن مروان نے ریاست آسٹریاس کے حاکم الفانسو سے اتحاد کر کے اپنی پشت مزید مضبوط کر لی۔

۲۶۲ھ میں امیر محمد بن عبدالرحمٰن نے سلطنت کے وزیر ہاشم بن عبدالعزیز کو ایک بڑا لشکر دے کر اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا مگر ابن مروان نے ایسی منصوبہ بندی سے مقابلہ کیا کہ سرکاری فوج کو شکستِ فاش ہوئی اور خود ہاشم بن عبدالعزیز گرفتار ہو گیا۔ ابن مروان نے اسے الفانسو کے حوالے کر دیا۔ وہ اڑھائی برس ریاست آسٹریاس کی جیل میں رہا۔ آخر محمد بن عبدالرحمٰن نے بھاری زرِ فدیہ دے کر اسے آزاد کرایا۔

امیر محمد بن عبدالرحمٰن نے ابن مروان کو ناقابلِ شکست دیکھ کر اس سے مذاکرات کیے اور صلح کی شرائط معلوم کیں۔ اس نے جواب دیا کہ اگر بطلیوس کا قلعہ اور مارِدہ حوالے کیا جائے، خراج معاف رکھا جائے اور کسی قسم کی اطاعت پر مجبور نہ کیا جائے، تو وہ لوٹ مار ترک کر دے گا اور امیر کے نام کا خطبہ جاری کر دے گا۔ اگرچہ شرائط سخت تھیں مگر امیر محمد بن عبدالرحمٰن نے قیامِ امن کی خاطر انہیں من وعن منظور کر لیا۔ یوں بطلیوس سے مارِدہ تک کا وسیع علاقہ ابن مروان کی نیم خود مختار ریاست بن گیا۔ عبدالرحمٰن الناصر کے دور تک یہ ریاست اسی طرح آزاد رہی۔[1]

عمر بن حفصون کا ظہور:

مولدین کا سب سے نامور جنگجو عمر بن حفصون تھا جو ۲۶۷ھ کے دوران شمالی اندلس کے کوہستانی علاقے "ریہ" میں حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گاتھک خاندان سے تھا، اس کے آباء واجداد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

وہ ۲۳۶ھ میں "رُندہ" کے ایک گاؤں "حصن اوطی" میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ حفصون ایک شریف اور دولت مند آدمی تھا مگر یہ نوجوان حد درجے فسادی تھا اور بات بات پر لڑنے مرنے پر اتر آتا تھا۔ انہی حرکات نے اسے قاتل بنا دیا۔ اس کے باپ نے اسے سزائے موت سے بچانے کے لیے اپنا گاؤں چھوڑ دیا اور شمال مشرق کے "جبل بُرشتر" (کوہ بوباسترو) کے ویران جنگلات میں رہائش اختیار کر لی۔ عمر بن حفصون نے یہاں بھی اپنی حرکات نہ چھوڑیں بلکہ جنگل میں رہنے والے قزاقوں اور ڈاکوؤں سے دوستی گانٹھ لی اور انہی کے رنگ ڈھنگ اپنا کر راہزن بن گیا۔ آخر باپ نے تنگ آکر اسے گھر سے بھگا دیا۔ وہ اندلس چھوڑ کر افریقہ کے شہر تاہرت پہنچا۔ یہاں ایک پادری نے تاڑ لیا کہ یہ شخص اندلس کی اسلامی حکومت کو ناکوں چنے چبوا سکتا ہے۔ پادری نے ایک جھوٹی پیش گوئی کر کے اسے یقین دلایا کہ وہ اندلس کا حکمران بنے گا۔ اس نے ترغیب دی کہ وہ واپس اندلس جا کر بنوامیہ کے لیے قہرِ الٰہی بنے اور وہاں کی حکومت حاصل کرلے۔

عمر بن حفصون واپس اندلس آیا اور کچھ ہم خیال لوگوں کو ساتھ ملا کر "جبل بُرشتر" کی چوٹی کے ایک قلعے پر قبضہ کر لیا۔ پورے اندلس میں اس جیسا محفوظ قلعہ کوئی نہ تھا۔ یہاں قدم جما کر اس نے اردگرد کے علاقوں میں

---

[1] البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۱۰۲/۲، ۱۰۳

لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ اس نے باقاعدہ کئی بستیوں اور قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ جب اس کے خلاف کارروائیاں ناکام رہیں تو امیر محمد بن عبدالرحمٰن نے ۲۷۰ھ میں اسے اعلیٰ ترین عہدوں کی پیش کش کر کے راضی کر لیا۔ وہ حکومت کا حصہ بننے قرطبہ چلا آیا۔ اس کی دلیری اور جنگی مہارت کی قدر کرتے ہوئے اسے فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔

اگلے سال وہ قرطبہ کی افواج کی قیادت کرتے ہوئے بعض مہمات کے لیے نکلا اور داد شجاعت دے کر سب سے خراج تحسین وصول کیا، مگر جلد ہی اعلیٰ حکومتی امراء سے اس کے اختلافات پیدا ہو گئے اور وہ اس منصب سے اکتا گیا کیوں کہ اس عہدے پر وہ اپنی آزاد ریاست کا خواب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لہٰذا کچھ ہی دنوں بعد وہ دوبارہ اپنی پہاڑی پناہ گاہ میں جا پہنچا۔ شورش پسند ایک بار پھر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اب چونکہ وہ شاہی دربار کے طور طریقے اور حکمرانوں کا انداز سیاست قریب سے دیکھ چکا تھا، اس لیے اس نے ایک ڈاکو یا باغی کی جگہ ایک رعایا پرور حاکم کا روپ دھار لیا۔ اپنے مقبوضہ علاقوں میں امن و امان قائم کر دیا اور لوگوں کو سخاوت کے ذریعے اپنا مرید گرویدہ بنا لیا۔

کوئی بھرپور کارروائی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی طاقت بڑھتی چلی گئی۔ اگلے حکمرانوں کے دور میں وہ ایک ناقابل شکست حریف ثابت ہوا۔[1]

وفات:

۲۷۳ھ میں محمد بن عبدالرحمٰن کی وفات ہو گئی۔ اس نے ۳۴ سال دس ماہ حکومت کی اور ۶۵ سال کی عمر پائی۔ وہ ایک نیک سیرت انسان تھا۔ لہو و لعب اور فضول کاموں سے اسے سخت نفرت تھی۔[2]

اس میں شجاعت اور جنگی صلاحیت کم نہ تھی مگر وہ مسلسل شورشوں اور بدامنی سے تنگ آ چکا تھا۔ اس لیے بھاری قیمت دے کر بھی امن چاہتا تھا۔ اس کی سیاسی پالیسی افہام و تفہیم پر مبنی تھی۔ اس نے مولدین کی طاقت بڑھتے دیکھ کر متعدد مواقع پر انہیں نیم خود مختاری دے کر مطمئن کیا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو محمد بن عبدالرحمٰن کا سارا زمانہ شمالی نصرانی ریاستوں اور اندرون ملک سر اٹھانے والے باغیوں سے نمٹنے میں گزر گیا۔ اس دور میں اندلس کی اسلامی حکومت مزید کمزور ہوئی اور اسے مٹانے کا تہیہ کرنے والے نصرانی طاقتور ہوتے چلے گئے۔ علامہ ابن عذاری رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ فصیح و بلیغ، نہایت باوقار اور برائیوں سے دور تھا۔ حق اور اہل حق کو ترجیح دیتا تھا۔ عقل مند، شائستہ اخلاق اور خوش خصال تھا۔ وہ حساب کتاب اور انتظامی کاموں میں سب پر فائق تھا۔''[3]

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۱۰۳ تا ۱۰۵

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۹۳

③ البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۱۰۷

عام طور پر اسے بخیل کہا جاتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سلطنت کے تمام حسابات کی جانچ پڑتال خود کرتا تھا اور لاکھوں کے معاملات میں ایک پیسے کی کمی بیشی بھی نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ اس کے سامنے جب حساب کی فائلیں رکھی جاتیں تو وہ اتنی باریک بینی سے ان کا جائزہ لیتا کہ منشی یا خزانچی سے ہونے والی معمولی لغزش بھی اس سے پوشیدہ نہیں رہتی تھی۔ معاملات میں یہ سختی بعض امراء کو ناگوار گزرتی تھی اور وہ اس کے خلاف ہو جاتے تھے۔ تاہم اس دور کے نامور محدث اور فقیہ حضرت بقی بن مخلد رحمہ اللہ فرماتے تھے:

"میں نے دنیا کے جتنے بھی حکمرانوں سے بات چیت کی ہے، ان میں محمد بن عبدالرحمٰن سے بڑھ کر دانش مند اور فضیلت مند کسی کو نہیں پایا۔ ایک دن میں اس کی مجلس میں تھا۔ اس نے حمد و ثنا اور درود شریف سے گفتگو کا آغاز کیا، پھر ایک ایک حکمران کا ذکر کیا اور بڑے فصیح و بلیغ پیرائے میں ہر ایک کی خوب تعریف و توصیف کی، اس کے محاسن اور کارنامے بیان کیے، مگر جب اپنے ذکر تک پہنچا تو خاموش ہو گیا۔"[1]

امام بقی بن مخلد رحمہ اللہ:

اس دور کے سب سے نامور عالم امام بقی بن مخلد رحمہ اللہ تھے جو امام مالک رحمہ اللہ کے تین صف اول کے تلامذہ: یعنی حضرت قاضی یحییٰ بن یحییٰ قرطبی رحمہ اللہ، حضرت یحییٰ بن بکیر رحمہ اللہ، اور افریقہ میں فقہ مالکی کی اشاعت کرنے والے حضرت قاضی سحنون بن سعید رحمہ اللہ کے فیض یافتہ تھے۔ انہیں بحر علم کہہ کر یاد کیا جاتا تھا۔ ان کی ولادت رمضان ۲۰۱ھ میں اور وفات جمادی الآخریٰ ۲۷۶ھ میں ہوئی۔

انہوں نے ملکوں ملکوں سفر کر کے احادیث جمع کی تھیں۔ ان کے مشائخ بکثرت تھے جن میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔ کہا جاتا تھا جس شہر میں بقی بن مخلد رحمہ اللہ ہوں وہاں کسی اور عالم کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اندلس میں امام ابوبکر ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ کی مصنف، امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب الفقہ اور خلیفہ بن خیاط رحمہ اللہ کی التاریخ کی روایت انہوں نے ہی کی۔[2]

✦✦✦

---

① البيان المغرب في اخبار الاندلس و المغرب لابن العذارى المراكشي: ۲/ ۱۰۹

② تاريخ علماء الأندلس لابن الفرضي: ۱/ ۱۰۹

منذر بن محمد

٢٧٣ھ تا ٢٧٥ھ
(٨٨٦ء تا ٨٨٨ء)

امیر محمد بن عبدالرحمٰن کے بعد ٨ ربیع الاول ٢٧٣ھ کو اس کا فرزند منذر بن محمد تخت نشین ہوا۔ وہ ٤٣ سال کا آزمودہ کار انسان تھا۔ اس نے اپنے والد کی زندگی میں کئی مہمات کی قیادت کی تھی اور ہر جگہ سرفروشانہ کارنامے انجام دیے تھے۔ مگر اس قابل حکمران کو حکومت کے صرف دو برس ملے۔ اس دوران وہ عمر بن حفصون سمیت ان باغیوں سے نبرد آزما رہا جنہوں نے اس کے والد کے دور میں سر اٹھایا تھا۔

٢٧٤ھ کے اواخر میں وہ عمر بن حفصون کے خلاف مہم کی قیادت کرتے ہوئے اس کی پہاڑی پناہ گاہ تک پہنچ گیا۔ اس سال قحط سالی بھی عام تھی اور موسم سرما میں شدید برف باری ہوتی رہی اس لیے کسی مہم میں ثابت قدمی دکھانا بہت مشکل تھا اس کے باوجود امیر منذر یہاں ڈیڑھ ماہ تک ٹھہرا رہا۔ اس نے عمر بن حفصون پر عسکری دباؤ بڑھانے کے ساتھ مذاکرات کا دروازہ بھی کھلا رکھا اور اس پر آمادہ ہو گیا کہ اسے پہاڑی علاقے میں نیم خودمختاری دے دی جائے۔

اس دوران موسم کی سختی اور مہم کی جانکاہی نے امیر منذر کو سخت بیمار کر دیا، اس نے مہم کی قیادت کے لیے اپنے بھائی عبداللہ کو قرطبہ سے بلوالیا۔ عبداللہ کے پہنچتے پہنچتے امیر منذر کا دم لبوں پر آچکا تھا۔ اس کی موت کے بعد لشکر کو واپس ہونا پڑا۔ یہ واقعہ ١٥ صفر ٢٧٥ھ کا ہے۔

امیر منذر کے بارے میں مؤرخین کا کہنا ہے کہ وہ نہایت عقل مند، دلیر اور فیاض انسان تھا۔ اپنے بھائیوں سے غیر معمولی محبت کرتا اور ان کا خیال رکھتا تھا۔ اندلس کے لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ اس کی وفات کے بعد قرطبہ کے بزرگوں کو کہتے سنا گیا کہ اگر امیر منذر کو مزید وقت ملتا تو ملک میں کوئی شورش پسند باقی نہ رہتا۔[1]

عباس بن فرناس کی ایجادات:

پُر آشوب حالات کے باوجود اندلس علماء و حکماء سے خالی نہ تھا۔ مشہور ماہر فلکیات، کیمیادان اور شاعر عباس بن فرناس کا تعلق اسی دور سے تھا جس نے عبدالرحمٰن ثانی اور محمد بن عبدالرحمٰن کے لیے جدید قسم کی گھڑیاں ایجاد کیں۔ وہ

[1] البیان المغرب: ١١٩/٢، ١٢٠۔ تاریخ ابن خلدون: ١٦٩/٣، ١٧٠، ط دار الفکر

پہلا شخص تھا جس نے پتھر سے شیشہ بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ وہ پہلا انسان تھا جس نے پرندوں کی طرح پرواز کا تجربہ کیا۔ ۲۷۴ھ میں اس نے اپنے بازوؤں پر لمبے لمبے پر باندھے اور ایک بلند پہاڑ سے چھلانگ لگادی۔

پرواز کرتے کرتے اس نے ایک طویل مسافت طے کی مگر اس تجربے میں یہ کمی رہ گئی کہ دُم کا انتظام نہیں کیا گیا تھا جس کے ذریعے پرندے اترتے ہوئے اپنا توازن برقرار رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ نیچے آتے وقت خود کو سنبھال نہ پایا اور شدید زخمی ہو کر جان کی بازی ہار گیا۔[1]

◆◆◆

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب للمقری التلمسانی: ۳/۳۷۴؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/۲۵۳

عبداللہ بن محمد

۲۷۵ھ تا ۳۰۰ھ

(۸۸۸ء تا ۹۱۲ء)

امیر منذر کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اس لیے حکومت اس کے بھائی عبداللہ بن محمد کو مل گئی جو نیکو کار مگر قائدانہ صلاحیتوں سے خالی تھا۔ اس کا دور حکومت اندلس میں فتنہ وفساد اور شورش انگیزی کا حسرت ناک مرقع تھا۔

عبداللہ حافظِ قرآن تھا اور کثرت سے تلاوت کیا کرتا تھا۔ نفل نمازوں اور صدقہ وخیرات کا عادی تھا۔ عاجزی و انکساری کا پیکر تھا۔[1]

عام حالات میں وہ ایک اچھا حکمران ثابت ہوتا مگر جس قسم کے مخدوش حالات میں اسے حکومت ملی تھی ان سے نبرد آزما ہونا اس کے بس سے باہر تھا۔ عبداللہ کی انتظامی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر امراء خود سر ہوگئے۔ نصرانی ریاستوں نے شورشوں کا طوفان برپا کر دیا اور اسلامی مقبوضات پر بے دریغ یلغار کر کے طُلَیطُلَہ سمیت اندلس کے تقریباً ایک تہائی حصے پر قبضہ کر لیا۔ بربر قبائل نے مغربی اندلس اور جنوبی پرتگال میں ایک خود مختار ریاست قائم کر لی۔ لُورقہ اور سَرَقُسطہ کے امراء بھی خود مختاری کا اعلان کر چکے تھے۔ البیرہ میں مولدین اور شامی عربوں میں سخت محاذ آرائی ہو چکی تھی۔ اشبیلیہ میں نہایت سخت بغاوت ہوئی اور یہ علاقہ حکومت کے ہاتھ سے نکل گیا۔ تقریباً پندرہ برس تک حکومت اس کی بازیابی سے عاجز رہی۔ اس کے بعد امیر عبداللہ کے وزیر بدر کی حکمتِ عملی سے یہاں کے باغی افہام وتفہیم پر آمادہ ہوئے اور اشبیلیہ دوبارہ قُرطُبہ کے ماتحت آیا۔[2]

اُدھر ابن مروان مولدین کو ساتھ ملا کر ماردہ اور بَطَلْیُوس پر قابض تھا۔ آسٹریاس کے بادشاہ الفانسو سوم سے صلح کر کے اس نے اپنی طاقت بہت بڑھا لی۔ ان حالات میں امیر عبداللہ نے قُرطُبہ کو بچانے کے لیے اپنے سب بڑے دشمن الفانسو سوم کی حکومت کو تسلیم کر کے اس سے اس شرط پر صلح کر لی کہ دونوں حکمران ایک دوسرے کی سرحدوں کا احترام کریں گے۔[3]

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۱۲۲/۲

② تاریخ ابن خلدون: ۱۷۳/۴، ۱۷۵، ط دار الفکر

③ تاریخ ابن خلدون: ۱۷۱/۴ تا ۱۷۳، ط دار الفکر

عمر بن حفصون سے قُرطبہ کے باہر تاریخی جنگ:

اس زمانے میں عمر بن حفصون جو کئی سال سے بغاوت کا علم بلند کیے ہوئے تھا، اندلس کی اُموی حکومت کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن چکا تھا۔ شاہی افواج سے اس کی بار بار جھڑپیں ہوئیں اور ہر بار اس نے شاہی افواج کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ اس نے خفیہ سازشوں کے ذریعے قُرطبہ کے نصرانی امراء کو بھی ساتھ ملالیا۔ یوں اس کی طاقت اس قدر بڑھ گئی کہ وہ قُرطبہ کے نواح تک آن پہنچا اور وادی الکبیر کے جنوب کا سارا علاقہ غصب کرلیا۔ رُندہ اور مالقہ کے درمیانی علاقوں پر بھی اس کا تسلط ہوگیا۔

اس کے بعد اس نے براہِ راست قُرطبہ پر قبضہ کر کے پورے اندلس کا حکمران بننے کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ قُرطبہ پر حملے کے لیے اس نے تیس ہزار فوج تیار کی اور قلعہ بلائی کو اپنی چھاؤنی بنالیا۔ ساتھ ہی عباسی حکام سے خط و کتابت کر کے مطالبہ کیا کہ اسے اندلس کا جائز حاکم تسلیم کرلیا جائے۔

قُرطبہ میں حالات سخت پریشان کن تھے۔ خدشہ تھا کہ کسی بھی دن عمر بن حفصون چڑھائی کر کے شہر سر کرلے گا۔ اگر عباسی خلفاء عمر بن حفصون کو جائز حکمران مان لیتے تو قُرطبہ کی رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہتی۔ عبداللہ کا خزانہ خالی تھا، دفاع کی تیاری کیا ہوتی، فوجیوں کو دینے کے لیے تنخواہیں تک نہ تھیں۔

ایسے میں عبداللہ کے قریشی خون نے جوش مارا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ذلت کی زندگی سے میدان میں عزت کی موت مرنا بہتر ہے۔ اس نے فوج کو شہر سے نکلنے کا حکم دیا اور ۱۴ ہزار کا لشکر لے کر خود قلعہ بلائی کی طرف روانہ ہوگیا۔ عمر بن حفصون بھی تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ میدان میں نکل آیا۔ اسے یقین تھا کہ اب اندلس کا حاکم وہی ہوگا۔

۱۲ محرم ۲۷۸ھ (۵ اپریل ۸۹۱ء) کو عبداللہ اور عمر بن حفصون کی افواج میں "اگیلر یا پولی" کے مقام پر گھمسان کا رن پڑا۔ اہلِ قُرطبہ نے جان پر کھیل کر جنگ لڑی اور آخرکار عمر بن حفصون اپنی تمام تر عسکری برتری کے باوجود شکستِ فاش کھا کر بھاگنے پر مجبور ہوگیا۔ امیر عبداللہ نے تعاقب کرتے ہوئے اس کے قلعہ بلائی پر بھی قبضہ کرلیا جہاں سے بے پناہ مالِ غنیمت اور اسلحہ ہاتھ لگا۔

عمر بن حفصون پسپا ہوتے ہوتے اپنی قدیم پہاڑی پناہ گاہوں میں چلا گیا۔ اس شکست نے اس کا رعب داب ختم کردیا اور عباسی حکام نے بھی اس کی پسپائی کی خبر سن کر اسے اندلس کا حاکم ماننے کا مطالبہ ٹال دیا۔ یوں بنو امیہ کی دم توڑتی حکومت کو نئی زندگی مل گئی اور جنوبی اندلس میں ان کی حکومت باقی رہ گئی۔[1]

عمر بن حفصون نے بنو عباس کی حمایت سے محروم ہونے کے بعد مسلمانوں کی جگہ نصرانیوں پر بھروسہ کرنے اور نصرانی ریاستوں سے امداد لینے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے ۲۸۶ھ میں اسلام ترک کر کے اہل و عیال سمیت نصرانی بن گیا۔ اس ناپاک اقدام کی خبر سن کر نصرانی جوق در جوق اس کے پاس پہنچنے لگے جبکہ مسلمان اس کا ساتھ چھوڑ

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۱۲۰/۲ تا ۱۲۲

گئے۔ اس کی طاقت کم ہوگئی مگر اس کا خاتمہ نہ ہوسکا اور عبداللہ کی وفات تک وہ ملک کے لیے بدستور خطرہ بنا رہا۔

امیر عبداللہ ۳۰۰ھ میں وفات پا گیا۔ اس نے ۲۴ برس حکومت کی۔ اس دوران اندلس کمزور تر ہو چکا تھا۔ سلطنت کی سالانہ آمدنی جو کبھی سالانہ دس لاکھ دینار تھی اب صرف ایک لاکھ دینار رہ گئی تھی۔ خزانہ خالی تھا، فوج ناتواں تھی، اسلامی سرحدیں سمٹ رہی تھیں۔[①]

الفانسو سوئم اور نصرانی مملکت "لیون" کا ظہور:

تیسری صدی ہجری کے نصفِ ثانی کا سب سے بڑا انقلاب شمالی اندلس میں الفانسو سوئم کا اقتدار تھا جس نے اپنی قوت اور سیاست سے نصرانی شاہی خاندان کے تمام باہمی تنازعات پر قابو پالیا۔ اس نے نصرانی ریاستوں کو متحد کر کے شمال میں ایک وسیع سلطنت قائم کر لی اور اس کا پایۂ تخت "لیون" نامی شہر میں منتقل کر دیا جو چاندی کی کانوں کے سبب مشہور تھا۔ لیون شہر جو پہلے "آسٹریاس" یا "جلیقیہ" (Galicia) کے ماتحت تھا، اب خود مختار ہو کر اپنی وسیع سرحدوں کے ساتھ "مملکتِ لیون" کہلانے لگا۔ "شلمنقہ" (سالمانکا) اور "سمورہ" اس کے اہم شہر تھے۔

"لیون" کی حدود سے متصل تین نصرانی ریاستیں اور بھی تھیں جو اس میں ضم نہیں ہوئی تھیں:

❶ ریاستِ نوار، جسے عرب "نبارہ" اور "نافار" بھی کہتے تھے ❷ قسطالیہ جسے عرب "القلاع" کہتے تھے۔[②]

❸ "ارغون" (Aragon) جو اسپین کے شمال مشرق میں جبل برانس سے نکلنے والے دریائے ارغون کے کنارے تھی۔[③] یہ ریاستیں کبھی "مملکتِ لیون" سے اتحاد کر لیتیں اور کبھی اس سے الجھ پڑتیں۔

محمد بن عبدالرحمٰن سے امیر عبداللہ تک کے طویل دور میں اسلامی حکومت اندرونی مسائل میں اس طرح الجھی رہی کہ نصرانیوں کی ان ریاستوں کو پھلنے پھولنے کے بھرپور مواقع ملتے رہے۔ اگر دیکھا جائے تو اندلس کی اُموی حکومت کے لئے تیسری صدی ہجری افراتفری اور بے اطمینانی کی صدی تھی، خصوصاً اس کے نصف آخر میں اندلس کے مسلم حکمرانوں کے قدموں کے نیچے سے زمین کھسک رہی تھی۔ اندلس کو اب ایک عبقری اور غیر معمولی شخصیت کی ضرورت تھی۔ یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ اگر اللہ کی خصوصی رحمت شاملِ حال نہ ہوئی اور اس نے حالات کا رخ پھیرنے کے لئے کسی مردِ آہن کو کھڑا نہ کیا تو یہ عظیم اسلامی سلطنت چند عشروں میں ملیامیٹ ہو جائے گی۔

◆◆◆

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۱۵۱ تا ۱۵۳

② ایک صدی بعد ریاست قسطالیہ زیادہ طاقتور ہوگئی اور اس نے "لیون" کو اپنے اندر ضم کر لیا۔ چند عشروں بعد لیون پھر آزاد ہوئی مگر تیرہویں صدی عیسوی میں اسے دوبارہ قسطالیہ کا حصہ بننا پڑا۔

③ التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ لعبدالرحمن علی: ص ۲۷۱ تا ۲۷۳ ...... اگلی صدیوں میں جب مسلمان زیادہ کمزور ہوئے تو یہ ریاست جبل البرانس سے مشرق میں بلنسیہ تک پھیل گئی۔ وشقہ اور سرقسطہ بھی اس کا حصہ بن گئے۔

عبدالرحمٰن الناصر

۳۰۰ھ تا ۳۵۰ھ
(۹۱۲ء تا ۹۶۱ء)

اب ہم اندلس کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر اللہ کی رحمت بن کر نمودار ہونے والے اس عظیم انسان کا تذکرہ شروع کرتے ہیں جس نے تاریخ کا رخ بدل ڈالا۔ وہ امیر عبداللہ کے بیٹے محمد کا فرزند عبدالرحمٰن الناصر تھا۔ امیر عبدالرحمٰن الناصر کی ولادت ۲۲ رمضان ۲۷۷ھ (دسمبر ۸۹۰ء) میں ہوئی تھی۔ ابھی عبدالرحمٰن کی عمر ایک ماہ بھی نہیں تھی کہ اس کا والد محمد اپنے بھائی کی سازش کی نذر ہو کر قتل ہو گیا۔ لہٰذا امیر عبداللہ نے اپنے یتیم پوتے کو گود لے کر خود اس کی پرورش کی۔

عبدالرحمٰن بن محمد کو قدرت خداوندی نے غیر معمولی صفات سے نوازا تھا۔ دس سال کی عمر میں وہ قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ ادب اور تاریخ میں بھی ماہر تھا۔ اس کی عمر صرف سترہ سال تھی، جب اس کے دادا نے اسکئی اہم ذمہ داریاں سونپ دی تھیں۔ کئی بار نماز جمعہ اور عیدین میں اپنی جگہ اسے آگے کر دیا۔

قدرت الٰہیہ جب کسی قوم کے دن پھیرنا چاہتی ہے تو بدترین حالات میں بھی اس کے رہنماؤں کو خیر کا فیصلہ کرنے کی توفیق دے دیتی ہے۔ چنانچہ امیر عبداللہ نے اپنی زندگی ہی میں شاہی انگوٹھی اپنے اس ہونہار پوتے کے سپرد کر کے اس کی جانشینی کا اعلان کر دیا تھا اور اس کے بھائیوں اور بیٹوں نے بھی غیر متوقع طور پر اسلامی سلطنت کی خیر خواہی کے پیش نظر باپ کی وفات کے بعد اس فیصلے کے مطابق اس نوجوان کی تخت نشینی قبول کر لی تھی۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس کی حکومت قائم ہونا عجیب تھا۔ کیوں کہ وہ نوجوان تھا، نہ صرف اس کے چچا بلکہ اس کے باپ کے چچا بھی زندہ تھے۔''[1]

دادا کی وفات کے بعد عبدالرحمٰن بن محمد یکم ربیع الاول ۳۰۰ھ کو تختِ قرطبہ پر براجمان ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۳ سال تھی۔ عوام کو عبدالرحمٰن بن محمد سے بہت توقعات تھیں۔ اس نوجوان کا دور اندلس کی آٹھ سو سالہ اسلامی تاریخ

[1] تاریخ ابن خلدون: ۱۷۹/۴، ط دار الفکر

کا سب سے سنہرا دور شمار کیا جاتا ہے۔ اندلس کے لوگ اس نجات دہندہ کو عبدالرحمن الناصر اور عبدالرحمن ثالث کہہ کر یاد کرتے رہے۔ ①

بگڑے ہوئے نظام کی اصلاح:

عبدالرحمن الناصر ایسے حالات میں تخت نشین ہوا تھا کہ اسلام کے دشمن تلواریں تیز کر رہے تھے اور اسلامی حکومت کے عمال بغاوتوں، سازشوں اور عوام پر زیادتیوں میں مصروف تھے۔

مگر اللہ تعالیٰ نے اس نوجوان کو مضبوط قوت ارادی، فولادی دل اور حیرت انگیز دانائی عطا کی تھی۔ اس نے تخت نشینی کے پہلے دن سے غور و تدبر، حکمت و دانائی اور عالی ہمتی کے ساتھ سلطنت کے بگاڑ کو دور کرنے کا آغاز کر دیا۔ اس نے کم ہمت یا بد سیرت حکام کو معزول کر دیا اور چن چن کر خدا ترس، جری اور باصلاحیت افراد کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔

اس نے ”باغیوں پر گرفت اور عوام پر مہربانی“ کا اصول اپنایا۔ ملک کے طول و عرض میں حکام کو پیغام بھیجا کہ جو سرکشی اور بغاوت کا ارتکاب کر چکا ہے یا اس کا ارادہ کر رہا ہے، اگر آئندہ وہ حکومت کا فرمان بردار رہے اور اطاعت کا وعدہ کرے تو اس کی سابقہ لغزشوں سے درگزر کیا جائے گا۔ ایسے حکام جو بغاوت کر چکے ہیں فوراً دارالحکومت حاضر ہو کر معافی چاہیں اور اپنے مقبوضات کی تفصیل فراہم کریں ورنہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔

یہ عبدالرحمن الناصر کی خداداد ہیبت تھی کہ ایک ہی پیغام سے کئی باغی سرداروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور انہوں نے باغیانہ روش ترک کر کے اطاعت اختیار کر لی، جبکہ وہ امراء جو بغاوت کی منصوبہ بندیاں کر رہے تھے اپنی غلط سوچ پر شرمندہ ہوئے اور حکومت کے پختہ حامی بن گئے۔ عبدالرحمن الناصر نے رعایا پر عائد کردہ تمام ٹیکس معاف کر دیے جس پر عوام نے سکھ کا سانس لیا اور سب اسے دل سے دعائیں دینے لگے۔ ②

باغیوں کے خلاف یلغار:

عبدالرحمن الناصر اسلامی سلطنت کے سب سے بڑے باغی عمر بن حفصون کو مزید موقع نہیں دینا چاہتا تھا مگر اس سے قبل راستے کے کانٹوں کو صاف کرنا ضروری تھا۔ عبدالرحمن الناصر نے اس کام میں دیر نہ کی، ابھی اس کی تخت نشینی کو تین ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ اس نے باغیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ سپہ سالار حاجب بدر کو ایک لشکر دے کر استجہ (Stanga) روانہ کیا، جس نے ۱۸ جمادی الاولیٰ ۳۰۰ھ (۳۱ دسمبر ۹۱۲ء) کو وہاں پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا، باغیوں کی ہمت جواب دے گئی اور شہر فتح ہو گیا۔

شعبان ۳۰۰ھ (مارچ ۹۱۳ء) میں عبدالرحمن الناصر نے فوج کی قیادت خود اپنے ہاتھ میں لے لی اور موسم بہار ہی میں جیّن کا محاصرہ کر کے اسے قبضے میں لے لیا۔ اس کا اگلا ہدف مرشّن (آرچی ڈونہ) تھا جس کا حاکم عمر بن حفصون

---

① البیان المغرب: ۲/۱۵۷، ۱۵۸؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/۱۷۹، ۱۷۷، ط دار الفکر؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/۳۵۳

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۳/۱۵۹، ۱۶۰

کا حلیف تھا۔ خیال تھا کہ مرتش کو محاصرے میں دیکھ کر عمر بن حفصون اپنے حلیفوں کی مدد کے لیے آئے گا مگر عبدالرحمٰن کی موجودگی میں عمر بن حفصون کو ادھر کا رخ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مرتش کی فتح کے بعد عبدالرحمٰن الناصر ''منت'' (Minta)، البیرہ اور عمر بن حفصون کے کوہستانی حلیفوں کے اہم مرکز ''کھیانہ'' کو زیرِ نگین کرتے ہوئے قلعہ شبلیس پہنچا، جہاں نصرانی لٹیروں کے درجنوں گروہ جمع تھے اور مسلم آبادیوں کو تاراج کر رہے تھے۔

قلعہ شبلیس کے لٹیروں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر اسلامی لشکر ان بلند پہاڑوں کی چوٹیوں کے قریب جا پہنچا جن پر شورش پسندوں اور ڈاکوؤں کے کئی قلعے واقع تھے۔ یہ دشوار گزار مقام ''آشیانہ عقاب'' کہلاتا تھا۔

عموماً مسلم امراء اس علاقے تک پیش قدمی کیے بغیر ہی لوٹ جاتے تھے مگر عبدالرحمٰن الناصر کو معلوم تھا کہ شر و فساد کے یہ اڈے البیرہ اور غرناطہ کے مسلمانوں کے لیے مدتوں سے عذاب بنے ہوئے ہیں اس لیے اس نے پیش قدمی جاری رکھی اور شلوبیہ، حصنِ اشتیبان اور بنہ قراطہ جیسے کٹھن مقامات کو یکے بعد دیگرے فتح کر کے تمام ڈاکوؤں اور رہزنوں کو ان کے انجام تک پہنچا دیا۔[1]

اشبیلیہ کی فتح:

اشبیلیہ اسلامی اندلس کے اہم ترین شہروں میں سے ایک تھا۔ وہاں کے حاکم ابن مسلمہ کی ریشہ دوانیوں سے مجبور ہو کر ۳۰۱ھ میں عبدالرحمٰن الناصر نے اشبیلیہ پر لشکر کشی کی۔ ابن مسلمہ نے سرکاری لشکر کی آمد کی خبر سن کر عمر بن حفصون سے مدد طلب کی۔ جب سرکاری فوج اشبیلیہ کے قریب پہنچی تو اس دوران عمر بن حفصون کے جنگجوؤں نے عقب میں پہنچ کر اس پر حملہ کر دیا، مگر سرکاری سپاہیوں نے پلٹ کر منہ توڑ جواب دیا اور ان لٹیروں کو دم دبا کر بھاگنا پڑا۔ ابن مسلمہ کو گرفتار کر لیا گیا اور اشبیلیہ میں اُموی حکومت کا نیا امیر مقرر کر دیا گیا۔[2]

عمر بن حفصون سرنگوں:

اشبیلیہ کی فتح کے بعد عبدالرحمٰن الناصر نے عمر بن حفصون کی سرکوبی کا ارادہ کیا۔ عمر بن حفصون نے ان دنوں ''طلوس'' کو مرکز بنا کر ارد گرد کے علاقوں میں اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ بڑی تعداد میں کرائے کے جنگجو جمع کر چکا تھا۔ نصف صدی کی لوٹ مار کے خزانے اس کے پاس جمع تھے جس کے باعث اس کی معاشی طاقت بھی بڑی مضبوط تھی۔

امیر عبدالرحمٰن الناصر نے اس کا فتنہ مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے بڑے اہتمام سے ایک لشکر ''طلوس'' بھیجا۔ فوج نے ایک مدت تک طلوس کے قلعے کا محاصرہ جاری رکھا اور بالآخر اس پر قبضہ کر لیا مگر اس دوران عمر بن حفصون بھی خفیہ راستے سے فرار ہو گیا تھا۔ ''طلوس'' میں شکست کھانے کے بعد عمر بن حفصون کی قوت ختم ہو گئی اور وہ پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ چونکہ اس کی سلطنت چھن چکی تھی لہٰذا اس نے مایوس ہو کر امیر عبدالرحمٰن سے صلح کر لی۔ شرائطِ صلح کے

---

(1) البیان المغرب: ۲/ ۹۰ تا ۹۲، دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۳۴۶، تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۱۷۹، ط دار الفکر

(2) البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۱۶۳

مطابق کئی پہاڑی قلعے اس کے پاس رہنے دیے گئے جن میں ''بوباسٹرو'' کی چوٹی پر واقع قدیم سنگین قلعہ بھی شامل تھا۔ یہ وہی قلعہ تھا جو عمر بن حفصون کی سب سے پہلی اور آخری پناہ گاہ تھا۔ ۳۴ سال تک باغیانہ لڑائیاں لڑنے والا عمر بن حفصون زندگی کے ۷۲ سال پورے کر کے ۳۰۵ھ میں مرگیا اور اپنے قدیم قلعے ''کسٹیلا'' میں دفن ہوا۔ اس طرح اندلس کے مسلمانوں کو ایک سخت جان دشمن سے نجات ملی۔[1]

عمر بن حفصون کے جانشینوں کا خاتمہ:

عمر بن حفصون کے پانچ بیٹے تھے: سلیمان، عبدالرحمن، جعفر، حفص اور ایوب۔ یہ سب باپ کی طرح مرتد ہو چکے تھے۔ کوہستانی قلعوں کی آڑ میں وہ مزید کئی سال تک شاہی افواج کی گرفت سے بچے رہے تاہم اب ان کا زور ٹوٹ چکا تھا اور ان کی سرگرمیاں باہمی چپقلشوں تک محدود ہو گئی تھیں۔ عبدالرحمن الناصر نے ایک مدت تک ان کے خلاف کوئی حتمی کارروائی نہیں کی بلکہ ان کو باہم سر پھٹول میں مشغول رہنے دیا۔ اس کے بعد عبدالرحمن الناصر نے الگ الگ مہمات کے دوران ان سب کو یکے بعد دیگرے قابو کیا۔ البتہ عمر بن حفصون کے قدیم قلعے بوباسٹرو کا مالک جعفر کئی سالوں تک ہاتھ نہ آیا۔

۳۱۴ھ میں جبکہ عمر بن حفصون کے جانشین باہمی اکھاڑ پچھاڑ سے خستہ حال ہو چکے تھے، امیر عبدالرحمن الناصر نے بوباسٹرو کا محاصرہ کرلیا۔ قلعے کے قریب واقع رومیوں کے ایک قدیم منہدم شدہ قلعے کو دوبارہ تعمیر کرایا اور اس میں اپنی فوج کا چھوٹا سا شہر آباد کر دیا۔ رسد کی دشواری کی وجہ سے اس علاقے میں کسی فوجی مہم کا طویل عرصے تک جاری رہنا ناممکن تھا۔ امیر کے حکم سے گرد و نواح کے علاقے کو کاشت کے قابل بنا کر وہاں سے فوج کے لیے اناج اور غلے کا مستقل انتظام کر دیا گیا۔ ان انتظامات کے بعد کہساروں اور دروں کا اتنا سخت محاصرہ کیا گیا کہ بوباسٹرو کی فلک بوس فصیلوں تک چھ ماہ میں غلے کا ایک دانہ بھی نہ پہنچ سکا۔

آخر کار محصورین غذا کی کمیابی کا شکار ہو کر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو گئے اور ۱۶ ذیقعدہ ۳۱۵ھ میں یہ ناقابل تسخیر قلعہ عبدالرحمن الناصر کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ عبدالرحمن الناصر اس عظیم فتح پر سجدہ شکر بجالایا اور کئی دن تک نفل روزے رکھتا اور شکرانے کے نوافل ادا کرتا رہا۔

عمر بن حفصون آخری سالوں میں نصرانی ہو گیا تھا مگر کچھ لوگ اسے اب بھی مسلمان سمجھتے تھے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے عبدالرحمن الناصر نے علماء و فقہاء کی اجازت سے اس کی قبر کھلوائی۔ دیکھا تو اس کی لاش نصرانی رسومات کے مطابق دفنائی گئی ہے۔ چہرے کا رخ قبلے کی بجائے مشرق کی طرف ہے اور ہاتھ سینے پر بندھے ہیں۔ لاش کو نکال کر قرطبہ کے چوک میں لٹکا دیا گیا تاکہ حقیقت سب پر واضح ہو جائے۔

بوباسٹرو کی فتح سے اندلس کے تمام سرکش نصرانیوں کو سانپ سونگھ گیا اور ان کی بڑی تعداد نے سرکشی ترک کر کے

[1] البیان المغرب: ۲/ ۱۶۲ تا ۱۷۱؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۳۸۰؛ المقتبس من انباء الاندلس لابن حیان: ۵/ ۲۵

اسلامی سلطنت کی اطاعت کا عہد کر لیا۔[1]

نصرانی ریاستوں سے جہاد:

عمرو بن حفصون کا فتنہ ٹھنڈا ہوتے ہی عبدالرحمٰن الناصر کو ان نصرانی ریاستوں سے پالا پڑا جو شمالی اندلس سے بڑھ کر وسطی اندلس تک پھیل گئی تھیں، ان میں یہ سب سے خطرناک حریف آسٹریاس کی ریاست تھی جو ایک مستقل مملکت کی شکل اختیار کر کے اسلامی اندلس کی رگ جان پر تلتا ہوا خنجر بن چکی تھی۔ جلیقیہ، لیون اور قستالیہ کی تین نصرانی ریاستوں کے آسٹریاس میں انضمام کے بعد آسٹریاس کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔

عبدالرحمٰن الناصر کے دادا امیر عبداللہ اور شاہ آسٹریاس الفانسو سوم کے مابین صلح کا معاہدہ ہوا تھا۔ الفانسو سوئم اس عہد کی پاسداری کرتا رہا۔ ۲۹۷ھ (۹۱۰ء) میں وہ معزول ہوا تو اس کا بیٹا غرسیہ تخت نشین ہوا، وہ بھی صلح پر قائم رہا۔ مگر عبدالرحمٰن الناصر کی حکومت کے دوسرے سال ۳۰۱ھ میں آسٹریاس کی حکومت الفانسو سوئم کے پوتے اردون (اردونیو) دوئم کو ملی جو ایک بدفطرت اور مکار انسان تھا۔ اس نے حکومت سنبھالتے ہی تیس ہزار سپاہی لے کر ''یابرہ'' پر حملہ کیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ واپسی میں وہ چار ہزار مرد و زن اور بچوں کو قیدی بنا کر لے گیا۔[2]

اس طرح وہ صلح ٹوٹ گئی جو امیر عبداللہ کے دور سے آسٹریاس کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ عبدالرحمٰن الناصر کے پاس ان سرکش نصرانیوں کے خلاف لشکر کشی کا معقول جواز موجود تھا مگر اس وقت وہ عمر بن حفصون سے اندرونی جنگ میں اس طرح مصروف تھا کہ بیرونی محاذ پر فوج نہ بھیج سکا۔

۳۰۲ھ میں اندلس میں شدید قحط پڑا جس سے مسلم عوام اور حکام سخت مشکلات کا شکار ہو گئے۔ عبدالرحمٰن الناصر نے اناج کی خریداری اور عوام کو فراہمی کے لیے خزانے کے منہ کھول دیے اور صدقہ وخیرات کی انتہا کر دی۔ بہرحال ملک اقتصادی بحران کا شکار ہوا جس کی وجہ سے فوجی مہمات کے لیے تیاری بھی مشکل ہو گئی۔ مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر اردون دوئم نے موقع غنیمت سمجھا اور ساٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ یلغار کر کے کئی قلعوں پر قابض ہو گیا۔

اس وقت تک عمر بن حفصون کا فتنہ ٹھنڈا ہو چکا تھا اس لیے عبدالرحمٰن الناصر نے محرم ۳۰۴ھ میں ابن ابی عبدہ کو ایک زبردست لشکر دے کر اردون کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ اردون چار گنا بڑا لشکر لے کر مقابلے پر آیا لیکن اسے بری طرح شکست ہوئی۔[3]

ابن ابی عبدہ کو نصرانیوں سے شکست:

اگلے سال اردون کی سرکشی کا زور مکمل طور پر توڑنے کے لئے ابن ابی عبدہ دوبارہ اس سے مقابلے کے لئے نکلا۔

---

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/۳۸۶؛ المقتبس من انباء الاندلس لابن حیان القرطبی: ۵/ ۲۲ تا ۳۰، ط المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیۃ قاہرہ، ۰؛ البیان المغرب: ۲/ ۱۹۱ تا ۱۹۶

[2] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۳۹۴ [3] البیان المغرب: ۲/ ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹

تقدیر الٰہی سے اس لڑائی میں مسلمانوں کو شکست ہوئی، ابن ابی عبدہ لڑتے ہوئے شہید ہوا۔ نصرانیوں نے نہایت بدبختی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کا سر خنزیر کے سر کے ساتھ باندھ کر ایک قلعے پر لٹکا دیا۔ عبدالرحمٰن الناصر نے نہایت حوصلے کے ساتھ اس شکست کا حال سنا اور جوابی حملے کا تہیہ کر لیا۔ [1]

نصرانیوں پر فیصلہ کن حملہ اور کامیابی:

مسلمانوں کو شکست دے کر اردونی کی ہمت بہت بڑھ گئی تھی، اس نے ذوالحجہ ۳۰۵ھ میں اندلس کے مغربی گوشے کے قلعوں: ناجرہ، تطیلہ اور وادی طرسونہ پر قبضہ کر لیا۔ اس مہم میں جلیقیہ اور ینبلونہ کا حاکم شانجہ بھی شریک تھا۔

عبدالرحمٰن الناصر یہ اطلاعات ملتے ہی اپنے خاص سپہ سالار حاجب بدر بن احمد کو جوابی حملے کے لیے لشکر دے کر بھیجا۔ وہ جنگ آزما سپاہیوں پر مشتمل ایک لشکر لے کر طوفانی رفتار سے نصرانی ریاستوں میں گھس گیا اور مقابلے پر آنے والی فوجوں کو یکے بعد دیگرے روندتا ہوا شمالی اندلس کے کوہستانی سلسلے تک جا نکلا۔ ان پہاڑوں میں نصرانی افواج سے دو نہایت قہر انگیز لڑائیاں ہوئیں جن میں بے شمار نصرانی ہلاک ہوئے۔

کچھ عرصہ بعد نصرانیوں کی طاقت کا مکمل سدباب کرنے کے لیے عبدالرحمٰن الناصر نے خود ایک لاکھ سپاہی لے کر قرطبہ سے یلغار کی اور میناسِلی (Menna Celli)، وادی ابیرو، ہضت اشتیبان، غرماج، قلعہ القبیلہ، قلعہ قلنہ اور قلعہ کرکر جیسے اہم مقامات فتح کر لیے۔

ان فتوحات کے بعد اسلامی لشکر مزید آگے بڑھا تو دریائے ابیرو کے پار نصرانی حاکم شانجہ سے زبردست مقابلہ ہوا جس میں بالآخر شانجہ شکست کھا کر بھاگ نکلا، یہ منظر دیکھ کر دیگر نصرانی امراء اور بادشاہ بھی شانجہ کی مدد کے لیے روانہ ہوئے اور کچھ آگے چل کر ایک وادی میں نصرانیوں کا مشترکہ لشکر مسلمانوں کے مقابلے پر آ گیا مگر یہاں بھی اللہ کی مدد لشکر اسلام کے شامل حال رہی۔ ہزاروں نصرانی گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کر گرے اور باقی پسپا ہو گئے۔

یہ مہمات ۳۰۶ھ میں شروع ہوئیں اور ۳۰۸ھ تک جاری رہیں۔ ۳۱۰ھ میں عبدالرحمٰن الناصر نے اپنی کمان میں دو مہمات انجام دیں: پہلی مہم میں ریّہ اور قلعہ طرش فتح کیے۔ دوسری مہم میں البیرہ اور قلعہ منتروبی کو قبضے میں لیا گیا۔ [2]

فتوحات کی تکمیل:

ان مسلسل ہزیموں کے بعد بھی اردونی چین سے نہ بیٹھا۔ ۳۱۱ھ (۹۲۳ء) میں اس نے بقیرہ پر حملہ کر کے سینکڑوں مسلمانوں کو بے دردی سے شہید کر ڈالا۔ اس اطلاع نے عبدالرحمٰن الناصر کو ہلا کر رکھ دیا اور اس نے اردونی کو ختم کیے بغیر تلوار ہاتھ سے نہ رکھنے کا عزم کر لیا۔ [3]

---

[1] البیان المغرب: ۲/۱۷۰، ۱۷۱؛ المقتبس من انباء الاندلس لابن حیان: ۵/۹۶

[2] تاریخ ابن خلدون: ۴/۱۸۲، ۱۸۳، ط دار الفکر؛ البیان المغرب: ۲/ ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۵ تا ۱۸۳

[3] البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲ / ۱۸۳

محرم ۳۱۲ھ (اپریل ۹۲۴ء) میں وہ بھرپور تیاریوں کے ساتھ قرطبہ سے نکلا اور نصرانیوں کی ریاست جبلوتہ پر حملہ آور ہوئے۔ نصرانی فوج بلا مزاحمت فرار ہوگئی اور مسلم افواج جبلوتہ تک بے روک ٹوک فتح کے پرچم لہراتی چلی گئیں۔

امیر عبدالرحمٰن نصرانیوں کے مظالم سے سخت برافروختہ تھا اس لیے اس نے جبلوتہ کی فصیل گرادی اور تمام گرجے منہدم کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ عظیم الشان گرجا بھی جسے شانجہ نے بے اندازہ رقم خرچ کرکے بنوایا تھا، مقامی نصرانیوں کے شدید احتجاج کے باوجود پیوندِ زمین کر دیا گیا۔

نصرانیوں کی اس ذلت کا حال سن کر ریاست قشتالیہ نے اپنی فوج مقابلے پر بھیجی مگر اسے بھی بدترین شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ عبدالرحمٰن الناصر بدفطرت اردون کو انجام تک پہنچائے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا تھا مگر اس دوران اطلاع ملی کہ اردون طبعی موت مرگیا ہے اور نصرانی حاکموں میں انتشار کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔

عبدالرحمٰن الناصر نے یہ خبر سن کر اللہ کا شکر ادا کیا اور واپس قرطبہ روانہ ہوا جہاں فاتح حکمران کا شاندار استقبال ہوا۔ ۳۱۳ھ میں امیر عبدالرحمٰن الناصر نے ایک اور جان توڑ مہم انجام دی اور ''قلعہ اشتین'' فتح کرلیا۔[1]

دشمنوں میں پھوٹ:

اللہ رب العزت کی غیبی مدد دشمنوں کے درمیان انتشار کی شکل میں ظاہر ہوچکی تھی اور الفانسو سوم کی اولاد میں سلطنت آسٹریاس کے باقی ماندہ حصوں کے استحقاق پر خانہ جنگی شروع تھی۔ اُدھر نصرانی ریاست جلیقیہ کا حاکم بھی مرگیا اور اس کی جگہ الفانسو رابع تخت پر بیٹھ گیا تھا۔ (اس نے سات برس کی حکومت کے بعد رہبانیت اختیار کرلی اور اس کی جگہ ردمیر دوئم حاکم بنا) اگلے برس جبلوتہ کا نصرانی حاکم شانجہ بھی فوت ہوگیا۔ اس طرح نصرانیوں کی ہمتیں پست ہوگئیں۔[2]

عبدالرحمٰن الناصر ایک زیرک سیاست داں تھا۔ وہ نصرانیوں کی فطرت سے خوب واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس موقع پر وہ نصرانی ریاستوں پر حملہ آور ہوئے تو ان کی خانہ جنگی ختم ہوجائے گی اور وہ سب اسلامی لشکر کے خلاف متحد ہوجائیں گے، اس لیے اس نے نصرانیوں کی باہمی خانہ جنگی کو جاری رہنے دیا۔ انجام کار چند برس میں آسٹریاس کی نصرانی سلطنت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گئی اور ان چھوٹی چھوٹی نصرانی ریاستوں کے کمزور خودمختار امراء اپنی بقاء کے لیے خود بخود امیر عبدالرحمٰن الناصر کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوگئے۔

خلافت کا اعلان:

اس زمانے میں خلافتِ عباسیہ اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ عالم اسلام کی پاسبانی اس کے بس سے باہر تھی۔ خلفاء کا حکم بغداد کے اندر بھی نافذ نہیں ہوتا تھا۔ قصر خلافت کے اندر خواتین کا راج تھا اور باہر ترک امراء ملک پر چھائے ہوئے تھے۔ بغداد کی مساجد اور چوکوں پر مناظرے ہوتے تھے جن کے ختم ہوتے ہوتے بعض اوقات درجنوں لاشیں گرجاتی

---

① تاریخ ابن خلدون: ۳/۱۸۲، ۱۸۳؛ البیان المغرب: ۲/ ۱۸۵ تا ۱۸۸؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۳۹۹، ۴۰۰
② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۱۸۹

تھیں۔ اُدھر رومی آئے دن ایشیائے کوچک میں لشکر کشی کر رہے تھے مگر مسلمانوں میں کوئی قوت مزاحمت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ قرامطیوں نے عراق اور عرب میں ایسا طوفان مچا رکھا تھا کہ بہت کم لوگ حج کے لیے مکہ پہنچ پاتے تھے۔

ان حالات کے پیش نظر ۳۱۶ھ میں عبدالرحمن الناصر نے علماء وفقہاء سے مشورے کے بعد طے کیا کہ اب اندلس کی عظیم الشان اُموی حکومت ہی خلافت کے فرائض بجالانے کی اہل ہے لہٰذا اس کے سربراہ کو آئندہ امیر کی جگہ خلیفہ کہا جائے گا۔ یوں امیر عبدالرحمن نے ''امیر المؤمنین الناصر لدین اللہ'' کا لقب اختیار کر کے اندلس میں اُموی خلافت کا آغاز کر دیا۔ اعلان کر دیا گیا کہ آیندہ سے جمعہ کے خطبے میں عبدالرحمن الناصر کا نام خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے لیا جائے گا۔ [1]

مشرق کے علمائے اسلام نے اندلس کی دولتِ اُمویہ کو کبھی بھی خلافت کے طور پر قبول نہیں کیا، لہٰذا اس اقدام کی شرعی حیثیت محل نظر رہی۔ تاہم اہل اندلس اپنے حالات کے پیش نظر اس اقدام کو درست سمجھتے تھے۔

بَطَلْیُوس اور ماردہ کی تسخیر:

قرطبہ کے مغرب میں چالیس سال سے بطلیوس اور ماردہ پر مولدین کا تسلط تھا جن کے نصرانی ریاستوں سے گہرے تعلقات تھے۔ یہ حکومت دولتِ بنواُمیہ کے لیے سخت خطرہ بنی ہوئی تھی۔ ۳۱۱ھ میں اس کا حکمران عبداللہ بن مروان جلیقی اپنے کسی حامی کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور اب یہاں اس کا لڑکا عبدالرحمن جلیقی قابض تھا۔

ربیع الاوّل ۳۱۷ھ میں عبدالرحمن الناصر نے اس ریاست کی طرف پیش قدمی کی اور طویل محاصرے کے بعد ۳۱۸ھ میں اس کے مرکز بطلیوس کو فتح کر لیا۔ [2]

طُلَیْطلہ (میڈرڈ) کی فتح:

وسطی اندلس کا اہم ترین شہر طُلَیْطلہ (اسپین کا موجودہ دارالحکومت میڈرڈ) گزشتہ ۸۰ برس سے خود مختار چلا آرہا تھا، یہاں ان نومسلم باشندوں کی حکومت تھی جو اسلامی اندلس کو عربوں کے ماتحت دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، عربوں کی بجائے اپنے آبائی مذہب نصرانیت کے علمبرداروں سے ان کے تعلقات پختہ تھے۔

خلیفہ عبدالرحمن الناصر نے پہلے ان کی سرکشی کا توڑ ضروری سمجھا اور علماء وفقہاء کا ایک وفد بھیج کر انہیں اطاعت و فرماں برداری کے راستے پر لانے کی کوشش کی تاکہ ان نومسلموں سے کشت وخون کی نوبت آئے بغیر معاملہ سلجھ جائے، مگر اہل طُلَیْطلہ کی سرکشی بڑھتی چلی گئی۔

بالآخر خلیفہ عبدالرحمن الناصر نے ربیع الآخر ۳۱۸ھ (مئی ۹۳۰ء) میں اپنے سپہ سالار سعید بن منذر کو ایک لشکر دے کر طُلَیْطلہ کی طرف روانہ کیا، اس لشکر نے تیزی سے یلغار کر کے طُلَیْطلہ کا محاصرہ کر لیا مگر اتنے بڑے شہر کے لئے

---

[1] نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب للمقری التلمسانی: ۱/ ۲۶۹
[2] البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۱۹۷ تا ۲۰۲

یہ فوج ناکافی تھی، اگلے مہینے عبدالرحمٰن الناصر خود دوسرا لشکر لے کر طُلَیْطلہ پہنچا اور ارد گرد کی تمام وادیوں، دروں اور شاہراہوں پر دستے متعین کر کے سخت ناکہ بندی کرلی۔ طُلَیْطلہ میں خورد و نوش کے اسباب کی فراوانی تھی اس لیے کئی ماہ گزرنے پر بھی اہل شہر کے حوصلے برقرار رہے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے حلیف نصرانی حکمرانوں کو مدد کے لیے بلا چکے تھے اور انہیں یقین تھا کہ نصرانی ریاستوں کا کوئی لشکر ان کی مدد کے لئے طُلَیْطلہ ضرور پہنچے گا، مگر نصرانیوں کو خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کے بذاتِ خود لشکر کی قیادت کی خبر نے خوفزدہ کردیا تھا اس لئے ان میں سے کوئی کمک کے لئے نہ پہنچا۔ اس کے باوجود اہل طُلَیْطلہ ڈٹے رہے، محاصرہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔

عبدالرحمٰن الناصر نے کسی بے صبری یا جلد بازی سے کام لینے کی بجائے یہاں بھی دور اندیشی اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اس نے طُلَیْطلہ کے باہر ایک باقاعدہ فوجی چھاؤنی تعمیر کرائی، فوج کی خوراک و رسد کے لئے مستقل بنیادوں پر انتظامات کرا دیے اور تہیہ کرلیا کہ جب تک شہر فتح نہ ہوگا وہ واپس نہیں جائے گا۔

دو سال تک یہ محاصرہ جاری رہا حتیٰ کہ شہر والے خوراک کی کمی کا شکار ہو گئے جبکہ اُموی فوج اطمینان سے باہر قدم جمائے کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر طُلَیْطلہ کے باشندوں کو یقین ہوگیا کہ اگر مزید دو سال گزر جائیں تب بھی یہ بلا یہاں سے نہیں ٹلے گی۔ آخر ۳۲۰ھ میں مجبور ہو کر انہوں نے اطاعت کا وعدہ کیا اور شہر کے دروازے کھول دیے۔ عبدالرحمٰن الناصر اس عظیم فتح پر سجدہ شکر بجا لایا۔[1]

طُلَیْطلہ اندلس کا وسطی شہر تھا اور پورے ملک کی شاہراہیں یہاں آ کر ملتی تھیں اس لئے اس کی فتح عبدالرحمٰن الناصر کی بہت بڑی کامیابی تھی جس کے بعد اندلس میں اسلامی سلطنت اپنی سابقہ حدود تک وسیع ہوگئی تھی اور ارد گرد کی نصرانی ریاستوں پر ایک بار پھر اسلامی حکومت کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔

سَرَقُسطہ کی فتح:

شمالی اندلس میں سَرَقُسطہ بھی ایک الگ آزاد ریاست تھا۔ یہاں محمد بن ہاشم کی حکومت تھی۔ ۳۲۶ھ میں عبدالرحمٰن الناصر نے یہاں لشکر کشی کی اور کئی ماہ کے محاصرے کے بعد محمد بن ہاشم کو صلح و اطاعت پر آمادہ کرلیا۔ معاہدے کے مطابق محمد بن ہاشم کو خلافتِ اُمویہ کے تحت بدستور سَرَقُسطہ کا صوبے دار باقی رکھا گیا۔[2]

افریقہ میں عبیداللہ مہدی اور اس کے جانشینوں کی فتنہ انگیزیاں:

یہ دور پورے عالم اسلام میں گمراہ فرقوں کی اجارہ داری کا تھا۔ اہل سنت کی حکومتیں کہیں کہیں رہ گئی تھیں اور وہ بھی برائے نام۔ ایران، عراق یہاں تک کہ دارالخلافہ بغداد پر اثنا عشری شیعہ مسلط تھے۔ بحرین سے عراق کی سرحدوں اور ہندوستان میں سندھ اور ملتان تک اسماعیلی قرامطہ کا قبضہ تھا۔ الجزیرہ سے شام تک شیعہ رؤساء کا ایک اور گروہ بنی حمدان

---

[1] البیان المغرب: ۲/۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۰۷، تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۱۸۰، ۱۸۱، ط دار الفکر
[2] المقتبس من انباء الاندلس لابن حیان: ۵/ ۱۵۶

قابض تھا۔ افریقہ کے تقریباً تمام مسلم علاقے اسماعیلی مبلغ عبید اللہ نے زیر کر لیے تھے۔ وہ خود کو مہدی اور فاطمی کہلواتا تھا اور اسلام کی آڑ میں کفریہ عقائد پھیلا رہا تھا۔

اس وقت عالم اسلام میں مشرق میں ترکستان اور مغرب میں صرف اندلس دو ایسے خطے تھے جو روافض کے تسلط سے بچے ہوئے تھے مگر عبید اللہ اپنے افکار کی تبلیغ کے لئے اندلس میں بھی اپنے خفیہ داعی بھیج رہا تھا۔ ان میں سے ایک داعی "ابن سرۃ" کی زہریلی کتب اندلس کے عوام میں پھیلنے لگی تھیں، عبد الرحمٰن الناصر کو اس کی اطلاع ہوئی تو اسے ملک بدر کرا دیا اور اس کی کتابوں کو نذرِ آتش کر دیا۔

خلیفہ عبد الرحمٰن الناصر کو احساس تھا افریقہ سے اٹھنے والے اس گمراہ کن طوفان کو اگر پوری تندہی سے نہ روکا گیا تو آیندہ برسوں میں یہ اندلس کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے افریقہ کے ساحلوں پر از خود یلغار کر کے اندلس کے بارے میں عبید اللہ کے عزائم کو ہمیشہ کے لئے بدل ڈالنے کا تہیہ کر لیا۔ تاہم اس نے عجلت پسندی سے کام نہیں لیا بلکہ وہ شمالی افریقہ کی سیاست کے نشیب و فراز پر کڑی نگاہ رکھ کر موقع کی تلاش میں رہا۔

عبد الرحمٰن الناصر کی افریقہ کی فتوحات:

۳۰۵ھ میں عبید اللہ مہدی نے الجزائر سے دولتِ ادارسہ کا خاتمہ کر دیا تھا جس کے بعد مراکش کے مسلمان بھی خطرے کی زد میں آ گئے۔ آخر ۳۱۹ھ میں وہاں کے قبیلہ مکناسہ کے سردار موسیٰ بن ابی عافیہ نے عبد الرحمٰن الناصر کو مراسلہ بھیج کر درخواست کی کہ اہلِ مراکش کی سرپرستی کر کے انہیں عبید اللہ مہدی کے خطرے سے نجات دلائی جائے۔

خلیفہ عبد الرحمٰن الناصر نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے اپنے امیر البحر احمد بن احمد کی قیادت میں ایک سو بیس جہازوں اور سات ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج بھیج کر موسیٰ بن ابی عافیہ کی امارت کی پشت پناہی کی۔ یہ دیکھ کر کئی بربر قبائل بھی موسیٰ بن ابی عافیہ کے حامی بن گئے۔ احمد بن احمد نے اس مجموعی طاقت کے ساتھ سبتہ پر حملہ کر کے اسے عبید اللہ مہدی کے نائبین سے آزاد کرا لیا اور وہاں امیر المومنین الناصر کے نام کا خطبہ جاری کر دیا۔[1]

عبد الرحمٰن الناصر کی فوج کو افریقہ میں قدم جمانے کے لیے مراکش کے ساحلی شہر طنجہ کی ضرورت تھی جسے دولتِ ادارسہ کے جلاوطن سربراہ ابو العیش حسنی نے اپنا آخری مورچہ بنا رکھا تھا۔ شروع میں ابو العیش نے اندلس کی فوج کو جگہ دینے سے انکار کیا مگر پھر عبد الرحمٰن الناصر کے دباؤ پر اسے قبول کر لیا اور ۳۳۳ھ میں خود قرطبہ حاضری دی۔ ابو العیش عالی نسب سادات میں سے تھا۔ عبد الرحمٰن الناصر نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ اس کے اعزاز میں پورے قرطبہ کو سجایا گیا۔[2]

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۰۳

② البیان المغرب: ۲/۲۱۲، تاریخ ابن خلدون: ۳/۱۸۰، ط دار الفکر ۔۔۔ ابو العیش کے جدِ امجد عبد اللہ بن حسن تھے۔ یہ عبد اللہ بن حسن وہی ہیں جن کے بیٹے محمد نفس زکیہ نے ۱۴۵ھ میں منصور عباسی کے خلاف خروج کیا تھا۔

اس وقت تک افریقہ میں اسماعیلی زندیق پیشوا عبید اللہ مہدی کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی خود ساختہ امامت اس کے بیٹے القائم نے سنبھال لی تھی۔ اس کے ظلم وستم سے تنگ آکر افریقہ میں ایک عمر رسیدہ امیر ابو یزید بن مخلد نے انقلابی مہم شروع کر دی تھی اور جگہ جگہ وہ بنو عبید کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اسی دوران شمالی افریقہ کے ایک بربری قبیلے زناتہ کا سردار محمد بن خزر بھی بنو عبید کے خلاف کھڑا ہو چکا تھا۔ خلیفہ عبد الرحمٰن الناصر نے ان دونوں علیحدگی پسند تحریکوں کی بھرپور اعانت شروع کر دی۔ ابو یزید اور محمد بن خزر کے سفیر یکے بعد دیگرے ۳۳۲ھ میں قرطبہ آئے اور الناصر کی خلافت کے تحت آنے کا اعلان کیا۔[1]

ابو یزید تو اپنی مہم میں کامیاب نہ ہو سکا اور عبیدیوں کے مقابلے میں گرفتار ہو کر مارا گیا مگر محمد بن خزر کی فتوحات جاری رہیں۔ ۳۳۸ھ میں اس نے بنو عبید کے مقبوضہ شہر "تاہرت" پر حملہ کر کے شیعوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا، بنو عبید کے امیر کو اس کے کئی اہم مصاحبین سمیت قتل کر دیا گیا اور ان کے سر قلم کر کے قرطبہ بھیج دیے گئے۔

ان طاقتور بربر قبائل کے تعاون سے خلیفہ عبد الرحمٰن الناصر نے کسی دشواری کے بغیر الجزائر سمیت شمالی افریقہ کے بڑے حصے کا اقتدار حاصل کر کے وہاں سے بنو عبید کا اثر ورسوخ ختم کر دیا۔ بنو عبید کی ضلالت اور گمراہی سے عوام کو آگاہ رکھنے کے لیے عبد الرحمٰن الناصر نے ۳۴۴ھ میں حکم جاری کیا کہ جمعے کے خطبے میں جہاں خلیفہ کے لیے دعا کی جائے وہاں خلافت کے دشمن بنو عبید کے لیے بددعا اور لعنت بھی کی جائے۔[2]

شمالی افریقہ پر بنو عبید کا تسلط اس کے بعد بھی برقرار رہا اور وہ اندلس کے حامی بربر قبائل کو دبانے میں اس حد تک کامیاب رہے کہ انہیں کسی بڑے رقبے پر کبھی قابض نہیں ہونے دیا۔ خلیفہ عبد الرحمٰن الناصر کو بنو عبید کے خلاف کوئی غیر معمولی کامیابی نہیں ہوئی مگر ان کی حکمتِ عملی اس حد تک فائدہ مند رہی کہ بنو عبید کبھی اندلس پر حملہ نہ کر سکے۔ اس کے برعکس اندلس کی فوجیں بار بار افریقہ کے ساحلوں پر اتر کر بنو عبید کو للکارتی رہیں۔

اس سلسلے کی آخری مہمات عبد الرحمٰن الناصر کی زندگی کے آخری برسوں میں احمد بن یعلیٰ کی قیادت میں انجام دی گئی۔ احمد بن یعلیٰ ستر (۷۰) بحری جہازوں کا بیڑا لے کر ۳۴۵ھ (۹۵۷ء) میں افریقہ پہنچا اور فتنہ پرداز عبیدیوں کی سرکوبی کر کے بے شمار مالِ غنیمت کے ساتھ اندلس واپس آیا۔ دو برس بعد ۳۴۷ھ میں ایک بار پھر اسی جرنیل کی قیادت میں ایک مہم روانہ کی گئی جو کامیاب وکامران لوٹی۔[3]

خندق کی ہولناک لڑائی:

عبیدیوں سے کش مکش کے دوران شمالی نصرانی ریاستوں پر ہر سال جہادی مہمات بھیجنے کا سلسلہ جاری رہا۔ کئی

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۱۲

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۱۶، ۲۱۸، ۲۲۰

③ البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۲۱، ۲۲۳

مہمات کی قیادت خلیفہ عبدالرحمن الناصر نے بذات خود کی اور ہر بار کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ تاہم فتوحات کے اس تسلسل کے دوران ۳۲۷ھ (۹۳۹ء) میں عبدالرحمن الناصر کو ایک ایسے حادثے کا سامنا کرنا پڑا جسے ہم اس کی زندگی کا سب سے سخت امتحان کہہ سکتے ہیں۔

۳۲۷ھ میں عبدالرحمن الناصر نے سَرَقُسطہ کے مسلمان امیر اُمیہ بن اسحاق کے بھائی احمد کو حکومت کے خلاف سازشوں اور اقدام بغاوت کے جرم میں قتل کرادیا۔ جس سے اُمیہ بن اسحاق بپھر گیا۔ نصرانی حکام نے موقع غنیمت جان کر اسے مزید بھڑکایا اور تعاون کا وعدہ کر کے اسے بغاوت پر آمادہ کرلیا۔

چنانچہ اُمیہ بن اسحاق نے بغاوت کا اعلان کردیا اور سَرَقُسطہ کی فوج اور خزانے سمیت جلیقیہ کے دارالحکومت سمورہ کا رخ کیا۔ وہاں کے حاکم رڈمیر نے اسے خوش آمدید کہا۔ نوار، لیون اور قسطالیہ کی نصرانی فوجیں بھی یہاں پہنچ گئیں اور سب نے اسلامی مقبوضات پر حملے کی تیاریاں شروع کردیں۔

خلیفہ عبدالرحمن الناصر کو اُمیہ بن اسحاق اور نصرانیوں کی فوجوں کے اجتماع کا حال معلوم ہوا تو وہ پچاس ہزار سے زیادہ سپاہی لے کر دشمنوں کی سرکوبی کے لیے جلیقیہ کے دارالحکومت سمورہ کی جانب روانہ ہوا۔ سمورہ کا قلعہ نہایت وسیع وعریض اور مضبوط تھا۔ سات بلند اور مستحکم فصلیں آہنی دائروں کی طرح اسکا احاطہ کئے ہوئے تھیں اور ہر دو فصیلوں کے درمیان ایک گہری اور چوڑی خندق حائل تھی۔

ابتداء میں جلیقیہ کے میدانوں میں چند چھوٹے معرکوں میں عبدالرحمن الناصر کو کامیابی ہوئی اور حریف کی متحدہ افواج سمورہ کے قلعے میں محصور ہوگئیں۔ اس موقع پر عبدالرحمن الناصر کے بعض ناتجربہ کار سالاروں نے اپنی ناقص سمجھ بوجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے خلیفہ کو بتائے بغیر قلعے پر حملے کی ایسی حکمت عملی طے کرلی جو سراسر غیر معقول تھی۔

۳ شوال ۳۲۷ھ (۵ اگست ۹۳۹ء) میں عبدالرحمن الناصر کی افواج نے سمورہ کے قلعے پر حملہ کردیا اور دو فصیلوں کو عبور کر کے باغی اور نصرانی افواج کو پیچھے دھکیلنے لگے۔ اس کے فوراً بعد چند عرب سالاروں نے اپنی طے شدہ وکمزور حکمت عملی کے مطابق یکدم پیچھے ہٹنا شروع کردیا۔ ان کا مقصد تھا کہ اس طرح دشمن کی تمام فوجیں ہمارا تعاقب کرتے ہوئے کھلے میدان میں نکل آئیں گی اور وہاں ان سے دو بدو مقابلہ کیا جائے گا مگر ان کی یہ توقعات پوری نہ ہوسکیں۔ تیسری فصیل کے قریب پہنچنے کے بعد وہ پیش قدمی ترک کر کے نمائشی پسپائی اختیار کر ہی رہے تھے کہ نصرانیوں نے موقع پا کر ان پر بھرپور حملہ کردیا۔ اس وقت تک اسلامی لشکر کے تمام سپاہی قلعے میں داخل ہوچکے تھے۔ دشمنوں کے اچانک بھرپور حملے سے ان میں بھگدڑ مچ گئی، وہ دونوں جانب سے سنگین فصیلوں اور خندقوں کے درمیان گھر کر رہ گئے تھے۔ ہزاروں سپاہی افراتفری کے عالم میں خندقوں میں جاگرے۔

عبدالرحمن الناصر خود بھی اس وقت فصیل عبور کر کے اندر داخل ہوچکا تھا۔ وہ بھی دشمن کے گھیرے میں آگیا۔ اس کے چند جانثاروں نے جان کی بازی لگا کر اسے دشمنوں کی تلواروں اور نیزوں سے بچایا اور اسے قلعے سے باہر لانے

میں کامیاب ہو گئے۔ اس لڑائی میں تقریباً پچاس ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ عبدالرحمٰن الناصر جب قرطبہ واپس پہنچا تو اس کے ساتھ صرف پینتالیس آدمی تھے۔

اس موقع پر اگر اس کی جگہ اور حکمران ہوتا تو نصرانی اتنی بڑی فتح کے بعد قرطبہ تک پہنچنے میں دیر نہ لگاتے مگر خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کا خداداد رُعب اور دبدبہ ایسا تھا کہ نصرانیوں نے تعاقب کی کوشش نہ کی اور عبدالرحمٰن الناصر بخیریت قرطبہ پہنچ گیا۔[1]

جوابی کارروائی اور مسلسل فتوحات:

اس شکست کا خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر پر اتنا اثر ہوا کہ اس کا چین و آرام جاتا رہا۔ اس نے شکست کے ذمہ دار افسران کو سخت سرزنش کی اور دشمن سے بدلہ لینے کے لئے بھرپور تیاریاں شروع کر دیں۔

پورے دو سال کی تیاریوں کے بعد جبکہ قشتالیہ کے حاکم فرڈی نینڈ اور جلیقیہ کے رئیس رڈمیر میں ناچاقی پیدا ہو چکی تھی، اسلامی لشکر نے احمد بن یعلیٰ کی قیادت میں نصرانی ریاستوں پر حملہ کر دیا۔ رڈمیر، قشتالیہ سے لڑائیوں کی وجہ سے پہلے ہی نڈھال ہو چکا تھا، اسے مکمل شکست ہوئی۔

رجب ۳۳۹ھ (جنوری ۹۵۱ء) میں رڈمیر کی موت کے بعد نصرانی ریاستوں کا حال مزید پتلا ہو گیا۔ اسلامی لشکر نے ان پر حملے جاری رکھے اور یکے بعد دیگرے تمام نصرانی حکام معافی مانگنے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے ہمیشہ مطیع رہنے اور خراج ادا کرنے کا وعدہ کر کے خود کو بچایا۔[2]

یورپی حکمرانوں کے وفود دربار قرطبہ میں:

ان فتوحات کے بعد اندلس میں امن وامان قائم ہو چکا تھا اور سرکشوں کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ اس لیے ۳۲۷ھ کے بعد خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر باقی زندگی قرطبہ ہی میں قیام پذیر رہا۔ وہ کھیت کو خون پسینے سے سینچ چکا تھا۔ اب اس کے لیے فصل کاٹنے کا زمانہ تھا، لہٰذا اس کے باقی ایام امن وسکون سے گزرے۔ اس دوران افریقہ اور شمالی اندلس کی طرف جہادی وعسکری مہمات ضرور بھیجی گئیں مگر ان کی قیادت شہزادے یا سپہ سالار کرتے رہے۔

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کی فتوحات نے اس کی شہرت دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دی۔ انداز جہاں بانی اور قوت جہانگیری میں اس کی شخصیت ضرب المثل بن گئی۔ نہ صرف اسلامی دنیا میں اس کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا تھا بلکہ غیر مسلم ممالک کے حکمران بھی اس کی عظمت کے سامنے سرنگوں تھے اور دربار قرطبہ میں اپنے وفود بھیج رہے تھے۔

قسطنطنیہ (استنبول) کا بادشاہ قیصر قسطنطین بن الیون جسے دنیائے نصرانیت کے مرکزی سربراہ کی حیثیت حاصل تھی، اس کی شوکت وسطوت سے لرزہ براندام تھا اور چاہتا تھا کہ اس سے دوستانہ مراسم قائم کر کے اپنی سیاسی ساکھ

---

① مروج الذهب للمسعودی: ۱/۸۴، الکامل فی التاریخ: سنة ۳۲۷ھ، نفح الطیب: ۱/۳۶۵؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۱/۴۱۳

② دولة الاسلام فی الاندلس: ۱/۴۱۹ تا ۴۲۱

کو سہارا دے۔ ۳۳۶ھ (۹۴۷ء) میں اس نے بیش قیمت تحائف کے ساتھ اپنا وفد قرطبہ روانہ کیا تاکہ عبدالرحمن الناصر سے مصالحانہ تعلقات کا آغاز کیا جائے۔

وفد کے ارکان قیصر کے دربار کے بہترین نوادرات اور تحائف ساتھ لائے تھے مگر عبدالرحمن الناصر کے عظیم الشان محل پر نظر ڈالتے ہی ان پر کپکپی طاری ہوگئی۔ قصر شاہی کے فلک بوس میناروں اور اس کی بلند و بالا دیواروں نے انہیں مبہوت کر دیا۔ ایوان خاص کی طلسماتی زیبائش دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ ستونوں اور محرابوں پر جڑے ہوئے موتیوں کی خیرہ کن جگمگاہٹ دیکھ کر انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ان کے لائے ہوئے تحائف کنکروں اور مٹی سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ جب وفد کے ارکان کو خلیفہ عبدالرحمن الناصر کے سامنے اپنے بادشاہ کا خط پڑھ کر سنانے کو کہا گیا تو خلیفہ کے رعب و دبدبے اور دربار کی مدہوش کر دینے والی رعنائی نے ان کی زبانیں گنگ کر دیں اور وہ بڑی مشکل سے اپنے بادشاہ کا پیغام سنا سکے۔

دربار قرطبہ میں ایک عالم شیخ ابوعلی قالی غیر ملکی سفیروں کے سامنے جوابی بیان کے لیے مقرر تھے اور اس وقت سب کو توقع تھی کہ وہ سفیر قسطنطنیہ کے سامنے اسلام اور اندلس کے مسلم حکمرانوں کی عظمت اپنے مخصوص دلنشین انداز میں بیان کریں گے مگر دربار کی سطوت و شکوہ سے شیخ ابوعلی قالی پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ ان کی زبان گنگ ہوگئی اور وہ اپنی جگہ کھڑے نہ ہو سکے۔ تب قاضی منذر بن سعید رحمہ اللہ جو ایک عام فقیہ سمجھے جاتے تھے، موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے خود اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ایسی رواں دواں، مؤثر اور مدلل تقریر کی کہ سب کے لبوں سے بے ساختہ سبحان اللہ! اور ماشاء اللہ! کے تعریفی کلمات بلند ہونے لگے۔ خلیفہ عبدالرحمن الناصر نے چند دنوں تک قیصر کے سفیروں کی شاندار میزبانی کرنے کے بعد اپنے جوابی خط کے ساتھ انہیں الوداع کیا اور قاضی منذر بن سعید کو دربار قرطبہ کی بہترین ترجمانی پر اپنا مقرب بنا لیا۔[1]

دو سال بعد ۳۳۸ھ میں قیصر کی سفارت دوبارہ آئی۔ اس بار بھی ویسا ہی شاندار استقبال ہوا اور قیصر کے سفیر بہت متاثر ہو کر واپس گئے۔[2]

۳۴۲ھ میں جرمنی کے بادشاہ اوٹو نے اپنے بشپ یوحنا کو سفیر بنا کر بھیجا تاکہ اندلس کی فوج کشی سے تحفظ حاصل کیا جائے مگر چونکہ خود شاہِ جرمنی کا رویہ بہتر نہ تھا، اس لیے الناصر نے بھی وفد کو اپنے سامنے باریابی کی اجازت نہ دی۔

---

① قاضی منذر بن سعید ۲۷۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس واقعے کے وقت وہ اکسٹھ برس کے تھے۔ الناصر نے انہیں اس واقعے کے بعد قاضی القضاۃ مقرر کر دیا اور الناصر کی وفات کے پانچ سال بعد ۳۵۵ھ تک زندہ رہے۔ آخر تک وہ اس عہدے پر برقرار تھے۔ اس طرح وہ اکیس برس قاضی رہے۔ فقاہت، اخلاص، حق گوئی، فصاحت و بلاغت اور عقل و دانش میں وہ اپنے دور کی ممتاز شخصیت تھے۔ الناصر کی کامیابیوں میں ایسے حضرات کی صحبت، مشوروں اور دعاؤں کا بہت بڑا حصہ تھا۔ (البیان المغرب: ۲/۲۵۰۔ سیر اعلام النبلاء: ۱۶/۱۷۳ تا ۱۷۵، ط الرسالۃ)

② البیان المغرب: ۲/۲۱۳، ۲۱۵، نفح الطیب: ۱/۳۷۲، دولة الاسلام فی الاندلس: ۱/۳۵۴ تا ۴۵۵، جذوة المقتبس فی ذکر ولاة الاندلس للحمیدی محمد بن فتوح: ۱/۲۲، ط الدار المصریة

بلغاریہ کے حکمران پیٹر نے ایک وفد بھیج کر تاجدار اندلس سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

۳۴۷ھ میں روم کے پوپ یوحنا ٹویلیتھ نے اپنے سفیر بھیجے جو نصرانیوں اور مسلمانوں میں صلح، امن اور باہمی تعاون کی پیش کش لے کر آئے۔ الناصر نے اسے بھی قبول کرلیا۔

شمالی اندلس کے نصرانی حکمران اب چھوٹی چھوٹی کمزور ٹکڑیوں میں بٹ کر مکمل طور پر عبدالرحمٰن الناصر کے رحم وکرم پر تھے، اس لئے اب ان میں سے ہر ایک اپنا سیاسی اثر ورسوخ برقرار رکھنے کے لئے اسلامی حکومت کی خوشنودی چاہتا تھا۔ فرانس جو مسلمانانِ اندلس کا سب سے سخت مخالف رہا تھا، اب دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ شاہِ فرانس لوئیس چہارم کے سفیر حاضر ہوئے اور دوستانہ تعلقات کی پیش کش کی۔ الناصر نے مثبت جواب دے کر وفد کو واپس بھیجا۔

۳۴۴ھ میں شمالی اندلس کی نصرانی ریاست لیون کے حکمران نے بھی صلح کے لیے سفارت بھیجی۔ ۳۴۵ھ میں قشتالیہ کے نواب فرڈیننڈ نے عبدالرحمٰن الناصر کی خدمت میں درخواست بھیجی کہ اسے قشتالیہ کا مستقل حاکم مقرر کردیا جائے۔ اس درخواست کی منظوری سے فرڈیننڈ کی سیاسی ساکھ بڑھ گئی۔[1]

نصرانی حکمران فریادی بن کر آئے:

فرڈیننڈ کے پڑوس میں واقعہ نصرانی ریاست پر اردون چہارم کی حکومت تھی جو اپنی بدسیرتی اور بدصورتی کے باعث اردون خبیث کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے فرڈیننڈ کو اپنے ساتھ ملا کر ریاست لیون کے حکمران شانجہ کے خلاف چڑھائی کر کے اسے ریاست لیون سے مار بھگایا۔ شانجہ جان بچا کر اپنی نانی ملکہ طوطہ کے پاس چلا گیا۔ ان دنوں شانجہ مختلف موذی بیماریوں میں مبتلا تھا اور اس کا جسم اتنا پھول گیا تھا کہ اس کے لئے چلنا پھرنا مشکل تھا۔

ملکہ طوطہ کی درخواست پر خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے پہلے تو قرطبہ کے ایک حاذق طبیب کو بھیج کر شانجہ کے موٹاپے اور دیگر بیماریوں کا علاج کرایا اور اس کے صحت یاب ہونے کے بعد اسے قرطبہ طلب کیا۔ شانجہ فریادی بن کر اپنی نانی ملکہ طوطہ اور اپنے ماموں (جو ریاست نوار کا حاکم تھا) کے ساتھ شمالی اندلس سے چل کر قرطبہ پہنچا۔

جب یہ تین نصرانی حکمران (دو بادشاہ اور ایک ملکہ) قرطبہ میں داخل ہو رہے تھے تو شہر کی سڑکوں پر عوام کا بے پناہ ہجوم ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ مسلمانوں کے لیے یہ نظارہ نہایت شادمانی کا باعث تھا کہ وہ سرکش نصرانی جو ڈیڑھ صدی سے مسلمانانِ اندلس کے لئے وبالِ جان بنے ہوئے تھے اب فریادی بن کر ان کے دربار میں حاضری دینے پر مجبور تھے۔ خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کے دربار میں پہنچ کر تینوں فریادیوں نے شانجہ پر دیگر نصرانی حکمرانوں کی زیادتیوں کے ازالے اور اسے تختِ لیون پر بحال کرنے کی درخواست کی۔ عبدالرحمٰن الناصر نے یہ درخواست قبول کرلی اور ان کو عزت واعزاز کے ساتھ واپس روانہ کیا۔ اس کے بعد شاہی افواج نے ایک ہی جھٹکے میں اردون خبیث سے ریاست لیون چھین کر شانجہ کے حوالے کر دی۔

---

[1] تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۱۸۳، ۱۸۲، والتاریخ الاسلامی لاشلبی: ۴/ ۱۰۷، ودولة الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۳۵۷ تا ۳۵۹

یہ صورتحال دیکھ کر باقی چھوٹی چھوٹی نصرانی ریاستوں کے حکمران بھی خوف سے لرزنے لگے اور سب نے خلیفہ الناصر کی خوشنودی چاہی۔ انہوں نے پیغامات بھیجے کہ ہم سب اسلامی دربار کے حلقہ بگوش غلام ہیں اور اپنی چپہ بھر کی حکومتوں کو دربار قرطبہ کا عطیہ تصور کرتے ہیں اور احکام شاہی کی تعمیل کو اپنا فرض اور سعادت سمجھتے ہیں، لہٰذا ہمیں ہماری ریاستوں کی حکمرانی کی تجدید کے پروانے عطا کر کے ممنونِ احسان کیا جائے۔

عبدالرحمن الناصر نے ان سب کو حکومت کے اجازت نامے روانہ کر کے ان پر اپنی سیاسی برتری قائم رکھی۔ ①

قارئین کرام! کیا دور تھا جب غیر مسلم حکمران اپنی بقا کے لئے مسلمانوں سے فریاد کرتے تھے۔ آج اغیار کے در پر جھک کر ان سے امن اور انصاف کی التجائیں کرتے ہیں مگر ہمیں ہر جگہ سے دھتکارا جاتا ہے۔ اگر ہمارا ایمان اللہ پر پختہ ہو، اعمال اور اخلاق کی اصلاح ہو جائے اور ہم حقیقی سیاسی شعور حاصل کر پائیں تو ایک بار پھر پانسہ پلٹ سکتا ہے۔

◆◆◆

اندلس کی علمی ومعاشی واقتصادی ترقی

خلیفہ عبدالرحمن الناصر کا عہد حکومت مسلم اندلس کی تاریخ کا سنہری دور تھا، اس دور میں اندلس امن وامان کا گہوارہ بن گیا تھا، تمام سرکش سرنگوں ہو گئے تھے اور تمام مخالفین تابعدار بن گئے تھے۔ علامہ ابن خلدون تحریر کرتے ہیں:

"عبدالرحمن الناصر نے تقریباً پچاس سال حکومت کی اور بنوامیہ کا اقتدار اس کے عہد حکومت میں پھر مستحکم ہو گیا۔" ②

مساجد، مدارس اور کتب خانوں کی کثرت ہو گئی تھی۔ لوگ نماز کے پابند تھے۔ ہر طرف علمی ذوق عام تھا۔ قرطبہ میں یہ دور "العقد الفرید" کے مؤلف علامہ ابن عبد ربہ (م ۳۲۸ھ) محدث احمد بن بقی بن مخلد (۳۲۴ھ) اور قاضی اسلم بن عبدالعزیز جیسے علماء کا تھا۔ لوگ علوم اسلامیہ کی تحصیل، کتب بینی اور جہاد میں شرکت جیسے اعلیٰ مقاصد میں دلچسپی لیتے تھے۔ شراب نوشی اور لہو ولعب سے گریزاں تھے۔ ③ مؤرخین کا کہنا ہے کہ اس دور میں اندلس کی گنجان آبادی کے سامنے یورپی ممالک دشت وصحرا معلوم ہوتے تھے، اندلس کا ہر شہر دلکش اور بلند وبالا عمارتوں سے سجا ہوا تھا اور ہر گاؤں نے ہریالی کی چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ ملک میں کوئی قطعہ زمین بنجر نہیں دکھائی دیتا تھا، چپے چپے کو قابل کاشت بنا لیا گیا تھا، زراعت کے سائنسی طریقے دریافت کر کے انہیں رائج کیا گیا تھا۔

اندلس کے مسلم ماہرین زراعت نے اس فن کی معراج کو پالیا تھا، ان کی مہارت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ پورے سال

---

① تاریخ ابن خلدون: ۱۸۳/۴، ۱۸۴، ط دار الفکر؛ نفح الطیب: ۳۶۵/۱، ۳۶۶؛
Moors in Spain, by stanly lane poole p:160,161

② تاریخ ابن خلدون: ۱۷۶/۴، ط دار الفکر

③ نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۳۶۲/۱

میں زمین کو ایک دن کے لیے بھی خالی نہیں رہنے دیتے تھے۔ ایک فصل کٹتے ہی موسم کے مناسب اگلی فصل کی تخم ریزی شروع ہو جاتی۔ کھجور، زعفران، انجیر، زیتون، پستہ، شہتوت، انار، کیلا، آڑو، کپاس اور چاول یہاں کی خاص پیداوار تھی۔ کسان جدید زرعی طریقوں پر عمل کر کے ایک سال میں تین تین فصلیں کاٹتے تھے۔ عبدالرحمٰن الناصر کے خزانے کو سالانہ دو کروڑ چون لاکھ اسی ہزار دینار کی آمدنی ہوتی تھی۔[1]

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کے دور میں ایک امتیازی خوبی یہ نظر آتی ہے کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر اور طبقات کے درمیان اختلافات کو ہوا دینے والے سماج دشمن عناصر کی تمام سازشیں ناکام ہو گئیں۔

پورے ملک میں مسلمانوں کے تمام گروہ شیر و شکر ہو گئے۔ اختلافی مسائل کی بحثیں علمی مجالس تک محدود ہو گئیں، حکومت ہر گروہ اور ہر جماعت کو ایک نظر سے دیکھتی تھی، عدالتی فیصلے قرآن و سنت کے مطابق ہوتے تھے، تمام طبقات کو یکساں حقوق دیئے گئے تھے، اس لئے عوام حکومت سے خوش اور باہم متحد تھے۔ ذمیوں (غیر مسلم شہریوں) سے بھی شریعت کے مطابق منصفانہ سلوک کیا جاتا تھا اس لئے وہ بھی حکومت سے مطمئن تھے اور عبدالرحمٰن الناصر کے زمانے میں انہوں نے شورش پسندی ترک کر کے اطاعت اور تابعداری کی روش اختیار کر لی تھی۔

شعر و ادب کی معراج:

اس دور میں اندلس علم و ادبی بلندیوں کی معراج کو چھو رہا تھا، عربی زبان ہر جگہ مادری زبان کی طرح بولی جاتی تھی، عربی کے بڑے بڑے نامور خطیب، ادیب، مصنف، شاعر اور نثر نگار اس دور میں اپنی اپنی سخن دانی کا جادو جگا رہے تھے...... خواص تو کیا عوام بھی شعر و ادب کی لطافتوں کے محرم راز تھے۔ رئیسوں کے ہاں پالتو پرندوں کو بھی عربی کے اچھے اچھے اشعار یاد کرائے جاتے تھے اور انہیں موقع کے مطابق یہ اشعار پڑھنے کی تربیت دی جاتی تھی۔

مؤرخین نے اس دور کا ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے کہ خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے اپنی فصد کھلوانے (جسم سے زائد و فاسد خون کے اخراج) کے لئے شاہی جراح کو طلب کیا۔ جراح نشتر اٹھا کر فصد لگانے کو تھا کہ یکا یک کھڑکی کے راستے ایک مینا اڑتی ہوئی آئی اور سونے کے گلدستے پر بیٹھ کر یہ اشعار پڑھنے لگی:

أيها الفاصِدُ رِفْقًا ...... بِأميرِ المُؤمِنينا

''اے جراح! امیر المؤمنین کو نشتر لگاتے ہوئے بڑی احتیاط اور نرمی سے کام لینا''

إنما تفصِدُ عِرقًا ...... فيهِ محيَى العالَمينا

''کیوں کہ تم ایسے انسان کی رگ پر نشتر زنی کرنے والے ہو جس پر سب کی زندگی کا دار و مدار ہے۔''

عبدالرحمٰن الناصر مینا سے یہ اشعار سن کر حیران رہ گیا اور پوچھا: ''یہ مینا کس کی ہے؟''

---

[1] نفح الطیب: ۱/ ۱۷۷، ۲۰۵؛ البیان المغرب: ۲/ ۲۳۷؛ نزهة المشتاق للادریسی: ص ۲۷۳

کسی کے بولنے سے قبل مینا نے خود ہی جواب دیا:

''میں آپ کے ولی عہد شہزادہ الحکم کی والدہ مرجانہ کی بیٹی ہوں۔''

عبدالرحمٰن الناصر یہ سن کر بہت خوش ہوا اور مرجانہ کو بیس ہزار دینار انعام میں دیے۔[1]

اندلس کی ترقی وخوشحالی:

اندلس میں یہ مسلمانوں کا دورِ عروج تھا۔ مؤرخین کے مطابق الناصر کے دور میں زرعی محصولات ۵۴ لاکھ ۸۰ ہزار دینار تک پہنچ گئے تھے۔[2] جبکہ تجارتی محصولات ۷ لاکھ ۶۵ ہزار دینار تھے۔[3] الناصر کی وفات کے وقت خزانے میں محفوظ رقم پانچ ارب دینار تھی۔[4] سرکاری بجٹ کا ایک تہائی فوج پر جبکہ ایک تہائی تعمیری وترقیاتی کاموں اور عوامی فلاح وبہبود پر خرچ کیا جاتا تھا۔ ایک تہائی محفوظ رکھا جاتا تھا۔[5] اس دور میں یورپ کے تمام بادشاہوں کی مجموعی آمدنی بھی اندلس کی اسلامی حکومت کی آمدنی کے برابر نہیں تھی۔

امیر شکیب ارسلان مرحوم کے مطابق الناصر کے دور میں یہاں کی مسلم آبادی ڈیڑھ کروڑ سے کم نہ تھی۔ یہاں چالیس شہر صرف عربوں کے تھے اور فقط قرطبہ کی آبادی اس زمانے میں بیس لاکھ تھی۔[6] سلطنت کا بحری بیڑا نہایت مضبوط تھا اور دو سو جنگی جہازوں پر مشتمل تھا جو شمالی افریقہ پر قابض بنوعبید کو مسلسل پسپا کر رہا تھا۔[7]

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کے دارالحکومت قرطبہ کو اس دور کی فردوسِ ارضی کہا جا سکتا ہے۔ یہ شہر چھ میل چوڑا تھا جس کی عمارتیں، محلات، بازار، مساجد اور باغات دریائے وادی الکبیر کے کنارے کنارے چوبیس میل تک چلے گئے تھے۔[8] شہر کے اندر صاف ستھری اور کشادہ سڑکیں تھیں جن کے اطراف میں حسین وجمیل اور مستحکم عمارتوں کا سلسلہ دکھائی دیتا تھا۔ کتنی ہی بارش ہو، یہاں کیچڑ کا نام ونشان تک نہ ہوتا تھا۔[9] شہر سے مدینۃ الزہراء تک دس میل طویل سڑک پر مسلسل آبادی تھی۔ رات کے وقت بھی چراغوں کی روشنی کے باعث اس پر آمد ورفت میں کوئی مشکل نہ تھی۔[10]

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۱/۳۶۱

② لگ بھگ ایک ارب ۹۰ کروڑ ڈالر

③ لگ بھگ ۲۴ کروڑ ۸۱ لاکھ ڈالر

④ لگ بھگ ۱۲ کھرب ۵۰ ارب ڈالر

⑤ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/۴۳۷

⑥ الحلل السندسیۃ فی الاخبار و الآثار الاندلسیۃ از امیر شکیب ارسلان: ۱/۳۱

یہ امیر شکیب ارسلان کا قول ہے، مؤرخ سڈیو نے تعداد دس لاکھ بتائی ہے اور بعض عرب مؤرخین نے پانچ لاکھ۔ غالباً زمانے کے لحاظ سے آبادی کم وبیش ہوتی رہی تھی۔ بہرکیف اندلس سے مسلمانوں کے خاتمے کے بعد اس ملک کی مجموعی آبادی مسلم دورِ عروج کے مقابلے میں بہت کم رہ گئی۔ ۱۷۶۸ء میں اسپین کی مجموعی آبادی ۹۰ لاکھ تھی اور بیسویں صدی کے آغاز تک وہ دو کروڑ دس لاکھ تک پہنچ پائی تھی۔ (الحلل السندسیہ: ص ۳۱، ۳۲)

⑦ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/۴۳۶

⑧ نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۱/۳۵۸

⑨ نفح الطیب: ۱/۳۶۲　　⑩ نفح الطیب: ۱/۳۵۶

شہر میں عام شہریوں کے مکانات کی تعداد ایک لاکھ تیرہ ہزار تھی۔ اُمراء، وزراء، افسران اور سرکاری خدمت گاروں کے مکانات اس کے علاوہ تھے۔ [1] قصرِ شاہی شہر کی سب سے پُرشکوہ اور عالی شان عمارت تھی جس کے درودیوار خوبصورت نقش ونگار اور مینا کاری سے آراستہ تھے۔ اس نقاشی میں پیتل، تانبے اور سیسے کے علاوہ سونے چاندی کا استعمال بھی کیا گیا تھا۔ قصر کے باغات میں جگہ جگہ سنگِ مرمر کے تالاب، حوض اور صاف پانی کی رَوئیں تھیں۔ [2] شہر کی آب وہوا نہایت عمدہ تھی۔ نہروں، چشموں، قلعوں اور تاحدِ نظر پھیلے ہوئے باغات اور کھیتوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ [3]

قرطبہ کے لوگ صحتِ اعتقاد، عالی ہمتی اور حسنِ اخلاق کے لیے مشہور تھے۔ کسبِ حلال، اچھے لباس اور عمدہ سواریوں کے عادی تھے۔ کھانے پینے میں بھی بڑا نفیس ذوق رکھتے تھے۔ [4] دین داری اور نماز کی پابندی میں معروف تھے۔ اعلیٰ نسبی کے بعد علمی یا عسکری کارنامے ہی شرف کا باعث تھے اور انہی کے سبب محفلوں میں اعزاز واکرام ہوتا تھا۔ علمی ذوق بہت عام تھا۔ لوگ کتابیں جمع کرنے کے شوقین تھے۔ کسی کو اس وقت تک معزز رئیس نہیں مانا جاتا تھا جب تک اس کا ذاتی کتب خانہ نہ ہو۔ قرطبہ جیسے کتب خانے پورے ملک میں کہیں نہ تھے۔ رؤساء اور اُمراء اپنی حویلیوں اور کوٹھیوں میں کتب خانے قائم کرتے اور ایسی نادرونایاب کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کرتے جو کسی اور کے پاس نہ ہوں۔ کسی کے پاس کوئی نایاب کتاب ہوتی تو وہ اس پر فخر کرتا اور لوگ اس پر رشک کرتے۔ [5]

قرطبہ پانچ حصوں میں تقسیم تھا۔ ہر حصہ اپنی جگہ بذاتِ خود ایک شہر تھا جس میں مساجد، مدارس، بازار، سرائے خانے، حمامات اور صنعتی علاقہ تھا۔ ہر حصے کے لیے الگ فصیل بھی تھی۔ [6] پھر مجموعی شہر کے گرد ایک اور بڑی فصیل تھی جس کے سات دروازوں سے سات مختلف اطراف میں شاہراہیں نکلتی تھیں۔ [7] شہر سے متصل اکیس (۲۱) قصبے تھے۔ ہر قصبے میں مسجد، بازار اور ضروریاتِ زندگی کی تمام سہولتیں میسر تھیں۔ مضافات میں تین ہزار گاؤں تھے۔ ہر گاؤں میں ایک ماہر عالم مقرر کیا گیا تھا۔ علم میں مہارت کا معیار یہ تھا کہ مؤطا امام مالک زبانی یاد ہو۔ ایک قول کے مطابق ماہر عالم اسے کہا جاتا تھا جو دس ہزار احادیث اور فقہ مالکی کی کتاب ''المدوّنہ'' کا حافظ ہو۔ [8]

قرطبہ کی اس شان وشوکت کا تذکرہ کرتے ہوئے سڈیو (یورپی مؤرخ) لکھتا ہے:

''مسلم اسپین چھے صوبوں، [9] اسّی بڑے اور تین سو چھوٹے شہروں، لاتعداد بستیوں اور ہزاروں دیہاتوں

---

① البیان المغرب: ۲/۲۳۲
② نفح الطیب: ۱/۳۶۳
③ نفح الطیب: ۱/۳۶۰
④ نزھۃ المشتاق فی اختراق الآفاق: ۲/۵۷۵
⑤ نفح الطیب: ۱/۳۶۲،۳۶۳
⑥ نزھۃ المشتاق: ۲/۵۷۵
⑦ نفح الطیب: ۱/۳۶۵
⑧ نفح الطیب: ۱/۳۵۸
⑨ یہ چھے صوبے قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، طلیطلہ، بلنسیہ اور سرقسطہ تھے۔ گنجان آباد بڑے شہروں میں مالقہ، المریہ، مرسیہ، جیان، شاطبہ، دانیہ، میورقہ، طرطوشہ، ماردہ، بطلیوس، شنترین، بربشلونہ اور اشبونہ وغیرہ شامل تھے۔ چھوٹے شہروں میں الجزیرۃ الخضراء، قرطاجنہ، وادی الحجارۃ، سالم، بربشتر، یابرہ، شقر، لوشہ، لورقہ، رندہ، طریف، وادی آش، وقاوش وغیرہ کو شمار کیا جاسکتا ہے۔

پر مشتمل تھا۔ ترقی کا یہ عالم تھا کہ صرف قرطبہ میں دو لاکھ مکانات [1]، چھ سو مسجدیں، پچاس اسپتال، اسی جامعات اور نو سو حمامات تھے۔ شہر کی آبادی کئی ملین تھی...... شہر کے ایک کتب خانے میں چھ لاکھ کتابیں تھیں۔" [2]

اس بنا پر دسویں صدی عیسوی کی نامور لاطینی شاعرہ "ہیروسوفیتا" نے اپنی ایک نظم میں قرطبہ کو "زینتِ دُنیا" کہہ کر یاد کیا تھا۔ [3]

سالم اور المریہ کی تعمیر:

عبدالرحمٰن الناصر کو اندلس میں متعدد شہر آباد کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ۳۳۵ھ میں اس نے طلیطلہ سے ۱۳۵ کلومیٹر شمال میں "مدینہ سالم" تعمیر کرایا تاکہ سرحدوں کا دفاع مضبوط ہو۔ [4] ۳۴۴ھ میں اس نے ملک کے جنوب مشرق میں ساحل بحیرۂ روم پر "المریہ" تعمیر کرایا جو بحری فوج کی چھاؤنی اور ایک عظیم تجارتی بندرگاہ ثابت ہوا۔ [5]

مدینۃ الزہراء:

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کی تعمیراتی دلچسپیوں کا سب سے بڑا محور "مدینۃ الزہراء" تھا۔ مدینۃ الزہراء قرطبہ سے پانچ میل شمال مغرب میں ایک چھوٹا مگر جنت نظیر شہر تھا، اس کی ابتداء ایک شاندار محل سے ہوئی تھی بعد میں اس کے ارد گرد خوبصورت عمارتوں کی مسلسل تعمیر نے اسے ایک شہر کی شکل دے دی۔

"الزہراء" کی تعمیر کے سبب کے بارے میں علامہ محی الدین بن العربی رحمہ اللہ نے "المسامرات" میں قرطبہ کے ایک بوڑھے کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کی ایک چہیتی باندی کا انتقال ہو گیا، اس نے ترکے میں بہت دولت چھوڑی تھی۔ اب عبدالرحمٰن اس کے آقا ہونے کی حیثیت سے اس مال کا حقدار تھا۔ اس نے حکم دیا کہ اس دولت کے بدلے مسلمان قیدیوں کو آزاد کرایا جائے۔ سرکاری اہلکاروں نے خبر دی کہ آس پاس کسی ملک میں کوئی مسلمان قیدی موجود نہیں ہے۔ اس پر خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

اسی اثناء میں خلیفہ کی ایک اور منظورِ نظر باندی "الزہراء" نے خواہش ظاہر کی کہ اس رقم سے اس کے نام سے موسوم ایک عظیم الشان محل تعمیر کرایا جائے۔ عبدالرحمٰن الناصر ویسے ہی تعمیرات کا شوقین تھا۔ فوراً آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ قرطبہ کے شمال میں جبل العروس کے دامن میں اس محل کی تعمیر شروع ہوئی۔ [6]

---

(1) ابن عذاری نے وزراء و امراء اور سرکاری ملازمین کو مستثنیٰ کر کے صرف عام شہریوں کے مکانات ایک لاکھ تیرہ ہزار بتائے تھے جبکہ تاہم سدیو نے ان کا استثنا نہیں کیا اس لیے دو لاکھ تعداد بتائی۔

ملحوظہ: قرطبہ کے مکانات، آبادی اور اسی طرح مساجد، حمامات وغیرہ کی تعداد میں متعدد اقوال ہیں۔ مثلاً آبادی کے متعلق پانچ لاکھ کا قول بھی ہے اور بیس لاکھ کا بھی۔ مگر درحقیقت یہ سب اندازے ہیں۔ بعض نے کم از کم کا تخمینہ لگایا اور بعض نے توسع کیا۔

(2) دائرة المعارف للقرن العشرين از فريد وجدى، نقله عن خلاصة تاريخ العرب للمؤرخ سديو

(3) دولة الاسلام فى الاندلس: ۱/۴۳۸ (4) البيان المغرب: ۲/۲۱۳

(5) التاريخ الاندلسى من الفتح الاسلامى الى سقوط غرناطة، لعبد الرحمن على: ص ۳۰۳ (6) نفح الطيب: ۱/۵۲۳

تعمیراتی کام ۳۲۵ھ (۹۳۷ء) میں شروع ہوا تھا۔ اس میں شاہی محل کے ساتھ ساتھ شہزادوں، شاہی بیگمات، خلیفہ کے قریبی اعزہ واقارب، خادموں اور محافظ سپاہیوں کے لیے بھی محلات اور مکانات تعمیر کیے گئے تھے۔

"قصر الزہراء" کی لمبائی چار میل اور چوڑائی تین میل سے کم نہ تھی۔ اس میں پندرہ ہزار بلند و بالا دروازے اور چار ہزار تین سو سولہ برج اور ستون تھے ان کی تعمیر پر کم از کم ایک کروڑ پچاس لاکھ دینار (موجودہ حساب سے تقریباً ۴ ارب ۳۵ کروڑ ڈالر) خرچ ہوئے۔ دس ہزار مزدوروں اور معماروں نے مسلسل کام کر کے ۲۵ برس میں اسے تیار کیا۔ اوسطاً روزانہ چھ ہزار پتھر تراش کر تعمیر میں استعمال کیے جاتے تھے۔

الزہراء کی تعمیر کے لیے سنگ مرمر کی بہت بڑی مقدار استعمال کی گئی تھی۔ یہ سنگ مرمر افریقہ سے منگوایا گیا تھا۔ فرانس اور قسطنطینیہ کے بادشاہوں نے تحفے میں کچھ ستون بھیجے تھے جنہیں ٹکڑوں کی شکل میں منتقل کر کے محل میں لگا دیا گیا۔ محل کے سبزہ زار کی سجاوٹ کے لیے قسطنطینیہ سے ایک فوارہ منگوایا گیا تھا جو بالکل سونے کا معلوم ہوتا تھا۔ شام سے بھی ایک بے مثال فوارہ منگوایا گیا تھا جو سبز رنگ کا اور نہایت خوبصورت تھا۔

"الزہراء" کا سب سے خاص حصہ قصر الخلفاء تھا۔ اس کی چھت سونے کی تھی۔ سنگ مرمر اتنا دیدہ زیب اور نفیس تھا کہ آئینے کی طرح چمکتا تھا۔ بیرونی دیواروں پر سونے چاندی کا کام تھا۔

قصر الخلفاء کے وسط میں ایک عجیب و غریب فوارہ تھا، اس کے بالائی حصے پر شاہِ یونان کا بھیجا ہوا قیمتی موتی نصب تھا، اس کے نیچے ایک بڑا سا فوارہ نما تھال تھا جس میں پارہ بھرا رہتا تھا۔ دیواروں پر ہاتھی دانت کے فریموں میں جڑے آئینے آویزاں تھے۔ جب سورج کی روشنی قصر الخلفاء کے دروازوں سے گزر کر ان آئینوں پر پڑتی تو پورا دربار جگمگا اٹھتا اور آئینوں کی چمک سے منعکس ہونے والی شعاعوں کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کرنے لگتی۔ اگر کبھی ہوا کے جھونکوں سے تھال میں موجود پارے میں لہریں پیدا ہوتیں تو آئینوں میں اس کے انعکاس کی وجہ سے یوں محسوس ہوتا جیسے پورا محل لرز رہا ہے۔ غیر ملکی سفیر قصر الخلفاء میں حاضر ہوتے تو ان کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں اور اگر اس موقع پر پارے کو حرکت دے دی جاتی تو مہمانوں کے ہوش اڑ جاتے تھے۔ انہیں گمان ہوتا تھا کہ زلزلہ آ گیا ہے۔

خلیفہ عبدالرحمن الناصر نے الزہراء کے انتظامات کے لیے ایک مستقل محکمہ قائم کیا تھا جس میں تیرہ ہزار سات سو پچاس ملازم اور تیرہ ہزار تین سو بیاسی غلام کام کرتے تھے۔ خواتین کی خدمات کے لیے چھ ہزار تین سو چودہ کنیزیں مقرر تھیں۔ اس وسیع و عریض دلکش تفریح گاہ میں سینکڑوں حوض تھے جن میں رنگ برنگی مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں۔ ان مچھلیوں کی خوراک کے طور پر روزانہ بارہ ہزار روٹیاں حوضوں میں ڈالی جاتی تھیں۔ باغات میں طرح طرح کے خوش آواز اور خوش نما پالتو پرندے فضا میں اڑتے اور شاخوں پر پھدکتے نظر آتے تھے۔ الزہراء کے مکینوں کو روزانہ بکری اور گائے کا تیرہ ہزار سیر گوشت فراہم کیا جاتا تھا۔ مرغیوں، مچھلیوں، مرغابیوں اور تیتروں کا گوشت اس کے علاوہ تھا۔

خلیفہ عبدالرحمن الناصر نے الزہراء میں ایک خوبصورت مسجد بھی بنوائی تھی جسے "مسجد الزہراء" کہا جاتا تھا، اس کی

بنیادیں اتنی گہری کھدوائی گئی تھیں کہ پانی نکل آیا تھا۔ مسجد کی تعمیر میں تین سو انجینئر، دو سو بڑھئی اور پانچ سو مزدور شریک ہوئے تھے۔ مدینۃ الزہراء میں آب رسانی کے لئے قرطبہ کے پہاڑوں سے صاف وشفاف شیریں پانی کی ایک نہر نکالی گئی تھی، پانی کے بہاؤ کے لئے جیومیٹری اور ریاضی کے اصولوں کے مطابق ایسے طریقے اختیار کیے گئے تھے کہ پانی پختہ نالیوں میں بہتا ہوا محلات کے ہر بلند و پست حصے تک پہنچ جاتا تھا۔[1]

قاضی منذر بن سعید رحمہ اللہ کی نصیحت:

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے الزہراء کو جس شان وشوکت کے ساتھ تعمیر کرایا تھا اسے ہم شوق کی وارفتگی کا نام دے سکتے ہیں۔ قرطبہ کے متبحر عالم قاضی منذر بن سعید رحمہ اللہ الناصر کے تعمیرات میں اس قدر انہماک کو اسراف اور فضول خرچی میں شمار کرتے تھے اور اسے اس پر ٹوکتے رہتے تھے۔ آخری سالوں میں خلیفہ نے قرطبہ کو چھوڑ کر الزہراء ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ الزہراء کی تعریف سن کر وہ بہت خوش ہوتا تھا اور امید کرتا تھا کہ ان کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ ایک روز اس کے درباری ابوعثمان بن ادریس نے قصر الزہراء میں اسے یہ اشعار سنائے:

سَيَشْهَدُ مَا اَبْقَيْتَ اَنَّكَ لَمْ تَكُنْ

مُضِيعًا وَقَدْ مَكَّنْتَ لِلدِّيْنِ وَالدُّنْيَا

"آپ کی چھوڑی ہوئی عمارتیں گواہی دیں گی کہ آپ نے کچھ ضائع نہیں کیا۔ دین و دنیا دونوں کو آباد کیا۔"

فَبِالْجَامِعِ الْمَعْمُوْرِ لِلْعِلْمِ وَالتُّقٰى

وَبِالزَّهْرَةِ الزَّهْرَاءِ لِلْمُلْكِ وَالْعُلْيَا

"آپ نے جامع مسجد سے علم اور پرہیزگاری کو اور حسین الزہراء سے حکومت اور شوکت کو ترقی دی ہے۔"

جامع مدینۃ الزہراء کے امام وخطیب قاضی منذر بن سعید رحمہ اللہ پاس بیٹھے تھے، انہوں نے فی البدیہہ کہا:

يَا بَانِيَ الزَّهْرَاءِ مُسْتَغْرِقًا .... اَوْقَاتَهُ فِيْهَا اَمَا تَمْهَلُ

"اے الزہراء کے بانی! آپ سارا وقت اس کی دیکھ بھال میں خرچ کرتے ہیں، کیا آپ دم نہ لیں گے؟"

لِلّٰهِ مَا اَحْسَنَهَا رَوْنَقًا .... لَوْ لَمْ تَكُنْ زَهْرَتُهَا تَذْبُلُ

"واہ واہ! اس کی دلکشی کے کیا کہنے بشرطیکہ اس کا زہرہ (پھول) نہ مرجھائے۔"[2]

الزہراء میں خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کی مجلس جس بالاخانے میں ہوتی تھی، وہ سونے اور چاندی سے ملمع شدہ اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ اس کی چھت زعفرانی تھی جس پر سفید چمکدار رنگ کے ایسے نقش ونگار تھے کہ نگاہ خیرہ ہو جاتی تھی۔

---

① نفح الطیب: ۱/ ۲۳۵، ۲۳۹، ۲۴۷، ۱۹۳، ۱۶۵، ۲۶۵، ۲۶۹، ۵۲۳ تا ۵۲۸، ۵۶۷ تا ۵۷۰؛ تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۱۸۳؛ صورۃ الارض لابن حوقل: ۱۱۱، ۱۱۲؛ البیان المغرب: ۲/ ۲۳۱؛ صفۃ جزیرۃ الاندلس: ۱/ ۹۵؛ المسالک والممالک لابی عبید البکری: ۲/ ۹۰۰ تا ۹۰۲

② نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب للمقری التلمسانی: ۱/ ۵۶۵، ۵۶۶

ایک بار عبدالرحمن ناصر نے اسی بالاخانے میں بیٹھے بیٹھے اپنے ارکان سلطنت سے پوچھا:

''کیا تم نے کسی اور حکمران کے بارے میں سنا ہے کہ اس نے ایسی جگہ بنوائی ہو۔''

بعض خوشامدیوں نے فوراً کہا: ''امیر المومنین اللہ کی قسم! آپ کی شان ہی الگ ہے۔''

اتنے میں قاضی منذر بن سعید رحمہ اللہ تشریف لے آئے، یہ سوال و جواب سن کر انہوں نے سر جھکا لیا اور زار و قطار رونے لگے۔ پھر سر اٹھا کر بولے: ''امیر المومنین! مجھے یہ توقع نہ تھی کہ شیطان ملعون آپ کو یہاں تک پہنچا دے گا اور نہ ہی یہ گمان تھا کہ آپ اللہ کے عطا کردہ انعامات اور اس کی دی ہوئی فضیلت کے باوجود اپنی لگام اس حد تک شیطان کے حوالے کر دیں گے کہ وہ آپ کو کفار کی جگہ پر پہنچا دے گا۔''

عبدالرحمن الناصر نے چونک کر کہا: ''سوچ کر بولیے۔ کیا شیطان مجھے کفار کی جگہ پر پہنچا سکتا ہے؟''

قاضی صاحب نے فرمایا: ''جی ہاں! کیا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد آپ نے نہیں سنا:

وَلَوْلَآ اَنْ یَّکُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّکْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَیْهَا یَظْهَرُوْنَ ۝

(اگر یہ امکان نہ ہوتا کہ تمام لوگ ایک ہی ملت بن جائیں گے (یعنی کفار کا عیش و آرام دیکھ کر سب لوگ کافر ہو جائیں گے) تو ہم رحمن کا انکار کرنے والوں کے لئے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں بھی (چاندی کی) جن پر وہ چڑھتے۔)[1]

خلیفہ نے سر جھکا کر یہ آیات سنیں۔ کچھ دیر چپ چاپ رہا، پھر اتنا رویا کہ ڈاڑھی بھیگ گئی۔ آخر سر اٹھا کر قاضی صاحب کو دیکھا اور بولے: ''اللہ آپ کو بہترین جزائے خیر دے اور دنیا میں آپ جیسی ہستیاں مزید پیدا ہوں۔ اللہ کی قسم! آپ نے جو کہا وہ بالکل درست ہے۔''

یہ کہہ کر استغفار کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا اور اس قبے کو گرا کر گارے مٹی سے تعمیر کرنے کا حکم دیا۔[2]

قحط سالی میں عبدالرحمن الناصر کی دعا:

ایک بار اندلس میں شدید قحط پڑا۔ کھیت ویران اور اناج کے گودام خالی ہو گئے۔ عبدالرحمن الناصر کی تاکید پر قاضی منذر بن سعید رحمہ اللہ نے نماز استسقاء کا اعلان کیا۔ عوام و خواص میدان میں جمع ہوئے۔ مگر عبدالرحمن الناصر دکھائی نہ دیا تو قاضی صاحب نے کہا: ''کاش مجھے معلوم ہو سکتا کہ وہ اس وقت کیا کر رہے ہیں؟''

ایک افسر نے عرض کیا: ''حضرت! وہ تو آج کل میلے کپڑے پہنے اپنے کمرے میں روتے رہتے ہیں، سر اور ڈاڑھی کے بالوں میں خاک ڈالتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں یا اللہ! تو میرے گناہوں کے سبب بے چارے عوام پر سختی نہ فرما۔''

---

[1] سورۃ الزخرف، آیت: ۳۳ [2] صفۃ جزیرۃ الاندلس از علامہ حمیری: ۱/۱۳۱؛ نفح الطیب: ۱/۵۷۳، ۵۷۵

قاضی صاحب کا چہرہ کھل اٹھا۔ فرمایا: ''جب زمین کا حاکم عاجزی کرے تو آسمان کا حکمران ضرور رحم کرتا ہے۔ تم بارش کی خوش خبری ساتھ لے جاؤ۔'' ابھی مجمع دعائے استسقاء سے فارغ ہو کر گھروں کو لوٹ ہی رہا تھا کہ گھنگھور گھٹائیں جھوم کر آئیں اور باران رحمت برسنے لگی۔ ①

جامع مسجد قرطبہ:

عبدالرحمٰن الناصر کو تعمیرات کا بڑا ذوق تھا۔ اس نے جامع مسجد قرطبہ کو جس کی بنیاد اس کے جد امجد عبدالرحمٰن الداخل نے رکھی تھی، حسن و دلکشی کا ایک نیا رنگ دیا اور اس کی توسیع اور آرائش کے لئے اس نے اپنے تمام پیش رووں سے بڑھ کر مال خرچ کیا۔ اس کے زمانے میں تعمیر نو اور توسیع کے بعد مسجد کی لمبائی ۵۰۰ فٹ تک پہنچ گئی۔ مسجد کا کل رقبہ ۳۳ ہزار مربع ذراع (تقریباً ۵۰ ہزار فٹ) کے لگ بھگ تھا۔ اس وقت رقبے کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ مسجد کے بڑے دروازے کے اندر داخل ہونے کے بعد باغیچوں اور حوضوں کے درمیان سے گزرنے والی روش پر چل کر لوگ مسجد کے مسقف (چھتے ہوئے) حصے میں داخل ہو جاتے تھے۔ یہ مسقف حصہ سنگ مرمر کے ایک ہزار ۴۱۷ ستونوں پر مشتمل تھا۔ ستونوں پر نہایت دیدہ زیب اور خوش نما محرابیں کڑی در کڑی قائم کر کے ان پر عظیم چھت تعمیر کی گئی تھی۔ ستونوں پر گلکاری کا ایسا عمدہ کام کیا گیا تھا کہ جو دیکھتا دنگ رہ جاتا۔ محرابوں کی بلندی اور چمک دمک بھی قابل دید تھی۔ ان کی تعداد سال کے دنوں کے حساب سے ۳۶۰ تھی۔ ان کے وسط میں چھوٹے چھوٹے طاق بنے ہوئے تھے۔ مشہور ہے کہ سورج اپنے سال بھر کی گردش میں روزانہ ایک طاق کے عین اوپر سے گزرتا تھا اور روزانہ ایک محراب کے طاق سے سورج کی شعاعیں خط مستقیم میں اندر داخل ہوتی تھیں۔

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے مسجد کے قدیم مینار منہدم کرا کے ایک نیا مینار بنوایا جو ۱۰۸ فٹ اونچا تھا۔ مینار پر چڑھنے اور اترنے کے لئے دو علیحدہ علیحدہ زینے بنائے گئے، ہر زینے میں ۱۰۷ سیڑھیاں تھیں۔ مؤذن کے مینار کی بلندی تقریباً ۸۲ فٹ تھی جس میں تین بڑے روشن دان تھے جو ''انار'' کی شکل کے دکھائی دیتے تھے۔

رات کے وقت مسجد میں روشنی کے لئے ۲۸۰ فانوس جلائے جاتے تھے جن میں سے تین بڑے فانوس چاندی کے تھے، بڑے فانوس میں ایک ہزار ۴۸۰ چراغ روشن ہوتے تھے، مجموعی طور پر فانوسوں میں سات ہزار ۴۲۵ چراغ جلائے جاتے تھے۔ روشنی کے اس بے مثال انتظام کی وجہ سے مسجد میں رات کو بھی دن کا گمان ہوتا تھا۔ مسجد میں جلنے والی شمعوں کے لئے ہر سال ساڑھے تین من موم اور ساڑھے ۳۴ سیر سوت درکار ہوتا۔ چراغوں میں سالانہ ۳۱۴ من تیل استعمال ہوتا، ہر جمعہ کے دن مسجد کو عود اور عنبر کی دھونی دی جاتی تھی۔

میناروں کے اوپر چاندی کے لٹو بنے ہوئے تھے جب سورج کی روشنی میناروں پر پڑتی تو ان کی جگمگاہٹ میلوں دور تک نظر آتی۔ مسجد کی مرکزی محراب جس میں امام مسجد کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے تھے، دلفریبی میں اپنی مثال آپ تھی۔

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۱/۳۷۵

اسے عجائبِ زمانہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ دور دور سے سیاح صرف اسے دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔

محراب میں خطیب اور امام کے داخل ہونے کے لیے علیحدہ دروازہ تھا۔ منبر خالص ہاتھی دانت کا بنا ہوا تھا، اس کی سجاوٹ کے لیے ۳۶ ہزار رنگ اور درجنوں قسم کی قیمتی لکڑیاں استعمال کی گئی تھیں۔ اس کو دنیا کے مانے ہوئے کاریگروں نے نہایت عرق ریزی اور نفاست سے سات برس میں تیار کیا تھا، اس کی تعمیر پر ۳۷ ہزار ۵۰ دینار خرچ ہوئے (جو آج کل محتاط اندازے کے مطابق ۱۲ کروڑ ۱۲ لاکھ ۶۲ ہزار ۵۰۰ روپے کے برابر ہیں) مسجد کی صفائی اور دیکھ بھال کے لیے ۳۰۰ ملازمین رکھے گئے تھے۔ امام مسجد کے لیے علیحدہ بہترین حجرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ حفاظتی نقطۂ نظر سے سربراہِ مملکت کے لیے پہلی صف میں علیحدہ جنگلے والا احاطہ بنوایا گیا تھا۔ ①

جامع قرطبہ کی حقیقی دلکشی اور رعنائی کو آج دیکھنا ممکن نہیں کیوں کہ نصرانیوں نے اندلس پر قبضے کے بعد مسجد کی خوبصورتی کو بڑی بے رحمی سے پامال کر دیا۔ جامع مسجد قرطبہ کی موجودہ حالت یہ ہے کہ اس میں داخلے کے بعد دائیں بائیں دونوں جانب دیواروں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کئی کلیسا بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مسجد کے بیچوں بیچ بڑا کلیسا ہے اس کے ساتھ ہی موسیقاروں کی نشست گاہ ہے۔ محراب سے ذرا دور وہ کلیسا ہے جو سب سے پہلے اس مسجد میں بنایا گیا تھا جبکہ محراب کے ساتھ بھی ایک کلیسا ہے جسے کارڈینل کا کلیسا کہا جاتا ہے۔ اندلس کے معماروں نے برسوں کی محنت سے جس عبادت گاہ کو محیر العقول زیبائش بخشی تھی، نصرانیوں نے اپنے دورِ حکومت میں اسے بری طرح مسخ کر ڈالا۔ وہ حسن آرا محراب جس میں بڑے بڑے ائمہ، مشائخ، فقہاء اور سلاطین سربسجود رہا کرتے تھے، پلستر سے ڈھانپ دی گئی۔ آج اس کے دائیں بائیں صبح و شام مشرکانہ رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ یہ دلخراش منظر دیکھ کر کوئی مسلمان اپنے دل پر صدمے کی چوٹ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم یورپ کے سفر کے دوران اسپین گئے تو قرطبہ کی جامع مسجد دیکھنے کا شوق انہیں کشاں کشاں اس محراب کے سامنے لے آیا۔ حفاظتی اہلکاروں کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے نظر بچا کر دو رکعت نماز پڑھی اور مسجد کے اداس در و دیوار پر نگاہ ڈال کر یوں گویا ہوئے:

یہی ہے میری نماز، یہی ہے میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

اپنی مشہور نظم "مسجد قرطبہ" میں وہ کہتے ہیں:

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب للمقری التلمسانی: ۱/ ۵۳۹ تا ۵۵۲، ۵۵۸ تا ۵۶۶؛ المسالک والممالک للبکری: ۲/ ۹۰۱؛ نزہۃ المشتاق: ۲/ ۵۷۵ تا ۵۷۹؛ خریدۃ العجائب و فریدۃ الغرائب: ۱/ ۹۱، ۹۲؛ الروض المعطار فی خبر الاقطار: ۱/ ۹۸؛ البیان المغرب: ۲/ ۲۲۹ تا ۲۳۱

عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود
تیری بنا پائیدار، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل
تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منار بلند جلوہ گہِ جبرئیل
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

عبدالرحمٰن الناصر کی بیماری اور وفات:

محرم ۳۵۰ھ میں خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر سرد ہوا لگنے سے بیمار ہوگیا۔ اس وقت اس کی عمر ستر سال تھی اور اس کی حکومت کو پچاس سال ہو چکے تھے۔ بیماری کا یہ سلسلہ طویل ہوگیا اور آخر کار ۲ رمضان ۳۵۰ھ (۱۴ اکتوبر ۹۶۱ء) کو اس نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔[1]

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر بلاشبہ اپنے دور کا عظیم اسلامی حکمران تھا۔ چوں کہ اس زمانے میں بغداد کی خلافت عباسیہ بہت کمزور پڑ چکی تھی اس لئے مغرب کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ عباسی خلیفہ کی بجائے انہیں خلیفہ تسلیم کرتا تھا۔ عبدالرحمٰن الناصر نے بھی خلیفہ کا لقب اسی بناء پر اختیار کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں عباسی خلیفہ کی بنسبت عالمی سیاست میں الناصر کا وزن زیادہ تھا۔ افریقہ سے لے کر یورپ تک کے غیر مسلم حکمران اسے خراج دیتے تھے۔ اس کا دور اسلامی اندلس کا بہترین دور تھا۔ وہ مخالفین کے مقابلے میں ہمیشہ کامیاب رہا اور اس کا ستارۂ اقبال اس کے دورِ حکومت کی ابتداء سے اختتام تک بلندی پر ہی رہا مگر اس کے باوجود وہ کبھی آرام سے نہیں بیٹھا، تعطیلات یا تفریحات پر نہیں گیا بلکہ مسلسل جدوجہد میں مصروف رہا۔ کبھی جہاد، کبھی سیاست، کبھی مقامی شورشوں کی سرکوبی، کبھی فریادیوں کی شنوائی اور کبھی تعمیراتی کاموں میں مشغول رہا۔

اس کی وفات کے بعد اس کے ذاتی کاغذات سے ایک تحریر برآمد ہوئی جس میں مکمل حساب لگا کر اس نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اپنے دورِ حکومت کے پچاس برسوں میں اسے آرام وسکون اور فراغت کے صرف چودہ دن نصیب ہوئے۔[2]

بلاشبہ ان عظیم مسلم حکمرانوں کی جہاد وسیاست، عدل وانصاف، عوامی فلاح وبہبود اور ترقیاتی کاموں میں مسلسل جدوجہد اور انتھک کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ ان کا نام آج بھی تاریخ میں عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔

◆◆◆

① البیان المغرب: ۲/۲۳۲　② البیان المغرب: ۲/۲۳۲

الحکم ثانی مستنصر باللہ

۳۵۰ھ-۳۶۶ھ
(۹۶۱ء تا ۹۷۶ء)

عبدالرحمٰن الناصر نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں شدید بیماری کے باعث امور سلطنت کی زیادہ ذمہ داریاں اپنے ولی عہد شہزادہ حکم کے سپرد کردی تھیں۔ جب الناصر وفات پا گیا تو ۵ رمضان المبارک ۳۵۰ھ (۱۹، اکتوبر ۹۶۱ء) کو شہزادہ حکم بن عبدالرحمٰن نے اندلس کے نئے خلیفہ کی حیثیت سے قصر الزہراء میں مسند حکومت سنبھالی، اس وقت اس کی عمر اڑتالیس سال تھی۔ اسے تاریخ میں حکم ثانی مستنصر باللہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے پندرہ سال سات ماہ تک حکومت کی۔ وہ اندلس کا پہلا حکمران تھا جس نے عباسی خلفاء کی طرح لفظ اللہ کو ملا کر لقب اختیار کیا۔[1]

علمی خدمات:

خلیفہ حکم ثانی کو مسلم حکمرانوں میں اس حیثیت سے نمایاں امتیاز حاصل ہے کہ وہ ایک جید عالم دین تھا۔ اس کے بچپن اور جوانی کے تمام ایام علوم وفنون کی تحصیل میں گزرے۔ اس کا والد عبدالرحمٰن الناصر بھی بڑا علم دوست اور علماء کا قدردان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ علم سب سے بڑا شرف ہے، اس لئے اس نے اپنے بیٹے کو علم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لئے اندلس کے بڑے بڑے علماء کی خدمات حاصل کیں۔

شباب کی حدود میں قدم رکھتے رکھتے حکم ثانی تجوید، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، صرف ونحو، لغت، بلاغت، فلسفہ، ریاضی، تاریخ، ہیئت، ادب اور دیگر مروجہ علوم وفنون میں کمال حاصل کر چکا تھا۔ وہ قادر الکلام شاعر اور صاحب طرز ادیب تھا۔ نظم ونثر میں اس جیسی یکساں مہارت بہت کم افراد کو نصیب ہوئی۔

اس کا حافظہ بے مثال تھا، جو پڑھتا ازبر ہو جاتا۔ مطالعہ نہایت وسیع تھا، نوجوانی ہی میں ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ عبدالرحمٰن الناصر کے کتب خانوں میں موجود تمام کتابیں شروع سے آخر تک پڑھ چکا تھا اور ان میں بہت سی کتابوں پر اپنے ہاتھ سے مفید حواشی تحریر کئے تھے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ حکومت سنبھالنے کے بعد اس کی علمی مصروفیت جاری نہ رہ سکے گی مگر اس نے شاہانہ اختیارات

---
[1] البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۳۳

سے کام لیتے ہوئے علم کی مزید خدمت کی۔ علماء کی بھرپور سرپرستی کی۔ اس کی علم دوستی کا چرچا سن کر دنیا کے کونے کونے سے جلیل القدر علماء کا ایک جم غفیر قرطبہ میں جمع ہوگیا۔ خلیفہ حکم ثانی ان کی تمام ضروریات کی کفالت کرتے رہے تاکہ وہ فکرِ معاش سے کی بجائے علمی خدمات میں مشغول رہیں۔

خلیفہ حکم ثانی نے علماء کی ایک جماعت صرف اس کام کے لئے مقرر کردی کہ وہ غیر ملکی زبانوں کی مفید کتب کے تراجم تحریر کریں۔ اس طرح اسلامی دنیا کے کتب خانوں میں سینکڑوں نئی کتابوں کا اضافہ ہوا۔

خلیفہ حکم ثانی کو نئی نئی کتابیں پڑھنے اور انہیں قرطبہ کے کتب خانے میں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، اس مقصد کے لئے اس نے اپنے خصوصی کارکن دنیا کے تمام علمی مراکز میں پھیلا دیے تھے، یہ کارکن مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، قاہرہ، دمشق، قسطنطنیہ، بغداد، کوفہ اور بصرہ سمیت ہر اس شہر میں جہاں علم کی گرم بازاری تھی، موجود رہتے اور نادر و نایاب کتابیں تلاش کر کر کے قرطبہ بھیجا کرتے۔ کسی کتاب کے حصول کے لئے یہ کارکن بڑی سے بڑی تکلیف بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔ ان خدمات کا ان کو نہایت معقول وظیفہ اور مزید انعام واکرام بھی ملتا تھا۔ اگر کوئی کتاب منہ مانگے داموں فروخت ہوتی تو بھی حکم ثانی کی ہدایت تھی کہ اسے خرید لیا جائے اور قیمت کی پروانہ کی جائے۔ بسا اوقات ایک کتاب کے لئے اسے اشرفیوں کے کئی توڑے خرچ کرنا پڑتے مگر وہ اسے سستا سودا سمجھتا۔

ہر شہر میں اس کے مقرر کردہ خوش نویس بھی موجود تھے۔ جو کتاب زیادہ خستہ ہوتی یا اس کا مالک اسے فروخت کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تو یہ خوش نویس اس کی نقل بنا کر حکم ثانی کی خدمت میں بھیج دیتے۔ کوئی شخص دربار میں باریابی اور عزت افزائی کا خواہش مند ہوتا تو جستجو کر کے کوئی نادر کتاب ڈھونڈ نکالتا اور اسے خدمت میں ہدیہ کر کے شاہی عنایات کا مستحق بن جاتا۔

خلیفہ حکم ثانی کے زمانے میں اندلس میں علمی ذوق اتنا عام ہوگیا تھا کہ مورخین کے بقول "ہر گھر میں ایک کتب خانہ موجود تھا" علاوہ ازیں اندلس کے ہر بڑے شہر میں ایک سرکاری کتب خانہ بھی بنایا گیا تھا جہاں کتابوں کے شوقین مطالعے میں غرق نظر آتے تھے۔ حکم ثانی نے اندلس میں جگہ جگہ نئی جامعات قائم کیں، چھوٹے چھوٹے دیہاتوں اور بستیوں میں نئے مکاتب اور مدارس کھلوائے۔ تمام جامعات اور مدارس و مکاتب کے جملہ اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی۔ بیرون ممالک سے آنے والے طلبہ کا اتنا اعزاز کیا جاتا تھا کہ جب تک وہ اندلس میں رہتے انہیں حکم ثانی کے ذاتی مہمان کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔

اسی دور میں مشہور ادیب و مورخ ابوالفرج اصفہانی نے شعراء، ادباء، اہل علم و فن، سلاطین اور امراء کے حالات پر ایک عظیم کتاب لکھی جو "الاغانی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ حکم ثانی کو ابوالفرج اصفہانی کی اس تالیف میں مشغولیت کا علم ہوا تو پیشگی ایک ہزار اشرفیاں ارسال کر کے درخواست کی کہ کتاب مکمل ہونے پر پہلا نسخہ قرطبہ روانہ کر دیا جائے۔ ابوالفرج نے کتاب ایک مدحیہ قصیدے سمیت حکم ثانی کو بھجوا دی جس پر حکم ثانی نے مزید ایک ہزار اشرفیاں ہدیہ کیں۔ اہل قلم کی یہ عزت افزائی دیکھ کر اس دور کے ممتاز مصنفین کا معمول بن گیا کہ وہ اپنی تصانیف کا پہلا نسخہ الحکم

کی خدمت میں روانہ کر دیا کرتے تھے۔ [1]

اہل علم کی قدر دانی:

خلیفہ حکم ثانی اہل علم کی کتنی قدر کرتا تھا اور ان سے کس قدر تواضع سے پیش آتا تھا، اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرطبہ کی ایک مسجد میں فقیہ ابو ابراہیم درس دے رہے تھے، اس اثناء میں خلیفہ کے کارندے نے آکر انہیں کہا: "خلیفہ فوراً آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

فقیہ نے جواب دیا: "ان سے کہو میں اللہ کے کام میں مشغول ہوں جب تک پورا نہ کرلوں حاضری سے قاصر ہوں۔" سرکاری کارندہ گھبرایا ہوا واپس گیا اور فقیہ کا جواب نقل کر دیا۔

حکم ثانی نے بالکل برا نہ منایا بلکہ کارندے کو کہا: "فقیہ صاحب کو جا کر بتاؤ کہ ہم ان کے جواب سے بہت خوش ہوئے ہیں، جب وہ اللہ کا کام کر چکیں تو تشریف لے آئیں۔ ہم منتظر ہیں۔"

سرکاری کارندے نے فقیہ ابو ابراہیم کو یہ پیغام پہنچایا تو انہوں نے کہا: "میں بڑھاپے کی وجہ سے نہ گھوڑے پر سوار ہو سکتا ہوں نہ پیدل زیادہ دور تک چل سکتا ہوں۔ اگر خلیفہ باب الصناعہ جو یہاں سے قریب تر ہے، کھلوا دیں تو میں سہولت سے حاضر ہو جاؤں گا۔ بصورت دیگر مجھے باب السدہ سے جانا پڑے گا جس کا راستہ بہت طویل ہے۔"

یہ جواب دے کر فقیہ ابو ابراہیم پھر درس میں مشغول ہو گئے۔

باب الصناعہ جسے کھلوانے کا فقیہ نے مطالبہ کیا تھا، خصوصی مواقع کے سوا ہمیشہ بند رکھا جاتا تھا مگر خلیفہ حکم ثانی نے فوراً اسے کھولنے کا حکم دیا اور چند امیروں اور وزیروں کو فقیہ کے استقبال کے لئے وہاں بھجوا دیا۔ فقیہ درس سے فارغ ہو کر آئے تو امراء نے بڑھ کر استقبال کیا اور انہیں خلیفہ کے پاس پہنچا دیا۔ خلیفہ نے ان سے ملاقات کے بعد انہیں عزت و اکرام کے ساتھ اسی دروازے سے واپس بھجوا دیا۔ [2]

علماء و فقہاء کا قرطبہ کی طرف رجوع:

حکم ثانی کے علمی ذوق نے اس دور کے بڑے بڑے عالی مرتبت علماء کو ان کا گرویدہ بنا کر قرطبہ سے وابستہ کر دیا تھا۔ بغداد کے مشہور ادیب و شاعر ابو علی القالی العراقی (۲۸۸ھ-۳۵۶ھ) جن کی کتاب "الامالی" مشہور و معروف ہے، حکم ثانی کے والد کے عہد حکومت میں اندلس آئے اور حکم ثانی کے دور میں بھی قرطبہ میں ٹھہرے رہے اور یہیں وفات پائی۔ [3]

---

① نفح الطیب: ۱/ ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۹۳، ۳۹۵، سیر اعلام النبلاء: ۱۶/ ۲۳۰ تا ۲۳۲، ط الرسالۃ؛ تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۱۸۷، ۱۸۸؛ ط دار الفکر؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۵۰۳ تا ۵۰۷۔

نوٹ: ابو الفرج اصفہانی کی یہ تالیف بلاشبہ ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہے مگر تاریخی لحاظ سے اس کی اکثر روایات معیار سے ساقط ہیں تاہم مستشرقین اور اہل باطل ان روایات سے دینیات حتیٰ کہ اعتقادی مسائل میں بھی استدلال کرتے ہیں جو اصول سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

② نفح الطیب: ۱/ ۳۷۸ ③ الاعلام للزرکلی: ۱/ ۳۲۱

اشعر البغدادی اس دور کے مشہور کاتب اور خطاط تھے، عراق میں حکم ثانی کی علم نوازی کا شہرہ سنا اور قرطبہ چلے آئے اور تادم آخر یہیں خدمات انجام دیتے رہے۔

قاہرہ کے علامہ اسماعیل بن عبدالرحمن القرشی رحمہ اللہ ممتاز عالم دین اور بلند پایہ انشاء پرداز تھے، قاہرہ میں بنوعبید کے ظلم وستم سے تنگ تھے، الحکم ثانی کی علم نوازی کی شہرت سنی تو ادھر کا رخ کیا اور اشبیلیہ میں جا ٹھہرے، حکم ثانی کو معلوم ہوا کہ ایسے جید عالم دین اندلس میں تشریف لائے ہیں تو پاس بلوا کر مشیر خاص بنالیا۔[1]

ابوبکر الازرق (۳۱۹ھ۔۳۸۵ھ) مصر میں تھے، وہاں حالات ناساز گار ہوئے تو تیونس چلے گئے، مگر قیروان کے عبیدیوں نے انہیں اہل سنت والجماعت کے عقائد کے اظہار کے سبب سخت تشدد کا نشانہ بنایا اور قید کردیا۔ جب رہا ہوئے تو ۳۴۹ھ میں اندلس آکر پناہ لی۔ حکم ثانی نے انہیں اپنے پاس بلایا اور ان کی علمیت اور حق پر استقامت سے متاثر ہوکر انہیں اپنا مقرب بنالیا۔[2]

یہ تو اس دور میں باہر سے اندلس آنے والے علماء کی فہرست سے ایک نمونہ تھا۔ خود اندلس کے نامی گرامی علماء کا جو حلقہ پہلے سے حکم ثانی کے اردگرد جمع تھا اس کا بھی ہر فرد آفتاب وماہتاب تھا۔ اس حلقے کے شیخ احمد بن دحیم، شیخ ثابت بن قاسم، محمد بن السلام، شیخ زکریا بن الخطاب اور علامہ قاسم ابن صبغ جیسے علماء سے خلیفہ حکم ثانی نے باقاعدہ حدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔[3]

ذاتی کتب خانہ:

خلیفہ حکم ثانی کا ذاتی کتب خانہ چھ لاکھ کے لگ بھگ کتابوں پر مشتمل تھا، اس کتب خانے میں نئی کتابوں کے مزید نسخے تیار کرنے کے لئے سینکڑوں ملازمین ہروقت مصروف کار رہتے تھے۔ کتب خانے کی عمارت ایک محل سے کم نہ تھی، اسے سنگ مرمر سے تیار کیا گیا تھا، اس میں صندل اور آبنوس کی بیش قیمت لکڑی سے تیار کردہ الماریاں قطار در قطار نظر آتی تھیں۔ الماریوں کو موضوعات کے لحاظ سے الگ الگ ترتیب دیا گیا تھا، ہر الماری پر متعلقہ موضوع کی تختی آویزاں تھی۔ کتب خانے میں شامل کی جانے والی ہر کتاب کی مضبوط اور خوبصورت جلد بندی کرائی جاتی تھی، اس مقصد کے لئے جلد سازوں کی ایک جماعت کتب خانے کے ایک حصے میں اپنے کام میں جتی نظر آتی تھی۔

اس کتب خانے کی کتابوں کی صرف فہرست ۴۴ جلدوں پر مشتمل تھی۔ جن میں کم وبیش چار لاکھ کتابوں کے کوائف درج تھے۔ اکثر کتابیں خلیفہ حکم ثانی نے پوری پوری پڑھی تھیں اور ان پر حواشی بھی لکھے تھے، صرف یہی نہیں بلکہ ہر کتاب کے پہلے صفحے پر خلیفہ حکم نے اپنے قلم سے کتاب کا نام اور مصنف کے کوائف لکھے تھے۔[4]

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۳/ ۹۹

② نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۱۲۲/۳

③ نفح الطیب: ۳۹۵/۱ ④ نفح الطیب: ۳۹۵،۳۹۳/۱

افسوس کہ اندلس کی اسلامی سلطنت ہاتھ سے گئی تو علم کے یہ گراں مایہ موتی بھی غیروں کے ہاتھ لگ گئے۔ آج یورپ اور امریکا کے کتب خانوں میں ماضی کے ان علم دوست بادشاہوں اور اسلامی دانشوروں کی لاکھوں ایسی کتابیں محفوظ ہیں جن سے عالم اسلام تا حال محروم ہے۔ اقبال مرحوم نے اسی حقیقت کے پیش نظر کہا تھا:

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

حکم ثانی کی جہادی سرگرمیاں:

حکم ثانی علمی مشاغل میں اس قدر انہماک کے باوجود محض ایک گوشہ نشین عالم نہ تھا بلکہ امور سلطنت پر پوری طرح حاوی حکمران، چوکنا سیاست دان اور معرکہ آزما سپہ سالار بھی تھا۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کے دور میں مخالفین کے مرعوب ہونے کے سبب جنگ وجدال کی زیادہ نوبت نہیں آئی مگر جب بھی ایسا موقع آیا تو حکم ثانی نے آہنی ہاتھوں سے دشمن کی گردن دبوچنے میں دیر نہیں کی۔ سب سے پہلی جنگی مہم سے اسے اس وقت سابقہ پڑا جب انہیں تخت نشین ہوئے نصف سال بھی نہ گزرا تھا۔

عبدالرحمن الناصر نے نصرانی شہزادے شانجہ کی مدد کر کے اسے اس کے سیاسی حریف اور چچازاد "اردون چہارم" کے مقابلے میں اس شرط پر "لیون" کی حکومت دلائی تھی کہ وہ کچھ سرحدی قلعے مسلمانوں کے حوالے کر دے گا مگر شانجہ نے الناصر کی وفات تک یہ عہد پورا نہیں کیا۔ حکم ثانی کی تخت نشینی پر شانجہ کو مزید شہ ملی اور وہ یہ سمجھ کر کہ قرطبہ کا نیا تاجدار محض ایک خلوت پسند عالم ہے، تمام معاہدوں سے مکر گیا۔

حکم ثانی نے یہ اطلاعات پا کر محرم ۳۵۱ھ میں تمام نائبین اور امراء کو حکم بھیجا کہ وہ اسلحہ، گھوڑے اور سامان جنگ تیار رکھیں۔ اس کے بعد انہوں نے خود لیون کی سرحد پر لشکر کشی کی اور ایک آزمائشی کامیاب حملہ کر کے واپس آگئے۔[1]

اردون چہارم کی دربار قرطبہ میں حاضری:

اردون چہارم جو اس وقت در بدر پھر رہا تھا، خلیفہ حکم ثانی اور شانجہ کے مابین کشیدگی دیکھ کر صفر ۳۵۱ھ میں دست بستہ خود قرطبہ حاضر ہوا تا کہ مسلمانوں کی حمایت سے شانجہ کو لیون سے بے دخل کر کے خود حکومت حاصل کرے۔

جب وہ شاہی محل کے قریب پہنچا تو استقبال کے لیے صف بستہ افواج کی سطوت وہیبت اور نظم وضبط کو دیکھ کر اس کے پسینے چھوٹنے لگے۔ وہ مرحوم خلیفہ عبدالرحمن الناصر کی قبر پر پہنچا اور اپنی ٹوپی اتار کر کچھ دیر ادب سے کھڑا رہا۔ جب وہ حکم ثانی کے ایوان خاص میں پہنچا تو دربار کی شان وشوکت نے اسے مبہوت کر دیا۔ اس نے نہایت عاجزی کے ساتھ خلیفہ سے سرپرستی اور اعانت کی درخواست کی۔ حکم ثانی نے سابقہ کوتاہیوں سے درگزر کرتے ہوئے اسے قبول کر لیا۔ طے پایا کہ اردون کو لیون کی حکومت دلائی جائے گی جو قرطبہ کی ہمیشہ تابع دار اور وفادار رہے گی۔

---

[1] البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۲۳۲، ۲۳۵

اُدھر شانجہ کو اردون اور حکم ثانی کے مابین صلح کا پتا چلا تو اس نے اپنے رئیسوں اور پادریوں کا ایک وفد قرطبہ بھیجا جس نے آئندہ معاہدوں کی پابندی کا یقین دلایا اور باہمی تعلقات بہتر رکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

مگر اسی دوران شانجہ کو اپنے سیاسی حریف اردون کی موت کی خبر ملی جس سے اپنا تخت بچانے کے لیے وہ قرطبہ سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ اردون کی موت سے شانجہ کو لاحق خطرات دور ہو گئے، لہٰذا اس نے فوراً پینترا بدلا اور دیگر تین نصرانی حکمرانوں: نواب قسطالیہ فرڈیننڈ، نواب نوار غرسیہ شانجہ اور نواب برسلونہ سے اتحاد کر کے قرطبہ سے جنگ کے لیے تیار ہو گیا۔[1]

ایک بار پھر جہادی سفر:

نصرانیوں کی ان بدعہدیوں کے علاج کے لیے الحکم ثانی نے تمام نصرانی ریاستوں کے خلاف بیک وقت اعلانِ جہاد کرتے ہوئے طُلَیطُلَہ میں فوج مرتب کی اور ۳۵۲ھ کے موسمِ گرما میں قسطالیہ پر چڑھائی کر کے سخت جنگ کے بعد حریف کا مضبوط ترین قلعہ "سینٹ اسٹیفن" (شنت اشتبین) سر کر لیا۔ دوسرے حملے میں شہر اثنیہ (Atienza) بھی فتح کر لیا گیا۔ دوسری اسلامی فوج سرقسطہ سے ریاست نوار پر حملہ آور ہوئی۔ تیسری فوج وشقہ سے نوار کے قلعے "بیہ" پر ٹوٹ پڑی۔ شانجہ اور اس کے اتحادیوں نے جگہ جگہ مزاحمت کی۔ یہ جنگیں وقفے وقفے سے چار سال تک جاری رہیں۔ اس دوران "قلہرہ" اور "غرماج" (Gormaz) جیسے اہم قلعے بھی فتح کر لیے گئے۔[2]

نصرانیوں کی حالت غیر ہو چکی تھی، مزید یہ کہ ان کے قائدین یکے بعد دیگرے مرتے چلے گئے۔ ۳۵۵ھ (۹۶۶ء) میں شانجہ زہر خورانی سے ہلاک ہو گیا اور اس کا کم سن لڑکا رمیر ثالث "لیون" کا وارث ہوا۔ اُدھر فرڈی ننڈ ثالث بھی مر گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا "غرسیہ فرڈی ننڈ" قسطالیہ کے تخت پر بیٹھا۔ نوار کا حاکم "غرسیہ شانجہ" بھی راہیِ عدم ہوا اور "شانجہ غرسیہ دوم" اس کا جانشین بنا۔ ان سب نے یکے بعد دیگرے الحکم سے صلح کر لی۔ ۳۶۰ھ سے ۳۶۳ھ تک ان کے وفود قرطبہ آتے رہے۔ سب نے اطاعت کا معاہدہ کیا۔ اسی دوران قیصرِ قسطنطنیہ اور شاہِ جرمنی ہوتو ثانی کے سفیر بھی آئے اور اندلس سے دوستانہ تعلقات کی تجدید کی۔[3]

افریقہ کی مہم:

اندلس کے سرحدی علاقوں کی شورشوں کی روک تھام کے بعد حکم ثانی کو بنوعبید کے فتنے کی روک تھام کے لیے افریقہ پر بھی فوج کشی کرنا پڑی۔ ان ایام میں بنوعبید نے شمالی افریقہ کی حکومت بربر قبیلے "صنہاجہ" کے حوالے کر دی تھی اور صنہاجی سردار یوسف بن زیری کو یہاں کا نائب بنا دیا تھا۔ اس وقت تک مراکش کے ساحل پر علوی خانوادے

---

① نفح الطیب: ۱/ ۱۸۱، البیان المغرب: ۲/ ۲۵۱؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۴۸۵

② البیان المغرب: ۱/ ۲۵۱ تا ۲۵۵؛ تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۱۸۵، ۱۸۶، ط دار الفکر

③ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۴۹۰

بنوادریس کی حکومت قائم تھی، اس لیے مرّاکش اور موریطانیہ کے علاقے بنوعبید کے صنہاجی نائب اور بنوادریس کے درمیان جھڑپوں کا میدان بنے ہوئے تھے۔ بنوادریس نے بنوعبید کے مقابلے میں عبدالرحمٰن الناصر کی خلافت کو قبول کرلیا تھا، مگر الناصر کی وفات کے چند سالوں بعد انہیں مرّاکش پر اُموی اقتدار کا سایہ ناگوار گزرنے لگا۔

جب بنوعبید کا حاکم یوسف بن زیری شمالی افریقہ کی طرف بڑھا تو طنجہ کا ادریسی امیر حسن بن غنون وہ پہلا شخص تھا جس نے اس کی اطاعت قبول کی اور صنہاجیوں سے اتحاد کرکے اُمویانِ اندلس کے خلاف ہوگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ طنجہ میں اندلس کے مقامی امیر لیلی ابن محمد کو قتل کردیا گیا۔

ان حالات میں حکم ثانی نے اپنے سپہ سالار غالب کو شمالی افریقہ کی تسخیر پر مامور کیا جس نے طنجہ اور سبتہ کے درمیان "قلعہ مصمودہ" کو چھاؤنی بنا کر اس مہم کو کامیابی کے ساتھ نمٹایا اور مرّاکش سمیت دیگر شورش زدہ علاقوں کو فتنوں سے پاک کرکے ۳۶۳ھ میں وہ اندلس واپس آگیا۔[1]

حکم ثانی کی وفات:

الحکم ثانی کے دور میں اندرونی طور پر پورے اندلس میں امن وامان رہا۔ کسی قسم کی کوئی بغاوت تھی نہ ہنگامہ آرائی۔ لوگ اطمینان وسکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ شروع کے پانچ سالوں کے سوا الحکم کو بیرونی مہمات سے بھی فرصت میسر رہی، اس لیے وہ یکسوئی سے ملک کو علوم وفنون کا مرکز بنانے میں مصروف رہا۔

۳۶۴ھ میں الحکم پر فالج کا حملہ ہوا اور مرض کی شدت اتنی بڑھی کہ موت قریب معلوم ہونے لگی۔ اس نیک دل حکمران نے زندگی کے آخری دنوں میں ۱۰۰ غلام آزاد کیے، عوام سے ٹیکس کا چھٹا حصہ معاف کردیا اور اپنی ذاتی ملکیت کے بازاروں کی آمدنی نادار طلبہ کی تعلیم اور اساتذہ کی تنخواہوں کے لئے وقف کردینے کا حکم دیا۔

دو سال بستر پر رہنے کے بعد ۳ رمضان ۳۶۶ھ کو خلیفہ حکم ثانی نے ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس نے ۱۶ سال حکومت کی اور اس عرصے میں عدل وانصاف، دین پروری اور علم دوستی کی ایسی مثال قائم کی کہ آج تک دنیا اسے ایک علم دوست حکمران کی حیثیت سے یاد کرتی ہے۔[2]

ویسے تو حکم ثانی جملہ علوم کے متبحر عالم اور معقولات ومنقولات دونوں کا رسیا تھا مگر علم تاریخ اور فن انساب سے اسے خصوصی لگاؤ تھا۔ کتب تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خود اندلس کی تاریخ بڑی تفصیل سے لکھی تھی مگر افسوس کہ حوادث زمانہ سے یہ قیمتی تصنیف ضائع ہوگئی۔ تاہم اندلس کے قدیم مؤرخین کی کتب میں ایسے حوالے بکثرت ملتے ہیں کہ فلاں واقعہ الحکم کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تاریخ سے نقل کیا جارہا ہے۔[3]

---

① دولة الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۳۹۳ تا ۳۹۷

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۲۵۳

③ مثلاً وجد بخط الخلیفة المستنصر باللہ ——— (البیان المغرب: ۲/ ۲۳۱)

ہشام المؤید باللہ اور محمد بن ابی عامر (حاجب المنصور)

۳۶۶ھ تا ۳۹۲ھ
(۹۷۶ء تا ۱۰۰۲ء)

الحکم نے وفات سے پہلے اپنے بیٹے ہشام کو جانشین مقرر کر دیا تھا، حالانکہ وہ کم عمر تھا۔ اگر اس کی جگہ اس کے چچا مغیرہ بن عبدالرحمٰن الناصر کو نامزد کیا جاتا تو خوب ہوتا کیوں کہ وہ ہر لحاظ سے حکمرانی کے لائق تھا۔ اس غلط فیصلے میں اصل ہاتھ ہشام کی والدہ "ملکہ صبح" کا تھا۔ وہ قبیلہ بشکنش سے تعلق رکھنے والی باندی تھی۔ وہ ایک اچھی گلوکارہ اور خلیفہ کی چہیتی تھی۔ ①

اس نے خلیفہ کو منا کر اپنے بیٹے کو ولی عہد بنوا دیا۔ یوں ایک وسیع سلطنت ایک ناتجربہ کار اور کمزور فرد کے سپرد کر دی گئی۔ ولی عہدی کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی گئی جس میں تمام ارکانِ سلطنت اور معززین نے شرکت کی۔ اس کے بعد الحکم فالج کی لپیٹ میں آ گیا اور مملکت کا نظام وزیر جعفر بن عثمان مصحفی اور شہزادے کے اتالیق محمد بن ابی عامر نے سنبھال لیا۔

الحکم کو بستر پر ایک سال سے زائد مدت گزر گئی اور رعایا میں حکومت کے مستقبل کی بابت چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ آخر محمد بن ابی عامر اور جعفر بن عثمان نے باہم مشورہ کر کے ۱۰ صفر ۳۶۶ھ کو ولی عہد ہشام بن الحکم کا جلوس نکالا تاکہ عوام مطمئن ہو جائیں کہ اگلا حکمران بالکل طے ہے۔ اس موقع پر ہشام بن حکم نے یہ بھی طے کر دیا کہ جب وہ تخت نشین ہوگا تو اس کا وزیر ابن ابی عامر ہوگا۔ اس موقع پر ابن ابی عامر کی طرف سے روغنِ زیتون پر عائد تجارتی ٹیکس معاف کرنے کا اعلان بھی کیا گیا جو اہلِ قرطبہ کی آمدن کا اہم ذریعہ تھا۔ اس اعلان سے لوگ بہت خوش ہوئے اور ابن ابی عامر کو دعائیں دینے لگے۔ ②

صقالبہ کی سازش اور مغیرہ بن الناصر کا قتل:

اس واقعے کے تقریباً سات ماہ بعد ۳ رمضان ۳۶۶ھ کو الحکم ثانی نے خاموشی سے اپنے بستر پر داعی اجل کو

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۵۳

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۵۳، ۲۵۳

لبیک کہہ دیا۔ الحکم کی وفات طویل بیماری کے بعد ہوئی تھی اور بہت دنوں سے وہ اپنے وزیر جعفر بن عثمان اور مشیروں سے بھی نہیں مل سکا تھا۔ خلیفہ کی دیکھ بھال اور قصر کے انتظامات دو صقلبی اُمراء: جوذر اور فائق نے سنبھال رکھے تھے جن کے ماتحت ایک ہزار صقلبی حشم وخدم اور سپاہی تھے۔ ①

انہوں نے خلیفہ کی موت کو سب سے پوشیدہ رکھا اور پہلے باہم طے کیا کہ مغیرہ بن الناصر کو خلیفہ بنایا جائے۔ پھر انہوں نے وزیر سلطنت جعفر بن عثمان کو الحکم کی وفات کی اطلاع دے کر مغیرہ کو خلیفہ بنانے کی رائے پیش کی۔ جعفر بن عثمان نے اس وقت تو یہی ظاہر کیا کہ وہ اس تجویز سے پوری طرح متفق ہے مگر وہاں سے نکل کر اس نے محمد بن ابی عامر اور دیگر افسرانِ فوج کو جمع کر لیا اور انہیں بتایا کہ صقلبی اُمراء نے ولی عہد کی بیعت توڑ دی ہے۔

اس نے کہا: ''اگر ہم ہشام کو اپنا سربراہ بنائیں تو نہ صرف مامون رہیں گے بلکہ یہ دُنیا ہمارے ہی ہاتھوں میں ہوگی، لہٰذا ہمیں مغیرہ کو قتل کر دینا چاہیے۔'' محمد بن ابی عامر سمیت اکثر افسرانِ فوج اس پر متفق ہو گئے۔

وزیر جعفر بن عثمان نے مغیرہ کے قتل کی ذمہ داری محمد بن ابی عامر کو سونپ دی۔ وہ کچھ سپاہی لے کر اس کی حویلی میں گھس گیا۔ مغیرہ کو اس وقت تک الحکم کی وفات کی خبر بھی نہ تھی۔ وہ سرکاری افسر اور سپاہیوں کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ابن ابی عامر نے اُسے خلیفہ کی موت کی خبر دے کر کہا کہ اب اُمرائے دربار اس کے قتل کا فیصلہ سنا چکے ہیں۔

مغیرہ نے کہا: ''میں ہر طرح سے نئے خلیفہ کا تابع دار اور مطیع ہوں۔ بیعت پر قائم ہوں۔ آپ جس طرح چاہیں، میری وفاداری کی تصدیق کر لیں۔''

محمد بن ابی عامر کو رحم آ گیا۔ اس نے وزیر کو پیغام بھیجا کہ مغیرہ سے کوئی خطرہ نہیں ہے، لہٰذا آپ اجازت دیں کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ وزیر نے محمد بن ابی عامر کی درخواست رَد کر دی اور اسے جوابی رقعے میں لکھ بھیجا:

''تم فریب میں آ گئے ہو۔ یہ کام پورا کرو، یا الگ ہو جاؤ۔ اسے کوئی اور قتل کر دے گا۔''

محمد بن ابی عامر خاموش ہو گیا اور یہ رُقعہ مغیرہ کو دکھا کر ایک طرف ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اُس کے اشارے پر سپاہیوں نے گلا گھونٹ کر اس بدقسمت شہزادے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ②

یوں ایک بے گناہ کی لاش پر یہ نئی حکومت قائم ہوئی جس میں خلیفہ بے بس تھا جب کہ اُمرائے لشکر حکومت پر حاوی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُمویانِ اندلس کے زوال کی پہلی سطر اسی دن لکھ دی گئی تھی۔

ہشام بن حکم جس کی عمر اس وقت گیارہ سال تھی، المؤید باللہ کے لقب کے ساتھ خلیفہ بن گیا۔ وہ خلوت نشینی کا عادی تھا۔ تلاوت اور ذکر و عبادت میں زیادہ وقت گزارتا تھا۔ صدقات و خیرات بکثرت نکالتا تھا۔

---

① صقالبہ یا صقلبی وہ لڑکے تھے جو جہاد کے دوران نصرانی ریاستوں سے قیدی بن کر آتے تھے اور ان کی اسلامی اور عسکری تربیت کر کے انہیں حکومتی اداروں، قصرِ خلافت کی ذمہ داریوں اور فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا۔ اس شعبے کو حکم اول نے بہت ترقی دی تھی۔

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/۲۶۰، ۲۶۱

چوں کہ اس نے اپنے استاذ محمد بن ابی عامر کو وزیر بنادیا تھا، اس لیے درحقیقت یہاں سے محمد بن ابی عامر کی حکومت کا دور شروع ہوتا ہے۔ ہشام بن حکم برائے نام سربراہ تھا، اُسے رسماً خلیفہ کہا جاتا تھا۔

محمد بن ابی عامر کے آباء و اجداد یمن کے قبیلہ معافر سے تعلق رکھتے تھے۔ طارق بن زیاد کے ساتھ اندلس فتح کرنے والے مجاہدین میں وہ پیش پیش رہے اور پھر یہیں مقیم ہوگئے۔ یہ خاندان آگے چل کر علم و فضل میں نمایاں رہا۔ محمد بن ابی عامر کے دادا محمد بن عبداللہ اشبیلیہ کے قاضی جبکہ ان کے والد ابوحفص اندلس کے نامور فقیہ تھے۔

ابن ابی عامر کی ولادت ۳۲۹ھ میں ہوئی۔ تحصیل علم کے بعد اس نے خلیفہ حکم ثانی کے دور میں معمولی پرچہ نویس کی حیثیت سے عملی زندگی میں قدم رکھا، مگر اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا جلد ہی شہرہ ہوگیا۔ حکم ثانی کی اہلیہ یعنی ولی عہد ہشام کی والدہ "ملکہ صبح" نے اسے اپنا محرر بنالیا۔ بعد ازاں خلیفہ حکم ثانی نے اسے شہزادہ ہشام کا معلم مقرر کردیا۔ [1]

ہشام ثانی کی تاج پوشی اور ابن ابی عامر کا اقتدار:

حکم ثانی کی وفات کے بعد ۳۸ سالہ محمد بن ابی عامر کا اقتدار شروع ہوگیا۔ اس ترقی میں اسے ملکہ صبح کی بھرپور سرپرستی حاصل تھی۔ نیا خلیفہ ہشام بھی اس کی مٹھی میں تھا۔ یوں اسے بے پناہ اختیارات حاصل تھے۔ [2]

ان اختیارات سے کام لے کر اس نے سب سے پہلے اُن صقلبی افسران اور خدام و سپاہ کا بندوبست کیا جو مغیرہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ چونکہ قصرِ خلافت میں صقلبی بڑا اثر و رسوخ رکھتے تھے، اس لیے ابن ابی عامر نے ان پر بڑی حکمت کے ساتھ قابو پایا۔ ان کے دو بڑے افسران: فائق اور جوذر کو قرطبہ سے باہر بھیج دیا گیا اور وہ گمنام ہوگئے۔ ان کا ایک افسر دری صغیر فتنہ پھیلانے کے لیے سرگرم ہوا تو ابن ابی عامر نے اسے گھیر کر قتل کرادیا۔ اس کے بعد اکثر صقلبیوں کو منتشر کرکے قرطبہ اور قصرِ خلافت میں ان کا عمل دخل بہت کم کردیا۔ [3]

ابن ابی عامر نے ایسے وقت میں اندلس کے سیاسی و عسکری امور کی باگ ڈور سنبھالی جبکہ سلطنت میں تفرقہ پڑنے کے سارے آثار پیدا ہوچکے تھے۔ ابن ابی عامر کے بغیر نوعمر ہشام کے لئے ایک دن بھی حکومت چلانا ممکن نہ تھا بلکہ خطرہ تھا کہ مفاد پرست امراء بغاوتیں کرکے کئی نئی حکومتیں بنالیتے اور پھر نصرانی حکمرانوں کو اندلس پر حملوں سے روکنے والا کوئی نہ ہوتا۔ اس لیے حکومت کا سارا انتظام ابن ابی عامر کے ہاتھ میں رہا۔

اس نے فوج کو از سرِ نو ترتیب دیا اور نصرانی حکومتوں کے خلاف بار بار یلغار کی۔ اس نے بعض ایسے مقامات تک بھی فوجیں بھیجیں جہاں تک اندلس کے سابقہ حکمرانوں میں سے کسی کو پیش قدمی کا موقع نہ ملا تھا۔ اس لیے بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ اس کے دور میں اندلس کی اُموی حکومت اس عروج پر جا پہنچی تھی جو عبدالرحمٰن الناصر کے

---

① البیان المغرب: ۲/ ۲۵۱ تا ۲۵۳؛ تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۱۸۹، ط دار الفکر

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۲۶۵

③ البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۲۶۲، ۲۶۳

دور میں بھی نصیب نہیں ہوا۔[1]

الزاہرۃ کی تعمیر:

محمد بن ابی عامر کو تعمیراتی ذوق بھی ملا تھا۔اس نے عبدالرحمن الناصر کے ''مدینۃ الزہراء'' سے متاثر ہو کر ۳۶۸ھ میں قرطبہ کے مشرق میں ایک نیا شہر ''الزاہرۃ'' تعمیر کرانا شروع کیا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ محمد بن ابی عامر قرطبہ کو اپنے لیے محفوظ نہیں سمجھتا تھا کیوں کہ وہاں اس کے مخالف امراء خاصی تعداد میں رہائش پذیر تھے۔ چونکہ قرطبہ کے عوام بنو اُمیہ سے عقیدت رکھتے تھے لہٰذا مخالف امراء کسی بھی وقت انہیں بھڑکا کر ابن ابی عامر کے خلاف کھڑا کر سکتے تھے۔

لہٰذا ۳۷۰ھ میں ''الزاہرۃ'' کی تعمیر مکمل ہوتے ہی ابن ابی عامر نے اپنے اہل وعیال اور وفادار امراء سمیت وہیں رہائش اختیار کر لی۔سرکاری دفاتر بھی وہیں منتقل کر دیے گئے۔یہاں فوج کی چھاؤنی بھی بنائی گئی جو زیادہ تر بربروں اور ''صقالبہ'' قوم کے لوگوں پر مشتمل تھی اس طرح یہ نیا شہر اندلس کا سیاسی مرکز بن گیا۔[2]

جعفر بن عثمان کا دردناک انجام:

سابق وزیر جعفر بن عثمان اس وقت سلطنت کا حاجب تھا اور بڑی وجاہت کا مالک تھا۔ابن ابی عامر کی مطلق العنانی کی راہ میں وہی بڑی رکاوٹ تھا۔محمد بن ابی عامر بھی اس کے خلاف موقع تلاش کر رہا تھا۔یہ موقع اُسے اُس وقت ملا جب شعبان ۳۶۷ھ میں خلیفہ ہشام بن حکم نے جعفر بن سلیمان کو معزول کر کے قید میں ڈال دیا۔جعفر بہترین ادیب اور نامور شاعر تھا۔اُس نے قید خانے سے ابن ابی عامر کے نام نظم اور نثر پر مشتمل کئی مراسلے بھیجے جن میں رحم کی درخواست کی گئی تھی مگر ابن ابی عامر نے اسے کوئی رعایت نہ دی۔بلکہ اس کے تمام اُموال اور جائدادیں ضبط کر کے اس کی آل واولاد کو کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا۔[3]

نصرانیوں پر ابن ابی عامر کی ہیبت:

محمد بن ابی عامر نے خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے ۲۷ برس حکومت کی۔اندرونی طور پر اندلس کے عوام کی اتنی خدمت کی کہ ہر چھوٹا بڑا اس کا گرویدہ نظر آتا تھا۔اس کا گھر عوام وخواص سب کے لیے کھلا رہتا تھا۔وسیع دسترخوان لگتا جس پر مہمان طرح طرح کے پکوانوں سے محظوظ ہوتے۔ابن ابی عامر مہربانی، سخاوت اور فیاضی میں کسی سے کم نہ تھا۔اسی لیے افسران اس پر جان چھڑکتے تھے۔اس کا سپاہیوں سے قریبی تعلق تھا۔اسے بے شمار سپاہیوں کے نام اور کوائف یاد تھے اس لیے وہ اس کے ایک اشارے پر ہر مہم میں بے خطر کود جاتے تھے۔

اس سرفروشانہ طاقت کے ساتھ اس حکمران نے بیرونی خطرات کا نہ صرف کامیابی سے دفاع کیا بلکہ نصرانی

---

① تاریخ ابن خلدون: ۳/۱۹۰، ط دار الفکر

② دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/۵۳۶ ③ البیان المغرب: ۲/۲۶۷، ۲۶۸؛ الاعلام لزرکلی: ۲/۱۲۵

حکومتوں کے خلاف جہاد جاری رکھا اور ۲۷ سال میں ۵۲ مہمات انجام دیں۔ ہر سال موسم بہار اور موسم خزاں میں افواج روانہ ہوتیں۔ ہر بار شاندار فتوحات حاصل ہوتیں۔ اس کے بھیجے ہوئے کسی لشکر کو کہیں شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس نے سرکش حریفوں کو اتنی عبرتناک سزائیں دیں کہ مخالفین اس کا نام سن کر تھر تھرانے لگے۔

مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ اندلس کی تاریخ میں نصرانیوں پر کسی مسلمان حکمران کی ایسی ہیبت طاری نہیں ہوئی جیسی محمد بن ابی عامر کی تھی۔ وہ حریف پر سخت گرفت کا قائل تھا۔ چند مواقع کے سوا کبھی دشمن سے صلح نہیں کی اور مکمل فتح حاصل کر کے ہی دم لیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ کئی نصرانی امراء اس کی فوج میں شامل ہو کر دوسرے نصرانی امراء کے خلاف مہمات میں حصہ لیتے، ان کے قلعوں کو ڈھاتے، فصیلوں کو پیوند زمین کرتے اور دم مارنے کی ہمت نہ رکھتے۔ ①

محمد ابن ابی عامر کے دور میں اندلس کی فوج اس قدر مضبوط ہو چکی تھی کہ ۲۶ ہزار گھڑ سوار باقاعدہ پیشہ ور فوج کا حصہ تھے۔ جہاد کے لیے لشکر چلتا تو رضاکاروں کو ملا کر مجاہدین کی تعداد بسا اوقات ایک لاکھ سے بھی متجاوز ہو جاتی تھی۔ ②

ریاست لیون پر حملہ:

۳۷۱ھ (۹۸۱ء) میں محمد بن ابی عامر شلمنقہ کے شمال میں ''سمورہ'' کے قلعے تک پہنچا۔ اگرچہ قلعہ سر نہیں کیا جا سکا مگر گرد و نواح کے سینکڑوں دیہات قبضے میں آگئے۔ رذمیر ثالث فرار ہو کر قسطالیہ پہنچ گیا اور غرسیہ فرڈی نند سے امداد طلب کی۔ نوار کا حاکم شانجہ بھی ان سے آملا اور تینوں نے متحد ہو کر مسلمانوں کے مقابلے میں صف بندی کی۔ شہر ''روضہ'' (Rueda) کے باہر فریقین میں زوردار تصادم ہوا جس میں نصرانی شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے آگے بڑھ کر قلعہ ''شنت منکش'' (Simancas) فتح کر لیا اور ''لیون'' کے پایہ تخت تک حریف کا تعاقب کیا۔ قریب تھا کہ یہ شہر بھی سر کر لیا جاتا مگر شدید برف باری نے اسلامی افواج کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ ③

بادشاہت کی طرف پیش رفت۔ جعفر بن عثمان کا قتل:

اس مہم سے واپسی پر ۳۷۱ھ میں ابن ابی عامر نے ''حاجب المنصور'' کا لقب اختیار کر کے سکوں پر اپنا نام نقش کرادیا اور جمعے کے خطبے میں اس کے لیے بھی دعا کی جانے لگی۔ اُس نے بادشاہوں والے طور طریقے اختیار کر لیے۔ دربار میں اپنے لیے دست بوسی کی رسم بھی شروع کرادی۔ ④

سابق وزیر جعفر بن عثمان اگرچہ اب بالکل لاچار اور بے بس تھا مگر ابن ابی عامر کو اس سے خدشات ضرور لاحق تھے،

---

① دولة الاسلام فی الاندلس: ۵۲۳/۱، تاریخ ابن خلدون: ۱۸۹/۴ تا ۱۹۱　② دولة الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۵۲۰
③ Dozy: Hist. Vol. II. p. 234-235 ; Recherches (3ème ed.) Vol. I. p. 180-181
④ دولة الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۵۳۰، ۵۳۱

چنانچہ اسے قتل کرا کے اُس کی لاش اس کے اہل و عیال کے حوالے کر دی۔ یہ ۳۷۲ھ کا واقعہ ہے۔[1]

خود مختاری:

جعفر بن عثمان کو قتل کرانے کے بعد محمد بن ابی عامر کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ چنانچہ اس نے ملکہ صبح کی خفگی کی پرواہ کیے بغیر خلیفہ ہشام بن حکم کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ترک جرنیلوں نے متوکل علی اللہ کے بعد ضعیف عباسی خلفاء کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے ہشام سے تمام اختیارات سلب کر کے اُسے شاہی رہائش گاہ میں محصور کر دیا اور خود ایک خودمختار سلطان کی حیثیت حاصل کر لی۔ ملکہ صبح اس صورتحال پر بہت ناخوش تھی مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی۔[2]

مزید فتوحات:

بادشاہ بننے کے بعد حاجب منصور نے مزید کئی فتوحات حاصل کیں۔ اس نے پہلی بار نصرانی ریاست لیون اور گرد و نواح کی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اسلامی عملداری میں شامل کیا۔ برشلونہ، قسطالیہ اور نوار کو مکمل فرمان بردار اور باج گزار بنا لیا۔ ۳۷۴ھ میں اس نے شمال مشرق کا رخ کیا اور برشلونہ پر یلغار کی جو ۱۸۵ھ سے نصرانیوں کے قبضے میں چلا آ رہا تھا۔ طویل جنگ کے بعد صفر ۳۷۵ھ میں برشلونہ فتح کر لیا گیا اور یہاں کا نواب مارا گیا۔ جغرافیائی اور طبعی حالات کی وجہ سے یہاں قبضہ برقرار رکھنا مشکل تھا، اس لیے اسلامی لشکر شہر کی فصیل اور قلعے کو تاراج کر کے لوٹ آیا۔

منصور کی جنگوں کا انداز گزشتہ خلفاء سے مختلف تھا۔ وہ عموماً دشمن کی طرف سے چھیڑ چھاڑ کے بعد لشکر روانہ کرتے تھے اور جلد صلح پر آمادہ ہو جاتے تھے، مگر منصور اکثر و بیشتر خود جنگ کا آغاز کرتا تھا اور حتی الامکان دشمن کو کسی معاہدے کے بغیر مکمل طور پر زیر کر کے ہی لوٹتا تھا۔ ان کامیابیوں کی بناء پر اندلس کے عوام اسے ''منصور اعظم'' کہنے لگے۔[3]

لیون اور جلیقیہ کی مہمات:

شمالی نصرانی ریاستوں میں حکمران تبدیل ہوئے تو ایک بار پھر وہاں سازشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ۳۷۸ھ میں منصور نے شمالی اندلس کی طرف طوفانی انداز میں پیش قدمی کی۔ وہ دریائے دویرہ عبور کر کے ''لیون'' کے پایہ تخت پر حملہ آور ہوا اور اسے فتح کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہاں کا نواب ''جونز الیفو'' مارا گیا۔

اس کے بعد لشکر جلیقیہ کے ناقابلِ تسخیر شہر ''سمورۃ'' تک جا پہنچا اور اس کا بھی وہی حشر کیا۔ یوں نصرانیوں کے پاس جلیقیہ کے شمال مغرب میں چپہ بھر زمین کے سوا کچھ نہیں بچا۔[4]

سینٹ یعقوب کی مہم:

۳۸۷ھ میں منصور کو معلوم ہوا کہ اندلس کے شمال مغرب میں بحر اوقیانوس کے ساحل پر نصرانیوں کا ایک گرجا

---

[1] البیان المغرب: ۲/ ۲۶۸،۲۶۷؛ الاعلام للزرکلی: ۲/ ۱۲۵

[2] المغرب فی حلی المغرب: ۱/ ۱۹۵؛ البیان المغرب: ۲/ ۲۷۳،۲۷۲

[3] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۵۳۱،۵۳۰

[4] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۳۳۸

"سینٹ یعقوب" ہے جسے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری یعقوب نامی کسی بزرگ کا مزار تصور کرتے ہیں اور اس کی زیارت کے لیے یورپ تک سے لوگ آتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی وہاں کئی چرچ تھے۔

منصور نے ان جزیروں تک رسائی کا فیصلہ کر لیا کیوں کہ نصرانیوں کے چرچ عقوبت خانے اور جیل خانے بھی تھے جہاں مسلمان قیدیوں کو طرح طرح کے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا جن میں خاصی تعداد خواتین کی تھی۔ ان سے کلیسا اور پادریوں کی خدمت کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ اس حقیقت کی شہادت درج ذیل واقعے سے ملتی ہے۔

ایک بار منصور کا ایک سفیر نصرانی ریاست "بلنکش" کے سفر کے دوران ایک گرجے میں چلا گیا۔ وہاں اسے ایک بدحال عورت دکھائی دی۔ سفیر نے اس کی خیر خیریت پوچھی تو اس نے کہا: "میں سالہا سال سے یہاں قید ہوں۔ کیا منصور اپنے عیش و آرام میں ہمیں بھول گیا ہے۔" اس نے سفیر کو قسم دی کہ منصور کو مجھ جیسے بے کسوں کا حال ضرور بتانا۔

سفیر نے واپس جا کر منصور کو اطلاع دی تو اس غیور انسان نے بلا تاخیر فوج لے کر اس نصرانی ریاست پر چڑھائی کر دی۔ ریاست کے حاکم غرسیہ نے یہ دیکھ کر دہائی دی کہ ہم سے کیا خطا ہوگئی۔

منصور نے کہلوایا: "تم لوگوں نے وعدہ کیا تھا کہ کسی مسلمان کو قید نہیں رکھو گے مگر ایک عورت تمہارے ہاں فلاں گرجے میں قید ہے۔ اللہ کی قسم میں تمہاری زمین کو روند کر رہوں گا۔"

نصرانی حاکم نے اس عورت سمیت مزید دو خواتین کو بھیج دیا اور پیغام میں کہا: "خدا کی قسم! مجھے ان کے قید ہونے کی کوئی خبر نہیں تھی۔"[1]

غالباً منصور کو دیگر کلیساؤں کے بارے میں بھی سن گن ملی ہوگی کہ وہاں مسلمان قید ہیں اور ان پر تشدد ہوتا ہے۔ بہرکیف اس نے جمادی الاخریٰ ۳۸۷ھ میں بحر اوقیانوس کی مہم کی تیاری شروع کی۔ نقشے پر غور و فکر کر کے کفر کے ان مراکز تک رسائی کی منصوبہ بندی کی گئی۔ اندلس کے جنوبی ساحل پر ایک بحری بیڑا تیار کرایا گیا جس میں وافر سامان رسد موجود تھا۔ یہ بیڑا پرتگال کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے دریائے دویرہ کے ڈیلٹا میں داخل ہوگیا۔ یہاں جا بجا پل تیار کر کے پیادہ دستوں کو آگے بڑھایا گیا۔ آگے ایک دیوار کی طرح سیدھا پہاڑ تھا جس میں ایک تنگ ترین گھاٹی کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ منصور کے حکم پر انجینئروں اور مزدوروں نے سخت مشقت سے اس گھاٹی کو تراش کر اتنا چوڑا کیا کہ سپاہی گزرنے کے قابل ہوئے۔ پہاڑ عبور کرنے کے بعد لشکر نصرانیوں کے علاقوں میں پھیل گیا اور کئی قلعوں کو پہلی بار فتح کیا، ان میں سینٹ بلایہ اور دیر قسطان بھی شامل تھے۔

ساحل پر تمام مخالفین کو روندنے کے ساتھ بحری لشکر بحر اوقیانوس میں بھی کارروائیاں کرتا رہا اور بسیط اونب، قرطیجہ، سینٹ بریہ اور سینٹ مانکش پر قابض ہوگیا۔ آخر میں لشکر اپنی منزل سینٹ یعقوب پہنچا۔ نصرانی اسے خالی کر چکے تھے۔ سینٹ یعقوب کی مفروضہ قبر پر صرف ایک بوڑھا راہب بیٹھا تھا۔

---

[1] البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲/ ۲۹۷، ۲۹۸

منصور نے پوچھا: تم کہاں کے ہو؟ اس نے کہا: ”ویلس کا“

منصور نے اسے کچھ نہ کہا اور مزار پر کچھ سپاہی مقرر کردیے تاکہ آئندہ یہاں شرکیہ رسومات نہ ہوں۔ منصور نے اٹلانٹک کے کئی جزیروں پر قبضہ کر کے فرانس کا رخ کیا۔ فرانس کے ساحل پر بھی کئی کامیابیاں حاصل کیں، متعدد قلعے فتح کیے اور مخالفین کے سازشی کیمپوں کو تباہ و برباد کر کے واپسی اختیار کی۔[1]

افریقہ میں کامیابیاں:

منصور اعظم نے ۳۸۳ھ میں افریقہ کے ساحلوں پر بھی لشکر کشی کی، بنوادریس کے ابن غنون نے دوبارہ طاقت پکڑلی تھی۔ منصور نے فوج بھیج کر اسے صلح پر مجبور کردیا۔ صنہاجی سردار زیری بن عطیہ بھی المنصور کے خلاف پخت وپز میں مصروف تھا، بگڑان حالات میں اسے بھی جھکنا پڑا۔ یوں منصور اعظم نے تمام مخالفین کی سرکوبی کردی۔[2]

خلیفہ کا جلوس:

منصور اعظم اگرچہ اپنے عدل و انصاف، جہاں داری اور جہادی مہمات کے باعث لوگوں میں بے حد مقبول تھا مگر اکثر لوگ اس بات سے رنجیدہ تھے کہ اس نے خلیفہ ہشام کو یرغمال بنا کر کاروبارِ مملکت سے بالکل لاتعلق کردیا ہے۔ منصور اعظم نے عوام کو مطمئن کرنے کے لئے ایک دن خلیفہ ہشام کی جلوہ آرائی کے لئے ایک عظیم الشان جلوس کا اہتمام کیا۔ خلیفہ کو شاہی پوشاک وکلاہ زیب تن کرا کے مرصع گھوڑے پر سوار کرایا اور خود وزارتِ عظمیٰ کا عصا تھام کر گھوڑے کی لگام پکڑے ادب و احترام کے ساتھ ہمراہ ہولیا۔

چوں کہ اس جلوس کا اعلان پہلے سے ہوچکا تھا اس لئے خلیفہ کو دیکھنے نہ صرف قرطبہ بلکہ دیگر شہروں کے عوام بھی آپہنچے اور قرطبہ کی سڑکوں پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ اندلس کے عوام اپنے خلیفہ کی رونمائی اور منصور اعظم کو ان کے ساتھ خادم کی حیثیت سے پیادہ چلتا دیکھ کر مطمئن ہوگئے اور نظامِ حکومت پر ان کا اعتماد بحال ہوگیا۔[3]

وفات:

منصور اپنی زندگی کے آخری ایام تک بڑھاپے، کمزوری اور امراض کے باوجود کفار سے جہاد میں مشغول رہا۔ صفر ۳۹۳ھ (دسمبر ۱۰۰۲ء) میں وہ آخری بار جہاد کے لئے نکلا، حسبِ معمول اپنا کفن جو اپنی بیٹیوں سے بنوایا تھا، ہمراہ تھا، اس بار اس نے قشتالیہ کے خلاف بھرپور کارروائی کی اور شاندار فتح کے بعد واپس لوٹا۔ مگر راستے میں مرض کا شدید حملہ ہوا اور وہ گھوڑے پر سواری کے قابل نہ رہا۔ خادموں نے ایک تخت پر لٹا دیا اور کاندھوں پر اٹھا کر لے چلے، راستے میں ماہ رمضان شروع ہوگیا۔ لشکر ”مدینہ سالم“ پہنچا تھا کہ منصور کا وقتِ موعود آپہنچا اور یہیں جان جاں آفریں کے سپرد

---

① البیان المغرب: ۲/ ۲۹۵ تا ۲۹۷

② دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۳۳۵ تا ۳۳۷

③ المغرب فی حلی المغرب، لابی الحسن المغربی الاندلسی (م ۶۸۵ھ): ۱/ ۲۰۱، ط دار المعارف قاهره

کردی۔ یہ ۲۸ رمضان المبارک ۳۹۲ھ (۱۰ اگست ۱۰۰۲ء) کا واقعہ ہے۔ وہی کفن جو وہ گھر سے ساتھ لے کر چلا تھا پہنایا گیا۔[1]

مذہبی جذبات:

منصور اعظم ایک غیور اور پختہ فکر مسلمان تھا۔ خلیفہ حکم ثانی نے قرطبہ کے شاہی کتب خانے جو لاکھوں کتب جمع کی تھیں، ان میں غیر مسلم حکماء، فلاسفہ اور ملحدین کی تصانیف بھی شامل تھیں۔ منصور اعظم نے ایسی کتب کو اسلامی معاشرے کے لیے خطرناک تصور کرتے ہوئے اپنی نگرانی میں تلف کرادیا۔[2]

وہ جہادی سفر میں ہمیشہ اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا کلام پاک کا نسخہ ساتھ رکھتا تھا اور اس کی تلاوت کرتا رہتا تھا۔[3]

وہ اپنی ۲۷ سالہ جہادی مہمات میں کپڑوں پر لگنے والا گرد وغبار اور مٹی جھاڑ کر ایک تھیلی میں جمع کرتا رہا تھا۔ اس کی وصیت تھی کہ اس کی نعش پر یہ گرد چھڑک دی جائے۔ وفات کے بعد اس تھیلی کو اٹھایا گیا تو اتنی وزنی ہو چکی تھی کہ اس میں موجود مٹی سے ایک اینٹ بنائی جاسکتی تھی۔[4]

راہِ جہاد کی یہ انمول خاک جس کی موجودگی میں حضور نبی الملاحم ﷺ نے دوزخ کی آگ نہ لگنے کی بشارت دی ہے، اس مردِ مجاہد کے جسم پر چھڑک دی گئی اور مدینہ سالم ہی میں دفنا دیا گیا۔

منصور اعظم کا جاسوسی نظام:

منصور اعظم نہایت بیدار مغز، منتظم اور حد درجے چوکس حاکم تھا، وہ اپنی ذہانت سے دشمنوں کی ایسی ایسی چالوں کو ناکام بنا دیتا جن کی کامیابی دشمن کے نزدیک یقینی ہوتی تھی۔ اس کی کامیابیوں کی ایک بڑی وجہ کامیاب جاسوسی نظام تھا۔ اس کے سینکڑوں مخبر ہر شعبۂ زندگی میں موجود تھے، دشمن کی صفوں اور ان کی خفیہ مجلسوں میں بھی منصور اعظم کے جاسوس شریک ہوتے تھے اور اسے پل پل کی خبر دیتے تھے۔

۳۸۷ھ (۹۹۷ء) کا واقعہ ہے کہ وہ نصرانیوں کے خلاف اپنا لشکر جرار لے کر روانہ ہوا۔ ایک رات کسی مقام پر پڑاؤ ڈالا اور ایک سپاہی کو حکم دیا کہ وہ طیالس کی گھاٹی پر کھڑا رہے اور وہاں سے جو شخص بھی گزرے اسے گرفتار کرکے حاضر خدمت کرے۔ سردیوں کی تاریک رات تھی، موسلا دھار بارش جاری تھی۔ سپاہی پوری رات چوکس کھڑا رہا مگر کوئی شخص نہ گزرا۔ صبح کی روشنی میں وہ منصور اعظم کو کارگزاری کی اطلاع دینے کے لیے لوٹنے کا ارادہ کررہا تھا کہ اسے ایک بوڑھا آدمی اپنے گدھے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ سپاہی نے اسے روک کر پوچھا: ''تم کون ہو؟''

بوڑھے نے جواب دیا: ''میں ایک غریب آدمی ہوں، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر انہیں فروخت کرکے بمشکل گزر

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۵۶۶/۱

② البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲۹۲/۲

③ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۵۷۷/۱

④ سیر اعلام النبلاء: ۱۶/۱۷، ط الرسالۃ

بسر کرتا ہوں۔" سپاہی نے یہ سوچ کر کہ ایسے مفلس اور لاچار بوڑھے سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے اسے چھوڑ دیا۔ بوڑھا کچھ دور نکل گیا تھا کہ سپاہی کو اچانک منصور اعظم کے الفاظ یاد آ گئے کہ "جو شخص بھی ادھر سے گزرے اسے گرفتار کر کے حاضر خدمت کرو۔" چنانچہ سپاہی دوڑ کر اس کے پیچھے گیا اور اسے پکڑ کر منصور اعظم کے پاس لے آیا۔

منصور اعظم پوری رات مطلوبہ آدمی کی گرفتاری کے انتظار میں جاگتا رہا تھا۔ اس بوڑھے کو دیکھتے ہی تلاشی لی مگر کچھ برآمد نہ ہوا۔ پھر حکم دیا کہ گدھے کے پالان کی تلاشی لو۔ پالان کو ٹٹولا گیا تو ایک پرچہ برآمد ہوا جس میں حریفوں کو لشکرِ اسلام کے ایسے رازوں سے آگاہ کیا گیا تھا جن کے عیاں ہونے پر پوری اسلامی فوج دشمن کے گھیرے میں آ سکتی تھی۔ منصور اعظم نے اس بروقت انکشاف پر اللہ کا شکر ادا کیا اور سازش کے اصل منصوبہ سازوں کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔[1]

اس طرح کامیاب جاسوسی کے ذریعے دشمن کی چالوں سے بچنے کے متعدد واقعات منصور اعظم کی حیات کا حصہ ہیں۔

قوتِ برداشت:

اللہ تعالیٰ نے منصور اعظم کو غیر معمولی قوت برداشت عطا کی تھی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایک بار اس کے پاؤں میں سخت تکلیف تھی، طبیبوں نے اس کا علاج لوہے سے داغنا تجویز کیا۔ منصور اعظم اپنے دربار میں کسی اہم مسئلے پر مشاورت میں مصروف تھا کہ طبیب حاضر ہوا، منصور نے وقت کی کمی کے باعث اسے اشارہ کیا کہ تم اسی حال میں اپنا کام شروع کر دو۔ طبیب نے لوہا گرم کر کے پاؤں کو داغنا شروع کیا، مگر اس کے باوجود منصور اعظم کی گفتگو میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑا۔ چہرے پر بھی کوئی تغیر ظاہر نہ ہوا۔

کئی امراء طبیب کی طرف متوجہ نہیں تھے، لہٰذا انہیں یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ کیا ہو رہا ہے۔ جب گوشت جلنے کی بو پھیلی تو انہیں معلوم ہوا کہ منصور اعظم کے پاؤں کو داغا جا رہا ہے۔[2]

عدل وانصاف کا عجیب واقعہ:

منصور اعظم کا عدل وانصاف مثالی تھا، عوام میں مشہور تھا کہ اس کا انصاف انسانوں کے علاوہ جانوروں اور پرندوں تک محیط ہے۔ ابن حیان نے اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے کہ مشرق کا ایک تاجر چند نہایت قیمتی یاقوت لے کر اندلس پہنچا، یہ یاقوت ایک سرخ تھیلی میں محفوظ تھے۔ قُرطُبَہ کے قریب ایک نہر کے کنارے اس نے غسل کے لیے کپڑے اتارے اور وہ تھیلی بھی ساتھ رکھ دی، اچانک ایک چیل آئی اور جھپٹا مار کر تھیلی لے گئی۔

تاجر روتا پیٹتا قُرطُبَہ میں داخل ہوا۔ لوگوں نے اسے دربارِ منصور میں فریاد کا مشورہ دیا۔ تاجر نے بارہا کہا کہ وزیر اعظم انسانوں کے ظلم وستم سے نجات دلا سکتے ہیں مگر جانوروں اور پرندوں پر ان کا کیا قابو چلے گا؟ مگر لوگوں کے مسلسل اصرار پر وہ بالآخر دربار میں حاضر ہوا اور اپنی بپتا سنائی۔

---

[1] البيان المغرب في اخبار الاندلس و المغرب لابن العذارى المراكشي: ۲/ ۲۹۰، ۲۹۱

[2] البيان المغرب في اخبار الاندلس و المغرب لابن العذارى المراكشي: ۲/ ۳۰۰، ۳۰۱، ط دار الثقافة بيروت

منصور نے کچھ دیر سوچنے کے بعد تاجر سے پوچھا: ''تھیلی اچکنے کے بعد چیل نے کس سمت پرواز کی تھی؟''
تاجر نے سمت بتائی تو منصور نے اس سمت میں واقع شہروں کے پولیس افسران کو طلب کیا اور انہیں حکم دیا کہ یہ معلوم کریں کہ حالیہ چند دنوں میں کوئی شخص یکدم مال دار ہوا ہے یا نہیں؟''
پولیس افسران نے مخبروں کے ذریعے تحقیق کر کے بتایا کہ ''فلاں مزدور جو چند روز قبل بالکل مفلس تھا، نئے کپڑے پہن کر گھوم رہا ہے، بیوی بچوں کو بھی نئے کپڑے پہنائے ہیں اور سواری کے لئے اس نے ایک خچر بھی خرید لیا ہے۔'' منصور نے فوراً اس مزدور کو بلوالیا اور باز پرس کی۔ مزدور نے اعتراف کرلیا کہ اسے یاقوتوں کی تھیلی ملی ہے جس میں سے وہ کچھ خرچ کر چکا ہے۔
منصور نے تاجر سے تھیلی میں موجود اشیاء کی تعیین کرائی اور اپنے اطمینان کے بعد تھیلی اس کے حوالے کی۔ دس دینار اپنی جانب سے تاجر کو دیے اور دس دینار مزدور کو اس کے سچ بولنے کے انعام میں عطا کئے اور ساتھ ہی کہا: ''اگر تم تھیلی ملتے ہی اطلاع دے دیتے تو زیادہ انعام کے حق دار ہوتے۔''[1]

اے کاش یہ قبر والا......!

چوں کہ نصرانی منصور اعظم کے جذبۂ جہاد کی وجہ سے اس سے بہت جلتے تھے اس لئے اسلامی اندلس کے دورِ تنزل میں جب نصرانیوں نے الفانسو کی قیادت میں مدینہ سالم پر قبضہ کرلیا تو الفانسو نے اپنا تخت منصور اعظم کی قبر پر بچھایا اور تخت پر گاؤ تکیہ لگا کر اپنی ملکہ کے ساتھ اس پر بیٹھ گیا۔
اس موقع پر وہاں شجاع نامی ایک مسلمان موجود تھا جسے مخاطب کر کے الفانسو نے کہا:
''تم نے دیکھا میں نے مسلم آبادیوں پر قبضہ کرلیا ہے اور اپنا تخت ان کے بادشاہ کی قبر پر لا کر بچھایا ہے۔''
مسلمان نے جواب دیا: ''مرے ہوئے کی قبر پر بیٹھنا کون سی دلیری کا کام ہے۔ اے کاش! یہ قبر والا آج زندہ ہوتا اور تیرے سامنے ایک سانس بھی لے لیتا تو تجھے اس تخت پر ٹکنا مشکل ہو جاتا۔''
یہ سن کر الفانسو کا طیش سے بُرا حال ہو گیا۔ وہ اس مسلمان کو قتل کرانے والا تھا کہ اس کی ملکہ آڑے آگئی اور بولی:
''یہ سچ ہی تو کہہ رہا ہے۔ کیا تم جیسے بادشاہ کو ایسی ڈینگیں مارنا زیب دیتا ہے۔''[2]

اُن نصرانی ریاستوں کا تعارف جن سے جہاد ہوتا رہا:

۳۹۲ھ میں حاجب المنصور کی وفات کے بعد شمالی نصرانی ریاستوں میں گھس کر جارحانہ حملوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اگلی صدیوں میں مسلمان صرف اپنا دفاع کرتے رہے۔ ۳۹۲ھ تک جو نصرانی علاقے اکثر و بیشتر مسلمانوں کے حملوں کا ہدف رہے، یہاں ان کا مختصر سا جائزہ لیا جاتا ہے جو ہمیں آئندہ کے حالات سمجھنے میں بھی مدد دے گا۔

---

[1] البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲ / ۲۹۱، ۲۹۲
[2] نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۱ / ۳۹۹

برشلونہ(Barcelona): یہ اندلس کا شمال مشرقی ساحلی شہر تھا۔ ۱۸۵ھ میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلا تھا۔ حکم اول، عبدالرحمٰن ثانی اور محمد بن عبدالرحمٰن نے اس کی طرف مہمات بھیجیں مگر شہر نصرانیوں کے پاس ہی رہا۔

برنطانیہ(Boltana): یہ جنوبی فرانس میں کوہ البرت کے پار ایک شہر تھا۔ ۱۷۶ھ میں ہشام اول، ۲۲۶ھ میں عبدالرحمٰن ثانی اور ۲۵۹ھ میں محمد بن عبدالرحمٰن نے اس پر لشکر کشی کی تھی۔

اُربونہ، جرُندہ(Gironde): یہ بھی جنوبی فرانس کے شہر تھے، جہاں کئی بار حملے کیے گئے۔

بنبلونہ: یہ نصرانی ریاست ''نوار'' (ناقار) کا پایہ تخت تھا۔ یہ علاقہ ''بنش تُخنس'' بھی کہلاتا تھا۔ یہاں ۲۲۹ھ میں عبدالرحمٰن ثانی اور ۲۴۷ھ میں محمد بن عبدالرحمٰن نے جہاد کیا تھا۔

البہ اور القلاع یعنی قسطالیہ: یہاں ہشام اول کے دور میں ۱۷۵ھ اور ۱۷۸ھ میں جہاد ہوا۔ عبدالرحمٰن ثانی نے ۲۰۸ھ میں یہاں لشکر کشی کرائی۔ ۲۲۳ھ میں عبیداللہ بن عبداللہ بلنسی نے یہاں حملہ کیا۔ ۲۲۶ھ میں امیر محمد بن عبدالرحمٰن نے یہاں خود لشکر کشی کی، ۲۳۱ھ میں اس نے موسیٰ بن موسیٰ کو یہاں بھیجا، ۲۳۹ھ میں عبدالرحمٰن بن محمد اول اور ۲۵۱ھ میں منذر بن محمد نے فوج کشی کی۔

جلیقیہ: یہاں ۱۷۶ھ، ۱۷۸ھ، ۱۸۵ھ، ۲۲۳ھ، ۲۳۱ھ اور ۲۵۱ھ میں کامیاب حملے ہوئے۔ ۲۶۳ھ کی ایک مہم میں یہاں سینکڑوں مجاہدین شہید ہوئے۔ اس شکست کے بدلے کے لیے ۲۶۴ھ میں بھی فوج کشی ہوئی۔

میُورقہ، منُورقہ، یابسہ: یہ اندلس کے مشرق میں بحیرۂ روم کے جزائر ہیں اور اندلس کی بندرگاہ ''دانیہ'' (Denia) کے قریب ہیں۔ یہاں حکم اول کے دور میں ۱۸۲ھ اور ۲۰۰ھ میں فوج کشی ہوئی، پھر امیر عبدالرحمٰن ثانی نے ۲۳۴ھ میں انہیں فتح کیا مگر فتح کی تکمیل ۲۳۵ھ میں ہوئی۔ علامہ حُمیدی (م ۴۸۸ھ) جنہوں نے اندلس کی تاریخ پر ''جذوۃ المقتبس'' لکھی ہے، جزیرہ منُورقہ کے تھے۔[1]

❖❖❖

[1] التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۲۳۶تا۲۶۲

عبدالملک حاجب المظفر

۳۹۲ھ تا ۳۹۹ھ
(۱۰۰۲ء تا ۱۰۰۸ء)

منصور اعظم نے اپنے نوجوان بیٹے عبدالملک کو جانشین بنادیا تھا جس کی ولادت ۳۶۴ھ میں ہوئی تھی۔ لہٰذا اس کی وفات کے بعد ۲۸ سالہ عبدالملک عملی طور پر ملک کا حکمران بن گیا جبکہ خلیفہ کا رسمی منصب حسب سابق ہشام مؤید باللہ کے پاس رہا۔①

خلیفہ ہشام المؤید کا جلوس:

اس دوران عوام وخواص نے کھل کر مطالبہ کر دیا کہ خلیفہ کے اختیارات بحال کیے جائیں۔ چونکہ خلیفہ ہشام خود خلوت نشینی کا عادی ہو چکا تھا، اس لیے لوگوں کو سراپا احتجاج دیکھ کر اس نے عام دربار منعقد کیا اور عبدالملک کو وہ تمام اختیارات دینے کا اعلان کیا جو اس کے باپ کو حاصل تھے۔ اس نے واضح طور پر کہا کہ وہ اپنی خوشی سے گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا ہے۔ مگر مظاہرین پھر بھی مطمئن نہ ہوئے اور اصرار کیا کہ اب خلیفہ کو خود حکومت چلانی چاہیے۔ آخر عبدالملک نے طاقت استعمال کر کے مجمعے کو منتشر کیا۔②

جہادی کارنامے:

عبدالملک اپنے باپ کی طرح بہادر اور جنگجو تھا، اس کی قیادت میں ملک امن وامان کے ساتھ ترقی وخوشحالی کی شاہراہ پر گامزن رہا۔ عبدالملک نے فوج میں بربروں کی تعداد بڑھادی اور اس نئی طاقت کے ساتھ شمالی نصرانی ریاستوں پر کئی حملے کیے۔ شعبان ۳۹۳ھ میں وہ "الزاہرہ" سے نکلا اور اپنی پہلی مہم پر روانہ ہوا۔ اس مہم میں اس نے "برشلونہ" کے گردونواح میں چھے قلعے فتح کیے اور ۸۵ قلعوں کو مسمار کیا اور ۵ ہزار ۷۰ قیدیوں کے ساتھ واپس آیا۔

اس جہاد کے دوران ایک دن عبدالملک کسی قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ منجنیقوں سے قلعے پر سنگ باری کی جاری تھی اور قریب ہی عبدالملک امراء کی مجلس مشاورت آراستہ کیے بیٹھا تھا۔ اچانک ایک منجنیق کا پتھر اچھل کر واپس ہو گیا

---

① دولة الاسلام في الاندلس: ۲۰۸/۱

② نهاية الارب للنويري: ۲۳/ ۲۰۷، ط دار الكتب والوثائق القومية

اور عبدالملک سے فقط دو بالشت دور آگرا۔ ایک عالم اس کی زد میں آکر جاں بحق ہوگئے۔ عبدالملک بال بال بچ گیا۔[1]

شانجہ غرسیہ سے اختلاف اور دوسری مہم:

عبدالملک کے دور میں قسطالیہ اور نوار کے شاطر اور عمر رسیدہ حاکم شانجہ غرسیہ نے ایک بار پھر سر اٹھایا۔ وجہ یہ بنی کہ اس زمانے میں لیون کا حاکم گیارہ سالہ الفانسو پنجم تھا جس کی سرپرستی جلیقیہ کے حاکم کاؤنٹ من ندیث کو حاصل تھی۔ مگر شانجہ الفانسو پنجم کے ماموں ہونے کی حیثیت سے یہ سرپرستی خود حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آخر مقدمہ عبدالملک کی عدالت میں پیش ہوا جہاں نصرانیوں کے قاضی اسامہ بن اصبغ نے کاؤنٹ من ندیث کی سرپرستی برقرار رکھی۔

شانجہ غرسیہ اس فیصلے سے ناراض ہو کر عبدالملک کا مخالف بن گیا۔ آخر ۳۹۳ھ میں عبدالملک نے اس کی مملکت پر دھاوا بولا جس کے بعد شانجہ غرسیہ کو خود قرطبہ حاضر ہو کر عقدِ صلح اور جنگ میں تعاون کے عہد کی تجدید کرنا پڑی۔[2]

دیگر مہمات اور جنگِ قلونیہ:

۳۹۵ھ میں عبدالملک نے شمال میں جلیقیہ کے سابق مرکز "سمورہ" تک پیش قدمی کی اور ۳۹۶ھ میں "نبلونہ" پر یلغار کی۔ ۳۹۷ھ میں حاکمِ قسطالیہ شانجہ غرسیہ اور حاکم لیون الفانسو پنجم سمیت کئی نصرانی امرا ایک بار پھر قرطبہ کے خلاف متحد ہوئے مگر عبدالملک نے تیزی سے آگے بڑھ کر قلونیہ کے میدان میں ان سب کو شکستِ فاش دی۔ ان فتوحات کے باعث عبدالملک "المظفر" کے لقب سے مشہور ہو گیا۔[3]

اس دور میں اسلامی اندلس کی حالت:

عبدالملک کے دور میں فتوحات کی کثرت کے باعث اسلامی اندلس میں مال و دولت اور خوشحالی کی وہ ریل پیل تھی کہ پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ لوگ بے فکری کی زندگی گزار رہے تھے۔ اوسط آمدن زیادہ تھی اور اخراجات کم۔ متوسط طبقہ بے فکری سے گزر بسر کر رہا تھا جبکہ اصحابِ ثروت کے ہاں زائد دولت کو خزانوں میں محفوظ کرنا معروف ہو گیا۔ اسی طرح رقص و سرود میں یکتا باندیوں کو مہنگے داموں خریدنے کا رواج بھی بڑھ گیا۔ یوں ایسی باندیوں کی قیمتیں بہت بڑھ گئیں۔ دنیا کی چمک دمک نے لوگوں کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں اور وہ اس بہشتِ ارضی میں مستقبل کے خطرات سے بے خبر عیش کا جھولا جھولنے میں مگن تھے۔[4]

وزیر عیسیٰ بن سعید کا انجام:

منصور اعظم کے زمانے سے حکومتی انتظامات عیسیٰ بن سعید عرف ابن قطاع کے ہاتھ میں تھے۔ عبدالملک کے دور میں وزیر کی حیثیت سے اس کی شان مزید بڑھ گئی مگر بعد میں عبدالملک اور اس کے درمیان ناچاقی پیدا ہوگئی۔ بات یہاں

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۳/۵ تا ۱۰

② دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۱ ۶۱

③ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۶۰۷ تا ۶۱۳

④ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۶۰۸

تک بڑھ گئی کہ ابن قطاع اپنے گہرے دوست اُموی شہزادے ہشام بن عبدالجبار (بن عبدالرحمٰن الناصر) کو خلیفہ بنانے کی سازش کرنے لگا مگر عبدالملک کو بروقت خبر مل گئی اور اُس نے ابن قطاع کو کسی بہانے اپنے پاس بلوا کر قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۲۰ ربیع الاوّل ۳۹۷ھ کا ہے۔ اس کے بعد شہزادہ ہشام بن عبدالجبار کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ①

آخری مہم اور وفات:

صفر ۳۹۸ھ میں عبدالملک نے قسطالیہ پر آخری حملہ کیا اور دریائے دویرہ کے کنارے واقع قلعہ سینٹ مارٹین کو گھیر لیا۔ قلعے کی فوج نے باہر نکل کر مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر قلعے میں مورچہ بند ہوگئی۔ عبدالملک نے سنگ باری سے قلعے کی دیواریں توڑ دیں اور مسلمانوں نے اندر گھس کر قلعے پر قبضہ کر لیا۔ یہاں کے تمام سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا۔

اس مہم سے اس کی واپسی ربیع الآخر میں ہوئی۔ ماہِ رمضان گزارتے ہی وہ ایک بار پھر جہاد کے لیے نکل پڑا۔ مگر مدینہ سالم پہنچا تھا کہ بیمار پڑ گیا۔ شفایابی کے انتظار میں وہاں بہت دن گزر گئے۔ اس دوران لشکر کے رضا کار اکتا گئے اور ان کی بڑی تعداد بکھر گئی۔ یہ دیکھ کر عبدالملک نے مہم کو ملتوی کر دیا اور وسط محرم ۳۹۹ھ میں قرطبہ واپس آگیا۔ تین ہفتوں بعد وہ ایک بار پھر جہاد کے لیے نکلا مگر قرطبہ سے نکلتے ہی بیماری بڑھ گئی اور اُسے واپس آنا پڑا۔ مرض کی شدت میں ناک سے خون جاری ہوگیا جس کے بعد ۱۶ صفر (۲۱ اکتوبر ۱۰۰۸ء) کو وہ وفات پا گیا۔ اس کی عمر ۳۳ سال تھی۔ ②

لوگوں میں مشہور تھا کہ اُسے اس کے سوتیلے بھائی عبدالرحمٰن بن محمد نے زہر دیا ہے۔ ③

عبدالملک کے کردار اور دورِ حکومت پر ایک نظر:

عبدالملک کی حکومت کا آغاز ماہِ رمضان ۳۹۲ھ کے اواخر میں ہوا تھا۔ یوں اس کی مدت حکومت چھے سال، ساڑھے چار ماہ بنتی ہے۔ وہ اپنے گناہوں پر رونے اور بکثرت توبہ واستغفار کرنے کا عادی تھا۔ انتہائی دلیر اور نہایت حیادار تھا۔ علماء وصلحاء کی خدمت میں بیٹھتا اور ان سے دعائیں لیتا۔ نبیذ نوشی اس کی بڑی کمزوری تھی مگر اس کی خوبیاں خامیوں پر غالب تھیں۔ وہ عدل وانصاف کے قیام اور شریعت کے نفاذ میں مستعد تھا۔ رعایا سے نرمی برتتا تھا۔ اس نے سرکاری محصولات کا چھٹا حصہ ساقط کر کے عوام کے دل جیت لیے تھے۔ لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ ④

اُموی دور کے باعظمت فرمانرواؤں میں سے وہ آخری شخص تھا۔ اس کے بعد مسلمانانِ اندلس اس تیزی سے زوال وانتشار کا شکار ہوئے کہ چند برسوں میں پورا اندلس چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گیا۔

◆◆◆

---

① البیان المغرب: ۳/ ۳۷ تا ۳۶ ؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۶۱۹

② تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۱۹۰، ط دار الفکر ؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۶۱۵، ۶۱۶

③ البیان المغرب: ۳/ ۳۷ ④ البیان المغرب: ۳/ ۳

اُمویانِ اَندلُس ...... دورِ زوال

① حاجب عبدالرحمٰن شانجول: (صفر تا جمادی الاولیٰ ۳۹۹ھ ...... اکتوبر ۱۰۰۸ء تا جنوری ۱۰۰۹ء)

عبدالملک کی ناگہانی وفات کے بعد اس کا سوتیلا بھائی عبدالرحمٰن شانجول اندلس کی حکومت پر براجمان ہوگیا۔ وہ قرطبہ کے کٹر مخالف نصرانی حکمران شانجہ غرسیہ (شاہِ قسطالیہ) کا نواسا تھا۔ شانجہ غرسیہ نہایت عیار تھا۔ کبھی مسلمانوں سے صلح کرتا اور کبھی ہتھیار اٹھالیتا۔ ایک صلح کے موقع پر اس نے اپنی بیٹی "عبدہ" منصور اعظم کے نکاح میں دے دی تھی۔ اس لڑکی نے اسلام قبول کرلیا اور منصور اعظم کی سب سے چہیتی بیگم ثابت ہوئی۔ عبدالرحمٰن شانجول اسی کی اولاد تھا۔ چونکہ شکل وصورت میں وہ اپنے نانا شانجہ غرسیہ سے ملتا جلتا تھا، اس لیے لوگ اسے "شانجول" یعنی چھوٹا شانجہ کہا کرتے تھے۔ ۳۸۲ھ میں جب شانجہ غرسیہ تجدید صلح کے لیے قرطبہ آیا تو اس وقت عبدالرحمٰن شانجول، دودھ پیتا بچہ تھا۔ ۱۲ سال بعد ۳۹۴ھ میں شانجہ حاجب عبدالملک سے تجدید صلح کے لیے ایک بار پھر قرطبہ آیا۔ اس وقت اس کا نواسا جوانی کی حدود میں قدم رکھنے کو تھا۔ شانجہ کو یہ دیکھ کر یقیناً خوشی ہوئی ہوگی کہ اندلس کے اگلے حکمرانوں میں اس کی نسل بھی حصہ دار بننے والی ہے۔[1]

شانجہ کی سیاست کامیاب رہی اور عبدالملک کے مرتے ہی اس کا نواسا اندلس کے سیاہ وسپید کا مالک بن گیا۔ مشہور تھا کہ اسی نے عبدالملک کو زہر آلود شربت کے ذریعے قتل کرایا تھا۔[2]

حکمران بن کر عبدالرحمٰن شانجول مسلمانوں کو تیزی سے تباہی کی طرف لے گیا۔ اندلس میں حکومت کا وقار اور حکمران کا رعب داب ختم ہوگیا۔ عوام صبر وتحمل سے عاری اور خواص بصیرت سے محروم ہوگئے۔

عبدالرحمٰن شانجول زبردستی تخت پر قابض ہوا تھا۔ اخلاق وکردار کے لحاظ سے بالکل نااہل تھا۔ اس کا سارا وقت کھیل تماشے اور عیش وعشرت میں گزرتا تھا۔ لہٰذا عوام وخواص سب اس سے نفرت کرنے لگے۔

حاجب المنصور اور عبدالملک نے اپنی قابلیت کے باوجود اپنے لیے "خلافت" حاصل کرنے یا خلیفہ کا ولی عہد بننے کی کوشش نہیں کی مگر عبدالرحمٰن شانجول نے تخت نشینی کے کچھ ہی دنوں بعد خلیفہ ہشام سے مطالبہ شروع کردیا کہ وہ اسے مسندِ خلافت کا جانشین مقرر کردے۔ ہشام نے پس وپیش کی مگر عبدالرحمٰن شانجول نے دباؤ ڈال کر اپنی ولی عہدی کا وثیقہ

---

① دولة الإسلام في الأندلس: ۱/ ۶۱۱،۵۸۲،۵۸۳

② دولة الإسلام في الأندلس: ۱/ ۶۱۵

تحریر کرالیا۔ اس طرح لوگوں کی بددلی میں مزید اضافہ ہوا کیوں کہ وہ اب بھی بنو اُمیہ کو دیگر خاندانوں پر ترجیح دیتے تھے۔

عبدالرحمن شانجول، ولی عہدی کا اعلان کرانے کے بعد فتوحات کی دھاک بٹھانے 'لیون' پر فوج کشی کرنے نکل پڑا۔ پیچھے قرطبہ کے امراء نے بغاوت کر دی۔ انہوں نے کٹھ پتلی خلیفہ ہشام بن حکم کے لڑکے محمد بن ہشام کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس نوجوان نے اپنے باپ کو قوتِ فیصلہ سے محروم قرار دے کر برطرف کرا دیا اور ۷ جمادی الاولیٰ ۳۹۹ھ (۲۹ جنوری ۱۰۰۹ء) میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ شانجول نے یہ اطلاع سنی تو اپنی مہم ادھوری چھوڑ کر پلٹا مگر فوج نے ساتھ چھوڑ دیا اور وہ واپسی میں راستے ہی میں قتل کر دیا گیا۔ اس کی نعش قرطبہ لا کر شارعِ عام پر لٹکا دی گئی۔[1]

عبدالرحمن شانجول کی موت کے ساتھ ہی قرطبہ میں ایک نہ ختم ہونے والی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ شروع ہو گئی۔ ایک طرف بربر تھے جو ویسے تو شروع سے اندلس کے اسلامی لشکر کا اہم حصہ تھے مگر محمد بن ابی عامر کے تیس سالہ دور میں ان کی بہت بڑی کھیپ مراکش سے قرطبہ منتقل ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ عبدالرحمن الناصر نے اپنے دور میں مراکش پر قبضہ کر کے دولتِ ادارسہ کی باقیات کا خاتمہ کر دیا تھا۔ چنانچہ اس حکومت کے بربر سپاہی، اس کے بعد تختِ قرطبہ سے وابستہ ہو گئے اور محمد بن ابی عامر کی فتوحات میں اصل زور انہی کا تھا۔

مگر عرب خصوصاً بنو اُمیہ کے وفاداروں کو محمد بن ابی عامر سے اس لیے نفرت تھی کہ اس نے اُموی خانوادے کو بے دست وپا کر دیا تھا، اس لیے وہ بربروں کو جو محمد بن ابی عامر کے دست و بازو تھے، اپنے دشمن سمجھنے لگے تھے۔

ایک گروہ ان صقلبی افسران وسپاہ کا بھی تھا جنہیں محمد بن ابی عامر کے دور میں ترقیاں ملی تھیں لہٰذا وہ اُموی اقتدار کو روکنے کے لیے بربروں سے ملنے میں کچھ حرج نہیں سمجھتے تھے۔ عربوں کے اس گروہ کو "جوانانِ عامری" کہا جاتا تھا۔

الغرض ان مختلف الخیال گروہوں کی کش مکش کی بنا پر قرطبہ میں یکے بعد دیگرے حکمران آتے اور جاتے رہے۔ امراء کسی ایک کو "مسندِ خلافت" پر بٹھاتے مگر عوام احتجاج کر کے اسے اترنے پر مجبور کر دیتے۔ پھر کوئی لیڈر عوام کا نمائندہ بن کر ان کی حمایت کے ساتھ اوپر آتا مگر امرائے لشکر کے ہاتھوں مارا جاتا۔ قرطبہ کے قضاۃ اور فقہاء کسی نیک بندے کو دستارِ خلافت پہناتے مگر وہ محلاتی سازشوں کا شکار ہو کر قتل ہو جاتا یا جیل کی کسی کال کوٹھری میں پہنچ جاتا۔ اقتدار کا کوئی بھوکا بربری قبائل کے بل بوتے پر مسندِ حکمرانی تک آن پہنچتا مگر عرب امراء بغاوت کر کے اس کا تختہ الٹ دیتے۔ الغرض مختلف حکمران اب یکے بعد دیگرے قرطبہ کے تخت پر بیٹھنے اور اُترنے لگے۔

◆◆◆

② محمد ثانی بن ہشام المہدی: (جمادی الاولیٰ ۳۹۹ھ تا ربیع الاول ۴۰۰ھ..... جنوری ۱۰۰۹ء تا نومبر ۱۰۰۹ء)

عبدالرحمن شانجول کے قتل کے بعد محمد بن ہشام نے المہدی کا لقب اختیار کر کے حکومت شروع کی تھی۔ اسے محمد ثانی بھی کہا جاتا تھا۔ تخت نشین ہو کر اس نے اپنے والد ہشام بن حکم کو کسی خفیہ مقام پر قید کر دیا اور مشہور کر دیا کہ وہ فوت

---

① نهاية الأرب للنويري: ۲۳/ ۴۱۰، ط دار الكتب والوثائق القومية؛ تاريخ ابن خلدون: ۴/ ۱۹۰، ط دار الفكر

ہو گیا ہے۔ المہدی کردار کے لحاظ سے شانجول سے بھی گیا گزرا تھا۔ وہ تخت پر بیٹھ کر تمام ذمہ داریوں سے غافل ہو گیا اور عیش وعشرت، مے نوشی اور دیگر معاصی میں منہمک ہو گیا۔

اس کی اصل طاقت قرطبہ کے وہ لوگ تھے جو بنو اُمیہ کے مداح اور خانوادہ منصور اعظم کے مخالف تھے۔ المہدی انہی کے بل بوتے پر مسندِ اقتدار تک پہنچا تھا، اور اپنی فوج بھی انہی سے ترتیب دی تھی، اس لیے عوام کو روکنا اس کے بس سے باہر ہو گیا۔ وہ خود بھی دوراندیشی سے محروم تھا اور اس کے حامی اس سے کہیں بڑھ کر ضدی اور متعصب تھے۔ وہ بنو اُمیہ کے دلدادہ اور حاجب المنصور کے خاندان کے دشمن تھے۔ وہ غضب ناک تھے کہ حاجب المنصور اور اس کے بیٹوں نے اُموی خلفاء کو اپنے ماتحت کیوں رکھا۔ چونکہ اب نہ تو نصرانیوں پر عقاب کی طرح جھپٹنے والا المنصور زندہ تھا نہ اس کے بیٹے۔ لہٰذا بنو اُمیہ کے ان عقیدت مندوں نے بنو عامر کی دشمنی میں منصور اعظم کے تعمیر کردہ عظیم الشان شہر "الزاہرہ" پر دھاوا بول دیا اور اسے جی بھر کر تاراج کیا۔ چار دن تک بلوائی قصر الزاہرہ کا ساز وسامان لوٹتے رہے۔ اس کی خوبصورت عمارتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور آخر میں شہر کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ یہ واقعہ غمازی کر رہا تھا کہ اندلس کے مسلمان سیاسی بے بصیرتی کی انتہاء پر پہنچ چکے ہیں۔

مہدی بطور سیاست دان بالکل ناکام ثابت ہوا۔ پہلے اس نے بربروں کو غیر مسلح کر کے اہلِ قرطبہ کو ان پر چڑھ دوڑنے کا کھلا موقع دیا، یوں بربر اس کے مخالف ہو گئے۔ پھر اس نے اقتدار چھیننے کا شک کر کے اُموی شہزادوں کو دبانے اور ختم کرنے کی کوشش کی اور یوں عربوں کو بھی اپنا دشمن بنا لیا۔ قرطبہ میں ایسی افراتفری مچی کہ الامان والحفیظ۔

ایسے میں بربروں نے ایک اُموی شہزادے سلیمان بن الحکم (بن عبدالرحمٰن الناصر) کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کی قیادت میں مہدی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ سلیمان نے اس موقع پر نصرانی ریاست قسطالیہ کے سربراہ شانجہ سے مدد کی درخواست کی۔ اس شاطر سیاست دان کو بھلا مسلمانوں کو تباہ کرنے کا اس سے اچھا موقع اور کیا مل سکتا تھا۔ چنانچہ نصرانی فوج بھی سلیمان بن الحکم کے ساتھ آملی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ اندلس میں مسلمانوں نے مسلمانوں کے خلاف نصرانیوں سے مدد لی۔ اس کے بعد نصرانیوں کی اعانت سے اپنے ہم مذہبوں کو نیچا دکھانا یہاں کی سیاست کا جزو لازم بن گیا۔ بہر کیف ۱۳ ربیع الاوّل ۴۰۰ھ کو قرطبہ کے باہر فریقین میں جنگ ہوئی۔ مہدی کی بے تدبیری کے باعث اس کے حامی بکھر چکے تھے، لہٰذا اس کی فوج کم تھی۔ تاہم شہریوں کی بہت بڑی تعداد اس کے ہمراہ تھی۔ آخر ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں مہدی کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ بیس ہزار سے زائد لاشیں چھوڑ کر پسپا ہو گیا جن میں بہت سے علماء، ائمہ مساجد، مؤذن اور نیک لوگ بھی تھے۔

مہدی قرطبہ کی فصیلوں کے پیچھے محصور ہو گیا مگر اب تمام تدابیر ناکام ہو چکی تھیں۔ جب اُس نے دیکھا کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں تو اس نے اپنے والد ہشام کو جو ایک خفیہ قید خانے میں بند تھا، باہر نکال کر قرطبہ میں تخت پر بٹھا دیا اور قاضی ابوذکوان کو سفیر بنا کر اس پیغام کے ساتھ بربروں کے پاس بھیجا کہ شرعی خلیفہ ہشام بن الحکم زندہ سلامت ہے

اور محمد المہدی فقط نائب سلطنت ہے، لہٰذا شرعی خلیفہ کے مدِ مقابل ہونا درست نہیں۔ بربروں نے سفیر کو بڑی اہانت کے ساتھ واپس بھیج دیا اور سلیمان کو خلیفہ بنانے پر مصر رہے۔ مہدی نے جب کوئی چارہ نہ دیکھا تو بھیس بدل کر قرطبہ سے فرار ہو گیا اور طلیطلہ پہنچ گیا۔[1]

◆◆◆

④ سلیمان بن الحکم مستعین باللہ: (ربیع الاول ۴۰۰ھ تا شوال ۴۰۰ھ ..... نومبر ۱۰۰۹ء تا مئی ۱۰۱۰ء)

۱۵ ربیع الاول ۴۰۰ھ میں بربر فاتحانہ طور پر قرطبہ میں داخل ہو گئے اور سلیمان بن الحکم مسندِ خلافت پر بیٹھ گیا۔ چونکہ اس فاتح لشکر میں نصرانی بھی شامل تھے لہٰذا لوٹ مار میں وہ بھی شریک رہے۔ یوں قرطبہ کئی دنوں تک بربروں اور نصرانیوں کے ہاتھوں لٹتا رہا۔ آخر سلیمان نے بڑی مشکل سے انہیں روکا۔ کچھ امن ہوا تو اس نے ''المستعین باللہ'' کا لقب اختیار کر کے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اس نے عبدالرحمٰن شانجول کی بوسیدہ لاش کو بھی جو کئی ماہ سے شاہراہِ عام پر لٹکی ہوئی تھی، اتروایا اور اس کی تدفین کرائی۔

اُدھر مہدی کے پاس طلیطلہ میں کچھ مطلب پرست امرا جمع ہو گئے تھے جنہوں نے قرطبہ کو واپس لینے کے لیے نصرانیوں سے رابطے قائم کر لیے۔ آخر قطلونیہ کی نصرانی فوج کو لے کر یہ لوگ مستعین سے جنگ کی تیاری کرنے لگے۔ مستعین کو یہ خبر ملی تو وہ قرطبہ سے فوج لے کر طلیطلہ کی طرف بڑھا اور وہاں کے لوگوں کو اپنی اطاعت کی دعوت دی، تاہم اس کی ترغیب بالکل بے اثر رہی۔ آخر مستعین واپس قرطبہ چلا گیا۔

اُدھر مہدی کی قوت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے تین نئے اتحادی مل گئے تھے۔ ان میں سے ایک کا تعلق جوانانِ عامری گروہ سے تھا۔ یہ ''مدینہ سالم'' کا خودمختار امیر واضح تھا۔ باقی دو اتحادیوں میں سے ایک ریاست ''اورقلہ'' کا نواب ارمنجو اور دوسرا برشلونہ کا نواب رامون بوریل تھا۔ نصرانیوں نے اس مہم میں شمولیت کے لیے درج ذیل شرائط رکھی تھیں:

1. ان کے لیے حسبِ طلب کھانے اور شراب کا انتظام کیا جائے گا۔
2. نوابوں کو یومیہ سو اشرفیاں دی جائیں گی۔
3. ہر نصرانی سپاہی کو یومیہ دو اشرفیاں دی جائیں گی۔
4. بربروں سے ملنے والے مالِ غنیمت کے حق دار صرف نصرانی ہوں گے۔
5. مدینہ سالم ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔

یہ تمام شرائط منظور کر لی گئیں اور آخر اتحادی لشکر قرطبہ روانہ ہو گیا۔ اُدھر سے مستعین بھی بربروں اور اہلِ قرطبہ کے جمِ غفیر کے ساتھ باہر نکلا۔ وسط شوال ۴۰۰ھ (وسطِ مئی ۱۰۱۰ء) میں قرطبہ سے بیس کلومیٹر دور عقبۃ البقر کے مقام پر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ فرنگیوں نے بربروں کی صفوں کو چیر دیا۔ یہ دیکھ کر مستعین سمجھا کہ لشکر کو شکست ہو گئی ہے۔ اگر

---

① تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۱۹۱، ۱۹۲؛ نفح الطیب: ۱/ ۴۲۷، ۴۲۸؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۶۴۴ تا ۶۴۷

وہ جم کر لڑتا تو جنگ کا نتیجہ مختلف ہوسکتا تھا مگر وہ گھبرا کر اپنے خواص کے ساتھ قصبہ شاطبہ کی طرف فرار ہوگیا۔ یہ دیکھ بربروں نے بھی میدان چھوڑ دیا اور مدینۃ الزہراء کی طرف نکل گئے اور وہاں سے اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر محفوظ مقامات کی طرف چلے گئے۔[1] یوں میدان مہدی اور اس کے اتحادیوں کے ہاتھ رہا۔

✦✦✦

④ **محمد ثانی المہدی، دوبارہ:** (شوال تا ذوالحجہ ۴۰۰ھ ...... مئی تا جولائی ۱۰۱۰ء)

۱۶ شوال ۴۰۰ھ کو مہدی قرطبہ میں داخل ہوگیا۔ قرطبہ ایک بار پھر مسلمانوں کے ''مددگار'' نصرانیوں کے ہاتھوں بُری طرح تاراج ہوا۔ مہدی نے نصرانی اتحادیوں کو حسبِ معاہدہ عطیات اور انعامات سے نوازا۔

اُسے سب سے زیادہ خطرہ بربروں سے تھا جو میدانِ جنگ سے اپنی طاقت کو بچا کر وادی آرہ چلے گئے تھے جو جزیرہ خضراء کے راستے میں ایک مقام تھا۔ مہدی لشکر مرتب کر کے ان کے تعاقب میں نکلا۔ اس کے ساتھ تیس ہزار مسلمان اور نو ہزار نصرانی تھے۔ ذوالقعدہ ۴۰۰ھ (جون ۱۰۱۰ء) میں فریقین میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں خلافِ توقع بربر غالب رہے اور ان کے ہاتھوں تین ہزار سے زائد نصرانی اتحادی قتل ہوگئے تھے۔ مہدی بُری طرح شکست کھا کر واپس قرطبہ کی طرف پسپا ہوگیا۔ قرطبہ پہنچتے ہی نصرانی اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنی ریاستوں کی طرف لوٹ گئے۔ اُدھر بربر اس فتح کے بعد جنوب کی طرف چلے گئے اور ''وادی ریہ'' میں مستعین (سلیمان بن حکم) سے جاملے۔

قرطبہ آکر مہدی نے اپنی حکومت جمانے کی کوشش شروع کی، مگر اقتدار زیادہ دنوں تک اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اس کی مے نوشی، بدخلقی اور دیگر حماقتوں کے باعث اس کے افسران تنگ آچکے تھے۔ انہیں یہ بھی سخت ناگوارِ خاطر تھا کہ مہدی نے بنو اُمیہ اور بنو عامر دونوں سے بے مروتی برتی ہے۔ ان ناراض سرداروں میں مدینہ سالم کا سابق حاکم واضح سب سے پیش پیش تھا جو بنو عامر کا پروردہ تھا۔ آخر ان سرداروں نے ۸ ذوالحجہ ۴۰۰ھ کو بغاوت کر دی جس میں مہدی مارا گیا۔ اس کا سر قلم کر کے قرطبہ کی شاہراہ پر لٹکا دیا گیا۔

سابق گوشہ نشین خلیفہ ہشام المؤید باللہ جو ایک عرصے سے قید تھا رہا کر کے دوبارہ مسندِ خلافت پر بٹھا دیا گیا۔[2]

✦✦✦

⑤ **ہشام المؤید، دوبارہ:** (ذوالحجہ ۴۰۰ھ تا شوال ۴۰۲ھ ...... جولائی ۱۰۱۰ء تا جولائی ۱۰۱۲ء)

ہشام المؤید نے اپنا پہلا دورِ اقتدار کٹھ پتلی کی طرح گزارا تھا۔ اب دوبارہ مسندِ خلافت پر بیٹھتے وقت اس کی عمر ۴۷ سال ہو چکی تھی۔ پہلی بار مسند نشینی کو اب ۳۴ سال گزر چکے تھے۔ اسلامی اندلس کی تاریخ میں یہ ۳۴ سال آئینی حکمران کی بے بسی اور غیر آئینی حکمرانوں (جرنیلوں) کے تسلط کے تھے۔ ان میں سے تیس سال تک ملک کی باگ ڈور ایک

---

① تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۱۹۲، ۱۹۳، ط دار الفکر؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۶۳۳ تا ۶۳۸، ۶۳۸

② تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۱۹۳، ۱۹۳، ط دار الفکر؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۶۳۸، ۶۳۹

طاقتور اور قابل جرنیل ابن ابی عامر (منصور اعظم) کے ہاتھ میں رہی، اس لیے امن و امان رہا۔ مگر پھر فتنوں کا دور شروع ہوا اور قرطبہ کا تخت اقتدار کے حریصوں کے لیے بازیچۂ اطفال بن گیا۔

اب ایک مدت بعد ہشام المؤید کو دوبارہ مسندِ خلافت ملی تھی تو وہ اپنے سابقہ دورِ حکومت کے برخلاف شہر کی سڑکوں پر ظاہر ہوا اور شاہی جاہ و جلال کو نمایاں کیا تاکہ لوگوں پر رعب پڑے۔ اگرچہ وہ جرنیل اور اُمراء جو اسے قید خانے سے نکال کر لائے تھے، اس پر اثر انداز تھے۔ ان میں واضح فتی سب سے نمایاں تھا جو خلیفہ کا حاجب بن گیا تھا۔

بہرکیف ہشام المؤید نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح امن و امان قائم ہو اور بربروں سے صلح ہو جائے۔ اس نے مہدی کا کٹا ہوا سر بھی ان کے پاس بھیج دیا تاکہ اپنے دشمن کا انجام دیکھ کر ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے مگر بربروں نے صاف جواب دے دیا کہ وہ اپنے قائد سلیمان بن حکم (مستعین باللہ) کے سوا کسی کی حکومت پر راضی نہیں۔

دراصل بربروں میں اہلِ قرطبہ سے نفرت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ماضی میں قرطبہ کے عرب شہزادوں اور اُمراء سے انہیں جو تکالیف پہنچی تھیں، وہ اس کے بدلے قرطبہ کی تباہی پر تلے ہوئے تھے، اس لیے وہ کسی سمجھوتے پر راضی نہ ہوئے۔ جلد ہی انہوں نے قسطالیہ کے حکمران شانجہ سے رابطہ کر کے ایک بار اس سے عسکری مدد مانگی تا کہ قرطبہ کو فتح کیا جا سکے۔ بدلے میں منصور اعظم کے فتح کردہ تمام قلعے نصرانیوں کو لوٹانے کی پیش کش کی۔ شانجہ سمجھدار سیاست دان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی پیش کش کا مجاز فقط قرطبہ کا مسند نشین خلیفہ ہے۔ لہٰذا اس نے بربروں کو ٹال دیا اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کے نتیجے کا منتظر رہا۔

بربروں کے ہاتھوں الزہراء کی تباہی:

جب بربروں کو قرطبہ جیسے مستحکم شہر کی تسخیر کے لیے مطلوبہ قوت نہ ملی تو وہ قصبات اور چھوٹے شہروں کو تہس نہس کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سب سے پہلے ربیع الاول ۴۰۱ھ (نومبر ۱۰۱۰ء) میں قرطبہ سے ملحق مدینۃ الزہراء پہنچے اور یہاں کی اکثر محافظ فوج کو مار ڈالا۔ وہ شعبان تک اس مقام پر خیمہ زن رہے۔

قرطبہ کے عربوں نے بربروں کے سرپرست منصور اعظم کے شہر "الزاہرہ" کو تہس نہس کیا تھا، اس لیے بربروں نے اس کے ردِ عمل میں "مدینۃ الزہراء" میں قیام کے دوران اس شہر کی عمارتوں کو بُری طرح اپنے انتقام کا نشانہ بنایا اور یہاں سے جاتے وقت انہوں نے شہر کو نذرِ آتش کر دیا۔

یوں وہ شہر جس کی ہر عمارت فنِ تعمیر کا ایک شہ پارہ اور تہذیب کا ایک تاج محل تھی، عصبیت کی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا۔ ہنگامہ آرائی اور بے لگامی کے راستے پر نکلنے والوں نے اُمویانِ اندلس کے اس بے مثال تعمیراتی شہ کار کو جس طرح پامال کیا، وہ لائقِ صد افسوس ہے۔

---

① تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۱۹۳، ۱۹۴، ط دار الفکر؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۶۳۹ تا ۶۵۳

اپنا گلشن آپ اجاڑا فخر کیا کہ فاتح ہیں
اپنی بستی پھونک کے ہم نے جنگ کا میداں مارا تھا
الزہرا کی عظمتِ رفتہ لوٹ کے اب نہ آئے گی
یاد کرے گی دُنیا مسلم خود سے خود ہی ہارا تھا [1]

الزہرا کے کچھ باقی ماندہ مکانات میں بعض لوگ رہا کرتے تھے مگر اس کا زیادہ حصہ غیر آباد ہی رہا۔ بعد کے مسلمان حکمرانوں نے اس کی تعمیرِ نو پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ باہمی خانہ جنگیوں میں مشغول رہے اور یہ شہر اُجڑتا چلا گیا۔ نصرانیوں کے دورِ اقتدار میں یہ مزید پامال ہوتا رہا۔ اس طرح وہ مدینۃ الزہراء جس کی سحر انگیز دلکشی بڑے بڑے بادشاہوں کو دنگ کر دیتی تھی، کھنڈر بن کر رہ گیا۔ آج اس مقام کو دیکھ کر موئن جودڑو اور ہڑپہ کا ملبہ یاد آتا ہے اور یہ باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ان منہدم بنیادوں پر کبھی اسلامی اندلس کی تہذیب کے وہ عظیم الشان محل کھڑے تھے جنہیں دیکھ کر یورپی سفیروں کو غش آجایا کرتا تھا۔ الزہراء کے کھنڈرات پر شیخ محی الدین ابن العربی رحمہ اللہ کے یہ اشعار اشک آور ہیں:

دِیَارٌ بِاَکْنَافِ الْمَلَاعِبِ تَلْمَعُ
وَمَا اِنْ بِهَا سَاکِنٌ وَهِيَ بَلْقَعُ

''ان تماشا گاہوں کے اردگرد کچھ مکانات صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ ان میں رہنے والا کوئی نہیں اور وہ بالکل ویران ہیں۔''

یَنُوحُ عَلَیْهَا الطَّیْرُ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ
فَیَصْمُتُ اَحْیَانًا وَحِیْنًا یُرَجِّعُ

''لگتا ہے چاروں طرف پرندے ان پر نوحہ وزاری کر رہے ہیں، کبھی چپ ہو جاتے ہیں، کبھی سسکیاں بھرتے ہیں۔''

فَخَاطَبْتُ مِنْهَا طَائِرًا مُتَغَرِّدًا
لَهُ شَجَنٌ فِی الْقَلْبِ وَهُوَ مُرَوَّعُ

''میں نے ایک چہچہاتے ہوئے پرندے کو کہ جس کے دل میں غم تھا اور وہ خوفزدہ تھا مخاطب کیا۔''

فَقُلْتُ عَلٰی مَا تَنُوحُ وَتَشْتَکِیْ
فَقَالَ عَلٰی دَهْرٍ مَضٰی لَیْسَ یَرْجِعُ

''میں نے پوچھا: تو کس بات پر نوحہ وزاری اور فریاد کر رہا ہے؟''
کہنے لگا: ''اس زمانے پر جو گزر گیا اور لوٹ کر نہیں آئے گا۔'' [2]

---

[1] سائرؔ [2] نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۱/۵۲۳

ہشام المؤید لاپتا:

الزہرا کو اجاڑ کر بربروں نے ایک طرف قرطبہ کا محاصرہ کرلیا اور دوسری طرف ان کے بہت سے دستے جنوبی اندلس کی طرف چلے گئے جہاں انہوں نے غرناطہ اور مالقہ جیسے شہروں کے گرد ونواح میں لوٹ مار کا بازار گرم کردیا۔

بربروں کی تباہ کاریاں دیکھ دیکھ کر ہشام المؤید اور اس کے اُمراءِ قرطبہ میں لرزہ براندام تھے۔ ساتھ ہی انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ اگر ایسے میں نصرانی بھی بربروں سے آملے تو شہر کا دفاع ناممکن ہوجائے گا۔

شانجہ کو اسی وقت کا انتظار تھا۔ اس نے حکومتِ قرطبہ کے خوف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سفارتی وفد بھیجا جس نے مطالبہ کیا خلیفہ الحکم سے لے کر منصور اعظم کے دور تک فتح کیے گئے تمام شہروں اور قلعوں کی تولیت نصرانیوں کو واپس کی جائے۔ ہشام المؤید کو ہر قیمت پر نصرانیوں کی خوشنودی چاہیے تھی تاکہ بربروں کو مزید قوت نہ ملے چنانچہ اس نے یہ معاہدہ کرلیا جسے علماء وفقہاء اور نصرانی عمائد کی موجودگی میں قانونی شکل دی گئی۔ اس معاہدے نے اندلس کے مسلمانوں کی تباہی کا فیصلہ کردیا۔ اس کے مطابق دو سو سرحدی قلعے اور چند شہر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ان شہروں میں شنت اشتمن، قلونیہ، اوسمہ اور غرماج شامل تھے۔ اس طرح اسلامی اندلس اپنے دفاع کے خطِ اولین سے محروم ہوگیا۔ دو صدیوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ اندلس کے کسی حکمران نے خود نصرانیوں کو اپنی زمین دی ہو۔

تاہم اس قدر ذلت آمیز اقدام کا حکومتِ قرطبہ کو ذرہ برابر فائدہ نہ ہوا۔ بربروں سے انہیں پھر بھی نجات نہ ملی اور شہر پر ان کے حملے جاری رہے۔ شہری فصیل کے دروازے بند کر کے کئی ماہ تک مزاحمت کرتے رہے۔ کئی بار انہوں نے شہر سے باہر نکل کر بھی حملے کیے مگر وہ بربروں کو پسپا نہ کرسکے۔ آخرکار ۲۶ شوال ۴۰۳ھ (یکم جون ۱۰۱۳ء) کو فریقین میں نہایت خونریز جنگ ہوئی جس میں اہلِ قرطبہ کو شکستِ فاش ہوئی۔ اس دوران کچھ لوگوں نے فصیل کے دروازے کھول دیے اور بربر جنگجو بپھرے ہوئے طوفان کی طرح شہر میں گھس گئے۔ انہوں نے ہزاروں لوگوں کو تہہ تیغ کر کے خون کی ندیاں بہادیں۔ بچوں، بوڑھوں اور خواتین تک کو نہیں بخشا گیا۔ عورتوں کو اغواء کر کے ان کی عصمت دری کی گئی۔ اگلے دن سلیمان مستعین لوگوں کی لاشوں سے گزر کر بربروں کے کاندھوں پر مسندِ خلافت تک پہنچا۔ ہشام المؤید لاپتا ہوگیا۔ کچھ کا کہنا تھا کہ وہ قتل کردیا گیا ہے۔ کچھ کا خیال تھا کہ سلیمان نے اُسے کسی خفیہ جگہ قید کر رکھا ہے۔[1]

◆◆◆

⑥ مستعین باللہ۔ دوبارہ: (شوال ۴۰۳ھ تا محرم ۴۰۷ھ ..... جون ۱۰۱۳ء تا جولائی ۱۰۱۶ء)

سلیمان مستعین باللہ قرطبہ میں دوبارہ حکمران بن گیا۔ وہ ذاتی طور پر علم وفضل سے آراستہ تھا اور اچھا شاعر وادیب تھا مگر وہ سیاست میں کمزور تھا، لہٰذا بربروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا تھا۔ ان ایام میں بربروں کے جتھے قبائل: بنو زیری (صنہاجہ)، بنو مغراوہ، بنو برزال، بنو یفرن، بنو دمر اور بنو ازداجہ پوری حکومت پر حاوی تھے۔

---

① تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۱۹۳، ۱۹۲، ط دار الفکر؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/ ۶۳۹ تا ۶۵۳

آخر مستعین نے انہیں قرطبہ سے نکالنے کے لیے کئی اہم اضلاع اور شہروں کی ولایت انہی کے سپرد کر دی۔ چنانچہ ضلع البیرہ (غرناطہ) بنو زیری کو، ضلع جیان مع مضافات بنو برزال اور بنو یفرن کو اور ضلع شذونہ اور مورو بنو دمر اور بنو ازدلیہ کو دے دیے گئے۔ بنو مغراوہ کو بعض وسطی شہر دے دیے گئے۔ یوں بربر جنوبی اور وسطی اندلس پر چھا گئے۔

جب بنو عامر کے وفادار اُمراء نے یہ منظر دیکھا تو بربروں سے خوف محسوس کیا لہٰذا اُن کی اکثریت قرطبہ چھوڑ کر وہاں سے بہت دور مشرقی اندلس چلی گئی۔ اُن کے ایک افسر مجاہد نے "دانیہ" میں اور دوسرے افسر خیران نے المریّہ اور مُرسیہ میں کچھ قلعوں پر چھوٹی چھوٹی آزاد حکومتیں بنا لیں۔

مستعین نے عربوں کو بھی کچھ اضلاع اور شہر دیے، مثلاً بنو تجیب کے منذر بن یحییٰ کو سرقسطہ اور شمالی سرحدوں کی ولایت دے دی۔ نیز اس زمانے میں مراکش کے حکمران خاندان الادارسہ کے بعض شہزادے اور اُمراء حکومت سے محروم ہونے کے بعد نئے مواقع کی تلاش میں قرطبہ آچکے تھے۔ ۴۰۴ھ میں مستعین نے انہیں مغربی سرحدوں کے اضلاع بخش دیے۔ علی بن حمود کو سبتہ کا حاکم بنا دیا جبکہ اس کے بھائی قاسم بن حمود کو جزیرۃ الخضراء اور طنجہ کی ولایت دے دی۔ مستعین نے سلطنت کو اس طرح تقسیم کر کے بظاہر قرطبہ کو بچا لیا تھا مگر یہی کام بہت جلد اُس کے دشمن بن گئے۔ ہوا یہ کہ ان دنوں یہ بات مشہور ہو گئی کہ سابق خلیفہ ہشام المؤید کی طرف سے علی بن حمود کو ایک خفیہ پیغام پہنچا تھا جس میں اُسے اپنا ولی عہد مقرر کیا گیا تھا اور اُسے تاکید کی گئی تھی کہ اگر وہ قتل کر دیا جائے تو علی بن حمود اس کا انتقام لے۔

یہ خط حقیقی تھا یا فرضی۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ بہرکیف علی بن حمود نے اسے بنیاد بنا کر مستعین کے خلاف مہم شروع کر دی۔ وہ ۴۰۶ھ کے اواخر میں سمندر عبور کر کے سبتہ سے اندلس آن پہنچا جہاں مالقہ کے حاکم عامر بن فتوح نے اپنا شہر اس کی تولیت میں دے دیا۔ المریّہ کا خیران عامری اور غرناطہ سے بربروں کا سردار زاوی بن زیری بھی اس سے آملے۔ یہ لشکر قرطبہ روانہ ہوا۔ اُدھر سے مستعین بھی لشکر لے کر نکلا۔ محرم ۴۰۷ھ میں قُرطبہ سے دس میل دور معرکہ برپا ہوا جس میں مستعین شکست کھا کر اپنے بھائی اور باپ سمیت گرفتار ہو گیا۔ علی بن حمود ۲۸ محرم ۴۰۷ھ (۸ جولائی ۱۰۱۶ء) کو نئے حکمران کی حیثیت سے قُرطبہ میں داخل ہوا۔ اُس کا خیال تھا کہ سابق خلیفہ ہشام المؤید کسی عقوبت خانے میں ہے اور مستعین نے اسے قتل نہیں کرایا۔ لہٰذا آتے ہی اس نے ہشام کو تلاش کرانا شروع کیا مگر وہ نہ ملا۔ جب اُس کے قتل کی تصدیق ہو گئی تو علی بن حمود نے اپنے ہاتھ سے مستعین اور اس کے بھائی کو قتل کیا اور سرکاری طور پر ہشام المؤید کی موت کا اعلان کرا دیا۔ یوں قُرطبہ سے بنو اُمیہ کی حکمرانی کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے بعد بنو حمود کی حکمرانی کا دور شروع ہو گیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی مختصر مدت کے لیے بعض اُموی حکمران آئے مگر ان کا دور کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔[1]

✦✦✦

[1] تاریخ ابن خلدون: ۱۹۳/۴، ۱۹۵، ط دار الفکر؛ نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۴۲۹/۱، ۴۳۸؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۶۵۳، ۶۵۳، ۶۵۷ تا ۶۶۰

قُرطُبہ۔ بنوحمود اور بنواُمیہ ...... باری باری

یہاں سے قُرطُبہ پر بنوحمود اور بنواُمیہ کے درمیان ایک نئی کش مکش شروع ہوئی اور باری باری دونوں خاندانوں کے حکمران مختصر وقفے کے لیے برسر اقتدار آتے رہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

⑦ **علی بن حمود:** (محرم ۴۰۷ھ تا ذوالقعدہ ۴۰۸ھ ...... جولائی ۱۰۱۶ء تا اپریل ۱۰۱۸ء)

بنوحمود اگرچہ نسلاً ہاشمی تھے مگر بربروں کے ملک میں نشو و نما کے باعث وہ بربری زبان بولتے تھے۔ عربی بمشکل بول پاتے اور وہ بھی بربری لہجے میں۔[1] محرم ۴۰۷ھ میں ان کا پہلا سربراہ علی بن حمود الناصر لدین اللہ کا لقب اختیار کر کے مسندِ خلافت پر بیٹھا۔[2] علی بن حمود نے شروع کے آٹھ ماہ میں بربروں پر سختی کی اور انہیں قواعد و ضوابط کا پابند کیا۔ اُس نے کئی بربروں کو جو شہریوں پر ظلم و زیادتی میں ملوث تھے، موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ دوسری طرف اُس نے اہل قُرطُبہ سے اچھا برتاؤ کیا۔ اس کے حسن سلوک سے عرب مطمئن ہوگئے اور قُرطُبہ میں امن و سکون ہوگیا۔

مگر کچھ عرصے بعد جو ابن عامری کے عرب سردار اور اَلمَریّہ کے حاکم خیران کو محسوس ہوا کہ اُس نے علی بن حمود کا ساتھ دے کر سخت غلطی کی ہے۔ دراصل اُس نے علی بن حمود کا ساتھ اس اُمید پر دیا تھا کہ قُرطُبہ کے کسی عقوبت خانے سے سابق خلیفہ ہشام المؤید کو بازیاب کر لیا جائے گا اور وہی ان کا خلیفہ ہوگا مگر جب علی بن حمود خود خلیفہ بن گیا تو خیران کی اُمید خاک میں مل گئی۔ ساتھ ہی اسے علی بن حمود سے بدعہدی اور قاتلانہ حملے کا خطرہ لاحق ہوگیا۔

ان وجوہ سے خیران قُرطُبہ سے نکل کر مشرقی اندلس میں واقع اپنے قلعے اَلمَریّہ چلا گیا اور اپنے ہم خیال عربوں کو ساتھ ملا کر ایک اُموی شہزادے عبدالرحمٰن بن محمد (جو عبداللہ بن عبدالرحمٰن الناصر کا پوتا تھا) کو قُرطُبہ کے تخت پر بٹھانے کی تحریک چلا دی اور اُسے المرتضیٰ کا لقب دے دیا۔ اسے عبدالرحمٰن الرابع بھی کہا جاتا تھا۔ ان اُمراء کا موقف یہ تھا کہ جب تک بنواُمیہ کے شہزادے موجود ہیں، کسی اور کو قُرطُبہ کی مسند کا حق نہیں۔ شاطبہ، بلنسیہ اور طرطوشہ کے حکام اس سے متفق ہوگئے۔

علی بن حمود کو اس گٹھ جوڑ کی اطلاع ملی تو وہ آگ بگولہ ہوگیا۔ اُسے عربوں پر بالکل اعتماد نہ رہا اور غصے کے عالم میں وہ قُرطُبہ کے عربوں کا بھی دشمن بن گیا۔ اس نے بربروں کو شہر پر مسلط کر کے ہر گلی کوچے کو قید خانہ بنا دیا۔ شہر کو جاسوسوں اور مخبروں سے بھر دیا۔ متعدد شرفاء اور عمائد کو قید میں ڈال دیا اور پھر خطیر رقمیں لے کر انہیں رہا کیا۔ عوام پر اتنے بھاری ٹیکس عائد کیے کہ وہ بلبلا اُٹھے۔ آخر میں اس نے قُرطُبہ کو بالکل ویران اور مسمار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر محل کی غلام گردشوں میں موجود مخالفین نے اس کا ارادہ پورا نہ ہونے دیا اور ۲ ذوالقعدہ ۴۰۸ھ (۱۳ اپریل ۱۰۱۸ء) کو شاہی محل کے تین صقلبی غلاموں نے اسے حمام میں بند کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود فرار ہو کر روپوش ہوگئے۔

---

① دولة الاسلام فی الاندلس: ۱/۶۵۷ ② دولة الاسلام فی الاندلس: ۱/۶۵۹

علی بن حمود کی حکومت فقط ایک سال نو ماہ تک رہی۔[1]

◆◆◆

⑧ قاسم بن حمود: (ذوالقعدہ ۴۰۸ھ تا ربیع الآخر ۴۱۲ھ..... اپریل ۱۰۱۸ء تا اگست ۱۰۱۲ء)

علی بن حمود کے قتل کے بعد کچھ امرائے قرطبہ اس کے بیٹے یحییٰ بن علی بن حمود (حاکم سبتہ) کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے جبکہ کچھ اس کے بھائی قاسم بن حمود (حاکم اشبیلیہ) کی خلافت پر مصر تھے جو علی بن حمود سے دس سال بڑا تھا۔

بہرکیف آخر میں قاسم ہی کو مسندِ خلافت کی پیش کش کی گئی۔ وہ شروع میں ڈرا کہ کہیں یہ اس کے بھائی علی بن حمود کی کوئی چال نہ ہو۔ مگر جب اس کے قتل کی تصدیق ہوگئی تو وہ قرطبہ آیا اور ۸ ذوالقعدہ ۴۰۸ھ کو المامون کے لقب کے ساتھ مسندِ خلافت پر بیٹھ گیا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے بھائی کے تینوں قاتلوں کو تلاش کر کے سزائے موت دی۔

اس نے شروع میں نرمی اور مہربانی کی سیاست اپنائی۔ عام معافی کا اعلان کیا اور کئی ٹیکس معاف کردیے جس سے اہلِ قرطبہ کو تسلی ہوئی۔ تاہم اُدھر مشرقی اندلس میں خیران اور اس کے ساتھی شہزادہ عبدالرحمٰن بن محمد المرتضیٰ کی خلافت پر مصر تھے۔ آخر ان کا لشکر قرطبہ کے باہر آن پہنچا مگر قرطبہ کی فوج نے انہیں شکست دے دی اور عبدالرحمٰن بن محمد قتل ہوگیا۔ اب قاسم بن حمود کے قدم جم گئے مگر اسے اپنے حامی بربروں کی تیز مزاجی سے خدشہ رہتا تھا، چنانچہ اس نے بربروں کو دبانے کے لیے افریقہ سے حبشی غلام خریدے اور ان کی ایک الگ فوج تیار کرلی۔ یہ دیکھ کر بربر نہایت مشتعل ہوئے اور اس کے خلاف بغاوت کا سوچنے لگے۔

انہی دنوں قاسم بن حمود کے بھتیجے یحییٰ بن علی نے چچا کے خلاف بغاوت کردی اور مالقہ پر قابض ہوگیا۔ بربر موقع دیکھ کر اس سے جا ملے۔ ان اتحادیوں نے قاسم بن حمود کا ناطقہ بند کردیا اور آخر ۲۳ ربیع الآخر ۴۱۲ھ (۱۷ اگست ۱۰۲۱ء) کو اسے قرطبہ سے فرار ہونے پر مجبور کردیا، وہ اشبیلیہ چلا گیا اور وہاں المستعلی باللہ کے نام سے خلیفہ بن گیا۔[2]

◆◆◆

⑨ یحییٰ بن علی بن حمود: (جمادی الاولیٰ ۴۱۲ھ تا ذوالقعدہ ۴۱۳ھ..... اگست ۱۰۲۱ء تا فروری ۱۰۲۳ء)

بربروں نے قصرِ خلافت پر قبضہ کرلیا اور یحییٰ بن علی کو تختِ قرطبہ پر براجمان ہونے کی دعوت دی۔ وہ چند دن میں قرطبہ پہنچ گیا اور یکم جمادی الاولیٰ ۴۱۲ھ (۲۳ اگست ۱۰۲۱ء) کو نیا خلیفہ بن گیا۔ اس کی عمر ۴۲ سال تھی۔ اس نے المعتلی باللہ کا لقب اختیار کیا۔ وہ ایک بہترین سپاہی، شہسوار اور عادل حکمران تھا مگر بربروں کے تسلط کے باعث وہ کچھ خاص کام نہ کرسکا۔ وہ نہایت دلیر تھا مگر خانہ جنگی سے بچنا چاہتا تھا، پس اس نے اپنے چچا قاسم بن حمود کے ساتھ ایک معاہدہ کرلیا جس میں طے ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی خلافت کو تسلیم کر کے دونوں بیک وقت خلیفہ رہیں گے۔ یہ تاریخ میں شاید واحد مثال ہے کہ دو حکمران خلافت کے دعوے دار ہوں اور ایک دوسرے کو خلیفہ بھی مانتے ہوں۔

---

① نفح الطیب: ۱/۳۸۲، ۳۸۳؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/۶۵۹ تا ۶۶۱ ② دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/۶۶۲، ۶۶۳

یہاں سے اندلس میں متعدد خلافتوں کا وہ نامبارک دور شروع ہوا کہ رفتہ رفتہ ہر صوبے دار خلیفہ بن گیا۔

اُدھر بربروں کو نام نہاد خلفاء سے کھیلنے میں بڑا لطف آ رہا تھا، لہٰذا اُنہوں نے ۱۲ ذوالقعدہ ۴۱۳ھ (۱۸ فروری ۱۰۲۳ء) کو یحییٰ بن علی کی برطرفی کا اعلان کر دیا۔ یحییٰ ایک محتاط انسان تھا۔ اُسے تختِ قرطبہ کی خون آشامی کا اندازہ اچھی طرح ہو چکا تھا، لہٰذا وہ کوئی مزاحمت کیے بغیر قرطبہ چھوڑ کر مالقہ چلا گیا۔ اس کی حکومت فقط ڈیڑھ سال رہی۔[1]

◆◆◆

⑩ قاسم بن حمود۔ دوبارہ (ذوالقعدہ ۴۱۳ھ تا جمادی الآخرہ ۴۱۴ھ ..... فروری ۱۰۲۳ء تا ستمبر ۱۰۲۳ء)

اب بربروں کی دعوت پر قاسم بن حمود دوبارہ آیا اور ۱۸ ذوالقعدہ ۴۱۳ھ (۲۴ فروری ۱۰۲۳ء) کو قرطبہ کے تخت پر بیٹھ گیا۔ مگر اب اس میں پہلے جیسا دم خم نہیں تھا کیونکہ خود خاندان بنو حمود کی چھوٹی سی سلطنت جو مراکش اور اندلس کے دو چار ساحلی شہروں تک محدود تھی، خاندان کے الگ الگ رئیسوں میں بٹ چکی تھی۔

اُدھر قاسم بن حمود کی بے بسی کے باعث بربر اہل قرطبہ پر بُری طرح مسلط ہو گئے تھے۔ ان کی سختیوں سے تنگ آ کر اہل قرطبہ نے بغاوت کر دی۔ یہ دیکھ کر قاسم بن حمود بربروں کو لے کر ان کے مقابلے پر آ گیا۔ شہر کے باہر گھمسان کی جنگ ہوئی۔ اہل قرطبہ نے اس جنگ کو اپنی آزادی کی آخری اُمید سمجھ کر لڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بربروں کو بدترین شکست ہوئی اور وہ پسپا ہو کر دور دور تک بکھر گئے۔ یہ جمادی الآخرہ ۴۱۴ھ کا واقعہ ہے۔ قاسم جان بچا کر اشبیلیہ پہنچا مگر اہل شہر نے اس کے لیے فصیل کے دروازے نہ کھولے۔ آخر اسے جنوبی اندلس کی طرف بھاگنا پڑا۔ مگر اس کی قسمت میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس کے بھتیجے یحییٰ بن علی نے اسے پکڑ کر جیل میں پھینک دیا جہاں تیرہ سال قید کے بعد اسے مار ڈالا گیا۔[2]

◆◆◆

⑪ عبدالرحمٰن بن ہشام، المستظہر (رمضان ۴۱۴ھ تا ذوالقعدہ ۴۱۴ھ ..... دسمبر ۱۰۲۳ء تا فروری ۱۰۲۴ء)

اہل قرطبہ بنو حمود سے اُکتا چکے تھے۔ بربروں کے تسلط سے وہ نکل آئے تھے۔ تین ماہ تک قرطبہ میں کوئی حکمران نہ تھا۔ اُمراء حیص بیص میں تھے کہ کس پر اعتبار کیا جائے؟ آخر اُنہوں نے طے کیا کہ خلافت دوبارہ اُموی خانوادے کو لوٹا دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے عبدالرحمٰن الناصر کے ایک پڑپوتے عبدالرحمٰن بن ہشام کو خلیفہ چن لیا۔ یہ ۱۶ رمضان ۴۱۴ھ (۱۴ دسمبر ۱۰۲۳ء) کا واقعہ ہے۔

نیا خلیفہ عبدالرحمٰن خامس کہلایا اور ''مستظہر'' کا لقب اختیار کیا۔ اس کی عمر ۲۳ برس تھی۔ وہ خاصا قابل آدمی تھا اور اس گئے گزرے وقت میں غنیمت تھا۔ شعر و ادب پر اچھی دسترس رکھتا تھا۔ نامور عالم علامہ ابن حزم اس کے درباری تھے۔ تاہم نئے خلیفہ کو قرطبہ کے باہر قبول نہ کیا گیا اور اندرونِ خانہ بھی اُمراء اور اُموی شہزادے اس سے مطلوبہ تعاون نہیں کر رہے تھے۔ عبدالرحمٰن بن ہشام اس صورتحال پر پیچ و تاب کھا گیا اور اس نے کئی اُمراء اور اُموی شہزادوں کو قید کر دیا۔

---

① دولة الاسلام فی الاندلس: ۶۶۳/۱ ② دولة الاسلام فی الاندلس: ۶۶۳،۶۶۴/۱

مزید یہ کہ اُس نے بربروں سے کام لینے کا ارادہ کیا اور ان کے چند سرداروں کو عزت واحترام کے ساتھ قصر خلافت میں بلوالیا۔ اُمرائے شہر نے یہ دیکھا تو لوگوں کو اشتعال دلایا اور کہا:

''ہم نے کس مصیبت سے بربروں سے نجات پائی تھی اور یہ شخص انہیں دوبارہ ہم پر مسلط کررہا ہے۔''

لوگ غصے سے بے حال ہوکر قصرِ خلافت میں گھس گئے اور بربر سرداروں کو قتل کر دیا۔ عبدالرحمٰن بن ہشام کسی خفیہ جگہ چھپ گیا۔ اس کی حکومت فقط ۴۷ دن رہی۔ [1]

+++

⑫ عبدالرحمٰن بن محمد، اَلْمُسْتَکْفِی: (ذوالقعدہ ۴۱۴ھ تا ربیع الاوّل ۴۱۶ھ..... فروری ۱۰۲۴ء تا جون ۱۰۲۵ء)

ان دنوں ایک اُموی شہزادہ عبدالرحمٰن بن محمد سابق حکمران کے ڈر سے روپوش تھا۔ اُس کے قتل کے بعد یہ باہر نکل آیا اور ۳ ذوالقعدہ ۴۱۴ھ کو اُمرائے قُرطُبہ نے اُسے تخت پر بٹھادیا۔ اُس نے ''اَلْمُسْتَکْفِی'' کا لقب اپنا کر حکومت سنبھال لی۔ اُس نے سابق حکمران کو ڈھونڈ نکالا اور اسے سزائے موت دے دی۔

نیا حکمران کسی قابل نہ تھا۔ اس کی نااہلی کے باعث بہت سے قابل لوگ شہر چھوڑ گئے۔ آخر اُمرائے قُرطُبہ نے یک زبان ہوکر اُس سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا۔ اس نے انہیں نرمی سے جواب دے کر کسی طرح ٹالا اور پھر ایک عورت کے بھیس میں شہر سے نکل گیا۔ یہ ۲۵ ربیع الاوّل ۴۱۶ھ (۷ جون ۱۰۲۵ء) کا واقعہ ہے۔ راستے میں کسی لٹیرے نے مال ودولت چھیننے کی خاطر اسے قتل کر دیا۔ [2]

+++

⑬ یحییٰ بن علی بن حمود۔ دوبارہ: (رمضان ۴۱۶ھ تا ربیع الاوّل ۴۱۷ھ..... نومبر ۱۰۲۵ء تا مئی ۱۰۲۶ء)

اہلِ قُرطُبہ کا مزاج بگڑ چکا تھا۔ وہ باری باری کبھی بنوحمود اور کبھی بنواُمیّہ کو اقتدار کا جھولا جھلا رہے تھے۔ مگر اب کوئی اس شہر کو سنبھالنے کے لیے تیار نہ تھا۔ چھ ماہ تک مسندِ اقتدار خالی رہی۔ آخر اُمرائے قُرطُبہ نے مالقہ کے حاکم یحییٰ حمودی کو دعوت دی کہ وہ آکر یہاں کی حکمرانی کا لطف اٹھائے۔ وہ ۱۵ رمضان ۴۱۶ھ (۲۱ نومبر ۱۰۲۵ء) کو قُرطُبہ پہنچا اور پانچ ماہ تک یہاں کے تخت پر بیٹھا رہا اور پھر احتیاط سے کام لیتے ہوئے محرم ۴۱۷ھ میں واپس مالقہ چلا گیا اور اپنے دو نائبین: احمد بن موسیٰ اور وزناس بن ابی روح کو ڈیڑھ ہزار بربروں کے ساتھ یہاں چھوڑ گیا۔

کچھ مدت بعد مشرقی اندلس کے عامری سرداروں: خَیران اور مجاہد نے اہلِ قُرطُبہ کو بربروں کی وہاں موجودگی پر ملامت کی اور شرم دلائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۰ ربیع الاوّل ۴۱۷ھ (۲۲ مئی ۱۰۲۶ء) کو قُرطُبہ میں بربروں کے خلاف ہنگامے پھوٹ پڑے اور انہیں قتل کیا جانے لگا۔ یحییٰ بن علی کے نائبین جان بچا کر بمشکل وہاں سے نکلے۔ [3]

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/۶۶۵، ۶۶۶

② دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/۶۶۶، ۶۶۷ ③ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱/۶۶۷، ۶۶۸

⑭ ہشام بن محمد، المعتد باللہ: (ربیع الآخر ۴۱۸ھ تا ذوالقعدہ ۴۲۲ھ ...... جون ۱۰۲۷ء تا نومبر ۱۰۳۱ء)

اُمرائے قرطبہ ایک سال تک بغیر کسی حکمران کے گزارا کرتے رہے۔ اُمورِ سلطنت چلانے والوں میں سب سے پیش پیش ابوالحزم جہور بن محمد تھا۔ اس کے مشورے پر ایک بار پھر اُموی خانوادے کو تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کیا گیا۔

ان دنوں ایک اُموی شہزادہ ہشام بن محمد (ہشام المرتضیٰ کا بھائی) شمال مشرقی اندلس کے قلعے "البونت" میں رہائش پذیر تھا۔ ایک وفد بھیج کر وہیں اس کی بیعت کر لی گئی۔ یہ ۲۵ ربیع الآخر ۴۱۸ھ (۱۵ جون ۱۰۲۷ء) کا واقعہ ہے۔ تاہم یہ شہزادہ دو سال سات ماہ تک قرطبہ نہ آیا۔ آخر ذوالحجہ ۴۲۰ھ میں وہ قرطبہ پہنچا جہاں اس کی تجدیدِ بیعت ہوئی اور اسے مسندِ خلافت پر بٹھا دیا گیا۔ اسے المعتد باللہ کا لقب دیا گیا۔ مگر درحقیقت خاندانِ بنواُمیہ قابل افراد سے خالی ہو چکا تھا۔ یہ خلیفہ بھی ایک آرام پسند اور بے کار انسان ثابت ہوا۔ اس نے اُمورِ حکومت اپنے وزیر حکم بن سعید کے سپرد کر دیے جس نے نالائق اور مفاد پرست عناصر کو اہم عہدے بخش دیے اور سرکاری اَموال میں خوب لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔ وزیر نے تجربہ کار اور قابل لوگوں کو خلیفہ کی مجلس سے بھی ہٹا دیا اور اسے بڑے لوگوں کا ہم صحبت کر کے مے نوشی کا عادی بنا دیا۔ عمائد شہر کی بے عزتی اور توہین عام ہو گئی اور لوگ وزیر کے شر سے اللہ کی پناہ مانگنے لگے۔

آخر دو سال بعد وزیر سے نالاں لوگ ایک اُموی رئیس اُمیہ بن عبدالرحمٰن کی قیادت میں منظم ہو گئے اور انہوں نے ذوالقعدہ ۴۲۲ھ (نومبر ۱۰۳۱ء) میں وزیر کو موقع پا کر قتل کر دیا اور اس کے سر کی پورے شہر میں نمائش کی۔

اُدھر بہت سے مشتعل لوگوں نے قصرِ خلافت پر حملہ کر دیا۔ اگر نامور اَمیر ابن جہور انہیں نہ روکتا تو قصر میں کوئی چیز باقی نہ بچتی۔ اس دوران ہشام المعتد جان بچا کر بھاگا۔ لوگوں نے اُسے جامع مسجد کی چاردیواری میں گھیر لیا اور وہ اپنی جاں بخشی کے لیے خدا کے واسطے دینے لگا۔ ابن جہور نے سامنے آ کر لوگوں کو ٹھنڈا کیا اور سب کے اتفاقِ رائے سے ہشام المعتد کو معزول کر کے شہر بدر کر دیا۔ ابن جہور نے اعلان کر دیا کہ اس وقت خلافت کا کوئی اہل موجود نہیں ہے، لہٰذا قرطبہ کی خلافت ختم کی جا رہی ہے۔ آئندہ سے کسی اُموی شہزادے کو قرطبہ میں نہیں آنے دیا جائے گا۔[1]

یہ اعلان دراصل اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ روایتی طریقِ سیاست ناکام ہو چکا ہے اور اب مسلم علماء کو شرعی دلائل پر مجتہدانہ نگاہ ڈال کر عقل اور تجربے کی روشنی میں کوئی مؤثر، بہتر اور جدید نظامِ حکومت تشکیل دینا ہوگا۔

اسبابِ زوال:

بنواُمیہ کی حکومت جو چوتھی صدی ہجری میں عبدالرحمٰن الناصر، الحکم ثانی اور حاجب المنصور جیسے حکمرانوں کے ماتحت دنیا کی عظیم اور مضبوط ترین سلطنتوں میں شمار ہوتی تھی، چند برسوں میں یوں زمین بوس ہوئی جیسے آئینہ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جائے۔ عروج کی پونے تین صدیوں میں یہاں گیارہ حکمران گزرے جبکہ زوال کی ربع صدی میں یہاں چودہ بار حکومت تبدیل ہوئی۔ یہ تیز تر زوال یقیناً باعثِ حیرت ہے لیکن اس زوال کے اسباب و علل کو دیکھا جائے

---

① تاریخ ابن خلدون: ۱۹۳/۴ تا ۱۹۸، ط دار الفکر؛ نفح الطیب: ۴۳۸/۱ تا ۴۳۸

تو یہ حیرانی بڑی حد تک کم ہو سکتی ہے۔

ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ اندلس کی دولتِ اُمویہ کی کمزوری اور زوال کے اسباب کا ذکر کرتے ہیں۔

❶ اندلس میں مسلمانوں کو جو سطوت شام کے اُموی خلفاء کے دور میں نصیب تھی، یہاں کی آزاد اُموی حکومت اس سے محروم تھی کیوں کہ خلفاء کے ماتحت اندلس کے پیچھے پورے عالم اسلام کی قوت شامل تھی۔ جب عبدالرحمن اوّل نے یہاں آزاد حکومت قائم کی تو اندلس سیاسی لحاظ سے باقی عالم اسلام سے کٹ گیا اور نصرانیوں نے مسلمانوں کو تنہا سمجھ لیا۔

❷ عباسیوں اور بنوعبید کی طرف سے اُمویانِ اندلس کے خلاف ریشہ دوانیوں نے نصرانیوں کے حوصلے مزید بڑھا دیے۔

❸ خلفائے شام کے دور میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بھی نسبتاً تیزی سے بڑھتا رہا کیوں کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان اپنے دین پر پختہ اور اخلاق و کردار میں بدرجہا بہتر اور اسلام کی تبلیغ کے لیے پرجوش بھی تھے، اس لیے مقامی لوگ ان کی سیرت اور گفتار سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے رہے۔ نیز بھاری تعداد میں ایشیا اور افریقہ کے مسلمان یہاں آ کر اسلامی آبادی کی شرح بڑھاتے رہے۔

مگر آزاد اندلس کے دور میں یہاں بیرونِ ممالک سے نئے مسلمانوں کی آمد کم ہو گئی۔ مقامی حکام اور عوام میں اسلام کی تبلیغ کا جذبہ بھی ماند پڑ گیا۔ ان کی سیرت و کردار میں بھی اپنے آباء جیسے جوہر نہ رہے، اس لیے غیر مسلموں کے اسلام قبول کرنے کی رفتار برائے نام رہ گئی، پس مسلم اور غیر مسلم آبادی میں اضافے کی شرح تقریباً یکساں ہو گئی۔

❹ اُمویانِ اندلس اَن گنت جہادی مہمات کے باوجود شمال میں قائم نصرانی ریاستوں کو مکمل طور پر ختم نہ کر سکے۔ عبدالرحمن الناصر اور منصور اعظم جیسے مجاہد حکمران جو اکثر و بیشتر اپنی قیادت میں افواج لے کر نصرانی ریاستوں پر حملہ آور ہوتے تھے، ان علاقوں کو مطیع اور باج گزار بنانے پر اکتفا کرتے رہے۔ دو صدیوں تک جاری ان سرمائی اور گرمائی مہمات کے اہداف درحقیقت دشمن کو مرعوب کرنے، اس کی قلعہ بندیوں کو ناکارہ بنانے، اس سے خراج وصول کرنے اور اسے معاشی طور پر کمزور کرنے تک محدود تھے۔ اس لیے شمال میں آسٹریاس، قسطلیہ، لیون اور نوار جیسی ریاستیں مکمل طور پر ختم نہ ہو سکیں اور جیسے ہی انہیں موقع ملا، وہ طاقت ور ہونا شروع ہو گئیں۔

❺ نصرانی مسلمانوں کے طریقِ جنگ کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے، اس لیے جب بھی کوئی بڑی فوج حملہ آور ہوتی تو وہ پسپائی اختیار کر لیتے اور معافی طلب کر کے خراج دینے کا وعدہ کر لیتے۔ مسلمانوں کی واپسی پر دوبارہ ان پہاڑوں پر قبضہ جما کر حسبِ معمول حکومت کرنے لگتے۔

❻ شمالی ریاستوں میں اشاعتِ اسلام کی کوئی مؤثر کوشش نہیں ہوئی۔ نیز ان علاقوں میں مسلمانوں کو بسا کر انہیں اسلامی آبادیوں میں تبدیل کرنا بھی ممکن نہ ہوا، کیوں کہ نہ تو باقی عالم اسلام سے لوگ نقل مکانی کر کے اندلس آ رہے

تھے، نہ مسلمانوں میں نسلی افزائش نصرانیوں سے زیادہ تھی اور نہ ہی مسلم شہروں کے نصرانی اسلام قبول کر رہے تھے۔ ایسے میں اگر دوسرے شہروں کے مسلمانوں کو شمالی ریاستوں میں آباد کیا جاتا تو خود جنوبی اور وسطی اسلامی شہر خالی ہو جاتے یا کم از کم وہاں نصرانیوں کا تناسب بڑھ جاتا کیوں کہ قرطبہ سمیت کوئی شہر غیر مسلموں سے خالی نہ تھا۔

7 معاشی آسودگی، بے پناہ خوشحالی اور ثروت نے مسلمانوں کو اعلیٰ مقاصد سے غافل کر دیا۔ زریاب جیسے موسیقی کاروں کی مقبولیت یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی کہ اہلِ اندلس کس رخ پر جا رہے ہیں۔ جب عیاشی، تفریح اور تن آسانی کی ثقافت عام ہوئی تو دنیا و آخرت کے اہم حقائق پس پشت چلے گئے اور لوگ نفس پرستی کے اسیر بن کر پے در پے غلط فیصلے کرتے چلے گئے جو زوالِ معاشرہ، خانہ جنگی اور انتشارِ قوم کا ذریعہ ہے۔

8 موروثی حکومتوں میں محض حسب نسب کی بناء پر کسی نااہل آدمی کے اوپر آنے کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ نیز اس نظام میں چونکہ سربراہِ حکومت بے پناہ اختیارات کا حامل ہوتا ہے، اس لیے اس کی شخصیت اور مزاج کا اثر براہِ راست ملک پر پڑتا ہے اور ملک کا بھلا بُرا اس کی سیرت و کردار پر منحصر ہو جاتا ہے۔ اگر بدقسمتی سے ایسے نظامِ مملکت میں کوئی کمزور یا بدکردار شخص برسرِ اقتدار آجائے تو سلطنت بہت تیزی سے تباہی کی طرف جا سکتی ہے کیوں کہ ارکانِ سلطنت اسے غلط فیصلوں سے روکنے کا اختیار نہیں رکھتے۔ یہ بنیادی خرابی امویانِ اندلس سمیت اس دور کی تمام مسلم سلطنتوں میں موجود تھی اور قریبی دور تک اسی طرح چلی آتی رہی۔

9 اہلیت کی جگہ خاندانی قرب کو ترجیح دینے کی بھاری غلطی حکم ثانی سے بھی ہوئی اور اس کے قابل بھائی مغیرہ کی جگہ اس کے بیٹے ہشام المؤید باللہ کو خلافت مل گئی۔ اُمویانِ اندلس کا دورِ زوال اسی دن سے شروع ہو گیا تھا کیوں کہ ہشام المؤید ذاتی طور پر نیک سیرت ہونے کے باوجود، انتظامی قابلیت اور سیاسی تجربے سے محروم تھا۔

10 منصور اعظم نے ہشام المؤید کا سرپرست بن کر سلطنت کو ربع صدی تک سنبھالے رکھا اور اس کا دور ایک لحاظ سے اندلس میں مسلمانوں کا دورِ عروج تھا مگر بغور دیکھا جائے تو اندلس کے سیاسی نظام کی کمزوری، ختم ہونے کی بجائے بڑھ گئی تھی کیوں کہ منصور اعظم کے دور میں خلیفہ کے اختیارات سلب کر لیے گئے تھے اور خاندانِ بنو اُمیہ کے اہم سیاست دان اور جرنیلوں کو راستے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ کچھ بغاوتوں کے الزامات میں قتل کر دیے گئے تھے اور کچھ گوشہ گمنامی میں جا پڑے تھے۔ علماء و فقہاء جو عوام و خواص پر بڑی حد تک اثر انداز تھے، چاہتے تھے کہ خلیفہ کے اختیارات بحال کیے جائیں تاہم منصور اعظم نے اپنی ذاتی قابلیت، مقبولیت اور سیاسی مہارت کے ذریعے حالات پر قابو پائے رکھا مگر جونہی وہ دنیا سے رخصت ہوا، نظام کی یہ خرابی پوری شدت سے اپنے تمام اثرات کے ساتھ ابھر آئی۔

11 ہشام المؤید کی گوشہ نشینی اور منصور اعظم کی شخصی سیاست نے بنو اُمیہ کی ہیبت اور عظمت کا تاثر ختم کر دیا تھا۔ پھر عبدالملک المظفر کی اچانک موت اور شانجول جیسے نالائق کی سربراہی نے امرائے قرطبہ کو بے باک کر دیا اور انہوں نے مسندِ خلافت کو کھیل بنا لیا۔ قرطبہ میں وہی حالات پیدا ہو گئے جو بنو عباس کے دورِ زوال میں بغداد کے تھے۔

۱۲ اندلس میں بربر، صقالبی، مولدین، یمانی عرب، مضری عرب، گاتھک اور دیگر نسلوں کے نصرانیوں سمیت طرح طرح کی قومیں جمع ہوگئی تھیں اور ہر قوم میں اقتدار کے کئی کئی حریص موجود تھے۔ اس صورتحال نے یہاں بار بار بغاوتوں اور خانہ جنگی کا ماحول پیدا کر کے ملک کو کمزور تر کر دیا۔

۱۳ اندلس میں مسلمانوں اور نصرانیوں کی باہمی معاشرت، رشتوں اور تعلقات نے بھی سیاسی ابتری میں اہم کردار ادا کیا۔ عبدالرحمن الناصر اور منصور اعظم کے دور میں ہونے والی جہادی مہمات میں بے شمار نصرانی عورتیں باندیاں بن کر مسلمانوں کے گھروں کا حصہ بنتی رہیں۔ ان خواتین کے اثرات اگلی نسلوں پر پڑے جن میں سے بعض کے ہاتھوں میں اقتدار کی باگ ڈور بھی آئی۔ شانجہ غرسیہ جیسے کٹر نصرانی کا نواسا 'شانجول' منصور اعظم کے گھر پیدا ہونے کے سبب قُرطُبہ کے تخت پر آ بیٹھا اور ملک کو تباہی کی راہ پر ڈال گیا۔

۱۴ آخری دور میں مسلمانانِ اندلس کے سیاسی رجحانات سخت عاقبت نااندیشی پر مبنی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے دشمنوں سے نہ صرف بے فکر ہو گئے بلکہ انہیں ساتھ ملا کر ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے تھے۔

غرض یہ وہ اہم اسباب تھے جن کی بناء پر دیکھتے ہی دیکھتے اُمویانِ اندلس کی عظیم حکومت زمین بوس ہوگئی۔

◆◆◆

اندلس (قُرطُبہ) کے حکمرانوں کی فہرست

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	کل مدت	خاص بات
۱	عبدالرحمن اوّل	۱۳۸ھ تا ۱۷۲ھ (۷۵۵ء تا ۷۸۸ء)	۳۳ سال ۴ ماہ	بانیٔ دولتِ اُمویہ قُرطُبہ
۲	ہشام الرضی	۱۷۲ھ تا ۱۸۰ھ (۷۸۸ء تا ۷۹۶ء)	۷ سال ۹ ماہ	مملکت کا استحکام ہوا
۳	الحکم اوّل	۱۸۰ھ تا ۲۰۶ھ (۷۹۶ء تا ۸۲۲ء)	۲۶ سال ۱۱ ماہ	نصاریٰ سے جہاد
۴	عبدالرحمن ثانی	۲۰۶ھ تا ۲۳۸ھ (۸۲۲ء تا ۸۵۲ء)	۳۱ سال ۳ ماہ	توہینِ رسالت کا فتنہ
۵	محمد اوّل	۲۳۸ھ تا ۲۷۳ھ (۸۵۲ء تا ۸۸۶ء)	۳۴ سال ۱۰ ماہ	اندرونی بغاوتیں
۶	منذر بن محمد	۲۷۳ھ تا ۲۷۵ھ (۸۸۶ء تا ۸۸۸ء)	۲ سال	حکومت کمزور ہوگئی
۷	عبداللہ بن محمد	۲۷۵ھ تا ۳۰۰۰ھ (۸۸۸ء تا ۹۱۲ء)	۲۵ سال ۶ ماہ	عمر بن حفصون کا فتنہ
۸	عبدالرحمن الناصر	۳۰۰ھ تا ۳۵۰ھ (۹۱۲ء تا ۹۶۱ء)	۵۰ سال ۶ ماہ	سنہرا دور۔ فتوحات۔ اعلانِ خلافت

نمبر	نام	دور	مدت	کیفیت
۹	الحکم ثانی	۳۵۰ھ تا ۳۶۶ھ (۹۶۱ء تا ۹۷۶ء)	۱۵ سال ۷ ماہ	علم نواز، پُرامن دور
	اُموی خلفاء، امرائے بنو عامر کے تحت			
۱۰	حاجب المنصور مع ہشام ثانی المؤید باللہ	۳۶۶ھ تا ۳۹۲ھ (۹۷۶ تا ۱۰۰۲ء)	۲۷ سال چند ماہ	نصرانیوں سے جہاد
۱۱	عبدالملک المظفر، مع ہشام المؤید	۳۹۲ھ تا ۳۹۹ھ (۱۰۰۲ء تا ۱۰۰۸ء)	۷ سال	نصرانیوں سے جہاد
۱۲	حاجب شانجول، مع ہشام المؤید	صفر تا جمادی الاولیٰ ۳۹۹ھ (اکتوبر ۱۰۰۸ء تا جنوری ۱۰۰۹ء)	تین ماہ	دورِ زوال شروع
	دورِ زوال۔ کمزور اُموی خلفاء			
۱۳	محمد بن ہشام المہدی	جمادی الاولیٰ ۳۹۹ھ تا ربیع الاول ۴۰۰ھ (جنوری ۱۰۰۹ء تا نومبر ۱۰۰۹ء)	دس ماہ	
۱۴	سلیمان بن الحکم مستعین	ربیع الاول تا شوال ۴۰۰ھ (نومبر ۱۰۰۹ء تا مئی ۱۰۱۰ء)	سات ماہ	
۱۵	محمد بن ہشام المہدی، دوبارہ	شوال تا ذوالحجہ ۴۰۰ھ (مئی تا جولائی ۱۰۱۰ء)	دو ماہ	
۱۶	ہشام المؤید۔ دوبارہ	ذوالحجہ ۴۰۰ھ تا شوال ۴۰۲ھ (جولائی ۱۰۱۰ء تا جولائی ۱۰۱۲ء)	ایک سال دس ماہ	
۱۷	سلیمان مستعین، دوبارہ	شوال ۴۰۲ھ تا محرم ۴۰۷ھ (جون ۱۰۱۲ھ تا جولائی ۱۰۱۶ء)	چار سال	
	قُرطُبہ پر بنو حمود کا تسلط جس کے دوران برائے نام اُموی خلفاء بھی آتے رہے۔			
۱۹	علی الناصر بن حمود	محرم ۴۰۷ھ تا ذوالقعدہ ۴۰۸ھ (جولائی ۱۰۱۶ء تا اپریل ۱۰۱۸ء)	ایک سال	
۲۰	القاسم المامون بن حمود	ذوالقعدہ ۴۰۸ھ تا ربیع الآخر ۴۱۲ھ (اپریل ۱۰۱۸ء تا اگست ۱۰۱۲ء)	پانچ سال	

۲۱	یحییٰ بن علی بن حمود	جمادی الاولیٰ ۴۱۲ھ تا ذوالقعدہ ۴۱۳ھ (اگست ۱۰۲۱ء تا فروری ۱۰۲۳ء)	چند ماہ	
۲۲	القاسم بن حمود۔ دوبارہ	ذوالقعدہ ۴۱۳ھ تا جمادی الآخرہ ۴۱۴ھ (فروری ۱۰۲۳ء تا ستمبر ۱۰۲۳ء)	ایک سال	
۲۳	عبدالرحمٰن بن ہشام، المستظہر	رمضان ۴۱۴ھ تا ذوالقعدہ ۴۱۴ھ (دسمبر ۱۰۲۳ء تا فروری ۱۰۲۴ء)	چند ماہ	
۲۴	محمد الثالث المستکفی	ذوالقعدہ ۴۱۴ھ تا ربیع الاول ۴۱۶ھ (فروری ۱۰۲۴ء تا جون ۱۰۲۵ء)	دو سال	
۲۵	یحییٰ بن علی۔ دوبارہ	رمضان ۴۱۶ھ تا ربیع الاول ۴۱۷ھ (نومبر ۱۰۲۵ء تا مئی ۱۰۲۶ء)	دو سال	
۲۶	ہشام الثالث المعتد باللہ	ربیع الآخر ۴۱۸ھ تا ذوالقعدہ ۴۲۲ھ (جون ۱۰۲۷ تا نومبر ۱۰۳۱)	چار سال	

ملوک الطّوائف

۴۰۰ھ تا ۴۸۴ھ

(۱۰۱۰ء تا ۱۰۹۱ء)

۸۴ سال

بدترین انتشار اور مرکز گریزی

قرطبہ میں اُموی حکومت کے زوال پذیر ہوتے ہی پورے ملک میں صوبے آزاد ہونے لگے۔ تقریباً ہر سال ایک دو شہروں کے خودمختاری کا دعویٰ کر دیتے اور مرکزی حکومت ان پر قابو پانے کی ہمت نہ کر سکتی۔

قصہ مختصر کہ عبدالرحمٰن اوّل نے جس اندلس کو جان کی بازی لگا کر حاصل کیا تھا اور عبدالرحمٰن الناصر اور حاجب المنصور نے جن شہروں کو سالہا سال جہاد کے بعد فتح کر کے ایک وسیع وعریض سلطنت قائم کی تھی، وہ بکھر گئے۔ خود غرض سیاست دانوں اور اقتدار کے بھوکے جرنیلوں نے اسلامی اندلس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کئی مملکتوں میں بانٹ لیا۔ پھر ہر ریاست کے اندر اقتدار کے کئی کئی دعوے دار پیدا ہو گئے اور ایک نہ ختم ہونے والی کشاکش شروع ہو گئی۔

یوں پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں یہاں کئی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ان میں سے بعض حکمران خلافت کے دعوے دار بھی بن گئے اور خلفائے بنو عباس کی طرح اپنے نام کے ساتھ، باللہ، من اللہ، للہ جیسے القاب لگانے لگے۔ باقی اسلامی دنیا میں انہیں "ملوک الطوائف" کہا جاتا تھا۔ ان میں سے مشہور حکومتیں درج ذیل ہیں۔

نمبر	حکومت	خاندان	علاقہ	مشہور حکمران
۱	دولۃ بنی حمود	علوی ادریسی (عرب)	مالقہ، الخضراء، پھر قرطبہ	علی بن حمود، قاسم بن حمود، یحییٰ، ادریس
۲	دولۃ بنی جَہْوَر	بنو کلب (عرب)	قرطبہ، وادی الکبیر	ابوالحزم ابن جَہْوَر، ابوالولید ابن جَہْوَر
۳	دولۃ بنی ذوالنون	ہوارہ (بربر)	طلیطلہ، پھر قرطبہ بھی	اسماعیل ذوالنون، یحییٰ المامون، یحییٰ القادر
۴	دولۃ بنی عباد	بنو لخم (عرب)	اشبیلیہ، پھر قرطبہ بھی	قاضی ابوالقاسم، عباد المعتضد، المعتمد
۵	دولۃ بنی تجیب	بنو تجیب (عرب)	سرقسطہ، لاردہ، تطیلہ، شمال مشرقی علاقے	منذر بن یحییٰ

۶	دولۃ بنی ہود	بنو ہود (عرب)	قلعہ ایوب، پھر سرقسطہ بھی	سلیمان بن ہود المستعین، احمد المقتدر، یوسف المؤتمن، احمد المستعین
۷	دولۃ بنی افطس	بنو افطس (بربر)	بطلیوس، ماردہ، لزبن، قلمریہ، پرتگال کا وسطی علاقہ	ابن افطس، محمد المظفر، ابو حفص عمر المتوکل
۸	دولۃ بنی زیری	بنو زیری (بربر)	غرناطہ، وادی الکبیر	زاوی بن زیری، حبوس، بادیس بن حبوس، تمیم، عبداللہ
۹	دولۃ بنی مزین	بنو مزین (عرب)	باجہ، شلب، مرتلہ، پرتگال کے جنوبی ساحل	قاضی عیسیٰ بن ابی بکر مزینی
۱۰	دولۃ بنی رزین	بنو رزین (بربر)	سہلہ، شنتمریہ شرقی	ہذیل بن عبدالملک
۱۱	دولۃ بنی فہر	بنو فہر (عرب)	بلنسیہ، بونت، شرقی ساحل	عبداللہ بن القاسم الفہری
۱۲	دولۃ بنی بکر	بنو بکر (عرب)	ولبہ، شلطیش	عبدالعزیز البکری
۱۳	دولۃ بنی ہارون	بنو ہارون (غالباً عرب)	شنتمریہ غربی	
۱۵	دولۃ بنی یحییٰ	بنو یحصب (عرب)	لبلہ	احمد بن یحییٰ الیحصبی
۱۶	دولۃ الصقالبہ	صقالبی امراء، بنو عامر	مرسیہ، شاطبہ، شرقی ساحل	خیران، زہیر
۱۷	دولۃ بنی برزال	بنو برزال (بربر)	قرمونہ	محمد بن عبداللہ برزالی
۱۸	دولۃ بنی صمادح	بنو تجیب (عرب)	المریہ، جنوب مشرقی ساحل	معن بن محمد ابی یحییٰ بن صمادح، معتصم
۱۹	دولۃ بنی مجاہد	صقلبی	دانیہ، جزائر میورقہ، منورقہ، یابسہ	مجاہد بن یوسف، اقبال الدولہ
۲۰	دولۃ بنی یفرن	بنو یفرن (بربر)	رندہ	ابو النور بن ابی قرہ یفرنی

✦✦✦

ملوک الطوائف کی خودنمائی:

ملوک الطوائف میں بنوذوالنون، بنوعباد، بنوزیری اور بنوافطس کی ریاستیں کسی قدر وسیع تھیں۔ ان کے سوا باقی ریاستیں دو چار شہروں اور چند قلعوں تک محدود تھیں۔ بعض ریاستوں کو ایک بھی بڑا شہر میسر نہ تھا۔ کسی ایک قلعے اور چند دیہاتوں کی جاگیر رکھنے والے بھی اپنے زعم میں بادشاہ اور خلیفہ بن کر خود کو امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین کہلواتے اور اپنے ناموں کے ساتھ عباسی خلفاء کی طرح عالی شان القاب لگاتے۔ ان میں سے کوئی المامون تھا کوئی المؤتمن۔ کوئی الناصر تھا کوئی المنصور۔ کوئی معتمد تھا کوئی معتضد۔ کسی نے القادر باللہ کہلوانا پسند کیا اور کسی نے المتوکل۔

ایک ایسا بھی وقت تھا کہ قرطبہ کے خلیفہ کے علاوہ جنوبی اندلس میں لگ بھگ پچاس ساٹھ کلومیٹر کے طول وعرض میں ایک ہی گھرانے یعنی بنوحمود کے تین تین خلفاء سریر آرائے مسندِ خلافت تھے۔ جزیرۃ الخضراء میں محمد بن قاسم (بن حمود)، مالقہ میں محمد بن ادریس (بن علی بن حمود) اور ببشتر میں ادریس بن یحییٰ (بن حمود)۔ ①

اس دور کا ایک شاعر ابن رشیق (م ۴۶۳ھ) ان کی حالت اور ان القابات کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

مِمَّا یُزَهِّدُنِی فِی أَرْضِ أَنْدَلُسٍ ...... سَمَاعُ مُقْتَدِرٍ فِیهَا وَمُعْتَضِدِ

''سرزمینِ اندلس میں مجھے کہیں مقتدر اور کہیں معتضد کا ذکر بہت برا لگتا ہے۔''

أَلْقَابُ مَمْلَكَةٍ فِی غَیْرِ مَوْضِعِهَا ...... كَالْهِرِّ یَحْكِی انْتِفَاخًا صَوْلَةَ الْأَسَدِ

''یہ شاہی القابات غلط استعمال ہو رہے ہیں۔ جیسے کوئی بلی خود کو پھلا کر شیر جیسے رعب داب کی نقل کرے۔'' ②

ایک اور شاعر کہتا ہے:

وَتَفَرَّقُوا شِیَعًا فَكُلُّ مَحَلَّةٍ ...... فِیهَا أَمِیرُ الْمُؤْمِنِینَ وَمِنْبَرُ

''یہ لوگ بکھر کر کئی گروہ بن گئے ہیں، پس ہر محلے میں ایک امیر المؤمنین اور ایک منبر ہے۔'' ③

شعروشاعری کا محاذ:

ملوک الطوائف کے ان خود پسندانہ رجحانات نے اندلس کے اکثر درباروں میں قابل اور سنجیدہ افراد کے لیے جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ علماء وفقہاء جو پہلے اندلس کی سیاست کا اہم ستون تھے، اب نظر انداز کیے جا رہے تھے یا انہیں بھی محدود سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ بہترین انتظامی صلاحیتیں رکھنے والے لوگ پیچھے چلے گئے تھے۔ تنگ نظر، عیار اور مطلب پرست لوگ ہر جگہ مسلط تھے۔ حکمرانوں کو حق گو علماء اور اصول پسند امراء کی جگہ خوشامدی اور جی حضوری شاعر زیادہ پسند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر دربار میں شعراء اور ادباء کا جم غفیر جمع ہوتا جا رہا تھا۔

---

① دولة الإسلام في الأندلس: ۳۸/۳

② المعجب في تلخيص أخبار المغرب: ۱/ ۵۹؛ خريدة القصر و جريدة العصر للعماد كاتب الأصفهاني قسم: شعراء المغرب والأندلس: ۱/ ۴۲

③ أعمال الأعلام فيمن بويع قبل الاحتلام: ۲/ ۲۳۲

اگر یہ شاعروادیب ایک زندہ قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے، حکمرانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کرتے اور عوام میں شعور اور بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتے تو یقیناً ان کی صلاحیتوں کی رہتی دنیا تک تعریف ہوتی مگر انہوں نے محض انعام اور منصب کی خاطر اپنی قابلیت کو عوام کی مدہوشی اور حکمران کی خود فراموشی کے لیے استعمال کیا۔ حکمرانوں کو زیادہ سے زیادہ خوش کرنے اور بڑے سے بڑا انعام پانے کے لیے جہاں انہیں فاتح اعظم ثابت کرنا ضروری تھا، وہاں یہ بھی لازم تھا کہ ان کے مخالفین پر پھبتیاں کسی جائیں اور ان کی ہنسی اڑائی جائے۔ چنانچہ اندلس میں جہاں قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کا فن عروج کو پہنچا، وہاں ہجو گوئی بھی ترقی پر تھی۔

اس دور کا ایک شاعر مخالف امراء کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے:

خُنْتُمْ فَهُنْتُمْ وَكَمْ اَهَنْتُمْ .... زَمَانَ كُنْتُمْ بِلَاعُيُوْن

''تم نے بدعہدی کی تو ذلیل ہو گئے، تم اندھے ہو کر عرصہ دراز تک زمانے کی توہین کرتے رہے۔''

فَاَنْتُمْ تَحْتَ كُلِّ تَحْتٍ ...... وَاَنْتُمْ دُوْنَ كُلِّ دُوْن

''پس اب تم ہر ماتحت کے ماتحت بن گئے۔ اور ہر کمینے سے زیادہ کمینے ہو گئے۔''

سَكَنْتُمْ يَا رِيَاحَ عَادٍ ..... وَكُلُّ رِيْحٍ اِلَى سُكُوْن

''اے قوم عاد کی آندھیو! تم تھم چکے ہو۔ اور ہر آندھی آخر تھم ہی جاتی ہے۔''[1]

بہت سے شاعر ہجو گوئی میں فحش اور اخلاق سے پست غلیظ باتیں شامل کرنے کے بھی عادی تھے۔ بعض شعراء تو تمام حدیں پار کر کے دین وعقیدے کو بھی مذاق کی زد میں لے آتے تھے۔ نہ انہیں اپنے ایمان کی فکر ہوتی تھی نہ ان کا کلام سننے والے حکمرانوں اور اہل دربار کو۔ ایک شاعر عربوں کی حمایت میں بربر عمائد کی ہجو کرتے ہوئے کہہ گیا:

رَاَيْتُ آدَمَ فِيْ نَوْمِيْ فَقُلْتُ لَهٗ .... اَبَا الْبَرِيَّةِ اِنَّ النَّاسَ قَدْ حَكَمُوْا

''میں نے آدم علیہ السلام کو خواب میں دیکھا تو کہا: اے انسانوں کے باپ! لوگ فیصلہ چاہتے ہیں کہ......''

اِنَّ الْبَرَابِرَ نَسْلٌ مِنْكَ قَالَ اِذَنْ ..... حَوَّاءُ طَالِقَةٌ اِنْ كَانَ مَا زَعَمُوْا

''بربر آپ کی نسل ہیں یا نہیں۔ وہ فرمانے لگے: اگر بربر واقعی میری نسل سے ہوں تو حواء کو طلاق۔''[2]

معاذ اللہ ، نعوذ باللہ من ذلک

قصیدہ گوئی عروج پر:

جب درباری شعراء اپنے سلطان کی تعریف کرتے ہوئے اس کے مخالف پر طنز کے تیر چلاتے تو اسے یقین ہو جاتا کہ وہ دنیا وعقبیٰ میں سربلند ہے جبکہ اس کا سیاسی مخالف ساری مخلوق کے سامنے رسوا ہو گیا ہے۔ یہ حکمران ان نصرانیوں سے لرزتے تھے جو کل تک مسلمانوں کو خراج ادا کیا کرتے تھے۔ ان کی کور چشمی کا یہ عالم تھا کہ جس وقت شمال

---

[1] تاریخ الادب الاندلسی عصر الطوائف: ۱/ ۱۳۲ ، [2] تاریخ الادب الاندلسی عصر الطوائف: ۱/ ۱۳۱

کے نصرانی ان کے خلاف تلواریں تیز کر رہے تھے، یہ ایک دوسرے کی جان کو آرہے تھے۔

مگر عجیب بات یہ ہے کہ جب ہم اس دور کے ادبی وشعری ذخیرے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسے نااہل، کمزور اور عاقبت نااندیش حکمرانوں کے بارے میں بھی ہمیں تعریفوں کے پل بندھے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر تاریخ نے ہمیں نہ بتایا ہوتا کہ اس دور میں اندلس کی حالت کس قدر شکستہ وخستہ تھی اور امرائے دولت مستقبل کے خطرات سے کس طرح آنکھیں موندے ہوئے تھے، تو یقیناً اس لٹریچر پر یقین کرتے ہوئے ملوک الطوائف میں سے ہر ایک کو جامع الصفات ہستی تصور کر لیا جاتا مگر حقائق پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ تمام شعری ذخیرہ بے پناہ خوشامد، حد درجے مبالغہ آرائی اور زبردست قسم کی ملمع سازی پر مبنی ہے۔ اس میں حقیقت برائے نام اور افسانہ بہت زیادہ ہے۔

ہاں یہ ماننا پڑے گا کہ ملوک الطوائف کے دور میں اندلس میں شعروادب، انشاء پردازی اور سخن وری کی معراج کو چھو رہا تھا۔ خیال آفرینی اور قوت کلام کی انتہا یہی ہو سکتی کہ رائی کو پہاڑ ثابت کر دیا جائے۔ ملوک الطوائف کے دور کے اہل شعروسخن واقعی اس مرتبۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ ایک بزدل شخص کو شیر ببر، دو قلعوں کے جاگیردار کو سکندر جیسا فاتح، کنجوس ترین رئیس کو حاتم طائی سے بڑھ کر سخی اور ایک عیاش ونااہل حاکم کو خلیفۂ عادل ثابت کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ نصرانیوں کو خراج دینے والے ایک حاکم کے بارے میں ایک درباری شاعر کہتا تھا:

مَنْ لا تُوَازِنُهُ الْجِبَالُ إِذَا احْتَبَى ...... مَنْ لا تُسَابِقُهُ الرِّيَاحُ إِذَا جَرَى

''یہ وہ ہستی ہیں جو بیٹھ جائیں تو پہاڑ بھی ان کے وزن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ وہ ہیں جب دوڑیں تو آندھیاں بھی ان سے آگے نہیں نکل سکتیں۔''

وَسَمِعْتُ بِاسْمِ الْقَطْرِ حَتَّى شِمْتُهُ ...... فَرَأَيْتُهُ فِي بُرْدَتَيْهِ مُصَوَّرًا

''میں نے بارش کا صرف نام ہی سنا تھا مگر جب ان کے پاس پہنچا تو بارش کو ان کے لباس میں منقش پایا۔''

وَجَهِلْتُ مَعْنَى الْجُوْدِ حَتَّى زُرْتُهُ ...... فَقَرَأْتُهُ فِي رَاحَتَيْهِ مُفَسَّرًا

''میں سخاوت کا مفہوم نہ جانتا تھا مگر میں نے ان کا دیدار کیا تو ان کی ہتھیلیوں پر سخاوت کی تشریح پڑھ لی۔''[1]

ایک اور شاعر جزیرہ مَیُوْرْقَہ کی چھوٹی سی ریاست کے حاکم کی مدح کرتے ہوئے کہتا تھا:

وَعَمَرْتَ بِالْإِحْسَانِ أُفُقَ مَيُوْرْقَةٍ ...... وَبَنَيْتَ فِيهَا مَا بَنَى الْإِسْكَنْدَرُ

''آپ نے میورقہ کی فضا کو احسانات سے معمور کر دیا...... آپ نے اسے سکندر کی دیوار جیسا مضبوط بنا دیا۔''

فَكَأَنَّهَا بَغْدَادُ، أَنْتَ رَشِيْدُهَا ...... وَوَزِيْرُهَا وَلَهُ السَّلَامَةُ جَعْفَرُ

''گویا یہ بغداد ہے اور آپ ہارون الرشید ہیں اور اللہ سلامت رکھے اس کے وزیر کو جو جعفر برمکی ہیں۔''[2]

---

① المطرب من اشعار اهل المغرب: ۱/ ۴۸

② المطرب من اشعار اهل المغرب: ۲/ ۵۱

حکام انہی شعری فتوحات کی محفلوں سے محظوظ ہوتے اور واقعی خود کو فاتح عالم اور جہاں گشا سمجھنے لگتے تھے۔ وہ جیتے جاگتے حالات سے غافل رہ کر قصیدوں کی تخیلاتی دنیا میں جی رہے تھے۔ اسلحہ سازی اور جہاز سازی کے کارخانے بند ہو رہے تھے جبکہ موسیقی کے آلات کی صنعت بام عروج پر تھی اور ان کے خریدار بھی بکثرت۔ شہزادے اور رؤسا باندیاں خریدتے ہوئے حسن و جمال کے ساتھ ساتھ گلوکاری میں مہارت کو پیش نظر رکھتے، ساز و آواز سے دل بہلانے والی ایک ایک باندی تین تین ہزار دینار (تقریباً ۶۰ لاکھ روپے) میں بکتی تھی۔

درباروں کا یہ ماحول نچلے طبقے پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ کے نہ صرف دانشور اور سپاہی شعر گوئی کے رسیا تھے بلکہ معمار، کسان، قلی، جولاہے اور ماہی گیر بھی بات بات پر شعر کہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ شوق گلوکاری اور فن موسیقی کی مقبولیت بھی انتہاء پر تھی۔ غرناطہ کا ابن حمارہ غرناطی اور قرطبہ کا ابن شمعون یہودی موسیقی کے نامور استاد تھے۔ اشبیلیہ میں ابوبکر اشبیلی اور بنوحمود کے ابن حمامی کی گلوکاری شہرہ آفاق تھی۔[1]

قُرطُبہ اور دولتِ بنوجَہوَر

اندلس کے اس سیاسی بحران کے دور میں قرطبہ کے بنوجہور کا وجود ایک نعمت تھا۔ وہاں خلافت کے خاتمے کے اعلان کے بعد امرائے قرطبہ نے ایک وسیع البنیاد اور بااختیار مجلس شوریٰ تشکیل دی تھی اور ذوالحجہ ۴۲۲ھ میں باہمی مشورے سے سابق وزیر سلطنت ابوالحزم ابن جہور کو سربراہ مملکت چن لیا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں صدیوں بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ شخصی و موروثی حکومت اور آمریت کی جگہ اسلام کے اصول شورائیت اور عوام کی ذہنی ہم آہنگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک حکومت تشکیل دی گئی جو ان حالات میں بھی قیام امن اور اپنی حفاظت میں کامیاب ثابت ہوئی۔

ابن جہور ایک پختہ عمر آدمی اور تجربہ کار سیاست دان تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اس ذمہ داری کا اہل تھا۔ اس نے شاہانہ طور طریقوں سے مکمل اجتناب کیا۔ قصر شاہی کی جگہ اپنے ذاتی مکان میں نشست رکھی جہاں عوام و خواص سب کے لیے دروازہ کھلا تھا۔ وہ ہر کام مجلس شوریٰ سے رائے لینے کے بعد کرتا تھا۔ اس نے قرطبہ کے مقامی لوگوں کو تربیت دلا کر ایک فوج تیار کی اور بربروں کے سرکش عناصر کو فوج سے خارج کر دیا۔

یہ حکومت اندلس کے تھوڑے سے وسطی علاقے تک محدود تھی جس میں قرطبہ کے علاوہ وادی الکبیر اور جبل الشارات کے کچھ قصبے اور دیہات شامل تھے۔ اس کی مجلس شوریٰ میں نہایت عالم فاضل ہستیاں شامل تھیں جن میں وزیر سلطنت ابوالولید ابن زیدون اور اندلس کے عظیم مؤرخ ابوحیان اندلسی رحمہ اللہ کا نام سب سے نمایاں ہے۔

ابوالحزم ابن جہور نے تیرہ سال بڑی خوش اسلوبی سے حکومت کی۔ ۴۳۵ھ میں اس کی وفات کے بعد شوریٰ نے

---

[1] تاریخ الادب الاندلسی، عصر الطوائف: ۱/۳۱، ۵۱، ۵۲

نے اس کے بیٹے ابوالولید ابن جَہْور کو سربراہ چن لیا۔ وہ بھی بہترین سیاست دان اور قومی بہی خواہی کے جذبے سے معمور انسان تھا۔ اس نے ۲۲ سال تک لوگوں کی اس طرح خدمت کی کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملا۔ ①

دولتِ اِشبِیلِیَہ اور بنو عباد

قُرطُبہ کے بعد دوسری اہم ریاست اِشبیلیَہ تھی۔ منصور اعظم کے دور سے یہاں عرب قبیلے بنو لخم کے ایک عالم فاضل آدمی ابوالقاسم اسماعیل بن عباد منصب قضاء پر فائز تھے۔ جب قُرطُبہ کی مرکزی حکومت بحران کا شکار ہوئی تو اس وقت قاضی صاحب بہت عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے منصب قضا اپنے بیٹے ابوالقاسم کے سپرد کر دیا۔ اس وقت قُرطُبہ میں اُموی شہزادے اور بنو حمود کے اُمراء باری باری حکومت کر کے بھی سیاسی بحران پر قابو نہ پا سکے تھے اور ساتھ ہی وہ اشبیلیَہ کو بھی اس اکھاڑ پچھاڑ میں گھسیٹ رہے تھے۔ ایسے میں قُرطُبہ کے وزیر ابومحمد عبداللہ مریم نے قاضی اسماعیل بن عباد اور فقیہ ابوعبداللہ زبیدی کے ساتھ مل کر ایک شورائی مجلس منتظمہ قائم کر دی اور اشبیلیَہ سے متعلق تمام احکام ان تینوں کے دستخطوں کے ساتھ جاری ہونے لگے تاہم اس مجلس میں قاضی اسماعیل بن عباد کی حیثیت قدرے بالاتر تھی۔ جمادی الآخرہ ۴۱۴ھ قاسم بن حمود قُرطُبہ سے بھاگ کر اشبیلیَہ میں پناہ لینے آیا تو اسی مجلس منتظمہ کے فیصلے پر اُسے شہر میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ یوں اشبیلیَہ نے اس فضول سیاست سے الگ اپنی شناخت بنائی۔

کچھ مدت بعد عمائدِ شہر کے اتفاق سے قاضی اسماعیل کے بیٹے ابوالقاسم کو اشبیلیَہ کا شورائی سربراہ چن لیا گیا۔ ان دنوں اشبیلیَہ پر بربروں کے حملے کا خطرہ تھا۔ ابوالقاسم نے اشبیلیَہ کے بربر عمائد کو بھی شہر سے نکال دیا اور ساتھ ہی بربروں سے معاہدہ کر لیا کہ حکومتِ اشبیلیَہ بربروں اور عربوں کے جھگڑوں میں غیر جانبدار رہے گی اور بربر عمائد کو ایک معقول سالانہ رقم ادا کرتی رہے گی۔ یوں ابوالقاسم نے اشبیلیَہ کو بربروں سے بچا لیا۔ اشبیلیَہ کو محفوظ سمجھ کر بربروں سے تنگ آئے ہوئے بے شمار عرب یہاں آ کر بس گئے۔ ابوالقاسم نے اشبیلیَہ پر ۲۰ سال حکومت کی۔ وہ کوئی مضبوط ریاست تو نہ بنا سکا مگر اس نے جگہ جگہ سے نکالے گئے عربوں کو ایک پناہ گاہ ضرور فراہم کر دی تھی۔ ②

معتضد کا دور:

۴۳۳ھ میں ابوالقاسم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابوعمرو، اپنے نام کے ساتھ معتضد کا لقب لگا کر بڑی آن بان کے ساتھ تخت پر بیٹھا۔ وہ متضاد صفات کا حامل ایک عجیب و غریب انسان تھا۔ اس کے جاسوس پورے اندلس میں متحرک رہتے تھے۔ وہ سیدھے سادے لوگوں کو جاسوسی کے لیے اس طرح آلۂ کار بناتا کہ انہیں بھی معلوم نہ ہو پاتا کہ

---

① تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۲۰۳، ۲۰۵ ط دار الفکر؛ البیان المغرب: ۳/ ۱۵۰ تا ۱۵۵؛ الحلۃ السیراء: ۱/ ۲۳۵؛ نفح الطیب: ۱/ ۳۰۲، ۳۳۹، ۳۳۰؛ المقتبس من انباء الاندلس لابن حیان: ۲/ ۳۳ تا ۳۵

② المعجب فی تلخیص اخبار المغرب: ۱/ ۴۷؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۳۲ تا ۳۵

کونسی مہم انجام دی جارہی ہے۔ ایک بار اس نے ایک بدو کو بلایا اور اسے ایک عمدہ جبّہ پہنا کر حکم دیا کہ وہ جنگل سے لکڑیاں جمع کرے اور انہیں بربروں کی ریاست قرمونہ میں جا کر بیچ دے مگر دام پانچ درہم سے کم نہ لے۔

بدو لکڑیاں کاٹنے اور اٹھانے کا عادی نہ تھا۔ اس نے تھوڑی سی لکڑیاں جمع کیں، قرمونہ پہنچا اور بازار میں پانچ درہم کی صدا لگانے لگا۔ لوگ ہنستے ہوئے گزر جاتے کہ نصف درہم کی چیز پانچ درہم میں بیچنے والا یہ شخص پاگل ہے۔

کچھ سادہ لوحوں کو دور سے شک ہوتا کہ یہ بدو آبنوس یا عود کی لکڑی لایا ہے تبھی اتنے دام لگا رہا ہے مگر قریب جا کر وہ بھی منہ بنا لیتے۔ سارا دن گزر گیا۔ شام کو ایک اجنبی آیا اور کہا: ''لکڑی کا گٹھا میرے گھر پہنچا دو۔ پانچ درہم دوں گا۔''

بدو گٹھا اٹھا کر اس کے گھر لے گیا۔ اجنبی نے پانچ درہم دے دیے مگر ساتھ ہی کہا:

''تم جانتے ہو کہ بربر کتنے خطرناک اور سفاک ہیں۔ رات یہیں ٹھہر جاؤ۔''

بدو کے لیے بستر لگایا گیا، جب وہ لیٹنے لگا تو اجنبی نے کہا: ''جبّہ اتار دو۔ اچھی نیند آئے گی۔''

بدو نے جبّہ اتار دیا اور گہری نیند میں غرق ہو گیا۔ اجنبی معتضد کا جاسوس تھا۔ اس کو پہلے سے ہدایات مل چکی تھیں جن کے مطابق اس نے جبے کی اندرونی تہہ کو چیرا۔ معتضد کا خفیہ مکتوب اندر موجود تھا۔ جاسوس نے اس کا مطالعہ کیا۔ پھر جوابی خط لکھ کر وہیں رکھ دیا اور جبے کو ویسا ہی سی دیا۔ صبح اٹھ کر بدو واپس اشبیلیہ روانہ ہو گیا۔ معتضد کے پاس پہنچا تو اس نے کہا: ''یہ جبّہ اتار دو اور مجھ سے نئی پوشاک لے لو۔''

اسے نہایت نفیس لباس پہنایا گیا اور وہ خوشی خوشی گھر چلا گیا۔

معتضد نے اس جبے کو کھول کر اپنے جاسوس کا جواب پڑھ لیا جبکہ بے چارے بدو کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ وہ کوئی پیغام لے کر گیا تھا اور اس کا جواب لا کر معتضد تک پہنچا چکا ہے۔[1]

معتضد کی سخت گیری:

ایک طرف وہ شعر و ادب اور حسن و جمال کا دلدادہ تھا تو دوسری طرف انتہائی سنگ دل اور بے رحم۔ اس نے اپنے بیٹے اسماعیل کو بغاوت کے جرم میں خود موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اسے جس سے دشمنی ہو جاتی، اس سے ہر حال میں انتقام لے کر رہتا۔ ایک مؤذن اس کی سخت گیری سے گھبرا کر طُلَیطلہ چلا گیا تھا اور تہجد میں اٹھ کر اسے بددعائیں دیتا تھا۔ معتضد کو پتا چلا تو ایک خفیہ اہلکار کو اس کے پیچھے بھیجا۔ جب تک اس غریب کا سر قلم کر کے معتضد کے سامنے نہ رکھا گیا اس کی انا کو تسکین نہ ملی۔ حد یہ ہے کہ ایک نابینا جو اس کے مظالم کا شکار تھا اور اسے بددعائیں دیتا تھا، بھاگ کر اندلس سے مکہ چلا گیا۔ معتضد نے وہاں تک اس کا پیچھا کرایا۔ اسے زہر دے کر مروائے بغیر معتضد کو چین نہ آیا۔[2]

وہ سیاسی مخالفین اور باغیوں کو چن چن کر قتل کرتا اور ان کی کھوپڑیوں کو اپنے خاص باغیچے میں گملوں کے طور پر نصب

---

[1] المعجب فی تلخیص اخبار المغرب: ۱/ ۷۵

[2] سیر اعلام النبلاء: ۱۹/ ۵۹، ط الرسالة

کرتا۔ گملوں پر ناموں کے پرچے لگا کر ان میں پھولوں کے پودے اگاتا۔ ①

جسمانی لحاظ سے وہ فولاد پیکر تھا۔ اس کی باندیوں کی تعداد ستر تھی جن کے ساتھ مجلس شراب و کباب گرم کرنا اس کا معمول تھا۔ اتنی عیاشی کے باوجود اسے کبھی بدنی کمزوری لاحق ہوئی نہ وہ کبھی نشے سے بدمست ہوا۔ وہ خود میدان جنگ میں کم ہی اترتا تھا مگر لڑائیوں کے نقشے بنانے اور قیادت میں اسے مہارت حاصل تھی۔ اس کا جاسوسی کا نظام نہایت تیز تھا۔ ملوک الطوائف کے ہر دربار میں اس کے مخبر موجود تھے۔ وہ سیاسی چالوں کا مانا ہوا کھلاڑی تھا۔ یہ الگ بات کہ یہ ساری قابلیت اڑوس پڑوس کی مسلم ریاستوں سے الجھنے ہی میں صرف ہو رہی تھی۔ جنوبی اندلس کے ملوک الطوائف اس کی ترک تازیوں کا سب سے بڑا ہدف تھے۔

اس نے ۴۴۳ھ میں ''ولبہ'' اور ''لبلہ'' پر قبضہ کر کے بنو بکر اور بنو یحییٰ کو سیاسی اکھاڑے سے باہر کر دیا۔ ۴۵۰ھ میں معتضد نے جنوبی اندلس میں مزید پیش قدمی کی اور جزیرۃ الخضراء پر قبضہ کر کے بنو حمود کو وہاں سے نکال دیا۔ پھر ۴۵۵ھ میں ''شلب'' پر قبضہ کر کے ''بنو مزین'' کو بھی دائرہ اقتدار سے بے دخل کر دیا۔ ②

معتضد کی فتوحات اور مخالفین پر مظالم:

اس کے بعد اس نے جنوب مشرق میں مورون اور رُندہ کی بربری ریاستوں کو زیر تسلط کر لیا۔ ان امراء کو مکمل طور پر رام کرنے کے لیے ایک بار وہ ''رُندہ'' گیا۔ بربری سرداروں نے اس کا استقبال کیا مگر اندرونی طور پر وہ اس کے مخالف تھے لہٰذا ایک دن اسے بے خبر سمجھ کر اس کے قتل کے درپے ہو گئے تاہم ایک رئیس معاذ بن ابی قرہ نے انہیں روک لیا۔ معتضد کو سازش کا علم ہو گیا مگر وہ انجان بن کر بربروں کی دوستی پر اعتماد ظاہر کرتا رہا۔

اشبیلیہ واپس پہنچ کر اس نے رُندہ، مورون، ارکش اور سریش کے ساتھ بربری سرداروں کو ایک شاندار ضیافت میں بلایا۔ کھانے سے پہلے انہیں اپنے خوبصورت حمام میں غسل کے لیے بھیج دیا۔ وہ سب حمام کا لطف اٹھا رہے تھے کہ یکایک اس میں ہوا کے تمام راستے بند ہو گئے اور حرارت اتنی بڑھی کہ سب حبس اور گرمی سے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ یہ سب معتضد کے حکم سے ہوا۔ اس نے حمام پر مٹی کا پلاستر کرا دیا تھا۔ ③

ساٹھ بربری سرداروں کی ایک ساتھ موت نے جنوبی اندلس میں ہل چل مچا دی اور عربوں اور بربروں کے مابین کشیدگی عروج پر پہنچ گئی۔ غرناطہ کے امیر بادیس نے بربروں کا بدلہ لینے کے لیے معتضد کے خلاف فوج کشی کی مگر معتضد نے اسے پسپا کر دیا۔ ④

ان فتوحات کے بعد معتضد خود کو اسلامی اندلس کے قدیم سیاسی مرکز ''قرطبہ'' کا وارث سمجھنے لگا لہٰذا اس نے

---

① البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۲۰۵/۳

② دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۵۳، ۵۶، ۶۰

③ سیر اعلام النبلاء: ۱۹/ ۵۹، ۶۰، ط الرسالۃ

④ تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۲۰۲، ط دار الفکر

قرطبہ پر قبضے کی کوششیں بھی شروع کر دیں مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ معتضد کی اس ہوسِ ملک گیری کے ردعمل میں دیگر ملوک الطوائف نے شاہِ قسطالیہ فرڈی نینڈ اوّل کو اپنا سرپرست بنالیا اور اسے پابندی سے لگان دینے لگے۔

دولتِ غرناطہ اور بادیس بن حبوس

غرناطہ میں بربر سردار بادیس بن حبوس کی حکومت تھی جو معتضد کا سب سے گراں جان حریف تھا۔ اگرچہ اس نے غرناطہ میں امن وامان قائم رکھا اور بڑے پیمانے پر تعمیری وترقیاتی کام کرا کے اسے نت نئی عمارتوں کے ساتھ ایک خوبصورت شہر بنا ڈالا تھا تاہم اخلاق و کردار کے اعتبار سے وہ بالکل گرا ہوا تھا، خصوصاً مخالفین کے لیے وہ ایک عذاب تھا۔ ایک مؤرخ لکھتا ہے:

''وہ اپنے مخالفین کو تباہ کر دیتا تھا۔ راہِ انصاف سے دور تھا۔ اللہ کے ممنوع کردہ کام بڑی بے باکی سے کرتا اور شرمندہ بھی نہ ہوتا۔ انجام کی پروا کیے بغیر وہ جو مرضی کر گزرتا تھا۔ زبان سے پہلے تلوار سے کام لیتا۔ اس کا شر اس کی خیر پر غالب تھا۔ مکاروں سے بڑا مکار اور مجرموں سے بڑھ کر مجرم تھا۔''[1]

بادیس کا عدل سب سے نرالا تھا۔ ایک بار کسی عورت نے آ کر فریاد کی: ''یا امیر! میرا بیٹا نافرمان ہے۔''

بادیس نے فوراً اسے بلوالیا اور تلوار سونت لی۔ عورت گھبرا کر کہنے لگی: ''یا امیر! میں تو صرف اسے تنبیہ کرنا چاہتی ہوں۔'' بادیس نے کہا: ''میں استاد نہیں جو کتاب پڑھاؤں۔'' یہ کہہ کر تلوار چلائی اور لڑکے کا سر قلم کر دیا۔[2]

غرناطہ کا یہودی وزیر:

اسے اہلِ ایمان سے زیادہ کفار پر بھروسہ تھا۔ اس نے اسماعیل بن نغرالہ نامی ایک یہودی کو وزیر بنا کر ملک کا نظام اس کے ہاتھوں میں دیا ہوا تھا۔ یہ یہودی انتظامی امور کا بڑا ماہر اور علوم وفنون میں حاذق تھا۔ اگر اسے اس کی قابلیت کے مطابق کوئی سرکاری ملازمت ملتی تو کوئی حرج نہ تھا مگر بادیس نے اسے سلطنت کا اہم ترین عہدہ دے رکھا تھا جو سخت عاقبت نااندیشی کی بات تھی۔ اہلِ غرناطہ کو اپنے سروں پر ایک یہودی کی موجودگی بڑی ناگوار گزرتی تھی۔ ابن نغرالہ کے مرنے پر انہیں توقع ہوئی کہ اب کسی مسلمان کو یہ منصب ملے گا مگر بادیس نے اسی یہودی کے بیٹے یوسف کو وزیر بنالیا۔

یوسف اپنے باپ سے کہیں زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ اس نے سرکاری عہدوں پر یہودی بھرتی کر کے غرناطہ میں ان کی اجارہ داری قائم کرنا شروع کر دی۔ شاہی محل میں ہر جگہ اس کے جاسوس مقرر تھے جو اسے حکمران خاندان کے ہر فرد کی ایک ایک حرکت کی خبر دیتے رہتے تھے۔

یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بادیس اپنے یہودی وزیر سے بالکل مطمئن تھا۔ تاہم اس کے بڑے بیٹے اور ولی عہد شہزادہ بُلُقِّین سیف الدولہ نے خطرے کو محسوس کر لیا۔ وہ یہودی وزیر سے ظاہری مدارات تو برت رہا تھا اور اس کے

---

[1] الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۱/ ۲۲۱، ط دار الکتب العلمیة   [2] سیر اعلام النبلاء: ۱۸/ ۵۹۱

ساتھ التفات بیٹھتا بھی تھا مگر دلی طور پر اُسے اُمورِ سلطنت پر یہودیوں کا تسلط بالکل برداشت نہیں تھا۔ قریب تھا کہ وہ یوسف کا قصہ تمام کر دیتا مگر یوسف کے جاسوسوں نے اسے چوکنا کر دیا اور اس نے شہزادہ بُلُقین کو مے نوشی کی مجلس میں مدعو کیا اور اُس کے جام میں زہر ملا دیا۔ شہزادہ جام پی کر مجلس سے اٹھا تو اُسے قے ہونے لگی۔ بمشکل اپنے محل پہنچا اور بستر پر پڑ گیا۔ طبیعت بگڑتی چلی گئی اور آخر اس نے دم توڑ دیا۔

بادیس اپنے بیٹے کی موت پر غم سے بے حال ہو گیا۔ مگر یہودی وزیر نے اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے بادیس کو یقین دلا دیا کہ یہ کچھ غلاموں اور باندیوں کی سازش ہے۔ بادیس نے اسے سچ مان کر کئی غلاموں اور باندیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھا۔ اقتدار اب مکمل طور پر یوسف یہودی کے ہاتھ میں تھا۔ غرناطہ کے علماء، فقہاء اور اہلِ علم و دانش اس صورتحال پر سخت کبیدہ خاطر تھے۔[1]

یہودی وزیر کے مظالم پر شعراء کا احتجاج:

ایک شاعر ابن الجد نے اس صورتحال پر کڑھتے ہوئے کہہ دیا:

تَحَكَّمَتِ الْيَهُوْدُ عَلَى الْفُرُوْجِ ...... وَتَاهَتْ بِالْبِغَالِ وَالسُّرُوْجِ

"یہودی ہماری ناموس کے مالک ہو گئے ...... وہ خچروں پر زینیں لگائے اکڑتے پھرتے ہیں۔"

وَقَامَتْ دَوْلَةُ الْاَنْذَالِ فِيْنَا ...... وَصَارَ الْحُكْمُ فِيْنَا لِلْعُلُوْجِ

"ہم پر پست لوگوں کی حکومت مسلط ہو گئی ہے ...... ہمارے ہاں اختیارات کفار کے پاس ہیں۔"

فَقُلْ لِلْاَعْوَرِ الدَّجَّالِ هٰذَا ...... زَمَانُكَ اِنْ عَزَمْتَ عَلَى الْخُرُوْجِ

"کانے دجال کو کہہ دو ...... اگر تو نمودار ہونا چاہتا ہے تو آ جا کہ تیرا زمانہ آ گیا ہے۔"

یہودی عہدے داروں نے مسلمانوں پر ناروا ٹیکس عائد کر رکھے تھے جس سے عوام جاں بلب تھے۔ ایک شاعر ابوحفص الزکوی اس پر فریاد کرتا ہوا کہتا ہے:

كُنَّا نُطَالِبُ لِلْيَهُوْدِ بِجِزْيَةٍ ...... وَ اَرَى الْيَهُوْدَ بِجِزْيَةٍ طَلَبُوْنَا

"ہم یہود سے جزیہ وصول کرتے رہے ...... مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ یہودی ہم سے جزیہ مانگ رہے ہیں۔"

فَاِنْ سَمِعْنَا مَالِكًا اَفْتٰى بِذَا ...... لَا، لَا وَلَا مِنْ بَعْدِهٖ سَحْنُوْنَا

"ہم نے نہ تو امام مالکؒ سے اس کے جواز کا فتویٰ سنا تھا، اور نہ ہی ان کے بعد سحنونؒ سے ایسا سنا۔"

سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ یہودی زعماء قرآن مجید کی حقانیت پر اعتراض کرتے تھے اور علماء کو اس حوالے سے چھیڑتے تھے۔ یوسف یہودی نے باقاعدہ ایک کتاب لکھی جس میں قرآن مجید کو غلط ثابت کرنے کی مذموم کوشش

---

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۱۳۳، ۱۳۴

کی گئی تھی۔ فقیہ ابو اسحٰق البیری ﷫ نے اس صورتحال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا:

فَصَارَتْ حَوَائِجُنَا عِنْدَهُ ...... وَنَحْنُ عَلَىٰ بَابِهِ قَائِمُوْنَ

"ہماری ضروریات اس یہودی کے اختیار میں ہیں...... پس ہم اس کے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں۔"

وَيَضْحَكُ مِنَّا وَمِنْ دِيْنِنَا ...... فَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا رَاجِعُوْنَ

"وہ ہمارا اور ہمارے دین کا مذاق اڑاتا ہے...... پس "انا للہ وانا الیہ راجعون""[1]

فقیہ ابو اسحٰق کے ان اشعار نے غرناطہ کے ان مسلمانوں کے جذبات کو مزید مہمیز کیا جو یوسف یہودی کی اسلام مخالف سرگرمیوں پر مشتعل تھے۔ چنانچہ صفر ۴۵۹ھ کی شب شہریوں نے قصرِ وزارت پر دھاوا بول کر یوسف یہودی کو قتل کر دیا۔[2]

اس طرح غرناطہ میں یہودیوں کی حکومت کے قیام کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔

بادیس بن حبوس ۳۷ سال طویل حکومت کر کے شوال ۴۶۵ھ (جولائی ۱۰۷۳ء) میں فوت ہو گیا۔ اندلس میں بربروں کا اس سے بڑھ کر طاقتور حاکم کوئی نہیں گزرا۔ اس کے بعد اُمرائے دولت نے اس کے کم عمر پوتے عبداللہ بن بُلقین کو تخت پر بٹھا دیا (کیوں کہ ولی عہد سلطنت بُلقین سیف الدولہ یہودی وزیر کی سازش سے قتل ہو چکا تھا۔)[3]

مشرقی اندلس کی آزاد ریاستیں

اسی زمانے میں مشرقی اندلس کے ساحلی شہروں بَلَنْسِیَه، اَلْمَرِیَّه اور مُرسِیَه میں چند آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں جن کے بانی قُرطُبہ کے وہ صقلبی افسران تھے جو ابن ابی عامر حاجب المنصور کے موالی ہونے کے باعث عامری کہلاتے تھے۔

❶ دانِیہ: مجاہد عامری نے ۴۰۸ھ میں دَانِیَہ کے خوبصورت ساحل پر اپنی چھوٹی سی حکومت قائم کر لی۔ اس نے مشرقی جزائر مَیُورْقَه، مَنُورْقَه اور یَابِسَه کو بھی اپنی عملداری میں شامل کر لیا۔ یہ شخص بحری جنگوں کا زبردست تجربہ رکھنے کے ساتھ ساتھ تجارتی اُمور میں بھی بہت ماہر تھا۔ اس لیے ریاستِ "دَانِیَہ" دولت و ثروت میں بہت سی بڑی ریاستوں سے آگے نکل گئی۔ ۲۸ سال حکومت کر کے ۴۳۶ھ میں مجاہد کی وفات ہو گئی اور یہاں کی مسند اس کے بیٹے علی بن مجاہد اقبال الدولہ نے سنبھال لی۔[4]

---

① تاریخ الادب الاندلسی عصر الطوائف: ۱/ ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۳۸

② دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۱۳۵، ۱۳۶

③ دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۱۳۹، ۱۴۲

④ دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۱۹۴ تا ۲۰۳

۴۶۸ھ میں اس کی حکومت سرقسطہ کے ہُودوں کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

❷ بَلَنْسِیَہ:

دو صقلبی افسران مبارک اور مظفر نے ۴۰۰ھ میں عظیم الشان ساحلی شہر بَلَنْسِیَہ کو آزاد ریاست بنادیا۔ یہ دونوں "یک جان دو قالب" کا مصداق تھے۔ ہمیشہ ساتھ رہتے اور ہر کام مل جل کے کرتے۔ انہوں نے بڑے اتفاق واتحاد سے اس نئی ریاست کو پروان چڑھایا۔ اگرچہ یہ دونوں تعلیم یافتہ نہ تھے مگر علم نواز ضرور تھے۔ ان کا دربار چوٹی کے علماء وفضلاء سے جگمگاتا تھا جن میں ابن تاکرنی، علامہ مہلب اور ابن طالوت جیسے لوگ تھے۔

مبارک اور فضل ساتھ ساتھ جیے اور معمولی وقفے سے ایک ہی سال یعنی ۴۰۸ھ میں وفات پاگئے۔

ان کے بعد حاجب المنصور کے پوتے عبدالعزیز بن عبدالرحمن (عبدالعزیز بن ابی عامر) نے یہ ریاست سنبھال لی اور ۴۲ سال تک (۴۱۱ھ تا ۴۵۳ھ) اس کا نظم ونسق چلایا اور اسے ایک خوشحال، ترقی یافتہ اور مستحکم ریاست بنادیا۔[1]

❸ اَلْمَرِیَّہ:

ایک اور صقلبی افسر خیران عامری نے اہم تجارتی بندرگاہوں: اَلْمَرِیَّہ اور مُرسِیَہ پر ۴۰۵ھ میں اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔ اس کی وفات کے کئی سال بعد یہاں کے وزیر معن بن صمادح نے جس کا تعلق عرب قبیلے بنو تجیب سے تھا، اَلْمَرِیَّہ میں خودمختاری حاصل کرلی۔ وہ بڑا عالم فاضل اور قابل انسان تھا۔ اس نے دس سال (۴۳۳ھ تا ۴۴۳ھ) حکومت کی اور اس حسین شہر کو علوم وفنون کا مرکز بنادیا۔

اس کے بعد اس کے بیٹے محمد بن معن نے معتصم کا لقب اختیار کرکے یہاں ۴۱ سال تک (۴۴۳ھ تا ۴۸۴ھ) بہت خوش اسلوبی سے حکومت کی۔ وہ رقبے کے لحاظ سے ایک چھوٹی ریاست کا مالک ہونے کے باوجود اپنی علم دوستی، شعر گوئی، سخاوت اور سیاسی مہارت کے باعث ایک ممتاز مقام رکھتا تھا۔[2]

فرڈی ننڈ اوّل اور قسطالیہ کے خطرناک عزائم

حالات اہل اندلس کو جھنجھوڑ رہے تھے مگر وہ نغمہ وسرود میں مدہوش تھے۔ اس وقت شمال میں قسطالیہ کی ریاست نہایت طاقتور ہوچکی تھی اور اس کا حکمران فرڈی ننڈ اوّل مسلمانوں کو مٹادینے کی تیاری کررہا تھا۔ فرڈی ننڈ اوّل نے تیس سال حکومت کی اور مسلمانوں کی کمزوری اور خانہ جنگی سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا۔ ملوک الطوائف آپس میں مسلسل لڑتے رہتے تھے اور ایک دوسرے کے علاقے ہتھیانے کے لیے ہر قسم کے مکروفریب اور دھوکہ دہی کو کام میں لاتے۔ باہمی لڑائیوں میں وہ فرڈی ننڈ کی امداد پر بھروسہ کرتے اور اسے اپنا حامی بنائے رکھنے کے لیے عوام کے خون

---

① دولة الاسلام في الاندلس: ۲/ ۲۱۷ تا ۲۲۳

② دولة الاسلام في الاندلس: ۲/ ۱۵۸ تا ۱۶۷۔ فاضل مصنف نے ان ریاستوں کی تشکیل، ترقی اور سیاسی انقلابات کی بہت تفصیل بیان کی ہے جو قابل ملاحظہ ہے۔ یہاں نہایت اختصار سے ضروری تعارف پیش کردیا گیا ہے۔

پیشے کی کمائی سے حاصل شدہ بھاری رقم اسے خراج میں ادا کرتے تھے۔ فرڈیننڈ حسب موقع متحارب امراء میں سے کبھی ایک اور کبھی دوسرے کی مدد کرتا اور کبھی اپنی سرپرستی کے صلے میں ان سے سرحدی قلعے لے لیتا۔ اس طرح تیس سالوں میں نصرانیوں نے مسلمانوں کے کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔

سابق ادوار میں جب نصرانی اسلامی شہروں پر جارحیت کرتے تو ان کا مقصد صرف لوٹ مار ہوتا تھا، مگر اب ان کی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ پہاڑوں سے اتر کر ساحلی اور نشیبی شہروں پر قابض ہونے لگے اور باقاعدہ اپنے اُمیر مقرر کرنے لگے۔ مشرقی ساحل کا ایک شہر برشلونہ ان کے قبضے میں تھا۔ اب وہ مغربی ساحل (یعنی موجودہ پرتگال) کے اسلامی شہروں کی طرف بھی پیش قدمی کرنے لگے۔ اندلس کے جنوبی شہر اگرچہ فرڈی ننڈ کی زد سے دور تھے مگر طلیطلہ اس کی سرحد سے ملا ہوا تھا جبکہ رفتہ رفتہ قرطبہ اور اشبیلیہ بھی اس کے فاصلے سمٹتے جارہے تھے۔

ذلت ونکبت کے ان دنوں میں بہت سے لوگ معتضد کو اندلس کا نجات دہندہ سمجھتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ وہ فرڈی ننڈ اول کو جنوب کی طرف بڑھنے سے نہ صرف روک لے گا بلکہ اسے قدیم سرحدوں تک پسپا کرسکے گا۔ مگر ان کی توقعات کبھی پوری نہ ہوسکیں۔

جب تک فرڈی ننڈ اول کو نصرانی ریاستوں کے اندرونی تنازعات سے پالا پڑتا رہا، وہ مسلمانوں سے خراج اور اکا دکا قلعے لینے پر قناعت کیے رہا مگر ۴۴۷ھ میں لیون اور قسطالیہ کے اتحاد کے ساتھ ہی نصرانیوں کے اندرونی جھگڑے ختم ہوگئے اور ساتھ ہی فرڈی ننڈ اول نے بطلیوس پر حملہ کرکے امیر مظفر سے چند شہر چھین لیے۔

۴۴۹ھ میں اس نے شمالی اندلس میں بنو ہود کے شہر "بازو" (Viseo) کو گھیر لیا اور اسے بزور شمشیر زیر نگین کرکے لوگوں کو قیدی بنالیا۔ تیس سال پہلے اسی شہر پر الفانسو پنجم نے حملہ کیا تھا اور "بازو" کے ایک تیر انداز نے صحیح نشانہ لگا کر اسے میدان جنگ میں قتل کردیا تھا۔ فرڈی ننڈ اول الفانسو پنجم کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے قیدیوں میں سے اس تیر انداز کو ڈھونڈ نکالا، اس کی آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلائیاں پھیری گئیں، پھر اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے تڑپتا چھوڑ دیا گیا یہاں تک کہ وہ شہید ہوگیا۔ "بازو" کی فتح سے سرقسطہ کا وہ سارا علاقہ نصرانیوں کے پاس چلا گیا جو دریائے دویرہ کے جنوب میں تھا۔[1]

طُلَیطلہ اور بنو ذوالنون

اس وقت مسلم اسپین کی سب سے مضبوط ریاست طُلَیطلہ تھی جہاں بربری قبیلے ہوارہ سے تعلق رکھنے والے ماموں ذوالنون کی حکومت تھی۔ اس خاندان کو تیسری صدی ہجری کے وسط میں اُس وقت شہرت ملی جب ان کے سردار موسیٰ بن ذوالنون نے طُلَیطلہ کے مشرق میں "شنت بریہ" کے پہاڑوں کو مستقر بنا کر اہل طُلَیطلہ کے مویشی لوٹنے

[1] التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الیٰ سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۳۲۸

کا سلسلہ شروع کیا۔ اہلِ طُلَیطلہ اس گروہ سے بہت تنگ تھے اور اس سے حفاظت کے جتن کیا کرتے تھے۔ [1] حاجب المنصور نے اپنے دور میں ان سرکش لوگوں کی طاقت کو مثبت طور پر استعمال کرنے کے لیے انہیں فوج میں بھرتی کے مواقع دیے۔ یحییٰ المامون اسی گروہ کا ''چشم و چراغ'' تھا۔ اس کے باپ اسماعیل ذوالنون نے انتشار اور افراتفری کے اس دور میں اپنی گروہی قوت کو کامیابی سے استعمال کر کے ۴۲۸ھ میں طُلَیطلہ پر قبضہ کر لیا تھا۔

سات سال حکومت کر کے ۴۳۵ھ میں اسماعیل ذوالنون کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا یحییٰ المامون حکمران بنا۔ شرافتِ نسبی سے محرومی کے باعث اسے عوامی حمایت حاصل نہیں تھی لہٰذا اس نے نصرانیوں سے روابط بڑھائے اور فرڈی ننڈ اوّل کو شروع ہی میں اپنا دوست بنالیا۔ اس نے کبھی نصرانیوں سے جنگ کا خطرہ مول نہ لیا بلکہ ملوک الطوائف سے لڑکر اپنا رقبہ بڑھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے بَطَلیُوس کے حکمران محمد بن عبداللہ افطس سے کئی جنگیں لڑیں اور اس سے کئی اہم قلعے چھین لیے۔ [2]

یحییٰ المامون کی بیٹی بَلَنْسِیَہ کے خودمختار حاکم عبدالملک کے نکاح میں تھی جو ابن ابی عامر کا پڑپوتا تھا۔ اس کے باپ عبدالعزیز نے قُرطُبہ کے سیاسی بحران کے دوران بَلَنْسِیَہ میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ عبدالملک باپ کے بعد تخت پر بیٹھ کر مے نوشی اور عیاشی میں غرق ہو گیا اور بیوی کی توہین و تذلیل کو عادت بنالیا۔ یحییٰ المامون یہ برداشت نہ کر سکا۔

ایک دن وہ سیر سپاٹے کے بہانے بَلَنْسِیَہ گیا۔ عبدالملک نے سسر کا استقبال کیا اور خاطر مدارات کی۔ ایک دن موقع پا کر المامون نے اپنے خدام کے ذریعے عبدالملک کو اغواء کر کے اپنے آبائی مستقر شنت بریہ کے پہاڑوں میں بھیج دیا اور بَلَنْسِیَہ پر آسانی سے قبضہ کر لیا۔ یہ ۴۵۷ھ کا واقعہ ہے۔ [3]

ملوک الطوائف اسی قسم کے باہمی تنازعات میں مگن تھے اور اُدھر ان حالات میں شمال سے فرڈی ننڈ اوّل کی یلغار دوبارہ شروع ہو گئی۔ یحییٰ المامون کو فرڈی ننڈ اوّل سے دوستی کے سبب یہ توقع تھی کہ وہ اس کے علاقے پر ہاتھ صاف نہیں کرے گا مگر ۴۵۴ھ میں جب وہ اپنا لاؤ لشکر لے کر طُلَیطلہ کے دروازے پر آدھمکا تو اہلِ طُلَیطلہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ جب مامون ذوالنون نے بھاری خراج کی شرط پر فرڈی ننڈ اوّل کے سامنے سر جھکا دیا تو طُلَیطلہ کے مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ اسلامی اندلس کی عظمت کے دن گنے جا چکے ہیں۔ [4]

اِشبیلیہ بھی باج گزار:

طُلَیطلہ کے بعد فرڈی ننڈ اوّل نے اندلس کی دوسری طاقتور ترین ریاست اشبیلیہ کو نشانہ بنایا اور ۴۵۵ھ میں لشکر

---

[1] الکامل فی التاریخ: ۶/۲۱۷، سنۃ ۲۹۰ھ

[2] التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۳۲۸

[3] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/۱۰۱، ۱۰۲

[4] التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۳۲۸

صلیب اشبیلیہ کے سامنے آن پہنچا۔ چونکہ معتضد جنوب میں مسلسل فتوحات کے باعث اپنی دھاک بٹھا چکا تھا لہٰذا مسلمان اس سے کسی جرأت مندانہ اقدام کی امید کر رہے تھے مگر انہیں یہ دیکھ کر نہایت مایوسی ہوئی کہ معتضد نے خود فرڈی ننڈ اوّل کی خیمہ گاہ میں حاضری دے کر بلا چوں چرا اس کی باج گزاری قبول کر لی۔ [1]

❖❖❖

دولتِ بنو افطس۔ بطلیوس

وسیع و عریض ریاست "بطلیوس" اندلس کے مغرب میں واقع تھی۔ باجہ، ماردہ، یابرہ، اشبونہ، شنترین، شنترہ، بازہ اور قلمریہ اس کے اہم شہر تھے۔ ان میں سے کئی شہر موجودہ پرتگال کا حصہ ہیں۔

قرطبہ کی مرکزی حکومت کے دورِ زوال میں یہاں شاپور فارسی نامی ایک غلام بطور نائب حکومت کر رہا تھا۔ اس کی وفات ہوئی تو اس کے وزیر محمد بن مسلمہ عرف ابن افطس نے (جس کا تعلق بربروں کے قبیلہ مکناسہ سے تھا) المنصور کا لقب لگا کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ رقبے کے لحاظ سے یہ ملوک الطوائف کی سب سے بڑی ریاست تھی۔

۴۳۷ھ میں محمد ابن افطس کی وفات ہوگئی اور اس کا بیٹا المظفر (۴۳۷ھ تا ۴۶۱ھ) یہاں کا حکمران بن گیا جسے علم و فضل میں قابلِ رشک مقام حاصل تھا۔ خصوصاً وہ شعر و ادب اور تاریخ کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے کئی سالوں کی محنت سے پچاس جلدوں پر مشتمل تاریخی اور ادبی واقعات پر مشتمل ایک عظیم الشان کتاب خود تصنیف کی تھی جسے "المظفری" کہا جاتا تھا۔ [2]

اس کے دور میں ملوک الطوائف کی خانہ جنگی انتہا پر تھی۔ المظفر کو اپنی ریاست بچانے کے لیے ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا۔ ۴۴۳ھ تک اس کی ریاست اشبیلیہ کے بنو عباد کے حملوں کی زد میں رہی، پھر طلیطلہ کے بنو ذوالنون سے کش مکش چلتی رہی۔ اس کے بعد قسطالیہ کے فرڈی ننڈ اوّل کے حملے شروع ہوگئے جس نے ۴۴۹ھ (۱۰۵۱ء) میں ریاست کے شمالی شہروں: لامیجو (ملیقیہ) اور بازو پر قبضہ کر لیا۔ المظفر نے فرڈی ننڈ کی جانب سے خراج ادا کرنے کا مطالبہ مسترد کر تا رہا مگر جب فرڈی ننڈ دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ دریائے تاجہ کے کنارے واقع ریاست کے اہم شہر شنترین کی طرف بڑھا تو المظفر دب گیا اور اس نے پانچ ہزار دینار سالانہ خراج دینے کا وعدہ کر کے فرڈی ننڈ کو واپسی پر آمادہ کر لیا۔ تاہم ریاست بطلیوس کو اس معاہدے کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور ۴۵۶ھ میں فرڈی ننڈ اوّل نے اس کے شمالی شہر قلمریہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں بے شمار مرد و زن کو قیدی بنا لیا گیا۔ جو بچ گئے، ان میں سے جن جن سے ممکن ہوا، وہ یہاں سے نقل مکانی کر گئے۔ فرڈی ننڈ نے اپنے مشیر سیسنانڈ و کو یہاں کا نواب مقرر کر دیا۔

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۳۸

[2] ایک قول یہ ہے کہ یہ کتاب دس ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی۔ بہر صورت یہ کتاب زمانہ دراز سے نایاب ہے۔ کئی محققین اس کی تلاش میں سرگرداں رہے مگر تا حال اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

قلمریہ کے سقوط نے مسلمانوں کو بہت خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد عین ممکن تھا کہ فرڈی ننڈ مزید پیش قدمی کرتا مگر اس کی موت اور اس کے تین بیٹوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی سے بطلیوس کو قدرے مہلت مل گئی۔ ①

ادھر ۴۶۱ھ میں المظفر کی وفات ہوگئی۔ بطلیوس میں اس کے دو بیٹوں: یحییٰ المنصور اور عمر المتوکل میں کش مکش ہوئی اور آخر ۴۶۴ھ میں عمر المتوکل ریاست کا نیا حکمران بن گیا جو اپنے والد کی طرح علوم وفنون کا ماہر اور علم نواز تھا۔ اس کے دور میں بطلیوس علم وادب کا گہوارہ بن گیا۔ اس دربار سے بڑے بڑے علماء وفقہاء اور شعراء واُدباء وابستہ تھے۔ ریاست میں ہر طرف امن وسکون اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ نصرانیوں کی خانہ جنگی کے باعث بیرونی حملے رک چکے تھے۔ چنانچہ کئی سال تک عمر المتوکل کو ان آزمائشوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا جن سے اس کے باپ المظفر کو پالا پڑا تھا۔ ②

دولتِ سرقسطہ اور بنو ہود

سرقسطہ شمالی اندلس کا وسیع صوبہ تھا جس میں وشقہ، بربشتر، لاردہ، افراغہ، طرکونہ اور طرطوشہ جیسے شہر تھے۔ اس صوبے کو تین نصرانی ریاستوں: ارغون، نوار اور قسطالیہ نے کمان کی شکل میں گھیر رکھا تھا جس کے باعث یہاں کے مسلمان اُمراء کو ہر وقت ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ اس طرح یہ لوگ نصرانیوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر ایک سے دوستی اور دوسرے سے لڑائی کے فن میں بھی ماہر ہو گئے تھے۔

اس ریاست کی خود مختاری کا قصہ یہ ہے کہ قرطبہ کے حکمران سلیمان مستعین نے ۴۰۳ھ میں بنو تجیب کے رئیس منذر بن یحییٰ کو سرقسطہ کا والی بنا دیا تھا جس کا خاندان طویل زمانے سے شمالی سرحدوں کا محافظ چلا آرہا تھا۔

۴۱۱ھ میں جب قرطبہ کا سیاسی بحران شدید تر ہوگیا تو منذر نے خود مختاری اختیار کر لی۔ اس نے سیاسی حربے اپنا کر شمال کے نصرانیوں سے اپنی ریاست بچائے رکھی۔ وہ بڑی شان وشوکت کے ساتھ رہتا تھا، اس کا محل نادر ونایاب اشیاء اور حسین باندیوں سے بھرا رہتا تھا۔ ایسی چیزیں وہ موقع بموقع نصرانی حکام کو ہدیہ بھی کرتا رہتا تھا۔ اس نے ۴۱۴ھ تک حکومت کی۔ اس کا بیٹا یحییٰ المظفر (۴۱۴ھ تا ۴۲۰ھ) اس کا جانشین ہوا۔ پھر پوتا منذر معز الدولہ حکمران ہوا جسے یکم ذوالحجہ ۴۳۰ھ کو اچانک قتل کر دیا گیا۔ سرقسطہ میں ایک ماہ تک افراتفری اور بے چینی رہی۔

آخر یکم محرم ۴۳۱ھ کو فوج کے ایک عرب سالار سلیمان بن محمد بن ہود جذامی نے حکومت سنبھال لی اور ملکی نظم ونسق کو بڑی ہوشیاری سے چلایا۔ ۴۳۸ھ کو اس کی وفات ہوگئی۔ اس سے قبل اس نے یہ غلطی کی کہ ریاست کے پانچ بڑے شہروں کو اپنے پانچ بیٹوں کے نام کر دیا تھا۔

نتیجہ ظاہر ہے یہی نکلا کہ اس کی وفات کے بعد بیٹوں میں کش مکش شروع ہوگئی جس سے شمال کے نصرانیوں نے

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/۸۱ تا ۸۷

② دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/۸۷ تا ۸۹

پورا فائدہ اٹھایا اور ایک دوسرے کے خلاف ان بھائیوں کی مدد کر کے انہیں کمزور کرتے رہے۔[1]

پوپ الیگزنڈر دوئم کی طرف سے اعلانِ جنگ اور نارمنوں کا حملہ:

اندلس میں مسلمانوں کی اس نا اتفاقی اور باہم اکھاڑ پچھاڑ کے تسلسل نے یورپ کے نصرانیوں کے حوصلے بھی بلند کر دیے۔ ۴۵۶ھ میں پوپ الیگزنڈر دوئم نے صلیب پرستوں کو کھل کر ترغیب دی کہ وہ اندلس سے مسلمانوں کو نکال باہر کریں۔ اپنی قوم کو جوش دلانے کے لیے پوپ نے اعلان کیا کہ اندلس کے مسلمانوں سے لڑنے والا ہر شخص تمام گناہوں سے پاک ہو کر جنت کا حق دار بن جائے گا۔[2]

اسی سال نارمن نصرانیوں نے اندلس میں فوج کشی کی اور سرقسطہ سے ۹۰ کلومیٹر شمال مشرق میں بربشتر پر حملہ آور ہو گئے جو شمالی حملہ آوروں سے دفاع کے لیے مضبوط ترین شہر تھا۔ چالیس دن کے محاصرے کے بعد شہر والوں نے جان و مال کے تحفظ کا معاہدہ کر کے فصیل کے دروازے کھول دیے۔ مگر نصرانیوں نے اندر گھستے ہی معاہدے کو پس پشت ڈال کر شہریوں کا قتل عام شروع کر دیا اور کم و بیش ۵۰ ہزار مرد و زن کو شہید کر ڈالا۔ بنو ہود اس وقت بھی متحد نہ ہو سکے اور وہاں نارمن بربشتر میں خون کی ندیاں بہاتے رہے۔[3]

بربشتر کی بازیابی۔ ایک جرأت مند اقدام:

تاہم اس حادثے نے عوام کو جھنجوڑ دیا اور رائے عامہ نے بنو ہود کے رئیس احمد بن سلیمان کو جوابی کارروائی پر آمادہ کر دیا۔ ایسے میں اشبیلیہ کے معتضد نے بھی پانچ سو سپاہی اس کی مدد کے لیے بھیج دیے۔ اس لشکر نے جمادی الاولیٰ ۴۵۷ھ میں شہر کا محاصرہ کر لیا۔ گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔ آخر مسلمان فصیل میں نقب لگا کر شہر میں گھس گئے اور نارمنوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ڈیڑھ ہزار نارمن قتل ہوئے اور پانچ ہزار سے زائد قیدی بنا کر سرقسطہ لائے گئے۔

"بربشتر" کی بازیابی ایک طویل عرصے بعد مسلمانوں کی طرف سے ایک جرأت مندانہ اقدام تھا۔ اس کارنامے نے احمد بن سلیمان کو بڑی نیک نامی بخشی اور اگلے سالوں میں اس نے اپنے بھائیوں پر قابو پا کر سرقسطہ کی مملکت کو دوبارہ متحد کر دیا۔ اس نے مقتدر باللہ کا لقب اختیار کر لیا۔ عموماً اسے مقتدر بن ہود کہا جاتا تھا۔[4]

نصرانیوں میں پھوٹ اور ملوک الطوائف کی نادانی:

نارمنوں کے خلاف مقتدر بن ہود کی اس کامیابی کے کچھ ہی دنوں بعد ۴۵۸ھ (۱۰۶۵ء) میں فرڈی ننڈ اوّل مر گیا اور اس کی وسیع سلطنت اس کے تین بیٹوں: شانجہ، الفانسو ششم اور غرسیہ میں تقسیم ہو گئی۔ شانجہ کو قسطلیہ کا تخت ملا، الفانسو لیون اور آسٹریاس کا حاکم بنا، جلیقیہ اور پرتگال غرسیہ کے حصے میں آئے۔ اس کے فوراً بعد ان تینوں بھائیوں میں

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/۲۶۵ تا ۲۷۳ ② تاریخ افریقا الشمالیۃ، اندری جولیان، تعریب محمد مزالی: ۲/۱۱۱

③ التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص: ۳۶۱؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/۲۷۳ تا ۲۷۶)

④ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/۲۷۶ تا ۲۸۰

اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی اور اسلامی شہروں کی طرف نصرانیوں کے بڑھتے ہوئے قدم کچھ مدت کے لیے رُک گئے۔ ①

اگر ملوک الطوائف دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے تو اگلے ایام میں سابقہ کوتاہیوں کی آسانی سے تلافی کر سکتے تھے مگر افسوس کہ انہوں نے اس نادر موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اگر وہ متحد ہو جاتے تو اس وقت گزشتہ دو تین عشروں کی شکستوں کا بدلہ لیا جا سکتا تھا مگر ملوک الطوائف میں سے کچھ خطرہ ٹلتے دیکھ کر پہلے سے کہیں بڑھ کر بے فکری کے ساتھ دنیا کی رنگینیوں میں مست ہو گئے اور کچھ نے اسے ایک دوسرے سے نبرد آزمائی کا بہترین وقت خیال کیا۔

طُلَیطُلَہ کا بدنام حکمران یحییٰ المامون ان سب سے آگے رہا۔ جب شمال کے نصرانی شہزادوں کی خانہ جنگی میں شانجہ کو فتح ہوئی اور الفانسو ششم شکست کھا کر بھاگا تو یحییٰ المامون نے اسے اور اس کے رفقاء کو اپنے ہاں معزز مہمانوں کی حیثیت دی اور انہیں شاہی محل میں شاہانہ طمطراق کے ساتھ رہنے کا موقع دیا۔

نصرانیوں کا دوسرا شہزادہ غرسیہ بھی اقتدار کی اس جنگ میں پسپا ہوا۔ اسے اشبیلیہ کے معتضد نے اپنے ہاں عزت واحترام سے ٹھہرا کر یہ ثبوت دیا کہ وہ نصرانیوں سے باج گزاری کے معاہدے پر اب بھی قائم ہے۔ ②

اُدھر مقتدر بن ہود نے ۴۶۸ھ میں اپنی ہمسایہ مسلم ریاست "دَانِیَہ" پر چڑھائی کردی۔ اس کی فتح کے بعد ریاست سَرَقُسطہ رقبے میں ملوک الطوائف کی سب سے بڑی ریاست بن گئی۔ مگر افسوس کہ یہ صورتحال زیادہ مدت تک برقرار نہ رہی اور مقتدر بن ہود نے ۴۷۴ھ میں اپنی وفات سے پہلے وہی غلطی کی جو اس کے باپ نے کی تھی۔ اس نے سَرَقُسطہ کو اپنے دو بیٹوں میں بانٹ دیا۔ پایہ تخت اور اس سے ملحقہ شہر یوسف کو دیے جو المؤتمن کا لقب لگا کر حکمران ہوا جبکہ دَانِیَہ، لاردہ اور طرطوشہ چھوٹے بیٹے منذر کے نام کر دیے۔ ③

معتضد کی ہمسایہ مسلمانوں سے جنگ اور وفات:

معتضد اور یحییٰ المامون سمیت ملوک الطوائف کے بھی حکام نے نصرانیوں کی بالادستی سے نجات کا یہ بہترین موقع بھی گنوا دیا اور اس فرصت کے دوران باہمی جنگوں میں مشغول رہے۔

معتضد نے ۴۵۹ھ میں بنو برزال کے خلاف چڑھائی کر کے ان سے "قَرمُونہ" کا علاقہ چھین لیا۔ پھر اس نے بحریہ کو مضبوط کرانا شروع کیا کیوں کہ اسے مَرّاکش میں مرابطین کی نئی ابھرتی ہوئی طاقت سے خطرہ تھا۔ تاہم موت نے اسے مہلت نہ دی۔ زندگی کی ۵۴ بہاریں دیکھ کر وہ ۴۶۱ھ میں فوت ہوگیا۔ ④

◆◆◆

---

① التاریخ الأندلسی من الفتح الاسلامی الیٰ سقوط غرناطة، لعبد الرحمن علی: ص: ۳۶۱،۳۳۰

② التاریخ الأندلسی من الفتح الاسلامی الیٰ سقوط غرناطة، لعبد الرحمن علی: ص: ۳۳۰

③ دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۲۸۲،۲۸۱

④ دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۵۸

محمد معتمد، اشبیلیہ کا شاعر بادشاہ

معتضد کے بعد اشبیلیہ کے تخت پر اس کا ۳۳ سالہ نوجوان بیٹا محمد معتمد کا لقب لگا کر براجمان ہوا۔ وہ اپنے باپ کے برعکس ایک سخی اور صاف دل آدمی تھا۔ مکروفریب اور ظلم وستم کو پسند نہیں کرتا تھا۔ شریف، بہادر اور جنگجو ضرور تھا تاہم سیاسی جوڑ توڑ میں اسے مہارت نہیں تھی۔ غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے اس نے کم عمری ہی میں مؤطا امام مالک سمیت حدیث وتفسیر کی بڑی بڑی کتب پڑھ لی تھیں۔ ①

شاعری کی ریل پیل:

تاہم معتمد کی سب سے زیادہ دلچسپی شعروادب میں تھی۔ وہ نہایت باکمال شاعر تھا۔ شاعری میں اس کی تراکیب، تخیلات اور تصورات سب سے جداگانہ تھے۔ وہ اس پائے کا ناقد تھا کہ اس کے ہاں معمولی شاعر یا ادیب کا گزر نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے وزیر، بیگمات اور باندیاں تک شعروشاعری میں طاق تھے۔ حقیقت میں معتمد ایک شاعر تھا مگر قسمت نے اسے تخت شاہی پر لا بٹھایا تھا۔ ②

ابن عمار کی کہانی:

ممکن تھا کہ تخت سنبھالنے کے بعد ذمہ داریوں کا احساس اس کی سوچ اور فکر کا دھارا بدل دیتا مگر بدقسمتی سے اسے ابن عمار کی شکل میں ایک ایسا مصاحب ملا ہوا تھا جو ہر جگہ اور ہر وقت اس کے مزاج پر اثر انداز رہتا تھا۔

ابوبکر محمد ابن عمار جنوبی اسپین کے شہر شلب کا ایک مفلس شاعر تھا۔ ۴۲۲ھ میں پیدا ہوا تھا۔ ایک غریب گھرانے کا فرد ہونے کے باوجود اس نے غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ نامور ادیبوں اور شاعروں سے استفادہ کیا۔ مگر عملی زندگی میں قدم رکھ کر ایک مدت تک اسے اپنی قادر الکلامی سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ قریہ قریہ گھوم پھر کر معمولی لوگوں کی مدح سرائی کر کے اپنا گزارا کرتا تھا۔ ایک بار پھرتا پھراتا وہ شلب آیا تو اس کی حالت اتنی غیر تھی کہ اپنے گدھے کے لیے چارہ خریدنے کے پیسے بھی نہیں تھے۔ اس نے کسی کسان کا قصیدہ لکھا اور اس نے معاوضے میں بوری بھر جو پیش کر دیے۔ تب ابن عمار گدھے کا پیٹ بھرنے کے قابل ہوسکا۔ یہ ابن عمار کے بُرے دن تھے۔ اس نے اچھے دنوں کی امید میں وہ خالی بوری سنبھال کر پاس رکھ لی۔

اور پھر ۴۵۵ھ میں اس کی قسمت اس وقت یکا یک بدل گئی جب معتضد نے شہزادہ معتمد کو سپہ سالار بنا کر شلب پر فوج کشی کرائی۔ شہر کے محاصرے کے دوران شہزادہ معتمد کی ابن عمار سے ملاقات ہوئی۔ شہزادہ اس وقت ۲۳ برس کا تھا اور ابن عمار ۳۳ سال کا۔ ابن عمار نے اپنی بذلہ سنجی اور شستہ کلامی سے شہزادے کو گرویدہ بنالیا۔

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۹/ ۶۱، ط الرسالۃ

② تاریخ الادب الاندلسی عصر الطوائف: ۱/ ۹۵؛ نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب للمقری التلمسانی: ۴/ ۲۸۳

شلب کی فتح کے بعد جب معتمد وہاں کا حاکم مقرر ہوا تو اس نے بلا پس وپیش ابن عمار کو اپنا مشیر خاص مقرر کر لیا۔ دونوں نے ایک مدت وہاں ساتھ گزاری۔ اس دوران ابن عمار نے معتمد پر اپنا رنگ خوب چڑھایا۔ دونوں میں ایسی دوستی ہوئی کہ یک جان اور دو قالب کا مصداق بن گئے۔ ایک شب ابن عمار کو ایک بھیانک خواب دیکھنے کے بعد خوف ہوا کہ شہزادے کے ساتھ اتنا قرب کبھی کسی گستاخی کا سبب ہو کر موت کا بہانہ نہ بن جائے۔ وہ بھاگا اور محل کے کسی تاریک گوشے میں چھپ گیا۔ مگر معتمد نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ جب بار بار پوچھنے پر ابن عمار نے اپنے خوف کا اظہار کیا تو معتمد نے ہنس کر کہا: ''تم میری جان کی طرح ہو۔ بھلا کوئی اپنی جان خود لے سکتا ہے؟''[1]

معتمد شعر وادب کا رسیا ہونے کے باوجود عربوں کے سپاہیانہ اوصاف سے مالا مال تھا۔ اگر اسے عالی ہمت اور دور اندیش لوگوں کی صحبت ملی ہوتی تو وہ ایک اچھا حکمران ثابت ہو سکتا تھا، مگر ابن عمار کی صحبت نے اسے شاعری اور رومانویت کا ایسا چسکا لگایا جس سے وہ عمر بھر چھٹکارا نہ پا سکا۔

ابن عمار عہدۂ وزارت پر:

اپنے باپ معتضد کی وفات کے بعد معتمد ریاستِ اشبیلیہ کا حکمران بن گیا۔ ابن عمار نے درخواست کر کے اس سے اپنے لیے اپنے آبائی شہر شلب کی امارت کی منظوری کرالی۔ اس کے بعد ماضی کا یہ معمولی شاعر ایسی شان وشوکت کے ساتھ اشبیلیہ سے شلب پہنچا کہ لوگوں نے کبھی کسی ولی عہد کا بھی ایسا شاندار جلوس نہیں دیکھا تھا۔ اس کے آگے پیچھے درباریوں، خادموں اور غلاموں کی ایک فوج چل رہی تھی تاہم ابن عمار نے شہر میں داخل ہوتے ہی لوگوں سے اس کسان کا پتا پوچھا جس نے اسے قصیدے کے معاوضے میں جو پیش کیے تھے جن کی بوری ابن عمار کے پاس اب تک محفوظ تھی۔ اس نے وہی بوری چاندی سے بھر کر اس کسان کو بھیج دی اور ساتھ ہی کہلوایا:

''اگر تم جو کی جگہ گندم دیتے تو میں چاندی کی جگہ یہ بوری سونے سے بھر دیتا۔''[2]

ابن عمار نے شلب میں بڑی شان وشوکت سے حکومت شروع کی اور دربار کو شاعرانہ رعنائیوں سے بھر دیا۔ سرکاری خزانے کو وہ بے دریغ شراب وکباب پر اڑاتا رہا۔[3]

معتمد کی ابن عمار سے محبت:

لیکن معتمد کو اپنے اس ندیم خاص سے جدائی گوارا نہ تھی۔ شلب میں اس نے ابن عمار کی ہم نشینی میں جو رنگین شب وروز گزارے تھے اسے وہ کبھی نہیں بھولتے تھے اور وہ اپنے اشعار میں انہیں یاد کرتا رہتا تھا۔ ایک غزل میں وہ ابن عمار کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

---

① المعجب فی اخبار المغرب: ۱/ ۹۰

② سیر اعلام النبلاء: ۱۸/ ۵۸۳، ط الرسالة

③ الحلة السیراء: ۱/ ۱۱۷

اَلَا حَيِّ اَوْطَانِيْ بِشِلْبَ اَبَابَكْرٍ ...... وَسَلْهُنَّ هَلْ عَهْدُ الشَّبَابِ كَمَا اَدْرِيْ

''سنواے ابوبکر! میرے وطن شِلب کو دعا دو...... اور اس سے پوچھو کہ کیا کبھی دورِ شباب اسی طرح ملے گا جیسے میں اسے جانتا تھا۔''

وَسَلِّمْ عَلٰى قَصْرِ الشَّرَاجِيْبِ عَنْ فَتًى ...... لَهٗ اَبَدًا شَوْقٌ اِلٰى ذَالِكَ الْقَصْرِ

''قصرِ شراجیب کو اس نوجوان کی طرف سے سلام کہہ دو جسے اس قصر میں جانے کا اشتیاق ہمیشہ رہے گا۔''

وَكَمْ لَيْلٍ قَدْ بِتُّ اَنْعَمُ جُنْحَهَا ...... بِمُضْحِيَةِ الْاَرْدَافِ مُجْدِبَةِ الْخَصْرِ

''میں نے وہاں کتنی راتیں جن کی تاریکی پُر لطف تھی، سبز لباس اور پتلی کمر والے یار کے دوش بدوش گزاریں۔''

وَلَيْلٍ بِسُدِّ النَّهْرِ لَهْوًا قَطَعْتُهٗ ...... بِذَاتِ سِوَارٍ مِثْلِ مُنْعَطِفِ الْبَدْرِ

''اور کتنی ہی ایسی راتیں دریا کے کنارے کھیل تماشے میں کاٹیں، جو چاندنی جیسے کنگنوں سے آراستہ تھیں۔''[1]

معتمد کے شوق اور اصرار پر ابن عمار شلب کی امارت چھوڑ کر اس کے پاس اشبیلیہ آ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس کا مرتبہ اور بڑھ گیا۔ معتمد نے اسے وزیرِ سلطنت بنا دیا اور خود کاروبارِ سیاست سے بے فکر ہو کر شاعری کی نکتہ آفرینیوں میں گم ہو گیا۔ سلطنت کا سارا انتظام ایک پیشہ ور شاعر کے ہاتھ میں آ گیا۔[2]

یہ شاعر بادشاہ اور وزیر جب بھی جمع ہوتے تو شعر و شاعری کے سوا کچھ نہ سوجھتا۔ معتمد بات بات پر ایک مصرعہ کہتا اور ابن عمار سے دوسرا مصرعہ لگانے کی فرمائش کرتا۔ ایک دن جامع مسجد جاتے ہوئے اذان سن کر معتمد نے کہا، اس پر مصرعہ لگاؤ:

هٰذَا الْمُؤَذِّنُ قَدْ بَدَا بِاَذَانِهٖ

(اس مؤذن نے اذان دینا شروع کی)

ابن عمار نے بلا تامل کہا:

يَرْجُوْا بِذَاكَ الْعَفْوَ مِنْ رَّحْمَانِهٖ

(وہ اس عمل پر اپنے رحمان سے معافی کی امید رکھتا ہے)

معتمد نے پھر مصرعہ دیا:

طُوْبٰى لَهٗ مِنْ شَاهِدٍ بِحَقِيْقَةٍ

(خوش قسمت ہے وہ جو ایک سچائی کا گواہ ہے)

ابن عمار نے فوراً کہا:

---

[1] الحماسة المغربية لأبي العباس الجراوي التادلي: ۲/ ۱۰۵۹، ط دار الفكر المعاصر بيروت

[2] المعجب في تلخيص اخبار المغرب لعبد الواحد المراكشي: ۱/ ۹۱؛ دولة الاسلام في الاندلس، لعبد الله عنان المصري: ۲/ ۹۳.

إِنْ كَانَ عَقْدُ ضَمِيرِهِ كَلِسَانِهِ

(بشرطیکہ اس کا دلی عقیدہ بھی اس کی زبان جیسا ہو)[1]

معتمد کی نئی محبت، رمیکیہ:

ریاست اشبیلیہ کے تنزل کے لیے حکمرانوں کا شاعری میں اس حد تک انہماک ہی بہت تھا مگر اچانک معتمد کی زندگی میں ایک حسین وجمیل شاعرہ بھی آدھمکی جس نے اسے اپنی مٹھی میں لے لیا۔

ایک شام معتمد اپنے وزیر ابن عمار کے ساتھ دریا کے کنارے چہل قدمی کر رہا تھا۔ ہوا کے تازہ جھونکوں نے دریا کی سطح پر ہلکی ہلکی لہریں پیدا کر دی تھیں۔ معتمد نے ابن عمار کو اس حسین منظر کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا:

''ذرا اس پر مصرعہ لگاؤ:

صَنَعَ الرِّيحُ مِنَ الْمَاءِ زَرَدْ

''ہوا نے پانی کی موجوں کو زرہ بنا دیا''

ابن عمار جیسا استاد شاعر بھی سوچتا رہ گیا۔ اتنے میں دریا کی سمت سے ایک نسوانی آواز آئی:

أَيُّ دِرْعٍ لِلْقِتَالِ لَوْ جَمَدْ

''اگر موجیں منجمد ہو جائیں تو کیا خوب زرہ تیار ہو جاتی۔''

معتمد نے پلٹ کر دیکھا تو یہ ایک دوشیزہ کی آواز تھی جو کپڑے دھو رہی تھی۔ معتمد اس کی ذہانت وظرافت، سخن آفرینی، خود اعتمادی اور حسن صورت سے دم بخود رہ گیا۔ اس نے پوچھا: ''کیا تم شادی شدہ ہو۔''

لڑکی نے نفی میں جواب دیا تو معتمد کھل اٹھا۔ اس لڑکی کا نام ''اعتماد'' تھا اور وہ ایک رئیس رمیک بن حجاج کی باندی تھی اس لیے رمیکیہ کہلاتی تھی۔ معتمد نے رمیک کو بھاری قیمت دے کر اسے خرید لیا اور پھر آزاد کر کے اسے نکاح کی پیش کش کی۔ یوں رمیکیہ نامی یہ نازنین اشبیلیہ کی ملکہ بن گئی۔ اشبیلیہ کی قسمت شاعروں کے رحم وکرم پر رہ گئی کہ اب سلطنت کے تینوں ستارے: بادشاہ، ملکہ اور وزیر، شاعر تھے۔[2]

معتمد اور رمیکیہ کے سہانے دن رات:

رمیکیہ حقیقت میں مردوں کو لبھانے اور ان کے ہوش اڑانے کی اکثر خوبیوں سے آراستہ تھی۔ ایک مؤرخ کا کہنا ہے: ''معتمد اس سے بہت مانوس تھا۔ اس کی عجیب وغریب باتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ رمیکیہ اگرچہ گلوکاری سے نابلد تھی مگر حسین اور خوش گفتار تھی۔ مزے دار باتوں کی ماہر تھی۔ ہر موضوع پر اسے ایک سے ایک عجیب بات یاد تھی۔''[3]

---

① نفح الطيب من غصن الاندلس الرطيب، للمقري التلمساني: ۳/ ۱۱۶

② شذرات الذهب: ۵/ ۳۳۵؛ نفح الطيب: ۳/ ۲۱۱، ۲۷۳

③ نفح الطيب من غصن الاندلس الرطيب، للمقري التلمساني: ۳/ ۲۷۲

شاعری اور رومانی جذبات لازم وملزوم ہیں۔ معتمد جیسے عاشق مزاج کو رمیکیہ جیسی بیوی ملی تو وہ اسی کا ہو کر رہ گیا۔ وہ اکثر رفیقہ حیات کے ساتھ اشبیلیہ کی ''وادیٔ طلح'' میں نکل جاتا اور دونوں قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے۔ ①

رمیکیہ کے ایک اشارے پر وہ سونے چاندی کے ڈھیر لگا دیتا۔ اس کی معمولی سی خواہش پوری کرنے کے لیے وہ خزانے کے منہ کھول دیتا۔ ایک دن رمیکیہ نے دیہات کی کچھ دودھ فروش عورتوں کو دیکھا کہ وہ دودھ کے مٹکے سر پر رکھے، پائنچے پنڈلیوں تک چڑھائے ننگے پاؤں مزے سے کیچڑ میں چل رہی ہیں۔ رمیکیہ کو شوق ہوا کہ وہ بھی کیچڑ میں چلنے کا لطف لے۔ معتمد کو اس کی خواہش کا پتا چلا تو اس کے حکم سے مٹی میں کئی من عرقِ گلاب گھول کر گارا تیار کیا گیا، پھر اس میں عنبر، مشک اور کافور سمیت طرح طرح کے بیش قیمت عطریات ڈال کر اسے گوندھا گیا۔ پھر اسے محل کے صحن میں پھیلا دیا گیا۔ وہاں خوبصورت مٹکے اور ریشم کی رسیاں لٹکا کر دودھ فروشوں کے ڈیرے جیسا ماحول پیدا کیا گیا۔ اب رمیکیہ کو بلایا گیا کہ وہ اپنا شوق پورا کرے۔ وہ اپنی سہیلیوں اور باندیوں کے ساتھ آئی اور کیچڑ میں لوٹ پوٹ ہو کر دیر تک نہال ہوتی رہی۔ ②

ایک دن شدید گرمی تھی۔ رمیکیہ نے کہا: کاش آج بادل چھائے ہوتے اور ہم بارش کا مزہ لیتے۔''

معتمد رمیکیہ کو لے کر محل کے باغ میں آبیٹھا اور حکم دیا کہ عنبر اور عود کی دھونی دی جائے۔ عود اور عنبر کو اتنی بھاری مقدار میں جلایا گیا کہ دھواں اٹھ کر آسمان تک جانے لگا اور ماحول ابر آلود ہو گیا۔ پھر فواروں کے ذریعے عرقِ گلاب کا چھڑکاؤ شروع کیا گیا تو یوں لگا کہ واقعی بارش ہو رہی ہے۔ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ ③

قرطبہ میں ملوک الطوائف کی اکھاڑ پچھاڑ

قرطبہ چار صدیوں سے اسپین میں مسلمانوں کا سیاسی مرکزِ وحدت چلا آیا تھا مگر اس وقت اس کی حدود ایک ضلعے میں سمٹ چکی تھیں۔ اس کے باوجود اندلس میں اب بھی اس جیسا خوبصورت اور ترقی یافتہ شہر اور کوئی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک طرف الفانسو ششم اور دوسری طرف ملوک الطوائف اس پر قبضہ کرنے کے لیے بے تاب تھے۔

اس وقت ملوک الطوائف میں شاہِ اشبیلیہ معتمد اور حاکم طلیطلہ یحییٰ ذوالنون سیاسی اثر ورسوخ، دولت وثروت اور فوجی طاقت کے اعتبار سے سب سے آگے تھے۔ اس لیے دونوں قرطبہ کے تخت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔

بنو امیہ کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی جب قرطبہ میں شورائی حکومت قائم ہوئی تو وہاں اندرونی طور پر امن اور استحکام کا ماحول قائم ہو گیا۔ اس حکومت کے پہلے سربراہ ابن جہور اور پھر اس کے بیٹے ابوالولید کی وفات تک یہ فضا

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۲/۲۸۵

② نفح الطیب: ۳/۲۷۳، ۱/۴۳۰؛ الاعلام للزرکلی: ۱/۳۳۲، ط دار العلم

③ نهاية الأرب في فنون الأدب للنويري: ۱/۱۳۹، ط دار الكتب والوثائق القومية

برقرار رہی مگر ۴۵۷ھ میں ابوالولید نے جب اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر گوشہ نشینی اختیار کی اور حکومت اس کے بیٹے عبدالملک کے ہاتھ میں آئی تو ایک بار پھر اہلیت کا اصول نظر انداز ہو گیا اور موروثیت ہی معیار بن گئی۔

ابوالولید کا جانشین عبدالملک سخت نالائق ثابت ہوا۔ اس نے ریاست کے انتہائی خیر خواہ اور سرد وگرم چشیدہ وزیر سلطنت ابن سقا کو قتل کر کے امرائے دربار اور فوج کو اتنا متنفر کر دیا کہ بڑے بڑے عہدے دار استعفے دینے لگے۔

حاکم طلیطلہ کب سے قرطبہ کی کمزوری کے دنوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جان کر ۴۶۱ھ میں قرطبہ پر چڑھائی کر دی۔ مگر قرطبہ کے لوگ جو کسی بھی قیمت پر یحییٰ المامون جیسے نصرانیت نواز حکمران کی غلامی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، شہر کے دفاع کے لیے متحد ہو گئے۔ دوسری طرف حاکم قرطبہ عبدالملک بن جہور نے، اشبیلیہ کی طرف اپنے سفیر دوڑا دیے کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ معتضد اور مامون ذی النون میں سخت رقابت ہے اور معتضد کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ قرطبہ مامون کے قبضے میں جائے۔

معتضد نے عبدالملک کی پیش کش کو غنیمت جانا اور اپنی فوج قرطبہ بھیج دی جس نے مامون کی افواج کو پسپا کر دیا۔ اہل قرطبہ کا خیال تھا کہ اشبیلیہ کی افواج ہماری مدد کے لیے آئی ہیں اور جنگ کے بعد واپس چلی جائیں گی مگر یہ ان کی خام خیالی تھی۔ معتضد کے منصوبے کے مطابق اشبیلیہ کی فوج نے اہل قرطبہ کو دھوکا دیا اور شہر کا نظم ونسق سنبھال لیا۔ بنو جہور کی حکومت ختم کر دی گئی اور معتضد نے اندلس کے عروس البلاد پر قبضے کی پرانی خواہش پوری کر لی۔ یہ ۴۶۲ھ کا واقعہ ہے۔ معتضد نے اپنے لڑکے عباد کو قرطبہ کا حاکم بنا دیا۔ اہل قرطبہ کی کوئی پیش نہ چلی اور وہ اس انقلاب کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکے۔ عباد کے لہو ولعب اور عیش وعشرت میں انہماک نے اہل قرطبہ کو مزید بددل کر دیا۔[1]

ابن عکاشہ کا قرطبہ پر قبضہ اور یحییٰ المامون کا انجام:

اُدھر یحییٰ المامون بھی قرطبہ پر قبضے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے ایک نئی چال چلی اور اہل قرطبہ کی عباد سے نفرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک پیشہ ور قاتل ابن عکاشہ کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ ابن عکاشہ اہل قرطبہ کا ہمدرد بن کر اپنے گروہ کے ساتھ میدان میں اترا۔ اس نے قرطبہ کے عمائد کو یقین دلایا کہ اگر وہ تعاون کریں تو وہ قرطبہ سے اشبیلیہ کی فوج کو بھگا کر انہیں آزادی دلا سکتا ہے۔

اہل قرطبہ فریب میں آ کر اس کے ساتھ ہو گئے۔ ابن عکاشہ نے ایک دن اچانک قرطبہ کے شاہی محل میں گھس کر معتضد کے بیٹے عباد کو قتل کر دیا۔ عباد کی تھوڑی سی فوج ابن عکاشہ کے آدمیوں اور اہل قرطبہ کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور یوں قرطبہ سے معتضد کا اقتدار ختم ہو گیا۔ مگر اس کے بعد ابن عکاشہ نے اہل قرطبہ سے کیا گیا کوئی وعدہ پورا نہ کیا۔ جب اس نے وہاں یحییٰ المامون کی بادشاہت کا اعلان کیا تو قرطبہ کے علماء وفقہاء کے چہرے فق ہو گئے۔ المامون قرطبہ پر اپنے کارندے کے قبضے سے اتنا مسرور ہوا کہ فوری طور پر قرطبہ آیا اور ابن عکاشہ کا شکریہ

---

[1] دولة الإسلام في الأندلس: ۲/ ۱۰۳،۶۱

ادا کرتے ہوئے اس پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ یہ جمادی الاخریٰ ۴۶۷ھ کا واقعہ ہے۔ یوں ابن عکاشہ قرطبہ کا نائب حاکم بن گیا۔ مگر یحییٰ المامون جانتا تھا کہ ابن عکاشہ جیسا جرائم پیشہ شخص بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ وہ ابن عکاشہ کو مہرہ بنا کر خود قرطبہ پر راج کرنا چاہتا تھا مگر اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ قرطبہ پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ یحییٰ ذوالنون اور ابن عکاشہ میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ مگر جب طلیطلہ میں ابن عکاشہ کو برطرف کرنے کے مشورے ہو رہے تھے، ابن عکاشہ ایک سازش تیار کر چکا تھا۔ وہ طاقت میں یحییٰ المامون کے ہم پلہ نہ تھی مگر اپنے فن کا استاد تھا۔

ذوالقعدہ ۴۶۷ھ میں یحییٰ المامون زہر خورنی کے باعث اچانک مر گیا۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے یہ ابن عکاشہ کی کارستانی تھی۔ یوں طلیطلہ کا یہ مشہور مگر بدنام حاکم ۳۲ سال حکومت کر کے سیاسی منظر نامے سے غائب ہو گیا۔[1]

یحییٰ القادر:

طلیطلہ کے تخت پر اب یحییٰ المامون کا بیٹا، یحییٰ القادر براجمان ہوا، جو نہایت کمزور، بزدل اور کند ذہن تھا۔ اس کا سارا وقت خواجہ سراؤں اور گویوں کی محفلوں میں گزرتا تھا۔ اس کی کم ہمتی کا یہ حال تھا کہ خواجہ سرا تک اس کا مذاق اڑاتے، چھوٹے چھوٹے رئیس بھی اس پر رعب جماتے اور مختلف حیلوں بہانوں کے ذریعے اس سے رقم اینٹھتے رہتے۔ یوں طلیطلہ جو پہلے ملوک الطوائف کی سب سے بڑی ریاست تھی، وقار و تمکین سے بالکل محروم ہو گئی۔

طلیطلہ کو کمزور دیکھ کر معتمد نے دوبارہ قرطبہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت تک ابن عکاشہ کے پنجے میں گرفتار اہل قرطبہ کی برداشت بھی جواب دے چکی تھی۔ اس لیے معتمد نے موقعے سے پورا فائدہ اٹھایا اور صفر ۴۷۱ھ میں فوج کشی کر کے قرطبہ کو زیر کر لیا۔ ابن عکاشہ اور اس کے ساتھی مارے گئے۔ قرطبہ پر ایک بار پھر اشبیلیہ کے پرچم لہرانے لگے۔[2]

الغرض ملوک الطوائف آنے والے خطرات کو بالکل نظر انداز کیے ہوئے تھے۔ وہ کبھی آپس میں لڑتے اور کبھی اپنی عشرت گاہوں کی بہاروں کے مزے لوٹتے تھے حالانکہ خزاں کا موسم آ چکا تھا۔

✦✦✦

---

① دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۱۰۳

② دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۱۰۳ ؛ المعجب فی تلخیص اخبار المغرب، لعبدالواحد المراکشی: ۱/ ۹۷

الفانسو ششم کی یلغار

آخر کار شمال میں نصرانیوں کی خانہ جنگی ختم ہوگئی۔ الفانسو ششم کی صورت میں نصرانیوں کو ایک نیا قائد مل گیا۔ اس نے اپنے بھائیوں کو نیچا دکھا کر شمالی اندلس کی تمام ریاستوں کا اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ تمام نصرانی مسلمانوں کے خلاف ایک پرچم تلے متحد ہو چکے تھے۔ لیون، جلیقیہ اور نوار کے قسطالیہ کے الحاق کے باعث اس کی فوجی قوت بے پناہ ہوگئی۔ وہ فرڈیننڈ کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے ملوک الطوائف کو دباتا چلا گیا۔ وہ ایک ریاست کے امیر کو سرپرستی کا جھانسا دے کر ساتھ ملاتا اور دوسری ریاست کے خلاف فوج کشی کر کے اس سے ایک دو شہر چھین لیتا اور پھر بھاری خراج عائد کر کے جنگ بندی قبول کرتا۔ کچھ مدت بعد وہ کسی دوسری مسلم ریاست کو اتحادی بنا کر تیسری سے لڑائی چھیڑ دیتا۔

مغربی مؤرخ لین پول لکھتا ہے:

''ملوک الطوائف جب اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑنے میں کمزور پڑے تو الفانسو کے قدموں پر جھک کر اس سے مدد لینے لگے۔ لہٰذا ہر اسلامی ریاست الفانسو کو خراج بھیجنے لگی۔ الفانسو ہر سال اپنی طاقت بڑھنے کے ساتھ ساتھ خراج کی رقم میں بھی اضافہ کرتا گیا کیوں کہ یہ اس کی مدد اور تعاون کا معاوضہ تھا، اور اس لیے بھی کہ وہ مسلمانوں کی دولت کو اتنا لوٹنا چاہتا تھا جو اندلس سے ان کا نام ونشان مٹانے کے لیے کافی ہو۔

ملوک الطوائف پوری تندہی سے یہ رقوم ادا کرتے رہے تاکہ الفانسو سے عسکری مدد لیں یا اس کے ان حملوں سے بچیں جو ہر جگہ جاری تھے یہاں تک کہ اس کی افواج قادس تک پہنچ گئی تھیں۔ شمالی اندلس مفلس اور قلاش خطہ تھا مگر یہ تقدیر کا عجوبہ ہے کہ الفانسو نے مسلمان بادشاہوں ہی سے وہ دولت حاصل کی جو انہیں تباہ کرنے کی تیاریوں کے لیے استعمال ہوئی۔''[1]

اس کا طریق جنگ چار مراحل پر مشتمل تھا: پہلے وہ کسی ریاست کو باج گزار بناتا اور لگان کو دوگنا چوگنا کرتے ہوئے ریاست کو معاشی طور پر دیوالیہ کر دیتا۔ دوسرے مرحلے میں وہ اس کے دیہات اجاڑ کر اس کے پیداواری وسائل ختم کر دیتا تاکہ وہ خراج دینے کے قابل نہ رہے۔ تیسرے مرحلے میں وہ خراج ادا نہ کرنے کا الزام لگا کر فوج میدان میں اتار دیتا اور اہم قلعوں پر قبضہ کر لیتا۔ چوتھے مرحلے میں باقاعدہ لشکر کشی کر کے ریاست کو فتح کر لیتا۔

طلیطلہ کا بزدل حکمران یحییٰ القادر الفانسو ششم کا اتحادی تھا، اس کی نااہلی کی وجہ سے ریاست میں اس شدت سے

---

[1] Story of the moors in Spain :177

بھاگ تمیں الجریں کر ۴۷۲ھ کے آغاز میں اسے بھاگ کر ریاست کے مشرقی قلعے "وبذہ" میں پناہ لینا پڑی۔ طلیطلہ میں اب کوئی حاکم نہ تھا، عمائد شہر کی درخواست پر آخر بطلیوس کے حکمران عمر المتوکل نے آکر شہر کا انتظام سنبھالا مگر اس دوران یحییٰ القادر، اقتدار کی بازیافت کے لیے اپنے دوست الفانسو ششم سے فوجی مدد طلب کر چکا تھا۔ آخر الفانسو افواج کے ساتھ یحییٰ القادر کو طلیطلہ کے تخت پر بٹھانے آیا اور عمر المتوکل کو بطلیوس واپس جانا پڑا۔ یوں ذوالقعدہ ۴۷۲ھ میں طلیطلہ دوبارہ یحییٰ القادر کے قبضے میں آگیا۔ [1]

الفانسو ششم کا اِشبِیلیہ پر حملہ۔ الفانسو سے مذاکرات اور شطرنج کی بساط:

الفانسو ششم مسلمانوں سے خراج وصول کرنے میں نہایت سخت گیر تھا۔ اگر کہیں سے رقم کی ادائیگی میں تاخیر ہوتی تو وہ فوج لے کر وہاں ٹوٹ پڑتا۔ بنو عباد کی مالی حالت بہت کمزور ہو چکی تھی۔ معتمد کی شاہ خرچیوں، رمیکیہ کی رنگ رلیوں اور ابن عمار کی عیاشیوں نے خزانہ تقریباً خالی کر دیا تھا۔ فوج کو تنخواہیں ادا کرنے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ یہ دیکھ کر الفانسو ششم فوج لے کر قُرطُبہ پر چڑھ دوڑا۔

اس کی فوج قُرطُبہ کے باہر خیمہ زن ہوئی تو لوگوں کا خوف و ہراس سے برا حال ہو گیا۔ معتمد کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اپنے تاج و تخت کو کس طرح بچائے۔ لڑنے کے لیے کوئی مضبوط فوج تھی نہ چکھ دینے کے لیے رقم۔

اس نے ابن عمار کو حکم دیا کہ وہ مذاکرات کے لیے الفانسو ششم کے پاس جائے اور کسی طرح اس بلا کو ٹالے۔ ابن عمار کو ایسے میں ایک عجیب شاعرانہ خیال سوجھا۔ اس نے شطرنج کی ایک بساط تیار کرائی جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں تھی۔ اس کے مہرے آبنوس، عود اور صندل کے تھے جن پر سونے کی ملمع کاری تھی۔

ابن عمار اپنے جلوس کے ساتھ قُرطُبہ سے نکلا اور الفانسو ششم کی خیمہ گاہ سے کچھ دور پڑاؤ ڈال دیا۔ الفانسو ششم کے امراء ابن عمار کے پاس آئے تو اس نے انہیں وہ شطرنج دکھائی اور ان امراء کو گراں قدر تحفوں اور دولت سے مالا مال کر کے وعدہ لیا کہ وہ اس نادر و نایاب چیز کا ذکر الفانسو ششم تک پہنچائیں گے اور جب الفانسو ششم اسے حاصل کرنا چاہے گا تو اس کے بدلے الفانسو کو ابن عمار کا مطالبہ ماننے پر آمادہ کریں گے۔

نصرانی امراء تیار ہو گئے۔ انہوں نے الفانسو ششم کے سامنے جا کر اس شطرنج کی تعریفیں کیں۔ الفانسو شطرنج کا بڑا شوقین تھا۔ اسے قدرتی طور پر وہ شطرنج حاصل کرنے کی خواہش ہوئی۔ جب ابن عمار مذاکرات کے لیے اس کے پاس آیا تو الفانسو نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور باتوں باتوں میں پوچھا: "تم شطرنج کھیلنا جانتے ہو؟"

ابن عمار نے شطرنج میں اپنی مہارت کا دعویٰ کیا تو الفانسو نے کہا: "سنا ہے تمہارے پاس ایک نہایت نادر اور بیش قیمت شطرنج ہے۔" ابن عمار نے کہا: "جی ہاں، بالکل ہے۔"

الفانسو نے کہا: "تو اسے دیکھنے کا موقع مل سکتا ہے؟"

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۱۰۵

ابن عمار نے کہا: ''میں وہ شطرنج تب حاضر خدمت کروں گا جب آپ اس پر مجھ سے کھیلنے کے لیے آمادہ ہوں۔ پھر اگر آپ بازی جیت گئے تو وہ شطرنج آپ کی نذر۔ اگر میں جیت گیا تو آپ کو میرا ایک مطالبہ ماننا ہوگا۔''

الفانسو نے کہا: ''تم وہ شطرنج منگوا لو۔''

ابن عمار نے ایک کارندے کو بھیج کر شطرنج منگوالی۔ الفانسو ششم نے جب کاریگری کے اس عجیب شاہکار کو دیکھا تو حیران ہو کر بولا: ''مجھے توقع نہ تھی کہ کوئی شطرنج کے شوق میں اس حد تک بھی جا سکتا ہے۔''

پھر اس نے ابن عمار سے کہا: ''تمہاری پیش کش کیا تھی؟''

ابن عمار نے کہا: ''اگر آپ جیتے تو شطرنج آپ کی، میں جیتا تو آپ میرا ایک مطالبہ مانیں گے۔''

الفانسو ششم نے کہا: ''نہیں! میں ایک مجہول بات کو ماننے پر تیار نہیں۔ ممکن ہے تم کوئی ایسا مطالبہ کر دو جو میرے بس سے باہر ہو۔''

محفل ختم ہوئی تو الفانسو ششم کے وہ امراء جنہیں ابن عمار بہت کچھ دے کر رام کر چکا تھا، الفانسو سے کہنے لگے: ''یہ پیش کش ماننے میں کیا حرج ہے۔ اگر آپ جیت گئے تو یہ بے مثال شطرنج آپ کو مل جائے گی۔ اور اگر وہ جیت گیا تب بھی وہ ہم سے زبردستی کچھ نہیں لے سکتا۔''

پھر انہوں نے الفانسو کو سمجھایا کہ اس پیش کش کو مسترد کرنے سے آپ کی ساکھ خراب ہوگی کیوں کہ لوگ آپ کو حریف کا ایک عام سا مطالبہ پورا کرنے سے عاجز سمجھیں گے۔ اگر واقعی ابن عمار نے کوئی ناجائز مطالبہ کیا تو ہمیں اختیار ہوگا کہ اسے رد کر دیں۔'' آخر الفانسو مان گیا۔ اس نے ابن عمار کو بلوالیا۔

وہ اپنی شطرنج ساتھ لے کر الفانسو کے خیمے میں پہنچ گیا۔ الفانسو نے کہا: ''مجھے تمہاری پیش کش قبول ہے۔''

ابن عمار نے کہا: ''اس بات پر گواہ مقرر کر لیجیے۔'' الفانسو ششم نے بڑے بڑے سرداروں کو گواہ بنالیا۔ اس کے بعد بازی شروع ہوئی۔ الفانسو اگرچہ شطرنج کا شیدائی تھا مگر ابن عمار اس فن میں استادوں کا استاد تھا۔ الفانسو کو بری طرح مات ہوئی اور ابن عمار نے اس سے کہا: ''کیا اب ایک مطالبہ کرنا میرا حق نہیں!۔''

الفانسو ششم نے کہا: ''ہاں، بالکل۔ تمہارا کیا مطالبہ ہے؟''

ابن عمار نے کہا: ''آپ اپنے ملک واپس لوٹ جائیں۔''

یہ سنتے ہی الفانسو ششم کا رنگ فق ہو گیا اور وہ تلملا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے سرداروں سے کہا: ''مجھے پہلے ہی اس بات کا خطرہ تھا مگر تم نے میری رائے بدل دی۔''

الفانسو وعدے سے مکرنا چاہتا تھا مگر سرداروں نے بمشکل سمجھا بجھا کر اسے ٹھنڈا کیا اور کہا: ''آپ نصرانیوں کے سب سے بڑے بادشاہ ہیں۔ اگر آپ طے شدہ بات کا انکار کریں گے تو بڑی سبکی ہوگی۔''

آخر الفانسو نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا: ''واپسی ایک شرط پر ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ مجھے آئندہ سے دوگنا

خراج دیا جائے۔'' ابن عمار اس پر رضامند ہو گیا اور الفانسو ششم اپنے لشکر سمیت واپس چلا گیا۔

قرطبہ اور اشبیلیہ میں یہ خبر پہنچی تو ہر طرف ابن عمار کی دھوم مچ گئی اور شعراء کے حلقوں میں اسے اندلس کا ''فاتح اعظم'' قرار دیا جانے لگا۔ ①

ابن عمار کا عروج:

اس کامیابی کے بعد ابن عمار واقعی خود کو عبد الرحمن اوّل اور حاجب المنصور جیسا عظیم حکمران تصور کرنے لگا۔ اس نے اشبیلیہ اور قرطبہ کی شان و شوکت کو اپنی ''سیاسی مہارت'' کے مرہونِ منت سمجھنا شروع کر دیا۔ وہ ملکی محصولات کا بڑا حصہ اپنی خرمستیوں پر اڑانے لگا۔ قرطبہ میں اس کا جلوس بڑی دھوم دھام سے نکلتا۔ خلقت اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑتی تھی۔ وہ لوگ بڑے خوش قسمت شمار ہوتے تھے جنہیں ابن عمار کا ہاتھ چومنے کا موقع ملتا، یا جنہیں اس کی ایک نگاہ اور سلام کا دستی اشارہ نصیب ہو جاتا۔ وہ لوگ بھی خود کو سعادت مند سمجھتے تھے جنہیں ابن عمار کی رکاب چومنے یا اس کی پوشاک چھونے کا موقع مل جاتا۔ ②

ابن عمار اور معتمد میں فاصلے اور پھر عداوات:

ابن عمار کے نزدیک معتمد اور رمیکیہ بے کار مہروں کی حیثیت اختیار کر گئے۔ یہ جذبات آہستہ آہستہ نفرت و حقارت میں بدلتے چلے گئے۔ رمیکیہ سے ابن عمار کی نفرت کی ایک اور بڑی وجہ تھی۔ رمیکیہ سے شادی کے بعد معتمد کی نگاہِ محبت والفت میں ابن عمار کی حیثیت ثانوی ہو گئی تھی۔ اگرچہ کاروبارِ حکومت اب بھی ابن عمار کے پاس تھا مگر اسے یہ بات ناگوار گزرتی تھی کہ معتمد اس سے پہلے جیسی وارفتگی نہیں برتتا۔ ابن عمار ایک مدت سے اس بناء پر دل ہی دل میں رمیکیہ سے جلتا آ رہا تھا۔ اب اس نے نجی مجالس میں رمیکیہ کے بارے میں کچھ نازیبا اشعار بھی کہہ ڈالے۔ رفتہ رفتہ وہ معتمد کی اولاد سے بھی بدسلوکی برتنے لگا۔ وہ اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے نصرانیوں سے دوستی میں بہت آگے نکل گیا۔

معتمد بیرونی معاملات کے حل اور مذاکرات کے لیے اسی کو بھیجتا۔ وہ ایسے فیصلوں پر دستخط کر کے آتا جو سراسر اشبیلیہ کے لیے مضر اور نصرانیوں کے لیے مفید ہوتے۔ معتمد اس پر برافروختہ ضرور ہوتا مگر ابن عمار سے پرانی دوستی کا لحاظ کر کے صبر کرتا۔ ③

غرور کا انجام ابتداء میں حماقت اور انتہاء میں تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ابن عمار کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ معتمد نے ۴۷۱ھ میں ابن عمار کو مُرسیہ اور اس سے ملحقہ شہروں کو (جو ضلع تدمیر کے ذیل میں آتے تھے) فتح کرنے کے لیے لشکر دے کر روانہ کیا۔ راستے میں ایک جنگجو رئیس ابن رشیق بھی اپنی فوج کے ساتھ اس سے آ ملا۔ اس نے مُرسیہ کے محاصرے اور وہاں کے باشندوں کو مقامی حاکم ابن طاہر کے خلاف کھڑا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یوں ابن عمار

---

① المعجب فی تلخیص اخبار المغرب: ۹۴/۱

② المعجب فی تلخیص اخبار المغرب، لعبدالواحد المراکشی: ۹۴/۱　③ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲۸/۲تا۵۰

نے آسانی سے مُرسِیَہ پر قبضہ کرلیا۔ مگراس کے فوراً بعد اس نے اپنی شامتِ اعمال کو آواز دیتے ہوئے خودمختاری کا اعلان کردیا۔[1]

بادشاہ بن کراس نے معتمد کو اپنا سب سے بڑا حریف قرار دیا اور میدانِ جنگ میں پنجہ آزمائی سے پہلے اس پر غلیظ اشعار کے زہریلے تیر چلانا شروع کیے۔ اس نے معتمد اور رمیکیہ کی ایسی ہجوگوئی کی جو اخلاقیات سے عاری تھی۔ اس نے نجی محفل میں معتمد کو خطاب کر کے کہا:

تَخَیَّرْتَهَا مِنْ بَنَاتِ الْهِجَانِ ...... رُمَیْکِیَّةً مَا تُسَاوِیْ عِقَالًا

''تو نے قوم کی لڑکیوں میں سے رمیک کی اس لونڈی کو پسند کیا جس کی قیمت اونٹ کی رسّی کے برابر بھی نہ تھی۔''

سَأَکْشِفُ عِرْضَکَ شَیْئًا فَشَیْئًا ...... وَأَهْتِکُ سِتْرَکَ حَالًا فَحَالًا

''اب میں دھیرے دھیرے تیری عزت اتاروں گا ...... اور موقع بموقع تیری پردہ دری کروں گا۔''[2]

ابن عمار کا انجام:

یہ اشعار کسی طرح معتمد تک پہنچ گئے اور یوں دونوں کے درمیان نہ ختم ہونے والی رنجش پیدا ہوگئی۔ ابن عمار کی گستاخی معمولی نہ تھی مگر معتمد کو مزید بھڑکانے میں رمیکیہ کے علاوہ ایک نامور درباری ابوبکر ابن زیدون کا بھی ہاتھ تھا جو ابن عمار کا ہم پلہ شاعر اور مناصب کی دوڑ میں اس کا رقیب تھا۔ اس وقت ابن عمار کی جگہ وہ لے چکا تھا اور چاہتا تھا کہ ابن عمار کو جلد کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔

اُدھر ابن عمار کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کی قسمت میں بس چار دن کی بادشاہی ہے۔ ایک دن وہ جونہی کسی ضروری مہم سے مُرسِیَہ سے باہر نکلا، ابن رَشیق نے جس کا مُرسِیَہ کی فتح میں سب سے اہم کردار تھا، بغاوت کردی۔

ابن عمار تیزی سے پلٹا مگر شہر کے دروازے بند کیے جا چکے تھے۔ ابن عمار اپنی محافظ فوج کے ساتھ مُرسِیَہ کی فلک بوس فصیلوں کو سر کرنے کی ناکام کوشش کے بعد سمجھ گیا کہ اس کے دن گنے جاچکے ہیں۔ وہ بھاگ کر قسطالیہ چلا گیا تاکہ الفانسو ششم سے مدد لے مگر اسے ذلت وخواری کے سوا کچھ نہ ملا۔

اب اس نے سَرَقُسطہ آکر بنوہود کی پناہ لی مگر ۴۷۵ھ میں وہاں کے امیر المقتدر بن ہود کی وفات کے بعد اس کے جانشین ایسے شخص کی نازبرداریوں سے تنگ آگئے جس نے اپنے آقائے ولی نعمت سے بدترین دغا کی تھی۔

ابن عمار بنوہود کی ترش روئی دیکھ کر سَرَقُسطہ سے نکلا اور یکے بعد دیگرے مختلف امراء کی پناہ ڈھونڈتا رہا مگر ہر کوئی اسے دھتکار دیتا تھا۔ ربیع الاوّل ۴۷۷ھ میں وہ ''وشقہ'' کے قلعے میں پہنچا جہاں قلعہ دار ابن مبارک نے فریب دے کر اسے قید کردیا۔ ابن عمار نے کچھ دن کال کوٹھری میں گزارنے کے بعد ابن مبارک کو پیش کش کی کہ وہ اسے قید رکھنے

---

① المعجب فی تلخیص اخبار المغرب: ۱/ ۹۵

② نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب للمقری التلمسانی: ۲/ ۳۵۱، ۳۵۲

کی بجائے اس کی بولی لگائے اور جو اس کی زیادہ قیمت دے، وہ اسے لے جائے۔ ابن مبارک کو یہ رائے پسند آئی۔ اس نے ہرکارے دوڑا کر ہر دربار میں ابن عمار کی نیلامی کی اطلاع دی۔ ابن عمار نے اس موقع پر کہا:

اَصْبَحْتُ فِی السُّوقِ یُنَادیٰ عَلیٰ ... رَاسِی بِاَنْوَاعٍ مِنَ الْمَالِ

''میں بازار میں کھڑا ہوں اور میرے سر کی قیمت طرح طرح کے اموال سے لگائی جا رہی ہے۔''

وَاللّٰهِ مَا جَارَ عَلیٰ مَالِهٖ ... مَنْ ضَمَّنِی بِالثَّمَنِ الْغَالِی

''اللہ کی قسم! جو مجھے زیادہ قیمت دے کر حاصل کرے گا وہ اپنی دولت پر ظلم نہیں کرے گا۔''

معتمد ابن عمار کو گرفتار کرنے کے لیے بے چین تھا۔ لہٰذا اس نے سب سے زیادہ قیمت دے کر ابن عمار کو حاصل کرلیا۔ اسے بھوسے سے لدے ہوئے گدھے پر بٹھا کر سخت پہرے میں پابہ زنجیر پہلے **قرطبہ** لایا گیا جہاں سڑکوں پر ان ہزاروں لوگوں نے، جو اس کے ہاتھ پاؤں چوما کرتے تھے، اس کی ذلت کا تماشا دیکھا۔ معتمد بھی اس وقت **قرطبہ** پہنچ چکا تھا۔ اس نے ابن عمار کو اپنے سامنے بلوایا، اپنی مہربانیاں اور اس کی احسان فراموشیاں یاد دلا کر اسے بری طرح ڈانٹا۔ ابن عمار سر جھکائے سنتا رہا اور پھر نہایت عاجزی کے ساتھ کہا:

''مجھ سے بھول ہوئی۔ مجھے معاف کر دیجیے۔''

مگر معتمد کا غصہ برقرار تھا۔ ابن عمار کو اشبیلیہ بھیج کر وہاں کی سڑکوں پر گھمانے کے بعد معتمد کی رہائش گاہ ''قصر المبارک'' کی ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ ابن عمار نے اس حالت میں معتمد کی شان میں کئی قصیدے کہے جن میں اپنی تقصیرات کے اعتراف کے ساتھ معافی کی امید کی گئی تھی۔ یہ کلام معتمد تک پہنچا تو اسے پرانی دوستی یاد آنے لگی۔

آخر ایک شب معتمد نے ابن عمار کو پاس بلوالیا۔ وہ زنجیروں کو گھسیٹتا ہوا چلا آیا۔ معتمد نے ایک بار پھر اپنی نوازشوں اور اس کی گستاخیوں کا ذکر کر کے اسے شرم دلائی۔ ابن عمار نگاہ نیچی کیے آنسو بہاتا رہا۔

معتمد نے مزید کچھ کہے بغیر اسے واپس بھیج دیا مگر وہ اندر سے نرم پڑ چکا تھا۔ اس کی یہ حالت اس کی ملکہ رمیکیہ اور شہزادوں سے پوشیدہ نہ رہی۔ معتمد شاید ابن عمار کو معاف کر دیتا مگر رمیکیہ اور اس کے بیٹے یہ کانٹا ہمیشہ کے لیے نکال دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ ایک شب رمیکیہ نے نا و نوش اور نغمہ و سرود کے دوران معتمد سے کہا: ''سنا ہے تم ابن عمار کو معاف کر دو گے۔ حالانکہ اس نے بغاوت بھی کی اور ہماری عزت سے بھی کھیلا۔ بادشاہ یہ کبھی برداشت نہیں کرتے۔''

یہ سنتے ہی معتمد آپے سے باہر ہو گیا اور سیدھا اس کوٹھڑی کی طرف لپکا جہاں ابن عمار قید تھا۔ ابن عمار زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ معتمد کو دیکھ کر وہ اس کے قدموں پر گر پڑا مگر معتمد اپنے ہوش میں نہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت وہ بربط تھا جو القانس ششم نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ اس نے بربط ابن عمار کے سر پر دے مارا اور پھر لگاتار ضربیں لگاتا چلا گیا یہاں تک کہ ابن عمار کی روح قفس عنصری کا ساتھ چھوڑ گئی۔ یہ واقعہ ۷۷ھ کے اواخر کا ہے۔ اس طرح معتمد اور

ابن عمار کی دوستی کا افسانہ ایک حسرت ناک انجام پر اختتام پذیر ہوا۔ [1]

طُلَیطلہ اور اِشبِیلِیَہ نشانے پر:

اس دوران الفانسو ششم نے اندلس کے وسطی شہر طُلَیطلہ کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ طُلَیطلہ دنیا کے محفوظ ترین شہروں میں سے ایک تھا اور شمالی اندلس کے نصرانی مدت دراز سے اپنے اس سابقہ پایہ تخت کو حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ الفانسو ششم نے کئی برس پہلے اقتدار کی جنگ میں اپنے بھائیوں سے شکست کھا کر طُلَیطلہ میں یحیٰی المامون کے پاس پناہ لی تھی تو اس دوران اس نے آنکھیں اور کان کھلے رکھے اور شہر کے ان تمام دفاعی انتظامات سے اچھی طرح واقف ہو گیا جنھیں سامنے رکھتے ہوئے یہ شہر فتح کیا جا سکتا تھا۔ اس نے المامون اور امرائے طُلَیطلہ کی ایک مشاورت چوری چھپے سن لی تھی جس سے اسے معلوم ہوا کہ اس شہر کو خوراک کے اتنے وسائل دستیاب ہیں کہ سات سال تک محاصرہ برداشت کیا جا سکتا ہے۔

الفانسو ششم نے یحیٰی المامون کی مہمانی کا بدلہ یہ دیا کہ حکمران بن کر اس پر لشکر کشی کرنے اور اسے باج گزار بنانے میں ذرا بھی شرم محسوس نہ کی۔ پھر ۴۶۷ھ میں جب المامون فوت ہوا تو اس کے کمزور دل جانشین یحیٰی القادر کو اس نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ جب شہریوں کی نفرت کے باعث ۴۷۲ھ میں وہ طُلَیطلہ سے بے دخل ہوا تو الفانسو ششم نے ہی اسے کٹھ پتلی حاکم کے طور پر دوبارہ طُلَیطلہ کا تخت دلوایا۔

اس کے بعد الفانسو ششم طُلَیطلہ پر باقاعدہ قبضے کی تیاری کرنے لگا جس کا پہلا قدم یہ تھا کہ اس نے اشبیلیہ کے حکمران معتمد سے جو اس کا باج گزار بھی تھا، یہ عہد لیا کہ اگر نصرانی طُلَیطلہ پر حملہ آور ہوئے تو معتمد طُلَیطلہ والوں کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ اس پیش بندی کے بعد الفانسو ششم کی فوجوں نے ۴۷۴ھ میں طُلَیطلہ کے مضافات پر چھاپہ مار حملے شروع کر دیے جن کے باعث آس پاس کے تمام کھیت، باغات اور دیہات ویران ہو گئے۔ [2]

ریاستِ اِشبِیلِیَہ کے شہروں پر حملے:

اُدھر اشبیلیہ پر عائد خراج دوگنا ہو چکا تھا اور معتمد کے پاس اتنی رقم نہ تھی وہ اسے ادا کر سکتا۔ اس نے مجبور ہو کر ٹکسال میں کھوٹے سکے تیار کرائے جن پر سونے کا پانی چڑھایا گیا تھا۔ ۴۷۵ھ میں جب الفانسو ششم کی طرف سے اس کا یہودی منشی ابن شالیب خراج کی رقم وصول کرنے آیا تو معتمد کے وزیر ابن زیدون نے اسے یہی سکے پیش کیے۔ مگر وہ کھرے کھوٹے کی پہچان کا ماہر تھا، اس لیے نہایت حقارت سے انھیں ٹھکرا کر بولا: ''اگر تم نے خود خالص سونا نہ دیا تو بہت جلد ہم تمہارے شہروں پر قبضہ کر کے اپنی مرضی کا سونا وصول کر لیں گے۔'' معتمد اس جواب پر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے یہودی کو پھانسی پر لٹکا دیا اور اس کے ساتھ آئے ہوئے دو نصرانی سپاہیوں کو جیل میں ڈال دیا۔

---

① المعجب فی تلخیص اخبار المغرب: ۱/ ۹۳ تا ۹۹؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۶۰ تا ۶۸

② التاریخ الاندلسی: لعبد الرحمن علی: ص ۳۳۱، ۳۳۲؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۱۰۸ تا ۱۱۰

الفانسو کو یہ اطلاع ملی تو اس نے معتمد سے انتقام لینے کی قسم کھائی۔ اس نے الگ الگ سمتوں میں دو لشکر روانہ کیے۔ پہلے لشکر نے اشبیلیہ کے ماتحت مغربی شہروں: وَلبہ اور باجہ کی سرحدوں میں گھس کر باغات اور فصلوں کو تباہ کرنے کے بعد لوگوں کو قیدی بھی بنایا۔ دوسرے لشکر کو لے کر الفانسو ششم خود روانہ ہوا اور دریائے وادی الکبیر کے کنارے عین اس جگہ پہنچا جہاں سے معتمد کا محل سامنے دکھائی دیتا تھا۔ اُدھر پہلا لشکر بھی اس سے آملا۔ نصرانی سورماؤں نے کوئی مزاحمت نہ دیکھ کر ہر طرف زبردست مار دھاڑ کی۔ الفانسو تین دن تک اشبیلیہ کا محاصرہ کر کے اہلِ شہر کو ڈرانے کے بعد جنوب کی طرف بڑھا، شذونہ کو قہر کا نشانہ بناتے ہوئے وہ طریف تک پہنچ گیا اور سمندر کی موجوں میں گھس کر اپنے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ [1]

اس مہم کے دوران اس نے معتمد کی طرف ایک طنزیہ مراسلہ بھیجا جس میں لکھا تھا:

''ہمارے ہاں مکھیاں بہت ہیں۔ تم اپنے محل سے ایک پنکھی بھیج دو تاکہ مجھے راحت ملے۔''

معتمد نے جواب میں لکھا: ''میں تمہارے غرور وتکبر کو خوب سمجھ چکا ہوں۔ میں تمہیں چمڑے کی ایسی پنکھیاں بھیجوں گا جو تمہارے شر سے لوگوں کو نجات دیں گی۔''

الفانسو ششم یہ جواب پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ اتنا وہ سمجھ چکا تھا کہ معتمد اب مزید ذلت سہنے کے لیے تیار نہیں۔ [2]

سقوطِ طُلَیطُلَہ:

الفانسو ششم ملوک الطوائف کی حکومتیں ختم کر کے پورے اندلس کو اپنے قبضے میں لینے کا فیصلہ کر چکا تھا مگر سب سے پہلے وہ طُلَیطُلَہ کو مسخر کرنا چاہتا تھا جہاں کا برائے نام حکمران یحییٰ القادر مزاحمت کی ذرا بھی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

الفانسو ششم نے یحییٰ القادر کو کہلوادیا کہ وہ طُلَیطُلَہ اس کے حوالے کر دے اور خود اس کی جگہ بَلَنْسِیَہ کی حکومت سنبھال لے جسے اس کے باپ یحییٰ المامون نے اپنے آخری ایام میں فتح کیا تھا۔ القادر کو چوں چرا کی مجال نہ تھی مگر طُلَیطُلَہ کے امراء شہر حوالے کرنے پر تیار نہ تھے۔ اس لیے الفانسو ششم کی افواج زبردست تیاری کے بعد طُلَیطُلَہ کی طرف بڑھنے لگیں۔ اس شہر کے دیہات اور باغات تین سال سے نصرانیوں کی تاخت وتاراج کی زد میں تھے لہٰذا غذائی ترسیل کے وسائل ختم ہو چکے تھے اور شہر پر قبضہ زیادہ مشکل نہ تھا۔ طُلَیطُلَہ کو خطرے میں دیکھ کر بھی ملوک الطوائف آنکھیں موندے رہے اور کوئی مدد کو نہ پہنچا بلکہ سب سراسیمگی کی کیفیت میں الفانسو ششم کو خراج دیتے رہے۔ [3]

صرف بَطَلْیُوس کے حاکم عمر بن محمد الافطس نے جو متوکل کے لقب سے موسوم تھا، ایمانی غیرت کا مظاہرہ کیا۔ وہ نہایت سمجھدار، دلیر اور فصیح وادیب انسان تھا۔ زوال کے اس دور میں اس نے بَطَلْیُوس کو نہ صرف علوم وفنون کا مرکز بنا دیا تھا بلکہ عسکری لحاظ سے بھی اسے ناقابلِ تسخیر مورچے میں تبدیل کر دیا تھا۔ [4]

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۷۲، ۷۳ [2] نفح الطیب: ۳/ ۳۵۸

[3] التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطة، لعبد الرحمن علی: ص ۳۳۳

[4] الحلة السیراء: ۲/ ۹۶، ۹۸

عمر المتوکل کے حکم پر اس کا بیٹا الفضل جو ماردہ کا حاکم تھا، اپنے دستوں کے ساتھ نصرانیوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے ان پر لگاتار حملے کر رہا تھا مگر الفانسو ششم کی طاقت بہت زیادہ تھی اور عمر المتوکل کی فوج محدود۔ اس لیے تمام کوششیں رائیگاں جاتی رہیں۔ جمادی الاخریٰ ۴۷۷ھ میں الفانسو ششم اپنی ٹڈی دل افواج کے ساتھ جن میں لیون اور قسطلیہ کے علاوہ ریاست ارغون اور فرانس کے رضا کار بھی شامل تھے، دریائے تاجہ کا موڑ عبور کر کے طلیطلہ کی فصیل تک پہنچ گیا۔

اہل طلیطلہ کا بچنا مشکل تھا پھر بھی انہوں نے شہر کی فلک بوس فصیلوں کا سہارا لے کر مزاحمت شروع کر دی۔ انہیں توقع تھی کہ ملوک الطوائف اسلامی اندلس کے اس دفاعی حصار کو بچانے کی خاطر ان کی مدد کو آجائیں گے۔ مگر ہر امید بے سود رہی۔ محاصرہ نو ماہ تک جاری رہا یہاں تک کہ اہل شہر فاقوں سے جاں بلب ہونے لگے۔ خلاصی ناممکن دیکھ کر عمائدِ شہر صلح کی درخواست کے ساتھ الفانسو ششم کے پاس گئے مگر اس نے ملے بغیر ان کی درخواست بڑی بے رحمی سے مسترد کر دی اور اپنے مکار و عیار وزیر ششناڈو کو حکم دیا کہ وہ ان سے گفتگو کرے۔ ششناڈو نے وفد کو سمجھایا کہ الفانسو ششم شہر کو فتح کیے بغیر پیچھے نہیں ہٹے گا۔ بہتر ہے کہ آپ بلا پس و پیش ہتھیار ڈال دیں۔

عمائدِ شہر نے کہا: ''اگر ملوک الطوائف کی کمک آگئی تو ہمارا پلہ بھاری ہو جائے گا۔''

ششناڈو نے یہ بات الفانسو ششم کو جا کر بتائی تو اس نے طنزیہ قہقہے لگائے اور ملوک الطوائف کے ان سفیروں کو پیش کر دیا جو اس کی اطاعت کا عہد و پیمان کرنے اس کے پاس آچکے تھے۔

طلیطلہ کا وفد نہایت مایوسی کے عالم میں واپس لوٹ گیا اور تین دن بعد الفانسو ششم کی افواج شہر میں داخل ہو گئیں۔ یہ محرم ۴۷۸ھ کا واقعہ ہے۔ کٹھ پتلی یحییٰ القادر کو کان سے پکڑ کر تخت سے اتارا گیا اور وہ الفانسو ششم کی اجازت سے اپنے اہل و عیال سمیت ''بلنسیہ'' چلا گیا جسے اس کے باپ نے اپنے آخری ایام میں فتح کیا تھا۔

الفانسو نے شہر فتح کرتے وقت مقامی مسلمانوں کو مذہبی شعائر اور عبادت گاہوں کی آزادی کی نوید سنائی تھی مگر دو ماہ بعد اس کا ارادہ بدل گیا۔ ربیع الاول میں اس نے حکم دیا کہ شہر کی عظیم الشان جامع مسجد کو چرچ میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس کے سپاہی اس حکم کے مطابق جامع مسجد میں داخل ہوئے۔ لوگوں کو پہلے سے اطلاع ہو چکی تھی اس لیے تمام نمازی، علماء، فقہاء اور طلبہ مسجد خالی کر چکے تھے۔ تاہم ایک محدث شیخ المغامی اپنے حلقے میں بیٹھے۔ سرکاری کارندے بار بار آکر کہتے: ''جلدی اٹھو۔'' وہ حدیث کی عبارت پڑھنے والے طالب علم کو اشارہ کر کے کہتے: ''روایت پوری کر لو۔''

سبق پورا کر کے وہ آہستہ سے اٹھے۔ سربسجود ہو کر مسجد کی خاک پاک کو اشکوں سے بھگوتے رہے۔ ان کے باہر نکلتے ہی مسجد کی محراب توڑ دی گئی اور چھت پر صلیب آویزاں کر دی گئی۔[1]

الفانسو ششم کی اندلس کے مشرقی ساحل تک رسائی:

اندلس کے وسطی شہر طلیطلہ کے ساتھ ہی ملک کا مشرقی ساحل بھی الفانسو ششم کے ہاتھ آگیا تھا کیوں کہ یحییٰ

[1] التاریخ الأندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطة، لعبد الرحمن علی، ص: ۳۳۲، ۳۳۳

القادر، الفانسو ششم کی افواج کے جلو میں ہی بَلَنْسِیَه پہنچا تھا جہاں اس کی حکومت کے پردے میں الفانسو ششم نے اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ یحییٰ القادر کی محافظ نصرانی فوج نے بَلَنْسِیَه میں قیام پذیر ہو کر تمام مضافاتی بستیوں اور دیہاتوں اور ساحلوں کو اپنی لوٹ مار اور غنڈہ گردی کا میدان بنالیا۔ ان ''خدمات'' کے عوض قسطالیہ نے یحییٰ القادر سے بھاری رقوم طلب کرنا شروع کردیں لہٰذا وہ اہل بَلَنْسِیَه پر کمرتوڑ ٹیکس عائد کرتا چلا گیا تا کہ الفانسو کے مطالبے پورے کرسکے۔[1]

اُندلس کے دیگر شہر خطرے میں:

طُلَیْطلہ کے سقوط کے بعد الفانسو ششم کی توجہ دوسرے ملوک الطوائف کی طرف ہوئی۔ اس نے تیزی سے مشرق اور جنوب میں افواج بھیج کر چھاپہ مار حملے شروع کرادیے۔ سینکڑوں دیہات، قصبات اور درجنوں چھوٹے چھوٹے شہر اس کی مملکت کا حصہ بن گئے۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ ''شہنشاہِ ملتین'' اور ''حامیِ مسیحیت واسلام'' کا لقب لگا کر دعویٰ کیا کہ وہ نصاریٰ اور مسلم دونوں قوموں کا سربراہ ہے۔[2]

اُندلس کے کسی حکمران کو اب یہ غلط فہمی نہیں تھی کہ وہ محفوظ ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ ''بَلَنْسِیَه'' اور ''طُلَیْطلہ'' کو اپنی لپیٹ میں لینے والی نصرانیت کے سیلاب کی دو لہریں جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے جبل الطارق کے پاس باہم آملیں گی اور اُندلس کا کوئی کونہ آزاد نہیں رہے گا۔ ایسے میں معتمد نے آخری کوشش کے طور پر اپنی ریاست کے ایک یہودی ابن مشعل کو از سرِ نو صلح کی بات کرنے الفانسو کے پاس بھیجا مگر مذاکرات بالکل ناکام رہے۔

الفانسو ششم نے نہایت غضب ناک ہو کر کہا:

''میں ایسی قوم کو آزاد کیسے چھوڑ دوں جس کا ہر امیر خلفاء اور سلاطین کے القاب لگائے بیٹھا ہے۔ کوئی معتمد ہے کوئی معتضد۔ کوئی معتصم ہے کوئی متوکل۔ کوئی مستعین ہے کوئی مقتدر۔ کوئی امین ہے کوئی مامون۔ حالانکہ ان میں سے کوئی اپنے دفاع کے لیے تلوار اٹھا سکتا ہے نہ اپنی اور اپنی رعایا کی عزت بچا سکتا ہے۔''[3]

مسلمانوں کے اتحاد کے لیے علماء کا کردار

ملوک الطوائف کی باہمی لڑائیوں اور شمال سے نصرانیوں کی یلغار کے دوران علمائے اُندلس اتحادِ ملت کی کوششیں شروع کرچکے تھے۔ ان میں قیروان کے مکی ابن ابی طالب رحمہ اللہ (۳۵۵ھ۔ ۴۳۷ھ) بھی تھے، جنہوں نے افریقہ اور مصر کے نامور قراء اور محدثین سے علم حاصل کیا۔ پھر قُرطُبہ آئے اور جامع قُرطُبہ میں درس دینا شروع کیا۔ ان کی تصانیف کی تعداد ۸۰ کے قریب ہے۔ انہوں نے ملوک الطوائف کے پُرآشوب زمانے کے ۳۸ برس اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ قُرطُبہ میں قیامِ امن کے حوالے سے ان کا خاص کردار تھا۔ یہاں کی شورائی حکومت کا سربراہ ابن جَهْوَر ان

---

① دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۴۲۸

② التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطة: ص: ص ۳۳۳، ۳۳۴ ③ دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۴۳

کا خاص شاگرد تھا۔ ①

علامہ ابن عبدالبر مالکی رحمۃ اللہ:

علامہ ابن عبدالبر مالکی رحمۃ اللہ (۳۶۸ھ۔۴۶۳ھ) بھی اس دور کی عظیم شخصیات میں سے ایک تھے۔ وہ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ اندلس کے علاوہ افریقہ کے مایہ ناز اساتذہ سے استفادہ کیا۔ بطلیوس کے حکمران مظفر افطس کے دور میں مغربی اندلس کے شہروں لشبونہ (لزبن) اور شنترین کے قاضی رہے۔ پھر مشرقی اندلس آکر دانیہ اور بلنسیہ میں ٹھہرے اور ۹۵ سال کی عمر پا کر ۴۶۳ھ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے مؤطا مالک کی نہایت جامع شرح لکھی جو ۲۴ جلدوں میں "التمهيد لما في الموطا من المعاني والاسانيد" کے نام سے معروف ہے۔ ان کی سب سے مشہور تالیف "الاستيعاب في معرفة الاصحاب" ہے جو صحابہ کرام کے حالات کا بیش قیمت مجموعہ ہے۔ ②

تعلیم و تدریس اور تصنیف کے ساتھ وہ قوم کو اتحاد کی دعوت بھی دیتے رہے۔ ③

علامہ ابن حزم الظاہری رحمۃ اللہ:

اس سلسلے میں علامہ علی بن احمد، ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ (۳۸۴ھ۔۴۵۶ھ) کا نام بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ وہ اپنے تحقیقی ذہن کی بناء پر متعدد فقہی مسائل میں جمہور اہل سنت سے ہم آہنگ نہ تھے اور اسی لیے انہوں نے شافعی مسلک چھوڑ کر ظاہری مکتب فکر اختیار کیا تھا۔ تاہم اس سے ہٹ کر ان کی خدمات کا ساری دنیا کو اعتراف ہے۔ ان کے والد احمد بن سعید دربار قرطبہ میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔ خود ابن حزم بھی کچھ مدت اعلیٰ سرکاری مناصب پر رہے۔ ان کی کوشش تھی کہ قرطبہ میں دوبارہ خلافتِ اُمویہ کا احیاء کیا جائے مگر سیاسی مخالفین آڑے آئے اور ان کی چیرہ دستیوں یہاں تک بڑھیں کہ ابن حزم کو قرطبہ چھوڑ کر مشرقی اندلس کے ساحلی شہر المریہ نقل مکانی کرنا پڑی۔ یہاں وہ سیاست سے کنارہ کش ہو کر تصنیف و تالیف میں منہمک ہو گئے اور اسلامی کتب خانے میں بیش بہا اضافہ کیا۔

انہوں نے اصول فقہ میں گزشتہ فقہاء سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے اصول پیش کیے اور اس موضوع پر ۸ جلدوں میں "الاحكام في اصول الاحكام" لکھی۔ فقہ میں ان کی مایہ ناز تصنیف "المحلّی بالآثار" ہے بارہ جلدوں میں ہے۔ پانچ جلدوں میں "الفصل في الملل و الاهواء و النحل" تحریر کی جس میں یہود و نصاریٰ، شیعہ، خوارج، معتزلہ اور مرجیہ جیسے فرق باطلہ کے عقائد کی مدلل تردید کی۔ وہ تاریخ و انساب کے بھی ماہر تھے جس کا ثبوت ان کی مشہور ترین تصنیف "جمهرة انساب العرب" سے ملتا ہے۔ تفسیر میں "الناسخ والمنسوخ" بھی ان کی نہایت مشہور کتاب ہے۔

قلم و قرطاس سے اٹوٹ رشتے کے باوجود وہ گرد و پیش سے بے خبر نہ تھے۔ قرطبہ کے سیاسی بحران اور مسلمانوں

---

① غاية النهاية في طبقات القراء لابن جزری: ۱/۳۱۳ ② سير اعلام النبلاء: ۱۸/۱۵۳، ۱۵۴، ط الرسالة
③ الزلاقة معركة من معارك الاسلام للمصري جميل عبدالله: ص ۱۴۹، ط الجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة

کی باہم خانہ جنگی کے دوران انہوں نے "طوق الحمامۃ" جیسی کتاب لکھی جس میں نہایت لطیف پیرائے میں وہ صفات اپنانے کی ترغیب دی گئی ہے جنہیں اپنا کر امت ہر دور میں اُس اخلاقی انحطاط سے نکل سکتی ہے جو سیاسی زوال کا سبب بنا کرتا ہے۔ انہوں نے حالات کی مناسبت سے بھی کئی رسالے لکھے۔

غرناطہ کے یہودی وزیر ابن نغریلہ نے جب قرآن مجید کے خلاف ایک کتاب لکھی تو ابن حزم نے اس کا دندان شکن جواب دیا جو "الرسالۃ فی الرد علی ابن نغریلہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ اکثر ملوک الطوائف ابن حزم کے مخالف تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی عمر کے آخری چالیس سالوں میں ان کی طرف سے بار بار تکالیف اٹھائیں۔ اشبیلیہ میں ان کی کتب کو سرِعام نذرِ آتش کیا گیا تاہم وہ اپنا کام کرتے رہے۔ ۷۲ سالہ مصروف اور بامقصد زندگی گزار کر ۴۵۶ھ میں وہ فوت ہوئے۔ ان کی تصانیف کی تعداد چار سو بتائی جاتی ہے۔ ان کے قلم کی تیزی دیکھ کر کہا جاتا تھا:

"ابن حزم کی زبان اور حجاج کی تلوار جڑواں بہنیں ہیں۔"[۱]

ابن حزمؒ نے اس دور میں جہادی اشعار بھی کہے اور قوم کو نصاریٰ کے مقابلے میں سربکف ہونے کی دعوت دی۔[۲]

ان حضرات کے علاوہ بھی کئی علماء و فضلاء نے ملت کی قیادت میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں غرناطہ کے ابو اسحٰق البیری رحمہ اللہ (م ۴۶۰ھ)، طلیطلہ کے ابن عسال رحمہ اللہ (م ۴۸۷ھ) اور اشبیلیہ کے ابو حفص ہوزنی رحمہ اللہ (۴۶۰ھ) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔[۳]

قاضی ابو الولید الباجی رحمہ اللہ کی تحریک:

تاہم جس شخصیت نے باقاعدہ طور پر مسلمانانِ اندلس میں سیاسی بیداری کے لیے اپنی زندگی وقف کی وہ قاضی ابو الولید رحمہ اللہ (م ۴۷۴ھ) تھے جو بطلیوس کے شہر "الباجہ" کی نسبت سے "الباجی" کہلاتے تھے۔ ان کا اصل نام سلیمان بن خلف تھا۔ وہ ۴۰۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ جوانی میں مزید علم حاصل کرنے ایشیا کے سفر پر نکلے۔ چار سال حجاز میں رہ کر حرمین کے عالی السند محدثین سے استفادہ کیا اور اس دوران چار حج کیے۔ تین سال بغداد میں ابو اسحٰق شیرازی رحمہ اللہ جیسی نابغۂ روزگار ہستی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ پھر موصل، دمشق اور حلب میں کئی سال گزارے۔ ۱۳ سال بعد ۴۴۰ھ میں جبکہ ان کی عمر ۳۷ سال ہو چکی تھی، وہ وطن لوٹے اور علم و فضل میں کمال کے باعث اندلس میں مختلف شہروں کے قاضی بنائے گئے۔ وہ محقق اور صاحبِ تصانیف عالم تھے۔ انہوں نے سات جلدوں میں مؤطا امام مالک کی بہترین شرح "المنتقی" لکھی جو آج تک اہلِ علم سے داد وصول کر رہی ہے۔ صحیح بخاری کے رجال پر ان کی محققانہ کاوش "التعدیل والتجریح" تین جلدوں میں ایک اور بے نظیر علمی شاہکار ہے۔[۴]

---

① الاعلام للزرکلی: ۴/ ۲۵۴، ط دار العلم　② سیر اعلام النبلاء: ۱۸/ ۲۰۶، ط الرسالۃ

③ التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۳۴۵ تا ۳۵۲

④ الاعلام للزرکلی: ۳/ ۱۲۵، ط دار العلم؛ التعدیل والتجریح للباجی: ۱/ ۵ تا ۱۶۳، مقدمۃ

وہ ملوک الطوائف کی خانہ جنگی اور نصرانی طاقتوں کے عروج پر سخت فکر مند تھے۔ لہٰذا انہوں نے پورے اندلس کا دورہ کرنا شروع کیا۔ وہ مختلف شہروں میں کئی کئی ماہ ٹھہر کر وہاں قضا، افتاء اور درسِ حدیث کی خدمات انجام دیتے اور ساتھ ساتھ علماء، شعراء، اہلِ قلم اور امراء کو بیدار کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ عوام پر اثر انداز طبقے کو جگانے کے بعد وہ امرائے فوج اور ملوک الطوائف کو نصرانیت کے اس سیلاب کے خلاف اتحاد کی دعوت دیتے۔ امراء اور سربراہان ریاست عزت واحترام سے ان کی باتیں سنتے مگر پھر ذاتی مصلحتوں کا نشا انہیں قومی مقاصد بھلا دیتا۔

ملوک الطوائف میں بَطَلْیُوس کا حکمران عمر المتوکل پہلا شخص تھا جس نے عملی طور پر اس تحریک کا اثر قبول کیا اور قاضی ابوالولید رحمہ اللہ کو مشیر خاص اور قاضی بنا کر اتحادِ ملت کی اس تحریک کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے بارہا انہیں مختلف درباروں میں بھیجنے کا انتظام کیا۔ وہ سَرَقُسطه، بَلَنْسِيَه، اَلْمَرِيَه، مُرسِيَه اور دانیہ سمیت اکثر ریاستوں کے امراء کے پاس یہ پیغام لے کر جاتے رہے کہ مسلمانوں کو دشمن کے مقابلے میں متحد ہو جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ آخری سالوں میں ان کی تجویز یہ بھی تھی کہ اس اتحاد میں مَرّاکُش کے حکمران یوسف بن تاشفین کو بھی شریک کیا جائے، کیوں کہ الفانسو ششم کی بے پناہ طاقت کے سامنے ملوک الطوائف کی فوجیں ناکافی ہوں گی۔

قاضی ابوالولید کی زندگی کے آخری سالوں میں، جب طُلَیْطُله پر الفانسو ششم کے چھاپہ مار حملے شروع ہو چکے تھے، ملک کے بیشتر امراء اور جرنیل ان کی رائے کو اہمیت دینے لگے تھے۔ اسی مہم کے دوران رجب ۴۷۴ھ میں قاضی ابو الولید رحمہ اللہ المریہ میں وفات پا گئے۔[1]

◆◆◆

---

[1] التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطة، لعبد الرحمن علی: ص ۳۳۸ تا ۳۴۳؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۱۱۱

مرابطین

جس وقت انتشار وافتراق کے مارے اندلس کے مہذب ومتمدن حکمران سنگِ مرمر کے ایوانوں میں محصور ہو کر بے بسی کے عالم میں نصرانیوں کے سیلاب کو شمال سے جنوب کی طرف آتا دیکھ رہے تھے، بحیرۂ روم کے پار افریقہ کے ساحلوں پر اہلِ ایمان اپنی تلواریں تیز کر کے ایک نیا جہان آباد کرنے کا عزم کر رہے تھے۔

بربری نسل کے قبیلہ ''لمتونہ'' سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ مراکش کے صحرائی علاقوں میں آباد تھے اور ریت اُڑاتی آندھیوں سے حفاظت کے لیے عموماً اپنے چہروں پر رومال باندھنے کے عادی تھے، اس لیے انہیں 'ملثمین' (نقاب پوش) کہا جاتا تھا۔ ۴۰۰ھ میں اس قبیلے کے کچھ افراد نے کسی گمنام مبلغ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کیا تھا۔ ان نومسلموں میں سے ''جوہر'' نامی ایک شخص حج کے سفر پر گیا تو واپسی پر تیونس کے شہر قیروان میں اس کی ملاقات ایک فقیہ سے ہوئی۔ جب جوہر نے انہیں بتایا کہ ہمیں کلمے اور نماز کے سوا دین کا کچھ علم نہیں، تو فقیہ نے اپنے شاگرد عبداللہ بن یاسین کو معلم بنا کر اس کے ساتھ کر دیا۔

عبداللہ بن یاسین لمتونہ قبیلے کے علاقے میں پہنچے تو ان کا شاندار استقبال ہوا۔ عبداللہ بن یاسین کی تبلیغی اور تعلیمی کوششوں سے وہاں اسلام کو ترقی ہوئی، لوگوں نے دینی علم حاصل کیا اور شعائرِ دین عام ہو گئے۔ اسلامی اخوت نے بکھرے ہوئے قبائلیوں کو متحد کر کے ایک طاقت بنا دیا اور یہ سارا صحرائی علاقہ جہاں یہ نومسلم آباد تھے، خود بخود ایک الگ آزاد ریاست کی شکل اختیار کر گیا۔ ایسے میں ضرورت محسوس ہوئی کہ اس ریاست کے انتظامات کے لیے ایک سربراہِ حکومت منتخب کیا جائے۔ عبداللہ بن یاسین خود تعلیم وتبلیغ پر توجہ مرکوز رکھنا چاہتے تھے۔ جوہر میں بھی یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ قبائلیوں کو سنبھال لیتا، اس لیے قبیلہ لمتونہ کے سردار ابوبکر بن عمر کو یہ ذمہ داری سونپ دی گئی اور اسے ''امیر المسلمین'' کا لقب دیا گیا۔

اس دوران نہ صرف مراکش اور الجزائر کے غیر مسلم قبائل اس نئی اسلامی قوت کی بالادستی سے خطرہ محسوس کرنے لگے تھے بلکہ بہت سے مسلمان بربر قبائل بھی اپنی سیاسی طاقت کو اس نئی تحریک میں ضم کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے، لہٰذا ان سب نے امیر ابوبکر بن عمر کے خلاف محاذ بنا لیا۔ ایسے میں ''ملثمین'' کے روحانی پیشوا عبداللہ بن یاسین نے ابوبکر بن عمر کو مخالفین سے لڑنے کی اجازت دی اور اپنی جماعت کو ''مرابطین'' کا نام دیا۔ ابوبکر بن عمر نے غیر مسلم قبائل اور ان کے اتحادی بربروں سے کئی جنگیں لڑیں اور ایک وسیع رقبے کو زیرِ نگیں کر لیا۔ تاہم قبائلی اتنی آسانی سے قابو آنے والے

نہ تھے۔ انہوں نے ''سوس'' میں بغاوت کی جس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جمادی الاولیٰ ۴۵۱ھ میں عبداللہ بن یاسین قتل ہوگئے۔[1]

تاہم ابوبکر بن عمر نے جوابی حملہ کر کے سوس کے باغیوں کو سبق سکھادیا، اس کی مملکت جنوب سے شمال کی طرف پھیلتی گئی، اس کی طاقت سے مرعوب ہو کر ان گنت قبائل اس کے ساتھ ہوگئے تھے جن میں بھلے بُرے ہر قسم کے لوگ تھے۔ لہٰذا ان لڑائیوں اور چھاپہ مار حملوں میں اس کی فوج سے کچھ غیر محتاط کارروائیاں بھی ہوئیں جن سے ابوبکر بن عمر کو ندامت ہوئی۔ جب ایک بڑھیا نے آکر شکایت کی کہ اس کے سپاہیوں کی لوٹ مار میں اس کا اونٹ ضائع ہوگیا ہے تو ابوبکر بن عمر کو بڑی فکر ہوئی۔ اس نے اپنی نوتشکیل مملکت کے لیے ایک بہترین منتظم کی تلاش شروع کر دی۔[2]

+++

یوسف بن تاشفین

اس کش مکش کے دوران افریقہ کے افق پر ایک ایسی شخصیت نمودار ہوئی جس میں قیادت کی غیر معمولی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر ودیعت کی گئی تھیں۔ یہ ''یوسف بن تاشفین'' تھے۔ گندمی رنگت، میانہ قامت، گھنگریالے بالوں، سرمگیں آنکھوں، اونچی ناک، دبلے پتلے بدن، ہلکی ڈاڑھی اور دھیمی گفتگو والی یہ ہستی شجاعت وبسالت، ہمت ومردانگی اور سیاست وجہاں داری کا پیکر تھی۔ وہ ابوبکر بن عمر کے بھتیجے تھے۔ نرم طبعی، رحم دلی، سادگی اور جفاکشی کے ساتھ دوراندیشی اور انتظامی مہارت بھی ان کی خاص صفات تھیں۔ ۴۵۳ھ میں سجلماسہ کی فتح کے بعد ابوبکر بن عمر نے انہیں نہ صرف وہاں کا امیر بنادیا بلکہ دولتِ مرابطین کا شمالی حصہ انہی کے سپرد کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر ۴۳ سال کے لگ بھگ تھی۔[3]

یوسف بن تاشفین کی امارت:

۴۶۲ھ میں ابوبکر بن عمر کی وفات کے بعد مرابطین نے یوسف بن تاشفین کو اپنا امیر چن لیا۔ انہوں نے حکومت سنبھالنے کے بعد مرابطین کی ریاست کو بڑی تیزی سے وسعت دی۔ ان کے جلو میں علماء وفقہاء کی بڑی تعداد تھی جو امورِ مملکت کو شرعی حدود پر استوار رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ مرابطین کے پیشہ ور سپاہی چالیس ہزار تھے جنہیں سیر بن ابوبکر جیسے سپہ سالار کی قیادت نصیب تھی۔ یہ نوجوان امیر یوسف کا چچازاد اور دستِ راست تھا۔

ایسے قابل جرنیلوں کی مدد سے یوسف بن تاشفین نے لمتونہ کے علاوہ صنہاجہ، کتامہ، مصمودہ اور زناتہ سمیت درجنوں

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۸ / ۴۲۶ تا ۴۲۸، ط الرسالۃ

[2] سیر اعلام النبلاء: ۱۸ / ۴۳۰، ط الرسالۃ

[3] سیر اعلام النبلاء: ۱۸ / ۴۲۹، ۴۳۰، ۱۹ / ۲۵۳، ط الرسالۃ ، دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲ / ۳۱۲

بربری قبائل کو مسخر کرلیا۔افریقہ کا یہ شمال مغربی علاقہ غیر متمدن قبائل کا مسکن تھا جو مدت دراز سے باہم دست وگریباں تھے۔افغات کا شمال مغربی علاقہ خاص کر نہایت خطرناک تھا جہاں قبائلی راہزنوں کا راج تھا۔اس علاقے کو مقامی زبان میں ”مَرّاکش“ کہا جاتا تھا جس کا ترجمہ ہے ”جلدی سے گزر جاؤ۔“یوسف بن تاشفین نے یہ علاقہ فتح کرنے کے بعد ۴۶۵ھ میں یہاں ”مَرّاکش“ شہر کی بنیاد رکھی جس کے نام پر بعد میں ملک کو بھی مَرّاکش کہا جانے لگا۔

۴۶۶ھ میں فقہاء کے مشورے پر یوسف بن تاشفین نے اپنی حکومت کو خلافتِ عباسیہ کی سرپرستی میں شامل کرلیا۔ خلیفہ مستظہر باللہ نے مرابطی امیر کے لیے خلعت اور پروانۂ حکومت روانہ کیا۔مرابطین کی مملکت میں خلیفہ کے نام کا سکہ جاری کردیا گیا۔اس کے بعد مرابطین کی افواج کئی سمتوں میں یلغار کرتی ہوئی افریقہ کے طول وعرض میں پھیل گئیں۔ایک عشرے کے اندر اندر مرابطین فاس،طنجہ،تلمسان اور وہران جیسے مشہور تاریخی شہر فتح کرچکے تھے۔ان کی مملکت مشرق میں تیونس اور مغرب میں بحر اوقیانوس کے ساحل تک پھیل گئی تھی جبکہ شمال میں یہ بحیرۂ روم اور جنوب میں سوڈان کی سرحدوں کو چھورہی تھی۔

ایسی عظیم الشان مملکت کا حکمران ہونے کے باوجود یوسف بن تاشفین کی زندگی سادگی کا بہترین نمونہ تھی۔ان کے دسترخوان پر جو کی روٹی،اونٹ کے گوشت اور دودھ کے ایک پیالے کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔اب بھی وہ خانہ بدوشوں کی طرح اون کا کھردرا لباس پہنتے تھے۔ان کے اور ایک صحرائی شتربان کے رہن سہن میں کوئی فرق نہ تھا۔انہوں نے اپنی رعایا پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا تھا۔زکوٰۃ،عشر اور ذمیوں کے جزیے کے سوا حکومت کچھ وصول نہیں کرتی تھی۔[1]

ملوک الطوائف کو مرابطین سے خطرہ اور باہمی مراسلت:

اندلس اور مرابطین کی مملکت کے درمیان بحیرۂ روم کی تنگ خلیج ہی حائل تھی۔اس لیے یہاں کے لوگ شروع میں مرابطین کی فتوحات سے واقف ہوچکے تھے۔ملوک الطوائف جس طرح الفانسو ششم سے ڈرتے تھے اسی طرح وہ مرابطین سے بھی خطرہ محسوس کرتے تھے۔معتمد کے باپ معتضد نے اسی لیے ایک طاقتور بحری بیڑہ تیار کرایا تھا تاکہ اگر مرابطین حملہ کریں تو وہ اپنی ریاست کو بچاسکے۔

یوسف بن تاشفین کی تخت نشینی کے بعد ملوک الطوائف خود کو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان محسوس کرنے لگے تھے۔ اس لیے انہوں نے باہمی مشورے سے ایک مراسلہ تیار کیا جس میں مرابطین کو اپنی اطاعت کا یقین دلاتے ہوئے یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ ملوک الطوائف کی آزادی سلب کرنے کا نہ سوچیں۔ان کے سفارتی وفد نے مَرّاکش جاکر بیش بہا تحائف کے ساتھ یوسف بن تاشفین کو اپنے حکام کا یہ مراسلہ پیش کیا:

”اگر آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں تو یہ آپ کی کرم نوازی ہوگی نہ کہ کمزوری۔آپ ایسے مقام پر ہیں کہ کسی کو بھی مہربانی میں آپ کی ہمسری نہیں کرنی چاہیے۔آپ ملوک الطوائف کو باقی رہنے دیں تو یہ آپ ہی کی

---

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/۳۱۰تا۳۱۲

حکومت کا تسلسل اور قیام کہلائے گا۔''

یوسف بن تاشفین نے شوریٰ سے مشورہ کر کے ملوک الطوائف کی حدود میں مداخلت نہ کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور جوابی مکتوب میں لکھا:

''آپ اپنی وفاداری کے ذریعے ہماری وفاداری کو برقرار رکھیے۔ اپنے بھائی چارے کے بدلے ہماری طرف سے بھی بھائی چارے کا پیغام قبول کیجیے۔''[1]

اس نامہ وپیام کے بعد یوسف بن تاشفین کی پوری توجہ افریقہ کی فتوحات پر مرکوز رہی اور انہوں نے کبھی اندلس میں مداخلت کی کوشش نہیں کی مگر چند سالوں کے اندر اندر اندلس کے حالات بہت بدل گئے اور الفانسو ششم کی یلغار نے غرناطہ، اشبیلیہ اور قرطبہ کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیا۔

قاضی ابوالولید الباجی رحمہ اللہ اور دیگر علمائے کرام کے مراسلے:

ایسے میں قاضی ابوالولید رحمہ اللہ نے اپنے آخری ایام میں علماء کا ایک وفد بھیج کر امیر یوسف کو اندلس میں آمد کی دعوت دے دی۔ ۴۷۴ھ میں جب قاضی ابوالولید رحمہ اللہ کا انتقال ہوا تو ایک اور جماعت مراکش حاضر ہوئی اور یہی درخواست دہرائی۔ اس بار یوسف بن تاشفین نے مسلمانانِ اندلس کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔[2]

تاہم اس سے پہلے افریقہ میں سرکش قبائل کی مکمل سرکوبی کرنا اور پھر اندلس تک رسائی کے لیے ایک بہترین بندرگاہ حاصل کرنا ضروری تھا۔ یوسف بن تاشفین نے یہ سال مسلسل مہمات میں گزار کر افریقی قبائل کو متحد کر لیا۔ پھر ۴۷۷ھ میں سبتہ کی بندرگاہ فتح کر کے ایک مضبوط بحری بیڑہ تیار کرانا شروع کیا تاکہ سمندر عبور کیا جا سکے۔

سبتہ پر مرابطین کے قبضے کے کچھ ہی دنوں بعد طلیطلہ پر الفانسو ششم کا قبضہ ہو گیا، جس کے بعد علمائے اندلس جوق در جوق سبتہ آنے لگے اور آنسوؤں کے ساتھ مسلمانانِ اندلس پر بیتنے والی قیامت کا حال سنا کر امیر مرابطین سے مدد طلب کرنے لگے جو اس دکھ بھری فریاد کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔[3]

مسلمانانِ اندلس کی قومی تحریک:

علماء کی یہ تحریک ایک قومی مطالبہ بن چکی تھی اور مسلمانانِ اندلس بیک زبان ملوک الطوائف سے مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ اقتدار کے ایوانوں کو ان غیور مجاہدین کے لیے خالی کر دیں جو ان کی عزت وناموس کی حفاظت کر سکیں۔ شعراء بھی اس تحریک میں شامل تھے اور اپنے کلام سے ملوک الطوائف کی غیرت پر چوٹ لگا رہے تھے۔ سمیسر نامی شاعر کے یہ اشعار بچے بچے کی زبان پر تھے:

---

① وفيات الأعيان: ۷/۱۳، ۱۵، ۱۵ط دار صادر
② الزلاقة الزلاقة معركة من معارك الاسلام: ص ۱۸۲
③ نفح الطيب من غصن الاندلس الرطيب للمقرى التلمساني: ۳/ ۳۵۳

وُلِّیتُمْ فَمَا اَحْسَنتُمْ مُذْ وُلِّیتُمْ ...... وَلَاصُنتُمْ عَمَّنْ یَغْزُونَکُمْ عِرْضًا

''تمہیں حکومت ملی مگر تم نے حکمران بن کر اچھا نہ کیا۔ تم اپنے ہی محافظوں سے اپنی عزت بھی نہ بچا پائے۔''

وَکُنتُمْ سَمَاءً لَایُنَالُ مَنَالُهَا ...... فَصِرْتُمْ لَدیٰ مَنْ لَایُنَالُکُمْ اَرْضًا

''تم تو ایسے آسمان تھے جس تک کسی کی رسائی نہ تھی۔ مگر اب تم ان کے نیچے ہو جو تم سے یہ بھی نہیں پوچھتے کہ تم کس زمین کے ہو۔''

سَتَرْجِعُ الْاَیَّامُ مَا اَقْرَضَتْکُمْ ...... اَلَا اِنَّهَا تَسْتَرْجِعُ الدَّیْنَ وَالْقَرْضَا

''زمانہ تمہیں دیا ہوا قرض واپس طلب کرے گا۔ یاد رکھو! وہ اُدھار اور قرض واپس ضرور لیتا ہے۔''[1]

ابن الفرج البیری کہہ رہا تھا:

نَادِ الْمُلُوکَ وَقُلْ لَهُمْ ...... مَاذَا الَّذِیْ اَحْدَثْتُمْ

''حکمرانوں کو پکار کر کہہ دو...... یہ تم نے کیا گل کھلائے۔''

اَسْلَمْتُمُ الْاِسْلَامَ فِیْ ...... اَسْرِ الْعِدیٰ وَقَعَدْتُمْ

''اسلام کو دشمنوں کی قید میں دے کر بیٹھ گئے۔''

وَجَبَ الْقِیَامُ عَلَیْکُمْ ...... اِذْ بِالنَّصَاریٰ قُمْتُمْ

''تم پر جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہونا واجب تھا جبکہ تم نصاریٰ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔''

لَا تُنْکِرُوْا شَقَّ الْعَصَا ...... فَعَصَا النَّبِیِّ شَقَقْتُمْ

''طاقت بکھر جانے پر حیرت نہ کرو۔ کیوں کہ تم نے خود پیغمبر کی اُمت کو توڑ ڈالا ہے۔''[2]

عمر المتوکل کا الفانسو ششم کو جواب:

ایسے میں معتمد سمیت کئی ملوک الطوائف یہ سمجھنے لگے تھے کہ اب انہیں اپنی روش بدل کر ملک وملت کے وسیع تر مفاد کے لیے ہمت کرنا ہوگی ورنہ زمین کا کوئی گوشہ انہیں پناہ نہیں دے گا۔ ملوک الطوائف میں اس وقت صرف بَطَلْیُوس کے حاکم عمر المتوکل اور اشبیلیہ کے معتمد میں کچھ دم خم تھا ورنہ باقی کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ الفانسو ششم کو بھی انہی دونوں سے خطرہ تھا۔ اس نے پہلے عمر المتوکل کو ایک دھمکی آمیز مکتوب بھیج کر سرنگوں ہونے کا حکم دیا مگر المتوکل نے جواب میں لکھا:

''آپ کا مراسلہ جس میں تقدیر اور اللہ عزیز وقدیر کے فیصلوں پر حاوی ہونے کے دعوے تھے، گرجتا چمکتا ہوا موصول ہوا۔ آپ کو اپنی کثیر افواج پر غرور ہے۔ کاش کہ آپ کو پتا ہوتا کہ اللہ کے ایسے لشکر اب بھی موجود ہیں

---

[1] تاریخ الادب الاندلسی عصر الطوائف: ۱/ ۱۳۲؛ نفح الطیب: ۵/ ۲۳۶، ۲۳۷

[2] الذخیرہ فی محاسن اهل الجزیرہ از علی بن بسام الشنترینی: ۲/ ۸۸۵، ط الدار العربیۃ للکتاب لیبیا

جن کے ذریعے وہ اسلام کو عزت دے گا اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو سربلند کرے گا۔ یہ وہ سپاہی ہیں جو اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے ہیں جنہیں کسی کا خوف نہیں۔ رہا آپ کا مسلمانوں کو ان کی کمزوری کا طعنہ دینا! تو یہ ان کے گناہوں کی شامت ہے۔ لیکن اگر اسلامی ممالک متحد ہو گئے تو آپ دیکھے گا کہ ہم آپ کو وہی مزہ چکھائیں گے جس کے گھونٹ آپ کے آباؤ واجداد کو پینے پڑے۔

جہاں تک ہماری ریاست کی بات ہے تو چاہے ہم کم ہوں اور بیرونی مدد سے محروم ہوں، تب بھی ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی سمندر یا پہاڑ حائل نہیں جسے عبور نہ کیا جاسکے۔ ہاں ہمارے پاس وہ شمشیریں ہیں جن کی تیز دھاری کی گواہی تمہاری قوم کی کٹی ہوئی گردنیں دیں گی۔ ہمیں دو کامیابیوں میں سے ایک کا انتظار ہے۔ اگر فتح ہوئی تو اس سے بڑھ کر کیا نعمت ہوگی۔ اگر ہم شہید ہوئے تو جنت سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی ہے۔''[1]

الفانسو کا مراسلہ اور معتمد کا ایمان افروز جواب:

الفانسو کا دوسرا خط معتمد کے نام تھا جس میں تحریر تھا:

''شہنشاہ ملتین، حامی مسیحیت واسلام کی طرف سے معتمد کے نام! خدا تمہاری رائے درست رکھے اور تمہیں حقیقت دکھا دے۔ تم نے طلیطلہ پر چڑھائی کرنے والے لشکر دیکھ لیے۔ تم نے خود اپنے بھائیوں کو بے آسرا رکھا۔ اب جو ہوش میں ہے، پھندے میں آنے سے پہلے ہوشیار ہو جائے۔''

معتمد کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر چکا تھا، اس نے جواب میں ایک نہایت طویل، فصیح و بلیغ اور مسجع و مقفی مکتوب لکھا جس میں اس کی لن ترانیوں پر خاک ڈالتے ہوئے کہا گیا تھا:

''تمہارا دونوں ملتوں کی سربراہی کا دعویٰ درست نہیں، مسلمان اس کے زیادہ اہل ہیں جو اس ملک کے مرکزی شہروں کے مالک رہے ہیں۔ اگر وہ اونگھ رہے تھے تو تمہاری آواز نے انہیں بیدار کر دیا ہے۔ کبھی ناگوار چیز پسندیدہ بات کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ تمہارے باپ دادوں کا ہمارے باپ دادوں کے سامنے جو حشر ہوا تھا اسے کیوں بھول گئے۔ ہم نے تمہارے ساتھ معاہدے کی وجہ سے اپنے بھائیوں کی مدد نہیں کی۔ اب ہم دشمنانِ اسلام سے مسلمانوں کی حفاظت میں کوتاہی پر اللہ سے استغفار کرتے ہیں اور اسی سے مدد مانگتے ہیں۔''[2]

معتمد کا فیصلہ:

معتمد یہ بھی سمجھ چکا تھا، ملوک الطوائف میں سے کوئی بھی الفانسو ششم کے مقابلے کی تاب نہیں لاسکتا، اس لیے اس وقت امیر مراکش سے مدد طلب کیے بغیر کوئی چارہ نہیں، ورنہ نصرانیت کا طوفان پورے اندلس کو بہالے جائے گا۔

یہ وہی تجویز تھی جو قاضی ابوالولید کئی سال پہلے جگہ جگہ پیش کر چکے تھے اور مسلمانانِ اندلس کا ہر فرد اس کے حق میں تھا۔ ملوک الطوائف اس اقدام کی جرأت اس لیے نہیں کرتے تھے کہ کہیں یوسف بن تاشفین الفانسو ششم کو پسپا کرنے

---

[1] التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۳۳۶، ۳۳۷

[2] دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۲/ ۲۷، ۲۸

کے بعد ان کی ریاستوں پر قابض نہ ہو جائے، مگر معتمد یہ خطرہ مول لینے کے لیے بھی تیار ہو گیا۔ اس کے بیٹے اس فیصلے کے مخالف تھے۔ اس کے لاڈلے شہزادے رشید نے کہا: ''ابا جان! آپ ایسے شخص کو اپنے ملک میں مداخلت کا موقع دے رہے ہیں جو ہم سے ہماری حکومت چھین لے گا اور ہمیں پارہ پارہ کر دے گا۔''

معتمد نے کہا: ''بیٹا! میں نہیں چاہتا کہ دنیا میں کل یہ کہا سنا جائے کہ معتمد نے اندلس کو کفریہ ملک میں تبدیل کر دیا، اسے نصاریٰ کے حوالے کر دیا۔ میں نہیں چاہتا کہ دنیا مجھے لعنت ملامت کرے۔ اللہ کی قسم! مجھے خنزیروں کی گلہ بانی کی بجائے اونٹ چرانا زیادہ پسند ہے۔''

معتمد کے علاوہ بطلیوس کا امیر المتوکل اور دانیہ کا دلیر حاکم معتصم بھی یوسف بن تاشفین کو بلانے کے حامی تھے۔ غرناطہ کا نوجوان بربری حاکم عبداللہ بن بلقین بھی (جو ۴۶۵ھ میں اپنے دادا بادیس بن حبوس کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا تھا) اس کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھ رہا تھا۔[1]

اتفاقِ رائے کے لیے معتمد کی تقریر:

اگرچہ ایسے امراء بھی کم نہ تھے جو مرابطین کی اندلس میں آمد کے خلاف تھے، ان میں مالقہ کا حاکم ابن سکوت پیش پیش تھا۔ قومی اتفاقِ رائے حاصل کرنے کے لیے قرطبہ میں معتمد کی صدارت میں اندلس کے سیاست دانوں اور علماء کا ایک تاریخی اجلاس ہوا۔ اکثریت یوسف بن تاشفین کو بلانے کی حامی تھی لہٰذا اصلاح و مشورے کے بعد یوسف بن تاشفین کو اندلس بلانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ جو امراء اب بھی تذبذب میں تھے، انہیں قائل کرنے کے لیے معتمد نے خود ایک تقریر کی اور کہا:

> ''اس وقت ایک بات مشکوک ہے اور ایک یقینی۔ مشکوک بات یہ ہے کہ اگر ہم الفانسو یا امیر یوسف میں سے کسی ایک کی پشت پناہی حاصل کریں تو ہمارے مفادات محفوظ رہیں گے یا نہیں۔ ممکن ہے الفانسو یا امیر یوسف ایفائے عہد کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بدعہدی کریں۔ ہاں ایک بات یقینی ہے، وہ یہ کہ اگر ہم امیر یوسف کی پشت پناہی حاصل کریں تو اللہ راضی رہے گا۔ الفانسو کی سرپرستی حاصل کریں گا تو اللہ ناراض ہوگا۔ پس ہم اللہ کی رضامندی کی یقینی صورت کو کیوں ترک کریں؟ مشکوک بات کیوں اختیار کریں؟''[2]

اس گفتگو نے تمام مخالفین کے منہ بند کر دیے۔

امیر یوسف کے نام اندلس کے حکام کا مراسلہ:

اب ایک مکتوب لکھا گیا جس میں امیر مرابطین سے درخواست کی گئی کہ وہ اندلس کے مسلمانوں کو نصرانیوں سے بچانے کے لیے الفانسو ششم سے فیصلہ کن جنگ لڑے۔ اشبیلیہ کے وزیر ابن زیدون کو سفارتی وفد کا سربراہ بنایا گیا،

---

① دولة الإسلام في الأندلس، لعبد الله عنان المصري: ۳/ ۷۷ تا ۷۹
② نفح الطيب من غصن الأندلس الرطيب، للمقري التلمساني: ۴/ ۳۵۹

اس کے ساتھ قرطبہ، غرناطہ اور بطلیوس کے قاضی حضرات بھی تھے۔[1]

یہ وفد سبتہ میں جا کر یوسف بن تاشفین سے ملا تو اس مردِ مجاہد نے مراسلہ پڑھ کر کہا:

''میں دینِ اسلام کی نصرت کے لیے سب سے پہلے لبیک کہتا ہوں۔ اس کام کو میں خود انجام دوں گا۔''[2]

یوسف بن تاشفین کے مطالبے پر معتمد نے مرابطین کے لیے جزیرۃ الخضراء خالی کرا دیا تاکہ وہ آمد و رفت کے لیے ایک پُل اور چھاؤنی کا کام دے سکے۔[3]

یوسف بن تاشفین کی اندلس آمد اور استقبال:

یوسف بن تاشفین نے ۱۵ ربیع الاول ۴۷۹ھ میں ایک سو جہازوں پر مشتمل بیڑے کے ذریعے جزیرۃ الخضراء کا رخ کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ سال کے قریب ہو چکی تھی مگر ان کی جسمانی اور ذہنی قوتیں جوان تھیں۔

بیڑا خلیج کے بیچوں بیچ تھا کہ اچانک طوفان آ گیا اور ہولناک لہریں کشتیوں کو بُری طرح اچھالنے لگیں۔ یوسف بن تاشفین نے ہاتھ بلند کر کے دعا کی:

''الٰہی! اگر یہ سفر مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ہے تو ہمارے لیے سمندر عبور کرنا آسان کر دے۔ اگر ایسا نہیں تو مجھے سمندر عبور نہ کرنے دے۔''

اسی وقت لہریں تھم گئیں اور سمندر پر سکون ہو گیا۔ جزیرۃ الخضراء پر اترنے والی پہلی کشتی امیر داؤد بن عائشہ کی تھی اور آخری امیر یوسف کی۔ امیر یوسف نے اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی سجدۂ شکرانہ کیا۔

یہاں معتمد کے بیٹے سمیت نامی گرامی امراء اور علماء استقبال کے لیے موجود تھے۔ جزیرۃ الخضراء مرابطین کا کیمپ بن گیا۔ قلعہ امیر کے لیے خالی کر دیا گیا۔[4]

اس کے بعد معتمد اپنے محافظ دستے کے جلو میں بیش قیمت تحائف کے ساتھ مرابطین کی چھاؤنی پہنچا اور یوسف بن تاشفین سے ملا۔ دونوں نے گرم جوشی کے ساتھ معانقہ کیا اور جہاد کی ترتیب کے لیے صلاح مشورہ کرنے لگے۔[5]

الفانسو ششم کا مراسلہ اور یوسف بن تاشفین کا جواب:

اس سے قبل الفانسو طُلَیطُلہ کے خزانے لوٹ کر فارغ ہو چکا تھا اور اب شمالی اندلس کی اسلامی ریاست سرقسطہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا جہاں کے حکمران یوسف مؤتمن کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا بیٹا المستعین ابھی ابھی تخت پر بیٹھا تھا۔ الفانسو ششم کی پیش کش تھی کہ وہ مسلمانوں پر شرعی احکام کے مطابق حکومت کرے گا اور انہیں ہر قسم کی آزادی مہیا

---

① الزلاقۃ معرکۃ من معارک الاسلام للمصری جمیل عبداللہ محمد: ص ۱۸۳

② المعجب فی تلخیص اخبار المغرب، لعبدالواحد المراکشی: ص ۱۳۲

③ الزلاقۃ معرکۃ من معارک الاسلامیۃ: ص ۱۸۳

④ الزلاقۃ معرکۃ من معارک الاسلام: ص ۱۸۳، ۱۸۵

⑤ نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۳/ ۳۶۲

کرے گا اور شرعی ٹیکس کے سوا اُن سے کچھ نہیں لے گا۔ اُدھر مستعین کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح الفانسو ششم کو واپسی پر تیار کرلے۔ اس نے الفانسو ششم کو بھاری خراج کی پیش کش کی مگر الفانسو ششم نہ مانا۔ اُس کا کہنا تھا کہ وہ قسم کھا کر آیا ہے کہ وہ سرقسطہ پر قبضہ کرکے دم لے گا، ورنہ مر جائے گا۔

سرقسطہ کے محاصرے کو کئی ماہ گزر گئے تھے اور اب سرقسطہ کے لوگوں کا دم لبوں پر تھا کہ اچانک ۴۷۹ھ کے اوائل میں امیر مرابطین کے اندلس میں داخل ہونے کی خبر پھیل گئی۔ الفانسو کو جونہی یہ اطلاع ملی، اُس نے یوں ظاہر کرتے ہوئے کہ جیسے وہ مرابطین کی آمد سے لاعلم ہے، مستعین کو پیغام بھیج دیا کہ وہ خراج لے کر واپسی پر تیار ہے۔

مستعین کو بھی مرابطین کی آمد کی خبر مل چکی تھی۔ اس نے جواب دیا: ''اب تمہیں ایک درہم بھی نہیں ملے گا۔''

الفانسو ششم کے پاس اب ٹھہرنے کا کوئی وقت نہ تھا۔ وہ فوراً محاصرہ ختم کرکے واپس ہو گیا اور تیزی سے اپنی افواج جمع کرنے نکل کھڑا ہوا۔ [1]

خود دیکھ لو گے:

پھر اس نے ایک زرخرید مسلمان ادیب سے ایک طویل مکتوب لکھوا کر امیر کو بھیجا جس میں اپنی قوت وطاقت اور شان وشوکت کی شیخیاں بگھاری گئی تھیں اور بُرے انجام سے ڈرایا گیا تھا۔ یوسف بن تاشفین نے یہ خط دیکھ کر معتمد کے کاتب ابن قصیرہ کو جواب لکھنے کا حکم دیا، اس نے ایک طویل مراسلہ لکھ دیا جس میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہائے گئے تھے اور الفانسو ششم کی ایک ایک ڈینگ کا جواب دیا گیا تھا۔

یوسف بن تاشفین نے اس جوابی خط پر نگاہ ڈالی تو اسے مسترد کرتے ہوئے کہا: ''یہ بہت طویل جواب ہے۔''

پھر اس نے الفانسو کا مراسلہ منگوایا اور اس کی پشت پر لکھوایا: ''جو ہوگا، وہ تم بہت جلد خود دیکھ لو گے۔''

الفانسو ششم یہ جواب پڑھ کر کانپ گیا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ اب اس کا مقابلہ خوابوں میں پلنے والے کسی شاعر سے نہیں، ایک عملیت پسند انسان سے ہے۔ [2]

الفانسو ششم کا خواب:

انہی دنوں الفانسو ششم نے خواب دیکھا کہ وہ ایک ہاتھی پر سوار ہے، جس کے آگے نقارہ بندھا ہے، ہاتھی چلتے ہوئے اپنی سونڈ اس نقارے پر مارتا ہے جس سے نہایت بھیانک آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس نے پادریوں سے اس کی تعبیر پوچھی مگر وہ اسے مطمئن نہ کرسکے۔ آخر الفانسو ششم نے ایک یہودی کو تعبیر لینے طُلیطلہ کے ایک مسلمان عالم کے پاس بھیجا۔ ساتھ ہی یہ تاکید کی کہ مسلمان عالم پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ یہ کس کا خواب ہے۔

یہودی نے عالم کے پاس جا کر اس طرح یہ خواب سنایا جیسے اس نے خود دیکھا ہو۔ عالم نے جواب دیا:

---

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/۲۸۶، ۲۸۷ [2] نفح الطیب: ۴/ ۳۶۱

"یہ ایسے شخص کا خواب ہے جو اصحاب فیل کی طرح ہلاک ہوگا۔"[1]

الفانسو ششم وقتی طور پر پریشان ہوا مگر جب اس کی پکار پر نہ صرف جلیقیہ، بشکونیہ، آسٹریاس، قسطالیہ، ارغون، لیون اور جبلونہ کی افواج ایک جگہ جمع ہوگئیں بلکہ فرانس، انگلینڈ، جرمنی اور اٹلی سے بھی ہزاروں رضا کار اس کے لشکر کا حصہ بننے چلے آئے تو اس کے تمام خدشات دور ہو گئے، اس نے نہایت غرور و تکبر کے ساتھ کہا:

"اس لشکر کے ساتھ میں انسانوں ہی نہیں جنات اور فرشتوں سے بھی لڑ سکتا ہوں۔ یہ لشکر لے کر میں محمد (ﷺ) کے خدا سے ٹکرا سکتا ہوں۔" (نعوذ باللہ)[2]

مرابطین کی پیش قدمی:

یوسف بن تاشفین نے پہلے مشرقی اندلس کا رخ کیا کیوں کہ ان سخت ترین حالات میں بھی ملوک الطوائف کے مابین کشیدگی باقی تھی جسے دور کرنا ضروری تھا۔ معتمد مُرسیہ پر اپنا حق جتاتا تھا مگر اس وقت وہاں ایک رئیس ابن رشیق قابض تھا۔ یوسف بن تاشفین نے ابن رشیق اور معتمد میں صلح کرا دی جس کے مطابق مُرسیہ معتمد کو واپس مل گیا اور ابن رشیق کو اشبیلیہ کے مضافات میں ایک جاگیر دے دی گئی۔ اس دوران غرناطہ میں عبداللہ بن بلقین اور المریہ میں معتصم بن صمادح سے بھی ملاقات ہوئی، سب نے امیر کا خیر مقدم کیا۔

یوسف بن تاشفین نے چند دنوں بعد الفانسو ششم سے ٹکر لینے کے لیے اشبیلیہ کے شمال مشرق کی طرف پیش قدمی کی۔ اشبیلیہ کے پاس سے گزرتے ہوئے معتمد نے مشورہ دیا کہ کچھ دن شاہی محل میں گزار کر تازہ دم ہو جائیں مگر امیر یوسف نے کہا "میں جہاد کی نیت سے آیا ہوں۔ جہاں دشمن ہوگا میں وہیں جاؤں گا۔"[3]

معرکۂ زلاقہ:

یہ لشکر بطلیوس پہنچا جہاں عمر المتوکل نے خیر مقدم کیا اور لشکر کو ہر ممکن سہولت پہنچائی۔ مسلمانوں کی پیشہ ور افواج کی تعداد لگ بھگ بیس ہزار تھی۔ اس کے علاوہ اندلس کے کونے کونے سے آنے والے کئی ہزار مزید رضا کار بھی شامل تھے۔ امیر یوسف نے مقامی امراء کے مشورے سے بطلیوس سے ۸ میل شمال مشرق میں دریائے تاجہ کے قریب ایک میدان منتخب کیا جسے مسلم مؤرخین "الزلاقہ" اور اہل یورپ "ساکرالیاس" کہتے ہیں۔[4]

اُدھر الفانسو ششم نے بے پناہ تیاریوں کے ساتھ ۸۰ ہزار سپاہی لے کر زلاقہ کا رخ کیا اور دریائے تاجہ کے پار خیمے گاڑ دیے۔ یوسف بن تاشفین نے اس کی آمد کی خبر سن کر اسے یہ پیغام بھیجا:

"الفانسو! ہمیں پتا چلا ہے کہ تم ہم سے تصادم کی دعا کرتے تھے، تمہاری تمنا تھی کہ تم سمندر عبور کر کے ہم

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۴۷۹ھ

② المعجب فی تلخیص اخبار المغرب، لعبدالواحد المراکشی: ص ۱۳۲ ③ المعجب فی تلخیص اخبار المغرب: ص ۱۳۲

④ آج کل یہ جگہ پرتگال میں ہے۔

تک پہنچتے۔ لو ہم خود سمندر پار آ گئے ہیں۔ اللہ نے ہمیں اور تمہیں اس میدان میں اکٹھا کر دیا ہے۔ تم اپنی دعا کا نتیجہ عن قریب دیکھ لو گے: وَمَا دُعَاءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝ کافروں کی دعا بس اکارت جانے والی ہے۔"[1]

یہاں اسلامی لشکر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ملوک الطوائف کی افواج نے جن کی قیادت معتمد کے ہاتھ میں تھی، یوسف بن تاشفین کے حکم سے اپنی خیمہ گاہ ایک سطح مرتفع پر اس طرح لگائی کہ وہ نصرانیوں کو اور نصرانی انہیں دیکھ سکیں۔ اس سے کوئی تین میل جھاڑیوں سے بھری ایک پہاڑی کے پیچھے مرابطین کا کیمپ تھا۔

معتمد اور مرابطین کے درمیان رابطے کا تیز ترین انتظام تھا۔ امیر کا منصوبہ یہ تھا کہ نصرانیوں کو مسلمانوں کی فوج کی تعداد معلوم نہ ہونے پائے۔ اپنی فوج کم دکھا کر اسے دھوکہ دیا جائے، نیز ملوک الطوائف کو آگے رکھا جائے تا کہ وہ میدان جنگ سے ہٹنے نہ پائیں۔ لہٰذا معتمد نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ کوئی انجان آدمی کسی بہانے لشکر کے آس پاس نہ پھٹکے۔ معتمد خود اس کام کی نگرانی کرتے ہوئے پڑاؤ کے چاروں طرف گھومتا رہا۔ اس کے جاسوس الفانسو ششم کی خیمہ گاہ میں متحرک ہو گئے تا کہ دشمن کی جنگی حکمتِ عملی معلوم کر سکیں۔

ایک دن جاسوسوں نے اطلاع دی کہ علی الصبح نصرانی فوج حملہ کرنے والی ہے۔ مسلمان بھی لڑائی کے لیے تیار ہو کر میدان میں نکل آئے مگر الفانسو ششم نے یہ خبر مسلمانوں کی اصل تعداد جاننے کے لیے پھیلائی تھی، تاہم اس کی تدبیر کارگر نہ ہوئی کیوں کہ مقابلے میں صرف ملوک الطوائف کی فوج نکلی تھی جسے دیکھ کر مسلمانوں کی تعداد کے متعلق الفانسو ششم کی غلط فہمی مزید بڑھ گئی۔

جنگ کے لیے ہفتے کا دن طے ہوا تھا مگر الفانسو ششم بے خبری میں مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتا تھا، اس نے معتمد کو یہ پُرفریب پیغام بھیجا: "جمعہ آپ کا مقدس دن ہے، ہفتہ یہودیوں کا ہے جو ہمارے منشی، وزیر اور ملازم ہیں۔ اتوار ہماری عبادت کا دن ہے۔ جنگ اس کے بعد پیر کے دن رکھی جائے۔"

اس کے بعد الفانسو ششم نے اپنی عسکری کونسل سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: "اس جنگ کی آگ بھڑکانے والا شخص معتمد ہے۔ افریقہ کے صحرا نشیں اگرچہ مضبوط اور جنگجو ہیں مگر وہ ہماری سرزمین سے واقف نہیں۔ ان کی کمان معتمد کر رہا ہے۔ تم اسے ہدف بنا لینا۔ اگر اس کے قدم اکھڑ گئے تو پھر باقی سب کا صفایا آسان ہے۔"

جاسوسوں نے یہ گفتگو اُچک لی۔ نصرانیوں کے پڑاؤ میں غیر معمولی گہما گہمی سے بھی اندازہ ہو گیا کہ کل جنگ ہو گی۔ جاسوسوں نے یہ ساری خبریں معتمد کو جا سنائیں۔ اسی رات معتمد کی فوج میں شامل قرطبہ کے ایک فقیہ احمد بن رُمیلہ رحمہ اللہ کو خواب میں آقائے نامدار ﷺ کی زیارت ہوئی۔ آپ ﷺ نے انہیں کل صبح شہادت کی خوشخبری دیتے ہوئے مسلمانوں کے لیے فتح کی نوید سنائی۔ پھر فقیہ کے سر پر تیل لگایا اور خوشبو ملی۔

معتمد نے فوراً یوسف بن تاشفین کو یہ اطلاعات بھیج دیں اور خبردار کیا کہ دشمن کل اچانک حملہ کر سکتا ہے۔

---

[1] سورۃ النحل، آیت: ۱۴

اس اطلاع پر مسلمان رات بھر چوکنا، بیدار اور جنگ کے لیے تیار رہے۔ یوسف بن تاشفین کے حکم سے مرابطین کے دس ہزار گھڑ سوار داؤد بن عائشہ کی قیادت میں ہراول کے طور پر سب سے آگے تعینات کر دیے گئے۔

جمعہ ۱۲ رجب ۴۷۹ھ کی صبح نصرانیوں کی خیمہ گاہ سے سپاہیوں کا ایک سیلاب امنڈ پڑا جس کا تصادم سب سے پہلے داؤد بن عائشہ کے ہراول دستوں سے ہوا۔ ابن عائشہ نے نہایت پامردی سے مزاحمت کی اور نصرانیوں کی سینکڑوں لاشیں گرا کر اس طوفان خیز لہر کا زور توڑنے کی پوری کوشش کی تاہم حریف بے پناہ افرادی طاقت کے بل پر آگے بڑھتا رہا۔ اس دوران خیمہ گاہ میں اطلاع پہنچ گئی کہ دشمن یلغار کر رہا ہے۔ مسلمان نماز فجر سے فارغ ہو کر تیزی سے صف بندی کرنے لگے۔ اشبیلیہ کی فوج قلب میں معتمد کی کمان میں کھڑی ہوگئی۔ دائیں بازو میں عمر المتوکل اور بائیں بازو میں مشرقی شہروں کے امراء اپنے دستے لیے تیار ہوگئے۔ پہاڑی کے پیچھے مرابطین کی فوج تھی اور اس کی چوٹی پر کھڑے یوسف بن تاشفین نے میدان جنگ پر نگاہیں جما رکھی تھیں۔

الفانسو کے اشارے پر البار ہانیس، کاؤنٹ جارسیان اور کاؤنٹ راڈرک اپنے دستوں کے ساتھ ملوک الطوائف کی فوج پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ مسلمانوں کے سینکڑوں افراد اسے روکنے کی کوشش میں شہید ہوئے، ملوک الطوائف میں سے غرناطہ، المریہ اور بطلیوس کے کئی دستے پیچھے ہٹ کر بطلیوس کی طرف بھاگ نکلے۔

معتمد کا بیٹا عبداللہ بھی فرار ہوگیا مگر معتمد نہایت جانبازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈٹا رہا۔ اپنے بادشاہ کو یوں لڑتا دیکھ کر اشبیلیہ کے سپاہیوں نے قدم جمالیے۔ معتمد دیر تک ایک خاندانی عرب کی طرح لڑتا رہا۔ اس دوران اس کے دو گھوڑے زخمی ہو کر ڈھیر ہوئے۔ وہ خود لہو میں نہا گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ اور پہلو پر زخم آئے۔ پھر شمشیر وسناں کے جوہر دکھاتے ہوئے اچانک اس کے خود پر تلوار کی ایسی ضرب لگی کہ سر کنپٹی تک گھائل ہوگیا۔ وہ اشبیلیہ میں اپنے کم سن بچے ابو ہاشم کو سخت بیماری کی حالت میں چھوڑ آیا تھا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

اَبَا هَاشِمٍ هَشَّمَتْنِي الشِّفَارُ ..... فَلِلّٰهِ صَبْرِيْ لِذَاكَ الْأُوَارِ

''ابو ہاشم! تیز دھار تلوار نے میرا سر پھاڑ دیا..... پس اس تپش پر میرا صبر اللہ ہی کی عطا ہے۔''

ذَكَرْتُ شُخَيْصَكَ تَحْتَ الْعَجَاجِ ..... فَلَمْ يَثْنِنِيْ ذِكْرُهٗ لِلْفِرَارِ

''مجھے گرد وغبار کے بادلوں میں تمہارا ننھا منا وجود یاد آگیا..... مگر یہ یاد مجھے فرار پر آمادہ نہ کر سکی۔''

مرابطین کے مقدمۃ الجیش کے قائد داؤد بن عائشہ نے معتمد کو نرغے میں دیکھا تو فوراً اپنے دستوں کے ساتھ مدد کو پہنچا اور نصرانیوں کو پیچھے ہٹایا۔[1]

اُدھر یوسف بن تاشفین بلندی سے جنگ کا سارا منظر دیکھ رہے تھے اور سمجھ چکے تھے کہ الفانسو ششم اپنی ساری

---

[1] نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۴/ ۳۶۶

طاقت میدان جنگ میں اتار چکا ہے۔ ان کی جنگی حکمت عملی یہ تھی کہ اس قہر انگیز جنگ کو شام تک حتمی نتیجے تک پہنچا دیا جائے مگر فیصلہ کن معرکے سے پہلے دشمن کو اچھی طرح تھکا دیا جائے۔

اس دوران معتمد اپنے منشی ابن قصیرہ کو امیر یوسف کی طرف دوڑا چکا تھا تاکہ کمک حاصل کی جائے۔ ابن قصیرہ کے آتے ہی امیر یوسف نے فوراً چند دستے روانہ کر دیے تاکہ اشبیلیہ کی فوج کے قدم جم جائیں۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے اپنے چچازاد سیر بن ابوبکر کو بربروں کے بہترین اور تازہ دم دستوں کے ساتھ نصرانیوں کی طرف بھیجا۔

سیر بن ابوبکر قسطالیہ کے ہراول دستوں پر حملہ آور ہوا جو تجربہ کار نصرانی ''کمانڈر البار ہانیس'' کی کمان میں تھے۔ بہت جلد کمانڈر کو اندازہ ہو گیا کہ وہ مرابطین کے طریق جنگ سے بالکل ناواقف ہے۔ وہ سیر بن ابی بکر کے شدید حملے کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹنے لگا۔ ادھر ملوک الطوائف کے مفرور سپاہی بھی پانسہ پلٹتا دیکھ کر واپس آنے لگے اور اپنی صفوں کو دوبارہ مرتب کر لیا۔ دیر تک گھمسان کی جنگ جاری رہی، کبھی مسلمان آگے بڑھتے اور کبھی نصرانی انہیں دھکیلتے چلے جاتے۔ ملوک الطوائف کے دستے پہلی بار جری ہو کر نصرانیوں سے سابقہ ذلتوں کا بدلہ لے رہے تھے۔

اس دوران الفانسو ششم خود میدان جنگ میں کود پڑا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جنگ کی اصل کمان معتمد نہیں، مرابطین کے امیر کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے دستوں کے ساتھ چکر کاٹ کر پہاڑی کے پیچھے مرابطین کے پڑاؤ تک جا پہنچا مگر اتنی دیر میں یوسف بن تاشفین خود لمتونہ اور صنہاجہ قبائل کے سخت جان سپاہیوں کے ساتھ نصرانیوں کے عقب میں پہنچ چکے تھے۔ آناً فاناً انہوں نے نصرانی کیمپ کے محافظ سپاہیوں کو تہ تیغ کر کے خیموں کو نذر آتش کر ڈالا۔

الفانسو ششم نے اپنی خیمہ سے دھوئیں کے مرغولے اٹھتے دیکھے تو حواس باختہ ہو کر پلٹا اور ایک طویل چکر کاٹ کر مرابطین تک پہنچ گیا مگر مرابطین کی صفیں اس کی توقع کے برخلاف نہایت منظم اور مضبوط تھیں۔

اب بگل بجائے گئے اور مسلمان اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے صلیب کے پجاریوں پر ٹوٹ پڑے۔ مرابطین کے سینکڑوں نقارچی افریقی وضع کے ڈھول پیٹ رہے تھے جن کی گونج سے ارض و سماء کے ساتھ نصرانیوں کے دل بھی دہل رہے تھے۔

کچھ دیر حریف کو تھکانے کے بعد یوسف بن تاشفین کے اشارے پر مرابطین ایک طرف ہو گئے اور الفانسو ششم تیزی سے اپنی خیمہ گاہ تک پہنچ گیا جس کا بیشتر حصہ خاکستر ہو چکا تھا۔ اتنے میں مرابطین بھی الفانسو ششم کے پیچھے پیچھے اس کی خیمہ گاہ میں گھس گئے اور پشت سے اس پر دھاوا بول دیا۔ الفانسو ششم نے تیزی سے اپنے سپاہیوں کو از سر نو مرتب کیا اور جوابی حملہ کر دیا۔ مرابطین اپنے امیر کے حکم پر ایک بار پھر دائیں بائیں ہو گئے اور الفانسو اپنے لشکر کے پاس پہنچ گیا۔ اسی لمحے امیر یوسف نے ایک بار پھر الفانسو پر عقب سے حملہ کر دیا۔ اس طرح نصرانی ایک طرف سے ملوک الطوائف اور دوسری طرف سے مرابطین کے درمیان پسنے لگے۔

امیر یوسف کے حکم سے اونٹوں کو صفوں میں سب سے آگے رکھا گیا تھا جن کی بلبلاہٹ سے نصرانی ناتوں کے

گھوڑے بدک رہے تھے کیوں کہ اندلس میں یہ نیا جانور تھا۔ مرابطین کی حکمتِ عملی حریف کو تھکا کر بے بس کرنے کی تھی۔ وہ بار بار حملے کر کے پیچھے ہٹتے اور نصرانیوں کو اپنے پیچھے دوڑنے پر مجبور کرتے۔ عصر تک جنگ پوری شدت سے جاری رہی۔ یوسف بن تاشفین اس دوران اپنے برق رفتار گھوڑے پر آندھی کی طرح میدان جنگ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا رہے تھے۔ ان کی آواز ہر طرف گونج رہی تھی:

''مسلمانو! اللہ کے دشمن کافروں کے مقابلے میں استقامت اختیار کرو۔ جسے شہادت نصیب ہوئی، اسے جنت ملی۔ جو زندہ بچا، وہ ثواب اور غنیمت پائے گا۔''

اس دن تین گھوڑوں نے امیر کی شہسواری کی تاب نہ لا کر دم توڑا تھا۔ غروب آفتاب کے قریب یوسف بن تاشفین نے جنگ کے اختتام کا فیصلہ کیا اور اپنی سب سے نادر طاقت کو استعمال کیا۔

یہ سوڈان کے چار ہزار دیوہیکل سیاہ فام جنگجو تھے جو ہر رکاوٹ کو تہس نہس کرنا جانتے تھے۔ یوسف بن تاشفین نے انہیں ساتھ لیا اور حریف کی اُدھڑی ہوئی صفوں کو تتر بتر کرتے ہوئے الفانسو ششم تک پہنچ گئے۔ ایک سوڈانی کا خنجر الفانسو کی ران پر لگا اور وہ زخمی ہو کر میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ اب اس کے ساتھ صرف پانچ سو آدمی رہ گئے تھے۔ رات کی تاریکی میں الفانسو اور اس کے زخمی ساتھی ٹیلوں اور کھائیوں میں پناہ لیتے ہوئے طلیطلہ کی طرف نکل گئے۔ الفانسو طلیطلہ پہنچا تو اس کے ساتھ لگ بھگ سو آدمی رہ گئے تھے۔ باقی زخموں کی تاب نہ لا کر راستے میں مر گئے تھے۔

زلاقہ کے میدان میں نصرانیوں کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان کی کٹی ہوئی کھوپڑیوں کے ڈھیر کئی کئی گز اونچے تھے جن پر چڑھ کر مؤذن صدائے توحید و رسالت بلند کر رہے تھے۔ مسلمانوں میں سے بھی ہزاروں افراد نے جامِ شہادت نوش کیا تھا جن میں چوٹی کے وہ علماء اور محدثین بھی شامل تھے جو اس جہاد کے محرک بھی تھے اور صفِ اوّل میں لڑنے والے بھی۔ ان میں علامہ احمد بن رمیلہ رحمہ اللہ بھی تھے جنہوں نے جنگ سے پہلے خواب میں حضور ﷺ سے فتح کی بشارت سنی تھی۔ اندلس کے مشہور ترین محدث علامہ ابن حزم ظاہری کے بیٹے علامہ ابو رافع رحمہ اللہ اور مراکش کے قاضی علامہ عبدالملک مصمودی رحمہ اللہ بھی شہادت سے سرفراز ہوئے۔

امیر یوسف بن تاشفین نے زلاقہ میں نصرانیوں کی طاقت کو فنا کر کے اسلامیانِ اندلس کو نصرانیوں کی غلامی کے خطرے سے نجات دلا دی۔ اس جزیرہ نما کا ہر فرد ان کا مشکور و ممنون تھا۔ ایک مورخ کا کہنا ہے:

''یہ یرموک اور قادسیہ کی طرح ایسا دن تھا جس کی مثال نہیں سنی گئی۔ کیا کہنے یہ کیسی عظیم الشان فتح تھی اور عزت و توقیر کا یہ کتنا بڑا دن تھا۔ اہلِ اسلام کے قدم جو ڈگمگا رہے تھے، زلاقہ کے معرکے کے بعد ایک بار پھر جم گئے۔ تاریکی کی لپیٹ میں آیا ہوا حق ایک بار پھر روشن ہو گیا۔ اس جزیرہ نما کی سانسیں بحال ہو گئیں اور یہاں کے لوگ ایک بار پھر سربلند ہو گئے۔''

امیر نے یہ جنگ محض اللہ کی رضا اور جہاد کے فریضے کی ادائیگی کے لیے لڑی تھی۔ ان کے اخلاص اور حسن نیت

کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ معرکے میں حریف کے چھوڑے ہوئے مال و دولت، اسلحے، سواریوں اور دیگر ساز و سامان کے انبار یہ کہہ کر ملوک الطوائف کے حوالے کر دیے کہ میرا مقصد صرف جہاد اور ثواب تھا۔ ①

فتح مبین کی مبارکباد:

یوسف بن تاشفین نے جنگ کے بعد معتمد بن عباد کو جس کے جسم پر جگہ جگہ پٹیاں بندھی تھیں، اس کی بہادری اور ثابت قدمی پر مبارک باد دی۔ الجزائر کے حکمران معز بن بادیس کو اس فتح کی خوشخبری پر مشتمل مکتوب میں بھی معتمد کی بہت تعریف کی۔ ②

معتمد نے میدان جنگ سے اشبیلیہ میں اپنے اہل خانہ کو فتح کا بشارت نامہ بھیجا جس میں تحریر تھا:

''اللہ نے اپنے دین کی مدد کی، کفار و مشرکین کو ہزیمت ہوئی، الفانسو کا لشکر تباہ ہو گیا۔ اہل ایمان نے ان کی کھوپڑیوں کو مینار بنا کر اذانیں دیں۔ مجھے چند معمولی زخموں کی تکلیف تھی جو اس فتح کے بعد دور ہو گئی۔ حمد و ستائش اور احسان اللہ ہی کا ہے۔ والسلام۔'' ③

عالم اسلام کے کونے کونے سے علماء نے یوسف بن تاشفین کو ان فتوحات پر مبارک باد دی۔ امام غزالی نے اپنے مکتوب میں لکھا:

''محمد بن محمد الغزالی کی طرف سے ابویعقوب یوسف بن تاشفین کے نام۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ سات آدمیوں کو اللہ قیامت کے دن جب کوئی سایہ نہ ہوگا اپنے عرش کا سایہ نصیب کریں گے۔ ان میں پہلا شخص عادل حکمران ہوگا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ امیر محترم بھی ان میں ہوں گے کہ اللہ نے آپ کو سلطنت بھی دی ہے اور اسے عدل و انصاف سے مزین بھی کیا ہے۔ جناب کی نیک سیرتی کی شہرت چہار سو پھیل چکی ہے۔ اندلس کے مسلمان مشرکین کے غلبے کی وجہ سے ذلت و خواری کا شکار تھے اور مسلم امراء اقتدار کی خاطر باہمی لڑائیوں میں مشغول تھے۔ ایسی حالت میں انہوں نے آپ کو پکارا تو آپ لبیک کہہ کر سمندر پار آئے اور جہاد کا حق ادا کر دیا۔ اللہ نے آپ کو مشرکین کے قلع قمع کی توفیق دی۔ دعا ہے کہ اللہ امیر کی حکومت اور ان کی تائید کو ہمیشہ باقی رکھے۔'' ④

یوسف بن تاشفین کی واپسی اور اس کی وجوہ:

امیر یوسف نے جنگ کے بعد معتمد کی دعوت پر کچھ دن اشبیلیہ میں گزارے۔ اس دوران انہیں مراکش میں اپنے بڑے بیٹے ابوبکر کی وفات کی اطلاع ملی۔ انہوں نے فوراً مراکش کے لیے رخت سفر باندھ لیا اور تیزی سے سمندر عبور

---

① معرکۂ زلاقہ کی تفاصیل کے قدیم مآخذ: الکامل فی التاریخ: سنة ۴۷۹ھ، المعجب فی تلخیص اخبار المغرب: ۱/ ۹۹ تا ۱۰۱؛ نفح الطیب: ۳/ ۳۶۰ تا ۳۷۰؛ وفیات الاعیان: ۷/ ۱۱۵ تا ۱۱۷، ط دار صادر۔
جدید مآخذ: الزلاقة معرکة من معارک الاسلام: ص ۱۹۰ تا ۱۹۵؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۳۱۵ تا ۳۲۳

② دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۳۲۹ ③ نفح الطیب: ۳/ ۳۶۹

④ دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۳۳۱ تا ۳۳۳، ملخص از مکتوب امام غزالی

کر کے اپنے وطن لوٹ گئے۔ البتہ انہوں نے اپنے جرنیل سیر بن ابوبکر کو چند ہزار سپاہیوں کے ساتھ ملوک الطوائف کی شمالی سرحدوں پر تعینات کر دیا تھا۔[1]

بعض مغربی مؤرخین اس اقدام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر امیر نے اندلس میں ٹھہر کر شمال کی طرف پیش قدمی جاری رکھی ہوتی تو سارا یورپ مسلمانوں کے قبضے میں چلا جاتا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یوسف بن تاشفین کے پاس واپسی کی قوی وجوہ تھیں۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ملوک الطوائف کا باہمی بغض وعناد، نصرانیوں کے اتنے بڑے خطرے اور جہاد کی ایسی اہم مہم کے درمیان بھی ختم نہیں ہوا تھا، صرف دب گیا تھا۔ اس فتح کے بعد بھی ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ نصرانیوں کے علاقے میں پیش قدمی کے لیے مخلصانہ اور مجاہدانہ انداز میں مرابطین کا ساتھ دیتے۔ یوسف بن تاشفین کو اندازہ تھا کہ ان آرام پسند امراء کی طبیعت کسی طویل مہم کو برداشت نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے زلاقہ کے معرکے کو بھی ایک دن کے اندر اندر، ملوک الطوائف کی ہمت ٹوٹ جانے سے پہلے پہلے انجام تک پہنچا دیا۔

فتح کے بعد اندلس کے امراء میں ہر ایک کی کوشش تھی کہ یوسف بن تاشفین کے ہاں اسے فوقیت ملے اور دوسرے کو منہ نہ لگایا جائے۔ ملوک الطوائف خلوت میں یوسف بن تاشفین کے سامنے ایک دوسرے کی برائیاں کرتے تھے۔ المریہ کا حکمران معتصم نیک سیرت آدمی تھا۔ علم وادب، شعر وسخن اور رزم وبزم کی متنوع قابلیتوں میں وہ قریب قریب معتمد کے ہم پلہ تھا۔ اندلس میں مرابطین کو بلانے اور ان سے تعاون میں بھی معتمد کے بعد وہ سب سے پیش پیش تھا۔ یوسف بن تاشفین معتصم اور معتمد کے متعلق کہتے تھے: ''اس جزیرے کے مرد یہی دونوں ہیں۔''

مگر آپس کے تعلقات کے لحاظ سے معتمد اور معتصم پرانے رقیب تھے۔ جنگِ زلاقہ تک ایک اجتماعی ضرورت نے انہیں یکجا رکھا مگر یہ ضرورت پوری ہوتے ہی دونوں کی سابقہ رقابت پوری طرح ابھر آئی۔ معتصم نے معتمد کو امیر یوسف کی نگاہوں میں گرانے کے لیے عجیب چال چلی۔ وہ معتمد کو یقین دلاتا رہا کہ مرابطین کو اندلس کی زرخیزی اور خوشنمائی بھا گئی ہے لہٰذا اب وہ یہاں قابض ہو کر رہیں گے۔ معتمد کانوں کا کچا اور ایک جذباتی انسان تھا۔ وہ ایسی باتیں سن کر یوسف بن تاشفین کے بارے میں نامناسب الفاظ کہہ گیا۔ معتصم نے یہ الفاظ نمک مرچ لگا کر یوسف بن تاشفین تک پہنچا دیے۔ بعض دیگر امراء نے بھی ایسا ہی کیا تا کہ امیر انہیں اپنا ہمدرد اور رازدان سمجھ کر مقرب بنا لے۔[2]

ان باتوں سے یوسف بن تاشفین جیسے صاف دل آدمی کو جس قدر اکتاہٹ ہوتی، کم تھی۔ وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ ملوک الطوائف نے اپنی جان بچانے کے لیے انہیں نہایت مجبوری کے عالم میں بلایا ہے ورنہ وہ مرابطین سے حسد کرتے ہیں۔ زلاقہ کی جنگ کے بعد نصرانیوں کا خطرہ دور ہو چکا تھا اور اب ملوک الطوائف کی مکارانہ طبیعت سے

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۳۷۰/۴
② المعجب فی تلخیص اخبار المغرب، لعبدالواحد المراکشی: ۱۳۸

یہ بعید نہ تھا کہ وہ مرابطین کو اندلس میں گھیرنے یا باہر دھکیلنے کی کوشش کر ڈالتے۔ یوسف بن تاشفین نے ایسی بدمزگی پیدا ہونے سے پہلے ہی واپسی اختیار کرلی تاکہ ایک تاریخی فتح کے شاندار نتائج پر نااتفاقی کی دھول نہ پڑنے پائے۔

♦♦♦

نصرانیوں کے دوبارہ حملے۔ سِڈ کمپیڈور کا عروج:

یوسف بن تاشفین واپس جا کر اندلس کے حالات سے بے خبر نہیں رہے۔ ایک سال کے اندر اندر انہیں اندازہ ہوگیا کہ ایک بار پھر انہیں اندلس جا کر ادھورے کام کی تکمیل کرنا ہوگی۔

اندلس میں ملوک الطوائف نے زلاقہ کی فتح سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اگر ان کا قومی شعور بیدار ہوتا تو وہ اپنی صفوں میں کوئی رخنہ پیدا نہ ہونے دیتے۔ وہ متحد ہو کر اندلس کے شمال میں فتوحات کی نئی تاریخ رقم کرسکتے تھے اور طُلَیطُلَہ سمیت اپنا ایک ایک شہر اور قلعہ واپس لے سکتے تھے مگر انہوں نے زلاقہ کے شہداء سے بے وفائی کرتے ہوئے آزادی کے نئے موسم میں عیش و آرام اور باہمی جھگڑوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کردیا۔ نصرانیوں نے ان کی سیاسی بے بصیرتی سے پورا فائدہ اٹھایا اور بَلَنسِیَہ کو مرکز بنا کر جہاں انہیں کٹھ پتلی یحییٰ القادر کی آڑ میں غیر اعلانیہ اقتدار حاصل تھا مُرسِیَہ اور لُورقَہ کو اپنی تاخت وتاراج کا نشانہ بنالیا۔ حملوں کی اس نئی لہر میں کمانڈر "ایل سِڈ۔ کمپیڈور" پیش پیش تھا۔ وہ قسطالیہ کا مشہور نائٹ تھا۔ اس کا اصل نام "راڈریگو ڈیاز" (Rodrigo Diaz) تھا۔ اہلِ عرب اُسے "السید قنبیطور" کہا کرتے تھے۔ وہ پیشہ ور جنگجو تھا۔ مسلمان زیادہ معاوضہ دیتے تو ان کے ساتھ مل کر نصرانیوں سے لڑتا۔ نصرانی زیادہ دیتے تو مسلمانوں سے نبرد آزما ہو جاتا۔[1]

زلاقہ میں شکست کے بعد قسطالیہ کی افواج بَلَنسِیَہ سے نکلیں تو وہاں کے عوام نے بھی کٹھ پتلی یحییٰ القادر سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایسے میں یحییٰ القادر نے سِڈ کمپیڈور جیسے پیشہ ور قاتل کو اپنا سرپرست بنالیا۔ سِڈ اپنے لٹیرے ساتھیوں کے ساتھ بَلَنسِیَہ میں ڈیرے ڈالنے آیا تو یحییٰ القادر نے خود استقبال کیا۔ اپنی کرسی کو مسلمانوں کے احتساب سے بچانے کے لیے وہ اس کو ہر ہفتے چار ہزار دینار ادا کرنے لگا۔ سِڈ نے دَانِیَہ، شاطِبَہ سے اریولہ تک ہر شہر کو لوٹ مار کا نشانہ بنالیا۔ اس کے کارنامے دیکھ کر الفانسو ششم نے ۴۸۲ھ میں اسے شمال مشرقی اندلس کے مزید کچھ قلعے دے دیے۔ یوں سِڈ ایک قسم کا آزاد حکمران بن گیا جو مسلمانوں سے رقم لے کر انہی کو کچل رہا تھا۔[2]

حِصْنُ اللَّیط۔ الفانسو کا نیا معسکر:

اُدھر الفانسو ششم نے بھی اِشبیلِیَہ اور بَطَلیُوس سے ٹکر لینے کی بجائے اپنی بچی کھچی طاقت کو مشرقی محاذ پر جمع کرنا

---

[1] ایل سِڈ (El Cid) اصل میں عربی لفظ "السید" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جس طرح الفانسو ششم خود کو "ذو الملّتین" کہلواتا تھا اسی طرح راڈریگو خود کو سید کہلواتا تھا۔ یہی لفظ مختصر ہو کر سِڈ رہ گیا۔ کمپیڈور (El Campeador) اس کا لقب تھا جس کا مطلب ہے "جنگجو"۔

[2] Story of the moors in Spain 205 to 207

شروع کر دیا۔ طُلَیطلہ پر قبضے کے بعد اس نے لُورْقہ اور مُرسِیہ کے درمیان ایک پہاڑی پر نہایت وسیع اور مضبوط قلعہ تعمیر کرایا تھا جسے حِصْنُ اللَّیَیط کہا جاتا تھا۔ یہ اتنا وسیع تھا کہ وہاں پندرہ ہزار فوج آسانی سے رکھی جا سکتی تھی۔ الفانسو ششم نے زلاقہ کی شکست کے بعد اپنے تیرہ ہزار سپاہی وہاں منتقل کر دیے۔ اس فوج نے مُرسِیہ، شقورہ، لُورْقہ اور اَلْمَرِیَہ کے اضلاع میں پے در پے یلغار کی اور ان تمام علاقوں کو برباد کر کے رکھ دیا۔

اس دوران معتمد جو پہلے بھی جنوب مشرقی شہروں پر قبضے کی کئی کوششیں کر چکا تھا موقع غنیمت سمجھ کر اشبیلیہ سے نکلا تاکہ لُورْقہ پر قبضہ کرلے جس پر وہ اپنا قانونی حق تصور کرتا تھا مگر لُورْقہ کے امراء نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔

معتمد نے لُورْقہ کا خیال چھوڑ کر مُرسِیہ کا رخ کیا جہاں ایک بار پھر ابن رشیق قابض ہو چکا تھا۔ اس نے بھی معتمد کو اندر داخل نہ ہونے دیا۔ معتمد یہ دیکھ کر اشبیلیہ کی طرف واپس ہو گیا۔ اس کی ناکامی نے نصرانیوں کے حوصلے بہت بلند کر دیے اور وہ پوری دلیری سے قُرْطُبہ اور غرناطہ تک لوٹ مار کرنے لگے۔[1]

یوسف بن تاشفین سے دوبارہ مداخلت کی درخواست:

ان حالات میں اندلس کے علماء و فقہاء کے وفود یکے بعد دیگرے یوسف بن تاشفین کی خدمت میں حاضر ہونے لگے کہ انہیں نصرانیوں کے مظالم سے نجات دلائی جائے۔

آخر میں معتمد نے چند ارکانِ سلطنت کے ساتھ یہی درخواست لے کر خود سمندر عبور کیا اور امیر یوسف سے مل کر التجا کی کہ حصن اللیط کے لٹیروں کا قلع قمع کیا جائے۔ امیر نے یہ درخواست قبول کرلی اور ربیع الاول ۴۸۱ھ میں ایک بار پھر اندلس میں قدم رکھ دیا۔[2]

حصن اللیط کا معرکہ اور ملوک الطوائف کی کم ظرفی:

جزیرۃ الخضراء ایک بار پھر مرابطین کی چھاؤنی بنا۔ یہاں سے امیر یوسف نے ملوک الطوائف کو مراسلے بھیجے کہ وہ اپنی افواج کے ساتھ جہاد میں شرکت کے لیے نکل پڑیں۔ امیر یوسف معتمد کو ساتھ لے کر مالقہ سے شمال مشرق کی طرف بڑھے، غرناطہ کا عبداللہ بن بلقین، اس کا بھائی تمیم اور اَلْمَرِیَہ سے معتصم بن صمادح بھی اپنی فوجوں سمیت پہنچ گئے۔ حصن اللیط کے پاس مُرسِیہ کے ابن رشیق کے علاوہ شقورہ، بسطہ اور جیان کے امراء بھی اپنی فوجیں لیے مرابطین سے آملے۔

حصن اللیط میں الفانسو ششم کی تیرہ ہزار فوج کی کمک کے لیے کئی نصرانی حکمرانوں کی افواج جمع ہو چکی تھیں۔ مسلمانوں نے نہایت سختی سے اس کا محاصرہ کر لیا اور قلعہ شکن آلات سے اس کی دیواریں توڑنے کی کوششیں کرنے لگے۔ تاہم قلعہ فولاد کی طرح مضبوط تھا، منجنیقوں کی ضرب کاری اسے ذرا بھی شکستہ نہ کر سکی۔ کئی ہفتے گزر گئے مگر جنگ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ امیر یوسف نے اس دوران دیکھ لیا تھا کہ ملوک الطوائف کی صفوں میں اتحاد و اتفاق کا نام و نشان تک

---

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس لعبداللہ عنان المصری: ۲/ ۳۳۵

[2] دولۃ الاسلام فی الاندلس لعبداللہ عنان المصری: ۲/ ۳۳۵؛ الزلاقۃ معرکۃ من معارک الاسلام: ص ۱۹۹، ۲۰۰

نہیں۔ ان میں سے ہر ایک، دوسرے کے خلاف بغض وعناد سے بھرا ہوا تھا۔ ہر ایک بتاتا کہ دوسرے نے اس پر زیادتی کی ہے اور امیر یوسف کو چاہیے کہ اسے انصاف دلائے اور اس کے مخالف امیر کو عبرت کا نشانہ بنادے۔

معتصم بن صمادح اور معتمد بن عباد ایک دوسرے کی بُرائیاں بیان کرتے رہتے تھے۔ غرناطہ کے امراء تمیم اور عبداللہ حقیقی بھائی تھے مگر دونوں امیر یوسف سے تنہائی میں مل کر فریاد کرتے کہ غرناطہ اس کی میراث ہے اور اس کا بھائی ناجائز طور پر اس کا دعوے دار ہے۔ معتمد اور ابن رُشیق میں بھی شدید عداوت چل رہی تھی۔ معتمد کا مطالبہ تھا کہ مرابطین ابن رُشیق سے مُرسیہ چھین کر اسے واپس دلوائیں۔ ابن رُشیق اس محاصرے میں مرابطین کے ساتھ تھا مگر اندرونِ خانہ وہ الفانسو ششم کو نہ صرف دوستی کا پیغام بھیج چکا تھا بلکہ اپنی چھوٹی سی مملکت کا خراج بھی اسے روانہ کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ محاصرے کے دوران خفیہ طور پر محصور نصرانیوں کی مدد بھی کر رہا تھا۔ معتمد نے اپنے مخبروں کے ذریعے یہ بھیانک راز جان کر یوسف بن تاشفین کو آگاہ کر دیا۔

یوسف بن تاشفین کو اب اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ کئی ہفتے گزرنے کے باوجود ایک قلعہ فتح ہونے میں کیوں نہیں آرہا۔ انہوں نے ابن رُشیق پر عائد الزامات کی تصدیق کے بعد اسے گرفتار کر لیا اور علماء وفقہاء کے مشورے سے اسے سزا کے طور پر اس شرط کے ساتھ معتمد کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے قتل نہیں کرے گا۔

اس فیصلے نے ملوک الطوائف کے لشکر میں ابتری پیدا کر دی کیوں کہ مُرسیہ اور گرد ونواح کے اکثر امراء ابن رُشیق کے رشتہ دار تھے، انہوں نے نہ صرف احتجاجاً لشکر سے علیحدگی اختیار کر لی بلکہ مُرسیہ اور نواحی شہروں سے مرابطین کی خیمہ گاہ کو خوراک ورسد کا سلسلہ بھی بند کر دیا۔ ان حالات میں مرابطین کے لیے حصن الّلیط کا مزید محاصرہ ممکن نہ رہا۔ اس دوران الفانسو ششم ایک لشکر لے کر حصن الّلیط کے محصور نصرانیوں کی مدد کے لیے آن پہنچا۔ قلعے میں داخل ہو کر اس نے دیکھا کہ تیرہ ہزار میں سے صرف گیارہ سو افراد زندہ بچے ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ حصن الّلیط کو مرابطین کسی بھی وقت فتح کر سکتے ہیں، اس لیے وہ محصور سپاہیوں کو ساتھ لے کر شمال کی طرف پسپا ہو گیا اور جاتے جاتے قلعے کی دیواریں گرا کر اسے کھنڈر بنا گیا۔ اشبیلیہ کی افواج نے آگے بڑھ کر ان کھنڈرات پر اپنے پرچم گاڑ دیے۔ یہ ۴۸۲ھ کا واقعہ ہے۔

یوسف بن تاشفین کے لیے اب اندلس کے امراء پر اعتماد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس مہم کے فوراً بعد سمندر عبور کر کے مَرّاکش چلے گئے۔ اس سے قبل انہوں نے امیر داؤد بن عائشہ کو چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ بلنسیہ اور مُرسیہ کی سرحدوں پر تعینات کر دیا تھا۔ ان تمام انتظامات کے باوجود امیر یوسف ملوک الطوائف سے بددل ہو چکے تھے اور انہیں اقتدار کے مزے لوٹنے کا مزید موقع دینا، اسلامی اندلس کی تباہی کے مترادف تصور کرتے تھے۔

اُدھر ملوک الطوائف بھی حصن الّلیط کے محاصرے میں یوسف بن تاشفین کے بدلے ہوئے تیور دیکھ چکے تھے اس لیے امیر کی واپسی کے فوراً بعد انہوں نے طے کر لیا کہ مرابطین کو دوبارہ اندلس میں مداخلت کا موقع نہیں دیں

گے۔ مرابطین کے جو دستے اسلامی اندلس کی مشرقی، مغربی اور شمالی سرحدوں پر متعین تھے، ملوک الطوائف نے انہیں خوراک ورسد مہیا کرنا بند کردی۔ غرناطہ کے حاکم عبداللہ بن بلقین اور معتمد بن عباد نے نادانی کی انتہاء کردی اور ایک بار پھر الفانسو ششم سے نامہ و پیام کر کے اسے مرابطین کے خلاف اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے مرابطین سے ممکنہ جنگ کے لیے اپنے اپنے شہروں کے دفاعی انتظامات مضبوط کرنا شروع کر دیے۔

یہ اطلاعات یوسف بن تاشفین کو برابر پہنچ رہی تھیں۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ عیش و تنعم نے ملوک الطوائف کی ہمتوں کو بالکل پست کر دیا ہے۔ زلاقہ جیسا عظیم معرکہ جیت کر بھی وہ اس قابل نہیں کہ اپنی عشرت گاہوں سے نکل کر سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھا سکیں اور حالات اسی ڈگر پر چلتے رہے تو اسلامیانِ اندلس بہت جلد نصرانیوں کے غلام بن جائیں گے۔ آخر میں مرابطین کے خلاف نصرانیوں سے گٹھ جوڑ کر کے انہوں نے محسن کشی کی نہایت مکروہ مثال پیش کی تھی۔ اس صورتحال میں یوسف بن تاشفین نے نہ صرف افریقہ بلکہ دوسرے ممالک کے مشاہیر علماء سے بھی استفتاء کیا کہ آیا ملوک الطوائف کو معزول کرنا جائز ہے یا نہیں۔ جن علماء نے اس کی اجازت کا فتویٰ دیا ان میں بغداد کے امام غزالی اور مصر کے ابوبکر طرطوشی جیسے جبالِ علم شامل تھے کیوں کہ اس کے بغیر اندلس کے مسلمانوں کو کفار کی غلامی سے بچانے کی کوئی اور صورت نہیں تھی۔ [1]

انہی دنوں معتمد نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص جامع قرطبہ کے منبر پر کھڑا کہہ رہا ہے:

سَكَتَ الدَّهْرُ زَمَانًا عَنْهُمْ ۔۔۔۔ ثُمَّ أَبْكَاهُمْ دَمًا حِيْنَ نَطَقْ

''زمانہ ایک مدت تک ان کی حالت پر چپ رہا۔۔۔۔ پھر جب وہ بولا تو انہیں خون کے آنسو رلا کے چھوڑا۔''

معتمد کو یقین ہو گیا کہ اس کی سلطنت جانے کو ہے۔ [2]

ملوک الطوائف کے خلاف جنگ:

۴۸۳ھ میں امیر مرابطین نے نئی منصوبہ بندی اور تیاری کے ساتھ تیسری بار اندلس میں قدم رکھ دیا۔ اس بار وہ مقامی امراء کے بلانے پر نہیں بلکہ انہیں زیر کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کی آمد سے پہلے معتمد بن عباد، عمر المتوکل اور عبداللہ بن بلقین الفانسو ششم سے مرابطین کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کا معاہدہ کر چکے تھے۔

یوسف بن تاشفین نے پھر بھی ملوک الطوائف کو ایک موقع دیا اور ان میں سے کسی کے خلاف کارروائی کیے بغیر سیدھا نصرانیوں کے علاقوں کا رخ کیا تاکہ کسی میں حمیت دینی ہے تو ان کے ساتھ آ ملے۔ وہ قشتالیہ کی سرحدوں پر چھاپے مارتے ہوئے طُلَیْطُلَہ تک چلے گئے جو اب قشتالیہ کا پایۂ تخت اور الفانسو ششم کا مستقر تھا۔ مرابطین کئی دنوں تک طُلَیْطُلَہ کے سامنے لڑتے رہے مگر ملوک الطوائف میں سے کوئی ان کی مدد کو نہ آیا۔ یوں الفانسو ششم سے ان کا اتحاد عملاً ثابت ہو گیا۔

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۳۳۵ تا ۳۳۸ ② الحلۃ السیراء: ۲/ ۹۳

آخر یوسف بن تاشفین نے محاصرہ چھوڑ کر غرناطہ کا رُخ کیا جہاں عبداللہ بن بلقین نے نصرانیوں کی حمایت میں مرابطین سے لڑنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ غرناطہ کے مفتیانِ کرام ان حالات میں عبداللہ کے معزول کیے جانے کا فتویٰ دے چکے تھے۔ عبداللہ کے خادم خاص مؤمل نے خود آ کر یوسف بن تاشفین کو اس کے الفانسو سے خفیہ معاہدے کا راز طشت از بام کیا تھا۔

یوسف بن تاشفین نے غرناطہ کا محاصرہ کیا تو عبداللہ بن بلقین زیادہ دن مزاحمت نہ کر سکا اور امان طلب کی۔ امیر مرابطین نے اسے جان کی امان دیتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ یہ رجب ۴۸۳ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی غرناطہ کے علماء اور عوام اندلس کے نجات دہندہ سے بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔

مالقہ کے علماء بھی عبداللہ کے بھائی تمیم بن بلقین کے مظالم اور نصرانیت نوازی سے تنگ آ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور جلد ہی مرابطین کے ایک دوسرے لشکر نے مالقہ پر حملہ کر کے تمیم کو گرفتار کر لیا۔

امیر یوسف نے ملوک الطوائف کو اندلس میں رکھنا خلافِ مصلحت سمجھا اور نہایت دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ان کے لیے مراکش کے قصبے "اغمات" میں ایک الگ جیل خانہ تعمیر کرایا۔ ملوک الطوائف کے ہر خاندان کے لیے کئی کئی مکانات پر مشتمل علیحدہ علیحدہ محلے تعمیر کیے گئے۔ عبداللہ بن بلقین اور اس کا بھائی تمیم سب سے پہلے اس جیل خانے کے مہمان بنے۔ عبداللہ بن بلقین چند سال بعد اسی عمارت میں فوت ہوا جبکہ اس کے بھائی تمیم کو معافی دے کر آزاد کر دیا گیا۔ ۴۸۸ھ میں اس نے مراکش ہی میں وفات پائی۔

غرناطہ پر مرابطین کے قبضے کی اطلاع سے اشبیلیہ اور بطلیوس کے ایوان بھی لرز گئے۔ عمر المتوکل اور معتمد غرناطہ پہنچے تاکہ یوسف بن تاشفین کو فتح کی مبارکباد دیتے ہوئے دوستانہ تعلقات کی تجدید کریں مگر انہوں نے امیر کے تیور بدلے ہوئے پائے۔ انہیں کسی آؤ بھگت کے بغیر رخصت کر دیا گیا۔ دونوں سمجھ گئے کہ ان کے دن گنے جا چکے ہیں۔

یوسف بن تاشفین نے رمضان ۴۸۳ھ میں سیر بن ابوبکر اور دوسرے امراء کو ملوک الطوائف سے نمٹنے کی تاکید کر کے دوبارہ مراکش کا رُخ کیا اور سبتہ کی چھاؤنی سے مرابطین کے تازہ دم دستوں کو اندلس بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سیر بن ابوبکر نے شوال میں ریاست اشبیلیہ کے شہروں: جَیّان اور رُندہ پر قبضہ کر لیا۔ معتمد کے بلاوے پر قسطالیہ کی افواج مرابطین کو روکنے آئیں مگر ان کی کوشش بے سود رہی۔[1]

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس: ۲/۳۲۵

معتمد، زائدہ اور ملکہ الزبتھ: یہاں ایک تاریخی غلطی دور کرنا ضروری ہے، یورپی تاریخی مآخذ میں ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ معتمد نے الفانسو سے اپنی دوستی کے لیے اپنی ایک بیٹی جس کا نام "زائدہ" تھا، اس کے نکاح میں دے دی تھی اور اسی سے الفانسو کا اکلوتا بیٹا "شانجہ" پیدا ہوا۔ درحقیقت یہ روایت بالکل من گھڑت ہے۔ عرب تاریخی مآخذ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ابوحیان، ابن عذاری اور المقری جیسے مؤرخین جو ایک ایک بات جمع کر گئے، اتنے غیر معمولی واقعے کو نظر انداز کر دیتے۔

ثابت شدہ بات صرف اتنی ہے کہ ایک مسلمان عورت سے جو نصرانی ہو گئی تھی یا جبراً نصرانی بنائی گئی تھی، الفانسو کا بیٹا شانجہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جنوب مغربی شہروں کی فتح کے بعد سیر بن ابی بکر یکدم قُرطُبہ جا پہنچا جہاں معتمد کا لڑکا فتح المامون مقابلے پر آیا مگر شکست کھا کر مارا گیا۔ ۳ صفر ۴۸۴ھ کو مرابطین فتح کے پرچم اٹھائے قُرطُبہ میں داخل ہو گئے۔

اس کے بعد مرابطین نے اشبیلیہ کا محاصرہ کر لیا۔ یوسف بن تاشفین نے سیر بن ابوبکر کو تاکید کی تھی کہ وہ مذاکرات کے ذریعے معتمد کو آمادہ کرے کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دے تو اسے اہل و عیال اور ساری دولت کے ساتھ مَرّاکش میں پُر آسائش زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے گا۔ مگر معتمد کو الفانسو ششم کے وعدے پر یقین تھا کہ وہ مرابطین سے زلاقہ کی شکست کا بدلہ لینے اشبیلیہ ضرور آئے گا، اس لیے اس نے مذاکرات سے انکار کر کے جنگ کا راستہ اختیار کر لیا۔

سیر ابن ابی بکر کئی ہفتوں تک اشبیلیہ کا محاصرہ کیے رہا۔ اچانک اسے خبر ملی کہ قسطالیہ سے بیس ہزار گھڑ سواروں اور چالیس ہزار پیادوں کا لشکر پیش قدمی کر رہا ہے۔ سیر نے ابراہیم بن اسحٰق کی قیادت میں دس ہزار چنیدہ گھڑ سواروں کو بھیج کر قسطالیہ کی فوج کو شکستِ فاش دی۔ یوں معتمد کی آخری امید بھی ختم ہو گئی۔

اشبیلیہ کی فصیل چار ماہ تک ناقابلِ تسخیر رہی۔ آخر میں سیر بن ابوبکر نے شہر میں موجود اپنے ہمدردوں کے ذریعے فصیل کے ایک کمزور حصے کا پتا لگا کر اسے منجنیقوں سے تڑوا دیا۔ معتمد یہ اطلاع ملتے ہی زرہ پہنے بغیر اٹھا اور دوڑ کر اس شگاف تک پہنچ گیا۔ اس نے شمشیر و سناں کے جوہر دکھا کر مرابطین کو اندر آنے سے اس وقت تک روکے رکھا جب تک شگاف کی مرمت نہ کر دی گئی۔ تاہم اسی دن مرابطین نے دریائے وادی الکبیر میں معتمد کے بحری بیڑے کو تباہ کر دیا جس کے بعد ۲۲ رجب ۴۸۴ھ کو آخری ضرب لگائی گئی اور دریا کے راستے سے مرابطین شہر میں داخل ہو گئے۔ معتمد محل کی چار دیواری میں دیوانہ وار لڑتا رہا تا کہ قید کی ذلت سے پہلے مر جائے۔ مگر آخر اسے زندہ پکڑ لیا گیا۔ وہ خودکشی کرنا چاہتا تھا مگر شرعی حکم کے پیش نظر اس سے باز رہا۔ اس کے چار بیٹے: مامون، راضی، معتد اور مالک مختلف جھڑپوں میں مارے جا چکے تھے۔ تاہم سیر بن ابوبکر نے معتمد اور اس کے باقی اہل و عیال کو جان کی امان بخش دی۔

معتمد، اس کی ملکہ رمیکیہ اور اس کی بیٹیاں قیدی بنا کر کشتی میں بٹھائی گئیں۔ دریائے وادی الکبیر کے دونوں کناروں پر لوگوں کا ہجوم ان کی رخصتی کا عبرت ناک منظر دیکھنے جمع تھا۔ ان میں بنو عباد کے ستائے ہوئے لوگ بھی تھے اور وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) پیدا ہوا۔ مگر اس عورت کا نام کیا تھا؟ کیا وہ معتمد کی بیٹی تھی؟ قدیم تاریخی مآخذ میں یہ کہیں منقول نہیں۔ ابن عذاری نے البیان المغرب میں سنہ ۴۸۵ھ کے حالات کے تحت اتنا لکھا ہے کہ الفانسو کا بیٹا شانجہ، مامون بن معتمد کی بیوی سے پیدا ہوا تھا۔ مگر معتمد کی یہ بہو الفانسو تک کیسے پہنچی؟ اس کا جواب کہیں نہیں ملتا۔ عقلی لحاظ سے دیکھا جائے تو آج کل کے گئے گزرے مسلمان بھی ایسے نہیں کہ اپنی بہو بیٹیاں کفار کو نکاح میں پیش کریں تو معتمد جیسے شرفاء سے اس کی توقع کیسے جا سکتی ہے؟ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی جنگ میں یہ لڑکی گرفتار ہو کر الفانسو کے ہاتھ لگی ہوگی۔ بس مغربی مؤرخین نے مسلم حکمرانوں کو رسوا کرنے کے لیے اپنی طرف سے یہ بات بنا ڈالی ہے کہ یہ معتمد کی بیٹی تھی جو دوستی کے معاوضے کے طور پر پیش کی گئی تھی۔ چونکہ آج کل کے مؤرخین مستشرقین کی ہر بات آنکھیں بند کر کے مان لیتے ہیں، اس لیے یہ مغربی خانہ ساز روایت موجودہ تاریخوں میں حتمی حقیقت کے طور پر جگہ پا گئی۔ مزید یہ کہ اب ملکہ برطانیہ الزبتھ کو بھی زائدہ کی وساطت سے معتمد کی اولاد قرار دے کر "سیدانی" کہا جانے لگا ہے جبکہ معتمد یمانی تھا، ہاشمی تو کجا قریشی بھی نہ تھا۔ اس کا قبیلہ بنولخم یمن کے عرب قبائل میں سے ہے۔ ان لوگوں کا ہاشمی یا قریشی حکمرانوں سے کوئی نسبی تعلق نہیں۔

شعرا بھی جن پر معتمد کی نوازشیں بارش کی طرح برستی تھیں۔ ایک شاعر ابوبکر بن لبانہ نے یہ منظر دیکھ کر کہا:

نَسِيتُ إِلَّا غَدَاةَ النَّهْرِ كَوْنَهُمُ ...... فِي الْمُنْشَآتِ كَأَمْوَاتٍ بِأَلْحَادِ

''میں سب کچھ بھول گیا مگر دریا کی وہ صبح نہیں بھلا پایا جب انہیں کشتیوں میں یوں ڈالا گیا تھا جیسے مردوں کو قبروں میں رکھا جاتا ہے۔''

وَالنَّاسُ قَدْ مَلَئُوا الْعِبْرَيْنِ وَاعْتَبَرُوا ...... مِنْ لُؤْلُؤٍ طَافِيَاتٍ فَوْقَ أَزْبَادِ

''لوگ دونوں کناروں پر جمع ہو کر ان موتیوں سے عبرت حاصل کر رہے تھے جو لہروں کے دوش پر ابھر آئے تھے۔''

سَارَتْ سَفَائِنُهُمْ وَالنَّوْحُ يَتْبَعُهَا ...... كَأَنَّهَا إِبِلٌ يَحْدُو بِهَا الْحَادِي

''کشتیاں انہیں لے کر چل پڑیں مگر نوحہ وزاری کی آوازیں ان کا پیچھا کرتی رہیں جیسے وہ اونٹوں کا کارواں ہو جسے حدی خوان چلا رہے ہوں۔''

معتمد کو مع اہل وعیال سمندر کے راستے مراکش بھیج دیا گیا جہاں اغمات کا وسیع وعریض جیل خانہ ان کا منتظر تھا۔ یوں بنو عباد کی طلسماتی حکومت ایک بھولا بسرا افسانہ بن کر تاریخ کی گرد میں چھپ گئی۔[1]

◆◆◆

اغمات کا قید خانہ:

مراکش سے چالیس کلومیٹر جنوب مشرق میں برف پوش چوٹیوں والے کوہ اطلس کے دامن میں ''اغمات'' آج بھی ایک مشہور قصبہ ہے۔ ۴۸۴ھ کے اواخر میں اغمات پہنچنے کے بعد معتمد کی زندگی کا وہ دور شروع ہوا، جب وہ ہر طرح کی ذمہ داریوں سے بالکل فارغ تھا۔ وہ آسمان سے زمین پر آ گیا تھا اور اب دنیا کی حقیقت اور اصلی دکھ درد کو اپنی شاعرانہ حساسیت کے ساتھ کہیں زیادہ گہرائی کے ساتھ محسوس کر سکتا تھا۔ اس کی بقیہ زندگی ایک آتش بجاں شاعر کی زندگی تھی جس کا ہر شعر اشک آور تھا۔ معتمد نے اس دوران انسانی جذبات کو جس انداز میں پیش کیا، وہ اسے تاریخ میں زندہ وجاوید بنا گیا۔ چند مثالیں پیش ہیں:

1. اغمات جاتے ہوئے معتمد نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو بارش کی دعا مانگ رہے تھے۔ معتمد نے کہا:

خَرَجُوا لِيَسْتَسْقُوا فَقُلْتُ إِلَيْهِمِ ...... دَمْعِي يَنُوبُ لَكُمْ عَنِ الْأَنْوَاءِ

''لوگ باہر نکل پڑے تاکہ بارش کی دعا مانگیں تو میں نے کہا: میرے آنسو تمہارے لیے بارش کا کام کریں گے۔''

قَالُوا حَقِيقٌ فِي دُمُوعِكَ مَقْنَعٌ ...... لٰكِنَّهَا مَمْزُوجَةٌ بِدِمَاءِ

''لوگوں نے کہا:'' یہ سچ ہے کہ تمہارے آنسو کافی ہیں لیکن ان میں خون ملا ہوا ہے۔''[2]

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۳۵۳ تا ۳۶۲

② خریدۃ القصر وجریدۃ العصر قسم: شعراء المغرب والاندلس: ۱/ ۳۹

❷ عید کے دن اس کی بیٹیاں سلام کرنے حاضر ہوئیں تو ان کی مرجھائی ہوئی صورتیں دیکھ کر اپنے آپ کو کہا:

فِیْمَا مَضٰی کُنْتَ بِالْاَعْیَادِ مَسْرُوْرًا ...... اَسَرَّکَ الْعِیْدُ فِیْ اَغْمَاتَ مَاْسُوْرًا

''ماضی میں تو عیدوں پر خوش ہوتا تھا...... کیا اغمات میں قید کی حالت میں بھی تجھے عید خوشی دے گی۔''

تَرٰی بَنَاتِکَ فِی الْاَطْمَارِ جَائِعَةً ...... یَغْزِلْنَ لِلنَّاسِ لَا یَمْلِکْنَ قِطْمِیْرًا

''تو اپنی بیٹیوں کو بوسیدہ چادروں میں بھوکی دیکھتا ہے...... لوگوں کے لیے سوت کاتتی ہیں، خود کسی شے کی مالک نہیں۔''

یَمْشِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَالْاَقْدَامُ حَافِیَةٌ ...... کَاَنَّهَا لَمْ تَطَاْ مِسْکًا وَّ کَافُوْرًا

''وہ زمین پر برہنہ پاؤں چلتی ہیں...... گویا کبھی یہ قدم مشک اور کافور پر چلے ہی نہیں تھے۔''

مَنْ بَاتَ بَعْدَکَ فِیْ مُلْکٍ یُسَرُّ بِهٖ ...... فَاِنَّمَا بَاتَ بِالْاَحْلَامِ مَغْرُوْرًا

''اس کے بعد بھی اگر کوئی حکومت کرکے خوش ہے...... تو یقیناً وہ خوابوں سے فریب کھا رہا ہے۔''

اَفْطَرْتَ فِی الْعِیْدِ لَا عَادَتْ مَسَاءَتُهٗ ...... فَکَانَ فِطْرُکَ لِلْاَکْبَادِ تَفْطِیْرًا

''تو نے ایسی عید گزاری کہ ایسی بری عید پھر نہ آئے...... کیونکہ تیری عید جگر کو پارہ پارہ کرنے والی ہے۔''[1]

❸ کچھ لوگوں نے اس سے اصرار کرکے مال مانگا تو کہنے لگا:

سَاَلُوا الْیَسِیْرَ مِنَ الْاَسِیْرِ وَاِنَّهٗ ...... بِسُؤَالِهِمْ لَاَحَقُّ مِنْهُمْ فَاعْجَبِ

''لوگوں نے قیدی سے معمولی سا عطیہ مانگا...... حالانکہ وہ ان کی خیرات کا زیادہ حق دار اور زیادہ لائق تعجب ہے۔''

لَوْلَا الْحَیَاءُ وَعِزَّةٌ لَخْمِیَّةٌ ...... طَیَّ الْحَشَا لَحَکَاهُمُ فِی الْمَطْلَبِ

اگر شرم وحیا اور بنولخم کی غیرت...... باطن میں پنہاں نہ ہوتی تو وہ قیدی انہیں حقیقت بتادیتا۔''

❹ ایک عالم فاضل دوست ملنے آیا تو اسے رخصت کرتے ہوئے بیس دینار دیے اور کہا:

اِلَیْکَ النَّزْرَ مِنْ کَفِّ الْاَسِیْرِ ...... وَاِنْ تَقْبَلْ تَکُنْ عَیْنَ الشَّکُوْرِ

''ایک قیدی کے ہاتھ سے یہ آپ کی نذر ہے...... اگر آپ قبول کرلیں تو آپ کی عین نوازش ہوگی۔''

تَقَبَّلْ مَا یَذُوْبُ لَهٗ حَیَاءً ...... وَاِنْ عَذَرَتْهُ حَالَاتُ الْفَقِیْرِ

''آپ یہ ہدیہ قبول کرلیں جسے دینے والے کی حیا مر رہی ہے...... اگرچہ فقیرانہ حالات اس کا عذر ہیں۔''[2]

✦✦✦

---

① نفح الطیب: ۳/ ۲۷۳ ② خریدۃ القصر وجریدۃ العصر، قسم: شعراء المغرب والأندلس: ۱/ ۳۷۲، ۳۰

یاد رہے کہ بیس دینار ایک خطیر رقم تھی جو آج کل کے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار ڈالر (گیارہ لاکھ پاکستانی روپے) کے برابر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معتمد پر قید میں ویسی تنگی نہ تھی جیسی عام قیدیوں کے ساتھ ہوتی ہے، ورنہ قید خانے میں اتنی دولت ساتھ رکھنا ممکن نہ تھا۔ بظاہر یہ رقم اس سے ہمدردی رکھنے والے امراء دیتے ہوں گے اور معتمد بھی دریا دلی کے ساتھ وہ ہدایا اہلِ علم اور ضرورت مندوں میں بانٹا کرتا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ معتمد سے ملاقات اور تحائف لینے دینے پر پابندی نہ تھی۔

قید خانے میں معتمد کی فریاد:

معتمد کی دردانگیز شاعری نے علامہ اقبال کو بھی متاثر کیا اور انہوں نے اس کے کچھ اشعار کو اردو میں یوں منظوم کیا:

ایک فغانِ بے شرر سینے میں باقی رہ گئی
سوز بھی رخصت ہوا، جاتی رہی تاثیر بھی
مردِ حُر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج
میں پشیماں ہوں، پشیماں ہے مری تدبیر بھی
خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل
تھی اسی فولاد سے شاید مری شمشیر بھی ①

معتمد کی بیٹی کا واقعہ:

معتمد اور رمیکیہ کے نکاح سے ایک بیٹی بثینہ ہوئی تھی جو اپنے والدین کی طرح فصیح و بلیغ تھی۔ انقلاب میں وہ گم ہوگئی۔ کسی نے اسے اغواء کر کے فروخت کر دیا۔ اسے خریدنے والا ایک شریف تاجر تھا جس نے اسے اپنے بیٹے کو ہدیہ کر دیا۔ لڑکے سے پہلی ملاقات میں بثینہ نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ ایک آزاد لڑکی ہے جسے جبراً فروخت کیا گیا ہے، وہ نکاح کے بغیر کسی غیر مرد کو اپنا بدن نہیں چھونے دے گی۔ پھر جب اس نے بتایا کہ وہ سابق بادشاہ معتمد کی بیٹی ہے تو لڑکا حیران رہ گیا۔ بثینہ نے اسے کہا کہ وہ نکاح کے لیے اپنے والدین سے اجازت حاصل کرے گی۔ اس نے ایک منظوم خط لکھ کر اپنے باپ کو بھیجا جس میں اس کے یہ اشعار تھے:

لَا تُنْكِرُوْا اَنِّيْ سُبِيْتُ وَاَنَّنِيْ .... بِنْتٌ لِمَلِكٍ مِنْ بَنِيْ عَبَّادِ

''آپ حیران نہ ہوں کہ میں قیدی بن چکی ہوں حالانکہ میں بنو عباد کے ایک بادشاہ کی بیٹی ہوں۔''

لَمَّا اَرَادَ اللّٰهُ فُرْقَةَ شَمْلِنَا .... وَاَذَاقَنَا طَعْمَ الْاَسٰى عَنْ زَادِ

''جب اللہ نے ہماری اجتماعیت کو توڑنا چاہا .... اور طعام سفر کی جگہ ہمیں بے نوائی کا مزہ چکھایا۔''

فَخَرَجْتُ هَارِبَةً فَحَازَنِيْ امْرُؤٌ .... لَمْ يَاْتِ بِالْعَجَالِهِ بِسَدَادِ

''تو میں بھاگ نکلی، پھر مجھے ایک شخص نے اٹھالیا .... جس نے اپنی جلد بازی میں صحیح کام نہ کیا۔''

اِذْ بَاعَنِيْ بَيْعَ الْعَبِيْدِ فَضَمَّنِيْ .... مَنْ صَانَنِيْ اِلَّا مِنَ الْاَنْكَادِ

''کہ اس نے مجھے غلاموں کی طرح بیچ دیا، پھر مجھے ایسوں کے ہاں پہنچایا جنہوں نے مجھے فقط مفلسی دی۔''

وَاَرَادَنِيْ لِنِكَاحِ نَجْلٍ طَاهِرٍ .... حَسَنِ الْخَلَائِقِ مِنْ بَنِي الْاَنْجَادِ

''اور میرا نکاح ایک پاکیزہ، خوش خلق اور عالی نسب گھرانے میں کرانا چاہا۔''

---

① بالِ جبریل، ص ۱۰۶

وَمَضَى إِلَيْكَ يَسُومُ رَأْيَكَ فِي الرِّضَا ...... وَلَأَنْتَ تَنْظُرُ فِي طَرِيقِ رَشَادِيْ

''اب وہ آپ کی طرف متوجہ ہو کر آپ کی رائے جاننا چاہتا ہے کیوں کہ آپ میرے لیے اچھائی کی راہ دیکھ سکتے ہیں۔''

فَعَسَاكَ يَا أَبَتِي تَعَرِّفُنِي بِهِ ...... إِنْ كَانَ مِمَّنْ يَرْتَجِي لِوِدَادِ

''پس اے ابا جان! امید ہے آپ اس شخص کو سمجھ لیں گے اگر وہ رشتہ داری کے لیے مناسب ہے۔''

وَعَسَى رُمَيْكِيَّةُ الْمُلُوكِ بِفَضْلِهَا ...... تَدْعُوا لَنَا بِالْيُمْنِ وَالْإِسْعَادِ

''اور امید ہے کہ ملکہ رمیکیہ اپنی مہربانی کے ساتھ ...... ہمارے لیے برکت اور کامیابی کی دعا کرتی رہیں گی۔''

معتمد اور اس کی بیوی رمیکیہ اپنی اس لخت جگر کی زندگی یا موت سے بے خبر اور اس کی بازیافت سے مایوس تھے۔ یہ خط ملنے پر ان کا مسرت سے برا حال ہو گیا۔ معتمد نے جوابی خط میں خوشی سے اس رشتے کی اجازت دے دی۔[1]

قید خانے کی زندگی سے تنگ آ کر ایک دن رمیکیہ معتمد کو کہنے لگی:

''تم نے میرے ساتھ کبھی کوئی بھلائی کی ہی نہیں۔''

معتمد نے دھیرے سے کہا: ''کیا اس کیچڑ والے دن بھی نہیں۔''

رمیکیہ شرمندہ ہو گئی اور اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔[2]

معتمد اور رمیکیہ کی وفات:

معتمد اور رمیکیہ چار سال تک قید و بند کی سخت زندگی گزارتے رہے۔ آخری دنوں میں معتمد کے پیروں میں بیڑیاں بھی ڈال دی گئیں کیوں کہ اس کے ایک بیٹے عبد الجبار نے قسطالیہ کی مدد سے اندلس کے ایک قلعے پر قبضہ کر کے بغاوت کر دی تھی۔ اگرچہ سیر بن ابوبکر نے اس پر فوراً قابو پا لیا تھا لیکن دوسری طرف یہ اطلاعات بھی ملی تھیں کہ معتمد کے بعض ہمدرد اسے جیل سے چھڑانے کی کوشش کرنے والے ہیں۔ اس لیے معتمد کو زنجیر لگا دی گئی۔

کچھ دنوں بعد معتمد کی واحد غم گسار اس کی شریک حیات ام الربیع (رمیکیہ) فوت ہو گئی۔ معتمد بھی اس کے بعد زیادہ دن زندہ نہ رہا۔ ۱۱ شوال ۴۸۸ھ کو ایک دن اس نے خاموشی سے اپنی زخمی روح خالق حقیقی کے سپرد کر دی۔ اس کی قبر رمیکیہ کے ساتھ ہی بنائی گئی۔[3]

اغمات میں دو قبریں:

معتمد ایک کامیاب حکمران نہ سہی، ایک بلند پایہ شاعر ضرور تھا، اسی لیے اس کی موت کے بعد بڑے بڑے سخن دان اس کی قبر پر آ کر اسے خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ ابو بحر نامی ایک شاعر عید کے دن اس کی مرقد پر آ کر گویا ہوا:

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۴/ ۲۸۳

② نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۴/ ۲۷۳، ۱/ ۴۴۰

③ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۳۶۰؛ الحلۃ السیراء: ۲/ ۹۳؛ الاعلام للزرکلی: ۱/ ۳۴۳

لَمَّا خَلَتْ مِنکَ الْقُصُورُ وَلَمْ تَکُنْ ...... فِیهَا کَمَا قَدْ کُنْتَ فِی الْأَعْیَادِ

''جب شاہی محل آپ سے خالی ہوگیا، اور گزشتہ عیدوں کی طرح آپ وہاں نہیں رہے۔''

قَبَّلْتُ مِنْ هٰذَا الثَّرٰی لَکَ خَاضِعًا ...... وَجَعَلْتُ قَبْرَکَ مَوْضِعَ الْإِنْشَادِ

''تو میں آپ کے سامنے عاجزی کے لیے یہ خاک چومنے آگیا اور آپ کی قبر کو شاعری کی محفل بنالیا۔''

یہ شعر پڑھتے ہوئے وہ خود بھی روتے روتے بے حال ہوگیا اور حاضرین کو بھی اشک بار کرگیا۔[1]

معتمد اور رمیکیہ کی قبریں آج بھی برف پوش پہاڑوں کے دامن میں زیتون وانجیر کے درختوں میں گھرے قصبے اغمات میں نظارۂ عبرت دے رہی ہیں۔ مؤرخ عبداللہ عنان مصری مرحوم (صاحب دولۃ الاسلام فی الاندلس) نے ۱۹۵۶ء میں مراکش کے سفر کے دوران ان قبروں کو دیکھا اور ان کی وحشت اور ویرانی دیکھ کر ان کا بھی دل بھر آیا۔[2]

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یاں سے اٹھتا ہے[3]

مشرقی اندلس کے ملوک الطوائف کا خاتمہ:

اشبیلیہ کے بعد باقی ملوک الطوائف میں کوئی خاص طاقت نہ تھی۔ معتصم کی وفات کے بعد بنوصمادح بھی بہت کمزور پڑگئے تھے لہٰذا مرابطین کے جرنیل داؤد بن عائشہ نے شوال ۴۸۴ھ میں ان سے المریہ چھین لیا۔

اگلے سال شاطبہ، شقورہ اور دانیہ بھی فتح کرلیے گئے۔[4]

شقورہ اور دانیہ اس وقت ریاست سرقسطہ کا حصہ تھے۔ مقتدر بن ہود نے مرنے سے قبل اپنی ریاست کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کیا تھا کہ پایۂ تخت اور شمالی اضلاع ولی عہد یوسف مؤتمن کو جبکہ مشرقی اضلاع چھوٹے بیٹے منذر بن ہود کو دے دیے تھے۔ منذر بن ہود ۴۸۳ھ میں وفات پاچکا تھا اور حکومت اس کے کم سن بیٹے سعد الدولہ کے نام ہوچکی تھی۔ بہرکیف ۴۸۵ھ میں مرابطین کے جرنیل ابن عائشہ نے یہ تمام علاقہ فتح کرلیا جس کے باعث یوسف المؤتمن کو سرقسطہ میں اس خوف نے گھیر لیا کہ اس کے دن بھی قریب ہیں۔ ایسے میں اس نے سرقسطہ کے قدیم نصرانی حلیف سِڈ اور نصرانی ریاستوں: ارغون اور نوار سے دفاعی معاہدے کرلیے۔ انہی معاہدوں کی آڑ میں سِڈ کو

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۴۵۹/۳

② دولة الاسلام فی الاندلس: ۳۶۳/۲

③ میر تقی میر

④ دولة السلام فی الأندلس: ۳۳۰/۲، ۳۳۱؛ تاریخ ابن خلدون: ۲۰۱/۳ تا ۲۰۵، ط دار الفکر

موقع ملا اور وہ مشرق اندلس میں گھس کر ۴۸۷ھ میں بلنسیہ جیسے اہم شہر پر قابض ہو گیا۔[1]

دولتِ بنی افطس کا خاتمہ:

دوسری طرف سیر بن ابوبکر مغربی شہروں کو فتح کر رہا تھا۔ بطلیوس کے حکمران عمر المتوکل نے جب دیکھا کہ مرابطین اس سے حکومت چھین کر رہیں گے، تو اس نے الفانسو ششم سے دفاعی معاہدہ کر لیا اور اس کے بدلے اُسے تین اہم قلعے: اشبونہ، شنترہ اور شنترین دے دیے۔ اس اقدام سے بطلیوس کے عوام سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے مرابطین سے مدد مانگ لی۔ آخر سیر بن ابوبکر نے ۴۸۸ھ میں بطلیوس پر حملے کے لیے فوج بھیج دی۔ عمر المتوکل کو شکست ہوئی اور وہ اپنے دولڑکوں سمیت گرفتار ہو گیا۔ اسے بیٹوں سمیت قتل کر دیا گیا۔ یوں مرابطین نے بنو افطس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ملوک الطوائف میں سے شمال مشرقی شہروں پر قابض صرف بنو ہود کی حکومت باقی رکھی گئی جو مرابطین سے اطاعت کا عہد و پیمان کر چکے تھے۔[2]

+++

ملوک الطوائف۔ جدول

اس نقشے سے معلوم ہوگا کہ دول طوائف کے قیام کا سلسلہ کب شروع ہوا اور کونسا صوبہ یا شہر کس سال خود مختار ہوا۔

نمبر	حکومت	بانی	مرکز سے علیحدگی
۱	بلنسیہ	مبارک عامری، مظفر عامری	۴۰۰ھ میں
۲	دانیہ، بلیار	مجاہد العامری	۴۰۰ھ میں
۳	البونت (الفنت)	عبداللہ بن قاسم	۴۰۰ھ میں
۴	ارکش	بنو خزرون	۴۰۰ھ میں
5	ولبہ	ابو زید عبدالعزیز البکری	۴۰۳ھ میں
۶	غرناطہ	زاوی بن زیری	۴۰۳ھ میں
۷	شنتمریہ الشرق (سانتاماریا)	ہذیل بن عبدالملک	۴۰۳ھ میں
۸	مورو	نوح بن ابی تزیری دمری	۴۰۳ھ میں
۹	مریہ	خیران عامری	۴۰۳ھ میں

---

[1] دولة الإسلام في الأندلس: ۲/ ۲۸۹، ۲۹۰

[2] تاريخ ابن خلدون: ۳/ ۲۰۵، ط دار الفكر؛ فقه التمكين عند دولة المرابطين للصلابي: ص ۱۲۷ تا ۱۳۲

۱۰	قرمونہ	ابو محمد بن برزال	۴۰۵ھ میں
۱۱	المریہ	خیران عامری	۴۰۵ھ میں
۱۲	رُندہ	بنو یفرن	۴۰۶ھ میں
۱۳	سرقسطہ	منذر بن یحییٰ تجیب	۴۰۸ھ میں
۱۴	بطلیوس	ابو محمد عبداللہ بن مسلمہ، ابن افطس	۴۱۳ھ میں
۱۵	اشبیلیہ	محمد بن اسماعیل بن عباد	۴۱۴ھ میں
۱۶	لبلہ	احمد بن یحییٰ	۴۱۴ھ میں
۱۷	باجہ	حاجب بن محمد	۴۲۲ھ میں
۱۸	طلیطلہ	بنو ذی النون	۴۲۲ھ میں
۱۹	شنتمریہ الغرب	ابو عبداللہ محمد بن سعید بن ہارون	۴۳۳ھ میں
۲۰	بربشتر	یوسف بن سلیمان	۴۳۸ھ میں

+++

ملوک الطوائف کی اہم حکومتیں اور ان کے سربراہ

بنو حمود۔ مالقہ و قرطبہ (جنوبی و وسطی اندلس)

یہ علوی تھے اور مراکش کے شاہی خاندان ''ادارسہ'' کی اولاد تھے۔ علی بن حمود اُمویانِ اندلس کی طرف سے مراکش کے شہر سبتہ کا حاکم تھا۔ ۴۰۶ھ میں اندلس آ کر مالقہ پر قابض ہو گیا۔ پھر اہلِ قرطبہ کی دعوت پر وہاں کا تخت سنبھال لیا مگر ۴۰۸ھ میں عمائدِ قرطبہ کی سازش سے قتل ہو گیا۔ اس کا بھائی قاسم بن حمود اور بیٹا یحییٰ معتلی کچھ مدت کے بعد دیگرے دو دو بار قرطبہ کے حکمران رہے مگر قاسم یحییٰ کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا جبکہ ۴۱۷ھ میں یحییٰ معتلی کو قرطبہ سے بے دخل ہو کر مالقہ اور مضافات پر اکتفا کرنا پڑا۔ پھر یہ حکومت اس کی اولاد میں چلتی رہی۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۱	ابو الحسن علی بن حمود، الناصر	۴۰۷ھ تا ۴۰۸ھ (۱۰۱۶ء تا ۱۰۱۸ء)	مالقہ چھوڑ کر قرطبہ کا حاکم بن گیا

۲	قاسم بن حمود، المامون	۴۰۸ھ تا ۴۱۲ھ (۱۰۱۸ء تا ۱۰۲۱ء)	قرطبہ پر حکومت کی
۳	یحییٰ بن علی، المعتلی	۴۱۲ھ تا ۴۱۳ھ (۱۰۲۱ء تا ۱۰۲۲ء)	یحییٰ قرطبہ پر۔ قاسم اشبیلیہ پر
	قاسم بن حمود (دوبارہ)	۴۱۳ھ تا ۴۱۳ھ (۱۰۲۲ء تا ۱۰۲۳ء)	قرطبہ پر دوبارہ حکومت۔ گرفتار
	یحییٰ المعتلی (دوبارہ)	۴۱۳ھ تا ۴۱۶ھ (۱۰۲۳ء تا ۱۰۲۵ء)	مالقہ، الخضرا، شریس پر حکومت
	یحییٰ المعتلی (سہ بارہ)	۴۱۶ھ تا ۴۱۷ھ (۱۰۲۵ء تا ۱۰۲۶ء)	قرطبہ و مالقہ پر حکومت
	یحییٰ المعتلی (چوتھی بار)	۴۱۷ھ تا ۴۲۷ھ (۱۰۲۶ء تا ۱۰۳۵ء)	مالقہ پر حکومت، جنگ میں قتل
۴	ادریس اول بن علی، المتأید	۴۲۷ھ تا ۴۳۱ھ (۱۰۳۵ء تا ۱۰۳۹ء)	سبتہ کا والی۔ مالقہ کا نیا حکمران
۵	یحییٰ بن ادریس، القاسم	محرم تا جمادی الآخر ۴۳۱ھ (۱۰۳۹ء)	کم عمر، نا سمجھ، معزول ہو کر قتل
۶	حسن بن یحییٰ المعتلی، المستنصر	جمادی الآخر ۴۳۱ھ تا ۴۳۴ھ (۱۰۳۹ء تا ۱۰۴۲ء)	زہر دیا گیا۔
۷	ادریس بن یحییٰ، العالی	۴۳۴ھ تا ۴۳۸ھ (۱۰۴۲ء تا ۱۰۴۶ء)	جیل سے تخت پر لایا گیا۔ عالم فاضل، ادیب، نیک و صالح مگر کمزور طبع۔ چچا زاد محمد بن ادریس بن علی بن حمود نے بغاوت کر دی تو یہ سبتہ چلا گیا۔
۸	محمد بن ادریس بن علی، المہدی	۴۳۸ھ تا ۴۴۴ھ (۱۰۴۶ء تا ۱۰۵۲ء)	زہر دیا گیا۔
۹	ادریس بن یحییٰ بن ادریس اول، السامی	۴۴۴ھ (۱۰۵۲ء)	کچھ مدت حکومت کی۔
	ادریس بن یحییٰ، العالی، دوبارہ	۴۴۵ھ تا ۴۴۶ھ (۱۰۵۳ء تا ۱۰۵۴ء)	اپنے بیٹے محمد کو جانشین بنا گیا۔
۱۰	محمد ثانی، المستعلی	۴۴۶ھ تا ۴۴۹ھ (۱۰۵۴ء تا ۱۰۵۷ء)	آخری حکمران

خاتمہ: ۴۴۹ھ میں غرناطہ کے حکمران بادیس بن حبوس نے مالقہ پر قبضہ کر کے دولتِ بنی حمود کا خاتمہ کر دیا۔ مستعلی افریقہ چلا گیا اور وہاں ۴۵۶ھ (۱۰۶۴ء) میں فوت ہو گیا۔

◆◆◆

اُمرائے بنو حمود۔ الجزیرۃ الخضراء (جنوبی اَندلُس)

قاسم بن حمود کو ۴۰۴ھ میں اُمویانِ اندلس نے الجزیرۃ الخضراء کا حاکم مقرر کیا تھا۔ ۴۱۶ھ میں اس کے بھتیجے یحییٰ بن علی معتلی نے مالقہ کی حکومت سنبھال کر اس کی اولاد کو قید کر دیا۔ ۴۲۷ھ میں معتلی مر گیا تو قاسم بن حمود کے بیٹے محمد کو فرار کا موقع مل گیا اور وہ الجزیرۃ الخضراء چلا گیا اور ۴۳۱ھ میں وہاں خود مختار حکومت قائم کر لی۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۱	محمد بن قاسم بن حمود، المعتصم	۴۳۱ھ تا ۴۴۰ھ (۱۰۳۹ تا ۱۰۴۸ء)	نئی خود مختار حکومت قائم کی
۲	قاسم بن محمد، الواثق	۴۴۰ تا ۴۴۶ھ (۱۰۴۸ء، تا ۱۰۵۵ء)	کمزور حکمران

خاتمہ: معتضد بن عباد (حاکم اشبیلیہ) نے ۴۴۶ھ میں الخضراء پر قابض ہو کر اسے معزول کر دیا۔ یہ المُرِیّہ کے حاکم معتصم بن صمادح کے پاس چلا گیا اور وہیں ۴۵۰ھ میں فوت ہو گیا۔

◆◆◆

دولت بنو مناد (بنو زیری) غرناطہ (جنوبی اَندلُس)

یہ لوگ صنہاجی بربر تھے۔ حاجب المنصور کے دور میں ان کے سردار زاوی بن زیری نے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اندلس آنے کی اجازت مانگی اور آ کر اپنے قبیلے سمیت منصور کی فوج کا حصہ بن گیا۔ یہ لوگ ۴۰۰ھ سے ۴۰۲ھ تک محمد المہدی کے خلاف سلیمان مستعین کے گرد جمع ہو کر خانہ جنگی کو بڑھانے اور مرکزی حکومت کو کمزور کرنے میں دخیل رہے۔ سلیمان مستعین ۴۰۲ھ میں دوسری بار قرطبہ کا حکمران بنا تو زاوی بن زیری کو اس کی خدمات کے عوض غرناطہ کی صوبہ داری بخش دی۔ زاوی بن زیری نے ۴۰۳ھ میں غرناطہ پر خود مختار حکومت قائم کر لی۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۱	زاوی بن زیری بن مناد	۴۰۳ھ تا ۴۱۰ھ (۱۰۱۲ تا ۱۰۱۹ء)	بانی حکومت
۲	حبوس بن ماکسن	۴۱۰ھ تا ۴۲۸ھ (۱۰۱۹ تا ۱۰۳۷ء)	زاوی بن زیری کا چچا زاد
۳	بادیس بن حبوس	۴۲۸ھ تا ۴۶۵ھ (۱۰۳۷ تا ۱۰۷۳ء)	بربروں کا طاقتور ترین حکمران

نمبر	حکمران	دور حکومت	خاص بات
۴	عبداللہ بن بلقین بن بادیس	۴۶۵ھ تا ۴۸۳ھ (۱۰۷۳ء تا ۱۰۹۰ء)	کم عمر نا تجربہ کار

خاتمہ: عبداللہ بن بلقین غرناطہ اور اس کا بھائی تمیم بن بلقین مالقہ کے حاکم تھے۔ ۴۸۳ھ میں مرابطین نے ان دونوں کو ان شہروں سے بے دخل کر دیا۔

+++

دولت بنو عباد۔ اِشبِیلِیَہ (جنوبی اَندلُس)

اشبیلیہ کے ایک نامور عالم قاضی اسماعیل بن عباد کے بیٹے قاضی ابو القاسم نے ۴۱۴ھ میں قرطبہ کے سیاسی بحران سے مایوس ہو کر اہل شہر کی مشاورت سے مقامی حکومت بنائی جس نے اندلس کے عربوں کو پناہ فراہم کی۔
قاضی ابو القاسم کے جنگجو جانشین معتضد نے اپنی ہمسایہ مسلم ریاستوں سے لڑ بھڑ کر اس حکومت کو بہت وسیع کر دیا۔

نمبر	حکمران	دور حکومت	خاص بات
۱	قاضی ابو القاسم بن اسماعیل	۴۱۴ھ تا ۴۳۳ھ (۱۰۲۳ء تا ۱۰۴۲ء)	عالم دین، شرعی حکومت
۲	معتضد بن ابو القاسم	۴۳۳ھ تا ۴۶۱ھ (۱۰۴۲ء تا ۱۰۶۸ء)	سخت گیر، ظالم، فاتح
۳	محمد معتمد بن معتضد	۴۶۱ھ تا ۴۸۴ھ (۱۰۶۸ء تا ۱۰۹۱ء)	ادیب و شاعر، نرم طبع

خاتمہ: ۴۸۴ھ میں اشبیلیہ کا آخری حکمران معتمد مرابطین کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

+++

دولت بنو جَہوَر۔ قُرطُبَہ (وسطی اندلس)

قرطبہ کا سیاسی بحران دیکھ کر وہاں کے وزیر ابو الحزم جہور محمد بن جہور نے اسلامی شورائی حکومت قائم کر لی جو ۴۸ برس تک قائم رہی۔ یہ حکومت اس گئے گزرے دور میں بہت غنیمت تھی۔ یہ ملوک الطوائف سے اپنی حفاظت کرتی رہی مگر عموماً ان کی خانہ جنگی میں غیر جانبدار رہی اور بعض مواقع پر اس نے متحارب فریقوں میں صلح بھی کرائی۔

نمبر	حکمران	دور حکومت	خاص بات
۱	ابو الحزم جہور بن محمد	۴۲۲ھ تا ۴۳۵ھ (۱۰۳۱ء تا ۱۰۴۳ء)	تجربہ کار، نیک، دور اندیش
۲	ابو الولید بن جہور	۴۳۵ھ تا ۴۵۰ھ (۱۰۴۳ء تا ۱۰۵۸ء)	اپنے بیٹے کو حکومت دے دی
۳	عبد الملک بن ابو الولید	۴۵۰ھ تا ۴۶۱ھ (۱۰۵۸ء تا ۱۰۶۸ء)	ناسمجھ حکمران

خاتمہ: اس حکومت کو بنو عباد (اشبیلیہ) کے حکمران معتمد نے قرطبہ پر قابض ہو کر ختم کیا۔

✦✦✦

دولت بنو ذوالنون ۔ طُلَیطلہ (وسطی اَندلُس)

یہ ہوارہ کے بربروں کا خاندان تھا۔ لوٹ مار سے آغاز کرکے سپہ گری تک پہنچا اور پھر قُرطُبہ کے سیاسی بحران سے فائدہ اٹھا کر طُلَیطلہ پر قابض ہو گیا۔ اس کے حکمران یحییٰ المامون نے نصرانیوں کی سرپرستی میں اپنا سیاسی قد وکاٹھ اونچا کیا اور اردگرد کی مسلم ریاستوں: اشبیلیہ، قُرطُبہ اور بطلیوس وغیرہ کے لیے دردِ سر بنا رہا۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۱	اسماعیل بن عبدالرحمن بن ذوالنون	۴۲۷ھ تا ۴۲۹ھ (۱۰۳۵ء تا ۱۰۳۷ء)	بانی حکومت
۲	یحییٰ بن اسماعیل، المامون	۴۲۹ھ تا ۴۶۸ھ (۱۰۳۷ء تا ۱۰۷۵ء)	نصرانیوں کا آلۂ کار
۳	یحییٰ بن اسماعیل القادر	۴۶۸ھ تا ۴۷۸ھ (۱۰۷۵ء تا ۱۰۸۵ء)	نااہل، نصرانیوں کی کٹھ پتلی

خاتمہ: الفانسو ششم نے طُلَیطلہ پر قبضہ کر کے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

✦✦✦

دولتِ بنو اَفطس ۔ بَطَلْیُوس (مغربی اَندلُس)

ریاست بطلیوس اندلس کے مغرب میں موجودہ پرتگال کے اکثر رقبے پر واقع تھی۔ قُرطُبہ کی مرکزی حکومت کے دورِ زوال میں یہاں شاپور فارسی نامی ایک غلام بطور نائب حکومت کر رہا تھا۔ اس کی وفات ہوئی تو اس کے وزیر محمد بن مسلمہ عرف ابن اَفطس نے (جس کا تعلق بربروں کے قبیلہ مکناسہ سے تھا) المنصور کا لقب لگا کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ رقبے کے لحاظ سے یہ ملوک الطوائف کی سب سے بڑی حکومت تھی۔

یہ ۴۴۳ھ تک بنو عباد کے حملوں کی زد میں رہی، پھر بنو ذوالنون سے کشمکش چلتی رہی اور پھر قسطالیہ کے نصاریٰ اس پر حملے کرتے رہے۔ ۴۵۶ھ میں فرڈی ننڈ اول نے اس کے شمالی شہر قلمریہ پر قبضہ کر لیا۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۱	شاپور فارسی، مولیٰ المستنصر اُموی	۴۰۰ھ تا ۴۱۳ھ (۱۰۱۰ء تا ۱۰۲۲ء)	قُرطُبہ کی طرف سے نائب
۲	عبداللہ بن مسلمہ، ابن اَفطس	۴۱۳ھ تا ۴۳۷ھ (۱۰۲۲ء تا ۱۰۴۵ء)	قابل، ہوشیار، دلیر
۳	محمد بن عبداللہ بن اَفطس، المظفر	۴۳۷ھ تا ۴۶۱ھ (۱۰۴۵ء تا ۱۰۶۸ء)	دلیر، ادیب، شاعر، مصنف
۴	یحییٰ المنصور	۴۶۱ھ تا ۴۶۴ھ (۱۰۶۸ء تا ۱۰۷۲ء)	اپنے بھائی عمر المتوکل سے لڑائی

۵	عمر المتوکل	۴۶۴ھ تا ۴۸۸ھ (۱۰۷۲ء تا ۱۰۹۵ء)	شعر و ادب کا دلدادہ، دلیر

خاتمہ: عمر المتوکل مرابطین کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دولتِ بنو افطس ختم ہوگئی۔

✦✦✦

دولت بنو تجیب، بنو ہود۔ سرقسطہ (شمالی اندلس)

سرقسطہ کا خاندانِ بنو تجیب طویل زمانے سے شمالی سرحدوں کا محافظ چلا آرہا تھا۔ قرطبہ میں سیاسی بحران شدید ہوا تو وہاں کے رئیس منذر بن یحییٰ نے خود مختاری اختیار کرلی۔ اس کا بیٹا یحییٰ اور پوتا منذر معز الدولہ اس کے جانشین ہوئے۔ معز الدولہ کے قتل کے بعد ۴۳۱ھ میں سلیمان بن ہود نے حکومت سنبھالی جو اس کی اولاد میں چلتی رہی۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۱	منذر بن یحییٰ	۴۱۱ھ تا ۴۱۴ھ (۱۰۲۰ء تا ۱۰۲۳ء)	بانیِ حکومت۔ ماہر سیاست دان
۲	یحییٰ بن منذر، المظفر	۴۱۴ھ تا ۴۲۰ھ (۱۰۲۳ء تا ۱۰۲۹ء)	نصرانیوں سے دوستی، کمزور، بعض قلعے دینے پر مجبور ہوا۔
۳	منذر بن یحییٰ، معز الدولہ	۴۲۰ھ تا ۴۳۰ھ (۱۰۲۹ء تا ۱۰۳۹ء)	محل میں قاتلانہ حملے میں قتل
۴	سلیمان بن احمد بن محمد بن ہود	۴۳۱ھ تا ۴۳۸ھ (۱۰۳۹ء تا ۱۰۴۶ء)	ماہر سیاست، حکومت اپنے خاندان میں منتقل کردی۔
۵	احمد بن سلیمان، المقتدر	۴۳۸ھ تا ۴۷۴ھ (۱۰۴۶ء تا ۱۰۸۱ء)	عالم فاضل، شاعر و ادیب، جنگجو، ہوشیار
۶	یوسف بن احمد، المؤتمن	۴۷۴ھ تا ۴۷۸ھ (۱۰۸۱ء تا ۱۰۸۵ء)	ریاضی اور فلکیات کا ماہر۔ بھائی منذر سے خانہ جنگی۔ سِڈ سے مدد لیتا رہا۔
۷	احمد بن یوسف، المستعین	۴۷۸ھ تا ۵۰۳ھ (۱۰۸۵ء تا ۱۱۰۹ء)	مرابطین کا مطیع رہا۔ نصرانیوں سے جنگ میں شہید ہوا۔
۸	عبد الملک بن احمد، عماد الدولہ	۵۰۳ھ (۱۱۰۹ء)	مرابطین نے بے دخل کردیا۔
	عبد الملک بن احمد، عماد الدولہ (دوبارہ)	۵۰۳ھ تا ۵۲۴ھ (۱۱۰۹ء تا ۱۱۳۰ء)	نصرانیوں سے معاہدہ کرکے روطہ الحصینہ پر حکومت کی۔

۹	احمد بن عبدالملک، سیف الدولہ	۵۲۴ھ تا ۵۳۶ھ (۱۱۳۰ء تا ۱۱۴۱ء)	الفانسو ریمنڈ نے بے دخل کردیا

خاتمہ: مرابطین کے دورِ زوال میں یہ حکومت شمال کے نصرانیوں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔

❖❖❖

دولت بنو عامر۔ بَلَنسِیَہ (مشرقی اندلس)

قُرطُبہ میں بحران کے دور میں ابن ابی عامر کے دو صقلبی غلاموں مبارک اور مظفر نے مل کر مشرقی اندلس کے اہم ساحلی شہر بَلَنسِیَہ میں آزاد حکومت قائم کرلی۔ ان دونوں کی وفات کے بعد مقالبہ نے منصورِ اعظم ابن ابی عامر کے پوتے عبدالعزیز بن عبدالرحمن بن ابن ابی عامر کی بیعت کرکے اُسے بَلَنسِیَہ کا حکمران بنالیا۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۱	مبارک، مظفر	۴۰۰ھ تا ۴۰۸ھ	مثالی اتحاد، قابل جوڑا
۲	مجاہد عامری	۴۰۸ھ تا ۴۱۱ھ	قابل حکمران
۳	عبدالعزیز بن عبدالرحمن	۴۱۱ھ تا ۴۵۳ھ	ہوشیار حکمران
۴	عبدالملک المظفر بن عبدالعزیز	۴۵۳ھ تا ۴۵۷ھ	بدسیرت، شرابی، عیاش

عبدالملک المظفر طُلَیطُلَہ کے حکمران یحییٰ المامون کا داماد تھا مگر بعد میں ان کے تعلقات کشیدہ ہوگئے اور یحییٰ نے اُسے قید کرکے بَلَنسِیَہ پر قبضہ کرلیا اور ابوبکر محمد بن عبدالعزیز کو یہاں کا اپنا نائب مقرر کردیا۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۵	ابوبکر محمد بن عبدالعزیز	۴۵۷ھ تا ۴۶۷ھ	نیابت از: یحییٰ المامون، طلیطلہ
۶	ابوبکر محمد بن عبدالعزیز	۴۶۷ھ تا ۴۶۸ھ	نیابت از: یحییٰ القادر، طلیطلہ

۴۶۸ھ میں ابوبکر بن عبدالعزیز نے یہاں خودمختار حکومت قائم کرلی۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۷	ابوبکر بن عبدالعزیز	۴۶۸ھ تا ۴۷۸ھ	
۸	قاضی عثمان بن ابوبکر	صفر ۴۷۸ھ تا ذوالقعدہ ۴۷۸ھ	

صفر ۴۷۸ھ میں طُلَیطُلَہ کے سقوط کے بعد بَلَنسِیَہ میں یحییٰ القادر نصرانیوں کی مدد سے کٹھ پتلی حاکم بن گیا۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۹	یحییٰ القادر	۴۷۸ھ تا ۴۸۵ھ	عوام نے قتل کردیا
۱۰	سِڈ (نصرانی حاکم)	۴۸۵ھ تا ۴۹۵ھ	نصرانیوں کی حکومت

خاتمہ: مرابطین نے شدید جنگوں کے بعد شہر کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

+++

امرائے دانیہ (مشرقی اندلس)

یہ وہ صقلبی امراء تھے جو قرطبہ سے تعلق رکھتے تھے اور دورِ زوال میں مشرقی اندلس کے بعض شہروں میں خود مختار ہو گئے تھے۔ ان میں سے مجاہد صقلبی نے دانیہ میں حکومت قائم کی۔

۱	مجاہد بن یوسف	۴۰۸ھ تا ۴۳۶ھ (۱۰۱۷ء تا ۱۰۴۴ء)	
۲	علی بن مجاہد اقبال الدولہ	۴۳۶ھ تا ۴۶۸ھ (۱۰۴۴ء تا ۱۰۷۵ء)	

خاتمہ: یہ حکومت سرقسطہ کے ہوہود کے ہاتھوں ختم ہوئی۔

+++

امرائے اَلمَرِیہ (مشرقی اندلس)

قرطبہ سے الگ ہونے والوں میں صقلبی سردار خیران عامری بھی تھا جس نے مشرقی اندلس کے شہر اَلمَرِیہ کے حاکم افلح صقلبی کو مغلوب کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۱	خیران عامری صقلبی	۴۰۵ھ تا ۴۱۹ھ (۱۰۱۴ء تا ۱۰۲۸ء)	قابل حکمران
۲	زہیر عامری، ابو القاسم	۴۱۹ھ تا ۴۲۹ھ (۱۰۲۸ء تا ۱۰۳۸ء)	اچھا، دلیر حکمران

زہیر عامری ۴۲۹ھ میں غرناطہ کے حکمران بادیس بن حبوس سے جنگ میں قتل ہو گیا تو مقامی امراء نے حکومت عبدالعزیز بن ابی عامر (حاکم بلنسیہ) کے حوالے کر دی۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۳	معن بن صمادح (بنو تجیب)	۴۲۹ھ تا ۴۳۳ھ (۱۰۳۸ء تا ۱۰۴۱ء)	نیابت از عبدالعزیز بن ابی عامر
۴	معن بن صمادح (بنو تجیب)	۴۳۳ھ تا ۴۴۳ھ (۱۰۴۱ء تا ۱۰۵۱ء)	خود مختار حکمرانی
۵	محمد بن معن بن صمادح، معتصم	۴۴۳ھ تا ۴۸۴ھ (۱۰۵۱ء تا ۱۰۹۱ء)	عالم فاضل، شاعر، ادیب، جنگجو
۶	معز الدولہ	۴۸۴ھ (۱۰۹۱ء)	چند ماہ حکومت، پھر فرار

خاتمہ: یہ حکومت ۴۸۴ھ میں مرابطین کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ اس سے قبل معز الدولہ فرار ہو کر افریقہ چلا گیا اور بنو حماد کے ہاں بجایہ میں پناہ لی۔

+++

امرائے مُرسیہ (مشرقِ اندلس)

خیران عامری نے المَرِیّہ کو مرکز بنا کر مُرسیہ پر بھی حکومت کی اور وہاں زُہیر عامری کو اپنا نائب بنایا۔ خیران عامری کی وفات کے بعد زُہیر وہاں کا خودمختار حاکم بن گیا۔ زُہیر کی نیابت میں وہاں ابوبکر احمد بن طاہر حکومت کرتا رہا اور بعد میں خودمختار ہوگیا۔ پھر یہ شہر اشبیلیہ کے تحت آگیا مگر بعد میں یہاں کے والی ابن رشیق نے بغاوت کردی۔

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	خاص بات
۱	ابوبکر احمد بن طاہر	۴۱۹ھ تا ۴۲۹ھ (۱۰۲۸ء تا ۱۰۳۸ء)	نیابت از زُہیر، حاکم المَرِیّہ
۲	ابوبکر احمد بن طاہر	۴۲۹ھ تا ۴۵۲ھ (۱۰۳۸ء تا ۱۰۶۱ء)	نیابت از عبدالعزیز، حاکم بلنسیہ
۳	محمد بن ابوبکر ابوعبدالرحمٰن	۴۵۲ھ تا ۴۵۷ھ (۱۰۶۳ء تا ۱۰۶۵ء)	نیابت از عبدالملک حاکم بلنسیہ
۴	محمد بن ابوبکر ابوعبدالرحمٰن	۴۵۷ھ تا ۴۷۱ھ (۱۰۶۵ء تا ۱۰۷۸ء)	خودمختار حکومت
۵	ابن عمار	۴۷۱ھ تا ۴۷۵ھ (۱۰۷۸ء تا ۱۰۸۱ء)	نیابت از معتمد (حاکم اشبیلیہ)
۶	ابن رشیق	۴۷۵ھ تا ۴۷۹ھ (۱۰۸۱ء تا ۱۰۸۶ء)	خودمختار حکومت
۷	ابوالحسن بن الیسع	۴۷۹ھ تا ۴۸۱ھ (۱۰۸۶ء تا ۱۰۸۹ء)	نیابت از معتمد (حاکم اشبیلیہ)
۸	ابن رشیق	۴۸۱ھ تا ۴۸۴ھ (۱۰۸۹ء تا ۱۰۹۱ء)	خودمختاری اور پھر معزولی

خاتمہ: مرابطین کے مقابلے میں ابن رشیق مغلوب ہوکر معزول ہوگیا اور یہ شہر دولتِ مرابطین کا حصہ بن گیا۔[1]

+++

---

① ملوک الطوائف کی حکومتوں کی مذکورہ فہارس مرتب کرنے میں درج ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے:

☆ دولة الاسلام فی الاندلس لعبدالله عنان المصری

☆ التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الیٰ سقوط غرناطة، لعلی عبدالرحمن

☆ فرمانروایانِ اسلام از ڈاکٹر غلام جیلانی برق، ط الفیصل لاہور

اندلس میں مرابطین کا دور

۴۸۴ھ تا ۵۴۱ھ

(۱۰۹۱ء تا ۱۱۴۷ء)

۵۷ سال

اندلس، مرابطین کی حکمرانی میں

۴۸۴ھ سے اندلس میں مرابطین کا دور شروع ہو جاتا ہے، اگرچہ افریقہ میں ان کی حکومت بہت پہلے شروع ہو چکی تھی جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے۔ مرابطین کی حکومت نے مسلم اندلس کو سقوط سے بچا کر ایک نئی زندگی دے دی اور ظاہر ہے کہ اتنی بڑی نعمت کے لیے اندلس کو قربانی دینا لازم تھی۔ انہی میں اُن خاندانی حکومتوں کی قربانی بھی شامل تھی جو الگ الگ شہروں پر مسلط تھیں۔

ملوک الطوائف کا جو انجام ہوا، وہ مکافاتِ عمل تھا۔ اس پر ہمیں غمزدہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، ہاں معتمد کی علم دوستی، شرافت اور دلیری جیسی خوبیوں کے باعث تاریخ کے طالب علم کو اس سے ہمدردی ضرور ہوتی ہے۔ اُس کے اور اُس کے خاندان کے ساتھ جو کچھ ہوا، یقیناً اس پر ہمیں افسوس ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ بالکل بے قصور تھے اور مرابطین نے ان پر ظلم کیا تھا۔ عام طور پر مغربی مؤرخین جو مرابطین سے شدید عناد رکھتے ہیں، ان واقعات کو اس طرح ذکر کرتے ہیں جیسے مرابطین نے ملوک الطوائف سے غیر انسانی سلوک کیا تھا۔ حالانکہ مرابطین کا برتاؤ اُن ظالم فاتحین سے کہیں بہتر تھا جو مخالفین کے سر قلم کر کے ہی چھوڑتے تھے۔

مرابطین سے، جو درویشانہ زندگی کے قائل تھے، یہ توقع رکھنا خوش فہمی تھی کہ وہ ملوک الطوائف پر قابو پا کر انہیں اندلس ہی میں عشرت گاہیں فراہم کریں گے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مرابطین ان حکام کو اپنی صفوں میں معزز مقام دے سکتے جو خود کو آزاد حکمران کے سوا کسی اور مقام پر دیکھنا برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان سے غداری کا بار بار تجربہ ہو چکا تھا اس لیے انہیں ساتھ رکھنا آستین میں سانپ پالنے کے مترادف تھا اور انہیں آزاد چھوڑنا بغاوتوں کو دعوت دینا تھا۔ مرابطین کے نزدیک ان سے مناسب سلوک یہی ہو سکتا تھا کہ انہیں ان کے اہل و عیال سمیت حراست میں رکھا جاتا۔ اگر انہیں عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کا موقع دیا جاتا تو یہ ان ہزاروں انسانوں سے ناانصافی ہوتی جن کا خون، ان حکام کی غیر ذمہ داری، نااہلی، عشرت پسندی، باہمی خانہ جنگی اور نصرانیت نوازی کی نذر ہوتا رہا۔

یہ درست ہے کہ قید خانے میں انہیں زیادہ عیش و راحت میسر نہ تھی۔ پہننے کو عام سے کپڑے اور کھانے کو معمولی غذا ملتی تھی مگر مرابطین کے حکمران یوسف بن تاشفین کا رہن سہن بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ الزام تب درست ہوتا جب امیر یوسف نے اپنے لیے اشبیلیہ اور قرطبہ کے خوبصورت محلات پسند کیے ہوتے۔

✦✦✦

بَلَنْسِیہ کی تحریکِ آزادی:

مرابطین کی فتوحات دیکھ کر بَلَنْسِیہ کے مقامی امراء نے نصرانیوں کا تسلط قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے یحییٰ القادر اور اس کے سرپرست سِڈ کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ابن جحاف نامی ایک غیور رئیس ان کی قیادت کر رہا تھا۔ جب اس نے داؤد بن عائشہ کو خفیہ پیغام بھیج کر بَلَنْسِیہ میں مداخلت کی دعوت دی تو اس نے بلا تاخیر چنیدہ سپاہیوں کا ایک دستہ بَلَنْسِیہ میں داخل کر دیا۔ اسی وقت امرائے شہر بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے سِڈ کے نائب ابن الفرج کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد وہ شاہی محل میں گھس گئے جہاں بڑی تلاش کے بعد یحییٰ القادر زر و جواہر کے صندوق سمیت غسل خانے میں چھپا ہوا ملا۔ اسے قتل کر کے سرِ شارع عام پر آویزاں کر دیا گیا۔ یہ ۲۳ رمضان ۴۸۵ھ کا واقعہ ہے۔ اس کامیابی کے بعد اہل شہر نے ابن جحاف کو اپنا سربراہ بنا کر نصرانیوں کی غلامی سے آزادی کا اعلان کر دیا۔[1]

سِڈ کا بَلَنْسِیہ پر قبضہ:

اس دوران ایک طرف الفانسو ششم مسلمانوں کو شرقی اور مغربی محاذوں پر متوجہ دیکھ کر ۴۸۵ھ میں یکدم "جیان" پر چڑھ دوڑا۔ مسلمانوں کو پہلے شکست ہوئی مگر بہت جلد انہوں نے سنبھل کر جوابی حملہ کیا اور نصرانیوں کو بدترین شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

دوسری طرف نصرانی کمانڈر سِڈ کمپیڈور، جو جنوب مشرقی اندلس کو اپنی جاگیر تصور کیے ہوئے تھا، سخت برافروختہ تھا۔ وہ ۴۸۶ھ میں جب بَلَنْسِیہ پہنچا جسے وہ اپنا پایہ تخت سمجھتا تھا تو اس کے لیے دروازے نہ کھولے گئے۔ سِڈ نے شہر کا سختی سے محاصرہ کر لیا جو بیس ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران اہل شہر فاقوں سے جاں بلب ہو گئے مگر انہوں نے ہتھیار ڈالنا گوارا نہ کیا۔ آخر ۲۸ جمادی الاولیٰ ۴۸۷ھ کو بَلَنْسِیہ کے عمائد نے جان و مال کی آزادی کی شرط پر شہر سِڈ کے حوالے کر دیا۔ اس وقت تک یہ عظیم الشان شہر کھنڈر بن چکا تھا اور لوگ دانے دانے کے محتاج ہو چکے تھے۔ سِڈ نے شہر پر قبضے کے بعد اس کی بہترین عمارتوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ اہل شہر کے سربراہ ابن جحاف کو زندہ آگ میں ڈال کر اپنی آتشِ انتقام بجھائی۔ اس نے خود کو "بادشاہ" قرار دیا اور پورے اندلس کو زیرِ نگیں کرنے کے سنہرے سپنے دیکھنے لگا۔[2]

محمد بن تاشفین کی آمد، بَلَنْسِیہ کی بازیابی اور سِڈ کی موت:

مگر مرابطین کی موجودگی میں یہ خواب زیادہ دن تک حقیقت نہ رہ سکا۔ یوسف بن تاشفین نے مشرقی اندلس کے امراء، علماء اور عوام کے فریادیں سننے کے بعد سِڈ کمپیڈور کی مکمل سرکوبی کا عزم کر لیا۔ ان کے بھائی محمد بن تاشفین نے مراکش، غرناطہ، شنتریہ اور طرطوشہ کی فوجیں لے کر رمضان ۴۸۸ھ میں بَلَنْسِیہ کو گھیر لیا۔

---

① دولة الإسلام في الأندلس: ۲/ ۳۳۰، ۳۳۱؛ تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۲۰۱، ۲۰۵، ط دار الفکر

② دولة الإسلام في الأندلس، لعبدالله عنان المصري: ۲/ ۳۳۵

ایک طویل محاصرانہ جنگ کا آغاز ہوا جس کے دوران درجنوں جھڑپیں ہوئیں۔ مسلمان پیچھے ہٹے نہ سِڈ نے ہتھیار ڈالے بلکہ کبھی کبھار وہ اپنے فوجیں لے کر شب خون مار کر مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچاتا رہا۔ سِڈ کی طلب پر الفانسو ششم نے بھی اپنی فوجیں بھیج دیں اور بلنسیہ کے گرد ونواح میں اس کی فوجوں سے مرابطین کی شدید جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ محمد بن تاشفین نے اپنا گھیرا ٹوٹنے نہ دیا۔ آخر نصرانی ریاست ارغون کا حکمران بیدرو بھی اپنی فوجیں لے کر اس محاذ پر آ گیا اور محاصرے کے دوسرے سال محرم ۴۹۰ھ میں کوہ مندیر کے قریب مسلمانوں کا نصرانیوں کی اس متحدہ فوج سے گھمسان کا معرکہ ہوا۔ مسلمانوں کو شکست ہوئی اور وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔

تاہم حاکم ارغون کے اپنے ملک واپس جانے کے بعد انہوں نے طلیطلہ کی طرف پیش قدمی کی۔ ''کونسوویجرا'' کے میدان میں نہ صرف الفانسو ششم کو شکست ہوئی بلکہ سِڈ کا اکلوتا بیٹا ڈان ڈیگو بھی مارا گیا۔ اس دوران مُرسیہ سے داؤد بن عائشہ نے اچانک یلغار کی اور قونقہ کے نواح میں قسطالیہ کی ایک اور فوج کو جو البار ہانیس کی کمان میں تھی، کچلتے ہوئے بلنسیہ پہنچ گیا اور شہر کے باہر تعینات فوج کو اس طرح روندڈالا کہ اکا دکا کے سوا کوئی زندہ نہ بچا۔

سِڈ کمپیڈور پہلے ہی بیمار تھا، بیٹے کی موت اور اپنی فوجوں کی پے در پے شکستوں نے اسے ایسا نڈھال کیا کہ وہ شعبان ۴۹۲ھ (جون ۱۰۹۹ء) میں آہ وبکا کے ساتھ ایک المناک موت مر گیا۔

یہ وہ دن تھے جب یورپ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ میں جلنے لگا تھا۔ ۴۸۴ھ میں ایک طرف نصرانیوں نے جزیرہ صقلیہ (سسلی) پر قبضہ کر کے وہاں سے مسلمانوں کی ۲۷۰ سالہ حکومت ختم کر دی، تو دوسری طرف پطرس راہب پہلی صلیبی جنگ کا بگل بجا چکا تھا اور پوپ کے حکم سے ہر نصرانی حکمران اپنے لشکر شام کے ساحلوں کی طرف روانہ کر رہا تھا۔ تاہم پوپ نے اسپین کے نصرانیوں کو اس فرض سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا تاکہ وہ مرابطین سے نبرد آزما رہیں۔ جب یورپ کے صلیبی لشکر شام میں گھس کر مسلمانوں کی سلامتی خطرے میں ڈال رہے تھے، تب اندلس میں مرابطین آزادی کی نئی تاریخ رقم کر رہے تھے۔ جب نصرانی بیت المقدس پر صلیبی پرچم گاڑ کر مسجدِ اقصیٰ کو مسلمانوں کا مذبح خانہ بنا رہے تھے تو مرابطین سِڈ اور الفانسو ششم جیسے فرعونوں کا غرور خاک میں ملا رہے تھے۔

سِڈ کے مرنے کے بعد اس کی بیوی نے شہر کا انتظام سنبھال کر مزید دو سال شہر کا دفاع کیا مگر آخر میں وہ یہ شہر الفانسو ششم کے حوالے کرنے پر مجبور ہوگئی۔ الفانسو ششم جمادی الاولیٰ ۴۹۵ھ (مارچ ۱۱۰۲ء) میں شہر میں داخل ہوگیا۔ اسلامی افواج اس وقت شاطبہ کے قریب ساحل پر چھاؤنی بنا کر فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ الفانسو ششم نے مقابلہ بے سود سمجھتے ہوئے نصرانیوں کو انخلاء کا حکم دیا۔ جاتے ہوئے وہ سِڈ کی حنوط شدہ لاش کے ساتھ مال ودولت کے تمام ذخائر لاد کر لے گیا اور شہر میں جگہ جگہ آگ لگا دی۔ شعبان ۴۹۵ھ میں جب مسلمان بلنسیہ میں داخل ہوئے تو وہاں کھنڈرات کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔[1]

---

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲/ ۳۲۶ تا ۳۲۸ Story of the moors in Spain 208 to 213

خلافتِ عباسیہ کے بارے میں مرابطین کا طرزِ عمل:

امیر یوسف بن تاشفین اور مرابطین عباسی خلافت کو عالمِ اسلام کا نقطۂ وحدت سمجھتے تھے اور اس کا انتہائی ادب و احترام کرتے ہوئے خود کو اس کا خادم تصور کرتے تھے۔ مرابطین خلافتِ عباسیہ کا شعار یعنی سیاہ عمامہ پہنتے اور اپنے سکوں پر عباسی خلیفہ کا نام کندہ کرواتے تھے۔ چنانچہ الفانسو کو شکست دینے اور ملوک الطوائف پر قابو پانے کے بعد امیر یوسف نے ۴۸۷ھ میں ایک وفد عباسی خلیفہ اَلْمُسْتَظْہِر باللہ کی خدمت میں بھیج کر ان فتوحات کی کارگزاری خلیفہ کے گوش گزار کرنے کے ساتھ دربارِ خلافت سے وابستگی کی تجدید کی۔

خلیفہ اَلْمُسْتَظْہِر نے اس سفارت کا خیر مقدم کیا اور جوابی مراسلے میں امیر یوسف بن تاشفین کی خوب تعریف و توصیف کی اور اسلام کے لیے ان کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے کہا:

> "اللہ آپ کے جلال میں اضافہ فرمائے اور آپ کا سایہ مزید پھیلے۔ آپ اخلاص کی رسّی کو تھامے رہیے کیوں کہ آپ دین پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کے باعث اس کے حق دار ہوئے کہ آپ کے ہاتھوں اس نظام کی اصلاح ہوئی اور کفار کا استیصال ہو گیا۔"[1]

اندلس کے بارے میں یوسف بن تاشفین کی حکمتِ عملی:

بَلَنْسِیَہ کی بازیابی کے بعد ۴۹۵ھ میں یوسف بن تاشفین نے چوتھی بار اندلس کا دورہ کیا اور اس جزیرہ نما کے سیاسی مرکز قُرطُبَہ میں اپنے بیٹے علی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا جو اپنی خوبیوں اور کارناموں کی وجہ سے بلاشبہ اس منصب کا حق دار تھا۔ یوسف بن تاشفین نے علی کو درج ذیل وصیتیں کیں:

1. اندلس کی سرحدوں کا ہمیشہ پورا خیال رکھا جائے۔
2. اہلِ اندلس خصوصاً قُرطُبہ کے باشندوں سے مہربانی کا سلوک کیا جائے۔ ان کی غلطیوں سے درگزر کیا جائے۔
3. ۱۷ ہزار سپاہی اندلس کی سرحد پر تعینات رکھے جائیں جن میں سے سات ہزار اشبیلیہ، چار ہزار سَرَقُسطہ، تین ہزار غرناطہ اور ایک ہزار قرطبہ میں ہوں۔ باقی دو ہزار کو دیگر اہم قلعوں میں رکھا جائے۔
4. سَرَقُسطہ کے بنوہود کو نہ چھیڑا جائے تاکہ وہ مرابطین اور نصرانیوں کے مابین حائل رہیں۔[2]

پیچھے بتایا جا چکا ہے کہ بنوہود کے فرمانروا المستعین نے مرابطین سے ڈر کر سِڈ اور دیگر نصرانی ریاستوں سے دفاعی معاہدہ کر لیا تھا مگر جب سِڈ اس کی آڑ میں بَلَنْسِیَہ پر قابض ہو گیا تو مستعین کو اپنی رائے بدلنا پڑی۔ چنانچہ اس نے ۴۹۶ھ میں اپنے بیٹے عبدالملک کو امیر یوسف بن تاشفین کے پاس قُرطُبَہ بھیجا اور اطاعت کا عہد و پیمان کیا۔ عبدالملک امیر کے بیٹے علی کی بیعتِ ولی عہدی میں شریک ہو کر واپس سَرَقُسطہ چلا گیا۔

---

[1] فقه التمكين عند المرابطين از علي محمد الصلابي: ص ۱۳۱، ط مؤسسة اقرأ قاهرة

[2] دولة الإسلام في الأندلس لعبدالله عنان المصري: ۲/ ۳۵۲

چوں کہ امیر یوسف بن تاشفین کو معلوم تھا کہ بنوہود کو شمال کے نصرانیوں سے لڑنے اور سیاسی داؤ پیچ کھیلنے کا قدیم تجربہ ہے، اس لیے امیر نے سرقسطہ کو آزاد ریاست کے طور پر رہنے دیا۔ ①

یوسف بن تاشفین کی وفات:

مراکش واپس جا کر ۴۹۸ھ میں یوسف بن تاشفین کی طبیعت بگڑ گئی۔ دو ماہ کی بیماری کاٹنے کے بعد آخر کار یکم محرم ۵۰۰ھ (۱۴ ستمبر ۱۱۰۶ء) کو تاریخ اسلام کا یہ بطل جلیل ۹۰ سالہ پُرمشقت مگر قابلِ رشک زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ② اسلام کے اس جری سپوت نے سرزمینِ اندلس کو وہ آب وتاب دی کہ مزید چار صدیوں تک یہاں اذانیں گونجتی رہیں اور صلیب سرنگوں رہی۔

مرابطین کے غلبے کا مسلمانانِ اندلس پر اثر:

یوسف بن تاشفین نے مسلمانانِ اندلس کو وہ حیات نو دی جس کی توانائی مزید چار سو سال تک باقی رہی۔ اس کے اس کارنامے پر پوری دنیا کے مسلمان خوش تھے تاہم شعراء وادباء نے اس کی دل کھول کر ستائش نہیں کی۔

لین پول اندلس کے ادباء وشعراء کی مرابطین سے بےزاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''شعراء ان بربروں کی سخت مزاجی، تندخوئی اور جہالت سے متنفر تھے۔ کیوں کہ وہ اشعار کے حسن کو سمجھنے سے قاصر تھے۔'' ③

مگر دوسری طرف وہ عوام کی مسرت کا ذکر یوں کرتا ہے:

''لیکن اندلس کے عوام مرابطین کے اندلس پر قبضے سے نہایت مسرور اور خوش تھے کیوں کہ ان کی جانیں اور اموال محفوظ ہوگئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بکھری ہوئی حکومتوں کے دور میں یہ ممکن نہ تھا۔ اس وقت طاقتور ترین حکمران بھی اتنا ہی کرسکتا تھا کہ اپنے قلعے کے آس پاس رہنے والی رعایا کی حفاظت کرلے ورنہ شاہراہیں ڈاکوؤں سے بھری رہتی تھیں اور نصرانی دیہاتوں اور شہروں کو لوٹتے رہتے تھے۔ مگر اب وقتی طور پر ہی سہی، امن قائم ہوگیا تھا۔ لوگ قانون کے پابند ہوگئے تھے۔ نصرانی شکست کھا کر اپنے قلعوں میں لوٹ گئے تھے۔'' ④

◆◆◆

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۲/ ۲۹۱

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس کے بعد مستعین بن ہود نے نصرانی ریاستوں سے دوستانہ معاہدوں کی جگہ جہاد کو ترجیح دی۔ رجب ۵۰۳ھ میں وہ خود نصرانیوں سے جنگ لڑتے ہوئے شہید ہوگیا۔ (دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۲/ ۲۹۱)

② الزلاقۃ معرکۃ من معارک الاسلام: ص ۲۰۲

نوٹ: یوسف بن تاشفین کی عمر کے بارے میں تین اقوال ہیں۔ ❶ ۸۰ سے اوپر "بضع وثمانون سنۃ" (سیر اعلام النبلاء: ۱۹/ ۲۵۳) ❷ ۹۰ سال "عن تسعین سنۃ" (العبر فی خبر من غبر، سنۃ ۵۰۰ھ) عاش تسعین سنۃ. (وفیات الاعیان: ۷/ ۱۲۵) ❸ لگ بھگ ۱۰۰ سال (الزلاقۃ معرکۃ من معارک الاسلام، ص ۲۰۲) بہرکیف ۹۰ کا قول راجح ہے جسے ابن خلکانؒ اور حافظ ذہبیؒ نے نقل کیا ہے۔

③ Story of the moors in Spain 81 ④ Story of the moors in Spain 82

علی بن یوسف

۵۰۰ھ تا ۵۳۷ھ

(۱۱۰۶ تا ۱۱۴۳ء)

یوسف بن تاشفین کی وفات کے بعد ان کے ۲۳ سالہ جانشین علی بن یوسف کا دور شروع ہوا۔ وہ بلند ہمت، ذہین اور مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا اور اپنے والد کی طرح جہاد کا سچا جذبہ رکھتا تھا۔ پس والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ مظلوموں کو انصاف کی فراہمی، مظالم کے انسداد، سرحدوں کی حفاظت اور دشمنوں کے خلاف پیش قدمی کے لیے مستعد رہا۔[1]

سلطنتِ مرابطین میں امام غزالی رحمہ اللہ کی ''احیاء العلوم'' پر پابندی:

علی بن یوسف علماء وفقہاء کی ہر بات مانتا تھا۔ اس زمانے میں امام غزالی رحمہ اللہ کی کتب کی ہر طرف شہرت ہو چکی تھی۔ ان کی کتاب احیاء علوم الدین میں اُن علماء پر جا بجا تنقید تھی جو معرفت سے محروم رہ کر کتب بینی پر انحصار کرتے ہوں اور مناصب کے طلب گار ہوں۔ مرابطین کے دربار سے وابستہ علماء کو خدشہ ہوا کہ اس طرح معاشرے میں علماء کی ساکھ گر جائے گی لہٰذا اس تنقید کو نقصان دہ قرار دیتے ہوئے انہوں نے علی بن یوسف کو آمادہ کر لیا کہ دولتِ مرابطین کی حدود میں امام غزالی کی یہ کتاب ممنوع قرار دی جائے۔ چنانچہ ۵۰۳ھ میں سرکاری حکم کے مطابق اس کتاب پر پابندی لگادی گئی۔ جہاں بھی اس کے نسخے ملے انہیں جلا دیا گیا۔[2]

معرکۂ ہفت میں فتح۔ الفانسو ششم کی موت:

علی بن یوسف نے باپ کی وصیت کے مطابق نصرانیوں کے خلاف جہادی مہمات بھی جاری رکھیں۔ مرابطین کا ہدف طُلَیطلہ کو فتح کرنا تھا مگر حکمتِ عملی کے تحت وہ پہلے اس کے گردو نواح کے قلعے سر کرنے لگے۔

۵۰۱ھ میں اسلامی لشکر نے امیر تمیم بن تاشفین کی قیادت میں طُلَیطلہ کے مشرقی ضلعے اقلیش (Ucles) پر حملہ کیا۔ الفانسو ششم نے اپنے گیارہ سالہ لڑکے شانجہ کو دس ہزار سوار دے کر بھیجا تھا جس کے ساتھ طُلَیطلہ کا نواب،

---

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۵۸

[2] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۷۸، ۷۹

نواب ''البرہانس'' اور قبرہ کا نواب ''غریب اردون'' بھی تھے۔

۱۶ شوال ۵۰۱ھ کو فیصلہ کن جنگ میں نصرانیوں کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ ۳۰ ہزار نصرانیوں کے علاوہ الفانسو ششم کا واحد وارث شانجہ بھی مارا گیا۔ اس کے علاوہ لشکر کی قیادت کرنے والے ساتوں نامی گرامی نصرانی نواب بھی مارے گئے اس لیے یہ جنگ ان کے ہاں معرکۂ ہفت (سات کا معرکہ) کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ بھیانک خبر سننے کے چند ماہ بعد ۵۰۲ھ میں بوڑھا الفانسو ششم خود بھی چل بسا۔ یوں مسلمانانِ اندلس کو ایک ایسے دشمن سے نجات ملی جو نصف صدی تک ان کے لیے ایک عذاب بنا رہا۔ الفانسو ششم کی موت کے بعد قسطالیہ کی حکومت کمزور ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ اندلس کے نصرانیوں کی عسکری وسیاسی قیادت کا مقام ریاستِ ارغون کے حکام کو مل گیا۔ [1]

طُلَیطلہ کے مضافات پر قبضہ:

اسی سال علی بن یوسف خود اندلس میں اترا، اس کا اصل ہدف طُلَیطلہ تھا مگر گرد و نواح کے شہر اور قلعے فتح کیے بغیر اس عظیم شہر کا محاصرہ بہت مشکل تھا لہٰذا کئی ماہ تک شمالی اندلس میں قسطالیہ کی افواج سے جنگیں ہوتی رہیں۔ بعض معرکوں میں مرابطین کو پسپائی بھی ہوئی تاہم اس دوران طُلَیطلہ کے نواح میں طلبیرہ، وادی الحجارہ اور مجریط (جس کے نام پر اب طُلَیطلہ کو مدرید کہا جاتا ہے) فتح کر لیے گئے۔ [2]

طُلَیطلہ پر قبضے میں ناکامی:

۵۰۳ھ کی اس مہم میں طُلَیطلہ کا بھی محاصرہ کیا گیا مگر سات دن بعد مسلمان محاصرہ ختم کر کے واپس ہو گئے۔ [3] غالباً محاصرے کی بھرپور تیاری نہ ہونے کے باعث واپسی کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

۵۰۷ھ میں امیر ابومحمد مزدلی (حاکم قرطبہ) کی قیادت میں طُلَیطلہ پر دوبارہ حملہ ہوا مگر نصرانی مرابطین کی منجنیقوں اور بھاری آلات حصار کو نذرِ آتش کرنے میں کامیاب ہو گئے، جس کے باعث محاصرہ جاری نہ رہ سکا۔

اسی سال جمادی الاولیٰ میں اندلس کے سپہ سالارِ اعلیٰ سیر بن ابوبکر کی، جبکہ شوال ۵۰۸ھ میں امیر ابومحمد مزدلی کی وفات ہوگئی۔ یوں مسلمانانِ اندلس کو دو بھاری نقصانات اٹھانا پڑے۔ [4]

بہرکیف یہ واپسی مسلمانوں کے لیے بہت مضر ثابت ہوئی۔ اگر مرابطین ڈٹ جاتے تو یہ شہر چند ہفتوں یا چند ماہ بعد فتح ہو ہی جاتا مگر اس کے بعد مسلمانوں کو دوبارہ یہاں حملے کا موقع نہ مل سکا جس کے باعث شمالی اندلس کی فتوحات کی نوبت نہ آسکی۔ دوسری طرف وسطی اندلس میں مسلمانوں کے خلاف سب سے مضبوط مورچہ نصرانیوں کے ہاتھ میں رہا جسے وہ مسلسل کام میں لاتے رہے۔

---

[1] دولة الاسلام في الاندلس، لعبدالله عنان المصري: ۳/۶۳ تا ۶۷؛ التاريخ الاندلسي من الفتح الاسلامي الى سقوط غرناطة، لعبدالرحمن علي: ص ۳۲۵

[2] دولة الاسلام في الاندلس: ۳/۶۷، ۶۸؛ التاريخ الاندلسي من الفتح الاسلامي الى سقوط غرناطة، لعبدالرحمن علي: ص ۳۲۶

[3] دولة الاسلام في الاندلس: ۳/۶۸، ۶۹ [4] دولة الاسلام في الاندلس: ۳/۷۰، ۷۱، ۷۲

سرقسطہ کی فتح:

اس دوران مرابطین سرقسطہ پر قبضے کا فیصلہ کر چکے تھے جو ملوک الطوائف کی واحد ریاست باقی رہ گیا تھا کیوں کہ یہاں کے امراء نے علی بن یوسف کو خطوط لکھے تھے کہ بنو ہود اپنی کمزوری کی وجہ سے نصرانیوں سے دفاع کے قابل نہیں رہے لہٰذا اس اہم شہر کو اپنی تحویل میں لیا جائے۔ علی بن یوسف کے حکم پر ۵۰۳ھ میں مرابطین کے افسر ابن الحاج نے سرقسطہ پر حملہ کر دیا۔ یہاں کے حاکم عماد الدولہ نے علی بن یوسف کو مراسلہ بھیج کر سابقہ تعلقات کا واسطہ دیا اور اطاعت کا وعدہ کرتے ہوئے رحم کی درخواست کی۔ علی بن یوسف نرم پڑ گیا اور ابن الحاج کو حکم بھیج دیا کہ وہ سرقسطہ کی مہم ترک کر دے۔ مگر اس مراسلے کے پہنچنے سے قبل کھیل ختم ہو چکا تھا۔ عماد الدولہ مایوس ہو کر اس سے پہلے شہر سے نکل کر ایک دوسری پہاڑی قلعے میں چلا گیا تھا۔ یوں سرقسطہ پر بنو ہود کی ستر سالہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔[1]

مشرقی جزائر کی بازیابی:

۵۰۸ھ میں مشرقی اندلس میں تین نصرانی ریاستوں: پیزہ (Pisa)، جینوہ (Genoa)، اور برشلونہ کی مشترک جمہوریہ نے اندلس کے مشرقی جزائر: میورقہ، منورقہ اور یابسہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ تاہم دو سال بعد ۵۰۹ھ میں مرابطین نے تین سو کشتیوں کا بیڑا لے کر وہاں جہاد کیا اور ان جزیروں پر اپنے پرچم لہرا دیے۔ نصرانیوں نے ان خوبصورت جزیروں کو لوٹ مار اور آتش زدگی سے تقریباً تباہ کر دیا تھا۔ مرابطین نے خطیر رقم خرچ کر کے وہاں از سرِ نو تعمیر آبادیاں، محلے اور مساجد تعمیر کیں۔[2]

پرتگال میں پیش قدمی:

۵۱۱ھ میں علی بن یوسف تیسری بار اندلس آیا اور مغرب میں پرتگال کی فتوحات میں مشغول ہو گیا۔ یہ ایک طویل مہم تھی جو کئی سال جاری رہی۔ اس دوران ۵۱۲ھ میں پرتگال کا پایہ تخت قُلُمریہ (Coimbra) بھی فتح کر لیا گیا۔ یہ شہر نصرانیوں نے ۴۵۶ھ میں بطلیوس کے حکمران المظفر سے چھینا تھا۔[3]

الفانسو رڈمیر اوّل کا عروج:

اسی زمانے میں شمال مشرق سے ارغون کا حاکم رڈمیر (الفانسو رڈمیر اوّل) ایک نئی بلا کی شکل میں نمودار ہوا۔ نصرانی اسے جنگجو بادشاہ اور مسلمان ''الفانسو المحارب'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس نے اپنے آباء و اجداد سے کہیں بڑھ کر جنگ آزما ہونے کا ثبوت دیا۔ اس کا پہلا نشانہ سرقسطہ تھا۔ ۵۱۲ھ میں وہ فرانسیسی فوجوں کو ساتھ ملا کر ۵۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ سرقسطہ پہنچ گیا۔ علی بن یوسف پرتگال میں اپنی سخت مصروفیت کے باعث اس محاذ کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ صفر ۵۱۲ھ سے محاصرہ شروع ہوا جو سات ماہ تک جاری رہا مگر مرابطین کی طرف سے شہر کو کوئی مدد نہ پہنچی۔

---

① دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۳/۷۳، ۷۴

② التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطة: ص ۳۳۶، ۳۳۷؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/۷۶، ۷۷

③ التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطة، لعبد: ص ۳۳۸؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/۸۰، ۸۱

اہلِ شہر نے جان توڑ مزاحمت کے بعد آخر کار فاقوں سے لاچار ہو کر ہتھیار ڈال دیے، یوں ۴ رمضان ۵۱۲ھ کو سَرَقُسطہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ یہاں کے ہزاروں مسلمان معاہدے کے مطابق جنوب مشرقی شہروں کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ رڈمیر نے اس عظیم الشان شہر کو ریاست ارغون کا پایہ تخت بنالیا۔ جامع مسجد چرچ میں تبدیل کردی گئی اور یوں اس شہر کی چار صد سالہ اسلامی تاریخ کا باب بند ہو گیا۔

رڈمیر نے اس کے بعد شمال کے اسلامی شہروں اور قلعوں پر پے در پے حملے کیے۔ تین سال میں وہ تطیلہ، اجون، مالن، ایبلا کے علاوہ ارغون اور قسطالیہ کے درمیان واقع مستحکم ترین قلعہ ایوب بھی فتح کر چکا تھا۔ ①

معرکۂ قُتُنْدہ میں مسلمانوں کو شکست:

علی بن یوسف نے ان حالات میں اپنے بھائی ابراہیم کو شمال کے محاذ پر بھیجا تاکہ سَرَقُسطہ اور دیگر مقبوضہ شہروں کو واپس لیا جائے۔ علماء اور رضا کاروں کی بہت بڑی تعداد بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ اس جہاد میں شرکت کے لیے نکلی۔ رڈمیر بارہ ہزار گھڑ سواروں اور ان گنت پیادوں کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ ۲۴ ربیع الاول ۵۱۴ھ کو شمالی شہر قُتُنْدہ (Cutanda) کے قریب ایک نہایت خونریز معرکہ ہوا جس میں مسلمانوں کو بہت بُری طرح شکست ہوئی۔ ۲۰ ہزار رضا کاروں کے علاوہ ہزاروں سپاہیوں اور سینکڑوں علماء نے جام شہادت نوش کیا۔ ②

رڈمیر جنوبی اندلس میں۔ غرناطہ پر حملہ:

قُتُنْدہ کی جنگ میں کامیابی نے نصرانیوں کے حوصلے بہت بڑھا دیے اور وہ جنوب کی طرف پیش قدمی کے لیے تیار ہو گئے۔ اسی زمانے میں شام میں چھڑنے والی صلیبی جنگوں کے اثرات سے شمالی اندلس میں صلیب کی خاطر لڑنے والی رضا کار تنظیمیں قائم ہوئیں۔ الفانسو رڈمیر نے جنگ قُتُنْدہ کے بعد ان تنظیموں کی سرپرستی کی جنہیں ہاسپٹلرز (الداویہ) یا ٹمپلرز (فرسان المعبد) کہا جاتا تھا۔ اگلی صدیوں میں یہ تنظیمیں مسلمانوں کے لیے بہت بڑی آفت ثابت ہوئیں۔ ③

یہی دن تھے جب غرناطہ کے نصرانی شہریوں نے خفیہ طور پر رڈمیر کو اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے غرناطہ پر قبضے کی دعوت دے ڈالی اور وہ شعبان ۵۱۹ھ میں پچاس ہزار سپاہی لے کر غرناطہ کی طرف نکل پڑا۔ اس کی رفتار اتنی تیز اور پیش قدمی کے خطوط اتنے غیر یقینی تھے کہ مرابطین کسی محاذ پر بھی زیادہ قوت جمع نہ کر سکے۔ غرناطہ کے نصرانی اس کی رہنمائی کے لیے پہنچ گئے تھے اور اسے نت نئے راستوں سے گزار کر ہر ہدف تک لے جا رہے تھے۔

رمضان میں وہ بَلَنْسِیہ کی سرحد تک پہنچ گیا مگر وہاں کے امیر ابو محمد نے اسے آگے نہ بڑھنے دیا۔ تب وہ اچانک سمت بدل کر پہلے شقر اور پھر دانیہ پر حملہ آور ہوا۔ شاطبہ، مرسیہ اور بسطہ تک وہ نواحی بستیوں اور دیہاتوں کو اجاڑتا چلا

---

① التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ: ص ۴۲۸؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۸۸ تا ۱۰۳

② التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ: ص ۴۲۹؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۱۰۲ تا ۱۰۵

③ دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۳/ ۵۱۸

گیا۔ ذوالقعدہ میں وہ وادی آش پہنچ گیا۔ اس یلغار میں اس نے جنوب اور مشرق کا کوئی ضلع نہ چھوڑا۔

مرابطین کی دفاعی تیاریاں یقیناً ناقص تھیں اس لیے دشمن راستے کی ہر رکاوٹ کو کچلتا ہوا آخر ذوالحجہ کے شروع (جنوری ۱۱۲۷ء) میں غرناطہ کے سامنے آدھمکا۔ مقامی نصرانیوں نے اس کا پورا ساتھ دیا۔ تاہم شہر کے جنگجو مسلمانوں نے حریف کی ایک نہ چلنے دی۔ ایک ماہ تک محاصرے کے باوجود لشکرِ صلیب غرناطہ میں داخل نہ ہو سکا اور آخر بارش اور خراب موسم نے اس کے حوصلے پست کر دیے۔

رڈمیر نے واپسی میں الگ راستہ اختیار کیا، وہ شمال کی طرف قلعہ صحب کو جاتے جاتے یکدم مغرب کی سمت مڑ گیا مگر اس دوران غرناطہ کے مسلمانوں نے حریف پر دائیں بائیں سے حملے شروع کر دیے تھے۔ رڈمیر نے غرناطہ سے کچھ دور ٹھہر کو فوج کو منظم کیا اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ مسلمان شام تک جم کر مقابلہ کرتے رہے۔ اگلے دن فیصلہ کن جنگ ہو سکتی تھی مگر رات کے وقت جب امیرِ غرناطہ کا خیمہ مناسب جگہ لگانے کے لیے اکھاڑا جا رہا تھا، یہ افواہ پھیل گئی کہ مسلمانوں کا امیر فرار ہو رہا ہے۔ اس سے فوج بدل ہو گئی اور اندھیرے میں اس طرح تتر بتر ہوئی کہ صبح خیمہ گاہ خالی تھی۔ رڈمیر یہ منظر دیکھ کر مزید جری ہو گیا، وہ دوبارہ جنوب مشرق کی طرف پلٹا اور لوٹ مار کرتے ہوئے کوہ سیرا نویدا کو پار کر کے بحیرۂ روم تک چلا گیا۔ واپسی میں اسے پھر مسلم شہسواروں کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جو عقب سے اس پر چھاپہ مار حملے کر رہے تھے۔ تنگ آ کر وہ مُرسیہ، شاطبہ اور بَلَنسیہ سے کنی کتراتا ہوا سرقسطہ لوٹ گیا۔ پندرہ ماہ کی اس پُر مشقت مہم میں ہزاروں سپاہی ضائع کر کے وہ ایک چھوٹا سا قلعہ بھی فتح نہیں کر سکا تھا۔ تاہم یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ جنوب مشرقی اندلس میں مرابطین کا دفاعی نظام کمزور پڑ چکا ہے۔ ①

غرناطہ کے نصرانیوں کی ملک بدری:

یہ ساری مہم غرناطہ کے غدار نصرانیوں کی مدد سے انجام دی گئی تھی، لہٰذا ان حالات میں مشہور فلسفی ابن رُشد کے دادا قاضی ابوالولید ابن رُشد (۴۵۰ھ۔ ۵۲۰ھ) نے فتویٰ دیا کہ غرناطہ میں موجود نصرانی مملکت کے لیے خطرہ ہیں۔ انہیں سمندر پار بھیجنا ضروری ہے۔ قاضی صاحب نے خود مَرّاکش جا کر امیر علی بن یوسف کو اس پر آمادہ کیا جس کے بعد غرناطہ کی ساری نصرانی آبادی مَرّاکش منتقل کر دی گئی۔ وہاں ستر ہزار دینار کے خرچے سے مَرّاکش شہر سے متصل الگ شہر بنا کر انہیں بسایا گیا۔ ۵۲۰ھ میں اس کام کی تکمیل کے چند ماہ بعد ہی قاضی صاحب کی وفات ہوئی۔ ②

قلاعہ کے میدان میں مسلمانوں کو شکست:

۵۲۳ھ میں رڈمیر ایک بار پھر ایک زبردست لشکر لے کر مسلمانوں کے مقابلے پر آ گیا۔ مسلمانوں نے شمال کی طرف پیش قدمی کی اور دریائے ابرہ کی نہر "سنکا" کے کنارے "قلاعہ" کے میدان میں اس سے ٹکر لی مگر اس بار بھی

---

① دولة الاسلام في الاندلس: ۳/ ۱۰۱ تا ۱۱۲ ؛ التاريخ الأندلسي من الفتح الاسلامي الى سقوط غرناطة: ص ۴۳۱ تا ۴۳۳

② التاريخ الأندلسي من الفتح الاسلامي الى سقوط غرناطة، لعبد الرحمن علي: ص ۴۳۳، ۴۳۴

انہیں شکست ہوئی۔ بارہ ہزار مجاہدین شہید یا گرفتار ہوئے۔

امیر علی بن یوسف نے اس شکست کی اطلاع پر ماہِ شعبان میں اندلس کے امراء کو ایک تسلی آمیز اور ولولہ انگیز مراسلہ بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ تقدیر کا لکھا ہو کر رہتا ہے، بہر حال اسلام کی سربلندی کے لیے جان و مال کی قربانی سے کبھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ امیر نے لکھا کہ اگر وہ خود اس معرکے میں ہوتا تو وہ بھی اپنی جان دینے میں دریغ نہ کرتا۔ ①

افراغہ کا معرکہ، نصرانیوں کو شکست، رذمیر کی موت:

کئی سالوں تک اندلس میں امن رہا کیوں کہ ارغون اور قسطالیہ کے نصرانی حکمران باہمی تنازعات میں الجھ گئے تھے۔ ان جھگڑوں سے فارغ ہوتے ہی ۵۲۸ھ میں الفانسو رذمیر نے بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ لاردہ کے جنوب مغرب میں نہر سنکا کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر تعمیر شدہ قلعے ''افراغہ'' (Farga) کا محاصرہ کر لیا۔ مرابطین اس بار پوری طرح تیار تھے چنانچہ حاکم بلنسیہ یحییٰ بن غانیہ تیزی سے پیش قدمی کر کے رذمیر کے پڑاؤ کے قریب پہنچ گیا۔

افراغہ نہایت مستحکم قلعہ تھا، اس لیے رذمیر نے قسم کھائی تھی کہ چاہے موت آجائے مگر وہ یہ قلعہ فتح کیے بغیر پیچھے نہیں ہٹے گا۔ یحییٰ ابن غانیہ کی آمد پر اسے کھلے میدان میں لڑنا پڑا۔ ابتدائی جھڑپوں کے بعد ۲۳ رمضان ۵۲۸ھ کو فریقین کے مابین نہایت قہر انگیز جنگ ہوئی۔ اُدھر عقب سے افراغہ کے مسلمان بھی میدان میں نکل آئے۔ لشکرِ صلیب مسلمانوں کے دو طرفہ حملے میں پھنس کر کٹ گیا۔ رذمیر دیر تک دست بدست لڑنے کے بعد آخر میں مایوس ہو کر بھاگ نکلا اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر پناہ لی مگر مرابطین تعاقب کرتے ہوئے وہاں بھی پہنچ گئے۔ رذمیر رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے نکل گیا اور بدترین حالت میں سَرَقُسطہ پہنچا۔ چند دنوں بعد وہ اسی بدحالی میں مر گیا۔ ②

البکار کے معرکے میں مسلمانوں کو کامیابی:

انہی دنوں ایک دوسرے محاذ پر قسطالیہ کے نصرانیوں نے یلغار کی۔ مسلمان مرابطین کے ولی عہد تاشفین بن علی کی قیادت میں حریف سے نبرد آزما ہوئے۔ دشمنوں کا دباؤ ایک موقعے پر اتنا بڑھا کہ اکثر اسلامی لشکر پیچھے ہٹ گیا تاشفین بن علی کے ساتھ صرف چالیس سوار رہ گئے۔ اسے فرار کا مشورہ دیا گیا مگر اس نے کہا:

''میں امت کو دشمن کے حوالے نہیں کروں گا، جب تک یہ حملہ پسپا نہیں ہو جاتا میں یہیں جما رہوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے شمشیر اور ڈھال سنبھال کر حریف پر حملہ کر دیا۔ اس کی دلیری نے مرابطین کے اکھڑے ہوئے پاؤں جما دیے۔ ایک زوردار دھاوے میں قسطالیہ کا سپہ سالار مارا گیا اور باقی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ جنگ قرطبہ سے بیس کلومیٹر شمال میں البکار (Albcar) کے مقام پر لڑی گئی۔ ③

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۳/ ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹

② التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ: ص ۳۳۷؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۱۲۲

③ التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۳۳۸، ۳۳۹

ایک تاریخی لغزش، نصرانیوں کے حملے جاری:

مرابطین نے جس طرح معرکۂ زلاقہ کے بعد طلیطلہ پر قبضے کی کوشش نہیں کی تھی اسی طرح ایک ہی وقت میں نصیب ہونے والی ان دونوں شاندار فتح کے بعد بھی انہوں نے طلیطلہ یا سرقسطہ کی طرف پیش قدمی کیے بغیر واپسی اختیار کرلی، حالانکہ اس وقت نصرانیوں کے ان مراکز کا محاصرہ کرنا زیادہ مشکل نہ تھا۔ یہ ایک عسکری غلطی تھی جس کے نتائج آگے چل کر سخت نقصان وہ نکلے اور ان صلیبی مراکز سے جنوبی اور مشرقی اندلس پر مسلسل حملے ہوتے رہے۔

قسطالیہ کی افواج طلیطلہ کے جنوبی قلعے ''مورہ'' کو مرکز بنا کر قرطبہ اور اشبیلیہ کے مضافات کو حملوں کا نشانہ بناتی رہتی تھیں۔ ۵۳۵ھ (۱۱۴۰ء) میں تاشفین کی افواج نے ایک سخت حملہ کر کے یہ قلعہ فتح کرلیا۔ اس پر الفانسو ریمنڈس سخت تلملایا، اس نے اگلے سال ایک لشکر بھیج کر قرطبہ اور اشبیلیہ کا اہم نواحی قلعہ ''قوریہ'' چھین لیا۔[1]

علی بن یوسف کی وفات:

۷ رجب ۵۳۷ھ (۶ فروری ۱۱۴۳ء) کو علی بن یوسف ۶۱ سال کی عمر میں وفات پا گیا۔[2]

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ بہادر، مجاہد، عادل، دین دار، متقی اور نیک تھا۔ علماء کی تعظیم کرتا اور ان کے مشورے پر چلتا تھا۔ اس کے دور میں فقہ اور فروعی مسائل کو اتنا فروغ ملا کہ لوگ حدیث سے لاپرواہ ہوگئے۔ فلسفے اور علم کلام کو مٹایا گیا کیوں کہ علی کے ذہن میں یہ جم گیا تھا کہ علم کلام بدعت ہے جیسا کہ اسلاف سمجھتے تھے۔''[3]

علی بن یوسف کے آخری ایام میں مرابطین کی سلطنت میں کمزوری کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ علی خود بہادر اور پرہیزگار ہونے کے باوجود اپنے باپ جیسا بیدار مغز اور چوکس نہیں تھا۔ اس کے والد نے سخت مشقت اور جہادِ مسلسل سے جو عظیم الشان حکومت قائم کی تھی، علی نے صرف اس کی حفاظت پر اکتفا کیا۔ اندلس میں جو جنگیں ہوئیں وہ بھی محض دفاعی تھیں۔ علی اپنے ۳۷ سالہ طویل دور میں نصرانیوں کا کوئی بڑا شہر فتح نہ کرسکا۔

مزید یہ کہ وہ آخری سالوں میں امورِ سیاست سے اُکتا کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گیا تھا جس کی وجہ سے انتظامی امور میں ہر طرف خلل ظاہر ہونے لگا تھا۔ علی یہ خبریں سن کر دعا کرتا تھا: ''الٰہی! یہ حکومت ایسے لوگوں کو بخش دے جو اسے سنبھال سکیں۔'' علی کی زندگی کے آخری سالوں میں افریقہ سے موحدین ایک زبردست طاقت بن کر ابھرے اور آگے چل کر پورے مراکش اور اسلامی اندلس پر چھا گئے۔[4]

✦✦✦

---

[1] دولة الإسلام في الأندلس، لعبدالله عنان المصري: ۳/ ۵۰۶، ۵۰۷

[2] تاريخ الإسلام للذهبي: ۱۱/ ۶۷۴، ت بشار

[3] سير اعلام النبلاء: ۲۰/ ۱۲۴، ۱۲۵، ط الرسالة

[4] سير اعلام النبلاء: ۲۰/ ۱۲۴، ۱۲۵، ط الرسالة

تاشفین بن علی

۵۳۷ھ تا ۵۳۹ھ

(۱۱۴۳ تا ۱۱۴۵ء)

علی کا جانشین تاشفین بن علی ذاتی طور پر ایک بہترین انسان تھا۔ علامہ ابن الخطیب اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ جوانمرد، بہادر اور نشست و برخاست میں پسندیدہ تھا۔ شریعت کا پابند تھا۔ عوام و خواص میں مقبول تھا۔ اس کی سیاست اچھی تھی۔ اس نے سرحدوں کی حفاظت کی اور دشمنوں کی نگاہوں میں کانٹا بنا رہا...... وہ دن کو روزے رکھنے، راتوں کو عبادت کرنے، کثرت سے قرآن مجید پڑھنے، پوشیدہ طور پر صدقہ وخیرات نکالنے، عدل وانصاف اور حق وصداقت کو ہر چیز پر ترجیح دینے والا تھا۔ اکثر مقدمات کی سماعت خود کرتا تھا۔ علم نواز تھا۔ فقہاء اور طلبہ کو انعام واکرام سے نوازتا تھا۔ اس نے اسپین میں نصرانیوں کو کئی شکستیں دیں۔"[1]

اندلس میں مرابطین کی کامیابی:

تاشفین بن علی کو حکومت کے بمشکل تین سال مل سکے۔ اس دوران وہ بیک وقت نصرانیوں اور موحدین سے نبرد آزما رہا۔ ۵۳۸ھ (۱۱۴۳ء) میں اسپین کے دو نامور جرنیلوں: مارٹن فرنانڈو اور یونیو الفانسو کی قیادت میں مسلمانانِ اندلس کے خلاف بہت بڑی فوج کشی کی گئی، تاہم اس بار مرابطین نے نہایت پامردی سے مزاحمت کی اور قسطالیہ کی فوج کو کاٹ کر رکھ دیا۔ مارٹن شدید زخمی ہو کر بھاگ نکلا۔ یونیو الفانسو فرار ہوتے ہوئے مارا گیا اور اس کا سر قلم کر کے تاشفین کے پاس مراکش بھیج دیا گیا۔[2]

موحدین سے جنگ میں تاشفین کو شکست:

ادھر تاشفین مراکش میں موحدین کا مقابلہ کر رہا تھا۔ وہ "وہران" میں تھا کہ موحدین نے اس شہر کا محاصرہ کر لیا۔ تاشفین آخر میں مزاحمت سے عاجز ہو کر ایک برق رفتار گھوڑے پر شہر سے فرار ہو گیا مگر موحدین کو اطلاع مل گئی اور وہ سائے کی طرح تعاقب میں لگ گئے۔ تاشفین ایک پہاڑ سے گزرتے ہوئے گھوڑے سمیت نیچے سمندر میں گر کر

---

[1] الإحاطة في أخبار الغرناطة: بتلخيص از تذكره تاشفين بن علي: ۱/ ۳۴۷ تا ۳۴۹؛ البيان المغرب: ۴/ ۸۹، ۸۰

[2] دولة الإسلام في الأندلس، لعبدالله عنان المصري: ۳/ ۵۰۶، ۵۰۷

جان بحق ہو گیا۔ یہ ۲۷ رمضان ۵۳۹ھ (۳ اپریل ۱۱۴۵ء) کا واقعہ ہے۔ [1]

◆◆◆

ابواسحٰق ابراہیم بن تاشفین

۵۳۹ھ تا ۵۴۱ھ

(۱۱۴۵ء تا ۱۱۴۷ء)

تاشفین بن علی کی وفات کی خبر ملنے پر امراء نے اس کے بھائی ابواسحٰق ابراہیم کو جس کی عمر سولہ برس تھی، تخت پر بٹھا دیا جو کسی قابل نہ تھا۔ موحدین نے اسے مراکش میں گھیر لیا۔ مرابطین نے بھرپور مدافعت کی اور نو ماہ تک موحدین کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔ تاہم ۱۸ شوال ۵۴۱ھ (۳ اپریل ۱۱۴۷ء) کو موحدین کے سپاہی سیڑھیوں اور رسیوں کی مدد سے فصیل پر چڑھ گئے اور شہر پر قابض ہو گئے۔ یوں مرابطین کی حکومت اپنے قیام کے ۶۷ سال کے بعد موحدین کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔ موحدین نے نہ صرف مرابطین کے خزانوں کو جو بے حد وحساب تھے، لوٹ لیا بلکہ شہر میں عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر تمام بالغ مردوں کا قتل عام بھی کیا جو تین دن تک جاری رہا۔

ابواسحاق ابراہیم جو کسی کونے میں چھپا ہوا تھا، پکڑا گیا۔ عبدالمومن کو اس پر رحم آ گیا۔ وہ اسے زندہ چھوڑ دینا چاہتا تھا مگر اس کے امراء نے قتل پر اصرار کیا، چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ [2]

مرابطین کے دور پر ایک تبصرہ:

مرابطین کی حکومت عمومی لحاظ سے اندلس کے لیے ایک نعمت تھی۔ اس دور کے اہل علم نے جا بجا اسے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اشبیلیہ کے قاضی ابوبکر بن العربی (م ۵۴۳ھ) کا کہنا تھا:

''مرابطین حق کی دعوت اور دین کی نصرت کے لیے کھڑے ہوئے، وہ مسلمانوں کے محافظ اور مجاہد تھے۔'' [3]

ابن ابی زرع رحمہ اللہ فرماتے تھے:

''لمتونہ والے دین دار، نیک نیت اور صحیح العقیدہ تھے۔ انہوں نے اندلس میں نصرانیوں کی سرحدوں سے لے کر بحر اوقیانوس تک، شہر بجایہ سے مراکش کے ساحل تک، اور کوہستان ذہب سے سوڈان تک حکومت کی۔ ان کے دور میں طوالت کے باوجود کوئی غلط رسم پیدا نہیں ہوئی، شہروں یا دیہاتوں پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا، دو ہزار سے زائد شہروں میں ان کے لیے خطبہ دیا جاتا تھا۔ ان کا دور بے فکری، خوشحالی، وسعت، عافیت اور امن کا دور تھا۔

---

① التاریخ الأندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطة، لعبد الرحمن علی، ص: ۳۳۱؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۳ / ۲۵۱

② التاریخ الأندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطة، ص: ۳۳۱، ۳۳۲؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۳ / ۲۶۰ تا ۲۶۵

③ الحلل الموشیة فی ذکر اخبار المراکشیة: ص ۱۳۰ ط دار الرشاد الحدیثة

نہ کوئی سازش تھی نہ ڈاکے اور رہزنی۔ لوگ انہیں پسند کرتے تھے۔"[1]

مرابطین کے زوال کی وجوہ:

مرابطین کے یکایک زوال کی درج ذیل اہم وجوہ تھیں:

1. مالی اسپین کے نصرانی متحد ہو کر بہت بڑی طاقت بن گئے تھے جنہوں نے یورپی طاقتوں سے مل کر اسلامی سرحدوں پر مسلسل جنگیں مسلط کیں اور مرابطین کو کمزور کیا۔

2. مرابطین کو اندلس کے بہت سے امراء کی دلی حمایت حاصل نہیں تھی۔ یہ امراء عیش و تنعم کے عادی تھے اور مرابطین کے سادہ تمدن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خاص کر اندلس کے اکثر عرب امراء، مرابطین کو بربری النسل ہونے کے سبب حکومت کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ غیر عرب امراء بھی مرابطین کو غیر ملکی تصور کر کے ان کا اقتدار ناپسند کرتے تھے۔

3. مرابطین کی حکومت میں بعض کمزوریاں بھی تھیں۔ شریعت کے نفاذ میں انہوں نے بعض جگہ بے جا سختی سے بھی کام لیا۔ جو لوگ توبہ تائب ہو کر ان کی اطاعت کرتے، اگر وہ سابقہ جرائم یا گناہوں کا اقرار کر لیتے یا ان کے خلاف ان معاصی کا ثبوت مل جاتا تو انہیں سزا ضرور دی جاتی۔ یہ سختی بہت سے لوگوں کے بددل ہونے کا سبب بنی۔

4. مرابطین میں بھی اسلامی حکومت، موروثی بادشاہت کی شکل اختیار کر گئی، اگرچہ ان کے سارے حکمران متقی اور لائق تھے، مگر بربروں کے ایک خاندان میں اقتدار کے مرکوز ہونے سے دیگر بربر قبائل میں حسد اور عدم اعتماد پیدا ہونے لگا۔ موحدین بھی بربری تھے اور ان کے خروج کی اصل وجہ یہی کشیدگی تھی۔

5. موحدین نے بڑی تیزی سے قوت پکڑ کر مرابطین کو مشرق سے اپنے حملوں کا ہدف بنایا اور ان کی افواج کو بیک وقت مشرق اور مغرب کے محاذوں پر منتشر کر دیا۔ اگر موحدین کا ظہور نہ ہوتا تو مرابطین اندلس کے نصرانیوں سے دبنے والے نہ تھے۔

فہرست اُمرائے مرابطین

نمبر	نام حکمران	سن ہجری	سن شمسی	مدت حکومت
۱	یوسف بن تاشفین	۴۸۴ھ تا ۵۰۰ھ	۱۰۹۱ء تا ۱۱۰۶ء	۱۶ سال
۲	علی بن تاشفین	۵۰۰ھ تا ۵۳۷ھ	۱۱۰۶ء تا ۱۱۴۳ء	۳۷ سال
۳	تاشفین بن علی	۵۳۷ھ تا ۵۳۹ھ	۱۱۴۳ تا ۱۱۴۵ء	۲ سال
۴	ابو اسحاق ابراہیم بن تاشفین	۵۳۹ھ تا ۵۴۱ھ	۱۱۴۵ء تا ۱۱۴۷ء	۲ سال

✦✦✦

[1] التاريخ الأندلسي من الفتح الإسلامي الى سقوط غرناطة، لعبد الرحمن علي: ص ۳۳۶

ملحوظہ: امیر یوسف بن تاشفین کی حکومت افریقہ میں ۴۶۲ھ تا ۵۰۰ھ ((۱۰۷۰ء تا ۱۱۰۶ء)) رہی جو مجموعی طور پر ۳۸ سال بنتی ہے۔ یہاں فہرست میں فقط اندلس کی حکومت کا زمانہ ذکر کیا ہے۔

اندلس میں موحدین کا دور

۵۴۱ھ تا ۶۲۹ھ

(۱۱۴۷ء تا ۱۲۳۲ء)

۸۸ سال

ابن تومرت

تاشفین بن یوسف کے دور میں افریقہ کی تحریک موحدین خاصی مقبول ہو چکی تھی۔ یہ وہ دور تھا کہ مصر کی نام نہاد خلافتِ فاطمیہ (بنو عبید) اور ان سے پھوٹنے والی باطنیت جیسی گمراہی کی دیگر شاخیں اسلام پر براہِ راست حملہ آور تھیں۔ لہٰذا اسلامی عقیدے اور اسلاف کے منہج کو قائم رکھنے اور قرآن وسنت کے نظریات میں خلط ملط کو دور کرنے کے لیے کئی علماء حرکت میں آئے۔ اسی دوران شمالی مَرّاکش سے ابوعبداللہ محمد بن تومرت نامی ایک شخص ظاہر ہوا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں لوگوں کو اپنا معتقد بنا کر مشرق میں بنوعبید اور مغرب میں مرابطین کے خلاف کھڑا کر دیا۔

مرابطین ابتداء میں جہاد فی سبیل اللہ، عدل وانصاف کے قیام اور منکرات وبدعات کے ازالے کے لیے اُٹھے تھے۔ مگر جب اقتدار "لمتونہ" برادری اور اس کے صنہاجی حلیف قبائل "کدالہ" اور "مسوفہ" میں محدود ہو گیا اور نسلی بادشاہت کا قدیم طرزِ عمل چل پڑا تو بربروں کے دیگر قبائل میں حسد اور بغض پیدا ہو گیا۔ بربروں کے مصمودی قبائل جو اقتدار سے بالکل الگ کر دیے گئے تھے، بگڑ کر کسی بھی باغیانہ تحریک کے لیے تیار ہو گئے۔ محمد بن تومرت کا تعلق انہی مصمودیوں کی شاخ "ہرغہ" سے تھا۔

ابن تومرت ذاتی طور پر عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا عابد وزاہد اور متقی انسان تھا۔ اپنے دعوے کے مطابق وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھا مگر محققین کے نزدیک یہ ایک بلاثبوت دعویٰ تھا جو سیاسی مقاصد کے لیے کیا گیا تھا ورنہ درحقیقت وہ بربری النسل تھا۔ اس کی پیدائش ۴۷۱ھ میں افریقہ کے صحرائی علاقے میں ہوئی تھی۔ ۵۰۱ھ میں وہ طلبِ علم کے لیے نکلا۔ پہلے قرطبہ پہنچا۔ پھر ایشیا کا سفر کیا، بغداد میں ابوبکر الشاشی سے فقہ اور اسکندریہ میں ابوبکر طرطوشی سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔

مشہور ہے کہ وہ امام غزالی رحمہ اللہ کی مجلس میں پہنچا جو ان دنوں بغداد (یا ایک روایت کے مطابق شام) میں تھے۔ امام غزالی رحمہ اللہ اس وقت اندلس میں اپنی کتب پر پابندی کے بارے میں افسوس کرتے ہوئے کہہ رہے تھے:

"عن قریب مرابطین کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا اور ان کی اولاد قتل کر دی جائے گی اور یہ کام جس شخص کے ہاتھوں ہوگا میرے خیال میں وہ اسی مجلس میں ہے۔"[1]

ایک روایت کے مطابق ابن تومرت نے خود انہیں اطلاع دی تھی کہ اندلس میں "احیاء العلوم" جلا دی گئی ہے۔

---

[1] المعجب فی تلخیص اخبار المغرب، لعبدالواحد المراکشی: ۱/ ۱۳۶

اس پر امام غزالی رحمہ اللہ نے ہاتھ اٹھا کر مرابطین کے لیے بددعا کی: ''الٰہی! ان کی حکومت پارہ پارہ کر دے جیسے انہوں نے یہ کتاب پھاڑی۔ ان کی سلطنت ختم کر دے جیسے انہوں نے اسے جلایا۔'' سب طلبہ نے آمین کہا۔ پھر ابن تومرت نے درخواست کی کہ دعا فرمائیں یہ کام میرے ہاتھوں ہو۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے اس کی بھی دعا فرما دی۔[1]

بدُعا کی روایت پر نقد و نظر:

یہ روایت اصولِ تحقیق پر پوری نہیں اترتی۔ اس کے مشکوک ہونے کے قرائن درج ذیل ہیں:

1. امام غزالی رحمہ اللہ نے بغداد میں ۴۸۸ھ تک تدریس کی۔ اس دوران وہ مرابطین کے مداح رہے۔ امیر یوسف بن تاشفین کو ملوک الطوائف کے خلاف کارروائی کے جواز کا فتویٰ دینے والوں میں بھی وہ نمایاں تھے۔ ۴۸۸ھ میں وہ تصوف کی طرف مائل ہو کر بغداد چھوڑ گئے۔ گیارہ سال تک دمشق، بیت المقدس، اسکندریہ، مکہ اور مدینہ میں زہد و ریاضت کی زندگی گزاری۔ ذوالقعدہ ۴۹۹ھ میں وہ بغداد واپس آئے مگر رُکے بغیر نیشاپور چلے گئے اور وہاں پڑھانا شروع کیا۔ تاہم ۵۰۰ھ کے اوائل میں وہاں سے بھی استعفیٰ دے دیا اور امیر یوسف بن تاشفین کے ہاں جانے کے لیے مراکش کے لیے رختِ سفر باندھ لیا مگر جب امیر کی وفات کی اطلاع ملی تو رک گئے۔ اس کے بعد ان کی باقی زندگی ایران کے شہر طوس میں تصنیف و تالیف میں گزری۔ جمادی الاخریٰ ۵۰۵ھ میں وہ فوت ہو گئے۔

مطلب یہ ہے کہ ۵۰۱ھ میں ابن تومرت کا سفر شروع ہونے سے پہلے ہی امام غزالی رحمہ اللہ ایران جا چکے تھے، اس لیے یہ بہت بعید ہے کہ ابن تومرت بغداد یا شام میں ان سے ملا ہو۔ اسی لیے علامہ ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ نے بھی یہ روایت نقل کر کے کہا ہے: ''صحیح بات یہ ہے کہ ابن تومرت کی ان (امام غزالی) سے ملاقات نہیں ہوئی۔''[2]

2. اندلس میں احیاء علوم الدین پر پابندی ۵۰۳ھ میں لگائی گئی تھی۔ اس وقت امام غزالی رحمہ اللہ ایران میں تھے۔ دو سال بعد امام غزالی رحمہ اللہ کی وفات ہو گئی۔ اندلس کی خبر ایران تک پہنچنے کے لیے خاصا وقت درکار تھا۔ ابن تومرت یہ خبر امام غزالی رحمہ اللہ کو اسی صورت میں دے سکتا تھا جب یہ واقعہ پیش آتے ہی وہ اندلس سے ایران روانہ ہو جاتا۔

3. امام غزالی رحمہ اللہ کے اخلاق عالیہ سے بعید ہے کہ انہوں نے ایک اسلامی حکومت کے خلاف صرف اس لیے بربادی کی بددعا دی ہو کہ وہ ان کے علم کی قائل نہ تھی۔ مرابطین نے قرآن وحدیث کا انکار نہیں کیا تھا۔ فقط ایک عالم کی تصنیف کو مسترد کیا تھا۔ پھر اس سارے معاملے میں اصل کردار حکومت کا نہیں ان علمائے دربار کا تھا جنہیں امام غزالی سے اختلاف تھا۔ اس پس منظر میں مرابطین کو ہلاکت کی بددعا دینا امام غزالی کے اخلاق سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ جس طرح ابن تومرت کا حسنی ہونا محض ایک دعویٰ تھا، اسی طرح امام غزالی رحمہ اللہ کی مرابطین کے لیے بددعا کا قصہ بھی سیاسی حربے کے طور پر مشہور کر دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

---

[1] البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۳/۷۷

[2] الکامل فی التاریخ: سنة ۵۱۴ھ

ابن تومرت کی تحریک:

ابن تومرت کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ ایک پیالے اور ایک لاٹھی کے سوا اس کے پاس کچھ نہ ہوتا تھا، اسی فقیرانہ حالت میں وہ ملک ملک گھومتا رہا۔ وہ ایک شگفتہ مسکراہٹ کے ساتھ ہر کسی کا استقبال کرتا اور اس کا دل موہ لیتا۔ تاہم وہ اکثر خاموش رہتا اور بلا ضرورت کوئی بات نہ کرتا تھا۔[1]

اسلامی معاشرے میں رائج غلط عقائد، حرام کاموں اور گناہوں سے وہ سخت کبیدہ خاطر تھا، لہٰذا جہاں جاتا نہایت شد و مد سے توحید کی وضاحت کرتا۔ اس کی دعوت قبول کرنے والے "موحدین" کہلانے لگے۔ وہ بڑی شدت کے ساتھ نیکی کی ترغیب دیتا اور منکرات سے روکتا۔ مگر اس کے عقائد و نظریات میں کچھ چیزیں قابلِ اعتراض تھیں، اس لیے جگہ جگہ علماء نے اس کی مخالفت کی، اسے شہر بدری کی اذیتیں بار بار سہنا پڑیں۔ مکہ سے نکالا گیا تو مصر چلا گیا، وہاں بھی مخالفت ہوئی تو تیونس کے حکام کو اپنی عبادت و ریاضت سے متاثر کرتے ہوئے مَرّاکش پہنچ گیا جہاں مرابطین کی حکومت تھی۔ امیر علی بن یوسف نے پہلے اس کی حرکتوں کو مشکوک سمجھ کر سزا دینے کا ارادہ کیا مگر پھر ایک معمولی فقیر اور مجذوب شمار کر کے شہر بدر کرنے پر اکتفا کیا۔

۵۱۵ھ میں ابن تومرت نے مَرّاکش کے شہر "سوس" سے کچھ دور پہاڑی علاقے "تین مَلَل" کو اپنا ٹھکانہ بنالیا۔ مقامی قبائل کے چند سردار اس کے مرید بنے تو پھر لوگوں کا تانتا بندھ گیا اور لاکھوں افراد اسے اپنا پیر ماننے لگے۔ اس نے اپنے سلسلے کو روحانیت کا رنگ دیا۔ اس کے پیروکار تقویٰ اور دین داری میں مشہور تھے۔

ابن تومرت کا خیال تھا کہ صرف زبانی دعوت اور عملی نمونہ پیش کر کے عالم اسلام میں کوئی ہمہ گیر انقلاب لانا ممکن نہیں، اس کے لیے بہت بڑی سیاسی قوت درکار ہے۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اس سے پہلے کئی سیاست دانوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کر کے لاکھوں لوگوں کو اپنا غلام بنایا اور بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیے۔ لہٰذا ابن تومرت نے شریعت کو رواج دینے کے لیے یہی راستہ اپنایا اور مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ وہ خود کو "امام معصوم" بھی کہتا تھا۔ اس کے انداز میں بنو عبید کی دعوت جیسا مکر و فریب بھی صاف جھلکتا تھا۔ ساتھ ہی معتزلہ کے عقائد و نظریات کی آمیزش بھی دکھائی دیتی تھی۔

اس نے ایک عالی شان مسجد بنا کر اسے اپنا مرکز قرار دیا۔ تعلیم و تربیت، اصلاح نفس اور رشد و ہدایت کا ایک خاص نصاب تیار کیا جسے "مرشدہ" کہا جانے لگا۔ مریدوں کے مراتب طے کیے۔ دس خاص خدام کی ایک مجلسِ عاملہ اور پچاس بربر سرداروں کی ایک مجلسِ شوریٰ قائم کی۔ عام مرید "مومن" یا "موحد" کہلاتے تھے۔ ان سب کو یہ یقین دلا دیا گیا کہ دنیا میں ان جیسے سچے، پاکباز اور خالص مسلمان کہیں بھی نہیں۔ وہ موحدین ہیں اور باقی سب توحید سے

---

① سیر اعلام النبلاء: ۵۳۱، ۵۳۰/۱۹، ط الرسالۃ

برگشتہ ہیں۔ اس وقت دنیا کی تمام مسلم حکومتیں باطل کی پیروکار ہیں لہٰذا ان سے لڑنا واجب ہے۔

اس دوران عبدالمؤمن نامی ایک نہایت ہوشیار، جنگجو اور مدبر نوجوان اس کا دستِ راست بن چکا تھا۔ ابن تومرت نے اسے اپنا نائب بنا کر تمام سیاسی امور اسی کے حوالے کر دیے اور اسے ''امیر المؤمنین'' کا لقب دیا۔

۵۱۷ھ میں اس نے عبدالمؤمن کو کہا:

''مرابطین کو دعوت دو کہ وہ گناہوں اور بدعات کو بند کریں اور امام معصوم پر ایمان لائیں۔ اگر وہ نہ مانیں تو شریعت ان سے جنگ کا حکم دیتی ہے۔''

اس طرح مرابطین اور موحدین میں جنگ ناگزیر ہوگئی۔ امیر علی بن یوسف کا بیٹا زبیر بن علی مرابطین کی فوج لے کر مقابلے پر نکلا اور عبدالمؤمن کو شکستِ فاش دے کر پسپائی پر مجبور کر دیا۔ ابن تومرت نے اس شکست کا حال سن کر کہا: ''اگر عبدالمؤمن سلامت ہے تو سب سلامت ہیں۔''

ابن تومرت نے افریقیوں کو اس طرح اپنا عقیدت مند بنا لیا تھا کہ اس کی طاقت کا خاتمہ کسی طرح نہ ہو سکا۔ اس کے ایک اشارے پر بھائی اپنے بھائی کا سر قلم کر دیتا تھا۔ اس کی ہیبت و مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سرکاری افسران اس کے ہاتھ چومتے۔ اگر وہ کسی قیدی کو چھوڑنے کا اشارہ کرتا تو افسران ذرا بھی پس و پیش نہ کرتے۔

ابن تومرت ان لوگوں میں سے تھا جو نیکی کو پھیلانے کے لیے برائی کا ارتکاب کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ وہ اپنے مخالفین کو زندہ چھوڑنے کا عادی نہ تھا۔ کوہستان تین مل کے قبائلیوں نے اسے ٹھکانا فراہم کیا تھا مگر وہ بعد میں اس کے امام معصوم ہونے میں شک کرنے لگے۔ ابن تومرت نے ان سب کو مروا ڈالا۔ جب اس کے مشیروں میں شامل ایک فقیہ نے ان محسن میزبانوں کو قتل کرنے پر اعتراض کیا تو ابن تومرت نے یہ کہہ کر اسے بھی قتل کرا دیا کہ یہ میری معصومیت میں شک کرنے لگا ہے۔

۵۲۴ھ میں ابن تومرت کا انتقال ہو گیا اور تمام امور عبدالمؤمن کے ہاتھ میں آ گئے۔[1]

◆◆◆

---

[1] سیر اعلام النبلاء: ۱۹/ ۵۳۹ تا ۵۵۲، ط الرسالۃ؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۱۵۵ تا ۲۲۰

عبدالمؤمن

(۵۲۴ھ تا ۵۵۸ھ (۱۱۳۰ تا ۱۱۶۳ء))

عبدالمؤمن ۴۸۷ھ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک سرخ وسفید، خوبصورت، میانہ قامت اور گونج دار آواز والا شخص تھا۔ بعض مؤرخین اس کا تعلق عرب قبیلے بنو مجمر کی شاخ کومہ سے بتاتے ہیں اور بعض قبیلہ مضر کی شاخ قیس سے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ وہ بربر تھا۔ اس کے مضری عرب ہونے کا دعویٰ ویسا ہی ہے جیسا ابن تومرت کے علوی ہونے کا۔

عبدالمؤمن لڑکپن ہی سے نیکی اور عبادت کا خوگر تھا۔ اس میں اخلاص، ہوشیاری، جفاکشی، فصاحت وبلاغت اور شجاعت سمیت وہ تمام صفات موجود تھیں جو بلند پایہ قائدین میں ہونا ضروری ہیں۔ علم کے لیے سفر کے دوران اس کی ملاقات ابن تومرت سے ہوئی۔ عبدالمؤمن اس کا مرید بن گیا اور سالہا سال تک ایسی خدمت کی کہ آخر میں ابن تومرت نے اسی کو اپنا نائب مقرر کر دیا۔

عبدالمؤمن نے قیادت سنبھال کر مرابطین کے علاقے میں مداخلت شروع کر دی۔ علی بن یوسف کے دور تک اسے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی مگر چونکہ موحدین نے نہایت دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں اپنے ٹھکانے بنا رکھے تھے، اس لیے مرابطین ان کی مکمل سرکوبی نہ کر سکے۔

۵۳۷ھ میں علی بن یوسف کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی عبدالمؤمن نے مرابطین کے علاقے پر فیصلہ کن دھاوا بول دیا۔ امیر مرابطین تاشفین کی زیادہ توجہ اندلس میں جہاد پر تھی اور وہاں نصرانیوں سے سخت معرکے جاری تھے، ایسے میں مرابطین دو محاذوں کو نہ سنبھال سکے۔ موحدین کی قوت بے پناہ اور ان کا جوش وخروش بے مثال تھا۔ اس لیے ۵۴۰ھ میں فاس مرابطین کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اگلے سال انہیں سبتہ، طنجہ اور اغمات میں بھی مسلسل شکستیں ہوئیں۔

آخر میں موحدین نے مرابطین کے پایۂ تخت "مراکش" کا محاصرہ کر لیا اور گیارہ ماہ کی جنگ کے بعد ۵۴۲ھ میں اس پر قبضہ کر کے مرابطین کے آخری حکمران ابواسحٰق ابراہیم بن علی کو جو ابھی لڑکا تھا، گرفتار کر لیا۔ عبدالمؤمن اسے معاف کرنا چاہتا تھا مگر اس کے افسران نے اصرار کر کے اسے قتل کر دیا۔ یوں مرابطین کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔[1]

موحدین اور مرابطین کے درمیان یہ کشمکش درحقیقت افسوس ناک تھی۔ اگرچہ موحدین اسے مذہبی رنگ دیتے

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۲۶۰ تا ۲۷۰؛ تاریخ الاسلام للذهبی: ۳۷/ ۸،۷، ۱۰۳، ۱۰۵، ط تدمری

تھے مگر در حقیقت یہ بربروں کے دو طاقتور قبائل کے مابین اقتدار کی رسہ کشی تھی۔ مرابطین کی حکومت میں ایسی کوئی بڑی خرابی نہ تھی کہ اسے بزورِ شمشیر ختم کیا جاتا۔ ایک عقیدے، ایک نظریے اور ایک مذہب کے پیروکاروں کی اس باہمی لڑائی کو اقتدار کی کش مکش کے سوا کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔

یہ بات درست ہے کہ موحدین نے بھی اندلس کی پاسبانی کی مگر موحدین کے اہل اندلس سے تعاون کو مرابطین کے ہم پلہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ مرابطین نے اندلس کو اس وقت بچایا جب ملوک الطوائف کی خود غرضی اور نصرانیوں کی قہر انگیزی نے اس ملک کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ مگر موحدین نے پہلے خود اندلس کے محافظوں کو کمزور کر کے نصرانیوں کو تسلط کا موقع دیا اور پھر تلافی کے لیے میدان میں آئے۔ گویا زخم لگانے والے بھی وہی تھے اور مرہم رکھنے والے بھی۔ مرابطین صرف محافظ تھے جو اندلس سے کچھ لیے بغیر اپنا وقت پورا کر گئے۔

اندلس میں نصرانیوں کی مار دھاڑ:

اس زمانے میں قسطالیہ کا حکمران الفانسو ریمنڈس (الفانسو ہشتم) اپنی مملکت کو وسعت دیتے ہوئے ۵۲۷ھ (۱۱۳۳ء) میں شریش، ۵۳۳ھ (۱۱۳۹ء) میں حصن ارنبہ اور ۵۳۶ھ (۱۱۴۲ء) میں قوریہ پر قبضہ کر چکا تھا۔ ۵۳۹ھ (۱۱۴۴ء) وہ مار دھاڑ کرتا ہوا المریہ اور غرناطہ تک پہنچ گیا اور اس سارے علاقے کو تاراج کر ڈالا۔

مرابطین اور موحدین کے باہمی کشت و خون کا نتیجہ یہ نکلا کہ اندلس میں مسلمانوں کی مرکزیت ختم ہوگئی۔ ملوک الطوائف کی باقیات سے تعلق رکھنے والے بہت سے امراء مرابطین کو غیر ملکی تصور کر کے ان کی حکومت سے ناخوش تھے۔ ایسے لوگوں نے جگہ جگہ خود مختاری کے دعوے کرنے میں پہل کی، یوں اندلس کی اسلامی وحدت کا شیرازہ بکھر گیا۔ بعض مسلم حکام نے اپنی حکومتیں بچانے کے لیے ارغون، قسطالیہ اور پرتگال کے نصرانی حکام کو سرپرست بنالیا۔ قرطبہ کے امراء نے الفانسو ریمنڈس کو بلالیا اور وہ ۵۴۱ھ میں قرطبہ آ کر اپنی مرضی کا نظام حکومت بنا گیا۔

اس کے باوجود نصرانیوں کو جہاں موقع ملا، انہوں نے عسکری کارروائی سے دریغ نہیں کیا۔ قسطالیہ کی فوج نے وینس اور جینوا کے بحری بیڑے کی مدد سے ۵۴۲ھ (اکتوبر ۱۱۴۷ء) میں المریہ پر قبضہ کر لیا۔ اسی سال الفانسو ریمنڈس نے قرطبہ کا محافظ قلعہ حصن رباح مسلمانوں سے چھین لیا۔ اُدھر برشلونہ کے حاکم کاؤنٹ رامون چہارم نے اٹلی کی بحری فوج کو ساتھ ملا کر ۵۴۳ھ میں طرطوشہ سے وادی ابرہ تک کا علاقہ زیر کر لیا۔[1]

اندلس میں موحدین کا مرابطین پر غلبہ:

مرابطین کا نائب ابن جامع ان حالات میں ملک چھوڑ کر جزائر شرق الاندلس میں پناہ لینے پر مجبور ہوگیا۔ یہ دیکھ کر علمائے اندلس مرابطین سے مایوس ہوگئے۔ ان کا ایک وفد مراکش پہنچا اور عبدالمؤمن سے نصرانیوں کی سرکوبی کی درخواست کی۔ عبدالمؤمن نے جو اس دوران افریقہ میں وسیع وعریض علاقے فتح کر چکا تھا، اس فریاد پر فوری توجہ دی

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۵۰۵ تا ۵۱۲

اور اپنے سالار ابو عمر و موسیٰ کو بیس ہزار کا لشکر دے کر اندلس میں اتار دیا۔
مسلمانانِ اندلس نے اس لشکر کا بھرپور ساتھ دیا۔ موحدین کے سالار نے پہلے ان شہروں پر قبضہ کیا جو مرابطین کے نائبین یا نئے خود مختار امراء کے ہاتھوں میں تھے۔ بطلیوس کی فوجیں بھی موحدین سے آملیں۔ اشبیلیہ کے امراء نے جواب تک مرابطین کے ساتھ تھے، جلد ہتھیار ڈال دیے۔ مالقہ کسی مزاحمت کے بغیر سرنگوں ہو گیا۔ قرطبہ میں مرابطین کے سپہ سالار ابن غانیہ نے موحدین کی آمد پر مقابلہ بے سود سمجھا اور شہر ان کے سپرد کر دیا۔
موحدین کو اب نصرانیوں سے المریہ اور بلنسیہ واپس لینے کے لیے افریقہ سے کمک کی ضرورت تھی مگر افریقہ میں عبدالمومن ایک نئی آزمائش سے دوچار تھا۔ وہاں ایک نیا مہدی اٹھ کھڑا ہوا تھا جو اصل میں ایک دھوبی تھا۔ اس نے طرح طرح کی شعبدہ بازیاں دکھا کر ہزاروں قبائلیوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ اس کی طاقت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس نے کئی میدانوں میں موحدین کو پسپا کر دیا۔ بہر کیف آخر موحدین اس کی سرکوبی میں کامیاب ہو گئے اور اس کے باقی ماندہ ساتھی موحدین سے آملے۔ اس فتنے سے فارغ ہو کر عبدالمومن نے بیس ہزار سپاہی اندلس بھیجے جنہوں نے ۵۵۲ھ کے اواخر میں سات ماہ کے محاصرے کے بعد المریہ کو نصرانیوں سے بازیاب کرا لیا۔[1]

موحدین کی فتوحات:

اس کے بعد ۵۵۳ھ (۱۱۵۸ء) میں موحدین قلعہ رباح کی طرف بڑھے جہاں ٹمپلرز کا قبضہ تھا تاہم دیگر نصرانی حکام نے ٹمپلرز کو بھاری کمک بھیج دی اور وہاں بیس ہزار جنگجو جمع ہو گئے اس لیے قلعہ رباح پر موحدین کا حملہ کامیاب نہ ہو سکا۔
عبدالمومن نے اندلس کو مراکش سے عسکری طور پر مربوط رکھنے کے لیے جبل الطارق کے ساتھ ایک مستحکم شہر تعمیر کرایا۔ ذوالقعدہ ۵۵۵ھ میں جب یہ شہر مکمل ہوا تو عبدالمومن خود وہاں آیا اور جبل الطارق کو "جبل الفتح" کا نام دیا۔
تاہم وہ اندلس پر زیادہ توجہ نہ دے سکا کیوں کہ افریقہ میں ہر طرف سے اسے مزاحمتی قوتوں کا سامنا تھا۔ البتہ اندلس میں مرابطین کے نائبین سے غرناطہ سمیت تمام علاقے واگزار کرا لیے گئے۔ اس کے بعد غرناطہ کو ایک زبردست دفاعی مرکز میں تبدیل کر دیا گیا۔ ساتھ ہی اندلس کا سیاسی مرکز اشبیلیہ سے دوبارہ قرطبہ منتقل کر دیا گیا۔
کئی سالوں تک شمالی افریقہ میں عبدالمومن کی افواج ایک سیلاب کی طرح آگے بڑھتی رہیں۔ اس کی فتوحات نے مرابطین کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ ۵۵۶ھ تک عبدالمومن نے الجزائر، تیونس، مہدیہ اور لیبیا پر قبضہ کر کے پورے شمالی افریقہ کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا تھا۔
اپنے آخری ایام میں عبدالمومن نے پورے اندلس پر قبضہ کرنے کی تیاری شروع کی اور ایک عظیم الشان لشکر تیار کیا مگر اس کی روانگی سے قبل عبدالمومن بیمار پڑ گیا اور جمادی الاخریٰ ۵۵۸ھ (جون ۱۱۶۳ء) میں حکمرانی کے ۳۳ سال

[1] دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۵۰۹ تا ۵۱۱

پورے کر کے دنیا سے رخصت ہو گیا۔[1]

عبدالمومن کے کردار پر ایک نگاہ:

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

''وہ عادل، مدبر، باہیبت اور عالی ہمت تھا۔ اس کی خوبیاں بہت زیادہ تھیں۔ دین داری میں مضبوط تھا۔ اس جیسے آدمی کم ہوتے ہیں۔ روزانہ قرآن مجید کی ایک منزل تلاوت کرتا تھا۔ ریشمی لباس نہیں پہنتا تھا۔ پیر اور جمعرات کو روزہ رکھتا تھا۔ جہاد اور امور مملکت کا بڑا خیال رکھتا تھا گویا اسے حکومت ہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔''[2]

اس کے دربار میں عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء جمع ہو گئے تھے۔ اس نے دنیا میں اپنی سیاست اور فتوحات کی دھاک بٹھا دی تھی۔ مرابطین کے برعکس موحدین عباسی خلافت کو جائز نہیں مانتے تھے اس لیے اس دور میں افریقہ سے عباسیوں کے سفارتی تعلقات ختم ہو گئے۔[3]

+++

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۰/ ۳۷۰ تا ۳۷۵، ط الرسالۃ؛ التاریخ الأندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۴۵۹

② العبر فی خبر من غبر: ۳/ ۱۶۵

③ دولۃ الاسلام فی الأندلس: ۱/ ۱۷۱

ابو یعقوب یوسف اوّل بن عبد المؤمن

۵۵۸ھ تا ۵۸۰ھ

(۱۱۶۳ء تا ۱۱۸۴ء)

عبد المؤمن کے بعد اس کا بیٹا ابو یعقوب مؤحدین کا حکمران بنا۔ اس نے افریقہ اور اندلس کے مفتوحہ علاقوں میں امن وامان قائم رکھا اور عدل وانصاف سے حکومت کی۔ وہ اپنے افسران کو ہمیشہ علانیہ اور پوشیدہ پرہیزگاری اور خدا خوفی کی تاکید کرتا تھا۔ مُرسیہ کا حاکم ابن مردنیش نصرانیوں کا حلیف تھا۔ ابو یعقوب نے اسے سزا دینے کے لیے ۵۶۰ھ میں ایک لشکر بھیجا۔ ابن مردنیش نے اپنی فوج کے ساتھ ۱۳ ہزار حلیف نصرانیوں کو ملا کر مُرسیہ سے ۱۲ کلومیٹر جنوب میں مقابلہ کیا اور شکست کھا کر قتل ہو گیا۔ تاہم اس خوں ریز جنگ میں مؤحدین فتح کے باوجود سخت جانی ومالی نقصانات سے دوچار ہوئے اس لیے وہ مُرسیہ پر قابض نہ ہو سکے۔[1]

سلطنتِ پرتگال کا قیام اور مسلمانانِ اندلس کے لیے نئی مشکلات:

مؤحدین کی سلطنت کے قیام سے پہلے پرتگال ایک نئی ریاست کی شکل میں ظاہر ہو چکا تھا۔ اس کا اصل بانی قسطالیہ کا حکمران فرنانڈو اوّل تھا جس نے ملوک الطوائف کے جھگڑوں کے دوران ۴۵۶ھ میں مغربی اندلس کے چند ساحلی شہروں کو فتح کر کے ایک ماتحت ریاست قرار دیا اور اس کا نام "پورت کال" (Porte calle) رکھا جس کا مطلب بندرگاہ ہے۔ اس کا مرکز "قُلُمریہ" تھا۔ علی بن یوسف تاشفین نے ۵۱۲ھ میں پرتگال میں طویل مہم جوئی کے بعد قُلُمریہ فتح کر لیا تھا مگر اس کے بعد مرابطین نے یہاں قبضہ برقرار رکھنے میں مستعدی نہ دکھائی اور واپس اشبیلیہ چلے گئے۔ یوں قُلُمریہ دوبارہ نصرانیوں کے قبضے میں آ گیا۔

چند سال گزرے تھے کہ ۵۲۳ھ (۱۱۲۸ء) میں حاکم پرتگال الفانسو ہنری کیز نے قسطالیہ سے الگ ہو کر خود مختار بادشاہت کا اعلان کر دیا اور شاہ قسطالیہ الفانسو ریمنڈس پوری کوشش کے باوجود اس پر حاوی نہ ہو سکا۔ الفانسو ہنری کیز (جسے عرب مؤرخین ابن الریق کہتے ہیں) مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ عبد المؤمن کے دور میں بھی وہی شاہ پرتگال تھا۔ اس نے انگلینڈ، ہالینڈ اور جرمنی کی افواج کو ساتھ ملا کر لشبونہ (لزبن) کا محاصرہ کر لیا اور ۵۴۲ھ (۱۱۴۷ء) میں اس

[1] التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الیٰ سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۴۹۰

پر قابض ہو گیا اور پھر شنترین (Santrarem) بھی فتح کر لیا۔ ۵۵۵ھ (۱۱۶۰ء) میں پرتگالی لشکر نے لزبن سے ۹۳ کلومیٹر جنوب میں قصر ابی دانس نامی قلعہ بھی فتح کر لیا۔ عبدالمومن کو اپنی زندگی میں اس کے سدباب کا موقع نہ ملا۔[1]

ابو یعقوب کی اندلس آمد اور جہادی مہمات:

تاہم خلیفہ ابو یعقوب ۵۶۶ھ میں خود اندلس پہنچا اور پانچ سال تک یہاں مہمات میں مشغول رہ کر نصرانیوں کو مزید آگے بڑھنے سے روکا اور وادی تجہ سے طُلَیطُلَہ تک کا علاقہ اپنی جولان گاہ بنائے رکھا اور القنطورہ کا سرحدی قلعہ فتح کر لیا۔ اس نے اندلس کے خود مختار امراء سے بَلَنسِیہ، مُرسِیہ اور لارقہ بھی چھین لیے۔ اس دوران اس کا قیام اشبیلیہ میں رہا۔ یہاں اس نے نئے محلات، مساجد، پل، عوامی حمام اور مینار بنوائے۔ شہر کے وسط میں ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی جس کا مینار غیر معمولی بلند تھا۔ اس مسجد کے آثار آج تک موجود ہیں۔[2]

ابو یعقوب کی اندلس میں آخری مہم اور شہادت:

۵۷۱ھ میں وہ واپس مَرّاکش آ گیا اور آٹھ سال تک دوبارہ اندلس نہ جا سکا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر نصرانیوں نے دوبارہ حملے شروع کر دیے۔ آخر موحدین نے ۵۷۸ھ میں شمالی کی طرف پیش قدمی کر کے طلبیرہ کے مقام پر قسطالیہ کے حاکم الفانسو ہشتم سے ٹکر لی۔ دو سال بعد ۵۸۰ھ میں ابو یعقوب ستر ہزار پیادوں اور تیس ہزار شہسواروں کو لے کر اندلس پہنچا اور پرتگالیوں کو سبق سکھانے کے لیے شنترین کا محاصرہ کر لیا۔ یہ مہم جاری تھی کہ ابو یعقوب کو ایک معرکے میں کاری زخم لگا جس کے سبب وہ ربیع الآخر ۵۸۰ھ میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد مَرّاکش میں اس کا بیٹا ابو یوسف یعقوب تخت نشین ہوا۔[3]

✦✦✦

---

[1] التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۳۶۰، ۳۶۱

[2] التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۳۶۴

[3] التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۳۶

ابو یوسف یعقوب، المنصور

۵۸۰ھ تا ۵۹۵ھ

(۱۱۸۴ تا ۱۱۹۹ء)

ابو یوسف یعقوب، المنصور کے لقب کے ساتھ تخت پر بیٹھا۔ وہ خاندانِ موحدین کا کامیاب ترین حکمران تھا۔ اس کی فیاضی، عدل وانصاف، فتوحات، حسنِ انتظام کا شہرہ پورے عالم اسلام میں تھا۔ اسے ایک عظیم سلطنت ورثے میں ملی تھی جسے اس نے ترقی یافتہ اور خوشحال بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس نے سلطنت کو بھی وسعت دی اور اندلس کے مشرقی جزائر بھی فتح کر لیے۔ [1]

صلیبی جنگیں، نصرانیوں کی چیرہ دستیاں اور ابو یوسف کا پرتگال پر حملہ:

اس کی حکومت کے دوسرے سال ۵۸۱ھ میں پرتگال کا بانی حکمران الفانسو ہنری کیز مر گیا اور اس کا بیٹا شانجہ حکمران بنا۔ چند سال امن سے گزرے۔ مگر پھر ایک شام و مصر میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے خلاف تیسری صلیبی جنگ شروع ہوگئی اور یورپ سے لاکھوں سپاہی شام روانہ ہونے لگے۔ ان میں سے بعض افواج اسپین کے راستے روانہ ہوئیں اور جاتے ہوئے انہوں نے کئی مسلم علاقوں کو تاخت وتاراج کا نشانہ بنایا۔ اس سے قسطالیہ کے نصرانیوں کی ہمت بھی بڑھ گئی اور الفانسو ہشتم نے فرانسیسی رضا کاروں کو ساتھ ملا کر مسلم اندلس پر حملے شروع کر دیے۔

پرتگال کے نئے بادشاہ شانجہ نے بھی جری ہو کر بحری بیڑے کے ساتھ جنوب مغربی اندلس کے ساحلی شہر شلب پر حملہ کیا اور تین ماہ کے محاصرے کے بعد ۵۸۵ھ میں اسے فتح کر لیا۔

ان حالات میں ابو یوسف المنصور اندلس پہنچا اور ۵۸۶ھ میں اس نے شلب کی بازیابی کے لیے وہاں پہلا حملہ کیا جو کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ اشبیلیہ پہنچا اور از سرِ نو تیاری کے بعد ربیع الآخر ۵۸۷ھ میں شمال مغرب کا رُخ کیا۔ ایک زوردار دھاوے میں قلعہ ابی دانس فتح کر کے اس نے پرتگال سے شلب کے نصرانیوں کی رسد منقطع کر دی۔ اس کے بعد وہ شلب پر حملہ آور ہوا اور اسے فتح کر کے دم لیا۔ پرتگال کی شکست دیکھ کر قسطالیہ کے حکام بھی دب گئے اور انہوں نے موحدین سے پانچ سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا اور امن قائم ہو گیا۔ [2]

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۱/ ۱۲ / ۳۱۲ تا ۳۱۶، ط الرسالۃ

② التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۶۱ تا ۶۲

جنگ الارک:

مگر صلح کی میعاد ختم ہونے سے پہلے شاہ قسطالیہ نے ابو یوسف المنصور کو افریقہ کی مہمات میں مصروف دیکھ کر اسلامی سرحدوں میں مداخلت شروع کر دی۔ یہی نہیں بلکہ الفانسو ہشتم نے ابو یوسف یعقوب کے نام ایک طنزیہ خط میں لکھا:

”اے امیر! کسی سے مخفی نہیں کہ جیسے میں ملت نصاریٰ کا سربراہ ہوں، ایسے تم ملت حنفیہ کے سربراہ ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ اندلس کے اُمراء لاچار، معطل، رعایا سے غافل اور عیش و عشرت میں مگن ہیں۔ میں انہیں روندتا اور علاقوں کو ان سے خالی کرتا رہتا ہوں، بچوں کو غلام بناتا ہوں، ادھیڑ عمر لوگوں کے ناک کان کاٹتا ہوں اور جوانوں کو قتل کر دیتا ہوں۔ تمہارے پاس ان کی مدد کے لیے نہ آنے کا کوئی عذر نہیں۔ تم ان کی مدد پر قادر ہو اور تمہارا عقیدہ ہے کہ اللہ نے ہمارے دس کے مقابلے میں تمہارے ایک پر جہاد فرض کیا تھا۔ پھر تمہارے لیے تخفیف کر دی اور دو کے مقابلے میں ایک پر جہاد فرض کیا۔ میں تمہارے لیے اس میں بھی تخفیف کر دیتا ہوں اور اب تمہارے ایک کے مقابلے میں ہمارا بھی ایک ہوگا۔ اب تمہارے لیے ممکن نہیں کہ تم جنگ سے خود کو محفوظ کرو اور اس مہم سے بچ پاؤ۔ تم اپنے نفس کو بہلاتے ہوئے اس مہم کو ایک سال سے دوسرے سال پر ٹال رہے ہو۔ ایک قدم آگے رکھتے ہو اور ایک قدم پیچھے ہٹ جاتے ہو۔

اب میں تمہارے سامنے آسان صورت رکھتا ہوں کہ تم اپنی تمام کشتیاں اور بحری جہاز لے کر آجاؤ اور میں بھی اپنے تمام لشکر لے کر آتا ہوں۔ جو میدانِ جنگ تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہو، وہیں مقابلہ ہوگا۔ اگر تم جیتے تو تمہیں عظیم مالِ غنیمت ملے گا۔ اگر میں جیتا تو دونوں ملتوں کی سربراہی کا حق مجھے حاصل ہوگا۔“

یہ مکتوب پڑھ کر المنصور کی اسلامی غیرت جوش میں آگئی۔ اس نے اسی خط کے بالائی حاشیے پر اپنے جواب کے طور پر قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ لکھ کر بھیج دی:[1]

ارْجِعْ إِلَيْهِمْ فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ بِجُنُودٍ لَا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِنْهَا أَذِلَّةً وَهُمْ صَاغِرُونَ ○

”ان کے پاس واپس جاؤ، کیوں کہ اب ہم ان کے پاس ایسے لشکر لے کر پہنچیں گے جن کے مقابلے کی ان میں تاب نہیں ہوگی اور انہیں وہاں سے اس طرح نکالیں گے کہ وہ ذلیل ہوں گے اور ماتحت بن کر رہیں گے۔“[2]

ان حالات میں المنصور دوبارہ ایک بڑا لشکر لے کر مراکش سے نکلا اور جمادی الاخریٰ ۵۹۱ھ میں اندلس پہنچ گیا۔ افریقی علماء و فقہاء کا ایک بڑا مجمع اس لشکر کے ساتھ تھا۔ ابو یوسف نے دو ہفتے اشبیلیہ میں قیام کر کے افواج کو منظم کیا اور اس کے بعد شمال کا رُخ کیا۔ اس کے حکم سے اشبیلیہ سے کچھ دور ایک نیا قلعہ حصن الفرج تعمیر کر دیا گیا تھا۔ اُدھر قسطالیہ کے بادشاہ الفانسو ہشتم نے بھی قلعہ رباح کے نواح میں ایک بلند ٹیلے ”الارک“ (Alarcos) پر ایک

---

① الكامل في التاريخ: سنة ۵۹۱ھ ② سورة النمل: آیت ۳۷

نیا قلعہ ہوا لیا تھا۔ وہ نوار اور لیون کی افواج کو ساتھ ملا کر پچیس ہزار گھڑ سواروں اور دو لاکھ پیادوں کے ساتھ طلیطلہ سے "الارک" پہنچ گیا۔[1]

نصرانیوں کو اپنی فتح کا اس قدر یقین تھا کہ ان کے ساتھ بڑے بڑے یہودی تاجر بھاری رقوم لے کر آئے تھے تاکہ فتح کے بعد زیادہ سے زیادہ مال غنیمت خرید سکیں اور مسلمان قیدیوں کو غلاموں کی منڈی میں لے جائیں۔

شعبان ۵۹۱ھ میں اسلامی لشکر بھی یہاں پہنچ گیا اور تقریباً تین میل دور خیمہ زن ہوا۔ قسطالیہ کے گشتی دستے مسلمانوں کی قوت کا اندازہ لگانے کے لیے نکلے تو اسلامی فوج کے ہراول سے ان کی جھڑپیں بھی ہوئیں۔ اس دوران ابو یوسف المنصور کی اندلسی امراء سے جنگی حکمتِ عملی کے متعلق مشاورت جاری تھی۔ ابو عبداللہ ابو صنادید نامی ایک جہاں دیدہ امیر نے معرکۂ زلاقہ کی حکمتِ عملی ذہن میں رکھتے ہوئے مشورہ دیا کہ ابتداء میں اندلسی، عرب، بربر اور قبائلی رضاکاروں کو بھیج کر جنگ چھیڑی جائے اور خلیفہ ابو یوسف خود موحدین کی باقاعدہ فوج کے ساتھ پہاڑوں میں پوشیدہ رہے۔ اگر مسلمانوں کو پسپائی ہونے لگے تو یہ محفوظ فوج کام میں لائی جائے۔

۸ شعبان کو موحدین کا لشکر "حصن الارک" سے چند میل کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ موحدین ایک سطح مرتفع کی کھائیوں میں جا کر ٹھہر گئے، ان کے چند دستے نمائشی پیش قدمی کے لیے اپنی پناہ گاہ سے نکلے اور حصن الارک کے قریب چکر لگا کر واپس آ گئے۔ ۹ شعبان (۱۸ جولائی ۱۱۹۵ء) کو طے شدہ منصوبے کے مطابق اندلسی، عرب، بربر اور قبائلی رضاکار ابو یحییٰ نامی امیر کی قیادت میں موحدین کے مورچوں سے آگے بڑھ گئے۔ ابو یحییٰ نے اس وقت فلک شگاف آواز میں فوج سے مخاطب ہو کر کہا: "امیر المومنین کی درخواست ہے کہ تم سب ان کے لیے دعائے مغفرت کرو کہ یہ وقت بخششِ الٰہیہ کا ہے۔ ایک دوسرے کو بھی معاف کر دو اور دلوں کو پاک رکھو۔ نیت اللہ کے لیے خالص رکھو۔"

یہ خطاب سن کر مجاہدین کے آنسو بہہ پڑے۔ خلیفہ کے لیے دعائے مغفرت ہوئی۔ پھر قاضی ابو علی بن حجاج نے جہاد کی فضیلت پر ایسی پُرجوش تقریر کی کہ سب کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔

سورج بلند ہوتے ہی نصرانیوں کی پیش قدمی شروع ہوئی، ان کی پہلی صف میں آٹھ ہزار زرہ پوش نائٹ تھے جو گھوڑے دوڑاتے ہوئے سیاہ آندھی کی طرح آئے، مسلمانوں نے نیزے تان کر اس حملے کا رُخ پھیر دیا۔ پیچھے نصرانیوں کا سیلاب امنڈتا آ رہا تھا۔ ان کے دائیں بازو نے لشکرِ اسلام کے میسرہ پر حملہ کیا جہاں زیادہ تر رضاکار تھے، وہ اس طوفانی حملے کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹ گئے۔ اب نصرانیوں نے سارا زور قلب لشکر پر ڈال دیا جہاں ابو یحییٰ کے سر پر سفید خلافتی علم لہراتا دیکھ کر انہیں یقین ہو چکا تھا کہ خلیفہ المنصور یہیں ہے۔

نصرانیوں کا دھاوا اس شدت کا تھا کہ ہزاروں مسلمان کٹ گئے حتیٰ کہ قائدِ لشکر ابو یحییٰ نے بھی جانبازی سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ ایسے میں عرب رضاکاروں اور تیر اندازوں نے مناسب جگہ سنبھال کر نصرانیوں پر تیروں

[1] الارک اسپین کے موجودہ صوبے "سوداد ریال" کے شہر "کاریون" سے ۶ میل دور ہے۔

کی بارش شروع کردی۔ اتنی دیر میں ابن صنادید اپنے دستوں کے ساتھ آگے آ گیا جنہوں نے حریف کے سامنے قدم جما لیے۔ سہ پہر کے وقت خلیفہ المنصور محفوظ افواج کو عقب میں چھوڑ کر سپاہیوں کو ہمت دلاتا ہوا خود آگے آیا اور فوج کو منظم کر کے نصرانیوں پر اس شدت کا حملہ کیا کہ وہ پسپا ہوتے ہوتے ''الارک'' کے ٹیلے تک چلے گئے اور جگہ جگہ ان کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ نصرانیوں نے حصن الارک میں پناہ لینے کی کوشش کی مگر موحدین کے محفوظ دستے ایک لمبا چکر کاٹ کر ان کے عقب میں آ کر واپسی کا راستہ بند کر چکے تھے۔ نصرانیوں نے نشیبی علاقوں کی طرف بھاگنا چاہا مگر وہاں رضا کار تیر اندازوں کی ٹولیوں نے انہیں اپنی زد میں لے لیا۔ صلیبی گھیرے میں آ کر بری طرح کچلے گئے۔

الفانسو ہشتم اپنے محفوظ دستوں کے ساتھ حصن الارک میں موجود تھا۔ خلیفہ نے میدان کو نصرانیوں سے صاف کرنے کے فوراً بعد بگل بجانے اور نقارے پیٹنے کا حکم دیا۔ الفانسو ہشتم یہ دیکھ کر باقی فوج کے ساتھ قلعے سے نکل آیا مگر اس کے سپاہی موحدین کے ایک دھاوے کی بھی تاب نہ لا سکے اور سینکڑوں لاشیں چھوڑ کر تیزی سے واپس قلعے میں گھس گئے۔ معرکہ غروب آفتاب کے وقت انجام کو پہنچ گیا۔ اس لڑائی میں بیس ہزار مسلمان شہید ہوئے جبکہ مقتول نصرانیوں کی تعداد ایک لاکھ چھیالیس ہزار بتائی جاتی ہے۔

الفانسو اسی رات قلعے کے کسی خفیہ راستے سے فرار ہو کر طلیطلہ پہنچ گیا مگر پانچ ہزار سپاہی ڈان پیڈرو نامی نواب کی قیادت میں اب بھی قلعے میں موجود تھے۔ موحدین نے قلعے کا محاصرہ کیا تو ڈان پیڈرو نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ ان پانچ ہزار سپاہیوں کی جان بخشی کی جائے، بدلے میں وہ پانچ ہزار مسلمان قیدی رہا کر دے گا۔ اس معاہدے کے مطابق قلعے سے نصرانیوں کا انخلاء ہوا اور مسلمان اس پر قابض ہو گئے۔[1]

المنصور کی اندلس میں مزید فتوحات:

اگلے دنوں میں موحدین نے قلعہ رباح کے علاوہ شلبطرہ پر بھی قبضہ کر لیا جو نصف صدی سے نصرانیوں کے پاس تھا۔ ۲۷ شعبان کو اشبیلیہ پہنچنے پر ابو یوسف منصور کا شاندار استقبال ہوا۔ مگر اس مجاہد حکمران نے جلد مراکش واپس جانے کی غلطی نہ کی اور موسم سرما گزرتے ہی حصن الفرج کو نئی مہمات کا مرکز بنا لیا۔ اس دوران شاہ قسطالیہ کی جانب سے صلح کا پیغام بھی آیا جسے ابو یوسف نے مسترد کر دیا۔

۵۹۲ھ میں موحدین کے لشکر شمال میں شرقاً و غرباً پھیل گئے۔ پرتگال کا قلعہ منت انتش، ترجالہ، سانتا کروٹ فتح کر کے وہ دریائے تاجہ کے پار آ گئے۔ یہاں الفانسو ہشتم کا تعمیر کردہ نیا شہر ''بلاسنیا'' بھی سرنگوں ہو گیا۔ طلبیرہ اور مکادہ کے مضافات کو تاراج کرتے ہوئے آخر میں موحدین شمال کا چکر کاٹ کر طلیطلہ کا محاصرہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ قریب تھا کہ شہر فتح ہو جاتا مگر الفانسو ہشتم کی ماں اور بیگمات ابو یوسف یعقوب کے پاس حاضر ہوئیں اور بڑی گریہ وزاری کے ساتھ شہر ان کے پاس باقی رہنے دینے کی درخواست کی۔ ابو یوسف کو رحم آ گیا اور وہ یہ شہر نصرانیوں

[1] دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۳/ ۲۰۸ تا ۲۱۲

کو سونپ کر اشبیلیہ واپس آگیا۔[1]

ابو یعقوب المنصور کی وفات:

طلیطلہ کو فتح نہ کرنا ابو یوسف کی غلطی تھی کیوں کہ اس کے بعد یہ شہر دوبارہ کبھی مسلمانوں کے ہاتھ نہ آیا بلکہ نصرانیت کا ناقابلِ تسخیر مورچہ بن کر جنوب کے مسلمانوں کے لیے سوہانِ روح رہا۔ اس مہم کے بعد وہ چند ماہ قرطبہ میں رہا۔ ۵۹۳ھ میں وہ دوبارہ مراکش چلا آیا اور ۲۲ ربیع الاول ۵۹۵ھ (۳ فروری ۱۱۹۹ء) کو وہیں وفات پائی۔[2]

ابو یعقوب کے دور پر ایک نظر:

ابو یعقوب المنصور اپنے عہد کا عظیم حکمران تھا۔ اس نے ٹیکسوں میں بہت کمی کر دی۔ رشوت ستانی کے لیے سخت سزائیں مقرر کیں۔ سڑکوں کے کنارے درخت لگوائے، جا بجا سرائیں بنوائیں، جگہ جگہ کنوئیں کھدوائے، پولیس کے شعبے کو ترقی دے کر اتنا منظم اور مضبوط کیا کہ پورے ملک میں چوری ڈاکے کا نام و نشان مٹ گیا۔ اس نے تمام پرانے قلعوں کی مرمت کرا کے انہیں ناقابلِ تسخیر بنا دیا۔ آب پاشی اور زراعت پر خاص توجہ دی۔ بے شمار درسگاہیں اور شفاخانے کھولے۔ مراکش میں اس کا قائم کردہ سرکاری شفاخانہ دنیا کا سب سے بڑا ہسپتال تھا۔ اس کا ملک نامی گرامی علماء، حکماء، اطباء اور دانشوروں کا مرکز تھا۔[3]

موحدین اور تقلیدِ فقہاء:

المنصور اور اس سے پہلے دیگر موحدین حکمران اصول وعقائد میں اہلِ سنت کے موافق تھے تاہم وہ ائمہ اربعہ کی تقلید کے قائل نہ تھے بلکہ فقہی مسائل میں غور و خوض کو بُرا سمجھتے تھے۔ المنصور فقہاء کی کتب کو تلف کرا دیتا تھا، ان کی بجائے وہ کتبِ حدیث سے براہِ راست استفادے کا قائل تھا۔ اس کے ایک معاصر عالم کا بیان ہے:

''میں اس کے پاس گیا تو وہ کسی فقیہ کی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا: یہ کیسی آراء ہیں جو دین میں داخل کر لی گئی ہیں۔ بتاؤ تو سہی! ایک ایک مسئلے میں کئی اقوال ہیں، کونسا صحیح مانا جائے! اور ایک مقلد کس پر عمل کرے؟'' عالم نے اسے سمجھانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ المنصور قرآن مجید کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا: ''یا تو اس سے دلیل لاؤ۔'' پھر سنن ابوداؤد کی طرف اشارہ کر کے بولا: ''یا اس سے۔'' پھر تلوار کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''ورنہ میں یہ استعمال کروں گا۔''[4]

قاضی ابن رُشد کی شہر بدری اور نظر بندی:

ابو یعقوب المنصور بڑا عالم فاضل آدمی تھا اور علماء کے ساتھ علمی ابحاث میں شریک ہوتا تھا۔ اسے عقلیات

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب للمقری التلمسانی: ۲/۲۰۷

② التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۴۶۳

③ سیر اعلام النبلاء: ۲۱/۳۱۱ تا ۳۱۷، ط الرسالۃ ④ سیر اعلام النبلاء: ۲۱/۳۱۴، ط الرسالۃ

سے بھی بہت مناسبت تھی۔ اس دور میں اندلس کے نامور ترین عالم اشبیلیہ کے قاضی علامہ ابن رشد تھے جن کی شرعی اور عقلی علوم پر دسترس کے بھی قائل تھے اوران کی تصانیف دنیا بھر میں مقبول ہوچکی تھیں مگران کی مقبولیت کے باعث بعض علماء اُن سے حسد کرنے لگے۔ انہوں نے ابن رشد کے فلسفیانہ مسائل پر اعتراضات کر کے انہیں گمراہ اور ملحد قرار دے دیا۔ المنصور ۵۹۲ھ میں اندلس آیا تو الارک کی فتح کے بعد کچھ مدت قرطبہ میں گزاری جہاں وہ ابن رشد کے علمی کمالات سے بہت متاثر ہوا اوران کی بڑی تعظیم وتکریم کی۔ تاہم ان کے خلاف حاسدین کا شور بھی کم نہ تھا۔

آخر قرطبہ میں علماء کی ایک مجلس بلائی گئی تاکہ ابن رشد کی متنازعہ عبارات کی تحقیق کی جائے۔ مجلس علماء نے ابن رشد کی بے دینی ثابت ہونے کا فیصلہ صادر کردیا۔

یادرہے کہ بعض عبارات کے ذریعے ابن رشد پر بادشاہ کی توہین کا الزام بھی لگایا گیا تھا۔ ابن رشد کی کسی کتاب میں المنصور کے لیے "ملک البربر" کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ حاسدین نے اس کا یہ مطلب نکالا کہ ابن رشد المنصور کو عرب نہیں بلکہ بربر مانتا ہے۔ المنصور علامہ ابن رشد کی بڑی عزت کرتا تھا مگر علماء کے فیصلے کے خلاف نہیں جاسکتا تھا۔ تاہم اس نے رعایت کرتے ہوئے سزائے موت کی جگہ شہر بدری اور نظر بندی کا حکم سنایا اور ابن رشد کی کتب تلف کرادیں۔

علامہ کو دریائے شنیل کے کنارے ایک قلعے "الیسانہ" میں نظر بند کردیا جہاں وہ تقریباً تین سال رہے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ برس ہوچکی تھی۔ آخر بڑی بڑی شخصیات نے المنصور سے رحم کی درخواست کی۔ علامہ نے خود بھی اپنے اوپر عائد الزامات کی نفی کی۔ "ملک البربر" کے بارے میں انہوں نے وضاحت کی کہ صحیح لفظ "ملک البرّین" (دو بڑے اعظموں کے بادشاہ) ہے مگر سہوِ کتابت سے "ملک البر" ہوگیا۔ آخر المنصور نے علامہ کی سزا معاف کردی اور وہ رہا کردیے گئے۔ رہائی پاکر وہ المنصور کی خدمت میں حاضری دینے مراکش آگئے۔ یہاں کچھ ہی دن گزارے تھے کہ ۹ صفر ۵۹۵ھ کو ان کی وفات ہوگئی۔ ان کی نعش قرطبہ منتقل کردی گئی جہاں وہ اپنے اجداد کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔[1]

ابن رشد نے ۷۵ سال عمر پائی اور پچاس کے قریب بہترین تصانیف پیش کیں۔ اصول فقہ میں "بدایة المجتهد" اور "منهاج الادلة"، مقاصد شریعت میں "فصل المقال فيما بين الحكمة والشريعة من الاتصال" اور فقہی اختلافات میں "التحصيل" لکھ کر اپنی فقہی مہارت کا ثبوت پیش کیا۔ ارسطو کی کتب کی تلخیص بھی کی۔ طب پر ابن سینا کے رسالے "ارجوزہ" کی شرح اور فلکیات میں "حركة الفلك" جیسا رسالہ لکھا۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے فلسفے کے خلاف اپنی لاجواب تصنیف "تهافت الفلاسفه" لکھ کر فلاسفہ کو گنگ کردیا تھا مگر اس کے جواب میں ابن رشد نے "تهافت التهافت" لکھ کر مردہ ہوتے عقلی علوم کو نئی زندگی بخش دی۔ اسی لیے یورپ کے فلاسفہ اور دانشور ابن رشد سے بے حد متاثر ہیں۔[2]

✦✦✦

① دولة الاسلام فی الاندلس لعبدالله عنان المصری: ۴/ ۲۲۳ تا ۲۲۸ ② سیر اعلام النبلاء: ۲۱/ ۳۰۷ تا ۳۱۰

محمد الناصر بن یعقوب

۵۹۵ھ تا ۶۱۰ھ

(۱۱۹۹ء تا ۱۲۱۳ء)

ابو یوسف کا بیٹا محمد بن یعقوب اس کا جانشین بنا۔ اس نے الناصر کے لقب کے ساتھ حکومت کی۔ مگر وہ اپنے والد کا صحیح وارث ثابت نہ ہوا۔ اس کی انتظامی کمزوریوں نے اس عظیم الشان سلطنت کو بہت جلد زوال کی طرف دھکیل دیا۔ اس کا دور فتنوں اور ہنگاموں سے بھرپور تھا۔

اس کے ابتدائی ایام میں ہی افریقہ کے شہر فاس میں شورش ہوئی جو جلد کچل دی گئی۔ تاہم ادھر جزائر شرق الاندلس میں مرابطین کے ایک امیر یحییٰ نے بغاوت کر دی جس کی کارروائیوں نے موحدین کو سخت ضیق میں ڈالے رکھا۔ اس نے افریقہ کے ساحلوں پر حملے کر کے تیونس کے شہر مہدیہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ تاہم اس کے بعد قیروان کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اسے موحدین کے مقابلے میں شکست ہوئی اور وہ صحرائے اعظم کی طرف پسپا ہو گیا۔[1]

جنگِ عقاب:

ادھر اندلس میں قسطالیہ کے الفانسو ہشتم نے قرطبہ اور اشبیلیہ تک حملے شروع کر دیے تھے۔ الناصر اندلس پہنچا مگر اس بار حالات نے ساتھ نہ دیا۔ اس نے اشبیلیہ میں جنگ کی تیاری کی اور آگے بڑھ کر قلعہ شیلطرہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس چھوٹے سے قلعے کی فتح میں اسے آٹھ ماہ لگ گئے۔ اس دوران قسطالیہ، لیون، ارغون، نبرہ اور پرتگال کی افواج نے پوری فراغت کے ساتھ یورپ کے صلیبیوں اور رضاکار جنگجو تنظیموں کو ساتھ ملا کر ایک بہت بڑا متحدہ لشکر ترتیب دے ڈالا جس میں دس ہزار گھڑسوار اور ایک لاکھ پیادے تھے۔

الناصر نے محرم ۶۰۹ھ کو فوج لے کر اشبیلیہ سے جیان کی طرف نکلا۔ اس دوران نصرانیوں نے قلعہ رباح کا محاصرہ کر لیا۔ قلعے کے امیر یوسف بن قادس نے بھرپور مزاحمت کی اور اس دوران الناصر سے کمک بھی طلب کی مگر الناصر نے جیان جیسے قریبی شہر میں ہوتے ہوئے بھی کوئی امداد نہ بھیجی۔ مایوس ہو کر یوسف بن قادس نے جان کی امان کے معاہدے پر شہر نصرانیوں کے حوالے کر دیا اور خود اپنے سر کے ساتھ قلعہ رباح کا قضیہ سنانے سیدھا الناصر کے

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۳/ ۲۵۰ تا ۲۷۰

پاس حاضر ہوا۔ الناصر کا وزیر ابوسعید، یوسف بن قادس کی مقبولیت سے حسد کرتا تھا۔ اس نے یوسف بن قادس کا ہمدرد بن کر اسے یقین دلایا کہ اس وقت خلیفہ سے ملنا کسی عتاب کا سبب بن سکتا ہے۔ اس کے بعد وزیر نے خود خلیفہ کو جا کر قلعہ رباح پر نصرانیوں کے قبضے کی اطلاع دے کر یوسف بن قادس کو خائن اور بزدل ثابت کر دکھایا۔

الناصر کانوں کا کچا تھا، یکدم آگ بگولا ہو گیا اور اس نے یوسف بن قادس اور اس کے سرکو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر سزائے موت دے دی۔ ابن قادس ہر دلعزیز شخصیت تھا، اس کے قتل سے اندلس کے لوگوں اور فوج میں بڑی بددلی پھیل گئی۔ ابن سعید نے جب محسوس کیا کہ اندلس کے امراء خلیفہ کے اس فیصلے سے غمزدہ ہیں تو اس نے مزید غلط رویہ اختیار کرتے ہوئے، اندلسی افسران کو صاف کہہ دیا کہ نصرانیوں سے لڑنے کے لیے موحدین کافی ہیں۔ جو واپس جانا چاہتا ہے، شوق سے واپس چلا جائے۔ ایسی طنزیہ باتوں نے لشکرِ اسلام میں مزید تکدر پیدا کر دیا۔

آخر ۱۵ صفر ۶۰۹ھ کو العقاب کے مقام پر ایک نہایت خونریز جنگ ہوئی۔ یہ جگہ دریائے وادی الکبیر کے پار جبل الشارات (سیرا مورینا) کے دامن میں موجودہ بستی 'سانتا ایلینا' (Sta Elena) کے شمال مغرب میں ہے۔ موحدین، عرب، بربر قبائل، رضا کار اور اندلسی پیشہ ور سپاہی الگ الگ دستوں میں حریف سے نبرد آزما ہوئے جن کی مجموعی تعداد محتاط اندازے کے مطابق دو لاکھ کے لگ بھگ تھی اور انہیں اپنی فتح کا پورا یقین تھا۔

نصرانیوں کے ہراول نے اسلامی لشکر پر حملہ کیا تو مقدمۃ الجیش میں تعینات رضا کاروں نے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ثابت قدمی دکھائی، یہاں تک کہ نصرانی پیچھے ہٹنے لگے مگر اسی وقت انہیں تازہ دم سپاہیوں کی کمک مل گئی اور وہ پھر بڑھ چڑھ کر حملے کرنے لگے۔ عین اسی وقت نصرانیوں کے دائیں اور بائیں بازو، اسلامی میسرہ اور میمنہ پر ٹوٹ پڑے اور انہیں دھکیلتے چلے گئے۔

رضا کار دستوں نے ہر جگہ اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت دکھائی اور نصرانیوں کے دم بدم بڑھتے دباؤ کے سامنے وہ پسپا ہوئے بغیر لڑتے رہے۔ مگر موحدین کی پیشہ ور افواج، اندلسی امراء اور عرب سپاہیوں نے رضا کاروں کا خون بے قیمت سمجھ کر ان کی مدد کے لیے لپکنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی اور تمام رضا کار دستے کٹ گئے۔

نصرانیوں نے رضا کاروں کی دیوار گرانے کے بعد مزید جوش و خروش کے ساتھ قلب میں تعینات موحدین کی پیشہ ور فوج پر حملہ کیا اور اس کی صفیں چیر کر رکھ دیں۔ تاہم اتنی دیر میں میمنہ اور میسرہ کے مسلمان دوبارہ منظم ہو کر پلٹنے اور نصرانیوں کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ موحدین کو فتح ہونے والی ہے۔

مگر الفانسو ہشتم جو ایک بلند ٹیلے سے یہ منظر دیکھ رہا تھا، قسطالیہ اور لیون کے محفوظ دستوں کو یکدم میدان میں لے آیا۔ ساتھ ہی ریاست نوار اور ارغون کے شہزادے بھی اپنی فوجوں سمیت میدان میں اتر گئے۔ اسلامی میمنہ اور میسرہ ایک بار پھر نصرانیوں کے زوردار دھاوے کی زد میں آ گئے۔ ان کے قدم ایسے اکھڑے کہ پھر جم نہ سکے۔ انہیں پیچھے ہٹتا دیکھ کر اندلسی اور عرب سپاہیوں کی صفیں بھی تتر بتر ہونے لگیں۔

اب نصرانی ہر طرف سے سمٹ کر موحدین کے قلب پر ٹوٹ پڑے جس کے بیچوں بیچ خلیفہ الناصر حبشی غلاموں کی فولادی دیوار کی حفاظت میں موجود تھا اور سرخ قبہ اس کی موجودگی کا پتا دے رہا تھا۔ نوار، لیون اور قسطالیہ کے نائٹ مسلسل نیزہ بازی اور شمشیر زنی کے ذریعے خلیفہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے تاہم حبشی غلاموں نے انہیں بار بار پیچھے دھکیل دیا۔ خلیفہ آخر تک فوج کو ہمت دلاتا اور للکار کر آگے بڑھاتا رہا مگر ہر صف میں سپاہیوں کے قدم اکھڑ رہے تھے۔ الناصر کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام نصرانیوں کا سیلاب قلب کی طرف متوجہ رہا اور مفرور مسلمان اس دوران جان بچا کر دور دور نکل گئے ورنہ اس وقت ان میں سے بہت کم زندہ بچ پاتے۔ آخر میں خلیفہ کا حفاظتی دستہ بھی خستہ و شکستہ ہو گیا۔ دس ہزار حبشی غلاموں کی لاشیں الناصر کے ارد گرد بکھری ہوئی تھیں اور باقی ماندہ اس کے گرد حلقے بنا کر لڑ رہے تھے۔ ایسے میں ایک اعرابی ایک برق رفتار گھوڑا لے کر خلیفہ کے پاس پہنچا۔ خلیفہ کو انجام سامنے دیکھ کر پسپائی کا فیصلہ کرنا پڑا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھا اور اپنے خواص کے ساتھ بڑی تیزی کے ساتھ "جیّان" کی طرف نکل گیا۔

اس کے بعد باقی ماندہ موحدین نے بھی میدان چھوڑ دیا۔ نصرانی کوئی پچاس میل تک ان کا تعاقب کرتے رہے، یہاں تک کہ رات کا اندھیرا پھیل گیا۔ اس عبرت ناک شکست کے بعد محمد الناصر جب اشبیلیہ لوٹا تو اس کے دو لاکھ میں سے صرف چار ہزار سپاہی ہم رکاب رہ گئے تھے۔ اندلس کی تاریخ میں اس جنگ کو جنگِ عقاب کے علاوہ، معرکہ بِھاب اور جنگِ اُبدہ بھی کہا جاتا ہے۔[1]

الناصر کی موت:

الناصر اس شکست سے اتنا غم زدہ ہوا کہ فوراً اندلس سے واپس مراکش چلا گیا۔ موحدین اگر از سرِ نو تیاری کرتے تو عقاب کی شکست کا بدلہ لینا کوئی ناممکن بات نہ تھی۔ مگر الناصر کو لگا کہ اندلس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کے لیے ولی عہدی کی بیعت لی اور خود تنہائی میں وقت گزارنے لگا۔ غم کو بھلانے کے لیے وہ رقص و سرود اور مے نوشی کا سہارا لینے لگا مگر سب کچھ بے سود رہا۔ شدید ذہنی تناؤ سے اس کے دماغ میں ورم آ گیا جس سے چند ہفتوں بعد ۱۳ شعبان ۶۱۰ھ (۲ جنوری ۱۲۱۴ء) کو اس کی موت واقع ہو گئی۔

اُدھر الفانسو ہشتم نے عقاب کی فتح سے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے لشکر اطراف و جوانب میں پھیلا کر کچھ ہی دنوں میں حصن عقاب، بلج اور بانیوس جیسے چھوٹے چھوٹے شہروں کو بلا مزاحمت فتح کر لیا۔ شہریوں کو بے دریغ قتل کیا گیا اور ان کی املاک لوٹ لی گئیں۔ یہ لشکر بیاسہ پہنچا تو وہاں کی اکثر آبادی انخلاء کر چکی تھی مگر سفر کی طاقت نہ رکھنے والے ہزاروں لوگ ابھی باقی تھے۔ نصرانیوں نے ان کی اکثریت کو قتل کر دیا اور شہر کی جامع مسجد کو خاکستر کر ڈالا۔ اگلا حملہ اُبدہ پر ہوا

---

[1] دولة الاسلام في الاندلس، لعبدالله عنان المصري: ۳/ ۲۹۰ تا ۳۱۰
عقاب، عقبہ کی جمع ہے جس کا معنی گھاٹی ہے۔ یہ جنگ جس جگہ ہوئی تھی وہ پہاڑی علاقہ تھا اور گھاٹیاں بکثرت تھیں۔ بِھاب، بِھبہ کی جمع ہے جس کا معنی وادی ہے۔ یہ جنگ وادیوں کے علاقے میں لڑی گئی تھی۔ اُبدہ میدان جنگ سے شمال مغرب میں ایک شہر کا نام ہے۔

جہاں مسلمانوں نے تیرہ دن مزاحمت کے بعد امن کا معاہدہ کر کے ہتھیار ڈال دیے۔ نصرانیوں نے شہر میں داخل ہو کر معاہدہ پامال کر دیا، یہاں ساٹھ ہزار مسلمان قتل کیے گئے جبکہ ایک لاکھ کے لگ بھگ کو قیدی بنالیا گیا۔

ان حالات میں اندلس کے محتاط لوگوں نے نوشتۂ دیوار پڑھ کر افریقہ ہجرت کا سلسلہ شروع کر دیا اور چند سالوں میں کم وبیش پانچ لاکھ مسلمان اندلس چھوڑ گئے۔[1]

+++

ابو یعقوب یوسف ثانی، مستنصر باللہ

۶۱۰ھ تا ۶۲۰ھ

(۱۲۱۳ء تا ۱۲۲۴ء)

الناصر کی وفات کے اگلے دن ۱۱ شعبان ۶۱۰ھ کو اس کا بیٹا ابو یعقوب یوسف، مستنصر باللہ کے لقب کے ساتھ موحدین کا خلیفہ بنا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ برس تھی۔ وہ ایک شریف مگر ناتجربہ کار نوجوان تھا۔ اسے مہمات، جہانبانی یا فتوحات سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی، اس لیے حکومت مسلسل کمزور ہوتی چلی گئی۔

اس کا دور عالمی سطح پر مسلمانوں کے لیے نہایت قیامت خیز تھا کیوں کہ اس دور میں ایک طرف مصر اور شام میں پانچویں صلیبی جنگ لڑی گئی جو کئی سال جاری رہی۔ دوسری طرف انہی سالوں میں منگولیا سے چنگیز خان ظاہر ہوا جس نے وسط ایشیا، خراسان، ایران اور عراق کے اکثر شہروں سے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا۔ تاہم اس دوران اندلس میں عموماً امن وامان رہا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ مستنصر کی حکومت کے تیسرے سال ۶۱۲ھ میں قسطالیہ نے دولتِ موحدین سے صلح کا معاہدہ کر لیا لہٰذا کئی سالوں تک قسطالیہ اور موحدین میں کوئی جنگ نہیں ہوئی۔

تاہم دوسری نصرانی ریاستیں وقتاً فوقتاً مسلمانوں سے نبرد آزما رہیں۔ اس دور کا اہم سانحہ "قصرابی دانس" کا سقوط تھا جو جنوبی اندلس کا ایک نہایت مضبوط مورچہ تھا۔ ہوا یہ کہ ۶۱۴ھ میں پرتگال نے جرمن بحری بیڑے کو ساتھ ملا کر اس شہر کو گھیر لیا۔ موحدین اہل شہر کی کمک کے لیے پہنچ گئے مگر پرتگالیوں نے انہیں پسپا کر دیا، اڑھائی ماہ تک محصورانہ جنگ کے بعد اہل شہر بھی ہمت ہار گئے اور یہ نہایت اہم دفاعی مرکز پرتگال کا حصہ بن گیا۔ یہ ۱۴ رجب ۶۱۴ھ کا واقعہ ہے۔ اس مورچے کے زمین بوس ہو جانے سے شلب تک جنوب مغرب کے تمام ساحلی شہر پرتگالیوں کی زد میں آگئے۔

۱۲ ذوالحجہ ۶۲۰ھ (۱۸ جنوری ۱۲۲۴ء) کو مستنصر باللہ کی وفات ہوگئی۔ اس کے دور میں افریقی شہر "فاس" میں بربروں کی ایک شاخ "بنو مرین" نے اپنی جتھہ بندی شروع کی اور اگلے حکمرانوں کے دور میں وہ اتنے طاقت ور ہو گئے کہ موحدین کی حکومت کا خاتمہ انہی کے ہاتھوں ہوا۔[2]

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس: ۳۱۸/۴ تا ۳۲۵ [2] دولة الاسلام فی الاندلس: ۳۳۰/۴ تا ۳۳۵

✦✦✦

عبدالواحد بن یوسف

ذوالحجہ ۶۲۰ھ تا شعبان ۶۲۱ھ

(جنوری ۱۲۲۴ء تا ستمبر ۱۲۲۴ء)

موحدین کے امراء ایک نوجوان کی حکومت کے نقصانات دیکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اب اقتدار کے لیے کسی معمر آدمی کو چنا جائے، لہٰذا انہوں نے عبدالمومن کے پوتے عبدالواحد بن یوسف کو خلیفہ چن لیا جس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ وہ خاموش طبع، متقی اور عزلت پسند تھا۔ بکثرت ذکر وعبادت اور تلاوت میں مشغول رہتا تھا، مگر کاروبار حکومت چلانا اُس کے بس کی بات نہ تھی اور اس نے خود بھی یہ منصب بادلِ نخواستہ قبول کیا تھا۔

اس کی حکومت کو دو ماہ گزرے تھے کہ اندلس کے شہر مُرسیہ کے حاکم عبداللہ نے (جو خلیفہ المنصور کا بیٹا، الناصر کا بھائی اور مستنصر کا چچا تھا) اندلسی امراء کو ساتھ ملا کر بغاوت کر دی۔ ۱۳ صفر ۶۲۱ھ (۱۸ مارچ ۱۲۲۴ء) کو امرائے اندلس نے عبداللہ کی بیعت کر لی اور اس نے العادل کا لقب لگا کر اندلس میں حکومت شروع کر دی۔ ساتھ ہی اس نے مرّاکش کے عمائد کو بھی اپنی اطاعت اور عبدالواحد کو ہٹانے کی دعوت دی۔

آخر دارالخلافہ کے عمائد نے عبدالواحد کو جبراً معزول کر دیا اور العادل کی بیعت کر لی۔ کچھ دنوں بعد ۲۲ شعبان ۶۲۱ھ (۳۰ ستمبر ۱۲۲۴ء) کو عبدالواحد کو گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا۔ یہ موحدین میں پہلا حکمران تھا جو معزول اور قتل کیا گیا۔ یہ صورتحال دولتِ موحدین کے زوال کی علامت تھی کیوں کہ حکمران خاندان میں اقتدار کی رسہ کشی شروع ہو چکی تھی اور سربراہِ حکومت کا رعب داب ختم ہو گیا تھا۔[1]

✦✦✦

العادل

شعبان ۶۲۱ھ تا شوال ۶۲۴ھ

(ستمبر ۱۲۲۴ء تا اکتوبر ۱۲۲۷ء)

۱۳ صفر ۶۲۱ھ کو اندلس میں تخت نشینی کے وقت العادل کی عمر تقریباً ۳۴ برس تھی۔ وہ ایک عالم فاضل، باوقار اور حوصلہ مند آدمی تھا۔ عبدالواحد کے قتل کے بعد افریقہ میں بھی العادل کی خلافت پر اتفاق ہو گیا تھا۔[2]

---

① دولة الاسلام فی الاندلس لعبدالله عنان المصری: ۳/۳۴۹، ۳۵۲

② دولة الاسلام فی الاندلس لعبدالله عنان المصری: ۳/۳۵۶

اندلس میں عبداللہ البیاسی کی بغاوت:

مگر افسوس کہ اندلس میں موحدین کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے شاہی خاندان کے ایک رئیس ابو محمد عبداللہ البیاسی نے جو کہ بیاسہ اور جیان کا حاکم تھا، بغاوت کر کے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے قسطالیہ کے حکمران فرڈی ننڈ سوئم سے بھی گٹھ جوڑ کر لیا اور یہ نہ سوچا کہ ماضی میں نصرانیوں کو ساتھ ملانے کا صلہ تباہی کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔ العادل نے ۶۲۱ھ کے اواخر میں اپنے بھائی ابو العلاء ادریس بن منصور کو جو اشبیلیہ کا حاکم تھا، بیاسی کے خلاف لشکر کشی کا حکم دیا۔ یہ لشکر اشبیلیہ سے چل کر بیاسہ پہنچا تو موسم سرما شروع ہو چکا تھا اور تیز بارش اور برف باری نے مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ بیاسی کے حلیف فرڈی ننڈ سوئم کی آمد کا خطرہ بھی تھا۔ اُدھر بیاسی نے اظہار اطاعت کرتے ہوئے العادل کی بیعت کا یقین دلا دیا، چنانچہ ابو العلاء نے کوئی پختہ معاہدہ کرائے بغیر واپسی مناسب سمجھی۔ یہ دیکھ کر العادل نے ایک امیر ابو سعید عثمان بن ابی حفص کی قیادت میں ایک اور لشکر وہاں بھیجا۔ اس بار بیاسی میدان میں نکل آیا۔ اس کے اپنے سپاہی صرف ایک سو تھے مگر اسے قسطالیہ کی کمک مل چکی تھی۔ ابو سعید نصرانیوں سے مرعوب ہو گیا اور بغیر لڑے واپس ہو گیا۔ اس صورتحال نے بیاسی کا حوصلہ بڑھا دیا اور وہ قرطبہ پر بھی قابض ہو گیا۔[1]

نصرانیوں کے مقابلے میں موحدین کو شکست:

مسلمانوں کے اس انتشار نے دیگر نصرانی ریاستوں کو بھی مزید پیش قدمی کا موقع دیا۔ ریاست لیون کا لشکر مارٹن شانیز (جو شاہ پرتگال شانجہ ثانی کا ناجائز بیٹا تھا۔) کی قیادت میں کوہستان شارات عبور کر کے جنوبی اندلس تک پہنچ گیا اور وہاں تاخت و تاراج کرنے لگا۔

جلد ہی نصرانی اشبیلیہ کے نواح میں پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر عوام نے جامع مسجد میں احتجاج کیا اور العادل سے جہاد کی تیاری کا مطالبہ کیا۔ رائے عامہ کے دباؤ سے مجبور ہو کر العادل نے جہاد کا حکم دیا اور جمادی الاولیٰ ۶۲۲ھ میں اشبیلیہ سے لشکر نکلا۔ لشکر میں زیادہ تر رضا کار تھے جو پیادہ اور غیر مسلح تھے۔ گھڑ سوار فقط ایک سو تھے۔ اُدھر سے نصرانی لشکر پوری طرح مسلح اور بکثرت سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ جب فریقین آمنے سامنے ہوئے تو مسلمانوں کے گھڑ سوار حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ لشکر کے امیر عبداللہ بن ابو بکر نے انہیں منع کیا اور کہا کہ اپنا دفاع زیادہ اہم ہے۔ گھڑ سوار نہ مانے اور اُسے برا بھلا کہتے ہوئے دشمن پر حملہ آور ہو گئے۔ نصرانیوں نے انہیں روند دیا اور پھر لشکرِ اسلام پر ٹوٹ پڑے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کو شکستِ فاش ہوئی اور تقریباً بیس ہزار افراد یہاں شہید ہو گئے۔

اسی سال رجب میں مشرقی اندلس کے امراء کو بھی نصرانیوں کے مقابلے میں ہزیمت اٹھانا پڑی۔[2]

العادل کی افریقہ واپسی:

ان شکستوں سے اندلس میں مسلمانوں کا ضعف پوری طرح ظاہر ہو گیا۔ اُدھر مراکش میں تخت خالی پڑا تھا

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۳/ ۳۵۲، ۳۵۳ [2] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۳۵۲

اور وہاں کے اُمراء العادل کو بلا رہے تھے۔ چنانچہ العادل نے اندلس میں اپنے بھائی ادریس ابوالعلاء کو نائب بنایا اور ذوالقعدہ ۶۲۲ھ میں خود مراکش آ گیا۔[1]

نصرانیوں کو اندلس پر مسلط کرنے میں البیاسی کا کردار:

العادل کی غیر موجودگی میں عبداللہ البیاسی کو کھلا موقع مل گیا اور وہ موحدین سے باقی علاقے چھیننے کے درپے ہو گیا۔ اُس کے پاس زیادہ فوج نہ تھی مگر اُس کا حلیف فرڈیننڈ سوئم اُس کے بلاوے پر فوراً آن پہنچا۔ بیاسی اُس کا تابع مہمل بن کر پہلے ضلع اُبدہ کے شہر قیساطہ (Quesada) پہنچا جو خوشحالی اور ثروت کے لیے مشہور تھا۔ سنگ باری کر کے شہر کی دیواریں توڑ دی گئیں اور وہاں قتل عام کے دوران ہزارہا مسلمان قتل کیے گئے اور قیدی بنائے گئے۔ اس کے بعد مزید کئی قلعے مسخر کیے گئے۔ قسطالیہ کی فوج نے جیّان کے گرد و نواح میں ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کو شہید کیا اور موسم سرما کی آمد پر ۶۲۲ھ کے اواخر (نومبر ۱۲۲۵ء) میں واپس ہو گئی۔

اگلے برس ۶۲۳ھ میں قسطالیہ کی افواج دوبارہ آئیں اور کوہستان شارات کو عبور کر کے عبداللہ بیاسی کے ساتھ آگے پیش قدمی کرنے لگیں۔ بیاسی کے علاقوں کو چھوڑ کر وہ مسلمانوں کے ہر قصبے اور بستی کو اجاڑتی چلی گئیں اور آخر میں جیّان کے محاصرے میں مشغول ہو گئیں جہاں موحدین کا امیر عمر بن عیسیٰ مورچہ بند تھا۔ اس نے کچھ دن محصورانہ جنگ کے بعد کھلے میدان میں آ کر مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ ۱۸۰ مسلمان قتل اور دو ہزار گرفتار ہو گئے۔ عمر بن عیسیٰ باقی فوج کے ساتھ دوبارہ قلعہ بند ہو گیا۔ فرڈی ننڈ سوئم متواتر حملے کر کے بھی اسے فتح نہ کر سکا۔

آخر اس نے دیگر قلعوں کی طرف پیش قدمی کی اور لوشہ اور الحمہ کو مسخر کرتے ہوئے غرناطہ تک پہنچ گیا۔ اس زمانے میں باربیر تھ نامی ایک نصرانی افسر فرڈی ننڈ سے ناراض ہو کر موحدین کی فوج میں شامل ہو گیا تھا۔ اہل غرناطہ نے اُسے اشبیلیہ سے بلوایا اور فرڈی ننڈ سوئم سے مذاکرات کی ذمہ داری سونپی۔ آخر معاہدے کے مطابق اہل غرناطہ نے تیرہ سو نصرانی قیدی جو گزشتہ جنگوں میں گرفتار ہوئے تھے، رہا کر دیے۔ باربیر تھ اس معاہدے کے بعد دوبارہ فرڈی ننڈ کا ملازم بن گیا اور اس کے ساتھ ہی واپس ہو گیا۔

فرڈی ننڈ کا اگلا حملہ موحدین کے صوبائی مرکز اشبیلیہ پر تھا۔ وہاں العادل کے نائب ابوالعلاء نے کھلے میدان میں نصرانیوں سے ٹکر لی مگر اُسے دو ہزار لاشیں چھوڑ کر پیچھے ہٹنا اور شہر میں محصور ہونا پڑا۔ اس شکست کی خبر قرطبہ پہنچی تو وہاں کے عمائد نے بیاسی کی قوت تسلیم کر کے اُسے موحدین کا نیا حکمران مان لیا۔ فرڈی ننڈ سوئم نے بیاسی کو عسکری امداد اس شرط پر دی تھی کہ وہ حکمران بننے کے بعد اس کے پسندیدہ قلعے اور شہر اسے سپرد کر دے گا۔ چنانچہ بیاسی نے مرتش، اندوجر، شلبطرہ، قبال اور برج الحمہ جیسے قلعے نصرانیوں کے حوالے کر کے وفاداری کا پورا ثبوت فراہم کر دیا۔[2]

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۳/۳۵۲ تا ۳۵۵

[2] دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۳/۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰

بیاسی کا انجام:

عبداللہ بیاسی اپنے زعم میں مسلمانانِ اندلس کا متفقہ حکمران بننے کے لیے اشبیلیہ پر قبضہ ضروری سمجھتا تھا۔ چنانچہ موقع پاتے ہی وہ لشکر لے کر اشبیلیہ پر چڑھ دوڑا مگر اس بار وہاں ابوالعلاء مقابلے کی بھرپور تیاری کر چکا تھا۔ ۲۵ صفر ۶۲۳ھ کو ہونے والے اس معرکے میں بیاسی کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ جان بچا کر تھوڑے سے سپاہیوں کے ساتھ قرطبہ پہنچا۔ بیاسی کی شکست کی خبر سن کر فرڈی ننڈ سوم لشکر لیے قسطالیہ سے نکلا اور قرطبہ کے شمال میں ایک اہم قلعے حصنِ قبالہ کو گھیر لیا۔ یہ دیکھ کر اہلِ قرطبہ کو خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں بیاسی قرطبہ بھی نصرانیوں کے سپرد نہ کر دے۔ چنانچہ بعض عمائدِ قرطبہ نے اسے قتل کرنے کی ٹھان لی۔ بیاسی کو اس کی بھنک پڑ گئی اور وہ شہر سے فرار ہو کر قرطبہ کے جنوب مغرب میں واقع حصنِ مدور میں چھپ گیا۔ تاہم اہلِ قرطبہ نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور قلعے کا محاصرہ کر کے اس میں گھس گئے اور بیاسی کو قتل کر دیا۔ العادل کے نائب ابوالعلاء کو قرطبہ کا تخت پیش کر دیا گیا۔ اس نے بیاسی کا سر فتح کے بشارت نامے کے ساتھ العادل کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

بیاسی کی عمر ساٹھ سال تھی۔ اس نے زندگی کے آخری تین سال مسلمانانِ اندلس کے اہم دفاعی خطوط تباہ کرنے میں صرف کیے اور نصرانیوں کو وہ تمام اہم قلعے دے دیے جن پر قبضے کے بعد اُن کے لیے وسطی اور جنوبی اندلس کو فتح کرنا زیادہ مشکل نہیں رہ گیا تھا۔ (1)

اُدھر ۶۲۳ھ کے اواخر میں فرڈی ننڈ نے حصنِ قبالہ کو فتح کر لیا۔ ۹ ذوالحجہ کو نصرانیوں کی ایک فوج بیاسہ کے مضبوط قلعے پر بھی قابض ہوگئی۔ اگلے برس بیاسہ کے جنوب میں واقع حصنِ شوذر بھی مسخر ہو گیا۔ یوں نصرانی اسلامی اندلس کے قدیم پایۂ تخت قرطبہ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ ابوالعلاء نے یہ صورتحال دیکھ کر فرڈی ننڈ سوم سے بھاری تاوان دینے کی شرائط پر ایک سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا۔ (2)

العادل نہ صرف اندلس سے لاتعلق ہو کر بیٹھ گیا تھا بلکہ افریقہ میں بھی حالات اس کے قابو میں نہیں رہے تھے، ایسے میں اس کے بھائی ابوالعلاء کو یہی سوجھی کہ وہ خود خلیفہ بن کر حالات کو سدھارے۔ چنانچہ عمائد قرطبہ و اشبیلیہ اور علماء سے مشاورت کے بعد ۲ شوال ۶۲۴ھ کو ابوالعلاء نے خلافت کا اعلان کر دیا اور المامون کا لقب اختیار کر لیا۔

اس سے اچھی اُمیدیں وابستہ کر کے مراکش کے موحدین نے بھی اس سے بیعت کر لی اور اس کے حکم پر العادل سے استعفیٰ دینے کا مطالبہ کیا۔ جب وہ نہ مانا تو اُسے قتل کر دیا۔ یہ ۲۲ شوال ۶۲۴ھ (۱۷ اکتوبر ۱۲۲۷ء) کا واقعہ ہے۔ (3)

◆◆◆

---

(1) دولة الإسلام في الأندلس: ۴/۳۶۰، ۳۶۱

(2) دولة الإسلام في الأندلس: ۴/۳۶۲، ۳۶۳

(3) دولة الإسلام في الأندلس لعبدالله عنان المصري: ۴/۳۶۳، ۳۶۴

ابوالعلاء ادریس المامون

شوال ۶۲۴ھ تا ذوالحجہ ۶۲۹ھ

(اکتوبر ۱۲۲۷ء تا اکتوبر ۱۲۳۲ء)

بظاہر اندلس اور مراکش پر المامون کی حکومت قائم ہوگئی تھی مگر فقط ایک ہفتے بعد مراکش میں موحدین نے اس کی بیعت توڑ دی اور ایک سولہ سالہ شہزادے یحییٰ بن ناصر کو خلیفہ چن لیا اور ۲۸ شوال ۶۲۴ھ کو اس کی بیعت کر لی اور وہ معتصم کا لقب لگا کر تخت نشین ہوگیا۔[1]

فرڈیننڈ سوئم سے ذلت آمیز معاہدہ:

المامون اس خبر پر بپھر گیا اور جلد از جلد فوج لے کر افریقہ جانے پر تل گیا مگر اسے قسطالیہ سے قرطبہ پر حملے کا خطرہ تھا جبکہ جنگ بندی کی مدت پوری ہو چکی تھی۔ المامون نے اس موقع پر فرڈی ننڈ سوئم سے مزید ایک سال کی جنگ بندی کا معاہدہ کیا جس میں درج ذیل امور طے پاگئے:

1. قسطالیہ کو چاندی کے دس لاکھ سکے ادا کیے جائیں گے۔
2. فرڈی ننڈ کے پسندیدہ دس قلعے اسے دے دیے جائیں گے۔
3. مراکش میں نصرانیوں کو ایک چرچ بنا کر دیا جائے گا۔
4. اگر (مامون کے علاقے میں) کوئی نصرانی اسلام لایا تو اس کا اسلام قبول نہیں کیا جائے گا بلکہ مسلمان اسے پادریوں کے سپرد کر دیں گے۔ اگر (فرڈی ننڈ کے علاقے میں) کوئی مسلمان نصرانی ہوا تو کسی کو اجازت نہیں ہوگی کہ اس معاملے میں دخل دے۔
5. فرڈی ننڈ المامون کو افریقہ پر قبضہ دلانے کے لیے فوجی مدد دے گا۔

یہ ذلت آمیز معاہدہ ۶۲۶ھ (۱۲۲۹ء) میں ہوا اور اسی سال ماہِ رمضان میں قسطالیہ کے پانچ سو سپاہی المامون کے پاس پہنچ گئے۔[2]

باغی شہزادے یحییٰ معتصم کو شکست:

المامون اپنے سپاہیوں اور نصرانیوں کو لے کر ذوالقعدہ میں افریقہ پہنچا جہاں موحدین کے کچھ امراء بھی اپنی جمعیتوں کے ساتھ اس سے آملے۔ اس لشکر نے ۲۵ ربیع الاول ۶۲۷ھ کو معتصم کے لشکر سے ٹکر لی اور اسے پسپا کر دیا۔ نصرانی دستہ معتصم کے خیمے میں گھس گیا۔ وہ بمشکل اپنی جان بچا کر نکلا اور کہیں روپوش ہوگیا۔

---

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۳۶۸/۴

[2] دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۳۶۸/۴

المامون نے جلد ہی مراکش شہر بھی فتح کرلیا۔ وہاں مفتی سے فتویٰ لے کر موحدین کے ایک سو قدیم اور تجربہ کار امراء کو جنہوں نے اس کی بیعت توڑی تھی، سزائے موت دے دی۔

اُدھر معتصم نے اپنی قوت دوبارہ جمع کرلی تھی۔ رمضان میں فریقین میں دوسرا معرکہ ہوا۔ معتصم کو دوبارہ شکست ہوئی اور وہ پسپا ہوگیا۔ المامون نے بغاوت کرنے والے چار ہزار موحدین کے سر قلم کرا کے مراکش شہر کی فصیل پر لٹکا دیے۔ گرمی کے باعث ان کی بدبو سے شہر کے لوگ پریشان ہوگئے۔

جب انہوں نے المامون کو یہ شکایت پہنچائی تو اس نے کہا: ''یہاں کچھ پاگل بستے ہیں جن کا علاج یہی ہے۔ ان سروں کو دیکھ کر انہیں عبرت ہوگی۔ ان کی بُو ہمارے دوستوں کے لیے عطر ہے، دشمنوں کو ناگوار ہے۔''

المامون نے فرڈیننڈ سے کیے گئے معاہدے کے مطابق مراکش میں ایک گرجا بنادیا اور باقی شرائط پر بھی عمل کیا۔[1]

ابن تومرت کی مہدویت اور عصمت کی تردید:

مامون نے کئی غلط فیصلے کیے مگر ایک کام بہت اچھا کیا۔ دولتِ موحدین میں ابن تومرت کو سرکاری طور پر مہدیٔ معصوم کہا جاتا تھا۔ سکوں پر اس کا نام نقش کیا جاتا تھا اور خطبوں میں اس کے لیے دعائیں کی جاتی تھیں۔ مامون نے اس کا نام خطبوں اور سکوں سے ختم کرادیا اور ایک اعلان میں واضح کیا کہ وہ نہ تو مہدی تھا اور نہ ہی معصوم تھا۔ عصمت صرف انبیائے کرام کے لیے خاص ہے۔ مامون نے حکم نامے میں بتایا کہ سابق خلیفہ ابو یوسف المنصور یہ اعلان کرانے کا فیصلہ کرچکا تھا مگر اسے مہلت نہیں ملی، لہٰذا یہ اہم کام اب انجام دیا جارہا ہے۔

اس حکم نامے کی کہیں مخالفت نہیں ہوئی کیوں کہ افریقہ اور اندلس میں اکثر لوگ اہل سنت تھے اور ان کا یہی عقیدہ تھا۔ ابن تومرت سے متعلقہ مہدویت اور عصمت کے الفاظ موحدین کے ہاں بطورِ غلط رسم چلے آرہے تھے جسے مٹانے کی کسی کو ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مامون کا یہ اعلان ان کے دلوں کی آواز تھا۔ یہ واقعہ ۶۲۷ھ کا ہے۔[2]

سبتہ میں بغاوت:

مامون کوشش کررہا تھا کہ کسی طرح عوام کو مطمئن کیا جائے اور کم از کم شمالی افریقہ میں اپنے قدم مضبوط کیے جائیں مگر اسی دوران ۶۲۹ھ میں اس کے بھائی ابو موسیٰ نے جسے اس نے سبتہ کا حاکم بنایا تھا، بغاوت کردی۔ مامون لشکر جمع کرکے سبتہ پہنچا اور شہر کا محاصرہ کرلیا۔ پیچھے مرّاکش کے دفاع کے لیے زیادہ سپاہی نہ تھے۔ سبتہ کا محاصرہ طویل ہوتا گیا یہاں تک کہ تین ماہ گزر گئے مگر شہر فتح ہونے میں نہ آیا۔[3]

مرّاکش پر یحییٰ معتصم کا قبضہ۔ مامون کی وفات:

اُدھر مامون کے پرانے حریف معتصم نے موقع غنیمت جانا اور اپنے حامیوں کو جمع کرکے مرّاکش پر حملہ آور ہوگیا۔

---

(1) دولۃ الاسلام فی الاندلس لعبداللہ عنان المصری: ۳/۳۶۸ تا ۳۷۰

(2) دولۃ الاسلام فی الاندلس لعبداللہ عنان المصری: ۳/۳۷۰ تا ۳۷۲ (3) دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۳/۳۸۲

چوں کہ وہاں کوئی لشکر نہ تھا اور اہل شہر کی طرف سے خاص مزاحمت بھی نہ ہوئی، لہٰذا شہر جلد مسخر ہو گیا۔ معتصم نے قصر خلافت کو پوری طرح لوٹ لیا اور تمام خزانے اپنے پہاڑی ٹھکانوں میں منتقل کرا دیے۔ مزید یہ کہ اس نے مامون کے تعمیر کردہ گرجے کو نذر آتش کر دیا اور وہاں رہنے والے پادریوں اور نصرانیوں کو قتل کرا دیا۔ اس کے علاوہ شہر میں جو بھی یہودی ملا، اسے زندہ نہ چھوڑا۔

مامون کو معلوم ہوا تو وہ سبتہ کا محاصرہ چھوڑ کر تیزی سے واپس مڑا تاکہ معتصم کو سزا دے کر نشانِ عبرت بنا دے۔ اُس نے اپنی فوج میں شامل نصرانیوں سے جو اپنے گرجے کی تباہی پر سخت مشتعل تھے، قسم کھا کر وعدہ کیا کہ وہ تین دن کے لیے مراکش کو انہی کے حوالے کر دے گا تاکہ وہ جو چاہیں لوٹ لیں اور اپنا غصہ ٹھنڈا کریں۔ تاہم اس کا یہ نامبارک وعدہ پورا نہ ہو سکا اور راستے ہی میں وہ بیمار ہو کر ۲۹ ذوالحجہ ۶۲۹ھ (۱۸ اکتوبر ۱۲۳۲ء) کو وفات پا گیا۔[1]

مامون کے دور پر ایک نظر:

مامون اپنے باپ ابو یوسف المنصور کی طرح بڑا دلیر اور ہوشیار تھا۔ ساتھ ساتھ قرآن وسنت اور فقہ کا عالم اور اچھا ادیب بھی تھا۔ مگر ان تمام صلاحیتوں کے باوجود وہ دولتِ موحدین کو زوال سے نہ بچا سکا۔ اُسے فقط پانچ سال ملے جو بغاوتوں کو کچلنے میں گزر گئے۔[2]

وہ ذاتی طور پر مذہبی آدمی تھا۔ اُس نے ۶۲۸ھ میں تمام بلادِ موحدین میں ایک اعلامیہ مشتہر کیا جس میں نمازوں کی پابندی، زکوٰۃ وصدقات نکالنے، نیکی کا حکم دینے، گناہوں سے روکنے، مے نوشی اور دیگر منشیات سے بچنے اور دین کی دعوت عام کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔[3]

اس کا سب سے بڑا قصور نصرانیوں سے مدد لینا اور انہیں اپنے لشکر کا حصہ بنانا تھا مگر اپنے دامن پر یہ داغ لگا کر بھی وہ کچھ حاصل نہ کر سکا بلکہ اس طرح معاملات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔

اس کے دور میں تیونس بھی موحدین کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پہلے وہاں موحدین کی طرف سے بنوحفص حکومت کر رہے تھے مگر موحدین کو کمزور دیکھ کر ۶۲۵ھ میں وہ خود مختار حکمران بن گئے۔ یوں موحدین کی قوت مزید کم ہو گئی۔ اس سے قبل ۶۲۳ھ میں تلمسان کے بنی زیان بھی خود مختار ہو چکے تھے۔ الغرض اب موحدین کی قوت دن بدن رو بہ زوال تھی، اس لیے وہ اس قابل ہی نہ رہے تھے کہ اندلس پر توجہ دے سکتے جہاں فرڈیننڈ سوم جیسا طاقتور دشمن مدمقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

◆◆◆

---

① دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۳۸۳/۴

② دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۳۸۵/۴

③ دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۳۸۱/۴

الرشید کی بیعت:

مامون کی وفات دورانِ سفر ہوئی تھی۔ اس کا چودہ سالہ لڑکا ابو محمد عبدالواحد ساتھ تھا۔ اُمرائے لشکر نے یکم محرم ۶۳۰ھ کو اس کی بیعت کر لی اور وہ الرشید کا لقب لگا کر خلیفہ ہوگیا۔ مامون کی موت کی خبر چھپائی گئی اور یہی ظاہر کیا گیا کہ وہ بیمار ہے اور نقل و حرکت سے قاصر ہے۔ [1]

یحییٰ معتصم کی شکست اور قتل:

یہ لشکر اسی انداز میں مرّاکش پہنچا جہاں یحییٰ معتصم قابض تھا۔ جب لشکر شہر کے قریب پہنچا تو یحییٰ معتصم نے باہر نکل کر مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور مارا گیا۔ تاہم اس وقت تک اہلِ شہر کو خبر مل چکی تھی کہ مامون نے نصرانیوں کو تین دن تک شہر لوٹنے کی اجازت دی ہے۔ اس لیے انہوں نے لشکر کے لیے شہر کے دروازے نہ کھولے اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو کر شہر کی فصیل پر جمع ہوگئے۔ [2]

مرّاکش پر الرشید کا قبضہ:

آخر اُمرائے لشکر نے شہر کے علماء و فقہاء کو واسطہ بنا کر واضح کیا کہ مامون کی وفات ہو چکی ہے اور نصرانیوں سے کیا گیا وعدہ کالعدم کر دیا گیا ہے۔ الرشید نے شہریوں کے لیے عام معافی کے علاوہ ٹیکس ساقط کرنے کا بھی اعلان کر دیا۔ آخر اہلِ شہر نے مطمئن ہو کر دروازے کھولے اور الرشید اپنے لشکر سمیت اندر داخل ہو کر تخت نشین ہوا۔ نصرانی دستوں کو وعدہ خلافی پر سخت طیش تھا۔ ایسے میں الرشید کی والدہ نے پانچ لاکھ دینار دے کر ان کا غم و غصہ دور کر دیا۔ [3]

الرشید اور موحدین کے اگلے حکمرانوں کا اندلس کی تاریخ سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ خلاصے کے طور پر اتنا جان لینا کافی ہے کہ موحدین مرّاکش میں مزید تین عشروں تک اقتدار میں رہے۔ الرشید کے بعد السعید، عمر المرتضیٰ اور ابو العلاء الواثق یکے بعد دیگرے موحدین کے سربراہ بنے۔ آخری سلطان ابو العلاء الواثق بربر قبیلے بنو مرین کے سامنے بالکل بے بس ہوگیا اور ۶۶۷ھ میں بنو مرین نے اسے قتل کر کے مرّاکش پر اپنی حکومت قائم کر لی۔

باقی بس ایک نام۔ خدا رہ گیا عدیم
سب کچھ بہا کے وقت کا دریا گزر گیا

موحدین پر ایک نظر:

موحدین میں بارہ حکمران گزرے۔ ان میں سے پہلے چار یعنی: عبدالمؤمن، ابو یعقوب، ابو یوسف اور الناصر بڑے عالی شان حکمران تھے مگر جنگِ عقاب میں شکست نے ان کے وقار کو گہن لگا دیا۔ پھر عبدالواحد سے کمزور حکمرانوں کا دور شروع ہوگیا۔ ان حکمرانوں کی فہرست درج ذیل ہے:

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس لعبدالله عنان المصری: ۳۸۳/۳

[2] دولة الاسلام فی الاندلس: ۳۸۴،۳۸۳/۳ [3] دولة الاسلام فی الاندلس: ۳۸۴/۳

نمبر	حکمران	زمانہ	خاص بات
۱	عبدالمومن	۵۲۴ھ تا ۵۵۸ھ (۱۱۳۰ء تا ۱۱۶۳ء)	بانی سلطنت، مرابطین کی حکومت ختم
۲	ابویعقوب یوسف اوّل	۵۵۸ھ تا ۵۸۰ھ (۱۱۶۳ء تا ۱۱۸۴ء)	موحدین کا دورِ عروج
۳	یعقوب ابویوسف المنصور	۵۸۰ھ تا ۵۹۵ھ (۱۱۸۴ء تا ۱۱۹۹ء)	جنگِ اراک کا فاتح، عظیم حکمران
۴	محمد الناصر	۵۹۵ھ تا ۶۱۰ھ (۱۱۹۹ء تا ۱۲۱۳ء)	جنگِ عقاب میں شکستِ فاش
۵	ابویعقوب یوسف ثانی مستنصر	۶۱۰ھ تا ۶۲۰ھ (۱۲۱۳ء تا ۱۲۲۴ء)	کم عمر اور ناتجربہ کار، زوال بڑھ گیا
۶	عبدالواحد	ذوالحجہ ۶۲۰ھ تا شعبان ۶۲۱ھ (جنوری ۱۲۲۴ء تا ستمبر ۱۲۲۴ء)	عابد وزاہد مگر جوہرِ حکمرانی سے عاری
۷	العادل	۶۲۱ھ تا ۶۲۴ھ (۱۲۲۴ء تا ۱۲۲۷ء)	اندلس میں بیاسی کی بغاوت
۸	ابوالعلاء ادریس المامون	۶۲۴ھ تا ۶۲۹ھ (۱۲۲۷ء تا ۱۲۳۲ء)	فتنوں اور بغاوتوں کی کثرت
۹	عبدالواحد الرشید	۶۳۰ھ تا ۶۴۰ھ (۱۲۳۲ء تا ۱۲۴۲ء)	
۱۰	ابوالحسن السعید	۶۴۰ھ تا ۶۴۶ھ (۱۲۴۲ء تا ۱۲۴۸ء)	
۱۱	ابوحفص عمر المرتضیٰ	۶۴۶ھ تا ۶۶۵ھ (۱۲۴۸ء تا ۱۲۶۶ء)	
۱۲	ابوالعلاء الواثق	۶۶۵ھ تا ۶۶۷ھ (۱۲۶۶ء تا ۱۲۶۹ء)	

◆◆◆

موحدین کے اندلس سے بے دخل ہونے کی وجوہ:

مرابطین کی طرح موحدین نے بھی مراکش میں رہ کر اسپین پر حکومت کی کوشش کی تھی، اس لیے یہ وسیع ملک جو نصرانیوں کے پڑوس کی وجہ سے عالم اسلام کی خطرناک ترین سرحد تھا، کبھی پوری طرح ان کے قابو میں نہ آسکا۔ اگرچہ موحدین نے نصرانیوں کی ہر یلغار کو روکنے یا مقامی بغاوتوں کو فرو کرنے میں کبھی تاخیر نہیں کی مگر انہیں اندلس کے داخلی معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے اندلس کو اپنی حکومت کا حصہ ضرور بنایا اور اس کی حفاظت کی کوشش بھی کی مگر المنصور کے سوا، ان کے کسی حکمران نے یہاں نئے قلعے قائم کرنے اور نصرانیوں کے مضبوط مراکز فتح کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لگ بھگ ایک صدی تک حکومت کے باوجود موحدین نے یہاں پر اپنے کوئی خاص اثرات نہیں چھوڑے۔ آخر میں وہ اندلس کے دفاع سے عاجز آگئے اور خود آپس میں دست وگریباں ہوگئے۔ ان کی واپسی کے بیس سال پورے ہونے سے پہلے نصرانی غرناطہ اور گردونواح کے کچھ اضلاع کے سوا، پورا اندلس فتح کر چکے تھے۔

◆◆◆

اندلس صغریٰ

۶۳۳ھ تا ۸۹۷ھ

(۱۲۳۶ء تا ۱۴۹۲ء)

۲۶۵ سال

موحدین کے بعد

اندلسی امراء نے موحدین کی حکومت کو صرف اس امید پر قبول کیا تھا کہ یہ لوگ نصرانیوں سے اندلس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ موحدین اپنی حفاظت کے بھی قابل نہیں رہے تو انہوں نے اپنی آزاد حکومتوں کے قیام کو ترجیح دی اور یوں اندلس میں ایک بار پھر جگہ جگہ آزاد حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ موحدین بے دخل ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی یہاں پھر ویسا ہی سیاسی انتشار پیدا ہو گیا جیسا بنوامیہ کی حکومت ختم ہونے پر ملوک الطوائف کے دور میں تھا۔ تاہم بڑا فرق یہ تھا کہ ملوک الطوائف کی ریاستوں کا مجموعی رقبہ خاصا وسیع تھا اور نصف سے زائد اندلس ان کے پاس تھا جبکہ موحدین کی واپسی کے بعد جو ریاستیں وجود میں آئیں وہ بہت چھوٹی اور کمزور تھیں، نیز ان سب کا رقبہ ملا کر اندلس کا تہائی بھی نہیں بنتا تھا۔

یہاں مقامی امراء کی جو ریاستیں وجود میں آئیں وہ بڑی حد تک نصرانیوں کے رحم و کرم پر تھیں اور انہیں اپنی آزاد اور خود مختار حیثیت برقرار رکھنا بہت مشکل تھا۔ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ ان حالات میں بھی یہ مسلم ریاستیں آپس میں دفاعی و عسکری اشتراک نہ کر سکیں بلکہ اس کے برعکس وہ قسطلیہ، ارغون یا پرتگال کے نصرانیوں سے مدد لے کر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہیں۔ ان میں سے ایک امیر اپنے مخالف کو زیر کرنے کے لیے نصرانیوں کی فوج سے مدد لیتا اور اس کے معاوضے میں اپنے ایک دو قلعے ان کے سپرد کر دیتا۔ اس طرح نصرانیوں کو جانی و مالی نقصان اٹھائے بغیر اپنا مقصود حاصل ہوتا رہا اور اسلامی ریاستوں کا حدود اربعہ جنوب اور مشرق کی طرف سمٹتا رہا۔ حد یہ ہے کہ نصرانیوں کی خوشنودی کے لیے بعض سرکردہ مسلم امراء مرتد بھی ہوئے جن میں بلنسیہ کے ابوزید کا نام پیش کیا جا سکتا ہے جو کسی بھی علاقے پر قبضہ کرنے میں ناکام رہنے کے بعد ارغون جا کر مسیحی بن گیا تاکہ اہل کلیسا کی مدد سے اقتدار حاصل کرے، یہ الگ بات ہے کہ وہ بالکل نامراد رہا اور کہیں بھی اس کی دال نہ گلی۔ ایسے چھوٹے موٹے سیاست دانوں اور ریاستوں کو چھوڑ کر اس دور میں قابلِ ذکر مسلم ریاستیں فقط تین تھیں: (1) بنوہود (2) بنومردنیش (3) بنونصر

مُرسِیہ کے بنوہود

اس ریاست کا بانی ابوعبداللہ محمد بن یوسف تھا جو ملوک الطوائف کے دور میں سرقسطہ پر حکومت کرنے والے بنوہود کی اولاد سے تھا اس لیے عام طور پر اسے ابن ہود کہا جاتا ہے۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کا بااثر آدمی تھا اور دریائے

شنتورہ کے قریب ایک چھوٹے سے قلعے کا مالک تھا۔ جب موحدین کی حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو اس نے اپنے حامیوں کی گروہ بندی کی اور انہیں لے کر مُرسِیَہ کے امیر ابوالعباس کو (جو عبدالمومن بانی دولتِ موحدین کا پڑپوتا تھا) بزورِ شمشیر بے دخل کر دیا۔ یہ رجب ۶۲۵ھ کا واقعہ ہے۔ کچھ دنوں بعد بَلنسیَہ کے حاکم ابوزید نے اسے بے دخل کرنے کے لیے مُرسِیَہ پر حملہ کیا مگر ابن ہود نے اسے پسپا کر دیا۔

اس کامیابی کے بعد رمضان ۶۲۵ھ میں ابن ہود نے مُرسِیَہ میں اپنی بیعت لی اور "امیر المسلمین" کہلانے لگا۔ اندلس کے مسلمان جو اس وقت کسی نجات دہندہ کے منتظر تھے، تیزی سے ابن ہود کی بیعت پر آمادہ ہونے لگے۔ مشرقی اندلس میں شاطِبَہ، جزیرۃ الشقر اور اس کے مضافات میں اس کی بیعت ہوگئی۔

اس وقت موحدین کے پاس بڑے شہروں میں سے فقط اشبیلیہ ہی رہ گیا تھا جہاں ان کا سربراہ ابوالعلاء المامون خود موجود تھا۔ اس نے ابن ہود کے خلاف لشکر کشی کی۔ ۶۲۶ھ کے اوائل میں لورقہ کے میدان میں ابن ہود کو شکست ہوئی اور وہ بَلنسیَہ میں محصور ہوگیا۔ تاہم اس کا زور توڑا نہ جاسکا اور لوگ اس کی طرف مائل رہے۔ ماردہ اور بطلیوس کے امراء نے بھی اس کی اطاعت قبول کر لی۔ ابوالعلاء المامون فضا کو ناسازگار دیکھ کر ذوالحجہ ۶۲۶ھ میں اندلس چھوڑ کر افریقہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اہلِ اشبیلیہ نے بھی ابن ہود کی بیعت کر لی۔[1] المَرِیّہ کا امیر محمد بن عبداللہ رمیمی اظہارِ اطاعت کر کے ابن ہود کے معتمد امراء میں شامل ہوگیا۔[2] اُدھر قُرطُبہ اور غرناطہ کے لوگوں نے بھی اس کے حلقے میں داخل ہونے کو ترجیح دی۔[3] یوں اسلامی اندلس کے اکثر شہر اس کے مطیع ہوگئے۔

سقوطِ بَطلیُوس:

مسلمانوں کی اس قدر حمایت حاصل ہونے کے باوجود ابن ہود شمال سے نصرانیوں کے ریلے کے سامنے بند نہ باندھ سکا۔ اس زمانے میں ریاست لیون کا بادشاہ الفانسو نہم اور اس کا بیٹا فرڈی نند سوم (شاہِ قسطالیہ) اسلامی اندلس کے باقی ماندہ شہر ہڑپ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

الفانسو نہم ریاست بَطلیُوس کے شمالی شہر ماردہ کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں ابن ہود کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ یہ دیکھ کر ابن ہود نے اس کی طرف پیش قدمی کی۔ حصن حنش کے قریب نہایت خونریز جنگ ہوئی۔ ابن ہود کی طبیعت میں استقلال نہ تھا۔ وہ جوشیلے نصرانیوں کے پے در پے حملوں کے سامنے قدم جما کر دیر تک نہ لڑ سکا اور پسپا ہوگیا۔ اس طرح ماردہ پر نصرانیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد جلد ہی بَطلیُوس بھی ان کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ افسوس ناک واقعہ ۶۲۷ھ کے وسط (مئی ۱۲۳۰ء) میں پیش آیا۔[4]

---

① تاریخ ابن خلدون: ۲۱۵/۴ ؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۳۸۹/۴ تا ۳۹۳

② دولة الاسلام فی الاندلس: ۳۳۹/۴ ③ تاریخ ابن خلدون: ۲۱۶/۴،۲۱۷ ؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۲۱۹/۴

④ دولة الاسلام فی الاندلس: ۲۹۹/۴، ۳۰۰

فرڈیننڈ کا جیان پر حملہ اور لیون کی بادشاہت:

اُدھر شعبان ۶۲۷ھ (جون ۱۲۳۰ء) میں فرڈی ننڈ سوئم جیان کے سامنے آن پہنچا اور اس کا سختی سے محاصرہ کر لیا، تاہم اہل شہر نے زبردست مدافعت کی اور حملہ آوروں کو شہر میں نہ گھسنے دیا۔ تین ماہ کے ناکام محاصرے کے بعد فرڈی ننڈ کو واپس جانا پڑا۔ [1] اس دوران اس کا باپ الفانسو نہم فوت ہو گیا۔ یہ خبر سنتے ہی فرڈی ننڈ اس کے پایہ تخت لیون پہنچا اور وہاں کی حکومت بھی سنبھال لی۔ یوں قسطلیہ کی ریاست مزید طاقتور ہو گئی۔ [2]

مستنصر باللہ عباسی کی طرف سے سندِ حکومت:

بہر کیف ابن ہود اس شکست کی تلافی اور مسلمانوں کے اپنی امارت پر اتفاق رائے کے لیے کوشاں رہا۔ ۶۲۹ھ میں اس نے جزیرۃ الخضراء اور جبل الطارق اور اسی سال سمندر پار مراکش کے ساحلی شہر سبتہ کو بھی تابع کر لیا۔ [3]

اس دوران اسی نے بغداد کے عباسی خلیفہ مستنصر باللہ سے روابط قائم کیے اور ۶۳۰ھ میں اس سے پروانۂ امارت حاصل کر کے اپنی سیاسی ساکھ بلند کر لی۔ [4]

فرڈی ننڈ کے مقابلے میں شکست اور خراج کا معاہدہ:

ابن ہود کی بڑھتی ہوئی قوت دیکھ کر ۶۳۰ھ میں فرڈی ننڈ سوئم نے اپنے بھائی الفونٹ الفانسو کی قیادت میں ایک لشکر اس کے خلاف بھیج دیا جس نے قرطبہ کے گرد و نواح میں لوٹ مار کرنے کے بعد شریس کا رخ کیا۔ یہاں ابن ہود نے "فحص شریش" نامی میدان میں اس کا مقابلہ کیا مگر اسے شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا۔

فرڈی ننڈ سوئم نے اب "اُبذہ" کے مستحکم شہر پر حملہ کیا اور طویل محاصرے کے بعد ۶۳۰ھ کے اواخر میں اس پر قابض ہو کر مقامی مسلمانوں کو نقل مکانی پر مجبور کر دیا۔ ان حالات میں ابن ہود نے فرڈی ننڈ سوئم کے مزید حملوں سے بچنے کے لیے اُسے یومیہ ایک ہزار دینار ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔ یہ معاہدہ ۶۳۰ھ میں ہوا۔ [5]

ابن الاحمر سے صلح:

ابن الاحمر اور ابن ہود کے درمیان سرحدی معاملات پر اختلافات چلے آرہے تھے۔ خصوصاً قرطبہ کو دونوں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ اُدھر اہل قرطبہ کا یہ حال تھا کہ کبھی وہ ابن ہود کے تابع ہو جاتے اور کبھی ابن الاحمر کو اپنا حاکم مان لیتے۔ آخر میں وہ ابن ہود کی طرف ہو گئے تھے اور ابن الاحمر کو قرطبہ سے بے دخل کر دیا تھا۔ اس بات کا ابن الاحمر کو سخت افسوس تھا اور وہ اہل قرطبہ سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔

---

1. دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۳۰۱
2. دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۳۰۱
3. دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۳۰۰
4. دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۳۱۱، ۳۱۲
5. دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۳۰۱، ۳۰۲

تاہم اس دوران نصرانیوں کے پے در پے حملوں نے ابن الاحمر کو فکر مند کر دیا اور وہ ابن ہود سے صلح پر آمادہ ہو گیا۔ خلیفہ مستنصر کی طرف سے ابن ہود کے لیے سندِ حکومت آنے کے بعد ابن الاحمر نے شوال ۶۳۱ھ میں اس شرط پر ابن ہود کی بیعت کر لی کہ اُسے جیّان اور گرد و نواح کے قلعوں اور قصبات کی حکمرانی پر برقرار رکھا جائے گا۔ اس معاہدے سے مسلمانوں کے درمیان انتشار میں کمی آگئی اور اندلس کے دو بڑے سیاست دان ایک صف میں آگئے۔[1]

فرڈیننڈ سوئم کی عیاری اور ابنِ ہود کی عاقبت نااندیشی:

فرڈی ننڈ سوئم کے لیے یہ اتحاد خطرے کی گھنٹی سے کم نہ تھا۔ اس نے بلا تاخیر ۶۳۲ھ میں جنوب کی طرف اس طرح یلغار شروع کر دی کہ ابن الاحمر اور ابن ہود دونوں کو اپنی سرحدیں خطرے میں نظر آنے لگیں۔

فرڈی ننڈ نے قریب آکر لشکر کو ابن الاحمر کے علاقے جیّان کی طرف موڑ دیا اور سفیر بھیج کر ابن ہود سے مذاکرات شروع کر دیے۔ فرڈی ننڈ کی پہلی شرط یہ تھی کہ ابن ہود اُسے ایک لاکھ تیس ہزار دینار ادا کرے جن میں سے پچاس ہزار فوراً ادا کیے جائیں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ وہ جبلِ شارات کے تیس قلعے قشتالیہ کے حوالے کر دے۔ اس کے بدلے تین سال تک اس کی سرحدوں کا احترام کیا جائے گا اور اس کے خلاف ابن الاحمر کی عسکری مدد نہیں کی جائے گی۔

درحقیقت فرڈی ننڈ اس معاہدے کے ذریعے ابن الاحمر اور ابن ہود میں بد اعتمادی پیدا کر کے ان کی صلح کو توڑ رہا تھا۔ نیز فرڈی ننڈ کی پیش کش میں بین السطور یہ دھمکی موجود تھی کہ اگر ابن ہود نے معاہدہ نہ کیا تو فرڈی ننڈ ابن الاحمر کو ساتھ ملا کر اس کے خلاف محاذ بنالے گا۔ مسلمانوں کی کم بختی تھی کہ ابن ہود نے جو کہ فرڈی ننڈ سے مرعوب ہو چکا تھا، ہر شرط مان لی اور یہ معاہدہ کر لیا۔ یوں اس کے اور ابن الاحمر کے درمیان ہونے والا صلح کا معاہدہ خود بخود سبوتاژ ہو گیا جس کا ثبوت یہ ہے کہ ابن الاحمر اس عقد میں شریک نہ تھا۔ حالانکہ وہ ابن ہود سے صلح کر چکا تھا اور اس لحاظ سے اس معاہدے میں اس کی شرکت لازم تھی۔ اس کی عدم شرکت کا مطلب یہ تھا کہ اس نے ابن ہود سے قطع تعلق کر لیا ہے۔

اس معاہدے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ایسے تیس قلعے فرڈی ننڈ کے قبضے میں چلے گئے جن پر قبضے کے بعد قشتالیہ کے لیے ایک طرف قرطبہ، دوسری طرف ابن الاحمر کے دار الحکومت جیّان پر حملہ کرنا بہت آسان تھا۔

معاہدے کے بعد فرڈی ننڈ واپس چلا گیا اور تین سال کے لیے امن و امان ہو گیا۔[2]

بنو مردنیش اور ابو جمیل

موحدین کے دورِ عروج میں محمد بن سعد ابن مردنیش نامی ایک رئیس بلنسیہ کو مرکز بنا کر شرقی اندلس میں تقریباً ربع صدی تک ایک آزاد ریاست کے قیام کے لیے کوشاں رہا۔ تاہم ۵۶۷ھ میں اس کی وفات ہوئی تو اس کے بیٹے

---

① دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۴۱۶

② دولة الاسلام فی الاندلس: ۳/ ۴۱۷

موحدین سے جا ملے اور ان سے بڑے بڑے مناصب حاصل کر کے مشرقی اندلس کی سیاست میں دخیل رہے۔

ساتویں صدی ہجری میں جب موحدین زوال پذیر ہوئے تو اسی خاندان کا ایک سیاست دان ابو جمیل زیان دیگر مقامی امراء کو پچھاڑ کر ۲۶ صفر ۶۲۶ھ کو بلنسیہ پر قابض ہو گیا اور یہاں سے موحدین کے شہزادے ابو زید کو (جو ابو عبداللہ بیاسی کا بھائی تھا) نکال باہر کیا۔ بلنسیہ کا آزاد حکمران بننے کے بعد ابو جمیل زیان نے عباسی خلیفہ مستنصر باللہ کا خطبہ جاری کر کے موحدین سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لیا۔[1]

موحدین کا شہزادہ ابو زید نصرانی ہو گیا:

مگر معاملے کا افسوس ناک ترین پہلو یہ ہے کہ موحدی شہزادہ ابو زید اپنے اہل وعیال سمیت بلنسیہ سے نکل کر ارغون کے نصرانی بادشاہ خایمی اوّل (جیمز پیڈرو) کی پناہ میں چلا گیا اور اس امید پر کہ وہ اسے بلنسیہ کا تخت واپس دلوا دے گا، بہت سے قلعے اس کی تحویل میں دے دیے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس نے نصرانی مذہب اختیار کر لیا اور اپنا نام بھی تبدیل کر لیا۔ مزید یہ کہ اس نے سرقسطہ کی ایک نصرانی امیر زادی سے شادی کر لی۔[2]

بہر کیف مشرقی اندلس میں ابو جمیل زیان کی مقبولیت بڑھتی گئی اور ساحلی شہر دانیہ کے علاوہ بعض دیگر قلعوں کے مسلمان بھی اس کے تابع ہو گئے۔[3]

ابو جمیل اور ابن ہود کے مابین کش مکش:

تاہم ابو جمیل زیان کے لیے مرسیہ کا حاکم ابن ہود (محمد بن یوسف) ایک بھاری حریف تھا جس نے امیر المسلمین کا لقب اختیار کر لیا تھا اور وہ خود کو مسلمانانِ اندلس کا واحد حکمران تسلیم کرانا چاہتا تھا۔ ابو جمیل اس کی سیادت قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس بناء پر مشرقی اندلس کے مسلمان سالہا سال تک ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کی بے سود کوششوں میں مصروف رہے۔ کاش کہ اگر اس وقت ابو جمیل، ابن ہود اور ابن الاحمر متحد ہو جاتے تو شاید اندلس کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

بنو نصر

اس خاندان کا بانی محمد بن یوسف بن نصر تھا جو تاریخ میں ابن الاحمر کے لقب سے مشہور ہے۔ وہ غیر معمولی حد تک ہوشیار، فعال، دلیر، سادگی پسند اور سخت محنت و مشقت کا عادی تھا۔ اس کا اصل علاقہ قرطبہ سے بیس میل دور ایک چھوٹا سا شہر "ارجونہ" تھا جہاں وہ ۵۹۱ھ میں پیدا ہوا تھا۔ بنو مردنیش اور بنو ہود کو حکومتیں قائم کرتے دیکھ کر اس نے بھی ارجونہ کو اپنی آزاد ریاست قرار دے دیا اور اپنی ہوشیاری کی بدولت بہت جلد اتنا اثر ورسوخ حاصل کر لیا کہ وادی آش

---

① دولة الاسلام في الاندلس: ۳۹۳/۴ تا ۳۹۵

② دولة الاسلام في الاندلس: ۳۹۷/۴ تا ۳۹۹

③ دولة الاسلام في الاندلس: ۳۹۵/۴

جیّان اور باجہ کے لوگ بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ اگلے سالوں میں وہ بنو ہود کا سب سے بڑا حریف ثابت ہوا۔[1]

ابن الاحمر نے اشبیلیہ کے رئیس احمد بن محمد الباجی سے ساز باز کی اور اُسے اپنا داماد بنا کر شیشے میں اُتار لیا۔ پھر اُس کے ذریعے اشبیلیہ میں ابن ہود کے خلاف بغاوت کرا دی۔ داماد اور سسر نے مل کر ۶۳۱ھ کے اوائل میں اشبیلیہ کے قریب ابن ہود کو شکست دے کر اس علاقے سے بے دخل کر دیا۔ تاہم ابن الاحمر نے اشبیلیہ کی حکومت حاصل کرنے کے بعد سازش کے ذریعے اپنے داماد کو قتل کرا دیا۔ یہ بات معلوم ہونے پر مقامی عمائد اس سے بدک گئے اور فقط ایک ڈیڑھ ماہ بعد دوبارہ ابن ہود کی بیعت کر لی۔ ۶۳۱ھ میں ابن الاحمر نے نصرانیوں کا خطرہ سر پر دیکھ کر ابن ہود کی بیعت کر لی مگر اگلے ہی سال فرڈی ننڈ نے ابن ہود کو اپنا حلیف بنا کر اس اتحاد کو توڑ دیا۔[2]

+++

[1] الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۲/۵۱ تا ۵٦، ط دار الکتب العلمیة؛ المغرب فی حلی المغرب: ۲/۱۰۹؛ تاریخ ابن خلدون: ۴/۴۱۸ تا ۴۲۰؛ نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۱/ص ۴۴۸،۴۴۴

[2] دولة الاسلام فی الاندلس: ۴/۱۵،۱٦،۱۷

سقوطِ اندلسِ کبریٰ

اس زمانے میں شمال میں ریاستِ ارغون میں خائمی اوّل (جیمز پیڈرو) ، ریاستِ قسطالیہ میں فرڈی ننڈ سوئم اور ریاستِ لیون میں الفانسو نہم کی بادشاہت تھی۔ خائمی مشرقی اندلس کو، فرڈی ننڈ سوئم وسطی اندلس کو اور الفانسو نہم مغربی اندلس کو تدریجاً مسلمانوں سے خالی کرنے میں مصروف تھے۔ مسلمانوں کی نااتفاقی سے فائدہ اٹھا کر یہ سال بسال آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ اندلس کے بڑے بڑے تمام اسلامی شہر جن کے مجموعے کو مؤرخین ''اندلسِ کبریٰ'' کہہ کر یاد کرتے ہیں، نصرانیوں کے قبضے میں چلے گئے۔

مسلمانوں کے پاس صرف جنوب کا کچھ حصہ بچ گیا جسے تاریخ میں ''اندلس صغریٰ'' کہا جاتا ہے۔ اندلسِ کبریٰ کے سقوط کی دردناک اور سبق آموز داستان کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

سقوطِ جزائرِ شرقی

اندلس کے جزائرِ شرقیہ: مَیُورْقَہ، مَنُورْقَہ اور یابِسَہ پر بنوغانیہ کی حکومت تھی جو موحدین کی باقیات میں سے تھے۔ یہ جزائر تجارتی گزرگاہ پر واقع ہونے کے باعث نہایت اہمیت کے حامل تھے۔ ان پر کبھی یورپ کے بحری افسران خصوصاً قطلونیہ، پیزہ اور جینوا کے جہاز ران اور کبھی شمالی اندلس کے نواب وقتاً فوقتاً حملے کرتے رہتے تھے۔ ایک بڑا حملہ ۵۰۸ھ میں ہوا تھا جس میں نصرانی یہاں قابض ہوگئے تھے مگر مرابطین نے ان جزائر کو جلد واپس لے لیا تھا۔

اُدھر ارغون کا بادشاہ خائمی اوّل (جیمز پیڈرو) مشرقی اندلس کے جزائر کو ہڑپ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ خصوصاً جب بَلَنْسِیَہ کے سابق حاکم ابوزید نے اس کے پاس جا کر نصرانیت اختیار کرلی تھی، تب سے شاہِ ارغون کی اُمیدیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ اس نے قطلونیہ کے نواب کورٹیس کو اپنی بحری کمک پر تیار کرلیا۔ اس حملے کی تیاری سے نصرانیوں میں جوش وخروش پھیل گیا اور پادریوں اور راہبوں کی بڑی تعداد خود اس میں شرکت کے لیے آمادہ ہوگئی۔ یورپ کے کئی نواب اس میں شرکت کے لیے آگئے اور مفتوحہ شہروں کی تقسیم کا معاہدہ طے پا گیا۔ آخر ۱۴ شوال ۶۲۶ھ کو ۱۵۵ بحری جہازوں اور بہت سی کشتیوں پر مشتمل بیڑا جزائرِ شرقیہ پر حملے کے لیے روانہ ہوگیا۔[1]

---

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۳/۳، ۲۰۳، ۲۰۲

مَیُوْرْقَہ کا سقوط:

اٹلی اور فرانس کے نواب بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ پہلا حملہ سب سے بڑے جزیرے مَیُوْرْقَہ پر ہوا۔ یہاں کے مسلمان انتہائی شجاعت اور ہمت کے ساتھ کئی ہفتوں تک حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ جب کوئی اُمید نہ رہی تو انہوں نے جان کی امان کے ساتھ شہر حوالے کرنے کی پیش کش کر دی۔ مگر حملہ آوروں نے اسے مسترد کر دیا۔ آخر کار ۱۴ صفر ۶۲۷ ھ کو مَیُوْرْقَہ پر نصرانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں ۲۴ ہزار مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ شہر کے والی ابو یحییٰ نے فاتحین کے ہاتھوں ڈیڑھ ماہ تک طرح طرح کا تشدد جھیلنے کے بعد شہادت پائی۔ بہت سے نامی گرامی اہل علم و فضل بھی شہید ہوئے جن میں امام قراآت و نحو عبد الملک بن ابراہیم عبدری رحمہ اللہ اور نامور شاعر محمد بن عبد اللہ بکری قابلِ ذکر ہیں۔

اس حادثے کے دوران ۳۰ ہزار کے لگ بھگ شہری جان بچا کر پہاڑی قلعوں میں جا چھپے تھے۔ وہ ابن سیری نامی ایک امیر کی قیادت میں منظم ہو کر ایک سال تک نصرانیوں کے لیے دردِ سر بنے رہے۔ آخر ۱۰ ربیع الآخر ۶۲۸ ھ کو ایک فیصلہ کن جنگ میں انہیں بھی شکست ہوئی اور پورا جزیرہ نصرانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔[1]

باقی جزائر کا حال:

مَیُوْرْقَہ پر قبضے کے بعد نصرانی اتحادی واپس چلے گئے۔ سب سے چھوٹے جزیرے یابسہ کا سقوط چند سال بعد ہوا۔ جبکہ مَنُوْرْقَہ پر قبضہ ساٹھ سال بعد ۶۸۶ ھ میں ہوا۔[2]

سقوطِ قُرطُبہ

یہ دور مسلمانانِ اندلس کے لیے سکرات کا تھا۔ موحدین چاہے غیر ملکی تھے مگر ان کی وسیع سلطنت سے جو افریقہ سے بھاری افواج منگوانے کی اہلیت رکھتی تھی، نصرانی خوفزدہ تھے۔ موحدین کے بے دخل ہونے کے بعد اندلس پر وہ سیاہ رات چھائی جس کی صبح کبھی نہ آئی۔ قسطالیہ اور ارغون کے نصرانی یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے صدیوں قدیم مراکز پر قابض ہوتے رہے۔ اندلس کے مسلمانوں کی آزادی ابن ہود، ابن الاحمر اور ابو جمیل زیان کی سیاست کی نذر ہوتی رہی۔

۶۲۷ ھ میں قسطالیہ کی افواج نے ماردہ اور بطلیوس پر قبضہ کر لیا۔ یوں مغربی شہر پوری طرح مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ ۶۲۸ ھ میں جزیرہ میورقہ کے سقوط کے بعد مشرقی اندلس بھی غیر محفوظ ہو گیا۔ اگلے سال سقوطِ قُرطُبہ کا روح فگار واقعہ پیش آیا جو اندلسی مسلم سیاست دانوں کی نااہلی اور بے حمیتی کا مرقع ہے۔ مسلمانوں کا یہ قدیم ترین عظیم الشان شہر جس آسانی سے نصرانیوں کے حوالے کیا گیا، اس پر آج بھی دل پاش پاش ہوتا ہے۔

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۴۰۳/۳-۴۰۷

② التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ: ص ۴۷۱

ناقابلِ شکست قُرطُبہ کیسے مسخر ہوا؟

قُرطُبہ اس وقت ہنوہود کی امارت کے تحت تھا مگر انہوں نے اس عظیم تاریخی شہر پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اہلِ قُرطُبہ سے ٹیکس لے کر اپنے مرکز مُرسیہ میں مطمئن بیٹھے تھے کہ اچانک ربیع الآخر ۶۳۳ھ میں ایک جنگجو نصرانی تنظیم کے گھڑ سوار قُرطُبہ پر حملہ آور ہو گئے۔ قُرطُبہ کی فصیلیں، دوہری تہری، نہایت بلند، مضبوط اور ناقابلِ تسخیر تھیں اور اس پر حملہ کرنے والوں کی تعداد ایک ہزار بھی نہیں تھی، اس لیے کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ شہر سرنگوں ہو جائے گا۔ مگر قُرطُبہ کے مقامی نصرانیوں نے حملہ آوروں کو بیرونی فصیل میں داخل ہونے کے راستے بتا دیے۔ یوں وہ مشرقی بیرونی فصیل پر قابض ہو گئے۔ اس غیر متوقع کامیابی کے بعد انہوں نے قسطالیہ سے فوجی مدد طلب کی اور دیکھتے ہی دیکھتے قسطالیہ کے کئی ہزار سپاہی پادریوں کی سرپرستی میں قُرطُبہ کے سامنے پہنچ گئے۔

اس کے بعد فرڈی ننڈ سوئم خود اس مہم کی قیادت کے لیے آ گیا۔ اس وقت قُرطُبہ سخت سیاسی بحران کا شکار تھا۔ یہاں کوئی مضبوط فوج تھی نہ کوئی جرنیل یا سیاسی قائد جو منصوبہ بندی اور عالی ہمتی سے شہر کی حفاظت کا انتظام کرتا۔

اہلِ شہر کی درخواست پر ابن ہود مُرسیہ سے ۳۵ ہزار سپاہی لے کر قُرطُبہ کی کمک کے لیے نکلا مگر اس نے قسطالیہ کی فوج پر حملہ کرنے میں پس و پیش کی اور کئی منازل دور پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گیا۔ اگر وہ حملہ کرتا تو یقیناً افواجِ قسطالیہ کو محاصرہ ختم کرنا پڑتا کیوں کہ اس وقت محاصرہ کرنے والے نصرانی دس پندرہ ہزار بھی نہیں تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ حملے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ایک نصرانی جاسوس نے، جس پر ابن ہود کو مکمل اعتماد تھا، غلط بیانی کرتے ہوئے اسے بتایا کہ قسطالیہ کی فوج بہت زیادہ ہے جس سے لڑنا ممکن نہیں۔ دوسری اور اصل وجہ یہ تھی کہ ابن ہود قسطالیہ سے صلح کا معاہدہ کیے ہوئے تھا اور اس کے بدلے سالانہ ایک بھاری رقم ادا کر رہا تھا۔

اگرچہ اب قسطالیہ اور ہنوہود کے درمیان صلح کی میعاد ختم ہو چکی تھی، اسی لیے قسطالیہ کی فوج پورے دھڑلے سے ہنوہود کے اس شہر کو گھیرے ہوئی تھی مگر ابن ہود آئندہ بھی اپنے مسلمان حریفوں سے لڑنے کے لیے قسطالیہ سے مدد لینا چاہتا تھا، اس لیے وہ اس سے معاہدۂ صلح کی تجدید پر آمادہ ہو گیا۔

اہلِ قُرطُبہ ابن ہود کی امداد سے مایوس ہونے کے بعد کئی ماہ تک محصورانہ جنگ لڑتے رہے، لیکن آخر کار لاکھوں کی آبادی والے اس شہر میں خوراک کے ذخائر بالکل ختم ہو گئے اور شہری بھوکوں مرنے لگے۔ مجبور ہو کر ان کے عمائد فرڈی ننڈ سوئم کے پاس حاضر ہوئے۔ طے پایا کہ اہلِ شہر کو جان کی امان اور پُر امن انخلاء کا موقع دیا جائے گا۔

اتوار ۲۳ شوال ۶۳۳ھ کو قسطالیہ کی افواج قُرطُبہ میں داخل ہو گئیں۔ پادریوں نے اسی دن عبدالرحمن اوّل کی جامع قُرطُبہ کو چرچ میں تبدیل کر دیا۔ اس کے مینار پر صلیب آویزاں کر دی گئی۔ اگلے دن فرڈی ننڈ اپنے جلوس سمیت شہر میں آیا اور خلفائے بنو اُمیہ کے شاندار قصر میں جا کر نشست جمائی۔ ۳۸۷ھ میں حاجب المنصور نے شمال مغربی کلیسا سینٹ یعقوب سے جو صلیبیں اتاری تھیں وہ اب تک خزانوں میں محفوظ تھیں۔ فرڈی ننڈ نے وہ صلیبیں مسلمان

قیدیوں کے کاندھوں پر لدوا کر دوبارہ سینٹ یعقوب روانہ کر دیں۔ اس طرح ۹۲ھ میں طارق بن زیاد کا فتح کردہ قرطبہ، پانچ سو چھبیس سال تک اذانوں اور نمازوں سے آباد رہنے کے بعد کلیسا کی گھنٹیوں سے گونجنے لگا۔ [1]

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی [2]

قرطبہ سے ہجرت کرنے والوں میں بڑے بڑے علماء وفقہاء شامل تھے جن میں علامہ ابوعبداللہ القرطبی رحمہ اللہ بھی تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۲ سال تھی۔ وہ اندلس چھوڑ کر مصر چلے آئے، وہاں عمر بھر گوشہ نشینی کی حالت میں تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ اسی دوران انہوں نے اپنی شہرہ آفاق تفسیر مکمل کی۔ وہیں ۶۷۱ھ میں فوت ہوئے۔ [3]

سقوطِ بلنسیہ

ادھر مشرقی علاقوں پر ریاست ارغون کے حکمران خائمی اول (جیمز پیڈرو) کی یورش جاری تھی۔ ۶۳۱ھ میں ارغون کی افواج بنومردنیش کے مرکز بلنسیہ کے گرد پھیل گئیں جن میں نصرانی جرنیلوں کے ساتھ مرتد ابوزید بھی تھا۔ پوپ گریگوری نہم اس مہم میں ارغون کی پوری سرپرستی کر رہا تھا لہٰذا مسیحی رضا کاروں کی کئی تنظیمیں اس لشکر کشی میں شامل ہو گئی تھیں۔ اس مہم میں بلنسیہ کے گرد ونواح کے تقریباً تمام چھوٹے شہر (مثلاً: آرش، مورلا اور ریانہ) اور کئی قلعے (مثلاً: بنشکلہ، شنتیت، بریول، کویفاس اور مصورہ) فتح کر کے بلنسیہ کی فتح کا راستہ ہموار کر لیا گیا تھا۔ [4]

جنگِ انیشہ:

دو سال کے وقفے کے بعد ۶۳۳ھ میں شاہ ارغون نے بلنسیہ سے سات میل شمال میں واقع مسلمانوں کے نہایت مستحکم قلعے ''انیشہ'' (انیجہ) پر قبضہ کر کے اسے مسمار کر دیا تھا اور اب وہ کچھ فاصلے پر اپنی افواج کے لیے ایک نیا قلعہ تعمیر کرا رہا تھا تاکہ بلنسیہ پر قبضے میں سہولت رہے۔

یہ دیکھ کر بلنسیہ کے حاکم ابوجمیل زیان نے شہر میں نفیرِ جہاد بلند کی اور ایک بڑے مجمع کے ساتھ انیشہ کی طرف پیش قدمی کی۔ آخر ۲۰ ذوالحجہ ۶۳۴ھ کو نصرانیوں سے سخت جنگ شروع ہو گئی۔ اس لشکر میں علماء وفقہاء کی بڑی تعداد شریک تھی جن میں ستر سالہ محدث ابوالربیع سلیمان بن سالم کلاعی رحمہ اللہ بھی تھے۔ وہ ایک مجاہد صفت عالم تھے اور

---

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۳/ ۴۵۱، ۴۶۳

[2] علامہ اقبال [3] الاعلام زرکلی: ۵/ ۳۲۲

[4] دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۳/ ۴۳۸، ۴۴۰

اس سے پہلے نصرانیوں کے خلاف کئی جنگوں میں اپنی شجاعت کا لوہا منوا چکے تھے۔ اس جنگ میں بھی وہ لشکر کا پرچم تھامے صفِ اول میں رہے اور مجاہدین کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ بہر کیف مسلمانوں کو شکست ہوئی اور وہ پسپا ہونے لگے مگر ابو الربیع رحمہ اللہ اپنی شہادت تک اپنی جگہ جمے رہے اور پکارتے رہے: ''مسلمانو! کیا جنت سے بھاگ رہے ہو؟''

اس جنگ میں علماء و فقہاء اور صالحین کثرت سے شہید ہوئے۔ بلنسیہ کی مرکزی جامع مسجد کی صفِ اول میں نماز پڑھنے والے ستر نمازی یکدم کم ہو گئے کہ وہ اس جنگ کے شہداء میں سے تھے۔ جنگِ انیشہ میں شکست عن قریب بلنسیہ کے سقوط کا پیش خیمہ تھی۔ ①

ابن ہود کا انجام:

ابو جمیل نے خطرے کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے ۶۳۵ھ کے ابتدائی مہینوں میں فقیہ محمد بن خلف انصاری کو ابن ہود سے مدد مانگنے مُرسیہ بھیج دیا۔ ابن ہود نے اس درخواست کا مثبت جواب دیا اور مدد کا وعدہ کر لیا مگر عملاً کچھ نہ کیا۔

ہاں اتنا ضرور ہوا کہ کچھ دن بعد وہ نصرانیوں سے جنگ کا انتظام کرنے کے عنوان سے اَلْمَرِیَّہ پہنچ گیا ہے۔ مگر یہ صرف اَلْمَرِیَّہ میں داخل ہونے کا ایک بہانہ تھا۔ اصل وجہ کچھ اور تھی۔ ہوا یہ تھا کہ کچھ مدت پہلے ابن ہود کو ایک انتہائی حسین وجمیل باندی ملی تھی اور وہ اس پر عاشق ہو گیا تھا مگر اپنی بیگم کے ڈر سے وہ اسے محل میں نہ لا سکا اور اسے بطور امانت اپنے نائب رمیمی کے ہاں اَلْمَرِیَّہ بھیج دیا۔ بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ رمیمی خود اس باندی پر فریفتہ ہے اور اسے اپنے حرم کی زینت بنانا چاہتا ہے۔ اس خبر سے ابن ہود چراغ پا ہو گیا۔ اَلْمَرِیَّہ پہنچنے کا مقصد رمیمی کو سزا دینا تھا۔

تاہم اَلْمَرِیَّہ پہنچ کر اس نے اپنے غصے کو سیاسی مسکراہٹ تلے چھپا لیا اور رمیمی کو یہی تاثر دیا کہ وہ جہاد کی تیاری کے لیے آیا ہے۔ مگر رمیمی اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا۔ اس نے بھی ظاہری طور پر ایک وفادار خادم کی طرح ابن ہود کا شاندار استقبال کیا اور اپنے محل میں اس کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت کا انتظام کیا۔ ساتھ ہی بتایا کہ محفل کے بعد خلوت گاہ میں منظورِ نظر باندی آپ کی نذر ہو گی۔

ابن ہود مطمئن ہو کر ضیافت میں شریک ہوا۔ ضیافت سے فراغت پر اُسے خلوت گاہ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں حمام میں رمیمی نے چار خاص خدام کو چھپا رکھا تھا۔ ابن ہود وہاں داخل ہوا تو ان چاروں نے گلا گھونٹ کر اسے مار دیا۔ یہ ۲۴ جمادی الاولیٰ ۶۳۵ھ کا واقعہ ہے۔ اگلے دن اعلان کر دیا گیا کہ وہ مرگی کے دورے سے مر گیا ہے۔ نعش تابوت میں رکھ کر مُرسیہ بھیج دی گئی۔ یوں بنو ہود کا یہ نامور سیاست دان فقط نو سال کی حکومت کے بعد منظر نامے سے اوجھل ہو گیا۔ ②

ہم دیکھنے کا ڈھنگ سمجھتے رہے عدیم
اتنے میں زندگی کا تماشا گزر گیا

---

① التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الیٰ سقوط غرناطۃ: ص ۳۷۳، ۳۷۴

② دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۴/۴۲۶، ۴۲۷

ابن ہود غیر محتاط حد تک بہادر اور جلد باز تھا اس لیے نصرانیوں سے کئی معرکوں میں شکست کھائی۔ اس نے جو حکومت قائم کی وہ نصف صدی بھی نہ چل پائی۔ اُس نے موحدین کو اندلس سے نکالنے میں اہم کردار ادا کیا مگر خود یہاں کے مسلمانوں کو متحد نہ کرسکا اور یوں اندلس کبریٰ منتشر ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

بلنسیہ پر حملہ:

اُدھر اُمرائے اندلس اپنی دشمنیاں نکال رہے تھے جس کے دوران ابن ہود ایک افسوس ناک انجام کو پہنچ چکا تھا اور اِدھر رجب ۶۳۵ھ میں ارغون کی فوجیں بلنسیہ کی طرف بڑھنا شروع ہو چکی تھیں۔ ریاست کے کئی قلعے مثلاً: المنارہ، بولیس، بطرنہ، بولیا اور اونشو بلا مزاحمت فتح ہو گئے تھے۔ شروع میں ارغون کا لشکر چند ہزار افراد پر مشتمل تھا مگر بلنسیہ پہنچ کر اسے یورپ کے دیگر نصرانی نوابوں کی مدد بھی مل گئی۔

آخر رمضان ۶۳۵ھ میں بلنسیہ پر دس ہزار سواروں اور ساٹھ ہزار پیادوں کے ساتھ فیصلہ کن حملہ ہوا۔ شہر کو اس وقت بیرونی امداد کی سخت ضرورت تھی۔ موحدین اس وقت افریقہ میں سمٹے، شدید سیاسی بحران سے گزر رہے تھے، اس لیے ان سے تعاون کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ ایسے میں ابو جمیل زیان نے اپنے وزیر، مشہور مورخ ابن الابار کو تیونس کی نئی حکومت دولتِ بنو حفص کے پاس امداد طلب کرنے بھیجا۔ ابن الابار نے وہاں کے حکمران ابوزکریا حفصی کے دربار میں پہنچ کر اپنی شہرۂ آفاق نظم پڑھی جو "اَلْقَصِیْدَۃُ السِّیْنِیَّۃ" کے عنوان سے مشہور ہے۔ اس میں کہا گیا تھا:

اَدْرِکْ بِخَیْلِکَ خَیْلِ اللّٰهِ اَنْدَلُسَا ...... اِنَّ السَّبِیْلَ اِلٰی مَنْجَاتِهَا دَرَسَا

"اپنے لشکر کو لے کر جو اللہ کا لشکر ہے، اندلس کی مدد کیجئے۔ بے شک اس کی نجات کا راستہ مٹ رہا ہے۔"

وَهَبْ لَهَا مِنْ عَزِیْزِ النَّصْرِ مَا الْتَمَسَتْ ...... فَلَمْ یَزَلْ مِنْکَ عِزُّ النَّصْرِ مُلْتَمَسَا

"اندلس کی طلب پر اس کی بھرپور مدد کر دیجئے ...... آپ سے ہمیشہ بھرپور مدد ہی مانگی جاتی ہے۔"

یَا لِلْجَزِیْرَۃِ اَضْحٰی اَهْلُهَا جَزَرًا ...... لِلنَّائِبَاتِ وَاَمْسٰی جَدُّهَا تَعَسَا

"بچائیے اس جزیرے کو جس کے باشندے مصائب سے تباہ ہو چکے ہیں اور ان کا اقبال برباد ہو گیا ہے۔"

مَدَائِنُ حَلَّهَا الْاِشْرَاکُ مُبْتَسِمًا ...... جَذْلَانَ وَ ارْتَحَلَ الْاِیْمَانُ مُبْتَئِسَا

"ان شہروں میں شرک مسکراتا خوش خوش آ چکا ہے اور ایمان بدحالی کے عالم میں وہاں سے رخصت ہو گیا ہے۔"

هٰذِهٖ رَسَائِلُهَا تَدْعُوْکَ مِنْ کَثَبٍ ...... وَاَنْتَ اَفْضَلُ مَرْجُوٍّ لِمَنْ یَئِسَا

"یہ آپ کو پڑوس سے پکارنے والوں کے خطوط ہیں ...... آپ نااُمیدوں کے لیے بہترین جائے اُمید ہیں۔"[1]

سلطان نے اس درخواست پر فوری توجہ دی اور ایک لاکھ دینار (۲۹ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر) خرچ کرکے دس بحری جہازوں میں خوراک، رسد اور دفاعی سامان روانہ کر دیا مگر اس وقت تک بلنسیہ کی بندرگاہ کو بھی گھیرا جا چکا تھا اور وہاں

[1] نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۴۵۸،۴۵۷/۱۳

نصرانیوں کے بحری جہاز کھڑے تھے، اس لیے سلطان کے بحری بیڑے کو ناکام واپس آنا پڑا۔ پانچ ماہ کے محاصرے کے بعد آخر اہل بلنسیہ کی طاقت جواب دے گئی اور ابوجمیل زیان نے صفر ۶۳۶ھ میں اس شرط پر کہ اہل بلنسیہ کو اپنے تمام ساز وسامان کے ساتھ دوسرے اسلامی شہروں کی طرف نقل مکانی کرنے دی جائے گی، شہر نصرانیوں کے حوالے کر دیا۔ ۲۷ صفر کو شاہ ارغون خائمی اوّل شہر میں داخل ہو گیا اور یہاں سے اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ①

ابوجمیل اور ابن الابار کا انجام:

بنومردنیش کے وارث ابوجمیل زیان کے پاس صرف دانیہ رہ گیا، مگر ذوالحجہ ۶۴۱ھ میں ارغونیوں نے دانیہ بھی فتح کر لیا۔ ابوجمیل چند سال گمنامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد تیونس چلا گیا اور ۶۶۸ھ میں وہیں وفات پائی۔

اس کا وزیر مؤرخ ابن الابار ہجرت کر کے تیونس چلا گیا اور وہاں ۶۵۸ھ میں فوت ہوا۔ اس نے اندلس اور علمائے اندلس کی یادیں محفوظ کرنے کے لیے "اَلْحُلَّةُ السِّیَرَاء"، "تُحْفَةُ الْقَادِم" اور "التکملة لکتاب الصلة" جیسی کتب تصنیف کیں جو اندلس کی تاریخ کے بہترین مآخذ ہیں۔

اُدھر مشرقی اندلس میں ارغونیوں کی فتوحات جاری رہیں، ۶۴۳ھ میں وہ شاطبہ اور لَقَنْت پر بھی قابض ہو گئے۔ یوں فقط چند سالوں میں مشرقی اندلس کے تمام شہر ریاستِ ارغون کا حصہ بن گئے۔ جزائر میورقہ اور سرقسطہ پہلے ہی سرنگوں ہو چکے تھے۔ صرف مُرسیہ میں ابن ہود کے ورثاء قسطالیہ کے باج گزار بن کر خود کو بمشکل بچائے ہوئے تھے۔ ②

ابن الاحمر کی اِشبیلیہ اور غرناطہ پر حکومت:

بنوہود قرطبہ سے محروم ہونے کے بعد بہت کمزور ہو چکے تھے۔ پھر ۶۳۵ھ میں ابن ہود کی وفات سے اس خاندان کی آن بان تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، جیّان کے سیاست دان ابن الاحمر نے اپنا اثر ورسوخ بڑھانا شروع کر دیا اور ابن ہود کے ورثاء سے اقتدار چھیننے کے لیے کوشاں ہو گیا۔

تاہم اس کی طاقت اب بھی بنوہود سے کم تھی۔ لہٰذا اس نے ایک طرف اشبیلیہ کے عمائد کو دوست بنایا اور دوسری طرف قسطالیہ سے امن معاہدہ کر لیا۔ پھر اس نے غرناطہ کے امراء سے رابطے کیے۔ اہل غرناطہ کو ابن ہود کی موت کے بعد شہر کے نصرانیوں کے قبضے میں چلے جانے کا خطرہ تھا لہٰذا انہوں نے اس خطرے سے بچنے کے لیے ابن الاحمر کی سیادت قبول کر لی۔ وہ جیّان سے غرناطہ پہنچا اور ۲۵ رمضان ۶۳۵ھ کو یہاں کا حکمران بن گیا۔ ایک سال کے اندر اندر اس نے مالقہ اور المَرِیَّہ بھی زیرنگین کر لیے۔ یوں اندلسی مسلم امراء میں وہ طاقت کے لحاظ سے پہلے نمبر پر آ گیا۔

غرناطہ اسلامی دور سے پہلے، البیرہ شہر کی چھوٹی سی بستی تھی مگر اسلامی دور میں رفتہ رفتہ یہ ایک بڑے شہر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ساتویں صدی ہجری میں اندلسِ کبریٰ کے سقوط کے بعد ابن الاحمر نے اسی غرناطہ کو اسلامیانِ اندلس

---

① دولة الاسلام فی الاندلس: ۴۴۸/۳ تا ۴۵۰

② دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۴۵۰/۳ تا ۴۶۰

کا آخری دفاعی مورچہ بنالیا جو اڑھائی سو سال تک اسلامی تہذیب وتمدن کا مرکز رہا۔

نصرانی ابن الاحمر کو زیادہ طاقتور ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے اس کے اہم شہر جیّان پر دھاوا بول دیا۔ ابن الاحمر نے غرناطہ سے امداد بھیج کر جیّان کو بچانے کی پوری کوشش کی مگر محاصرے کی طوالت نے اہل شہر کو جاں بلب کر دیا۔ جیّان کے بعد یقیناً اشبیلیہ اور پھر غرناطہ کی باری آنے کو تھی۔ ابن الاحمر نے ایسے میں قسطالیہ سے مذاکرات کر کے اس کی بالادستی قبول کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ پایا۔

اس نے فرڈی ننڈ سوئم سے ملاقات کی جس میں طے پایا کہ فریقین میں بیس ماہ کے لیے جنگ بندی ہوگی، ابن الاحمر قسطالیہ کو اس مدت میں ڈیڑھ لاکھ دینار ادا کرے گا، جیّان قسطالیہ کے حوالے کر دیا جائے گا، ابن الاحمر غرناطہ اور اس کے باقی نواحی قلعوں اور شہروں کا حکمران رہے گا۔

۶۴۳ھ کے اواخر میں ہونے والے اس معاہدے کے بعد جیّان قسطالیہ کا حصہ بن گیا اور وہاں کے مسلمان بھی جنوبی شہروں کی طرف نقل مکانی کر گئے۔[1]

سقوطِ اشبیلیہ

فرڈی ننڈ کی نگاہیں اب اشبیلیہ پر جم گئیں جو قرطبہ اور طلیطلہ کے بعد اندلس کا تیسرا سب سے بڑا شہر تھا۔ موحدین کے بعد یہ شہر سخت سیاسی بحران میں مبتلا تھا۔ کبھی اس پر بنو ہود قابض ہوتے، کبھی ابن الاحمر۔ اشبیلیہ کے عمائد نے اس کش مکش سے تنگ آکر ۶۳۵ھ میں مراکش کے موحدین کی اطاعت قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ مگر اس کی حیثیت محض رسمی رہی کیوں کہ موحدین کے پاس اندلس کے شہروں کو سنبھالنے کی طاقت نہیں تھی۔

۶۴۳ھ میں اشبیلیہ کے نامور رئیس ابن الجد نے مراکش سے مایوس ہو کر تیونس کی دولتِ بنو حفص کے سائے میں آنے کا فیصلہ کیا مگر بنو حفص کے افریقی افسران نے اشبیلیہ میں آکر ایسا فساد مچایا کہ شہری مشتعل ہوگئے اور انہوں نے نہ صرف ان افسران کو شہر سے نکال دیا بلکہ انہیں بلانے کی پاداش میں ابن الجد کو بھی قتل کر دیا۔

ابن الجد نے فرڈی ننڈ سوئم سے دوستانہ تعلقات قائم کر کے اپنی سیادت قائم رکھی ہوئی تھی مگر جب اہل اشبیلیہ نے فرڈی ننڈ کی مکروہ سیاست کا حصہ بننے سے انکار کیا تو فرڈی ننڈ نے اشبیلیہ کو فتح کرنا ضروری سمجھا اور ۶۴۴ھ میں اشبیلیہ کے گرد ونواح کی چوکیوں اور قلعوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کی افواج کئی سمتوں میں پھیل کر یلغار کرتی رہیں۔ اشبیلیہ کے شمالی محافظ شہر قرمونہ کو چھ ماہ کے محاصرے کے بعد فتح کر لیا گیا۔ اسی طرح لورہ، قطلانہ، غلیانہ، جریرہ اور وادی الکبیر کا قلعہ حصینہ بھی نصرانیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ یوں اشبیلیہ کے حفاظتی بازو کاٹ دیے گئے۔

اس کے بعد جمادی الاولیٰ ۶۴۵ھ میں نصرانیوں نے پوری طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے اس فقید المثال علمی و

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۴/ ۴۷۰

ثقافتی مرکز کا محاصرہ کرلیا جو پندرہ ماہ تک جاری رہا۔ اشبیلیہ کے مسلمانوں نے جرأت اور دلیری کی ایک تاریخ رقم کردی اور پیٹ پر پتھر باندھ کر حریف سے نبرد آزما رہے۔ ان کے قائدین میں ابوالحسن الشکاف اور ابن شعیب کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں۔ انہوں نے حریف کو سخت جانی ومالی نقصانات پہنچائے اور کئی بار اسے شہر کی فصیلوں سے پیچھے دھکیلا۔ انہوں نے مراکش اور دوسری اسلامی ریاستوں کو بار بار پیغامات بھیجے۔ وہ انہیں اپنی حالت زار سناتے اور کمک بھیجنے کی درخواست کرتے رہے۔

اے چمن والو! متاعِ رنگ و بو جلنے لگی
ہر روش پر نکہتوں کی آبرو جلنے لگی
پھر لغاتِ زندگی کو دو کوئی حرفِ جنوں
اے خرد مندو! ادائے گفتگو جلنے لگی [1]

مگر بے حسی کا یہ عالم تھا کہ کہیں سے کوئی بھی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ سب سے زیادہ قابلِ افسوس بات یہ تھی کہ غرناطہ کے حاکم ابن الاحمر کی فوج بھی قسطالیہ کی صفوں میں شامل تھی۔ آخر میں قسطالیہ کو پرتگال اور دوسری نصرانی ریاستوں اور صلیبی تنظیموں کی کمک بھی پہنچ گئی۔ یوں محاصرہ اتنا سخت ہوا کہ ہر طرف سے یہ شہر دنیا سے کٹ گیا۔ [2]

اہلِ اِشْبِیلیہ کی حالت ایک مؤرخ کے الفاظ میں:

اہلِ اشبیلیہ لڑتے لڑتے زخمی اور نڈھال ہو چکے تھے۔ محاصرے کی سختی نے آخر میں شہر کو اناج سے محروم کردیا تھا۔ لوگوں کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخ ابن عذاری کا بیان ہے:

''اہلِ اشبیلیہ ہر قسم کی مدد سے محروم ہو چکے تھے، چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ ہاں بعض رئیسوں کے گھروں میں جو کچھ تھا وہ کام آرہا تھا جیسا کہ قاضی ابن منظور، جو کہ اس وقت بھی نصرانیوں کو شکست دینے کے بارے میں پُر امید تھے اور لوگوں کو لڑائی اور تیر اندازی کی ہمت دلا رہے تھے۔ مگر لوگ حیران و پریشان تھے۔ وہ یوں لڑکھڑاتے پھرتے تھے جیسے نشے میں ہوں، حالانکہ وہ نشے میں نہیں تھے۔

بھوک سے لوگوں کی بڑی تعداد جاں بحق ہوگئی۔ گندم اور جو نایاب ہوگئے۔ لوگ کھالیں کھانے پر مجبور ہوئے۔ لڑنے والے اور سپاہی ختم ہوگئے۔'' [3]

اشبیلیہ کا نوحہ:

آخر اہلِ شہر نے شعبان ۶۴۶ھ میں نہایت مجبور ہو کر جاں بخشی اور پُرامن انخلاء کی ضمانت پر شہر نصرانیوں کے

---

① ساغر صدیقی
② دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۳/ ۴۷۵ تا ۴۸۲
③ البیان المغرب فی اخبار الاندلس و المغرب لابن العذاری المراکشی: ۳/ ۳۸۱

حوالے کر دیا۔ یہاں آبادی اتنی زیادہ تھی کہ انخلاء کے عمل میں تقریباً ایک مہینہ لگ گیا۔ ان میں سے ایک لاکھ افراد سمندری راستے سے مراکش چلے گئے جبکہ تین لاکھ کو ابن الاحمر نے غرناطہ میں جگہ دے دی۔

مسلمانوں کے مکمل انخلاء کے بعد ماہِ رمضان میں فرڈی نینڈ کا جلوس اشبیلیہ میں داخل ہوا۔ دیگر شہروں کی طرح یہاں بھی جامع مسجد سمیت تمام مساجد کو چرچ بنا دیا گیا اور تمام مکانات نصرانیوں میں بانٹ دیے گئے۔ اس کے بعد طلیطلہ کی جگہ اشبیلیہ کو ہی قسطالیہ کا پایۂ تخت بنالیا گیا تاکہ جنوبی اسلامی شہروں پر فوج کشی آسان رہے۔[1]

اشبیلیہ کے سقوط کے ساتھ ہی اُس اندلس کبریٰ کی تاریخ بھی ختم ہوگئی جسے طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر نے فتح کیا تھا۔ اندلس کبریٰ جو اس جزیرہ نما کے دو تہائی جغرافیائی رقبے کو گھیرے ہوئے تھا، سوا پانچ صدیوں تک اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہنے کے بعد آخر ساتویں صدی ہجری کے وسط میں صلیب پرستوں کا مسکن بن گیا۔

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح!
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یہاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز[2]

✦✦✦

---

(1) دولة الإسلام في الأندلس لعبد الله عنان المصري: ۳/۳۸۵ تا ۳۸۹
(2) الطاف حسین حالی

دولتِ بنو نصر

① محمد ابن الاحمر، محمد اوّل، الغالب باللہ

۶۳۵ھ تا ۶۷۱ھ (۱۲۳۸ء تا ۱۲۷۳ء)

تاریخ کے اگلے مرحلے میں اندلس کے صرف ایک مسلمان حکمران محمد بن الاحمر (محمد بن یوسف بن نصر) کی حکومت باقی رہ گئی۔ وہ ۵۹۱ھ میں قرطبہ کے نواحی قصبے "ارجونہ" میں پیدا ہوا تھا۔ موحدین کے دورِ زوال میں اس نے جیان میں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی اور سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں شریک ہو کر بنو مردنیش اور بنو ہود کا حریف بن گیا۔ ۲۵ رمضان ۶۳۵ھ (۲۳ مئی ۱۲۳۸ء) کو اس نے اہلِ غرناطہ کی دعوت پر وہاں بھی اپنی بیعت لے لی اور ایک سال کے اندر اندر مالقہ اور المریہ کو بھی اپنی قلمرو کا حصہ بنالیا۔ یہ باتیں تفصیل سے گزشتہ اوراق میں آچکی ہیں۔ وہ نسلاً مدینہ منورہ کے انصاری قبیلے بنو خزرج سے تعلق رکھتا تھا اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھا۔[1] اس کے بعد اس کے کئی جانشینوں کا نام "محمد" ہوا، لہٰذا ابن الاحمر کو محمد اوّل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا خانوادہ بنو نصر کہلایا جس نے ساتویں صدی ہجری کے وسط سے نویں صدی ہجری کے اواخر تک اس خطے میں مسلمانوں کو ایک محفوظ پناہ گاہ مہیا کی۔

محمد ابن الاحمر کا بعض اسلامی شہروں پر چڑھائی میں نصرانیوں کی مدد کرنا یقیناً ایک المیہ تھا مگر دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے غرناطہ کو اندلس کے تمام مسلمانوں کے لیے ایک حصار بنا دیا تھا جہاں ٹھہر کر وہ مناسب وقت کا انتظار کر سکتے تھے اور موقع ملنے پر اپنے علاقے دوبارہ حاصل کر سکتے تھے۔ محمد ابن الاحمر کے نزدیک ایسا وقت آنے تک نصرانیوں کو دوستی کا جھانسہ دینا ہی مناسب حکمتِ عملی تھی، اسی لیے اس نے وقت پڑنے پر نصرانیوں کی مدد بھی کی اور ضرورت کے موقع پر ان سے فائدہ بھی اٹھایا۔ اسے جن شدید اور نازک حالات سے سابقہ پڑا تھا، ان میں مسلمانانِ اندلس کا وجود باقی رکھنا بھی بہت بڑی خدمت تھی جس میں وہ کامیاب رہا۔ وہ عمر بھر غرناطہ کو ایک مضبوط اور خوشحال مملکت بنانے میں جتا رہا جہاں اندلس کے طول و عرض میں دربدر بھٹکتے ہوئے مسلمانوں کو بسایا جا سکے۔

اس نے بیرونی خطرات دور کرنے کے ساتھ اندرونی طور پر بھی حیرت انگیز کارنامے انجام دیے۔ صنعت و تجارت

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب للمقری التلمسانی: ۱/۴۴۷؛ تاریخ ابن خلدون: ۴/۲۱۸

پر خاص توجہ دی۔ ریشم کی صنعت کو اتنی ترقی دی کہ ساری دنیا میں یہاں کا ریشم مشہور ہو گیا۔ چپے چپے کو زراعت کے لیے اس طرح استعمال کیا گیا کہ زائد پیداوار برآمد کی جانے لگی۔ بندرگاہوں کو اتنا وسیع اور فعال بنایا گیا کہ یورپ تک سے جہاز راں یہاں مال اتارنے لگے۔ ریاست غرناطہ کی منڈیاں مال سے بھر گئیں اور ہر طرف تجارت چمک اٹھی۔ خواص ہی نہیں عوام بھی مالا مال اور خوشحال ہو گئے۔

اس قدر آمدن اور ترقی کے باوجود محمد ابن الاحمر کی ذاتی زندگی ویسی ہی سادہ اور فقیرانہ تھی جیسی ابتداء میں تھی۔ وہ ہر وقت امور سلطنت میں مصروف رہتا تھا۔ کبھی عیش و آرام کے قریب نہ پھٹکا۔ سرکاری آمد و خرچ کے حسابات کی جانچ پڑتال خود کرتا تھا۔ اس کی تدبیر اور انتظام کے سبب غرناطہ اندلس کی خوشحال ترین ریاست بن گیا۔ وہ کثرت سے صدقہ و خیرات کا عادی تھا۔ اس کی درباری مصروفیات بڑی دلچسپ اور منظم تھیں جن میں کئی الگ الگ مجالس ہوتیں۔ ایک نشست صرف فریادیوں کے لیے ہوتی جنہیں بلا دریغ انصاف مہیا کیا جاتا۔ ایک مجلس میں صرف علماء و فقہاء اور عمائدِ شہر شریک ہوتے۔ اس میں تفسیر و حدیث کا درس بھی ہوتا اور دس حصوں میں قرآن مجید کا ختم کیا جاتا۔ ایک مجلس شعراء و ادباء کا کلام سننے اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے مخصوص تھی۔ ایک نشست خاص ہوتی جس میں امور سلطنت پر خواص سے مشاورت ہوتی۔

وہ تعمیرات کا بھی شائق اور ماہر تھا۔ اس نے غرناطہ میں قصر الحمراء جیسی بے مثال عمارت تعمیر کرائی جو آج بھی سیاحوں سے خراج تحسین وصول کر رہی ہے۔ اس نے بکثرت مدارس کھولے اور اہل علم کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ اس نے ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا اور قرطبہ سمیت ہر شہر سے کتابیں منگوا کر وہاں جمع کیں۔ الحکم اموی کے مشہور کتب خانے کا بہت بڑا ذخیرہ غرناطہ کے اس نئے کتب خانے میں محفوظ ہو گیا۔

محمد ابن الاحمر نصرانیوں سے لڑنا نہیں چاہتا تھا، وہ ان سے دوستانہ معاہدوں کو ہمیشہ جنگ پر ترجیح دیتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ کبھی قابلِ اعتراض حد تک بھی پہنچ جاتا تھا۔ تاہم اس تدبیر کے نتیجے میں اس کا دور عمومی طور پر امن و امان کا تھا۔ چونکہ تمام معاہدوں کے پیچھے فریقین کے مفادات یا مجبوریاں کارفرما ہوتی ہیں، اس لیے حالات بدلتے ہی اہداف بھی بدل جاتے ہیں اور امن معاہدوں کے نقیب پھر ہتھیار اٹھا لیتے ہیں۔ اس لیے ابن الاحمر نے نصرانیوں سے ظاہری دوستی ضرور رکھی مگر کبھی انہیں قابل بھروسہ سمجھنے کی غلطی نہیں کی۔ اس نے غرناطہ پر نصرانیوں کے قبضے کے ارادے کو خاک میں ملا دیا۔ وہ خفیہ طور پر شذونہ، مُرسیہ اور دیگر علاقوں میں نصرانیوں سے برسرِ پیکار مسلمانوں کو مدد بھی فراہم کرتا رہا۔ وہ موقعے کا منتظر رہا کہ کب نصرانی کمزور ہوں اور وہ ان کی بالادستی سے آزاد ہو سکے۔

۶۵۰ھ میں فرڈیننڈ سوئم مر گیا۔ کچھ عرصے تک امن و امان اسی طرح برقرار رہا مگر ۶۶۰ھ میں قسطلیہ کے نئے حکمران الفانسو دہم نے اعلان جنگ کر دیا اور حملہ کر کے غرناطہ کے بعض قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ جنگ کا ماحول کئی سالوں تک چھایا رہا۔ ابن الاحمر نے ۶۶۱ھ میں مالقہ اور وادی آش پر نصرانیوں کے حملے کو ناکام بنا دیا اور قلعہ لاریال کے

قریب انہیں شکست دے کر بھگا دیا۔ تاہم ۶۶۵ھ میں اسے چند قلعے دے کر الفانسو دہم سے صلح کرنا پڑی۔

اس دوران اس نے اپنی باج گزار ریاست کو بڑی تیزی سے مضبوط کر کے ایک آزاد و خود مختار مملکت بنا دیا جس کی افواج اپنی سرحدوں کی حفاظت کر سکتی تھیں۔ الفانسو دہم یہ برداشت نہ کر سکا اور ایک بار پھر اس نے غرناطہ پر جنگ مسلط کرنا چاہی۔ اس زمانے میں مراکش میں موحدین کی جگہ بنو مرین نے ایک نئی حکومت قائم کر لی تھی۔ ابن الاحمر نے سیاسی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے بنو مرین کے سلطان یعقوب بن عبد الحق سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے اور نصرانیوں سے حفاظت کے لیے اس سے مدد طلب کی۔

تاہم بنو مرین کی افواج پہنچنے سے قبل محمد ابن الاحمر گھوڑے سے گر کر زخمی ہو چکا تھا۔ اسی زخم کے سبب ۲۹ جمادی الاخریٰ ۶۷۱ھ (یکم فروری ۱۲۷۳ء) کو ابن الاحمر کی وفات ہو گئی۔ اس نے لگ بھگ نصف صدی حکومت کی۔ وہ اپنے دور کا اقبال مند سیاست دان تھا جو اسلامیان اندلس کے ختم ہوتے وجود کو قوی سہارا دے گیا اور اندلس کبریٰ کی جگہ اندلس صغریٰ کا حصار قائم کر گیا۔[1]

محمد ابن الاحمر کے جانشینوں کی حکومت:

محمد ابن الاحمر کے بعد اس کی اولاد میں سوا دو سو سال حکومت باقی رہی۔ اس کی ریاست کو مؤرخین "اندلس صغریٰ" کہتے ہیں جس میں غرناطہ کے علاوہ مالقہ اور المریہ بھی دو بڑے شہر تھے۔ جبکہ جزیرۃ الخضراء، لوشہ، اور وادی آش چھوٹے شہر یا قلعے تھے۔ یہ ریاست اندلس کے لگ بھگ چوتھائی رقبے پر مشتمل تھی۔ ابن الاحمر کے اکثر جانشین حکومت و سیاست میں اسی کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ ابن الاحمر کو پہلا حکمران شمار کرتے ہوئے اب اس کے جانشینوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

◆◆◆

---

① الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۲/ ۵۱ تا ۵۶، ط دار الکتب العلمیة؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۲۱۸ تا ۲۲۰؛ الاعلام زرکلی: ۷/ ۵۰، ۵۱؛ التاریخ الأندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطة، لعبد الرحمن علی: ص ۵۳۲ تا ۵۳۶؛

② اَلْفَقِیہ، محمد بن محمد، محمد دومؒ

رجب ۶۷۱ھ تا شعبان ۷۰۱ھ (جولائی ۱۲۷۳ء تا اپریل ۱۳۰۲ء)

محمد ابن الاحمر کا جانشین، محمد دومؒ ۶۳۳ھ میں پیدا ہوا تھا اور ۳۸ برس کی عمر میں یکم رجب ۶۷۱ھ (۱۱ جولائی ۱۲۷۳ء) کو تخت نشین ہوا۔ یہ بڑا عالم فاضل حکمران تھا اور اپنے علم اور مطالعے کی وجہ سے محمد اَلْفَقِیہ کہلاتا تھا۔ شعر و ادب میں ید طولیٰ رکھتا تھا، کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ سخاوت و شجاعت اور سیاست و تدبر میں اپنے باپ کی مثل تھا۔ اس نے ریاستِ غرناطہ کو مزید ترقی دے کر دولت و ثروت میں قابلِ رشک اور حرب و ضرب میں قسطالیہ کے مدمقابل بنا دیا۔

اس کی سیاست بھی بڑی عجیب تھی۔ بعض اوقات وہ دو نصرانی حکمرانوں میں سے کسی ایک سے اتحاد کر کے دوسرے کے خلاف جنگ آزمائی کرتا۔ اس نے اپنے باپ کی طرح مراکش کے بنو مرین سے دوستانہ تعلقات رکھے مگر کبھی وہ ان کے خلاف بھی نصرانیوں سے اتحاد کر لیتا۔ اس کی سیاست سب کی سمجھ سے باہر تھی، تاہم نتائج کے لحاظ سے اس نے ہمیشہ نصرانیوں کو نیچا دکھایا اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت میں پوری طرح کامیاب رہا۔

اس کی تخت نشینی کے وقت غرناطہ اور قسطالیہ کی کشیدگی برقرار تھی اور اسی خطرے کے پیش نظر اس کا باپ بنو مرین سے فوجی تعاون کا معاہدہ کر چکا تھا۔ جب ۶۷۲ھ میں قسطالیہ نے غرناطہ پر بڑا حملہ کیا تو اَلْفَقِیہ نے بنو مرین کے حکمران ابو یوسف یعقوب المنصور سے مدد مانگی۔ وہ بلا دریغ پانچ ہزار سپاہی لے کر اہل غرناطہ کی مدد کو پہنچ گیا۔ اُدھر نصرانی ۹۰ ہزار سپاہی میدان میں لے آئے تھے۔

۱۵ ربیع الاول ۶۷۲ھ کو قُرطبہ کے جنوب مغرب میں استجہ شہر کے باہر فریقین کا آمنا سامنا ہوا۔ ابو یوسف یعقوب خود میدان میں موجود تھا اور اپنے لڑکے یوسف کو پہلی صف میں تعینات کیا تھا۔ جنگ کے آغاز سے قبل ابو یوسف گھوڑے سے اترا، وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کی، پھر ہاتھ بلند کر کے باآواز بلند دعا کی:

''یا اللہ! اس جماعت کی نصرت فرما! اپنے دشمنوں کے خلاف جہاد میں اس کی اعانت کر۔''

پورے لشکر نے آمین کہی۔ ابو یوسف نے دعا مکمل کر کے گھوڑے پر سوار ہو کر مجاہدین کو پکارا:

''مسلمانو! اے مجاہدو! تمہی دین کے مددگار ہو۔ تمہی اس کی سرحد کے محافظ اور اس کے دشمنوں کے مقابل ہو۔ آج ایک تاریخی دن اور یادگار معرکہ ہے۔ کل جو ہوگا وہ اسی پر منحصر ہے۔ سنو! جنت کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔ حوریں سج چکی ہیں۔ ان کی طرف لپکو۔ ان کی طلب میں انتہا کر دکھاؤ۔ اپنی جانوں کو ان کی قیمت بنا دو۔ سنو! جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

''بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جنت تیار کر رکھی ہے۔''[1]

اس نفع بخش تجارت کو غنیمت سمجھو۔ اعمال صالحہ کر کے جنت کی طرف بڑھو۔ اللہ کے منکر دشمنوں اور بدکار مشرکوں سے جہاد کے لیے آستینیں چڑھا لو۔ جو مرے گا، شہید ہوگا، جو زندہ سلامت گھر لوٹے گا، وہ ثواب بھی پائے گا اور نیک نامی بھی۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

''ایمان والو! صبر کرو۔ مقابلہ میں ثابت قدم رہو۔ آپس میں مربوط رہو...... اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچتے رہو...... تاکہ تم فلاح پاؤ۔''[2]

اس تقریر نے مسلمانوں کے دلوں کو ایسا جھنجوڑا کہ آنسو بہہ پڑے اور لہو گرم ہو گیا۔ اس کے بعد گھمسان کی جنگ شروع ہوئی۔ آخر نصرانی آٹھ ہزار لاشیں چھوڑ کر فرار ہوئے۔ مسلمانوں نے آگے بڑھ کر قسطالیہ کے نئے پایہ تخت اشبیلیہ کا محاصرہ کر لیا اور آخر میں غرناطہ کی آزادی و استقلال کی شرط پر صلح قبول کی۔ ابو یوسف یعقوب مرینی رجب ۶۷۴ھ میں مراکش واپس گیا اور پیچھے تین ہزار سپاہی غرناطہ کی تقویت کے لیے چھوڑ گیا۔[3]

الفقیہ کو اس دوران یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں بنو مرین، مرابطین اور موحدین کی طرح اندلس پر قابض نہ ہو جائیں لہٰذا اس نے اندلس میں بنو مرین کی بندرگاہ جزیرۃ الخضراء کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے قسطالیہ سے صلح کا معاہدہ کر لیا اور دونوں کی مشترک افواج وہاں تعینات ہو گئیں۔

یہ الفقیہ کی بڑی سخت غلطی تھی مگر شاہِ مراکش ابو یوسف مرینی نے اس صورتحال کو بڑی دانائی سے سنبھالا۔ اس نے ۶۷۸ھ میں اپنے بیٹے کی قیادت میں ایک مضبوط بحری بیڑا بھیج کر قسطالیہ کی بحریہ کو مار بھگایا اور جزیرۃ الخضراء پر اپنی فوج مقرر کر دی۔ اس کے بعد اس نے سفیر بھیج کر الفقیہ کی غلط فہمیاں دور کیں اور دونوں اسلامی ملکوں میں پھر سے اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔

کچھ عرصے بعد دونوں حکومتوں میں طے پایا کہ اندلس میں بنو مرین کے کسی کہنہ مشق قائد کا مستقل تقرر ہو جو جہاد کی قیادت کیا کرے۔ اس منصب کو ''مَشِيْخَةُ الْغُزَاة'' اور منصب دار کو ''شَيْخُ الْغُزَاة'' کا نام دیا گیا۔ پہلا شیخ الغزاۃ عبداللہ بن ابی العلاء تھا جو ۶۹۳ھ کی ایک جنگ میں شہید ہوا۔ اس کے بعد اس کے بھائی ابو سعید عثمان بن ابی العلاء کو یہ منصب ملا۔

---

[1] سورۃ التوبۃ، آیت: ۱۱۱ [2] سورۃ آل عمران، آیت: ۲۰۰

[3] التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الیٰ سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۵۳۶ تا ۵۳۸

مراکش کا مجاہد حکمران ابو یوسف یعقوب، برابر اندلس پر توجہ دیتا رہا اور ایک مہم کے دوران ۶۸۵ھ میں یہیں وفات پائی۔ نصرانی جزیرۃ الخضراء میں بنو مرین کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک غرناطہ کی افریقہ سے کمک کا راستہ مسدود نہیں کیا جاتا، اندلس سے مسلمانوں کا خاتمہ ممکن نہیں، لہٰذا انہوں نے جزیرۃ الخضراء پر دوبارہ چڑھائی کی مگر مراکش اور غرناطہ کی مشترکہ فوج نے انہیں مار بھگایا۔

محرم ۶۹۵ھ میں ارغون کے حکمران شاہ جیمز اوّل نے غرناطہ کی طرف فوج کشی کی مگر اَلْفَقِیْہ نے جیّان کے مقام پر اس فوج کو بھی عبرت ناک شکست دی جس میں شاہ جیمز کا بیٹا شانجہ بھی مارا گیا۔ نصرانیوں کو پسپا کر کے اَلْفَقِیْہ نے ان کے شہر ''قیجاطہ'' (Quesada) پر قبضہ کرلیا۔ ۶۹۹ھ میں اس نے قُرْطُبہ کے نواحی شہر قبذاق کو بھی فتح کر لیا۔

غرض اس کے دَور میں نہ صرف غرناطہ کی سرحدوں کا کامیابی سے دفاع کیا گیا بلکہ ریاستی رقبے میں توسیع بھی ہوئی۔ تیس سالہ قابلِ تعریف حکمرانی کے بعد ۸ شعبان ۷۰۱ھ (۱۹ اپریل ۱۳۰۲ء) کو محمد دوم نے ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔ ①

◆◆◆

① تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۲۲۰ تا ۲۲۱؛ الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۱/ ۳۲۶ تا ۳۳۳، ط العلمية؛ الدرر الكامنة فی اعيان مائة الثامنة: ۵/ ۵۱۵؛ الاعلام للزرکلی: ۷/ ۳۲؛ التاريخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطة: ص ۵۲۹ تا ۵۳۱؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۹۳ تا ۱۱۲

دولتِ مرینیہ پر ایک نگاہ:

یہ حکومت ساتویں صدی ہجری کے وسط میں قائم ہوئی اور دو سو سال سے زائد مدت تک باقی رہی۔ اس کے بانی عبدالحق بن محیو کا تعلق بربر قبیلے زناتہ سے تھا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اصلاً عرب تھے مگر بربروں میں خلط ملط ہو گئے تھے۔ جب جنگ عقاب (۶۰۹ھ) میں موحدین نصرانیوں سے شکست کھا کر کمزور ہو گئے اور اندلس کے علاوہ مراکش میں بھی سیاسی بحران بڑھنے لگا تو عبدالحق نے مراکش کے کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ موحدین اور بنو مرین کی یہ کشمکش عبدالحق کے قتل پر منتج ہوئی جس کے بعد مخاصمت مزید بڑھ گئی۔ پھر عبدالحق کے بیٹوں: عثمان ابو سعید (۶۱۳ تا ۶۳۸ھ) اور محمد (۶۳۸ تا ۶۴۲ھ) نے بنو مرین کی قیادت کی۔ تیسرے بیٹے ابوبکر یحییٰ نے ۶۴۳ھ میں مکناس سمیت کئی اضلاع فتح کر لیے۔ ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں ابوبکر کی وفات کے بعد عبدالحق کے چوتھے بیٹے یعقوب نے حکومت سنبھالی اور آخر کار ۶۶۷ھ (۱۲۶۹ء) میں دولتِ موحدین کا خاتمہ کر دیا۔ دولتِ بنو مرین نے شمالی افریقہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت کو عروج پر پہنچا دیا اور شاندار تعمیراتی کام کرائے۔ مراکش کا شہر فاس اس کا دارالحکومت تھا۔ اپنے دورِ عروج میں یہ اندلس کے بعض ساحلی علاقوں کے علاوہ موجودہ الجزائر اور تیونس تک پھیل گئی تھی۔ اس کے چند اہم حکمران یہ تھے:

❶ یعقوب بن عبدالحق: ۶۵۶ تا ۶۸۵ھ
❷ یوسف بن یعقوب الناصر: ۶۸۵ تا ۷۰۶ھ
❸ ابو الربیع سلیمان: ۷۰۸ تا ۷۱۰ھ
❹ ابو سعید عثمان بن یعقوب: ۷۱۰ تا ۷۳۲ھ
❺ ابو الحسن علی بن عثمان: ۷۳۲ تا ۷۴۹ھ

❻ ابو عنان فارس بن علی: ۷۴۹ تا ۷۵۹ھ
اس کے بعد سیاسی بحران پیدا ہو گیا۔
چند سالوں میں چھ کمزور حکمران گزر گئے۔
❼ ابو فارس عبدالعزیز: ۷۶۸ تا ۷۷۴ھ
اس کے بعد دوبارہ کمزور حکمرانوں کا دور آ گیا۔

۷۷۴ھ سے ۸۰۱ھ تک ۲۷ سالوں میں نو حکمران گزرے، یعنی سیاسی انتشار انتہا پر تھا۔
❽ ابو سعید عثمان ثانی: (۸۰۱ تا ۸۲۳ھ)
اس کے بعد آخری حکمران عبدالحق ثانی نے ۸۶۹ھ (۱۴۶۵ء) تک حکومت کی۔

دولتِ مرینیہ اپنے دورِ عروج میں نہ صرف شمالی افریقہ کی سب سے بڑی سلطنت تھی بلکہ ۶۰۰ بحری جہازوں کے ساتھ وہ بحیرۂ روم میں بھی یورپی طاقتوں کو للکارتی رہی۔ بنو مرین نے اسلامی اندلس کو بچانے کے لیے بڑی ذمہ داری کا مظاہرہ کیا اور بار بار یہاں کے مسلمانوں کی مدد کے لیے لشکر بھیجے۔

③ محمد سوم، اَلْمَخْلُوع، ابوعبداللہ

شعبان ۷۰۱ھ تا شوال ۷۰۸ھ (۱۳۰۲ء تا ۱۳۰۹ء)

محمد بن محمد، ابوعبداللہ اَلْـمَـخْـلُـوع ۶۵۵ھ میں پیدا ہوا تھا اور ۴۶ برس کی عمر میں ۹ شعبان ۷۰۱ھ (۱۰ اپریل ۱۳۰۲ء) کو حکمران بنا۔ اس کے باپ اور دادا کا نام بھی محمد تھا، فرق کے لیے اسے محمد سوم کہا جاتا تھا۔ وہ وجیہ و شکیل، عالی ہمت، ذہین اور دور اندیش آدمی تھا۔ اپنے والد کے دور میں سیاسی اُمور کا خاصا تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ حکمران بن کر وہ اُمور سلطنت کو بذاتِ خود دیکھتا بھالتا تھا اور دوسروں پر تکیہ نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنے چند سالہ دورِ حکومت میں کئی اچھے کام کرائے۔ قصر الحمراء کے قریب اس نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی جس میں چاندی کی ملمع کاری کی گئی۔

وہ سخت گیر طبیعت کا تھا۔ ایک بار کچھ اُمراء سے ناراض ہوا تو انہیں ایک خانے میں بند کر کے دروازے پر تالا لگوا دیا اور چابی اپنے پاس رکھ لی۔ وہ سب کچھ دنوں بعد بھوک اور پیاس سے مر گئے۔ اس دوران ایک دربان نے روشندان سے انہیں کچھ خوراک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ اَلْمَخْلُوع کو علم ہوا تو اس دربان کو ذبح کرا دیا۔

اَلْمَخْلُوع کے دور میں مراکش کے بنو مرین سے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور مملکتِ غرناطہ میں داخلی انتشار بھی پھیلا، اَلْمَرِیَّہ اور وادی آش کے اُمراء نے یکے بعد دیگرے بغاوتیں کیں مگر اَلْمَخْلُوع نے سب پر قابو پا لیا۔

اس صورتحال سے نصرانیوں نے فائدہ اٹھایا۔ شاہِ قسطالیہ فرڈی ننڈ چہارم اور شاہِ ارغون جیمز دوم (خائمی) نے غرناطہ سے امن معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جبل الطارق اور اَلْمَرِیَّہ پر حملہ کر دیا۔ شیخ الغزاۃ عثمان بن ابی العلاء نے اَلْـمَـرِیَّـہ کے قریب ارغونی افواج کا سامنا کر کے انہیں شہر کا محاصرہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ تاہم دوسرے محاذ پر قسطالیہ کی افواج جبل الطارق اور جزیرۃ الخضراء پر حملہ آور رہیں۔ اَلْمَخْلُوع نے جواب میں نصرانی علاقوں میں اپنی فوج داخل کر دی جس سے نصرانی گھبرا گئے اور الخضراء کا محاصرہ چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

اَلْـمَـخْـلُـوع راتوں کو بڑی بڑی شمعوں کی تیز روشنی میں جاگتا رہتا تھا، چنانچہ اس کی آنکھیں متاثر ہو گئیں اور آخر کار نابینا ہو گیا جس کے بعد امورِ سلطنت پر اس کا وزیر محمد بن حکیم لخمی حاوی رہا۔ اس نے اَلْمَخْلُوع کے اختیارات محدود کر دیے اس بناء پر دونوں میں کشیدگی ہو گئی۔ یکم شوال ۷۰۸ھ (۱۴ مارچ ۱۳۰۹ء) کو اَلْـمَـخْلُوع کے خلاف اس کے بھائی نصر بن محمد نے بغاوت کر دی۔ قصر الحمراء میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ باغی سپاہیوں کے ساتھ عوام اور اوباش بھی محل میں گھس گئے اور جی بھر کے لوٹ مار کی۔ بہرکیف محمد سوم کو جبراً معزول کر دیا گیا۔[1] وہ بنو نصر کا پہلا حکمران تھا جسے معزول کیا گیا، اسی معزولی کے باعث اسے ''مخلوع'' کہا جاتا ہے۔

① الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۱/ ۳۶۹ تا ۳۲۳، ط العلمیة، الاعلام للزرکلی: ۷/ ۳۳؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۱۱۲ تا ۱۱۴۔ معزولی کے تین سال بعد ۳ شوال ۷۱۳ھ (۲۳ فروری ۱۳۱۴ء) کو وہ جیل میں قتل کر دیا گیا۔ (الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۱/ ۳۱، ط العلمیة)

④ اَبُو الْجُیُوْش، نصر بن محمد

۷۰۸ھ تا ۷۱۳ھ (۱۳۰۹ء تا ۱۳۱۴ء)

اَبُو الْجُیُوْش نصر بن محمد ماہ رمضان ۶۸۶ھ میں پیدا ہوا تھا۔ ۲۳ سال کی عمر میں جمعہ یکم شوال ۷۰۸ھ (۲۶ مارچ ۱۳۰۹ء) کو تخت نشین ہوا۔ وہ خوبصورت، نرم مزاج، پاکباز اور صلح پسند نوجوان تھا۔ خونریزی کو ناپسند کرتا تھا۔ اس میں سیاسی پختگی بالکل نہ تھی۔ اپنے بھائی سے حکومت چھین کر خود کوئی قابلِ تحسین دور نہ گزار سکا۔ اس کی حکومت پانچ سال ایک ماہ تک رہی۔ یہ ایام مسلسل شورشوں اور بدامنی کا مرقع تھے۔

۷۰۹ھ میں قسطالیہ کے حکمران فرڈی ننڈ چہارم نے طویل محاصرے کے بعد جبل الطارق پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد غرناطہ کی شہ رگ جزیرۃ الخضراء کو ایک بار پھر گھیرنے کی کوشش کی۔ اُدھر برشلونہ کے نصرانیوں نے دوبارہ المریہ پر حملہ کر دیا۔ ابو الجیوش نے مرعوب ہو کر قسطالیہ کی باج گزاری قبول کر لی۔

کچھ عرصے بعد فرڈی ننڈ چہارم مر گیا اور اس کا کم سن لڑکا تخت پر بیٹھا جس کی وجہ سے قسطالیہ میں زبردست سیاسی بحران پیدا ہو گیا اور نصرانی شہزادے باہم لڑ پڑے۔ اس وقت اگر غرناطہ کے اربابِ اقتدار متحد و متفق رہتے تو نصرانیوں پر ضربِ کاری لگا سکتے تھے مگر غرناطہ میں خود اقتدار کی کشمکش جاری تھی۔

جمادی الاخریٰ ۷۱۰ھ میں اَبُو الْجُیُوْش اتنا بیمار ہوا کہ زندگی کی امید باقی نہ رہی۔ امراء نے ان حالات میں سابق حکمران اَلْمَخْلُوع محمد سوم کو جیل سے نکال کر تخت پر بٹھانے کی کوشش کی مگر ابو الجیوش یکا یک صحت یاب ہو گیا اور اس نے بغاوت سے بچنے کے لیے اَلْمَخْلُوع کو جیل ہی میں قتل کرا دیا۔ اس کے بعد بھی غرناطہ میں اقتدار کی کھینچا تانی جاری رہی جس کا نتیجہ آخر یہ نکلا کہ مالقہ میں اَبُو الْجُیُوْش کے خلاف بغاوت ہوئی اور باغی افواج گرد و نواح کے کئی قلعوں پر قبضے کے بعد غرناطہ تک پہنچ گئیں اور سرکاری فوج کو بھی شکست دے ڈالی۔ اس کے بعد ۱۳ ذوالقعدہ ۷۱۳ھ (۱۲ مارچ ۱۳۱۴ء) میں ابو الجیوش کو برطرف کر دیا گیا، البتہ اسے وادیٔ آش کا حاکم مان لیا گیا۔

اگرچہ اَبُو الْجُیُوْش میں حکمرانی کی قابلیت نہیں تھی مگر وہ علوم و فنون خصوصاً فلکیات، فلسفے اور سائنس کا ماہر تھا۔ اس کے دور میں سائنس اور فلسفے پر بہت سی نئی کتب لکھی گئیں اور قدیم غیر ملکی کتب کے تراجم ہوئے۔ معزولی کے بعد بھی ابو الجیوش دوبارہ اقتدار میں آنے کی کچھ نہ کچھ کوشش کرتا رہا۔ کبھی غرناطہ کے حکمران ابو الولید سے اس کی صلح ہو جاتی اور کبھی دوبارہ کشیدگی ہو جاتی۔ ۶ ذوالقعدہ ۷۲۲ھ کو اس کی وفات ہوئی۔ اس کی عمر ۳۶ سال سے کچھ اوپر تھی۔[1]

✦✦✦

① الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۱/ ۳۱، ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۰۶؛ ۳/ ۲۵۳ تا ۲۶۰، ط دار الکتب العلمیة؛ تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۲۲۱، ۲۲۲؛ الاعلام للزرکلی: ۸/ ۲۸؛ نفح الطیب: ۵/ ۱۴۰؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۴/ ۱۲۲

⑤ ابو الولید، اسماعیل اوّل بن فرج

(۷۱۳ھ تا ۷۲۵ھ (۱۳۱۴ء تا ۱۳۲۵ء)

ابو الجیوش کی جگہ اسی خاندان کا ایک بڑا دلیر فرد ابو الولید اسماعیل بن فرج تخت نشین ہوا۔ وہ ابن الاحمر کے بھائی اسماعیل کا پوتا تھا۔ ۷ شوال ۶۷۷ھ کو پیدا ہوا تھا۔ ۱۲ ذوالقعدہ ۷۱۳ھ کو تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۳۶ سال تھی۔

ابو الولید نہایت شریف، سمجھدار اور بلند ہمت انسان تھا۔ اس نے حکومت سنبھال کر سابق حکمران نصر بن محمد سے بھی اچھا سلوک کیا اور اسے وادی آش کا امیر مقرر کر دیا۔ ابو الولید نے مذہبی اصلاحات بھی کیں، بدعات کو مٹایا، اہلِ سنت کو عزت بخشی اور سادات کو خوب نوازا۔ شرعی قوانین کے نفاذ میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ معاشرے میں رائج منکرات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ طوائفوں پر پابندی لگائی۔ یہودیوں کو شناخت کرانے کے لیے زرد عمامے باندھنے کا حکم دیا۔

ابو الولید نے غرناطہ کے رقبے کو وسعت دینے کی پوری کوشش کی، مراکش کے بنو مرین سے کشیدگی ابھی جاری تھی، اس دوران ابو الولید نے بنو مرین سے اندلس کے قلعوں: طریف اور رُندہ کو دوبارہ حاصل کر لیا۔[1]

منظرہ بینوس کی تاریخی جنگ:

شاہ قسطالیہ الفانسو یازدہم نے غرناطہ کو ایک دلیر اور مضبوط حکمران کے قبضے میں دیکھ کر سخت خطرہ محسوس کیا۔ غرناطہ کی بڑھتی ہوئی طاقت نے پورے یورپ میں ہل چل پیدا کر دی۔ پادریوں نے جوشیلی تقریریں کر کے صلیبی جنگ جیسا ماحول پیدا کر دیا۔ اسپین کا بشپ اس مہم میں پیش پیش رہا۔ پورے براعظم کے کلیساؤں میں اندلس سے مسلمانوں کے خاتمے کی دعائیں مانگی گئیں۔ طُلَیطُلہ میں نصرانیوں کا ایک تاریخی اجتماع ہوا جس میں پچیس کے لگ بھگ نواب شریک ہوئے، پوپ نے ہر ایک کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے برکت کی دعا دی۔

قسطالیہ کے ولی عہد ڈان پیڈرو (دون بطرُ ہ Don Pedro) کو سپہ سالار قرار دیا گیا۔ ایک اور نامور جرنیل ڈان جان (دون خوان Don Juan) کو اس کا نائب بنایا گیا۔ اس نے پوپ سے اندلس کے بقیہ مسلمانوں کے خاتمے کے لیے دعا کی درخواست کی۔ جس کے بعد دولاکھ کا ٹڈی دل لشکر غرناطہ کو فتح کرنے اور جزیرہ نما اندلس سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے کے لیے روانہ ہوا جس میں برطانوی رضا کار بھی شامل تھے۔

یہ لشکر شروع میں کئی سرحدی قلعوں پر قابض ہو گیا۔ تاہم ابو الولید اتنے بڑے پیمانے پر لشکر کشی کی اطلاعات سن کر بھی مایوس نہ ہوا۔ اس نے مراکش کے حکمران ابو سعید سے کمک طلب کی مگر دونوں مملکتوں میں رنجش چل رہی تھی اس لیے کوئی مدد نہ آئی اور اس دوران نصرانیوں کا سیلاب غرناطہ کی سرحدوں پر آن پہنچا اور شہر سے دس میل دور کوہ والبیرہ کے

---

[1] الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۱/ ۴۰۰ تا ۴۰۶، ط دار الکتب العلمیة

دامن میں "فلوتونة" نامی وادی میں خیمہ زن ہوا۔

غرناطہ کے مسلمان کوئی سہارا نہ پاکر اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ ابوالولید فوری طور پر جو سپاہی جمع کر سکا ان کی تعداد ساڑھے پانچ ہزار سے زائد نہ تھی۔ ان سب نے نیتوں کو خالص اور عزائم کو بلند کیا، شوقِ شہادت سے معمور ہوئے اور اللہ کا نام لے کر ۲۰ ربیع الآخر ۷۱۹ھ کو غرناطہ سے نکل کھڑے ہوئے۔

ابوالولید نے نصرانیوں کی لشکرگاہ سے چند میل کے فاصلے پر پہنچ کر شیخ الغزاۃ عثمان بن ادریس کو تاکید کی کہ وہ ہراول دستے کے پانچ سو چیدہ سپاہی لے کر آگے بڑھے اور نصرانیوں کے ہراول پر اچانک دھاوا بول دے۔ شیخ الغزاۃ نے آگے بڑھ کر نصرانیوں کے ہراول دستے پر جارحانہ حملہ کیا تو اس غیر متوقع صورتحال سے نصرانیوں میں بھگدڑ مچ گئی، وہ ہراساں ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور سمجھے کہ مسلمانوں کے پاس ٹھیک ٹھاک طاقت موجود ہے۔

شیخ الغزاۃ اپنے مجاہدین کے ساتھ واپس ابوالولید کے پاس آن پہنچا۔ کچھ دنوں تک دونوں لشکر اپنی اپنی جگہ ساکت رہے۔ ابوالولید نے جنگی حکمتِ عملی طے کی اور اپنے ایک سالار ابوالجیوش کو ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ قریبی جنگل میں کمین گاہیں بنانے کا حکم دیا۔ پھر شیخ الغزاۃ کو ہدایت دی کہ وہ پانچ سو سپاہی لے کر نصرانیوں پر نمائشی حملہ کرے اور پسپائی اختیار کر کے نصرانیوں کو اپنے پیچھے لگاتے ہوئے ابوالجیوش کی کمین گاہوں سے آگے لے جائے۔

اس دوران ابوالولید تین سو سپاہیوں کے ساتھ ایک اور سمت میں کھڑا رہا۔ بقیہ چار ہزار سپاہی چوتھی سمت میں فیصلہ کن حملے کے لیے محفوظ رکھے گئے۔ شیخ الغزاۃ مجاہدین کو لے کر نصرانیوں کے لشکر کے قریب پہنچا، گھوڑے سے اتر کر ایک طویل سجدہ کیا اور گڑگڑا کر اللہ سے نصرت کی دعا مانگی۔ پھر آواز بلند کی: "حملہ کرو۔"

مجاہدین نے یک بارگی حریف پر دھاوا بول دیا اور کچھ دیر کی لڑائی کے بعد منصوبے کے مطابق پسپائی اختیار کر لی۔ یہ دیکھ کر نصرانیوں کا پورا لشکر ایک عظیم الشان فتح میں شرکت کے خیال سے ان کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا، یہاں تک کہ شیخ الغزاۃ جنگل میں گھس کر دور نکل گیا۔ تعاقب میں آنے والے نصرانی گھڑسوار اور پیادے جنگل میں داخل ہونے کے بعد تنظیم برقرار نہ رکھ سکے اور منتشر انداز میں مفرور مسلمانوں کے پیچھے دوڑتے رہے۔ جب وہ ابوالجیوش کی کمین گاہوں کے پاس سے گزر گئے تو اس نے عقب سے ایسا زوردار حملہ کیا کہ نصرانیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ ادھر سے شیخ الغزاۃ نے بھی مڑ کر دھاوا بول دیا۔ نصرانی حواس باختہ ہو کر تیسری سمت میں فرار ہونے لگے تو وہاں ابوالولید نے اپنے تین سو سپاہیوں کے ساتھ انہیں تیروں کی زد پر رکھ لیا۔ جنگل میں درختوں کی کثرت کی وجہ سے نصرانیوں کو اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ ان پر حملہ کرنے والوں کی تعداد کتنی ہے۔ یہ کھلے میدان کی طرف نکلے تو باقی چار ہزار گھڑسوار مجاہدین نے نیزے تان کر ان پر فیصلہ کن حملہ کر دیا اور نصرانیوں کو روندتے چلے گئے۔ یہ جنگ ۶ جمادی الاولیٰ ۷۱۹ھ کو تل قم کے میدان میں لڑی جا رہی تھی۔

شیخ الغزاۃ دو ہزار شہسواروں کو لے کر ایک طوفان کی طرح نصرانیوں کی خیمہ گاہ میں گھس گیا۔ درجنوں نواب جو

مسلمانوں کی شکست فاش کی خبر کا انتظار کر رہے تھے، اس اچانک حملے کی زد میں آ کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔

باقی نصرانی نہایت سراسیمہ ہو کر طلیطلہ کی طرف بھاگے، مسلمان ان کا برابر تعاقب کرتے رہے اور قدم قدم پر ان کی لاشیں گراتے رہے۔ یہ تاریخ کی ایک حیرت انگیز لڑائی تھی جس میں صرف ساڑھے پانچ ہزار مسلمانوں نے اللہ کی نصرت، اپنی قوتِ ایمانی، جذبۂ جہاد، شوقِ شہادت، ہمت و تدبیر اور تنظیم و اتحاد کی بدولت، دو لاکھ کے لشکر پر فتح پائی۔ علی قم سے طلیطلہ کی شاہراہ تک ساٹھ ہزار (دوسری روایت کے مطابق ۸۰ ہزار) نصرانیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں جن میں قسطلیہ کے ولی عہد ڈان پیڈرو سمیت پچیس نامور نصرانی عمائد بھی شامل تھے۔ عجیب ترین بات یہ تھی کہ اس پورے معرکے میں صرف تیرہ مسلمان شہید ہوئے۔ ڈان پیڈرو کے بیوی بچوں سمیت سات ہزار نصرانی قیدی بنے۔ پیڈرو کی لاش غرناطہ کے دروازے پر لٹکا دی گئی تاکہ دنیا دیکھ لے کہ مسلمانوں کو مٹانا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اس طرح نصرانی حکام کی سطوت و ہیبت خاک میں مل گئی اور وہ غرناطہ سے صلح پر مجبور ہو گئے۔

ابوالولید کی فتوحات اس کے بعد بھی جاری رہیں۔ ۲۴ رجب ۷۲۴ھ کو اس نے نصرانیوں کا مضبوط قلعہ ''حصن اشکر'' فتح کر لیا۔ اگلے سال رجب ۷۲۵ھ میں اس نے جیان سے ۱۶ میل جنوب مغرب میں مرتش کے قلعے پر قبضہ کر کے اپنی مملکت کو مزید وسیع کر دیا۔

تاہم یہ عالی حوصلہ مجاہدِ اسلام جسے پورا یورپ مل کر زیر نہ کر سکا، اپنوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ وہ قلعہ مرتش فتح کر کے اپنے مصاحبین اور مہمانوں سے مل رہا تھا کہ اس کا بھتیجا محمد بن اسماعیل معانقے کے لیے آگے بڑھا، ابوالولید نے جونہی اسے گلے سے لگایا، اس نے خنجر نکال کر پے در پے تین وار کر دیے جن میں سے ایک گردن پر لگا۔ قاتل کو جائے واردات پر ہی قتل کر دیا گیا اور ابوالولید کو غرناطہ لے جایا گیا جہاں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ فوت ہو گیا۔ یہ ۲۷ رجب ۷۲۵ھ (۲۱ جولائی ۱۳۲۵ء) کا واقعہ ہے۔ ابوالولید کی عمر ۴۸ سال تھی۔[1]

+++

[1] الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۱/ ۲۰۰ تا ۲۱۰، ط العلمیة ؛ نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۱/ ۴۴۹ تا ۴۵۲، ط دار صادر ؛ الاعلام للزرکلی: ۱/ ۳۲۱ ؛ تاریخ ابن خلدون: ۴/ ۲۲۲؛ اعیان العصر واعوان النصر از صلاح الدین الصفدی: ۱/ ۵۱۲، ۵۱۳، ط دار الفکر المعاصر بیروت ؛ المنهل الصافی والمستوفی بعد الوافی از علامه یوسف بن تغری بردی: ۲/ ۴۱۹ ؛ التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطة، لعبد الرحمن علی: ص ۵۴۲، ۵۴۳

معرکہ وادی فرتونہ (۷۱۹ھ) کی تفصیل سب سے زیادہ نفح الطیب میں ہے:

⑥ محمد چہارم، محمد بن اسماعیل بن فرج

۷۲۵ھ تا ۷۳۳ھ (۱۳۲۵ء تا ۱۳۳۳ء)

ابوالولید اسماعیل کی موت بہت بڑا حادثہ تھی جس نے نصرانیوں کے دلوں کو ٹھنڈا اور اہل ایمان کو پژمردہ کر دیا۔ ابوالولید کی وصیت کے مطابق اس کے قتل کے فوراً بعد ۲۷ رجب ۷۲۵ھ (۲۱ جولائی ۱۳۲۵ء) کو اُمرائے سلطنت نے اس کے بیٹے محمد چہارم کی بیعت کر لی۔ وہ ۸ محرم ۷۱۵ھ کو پیدا ہوا تھا اور اس وقت ساڑھے دس سال کا تھا۔ علامہ لسان الدین خطیب رحمہ اللہ کے مطابق وہ حسین، بااخلاق، فیاض اور دلیر نوجوان تھا۔ اس کی شجاعت جنون کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ گھڑ سواری میں نہایت ماہر تھا۔ گھوڑوں کی مختلف نسلوں اور قسموں کو خوب پہچانتا تھا۔ شکار کا بے حد شوقین اور شعر و ادب کا دلدادہ تھا۔ تاہم ان خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوری یہ تھی کہ جب اسے غصہ آتا تو امراء کو بہت سختی سے ڈانٹتا اور ان کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتا جو بہت سوں کے لیے قابلِ برداشت نہیں تھے۔

شروع میں وہ وزراء کے زیرِ اثر رہا مگر چودہ سال کی عمر میں اس نے امورِ سلطنت خود سنبھال لیے، تاہم وزیر ابن محروق جو اس پر مسلط تھا، اسے دبائے رکھنا چاہتا تھا۔ آخر محمد چہارم نے ۷۲۹ھ میں قابو پا کر اسے قتل کرا دیا۔

محمد چہارم سلطنت کی حفاظت کے لیے بہت سنجیدہ تھا۔ اس نے کئی جنگیں لڑیں اور اکثر میں فتح یاب ہوا۔ ایک اور جنگ میں اس نے ''قبرۃ'' شہر کے باہر نصرانیوں کو شکست دی۔ مختلف مہمات میں اس نے باغورہ، حصن قسطالیہ اور حصن قشرہ جیسے قلعوں کو فتح کر کے اندلس صغریٰ کا رقبہ خاصا وسیع کر دیا۔ اس نے بنو مرین سے تعلقات بہتر بنائے اور ۷۳۳ھ میں ان کی مدد سے جبل الطارق کو نصرانیوں سے بازیاب کرا لیا۔ یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ شمار ہوتا ہے۔

اس نوجوان حکمران کا انجام بھی دردناک ہوا۔ کچھ عرصے پہلے اس کے شیخ الغزاۃ عثمان بن ابی العلاء سے اختلافات شدید ہو گئے تھے اور اس نے شیخ الغزاۃ کو معزول کر دیا تھا۔ جب محمد چہارم جبل الطارق کی مہم سے فارغ ہو کر واپس آ رہا تھا تو شیخ الغزاۃ کی اولاد کے ایماء پر کچھ افسرانِ فوج نے اچانک حملہ کر کے اس بہادر حکمران کو قتل کر دیا۔ اس کی عمر فقط بیس برس تھی۔ یہ افسوس ناک واقعہ ۱۳ ذوالحجہ ۷۳۳ھ (۵ ستمبر ۱۳۳۳ء) کا ہے۔ امرائے سلطنت نے اس کی لاش کو وہیں چھوڑ دیا۔ بعد میں لوگوں نے اسے مالقہ لے جا کر دفن کر دیا۔[1]

✦✦✦

---

① الاحاطۃ فی اخبار غرناطۃ: ۱/ ۳۱، ۱۳۲/۱۳۰۹/۱۳۲ تا ۳۱۳؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۲۲۲، ۲۲۳؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۱۲۱ تا ۱۲۳؛ الدرر الکامنۃ فی اعیان المائۃ الثامنۃ لابن حجر العسقلانی: ۵/ ۱۲۵؛ الاعلام زرکلی: ۹/ ۳۶

⑦ اَبُو الْحجاج، یوسف بن اسماعیل، یوسف اوّل

۷۳۳ھ تا ۷۵۵ھ (۱۳۳۳ء تا ۱۳۵۴ء) :

اب محمد چہارم کا بھائی ابوالحجاج یوسف بن اسماعیل بن فرج تخت نشین ہوا جسے یوسف اوّل کہا جاتا ہے۔ اس کی بیعت ۱۳ ذوالحجہ ۷۳۳ھ (۶ ستمبر ۱۳۳۳ء) کو ہوئی۔ اس وقت وہ پندرہ سال آٹھ ماہ کا تھا مگر دلیر، عقل مند اور ہوشیار تھا۔ شیریں سخن، ذہین، نکتہ دان اور مروّجہ علوم وفنون میں اچھا ادراک رکھتا تھا۔ خونریزی سے گریزاں اور امن پسند تھا۔

اس نے اپنے بھائی کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچا کر چھوڑا۔ اس کے دورِ حکومت میں نصرانیوں نے ایک بار پھر جبل الطارق پر حملہ کیا تاکہ مراکش اور اسپین کا رابطہ ختم کر دیا جائے۔ یوسف اوّل نے مراکش کے حکمران ابوالحسن مَرینی سے مدد طلب کی، جس نے اپنے بیٹے عبدالملک کی قیادت میں فوج بھیج دی۔ یوسف اوّل نے مراکش کی افواج کو ساتھ ملا کر جبل الطارق کے قریب نصرانیوں کو پسپا کر دیا اور جنوبی اندلس کا اکثر علاقہ ان سے خالی کرالیا۔ مگر جب مراکش کی افواج واپس روانہ ہونے لگیں تو نصرانیوں نے اچانک پلٹ کر حملہ کر دیا جس میں مراکشی مسلمانوں کا سخت نقصان ہوا اور ان کا امیر عبدالملک دس ہزار سپاہیوں سمیت شہید ہوگیا۔

اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے ۷۴۰ھ میں امیرِ مراکش ابوالحسن خود ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر اندلس کے مغربی ساحل پر اترا اور ابوالحجاج کی فوج کے ساتھ مل کر نصرانیوں کو زور آزمائی کی دعوت دیتے ہوئے طریف کا محاصرہ کرلیا۔ یہ حالت دیکھ کر قسطالیہ، ارغون اور پرتگال کی افواج نے ایک متحدہ محاذ قائم کر کے بے پناہ طاقت کے ساتھ پیش قدمی کی۔ طریف کے باہر "سلادو" کے قریب ۷ جمادی الاولیٰ ۷۴۱ھ (۳۰ اکتوبر ۱۳۴۰ء) کو ایک نہایت قہر انگیز جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں اندلس کے مسلمانوں نے پہلی بار آتشیں اسلحہ استعمال کیا جو بعد میں روایتی ہتھیاروں میں شامل ہوگیا۔ اس کے باوجود اس بار نصرانی فتح یاب ہوئے اور اسلامی خیمہ گاہ پر قابض ہو کر تمام ذخائر اور ہتھیاروں پر قابض ہوگئے۔ مملکتِ غرناطہ کا ایک حصہ ان کے قبضے میں چلا گیا۔ تاریخ میں جنگِ طریف کو جنگِ عقاب کی طرح مسلمانانِ اندلس کی بہت بڑی پسپائی مانا جاتا ہے۔

سلطان ابوالحسن نے بڑی خستہ حالت میں مراکش کا رُخ کیا اور ابوالحجاج نے غرناطہ میں پناہ لی۔ مراکش کے نقصانات اتنے زیادہ تھے کہ اس کے بعد مراکشی حکمرانوں نے اندلس میں پھر کسی بڑی فوج کشی کی ہمت نہیں کی اور اہلِ غرناطہ کو زیادہ تر اپنی قوت پر ہی بھروسہ کرنا پڑا۔ اس جنگ میں ہزاروں مسلمان اور سینکڑوں علماء ومشائخ شہید ہوئے جن میں غرناطہ کے وزیر، علامہ لسان الدین ابن الخطیب رحمہ اللہ کے والد، عبداللہ بن سعید بھی شامل تھے۔

علامہ لسان الدین ابن الخطیب رحمہ اللہ کے استاذ قاضی محمد بن بکر الماقی رحمہ اللہ (۶۷۴ھ۔ ۷۴۱ھ) بھی مجاہدین میں

شامل تھے جن کی تصنیف "التمهيد والبيان في مقتل الشهيد عثمان" شہرہ آفاق ہے۔ شکست سامنے دیکھ کر ان کے دوست فرار ہونے لگے تو انہیں بھی اصرار کر کے ساتھ لے جانا چاہا مگر انہوں نے فرمایا: "یہ خوشی کا دن چھوڑ کر کیسے لوٹ جاؤں۔" ان کا اشارہ شہداء کی تعریف میں مذکور اس آیت کی طرف تھا:

فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○

"وہ خوش ہیں اس چیز پر جو اللہ نے انہیں عطا کیں اپنے فضل سے۔ اور وہ بشارتیں لیتے ہیں ان لوگوں کے بارے میں بھی جو ابھی ان سے نہیں ملے ان کے پیچھے سے کہ ان پر بھی نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔"[1]

۷۵۰ھ میں الفانسو یازدہم نے جبل الطارق پر قبضے کی ایک اور کوشش کی اور ایک سال تک قلعے کا محاصرہ کیے رہا۔ مسلمانوں نے بھرپور مزاحمت کی اور حریف کی ایک نہ چلنے دی۔ اس دوران اندلس اور بحیرۂ روم کے کئی ملکوں میں طاعون کی وبا پھیل گئی جس سے ہزاروں انسان لقمۂ اجل بن گئے۔[2] الفانسو یازدہم بھی وبا سے مرگیا اور اس کا لشکر واپسی پر مجبور ہوگیا۔ مسلمان چاہتے تو اب نصرانیوں کو با آسانی نشانہ بنا سکتے تھے مگر انہوں نے روایتی شرافت کا مظاہرہ کیا اور وبا سے متاثرہ حریف اور دشمن بادشاہ کے جنازے کا خیال کرتے ہوئے تعاقب نہ کیا۔ افسوس کہ قسطالیہ والے اس کے بعد بھی سرحدی چھیڑ چھاڑ سے باز نہ آئے۔ البتہ ارغون کے حکمران پیڈرو چہارم نے غرناطہ سے صلح کر لی۔

یوسف اول ایک غیور انسان تھا لہٰذا قسطالیہ سے بدلہ لینے کی تیاری کرتا رہا۔ ۷۵۵ھ میں وہ لشکر کشی کا عزم کر چکا تھا کہ عید کی نماز کے دوران سجدے کی حالت میں اس پر کسی گمنام شخص نے نیزے کا وار کیا جس سے یہ مردِ حُر شہید ہوگیا۔ حملہ آور کو گرفتار کر لیا گیا مگر اس کا کوئی نام پتا معلوم نہ ہوسکا کیوں کہ اس کی حرکات پاگلوں جیسی تھیں۔ اندازہ یہی ہے کہ وہ نصرانیوں کا کوئی گماشتہ تھا جس نے تفتیش کی راہ مسدود کرنے کے لیے پاگل پن کا ناٹک رچایا۔ سلطان یوسف اول کو قصر الحمراء میں دفن کر دیا گیا۔ علامہ لسان الدین خطیب کے بقول اس کا رنگ نہایت گورا، دانت انتہائی چمکدار، ہاتھ پاؤں بڑے مضبوط، ڈاڑھی خوب گھنی اور بال نہایت سیاہ اور گھنگریالے تھے۔[3]

◆◆◆

---

① سورۃ آل عمران، آیت: ۱۷۰

② اس طاعونی وبا کو تاریخ میں "سیاہ موت" کہا جاتا ہے۔ اس کا زیادہ زور ۷۴۹ھ سے ۷۵۰ھ (۱۳۴۸ء، ۱۳۴۹ء) تک رہا۔ یہ بیماری مشرق و مغرب میں اسلامی ممالک سے یورپ تک پھیل گئی تھی۔ اندلس میں اس کے باعث نصرانی اور مسلمان بکثرت فوت ہوئے جن میں نامور اہل علم و ادب بھی تھے۔ اس وبا سے مویشی، پرندے یہاں تک کہ مچھلیاں بھی متاثر ہوئیں۔ ملاحظہ ہو: السلوک لمعرفة دول الملوک للمقریزی: سنہ ۷۴۹ھ۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مقالہ "Black Death"۔ نیز ابن بطوطہ نے بھی اس وبا کا ذکر کیا ہے۔

③ الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۲۸۰/۳ تا ۲۹۱؛ تاریخ ابن خلدون: ۲۲۳/۳، ۲۳۳؛ نفح الطیب: ۸۰/۵، ۸۱؛ الاعلام للزرکلی: ۲۱۷/۸؛ التاریخ الاندلسی لعبد الرحمن علی: ص ۵۳۳ تا ۵۳۶، ۵۳۸، ۵۳۹

⑧ محمد بن یوسف، محمد پنجم، غنی باللہ

۷۵۵ھ تا ۷۶۰ھ (۱۳۵۴ء تا ۱۳۵۹ء)

سلطان یوسف اوّل کو اپنی اُمِ ولد مریم اور اس کے بیٹے اسماعیل سے زیادہ محبت تھی اور اس کا رجحان اسی کو ولی عہد بنانے کا تھا مگر سلطان کے قتل کے بعد اُمراء نے ماں بیٹے کو نظر بند کر دیا اور سلطان کے بڑے بیٹے محمد کی بیعت کر لی۔[1]

۲۱ سالہ محمد (بن یوسف بن فرج) یکم شوال ۷۵۵ھ (۳۱ اکتوبر ۱۳۵۴ء) کو غنی باللہ کا لقب لگا کر تخت نشین ہوا اور محمد پنجم کہلایا۔ وہ خوبصورت، شریف، ذہین، بردبار، مہربان اور خیر کے کاموں کی طرف راغب تھا۔ وہ درحقیقت ایک سیاست دان تھا جسے عوام وخواص سب نے پسند کیا۔ اُس نے زیادہ تر اُمور اپنے والد کے حاجب رضوان کو سونپ دیے جبکہ وزارت علامہ لسان الدین خطیب رحمہ اللہ کے سپرد کر دی۔ یوں ملکی انتظامات اچھی طرح چلنے لگے۔[2]

اس زمانے میں نصرانیوں کی دونوں مملکتوں: قسطالیہ اور ارغون میں جنگ چھڑ گئی تھی، اس لیے مسلمانوں کی سرحدیں محفوظ تھیں۔ غنی باللہ نے مزید سیاسی تدبیر یہ اپنائی کہ اس موقع پر قسطالیہ کے حکمران پطرس اوّل (Peter the Cruel) کے ساتھ ریاست ارغون کے خلاف معاہدہ کر لیا۔ یوں پطرس اوّل کی کمر مضبوط ہو گئی۔[3]

غنی باللہ نے بنو مرین سے تعلقات بہتر بنانے کے لیے ۷۵۵ھ میں وزیر سلطنت علامہ لسان الدین الخطیب رحمہ اللہ کو سلطان ابوسالم بن ابوالحسن مرینی کے پاس مراکش بھیجا جن کی وہاں بہت پذیرائی ہوئی۔[4]

تاہم حوادث غنی باللہ کے منتظر تھے۔ اس کے والد یوسف اوّل نے شاہی خاندان میں لڑکوں کی کمی سے مجبور ہو کر اپنی لڑکی خاندان کے ایک بداخلاق شہزادے محمد بن اسماعیل (بن محمد بن فرج) کے نکاح میں دے دی تھی جسے رئیس ابوعبداللہ کہا جاتا تھا۔ اس کی فتنہ پروری کے باعث قصر الحمراء میں اس کا داخلہ ممنوع تھا۔ اُدھر شہزادہ اسماعیل اور اس کی والدہ مریم نظر بند تھے۔ مریم نے سلطان کے قتل کے بعد بہت سی دولت چھپا کر رکھ لی تھی۔ اس نے ابوعبداللہ سے رابطہ کیا اور خطیر رقم دے کر رہائی دلانے کی درخواست کی۔ چنانچہ ابوعبداللہ نے بغاوت کی تیاری کر لی۔[5]

۲۸ رمضان ۷۶۰ھ (۲۳ اگست ۱۳۵۹ء) کی شب وہ ایک جتھے کے ساتھ قصر الحمراء میں گھس گیا جہاں کئی غلام اور پہرے دار پہلے ہی اس کے ساتھ مل چکے تھے۔ قصر پر قبضہ کر کے اُس نے حاجب رضوان کو قتل کر دیا اور اسماعیل کو آزاد

✦✦✦

① تاریخ ابن خلدون: ۴۰۵/۷، ط دار الفکر
② الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۳۰۳/۲، ط العلمیة؛ اعمال الاعلام از لسان الدین الخطیب: ۲۶۷/۲، ط العلمیة
③ الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۹/۲؛ غرناطة فی ظل بنی الاحمر از دکتور یوسف شکری: ص ۳۷، ط دار الجیل بیروت
④ الدرر الکامنة فی اعیان المائة الثامنة لابن حجر العسقلانی: ۱۲۹/۵، ۱۲۷، ط حیدر آباد دکن؛ اعمال الاعلام: ۲۹۷/۲
⑤ الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۲۱۳/۱، ۲۱۵، ۲۱۶، ط دار الکتب العلمیة؛ تاریخ ابن خلدون: ۲۲۳/۴

کر کے تخت پر بٹھا دیا۔ غنی باللہ اُس وقت کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اُس نے مقابلہ بے سود تصور کیا اور وادیٔ آش چلا گیا۔ وہاں اُس نے مراکش کے سلطان ابوسالم سے رابطہ کر کے اس کے ہاں سیاسی پناہ کی اجازت لی اور ۱۱ ذوالحجہ ۷۶۰ھ کو وہ وادیٔ آش سے روانہ ہو کر ۲۴ ذوالحجہ کو مراکش کے ساحلی شہر سبتہ پہنچ گیا۔ اس کے چلے جانے سے نئے حکمران اسماعیل بن یوسف کے لیے راستہ بالکل صاف ہو گیا۔[1]

⑨ اسماعیل بن یوسف، اسماعیل ثانی

۷۶۰ھ تا ۷۶۱ھ (۱۳۵۹ء تا ۱۳۶۰ء)

اسماعیل بن یوسف ۷۴۰ھ میں پیدا ہوا تھا۔ ناتجربہ کار اور آرام پسند تھا۔ اس کے ہم نشین زیادہ تر اس کے نالائق دوست تھے۔ اُسے تخت پر بٹھانے والا ابوعبداللہ ایک طرف ملکہ مریم کی وفاداری کا دم بھرتا تھا اور دوسری طرف بھولے بھالے بادشاہ کے سامنے خادم کی طرح باادب کھڑا ہوتا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ خفیہ سازشوں کے ذریعے اس پر بھی حاوی رہتا تھا۔ اُس کی کوشش تھی کہ نوجوان بادشاہ زیادہ سے زیادہ عیش و عشرت میں مگن رہا کرے تاکہ درباری اور عوام دن بدن اس سے متنفر ہوتے جائیں۔ وہ لوگوں کے سامنے بادشاہ کی برائیوں پر اظہار افسوس کرتا اور خود کو اس حوالے سے بری الذمہ ظاہر کرتا۔ ساتھ ہی شاہی خزانے سے لوگوں پر خوب خرچ کرتا تاکہ لوگ اس پر اعتماد کریں اور بادشاہ کی بجائے اس کے گرد جمع رہیں۔ ابوعبداللہ کی سازش کامیاب رہی اور لوگ دن بدن حکمران سے بیزار ہوتے چلے گئے۔ آخر کار ابوعبداللہ نے اُسے قتل کرا دیا۔ یہ ۲۷ شعبان ۷۶۱ھ (۲۴ جولائی ۱۳۶۰ء) کا واقعہ ہے۔[2]

⑩ ابوعبداللہ، ابوسعید، محمد بن اسماعیل بن فرج، محمد ششم

۷۶۱ھ تا ۷۶۲ھ (۱۳۶۰ء تا ۱۳۶۲ء)

رئیس ابوعبداللہ آلِ نصر کا ایک شہزادہ تھا۔ اس کا نام محمد بن اسماعیل (بن فرج بن اسماعیل) تھا۔ وہ ۷۳۲ھ میں پیدا ہوا تھا۔ اسماعیل بن یوسف کو قتل کرانے کے بعد وہ خود تخت پر آ بیٹھا۔ لوگ سابق حکمران سے اس قدر تنگ آ چکے تھے کہ اس نئے حکمران کی تخت نشینی پر کسی امیر نے مخالفت نہیں کی اور بلا تامل سب نے بیعت کر لی۔

ابوعبداللہ کو محمد ششم بھی کہا جاتا ہے۔ وہ ایک شاطر، تیز طرار اور بدسیرت آدمی تھا۔ لوگوں نے اس کی خراب عادات

---

① الاحاطۃ فی اخبار غرناطۃ: ۲/ ۱۱، ۱۲، ط دار الکتب العلمیۃ

② الاحاطۃ فی اخبار غرناطۃ: ۱/ ۲۱۳ تا ۲۱۷، ۳۰۲، ط دار الکتب العلمیۃ؛ اعمال الاعلام از لسان الدین الخطیب: ۲/ ۲۶۶، ط العلمیۃ؛ الاعلام للزرکلی: ۱/ ۳۲۹؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۴/ ۱۳۱؛ غرناطۃ فی ظل بنی الاحمر: ص ۳۸ مع حاشیۃ
و ان شئتم مزید التفصیل لھذہ الحوادث، فعلیکم بالمقالۃ "الصراع بین یوسف الاوّل و اسرۃ فی اضعاف مملکۃ غرناطۃ" للدکتورۃ نورۃ بنت محمد بن عبدالعزیز التویجری، نشرت فی مجلۃ جامعۃ ام القری، السنۃ العاشرۃ، العدد الخامس عشر، ۱۴۱۷ھ

سے چشم پوشی کرتے ہوئے اچھی توقعات وابستہ کر کے اس کی بیعت کی تھی مگر ان کے خواب اس وقت چکنا چور ہو گئے جب انہوں نے دیکھا کہ نیا حکمران سلطنت کے بدخواہوں اور شریر لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے انہیں بڑے بڑے عہدوں سے نوازتا جا رہا ہے۔ الغرض ملکی نظام پہلے سے بھی بدتر ہو گیا اور عوام کی بے زاری دن بدن بڑھتی گئی۔ ①

سابق حکمران غنی باللہ نے سیاسی ضرورت کی بناء پر قسطالیہ کو خراج ادا کرنا منظور کر لیا تھا مگر ابوعبداللہ نے آتے ہی اس معاہدے کو توڑ ڈالا۔ اس پر شاہِ قسطالیہ پطرس اوّل نے دھمکانے کے لیے ایک لشکر بھیجا جسے شکست ہوئی۔ ② اس وقت ریاستِ ارغون سے کش مکش کے باعث سخت ضیق میں تھا، لہٰذا اس نے ابوعبداللہ کو معاہدۂ صلح کی پیش کش کر دی۔ ابوعبداللہ نے صلح کے بدلے شاہِ قسطالیہ پر بڑی ذلت آمیز شرائط عائد کیں جو اس نے مصلحتِ وقت کو دیکھتے ہوئے بظاہر قبول کر لیں مگر وہ اندر ہی اندر سراپا غضب بن گیا۔ ③ وہ ریاست ارغون سے پہلے ہی تنگ تھا۔ اب غرناطہ سے شکست مزید پریشانی کا باعث بن گئی۔ ایسے میں امن پسند حکمران غنی باللہ کی واپسی اس کی بھی ترجیح بن گئی۔ ③

اُدھر مراکش کے حکمران نے بھی شاہِ قسطالیہ سے رابطہ کیا اور اسے غنی باللہ سے اتحاد و تعاون کا مشورہ دیا جسے شاہِ قسطالیہ نے قبول کر لیا۔ ⑤ فضا سازگار دیکھ کر غنی باللہ مراکش سے نکلا اور ایک بحری بیڑے میں اندلس کے ساحل پر پہنچ گیا۔ جب ابوعبداللہ کو اطلاع ملی کہ لوگ ہر طرف سے جمع ہو کر غنی باللہ کی بیعت کر رہے ہیں تو وہ سخت پریشان ہوا۔ اس نے ایسے میں خزانے کے منہ کھول دیے اور لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے کی کوشش کی مگر یہ حربہ بھی ناکام رہا۔

آخر اسے ہر طرف موت نظر آنے لگی۔ اُس نے خزانے میں سے جو سمیٹنا ممکن تھا، سمیٹا اور اپنے تین سو اعیان اور خدام کے ساتھ ۲۷ جمادی الآخرہ ۷۶۳ھ کو رات کی تاریکی میں غرناطہ سے نکل کر قسطالیہ روانہ ہو گیا۔ گھبراہٹ میں اُس کی تمام ہوشیاری اور چالاکی دھری رہ گئی اور وہ قسطالیہ میں داخل ہونے سے قبل جان و مال کی امان لینا بھی بھول گیا۔ اُسے یاد ہی نہ رہا کہ شاہِ قسطالیہ اُس سے کتنا ناراض ہے۔ اس حماقت کا انجام یہ ہوا کہ جب وہ پطرس اوّل کے ہاں اشبیلیہ پہنچا اور پناہ طلب کی تو اُس نے صاف انکار کر دیا اور اپنا غیظ و غضب یوں ٹھنڈا کیا کہ ناک کان کٹوا کر اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ اس کے بعد اس کے عمائد، افسران اور خدام کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کے تمام ساز و سامان اور اموال پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ ۲ رجب ۷۶۳ھ (۹ مئی ۱۳۶۲ء) کا ہے۔ ⑥

✦✦✦

---

① الإحاطة في أخبار غرناطة: ۲/ ۱۱، ط دار الكتب العلمية
② تاريخ ابن خلدون: ۴/ ۲۲۳
③ الإحاطة في أخبار غرناطة: ۱/ ۳۰۲، ط دار الكتب العلمية
③ تاريخ ابن خلدون: ۴/ ۲۲۳
⑤ أعمال الأعلام فيمن بويع قبل الاحتلام: ۲/ ۲۶۷
⑥ الإحاطة في أخبار غرناطة: ۱/ ۳۰۲، ۳۰۳، ط دار الكتب العلمية

محمد بن یوسف، غنی باللہ، محمد پنجم (دوبارہ)

۷۶۳ھ تا ۷۹۳ھ (۱۳۶۲ء تا ۱۳۹۱ء)

سلطان محمد پنجم غنی باللہ امرائے سلطنت کی حمایت سے ۲۰ جمادی الآخرہ ۷۶۳ھ (۲۸ اپریل ۱۳۶۲ء) کو دوبارہ غرناطہ کا حکمران بن گیا۔ محمد پنجم نے اپنے اس دوسرے دورِ حکومت میں تیس سال ملک وقوم کی خدمت کی۔ وہ جرأت ایمانی، جذبۂ جہاد، ثابت قدمی، دلیری، رحم دلی اور مہربانی کی صفات سے آراستہ تھا۔ مجالسِ وعظ میں شرکت کرتا اور زار وقطار روتا۔ ہر کس وناکس کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتا۔ تشدد کرنے والے پولیس افسران کو سخت سزائیں دیتا۔ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید کرتا۔ عیش وعشرت اور لذتوں سے کنارہ کش تھا۔ جہاد میں شرکت اس کا سب سے بڑا شوق تھا۔ اس نے جا بجا مدارس اور خانقاہوں کو فروغ دیا۔ اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا۔ ایک ایسا شفاخانہ بنوایا جس کی مثال پورے عالم اسلام میں نہ تھی۔ اس نے غرناطہ کے بحری بیڑے کو ایک زبردست طاقت میں تبدیل کر دیا۔ تجارت وزراعت، آب پاشی اور کسانوں کو مراعات دینے پر خاص توجہ دی۔

صلح پسند ہونے کے باوجود وہ سرحدوں کی حفاظت کے لیے مستعد اور جذبۂ جہاد سے معمور تھا۔ اس کے دور میں شعبان ۷۶۷ھ میں غرناطہ کی افواج نے رُندہ جیسے اہم قلعے کو فتح کر کے نصرانیوں کو اپنی قوت کی جھلک دکھادی۔

گزشتہ حکمرانوں نے غرناطہ کو کمزور کر کے نصرانیوں کا باج گزار بنا دیا تھا۔ محمد پنجم نے قسطالیہ کی باہمی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا اور اندرونی کمزوریوں کو دور کرنے کے بعد ۷۷۲ھ میں قسطالیہ کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنے ملک کو اتنا مضبوط کر چکا تھا کہ بحران زدہ قسطالیہ جوابی کارروائی کے طور پر کچھ بھی نہ کر سکا۔ یوں غرناطہ زوال کا شکار ہوتے ہوتے دوبارہ خوشحالی کی طرف گامزن ہو گیا۔[1]

غنی باللہ کے دور میں مشہور مؤرخ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کچھ مدت غرناطہ کے دربار سے منسلک رہے۔ ۷۶۵ھ میں وہ غرناطہ کے سفیر بن کر قسطالیہ کے حکمران پطرس اوّل سے ملاقات کے لیے اشبیلیہ گئے تھے۔[2] غنی باللہ نے عمر بھر غرناطہ کو مضبوط اور مستحکم رکھنے کی پوری کوشش کی اور اس میں کامیاب رہا۔ اس کے جانشینوں میں اس جیسا کوئی نہ تھا۔ غنی باللہ محمد پنجم تیس سالہ طویل دورِ حکومت کے بعد ۱۰ صفر ۷۹۳ھ (۲۹ جنوری ۱۳۹۱ء) کو وفات پا گیا۔[3]

علامہ لسان الدین ابن الخطیب رحمہ اللہ:

غنی باللہ کا دربار چوٹی کے اہلِ کمال سے آراستہ تھا، ان میں علامہ لسان الدین ابن الخطیب رحمہ اللہ بھی تھے۔ وہ

---

① تاریخ ابن خلدون: ۴/۳۲۵؛ الاحاطة فی اخبار غرناطة: ۲/۳ تا ۴۳، ط العلمیة؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۵/۱۳۷، ۱۳۸؛ الاعلام للزرکلی: ۷/۱۵۳، ۱۵۴

② التعریف بابن خلدون: ص ۸۴؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۵/۱۴۳ ③ غرناطة فی ظل بنی الاحمر: ص ۴۱

۷۹ھ میں یوسف اوّل کے وزیر مقرر ہوئے تھے۔ غنی باللہ کے دور میں بھی ایک مدت تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے۔ وہ اندلس کے ان نامی گرامی علماء میں تھے جن کے علم سے آج تک دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ تاریخ اور ادب میں انہیں بڑی مہارت تھی۔ ان کی تصانیف ۶۰ سے زائد ہیں۔ اندلس صغریٰ کے حالات پر ان کی تصنیف ''الاحاطة فی اخبار غرناطه'' سے زیادہ جامع کتاب کوئی نہیں دیکھی گئی۔ اسلامی اندلس کی آخری صدیوں کے احوال کے بارے میں یہی سب سے اہم ماخذ ہے۔ شعرائے اندلس کے بارے میں ان کی تصنیف ''الکتیبة الکامنة فی من لقیناه بالاندلس من شعراء المائة الثامنة'' بھی اپنی نظیر آپ ہے۔ ''ریحانة الکتاب'' نہ صرف اس دور کے سرکاری خطوط اور دستاویز کا مجموعہ ہے بلکہ اس میں اندلس کے نامور حکام، وزراء اور امراء کے حالات بھی آ گئے ہیں۔ ''معیار الاختیار'' اندلس کے جغرافیے پر ایک شاہکار ہے۔ ''نفاضة الجراب'' میں وہ اپنے دور کے حالات کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ ان کی تمام تصانیف ادبی پہلو سے بھی بہت اعلیٰ معیار پر ہیں۔

اندلس میں ان کے حاسد کم نہ تھے، ان میں خود ان کا ایک شاگرد ابوعبداللہ ابن زمرک پیش پیش تھا اور دربار میں ان کی جگہ خود لینا چاہتا تھا۔ علامہ ابن الخطیب رحمہ اللہ اس ماحول سے بےزار ہو گئے اور آخر بنو مرین کی دعوت پر ۷۷۳ھ میں مراکش چلے گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں ابن زمرک نے انہیں مزید بدنام کیا حتیٰ کہ ایک وفد نے جا کر امیر مراکش کو یقین دلا دیا کہ ابن الخطیب زندیق اور بے دین ہیں۔ چنانچہ انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ ۷۷۶ھ میں مراکش کے رئیس شوریٰ نے ایک سازش کے تحت انہیں پھانسی دلوادی۔[1]

صد افسوس کہ اپنے دور کے اتنے بڑے عالم کے ساتھ ایسا گھناؤنا کھیل کھیلا گیا۔ جب کسی معاشرے میں قابل ترین افراد کے ساتھ یہ سلوک ہونے لگے تو پھر وہاں قابلیت کی نشوونما بند ہونے لگتی ہے۔

اس دور کے غیر مسلم حکام بھی علامہ ابن الخطیب رحمہ اللہ کی قابلیت کے مداح تھے۔ ایک بار دربار غرناطہ سے ایک سفیر کسی فرنگی حاکم کے پاس گیا۔ اصل موضوع پر بات چیت سے فراغت کے بعد فرنگی حاکم نے علامہ ابن الخطیب رحمہ اللہ کا لکھا ہوا ایک مکتوب نکال کر سفیر کو دکھایا جو فصاحت و بلاغت میں بے نظیر تھا۔ فرنگی حاکم نے کہا: ''کیا اس جیسے لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں قتل کیا جائے۔'' یہ کہہ کر وہ فرنگی حاکم اتنا رویا کہ اس کے کپڑے بھیگ گئے۔[2]

علامہ ابن الخطیب رحمہ اللہ سے دشمنی کرنے والے ابن زمرک کو اپنے کیے کا پھل جلد ہی مل گیا۔ وہ مقام اور رتبے کی انتہاء پر پہنچ کر منہ کے بل گرا۔ پہلے اسے دربار سے نکالا گیا اور پھر ۷۹۷ھ میں اہل و عیال سمیت قتل کر دیا گیا۔[3]

✦✦✦

---

① انباء الغمر بابناء العمر لابن حجر العسقلانی: ۱/ ۹۱ تا ۹۳، ط لجنة احیاء التراث الاسلامی؛ الاعلام للزرکلی: ۶/ ۲۳۵

② انباء الغمر بابناء العمر لابن حجر العسقلانی: ۱/ ۹۳، ط لجنة احیاء التراث الاسلامی مصر

③ دولة الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۱۵۰؛ الاعلام للزرکلی: ۷/ ۱۵۳

بنو نصر کا دورِ زوال

غنی باللہ محمد پنجم کے بعد غرناطہ میں بنو نصر کی حکومت مزید ایک صدی چلی مگر یہ اس کا دورِ زوال تھا۔ اس دوران کسی حکمران کو استحکام نصیب نہ ہوا، محلاتی سازشوں اور اقتدار کی اکھاڑ پچھاڑ تیز تر ہو گئی۔ ایک صدی میں سترہ بار حکومت تبدیل ہوئی۔ بعض حکمران دو یا تین بار تخت نشین ہوئے۔ دورِ زوال کے ان حکمرانوں کا ذکر پیشِ خدمت ہے۔

⑪ یوسف دوئم، ابوالحجاج

اوائل ۷۹۳ھ تا اوائل ۷۹۷ھ (۱۳۹۱ء تا ۱۳۹۴ء)

محمد پنجم غنی باللہ کے بعد اس کا بیٹا ابوالحجاج یوسف دوئم حکمران بنا۔ اس کے دور میں اس کے والد کا آزاد کردہ غلام خالد اُمورِ مملکت پر حاوی تھا۔ اس نے یوسف کے تین بھائیوں: سعد، محمد اور نصر کو جو قید خانے میں تھے، قتل کرا دیا اور اس کے بعد یوسف کو زہر دینے کے درپے ہوا۔ یوسف کو بھنک پڑ گئی اور اس نے خالد پر قابو پا کر اسے قتل کرا دیا۔

اس زمانے میں قسطلہ اور غرناطہ دونوں میں داخلی صورتحال اچھی نہ تھی۔ یوسف دوئم نے شاہِ قسطلہ ہنری سوئم سے جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا اور گزشتہ جنگوں میں قید کیے گئے نصرانی افسران اور سپاہیوں کو عزت واحترام کے ساتھ واپس قسطلہ بھیج دیا۔ یوں کچھ عرصے کے لیے ہر طرف امن وامان ہو گیا۔ بعد میں یہ صلح ٹوٹ گئی اور مسلمانوں نے نصرانیوں کے علاقوں: مُرسیہ اور لُورْقہ پر حملے کیے۔ جواب میں نصرانیوں کی ایک فوج غرناطہ کی چراگاہوں میں گھس آئی تاہم مسلمانوں نے اسے مار بھگایا۔ اس کے بعد فریقین نے دوبارہ جنگ بندی کر لی۔

یوسف دوئم نے دو سال چند ماہ کی حکومت کے بعد ۷۹۵ھ میں بیماری کے باعث وفات پائی۔ ①

⑫ محمد ہفتم، ابوعبداللہ مستعین باللہ

۷۹۷ھ تا ۸۱۱ھ (۱۳۹۴ء تا ۱۴۰۸ء)

یوسف دوئم وفات سے قبل اپنے بڑے بیٹے یوسف سوئم کو ولی عہد بنا چکا تھا مگر چھوٹا بیٹا محمد جو ضدی طبیعت کا تھا، یہ برداشت نہ کر سکا اور بغاوت پر تل گیا، اگرچہ وہ کامیاب نہ ہو سکا مگر باپ کی وفات کے بعد اس نے اپنی تیزی اور

① دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱۳۹/۵، ۱۵۰

ہوشیاری سے یوسف سوم کو راستے سے ہٹا کر جیل میں ڈال دیا اور خود تخت پر براجمان ہوگیا اور محمد ہفتم کہلایا اور مستعین باللہ کا لقب اختیار کر کے مسند نشین ہوا۔

اس کے ابتدائی دور میں ابوعبداللہ ابن زمرک اس کا وزیر مقرر رہا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے علامہ لسان الدین الخطیب رحمۃ اللہ کے خلاف سازشیں کی تھیں۔ مسندِ وزارت پر آ کر اس کی کارکردگی انتہائی ناقص رہی اور اس کا رویہ بھی دوسروں کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ آخر کار اُمرائے سلطنت اس کے خلاف ہوگئے۔ انہوں نے ۷۹۷ھ کے اواخر میں ابن زمرک کو اس کی حویلی میں قتل کر ڈالا۔ اس کی وزارت چند ماہ ہی رہ سکی۔

محمد ہفتم کے دور میں قسطالیہ کا حکمران ہنری ثالث تھا جو غرناطہ پر قبضے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔ محمد ہفتم اس کے عزائم سے واقف تھا اس لیے اپنا دفاع مضبوط رکھنے کے لیے چوکس رہتا تھا۔ ساتھ ہی اُس نے قسطالیہ سے صلح کی کوششیں کیں اور آخر فریقین میں ایک معاہدہ ہوگیا۔

مگر معاہدے کے کچھ عرصے بعد نصرانیوں نے سرحدی خلاف ورزی کی اور غرناطہ کے مضافات کو لوٹا۔ محمد ہفتم نے جواب میں مغربی اسپین کی طرف یلغار کی اور خاصے علاقے کو تاراج کرنے کے بعد قلعہ ایاموتی پر قابض ہوگیا اور بھاری مقدار میں مالِ غنیمت اور قیدیوں کے ساتھ واپس ہوا۔ قسطالیہ سے ان جنگوں کے دوران محمد ہفتم نے دوسری نصرانی ریاست ارغون سے تعلقات بنائے رکھے اور دو دشمنوں کو اپنے خلاف متحد نہ ہونے دیا۔

اسی زمانے میں محمد ہفتم نے شاہ تیونس اور شاہ تلمسان سے عسکری مدد طلب کی۔ ان کی جانب سے بحری بیڑہ بھیجا گیا مگر اُسے جبل الطارق کے قریب شکست اور پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کش مکش کے بعد ربیع الآخر ۸۰۹ھ (اکتوبر ۱۴۰۶ء) میں غرناطہ اور قسطالیہ میں دوبارہ جنگ بندی کا معاہدہ ہوگیا۔

اس زمانے میں بنومرین کا زوال شروع ہو چکا تھا اور وہ بمشکل اپنی حکومت کو باقی رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیز یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ بیرونی مددگار اہل اندلس کے ساتھ ایک حد سے زیادہ تعاون نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا اب اسلامیانِ اندلس کو اپنی قوت بازو، اپنے وسائل و ذرائع اور اپنی سیاسی حکمتِ عملی کے ذریعے ہی اپنا بچاؤ کرنا تھا۔

صلح نامے کے چند ہفتے بعد شاہ قسطالیہ ہنری سوئم مر گیا اور اس کا شیر خوار لڑکا جان دوئم (یوحنا) اس کا وارث بنا۔ اس کے چچا فرنانڈو نے امورِ سلطنت سنبھال کر عہد شکنی کی اور مسلمانوں سے جنگ چھیڑ کر محاذِ جنگ کو بہت پھیلا دیا۔ اس نے قلعہ ایاموتی واپس لے لیا اور آگے بڑھ کر قلعہ صخرہ اور قلعہ بانہ پر بھی قبضہ کر لیا۔

ایسے میں محمد ہفتم نے حریف کے اہم سرحدی شہر جیان پر دھاوا بول دیا۔ نصرانیوں کو بھی ہر طرف سے سمٹ کر جیان کے دفاع کے لیے آنا پڑا مگر مسلمان وہاں اپنے قدم گاڑ چکے تھے۔ مجبور ہو کر قسطالیہ نے صلح کر لی اور دو سال کے لیے جنگ بندی ہوگئی۔ محمد ہفتم اس مہم کے بعد واپس آ کر بیمار پڑ گیا اور ۸۱۱ھ (۱۴۰۸ء) میں وفات پا گیا۔[1]

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۵/۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲

⑭ یوسف سوئم، الناصر

۸۱۱ھ تا ۸۲۰ھ (۱۴۰۸ء تا ۱۴۱۷ء)

محمد ہفتم کے بعد اس کا بھائی یوسف سوئم جو ایک مدت سے قید خانے میں تھا، آزاد ہوگیا اور تخت نشین ہو کر الناصر کہلایا۔ وہ جنگ کا ماحول ختم کر کے ملک کو اندرونی طور پر مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے قسطالیہ سے جنگ بندی کی میعاد بڑھانے کی کوشش کی۔ شاہ قسطالیہ جان دوئم کے چچا فرنانڈو نے مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر صلح کے بدلے سالانہ خراج ادا کرنے کی شرط رکھ دی مگر الناصر نے خراج دینے سے انکار کر دیا جس پر قسطالیہ اور غرناطہ میں جنگ چھڑ گئی اور فرنانڈو نے لشکر لے کر مالقہ کے شمال مغرب میں واقع سرحدی قلعے "انتقیرہ" کو گھیر لیا۔

مسلمانوں نے قلعے کو چھڑانے کی سرتوڑ کوشش کی اور کھلے میدان میں نصرانیوں سے سخت جنگ لڑی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ۸۱۵ھ (۱۴۱۲ء) میں نصرانی اس قلعے پر قابض ہوگئے۔[1] اس کے بعد فریقین میں اس شرط پر صلح ہو گئی کہ مسلمان حالیہ جنگوں میں گرفتار ہونے والے سینکڑوں نصرانی سپاہیوں کو بغیر فدیہ لیے آزاد کر دیں گے۔

اس صلح کے بعد چند سال تک غرناطہ اور قسطالیہ میں بہت اچھے تعلقات رہے۔ دونوں اطراف سے وفود اور تاجروں کا آنا جانا بکثرت ہوگیا۔ خاص کر قسطالیہ کے نواب اور اُمراء، غرناطہ کا حسن جمال اور الحمراء کی دلکشی دیکھنے جوق در جوق وہاں آیا کرتے تھے۔ شہر کے بڑے میدانوں میں ان کے اعزاز میں تقاریب ہوتیں۔ گھڑ دوڑ، نیزہ بازی، تیراندازی اور شمشیر زنی جیسے حربی کھیلوں کے مقابلے ہوتے جنہیں دیکھنے غرناطہ کے عوام ٹوٹ پڑتے۔ اس زمانے میں وہاں مسلم خواتین میں پردے کا رواج کم ہوگیا تھا، اس لیے خواتین بھی بڑی تعداد میں کھلے چہروں کے ساتھ یہ کھیل دیکھنے آیا کرتی تھیں۔ تاہم نصرانیوں کے غرناطہ میں بکثرت آنے جانے کا ایک نقصان یہ ہوا کہ ان لوگوں نے یہاں افسران شاہی سے تعلقات بنا لیے اور مستقبل میں یہاں محلاتی سازشوں میں اپنی شرکت کی راہ ہموار کر لی۔

الناصر کے دور میں جبل الطارق کے باشندوں نے یہ سوچ کر کہ بنو مرین ان کے ملک کی بہتر حفاظت کر سکتے ہیں، اپنا علاقہ انہیں سونپنے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کی دعوت پر بنو مرین کے سربراہ ابوسعید نے اپنے بھائی ابوعبداللہ کو ایک لشکر دے کر وہاں بھیج دیا۔ تاہم یوسف سوئم نے فوراً وہاں اپنے نائب کو کمک بھیج کر اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ بنو مرین کو شکست ہوئی اور ابوعبداللہ گرفتار ہوگیا۔ یوسف سوئم نے اسے نہ صرف عزت و احترام کے ساتھ رہا کر دیا بلکہ اپنی طرف سے مال و زر اور لشکر بھی دیا تاکہ بنو مرین کے پایۂ تخت پر وہی قبضہ کر لے۔ ابوعبداللہ اس کوشش میں کامیاب رہا اور اُس نے اپنے بھائی ابوسعید پر غلبہ پا کر بنو مرین کی حکومت سنبھال لی۔

---

[1] ایک تاریخی روایت کے مطابق یہ سرحدی کشیدگی جاری تھی کہ قسطالیہ کے اصل حکمران جان نے جو بالغ ہو چکا تھا، اپنے چچا کو معزول کر کے امورِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیے اور اپنی ماں کے مشورے کے مطابق یوسف سوئم سے دو سال کے لیے صلح کر لی۔

یوسف سوم نے نو سال حکومت کی اور ۸۲۰ھ (۱۴۱۷ء) میں فوت ہوا۔ اس نے اندرونی طور پر ملک کو پُر امن اور خوشحال رکھا، اسی لیے مؤرخین اسے قابل تعریف حکمرانوں کی فہرست میں شامل کرتے ہیں۔ [1]

⑭ محمد ہشتم، ابوعبداللہ، الأیسر

۸۲۰ھ تا ۸۳۱ھ (۱۴۱۷ء تا ۱۴۲۸ء)

یوسف سوم کے بعد اس کا بیٹا محمد ہشتم ''الأیسر'' کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوگیا۔ [2] وہ سخت مزاج اور نا تجربہ کار تھا اور کاروبارِ مملکت میں دلچسپی نہ لیتا تھا۔ اس کا زیادہ تر دارومدار اپنے وزیر یوسف بن سراج پر تھا جو بڑا قابل اور مدبر انسان تھا۔ الأیسر کے دور میں حکومتی انتظامات یہی وزیر چلاتا رہا۔

الأیسر کی ناتجربہ کاری کے باعث غرناطہ کے بُرے دن شروع ہوگئے اور انتشار کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس سیاسی بحران کو تقویت دینے میں قسطالیہ کے حکام پوری طرح شریک تھا۔ بعض اُمراء اور افسران حکومتِ قسطالیہ سے رابطے میں رہتے تھے اور اس کے اشارے پر عمل کرتے تھے۔ ۸۳۱ھ (۱۴۲۸ء) میں قسطالیہ کی افواج غرناطہ کو کمزور پا کر اس کی سرحدوں میں گھس گئیں اور لوٹ مار شروع کردی۔ الأیسر اس خطرے کی گھڑی میں بھی بے حس و حرکت رہا۔ ریاست کے وفادار اُمراء یہ دیکھ کر غضب ناک ہوگئے اور انہوں نے بغاوت کردی۔ الأیسر فرار ہو کر تیونس چلا گیا اور اُمراء نے اس کی جگہ اس کے بیٹے محمد الصغیر کو تخت پر بٹھا دیا۔ الأیسر کی حکمرانی ساڑھے دس سال رہی۔ [3]

⑮ محمد نہم، الزغیر

۸۳۱ھ تا ۸۳۳ھ (۱۴۲۸ء تا ۱۴۳۰ء)

الأیسر کی جگہ اب محمد نہم کو تخت پر بٹھا دیا گیا جسے محمد الزغیر (الصغیر) کہا جاتا ہے۔ وہ ایک اچھا سپاہی تھا مگر اُمورِ سیاست سے نابلد تھا۔ اس لیے سیاسی بحران نہ صرف برقرار رہا بلکہ اتنا بڑھ گیا کہ اگلے سالوں میں ہر طالع آزما غرناطہ کے تخت کی حرص کرنے سے پہلے قسطالیہ کی سرپرستی حاصل کرنا ضروری سمجھنے لگا۔

اس زمانے میں دربارِ سلطانی پر بنو سراج چھائے ہوئے تھے جو الزغیر کے سخت مخالف تھے۔ الزغیر نے انہیں خوش اسلوبی سے حامی بنانے کی بجائے سختی سے دبانے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر اس خاندان کا رئیس یوسف بن سراج غرناطہ چھوڑ کر قسطالیہ کے بادشاہ جان دوئم سے جا ملا اور اسے ترغیب دی کہ محمد الأیسر کو جو تیونس میں پناہ گزیں ہے، دوبارہ شاہِ غرناطہ بنایا جائے۔ شاہِ قسطالیہ اس پر تیار ہوگیا۔ چنانچہ ابن سراج نے محمد الأیسر کو دعوت دی کہ وہ واپس

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۱۵۲، ۱۵۳

② بعض مؤرخین کے بقول اس نے غنشک کا لقب اختیار کیا تھا۔ ③ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۱۵۴، ۱۵۵

آکر اپنا تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔
محمد الایسر بہت خوش ہوا۔ اس نے امیر تیونس ابو فارس کو بھی اپنا حامی بنالیا اور اس سے امدادی فوج لے کر اندلس کی بندرگاہ المریہ پر اتر گیا۔ الزغیبر نے یہ خبر سن کر الایسر کے خلاف لشکر بھیجا مگر لشکر کے اکثر سپاہی الزغیبر سے بغاوت کرکے الایسر کے ساتھ مل گئے۔ الزغیبر کے وفاداروں کو شکست ہوئی اور ۸۳۳ھ میں محمد ہشتم نے غرناطہ پہنچ کر الزغیبر کو قتل کردیا۔ اس کی حکومت فقط دو برس چند ماہ رہی۔ [1]

محمد ہشتم ، الایسر۔ دوبارہ

(۸۳۳ھ تا ۸۳۵ھ (۱۴۳۰ء تا ۱۴۳۱ء)

محمد الایسر دوبارہ تخت نشین ہوا تو اس کی کوشش تھی کہ وہ خود مختار حکمران بھی رہے اور شاہ قسطالیہ سے جنگ کی نوبت نہ آئے مگر اسے تخت پر بٹھانے کے بعد شاہ قسطالیہ جان دوئم نے مطالبہ کیا کہ قسطالیہ نے اسے تخت دلوانے پر جو رقم خرچ کی ہے، وہ ادا کی جائے۔ جو بھی نصرانی قیدی غرناطہ میں ہیں، سب رہا کیے جائیں اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ غرناطہ اب باج گزار ریاست ہوگی، اس لیے سالانہ بھاری خراج ادا کرے، ورنہ جنگ کے لیے تیار رہے۔
الایسر دیکھ چکا تھا کہ اس وقت قسطالیہ اندرونی طور پر سیاسی بحران سے گزر رہا ہے، اس لیے وہ خراج دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ قسطالیہ بھی اس وقت فوج کشی کرنے کی حالت میں نہیں تھا مگر کچھ عرصے بعد قسطالیہ سیاسی بحران سے نکل گیا جس کے فوراً بعد شاہ قسطالیہ جان دوئم نے غرناطہ پر ایک بڑا حملہ کرنے کی تیاری کرلی۔ اس سے پہلے اس نے تیونس کے حکمران ابو فارس اور مراکش کے حکمران عبدالحق بن عثمان مرینی کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ دونوں غرناطہ اور قسطالیہ کی کش مکش میں دخل دینے کی کوشش نہ کریں۔ دونوں حکمرانوں نے اسے مان لیا۔
اب قسطالیہ اور غرناطہ میں معرکے شروع ہوگئے جن میں کبھی مسلمان غالب آتے کبھی نصرانی۔ جنگ جاری تھی کہ بنو نصر کے ایک عمر رسیدہ شہزادے یوسف ابن الاحمر نے موقع غنیمت جان کر البیرہ میں بغاوت کردی۔ وہ سلطان محمد بن یوسف بن غنی باللہ کا نواسا تھا۔ اس نے شاہ قسطالیہ کو پیغام بھیجا کہ اگر اسے غرناطہ کا حکمران بننے کا موقع دیا جائے تو وہ تمام نصرانی قیدی رہا کردے گا، قسطالیہ کو بیس ہزار دینار سالانہ خراج ادا کرتا رہے گا اور شاہ قسطالیہ کسی مسلم یا نصرانی ریاست کے خلاف مدد طلب کرے گا تو اسے ڈیڑھ ہزار سپاہیوں کی مدد دے گا۔ شاہ قسطالیہ کو اور کیا چاہیے تھا۔ اس جواب میں اس سے وعدہ کیا کہ اس کی وفاداری کے بدلے غرناطہ کی حکومت آئندہ ہمیشہ اس کے گھرانے میں رکھی جائے گی۔ الغرض ۵ محرم ۸۳۵ھ (۱۶ ستمبر ۱۴۳۱ء) کو شاہ قسطالیہ اور یوسف بن الاحمر کے مابین معاہدہ طے ہوگیا۔
اب یوسف ابن الاحمر محمد ہشتم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور شاہ قسطالیہ نے اسے فوجی مدد فراہم کردی۔ الایسر نے

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۱۵۳ تا ۱۵۶

اس بغاوت کو کچلنے کے لیے فوج بھیجی، یوں البیرہ اور غرناطہ کے مسلمان آپس میں لڑنے لگے۔ ان لڑائیوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تاہم ہزاروں مسلمان بے فائدہ کٹ گئے۔ شاہ قسطالیہ آرام سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر اس نے قرطبہ میں دربار منعقد کر کے یوسف ابن الاحمر کو غرناطہ سونپنے کا اعلان کیا اور پھر اسے فوجیں دے کر غرناطہ کی طرف بھیج دیا۔ ۸۳۹ھ میں غرناطہ کی سرکاری فوج اور باغی سپاہیوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں باغی فتح یاب ہوئے۔ الایسر لگ بھگ دو سال حکومت کرنے کے بعد غرناطہ کا سارا خزانہ سمیٹ کر مالقہ چلا گیا۔

۱۵ ربیع الآخر ۸۳۵ھ (یکم جنوری ۱۴۳۲ء) کو یوسف ابن الاحمر الحمراء میں داخل ہو کر تخت پر بیٹھ گیا۔[1]

⑯ یوسف چہارم، ابن الاحمر

ربیع الآخر تا شوال ۸۳۵ھ (جنوری تا جولائی ۱۴۳۲ء)

اب مسند غرناطہ پر یوسف ابن الاحمر براجمان ہو گیا جو یوسف چہارم کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس نے قسطالیہ کو اپنا سرپرست بنا کر اسے خراج ادا کرنا قبول کر لیا تھا۔ مگر وہ عمر رسیدہ اور بیمار تھا۔ فقط چھ ماہ حکومت کر کے فوت ہو گیا۔[2]

❋ محمد ہشتم، الایسر۔ تیسری بار

۸۳۵ھ تا ۸۴۶ھ (۱۴۳۲ء تا ۱۴۴۴ء)

الایسر اس وقت مالقہ پر حکومت کر رہا تھا۔ یوسف ابن الاحمر کی موت کے فوراً بعد امرائے غرناطہ محمد الایسر کو دوبارہ اپنا حکمران بنانے پر متفق ہو گئے۔ چنانچہ الایسر نے آکر تیسری بار غرناطہ کا تاج و تخت سنبھال لیا۔

اب وہ خاصا تجربہ کار ہو چکا تھا اور اُس قسطالیہ کی سازشوں کا خوب اندازہ بھی ہو گیا تھا۔ لہٰذا اُس نے غرناطہ کی خودمختاری کا دفاع کرتے ہوئے خراج دینے کا وعدہ مسترد کر دیا اور قسطالیہ سے ایک سالہ صلح کا از سر نو معاہدہ کیا۔

قسطالیہ نے یہ نیا معاہدہ موقع پانے کے لیے کیا تھا۔ چنانچہ اہل غرناطہ کو غافل سمجھ کر کچھ ہی دنوں بعد نصرانی لشکر ان کی مشرقی سرحدوں میں گھس آیا۔ مسلمانانِ غرناطہ نے اپنے وزیر ابن عبدالبر بن سراج کی قیادت میں ان کا مقابلہ کیا اور انہیں پسپائی پر مجبور کر دیا۔ ایک دوسری جنگ شہر "ارشذونہ" کے قریب ہوئی۔ یہاں بھی مسلمان غالب رہے اور نصرانیوں کے بکثرت سپاہی قتل اور گرفتار ہوئے۔ اس طرح غرناطہ کی ہیبت دوبارہ قائم ہونے لگی۔ یہ ۸۳۸ھ (۱۴۳۴ء) کے واقعات ہیں۔ ۸۳۹ھ (۱۴۳۵ء) میں الایسر خود لشکر لے کر نکلا اور غرناطہ کے مضافات اور وادی آش کے نواح سے نصرانیوں کو پسپا کیا۔ کچھ دنوں بعد نصرانیوں نے زیادہ تیاری کے ساتھ آکر بسطہ اور وادی آش کے آس پاس غارت گری کی اور کچھ قلعوں پر قابض ہو گئے۔

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱۵۷/۵ تا ۱۶۰ ② دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۱۹۰/۵، ۱۹۱

۸۴۰ھ (۱۴۳۶ء) میں نصرانیوں کا ایک بڑا لشکر جبل الطارق پر قبضے کے لیے پہنچ گیا۔ اسے فتح کرنا ان کی پرانی خواہش تھی کیوں کہ اس سے محرومی کی صورت میں مسلمانانِ اندلس کا بیرونی دُنیا سے رابطہ تقریباً منقطع ہو جاتا۔ تاہم مسلمانوں نے کمانڈار ابن سراج کی قیادت میں حملہ آوروں کا زبردست مقابلہ کیا اور انہیں شکستِ فاش دے دی۔ تاہم اسی جنگ میں کمانڈار ابن سراج شہید ہو گیا جو مسلمانانِ غرناطہ کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ الغرض اس زمانے میں فریقین میں جنگیں ہوتی رہیں۔ آخر سلطنتِ قسطالیہ شدید نقصانات اٹھانے کے بعد جنگ بندی پر راضی ہو گئی۔

الأیسر نے کچھ مدت بعد نصرانیوں کے گھناؤنے عزائم بھانپ کر سلطان مصر کے پاس سفارت روانہ کی تاکہ اسے مسلمانانِ اندلس کے مصائب سے آگاہ کر کے بھرپور عسکری مدد حاصل کی جائے۔ سلاطینِ اندلس کے مصر سے مدد طلب کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس سے قبل اندلس کے اُمراء ہمیشہ شمالی افریقہ کے سلاطین سے کمک طلب کرتے تھے۔ مگر اب افریقہ کی دولتِ بنو مرین جو ایک زمانے سے مسلمانانِ اندلس کی مدد کرتی آئی تھی، خود انحطاط اور انتشار کے مرحلے سے گزر رہی تھی، اسی لیے الأیسر نے مصر سے مدد طلب کی۔ یہ سفارت رجب ۸۴۴ھ میں مصر پہنچی۔ اس وقت مصر میں مملوک بادشاہ الملک الظاہر چقمق کی حکومت تھی جو ایک نیک سیرت اور طاقتور سلطان تھا[1] مگر اس نے طویل فاصلوں کے باعث عسکری مدد سے معذرت کر لی، البتہ مالی تعاون کا وعدہ کیا۔ بہرکیف مجموعی طور پر یہ سفارت بے نتیجہ رہی۔

الأیسر نصرانیوں کے مقابلے میں جتنا مضبوط ثابت ہوا، اندرونی سیاست میں وہ اسی قدر کمزور نکلا۔ اس وقت خود اُمرائے ریاستِ غرناطہ تین گروہوں میں بٹ گئے تھے: پہلا گروہ الأیسر کا حامی اور نصرانیوں سے لڑنے پر تیار تھا۔ دوسرا گروہ الأیسر کے چچازاد بھائی یوسف بن احمد کا حامی تھا جو ریاست قسطالیہ سے دوستی کا قائل تھا۔ اس یوسف بن احمد کو مغربی مآخذ میں عموماً ابن اسماعیل کہا جاتا ہے کیوں کہ اس کا نسب سلطان ابوالولید اسماعیل سے جا ملتا ہے۔ نیز اسی کو سعد بن اسماعیل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا گروہ قسطالیہ سے اچھے تعلقات میں ہی نجات سمجھتا تھا۔

تیسرا گروہ "الصغیر" کے امیر شہزادہ محمد احنف (محمد بن نصر بن غنی باللہ) کا تھا جس کے حامی اسی کو حکمران بنانا چاہتے تھے۔ آخر احنف اپنے گروہ کے کچھ چیدہ لوگوں کو لے کر خفیہ طور پر غرناطہ میں داخل ہو گیا۔ پہلے اس نے وہاں چپکے چپکے اپنے نئے حامی بنائے اور پھر ایک دن انہیں لے کر یکایک قصر الحمراء میں گھس گیا اور الأیسر کو گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا اور اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ یہ واقعہ ۸۳۶ھ (۱۴۳۲ء) کا ہے۔[2]

---

① ممالیک چراکسہ کے سلطان الملک الظاہر چقمق کی حکومت ۸۴۲ھ سے ۸۵۷ھ تک رہی۔ اسے ممالیک کے عظیم الشان حکمرانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ گناہوں سے اجتناب کرنے والا، پاک دامن اور پاک زبان انسان تھا۔ علماء اور درویشوں سے بڑی محبت کرتا تھا۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ ممالیک چراکسہ میں اس سے زیادہ شریف حکمران کوئی نہیں گزرا۔ (سمط النجوم العوالي: ۴/۴۹، ۵۰)

② دولة الإسلام في الأندلس: ۵/۱۶۱ تا ۱۶۳

⑰ محمد الاحنف بن نصر، محمد دہم

۸۳۶ھ تا ۸۳۹ھ (۱۴۳۲ء تا ۱۴۳۵ء)

محمد احنف کی حکومت کا آغاز ہی کمزوری کے ساتھ ہوا۔ اَلْاَبْتَـــر کا وزیر ابن عبدالبر اس وقت دارالحکومت کے شمال مغربی قلعے "مونت فریو" میں تھا۔ اس نے احنف کی جگہ اَلْاَبْتَـــر کے دوسرے بھتیجے سعد بن اسماعیل کی حکمرانی کی دعوت دینا شروع کر دی۔ سعد بن اسماعیل اس وقت قسطالیہ کے پایۂ تخت اشبیلیہ میں تھا اور وہاں کی حکومت بھی اسی کو غرناطہ کا حکمران دیکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ سعد بن اسماعیل نصرانی فوج کو ساتھ لے کر غرناطہ پہنچا اور احنف سے نبرد آزما ہو گیا۔ اس جنگ میں سعد بن اسماعیل کو فتح نصیب ہوئی اور اس نے قصر الحمراء پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔

محمد احنف کی حکومت تقریباً اڑھائی سال رہی۔[1]

⑱ سعد بن علی بن اسماعیل، یوسف پنجم، مستعین باللہ

۸۳۹ھ (اواخر ۱۴۳۵ء تا اوائل ۱۴۳۶ء)

سعد کے والد کا نام علی اور دادا کا نام اسماعیل تھا۔ دادا کی طرف نسبت کر کے اسے ابن اسماعیل کہا جاتا ہے اور چوں کہ اس کا اصل نام یوسف تھا، لہٰذا اُسے یوسف پنجم بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے مُسْتَعِین بِاللّٰہ کا لقب اختیار کیا۔ وہ فقط چند ماہ حکومت کر سکا۔ اس دوران قسطالیہ سے جنگ بندی رہی اور امن وامان قائم تھا۔ تاہم ابن اسماعیل کی نصرانیت نوازی کے باعث رائے عامہ اس کے خلاف ہو چکی تھی، اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر محمد احنف اپنے حامی اُمراء کی مدد سے شوال ۸۳۹ھ (اوائل ۱۴۳۶ء) میں دوبارہ غرناطہ کا حکمران بن گیا۔ ابن اسماعیل فرار ہو کر قلعۂ مونت فریو میں مورچہ بند ہو گیا اور کچھ علاقے پر حکومت قائم کر لی۔[2]

❁ محمد الاحنف بن نصر، محمد دہم، دوبارہ

۸۳۹ھ تا ۸۵۴ھ (۱۴۳۶ء تا ۱۴۵۰ء)

ابن اسماعیل کو غرناطہ سے نکالنے کے بعد احنف نے اس کے سرپرست نصرانیوں کو سزا دینے کی تیاری کی اور لشکر لے کر قسطالیہ کے سرحدی قلعوں: قلعۂ بنی موریل اور قلعۂ ابن سلامہ پر حملے کیے۔ ساتھ ہی ایک لشکر ابن اسماعیل سے لڑنے کے لیے بھی بھیج دیا۔ ابھی فریقین میں شدید کشمکش جاری تھی کہ نصرانی ریاستوں میں سیاسی اختلافات عروج پر پہنچ گئے جس کے نتیجے میں ارغون اور اربونہ کی نصرانی ریاستیں ۸۵۲ھ میں متحد ہو کر قسطالیہ پر حملہ آور ہو گئیں۔

---

① دولة الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۱۶۳ ② دولة الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۱۶۳، ۱۶۴؛ الاعلام للزرکلی: ۳/ ۸۶

نصرانیوں میں جنگ چھڑتے دیکھ کر محمد احنف نے بھی ارغون اور اربونہ سے تعلقات قائم کر لیے اور ایک معاہدے کے تحت قسطالیہ کے خلاف جنگ میں حصہ دار بن گیا۔ وہ مرسیہ کی جانب سے قسطالیہ کی طرف بڑھا اور حریف کو ''جنجالہ'' کے میدان میں شکستِ فاش دی اور ۸۵۴ھ (۱۴۵۰ء) میں بے پناہ مال غنیمت کے ساتھ واپس لوٹا۔

نصرانیوں کی اس باہمی جنگ کے دوران مسلمان متحد ہو جاتے تو قرطبہ اور اشبیلیہ بھی فتح کر سکتے تھے مگر افسوس کہ اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ چند ماہ بعد متحارب نصرانی ریاستوں میں جنگ بندی ہوگئی اور ان کا رخ دوبارہ مسلمانوں کی طرف ہو گیا۔ تاہم قسطالیہ نے براہ راست فوج کشی کرنے کی بجائے ابن اسماعیل کو فوجی مدد دے کر غرناطہ کی حکومت کا دعوے دار بنا دیا جو اس زمانے میں ''قلعہ مونتی فریو'' میں تھا۔ ابن اسماعیل کے لیے فضا اس لیے جلد سازگار ہوگئی کہ محمد احنف کی طبیعت میں جوش اور غصہ بہت زیادہ تھا جس کے باعث بہت سے اُمرائے غرناطہ اس سے دل ہی دل میں خائف اور ناراض تھے۔ چنانچہ ان کی ہمدردیاں ابن اسماعیل کے ساتھ ہوگئیں۔

آخر ابن اسماعیل اور احنف اپنی اپنی جمعیت لے کر مدِ مقابل آگئے۔ غرناطہ کے باہر دونوں میں شدید جنگ ہوئی جس میں ابن اسماعیل غالب آیا اور محمد احنف کو فرار ہونا پڑا۔ ابن اسماعیل غرناطہ میں داخل ہو کر تخت پر براجمان ہو گیا۔

محمد احنف کی دوسری بار حکومت تقریباً سات سال تک رہی۔[1]

❁ ابن اسماعیل، یوسف پنجم، مستعین باللہ

دوبارہ: ۸۵۴ھ تا ۸۷۰ھ (۱۴۵۰ء تا ۱۴۶۴ء)

ابن اسماعیل کو دوبارہ اقتدار سنبھالنے کا موقع ملا تو اس نے جم کر سولہ سال حکومت کی اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ مؤرخین کے مطابق وہ ایک عادل، نیک سیرت، دلیر، عقل مند اور ہوشیار حکمران ثابت ہوا۔ اُس نے اپنی قلمرو میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے عمدہ انتظامات کیے، بہت سے نئے قلعے تعمیر کرائے اور سرحدوں کی حفاظت کا بہترین بندوبست کیا۔ وہ ایک اچھا شہ سوار تھا اور نیزہ بازی اور گھڑ سواری کے مقابلوں میں بذاتِ خود حصہ لیتا تھا۔

اس نے تخت نشینی کے بعد شاہِ قسطالیہ جان دوئم کو پیغام بھیج کر سرحدوں کے احترام کا معاہدہ کیا مگر چند ماہ بعد شاہِ قسطالیہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے جانشین ہنری چہارم نے سعد ابن اسماعیل کو باج گزاری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ ابن اسماعیل نے صاف انکار کر دیا اور کچھ فوج بھیج کر قسطالیہ کی سرحدوں پر انتہائی حملے کر کے اپنی طاقت کا اظہار کیا۔

ہنری چہارم نے دوبارہ اصرار کیا کہ غرناطہ قسطالیہ کی بالادستی قبول کر لے، ورنہ انجام اچھا نہ ہوگا۔ جب مثبت جواب نہ آیا تو وہ ایک بڑا لشکر لے کر غرناطہ کے مضافات کو تاراج کرنے لگا۔ اس غارت گری میں بہت سے دیہات تباہ ہوئے اور بکثرت مسلمان مرد وزن قیدی بن گئے۔ اس دوران مسلمانانِ غرناطہ چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں

---

[1] دولة الاسلام في الاندلس: ۵/ ۱۶۳، ۱۶۴

اس لشکر کے ارد گرد پہنچ گئے۔ ان کے تابڑ توڑ حملوں سے لشکرِ نصاریٰ کو شدید نقصانات پہنچے۔

اگلے برس قسطالیہ نے اسی طرح دوبارہ حملہ کیا جس کے جواب میں مسلمانوں نے "جیان" کے قریب نصرانیوں کو سخت نقصانات پہنچائے۔ اگلے برسوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ کبھی مسلمان غالب آتے اور کبھی نصرانی مگر مجموعی طور پر نصرانیوں کا پلہ قدرے بھاری رہا کیوں کہ ان سالوں میں وہ چند قلعوں پر قابض ہونے میں کامیاب رہے جبکہ بعض قلعے جنگ بندی کی شرائط کے تحت نصرانیوں کے حوالے کر دیے گئے۔

ابن اسماعیل کے دور کا سب سے بڑا واقعہ اور عظیم ترین سانحہ جبل الطارق کا سقوط ہے۔ قسطالیہ کا لشکر ۸۶۷ھ (۱۴۶۲ء) میں اچانک حملے کے ذریعے یہاں قابض ہونے میں کامیاب رہا۔ غرناطہ کے مسلمانوں کو موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ اس محاذ پر پہنچ کر دشمن کو روکنے کی کوشش کرتے۔ جبل الطارق کے ہاتھ سے نکل جانے سے مراکش سے غرناطہ کی کمک کا ایک اہم راستہ بند ہوگیا۔

۸۶۹ھ میں مراکش سے بنومرین کی حکومت ختم ہوگئی جو دو صدیوں سے مسلمانانِ اندلس کی فوجی مدد کرتی آرہی تھی۔ اس طرح غرناطہ اپنے بیرونی مددگاروں سے محروم ہوگیا۔

۸۷۰ھ میں سعد بن اسماعیل کی وفات ہوگئی۔ اس وقت قسطالیہ سے کشیدگی عروج پر تھی اور وقفے وقفے سے فریقین میں جنگیں جاری تھی۔ ان جنگوں میں سعد بن اسماعیل کے ولی عہد ابوالحسن علی نے دلیرانہ کارنامے دکھا کر بڑی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔[1]

◆◆◆

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۱۶۴، ۱۶۵

تاریخِ اندلس کا آخری الم ناک باب

اب ہم اندلس کی تاریخ کا آخری باب کھول رہے ہیں جس کی ایک ایک سطر عبرت ناک ہے اور جس کا ایک ایک لفظ ثابت کرتا ہے کہ جس قوم میں یک جہتی مفقود ہو، وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتی۔ تاریخ اندلس کا یہ آخری باب سلطان ابوالحسن علی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے جو بنو نصر کا انیسواں حکمران تھا۔

⑲ سلطان ابوالحسن علی، الغالب باللہ

۸۷۰ھ تا ۸۹۰ھ (۱۴۶۴ تا ۱۴۸۵ء)

سلطان ابوالحسن علی غرناطہ کا آخری حکمران تھا جس میں آزادی اور غیرت وحمیت کی رمق باقی تھی۔ اپنی ولی عہدی کے زمانے میں اس نے سپاہیانہ کارناموں سے قوم کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۳۰ سال تھی۔ اس نے ''الغالب باللہ'' کا لقب اختیار کیا۔ اس زمانے میں قسطالیہ اور غرناطہ میں کشیدگی جاری تھی اور سرحدی جھڑپیں ہو رہی تھیں، سلطان ابوالحسن علی پوری مستعدی سے سرحدوں کا دفاع کرتا رہا۔

وہ ملک وقوم کے لیے مخلص ہونے کے باوجود، ایک مدت تک شرعی احکام کے بارے میں آزاد روش رکھتا تھا اور دین داری کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتا تھا۔ اس دوران اسے اپنے بھائی محمد الزغل کی شورش سے بھی سابقہ پڑا، جو مالقہ کا امیر اور بڑا نامور سپاہی تھا۔ بھائیوں کے اختلاف کے باعث کئی سال تک یہ چھوٹی سی مملکت دو ٹکڑوں میں بٹی رہی۔ اس دوران قسطالیہ میں ہنری چہارم کی حکومت تھی جو اپنے اندرونی تنازعات کی وجہ سے ان دونوں بھائیوں کے اختلاف سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکا۔

ابوالحسن کو جب کئی سال تک اسی قسم کی اندرونی بغاوتوں سے سابقہ پڑتا رہا تو اس نے اپنی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ اس نے غرناطہ کے لوگوں کے سامنے علانیہ توبہ کی اور وعدہ کیا کہ وہ شریعت کے نفاذ اور سرحدوں کی حفاظت میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔ چونکہ طبیعت کے لحاظ سے وہ ایک کھرا آدمی تھا، اس لیے اہل غرناطہ اس پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے مخالفین سے کنارہ کش ہو گئے۔ الزغل نے بھی صلح کر لی اور شورشوں کا خاتمہ ہو گیا۔ سلطان ابوالحسن علی نے وعدہ نبھاتے ہوئے متقیانہ اور مجاہدانہ زندگی اپنائی اور اس کی حکومت مضبوط ہو گئی۔ سلطان ابوالحسن علی کی طاقت

دیکھتے ہوئے قسطالیہ نے بھی جنگ بندی کا معاہدہ کرلیا اور ہر طرف امن وامان ہوگیا۔[1]

خوفناک سیلاب:

۸۸۲ھ کی عید الاضحی کے بعد سلطان ابوالحسن علی نے غرناطہ کے باہر ایک کھلی وادی میں عسکری نمائش منعقد کی تاکہ اپنے اور پرائے سب غرناطہ کی فوجی طاقت دیکھ کر مرعوب رہیں۔ ۱۹ ذوالحجہ کو یہ نمائش شروع ہوئی اور تقریباً ایک ماہ تک جاری رہی۔ علامہ مقری (صاحب نفح الطیب) کے بیان کے مطابق اس تقریب میں کھلم کھلا فسق وفجور کے مظاہرے بھی ہورہے تھے۔ غرناطہ کے مرد وزن اور بچے گروہ درگروہ یہ میلہ دیکھنے آتے رہے اور اپنی فوج کے حربی کرتبوں اور دیگر کھیل تماشوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ ۲۲ محرم ۸۸۳ھ کو نمائش کا آخری دن تھا کہ اچانک خوفناک گھن گرج کے ساتھ سیاہ بادل امنڈ آئے اور ایسی موسلا دھار بارش شروع ہوئی کہ آن کی آن میں پوری وادی زیر آب آگئی۔ سپاہیوں اور تماش بینوں نے بمشکل ادھر اُدھر بھاگ کر جان بچائی اور پھر اپنے گھروں کا رُخ کیا۔ بارش رُکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ غرناطہ شہر کی گلیاں، سڑکیں اور گرد ونواح کی تمام وادیاں جھیل کا منظر پیش کررہی تھیں۔ غرناطہ کی نہروں کے کنارے لگے دیودار، اخروٹ اور پستے کے تناآور درخت اکھڑ اکھڑ کے سیلاب میں بہہ گئے۔ درختوں کے یہ ڈھیر نہروں کے پلوں سے ٹکرا کر بند کی صورت اختیار کرگئے اور پانی انہیں ساتھ لے کر دائیں بائیں راستے بناتا ہوا دکانوں، مکانوں، مسجدوں اور قہوہ خانوں میں گھس گیا۔ بڑے بڑے تنوں کے ٹکرانے سے درجنوں عالی شان عمارتیں زمین بوس ہوگئیں اور کئی پل تباہ ہوگئے۔ جامع مسجد تک محفوظ نہ رہی۔ اہل نظر اس سیلاب کو اللہ کی طرف سے کسی ناگہانی خطرے کی تنبیہ شمار کررہے تھے۔[2]

حکام کی بے فکری:

مگر دوسری طرف عجیب بات یہ ہوئی کہ سلطان ابوالحسن علی جو کچھ مدت پہلے متقی وپرہیزگار ہوگیا تھا، اس آفتِ ناگہانی کے بعد یکدم بدل گیا اور عیش وعشرت میں منہمک ہوگیا۔ علامہ مقری رحمہ اللہ کے مطابق اُسے نصرانی شہزادوں کی باہمی خانہ جنگی سے یہ دھوکہ ہوگیا تھا کہ وہ ہمیشہ لڑتے رہیں گے لہٰذا مسلمان اب بے فکری سے زندگی گزار سکتے ہیں۔

---

① نبذۃ العصر فی اخوال ملوک بنی نصر: ص ۳۰ تا ۳۳، ط دار احسان دمشق ؛ نفح الطیب: ۴/ ۵۱۱، ۵۱۲ ؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۱۹۸، ۱۹۹ ؛ الاعلام للزرکلی: ۴/ ۲۹۰
یاد رہے کہ تاریخ غرناطہ کے اس آخری باب کا اکثر احوال کا اسلامی ماخذ "نبذۃ العصر" نامی ایک تاریخی نوشتہ ہے جو غرناطہ کے سقوط کے بعد کسی مسلمان عالم نے تحریر کیا تھا۔ اس دور میں اندلس کے محکوم مسلمانوں کے لیے جینا دوبھر ہوچکا تھا اس لیے وہ عالم کتاب کو اپنے نام سے موسوم نہ کرسکے اس لیے کوئی نہیں جانتا کہ یہ کس کی تصنیف ہے۔ اندازہ ہے کہ مصنف غرناطہ کے کوئی اہم عالم تھے جو دربار اور سیاسی شخصیات کی مصروفیات سے بخوبی واقف تھے۔

② نبذۃ العصر فی اخوال ملوک بنی نصر: ص ۳۳ تا ۳۵ ؛ نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی ۴/ ۵۱۱، ۵۱۲ ؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۱۹۸، ۱۹۹

اُس کا زیادہ وقت گلوکاراؤں کی محفلوں میں گزرنے لگا۔ اُس نے فوج کے بجٹ میں کمی کر دی اور بہت سے بہترین دستوں کو فارغ کر دیا۔ عوام اور تاجروں پر نئے ٹیکس عائد کر دیے جس کے باعث لوگ تنگ آ گئے اور تجارتی سرگرمیوں میں مندی آتی گئی۔ الغرض یہاں سے ابوالحسن علی کی حکومت تیزی سے زوال کی جانب جانے لگی۔ ①

ابوالقاسم کی وزارت:

مزید یہ کہ خود کو بے فکر رکھنے کے لیے سلطان ابوالحسن نے تمام امورِ سلطنت اپنے وزیر ابوالقاسم بن رضوان کے حوالے کر دیے جو بظاہر سلطنت کا انتہائی وفادار مگر اندرون خانہ بے حد عیار تھا۔ اس کا دادا نصرانی تھا جو ایک جنگ میں قیدی بن کر غرناطہ آیا تھا۔ اس کی اولاد اپنی قابلیت کی وجہ سے غرناطہ کی وزارت تک پہنچ گئی تھی۔ ②

ابوالحسن اور بیگمات:

ابوالحسن سرکاری ذمہ داریوں سے یکسو ہو کر سیر و آرام اور تفریح میں منہمک ہو گیا۔ اس کا زیادہ وقت اپنی حرم سرا میں بیگمات اور باندیوں کے ساتھ گزرنے لگا۔ اس کی ایک بیوی عرب تھی اور دوسری یورپی نومسلم۔ عرب بیوی کا نام عائشہ تھا جو اس کی چچازاد بھی تھی۔ اس سے دو بیٹے: ابوعبداللہ محمد اور یوسف تھے۔ ملکہ عائشہ بڑی بہادر اور غیور خاتون تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سلطنت کا ولی عہد اسی کا کوئی بیٹا ہو مگر یورپی سوکن اس کی خطرناک مدمقابل بن کر راستے میں آ گئی۔

یورپی ملکہ کا اصل نام ''زریدہ'' تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد وہ ثریا کہلائی۔ وہ اپنے حسن و جمال کی وجہ سے سلطان پر غیر معمولی حد تک اثر انداز ہو چکی تھی۔ اس کے بھی دو بیٹے تھے۔ سلطان ابوالحسن نے اس کی خوشنودی کے لیے ملکہ عائشہ اور اس کے بیٹوں سے بے اعتنائی برتنا شروع کر دی تھی۔ اس صورتحال سے سلطان کے رشتہ داروں، محل کے خدام اور امرائے فوج میں دو گروہ بن گئے۔ کچھ لوگ سلطان کی عرب بیوی کو زیادہ قابلِ عزت سمجھتے تھے اور اسی کی اولاد کو سلطنت کا وارث دیکھنا چاہتے تھے۔ دوسرا گروہ سلطان کی خواہش کو ترجیح دیتے ہوئے ثریا اور اس کے بیٹوں کا حامی تھا۔ ابوالحسن علی سخت مزاج تھا۔ اس نے محل کی اس فضا سے نالاں ہو کر ملکہ عائشہ اور اس کے دونوں بیٹوں: ابوعبداللہ محمد اور یوسف کو شاہی محل کے ایک الگ برج میں نظر بند کر دیا اور ان کی آمد و رفت پر کڑا پہرہ لگا دیا۔ ایسے میں ملکہ عائشہ کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں ابوالحسن یورپی بیوی کے کہنے پر انہیں قتل ہی نہ کرا دے۔ ③

وزیر ابوالقاسم کی بدعنوانیاں:

اس دوران وزیر ابوالقاسم نے عوام پر ٹیکس بڑھا کر انہیں بدحال کر دیا۔ ٹیکسوں کی رقم دفاعی یا ترقیاتی کاموں کی بجائے اپنی مرضی سے اڑا دی جاتی تھی۔ سپاہیوں کو بروقت تنخواہیں ملنا مشکل ہو گئیں۔ وہ اپنا اسلحہ بیچ کر گزر بسر کرنے لگے۔ آخر دفاعی اخراجات میں مزید کمی کے لیے فوج کا ایک حصہ معطل کر دیا گیا۔ لوگوں نے ان حالات پر احتجاج

---

① نبذۃ العصر: ص ۳۵، نفح الطیب: ۴/ ۵۱۲ ② نبذۃ العصر: ص ۳۹ تا ۴۹؛ نفح الطیب: ۴/ ۵۱۲

③ نبذۃ العصر: ص ۵۰۔ نفح الطیب: ۴/ ۵۱۲، ۵۱۳؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۱۹۹ تا ۲۰۰

کرتے ہوئے وزیر ابوالقاسم کی معزولی کا مطالبہ شروع کیا مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ①

فرڈی ننڈ پنجم اور ازابیلا:

اندلس میں ان پرآشوب حالات کے دوران مشرق کی سلطنتِ عثمانیہ اپنے دورِ عروج سے گزر رہی تھی۔ ۸۵۷ھ (۱۴۵۳ء) میں سلطان محمد خان فاتح نے قسطنطنیہ فتح کر کے پورے یورپ کو ہلا ڈالا تھا۔ ایسے میں اسپین کے نصرانیوں میں مسلمانوں سے بدلہ لینے کا جذبہ تیز تر ہو گیا۔ انہیں یہ موقع بہت جلد اس طرح مل گیا کہ ۸۷۳ھ میں قسطالیہ کے نوجوان بادشاہ فرڈی ننڈ پنجم کی شادی، ارغون کی شہزادی ازابیلا کے ساتھ ہو گئی۔ دونوں انتہائی عیار و مکار اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ وہ مسلمانانِ اندلس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ ②

ابوالحسن علی کا خراج دینے سے انکار...... ارغون اور قسطالیہ کا انضمام:

۸۸۰ھ میں فرڈی ننڈ پنجم نے ابوالحسن کو پیغام بھیجا کہ اگر تم صلح کے خواہاں ہو تو ہمیں خراج دینا منظور کر لو۔ سلطان ابوالحسن علی نے جواب میں یہ تاریخی جملہ کہلوایا:

”خراج ادا کرنے والے حکمران مر چکے ہیں۔ غرناطہ کی ٹکسال میں اب سکے نہیں، تلواریں تیار کی جاتی ہیں۔“ ③

فرڈی ننڈ پنجم یہ جواب سن کر گم صم رہ گیا اور چند سالوں تک اسے کچھ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس دوران وہ اپنی ملکہ ازابیلا سے غرناطہ کی تسخیر کے لیے مشورے کرتا رہا، آخر دونوں میں یہ طے پایا کہ اپنی قوت کو منظم اور مستحکم کرنے کی خاطر ریاست ارغون اور قسطالیہ کا انضمام کر لیا جائے۔ یوں ۸۸۴ھ میں نصرانیوں کی ایک بہت بڑی متحدہ طاقت وجود میں آگئی جو لگ بھگ سوا لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی جبکہ مملکتِ غرناطہ کا رقبہ سمٹ کر اس وقت کوئی چار ہزار مربع میل رہ گیا تھا۔ ④

اعلانِ جہاد، اَلصَّخْرَہ کی فتح:

نصرانیوں کی اتنی بڑی طاقت کا ظہور مسلمانانِ اندلس کے خاتمے کی علامت تھا۔ ایسے میں علماء، صلحاء اور مجاہدین کے کہنے پر سلطان ابوالحسن نے جہاد کا اعلان کیا اور ۸۸۶ھ میں خود پیش قدمی کر کے دریائے وادی الکبیر کے کنارے واقع نصرانیوں کا مستحکم سرحدی قلعہ اَلصَّخْرَہ فتح کر لیا جسے فرڈی ننڈ پنجم کے دادا نے مسلمانوں سے چھینا تھا۔ فرڈی ننڈ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا اور اس کی بجائے دونوں مملکتوں میں عارضی صلح ہو گئی۔ ⑤

الحمہ کی جنگ:

سلطان ابوالحسن اپنی حکومت کے پائے مضبوط شمار کر رہا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ نصرانی صلح کے باوجود موقع کی

---

① نبذة العصر في أحوال ملوك بني نصر: ص ۵۱؛ نفح الطيب: ۵۱۲/۳
② التاريخ الأندلسي من الفتح الإسلامي إلى سقوط غرناطة، لعبد الرحمن علي: ص ۵۳۸ تا ۵۵۰
③ لین پول، مورس ان اسپین: ص ۱۳۹
④ التاريخ الأندلسي من الفتح الإسلامي إلى سقوط غرناطة، لعبد الرحمن علي: ص ۵۳۸ تا ۵۵۰
⑤ مورس ان اسپین از لین پول: ص ۱۳۹

تاک میں ہیں۔ ۱۸ محرم ۸۸۷ھ کو قسطالیہ سے جنگ بندی کی معیاد پوری ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی قسطالیہ کے دس ہزار سپاہی راتوں رات غرناطہ کے سرحدی شہر الحمہ پر حملہ آور ہو گئے۔ قلعے کے مٹھی بھر سپاہی کوئی مزاحمت نہ کر سکے اور نصرانیوں نے شہر پر قبضہ کر کے عورتوں اور بچوں کو بے دریغ قتل کیا اور قیدی بنالیا۔ یہ ۱۹ محرم ۸۸۷ھ کا واقعہ ہے۔

اس وقت غرناطہ اور گرد و نواح کے مسلمانوں میں اپنی مدد آپ کے تحت جہاد کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا۔ غرناطہ کے کئی علماء، عمائد اور امراء ان کے ہم نوا تھے۔ وہ سلطان ابوالحسن کے وزیر ابوالقاسم سے ملے اور فوری طور پر جوابی حملے کا مطالبہ کیا۔ وزیر نے انہیں بہلانے اور یقین دلانے کی کوشش کی کہ اب جوابی کارروائی بے سود ہے مگر عوام کے وفد نے کہا: ''یا تو ہم لڑتے لڑتے مرجائیں گے یا اپنے بھائی بہنوں کو چھڑائیں گے۔''

آخر رضا کاروں کا ایک دستہ تیار ہو کر الحمہ پہنچا۔ دیکھا کہ نصرانی مسلمانوں کو قیدی بنا کر قسطالیہ روانہ ہو رہے ہیں اور ان کے بار برداری کے جانور مال غنیمت کے وزن سے بوجھل ہیں۔ مسلمانوں کو آتا دیکھ کر نصرانیوں نے مال واسباب اور قیدیوں کو وہیں چھوڑا اور تیزی سے قلعے میں گھس گئے۔ مجاہدین نے پوری قوت سے شہر پر حملہ کیا، شام تک جنگ ہوتی رہی۔ مجاہدین نے شہر کا دروازہ شکستہ کر دیا اور فصیل پر چڑھ گئے۔ قریب تھا کہ وہ فصیل سر کر لیتے کہ ابوالقاسم کی طرف سے مہم کو ادھورا چھوڑ کر واپسی کی ہدایت آگئی۔ اہل غرناطہ نے انکار کرتے ہوئے کہا: ''ہم قلعہ فتح کر کے دم لیں گے۔'' ابوالقاسم نے کہلوایا: ''آج شب آرام کر لیا جائے، صبح قلعہ فتح ہو جائے گا۔''

مگر صبح تک نصرانیوں نے فصیل کے ٹوٹے پھوٹے حصوں کی مرمت کر لی اور پہلے سے زیادہ مستعد ہو گئے۔ مجاہدین نے بھی ہمت نہ ہاری اور قلعے پر حملے جاری رکھے تاہم وہ حکومت سے نالاں تھے جس نے ابھی تک اس جنگ میں کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔ مجاہدین کے یہ تیور، ابوالقاسم سے پوشیدہ نہ تھے۔ اسے خطرہ ہوا کہ اگر اس اجتماع نے غرناطہ کا رُخ کر کے حکومت تبدیل کرنے کی کوشش شروع کر دی تو مقابلہ بہت مشکل ہوگا۔ اس نے اپنے کارندوں کے ذریعے یہ افواہ پھیلا دی کہ شاہ قسطالیہ بہت بڑا لشکر لے کر الحمہ پہنچ رہا ہے۔ اس خبر سے مجاہدین کی ہمت ٹوٹ گئی جن کے پاس طویل محاصرے کا ساز و سامان بالکل نہ تھا۔ وہ الحمہ کا محاصرہ چھوڑ کر اپنے اپنے علاقوں کی طرف لوٹ گئے۔

سلطان ابوالحسن بہر حال دفاعِ ملک و ملت کے لیے مخلص تھا۔ الحمہ پر نصرانیوں کے قبضے نے اسے جھنجوڑ دیا اور اس نے ایک فوج تیار کر کے وہاں بھیج دی جس نے نصرانیوں پر اچانک شب خون مارنے کی کوشش کی مگر اس وقت تک وہاں نصرانی قدم بڑی مضبوطی سے جما چکے تھے اور پوری طرح چوکنا تھے، اس لیے یہ مہم بھی ناکام رہی۔ اس حملے میں شامل وادی آش اور بسطہ کے اکثر مجاہدین شہید ہو گئے۔[1]

لوشہ کا محاذ:

غرناطہ کی کمزوری بھانپ کر فرڈیننڈ پنجم نے ایک لشکرِ جرار تیار کیا اور خود اس کی کمان کرتا ہوا، غرناطہ کے سرحدی

---

[1] نبذة العصر في احوال ملوك بني نصر: ص ۵۵؛ نفح الطيب: ۵۱۳/۴

شہر لوشہ پہنچ گیا۔ یہی شہر علامہ لسان الدین ابن الخطیب رحمہ اللہ کی جائے پیدائش تھا۔ اس وقت یہاں شیخ علی العطار رحمہ اللہ مجاہدین کے سربراہ تھے جن کی عمر ۸۰ برس ہو چکی تھی۔ نصرانیوں کی پیش قدمی کی خبر سن کر اندلس صغریٰ کے ہزاروں مجاہدین اپنے گھروں سے نکل کر لوشہ کے دفاع کے لیے شیخ علی العطار رحمہ اللہ کے پرچم تلے جمع ہو چکے تھے۔ انہوں نے نہایت بے جگری سے نصرانیوں کا مقابلہ کیا اور انہیں آگے نہ بڑھنے دیا۔

اس دوران سلطان ابوالحسن علی گھڑسوار لے کر لوشہ کے مجاہدین کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ کمک ملنے سے مجاہدین کا حوصلہ بہت بڑھ گیا اور انہوں نے ۲۷ جمادی الاولیٰ ۸۸۷ھ کو لوشہ کے میدان میں نصرانیوں کو ایسی عبرت ناک شکست دی کہ وہ ہزاروں لاشیں اور تمام ساز و سامان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔[1]

ابوعبداللہ محمد کی بغاوت:

اس فتح کی خوشخبری جونہی غرناطہ پہنچی وہاں مسرت کا سماں ہو گیا مگر شاہی محل کے برج میں نظر بند شہزادہ ابوعبداللہ محمد کا مزاج بگڑ گیا۔ حاشیہ برداروں نے اسے باپ کا سخت مخالف بنا رکھا تھا اور ساتھ ہی اسے یہ بھی یقین دلا دیا تھا کہ سلطان ابوالحسن بہت جلد اپنی یورپی بیوی ثریا کے اشارے پر اسے قتل کرا سکتا ہے۔ یہ دوست نما دشمن شہزادے کو مشورہ دے رہے تھے کہ باپ کی پکڑ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہونے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں بغاوت کر کے تاج و تخت پر قبضہ کر لیا جائے۔ چونکہ شاہی محل میں شہزادہ ابوعبداللہ محمد اور اس کا بھائی یوسف پہلے ہی پہرے میں تھے، اس لیے وہ راتوں رات برج سے فرار ہوئے اور وادیٔ آش میں اپنے حامیوں کے پاس پہنچ کر بغاوت کر دی۔ ابوعبداللہ محمد نے جس کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی، اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔[2]

مالقہ میں نصرانیوں کو شکست:

لوشہ کے فاتحین کو یہ اطلاع ملی تو ان پر بجلی گر پڑی اور فتح کی خوشی خاک میں مل گئی۔ سلطان ابوالحسن علی نے صدمے سے بوجھل ہو کر مالقہ کا رخ کیا اور وہاں اپنے بھائی الزغل کے ہاں پناہ لی۔

اب چھوٹی سی مملکتِ غرناطہ دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی: غرناطہ، وادی آش، المریّہ اور جنوب مشرقی شہروں کا بادشاہ ابوعبداللہ تھا جبکہ مالقہ، بلش اور جنوب مغرب کے کچھ قلعوں پر سلطان ابوالحسن علی کی حکومت تھی۔

فرڈی نینڈ پنجم کو اصل خطرہ ابوالحسن علی سے تھا، لہٰذا اسے ٹھکانے لگانے کے لیے صفر ۸۸۸ھ میں قسطالیہ کی افواج دو سمتوں سے مالقہ کی طرف بڑھنے لگیں۔ ابوالحسن علی اس وقت "المُنَکَّب"[3] منتقل ہو چکا تھا اور مالقہ میں اس کا بھائی

---

① نبذة العصر: ص ۵۵ تا ۶۰؛ نفح الطیب: ۳/ ۵۱۳؛ التاریخ الأندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص ۵۵۱، ۵۵۲۔ شیخ علی العطار کی تلوار آج بھی میڈرڈ کے عسکری عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

② نبذة العصر فی اخبار ملوک بنی نصر: ص ۶۰ تا ۶۲؛ دولة الاسلام فی الاندلس لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۰۲، ۲۰۳

③ یہ غرناطے سے چالیس میل دور ضلع البیرہ میں ایک ساحلی قلعہ بند قصبہ تھا۔

محمد الزغل موجود تھا۔ اس کی کمان میں مجاہدین اور سرکاری فوج نے بلش کی سمت سے آنے والے نصرانیوں پر گھاٹیوں اور وادیوں میں چھاپہ مار حملے شروع کیے۔ آخر کار نصرانی قدم قدم پر لاشیں چھوڑتے ہوئے واپس بھاگے۔ دوسری سمت سے یلغار کرنے والے لشکر کو الزغل نے بُری طرح شکست دی۔ تین ہزار نصرانی قتل ہوئے جبکہ دو ہزار افسران اور سپاہی گرفتار کر لیے۔ یہ گیارہ صفر ۸۸۸ھ کا واقعہ ہے۔

یہ اللہ کی خاص نصرت و رحمت تھی کہ اتنی کمزور حالت میں بھی مسلمان، قسطالیہ کی افواج کو شکستیں دے رہے تھے۔ مگر ان فتوحات کے بعد جب مال غنیمت کی تقسیم کا مرحلہ آیا تو شرعی حکم کی مخالفت کی گئی۔ شرعاً مال غنیمت کے چار حصے جنگ کے شرکاء میں تقسیم ہوتے ہیں اور پانچواں حصہ سرکاری خزانے میں جاتا ہے۔ مگر حکومت نے جنگ میں شریک سپاہیوں اور مجاہدین کو کچھ بھی نہ دیا اور سارا مال بحق سرکار ضبط کر لیا۔ اس سے بڑی بددلی پھیلی اور عام تاثر یہ بن گیا کہ حکام کا مقصد لوگوں کو لڑا کر اپنے خزانے بھرنے کے سوا کچھ نہیں۔[1]

ابوعبداللہ محمد کی گرفتاری اور معزولی:

ابوعبداللہ محمد میں بھی سپاہیانہ جوہر موجود تھے مگر وہ قائدانہ صفات سے محروم تھا۔ دور اندیشی کی جگہ جلد بازی کا عادی تھا۔ قوت فیصلہ اتنی کمزور تھی کہ معمولی سے مسئلے پر تذبذب میں پڑ جاتا اور کبھی چند لمحوں میں کوئی بہت بڑا فیصلہ کر گزرتا اور پھر اس سے ہونے والی تباہی پر کفِ افسوس ملتا رہتا۔[2]

غرناطہ پر قبضے کے بعد ابوعبداللہ نے اپنے باپ اور چچا کے خلاف صف آراء ہونے میں دیر نہیں لگائی اور جلد ہی اس نے فوج لے کر مالقہ کی طرف کوچ کیا۔ الزغل بھی مجاہدین اور سپاہیوں کو لے کر میدان میں نکل آیا۔ ابوعبداللہ کو شکست فاش ہوئی اور وہ غرناطہ کی طرف بھاگ نکلا۔ غرناطہ واپس آ کر اسے احساس ہوا کہ وہ عوامی مقبولیت سے محروم ہے اور اسے اپنا سیاسی قد بلند کرنے کے لیے اپنے باپ اور چچا کی طرح دو چار میدانوں میں نصرانیوں کو شکست ضرور دینی چاہیے۔ چنانچہ اس نے غرناطہ کی فوج اور رضا کاروں کے ساتھ ربیع الاول ۸۸۸ھ میں شمال مغرب کی سمت قسطالیہ کے شہر قرطبہ کی طرف یلغار کی۔ راستے میں اس نے کئی قلعے فتح کیے اور کئی جھڑپوں میں نصرانیوں کو شکست دی۔

ان فتوحات کے بعد وہ مال غنیمت سے لدا پھندا واپس آ رہا تھا کہ لسانہ کے قلعے کے قریب نصرانیوں کی ایک فوج عقب سے اس پر حملہ آور ہوگئی۔ سینکڑوں مسلمان قتل اور باقی پسپا ہوئے مگر نصرانیوں نے گھیر کر درجنوں افراد کو قیدی بنا لیا جنہیں قلعہ لسانہ لے جایا گیا، وہاں معلوم ہوا کہ قیدیوں میں شہزادہ ابوعبداللہ محمد بھی شامل ہے۔ اسے سخت پہرے میں فرڈی ننڈ پنجم کے پاس قرطبہ بھیج دیا گیا جس نے ملاقات اور گفتگو میں شہزادے کی کم عقلی کا اندازہ لگا لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ غرناطہ پر قبضہ تب ہی ہو سکتا ہے جب ایسا نادان نوجوان وہاں تخت نشین ہو۔ اس نے شہزادے پر مہربانیوں اور

---

① بلغة العصر فی اخبار ملوک بنی نصر: ص ۶۳، ۶۴؛ نفح الطیب: ۴/ ۵۱۵
② موورس ان اسپین از لین پول: ص ۱۲۶

نوازشوں کی بارش کر کے اسے یقین دلا دیا کہ دنیا میں اس کے سچے دوست صرف فرڈی ننڈ اور ازابیلا ہیں۔[1]

سلطان ابوالحسن علی کی وفات:

شہزادے کی گرفتاری سے غرناطہ کا ایوانِ اقتدار لرزنے لگا تھا۔ مسلمانانِ اندلس آٹھ صدیوں میں کبھی ایسی ذلت سے دوچار نہیں ہوئے تھے۔ شاہی خاندان کے امراء اور غرناطہ کے عمائد حیران تھے کہ اب کیا کیا جائے۔

ایسے میں ملکہ عائشہ نے نہایت صبر وتحمل کام لیتے ہوئے سب کی ہمت برقرار رکھی جس کی بناء پر آخر کار سب نے متفق ہو کر دوبارہ ابوالحسن علی کو سلطان مان لیا اور ان کے وفد نے مالقہ حاضر ہو کر سلطان سے دوبارہ تاج وتخت سنبھالنے کی درخواست کی۔ ابوالحسن پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا، نگاہ جواب دے گئی تھی تاہم وہ امراء کے ساتھ غرناطہ چلا گیا اور حکومت سنبھال لی۔ اس نے پوری کوشش کی کہ منہ مانگی دولت دے کر اپنے بیٹے ابوعبداللہ کو فرڈی ننڈ پنجم کی قید سے چھڑا لے۔ اس کوشش کے پیچھے شفقتِ پدری سے زیادہ یہ خیال کارفرما تھا کہ شہزادہ فرڈی ننڈ پنجم کے پاس رہ کر دشمن کا آلہ کار بن جائے گا جبکہ غرناطہ واپس لا کر اسے قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ ابوالحسن نے فرڈی ننڈ پنجم کو شہزادے کے بدلے اپنے ہاں قید کئی نصرانی جرنیلوں کی رہائی کا یقین بھی دلایا مگر فرڈی ننڈ پنجم نہ مانا۔

ابوالحسن علی سخت بیماری اور طبیعت کے ملال کے باعث کچھ مدت بعد تخت سے دستبردار ہو گیا اور اپنے بھائی محمد الزغل کو نیا سلطان مقرر کر کے خود اَلْمُنَکَّب چلا گیا جہاں کچھ دنوں بعد اس کی وفات ہو گئی۔ یہ ۸۹۰ھ کا واقعہ ہے۔[2]

ہر قدم دست وگریباں ہے یہاں خیر سے شر...... ہم بھی کس معرکۂ جنگ وجدل میں آئے
زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی...... ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اجل میں آئے[3]

⑳ سلطان محمد بن سعد الزغل، محمد دہم

۸۹۰ھ تا ۸۹۵ھ (۱۴۸۵ء تا ۱۴۹۰ء)

سلطان ابوالحسن علی کی موت کے ساتھ ہی فرڈی ننڈ پنجم نے غرناطہ کے خلاف نئی مہمات کا آغاز کر دیا۔ ربیع الآخر ۸۹۰ھ میں اس کی افواج حصنِ قرمط اور حصنِ ذکوین پر حملہ آور ہو گئیں۔ اگلے ماہ یہ فوجیں بارودی دھماکوں کے ساتھ شہر رُندہ کی فصیل توڑ کر اس پر بھی قابض ہو گئیں۔ پھر یکے بعد دیگرے قنبیل، ارنیہ، مشاقر، اللوز اور بنش بھی مسلمانوں سے چھین لیے۔ اس سے پہلے ۸۸۹ھ میں نصرانی حصن القرۃ اور حصن شیطنتین فتح کر چکے تھے۔ اس طرح مغرب کی سمت میں غرناطہ کی تقریباً تمام دفاعی چوکیاں ایک ایک کر کے چھن گئیں۔

ان حالات میں ۱۹ شعبان ۸۹۰ھ کو امیر الزغل غرناطہ کے رضا کاروں کو لے کر حصنِ مکلین کی مرمت کے لیے

---

① نبذة العصر فی اخبار ملوک بنی نصر: ص ۶۶، ۶۷

② نبذة العصر: ص ۶۷، ۶۸؛ دولة الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۰۳ تا ۲۰۵ ③ ناصر کاظمی

نکلا کیوں کہ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ نصرانی اس پر بھی قبضہ کرنے کے لیے پیش قدمی کرنے والے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ قافلہ قلعے تک پہنچ کر خیمہ زن ہوا ہی تھا کہ رات کو نصرانی لشکر نے بھی قریب آکر ڈیرے ڈال دیے۔ دونوں گروہ ایک دوسرے سے لاعلم تھے۔ منہ اندھیرے نصرانی قلعے کی طرف بڑھے تو الزغل کے سپاہیوں سے ٹکراؤ ہوگیا۔ لوگ باہم گڈمڈ ہوگئے، کچھ دیر بعد تکبیر کے نعروں اور ناقوس کی صداؤں سے صورتحال واضح ہوئی اور تلواریں میانوں سے نکل آئیں۔ نصرانی بڑھتے بڑھتے الزغل کے خیمے تک پہنچ گئے مگر مسلمانوں نے نہایت ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور جوابی حملے میں کشتوں کے پشتے لگادیے۔ آخر نصرانی سینکڑوں افراد ضائع کر کے بھاگ نکلے۔ ان کے پڑاؤ سے بکثرت اسلحہ اور گولہ بارود ہاتھ آیا۔ (1)

الزغل غرناطہ کے شمال مغرب کی ان مہمات میں مصروف تھا کہ اُدھر مشرق کی سمت اَلْمَرِیَہ میں اس کے بھتیجے یوسف نے بغاوت کا پرچم بلند کردیا، دراصل ابوالحسن علی کی اولاد الزغل کی حکومت سے مطمئن نہیں تھی اور اسے اپنا حق سمجھتی تھی۔ الزغل تیزی سے اَلْمَرِیَہ پہنچا اور بزورِ شمشیر اس پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اس لڑائی میں شہزادہ یوسف مارا گیا۔ (2)

فرڈیننڈ اور ملکہ عائشہ میں خفیہ معاہدہ:

اس دوران ملکہ عائشہ نے فرڈی ننڈ پنجم کی طرف سفیر بھیج کر ایک بار پھر شہزادہ ابوعبداللہ کی رہائی کی کوشش کی۔ فرڈی ننڈ پنجم نے رہائی کی سخت قیمت لگائی اور مطالبہ کیا کہ شہزادے کے بدلے چار سو نصرانی قیدی فوراً آزاد کیے جائیں گے، شہزادہ رہائی کے بعد غرناطہ کا تخت سنبھال کر فرڈی ننڈ پنجم اور ازابیلا کا مطیع رہے گا اور اندلس کے باقی ماندہ شہروں کی فتح میں قسطالیہ کی مدد کرے گا، ہر سال بارہ ہزار اشرفیاں خراج دے گا، معاہدے کی پابندی کی ضمانت کے طور پر ابوعبداللہ کا بڑا لڑکا قسطالیہ میں یرغمال رہے گا۔ معاہدہ شہزادے کی رہائی کے دن سے دو سال تک نافذ ہوگا اور اس دوران جنگ بند رہے گی۔ ملکہ کی طرف سے یہ مطالبات تسلیم کر لیے گئے اور ایک خفیہ معاہدہ طے پا گیا۔ (3)

جو ہوئے ہیں قرار آپس میں
میں تیرا اور تو میرا گواہ
ہر گھڑی کان میں وہ کہتا ہے
کوئی اس بات سے نہ ہو آگاہ
درد اپنی طرف سے حاضر ہے
آگے پھر ہے تمہارے ہاتھ نباہ (4)

---

(1) نفاضة الجراب / نبذة العصر فی اخبار ملوک بنی نصر: ص ۱۷ تا ۳۲، نفح الطیب: ۳/ ۵۱۹

(2) دولة الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۳/ ۲۱۱

(3) دولة الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۰۵، ۲۰۶ — (4) میر درد

ابوعبداللہ کی رہائی اور لوشہ پر نصرانیوں کا قبضہ:

حقیقت یہ ہے کہ غرناطہ کے سقوط میں اس خفیہ معاہدے کا بڑا دخل تھا جو سلطان غرناطہ محمد الزغل سے بے خبری میں طے پایا۔ دراصل امیر محمد الزغل کے ہاتھوں دو تین میدانوں میں شکست کے بعد فرڈی ننڈ پنجم سمجھ گیا تھا کہ جب تک مسلمانوں کو باہم لڑایا نہیں جائے گا، غرناطہ پر قبضہ مشکل ہے۔ چنانچہ اس نے خفیہ معاہدہ کر کے چچا اور بھتیجے کے درمیان خانہ جنگی کی آگ بھڑکا دی۔ اس نے شہزادے کو آزاد کر دیا، مگر قسطالیہ کی فوج کا ایک دستہ اس کے ساتھ رہا۔ شہزادے کو سب سے پہلے تختِ غرناطہ حاصل کرنا تھا تاکہ وہ معاہدے کی باقی شقوں پر عمل کے قابل ہو سکے۔ فرڈی ننڈ پنجم اس سے وعدہ کر چکا تھا کہ اگر وہ امراء کو ساتھ ملا کر غرناطہ حاصل کر لے تو قسطالیہ معاہدے کی پابندی کرتے ہوئے غرناطہ سے دوستی رکھے گا۔ فرڈی ننڈ پنجم نے ابوعبداللہ کو امراء کی وفاداریاں خریدنے کے لیے بے پناہ رقم بھی دی۔

ابوعبداللہ پہلے مشرقی اندلس پہنچا اور فرڈی ننڈ پنجم کا آلۂ کار بن کر یہ مہم شروع کر دی۔ مستقبل کے خوف اور فرڈی ننڈ پنجم کی بھیجی ہوئی دولت نے بسطہ اور بشش کے کئی امراء کو مرعوب کر دیا اور انہوں نے ابوعبداللہ کی بیعت کر لی تاکہ اس کی فرڈی ننڈ پنجم سے دوستی کا فائدہ اٹھا کر نصرانیوں کے حملوں سے محفوظ رہا جائے۔

ملت فروشوں کا ایک گروہ غرناطہ کے نواح میں یہی ذہن عام کر رہا تھا۔ قدیم غرناطہ شہر کی فصیل سے متصل محلّہ بیازین کے لوگ خاندانِ بنونصر کے پکے حامی تھے۔ ان میں سے ہزاروں افراد نے امیر الزغل کے خلاف بغاوت کر کے غرناطہ کا محاصرہ کر لیا۔ ۳ ربیع الاوّل ۸۹۱ھ سے شروع ہونے والا یہ محاصرہ اڑھائی ماہ تک جاری رہا۔ امیر الزغل اس وقت مشرقی علاقوں کی دیکھ بھال کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہ برابر کوشش کرتا رہا کہ یہ بغاوت ختم ہو جائے مگر بے سود۔[1]

الزغل اور ابوعبداللہ کا معاہدہ:

اس دوران شہزادہ ابوعبداللہ لوشہ پہنچ چکا تھا۔ الزغل نے اس سے رابطہ کیا اور اسے بمشکل سمجھایا کہ اس وقت اختلافات کا نتیجہ اندلس سے مسلمانوں کے خاتمے کے سوا کچھ نہیں نکلے گا۔ آخر ابوعبداللہ مان گیا۔ طے پایا کہ تختِ غرناطہ الزغل کے پاس رہے گا اور شہزادہ ابوعبداللہ کو بشش یا اس کے پسندیدہ شہر کی امارت دی جائے گی۔ اختلاف ختم ہوتے ہی مسلمان نصرانیوں سے جہاد کے لیے متحد ہونے لگے۔ ابوعبداللہ محمد کے سینکڑوں حامی، جن کا تعلق محلّہ بیازین سے تھا، بغاوت ترک کر کے لوشہ پہنچ گئے تاکہ جہاد میں شہزادے کا ساتھ دیں۔[2]

لوشہ پر نصرانیوں کا حملہ۔ ابوعبداللہ کی دوبارہ گرفتاری:

ابوعبداللہ اور الزغل کا اتحاد فرڈی ننڈ پنجم کی امیدوں پر پانی پھیرنے کے مترادف تھا۔ شہزادہ ابوعبداللہ محمد لوشہ ہی میں تھا کہ فرڈی ننڈ پنجم نے ایک بڑا لشکر بھیج کر اس شہر کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں نے جان لڑا کر مزاحمت کی مگر

---

(1) نبذة العصر: ص ۷۹، ۸۰؛ نفح الطیب: ۴/ ۵۱۷، ۵۱۸؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۲۱۲، ۲۱۳

(2) نبذة العصر: ص ۷۹، ۸۰؛ نفح الطیب: ۴/ ۵۱۷، ۵۱۸؛ دولة الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۲۱۲، ۲۱۳

ان کی تعداد بہت کم تھی ، غرناطہ سے بھی کوئی کمک نہ آئی اور آخر شہر فتح ہو گیا۔ فرڈی ننڈ پنجم شہزادہ ابو عبداللہ محمد کو گرفتار کر کے ساتھ لے گیا تا کہ اس سے مزید کام لے سکے۔ یہ واقعہ ۲۶ جمادی الاولیٰ ۸۹۱ھ کا ہے۔[1]

اس کے بعد نصرانی بڑی تیزی سے الیرہ، قلنبیرہ، مکلین، منت فرید اور صیحہ کے قلعوں پر قابض ہو گئے۔ کچھ عرصے پہلے توپ ایجاد ہو چکی تھی۔ نصرانیوں نے آتشیں اسلحے کا استعمال مسلمانوں سے سیکھا تھا جو چھٹی صدی ہجری سے اسے کامیابی کے ساتھ آزما رہے تھے۔ اندلس کے نصرانی رفتہ رفتہ اس فن میں مسلمانوں سے آگے نکل گئے۔ وشقہ ان کے ہاں توپ سازی کا بڑا مرکز بن گیا اور کوہ قسطینا میں توپ کے گولے تیار کیے جاتے تھے۔ توپوں کی گولہ باری کے ذریعے نصرانیوں کے لیے قلعوں کی دیواریں گرانا زیادہ مشکل نہیں رہا تھا۔

ان تمام شہروں، قلعوں اور بستیوں سے آبادی کا انخلاء کرایا گیا۔ لوگوں کے پاس غرناطہ کے سوا، کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ لہٰذا ہر طرف سے سمٹ کر مسلم آبادی غرناطہ کا رخ کرنے لگی۔ فرڈی ننڈ پنجم نے غرناطہ کے اطراف کے تمام نو مفتوحہ قلعوں کو فوج، سامانِ رسد، اسلحے اور گولہ بارود سے بھر دیا تا کہ غرناطہ پر فیصلہ کن حملے میں ان تمام قلعوں کو کیمپ کے طور پر استعمال کیا جائے۔[2]

فرڈی ننڈ پنجم اور ابو عبداللہ کے مابین زیرِ غور خفیہ معاہدہ:

شہزادہ ابو عبداللہ محمد، فرڈی ننڈ پنجم کی قید میں تھا اور اسے یہ یقین دلایا جا چکا تھا کہ غرناطہ چند دنوں کا مہمان ہے، لہٰذا اس سے پہلے کہ نصرانی افواج غرناطہ پر قابض ہو کر مسلمانوں کا قتل عام کریں، کسی ایسے معاہدے پر غور کر لیا جائے جو ابو عبداللہ اور اس کے خاندان کو بھی تحفظ فراہم کرے اور مسلمانوں کو بھی۔ ابو عبداللہ محمد مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس نے غرناطہ حوالے کرنے کا ایک شرائط نامہ مرتب کیا جس کی اہم دفعات یہ تھیں:

1. غرناطہ اور اس کے مضافات کے باشندوں کی املاک محفوظ ہوں گی اور انہیں ہراساں نہیں کیا جائے گا۔
2. غرناطہ میں رہنے والوں یا نقل مکانی کرنے والوں کو بھی غیر مسلح نہیں کیا جائے گا۔
3. نقل مکانی کرنے والوں کو اثاثے فروخت کرنے یا ساتھ لے جانے کی اجازت ہو گی۔
4. نصرانیوں کو مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہو گی۔
5. مسلمانوں کے باہمی تنازعات میں مسلمان قاضی ہی ان کے مقدمے طے کریں گے۔
6. کسی مسلمان سے دوسرے کے جرائم پر باز پرس نہیں ہو گی۔ باپ کے جرائم کا بیٹے سے یا بھائی کے جرائم کا بھائی سے محاسبہ نہیں ہو گا۔
7. مسلمان جنگی قیدیوں کو آزاد سمجھا جائے گا۔

---

[1] نبذة العصر: ص ۷۹، ۸۰؛ نفح الطیب: ۴/ ۵۱۸، ۵۱۹؛ دولة الإسلام فی الأندلس: ۵/ ۲۱۲، ۲۱۳

[2] نبذة العصر: ص ۸۰، ۸۱؛ نفح الطیب: ۴/ ۵۱۸، ۵۱۹؛ دولة الإسلام فی الأندلس: ۵/ ۲۱۲، ۲۱۳

❽ پانچ سال تک مسلمان ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے، پھر وہ اتنا ٹیکس دیا کریں گے جتنا مسلم دور میں دیتے تھے۔[1]

ابو عبداللہ کا غرناطہ پر قبضہ:

یہ بات یقینی تھی غرناطہ کا موجودہ حکمران الزغل کسی معاہدے پر رضامند نہیں ہوگا بلکہ آخر دم تک لڑنے کی کوشش کرے گا۔ غرناطہ کو انجام تک پہنچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہاں فرڈی ننڈ پنجم کی سوچ سے ہم آہنگ حکمران تخت نشین ہو، جس کے ہاتھوں یہ ''عظیم کارنامہ'' عمل میں آئے۔ فرڈی ننڈ نے شہزادہ ابو عبداللہ ہی کو یہ مہم سونپی اور اسے غرناطہ کا جائز حاکم اور اپنا دوست قرار دیتے ہوئے آزاد کر دیا تاکہ وہ الزغل کے خلاف بغاوت کر کے غرناطہ کو مزید کمزور اور لاچار کر دے۔ شہزادہ ابو عبداللہ فرڈی ننڈ کی توقع کے عین مطابق جنوب مشرقی اندلس کے قلعہ داروں کے پاس پہنچا اور انہیں اپنی بیعت کے بدلے نصرانیوں کی حمایت اور سرپرستی کے سہانے سپنے دکھائے۔ قلعہ دار پہلے تو جھانسے میں نہ آئے مگر پھر فرڈی ننڈ کے بڑھتے ہوئے خطرے کے پیشِ نظر انہوں نے بادلِ نخواستہ اس کی بیعت کر لی۔ ابو عبداللہ نے اپنے سفیر بھیج کر مملکتِ غرناطہ کے ہر شہر اور قلعے والوں کو اپنی بیعت کی دعوت دی تاہم اکثر لوگوں کو ابو عبداللہ کے جسم میں فرڈی ننڈ کی روح دکھائی دے رہی تھی اس لیے اس کی مخالفت کا زور کم نہ ہوا۔ اس کے باوجود غرناطہ کی نواحی بستیوں میں کچھ ملت فروش ایک بار پھر اس کے حامی بن گئے تاہم اس بار انہوں نے اپنے عزائم کو خفیہ رکھا۔

سازش یہ تیار کی گئی کہ محمد الزغل کو بے خبر رکھتے ہوئے کچھ لوگ شہزادہ ابو عبداللہ محمد کو لے کر بیازین میں داخل ہو جائیں گے۔ شہر کے مختلف گوشوں میں پہلے سے موجود سازش کے آلۂ کار شہزادے کے گرد جمع ہو کر ایک جلوس کی شکل بنالیں گے اور منادی کر دی جائے گی کہ شہزادے کے توسط سے نصرانیوں سے صلح ہو چکی ہے لہٰذا صلح اور امن چاہنے والے شہزادے کے ساتھ ہو جائیں۔ اس طرح عوام کی حمایت سے تخت پر قبضہ کر لیا جائے گا۔

اس منصوبے کے مطابق ۶ شوال ۸۹۱ھ کو ابو عبداللہ محمد غرناطہ کے محلے بیازین پہنچا اور وہاں اس کی بیعت کر کے نصرانیوں سے صلح کا اعلان کر دیا گیا۔ غرناطہ کے شہریوں نے اس اعلان کو مسترد کر دیا اور شہزادے کے لیے فصیل کے دروازے نہ کھولے۔ آخر شہزادے کے حامیوں نے مسلح ہو کر غرناطہ پر حملہ کر دیا۔ ساتھ ہی انہیں فرڈی ننڈ پنجم کی فوجی مدد بھی مل گئی۔ امیر الزغل کئی دنوں تک یہ ہنگامہ برداشت کرتا رہا۔ آخر اس نے امرائے غرناطہ کے اجلاس میں کہا:

''ان لوگوں نے نصرانیوں کے آلۂ کار بن کر اپنا خون حلال کر لیا ہے۔ اب تلوار ہی ان کا فیصلہ کرے گی۔''

---

[1] یاد رہے کہ یہ معاہدہ اس وقت عمل میں نہیں آیا تھا۔ صرف معاہدے کی تجاویز تھیں جن پر غور ہو رہا تھا۔ بعد میں ابو عبداللہ نے غرناطہ کو بچانے کے لیے کچھ جنگیں بھی لڑیں جو خلافِ معاہدہ ہرگز نہیں تھیں۔ آخر میں جب ہر طرف سے مایوسی ہو گئی تو پھر اسی خفیہ معاہدے میں کچھ شقوں کا اضافہ کر کے دوبارہ مذاکرات کیے گئے اور ان پر عمل درآمد کی ضمانت لے کر غرناطہ فرڈی ننڈ پنجم کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ دستاویز مئی ۱۴۹۵ء کی ہے جو اسپین کے میڈرڈ آرکائیوز میں آج بھی محفوظ ہے۔ ڈاکٹر حمق حق نے اس کا ترجمہ اور عکس اپنی محققانہ تصنیف "ہوئے تم دوست جس کے" میں پیش کیا ہے۔ دیکھیے ص ۱۱۱ تا ۱۱۶ ۔۔۔ اس دستاویز میں مزید کئی شقیں تھیں اور تقریباً سب حتمی غرناطہ کے ۶۷ شقوں پر مشتمل اصل معاہدے میں شامل کر لی گئی تھیں۔

علماء نے بھی اس کے فیصلے کی تائید کی اور نصرانیوں کے حامیوں سے جنگ ضروری قرار دی۔ ۲۷ محرم ۸۹۲ھ کو امیر الزغل نے وادی آش اور وادی بسطہ کے مجاہدین کو مدد کے لیے طلب کیا اور غرناطہ کے دروازے کھول کر اپنے حامیوں کے ساتھ ابو عبداللہ کے مقابلے پر نکل آیا۔ کئی دنوں تک فریقین میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ فرڈیننڈ پنجم دیر تک اس تماشے سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کے بعد اس نے شطرنج حرب وضرب کی ایک نہایت خطرناک چال چلی اور ربیع الآخر میں یکدم بلش اور مالقہ کی طرف لپکا جو مملکتِ غرناطہ کا آخری ساحلی شہر تھا جس پر نصرانیوں کے قبضے سے مسلمانوں کی سمندر پار آمد ورفت کا ہر امکان مسدود ہو جاتا۔

الزغل بلش اور مالقہ پر فرڈی ننڈ پنجم کی یلغار کی خبر سن کر رہ نہ سکا۔ اس نے غرناطہ میں اپنے حامیوں کو ابو عبداللہ کے مقابلے میں جمے رہنے کی تاکید کی اور فوج کا بڑا حصہ ساتھ لے کر ۲۳ ربیع الآخر کو تیزی سے بلش اور مالقہ کی سمت روانہ ہو گیا۔ مگر بلش کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ نصرانی اتنا سخت محاصرہ کر چکے ہیں کہ اہل شہر کو کمک پہنچانے کا کوئی راستہ نہیں بچا۔ الزغل اپنی فوج کو لے کر پیچھے ہٹ گیا اور صلاح ومشورہ کرنے لگا۔

شام کو وہ شب خون مارنے حریف کے پڑاؤ کی طرف روانہ ہوا مگر اچانک فوج کے امراء میں اختلاف رائے ہو گیا اور اکثریت نے جنگ میں کامیابی کے امکانات کی نفی کرتے ہوئے واپسی پر اصرار کیا۔ لشکر اپنی خیمہ گاہ میں لوٹ آیا اور صبح خبر ملی کہ بلش پر نصرانی قابض ہو چکے ہیں۔ یہ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۸۹۲ھ کا واقعہ ہے۔ اس اطلاع سے الزغل کے سپاہیوں میں حد درجے بددلی پھیل گئی اور ان میں سے زیادہ تر اپنے شہروں اور بستیوں کی طرف چلے گئے۔ الزغل تھوڑی سی فوج کے ساتھ تیزی سے غرناطہ واپس روانہ ہوا مگر راستے میں یہ اطلاع ملی کہ پانچ دن پہلے ابو عبداللہ محمد غرناطہ پر قبضہ کر چکا ہے۔ ۵ جمادی الاولیٰ کو کچھ غداروں نے اس کے لیے شہر کے دروازے کھول دیے تھے، شہر کی بقیہ محافظ فوج قتل کر دی گئی تھی۔ یوں تختِ غرناطہ پر نصرانیوں کا ہمدرد ایک کمزور حکمران براجمان ہو گیا تھا۔ الزغل یہ اطلاع ملنے پر مایوس ہو کر کوہ البشارۃ عبور کر کے وادی آش چلا گیا اور وہاں کے کچھ قلعوں پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ [1] اس طرح فرڈی ننڈ پنجم کے منصوبے کے عین مطابق چھوٹی سی مملکتِ غرناطہ دو حصوں میں بٹ گئی۔ غرناطہ اور اس کے مضافات پر ابو عبداللہ کا حکم چلتا تھا اور جنوب مشرق میں وادی آش، مالقہ، بسطہ اور المریہ پر الزغل کی حکومت تھی۔

سقوطِ مالقہ:

ادھر فرڈی ننڈ پنجم کے لشکر نے بلش کے بعد سیدھا مالقہ کو جا گھیرا۔ مالقہ کے مسلمانوں نے کھلے میدان میں آکر نصرانیوں سے اپنی مدافعت کی اور ان پر ایسے تابڑ توڑ حملے کیے کہ صرف ایک دن میں ساڑھے بارہ ہزار نصرانی مارے گئے۔ تاہم نصرانیوں نے شہر کا بری اور بحری محاصرہ کر کے اسے باقی دنیا سے کاٹ دیا۔ اس کے بعد محصورانہ جنگ کئی ماہ تک جاری رہی۔ مالقہ کا محاذ بہت اہم تھا۔ اس کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد مسلمانوں کو سمندر پار سے کوئی کمک

---

[1] نبذۃ العصر فی اخوال ملوک بنی نصر: ص ۹۰ تا ۹۲

ماننا ممکن ہو جاتا۔ چونکہ مالقہ الزغل کی ریاست میں آتا تھا، اس لیے غرناطہ سے مالقہ کو کوئی مدد نہ پہنچی، ویسے بھی ابو عبداللہ شاہ قسطالیہ سے صلح کر چکا تھا۔

الزغل کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ وہ مالقہ کا محاصرہ توڑ سکتا۔ تاہم اس کی پوری کوشش تھی کہ بیرونی اسلامی ممالک سے مدد لے کر کسی طرح اندلس کی اکھڑتی سانسوں کو بچالے۔ اس کے سفیر ۸۹۲ھ کے اواخر میں مصر کے مملوک حکمران سلطان اشرف قائتبائی (م ۹۰۱ھ) کے دربار میں پہنچے اور مالقہ کو بچانے لیے بحری فوج بھیجنے کی درخواست کی۔ مصر اس وقت شان وشکوہ کے عروج پر تھا تاہم مصر اور سلطنتِ عثمانیہ میں کشیدگی جاری تھی اور جنگ کا خطرہ موجود تھا۔ ایسے میں قائتبائی نے اہلِ اندلس کے لیے کمک بھیجنے کی بجائے، سفارتی امداد کا راستہ اختیار کیا اور بیت المقدس کے کچھ پادریوں کو نمائندہ بنا کر اسپین کے نصرانی حکام اور پوپ کی طرف بھیجا تاکہ اندلس کے مسلمانوں کی نسل کشی بند کی جائے۔

سلطان قائتبائی کی سفارت ابھی راستے میں تھی کہ مالقہ کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ سپاہی اور شہری بھوک سے مرنے لگے۔ شہر کے عمائد نے ان حالات میں جان ومال کی امان کے وعدے پر مالقہ کے دروازے کھول دیے مگر نصرانیوں نے بدعہدی کرتے ہوئے عورتوں اور بچوں سمیت سب کو قیدی بنالیا اور پورے شہر کو لوٹ لیا۔ یہ المیہ شعبان ۸۹۲ھ کے اواخر میں پیش آیا۔ اس کے بعد پورے اندلس میں غرناطہ شہر کے سوا مسلمانوں کے پاس کوئی بڑا شہر نہیں رہا جو آزاد اور خود مختار ہو۔[1]

یہ انقلاب دوراں یہ عیش وغم کے عنواں .... گویا زبانِ فطرت افسانہ کہہ رہی ہے[2]

شاہِ مصر کا مراسلہ اور فرڈی نند پنجم کا جواب:

سقوطِ مالقہ کے کئی ماہ بعد سلطان قائتبائی کی سفارت پہلے پوپ اور پھر فرڈی نند پنجم کے پاس پہنچی، قائتبائی نے اپنے مراسلے میں شاہ قسطالیہ کو دھمکی بھی دی کہ اگر اس کی فوجیں واپس نہ ہوئیں تو وہ القدس میں نصرانیوں کا سب سے بڑا گرجا "قمامہ" (سینٹ جان) بند کرادے گا۔ تاہم اس تنبیہ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ فرڈی نند پنجم نے جواب میں دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے سلطان قائتبائی کو لکھا:

"ہم رعایا میں مسلم اور نصرانی کا کوئی فرق نہیں کرتے۔ مگر ہم اپنی زمین کو اجنبیوں کے قبضے میں نہیں دیکھ سکتے۔ مسلمان خود ہماری قیادت پر دل سے راضی ہیں۔"

دیگر ممالک میں بھی الزغل کے سفیروں کو ناکامی ہوئی۔ ہاں رضا کار مجاہدین کی کچھ ٹولیاں سمندر عبور کر کے الزغل کے پاس پہنچ گئیں۔[3]

مشرقی شہروں کا سقوط۔ الزغل سرنگوں:

فرڈی نند پنجم غرناطہ پر قبضے سے پہلے تمام مشرقی شہروں کو فتح کرنا چاہتا تھا تاکہ مشرق سے غرناطہ کو کمک یا رسد ملنے

---

① نبذة العصر فی احوال ملوک بنی نصر: ص ۹۰ تا ۹۵؛ دولة الإسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۲۵ تا ۲۲۲
② شکیل بدایونی ③ دولة الإسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۱۹ تا ۲۳۱

کا ہر امکان ختم ہو جائے۔ ان میں سے بعض شہر سلطان الزغل کے ماتحت تھے اور بعض ابوعبداللہ محمد کے فرڈی ننڈ پنجم سے معاہدے میں شریک ہو کر قسطالیہ کو خراج بھی ادا کر رہے تھے۔ اس معاہدے کے مطابق نصرانی ان شہروں کے باشندوں کو تمام حقوق دینے، شرعی عدالتیں باقی رکھنے اور شہریوں کی عزت و احترام اور جان مال کا پورا خیال کرنے کے پابند تھے۔ اس کے باوجود قسطالیہ کی افواج نے ۱۴۸۸ء (۸۹۳ھ) کے موسم بہار میں ان شہروں پر حملہ کیا اور کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر سب پر قبضہ کر لیا۔ ان شہروں میں بیرہ، بلشین اور اشکر قابل ذکر ہیں۔ فتح کے بعد بہت جلد معاہدے کی ہر شق کو فراموش کر دیا گیا اور لوگوں سے غیر انسانی سلوک میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔

رجب ۸۹۴ھ میں قسطالیہ نے قلعہ مُوجر فتح کر لیا۔ اس کے بعد المنکب پر حملہ ہوا جو مالقہ اور المَریّہ دونوں سے برابر کی مسافت پر تھا۔ یہاں کے حاکم محمد بن الحاج نے انجام کی پروا کیے بغیر تین ماہ تک شہر کا دفاع کیا۔ آخر میں فرڈی ننڈ پنجم نے اسے تمام امراء اور جرنیلوں سمیت بہترین مراعات دینے کا معاہدہ کیا جس میں طے پایا کہ مسلمان اپنے شہر میں پوری آزادی سے رہیں گے، مساجد آباد رہنے دی جائیں گی، جان و مال کا پورا تحفظ ملے گا، بارود کے سوا، وہ ہر قسم کا اسلحہ ساتھ رکھ سکیں گے۔ یوں محرم ۸۹۵ھ (دسمبر ۱۴۸۹ء) میں اَلْمُنکّب بھی قسطالیہ کا حصہ بن گیا۔

اس دوران نصرانی بَسْطہ پر بھی حملہ آور ہو چکے تھے جس کے بعد اَلْمَریّہ کا بچنا بھی مشکل تھا کیوں کہ اس کا دفاع بَسْطہ کی حفاظت پر منحصر تھا۔ سلطان الزغل اگر اپنے مرکز وادیٔ آش سے نکل کر بَسْطہ کی حفاظت کے لیے جاتا تو وادیٔ آش پر ابوعبداللہ محمد کے حملے کا خطرہ تھا۔ اس لیے الزغل نے اپنے داماد یحییٰ النیار کو جو المَریّہ کا حاکم بھی تھا، کچھ فوج دے کر بَسْطہ بھیج دیا۔ اس نے یہاں کے جنگجو مسلمانوں کو ساتھ ملا کر بڑی پامردی سے کئی ماہ تک قسطالیہ کی افواج کو روکے رکھا۔ آخر محرم ۸۹۵ھ میں یہاں بھی خوراک کے ذخائر ختم ہو گئے اور یحییٰ النیار مذاکرات پر مجبور ہو گیا۔ ۲۵ دسمبر ۱۴۸۹ء (۱۹ محرم ۸۹۵ھ) کو المَریّہ کے قریب نصرانیوں کی فوجی چھاؤنی میں ایک معاہدہ ہوا جس میں فرڈی ننڈ پنجم نے بَسْطہ اور المَریّہ حوالے کرنے کے بدلے یحییٰ النیار کو قسطالیہ میں شہزادوں جیسی مراعات دینے اور اہلِ بَسْطہ کو ہر قسم کی آزادیاں اور سہولتیں بہم پہنچانے کا یقین دلایا۔ یوں النیار نے بَسْطہ نصرانیوں کے حوالے کر دیا۔

اس کے بعد مشرقی اندلس میں الزغل کے مورچے: وادیٔ آش اور اَلْمَریّہ کے سوا کوئی قلعہ مسلمانوں کے پاس نہ رہا۔ فرڈی ننڈ پنجم نے اَلْمَریّہ سے الزغل کو کمک ملنے کے امکانی راستے منقطع کرتے ہوئے پہلے وادیٔ آش کا رخ کیا۔ الزغل اپنی شجاعت و بسالت کے باوجود، اب کچھ کرنے کے قابل نہ تھا۔ اس کے پاس مٹھی بھر مجاہدین اور مختصری فوج کے سوا کچھ نہ تھا جو ایک شہر کو بمشکل سنبھالے ہوئے تھی۔ کہیں سے کوئی کمک ملنے کا امکان نہ تھا۔ مایوس ہو کر الزغل نے خود فرڈی ننڈ پنجم کے پڑاؤ کا رخ کیا اور اپنے لیے اندرش کی قلعہ داری سمیت کچھ مراعات منظور کرا کے وادیٔ آش نصرانیوں کے حوالے کر دیا۔ یہ صفر ۸۹۵ھ کا واقعہ ہے۔

پِرسال تو کلیاں ہی جھڑی تھیں مگر اب کے .... گلشن میں ہیں آثار خزاں اور طرح کے

لشکر ہے نہ پرچم ہے نہ دولت ہے نہ ثروت .... ہیں خاک نشینوں کے نشاں اور طرح کے[1]

اب تک اَلْمَرِیَہ کے امرا یحییٰ النیار کے اعتراف شکست کے باوجود، اَلْمَرِیَہ حوالے کرنے پر رضامند نہ تھے مگر الزغل سرنگوں کرنے کے بعد فرڈی ننڈ پنجم نے انہیں بھی اسی قسم خوبصورت عہدو پیمان کے ذریعے شہر کے دروازے کھولنے پر آمادہ کرلیا۔ یوں ربیع الاوّل ۸۹۵ھ میں مشرقی اندلس کا آخری شہر بھی قسطالیہ میں ضم ہوگیا۔[2]

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ امیر الزغل آخر میں مسلمانوں سے غداری کرتے ہوئے اپنے بھتیجے ابوعبداللہ محمد سے انتقام لینے کے لیے فرڈی ننڈ پنجم کے ساتھ ہوگیا تھا، تاکہ ابوعبداللہ اپنی حکومت سمیت غرق ہوجائے۔ مگر یہ ایک ظن ہی ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر دیکھا جائے تو الزغل سالہا سال تک نصرانیوں سے برسر پیکار رہا اور اس نے اپنے بڑے بھائی ابوالحسن علی کی طرح حتی الامکان اپنے ملک کو بچانے کی کوشش کی۔ مگر ابوعبداللہ کی حماقتوں، فرڈی ننڈ پنجم کی چالوں اور بیرونی اسلامی دنیا کی بے اعتنائی نے آخرکار اسے بالکل بے بس کردیا اور آخر میں اس کے تجزیے کے مطابق اندلس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ اس نے تلوار ایسے حالات میں پھینکی جب اسے چلانا بے سود تھا۔ تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ اگر وہ آخر تک لڑتا اور اسی جدوجہد میں جان دے دیتا تو تاریخ میں اس کا نام سنہرے حروف میں لکھا جاتا اور اسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے والے بہت سے مسلمان اس کے خلاف غم و غصے میں مبتلا نہ ہوتے۔[3]

(۲۱) ابوعبداللہ محمد، محمد یازدہم

۸۹۵ھ تا ۸۹۷ھ (۱۳۹۰ء تا ۱۳۹۲ء)

ابوعبداللہ محمد کے دورِ حکمرانی کے تعین میں دو بڑی غلط فہمیاں ہیں: ایک یہ کہ ابوعبداللہ جب سلطان ابوالحسن کے دور میں بغاوت کرکے ایک سال تک غرناطہ پر قابض رہا، تو اسے اس دور میں سلطان مانا جاتا ہے جبکہ آئینی سلطان اس وقت ابوالحسن تھا جس کی قوت مالقہ میں بہرحال قائم تھی۔ دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ ابوعبداللہ دوبارہ ۸۹۲ھ میں جب غرناطہ پر قابض ہوا تو تب سے لے کر اسے سقوطِ غرناطہ تک سلطان مانا جاتا ہے جبکہ سلطان ابوالحسن کی طرف سے آئینی سلطان محمد الزغل مقرر ہوا تھا اور اپنی دست برداری یعنی صفر ۸۹۵ھ تک شرعی سلطان وہی تھا۔ چنانچہ ابوعبداللہ محمد کی سلطنت کا اصل دور صفر ۸۹۵ھ (جنوری ۱۳۹۰ء) سے شروع ہوتا ہے۔

ابوعبداللہ محمد اور موسیٰ بن ابی الغسان:

غرناطہ کا نیا بادشاہ ابوعبداللہ محمد مشرقی اور جنوبی علاقوں میں فرڈی ننڈ پنجم کی برفتح کو اپنے دوست کی فتوحات تصور کرکے بے فکر تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے امن پسندانہ حکمت عملی سے نصرانیوں کو اپنا مخلص دوست بنالیا ہے۔ اسے

---

(1) ناصر کاظمی (2) نبذة العصر: ص ۹۰ تا ۹۹؛ دولة الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/۲۲۵ تا ۲۳۰

(3) نبذة العصر: ص ۹۰ تا ۱۰۱؛ دولة الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/۲۳۰

یقین تھا کہ اسے ایک طویل اور پُر امن دور اقتدار نصیب ہوگا اور دنیا اسے اسلامیانِ اندلس کا محسن تصور کرے گی۔

تاہم یکایک اس کی سوچ میں غیر معمولی تبدیلی ظاہر ہوئی اور وہ فرڈیننڈ پنجم کے مقابلے پر کمر بستہ ہو گیا۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ ابوعبداللہ محمد کی سوچ میں تبدیلی کے پیچھے غرناطہ کے سپہ سالار موسیٰ بن ابی الغسان کا بڑا ہاتھ تھا۔ موسیٰ بن ابی الغسان غرناطہ کی تاریخ کے آخری ایام میں مسلمانوں کی حریت، آزادی اور جذبۂ جہاد کا وہ روشن مینار تھا جس کی عظمت وشجاعت کا اعتراف ساری دنیا نے کیا ہے۔ اس حالت میں جبکہ غرناطہ ہر طرف سے گھر چکا تھا، موسیٰ بن ابی الغسان واحد شخص تھا جو اسلامیانِ اندلس کو آخری سانس تک لڑنے کا پیغام دے رہا تھا۔ وہ شاہی خاندان کا فرد اور ابوعبداللہ محمد کا قریبی تھا۔ اس کی خطابت میں جذبات کا رُخ پھیرنے کی زبردست طاقت تھی۔ وہ ابوعبداللہ کو مسلسل ترغیب دیتا رہا کہ یہ وقت قومی ودینی غیرت سے آراستہ ہو کر میدانِ جہاد میں اترنے کا ہے۔ ابوعبداللہ شاید موسیٰ کی باتوں سے کبھی اتنا متاثر نہ ہوتا مگر ۸۹۵ھ کے وسط میں جب فرڈی ننڈ پنجم نے اپنے چہرے سے دوستی کا نقاب اتارا تو ابوعبداللہ کو موسیٰ بن ابی الغسان کی رائے ماننا پڑی۔

فرڈی ننڈ پنجم نے یکایک غرناطہ سے صلح کا معاہدہ توڑ ڈالا اور اپنے دو سرحدی قلعوں ملاحہ اور ھدآن کو بھاری لاؤ لشکر، اسلحے، گولہ بارود اور خوراک ورسد سے پُر کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ابوعبداللہ کو پیغام بھیجا کہ وہ شاہی محل قصر الحمراء، سرکاری عمارات اور غرناطہ کا مرکزی حصہ اس کے سپرد کر دے اور اس کا مطیع بن کر غرناطہ میں مقیم رہے یا اندلس کے کسی اور شہر میں رہائش اختیار کرلے۔ اس کی بھرپور مالی کفالت کی جاتی رہے گی۔

ابوعبداللہ نے اہل حل وعقد کا اجلاس بلا کر صورتحال سامنے رکھ دی۔ موسیٰ بن ابی الغسان سمیت اکثر امراء نے فرڈی ننڈ پنجم کا مطالبہ مسترد کر دینے پر زور دیا۔ انہیں امید تھی کہ نصرانیوں کو پسپا کیا جا سکتا ہے۔

ربیع الاوّل ۸۹۵ھ (فروری ۱۴۹۰ء) میں ابوعبداللہ نے ابوالقاسم عبدالملک کو سفیر بنا کر فرڈی ننڈ پنجم کے پاس بھیجا اور غرناطہ کے حالات بتا کر درخواست کی کہ شہر حوالے کرنے پر اصرار نہ کیا جائے۔ مگر فرڈی ننڈ پنجم نے اپنا مطالبہ جاری رکھا۔ ابوالقاسم کی ناکام واپسی پر ابوعبداللہ سخت پریشان ہوا۔ اس نے اپنے وزیر یوسف بن کماشہ کو اندلس کے ایک نامور تاجر ابراہیم قیسی کے ساتھ ایک بار پھر یہی درخواست دے کر قسطالیہ روانہ کیا۔ ابراہیم قیسی کے نصرانیوں سے بڑے دوستانہ تعلقات تھے مگر اس معاملے میں اس کی سفارش بھی رد کر دی گئی۔ یہ وفد بھی ناکام واپس آیا۔[1]

ابوعبداللہ کی ہمت اور فرڈی ننڈ سے جنگ:

اسی دوران ابوعبداللہ نے فرڈی ننڈ پنجم کو الحمراء آنے کی دعوت دی۔ اسے کچھ دوستوں نے مشورہ دیا کہ فرڈی ننڈ پنجم کی بدعہدی کا جواب، دھوکے سے دیا جائے اور اسے الحمراء بلا کر اچانک گھیر لیا جائے۔ اگر شاہِ قسطالیہ قیدی بن گیا تو بدلے میں نصرانیوں سے ہر مطالبہ منوایا جا سکتا ہے۔ ابوعبداللہ نے اس کی منظوری دے دی مگر اسے معلوم نہ تھا کہ اس

① دولة الاسلام فی الاندلس: ۵/ ۲۳۳، ۲۳۵

مجلس میں نصرانیوں کے جاسوس موجود ہیں۔ فرڈیننڈ پنجم کو جونہی ابو عبداللہ کے ارادے کا پتا چلا وہ فوج لے کر غرناطہ پر چڑھ دوڑا اور گردونواح کی فصلیں اور باغات کو نذرِ آتش کرنے لگا۔[1] ابو عبداللہ جیسا کمزور حکمران اس وقت اتنے بڑے امتحان سے گزر رہا تھا جس کا تحمل پہاڑوں جیسا جگر رکھنے والوں کے لیے بھی مشکل تھا۔ غرناطہ کے سوا، سارا اندلس نصرانیوں کے قبضے میں آچکا تھا۔ گردونواح سے ہجرت کرکے آنے والے مسلمانوں کو ملا کر اب غرناطہ میں لگ بھگ چار لاکھ مسلمان پناہ لیے ہوئے تھے۔ یہ لوگ ہرگز برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ غرناطہ کو نصرانیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ ایسا کوئی فیصلہ کیا جاتا تو لوگ بغاوت سے بھی نہ چوکتے۔ آخر ابو عبداللہ نے فرڈی ننڈ پنجم کو دوٹوک جواب دے دیا کہ معاملہ اس کے بس سے باہر ہے۔ وہ غرناطہ اس کے سپرد نہیں کرے گا۔ ایسا کیا گیا تو امراء بغاوت کردیں گے۔

اس نے پہلی بار فرڈی ننڈ پنجم کے خلاف تلوار بے نیام کی اور غرناطہ کے مجاہدین کو لے کر مقابلے پر نکل آیا۔ یہ اس کا ایک نیا کردار تھا جس کی فرڈی ننڈ پنجم کو ہرگز توقع نہ تھی۔ ربیع الاول سے رجب ۸۹۵ھ تک فریقین کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئیں۔ موسیٰ بن ابی الغسان اور ابو عبداللہ کی قیادت میں غرناطہ کو اپنا آخری حصار سمجھ کر لڑنے والے مسلمانوں کے جوش و جذبے کے آگے صلیب پرستوں کو بار بار پسپا ہونا پڑا۔ آخرکار فرڈی ننڈ پنجم اپنا لشکر لے کر واپس ہوگیا۔ ابو عبداللہ نے اس کی واپسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بذول اور بشرۃ جیسے کچھ نواحی قلعے فتح کرلیے۔

اسلامیانِ اندلس ابو عبداللہ کو ایک جرأت مند سپاہی کے روپ میں دیکھ کر ایک ہلکی سی امید پر اس کے ساتھ ہوگئے تھے۔ البشرات اور وادیٔ آش کے محکوم مسلمان نصرانیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے نصرانی حکام کو بے دخل کرکے ابو عبداللہ کی اطاعت کا اعلان کردیا۔[2] ابو عبداللہ کی یہ ہمت یقیناً قابلِ داد تھی مگر یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو اس تباہی تک پہنچانے میں اس کی حماقتوں کا بڑا دخل تھا۔ اگر وہ چند سال قبل اپنے والد کے خلاف عین اس وقت بغاوت نہ کرتا جب مسلمان فرڈی ننڈ کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے، تو شاید اندلس کی تاریخ مختلف ہوتی۔ اب جبکہ ابوالحسن مر چکا تھا اور کتنے بہترین سپاہی مختلف محاذوں پر پسپائی میں شہید ہوچکے تھے اور کتنا اہم قلعے ہاتھ سے نکل چکے تھے، اس کا میدانِ جنگ میں نکل آنا تاریخ کے دھارے کو نہیں بدل سکتا تھا۔

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہوگئے
ساقیا! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہوچکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا[3]

---

[1] نبذة العصر فی احوال ملوک بنی نصر: ص ۱۰۰ تا ۱۰۳

[2] دولۃ الاسلام فی الاندلس لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۳۷؛ نبذة العصر فی احوال ملوک بنی نصر: ص ۱۰۰ تا ۱۰۶

[3] اقبال

شعبان میں ابوعبداللہ محمد پھر نصرانیوں سے لڑنے نکلا۔ اس نے غرناطہ کے جنوب مشرق میں ساحل کے قریب واقع قلعہ اندرش کا رخ کیا۔ [1]

الزغل کی افریقہ روانگی:

ابوعبداللہ کا چچا الزغل نصرانیوں سے صلح کے بعد یہیں مقیم تھا۔ ابوعبداللہ کی آمد کی خبر سن کر وہ اندرش سے نکل گیا اور المریہ میں جا کر قیام کیا۔ اب اس کے پاس برائے نام حکومت کے لیے بھی کوئی شہر یا قلعہ نہ رہا تھا۔ وہ زیادہ دنوں تک غلامانہ زندگی برداشت نہ کر سکا اور آخر کار ہمیشہ کے لیے اندلس چھوڑ کر مراکش کے شہر تلمسان چلا گیا اور وہیں گمنامی کی زندگی گزارتے ہوئے فوت ہو گیا۔ [2]

ابوعبداللہ کا چند قلعوں اور اسلحے کے ذخائر پر قبضہ:

ادھر ابوعبداللہ نے اندرش پر قبضہ کر لیا اور پھر برجہ اور دلید کے قلعے بھی کسی مزاحمت کے بغیر فتح کر لیے۔ تاہم رمضان میں نصرانیوں نے پلٹ کر حملہ کیا اور قلعہ اندرش واپس لے لیا۔ ابوعبداللہ یہ خبر سن کر مجاہدین کے ساتھ نصرانیوں کے دوسرے مضبوط قلعے ہمدان پر حملہ آور ہوا۔ یہاں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں نے سینکڑوں جانوں کی قربانی دی۔ وہ قلعے کی دیواروں کو شکستہ کر کے اس میں گھس گئے اور یہاں کے تمام اسلحے، گولہ بارود اور خوراک کے ذخائر پر قابض ہو گئے جو غرناطہ پر فیصلہ کن حملے کی تیاری کے لیے محفوظ کیے گئے تھے۔

غرناطہ کے دفاع کے لیے بیرونی ممالک سے رسد کا انتظام بہت ضروری تھا۔ رمضان کے اواخر میں ابوعبداللہ نے المنکب کا رخ کیا تاکہ مراکش اور اندلس کا درمیانی راستہ بازیاب کرائے۔ اس نے قلعہ شلوبانیہ پر حملہ کر کے اس کا سختی سے محاصرہ کر لیا مگر اسی دوران اطلاع آئی کہ فرڈیننڈ پنجم نے غرناطہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی ہے۔ ابوعبداللہ کو محاصرہ چھوڑ کر غرناطہ واپس آنا پڑا۔ [3]

فرڈی ننڈ پنجم کا غرناطہ پر حملہ:

تین چار دن بعد فرڈی ننڈ اپنے لاؤ لشکر سمیت غرناطہ کی فصیل کے سامنے آ دھمکا۔ اس کے ساتھ غداروں، ملت فروشوں اور مرتدین کی ایک پوری جماعت تھی جو اسے غرناطہ کی دفاعی کمزوریوں اور اس پر قبضے کے کامیاب طریقوں سے آگاہ کر رہی تھی۔ فرڈی ننڈ پنجم ایک ہفتے تک غرناطہ کے سامنے پڑا رہا۔ وہ فیصلہ کن حملہ کرنا چاہتا تھا مگر یکایک اس نے عقب نشینی اختیار کر لی۔ دراصل انہی دنوں قسطالیہ اور فرانس کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی اور فرڈی ننڈ کو اپنی شمالی سرحدوں کی طرف جانا پڑا۔ اسے اندازہ تھا کہ ابوعبداللہ ایک بار پھر باہر نکلے گا اور قسطالیہ کی سرحد تک تمام چھوٹے موٹے قلعے بلا مزاحمت فتح کر لے گا، لہٰذا واپس جاتے جاتے اس نے ملاحہ، رومہ، مرتین، قرنیہ، لوزات، اندراش اور

---

[1] نبذۃ العصر فی أحوال ملوک بنی نصر: ص ۱۱۱ [2] نفح الطیب: ۴/ ۵۲۳؛ الاعلام للزرکلی: ۶/ ۲۸۹، ۲۹۰

[3] نبذۃ العصر فی أحوال ملوک بنی نصر: ص ۱۱۱؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۳۴

السنـدور سمیت کئی قلعے منہدم کرادیے۔ اس دوران وادیٔ آش سے گزرتے ہوئے وہاں کے ان تمام مسلمانوں کو ذلت وخواری کے ساتھ جلاوطن کردیا جنہوں نے پہلے الزغل پر اعتماد کرتے ہوئے قسطالیہ کی بالادستی قبول کی تھی اور اب ابوعبداللہ کے ساتھ ہوگئے تھے۔ ①

بے کس مسلمان افریقہ اور غرناطہ منتقل:

فرڈی نینڈ پنجم کی واپسی سے فائدہ اٹھا کر غرناطہ کے مسلمان پھر جہاد کے لیے نکلے۔ مرشانہ، غنیانہ، وادیٔ آش اور وادیٔ آنجر کے مسلمان ایک بار پھر غرناطہ کے پرچم تلے آگئے، تاہم ان میں سے کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں تھی، اس لیے ابوعبداللہ کے حکم سے یہاں کے ہزاروں مسلمانوں کو غرناطہ منتقل کردیا گیا۔ ساتھ یہاں کے وسیع وعریض زرعی رقبوں کی فصل کاٹ کر اناج بھی غرناطہ بھیج دیا گیا تاکہ فرڈی نینڈ پنجم سے فیصلہ کن جنگ کے دوران غرناطہ طویل محاصرہ برداشت کرسکے۔ اس مہم کے بعد ابوعبداللہ ۲۳ ذوالقعدہ کو غرناطہ واپس پہنچ گیا۔ ②

فرڈی نینڈ پنجم اس دوران نرمی سے کام لیتا رہا۔ اس نے مفتوحہ شہروں کے مسلمانوں کو اجازت دی کہ وہ جہاں چاہیں رہیں، جہاں چاہیں چلے جائیں۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر المریہ اور بسطہ کے ان گنت مسلمان غرناطہ آگئے۔ ان کی بہت بڑی تعداد سمندر عبور کرکے مراکش چلی گئی اور شہر کے شہر مسلمانوں سے خالی ہوگئے۔ ③

یہ دیکھ کر فرڈی نینڈ پنجم نے اعلان کرادیا کہ جو مسلمان اپنے علاقے چھوڑ کر غرناطہ گئے ہیں، انہیں ہر طرح کی امان ہے، وہ واپس آجائیں۔ اس اعلان پر یقین کرکے غرناطہ آنے والے ہزاروں مسلمان دوبارہ اپنے علاقوں کو لوٹ گئے۔ ④

✦✦✦

---

① نبذة العصر في احوال ملوک بني نصر: ص ۱۱۲ تا ۱۱۳

② نبذة العصر في احوال ملوک بني نصر: ص ۱۱۳ تا ۱۱۶

③ دولة الاسلام في الاندلس لعبدالله عنان المصري: ۵/ ۲۳۸

④ نبذة العصر في احوال ملوک بني نصر: ص ۱۱۶

سقوطِ غرناطہ

فرڈیننڈ پنجم اور ازابیلا کو یقین تھا کہ جب تک غرناطہ فتح نہیں ہو جاتا، اندلس کے مسلمانوں میں حریت کی شمع جلتی رہے گی، اس لیے جمادی الاخریٰ ۸۹۶ھ (اپریل ۱۴۹۱ء) کے موسم بہار میں وہ اس عزم کے ساتھ جنگ کے لیے نکلے کہ اس بار الحمرا فتح کیے بغیر ہرگز واپس نہیں جائیں گے۔ وہ پچاس ہزار سپاہی لے کر غرناطہ روانہ ہوئے (بعض مؤرخین نے تعداد ۸۰ ہزار بتائی ہے)۔ نصرانیوں نے غرناطہ کے قریب پہنچ کر گندم کی تیار فصلوں کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ فرڈی ننڈ پنجم نے غرناطہ کے سامنے ایک فصیل بند چھاؤنی تیار کرائی تا کہ طویل مدت تک یہاں ٹھہرا جا سکے۔ یہ چھاؤنی ایک شہر کی شکل اختیار کر گئی جو "سانتافی" کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ اندلس کا واحد شہر تھا جس میں کبھی کسی مسلمان کے قدم نہیں پڑے تھے۔[1]

موسیٰ کا نعرہ:

غرناطہ کے مسلمان ایک مدت تک فرڈی ننڈ پنجم کی ٹڈی دل افواج کا جم کر مقابلہ کرتے رہے۔ ان کی ہمت بڑھانے میں سپہ سالار موسیٰ بن ابی الغسان پیش پیش تھا۔ اس کا یہ نعرہ ہر کسی کی زبان پر تھا:

"نصرانی بادشاہ جان لے کہ عرب گھڑ سواری اور نیزہ بازی کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔"

غرناطہ کے نامی گرامی جرنیل نعیم بن رضوان اور محمد بن زائدہ موسیٰ کے شانہ بشانہ تھے جنہوں نے نصرانیوں کے اس سیلاب کو پیچھے دھکیلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ آل ثغری شہر کی فصیلوں پر جان توڑ مزاحمت کرتے رہے۔[2]

چھاپہ ماروں کی کامیاب کارروائیاں:

اس دوران غرناطہ کا جنوب مشرق محفوظ تھا اور البشرات کے دیہاتی کوہ شلیر کے راستے سے غرناطہ کو برابر رسد پہنچا رہے تھے جس میں گندم، جو، بھوسا، زیتون کا تیل، کشمش اور دیگر مقامی پیداوار شامل تھی۔ اس دوران پہاڑیوں اور وادیوں کی چھوٹی چھوٹی قلعہ نما بستیوں کے مجاہدین نے نصرانیوں پر چھاپہ مار حملے شروع کر دیے۔ الفخار، بلیانہ، رسانہ، شلفیر، یعمور، جدوی، رملہ القوم، الربیط اور وادی منتیل کے جنگجو مسلمانوں نے اپنی کارروائیوں میں سینکڑوں جانیں دے کر ہزاروں نصرانیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ چھاپہ ماروں نے نصرانیوں کی رسد اور مویشی بھی لوٹنے میں

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۵/ ۲۳۶؛ مورس ان اسپین از لین پول: ص ۱۵۳

[2] دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۵/ ۲۳۹

تیزی دکھائی حتیٰ کہ غرناطہ میں گوشت ارزاں ہوگیا۔ ①

برف باری اور غرناطہ میں قحط:

تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ مسلمان محض وقت حاصل کرنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ کسی شاندار فتح کا دور دور تک امکان نہ تھا۔ بیرونی کمک کی ہر توقع ختم ہوچکی تھی۔ بنو مرین کے بعد مراکش میں برسر اقتدار آنے والے بنو وطاس کی حکومت اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ پرتگال کی افواج نے سمندر عبور کر کے اس کے دو اہم ترین ساحلی شہروں: طنجہ اور سبتہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ مسلمانانِ غرناطہ سمندر اور خشکی دونوں جانب سے گھرے ہوئے تھے۔ سات مہینے تک یہ جھڑپیں جاری رہیں۔ نصرانیوں کو دور دراز کے شہروں سے مسلسل کمک مل رہی تھی جبکہ مسلمانوں کی افرادی قوت محدود تھی۔

اس دوران سردی کا موسم شروع ہوگیا۔ برف باری ہونے لگی، کوہِ شلیر اور سیرا نویدا کی چوٹیاں اور ڈھلوانیں برف سے اَٹ گئیں۔ البشرات سے رسد کا راستہ بند ہوگیا۔ غرناطہ میں مقامی آبادی کے ساتھ گردونواح کے لاکھوں بے گھر افراد جمع ہوچکے تھے، اس لیے رسد بند ہوتے ہی شہر میں بہت جلد قحط کی سی صورتحال پیدا ہوگئی۔ مجاہدین کی بڑی تعداد شہید یا زخمی ہوچکی تھی۔ جھڑپوں کا سلسلہ دھیما پڑ گیا۔ دو ماہ تک فریقین میں کوئی جھڑپ نہیں ہوئی۔ اہلِ شہر میدانِ جنگ میں شکست نہ کھا سکے مگر فاقوں نے انہیں لاچار کردیا۔ ②

آخر ابوالقاسم عبدالملک نے دربار میں اعلان کیا کہ صرف چند دنوں کا راشن باقی رہ گیا ہے، فوج اور عوام ہمت ہار چکے ہیں۔ مزید مزاحمت بے سود ہے۔ موسیٰ بن ابی الغسان واحد شخص تھا جس نے ہتھیار ڈالنے پر غور کرنے سے انکار کردیا اور پورے شدومد سے کہا کہ شہر کا دفاع ہم پر فرض ہے۔ اس نے امرائے سلطنت کو آخری دم تک لڑنے پر ابھارا۔ ابوعبداللہ نے مایوس کن حالات کے باوجود، اس کی بات مانتے ہوئے لڑائی جاری رکھنے کی اجازت دی۔ ③

آخری لڑائی:

شہر کے دروازے ایک مدت سے بند تھے۔ موسیٰ نے انہیں کھولنے کا حکم دیا اور کہا:

''ہم اپنے جسموں سے دروازوں کی حفاظت کریں گے۔''

اس کے الفاظ نے شہر میں ایک نیا جوش پیدا کردیا اور ہر طرف اسلحے کی جھنکار گونجنے لگی۔ غرناطہ کے نوجوانوں نے ایک تازہ حوصلے کے ساتھ نصرانیوں پر زوردار حملے شروع کردیے۔ نعیم بن رضوان اور محمد بن زائدہ صفِ اوّل میں لڑنے والوں کی قیادت کر رہے تھے۔ یہ فوج دن رات لشکرِ صلیب پر بجلیاں گراتی رہتی۔ جب بھی نصرانیوں کا کوئی دستہ شہر کے قریب آتا، یہ لوگ عقابوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے۔ موسیٰ اپنے سپاہیوں سے کہتا تھا: ''ہمارے لیے اس

---

① نبذة العصر فی اخبار ملوک بنی نصر: ص ۱۱۸، ۱۱۹

② نبذة العصر فی اخبار ملوک بنی نصر: ص ۱۲۰ تا ۱۲۲؛ دولة الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۳۰

③ دولة الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۳۹، ۲۳۰

کے سوا کوئی زمین نہیں جس پر ہم کھڑے ہیں۔ اسے کھو کر ہم اپنا نام ونشان، گھر بار اور وطن سب کچھ گم کر دیں گے۔“

آخر کار فرڈی منڈ ہجم نے شہر پر بڑے حملے کا حکم دیا۔ نصرانی ایک ریلے کی طرح صفیں بنا کر غرناطہ کی فصیلوں کی طرف بڑھے۔ اُدھر سے مسلمان بھی سر پر کفن باندھ کر نکل آئے۔ ابوعبداللہ محمد سرکاری سپاہیوں کی قیادت کر رہا تھا جبکہ موسیٰ بن ابی الغسان کے پاس مجاہدین کی کمان تھی۔ فریقین میں نہایت خوں ریز جنگ شروع ہوگئی۔

رضا کاروں پر مشتمل مسلمانوں کی پیادہ فوج نا تجربہ کار تھی، وہ جوش وجذبے کے باوجود، نصرانیوں کا دباؤ برداشت نہ کر سکی اور جنگ کے قہر انگیز لمحات میں ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ یہ دیکھ کر سرکاری فوج بھی جم کر نہ لڑ سکی اور ابوعبداللہ انہیں سنبھالتا ہوا غرناطہ کے دروازے کی طرف پسپا ہو گیا۔

موسیٰ بن ابی الغسان آخری لمحے تک مجاہدین کو دوبارہ منظم کر کے قدم جمانے کی کوشش کرتا رہا تاہم یہ کوشش بے سود رہی۔ آخر میں وہ اپنے مٹھی بھر جاں نثاروں سمیت نصرانیوں کے جم غفیر پر ٹوٹ پڑا۔ کچھ دیر شمشیر وسناں کے جوہر دکھانے اور درجنوں نصرانیوں کو ڈھیر کرنے کے بعد اسے بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ وہ نہایت غم وغصے اور صدمے کی حالت میں شہر کی طرف پلٹ گیا۔ اس ناکام معرکے کے بعد شہر کے دروازے سختی سے بند کر دیے گئے۔ حملہ آوروں کو پسپا کرنے کی ہر امید ختم ہوگئی۔ غرناطہ پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ [1]

قصر الحمراء کا اجلاس:

اس دوران حکومتِ غرناطہ عالم اسلام کے مختلف ممالک سے مدد طلب کرنے کے لیے سفیر بھیج چکی تھی مگر کہیں سے کوئی کمک نہیں آئی۔ مراکش نے بھی جو ماضی میں اندلس کا معاون ومحافظ رہا، خاموشی اختیار کیے رکھی۔

ماہِ صفر میں ابوعبداللہ کی موجودگی میں علماء، امرائے فوج اور عمائدِ شہر کا اجلاس ہوا۔ سب قصر الحمراء کے مرکزی ہال ”قمارش“ میں جمع ہوئے۔ ان کے چہروں پر خوف واضطراب اور مایوسی صاف دکھائی دیتی تھی۔ ساری صورتحال پر غور کیا گیا۔ دو ہی راستے تھے: انجام کی پروا کیے بغیر لڑنا، یا ہتھیار ڈال کر خود کو دشمن کے حوالے کر دینا۔

ابوالقاسم نے آگاہ کیا کہ ہماری گھڑ سوار فوج کا بہترین حصہ کام آچکا ہے، دفاع کی امید ختم ہو چکی ہے، اناج ختم ہونے کو ہے اور کہیں سے کوئی کمک ملنے کا کوئی امکان نہیں۔

ان حالات میں تمام امراء نے اتفاق کیا کہ دشمن سے باعزت شرائط پر صلح کر لینی چاہیے۔ تاہم موسیٰ بن ابی الغسان نے بلند آواز سے اس رجحان کی مخالفت کی۔ اس نے گرج کر کہا:

”ابھی راستے بند نہیں ہوئے۔ ایک ایسا راستہ ہے جس سے کوئی کرشمہ دکھایا جا سکتا ہے۔ ہماری مایوسی نے ہمیں اس حال تک پہنچایا ہے۔ ہم عوام کو لڑنے مرنے پر آمادہ کریں گے، ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھما دیں گے،

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۳۹، ۲۴۰ ؛ مورس ان اسپین، لین پول: ص ۱۵۳

ہم آخری سانس اور آخری جان تک دشمن سے لڑیں گے۔ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ غرناطہ کو دشمن کے سامنے سرنگوں دیکھوں۔ مجھے اس پر فخر ہوگا کہ میری لاش ان لوگوں میں ملے جو غرناطہ کے دفاع میں قربان ہو گئے۔"[1]

اے دورِ بتاں، دورِ فتن، دورِ غلامی
پیمانہ تیری عمر کا ہم بھر کے ہٹیں گے
طوفانِ حوادث سے نہ منہ موڑیں گے جاں باز
ہرگز نہ یہ تیراک سمندر سے ہٹیں گے[2]

مگر اس بار موسیٰ بن ابی الغسان کی شعلہ نوائی، دربار کے ماحول میں کوئی تبدیلی نہ لاسکی۔ لوگ اس حالت سے گزر رہے تھے جس میں بہادروں کی للکار اور شعراء کے رجز کی جگہ بوڑھوں کی نصیحت پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

صلح کے حامی امراء نے کہا:

"ہم نے مراکش میں سفیر بھیج کر دیکھ لیا، ہماری فریاد سن کر بھی کوئی مدد کے لیے نہیں آیا۔ دشمن ہمارے بالمقابل اپنا مرکز قائم کر کے رہنے بسنے لگا ہے۔ اس کی قوت بڑھتی جارہی ہے اور ہم دن بدن کمزور ہو رہے ہیں۔ اسے مختلف شہروں سے کمک پہنچ رہی ہے۔ ہماری کمک و رسد بند ہے۔ اب موسم سرما شروع ہو گیا ہے۔ اس وقت دشمن نے اپنی فوج بکھیر دی ہے۔ جنگ رکی ہوئی ہے۔ ابھی اگر ہم اس سے مذاکرات کریں تو ہمارے تمام مطالبات مان لیے جائیں گے۔ اگر ہم نے دیر کی اور موسم بہار شروع ہو گیا تو تب تک حریف کا بکھرا ہوا لشکر دوبارہ جمع ہو جائے گا اور ہم مزید کمزور اور قلیل ہو چکے ہوں گے۔ ایسی حالت میں وہ ہمارے مطالبے نہیں مانے گا، ہمیں اپنی جانوں کا تحفظ بھی نہیں مل سکے گا۔ ہماری چھاؤنی سے بہت سے لوگ فرار ہو کر دشمن سے جا ملے ہیں اور اسے ہماری تمام کمزوریوں سے آگاہ کر چکے ہیں۔ دشمن ان سے بھی ہمارے خلاف مدد لے رہا ہے۔"

ابوعبداللہ محمد نے مایوسی کے عالم میں کہا:

"آپ حضرات کو جو بھاتا ہے، اور جس پر آپ متفق ہو جائیں وہی کر لیں۔"[3]

ابوعبداللہ کے اس اندازِ فکر سے واضح ہے کہ اس کی قوتِ فیصلہ بالکل جواب دے چکی تھی۔ ایسے میں امرائے دربار میں ہمت کہاں سے آسکتی تھی اور وہ مایوسی کے اندھیرے سے کیسے نکل سکتے تھے۔ حکمرانوں اور قائدین کی ایسی کم ہمتی ہمیشہ قوم کی تباہی کا پیش خیمہ ہوئی ہے۔

شمعِ محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے

---

(1) دولة الاسلام فی الاندلس لعبدالله عنان المصری: ۵/۲۲۱　(2) خواجہ محذوب　(3) نبذة العصر: ص ۱۲۳

رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے
شوقِ بے پروا گیا، فکرِ فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے [1]

سقوطِ غرناطہ کا صلح نامہ:

امراء نے باہم مشورے سے یہ طے کیا کہ چند بہترین سفارت کار، ابو القاسم عبد الملک اور وزیر یوسف بن کماشہ کی قیادت میں فرڈی ننڈ پنجم سے صلح کی بات چیت شروع کریں اور اس سے ایسا معاہدہ کرلیں جس میں مسلمانوں کے مفادات کا مکمل تحفظ یقینی ہو۔ اواخرِ ذوالحجہ ۸۹۶ھ (اکتوبر ۱۴۹۱ء) میں مذاکرات شروع ہوئے اور تین ہفتوں تک جاری رہے۔ مذاکرات کو پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کی گئی کیوں کہ ڈر تھا کہ جنگ کو صلح پر ترجیح دینے والے سپاہیوں اور رضاکاروں کو بھنک پڑ گئی تو وہ بغاوت کردیں گے۔ آخر ایک معاہدہ طے پا گیا جس میں کچھ خفیہ دفعات بھی تھیں جن میں ابوعبداللہ، اس کے امراء اور ان سب کے اہل وعیال کے لیے ممکنہ مراعات اور سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنایا گیا تھا۔ [2]

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ابوعبداللہ اور اس کے مقرب امراء خصوصاً ابو القاسم نے اہلِ غرناطہ سے غداری کرتے ہوئے اپنی مراعات کے لیے فرڈی ننڈ پنجم سے ساز باز کی تھی اور ایسے وقت میں جبکہ شہر کا دفاع ممکن تھا، مسلمانوں کو ایک بے رحم دشمن کے حوالے کردیا تھا۔ مگر ٹھنڈے دل ودماغ سے غور کریں تو زمینی حقائق اس تاثر کی تردید کرتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابوعبداللہ نے آخر تک موسیٰ بن ابی الغسان کے مشورے پر عمل کر کے دشمن سے جنگ جاری رکھی تھی۔ صلح کا معاہدہ اس وقت طے کیا گیا جب لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں رہا تھا۔ موسیٰ جیسے جانباز کے یہی شایانِ شان تھا کہ وہ جنگ پر اصرار کرتا مگر لاکھوں مسلمانوں کی جان ومال اور عزت کی ذمہ داری جس طرح ابوعبداللہ کے سر پر تھی، اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ فرڈی ننڈ پنجم سے کوئی مناسب معاہدہ طے کر کے مسلمانوں کے لیے ہر ممکنہ سہولت حاصل کرلے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ البتہ اس کے ساتھ اس نے اپنے اور اپنے امراء کے لیے ایک پرسہولت زندگی کی ضمانت بھی لی اور عام معاہدے کے ساتھ کچھ خفیہ شقیں بھی طے کرالیں۔ ظاہر ہے یہ کوئی گناہ نہ تھا۔ ابوعبداللہ کی جگہ کوئی بھی ہوتا، اپنی سابقہ شان وشوکت سے محرومی کے بعد کچھ نہ کچھ جائداد اور دولت باقی رکھنے کی کوشش ضرور کرتا۔ ابوعبداللہ، جتنی بڑی سلطنت، دولت اور جائداد فرڈی ننڈ پنجم کے حوالے کر رہا تھا، اس کے عوض اس نے جو کچھ اپنے لیے لیا، وہ کچھ زیادہ نہ تھا۔

ذیل میں اس معاہدے کی اہم شقیں درج کی جارہی ہیں جس پر فرڈی ننڈ پنجم اور ابوعبداللہ کا اتفاق ہوا تھا۔

---

① اقبال
② دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/۲۲۳

❶ مسلمانوں کا بادشاہ، سپہ سالار اور قاضی، ساٹھ دن کے اندر غرناطہ، اس کے مضافات اور قصر الحمراء کو شاہ قسطالیہ کے نمائندوں کے حوالے کرنے کا عہد کرتے ہیں۔

❷ شہر حوالے کرنے کی یقین دہانی کے لیے ابوعبداللہ کا بیٹا، اس کا مشیر خاص ابوالقاسم اور شہری عمائد میں سے پانچ سو افراد سقوطِ غرناطہ تک بطور یرغمال قسطالیہ کے پاس رہیں گے۔

❸ فرڈی ننڈ پنجم کی فوج ان ساٹھ دنوں میں غرناطہ پر حملے معطل رکھے گی۔

❹ مسلمانوں کے پاس قید تمام نصرانی کسی تاوان کے بغیر آزاد کر دیے جائیں گے۔

❺ ابوعبداللہ اور تمام مسلمان امراء، شاہ قسطالیہ سے وفاداری کا حلف اٹھائیں گے۔

❻ البشارۃ ابوعبداللہ کو دیا جائے گا۔ اسے اور اس کے امراء کو مال اور جائداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

❼ امیر غریب، چھوٹے بڑے تمام مسلمانوں کو جان و مال کا بلا امتیاز تحفظ دیا جائے گا۔

❽ مسلمانوں کی اجتماعی املاک، اوقاف، مینار اور منابر کو تحفظ حاصل ہوگا۔ مساجد کی جائدادیں حسب سابق محفوظ ہوں گی۔ ان امور میں نصرانی مداخلت نہیں کریں گے۔

❾ مسلمانوں کے باہمی تنازعات کے فیصلے اسلامی قوانین کے مطابق کیے جائیں گے جس کے مجاز صرف مسلمان قاضی ہوں گے۔

❿ تین سال تک مسلمان ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اس کے بعد وہ اتنا ہی ٹیکس دیا کریں گے جتنا مسلم دور میں دیا کرتے تھے۔

⓫ ساٹھ دنوں تک قسطالیہ کے دس بڑے بحری جہاز مسلمانوں کو بلا معاوضہ افریقہ لے جانے کے لیے مخصوص رہیں گے۔ تین سال کے اندر جو مسلمان افریقہ جا کر آباد ہونا چاہیں گے، انہیں کسی بھی بندرگاہ سے بلا معاوضہ افریقہ سفر کی اجازت ہوگی۔ تین سال بعد بھی مسلمانوں کو کرایہ ادا کر کے افریقہ جانے کی اجازت ہوگی۔ افریقہ جانے والے ہلکے ہتھیار اور منقولہ اثاثے ساتھ لے جاسکیں گے۔

⓬ غرناطہ کے مسلمانوں کو شہر کے اندر یا باہر کسی بھی جگہ رہنے کی اجازت ہوگی۔

⓭ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

⓮ کسی نصرانی یا یہودی کو مساجد میں داخلے کی اجازت نہیں ہوگی۔ مسلمانوں کے گھروں یا مساجد پر نصرانی پہرے دار تعینات نہیں کیے جائیں گے۔ کسی نصرانی کو مسلمانوں کے گھروں میں تاک جھانک کی اجازت نہیں ہوگی۔

⓯ کسی مسلمان کو نصرانیت قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

⓰ اس معاہدے سے قبل اسلام قبول کرنے والے نصرانی مرد و زن کو ترکِ اسلام پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

⓱ کوئی مسلمان چاہے تو برضا و رغبت نصرانیت قبول کر سکتا ہے۔ اس کے لیے اسے مسلمان اور نصرانی علماء

کے مشترکہ اجلاس میں اپنا موقف بیان کرنا ہوگا۔

⓲ مسلمانوں کو شاہی فوج میں شمولیت پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

⓳ مسلمانوں اور نصرانیوں کے مذبح خانے الگ ہوں گے۔

⓴ فرڈی نینڈ پنجم اور ازابیلا مسلم اکثریتی علاقوں میں ایسے حکام تعینات کریں گے جو مسلمانوں سے عزت واحترام کے ساتھ پیش آئیں گے۔

یہ معاہدہ (۲۵ نومبر ۱۴۹۱ء) کو ہوا۔ اس میں ۷۶ شقیں تھیں۔ اس پر ابو عبداللہ، ابوالقاسم عبدالملک، فرڈی نینڈ پنجم، ازابیلا اور قسطالیہ کے کاتب فرنانڈو زافرا کے دستخط تھے۔ فرڈی نینڈ پنجم اور ازابیلا نے اپنے تمام بڑے امراء سمیت عہد کیا کہ اس معاہدے کی کبھی بھی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی، اس میں کبھی بھی کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی۔

خفیہ معاہدے میں یہ طے پایا تھا کہ:

❶ برجہ، دلایہ، مرشانہ، لوشہ اور اندرش کی جاگیریں ہمیشہ کے لیے ابو عبداللہ اور اس کی اولاد کے نام رہیں گی۔

❷ الحمراء حوالے کرنے کے بعد فرڈی نینڈ پنجم تیس ہزار اشرفیاں ابو عبداللہ کو دے گا۔

❸ غرناطہ کے مضافات اور البشرات کے موروثی کھیت اور باغات بدستور ابو عبداللہ اور اس کے وارثین کی جاگیر رہیں گے۔

❹ اگر ابو عبداللہ اور اس کے متعلقین افریقہ جانا چاہیں تو شاہِ قسطالیہ انہیں ان کے تمام منقول اثاثوں سمیت بلامعاوضہ وہاں پہنچائے گا۔[1]

مار ڈالیں گے یہ حالات، چلو سو جائیں:

ابوالقاسم اور یوسف بن کماشہ معاہدے کی دستاویز کو فرڈی نینڈ پنجم سے منظور کرانے کے بعد خفیہ طور پر غرناطہ پہنچے ایک بار پھر قصر الحمراء کے ایوان قمارش میں امرائے غرناطہ کا اجلاس ہوا۔ معاہدے کی دستاویز کو بحث کے بعد حتمی مان لیا گیا۔ صرف موسیٰ بن ابی الغسان نے اس کی مخالفت کی اور مستقبل کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا:

> ''نوحہ وزاری کا کام عورتوں اور بچوں کے لیے چھوڑ دو۔ ہم مرد ہیں۔ ہم آنسو نہیں خون بہانے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ حریت کی روح مرچکی ہے اور غرناطہ کو بچانا محال ہوگیا ہے۔ مگر ایک چیز باقی ہے جسے غیور انسان پسند کریں گے۔ وہ ہے عزت کی موت۔ ہم اپنی آزادی کی خاطر اور دشمن سے انتقام کے لیے کٹ مریں گے۔ فاتحین کے ہاتھوں ظلم کی زنجیریں پہننے سے کہیں بہتر ہے کہ مادرِ وطن ہمیں آزادی کے لیے لڑتا ہوا اپنی آغوش میں لے لے۔ اگر ہماری ہڈیوں کو ایک قبر کی پناہ نہ ملے تو بھی اس آسمان کا سایہ ان پر باقی رہے

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس، لعبد اللہ عنان المصری: ۵/ ۲۲۳ تا ۲۵۰۔
اس کی اصل اسپین کے ''سیماناکا آرکائیو'' میں محفوظ ہے۔ فوٹو کے لیے دیکھئے: ''ہوئے تم دوست جس کے'' از ڈاکٹر حقی حق، ص ۳۵ تا ۵۱

گا۔ اللہ نہ کرے کہ کل کوئی یہ کہے کہ غرناطہ کے شرفاء اپنے دفاع کے لیے مرمٹنے سے ڈرتے تھے۔"

موسیٰ یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ مجلس پر سکوتِ مرگ طاری تھا۔ ابوعبداللہ نے دربار پر نگاہ ڈالی۔ سبھی کے چہروں پر مایوسی کھنڈی ہوئی تھی۔ ابوعبداللہ کے منہ سے نکلا: "اللہ اکبر! ...... لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ...... اللہ کی تقدیر کو کون ٹال سکتا ہے۔ یقیناً میں بدبخت ہوں ...... یہ مملکت میرے ہاتھوں سرنگوں ہوئی تھی۔"

حاضرینِ مجلس نے بے اختیار کہا: "اللہ اکبر! اللہ کا فیصلہ ٹالا نہیں جاسکتا۔"

اس کے بعد امرائے دربار میں سے ہر ایک کی گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ تقدیر اپنا فیصلہ دے چکی ہے۔ جنگ بے سود ہے اور اس معاہدے کو قبول کرنے سے بہتر راستہ اور کوئی نہیں۔ ①

ڈھل گیا چاند، گئی رات، چلو سو جائیں
ہو چکی اُن سے ملاقات، چلو سو جائیں
دُور تک گونج نہیں کسی شہنائی کی
لُٹ گئی آس کی بارات، چلو سو جائیں
جو ہے بیداریاں، اس پہ ہے جینا بھاری
مار ڈالیں گے یہ حالات، چلو سو جائیں ②

موسیٰ بن ابی الغسان کی چشم کشا تقریر:

موسیٰ بن ابی الغسان نوشتۂ تقدیر پڑھ چکا تھا۔ اس نے آخری بار امرائے غرناطہ کو مخاطب کر کے واشگاف الفاظ میں کہا:

"اپنے آپ کو دھوکا مت دو۔ کیا تم گمان کرتے ہو کہ نصرانی معاہدے کی پاسداری کریں گے؟ شاہِ نصاریٰ کی شان و شوکت پرست رہ سمجھو! یہ لوگ ہمارے خون کے پیاسے ہیں۔ ہمیں خوف زدہ کرنے والی چیزوں میں موت سب سے آسان ہے۔ ہمارے سامنے ہے اپنے شہروں کی تباہی و بربادی، اپنی مساجد کی بے حرمتی، اپنے گھروں کی پامالی، اپنی عورتوں کی عصمت دری۔ ہمارے سامنے ہے کھلم کھلا ظلم اور پاگل پن کی حد تک تعصب۔ ہمارے سامنے ہیں کوڑے، طوق، بیڑیاں، جیل خانے، عقوبت خانے اور آگ کے الاؤ۔ بہت جلد ہم ان تمام مظالم کے لیے تختۂ مشق ہوں گے۔ جو بزدل لوگ آج ایک باعزت موت سے ڈر رہے ہیں وہ عن قریب یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ مگر میں ہرگز یہ نہیں دیکھوں گا۔"

موسیٰ بن ابی الغسان یہ کہہ کر تیزی سے دربار سے باہر نکل گیا۔ سب خاموشی سے اسے تکتے رہ گئے۔ موسیٰ نے سر سے پاؤں تک بھاری زرہ پہنی، اسلحہ لگایا، نیزہ تھام کر اپنے برق رفتار گھوڑے پر سوار ہوا اور غرناطہ کی شاہراہوں سے گزرتا ہوا باب البیرہ سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد کسی نے اسے نہیں دیکھا۔

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: 5/ 255، 256 ② قتیل شفائی

تاریخی روایات بتاتی ہیں کہ اسی دن شہر سے باہر ایک زرہ پوش نے دریائے شنیل کے کنارے پہرہ دینے والے پندرہ نصرانیوں کی ایک ٹولی پر تن تنہا حملہ کر دیا۔ اس نے نیزے کے پے در پے وار کر کے کئی نصرانیوں کو مار گرایا۔ جوابی حملے میں وہ خود بھی شدید زخمی ہوا مگر اسی طرح بے جگری سے لڑتا رہا۔ آخر اس کے گھوڑے کو ایک کاری زخم لگا اور گھوڑے کے ساتھ سوار بھی زمین پر آ گرا۔ نصرانیوں نے اسے زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر اس حالت میں بھی وہ گھٹنوں کے بل اٹھ کر خنجر چلاتا رہا اور جب لڑنے کی رمق ختم ہو گئی تو اس نے خود کو دریائے شنیل میں گرا دیا۔ بھاری زرہ بکتر کی وجہ سے وہ تیر نہ سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے ڈوب گیا۔ اس کی لاش نہ مل سکی۔ ①

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمیں پہ نہیں گرتا
گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا ②

قسطالیہ کے لشکر میں شامل بعض عربوں نے جنہیں جبراً نصرانی بنایا گیا تھا، مرے ہوئے گھوڑے کو دیکھ کر گواہی دی کہ یہ موسیٰ بن ابی الغسان کی سواری تھی۔ ③

غرناطہ کی آخری صبح:

جونہی یہ خبر پھیلی کہ شہر نصرانیوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے، غرناطہ کے گلی کوچوں میں شدید اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ ابو عبداللہ اور اس کے امراء کو خطرہ ہوا کہ کہیں ساٹھ دن پورے ہونے سے پہلے ہی شہر میں بغاوت نہ ہو جائے۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ جلد از جلد شہر فرڈی نینڈ پنجم کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے لیے ۲ ربیع الاول ۸۹۷ھ (۲ جنوری ۱۴۹۲ء) کی تاریخ طے ہو گئی۔

یہ مسلمانوں کی تاریخ کا نہایت عبرت ناک دن تھا۔ موذنوں نے آخری بار اندلس کے اس آخری آزاد شہر میں صدائے توحید و رسالت بلند کی جہاں چند ساعت بعد غلامی کی اندھیری رات چھانے والی تھی۔ صبح کے وقت غرناطہ کی سڑکوں سے قصر الحمراء تک موت کا سناٹا تھا، برفیلی ہواؤں کے سبب ہر چیز دھوئیں میں لپٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ الحمراء کے ہر گوشے سے گھٹی گھٹی سسکیاں اُبل رہی تھیں۔ محل کے خدام سامان باندھنے اور اسے منتقل کرنے میں مصروف تھے۔ ابو عبداللہ کی والدہ ملکہ عائشہ اپنے گھوڑے کی زین کس رہی تھی۔

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۵۵، ۲۵۶

یاد رہے کہ موسیٰ بن ابی الغسان کا ذکر اس دور کے کسی اسلامی ماخذ میں نہیں۔ دراصل غرناطہ کے ان آخری دنوں کی داستان لکھنے کے لیے کوئی بچا ہی نہیں تھا۔ اس لیے موسیٰ جیسے نامور مجاہد کے حالات بھی اس دور کے نصرانی مؤرخین ہی کی کتب میں ملتے ہیں۔ صاحب دولۃ الاسلام فی الاندلس نے متعدد یورپی مآخذ سے کشید کر کے ان ایام کے حالات نقل کیے ہیں۔ راقم نے موسیٰ بن ابی الغسان کی پوری روداد انہی سے لی ہے۔

② قتیل شفائی ③ دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۵۶

فرڈی ننڈ پنجم نے احتیاط سے کام لیا اور غرناطہ جانے میں پہل نہ کی، اپنی جگہ اس نے بڑے پادری کارڈینل منڈوس کو تین ہزار سپاہیوں اور نامی گرامی نصرانی امراء کے ساتھ غرناطہ بھیجا۔ یہ جلوس عام شاہراہ سے ہٹ کر ظہر کے وقت قصر الحمراء پہنچا جہاں وزیر غرناطہ یوسف بن کماشہ نے نصرانی عمائد کا استقبال کیا اور غرناطہ کی فوج نے اپنا اسلحہ ان کے حوالے کر دیا۔

ابوعبداللہ اپنی والدہ، بیگمات، بہنوں اور بچوں سمیت پچاس کے لگ بھگ افراد کے ساتھ گھوڑے پر سوار قصر سے باہر نکلا۔ کارڈینل اسے دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا۔ ابوعبداللہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

''لیجیے! یہ قصر آپ کے سپرد ہے۔ اللہ نے ہماری خطاؤں کے سبب ہمیں اس سے محروم کر دیا..... فرڈی ننڈ پنجم اور ازابیلا کو ان کی قابلیت کی وجہ سے اس کا مالک بنا دیا۔''

کارڈینل نے ابوعبداللہ کو تسلی دینے کے لیے چند جملے کہے، ابوعبداللہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شہر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اندلس کے آخری مسلم حکمران کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس آخری اسلامی شہر سے نکلنے کا منظر اتنا کربناک تھا کہ کوئی بھی دیکھنے والا اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔

اب نصرانی سپاہی الحمراء کے دروازوں اور برجوں پر تعینات ہو گئے۔ کارڈینل اور نصرانی عمائد الحمراء کے سب سے بلند مینار ''برج الحراسہ'' پر چڑھے..... صدیوں سے نصب اسلامی پرچم اتار پھینکا اور وہاں نقرئی صلیب آویزاں کر دی۔ الحمراء کے برجوں پر کلیسا کے پرچم لہرا دیے گئے۔ ایک طرف ہزاروں مسلمان سکتے کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہے تھے، دوسری طرف فاتح قوم کے افسران اور سپاہیوں میں جوش کی کیفیت ناقابل بیان تھی۔ ایک سمت آنسوؤں کی برسات تھی اور دوسری طرف فاتحانہ نعرے بلند ہو رہے تھے۔

''غرناطہ ہے ڈان فرنانڈو کا..... غرناطہ ہے ڈونیا ازابیلا کا.....''

کارڈینل کے اشارے پر کلیسا کے مغنیوں نے ساز و طرب کے ساتھ دعائیہ نغمے چھیڑ دیے۔ فرڈی ننڈ پنجم شہر کے باہر الحمراء کے برجوں پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ وہاں صلیب آویزاں ہوتے دیکھ کر وہ پوری فوج سمیت گھٹنوں کے بل گر گیا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

ابوعبداللہ شہر سے نکل کر فرڈی ننڈ پنجم کے پاس پہنچا جو دریائے شنیل کے کنارے گھوڑے پر سوار، ایک عظیم الشان جلوس کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ ابوعبداللہ نے گھوڑے سے اترنا چاہا مگر فرڈی ننڈ پنجم نے منع کر دیا اور اسے گلے سے لگا لیا۔

ابوعبداللہ نے اسے قصر الحمراء اور شہر کی چابیاں پیش کرتے ہوئے کہا:

''یہ اس جنت کی چابیاں ہیں، یہ اندلس میں مسلمانوں کی آخری نشانیاں ہیں۔ اب تم ہماری میراث، ہماری زمین اور ہماری رعایا کے مالک ہو۔ یہی اللہ کا فیصلہ تھا۔ تم اس فتح پر رحم دلی اور انصاف سے کام لینا۔''

فرڈی ننڈ پنجم نے کہا: ''ہمارے وعدوں پر شک نہ کریں۔ تقدیر نے آپ سے جو چھینا ہے، ہماری دوستی کی شکل میں

آپ کو اس کا بہترین بدلہ ملے گا۔"

آگے چل کر ابوعبداللہ کے قافلے کی ملاقات ملکہ ازابیلا کے جلوس سے ہوئی۔ ازابیلا نے ابوعبداللہ کے چھوٹے لڑکے کو جو سقوطِ غرناطہ تک یرغمالی رکھا گیا تھا، اس کے حوالے کر دیا۔ ابوعبداللہ کچھ دن تک ازابیلا کی خیمہ گاہ میں رہا۔ چند دنوں بعد وہ اپنے اہل وعیال اور حشم وخدم کے ساتھ البشرات کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ غرناطہ سے کچھ دور "البلول" کی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا جہاں غرناطہ ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہونے کو تھا۔ ابوعبداللہ نے پلٹ کر آخری بار اس جنتِ ارضی کی طرف دیکھا جہاں آٹھ صد سالہ مسلم دورِ حکمرانی میں تین صدیوں تک آلِ نصر نے بڑی آن بان سے حکومت کی تھی۔ اب ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ملکہ عائشہ نے ڈانٹ کر کہا: "ہاں ہاں! جو بادشاہ مردوں کی طرح اپنے ملک کی حفاظت نہ کر سکے، اسے عورتوں کی طرح آنسو بہانا پڑتے ہیں۔"[1]

اُدھر غرناطہ پر عسکری تسلط مکمل ہونے اور کسی بھی قسم کی مزاحمت کا خدشہ باقی نہ رہنے کے بعد ۶ جنوری ۱۴۹۲ء کو ازابیلا اور فرڈی ننڈ پنجم قصر الحمراء میں داخل ہوئے اور جشنِ فتح مناتے ہوئے امرائے فوج کی شاندار دعوت کی۔

غرناطہ پر قبضہ مکمل ہونے کے بعد معاہدے کی دفعات یکے بعد دیگرے پامال کی جانے لگیں۔ سقوطِ غرناطہ کے چوتھے دن مسلمانوں کے ساتھ پہلی وعدہ خلافی کی گئی اور غرناطہ کی جامع مسجد کو کلیسا میں تبدیل کر دیا گیا۔

اہلِ قسطالیہ نے سقوطِ غرناطہ کے دن یعنی یکم جنوری کو اپنا قومی تہوار قرار دے دیا۔ آئندہ ہر سال اس دن جشن منایا جانے لگا۔[2]

علامہ ابویحییٰ ابن عاصم رحمہ اللہ اپنی تصنیف "جنة الرضیٰ فی التسلیم لما قدر الله تعالیٰ وقضیٰ" میں اس سانحے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جس نے بھی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا ہے وہ جان لے گا کہ نصرانی مسلمانوں سے انتقام لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، انہیں اس میں کوئی عار نہیں ہوتی۔ وہ جزیرۃ الاندلس کی آبادیوں اور چھوٹے بڑے شہروں پر اسی وقت قابض ہوئے جب وہ مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے اور تفرقہ بازی کو پروان چڑھانے میں کامیاب ہوئے۔ نصرانیوں نے اندلس کے امراء کو مکر وفریب کے ذریعے لڑوایا اور سازشوں کے ذریعے اس ملک کے محافظوں کو باہمی خونریزی کے فتنوں میں مبتلا کیا۔ جب تک مسلمان متحد تھے اور علماء متفق تھے، تب تک جنگ میں بھی کبھی مسلمان جیتتے کبھی نصرانی۔"

"مسلمانوں اور نصرانیوں کے درمیان صلح اور جنگ، لڑائیوں اور جنگ بندیوں کو ایک مدت گزر چکی تھی۔

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۵ / ۲۵۷ تا ۲۶۹

[2] دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۵ / ۲۸۵، ۳۶۰

کفار کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ مسلمانوں سے فریب کر کے اور اپنے اندرونی عزائم کو ان سے چھپا کر یہاں سے اسلام اور مسلمانوں کو مٹا دیں۔ وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ وطن کا مستقبل بہتر بنانا، اعلیٰ مقاصد کو پورا کرنا اور یہاں کے عام و خاص باشندوں کا خیال رکھنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ دھوکے کی چال چل رہے تھے اور ملک پر قبضے اور اہل وطن کی ہلاکت کے درپے تھے۔ پس افسوس ہے ان ذہنوں پر جو اس ناممکن بات کو مان گئے اور اس جھوٹ پر یقین کر بیٹھے۔"[1]

ابو عبداللہ کا انجام:

ابو عبداللہ جس کی عمر سقوطِ غرناطہ کے وقت تقریباً تیس سال تھی، تقریباً ایک سال تک البشرات کے قلعے اندرش میں رہائش پذیر رہا۔ رمضان ۸۹۸ھ (اپریل ۱۴۹۳ء) میں شاہ قسطالیہ نے اسے اپنی تمام جاگیروں سے دست بردار ہو کر اندلس چھوڑنے کا حکم دیا کیوں کہ اسے ایک سابق مسلمان حکمران سے کسی بھی وقت بغاوت کا اندیشہ تھا۔ ابو عبداللہ سخت مضطرب ہوا مگر ابو القاسم نے جو فرڈی نینڈ پنجم اور اس کے درمیان سفیر کا کردار ادا کر رہا تھا، سمجھایا کہ نصرانیوں سے ہر وقت بد عہدی کا خطرہ ہے، اس لیے عافیت کے ساتھ یہاں سے نکل جانا بہتر ہے۔[2]

ابو عبداللہ کا اشک انگیز مراسلہ:

ابو عبداللہ نے اس موقع پر مراکش میں بنو وطاس کے امیر محمد بن زکریا کو ایک مراسلہ لکھ کر پناہ کی درخواست کی جس کا حرف حرف، داستانِ عبرت ہے۔ وہ ایک نااہل اور خائن حکمران کے طور پر مشہور ہو چکا تھا، اس مراسلے میں وہ اپنے قصور کا اعتراف اور ساتھ ہی ملت فروشی اور غداری کے الزام سے اپنی برأت ظاہر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"یا الٰہی! میں بری الذمہ نہیں کہ اپنا عذر پیش کروں، طاقت ور نہیں کہ بدلہ لے سکوں، ہاں مگر میں معافی کا طلب گار ہوں، استغفار کرتا ہوں۔ حالات نے جس شخص کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے، اس کی صفائی میں کم از کم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے۔

جہاں تک تحقیقی بات کا سوال ہے تو میں وہی کہتا ہوں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی (سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) نے کہا تھا کہ اللہ کی قسم! اگر میں اس الزام سے برأت ظاہر کروں جو لوگ عائد کر رہے ہیں تو آپ بھی مجھ پر یقین نہیں کریں گے۔ پس مجھے پدرِ یوسف کی طرح یہی کہنا ہے کہ صبرِ جمیل بہتر ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں اپنے عیوب کا انکار نہیں کرتا بلکہ میں تو عیبوں سے بھرا ہوا ہوں۔ میں اپنے گناہوں کی تردید نہیں کر سکتا کہ میں تو معصیت کا پہاڑ ہوں۔ اپنی عاجزی و شکستگی، اپنی لغزشوں اور غلطیوں کا حال اللہ ہی سے کہتا ہوں...... ہم پر جھوٹی افواہوں سے سنگ باری کی گئی اور وہ الزامات لگائے گئے جو کفار پر بھی نہیں لگائے

---

[1] نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۴/ ۵۰۸، ۵۰۹

[2] دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۲۸۵

جاتے۔ اللہ ان لوگوں کو معاف کرے..... ہم جو چاہتے ہیں وہ ہمیشہ حاصل نہیں ہوتا، بہت مرتبہ ہم اس سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ہر شے تقدیر میں لکھی ہے یہاں تک کہ آدمی کا ہوشیار یا احمق ہونا بھی۔"[1]

ابوعبداللہ نے اپنے اہل و عیال سمیت سمندر عبور کر کے مراکش کے شہر فاس میں پناہ لی۔ امیر محمد بن زکریا نے اسے رہنے کے لیے ایک قطعۂ زمین دے دیا جہاں اس نے غرناطہ کے محلات کی طرز پر ایک خوشنما گھر بنالیا۔ تاہم حسرت و یاس نے کبھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

کثرتِ غم بھی میرے غم کا مداوا نہ ہوئی
میرے بے چین خیالوں کو سکوں مل نہ سکا
دل نے دُنیا کے ہر اک درد کو اپنا تو لیا
مضمحل روح کو اندازِ جنوں مل نہ سکا[2]

ابوعبداللہ محمد گمنامی کے طویل ایام گزار کر ۹۴۰ھ میں فوت ہوگیا۔ اس کی عمر لگ بھگ ۷۵ سال تھی۔ اس کے دو بیٹوں: یوسف اور احمد سے اس کی نسل چلتی رہی مگر اقبال مندی اس خاندان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی، یہ لوگ افریقہ میں نہایت غربت و عسرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔[3]

◆◆◆

---

① نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب، للمقری التلمسانی: ۴/ ۵۲۰ تا ۵۲۳

② ساحر لدھیانوی

③ دولۃ الاسلام فی الاندلس، لمحمد عبداللہ عنان المصری: ۵ / ۲۸۷، ۲۸۸؛ التاریخ الأندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ، لعبد الرحمن علی: ص: ۵۵۷

مسلم اَنْدُلُس صغریٰ کے تادیر باقی رہنے کی وجوہ

یہ امر حیرت انگیز محسوس ہوتا ہے کہ قسطالیہ اور ارغون کی ریاستوں نے موحدین کے بعد دو عشروں میں مسلم اندلس کبریٰ کو تہ وبالا کرڈالا مگر مسلم اندلس صغریٰ کو وہ اڑھائی سو سال تک مسخر نہ کرسکے۔

اس کی اصل وجہ تو تقدیر و مشیتِ الٰہیہ ہے جو ہر قوم کو بار بار سنبھلنے کے مواقع دیتی ہے۔ اندلس کے مسلمانوں کی ایک عظیم حکومت سے محرومی کے بعد اللہ نے انہیں ایک طویل وقت دیا کہ وہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کرکے سابقہ نقصانات کا ازالہ کرلیں۔ اس لیے نصرانی شدید تمنا اور کوشش کے باوجود اڑھائی سو سال تک غرناطہ پر قابض نہ ہوسکے۔ تاہم تقدیر کے علاوہ اس کی کچھ ظاہری وجوہ بھی سمجھ آتی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

① موحدین کی حکومت کے خاتمے اور سقوطِ اندلس کبریٰ کا زمانہ عالمی سطح پر مسلمانوں کے لیے نہایت قیامت خیز تھا۔ اس دور میں شام ومصر مسلسل صلیبی جنگوں کی زد میں رہے۔ بنو ایوب کی عظیم سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ افریقہ میں موحدین سمٹتے سمٹتے نصف صدی کے اندر ختم ہوگئے۔ وسط ایشیا سے عراق تک تاتاریوں کا قبضہ ہوگیا۔ پھر ہلاکو کے ہاتھوں بغداد تباہ ہوا اور عباسی خلافت مٹ گئی۔ ان حالات میں پوری اسلامی دنیا سکرات کی کیفیت سے گزر رہی تھی لہٰذا اسلامیانِ اندلس کی ہمتیں بھی پست ہوچکی تھیں۔ بین الاقوامی تناظر میں مسلمانوں کی تباہی دیکھ کر نصرانیوں کے حوصلے آسمان کو چھو رہے تھے۔ ہمتوں اور حوصلوں کا یہ فرق سقوطِ اندلس کبریٰ کی اہم وجہ تھا۔

تاہم نصف صدی بعد بڑی تیزی سے حالات تبدیل ہوئے۔ مصر میں خلافتِ عباسیہ کا احیاء ہوگیا اور مملوکوں کے ہاتھوں تاتاریوں کو عبرت ناک شکستیں ہوئیں۔ رکن الدین بیبرس اور سیف الدین قلاوون کے ہاتھوں نصرانیوں کو ایسی مار پڑی کہ وہ ہمیشہ کے لیے شام کا رُخ کرنے سے باز آگئے۔ پھر ایشیائے کوچک میں عثمانیوں کو ایسا عروج نصیب ہوا کہ بحیرۂ روم پوری طرح ان کی دسترس میں آگیا اور یورپی طاقتیں ان کے نام سے لرزنے لگیں۔

عالمی طور پر مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا لازمی اثر اندلس پر بھی پڑا، یہاں کے مسلمانوں کی ہمتیں بڑھ گئیں جبکہ نصرانیوں کے حوصلے پست ہوگئے۔ انہیں یہ خدشہ لاحق رہا کہ کہیں غرناطہ کو ختم کرنے کی کوشش مہنگی نہ پڑ جائے اور مملوک یا عثمانی اپنے بھائیوں کی مدد کو نہ آجائیں۔

② اندلس کبریٰ کے سقوط کے باوجود ان علاقوں میں مسلمانوں کی مزاحمتی تحریکیں ایک عرصے تک باقی رہیں۔ قسطالیہ اور ارغون کے حکمرانوں کو جنوب کی طرف جانے سے پہلے ان سے پالا پڑتا رہا اور وہ اپنی حفاظت کے لیے

خاصی مدت تک نئے قلعے بنانے اور پرانے قلعوں کی مرمت میں مشغول رہے۔ اس طرح اہل غرناطہ کو خاصا وقت مل گیا کہ وہ اپنی سرحدیں محفوظ کر لیں۔

③ اسپین کے نصاریٰ کو بھی عروج کے بعد زوال ہوا۔ کئی باران کے شہزادوں میں اقتدار کے جھگڑے ہوئے جو بعض اوقات سالہا سال چلے۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ ان کی بڑی مملکتیں ٹوٹ کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تبدیل ہوئیں جن میں سے کوئی بھی تنہا غرناطہ پر قابض ہونے کے قابل نہ تھی۔ یہ صورتحال بھی مسلمانوں کے حق میں رہی۔

④ غرناطہ اور اس کے نواحی قلعوں اور شہروں میں پورے اندلس کے باصلاحیت علماء، ادباء، شعراء، مجاہدین اور فنونِ حرب کے ماہر جمع ہو چکے تھے۔ یہ افرادی قوت نصرانیوں کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوتی رہی۔

⑤ امرائے غرناطہ کی سیاست مصلحت پسندی، موقع شناسی، جوڑ توڑ، اپنی طاقت محفوظ کرنے اور موقع ملنے پر دشمن سے بدلہ لینے پر مبنی تھی۔ یہ پالیسی اس وقت کے لحاظ سے نصرانیوں کے مقابلے میں بہت کامیاب رہی۔

اس وقت غرناطہ کی حیثیت ویسی ہی ہو چکی تھی جیسی عبدالرحمٰن الناصر اور حاجب المنصور کے دور میں لیون، آسٹریاس اور قسطالیہ کے حکام کی تھی کہ جب بھی ان پر چڑھائی ہوتی وہ خراج دینا منظور کر لیتے، ساتھ ہی ایک دو قلعے حوالے کر کے خود کو بچا لیتے۔ پھر جوں ہی مسلمان دوسری طرف متوجہ ہوتے یا ان میں باہمی انتشار پیدا ہوتا، یہ ریاستیں خراج دینا بند کر دیتیں اور مسلمانوں سے ایک دو قلعے چھین لیتیں۔ بنو نصر نے بھی اسی تدبیر پر عمل کر کے مزید سوا دو صدیاں گزار لیں۔

⑥ بیرونی طور پر غرناطہ کو مراکش کے بنو مَرین کی صورت میں مددگار میسر رہے۔ بنو مَرین کے حکمران کئی بار خود لشکر لے کر اندلس کے ساحلوں پر اترے اور نصرانیوں کو پسپا کرتے رہے۔ آڑے وقت میں وہ غرناطہ کو کمک پہنچاتے رہے۔ غرناطہ کے اکثر حکمرانوں نے بنو مَرین سے اچھے تعلقات رکھے۔ اگرچہ درمیان میں ناخوشگوار واقعات اور کشیدگی کے بھی کچھ عارضی وقفے آئے مگر عمومی طور پر دوستی رہی اور مراکش کے حکام کے تعاون کے باعث نصرانیوں کو بار بار پسپا ہونا پڑا۔

⑦ غرناطہ جغرافیائی لحاظ سے بھی نہایت محفوظ علاقہ تھا۔ کوہ سیرانویدا اور جبل البشارات اسے جنوب اور مشرق سے محفوظ بنائے ہوئے تھے۔ سمندر بھی قریب تھا لہٰذا اسے شمالی افریقہ کے ہر ملک سے کمک مل سکتی تھی۔ وادی الکبیر، اس کا دریا، اس کے ملحقہ جنگلات اور ٹیلوں کا وسیع سلسلہ اسے شمال مغرب سے تحفظ فراہم کرتا تھا۔

◆◆◆

غرناطہ کی تاریخ میں دو تین مواقع ایسے بھی آئے کہ مسلمان نصرانیوں سے سابقہ شکستوں کا بدلہ لینے کے قابل ہو گئے۔ اگر وہ ایسے میں متحد رہتے تو اپنے تمام علاقے واپس لے سکتے تھے اور اندلس کبریٰ کی عظیم الشان حکومت کا دوبارہ احیاء کر سکتے تھے مگر افسوس کہ باہمی انتشار و افتراق کا مرض غرناطہ کے ایوانوں میں ہمیشہ پرورش پاتا رہا۔ اس

لیے ایسے شاندار مواقع رائیگاں چلے گئے۔ بنو نصر کے آخری حکمرانوں کے دور میں محلاتی سازشوں، بغاوتوں اور مقتدر طبقے کی باہمی لڑائیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ آخر کار یہی کرتوت غرناطہ کی حکومت کو لے ڈوبے۔

مسلمانوں کی رواداری کے مقابلے میں نصرانیوں کی تنگ دلی:

تاریخ ہمیشہ یہ سوال کرتی رہے گی کہ اگر نصرانی مملکتِ غرناطہ کو باقی رہنے دیتا تو انہیں کیا نقصان تھا؟ اس سے پہلے مسلمانوں نے آٹھ صدیاں نصرانیوں کے ساتھ گزاریں۔ انہوں نے کبھی دوسرے مذاہب کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی کوشش نہیں کی۔ عبدالرحمٰن الناصر جیسے فاتح شمال کے نصرانیوں سے خراج لینے پر اکتفا کرتے رہے۔ مسلمانوں کے اپنے شہروں میں لاکھوں نصرانی پورے آرام و سکون سے آباد رہے۔

نصرانیوں نے بے پناہ فتوحات حاصل کرکے تین وسیع و عریض ریاستیں بنالی تھیں اور اپنی حدود میں پوری آزادی سے جی رہے تھے۔ مسلم آبادی کا بڑا حصہ جنوب کی طرف سمٹ آیا تھا۔ انہیں اپنے دین و مذہب کے مطابق جینے کا حق دینا، ایک انسانی تقاضا تھا۔ مسلمانوں کی سابقہ رواداری دیکھ کر بھی نصرانیوں کو شرم آنی چاہیے تھی کہ وہ انہیں کم سے کم آخری حد میں باقی رہنے دیتے۔ مگر اس کے برخلاف نصرانیوں نے غرناطہ کے اڑھائی سو سالوں میں یہاں مسلسل حملے کیے اور کبھی اس کے لیے تیار نہ ہوئے کہ مسلمانوں کے ساتھ ایک شریف پڑوسی کا برتاؤ کرتے۔

فہرست سلاطین بنوالاحمر، غرناطہ

ابن الاحمر سے لے کر غنی باللہ تک دس حکمران گزرے تھے جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

نمبر	نام حکمران	ہجری سنہ	عیسوی سنہ	مدت حکومت
۱	ابن الاحمر، محمد بن یوسف، محمد اول	۶۳۵ھ تا ۶۷۱ھ	۱۲۳۸ء تا ۱۲۷۳ء	۳۶ سال
۲	الفقیہ، محمد دوم	۶۷۱ھ تا ۷۰۱ھ	۱۲۷۲ء تا ۱۳۰۲ء	۳۰ سال
۳	المخلوع، محمد سوم بن محمد دوم	۷۰۱ھ تا ۷۰۸ھ	۱۳۰۲ء تا ۱۳۰۹ء	۷ سال
۴	ابوالجیوش، نصر بن محمد دوم	۷۰۸ھ تا ۷۱۳ھ	۱۳۰۹ء تا ۱۳۱۳ء	۵ سال
۵	ابوالولید اسماعیل بن فرج	۷۱۳ھ تا ۷۲۵ھ	۱۳۱۳ء تا ۱۳۲۵ء	۱۱ سال
۶	محمد بن ابوالولید اسماعیل، محمد چہارم	۷۲۵ھ تا ۷۳۳ھ	۱۳۲۵ء تا ۱۳۳۳ء	۸ سال
۷	ابوالحجاج بن ابوالولید، یوسف اول	۷۳۳ھ تا ۷۵۴ھ	۱۳۳۳ء تا ۱۳۵۴ء	۲۱ سال
۸	محمد پنجم غنی باللہ، بن یوسف اول	۷۵۴ھ تا ۷۶۰ھ	۱۳۵۴ء تا ۱۳۵۹ء	چھ سال
۹	اسماعیل بن یوسف اول	۷۶۰ھ تا ۷۶۱ھ	۱۳۵۹ء تا ۱۳۶۰ء	ایک سال

۱۰	محمد ششم ابو سعید بن اسماعیل	۷۶۱ھ تا ۷۶۳ھ	۱۳۶۰ء تا ۱۳۶۲ء	دو سال
	محمد پنجم غنی باللہ، دوبارہ	۷۶۳ھ تا ۷۹۳ھ	۱۳۶۲ء تا ۱۳۹۱ء	۳۰ سال

دورِ زوال کے حکمرانوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

نمبر	نام حکمران	سن ہجری	سن شمسی	مدت
۱۱	یوسف دوم، ابوالحجاج بن محمد پنجم	۷۹۳ھ تا ۷۹۷ھ	۱۳۹۱ء تا ۱۳۹۴ء	چار سال
۱۲	محمد ہفتم مستعین باللہ، بن یوسف دوم	۷۹۷ھ تا ۸۱۱ھ	۱۳۹۴ء تا ۱۴۰۸ء	چودہ سال
۱۳	یوسف سوم الناصر بن یوسف دوم	۸۱۱ھ تا ۸۲۰ھ	۱۴۰۸ء تا ۱۴۱۷ء	نو سال
۱۴	محمد ہشتم، الایسر، محمد بن یوسف سوم	۸۲۰ھ تا ۸۳۱ھ	۱۴۱۷ء تا ۱۴۲۸ء	گیارہ سال
۱۵	محمد نہم الزغیر (الصغیر) بن نصر	۸۳۱ھ تا ۸۳۳ھ	۱۴۲۸ء تا ۱۴۳۰ء	دو سال
	محمد ہشتم الایسر۔ دوبارہ	۸۳۳ھ تا ۸۳۵ھ	۱۴۲۹ء تا اواخر ۱۴۳۱ء	دو سال
۱۶	یوسف چہارم بن محمد ششم، ابن الاحمر	ربیع الآخر تا شوال ۸۳۵ھ	جنوری تا جولائی ۱۴۳۲ء	چھے ماہ
	محمد ہشتم، الایسر۔ تیسری بار	۸۳۵ھ تا ۸۳۶ھ	۱۴۳۲ء تا ۱۴۳۲ء	سوا دس سال
۱۷	الاحنف، محمد بن نصر، محمد دہم	۸۳۶ھ تا ۸۳۹ھ	۱۴۳۲ء تا ۱۴۳۵ء	اڑھائی سال
۱۸	یوسف پنجم، سعد بن علی بن اسماعیل	۸۳۹ھ	اواخر ۱۴۳۵ء تا اوائل ۱۴۳۶ء	چند ماہ
	الاحنف، محمد بن نصر، محمد دہم۔ دوبارہ	۸۳۹ھ تا ۸۵۴ھ	۱۴۳۶ء تا ۱۴۵۰ء	پانچ سال
	یوسف پنجم، سعد بن اسماعیل، دوبارہ	۸۵۴ھ تا ۸۷۰ھ	۱۴۵۰ء تا ۱۴۶۴ء	سولہ سال
۱۹	ابو الحسن، علی بن سعد	۸۷۰ھ تا ۸۹۰ھ	۱۴۶۴ء تا ۱۴۸۵ء	سترہ سال
	غرناطہ میں ابو عبداللہ محمد کی باغیانہ حکومت۔ مالقہ میں ابو الحسن کی حکمرانی	۸۸۷ھ تا ۸۸۸ھ	۱۴۸۲ء تا ۱۴۸۳ء	ایک سال
۲۰	الزغل، محمد بن سعد	۸۹۰ھ تا ۸۹۲ھ	۱۴۸۵ء تا ۱۴۸۷ھ	پانچ سال
۲۱	ابو عبداللہ محمد (محمد یازدہم)	۸۹۲ھ تا ۸۹۷ھ	۱۴۸۷ء تا ۱۴۹۲ء	دو سال

◆◆◆

اَندَلُس میں غلاموں کے شب و روز

غرناطہ کے سقوط کے بعد اندلس میں ایک چپہ زمین بھی مسلمانوں کے قبضے میں نہ رہی۔ بعض علماء جن میں غرناطہ کے قاضی علامہ ابن الازرق المغربی رحمہ اللہ کا نام محفوظ ہے، غرناطہ کی بازیابی کے لیے امداد طلب کرنے مراکش گئے مگر یہ کوشش بے سود رہی۔ پھر وہ سلطان مصر قائتبائی کے پاس گئے مگر وہ ترکی کے حکمران بایزید ثانی سے جنگ میں مشغول تھا۔ کوئی بھی اندلس کی طرف توجہ دینے کے لیے فارغ نہ تھا۔[1]

وہ جو آجاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر
جانے کس دیس گئے خواب ہمارے لے کر
وہ جو آسودہ ساحل ہیں انہیں کیا معلوم
اب کے موج آئی تو پلٹے گی کنارے لے کر[2]

فرڈیننڈ کی عہد شکنی:

فرڈی ننڈ پنجم نے فتح کے بعد کچھ دنوں تک اہل غرناطہ کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا اور جو مسلمان افریقہ جانا چاہتے تھے ان کے لیے راستے کھلے رکھے اور بحری جہاز بھی مہیا کر دیے۔ غرناطہ کے بے شمار لوگ نصرانیوں سے معاہدے کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے تمام اثاثے سستے داموں نصرانیوں کو فروخت کر دیے اور افریقہ ہجرت کر گئے۔ انہوں نے اپنی جان اور ایمان کو بچا لیا۔

افریقہ میں اس وقت قحط سالی تھی۔ ہجرت کرنے والوں میں سے بہت سے فاقوں سے مر گئے اور کچھ بھاگ کر واپس اندلس آگئے۔ ان کی زبانی وہاں کے سخت حالات کا چرچا ہوا تو باقی مسلمانوں نے اندلس میں رہنے کو ہی ترجیح دی۔ یہ وہ لوگ تھے جو سفر کی طاقت نہیں رکھتے تھے یا نصرانیوں کے وعدوں پر مطمئن تھے۔

فرڈی ننڈ پنجم اور ازابیلا نے شروع کے سات سالوں میں نرمی سے کام لیا تاکہ مسلمانوں کو کہیں بھی اسلحہ اٹھانے کا خیال نہ آئے اور نصرانی مملکت پوری طرح مستحکم ہو جائے۔ ان سات سالوں میں مسلمان آرام سے زندگی بسر کرتے رہے۔ انہیں یہ یقین ہو گیا کہ انہوں نے نصرانیوں کی سرپرستی میں رہنا قبول کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔

---

[1] الانس الجلیل بتاریخ القدس والخلیل لابی الیمن عبد الرحمن بن محمد الحنبلی: ۲/ ۲۵۵، ط مکتبۃ دندیس عمان

[2] احمد فراز

لیکن متعصب پادری اس ملک سے مسلمانوں کا نام ونشان تک مٹا دینا چاہتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ معاہدے سے ملنے والی مراعات کے باعث مسلمان پُر امن زندگی گزار رہے ہیں تو ان سے برداشت نہ ہوا اور وہ حکام کو مسلمانوں کے خاتمے پر ابھارنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے ہونے چاہئیں۔ وہ اندلس چھوڑ دیں یا نصرانی بن کر رہیں۔ طلیطلہ کے مرکزی کلیسا کا کارڈینل اور ازابیلا کا خاص پادری "فرانسس شمنیس سیزر" اس ذہن سازی میں سب سے آگے تھا۔ فرڈی ننڈ پنجم اور ازابیلا کٹر مذہبی تھے۔ جب ان کے مذہبی رہنما خود عہد شکنی کی ترغیب دینے لگے تو انہیں بھی اس میں کوئی عار نہ رہی۔[1]

انہوں نے رفتہ رفتہ معاہدے کی تمام دفعات کو پس پشت ڈال دیا۔ پہلے اہل غرناطہ پر سخت ٹیکس عائد کر دیے گئے، مساجد کے میناروں پر اذان کی ممانعت کر دی گئی۔ ہزاروں مسلمانوں کو نکال کر گرد ونواح کی بستیوں میں جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ دوسرے مرحلے میں مساجد کو گرجے بنا دیا گیا۔ مسلمان صرف گھروں میں نماز پڑھ سکتے تھے۔ ۹۰۴ھ میں اسلام پر پابندی عائد کر دی گئی اور مسلمانوں کو نصرانی بنانے کی مہم شروع کر دی گئی۔[2]

تاریکی بڑھتی گئی:

۹۰۵ھ میں پادری "فرانسس شمنیس سیزر" غرناطہ آیا اور شہر کے تمام عمائد اور اہل علم کو جمع کر کے نصرانیت قبول کرنے کی ترغیب دی، بدلے میں انہیں گراں قدر تحائف پیش کیے۔ کئی عمائد نے نصرانیت قبول کر لی، یہ دیکھ کر بہت سے عام لوگوں نے بھی ان کی اقتداء کی۔ پادری پہلے پہل وعظ ونصیحت اور پرکشش مراعات کے ذریعے مسلمانوں کو نصرانی بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ اعلان کیا گیا کہ نصرانیت قبول کرنے والوں سے تمام ٹیکس معاف کر دیے جائیں گے، انہیں زمین کی ملکیت کا حق دیا جائے گا۔

عام مسلمانوں پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ کسی مسلمان کو اسلحہ تو در کنار، چھری لے کر باہر نکلنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ غرناطہ کے کچھ مسلمانوں نے مصر کے بادشاہ الظاہر برقوق کو مراسلہ لکھ کر ان الم ناک واقعات کی اطلاع دی اور درخواست کی کہ وہ فرڈی ننڈ پنجم پر سفارتی دباؤ ڈال کر یہاں کے مسلمانوں کے حقوق بحال کرانے کی کوشش کرے۔ سلطان مصر کی طرف سے فرڈی ننڈ پنجم کی طرف احتجاجی سفارت آئی تو اس نے جواب میں ایک چرب زبان نمائندے کو قاہرہ بھیجا جس نے (۱۵۰۱ء میں قاہرہ پہنچ کر) سلطان مصر کو یقین دلایا کہ اندلس میں مسلمانوں کو تمام حقوق مہیا ہیں، البتہ بہت سے مسلمان اپنی خوشی سے نصرانی بن گئے ہیں۔ انہیں ہرگز مجبور نہیں کیا گیا۔ سلطان مصر اس پر مطمئن ہو گیا۔

اپنی فریاد رائیگاں دیکھ کر مسلمانان اندلس کسی بھی بیرونی مدد سے بالکل مایوس ہو گئے۔ دوسری طرف فرڈی ننڈ پنجم نے بیرونی مسلم ممالک سے رابطے کی اس کوشش کو بغاوت سے تعبیر کیا اور مسلمانوں پر مزید سختی شروع کر دی۔[3]

---

[1] دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۳۱۱ تا ۳۱۵

[2] بذالعصر: ص ۱۳۱ [3] دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۳۲۰ تا ۳۲۳

ایک لرزہ خیز منظوم مراسلہ:

اندلس کے علماء اور ادباء وشعراء نے نظم ونثر میں کئی مراسلے لکھ کر نہایت رازداری کے ساتھ قسطنطنیہ ، قاہرہ اور دوسرے طاقتور مسلمان حکمرانوں کو بار بار اپنی الم ناک داستان سنائی مگر ان کی شب الم کی صبح کرنے والا کوئی نہ آیا۔ ۱۵۰۵ء (۹۱۰ھ) میں ایک مسلمان نے اپنے منظوم مراسلے میں عثمانی حکمران سلطان بایزید ثانی کو لکھا تھا:

فَلَمَّا دَخَلْنَا تَحْتَ عَقْدِ ذِمَامِهِمْ ...... بَدَا غَدْرُهُمْ فِينَا بِنَقْضِ الْعَزِيْمَةِ

''جب ہم ان کی ماتحتی میں آئے ...... تو عہد شکنی کے ساتھ ان کی دھوکہ دہی ظاہر ہوگئی۔''

وَخَانَ عُهُوْدًا كَانَ قَدْ غَرَّنَا بِهَا ...... وَنَصَّرَنَا كُرْهًا بِعُنْفٍ وَسَطْوَةٍ

''انہوں نے ہم سے کیے گئے تمام وعدوں میں خیانت کی ...... ہمیں زبردستی ، مجبور کر کے نصرانی بنادیا گیا۔''

وَكُلُّ كِتَابٍ كَانَ فِيْ اَمْرِ دِيْنِنَا ...... فَفِى النَّارِ اَلْقَوْهُ بِهُزْءٍ وَحَقْرَةٍ

''ہماری ہر دینی کتاب کو نہایت حقارت کے ساتھ آگ میں پھینک دیا گیا۔''

وَلَمْ يَتْرُكُوْا فِيْهَا كِتَابًا لِمُسْلِمٍ ...... وَلَا مُصْحَفًا يُخْلٰى بِهٖ لِلْقِرَاءَةِ

''کسی مسلمان کے پاس کوئی کتاب تو کیا کوئی قرآن مجید کا نسخہ تک نہ رہا جسے وہ تلاوت کرتا۔''

وَمَنْ صَامَ اَوْ صَلّٰى وَيُعْلَمُ حَالُهٗ ...... فَفِى النَّارِ يُلْقُوْهُ عَلٰى كُلِّ حَالَةٍ

''کسی کے نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے کی انہیں اطلاع ہوجاتی تو اسے بہرحال آگ میں پھینک دیتے۔''

وَمَنْ لَمْ يَجِىءْ مِنَّا لِمَوْضِعِ كُفْرِهِمْ ...... يُعَاقِبُهُ اللَّبَّاطُ شَرَّ الْعُقُوْبَةِ

''ہم میں سے جو بھی ان کے کفریہ مرکز (چرچ) نہ جائے ، اسے بدترین سزادی جاتی ہے۔''

وَيَلْطِمُ خَدَّيْهِ وَيُؤْخَذُ مَالُهٗ ...... وَيَجْعَلُهٗ فِى السِّجْنِ فِىْ سُوْءِ حَالَةٍ

''اسے منہ پر طمانچے مارے جاتے ہیں ، مال چھین لیا جاتا ہے ، اور جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔''

وَفِىْ رَمَضَانَ يُفْسِدُوْنَ صِيَامَنَا ...... بِاَكْلٍ وَ شُرْبٍ مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ

''رمضان میں وہ ہمیں بار بار کھانے پر مجبور کر کے ہمارے روزے فاسد کرتے ہیں۔''

وَقَدْ اَمَرُوْنَا اَنْ نَسُبَّ نَبِيَّنَا ...... وَلَا نَذْكُرَنْهُ فِىْ رَخَاءٍ وَ شِدَّةٍ

''ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہم اپنے نبی کو گالی دیں۔ اور کبھی اچھی یا بری حالت میں انہیں یاد نہ کریں۔''

وَقَدْ سَمِعُوْا قَوْمًا يُغَنُّوْنَهٗ بِاِسْمِهٖ ...... فَاَدْرَكَهُمْ مِنْهُمْ اَلِيْمُ الْمَضَرَّةِ

''انہوں نے ہمارے کچھ لوگوں کو نعت پڑھتے دیکھا تو انہیں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا۔''

وَعَاقَبَهُمْ حُكَّامُهُمْ وَوُلَاتُهُمْ ...... بِضَرْبٍ وَتَغْرِيْمٍ وَسِجْنٍ وَذِلَّةٍ

''حکام نے انہیں مار پیٹ ، جرمانے ، ذلت اور قید کی سزا دی۔''

وَقَدْ بَدَّلَتْ اَسْمَاؤُنَا وَتَحَوَّلَتْ ...... بِغَيْرِ رِضَا مِنَّا وَغَيْرِ اِرَادَة

''انہوں نے ہمارے نام تک بدل ڈالے جبکہ ہم نے ایسا چاہا نہ ہم اس پر راضی تھے۔''

فَآهاً عَلىٰ تَبْدِيْلِ دِيْنِ مُحَمَّدٍ ...... بِدِيْنِ كِلَابِ الرُّوْمِ شَرِّ الْبَرِيَّة

''آہ! دین اسلام کی جگہ رومی کتوں کا دین آ گیا جو بدترین لوگ ہیں۔''

وَآهاً عَلىٰ تِلْكَ الصَّوَامِعِ عُلِّقَتْ ...... نَوَاقِيْسُهُمْ بِهَا نَظِيْرَ الشَّهَادَة

''آہ! وہ مینار جہاں اب کلمہ شہادت کی جگہ بگل بجائے جاتے ہیں۔''

وَآهاً عَلىٰ تِلْكَ الْبِلَادِ وَحُسْنِهَا ...... لَقَدْ اَظْلَمَتْ بِالْكُفْرِ اَعْظَمَ ظُلْمَة

''آہ! وہ خوبصورت شہر جہاں کفر کی مہیب ترین ظلمت چھا گئی ہے۔''

وَصَارَتْ لِعُبَّادِ الصَّلِيْبِ مَعَاقِلاً ...... وَقَدْ اَمِنُوْا فِيْهَا وُقُوْعَ الْاِغَارَة

''وہ شہر صلیب کے گڑھ بن گئے ہیں۔ نصرانیوں کو اب وہاں کسی حملے کا ڈر نہیں۔''

وَصِرْنَا عَبِيْداً لَا اُسَارىٰ نُفْتَدىٰ ...... وَلَا مُسْلِمِيْنَ نُطْقُهُمْ بِالشَّهَادَة

''ہم غلام ہیں، قیدی نہیں کہ کوئی فدیہ دے کر چھڑا لے۔ ہم ایسے مسلمان بھی نہیں جو کلمہ شہادت پڑھ سکیں۔''

فَلَوْ اَبْصَرَتْ عَيْنَاكَ مَا صَارَ حَالُنَا ...... اِلَيْهِ لَجَادَتْ بِالدُّمُوْعِ الْغَزِيْرَة

''اگر آپ کی آنکھیں ہمارا حال دیکھ لیں تو آپ کے آنسو بہہ پڑیں گے۔''

فَيَاوَيْلَنَا يَا بُؤْسَ مَا قَدْ اَصَابَنَا ...... مِنَ الضُّرِّ وَالْبَلْوىٰ وَثَوْبِ الْمَذَلَّة

''ہائے! یہ کیسی تباہی اور کیسی مصیبت ہے۔ ذلت کا کیسا لبادہ ہے جس میں ہم لپٹے ہوئے ہیں۔''

وَقَدْ بَلَغَ الْمَكْتُوْبُ مِنْكُمْ اِلَيْهِمْ ...... فَلَمْ يَعْمَلُوْا مِنْهُ جَمِيْعاً بِكَلِمَة

''آپ کے خطوط نصرانی حکام تک پہنچے تھے مگر انہوں نے ایک لفظ پر بھی عمل نہیں کیا۔''

وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اعْتِدَاءً وَجُرْاَةً ...... عَلَيْنَا وَاِقْدَاماً بِكُلِّ مَسَاءَة

''بلکہ ان کی سرکشی، ہمارے خلاف جرأت اور ظلم و زیادتی مزید بڑھ گئی۔''

وَقَدْ بَلَغَتْ اِرْسَالُ مِصْرَ اِلَيْهِمْ ...... وَمَا نَالَهُمْ غَدْرٌ وَهَتْكُ حُرْمَة

''مصر والوں کی سفارت بھی ان کے پاس آئی تھی جس سے انہوں نے دھوکے اور بے عزتی کا سلوک کیا۔''

وَقَالُوْا لِتِلْكَ الرُّسُلِ عَنَّا بِاَنَّنَا ...... رَضِيْنَا بِدِيْنِ الْكُفْرِ مِنْ غَيْرِ قَهْرَة

''سفیر کو کہا کہ ہم کسی جبر کے بغیر خوشی سے کافر ہوئے ہیں۔''

لَقَدْ كَذَبُوْا فِيْ قَوْلِهِمْ وَكَلَامِهِمْ ...... عَلَيْنَا بِهٰذَا الْقَوْلِ اَكْبَرَ فِرْيَة

''ہمارے متعلق بالکل جھوٹی بات کہی، یہ سب سے بڑی دروغ گوئی ہے۔''

وَلٰکِنْ خَوْفُ الْقَتْلِ وَالْحَرْقِ رَدَّنَا ..... نَقُوْلُ کَمَا قَالُوْہُ بِغَیْرِ نِیَّۃٖ

''ہاں! قتل اور جلانے کی سزاؤں نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم نیت کے بغیر وہی کہیں جو وہ کہتے ہیں۔''①

آزادی کی پہلی تحریک اور اس کا انجام:

جبری نصرانی بنانے کی مہم نے پہاڑی اور دیہی علاقوں کے مسلمانوں کو شعلۂ جوالا بنا دیا۔ غرناطہ کے مضافاتی قصبوں: بیازین، البشرات اور بلفیق میں مسلمانوں نے ہتھیار اٹھا کر ظلم و بہیمیت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ اندرش میں جہاں نصرانی حاکم نے جامع مسجد کو بارود سے اڑا دیا تھا، مجاہدین نے اعلانِ جہاد کر دیا۔ ایک مدت تک وہ نصرانی افواج سے چھاپہ مار جنگیں لڑتے رہے۔ مگر آخر کار انہیں شکست ہوئی اور نصرانیوں نے ان علاقوں میں مظالم کی انتہا کر دی۔ صاحب ''نبذۃ العصر'' لکھتے ہیں:

''اندلس کے کچھ لوگوں نے نصرانیت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے دفاع کا عزم کر لیا جیسا کہ قریٰ، نجر، البشرۃ، اندرش اور بلفیق کے مسلمان۔ شاہِ قسطلہ نے فوجیں جمع کر کے ان پر حملہ کیا اور انہیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ آخر کار وہ سخت لڑائی کے بعد بزورِ شمشیر ان علاقوں پر قابض ہو گیا۔ اس نے وہاں مردوں کو قتل کرا دیا، عورتوں اور بچوں کو قید کر کے نصرانی بنا لیا اور انہیں غلام قرار دیا۔''②

مغربی اندلس میں جدوجہدِ حریت:

مغربی اندلس میں بھی مجاہدین ایک طویل عرصے تک چھاپہ مار لڑائی لڑتے رہے اور انہوں نے آتش و آہن کے سیلابِ بلا کو بار بار پسپا کیا مگر تا کے..... صاحب ''نبذۃ العصر'' لکھتے ہیں:

''مغربی اندلس میں کچھ لوگ نصرانیت قبول کرنے سے باز رہے، وہ اپنے اہل و عیال سمیت ایک دشوار گزار پہاڑ میں اکٹھے ہو گئے اور وہاں مورچہ بندی کر لی۔ شاہِ قسطلہ فوجیں جمع کر کے ان پر حملہ آور ہوا اور دوسرے مقامات کی طرح وہاں بھی لڑ کر قابض ہونا چاہا مگر اللہ نے اس کی امید پوری نہ کی۔ اللہ نے اس کے خلاف اہلِ ایمان کی مدد کی اور اسے ۲۳ معرکوں کے بعد ناکام لوٹا دیا۔ اس کے سپاہی اور گھڑ سوار بکثرت قتل ہوئے۔ جب اس نے دیکھا کہ ان پر قابو پانا ممکن نہیں تو اس نے انہیں امان دے کر مراکش بھیجنے کا وعدہ کیا۔ وہ لوگ اس پر خوشی سے راضی ہو گئے۔ مگر انہیں کپڑوں کے سوا کوئی سامان ساتھ لے جانے نہیں دیا گیا۔ وعدے کے مطابق انہیں سمندر پار بھیج دیا گیا۔ ان کے بعد کسی کو امید نہ رہی کہ اندلس میں کہیں اسلام باقی رہ سکتا ہے۔ تمام شہروں اور دیہاتوں میں کفر پھیل گیا اور اسلام و ایمان کی روشنی اندلس سے بالکل مٹ گئی۔ یہ ایسا حادثہ ہے جس پر رونے والے روئیں اور ماتم کرنے والے ماتم کریں۔''③

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۳۲۷، ۳۲۸

② نبذۃ العصر فی اخبار ملوک بنی نصر: ص ۱۳۳، ۱۳۲ ③ نبذۃ العصر: ص ۱۳۳ تا ۱۳۵

کتب خانوں کی بربادی:

مزاحمت میں ناکامی کے بعد انتقامی مہم کے دوران نصرانی پادریوں نے مسلمانوں کی تمام علمی متاع ضبط کرلی۔غرناطہ اور گردونواح کی آبادیوں میں گھر گھر کی تلاشی لے کر تمام اسلامی کتب چھین لی گئیں۔شہر کے سب سے بڑے چوک باب الرملہ میں لاکھوں کتابیں بیک وقت ڈھیر کی گئیں۔ان میں سونے کی ملمع کاری سے آراستہ قرآن مجید کے وہ نسخے سب سے نمایاں تھے جنہیں اندلس کے کاتب بڑے شوق اور محبت سے تیار کرتے تھے۔پادریوں نے اس انبار میں سے طب کی تین سو کتب الگ کر کے باقی سارا ذخیرہ نذرِ آتش کرادیا۔یوں اندلس کے مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ علمی دولت وثروت راکھ کا ڈھیر بن گئی۔[1]

پرتگال کے مسلمانوں کا انجام:

یہی قیامت اندلس کے مغربی حصے میں برپا ہوئی جو"پرتگال" نامی الگ مملکت بن چکا تھا۔وہاں بھی لاکھوں مسلمان آباد تھے۔شاہِ پرتگال نے انہیں نصرانیت اختیار کرنے یا ملک چھوڑ جانے کا اختیار دیا۔بہت سے لوگوں نے جو ہجرت کی طاقت نہیں رکھتے تھے،نصرانیت اختیار کرلی۔باقی سب ملک چھوڑ گئے۔جو افریقہ گئے وہ بچ گئے مگر جو فرڈی ننڈ پنجم کو مہربان اور قسطالیہ کو محفوظ سمجھ کر ادھر آئے وہ بدترین آزمائشوں میں مبتلا ہوکر رہے۔[2]

اندلس کے مورسکی اور تفتیشی ادارے:

اس انقلاب کے بعد بھی مسلمان ختم نہیں ہوئے بلکہ وہ ایک نئے طبقے میں ڈھل گئے جنہیں"مورسکی" یا"مراکسی" (حقیر مسلمان) کہا جاتا تھا۔یہ وہ مسلمان تھے جنہیں جبراً مذہب تبدیل کرایا گیا۔ان میں سے شاید ہی کوئی ہو جو دل سے نصرانی ہوا ہو۔خود نصرانیوں کو بھی اس کا احساس تھا،اس لیے انہوں نے جبراً نصرانیت قبول کرنے والوں کو بھی عام نصرانی نہیں سمجھا بلکہ انہیں"اندرسے مسلمان" تصور کرتے رہے۔انہیں اپنی املاک فروخت کرنے یا کسی دوسرے شہر کا سفر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ان کے خلاف جبر وتشدد کا محاذ کھول دیا گیا۔

کارڈینل فرانسس نے فرڈی ننڈ پنجم اور ازابیلا کی سرپرستی میں مورسکین کے"ایمان" کی آزمائش کے لیے تفتیشی ادارے قائم کیے۔پادری ان اداروں کے نگران تھے اور انہیں مکمل اختیارات حاصل تھے۔ان اداروں کی تمام کارروائی خفیہ ہوتی تھی۔"تفتیشی محکموں" کا سربراہ ڈون ڈیگو دیسا نامی ایک سنگ دل پادری تھا۔اس کا کام چن چن کر ان لوگوں کو گرفتار کرنا تھا جن پر مسلمان ہونے کا شک ہوتا۔معمولی باتیں بھی شک کی وجہ قرار دی جاتیں۔تفتیشی اداروں کی طرف سے جاری کردہ ایک سرکلر میں کہا گیا تھا:

"درج ذیل صورتوں میں کسی بھی مورسکی کا اسلام کی طرف رجوع ثابت ہوجائے گا:

---

① دولة الاسلام فی الاندلس،لعبدالله عنان المصری: ۵/ ۳۱۶

② دولة الاسلام فی الاندلس،لعبدالله عنان المصری: ۵/ ۳۲۲

جب وہ اسلام کی تعریف کرے...... یا کہے یسوع خدا نہیں...... یا کہے وہ صرف رسول تھے۔

ہر نصرانی پر لازم ہے کہ وہ ایسی باتیں ہم تک پہنچائے۔ اس پر یہ بھی لازم ہے کہ اگر وہ کسی مورسکی کو دیکھے یا نے کہ وہ بعض اسلامی عادات پر عمل پیرا ہے تو ہمیں اطلاع دے، مثلاً مورسکی جمعے کو گوشت کھانا حلال سمجھے، جمعے کے دن اچھے کپڑے پہنے یا قبلہ رخ ہو کر بسم اللہ کہے، یا جانور کو ذبح کرنے سے پہلے اس کے پاؤں باندھے، یا غیر مذبوحہ جانور کا گوشت نہ کھائے، یا بچوں کا ختنہ کرائے، یا بچوں کے عربی نام رکھے، یا قرآن کی قسم کھائے، یا رمضان میں روزہ رکھے، یا رمضان کے دوران صدقہ نکالے، یا رمضان میں سحری اور افطار کے وقت کھائے پیے، یا خنزیر کے گوشت سے بچے، یا شراب نہ پیے، یا وضو کرے، یا نماز پڑھے، یا اسلامی طریقے پر شادی کرے، یا عربی اشعار پڑھے، یا مردوں کو غسل و کفن دے، یا اپنے آباؤ اجداد کے مسلمان مرنے پر انہیں مرحوم و مغفور قرار دے۔"[1]

جو لوگ اسلام کے شبے میں گرفتار کیے جاتے، انہیں کسی عدالت میں اپنے دفاع یا صفائی کا حق حاصل نہ تھا۔ انہیں عقوبت خانوں میں شدید ترین سزائیں دی جاتیں، کوڑوں سے مارا جاتا، آگ میں جلایا جاتا، یہاں تک کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتے یا نصرانیت پر اپنے ایمان کا یقین دلا دیتے۔

اس زمانے میں یہودیوں اور نصرانیوں میں منافرت عروج پر تھی۔ جب تک اندلس میں مسلمانوں کی حکومت تھی، یہودیوں کو ہر قسم کی جانی و مالی سلامتی نصیب تھی۔ غرناطہ میں آخر تک یہودی آرام کی زندگی بسر کرتے رہے مگر سقوط غرناطہ کے بعد جب فرڈی ننڈ پنجم اور ازابیلا نے اندلس کو خالص کیتھولک نصرانی ملک بنانے کا عزم کیا تو یہودیوں کے لیے بھی اندلس کی زمین تنگ کر دی گئی۔ انہیں بھی ایک محدود وقت کے اندر اندلس چھوڑنے یا نصرانیت قبول کرنے کا حکم دیا گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ یہودی بھی تفتیشی اداروں کی ستم رانیوں کا نشانہ بنے۔ حراست میں لیے گئے افراد کو زمین دوز تاریک عقوبت خانوں میں رکھا جاتا۔ ان میں سے بہت کم کو زندہ نکلنا نصیب ہوتا۔ اکثر تشدد یا بیماریوں کا شکار ہو کر وہیں جان دے دیتے۔[2]

جو لوگ ان ناقابل برداشت آزمائشوں سے تنگ آ کر اندلس سے بھاگنے کی کوشش کرتے، تفتیشی ادارے ان کے پیچھے پڑ جاتے۔ اسی لیے ۹۱۸ھ (۱۵۰۲ء) میں حکم جاری ہوا کہ کوئی ملاح کسی مورسکی کو خصوصی اجازت نامے کے بغیر اپنی کشتی یا جہاز میں سوار نہیں کرے گا۔ اجازت نامے کے بغیر سفر کرنے والے گرفتار کر لیے جاتے اور انہیں تفتیشی اداروں کے حوالے کر دیا جاتا۔[3]

---

① دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۳۳۵، ۳۳۶

② دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۳۳۵ تا ۳۳۶

③ دولۃ الاسلام فی الاندلس، لعبداللہ عنان المصری: ۵/ ۳۳۱

جبری نصرانی بنانے کی مہم کا چشم دید حال:

ان الم انگیز واقعات کے چشم دید شاہد صاحب نبذۃ العصر لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کو جبراً نصرانیت میں داخل کیا گیا، پورا اندلس نصرانی ہوگیا۔ کوئی نہ رہا جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی سرعام گواہی دے سکتا ہو۔ بس اپنے دل میں یا لوگوں سے چھپ کر کلمہ پڑھنے والے لوگ باقی تھے۔ میناروں پر اذان کی جگہ بگل بجائے جانے لگے۔ مساجد میں ذکر وتلاوت کی جگہ تصاویر اور صلیبیں تھیں۔ کتنی ہی آنکھیں اشک بار تھیں۔ کتنے ہی دل غم گین تھے۔ کتنے ہی ضعیف اور غریب مسلمان تھے جو ہجرت کرنے اور اپنے بھائیوں سے جا ملنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ ان کے دلوں میں آگ بھڑک رہی تھی اور ان کے آنسو سیلاب کی طرح جاری تھے۔ وہ اپنے بچوں اور بچیوں کو دیکھ رہے تھے کہ وہ صلیب اور مورتیوں کو سجدہ کرتے ہیں، خنزیر اور مردار کھاتے ہیں اور تمام گناہوں کی جڑ شراب پیتے ہیں۔ مگر وہ انہیں منع نہیں کر سکتے تھے۔ جو ایسا کرتا اسے سخت سزا دی جاتی۔ آہ! یہ کیسا المیہ تھا، ہائے! یہ کتنی بڑی مصیبت تھی۔ یہ تو قیامت کبریٰ تھی۔''[1]

فقہاء کا فتویٰ:

مصیبت زدہ مسلمانوں کو ان حالات میں بھی اپنے دین کی فکر تھی، انہوں نے کسی نہ کسی طرح افریقہ کے فقہاء سے رابطہ کر کے اپنی حالت بتائی اور ایسی زندگی کے بارے میں فتویٰ لیا۔ ایک بڑے فقیہ کی طرف سے جواب آیا:

''ان حالات میں آپ اشاروں سے نماز پڑھ لیا کریں، زکوٰۃ، ہدیے کے نام پر کسی فقیر کو دے دیا کریں، اللہ صورت کو نہیں دلوں کو دیکھتا ہے، غسل جنابت سمندر میں غوطہ لگا کر کیا جا سکتا ہے، نماز پر پابندی ہے تو دن کی نمازیں رات کو ادا کر لیں، آپ کے لیے پانی کی طہارت ناممکن ہے تو تیمم کر لیں چاہے دیواروں پر ہاتھ لگا کر ہو، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو مشہور قول یہ ہے کہ آپ سے نماز اور طہارت ساقط ہے اور قضا بھی نہیں۔ یا اتنا کر لیں کہ جن چیزوں سے تیمم کیا جاتا ہے ان کی طرف اشارہ کر کے تیمم کی نیت کر لیں۔ اگر آپ کو بتوں کے آگے سجدہ ریزی کا حکم دیا جاتا ہے تو کر لیں اور نیت اللہ کی طرف رکھیں۔ اگر وہ مے نوشی پر مجبور کریں تو اس کے استعمال کی نیت کیے بغیر پی لیں۔ اگر خنزیر خوری پر مجبور کریں تو اسے دل سے برا اور حرام سمجھتے ہوئے کھا لیں۔ اگر وہ آپ کے لڑکوں کو نصرانی لڑکیوں سے نکاح کا کہیں تو ایسا کر لیں کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ اگر وہ آپ کی بیٹیوں کو اپنے لڑکوں کے نکاح میں دینے پر مجبور کریں تو اسے حرام اور دل سے برا سمجھیں۔ اگر ممکن ہو تو ایسا نہ کرنے دیں۔ اگر وہ سود خوری پر مجبور کریں تو سودی معاملہ کر لیں مگر اپنے اصل سرمایے کے سوا جو ملے اسے صدقہ کر دیں، اگر وہ کفریہ کلمات پر مجبور کریں تو ذو معنی بات کہہ دیں یا غلط تلفظ کے ساتھ بولیں اور اسے برا سمجھیں، دل کو ایمان پر

---

[1] نبذة العصر فی اخبار ملوک بنی نصر: ص ۱۳۱، ۱۳۲

جمائے رکھیں۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ لوگ ایمان پر قائم ہیں۔ والسلام۔ یکم رجب ۹۱۰ھ۔"[1]

کولمبس اور امریکا کی دریافت:

سقوطِ غرناطہ سے چار عشرے قبل یورپ کی ایشیا سے تجارت کا واحد سمندری راستہ جو بحیرۂ روم سے گزرتا تھا، عثمانی ترکوں کی فتوحات کے سبب بند ہو چکا تھا۔ یورپی جغرافیہ دان اور جہاز ران تب سے اس فکر میں تھے کہ کسی طرح مشرقی ایشیا کے لیے کوئی نیا راستہ تلاش کریں۔ یورپی حکمرانوں سے اس بارے میں ان کی مشاورت ہوتی رہتی تھی۔ اسپین کا ایک یہودی جہاز ران کولمبس اس سلسلے میں پیش پیش تھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ اگر مغرب کی طرف سفر کیا جائے تو کسی نہ کسی طرح مشرقی ایشیا پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ اس منصوبے کو لے کر طویل عرصے تک مالقہ، المریہ، غرناطہ اور قرطبہ میں قیام پذیر رہا مگر اس کے منصوبے کو ہر جگہ مسترد کر دیا گیا اور کوئی بھی اس میں سرمایہ کاری پر آمادہ نہ ہوا۔

غرناطہ کی فتح کے فوراً بعد ازابیلا نے یہودی جہاز ران کولمبس کو اس مہم کی اجازت دے دی اور غرناطہ کے یہودی امراء نے اس مہم کے لیے دل کھول کر سرمایہ فراہم کیا کیوں کہ وہ سمجھ چکے تھے کہ کیتھولک نصرانی حکمران اپنے مذہبی تعصب کی بناء پر بہت جلد ان کی خوشحالی اور ثروت کو پامال کر دیں گے، لہٰذا انہوں نے ایک نئی پناہ گاہ کی تلاش کی مہم میں پورا حصہ لیا۔ کولمبس بحرِ اوقیانوس میں سفر کرتا ہوا ہندوستان تلاش کرنے نکلا مگر ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء (۱۸ ذوالحجہ ۸۹۷ھ) کو وہ جنوبی امریکا کے علاقے ویسٹ انڈیز کے جزیرے "گواناہانی" پہنچ گیا اور ان جزائر پر اسپین کا پرچم لہرا دیا۔ یوں نئی دنیا امریکا کی دریافت ہوئی اور وہاں سے حاصل شدہ وسائل اور پیداوار نے اسپین کو نہایت خوشحال اور مضبوط سلطنت بنا دیا۔[2]

فرڈیننڈ پنجم کے جانشین اور اسپینی استعمار کا عروج:

۱۵۰۴ء (۹۰۹ھ) میں ازابیلا فوت ہو گئی۔ اس نے فرڈی ننڈ پنجم کو وصیت کی تھی کہ وہ شمالی افریقہ فتح کرنے کی کوشش کرے۔ فرڈی ننڈ پنجم نے اس وصیت کے مطابق شمالی افریقہ میں مہمات بھیجیں جو زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ ۱۵۱۶ء (۹۲۲ھ) میں فرڈی ننڈ پنجم بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مسلمانوں نے اس کی حکومت کے آخری چودہ سال نہایت کرب ناک حالت میں گزارے تھے۔ مجموعی طور پر فرڈی ننڈ پنجم نے ۳۷ سال حکومت کی۔ اس نے مکاری، دھوکہ بازی اور گھناؤنی سیاست کے ساتھ جس طرح مسلمانوں سے حکومت چھینی اور پھر جس ظالمانہ اور بہیمانہ انداز میں انہیں کچلا، اس کا داغ تاریخ یورپ کی پیشانی سے کبھی نہیں مٹایا جا سکتا۔

۱۵۱۶ء (۹۲۲ھ) میں فرڈی ننڈ پنجم کی موت کے بعد اس کا نواسا چارلس پنجم تخت نشین ہوا۔ وہ ۱۵۰۰ء (۹۰۵ھ) میں پیدا ہوا تھا اور اس وقت صرف ۱۶ سال کا تھا۔ اس کے دور میں اسپین نے باقاعدہ ایک استعماری ریاست کی شکل

---

[1] دولة الاسلام فی الاندلس، لعبدالله عنان المصری: ۵/ ۳۲۳

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: کرسٹوفر کولمبس

اختیار کرلی۔ اس نے جرمنی، ہالینڈ اور جنوبی اٹلی سمیت یورپ کے وسیع علاقے فتح کر لیے۔ ۱۵۲۲ء (۹۲۸ھ) میں اسپینی جہاز ران سیجی لین جنوبی امریکا کے مغرب میں سفر کرتا ہوا بحر الکاہل سے ہوکر مشرق بعید کے جزیرے فلپائن پہنچ گیا جہاں مسلمان آباد تھے۔ اس کے بعد وہ بحر ہند سے گزر کر واپس اسپین آیا۔ یوں ہسپانویوں نے کرۂ ارض کا پورا چکر لگا کر ایک نئی تاریخ رقم کی اور نئی شکارگاہیں تاک لیں۔ اسپینی افواج نے ۱۵۳۵ء (۹۴۱ھ) میں شمالی افریقہ پر حملہ کرکے تیونس پر بھی قبضہ کرلیا۔ پھر الجزائر پر بھی یلغار کی اور اس کے حکام کو باج گزار بنالیا۔ اس دوران اسپین کی بحری فوج کو عثمانی ترکوں کے مشہور بحری کمانڈر خیر الدین باربروسا سے پالا پڑتا رہا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو اسپینی افواج پورے شمالی افریقہ کو فتح کرلیتیں۔ چارلس کی فرانس سے بھی لڑائیاں جاری رہیں اور وہ پورے یورپ پر چھا گیا۔

۱۵۵۶ء (۹۶۳ھ) میں اس نے حکومت اپنے بیٹے فلپ دوئم کے حوالے کردی اور خود راہب بن گیا۔ اس وقت سلطنتِ اسپین، جرمنی، ہالینڈ کے ساحلی علاقوں، جنوبی اٹلی، جزائر غرب الہند، میکسیکو اور پیرو پر بھی حاوی تھی۔ فلپ دوئم کے دور میں اسپین نے فلپائن پر باقاعدہ فوج کشی کی۔ ۱۵۶۵ء (۹۷۲ھ) میں ہسپانوی فلپائن کے ساحلوں پر قابض ہوگئے۔ ان جزائر کو شاہ فلپ کے نام پر فلپائن کا نام دیا گیا۔ اسپین کی فرانس اور ہالینڈ سے بھی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ فلپ دوئم ۱۵۹۸ء (۱۰۰۶ھ) میں فوت ہوا۔ اس کا لڑکا فلپ سوئم اس کا جانشین بنا جس نے اسپین سے مسلمانوں کے خاتمے کا سیاہ کارنامہ انجام دیا۔ اس سو اصدی میں مسلمانانِ اندلس اپنا وجود کسی نہ کسی طرح باقی رکھنے میں کامیاب رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی زندگی نہایت کٹھن اور تلخ تھی۔[1]

مورسکی مسلمانوں کی بپتا:

اس دوران اسپین میں مسلمانوں کو جبراً نصرانی بنانے کی مہم جاری رہی جس کا زیادہ زور جنوبی غرناطہ اور اس کے گرد و نواح میں تھا۔ بلنسیہ، لیون، ارغون اور دیگر شہروں کے مسلمان جو گزشتہ دو تین صدیوں سے نصرانیوں کی ماتحتی میں تھے، قدرے محفوظ رہے کیوں کہ صدیوں سے اسپین کی زراعت اور صنعت و تجارت کا انحصار انہی ہنرمند مسلمانوں کی قابلیت پر تھا۔ زراعت و آب پاشی کے بہترین تجربے کی بنا پر یہاں کے مسلم کاشت کار پورے یورپ میں مشہور تھے اور نصرانی جاگیردار ان سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتے تھے۔ اگرچہ پادریوں کی پوری کوشش تھی کہ تمام شہروں کے مسلمانوں کو جلد از جلد نصرانی بنایا جائے مگر حکمرانوں اور جاگیرداروں کی معاشی مجبوریاں اور سیاسی مصلحتیں آڑے آتی رہیں۔

جب چارلس پنجم تخت نشین ہوا تو اس کی کم عمری کی وجہ سے اندلس کے مسلمانوں کو رحم کی امید ہوئی۔ انہوں نے طلیطلہ وفد بھیج کر جبری نصرانی بنانے کی مہم ختم کرنے اور عدل و انصاف سے کام لینے کی درخواست کی۔ چارلس پنجم نے پادریوں کو بلا کر مشاورت کی کہ آیا مورسکی مسلمانوں سے جو سلوک ہو رہا ہے وہ ظلم ہے یا عدل۔ پادریوں نے اپنی

---

[1] الأندلسیون المواركة از ڈاکٹر عادل سعید بشتاوی: ص ۱۲۵ تا ۱۳۰؛ تاریخ الدولة العلیة العثمانیة از محامی: ص ۲۰۳ تا ۲۰۵ حاشیہ

بات منوائی۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ موریسکی اسی سلوک کے مستحق ہیں اور یہی ان کے حق میں عدل وانصاف ہے۔ اس فیصلے کے بعد قانونی طور پر تمام مسلمانوں اور ان کی اولاد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نصرانی قرار دے دیا گیا۔ یہ ۱۵۲۵ء (۹۳۱ھ) کا واقعہ ہے۔

بلنسیہ میں مسلمانوں کے ۲۷ ہزار گھرانے تھے جو اس اعلان پر سراپا احتجاج بن گئے اور ہنگامہ کر دیا۔ حکومت نے بڑی مشکل سے ان پر قابو پایا۔ اُدھر غرناطہ کے مسلمان بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ظالمانہ قوانین ختم کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ انہوں نے ۱۵۲۶ء (۹۳۲ھ) میں کچھ اعتدال پسند نصرانی رہنماؤں کو نمائندہ بنا کر چارلس پنجم کے پاس بھیجا تاکہ ان کے ساتھ کچھ رعایت کی جائے۔ چارلس مسلمانوں کو موقع دینا چاہتا تھا مگر اس پر پادریوں کا دباؤ بھی تھا۔ اس نے تمام مسلمانوں کو نصرانی قرار دینے کا قانون باقی رکھا، انہیں ناموں، لباس، زبان اور رسم ورواج میں یورپی تمدن اختیار کرنے کا حکم بھی دیا مگر ساتھ ہی یہ رعایت دی کہ نصرانی مذہب ومعاشرت اختیار کرنے کے لیے انہیں چالیس سال کی مہلت ہے۔ وہ اس دوران پکے نصرانی بن جائیں۔

یہی وہ دن تھے جب یورپ میں اصلاح مذہب کی تحریک شروع ہوئی جس کا بانی جرمنی کا ایک پادری مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء۔ ۱۵۴۶ء) تھا۔ اس نے قدیم مذہبی معتقدات کے خلاف بغاوت کی، عوام کو حق دیا کہ وہ خود بائبل کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس نے پوپ کے غیر معمولی اختیارات کا انکار کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ کیا جائے، پوپ کو چرچ سے باہر کسی شے میں دخیل نہیں ہونا چاہیے۔ چونکہ پادریوں کی اجارہ داری سے یورپی بادشاہ پہلے ہی تنگ تھے، اس لیے مارٹن لوتھر کے ان خیالات کو کئی شاہی گھرانوں میں بھی قبول کر لیا گیا۔ جرمنی، فرانس اور اٹلی کے حکام نے اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔ برطانوی بادشاہ ہنری ہشتم اور ایڈورڈ چہارم اس تحریک کے سرپرست بن گئے۔ لوتھر کے حامیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر ۱۵۲۶ء (۹۳۲ھ) میں پوپ اور یورپی بادشاہوں نے ایک کانفرنس منعقد کی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ہر ملک میں مذہبی آزادی دے دی جائے۔ مگر ۱۵۲۹ء (۹۳۵ھ) میں چرچ نے اس فیصلے کو منسوخ قرار دے دیا۔ اس پر کئی بادشاہوں اور شہزادوں نے احتجاج کیا۔ اسی وجہ سے لوتھر کے حامیوں کو "فرقہ احتجاجیہ" (پروٹسٹنٹ) کہا جانے لگا۔ آخر کار روما کے پوپ نے ہار مان لی اور طے پایا کہ ہر حکمران اپنے ملک میں اپنی پسند کے مذہب کو فروغ دے سکتا ہے۔ اس کے بعد یورپ میں رومن چرچ کے مقابلے میں پروٹسٹنٹ چرچ بھی قائم ہوگیا اور یورپ کی کئی اقوام کیتھولک کلیسا سے الگ ہوگئیں۔

اس انقلاب کا اسپین میں کچھ زیادہ اثر تو نہ ہوا کیوں کہ چارلس کٹر کیتھولک تھا، البتہ اتنا ضرور ہوا کہ مسلمانوں کی نسل کشی کا جنون کچھ کم ہوگیا۔ اس دور میں مسلمانوں پر کبھی سختی ہوتی، کبھی نرمی۔ حکومت نت نئے قوانین بناتی، کبھی مسلمانوں کے لیے کچھ رعایت کر دیتی، کبھی مشکلات بڑھا دیتی۔ خنزیر کا گوشت اور شراب فروخت نہ کرنے والے تاجروں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ عربی زبان بولنے اور عربی لباس کے استعمال کی اجازت تھی مگر اس پر ٹیکس عائد تھا۔

ان حالات میں بھی اکثر مسلمان اپنے دین وایمان پر قائم رہے۔

۱۵۵۶ء سے ۱۵۹۸ء تک چارلس کے بیٹے فلپ دوئم کی حکومت رہی۔ اس نے گزشتہ دور کی برائے نام نرمی کو ختم کر ڈالا۔ جنوری ۱۵۶۵ء (جمادی الاولیٰ ۹۷۲ھ) میں مسلمانوں کو دی گئی چالیس سالہ مدت مکمل ہوتے ہی نئے قوانین کا اجراء ہوا۔ اب روزانہ غسل کرنا بھی اسلام کی علامت قرار دے کر قابلِ سزا ٹھہرا۔ فلپ کے حکم سے قصر الحمراء کے تمام حمام بھی مسمار کر دیے گئے۔ یکم جنوری ۱۵۶۷ء (۸ جمادی الآخرہ ۹۷۴ھ) کو اعلان ہوا کہ تین سال کے اندر اندر تمام مور کی قسطالین زبان سیکھ لیں۔ اس کے بعد کسی کو عربی کا ایک جملہ بولنے یا لکھنے کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ بھی حکم جاری ہوا کہ پندرہ سال کی عمر تک کے تمام مسلمان بچوں کے نام رجسٹرڈ کرائے جائیں تاکہ انہیں جبراً نصرانی مذہب پڑھایا جائے۔ عورتوں کو پردہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ چہرہ کھول کر باہر نکلنا ان پر لازم کر دیا گیا۔ اس دور میں اگر کہیں مسلمانوں سے چشم پوشی برتی گئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض دولت مند مسلمان، تفتیشی اداروں کے افسران کو بطور رشوت خطیر دولت پیش کرتے اور اس کے عوض اپنے علاقے کے لوگوں کو کسی نہ کسی حد تک ان بے جا قوانین کی زد سے بچا لیتے۔[1]

آخری چنگاری:

مایوسی کی انتہاء نے بہت سے غیور مسلمانوں کو ان حالات میں موت کے لیے تیار کر دیا۔ دبے اور کچلے ہوئے لوگوں میں مزاحمت کی چنگاری ایک بار پھر بھڑک اٹھی۔ ہزاروں نوجوان آزادی کی جنگ کے لیے خفیہ تیاری میں مشغول ہو گئے۔ اس تحریک کا بانی غرناطہ کے محلے "بیازین" کا ایک شخص فرج بن فرج تھا۔ اس کے ساتھ ابن داؤد نامی ایک مسلمان ادیب شریک تھا جس نے قوم کی ذہن سازی کے لیے ایک کتابچہ لکھ کر خفیہ طور پر اسے ایک طرف قسطالیہ کے محکوم مسلمانوں اور دوسری طرف مراکش کے امراء تک پہنچایا جس میں مسلمانوں کی غیرت وحمیت کو جھنجھوڑا گیا تھا اور انہیں نصرانیوں کے انسانیت سوز مظالم کے خلاف مزاحمت کی ترغیب دی گئی تھی۔ ذہن سازی اور خفیہ تیاریوں کے بعد دسمبر ۱۵۶۸ء (جمادی الآخرہ ۹۷۶ھ) میں فرج بن فرج نے غرناطہ کے راستے میں نصرانیوں کے ایک اسلحہ بردار قافلے پر چھاپہ مارا جو بندوقوں کی بھاری کھیپ لیے جا رہا تھا۔ (اس زمانے میں بندوقیں ایجاد ہو چکی تھیں اور مجاہدین نے آئندہ چھاپہ مار حملوں میں ان سے پوری طرح کام لیا)۔ اسلحہ حاصل کرتے کے فوراً بعد فرج بن فرج دو سو مجاہدین کے ساتھ غرناطہ کی نواحی بستی بیازین پہنچا اور لوگوں کو ساتھ دینے کی ترغیب دی۔ طے یہ ہوا کہ بیازین اور غرناطہ جیسے شہروں کے مسلمان مالی تعاون ضرور کریں گے مگر عسکری مراکز قلعہ بند شہروں کی جگہ پہاڑوں میں بنائے جائیں گے تاکہ مسلم آبادیاں انتقامی کارروائیوں کا نشانہ نہ بنیں۔

فرج بن فرج مجاہدین کو لے کر جبل شلیر کی طرف چلا گیا۔ لوگ اس کے گرد جمع ہوتے گئے۔ غرناطہ کا ایک بہادر

---

[1] الاندلسیون المواركة از ڈاکٹر عادل سعید بشتاوی، ص ۱۳۱ تا ۱۳۶

اور صاحب ثروت اُموی نوجوان محمد بن اُمیہ شہر چھوڑ کر اپنے اہل خانہ سمیت وہاں پہنچا تو لوگوں نے بنوامیہ کی امارت کے احیا کا فیصلہ کیا۔ اس بیس سالہ نوجوان کو امیر مان کر بیعت کر لی گئی اور ایک تقریب میں اس کی تاج پوشی کی گئی۔ اس کے چچا مسلم بن جوہر کو سپہ سالار مقرر کر دیا گیا۔ مدتوں بعد مسلمانوں نے قبلہ رخ ہو کر باجماعت نماز ادا کی، اسلامی ریاست کے پرچم تیار کیے گئے۔ ابن اُمیہ نے جبل احمر کے محفوظ ترین قلعے حصن اللوز کو مرکز بنایا جہاں سارا سال برف پڑتی تھی اور گلیشیئر زسے دریا پھوٹتے تھے۔

اس سرد ترین مقام پر رہنا کوئی آسان کام نہ تھا مگر سر کی بازی لگانے والوں کی ہمت کسی مشکل کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ محمد بن اُمیہ نے غیر معمولی جرأت، حوصلے اور تدبر کے ساتھ تحریک کی قیادت کی۔ تحریک کا بانی فرج بن فرج اس کے پرچم تلے ایک معمولی سپاہی بن کر لڑتا رہا۔ اس کا نام پھر کبھی نہیں سنا گیا۔

انقلاب کے نقارے پر چوٹ پڑتے ہی مردہ قوم میں جابجا زندگی کی لہر دوڑ گئی اور جگہ جگہ اہل ایمان نصرانیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ تفتیشی اداروں کے سنگ دل پادریوں، مسلمانوں پر ظلم ڈھانے والے درندہ صفت افسران اور سرکاری اہلکاروں کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ البشارۃ کا کوہستان مجاہدین کا اہم مرکز بنا اور نصرانیوں کے خلاف چھاپہ مار جنگ شروع ہوگئی جس کا دائرہ کار اتنی دور تک پھیلا کہ غرناطہ سمیت تمام جنوبی اسپین سے نصرانیوں کا تسلط ختم ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ اندرش، لورہ، کوہستان رندہ، جبل احمر، وادی آش، بیرون اور الحمہ سمیت متعدد اضلاع قسطالیہ کی گرفت سے نکل گئے۔ المریہ اور مالقہ میں حالات قابو میں رہے مگر مضافات میں مجاہدین کا پلہ بھاری تھا۔

نصرانیوں کو ہرگز توقع نہ تھی کہ سقوطِ غرناطہ کے پون صدی بعد بھی اس قوم میں مقاومت کی کوئی رمق ہوگی۔ قسطالیہ کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہاں سے فوجوں پر فوجیں روانہ کی گئیں۔ مجاہدین کے پاس اسلحہ پرانا اور محدود تھا مگر وہ پہاڑی راستوں اور چھاپہ مار جنگ کے ماہر تھے، اس لیے قسطالیہ کی فوجوں کو مسلسل ہزیمت ہوتی رہی۔ اگرچہ بعض معرکوں میں مسلمان بھی شدید نقصانات سے دوچار ہوئے، ایک لڑائی میں ابن اُمیہ کو شکست ہوئی اور وہ پسپائی پر مجبور ہوگیا۔ اس کی والدہ، بیوی، بہنیں اور کئی افسران دشمنوں کے ہاتھ آگئے۔ ان میں سے الزمار نامی مجاہد رہنما کو غرناطہ کے چوک میں ایک ایک بوٹی نوچ کر قتل کیا گیا۔ نصرانی فوجی اپنی ناکامی کا غصہ قیدیوں پر اتارتے رہے۔ غرناطہ کی جیل میں بند تمام قیدیوں کو ایک ہی دن یہ کہہ کر ذبح کر دیا گیا کہ کہیں یہ جیل توڑ کر مجاہدین سے نہ جا ملیں۔

مگر ابن اُمیہ نے ہار نہ مانی۔ ان انتقامی کارروائیوں سے مجاہدین مزید جوش میں آتے رہے اور ان کا یہ نظریہ مضبوط ہوتا گیا کہ میدان میں لڑتے ہوئے مرنا، غلامی اور قید و بند کی صعوبتوں سے کہیں بہتر ہے۔

چار سال تک یہ مجاہدین نصرانی افواج کے حملے پسپا کرتے رہے۔ لڑنے والوں میں مرد ہی نہیں عورتیں بھی شامل تھیں۔ اس دوران ابن اُمیہ نے استنبول، الجزائر اور مراکش کے درباروں میں درخواست بھیجی کہ انہیں کمک بھیجی جائے مگر کہیں سے کوئی مدد نہ آئی۔ اگر بیرونی امداد مل جاتی تو کوئی بعید نہ تھا کہ اس تحریک کے ذریعے کم از کم جنوبی

اندلس کو آزاد کرا لیا جاتا مگر افسوس صد افسوس کہ مسلم حکومتیں مسلمانانِ اندلس پر جیتے جی فاتحہ پڑھ چکی تھیں۔

کیا مجھ کو داغوں نے سرو چراغاں
کبھو تو نے آ کے تماشا نہ دیکھا
تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے
ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا، نہ دیکھا [1]

ہاں عام مسلمان ضرور اس رزم گاہ کی طرف متوجہ ہوئے اور افریقہ اور ترکی کے سینکڑوں رضا کار سمندر عبور کر کے اندلسی بھائیوں کے پاس پہنچنے لگے۔

اس دوران مجاہدین میں عبداللہ بن ابیہ نامی ایک اور نہایت ہوشیار اور عالی ہمت قائد سامنے آیا۔ اس نے ۱۵۶۹ء (۹۷۷ھ) میں غرناطہ کی کلید سمجھے جانے والے قلعے "ارجبہ" کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ بہت جلد اس کے ساتھی البشرات اور رندہ سے مالقہ تک پھیل گئے۔ تحریک کامیابی کی طرف گامزن تھی کہ شاہ فلپ دوئم کے بھائی ڈون خوان نے جو جنوبی اندلس پر قابو پانے کا ذمہ دار تھا، اپنی سازشوں کے ذریعے عبداللہ بن ابیہ اور محمد بن اُمیہ میں پھوٹ ڈلوا دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عبداللہ بن ابیہ کے حامیوں نے محمد بن اُمیہ کو قتل کر دیا۔

اب مجاہدین کی مرکزی قیادت عبداللہ بن ابیہ نے سنبھال لی۔ اس نے بھی اسپینی فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور سرنگ جھکایا۔ کئی ناکام جنگوں کے بعد آخر فلپ دوئم نے ڈون خوان کو ایک بہت بڑا لشکر دے کر جنوبی اندلس بھیجا۔ اس نے غرناطہ سمیت تمام جنوبی شہروں میں مردوں کی نقل و حرکت پر سخت پابندی لگا دی، ہزاروں افراد کو بغاوت میں شرکت کے شبہے میں گرفتار کر لیا۔ شاہراہوں سے لے کر پہاڑی گھاٹیوں تک ہر جگہ سخت پہرے لگا دیے اور مجاہدین کے مختلف مراکز کے درمیان رابطے مسدود کر دیے۔ اس کی فوجیں ایک جامع منصوبے کے تحت مجاہدین کے ٹھکانوں کو گھیرتی رہیں۔ کئی ماہ تک یہ مہم جاری رہی۔ ڈان خوان نے بسطہ کے قریب واقع حصن غرۃ کا محاصرہ کر لیا جہاں ترکی سے آئے ہوئے رضا کاروں سمیت تین ہزار مرد و زن مورچہ بند تھے۔ مجاہدین کئی ماہ تک بڑی پامردی سے لڑتے رہے۔ آخر کار فاقوں سے لاچار ہو کر فروری ۱۵۷۰ء (۹۷۸ھ) میں انہوں نے جان کی امان پر ہتھیار ڈال دیے۔ ڈان خوان نے ان پر قابو پانے کے بعد امان کا وعدہ پس پشت ڈال دیا۔ عورتوں کو باندیاں بنا لیا گیا اور تمام مرد شہید کر دیے گئے۔

اس دوران ایک اور مجاہد سردار "حیقی" جو کہ سیرون، جول اور برشانہ کا مسئول تھا لشکرِ صلیب سے مقابلے کے لیے پہنچا اور ڈان خوان کو چھے سو لاشیں چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ڈان نے جا کر فلپ کو ساری صورتحال بتائی جس کے بعد فیصلہ ہوا کہ مذاکرات اور پرکشش مراعات کے ذریعے اس تحریک کو سبوتاژ کیا جائے۔ ڈان خوان نے مجاہدین کے زعماء سے رابطے کر کے انہیں یقین دلایا کہ اگر وہ ۲۰ دن کے اندر ہتھیار ڈال دیں تو انہیں عام معافی دی جائے گی۔

[1] داغ دہلوی

بصورت دیگر چودہ سال سے زائد عمر کا ہر مسلمان قتل کر دیا جائے گا۔

مجاہدین نے اس اعلان کو پر کاہ کی بھی حیثیت نہ دی، کیوں کہ ایک صدی کا تجربہ ثابت کرتا تھا کہ نصرانیوں کے وعدے نقش برآب ہیں۔ تاہم حبقی صلح پر آمادہ ہو گیا اور اس نے اپنے زیر قبضہ علاقوں کو خالی کر دیا جبکہ اکثر حریت پسندوں نے اپنے قائد عبداللہ ابن ابیہ کا ساتھ دیا اور ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا کیوں کہ انہی دنوں افریقی مجاہدین کی تازہ کمک آئی تھی اور مزید کئی سال تک لڑائی جاری رکھی جانے کی امید تھی۔

ڈان خوان نے حبقی کو بھیج کر مجاہدین کو منانے کی کوشش کی مگر مجاہدین نے حبقی کو غدار قرار دے کر قتل کر دیا۔

ڈان خوان نے سفیر بھیج کر ایک بار پھر صلح کی پیش کش کی۔ ابن ابیہ نے جواب دیا:

''میں اپنے ساتھیوں کو منع نہیں کرتا، وہ جو چاہیں کریں۔ لیکن تم جا کر اپنے آقا کو بتا دو کہ جب تک مجھے بدن ڈھانپنے کے لیے ایک چادر بھی میسر ہے، میں ان کے راستے پر نہیں چلوں گا۔ اگر البشارۃ کا کوئی فرد بھی اسلحہ نہ اٹھائے، تب بھی میں اسلحہ اٹھائے رہوں گا۔ مجھے مسلمان رہ کر جینا مرنا پسند ہے۔ فلپ ثانی کی مراعات منظور نہیں۔''

جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں الجھ کر کیا لیں گے
ایک موت کا دھندا باقی ہے، جب چاہیں گے نپٹا لیں گے [1]

آخر کار ڈون خوان نے بھاری کمک منگوا کر البشارۃ اور مجاہدین کے دوسرے عسکری مراکز پر حملہ شروع کیا۔ تین لشکروں نے بیک وقت حملہ شروع کیا۔ ایک لشکر غرناطہ سے البشارۃ کی طرف بڑھا۔ دوسرے نے رُندہ کا رُخ کیا۔ ڈان خوان نے وادی آش کی طرف پیش قدمی کی۔ اس کا اعلان تھا: ''کوئی رحم ہوگا نہ نرمی۔''

یہ فوجیں ہر گاؤں، ہر بستی، ہر کھیت، ہر باغ، ہر تالاب اور ہر کنوئیں کو تباہ کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہیں تاکہ مسلمانوں کے لیے یہاں رہنا بسنا ممکن نہ رہے۔ مجاہدین آبادیوں سے نکل کر پہاڑ کی چوٹیوں اور غاروں کی طرف پسپا ہوتے رہے۔ بہت سے مجاہدین اور ہزاروں موریسکو نوشتۂ تقدیر پڑھ کر افریقی بھائیوں کی مدد سے سمندر پار چلے گئے۔

باقی ماندہ مجاہدین کمزور ہو چکے تھے۔ نصرانیوں کا سیلاب ہر طرف پھیل کر انہیں کہساروں میں گھیر چکا تھا۔ مجاہدین جگہ جگہ مورچہ بند لڑائی کرتے ہوئے شہید ہوتے اور پیچھے ہٹتے رہے۔ عبداللہ بن ابیہ اپنے بیوی بچوں اور ستر کے لگ بھگ ساتھیوں کے ساتھ ایک غار میں پناہ گزین تھا کہ نصرانیوں نے اس کے دھانے پر قبضہ کر کے آگ لگا دی، دھوئیں سے دم گھٹ کر غار میں موجود تمام افراد شہید ہو گئے۔ عبداللہ بن ابیہ کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا مگر بعد میں ایک غدار نے نصرانیوں سے انعام کی امید پر اسے قتل کر دیا اور لاش غرناطہ پہنچا دی۔ اس دلیر رہنما کا سر کاٹ کر غرناطہ کے پھاٹک پر آویزاں کر دیا گیا اور لاش جلا دی گئی۔ یہ مارچ ۱۵۷۱ء (شوال ۹۷۸ھ) کا واقعہ ہے۔

---

① فیض احمد فیض

۱۵۸۲ء (۹۹۰ھ) میں بلنسیہ کے مسلمانوں نے بھی آخری کوشش کے طور پر اپنے صوبے میں نصرانی حکام کا تختہ الٹنے کی کوشش کی اور بڑی پامردی سے ایک خونریز جنگ لڑی مگر انہیں بھی شکست ہوئی۔

نصرانیوں نے اس مزاحمتی تحریک کا نہایت ہولناک انتقام لیا۔ البشارۃ کے پورے علاقے کو مقتل بنا دیا گیا۔ ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کو ذبح کر دیا گیا۔ جگہ جگہ مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ ہزاروں افراد کو محض بغاوت کی حمایت کے شبہے میں قتل کر دیا گیا، لاشیں پانی میں بہادی گئیں اور اندلس کے دریا مسلمانوں کے خون سے سرخ ہو گئے۔ ان گنت افراد حراست میں لیے گئے اور باقی ماندہ کو بڑے پیمانے پر ادھر سے اُدھر منتقل کیا گیا۔

اسپینی حکام کو اندیشہ تھا کہ ساحل کے قریب آباد مسلمان کسی بھی وقت بیرونی مسلم دنیا سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں، اس لیے ۱۶۰۵ء (۱۰۱۴ھ) میں بحیرۂ روم کے ساحل کو مسلمانوں سے بالکل خالی کر کے ان لوگوں کو اندرونِ ملک بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد اگر کوئی مسلمان کسی ساحل کے قریب بھی پھٹکتا تو قتل کر دیا جاتا۔[1]

کر یاد ان دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں جو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئیں
کیا باب تھے یہاں جو صدا سے نہیں کھلے
کیسی دعائیں تھیں جو یہاں بے اثر گئیں

مسلمانوں کا کلی طور پر اخراج:

تحریکِ مزاحمت کے خاتمے کے بعد مورسکی بالکل ساکت و جامد ہو گئے۔ ظلم و ستم کی تیز تر آنچ کو وہ خاموشی سے سہتے رہے۔ انہیں اپنا انجام معلوم تھا، جو مکمل خاتمے کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ بس صور پھونکے جانے کے منتظر تھے۔ ۱۵۹۸ء (۱۰۰۶ھ) میں فلپ سوئم بادشاہ بنا جس کی بے رحمی اپنی مثال آپ تھی۔ ایک صدی تک مسلمانوں کو کچلنے، پیٹنے اور انہیں اسلام سے برگشتہ کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود نصرانی حکام اور مذہبی پیشوا یہ دیکھ چکے تھے کہ گنے چنے کچھ لوگوں کے سوا مورسکیوں میں سے کوئی بھی دل سے نصرانی نہیں ہوا۔ تین نسلیں گزرنے کے باوجود وہ اندر سے وہ پکے مسلمان ہیں۔ انہیں کبھی بھی نصرانی نہیں بنایا جا سکتا۔

لاٹ پادری کیسپر ڈی کیوروگا نے ۱۵۸۸ء میں ایک سرکاری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''شیطانی عقائد کے پیروکار مسلمان نہ تو نصرانی مذہبی عبادات میں شریک ہوتے ہیں، نہ ہی سڑکوں پر مقدس صلیبی جلوسوں میں نظر آتے ہیں۔ خود کو پابندیوں سے بچانے کے لیے وہ صرف اعتراف گناہ کے لیے پادریوں کے پاس آتے ہیں۔ وہ اپنوں ہی میں شادیاں کرتے ہیں۔ بپتسمہ سے بچانے کے لیے اپنے بچوں کو

---

[1] الاندلسیون المواركة: ص ۱۳۵ تا ۱۸۸؛ دولة الاسلام فی الاندلس لعبدالله عنان المصری: ۵/ ۲۶۵ تا ۳۷۵

چھپائے رکھتے ہیں۔"[1]

مسلمانوں کو نصرانی بنانے میں مکمل ناکامی کے بعد نصرانیوں کے سامنے دو ہی راستے تھے: انسانیت کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمانوں کو اپنے ساتھ رہنے بسنے دیں...... یا درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں ملک سے نکال دیں۔

انسانیت سے عاری حکام نے دوسرا راستہ ہی اختیار کیا۔ ۴ اگست ۱۶۰۹ء (یکم جمادی الاولیٰ ۱۰۱۸ھ) کو فلپ سوئم نے حتمی طور پر مسلمانوں کے اخراج کی منظوری دے دی اور ۲۲ ستمبر کو اعلان کر دیا گیا کہ مسلمانوں کو فی الفور اسپین سے نکلنا ہوگا۔ جبراً نصرانی بنائے جانے والے صرف ایسے افراد کو ملک میں رہنے کی اجازت دی گئی جو چرچ میں حاضر ہو رہے تھے۔ ان کے سوا باقی تمام مسلمانوں کو جو چاہے سرکاری اندراج میں نصرانی قرار دیے گئے تھے مگر عبادات میں غیر حاضر رہ کر مشکوک ہو گئے تھے، ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا۔

توصدیوں سے اس سرزمین میں بسنے والی نسل کو نکلنے کے لیے صرف تین دن کی مہلت دی گئی۔ اتنی دیر میں وہ بھلا کہاں جا سکتے تھے۔ ان کی بڑی تعداد گھروں، محلوں، شہروں اور دیہاتوں سے اُفتاں وخیزاں نکلی اور کسی نامعلوم منزل کی تلاش میں بھٹکنے لگی۔ نصرانی حکام کا مقصد ہی مسلمانوں کا نام ونشان مٹانا تھا اس لیے انہیں ملک بدر کرتے ہوئے ان کی جان ومال کے تحفظ کی ذرا بھی پروا نہیں کی گئی۔ ان سے نہایت شرمناک سلوک کیا گیا۔ انہیں پینے کا پانی بھی نہایت گراں قیمت پر دیا جاتا۔ وہ گرمی سے پناہ کے لیے کسی درخت تلے بیٹھتے تو اس کی بھی قیمت وصول کی جاتی۔

وسطی شہروں کے ۱۴ ہزار نہتے اور بے سروسامان مسلمانوں کو پہاڑی دڑوں میں ٹھونس کر فرانس کی طرف ہانک دیا گیا مگر فرانس نے انہیں جگہ دینے سے انکار کر دیا اور وہ مجبوراً کوہ البرانس کی برف پوش گھاٹیوں میں پھنس کر رہ گئے۔ بے شمار قلاش اور مفلوک الحال افراد کو بحیرۂ روم کے جزیروں کی طرف دھکیل دیا گیا۔ ہزاروں بے خانماں لوگوں کو شمالی افریقہ یا کسی اور محفوظ ملک کی طرف جانے کا موقع دینے کی بجائے بقلونیہ کے راستے خلیج بسکی میں اتار دیا گیا جہاں وہ بحری قزاقوں کا نشانہ بن گئے۔

بلنسیہ کے مسلمانوں نے ان حالات میں ایک بار پھر لڑنے کی ہمت کی مگر انہیں بری طرح کچل دیا گیا۔ اس شہر کے مسلمان اس حالت میں سمندر کی طرف ہانکے گئے کہ ان کے پاس پہننے کے لیے مناسب کپڑوں اور خوراک کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ان میں سے ساڑھے تین ہزار افراد بلنسیہ کے پہاڑوں میں روپوش ہو کر چھاپہ مار جنگ لڑنے لگے۔ تین سال تک وہ حکومت کے لیے دردِ سر بنے رہے۔ آخر ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۲ء) میں حکام نے مذاکرات کر کے انہیں الجزائر کی طرف جلاوطن کر دیا۔ یوں ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۲ء) کے اختتام تک بظاہر اندلس میں کوئی شخص باقی نہ رہا جس کے بارے میں کہا جا سکتا کہ وہ اسلام کا نام لیوا ہے۔[2]

---

[1] ہوئے تم دوست جس کے، از ڈاکٹر حقی حق: ص ۶۲

[2] الاندلسیون المواركة: ۱۸۸ تا ۲۳۳

اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد ۱۶۰۹ء تک، ۱۱۸ سال کے دورِ غلامی میں قتل، لاپتہ یا شمالی افریقہ کی طرف فرار ہونے والے ان گنت مسلمانوں کی تعداد کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی آخر تک اندلس میں عربی اور بربری مسلمانوں کی تعداد چھے لاکھ تک تھی۔ ان میں سے ڈیڑھ لاکھ کو ترک جہاز رانوں نے جان پر کھیل کر الجزائر کے ساحلوں تک پہنچایا۔ تقریباً چالیس ہزار مسلمان وہ تھے جو ہسپانیہ کی مزاحمت توڑنے کے دوران قتل کیے گئے۔ دس ہزار افراد وہ تھے جو شمالی اندلس سے نکل کر مغربی یورپ پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور ترک حکام نے برطانیہ سے مذاکرات کر کے انہیں بحری جہازوں کے ذریعے استنبول منتقل کر لیا۔

ان کے سوا باقی لگ بھگ چار لاکھ مسلمانوں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ وہ بالکل بے نام و نشاں ہو گئے۔ پس یہ بات ظاہر ہے کہ انخلاء کا اعلان کر کے دو تہائی مسلمانوں کو لقمۂ اجل بنا دیا گیا، اور وہ لوگ کم تھے جو مراکش، الجزائر، تیونس یا ترکی جیسے محفوظ علاقوں تک پہنچ سکے۔[1]

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر ان کے مٹ گئے آبادیاں بَن ہو گئیں
دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں
خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں نا اُمیدِ نورِ ایمن ہو گئیں[2]

اسبابِ زوال

اندلس میں مسلمانوں کے زوال اور اسلامی حکومتوں کے خاتمے کے کئی اسباب تھے۔ اگر تفصیلی بات کی جائے تو یہ بحث کئی صفحات پر پھیل جائے گی مگر ہم بات کو مختصر کرتے ہوئے چند اہم اسباب کی طرف صرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ان کی مثالیں گزشتہ صفحات پر جا بجا بکھری دکھائی دیں گی۔

1. مسلمانانِ اندلس اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا حق ادا کرنے سے غافل ہو گئے تھے۔ صدیوں تک وہ حصولِ دولت و ثروت میں منہمک رہے، دنیا کو اپنا مقصد بنا لیا تھا، آخرت کی تیاری کی فکر پس پشت چلی گئی تھی، ایسی حالت میں کوئی بھی قوم زوال کا شکار ہو کر رہتی ہے۔
2. دینِ اسلام کی دعوت کا فریضہ ہر مسلمان پر عائد ہوتا ہے۔ اندلس کے مسلمانوں کے پاس کام کرنے کا بہت

---

① تاریخ الدولۃ العثمانیۃ از یلماز اوزتونا: ۱/ ۳۳۶، ۳۳۷
② اقبال

بڑا میدان تھا۔انہوں نے آٹھ صدیاں اہلِ یورپ کے ساتھ گزاریں۔نصرانیوں سے ان کا گہرا اختلاط رہا۔اس کے باوجود نصرانیوں کو اسلام سے متعارف کرانے پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔عمومی طور پر نصرانیوں کو اسلام کی دعوت دینے کی کوئی تحریک شروع نہیں ہوئی۔مسلمان چار پانچ صدیوں تک اندلس میں غالب طاقت اور معزز ترین طبقے کی شکل میں تھے۔اس وقت یقیناً ان کی دعوت بہت مؤثر ہوتی۔اگر دھیرے دھیرے بھی دعوتِ اسلام کا کام ہوتا تو کوئی بعید نہ تھا کہ اندلس شام ومصر کی طرح مسلم اکثریتی ملک بن جاتا۔دعوتِ دین میں کوتاہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ نصرانی ایک دشمن کی شکل میں ہمیشہ ان سے نبرد آزما رہے اور ان کی مکمل تباہی کا ذریعہ بنے۔

❸ سیاسی اختلاف، نسلی وگروہی انتشار اور خانہ جنگیاں بڑی بڑی مسلم مملکتوں کی تباہی کا باعث بنیں۔اندلس کے مسلم حکمرانوں میں اس قسم کے اختلاف بہت زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ہر عظیم حکومت بہت جلد زوال کا شکار ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہوئی۔اندلس میں ابوعبداللہ اور الزغل جیسے مسلم امراء اس وقت بھی آپس میں لڑ رہے تھے جب فرڈیننڈ پنجم ان کے خلاف لشکر کشی کی تیاری مکمل کر چکا تھا۔یہی انتشار مسلمانوں کو لے ڈوبا۔

❹ اندلس میں مسلمانوں نے ایک عرصے تک اسلامی تہذیب کی نشو ونما کی مگر بہت جلد وہ نصرانی تمدن وثقافت سے متاثر ہونے لگے۔اسلام کی رونقیں مساجد، مدارس اور خانقاہوں تک محدود ہو گئیں۔تہذیبِ فرنگ نے مسلمانوں کو بری طرح متاثر کیا۔مسلمانوں کی بڑی تعداد رقص وسرود، مے نوشی اور دوسری عیاشیوں کے عادی بن گئی۔مسلم امراء نصرانی بیویوں اور رومی باندیوں کے حسن وشباب پر دل وجان فدا کرنے لگے۔

❺ مسلمانانِ اندلس کے آباؤ اجداد نے کتاب وسنت کو رہنما اور اسلحے کو اپنا زیور بنا کر یہ سرزمین فتح کی تھی۔بعد والے مسلمان غرقِ عیش وعشرت ہو گئے۔شمشیر وسناں کی جگہ شعر وشاعری اور طاؤس ورباب ان کی پہچان بن گئے۔جبکہ نصرانیوں نے مذہبی جوش وجذبے کے ساتھ اسلحہ اٹھالیا اور سپاہیانہ صفات پیدا کر کے نسل در نسل مسلمانوں سے لڑتے رہے۔ایک کے بعد دوسرا الفانسو اور ایک کے بعد دوسرا فرڈی ننڈ ان کے لیے تباہی کا پیغام لاتا رہا۔اس کے باوجود مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوئے اور آخر کار برباد ہو کر رہے۔

❻ بنوامیہ کے بعد اندلس کے مقامی مسلمانوں کا جذبۂ جہاد تقریباً سرد پڑ گیا تھا۔اس کے بعد وہ مراکش کے مرابطین، موحدین اور بنومرین کے سہارے اپنا دفاع کرتے رہے۔اگر ان میں شجاعت وجنگجوئی کے اوصاف زندہ ہوتے، تو انہیں کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔اندلس میں آخر تک پندرہ بیس لاکھ مسلمان موجود تھے۔اگر صحیح عسکری تربیت کی جاتی تو اس آبادی سے ایک لاکھ کی فوج تیار کرنا مشکل نہ تھا۔

غرناطہ کا محاصرہ کرنے والے فرڈی ننڈ پنجم کے پاس اسی ہزار سپاہی تھے۔ایسے میں بنونصر غرناطہ کی پانچ لاکھ آبادی سے چالیس ہزار فوج بھی تیار نہ کر پائے۔اگر حکمران سادہ زندگی اختیار کر کے اپنے اقتصادی وسائل کا خاطر خواہ حصہ عسکری تیاری پر خرچ کرتے تو ایک مضبوط فوج کے اخراجات کا انتظام مشکل نہ تھا۔مگر پُرتکلف زندگیوں کا التزام

کرنے کے بعد وہ چند ہزار سپاہیوں کا بوجھ ہی برداشت کر سکتے تھے۔

❼ امرائے اندلس نے نصرانیوں کو دوست سمجھنے کی سخت غلطی کی۔ جبکہ قرآن مجید کہتا ہے:

"ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست مت بنانا۔"[1]

ملوک الطوائف الفانسو کو اپنا سرپرست بنائے ہوئے تھے۔ ابو عبداللہ نے فرڈی ننڈ پنجم سے دوستی لگائے رکھی۔ آخر یہی بھروسہ انہیں لے ڈوبا۔

❽ موروثی نظام حکومت صدیوں سے مسلمانوں کی بڑی بڑی حکومتوں کو کمزور اور منقسم کرتا رہا۔ اندلس کے حکمرانوں نے اسی فرسودہ نظام کو گلے لگائے رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہی گھر میں بیک وقت دو، دو، تین تین حکمرانی کے دعوے دار کھڑے ہوتے رہے۔ اس کا وہی نتیجہ نکلا جو نکلنا تھا۔

❾ اندلس کی تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ مسلمانوں کی بقا، ان کے اتحاد میں ہے اور انتشار ان کے لیے موت کا پیغام ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

+++

[1] سورة المائدة، آیت: ۵۱

مسلم دور میں اسپین کی نصرانی ریاستیں

ریاست لیون، آسٹریاس

نمبر	اہم حکمران	دور حکومت	معاصر مسلم حکمران	ریاستیں
۱	پلائیو (بلائی) بانی ریاست	۱۰۳ھ تا ۱۱۹ھ (۷۲۲ء تا ۷۳۷ء)	مختلف والیان اندلس	
۲	الفانسو اوّل، (اذفونش)	۱۲۱ھ تا ۱۴۰ھ (۷۳۹ء تا ۷۵۷ء)	عبدالرحمٰن اوّل	
۳	الفانسو دوئم	۱۷۵ھ تا ۲۲۷ھ (۷۹۱ء تا ۸۴۲ء)	ہشام اوّل، حکم اوّل، عبدالرحمٰن ثانی	
۴	رومیر اوّل	۲۲۷ھ تا ۲۳۶ھ (۸۴۲ء تا ۸۵۰ء)	عبدالرحمٰن ثانی	
۵	اُردون اوّل	۲۳۶ھ تا ۲۵۲ھ (۸۵۰ء تا ۸۶۶ء)	محمد اوّل	
۶	الفانسو سوئم	۲۵۲ھ تا ۲۹۷ھ (۸۶۶ء تا ۹۱۰ء)	محمد اوّل، منذر، عبداللہ	
۷	غرسیہ اوّل (Garcia)	۲۹۷ھ تا ۳۰۱ھ (۹۱۰ء تا ۹۱۴ء)	عبداللہ	
۸	اُردون دوئم	۳۰۱ھ تا ۳۱۲ھ (۹۱۴ء تا ۹۲۴ء)	عبدالرحمٰن الناصر	
۹	الفانسو چہارم	۳۱۳ھ تا ۳۲۰ھ (۹۲۵ء تا ۹۳۲ء)	عبدالرحمٰن الناصر	
۱۰	رومیر دوئم	۳۲۰ھ تا ۳۳۹ھ (۹۳۲ء تا ۹۵۰ء)	عبدالرحمٰن الناصر	
۱۱	اردون سوئم	۳۳۹ھ تا ۳۳۵ھ (۹۵۰ء تا ۹۵۶ء)	عبدالرحمٰن الناصر	
۱۲	شانجہ اوّل (Sancho)	۳۳۵ھ تا ۳۵۵ھ (۹۵۶ء تا ۹۶۶ء)	عبدالرحمٰن الناصر، حکم ثانی	
۱۳	اردون چہارم		حکم ثانی	
۱۴	رومیر سوئم	۳۵۵ھ تا ۳۷۵ھ (۹۶۶ء تا ۹۸۵ء)	حکم ثانی، حاجب منصور	
۱۵	الفانسو پنجم	۳۸۹ھ تا ۴۱۸ھ (۹۹۹ء تا ۱۰۲۷ء)	حاجب منصور، حاجب المظفر، ملوک الطوائف	

۱۶	الفانسو ششم	۴۶۵ھ تا ۵۰۲ھ (۱۰۷۲ء تا ۱۱۰۹ء)	ملوک الطوائف، یوسف بن تاشفین	آسٹریاس، لیون
۱۷	ملکہ اراک، کاؤنٹ ریمنڈ	۵۰۲ھ تا ۵۳۰ھ (۱۱۰۹ء تا ۱۱۳۶ء)		لیون، قسطالیہ

ریاست نوار

نمبر	اہم حکمران	دور حکومت	معاصر مسلم حکمران	ریاستیں
۱	شانجہ	تا ۲۲۱ھ (تا ۸۳۶ء)	عبدالرحمٰن ثانی	
۲	غرسیہ بن ونقہ	تا ۲۴۸ھ (تا ۸۶۲ء)	عبدالرحمٰن ثانی، محمد اول	
۳	فرتون			
۴	شانجہ غرسیہ اوّل	۲۹۳ھ تا ۳۱۴ھ (۹۰۵ء تا ۹۲۶ء)	عبداللہ، عبدالرحمٰن الناصر	
۵	غرسیہ شانجہ اوّل	۳۱۴ھ تا ۳۵۹ھ (۹۲۶ء تا ۹۷۰ء)	الناصر، حکم ثانی	
۶	شانجہ غرسیہ دوئم (ابرکہ)	۳۵۹ھ تا ۳۸۵ھ (۹۷۰ء تا ۹۹۴ء)	حکم ثانی، حاجب منصور	
۷	غرسیہ شانجہ دوئم	۳۸۵ھ تا ۳۹۱ھ (۹۹۴ء تا ۱۰۰۰ء)	حاجب منصور	
۸	شانجہ غرسیہ سوئم	۳۹۱ھ تا ۴۲۶ھ (۱۰۰۰ء تا ۱۰۳۵ء)	حاجب مظفر، ملوک الطوائف	

ریاست قسطالیہ کے اہم حکمران

۱	فرنانڈ گونسالز	۳۱۸ تا ۳۵۹ھ (۹۳۰ تا ۹۷۰ء)	الناصر، حکم ثانی	ریاستیں
۲	غرسیہ فرڈی ننڈ	۳۵۹ تا ۳۸۹ھ (۹۷۰ء تا ۹۹۵ء)	حاجب منصور	
۳	شانجہ	۳۸۹ تا ۴۱۲ھ (۹۹۵ء تا ۱۰۲۱ء)	حاجب منصور، حاجب مظفر، ملوک الطوائف	
۴	فرڈی ننڈ، فرنانڈو اوّل	۴۲۶ھ تا ۴۵۸ھ (۱۰۳۵ء، ۱۰۶۵ء)	ملوک الطوائف	
۵	شانجہ دوئم			
۶	الفانسو ششم	۴۶۵ھ تا ۵۰۲ھ (۱۰۷۲ء تا ۱۱۰۹ء)	ملوک الطوائف، مرابطین	آسٹریاس، اور لیون

۷	الفانسو ہفتم	ت۵۵۲ھ(ت۱۱۵۷ء)		جلیقیہ، قسطالیہ اور لیون
۸	فرڈی ننڈ دوئم	ت۵۸۴ھ(ت۱۱۸۸ء)		
۹	الفانسو ہشتم	ت۶۱۱ھ(ت۱۲۱۴ء)		
۱۰	الفانسو نہم	ت۶۲۸ھ(ت۱۲۳۰ء)		
۱۱	فرڈی ننڈ سوئم	ت۶۵۰ھ(ت۱۲۵۲ء)		قسطالیہ، لیون

مملکتِ غرناطہ کے معاصر قسطالیہ کے اہم حکمران

۱	الفانسو دہم	ت۶۸۱ھ(ت۱۲۸۴ء)		
۲	شانجہ چہارم، بریوو	ت۶۹۵ھ(۱۲۹۵ء)		
۳	فرڈی ننڈ چہارم	ت۷۱۲ھ(ت۱۳۱۲ء)		
۴	الفانسو یازدہم	ت۷۵۱ھ(ت۱۳۵۰ء)		
۵	پیٹر اول	ت۷۶۹ھ(ت۱۳۶۹ء)		
۶	ہنری دوئم	ت۷۸۰ھ(ت۱۳۷۹ء)		
۷	جان (یوحنا) اول	ت۷۹۲ھ(ت۱۳۹۰ء)		
۸	ہنری سوئم	ت۸۰۹ء(ت۱۴۰۶ء)		
۹	جان دوئم	ت۸۵۸ھ(۱۴۵۴ء)		
۱۰	ہنری چہارم	ت۸۷۹ھ(ت۱۴۷۴ء)		
۱۱	ملکہ ازابیلا	ت۹۱۰ھ(ت۱۵۰۴ء		

ریاستِ ارغون کے اہم حکمران

۱	شانجہ رڈمیر	ت۴۸۷ھ(ت۱۰۹۴ء)		
۲	الفانسو اول	ت۵۲۸ھ(ت۱۱۳۴ء)		
۳	رڈمیر راہب	ت۵۳۱ھ(ت۱۱۳۷ء)		
۴	ریمنڈ بیرنگور چہارم	ت۵۵۸ھ(۱۱۶۲ء)		

۵	الفانسو دوم	تا ۵۹۳ھ (۱۱۹۶ء)		
۶	پیٹر دوم کیتھولکی	تا ۶۱۰ھ (تا ۱۲۱۳ء)		
۷	جیمز اول	تا ۶۷۵ھ (۱۲۷۶ء)		

مملکتِ غرناطہ کے معاصر ارغون کے اہم حکمران

۱	پیٹر سوم	تا ۶۸۳ھ (تا ۱۲۷۶ء)		
۲	الفانسو سوم	تا ۶۸۴ھ (تا ۱۲۸۵ء)		
۳	الفانسو سوم	تا ۶۹۰ھ (تا ۱۲۹۱ء)		
۴	جیمز دوم	تا ۷۲۷ھ (تا ۱۳۲۷ء)		
۵	الفانسو چہارم	تا ۷۳۶ھ (تا ۱۳۳۶ء)		
۶	پیٹر چہارم	تا ۷۸۹ھ (تا ۱۳۸۷ء)		
۷	یوحنا اول	تا ۸۱۳ھ (تا ۱۴۱۰ء)		
۸	فرنانڈو انکٹیریا	تا ۸۱۸ھ (تا ۱۴۱۶ء)		
۹	الفانسو پنجم	تا ۸۳۶ھ (تا ۱۴۳۲ء)		
۱۰	یوحنا دوم	تا ۸۸۴ھ (تا ۱۴۷۹ء)		
۱۱	فرڈی ننڈ پنجم	تا ۹۲۱ھ (تا ۱۵۱۶ء)		

ریاستِ پرتگال کے اہم حکمران

۱	الفانسو ہنری کیز، (ابن الریق)	تا ۵۸۱ھ (۱۱۸۵ء)		
۲	شانجہ اول	تا ۶۰۸ھ (۱۲۱۱ء)		
۳	الفانسو دوم	تا ۶۲۰ھ (تا ۱۲۲۳ء)		
۴	شانجہ دوم			
۵	الفانسو سوم			

① کتاب الهند البیرونی، ص ۳۴۲

تیسرا باب

تاریخِ برِّصغیر (۱)

سندھ اور بلوچستان کی مسلم ریاستیں

برصغیر ماقبل از اسلام

برصغیر ایک ملک نہیں ایک برعظیم ہے۔ اسے برصغیر کہنا درحقیقت اس کی اصلیت کو چھپا دیتا ہے۔ یہ رقبے کے لحاظ سے براعظم آسٹریلیا کے قریب اور آبادی کے اعتبار سے دو براعظموں: یورپ اور آسٹریلیا کی مجموعی آبادی سے بڑھ کر ہے۔ قدیم جغرافیہ دانوں میں سے بہت سوں نے سندھ کو ہندوستان سے الگ ایک ملک شمار کیا ہے جیسا کہ ان کی جابجا تصریحات سے ظاہر ہے۔ اگرچہ متعدد مؤرخین نے سندھ کو "ہند" کے تحت بھی بیان کیا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جن حضرات نے "ہند" کو متعدد ممالک کے مجموعے یعنی ایک برعظیم کے طور پر لیا ہے، انہوں نے سندھ کو بھی اس میں شامل کر لیا ہے اور جو جغرافیہ نویس ہر ملک کو الگ الگ بیان کر رہے تھے، انہوں نے سندھ کو الگ شمار کیا۔

اس دور میں پنجاب، وسطی ہند، جنوبی ہند، شمالی ہند اور بنگال و بہار میں اکثر و بیشتر الگ الگ حکومتیں ہی قائم دکھائی دیتی ہیں۔ ان تمام علاقوں کی لسانیات اور تہذیب و ثقافت میں ویسا ہی تنوع دکھائی دیتا ہے جیسا کہ یورپ میں۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کی تاریخ بہت منتشر اور بکھری ہوئی ہے اور اسی لیے اسے یکجا ایک سیاق میں بیان کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اسی مشکل کے پیش نظر ہم بھی تاریخ برصغیر کو الگ الگ ابواب میں بیان کریں گے۔

برصغیر کی تاریخ ہزاروں سال قدیم ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق یہاں سے برآمد ہونے والے انسانی تمدن کے آثار کم از کم پانچ ہزار سال پرانے ہیں۔ وسطی ہندوستان کے زرخیز علاقوں میں کاشتکاری کرنے والی قدیم قوموں کو "دراوڑ" کہا جاتا تھا۔ اس زمانے کی تاریخ کہیں محفوظ نہیں۔ البتہ ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتب سے دو تا ڈیڑھ ہزار سال قبل از مسیح کی تاریخ کے کچھ مبہم آثار ملتے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق یہاں زراعت پیشہ لوگ آباد تھے۔

اس دور میں دریائے سندھ کی تہذیب بہت مشہور تھی جو دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی وادیوں میں پھلی پھولی۔ اس کے آثار سندھ میں لاڑکانہ کے قریب موئن جوڈرو اور پنجاب میں دریائے راوی کے کنارے ہڑپہ (ضلع ساہیوال) میں ملتے ہیں اور دو سے تین ہزار سال قبل از مسیح کے بتائے جاتے ہیں۔ ان کھنڈرات سے برآمد ہونے والی مہروں پر دیوی دیوتاؤں کی تصاویر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بت پرست تھے۔ بیل، گینڈے، شیر اور ہاتھی جیسے حیوانوں کے علاوہ درختوں کو بھی بابرکت سمجھ کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق یہ تہذیب ڈیڑھ ہزار سال قبل از مسیح میں زلزلوں یا سیلابوں کے باعث اچانک ملیامیٹ ہو گئی۔ غالباً یہ کوئی آسمانی عذاب تھا جیسا کہ کفر و شرک اور انبیاء کی تکذیب کے باعث دیگر سرزمینوں کے نافرمان لوگوں کا ایسا ہی انجام ہوا۔ ایسے

کھنڈرات زبان حال سے درس عبرت دیتے ہیں اور سرکشی ترک کر کے آخرت کی تیاری کی فکر دلاتے ہیں۔

اسلام سے پہلے برصغیر کی حالت:

دو ہزار سال قبل از مسیح میں وسط ایشیا کے آریا قبائل اپنے ہاں مویشیوں کے لیے چارے کی کمی کی وجہ سے نقل مکانی پر مجبور ہوئے اور ہندوستان کا رخ کیا تھا۔ یہ قبائل ایران اور افغانستان سے ہو کر پنجاب میں داخل ہوئے۔ رگ وید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آریہ قبائل دو ہزار سال قبل مسیح سے لے کر بارہ سو سال قبل مسیح تک مختلف گروہوں کی شکل میں کابل اور بلمند کی وادیوں سے ہوتے ہوئے کوہ سلیمان کے دروں کے راستے پنجاب میں اترتے رہے۔

آریاؤں نے مقامی لوگوں کو زور وجبر سے دبا کر یہاں اپنی حکومتیں اور آبادیاں قائم کیں۔ موہن جوڈرو کے آثار قدیمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آریاؤں نے مقامی لوگوں کا بے پناہ قتل عام کیا تھا اور باقی ماندہ کو غلام بنالیا تھا۔ ہڑپہ کے کھنڈرات اور ہندوؤں کی قدیم کتب ''ویدوں'' سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک بڑی جنگ دریائے راوی کے کنارے لڑی گئی تھی جو ہڑپہ کی ریاست کے خلاف تھی۔ غلام بنائے جانے والے لوگوں کو ''شودر'' یعنی پست ترین ذات قرار دیا گیا جس کے افراد کو آریاؤں سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ یوں آریہ اور غیر آریہ کی تفریق کے ذریعے ذات پات کا نظام پیدا ہوا۔

آریاؤں نے دریائے سندھ کی وادی کو اپنا وطن نہیں بنایا بلکہ آگے بڑھ کر وسطی ہندوستان میں گنگا جمنا کی وادی کو پسند کیا اور وہیں اپنی تہذیب وتمدن کو ترقی دی۔ اس سرزمین کا نام ''آریہ ورت'' رکھا گیا۔ یہاں آریہ اور مقامی باشندے چار سو سال قبل از مسیح تک ایک دوسرے پر فکری وتہذیبی اثرات ڈالتے رہے۔ آریا ناچ گانے اور موسیقی کے شوقین تھے، ان کے ہاں مذہبی رسومات میں مرد اور عورتیں برابر شریک ہوتے تھے۔ مگر انہوں نے بتوں کی پوجا کا طریقہ قدیم ہندوستانیوں سے اخذ کیا جبکہ مقامی آبادی نے آریاؤں سے مختلف رسومات سیکھیں۔ یہ لوگ بت پرست بن گئے۔ دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے انہیں نذرانے پیش کرنے لگے۔ وہ جادو ٹونے پر یقین رکھتے تھے۔ مردوں کو جلادیا کرتے تھے۔ رگ وید ان کی مذہبی کتاب تھی۔ برہما، شیو، وشنو، اگنی، اندر، اور گنیش ان کے مشہور دیوتا تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مرنے کے بعد اسی دنیا میں یکے بعد دیگرے سات بار جنم لیتا ہے۔ جس کے عمل اچھے ہوں وہ اگلے جنم میں اچھی صورت میں پیدا ہوگا جبکہ بدکردار آدمی کا اگلا جنم کسی بدترین شکل میں ہوگا۔ ان عقائد اور رسومات کے اشتراک سے ہندو مذہب کی صورت میں سامنے آیا۔

ہندو مذہب میں ذات پات کے نظام کے بانی اُس دور کے مذہبی پیشوا تھے جو ایک خاص نسل کے تھے۔ ان مذہبی پیشواؤں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ برہما کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں، اور مذہب کی حفاظت انہی کا کام ہے۔ انہوں نے خود کو فوق الکتاب اور محاسبے سے بالاتر قرار دیا اور دیوتاؤں کی بھینٹ کے نام پر مندروں کو اپنے لیے مستقل آمدن کا ذریعہ بنالیا۔ ساتھ ہی حکومتی ذمہ داریوں کی کلفت سے بچنے کے لیے یہ دشوار کام آریہ قبائل کے سرداروں کے سپرد کردیا۔ یہ سردار ''کھشتری'' کہلانے لگے۔ اس طرح برہمن خود جنگی مصائب سے بچ گئے۔ ہندوستان کے

کثر راجے، مہاراجے اور سپہ سالار کھشتری یعنی آریہ ہی تھے۔

پیداوار اور کاروبار کا مسئلہ ان مقامی باشندوں کے پاس رہنے دیا گیا جو پہلے سے کاشتکار، ہنر مند، یا تجارت پیشہ تھے۔ انہیں ''ویش'' کہا جانے لگا۔ غلام بنائے جانے والے مقامی لوگوں، ان کی آل اولاد اور معمولی کام کاج کرنے والے مفلس لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ''شودر'' کا نام دے کر مشکل کاموں کا سارا بوجھ ان پر ڈال دیا گیا اور انہیں پیدائشی گنہگار اور ناپاک ٹھہرایا گیا۔ ان کا جینا مرنا سب اونچی ذات والوں ہی کے لیے تھا جن کا خیال تھا کہ شودر کو چھونے بلکہ اس کا سایہ پڑنے سے بھی اونچی ذات والا ناپاک ہو جاتا ہے۔

ذات پات کے اس نظام کو منو نامی ایک برہمن نے ضابطے کی شکل میں ڈھال دیا۔ اس نے مذہبی اور حکمران طبقے کے لیے ''دھرم شاستر'' تیار کی، جسے منو شاستر بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ہندو معاشرے کو چار طبقوں: برہمن، کھشتری، (کھتری) ویش اور شودر میں تقسیم کر کے ان کے لیے تفصیلی اصول و ضوابط وضع کیے گئے۔ اس کا مقصد برہموں کی بالادستی کو ہمیشہ قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

بدھ مت کا فروغ:

چھٹی صدی قبل از مسیح میں گوتم بدھ نے ذات پات کے اس گورکھ دھندے کے خلاف بغاوت کر کے بدھ مت کی بنیاد رکھی۔ اس نئے نظام کو پست طبقات میں بڑی مقبولیت ملی۔ بدھ مت اصل میں جنوبی ہندوستان کا مذہب تھا۔ اس کا بانی شہزادہ سدارتھ تھا جسے گوتم بدھ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ کپیلا کے راجا کا بیٹا اور ولی عہد سلطنت تھا۔ اس کی پیدائش ''۵۶۳ قبل از مسیح'' میں ہوئی۔ ۲۹ سال کی عمر میں اس کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا تھا اور اس نے آبادی چھوڑ کر تنہائی اختیار کر لی تھی۔ وہ ہندو مذہب میں ذات پات کی انسانیت سوز حد بندیوں اور عوام کی تکلیفوں سے رنجیدہ تھا لہٰذا اُس نے غور و فکر کے بعد ایک نیا اخلاقی نظام تیار کیا جس میں سب انسان برابر تھے۔

کئی سال بعد وہ اپنی راج دھانی واپس آ گیا جہاں اس کا باپ اب تک راج کر رہا تھا۔ اس نے اپنے خاندان کو اپنے دین ''بدھ مت'' کا پیرو بنایا اور خود راجہ بننے سے انکار کر دیا۔ وہ عمر بھر اپنے افکار کی اشاعت کرتا رہا۔ ہندو مذہب کے ردعمل میں اس نے کروڑوں دیوی، دیوتاؤں کا انکار کیا مگر اس کی تعلیمات وحی کی روشنی سے محروم تھیں، ان میں اللہ کی توحید یا انبیائے کرام پر ایمان کا کوئی ذکر نہ تھا، پس یہ مذہب کسی بھی لحاظ سے اخروی کامیابی کا ضامن نہیں بن سکتا تھا۔ دو صدیوں بعد بدھ کے پیروکاروں نے اس کی مورتیوں کی پوجا شروع کر دی، انہوں نے بت پرستی اور مجسمہ سازی کے ذریعے کفر و شرک کو فروغ دے کر ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جو ''گندھارا تہذیب'' کہلائی جس کے آثار ٹیکسلا اور وادیٔ سوات میں موجود ہیں۔

جین مت:

''۵۹۹ قبل از مسیح'' میں پٹنہ کے ایک قصبے ویشالی میں مہاویر نامی ایک دانشور کی ولادت ہوئی۔ وہ بھی برہموں کی

مذہبی اجارہ داری سے تنگ تھا، اس لیے اس نے ایک نیا مذہب پیش کیا جو ''جین مت'' کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ مذہب نفس کشی، ترک دنیا اور خواہشات کی مخالفت کی تلقین کرتا تھا، اس میں گوشت کھانا منع تھا اور ذاتی جائیداد رکھنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ درحقیقت یہ رہبانیت اور انسانی معاشرے سے لاتعلقی پر مبنی ایک نظام تھا جس میں انسانی مسائل کا حل ہرگز موجود نہیں تھا۔

سکندر کا حملہ:

برصغیر کی تاریخ کا وہ دور جس کی تاریخ محفوظ چلی آرہی ہے، چوتھی صدی قبل از مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ ۳۳۰ قبل از مسیح میں مغرب سے یونانی حکمران سکندر اعظم (الیگزینڈر) کا ظہور ہوا جس نے مختصری مدت میں ایک طوفان کی طرح دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ یونان کے بادشاہ فلپ کا بیٹا اور مشہور فلسفی ارسطو کا شاگرد تھا۔ وہ ''۳۵۶ سال قبل از مسیح'' میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے عین نوجوانی میں یورپ سے باہر فتوحات کا آغاز کیا اور بحیرۂ روم عبور کر کے مصر پہنچ گیا۔ مصر اور شام کو فتح کر کے اس نے ایران پر حملہ کر دیا اور ایرانی بادشاہ 'دارا' کو شکست فاش دے کر اپنی سلطنت بے پناہ وسیع کر لی۔

پھر اس نے وسط ایشیا اور موجودہ افغانستان کے علاقوں کو زیر نگین کیا اور ''۳۲۷ سال قبل از مسیح'' میں کابل فتح کر کے ہندوستان کے دروازے پر آن پہنچا۔ اس کے حملے کی ایک بڑی وجہ ہندوستان کی وہ دولت اور خوش حالی تھی جس کے قصے اس نے سن رکھے تھے۔ یہاں کی سونے کی کانیں دنیا بھر میں مشہور تھیں جن میں سونا ڈلیوں کی بجائے ریت کی صورت میں ملتا تھا۔ یونانیوں کو ہندوستان میں گنے اور کپاس کی فصل دیکھ کر بھی شدید حیرت ہوئی۔ ایک یونانی مورخ نے لکھا: ''اس ملک میں ایسے درخت پائے جاتے ہیں جن پر اون اُگتی ہے۔''

ہندوستان کی سرحد پر سکندر کو غیر معمولی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے محتاط ہو کر درۂ خیبر کی بجائے سوات اور باجوڑ کا راستہ اختیار کیا۔ آخر کار ''۳۲۶ سال قبل از مسیح'' میں وہ دریائے سندھ عبور کر کے ٹیکسلا پہنچ گیا جہاں کے راجا نے اس کا خیر مقدم کیا اور تحائف پیش کیے۔

یہاں سے کچھ دور دریائے جہلم سے لے کر چناب کی وادی تک راجا پورس کی حکومت تھی۔ سکندر نے اسے ٹیکسلا حاضر ہو کر اظہار اطاعت کا حکم دیا مگر پورس نے جواب دیا کہ وہ اپنی ریاست کی سرحد پر ہتھیار لے کر اس کا انتظار کرے گا۔ پورس کی خیمہ گاہ دریائے جہلم کے مشرقی کنارے پر تھی۔ سکندر کو اس کے مقابل میں دریا عبور کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور اس نے طوفان خیز بارش کے دوران ایک اندھیری شب اپنی فوج کے ایک حصے کو ۱۷ میل شمال میں لے جا کر دریا عبور کر لیا۔ پورس کو اس کی اطلاع نہ ہو سکی اور سکندر نے اچانک حملہ کر کے اسے شکست دے دی۔

سکندر نے جنگ جیت لی مگر پورس کی بہادری نے اسے بہت متاثر کیا۔ جب پورس کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے پورس سے پوچھا: ''تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''

پورس نے جواب دیا: ''وہی جو ایک راجا دوسرے راجا کے ساتھ کرتا ہے۔''

سکندر نے اسے اس کی سلطنت واپس کر دی۔

سکندر مزید پیش قدمی کرتے ہوئے دریائے بیاس کے کنارے پہنچ گیا مگر اس دوران مقامی قبائل کی بے پناہ مزاحمت نے اس کی فوج کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ راوی اور چناب کے مابین آباد ملی قوم سے لڑائی میں اسے زبردست جانی نقصان کا سامنا ہوا جس کے بعد سکندر نے بہت جلد واپسی اختیار کر لی۔ وطن پہنچنے سے پہلے ۳۲۳ ق م میں اس کا بیماری سے انتقال ہو گیا۔

سکندر کے حملے سے اہلِ یورپ کو برصغیر کے راستوں سے واقفیت ہوئی اور ان خطوں کے مابین تجارتی تعلقات کا آغاز ہوا۔ سکندر کے ساتھ آنے والے بہت سے یونانی یہیں آباد ہو گئے۔ بہت سے تجارتی روابط کی وجہ سے بعد میں آئے اور یہیں بس گئے۔ ان میں کئی ماہر سنگ تراش بھی تھے جنہوں نے بت سازی کی مشرکانہ تہذیب کو آگے بڑھایا۔ ان کی بنائی ہوئی مورتیاں آج بھی قدیم کھنڈرات یا عجائب خانوں میں موجود ہیں۔

موریہ خاندان کی حکومت:

اس دور میں ریاستِ بہار میں نندہ خاندان کی بادشاہت تھی جس کا مرکز پاٹلی پتر تھا۔ اس خاندان کا ایک نامور شہزادہ چندر گپت موریا تھا جسے نندہ خاندان کے آخری راجا نے ملک بدر کر دیا تھا۔ چندر گپت موریا نقل مکانی کر کے پنجاب آ گیا تھا اور یہاں اس نے سکندر سے بھی ملاقات کی تھی۔

سکندر اپنے مفتوحہ علاقوں میں نائب حکام مقرر کر کے گیا تھا مگر اس کی واپسی کے بعد پورے ہندوستان میں بغاوتیں شروع ہو گئی تھیں۔ ان حالات میں چندر گپت موریا کو ایک نئی حکومت بنانے کا موقع مل گیا۔ اس نے مقامی قبائل کو جمع کر کے یونانی حکام کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس نے پنجاب سے درۂ خیبر تک کا علاقہ فتح کرنے کے بعد اس نے بہار اور پٹنہ کا رُخ کیا اور پاٹلی پتر سے نندہ خاندان کو بے دخل کر کے ایک بے حد وسیع سلطنت قائم کر ڈالی جس کا پایۂ تخت ٹیکسلا تھا۔ یہ سلطنت "۳۲۱ سال قبل از مسیح" سے "۱۸۵ سال قبل از مسیح" تک یعنی ۱۳۷ سال تک برقرار رہی۔ چندر گپت نے یوپی، مالوہ اور جنوبی پنجاب تک فتح کر ڈالے۔ اس کے پاس برصغیر کی مضبوط ترین فوج تھی جس میں ہاتھیوں کی بڑی تعداد شامل تھی جن سے حریف پر نیزہ بازی کی جاتی تھی۔

اس وقت پنجاب سے عراق تک سکندر کے نائبین میں سے ایک یونانی جرنیل سلیوکس حکومت کر رہا تھا جس کی حکومت "سلیوکسی" کہلاتی تھی۔ عراق کا شہر "بابل" اس کا مرکز تھا۔ ۳۰۶ قبل از مسیح میں سلیوکس اور چندر گپت موریا کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ چندر گپت نے پانچ سو ہاتھیوں پر مشتمل لشکر کے ساتھ حملہ کیا اور سکندر اعظم کے نائبین کو شکست دے کر دریائے سندھ کے پار بھگا دیا۔ سلیوکس نے کابل، قندھار اور ہرات چندر گپت کے حوالے کر دیے اور صلح کر کے صرف خراسان اور عراق پر قناعت کر لی۔

اس کے بعد چندر گپت نے کشمیر، شمالی ہند، بلوچستان، افغانستان اور جنوب میں میسور کو بھی فتح کر لیا۔ اس کی

سلطنت خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب سے کوہ ہمالیہ تک پھیل گئی۔ اس دور میں ٹیکسلا اپنے تہذیب وتمدن کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔ یہ شہر تین بار اجڑ کر آباد ہوا۔ اس کے کھنڈرات سے اس کی وسعت اور عمارتوں کی مضبوطی کا اندازہ ہوتا ہے۔

چندر گپت موریا کی کامیابیوں میں اس دور کے ایک سیاست دان چانکیہ کے مشوروں کا بڑا دخل تھا جو ٹیکسلا کا باشندہ تھا۔ اس کے افکار نے ہندوؤں کی سیاسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ چانکیہ مخالفین کے خلاف ہر قسم کے مکر و فریب کو درست قرار دیتا تھا۔ وہ جاسوسی اور سازشوں کے ذریعے دشمن پر قابو پانے کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ آج بھی برہمن سیاست دانوں کے مزاج پر چانکیہ کی تعلیمات پوری طرح اثر انداز ہیں۔

اشوکا:

''۲۷۳ قبل از مسیح'' میں چندر گپت کا پوتا اشوکا اپنے باپ بندوسارا کی موت کے بعد تخت نشین ہوا۔ وہ جوانی میں ٹیکسلا کا حاکم رہ چکا تھا۔ وہ بڑا سخت جنگجو تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں کو قتل کر کے سلطنت پر گرفت مضبوط کی۔ ۲۶۱ ق م میں اس نے اڑیسہ پر حملہ کیا اور ایک لاکھ افراد کے کشت وخون کے بعد فتح حاصل کی۔

کچھ مدت بعد اس نے بدھ مذہب قبول کر لیا اور جنگجوئی چھوڑ کر اس کی اشاعت میں سرگرم ہو گیا۔ اس نے نہ صرف پورے برصغیر بلکہ مشرقی اور وسطی افغانستان تک اپنی حدودِ سلطنت وسیع کر لیں۔ اس نے جگہ جگہ بدھ کے مجسمے اور سٹوپے بنوائے اور افغانستان، ترکستان، ایران، شام، مصر، یونان، لنکا، برما اور چین تک بدھ مت کے مبلغین بھیجے۔ اس کے دور میں سرکاری مذہب بدھ مت قرار پایا۔ اس نے بدھ کی تعلیمات کو چٹانوں اور لاٹوں پر کندہ کرانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس قسم کا ایک کتبہ آج بھی مانسہرہ کے قریب ایک چٹان پر موجود ہے۔ اشوکا ۲۳۲ ق م میں فوت ہوا۔

مختلف غیر ملکی حکومتیں:

بدھ حکمرانوں نے برصغیر کے بڑے رقبے پر قبضہ کر لیا تھا مگر وہ یونانیوں کا زور مکمل طور پر توڑنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ ۱۳۷ سال کے عروج کے بعد موریا خاندان کی حکومت اس وقت کمزور پڑ گئی جب اشوک کے جانشینوں میں اقتدار کی جنگ شروع ہوئی اور ہندوستان کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ایسے میں بعض یونانی طالع آزماؤں نے برصغیر کے مغربی حصے کو فتح کر کے ایک نئی مملکت قائم کی جس کا صدر مقام سیالکوٹ تھا۔

اس دور میں برصغیر کی سیاحت کرنے والے چینی سیاح ''ہیون سانگ'' نے سیالکوٹ کے باغات، بازاروں اور تالابوں کی بہت تعریف کی ہے۔ اس مملکت کا سب سے مشہور یونانی حکمران ''مینانڈر'' تھا جس نے بدھ مذہب قبول کر لیا تھا۔ اس کی سلطنت مشرق میں متھرا اور مالوہ تک وسیع تھی۔

چینی ترکستان کے یوچی قبائل:

''۱۳۵ سال قبل از مسیح'' میں چینی ترکستان (وسطی چین) سے یوچی قبائل ابھرے۔ انہوں نے سنکیانگ سے لے کر پشاور، سوات اور پنجاب تک قبضہ جما لیا۔ ''۱۲۸ سال قبل از مسیح'' میں وہ یونانیوں کی ''باختریہ'' مملکت کو شکست دے

کر شمالی افغانستان پر بھی قابض ہو گئے۔ ان کے بعد چین کے ایک اور قبیلے "یوچی" نے اس خطے پر طویل عرصے تک حکومت کی۔

کوشان خاندان اور کنشک:

۴۰ عیسوی میں یوچی قبائل کے ایک سردار کادفس اوّل نے پشاور میں کوشان خاندان کی بنیاد رکھی اور "گندھارا حکومت" قائم کی۔ سنہ ۸۵ عیسوی میں کادفس اوّل کے جانشین نے اس سلطنت کو بنارس تک پھیلا دیا اور سندھ، راجپوتانہ اور کاٹھیاواڑ سے پارتھیوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

"سنہ ۱۲۵عیسوی" سے "سنہ ۱۵۲عیسوی" تک یہاں کوشان خاندان کے ایک نامور بادشاہ کنشک اعظم کا اقتدار رہا جس نے پشاور کو پایۂ تخت بنا کر نہ صرف کشمیر فتح کیا بلکہ پامیر کی سطح مرتفع عبور کر کے چین کے صوبوں، ختن، یارقند اور کاشغر کو بھی اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ وہ چین سے بہت سے قیدی ساتھ لایا جو پشاور کے نواح اور دریائے راوی کے پار آباد کیے گئے۔ یہ قیدی باغبانی کے ماہر تھے اور اپنے ساتھ آڑو اور ناشپاتی کے پودے لائے تھے۔ انہوں نے ان علاقوں میں ان پھلوں کی کاشت عام کی۔

اس دور میں ٹیکسلا علم طب کا بڑا مرکز تھا۔ برصغیر کا مشہور طبیب چرک اسی شہر سے تعلق رکھتا تھا جو کنشک کا درباری معالج تھا۔ عباسی خلفاء کے دور میں اس کی علم طب پر لکھی ہوئی ایک کتاب کا عربی ترجمہ بھی کرایا گیا۔

کنشک بدھ مت کا پرجوش مبلغ تھا۔ اس نے پشاور میں ایک بہت بڑا "اسٹوپا" (بدھ مت کی عبادت گاہ) تعمیر کرایا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس میں گوتم بدھ کی ہڈیاں محفوظ ہیں۔

بدھ مذہب میں خدا کا تصور واضح نہ تھا اس لیے اب تک اسے زیادہ مقبولیت نہیں ملی تھی۔ کنشک نے اس کی اشاعت شروع کی تو ہندوؤں کو متاثر کرنے کے لیے گوتم بدھ ہی کو خدا قرار دے دیا اور اس کی مورتی پوجا کو اتنا رواج دیا کہ ہندوؤں کی بت سازی بھی پیچھے رہ گئی۔ بدھ کے مجسمے وسط ایشیا سے مشرق بعید اور بحرالکاہل کے جزائر تک نصب ہو گئے۔ یوں بدھ مذہب میں ایک نئے فرقے کا آغاز ہوا جسے "مہایانی" کہا جاتا ہے۔ اس فرقے کا اثر چین اور جاپان تک جا پہنچا جہاں آج بھی بدھ مت کے پیروکار بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ کنشک نے بامیان میں گوتم بدھ کے ۱۲۰ اور ۱۷۵ فٹ بلند مجسمے ترشوائے جنہیں بدھسٹوں کے نزدیک سب سے بڑے بتوں کی حیثیت حاصل ہوئی۔

کنشک نے ضلع ٹیکسلا میں سرکھ کے مقام پر ایک نیا شہر بھی بسایا۔

اس دور میں شاہراہ ریشم کے ذریعے برصغیر اور چین کے درمیان تجارتی روابط بہت مستحکم رہے۔ کنشک کے بعد گندھارا سلطنت کو زوال آیا اور یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔

گپت حکمران:

ہندوستان میں بدھ مت کا عروج آٹھ نو صدیوں تک رہا۔ ۳۲۰ء میں چندر گپت اوّل، مگدھ (موجودہ بہار اور

پٹنہ) میں تخت نشین ہوا اور اس آبائی ریاست کو وسعت دے کر گنگا جمنا تک پھیلا دیا۔ اس نے تبت بھی فتح کر لیا اور ہندوستان کو دوبارہ متحد کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے جانشین سمدر گپت نے چالیس سال حکومت کی اور اس سلطنت کو مزید وسعت واستحکام بخشا۔

سمدر گپت کے بعد ۳۷۵ء میں اس کا بیٹا "چندر گپت بکرماجیت" حکمران بنا جو کٹر ہندو تھا۔ وہ ۳۸ سال تک حکمران رہا۔ پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس نے بدھ مت کی تبلیغ کو روک کر نہ صرف برہمنی مذہب کو رواج دیا بلکہ اس کی سرپرستی میں ہندو پیشواؤں نے اپنے مذہب کو از سر نو پرکشش بنانے کی کوشش کی۔ آج کا ہندو دھرم چندر گپت بکرماجیت کے دور ہی کی پیداوار ہے۔ اس نے سنسکرت زبان کو عام کیا۔ مندر بنوائے۔ مورتی پوجا، سنگ تراشی اور موسیقی کو فروغ دیا۔ یوں ہندومت اور ذات پات کا نظام پھر جڑیں پکڑ گیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ ہندو حکمرانوں کی بالادستی ہوتے ہوئے اس خطے میں اصلاح معاشرہ کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔

گپت کے بیٹے کمار گپت نے ۴۷ سال حکومت کی اور ۴۵۳ء میں فوت ہوا۔ اس کے بیٹے سکندر گپت کے عہد میں وسط ایشیا سے "سفید ہنوں" نے حملہ کر کے پہلے کابل اور غزنی کی گندھارا سلطنت کو تہ و بالا کیا، پھر مغربی ہندوستان اور ایران پر قابض پارتھیوں کو بے دخل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے گپت سلطنت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ۵۳۰ء تک ہنوں کے عروج برقرار رہا۔

نئی ریاستیں

۶۰۶ء میں راجا ہرش ہندوستان کے افق پر نمودار ہوا جس نے جنوبی پنجاب، قنوج، بنگال، اڑیسہ اور مالوہ کو فتح کر کے ایک مضبوط حکومت قائم کی۔ پھر سندھ اور نیپال کو زیر نگیں کر کے شمالی ہندوستان کو یکجا کر ڈالا۔ صرف دکن پر فوج کشی میں اسے ناکامی ہوئی۔ ۶۴۷ء میں اس کی موت کے بعد راجپوتوں نے شمالی ہندوستان میں کئی آزاد ریاستیں قائم کر لیں۔ یوں یہ سرزمین پھر سیاسی انتشار کا شکار ہو گئی۔ ہندوستان کی ان نئی ریاستوں کی تفصیل یہ ہے:

قنوج:

راجپوتوں کا مشہور بادشاہ "راجا بھوج" تھا جس کا پایۂ تخت "قنوج" تھا۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں اس کی ریاست گجرات سے بنگال تک وسیع تھی۔ مالوہ اور راجپوتانہ بھی اس میں شامل تھے۔ راجپوتوں نے بارہویں صدی عیسوی میں دہلی بھی فتح کر لیا۔ راجپوتوں میں اجمیر کا "پرتھوی راج چوہان" مشہور ہے جس نے ۱۱۶۵ء سے ۱۱۹۲ء تک حکومت کی اور آخر کار مسلمان فاتح سلطان شہاب الدین غوری سے جنگ میں قتل ہوا۔

دہلی:

دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں تومار خاندان دہلی پر قابض ہو گیا۔ اس خاندان کا بانی راجا اننگ پال تھا۔ ۱۰۷۱ء

میں راجپوتوں نے دہلی پر قبضہ کرلیا۔

تامل:

دسویں صدی عیسوی میں جنوبی ہندوستان میں تامل ریاست قائم ہوئی جو دکن سے سری لنکا تک وسیع تھی۔

بنگال و بہار:

آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں پال خاندان نے قبضہ کرلیا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں سین خاندان نے یہاں تسلط حاصل کرلیا۔

جنوبی ہندوستان:

یہاں نویں صدی عیسوی کے آغاز سے ۹۷۳ء تک راشٹرکوٹ خاندان حکومت کرتا رہا۔ پھر "چالوکیا" خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ ۱۲۰۰ء میں یہاں "یادو" خاندان قابض ہوگیا۔[1]

✦✦✦

---

[1] برصغیر کی ان تمام حکومتوں کے حالات کے لیے درج ذیل مآخذ دیکھئے:
(۱) تاریخ فرشتہ از محمد قاسم فرشتہ جلد اول
(۲) تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ دہلوی، جلد اول
(۳) تاریخ ہندوستان بہ شمولہ قدیم یونانی مؤرخین، از [illegible] پوری ایم اے، مطبوعہ: نول کشور پریس لکھنؤ سن ۱۹۲۷ء
(۴) قدیم تاریخ ہند، از ونسنٹ اے سمتھ، مترجم: مولوی جمیل الرحمن، مطبوعہ: جامعہ عثمانیہ دکن، سن ۱۹۲۲ء
(۵) تاریخ تمدن ہند، از محمد مجیب، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، سن ۱۹۹۹ء
(۶) آئینہ تاریخ، از پروفیسر بی این ارما، مطبوعہ رام پرشاد اینڈ برادرس، آگرہ سن ۱۹۳۳ء
(۷) تاریخ ہند، از تاپار رومیلا، مطبوعہ مرکز تحقیقات رایانہ اصفہان
(۸) قدیم ہندوستان کی تاریخ، از رما شنکر ترپاٹھی، مترجم سید علی حسن نقوی، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
(۹) تاریخ ہند، از ڈاکٹر محمد شیخ اقبال، لالہ رام پرشاد پروفیسر ہسٹری گورنمنٹ کالج لاہور، مطبوعہ: ایجوکیشنل پبلشرز لاہور، مطبوعہ ۱۹۱۳ء
(۱۰) عہد اسلامی کا ہندوستان از مولانا ریاست علی ندوی ص ۳۴۳ تا ۳۵۳، مطبوعہ ادارۃ المصنفین پٹنہ ۱۹۵۰ء
(۱۱) مطالعہ پاک و ہند، از ڈاکٹر مقصود چودھری، نشتر اکیڈمی، مطبوعہ ۱۹۸۶ء

سندھ کے غیر مسلم حکمران

حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت سندھ کے باسی زیادہ تر بدھ مت تھے۔ یہاں رائے سیہرس بن ساہسی نامی راجا کی حکومت تھی جس کی حکومت بڑی وسیع وعریض تھی اور اس کا پایہ تخت سندھ کا قدیم شہر "اروڑ" تھا۔ [1]

یہ خاندان بدھ مت کا پیروکار تھا۔

رائے سیہرس کی حکومت:

رائے سیہرس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے رائے ساہسی نے تخت سنبھالا۔ اس کی حکومت بھی بڑی مستحکم تھی۔ اسی زمانے میں چچ نامی ایک برہمن پجاری اس کے ہاں ملازم ہوا۔ دھیرے دھیرے راجا کو اس پر ایسا اعتماد ہوا کہ اسی کو اپنا وزیر بنالیا۔ راجا کی موت کے بعد چچ نے اس کی بیوی رانی سوہندی سے شادی کرلی اور بادشاہ بن گیا۔

چچ نے چالیس سال حکومت کی۔ وہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے زمانے میں تھا۔ فتح نامہ سندھ کے مطابق جب وہ کرمان کے سفر پر روانہ ہوا تو اس وقت حضور اکرم ﷺ کی ہجرت مدینہ کو دو برس گزر چکے تھے۔ اس نے بھاٹیہ (ریاست بہاولپور)، اسکلندہ (اُچ) اور ملتان سے لے کر سیوستان (سیہون)، برہمن آباد اور مکران تک کے علاقے فتح کر ڈالے۔ چونکہ چچ برہمن تھا، لہٰذا اس نے ایک بار پھر اپنے مقبوضہ علاقوں میں نچلی ذات کی قوموں کو ذلیل اور بے عزت کر کے رکھا اور ان پر سخت پابندیاں عائد کیں۔ یہی وجہ تھی کہ سندھ کے لوگ جو زیادہ تر بدھ مت کے ماننے والے تھے، اس کی حکومت سے خوش نہیں تھے۔ [2]

چندر:

چچ کے بعد اس کا بھائی چندر بن سیلائج تخت نشین ہوا۔ وہ بدھ مت کی طرف مائل تھا اور عموماً بدھوں کے معبد میں پوجا پاٹ کرتا رہتا تھا۔ اس نے سات سال تک حکومت کی۔

داہر اور راج چندر کی بادشاہتیں:

چندر کی موت کے بعد سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی: داہر بن چچ اروڑ کے تخت پر بیٹھ گیا جبکہ راج بن چندر نے برہمن آباد کی حکومت سنبھال لی مگر وہ فقط ایک سال حکومت کرسکا اور فوت ہوگیا۔

---

① یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے روہڑی کے قریب آباد تھا۔

② چچ نامہ، ص: ۱۸۰ تا ۵۰

داہر اور دہر سنگھ کی بادشاہتیں:

اس کے بعد چچ کا بڑا بیٹا دہر سنگھ برہمن آباد میں تخت نشین ہوا جبکہ اروڑ میں داہر بدستور حکمران تھا۔ دہر سنگھ نے حاکم لوہانہ ''اگھم'' کی بیٹی سے شادی کی اور پانچ سال امن وامان کے ساتھ گزارے۔ اس دوران اس نے راوڑ کے قلعے کو، جس کی بنیاد اس کے باپ چچ نے رکھی تھی اور اس کی تعمیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی، مکمل کرایا۔

ادھر اس کی بہن مائین جوان ہو چکی تھی۔ دہر سنگھ اس کی شادی کے لیے رشتہ تلاش کر رہا تھا کہ ملک رمل (چولستان) کے راجا سوہن رائے بھاٹیہ کے نمائندے لڑکی کا رشتہ مانگنے آ گئے۔ دہر سنگھ نے رشتہ منظور کر لیا اور لڑکی کا شاہانہ جہیز تیار کر کے اسے پانچ سو گھوڑوں اور سات سو ٹھاکروں کے ساتھ اروڑ روانہ کیا اور داہر کو لکھا کہ وہ لڑکی کو رائے بھاٹیہ کے سپرد کر دے۔ جب یہ قافلہ اروڑ پہنچا تو شادی کی تاریخ میں فقط ایک ماہ رہ گیا تھا۔

انہی دنوں داہر کی ملاقات ایک ماہر نجومی سے ہوئی۔ اس نے نجومی سے اپنی بہن کا زائچہ نکلوایا تو اس نے کہا: ''حساب کے مطابق یہ لڑکی اروڑ کے قلعے سے باہر نہ جائے گی۔ اس کا رشتہ وہ طلب کرے گا جس کے قبضے میں ہندوستان کی بادشاہت ہوگی اور یہ لڑکی اس کے عقد میں آئے گی۔''

داہر یہ سن کر بڑا گھبرایا، اس نے اپنے وزیر بدھی مان سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا: ''آپ بہن سے شادی کر لیں مگر جسمانی تعلق نہ رکھیں، اس طرح وہ آپ کی بیوی بھی کہلائے گی اور سلطنت بھی آپ ہی کے پاس رہے گی۔''

داہر نے یہ بات مان کر مائین کا رائے بھاٹیہ سے رشتہ منسوخ کر دیا۔ وہ محل میں گیا اور بہن کے سر پر چادر ڈالی، اسے زیور پہنائے اور اپنی تلوار اس کے پہلو میں رکھ دی جو کہ شادی کی علامت تھی۔ پھر اس کی چادر کا پلو اپنی چادر سے باندھ کر اپنے ساتھ دربار میں لایا اور تخت پر ساتھ بٹھا دیا۔

داہر کی اس حرکت پر اکثر امرائے لشکر یہاں تک کہ اس کا بھائی دہر سنگھ بھی جو برہمن آباد کا خودمختار حکمران تھا، سخت مشتعل ہوا۔ اس نے بھائی کو خط لکھ کر خبردار کیا کہ وہ اس حرکت سے توبہ کرے ورنہ ہر طرف بغاوت پھوٹ پڑے گی۔ مگر راجہ داہر باز نہ آیا اور فضول تاویلات کر کے اس رشتے کو جائز قرار دیا۔

داہر اور دہر سنگھ میں یہ کشمکش جاری رہی۔ آخر میں دہر سنگھ فیصلہ کرانے اروڑ کے قلعے میں آیا مگر یہاں اسے بھائی کی طرف سے ایسے پُر فریب اور منافقانہ سلوک کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ دل گرفتہ ہو کر بستر سے لگ گیا اور چند دن میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی عمر تیس سال تھی۔ داہر نے اس کی آخری رسومات ادا کرنے کے ایک ماہ بعد اس کی بیوی سے جو لوہانہ کے حاکم اگھم کی بیٹی تھی، شادی کر لی۔

راجہ داہر گرمی کے چار ماہ نو تعمیر شدہ راوڑ قلعے میں گزارنے لگا کیوں کہ اس کی آب وہوا معتدل تھی اور وہاں پانی میٹھا تھا۔ سردی کے چار ماہ وہ برہمن آباد میں رہتا اور بہار کے چار ماہ اروڑ میں گزارتا۔ یوں اس کی حکومت کو آٹھ سال گزر گئے۔ آخر ملک رمل (شاہ چولستان) اس پر چڑھائی کی اور اروڑ کے قریب آن پہنچا۔ داہر مقابلے کے لیے تیار ہوا

مگر کھلے میدان میں فتح کی امید کم تھی۔ یہ بنو امیہ کے دورِ حکومت کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں ایک مفرور عرب سردار محمد علافی داہر کے ہاں ملازم تھا۔[1] اس نے داہر کو حوصلہ دلایا اور عرب دستے کے ساتھ داہر کے چیدہ سپاہیوں کو ملا کر حریف پر ایسا شب خون مارا کہ وہ بوکھلا کر فرار ہوگیا اور داہر کو فتح ہوئی۔[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکِ رمل کی طاقت بہت زیادہ تھی، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس زمانے میں بھی بنو امیہ سے منحرف ہونے والے کچھ عرب مسلمان سندھی فوج میں بھرتی تھے۔

◆◆◆

---

① علافی کا راجہ داہر سے منسلک ہونے کا قصہ آگے تفصیل سے آئے گا۔ ② چچ نامہ، ص ۳۰ تا ۳۳

ملحوظہ: چچ اور اس کی اولاد کے حالات کا اکثر مواد چچ نامے سے لیا گیا ہے۔ اس لیے کسی بھی واقعے کے حوالے کی مراجعت کے لیے اسی کو دیکھا جائے۔

ملحوظہ: چچ نامہ میں سلطنتِ سندھ کی تاریخ کے حوالے سے مختلف مقامات کے نام آتے ہیں جن کی وضاحت درج ذیل ہے:

کشمیر اور چچ نابیات: اس زمانے کا کشمیر جہلم کے ذراع تک وسیع تھا۔ چچ کی سرحد شمال میں یہاں کے ایک مقام "چچ نابیات" تک تھی۔

دریائے محیط: اس سے بحیرۂ عرب مراد ہے۔

اروڑ: یہ "راوڑ" سے الگ قلعہ تھا۔ یہ روہڑی کے قریب تھا اور چچ خاندان کی حکومت سے پہلے رائے خاندان کے دور میں بھی سندھ کا پایۂ تخت رہا تھا۔ پھر ۱۲۵ھ تک یعنی منصورہ کی تعمیر سے پہلے تک یہ مسلمانوں کا دار الحکومت بھی رہا۔ راوڑ کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

دیبل: دریائے سندھ اور سمندر کی ایک کھاڑی کے سنگم پر واقع قدیم شہر۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے مطابق بھنبھور اور دیبل ایک ہی شہر کے دو نام ہیں۔

لوہانہ: یہ مسلمانوں کی آمد کے وقت سلطنتِ سندھ کا ایک وسیع صوبہ تھا جو شہدادپور، جھمپیر اور "بالا" کو محیط تھا۔ لاکھہ، سمہ اور سہتہ نامی اراضی اس میں شامل تھیں۔ یہ نام ان اراضی میں رہنے والی قوموں کے ناموں پر تھے۔

رمل: اس سے مراد چولستان ہے۔

سیوستان: سیہون شریف مراد ہے۔

بدھیہ: یہ سلطنتِ سندھ کا شمال مغربی صوبہ تھا جس میں لاڑکانہ اور جیکب آباد شامل تھے۔ نیز بلوچستان اور سندھ کی سرحدوں پر واقع شہر قیقان اور قندابیل بھی اس میں شمار کیے جاتے تھے اور کبھی بلوچستانی صوبے توران میں۔

جنکان: غالباً وہ شہر مراد ہے جسے ابن بطوطہ نے جنانی موسوم کیا ہے اور وہ بلوچستان سے آتے ہوئے سیہون سے پہلے پڑتا ہے۔

کوہ پایہ: یہ غالباً کوہ کھیر تھر سے متصل "کوہ پاپ" ہے جس کے نالے اور ندیاں جمع ہو کر "دریائے پاپ" (حب ندی) کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کوہ پایہ اور قیقان کا ذکر متعدد مقامات پر اکٹھا آتا ہے۔ یعنی دونوں قریب قریب تھے۔ کوہ پاپ بھی کھیر تھر پہاڑ سے متصل ہے جو قیقان کا دوسرا نام ہے۔

روجھان: ضلع جیکب آباد سے متصل دو شہر اس نام کے ہیں: روجھان جمالی اور روجھان مزاری۔ شاید قدیم روجھان ان تمام علاقے کو محیط تھا۔

کرور: غالباً اس سے مراد "کہروڑ پکا" ہے جو جنوبی پنجاب کا مشہور شہر ہے۔

اشہار: غالباً اس کا مصداق "ٹیکسلا" ہے۔ بدھوں کی اصطلاح میں "ہار" مندر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

طاکیہ: اسے "تکہ" بھی لکھا گیا ہے اور بعض نے "کیہ" لکھا ہے۔ پنجاب سے اوپر کشمیر تک کا علاقہ "تکاویش" کہلاتا تھا، یہاں وہی علاقہ مراد ہے۔

چتوڑ۔ چترور۔ جاتور: چچ نامے میں اس کا نام "جاتور" بتایا گیا ہے۔ غالباً ملتان کے نواح کا قصبہ چتروڑگڑھ یا راجپوتانہ کا کوئی شہر مراد ہے۔

پوراں: یہ وہی دریا ہے جو کوہ پبلہ کے مغرب میں بہتا ہے اور خلیج سون میانی میں جا گرتا ہے۔

نہر سینی: غالباً سینی سے مراد "سنی" ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں سنی میں کوئی نہر بھی تھی۔

شاکلہار: یہ مضافاتِ کشمیر میں کوئی علاقہ تھا۔ ممکن ہے یہ وہی علاقہ ہو جسے اب گلہار کہا جاتا ہے۔

نوٹ: ان اکثر مقامات کی تحقیق میں ڈاکٹر محمد عمر بن داؤد پوتہ اور ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی تحقیقات (مکتوبہ بر حواشی چچ نامہ) پر اعتماد کیا گیا ہے۔

برصغیر خلفائے راشدین کے دور میں

آٹھویں صدی عیسوی میں برصغیر کفر وشرک اور ذات پات کے نظام میں بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ سیاسی لحاظ سے یہ خطہ نہایت منتشر تھا۔ نسلی اور لسانی افتراق کے علاوہ مذہبی اور نظریاتی اختلافات بھی کم نہ تھے۔ یہی وہ دور تھا جب مسلمان اس خطے میں آئے۔ برصغیر (جنوبی ایشیا) میں مسلمانوں کی آمد خلفائے راشدین کے زمانے میں ہو چکی تھی۔ عربوں کا قدیم پیشہ گلہ بانی کے علاوہ تجارت تھا، اس لیے وہ دنیا کے مختلف ممالک میں تجارت کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ ہندوؤں کو بحری تجارت کا کوئی تجربہ نہیں تھا بلکہ ان کے مذہب میں سمندری سفر جائز ہی نہیں تھا، اس لیے ان کا مال عرب تاجروں ہی کے ذریعے باقی دنیا تک پہنچا کرتا تھا۔ عرب تاجر جنوبی ہندوستان کے ساحلوں پر آکر یہاں سے مال واسباب کشتیوں کے ذریعے شام اور مصر تک لے جاتے تھے۔ اسلامی دور میں تجارت کو مزید ترقی ہوئی تو برصغیر میں عرب تاجروں کی آمد ورفت بھی بڑھ گئی اور مقامی لوگوں سے ان کے خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔

عرب تاجروں کے جہاز بصرہ کی بندرگاہ سے روانہ ہو کر برصغیر کے مغربی وجنوبی ساحلوں پر رکتے ہوئے بنگال میں چاٹگام تک پہنچتے تھے۔ کچھ تاجر کشتیوں میں سلہٹ تک چلے جاتے تھے۔ یہ علاقہ ریشم، چینی اور ناریل کے لیے بہت مشہور تھا۔ یہ چیزیں عرب تاجروں کی وساطت سے باقی دنیا تک پہنچتی تھیں۔[1]

خلافتِ راشدہ میں اسلامی لشکر ہندوستان کی مغربی، جنوب مغربی اور شمال مغربی سرحدوں پر دستک دے چکے تھے۔ یہاں فوج کشی کی ضرورت اس لیے تھی کہ یہاں کے جنگجو حکام مسلمانوں کے خلاف فارس اور خراسان کے مجوسی حکمرانوں کی مدد کرتے تھے اور سرحدوں پر اچانک حملے کر کے مسلم امراء اور سپاہیوں کو شہید کر دیتے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور کی مہمات: گجرات اور دیبل پر حملہ: ۱۵ ہجری

برصغیر کی مغربی بندرگاہوں پر سب سے پہلا حملہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اس وقت ہوا جب انہوں نے حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی رضی اللہ عنہ کو بحرین اور عمان کا امیر بنایا۔ یہ ۱۵ھ کی بات ہے۔ حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ نے بحرین کے انتظامات اپنے بھائی حضرت حکم بن ابی العاص ثقفی رحمہ اللہ کے سپرد کیے اور عمان پہنچ کر وہاں کے ساحل سے کشتیوں کے ذریعے بمبئی کے قریب کی مشہور بندرگاہ "تھانہ" پر حملہ کیا۔ کچھ دنوں بعد حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی حکم بن ابی العاص رحمہ اللہ کو بروص (بھروچ، گجرات) پر چھاپہ مار کارروائی کے لیے بھیجا۔ اس کے علاوہ

---

[1] عرب وہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی، ص ۵۰تا۵۲؛ مطالعہ پاک وہند از ڈاکٹر منظور چودھری، ص ۳۵

اپنے دوسرے بھائی حضرت مغیرہ بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو سندھ کے ساحلی شہر دیبل پر حملے کے لیے روانہ کیا۔ اسلامی لشکر "خورالدیبل" (دیبل کی کھاڑی) میں داخل ہوا۔ ① دشمن نے باہر نکل کر جنگ کی۔ فریقین آمنے سامنے ہوئے تو حضرت مغیرہ بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے شمشیر سونت لی اور "بِسْمِ اللّٰهِ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" کہہ کر دشمن پر ٹوٹ پڑے اور لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔ ② تاہم مسلمان میدان جنگ میں ڈٹے رہے اور فتح یاب ہوئے۔ ③

یہ تمام حملے "ریکی" کی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے ان میں کسی مقام پر قبضہ نہیں کیا گیا بلکہ مجاہدین علاقے کے نشیب و فراز دیکھ بھال کر اور دشمن کی طاقت کا اندازہ لگا کر واپس آگئے۔

مکران کی فتح:

۱۷ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا حاکم بنایا اور اسی سال حکم بن عمیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مکران کی فتح کے لیے ایک فوج بھیجنے کی تیاری کی ④ مگر کوچ کے انتظامات مکمل نہ ہوسکے اور اگلا سال شروع ہوگیا۔ یوں یہ فوج ۱۸ھ میں مکران پہنچی۔ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لشکرِ بلوچستان کی کمک کے لیے کوفہ سے مزید مجاہدین بھیج دیے۔ ⑤

اس دوران حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ہند اور کرمان کے حالات سے آگاہ کریں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنے نائبین کے ذریعے تازہ حالات معلوم کرائے تو پتہ چلا کہ سندھ میں اس وقت ایک سرکش راجا کا ظہور ہوا ہے جو مسلمانوں سے بغض اور دشمنی رکھتا ہے۔ ⑥

---

① فتوح البلدان: ص ۴۲۶ ..... ملحوظہ: عثمان بن ابی العاص کو صحابہ میں شمار کیا گیا ہے کیوں کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہونے والے ثقیف کے وفد میں شامل تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۲/۳۷۴) جبکہ ان کے بھائیوں حکم بن ابی العاص اور مغیرہ بن ابی العاص کے بارے میں ایسی کوئی وضاحت نہیں ملی، اس لیے وہ تابعین میں شمار ہوں گے۔

ملحوظہ: مروان کے والد حکم بن ابی العاص اور ان تینوں بھائیوں کے والد حکم بن ابی العاص میں فرق رکھا جائے۔ ثانی الذکر ثقفی تھے اور اول الذکر اموی۔

② چچ نامہ، ص ۷۷ ③ فتوح البلدان: ص ۴۲۶

④ تاریخ طبری میں یہ نام "الحکم بن عمیر التغلبی" لکھا گیا ہے اور اسی سے ابن اثیر نے الکامل فی التاریخ اور ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں من وعن یہی نقل کیا ہے، حالانکہ اسماء الرجال میں ایسی کوئی شخصیت مذکور نہیں۔ البتہ "الحکم بن عمیر الثمالی" کا ذکر ضرور ہے جو صحابی تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۷/۴۱۲، ط صادر۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۲/۹۵) پس ممکن ہے کہ یہاں طبری کے قدیم نسخوں میں کتابت کی غلطی چلی آرہی ہو اور درحقیقت مکران کے پہلے فاتح حکم بن عمیر ثمالی رضی اللہ عنہ ہی ہوں۔

⑤ تاریخ الطبری: سنۃ ۱۷ھ ..... ان افواج کے تمام معاملات بصرہ کے حاکم حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھے کیوں کہ بر صغیر کے امور حاکمِ بصرہ سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کرمان اور مکران میں ربیع بن زیاد حارثی کو نائب مقرر کر دیا۔ ربیع بن زیاد حارثی تابعی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں بہت پسند کرتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں جب انہیں حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر ملی تو اپنے لیے موت کی دعا کی اور اسی وقت خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ (تاریخ الاسلام ذہبی: ۴/۲۸۷، ت بشار)

⑥ اس سے مراد راجہ داہر کا باپ "چچ" تھا جس نے اس زمانے میں بڑا عروج حاصل کر لیا تھا۔ اگرچہ اس کی حکومت کئی سال قبل قائم ہو چکی تھی مگر اب اس کے اقتدار کے گھوڑے چہار سو گھوم چکے تھے اور اکثر ریاستیں اس کی راجدھانی میں ضم ہو گئی تھیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ان احوال سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مطلع کیا تو انہوں نے ہندوستان میں پیش قدمی سے منع کر دیا۔ اس طرح یہ لشکر تقریباً پانچ سال تک ہندوستان پر حملہ نہ کر سکا۔ (۱)

غالباً اس احتیاط کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت اسلامی فوجیں جا بجا بکھری ہوئی تھیں اس لیے فوری ضرورت کے وقت بلوچستان کے محاذ پر کوئی بھاری کمک پہنچانا ممکن نہ تھا۔

تاہم ۲۱ ہجری میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ سندھ پر فوری توجہ دینا ناگزیر ہو گیا۔ ان دنوں ساسانی سلطنت کا آخری بادشاہ یزدگرد مسلمانوں سے مسلسل شکستیں کھانے کے بعد اپنے تاج و تخت سے محروم ہو کر مرو میں پناہ گزین تھا۔ ایسے میں ایرانی امراء مسلمانوں سے بدلہ لینے کی آخری کوشش کے طور پر ایک بار پھر اس کے پرچم تلے جمع ہونے لگے۔ انہوں نے گرد و نواح کے ممالک کو بھی مسلمانوں کے خلاف اکسایا اور انہیں اپنا اتحادی بنا لیا۔ اس ضمن میں سندھ کے حکام سے بھی ان کی خط و کتابت ہوئی اور سندھی بھی ان کے ہمنوا ہو گئے۔ یوں ایرانیوں، خراسانیوں اور سندھیوں کا ڈیڑھ لاکھ افراد پر مشتمل لشکرِ جرار تیار ہو کر "نہاوند" پہنچا۔ اُدھر سے مسلمان حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مدِ مقابل آئے۔ کئی قہر انگیز معرکے پیش آئے اور فیصلہ کن لڑائی میں مسلمانوں کو بھی خاصا نقصان اٹھانا پڑا یہاں تک کہ خود امیرِ لشکر نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ اس معرکے میں شہید ہو گئے۔ بہر حال اللہ نے مسلمانوں کو فتح یاب کیا اور اتحادی لشکر شکست کھا کر منتشر ہو گئے۔ (۲)

اس جنگ کے بعد ایرانیوں کے اتحادی خراسانیوں اور سندھیوں کو سبق سکھانا ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ کی کمان میں مسلمانوں کا ایک لشکر ۲۲ ہجری میں خراسان اور اس کے نواحی علاقوں کو مسخر کرنے نکلا۔ اسی طرح سجستان اور کرمان پر بھی یلغار ہوئی۔ ۲۳ ہجری میں یہ مہمات اختتام پذیر ہوئیں۔ سجستان اور کرمان کی فتح کے بعد وہاں کے صوبہ دار سندھ کی مہم میں تعاون کے لیے فارغ ہو گئے۔ چنانچہ ۲۳ ہجری میں اسلامی افواج حکم بن عمیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مکران روانہ ہوئیں۔ اس دوران دو افسران: سہیل بن عدی اور عبداللہ بن عتبان بھی جو کرمان میں اپنی افواج کے ساتھ موجود تھے، اس محاذ پر پہنچ گئے۔ (۳)

یوں حکم بن عمیر رضی اللہ عنہ کی کمان میں ایک مضبوط لشکر جمع ہو گیا۔ جب یہ لشکر مکران شہر کے قریب پہنچا تو شاہِ مکران اپنی فوج کے ساتھ شہر خالی کر کے دریائے دوین کی طرف نکل گیا۔ (۴)

اور وہاں مورچہ بندی کرنے لگا۔ اس سے قبل وہ حاکم سندھ راسل کو اپنی مدد کے لیے بلا چکا تھا۔

چنانچہ راسل ایک لشکرِ جرار لے کر آن پہنچا اور اس کے دستے دریا کے پار اترنے لگے۔ جب اس کی پوری فوج دریا

---

(۱) چچ نامہ ص ۶۰

(۲) الکامل فی التاریخ: سنة ۲۱ھ (۳) تاریخ الطبری: سنة ۲۳ھ

(۴) دوین سے غالباً دریائے دشت مراد ہے جو مکران کے قریب ہے اور اس ضلع سے گزر کر بحیرۂ عرب میں جا گرتا ہے۔

کے پار آ گئی تو راسل اور شاہ مکران مسلمانوں کی طرف بڑھے۔ مسلمان بھی صفیں مرتب کر کے میدان میں آ گئے۔ یوں مکران کی ایک وادی میں جو دریائے دوین سے چند دن کی مسافت پر تھی، نہایت ہولناک جنگ چھڑ گئی۔ آخر میں اللہ کی نصرت شامل حال ہوئی اور کفار شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ مسلمان کئی دنوں تک مفرورین کو قتل کرتے رہے اور دریائے دوین تک ان کے تعاقب میں رہے۔ اس کے بعد وہ مکران شہر لوٹ آئے۔ ①

حکم بن عمیر رضی اللہ عنہ نے فتح کا بشارت نامہ اور مال غنیمت کے خمس کے ساتھ صحار العبدی رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ روانہ کیا۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے مکران کے حالات پوچھے۔ انہوں نے فصیح و بلیغ انداز میں کہا:

"یَا أَمِیرَ الْمُؤْمِنِینَ! هِیَ أَرْضٌ سَهْلُهَا جَبَلٌ، وَمَاؤُهَا وَشَلٌ، وَتَمْرُهَا دَقَلٌ، وَعَدُوُّهَا بَطَلٌ، وَخَیْرُهَا قَلِیلٌ، وَشَرُّهَا طَوِیلٌ، وَالْكَثِیرُ فِیهَا قَلِیلٌ، وَالْقَلِیلُ فِیهَا ضَائِعٌ، وَمَا وَرَاءَهَا شَرٌّ مِنْهَا"

"امیر المومنین! وہ ایسی سرزمین ہے جس کا ہموار علاقہ بھی پہاڑوں کی مانند (دشوار گزار) ہے۔ اس کا پانی گدلا ہے۔ اس کی کھجور خراب ہے۔ وہاں دشمن بڑا جنگجو ہے۔ وہاں خیر کم ہے اور شر زیادہ۔ زیادہ لشکر بھی وہاں کم ثابت ہوتا ہے اور کم لشکر وہاں ضائع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کا علاقہ اس سے بھی بدتر ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کلام کو مبالغے پر محمول کرتے ہوئے پوچھا:

"تم لفاظی کر رہے ہو یا (صحیح صحیح) خبر دے رہے ہو؟"

جب یقین ہو گیا کہ صحار العبدی رضی اللہ عنہ کا بیان لفظ بلفظ حقیقت ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے حکم بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ان کے معاون سہیل بن عدی کو حکم بھیجا: "تمہارے لشکروں میں سے کوئی ایک بھی مکران کی حدود سے آگے ہرگز نہ بڑھے۔"

مکران کی فتح کے موقع پر بے شمار مال غنیمت کے علاوہ بہت سے ہاتھی بھی ہاتھ آئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہدایت پر ان ہاتھیوں کو عالم اسلام میں فروخت کر کے ان کی قیمت مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی۔ ②

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت اسلامی افواج مکران میں اور قندابیل کے گرد و نواح میں موجود تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ اسلامی افواج اب مزید پیش قدمی کریں۔ اس لیے انہوں نے ۲۹ھ میں عبید اللہ بن معمر تیمی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک اور فوج مکران بھیجی جو دشمنوں کو زیر کرتے ہوئے دریائے دوین تک پہنچ گئی۔ ③

---

① تاریخ الطبری ۲۳ھ

② تاریخ الطبری: ۱۸۱/۳، ۱۸۲؛ عیون الاخبار لابن قتیبۃ الدینوری: ۲۱۷/۱؛ الکامل فی التاریخ: ۲/ ۳۵ ۳۳
نوٹ: یہ "صحار" صحار بن عباس العبدی ہیں۔ امام بخاری، ابن سکن اور ابن حبان نے انہیں صحابہ میں شمار کیا ہے۔ (الاصابۃ: ۳/ ۳۲۹)

③ فتح نامہ، ص ۶۷؛ تاریخ الطبری سنۃ ۲۹ھ؛ الکامل فی التاریخ سنۃ ۲۹ھ۔ **نوٹ:** عبید اللہ بن معمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پیدا ہوئے تھے، ان کی صحبت مختلف فیہ ہے۔ (معرفۃ الصحابۃ للاصبہانی: ۳/ ۱۸۶۷؛ الاصابۃ: ۵/ ۳۳؛ الاستیعاب: ۳/ ۱۰۱۳) یہ اپنے آقا کی تھے کہ گلے کی ان ہڈیوں کو جو کلہاڑی سے کاٹی جاتی ہیں، ہاتھ سے توڑ کر گودا نکال لیتے تھے۔ (تاریخ الطبری: ۷۷ھ)

اس فتح کے بعد اسی سال مکران پر پہلے عمیر بن عثمان بن سعد رضی اللہ عنہ اور پھر ابن کندیر القشیری کو امیر مقرر کر دیا گیا۔[1] آخر میں امیرِ عراق حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے یہ ذمہ داری عبداللہ بن سوار رحمہ اللہ کو سونپی۔[2] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت سرحدات ہند کے عامل وہی تھے۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں قندابیل اور قیقان کی فتح:

سن ۳۹ ہجری کے آغاز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق مسلمان بلوچستان میں مزید آگے بڑھے۔ اس مہم کے سربراہ حارث بن مرۃ العبدی رحمہ اللہ نامی ایک جری افسر تھے۔[4] لشکرِ اسلام کے حرکت میں آنے کی خبر اہل قیقان کو پہنچ چکی تھی۔ کوہ پایہ اور قیقان کے بیس ہزار پیادے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تیار تھے۔[5]

مسلمانوں کے پہنچتے ہی گھمسان کی جنگ چھڑ گئی۔ ایک شدید معرکے کے بعد میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا اور کفار نے پسپا ہو کر پہاڑی گھاٹیوں میں پناہ لے لی۔ لشکرِ اسلام نے راستہ صاف دیکھ کر قیقان شہر کا رُخ کیا مگر جب مجاہدین قیقان کے درّے سے نیچے اتر رہے تھے کہ یکا یک کفار نے انہیں درّے میں گھیرنا شروع کر دیا۔ اس نازک موقع پر مسلمانوں نے پوری قوت سے تکبیر کے نعرے بلند کیے جن کی بازگشت سے پہاڑ لرز اٹھے اور ہر طرف سے تکبیریں گونجتی محسوس ہونے لگیں۔ کفار پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ ان میں سے بعض نے اسی وقت آگے بڑھ کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا جبکہ باقی ماندہ فرار ہو گئے۔[6]

برصغیر دولتِ اُمویہ کے دور میں

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت محاذِ سندھ و بلوچستان کے امیر حارث بن مُرّہ رحمہ اللہ تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

---

① تاریخ الطبری: سنۃ ۲۹ھ، الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۹ھ

ملحوظ: عمیر بن عثمان بن سعد کو کتب اسماء الرجال میں "عمیر بن سعد بن عبید" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ زُہاد صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعد میں انہیں حمص کا والی بنایا تھا اور فرماتے تھے: کاش میرے پاس ان جیسے کچھ اور لوگ بھی ہوتے۔ (الاصابۃ: ۴/۵۹۹)

ابن کندیر القشیری کے حالات اسماء الرجال میں کہیں مذکور نہیں مل سکے۔ مکران کا امیر بننا اس بات کی علامت ہے کہ وہ معمولی آدمی نہ تھے۔ ذخیرہ اسماء الرجال میں سعید بن حیدۃ قشیری (یا حیوۃ) نامی ایک صحابی کا ذکر ہے جن کے ایک بیٹے کندیر تھے جن کا صحابی ہونا مختلف فیہ ہے۔ ممکن ہے سعید بن حیدہ کو اپنے بیٹے کندیر کی مناسبت سے ابو کندیر قشیری کہا جاتا ہو اور تاریخ طبری وغیرہ میں ابو کندیر کی جگہ ابن کندیر نقل کی قدیم غلطی چلی آ رہی ہو۔

② عبداللہ بن سوار بن ہمام العبدی نامور تابعی تھے۔ (المحبر: ص ۱۵۳) نبی اکرم ﷺ کی جانب سے بحرین کے عامل مقرر ہوئے تھے۔ (الاصابۃ: ۵/۱۷) مگر آپ کا صحبت نصیب نہیں ہوئی تھی، اس لیے ابن عساکر نے انہیں تابعی شمار کیا ہے۔ (مختصر تاریخ دمشق: ۲۹/۹۶)

③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۱۸۰

④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۱۹۱، فتوح البلدان ص: ۳۳۸

⑤ چچ نامہ، ص ۷۸، ۷۹۔ ملحوظ: کوہ پایہ کیمر تھر سے متصل "کوہ پاپ" ہے جس کے نالے اور ندیاں جمع ہو کر حب ندی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ (تاریخ سندھ، ص ۹، از عبدالحلیم شرر)

⑥ چچ نامہ، ص ۷۸، ۷۹

کی خلافت کے دوسرے سال سن ۴۲ھ میں وہ اس مہم سے واپس آرہے تھے کہ دشمن نے ایک گھاٹی میں ناکہ بندی کر کے انہیں گھیر لیا۔ حارث بن مُرّہ رحمہ اللہ اپنے اکثر ہمراہیوں سمیت لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ [1]

راشد بن عمرو جدیدی۔ پہلی بار:

ان کے بعد بصرہ کے امیر عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے راشد بن عمرو جدیدی رحمہ اللہ کو محاذِ ہند کا افسر اعلیٰ بنایا۔ وہ ۴۲ھ میں افواج لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے اور مکران سے ہوتے ہوئے سندھ میں دور تک یلغار کرتے چلے گئے۔ [2]

عبداللہ بن سوار کی مہم، قیقان کی از سرِ نو فتح:

راشد بن عمرو رحمہ اللہ کو مزید فتوحات کا وقت نہ مل سکا اور ۴۳ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سوار رحمہ اللہ کو بلوچستان کا امیر بنا دیا۔ [3] آخر عبداللہ بن سوار رحمہ اللہ سرحداتِ ہند پہنچے اور "قیقان" میں پیش قدمی کی۔ [4]

قیقان کا کوہستان بہت دشوار محاذ تھا۔ یہاں بڑی خونریز لڑائی ہوئی جس کی ابتداء میں مقامی جنگجو غالب آئے مگر آخر کار مسلمان انہیں شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ [5]

اس فتح میں بہت سے قیقانی گھوڑے بھی ہاتھ لگے۔ عبداللہ بن سوار رحمہ اللہ نے علاقے میں امن و امان قائم کر کے کراز بن کراز عبدی کو اپنا نائب بنایا اور خود مالِ غنیمت کے قیقانی گھوڑے لے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دمشق پہنچے اور یہ گھوڑے انہیں پیش کیے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خوش ہوئے اور انہیں بلوچستان کے محاذ پر دوبارہ تعینات کر دیا۔ [6]

مہلّب بن ابی صُفرہ رحمہ اللہ کی مہمات۔ بنوں اور صوابی تک دھاوے:

عبداللہ بن سوار رحمہ اللہ کی عدم موجودگی میں سرحداتِ ہند پر دھاوے جاری رہے۔ ۴۴ھ میں ایک منفرد نوعیت کا حملہ ہوا جس کی قیادت نامور اسلامی شمشیر زن مُہلّب بن ابی صُفرہ رحمہ اللہ نے کی۔ وہ اپنے طوفانی دستوں کے ساتھ قندابیل سے ہوتے ہوئے شمال کی طرف بڑھے اور بنّہ (بنوں) کو فتح کر لیا۔ [7]

یہاں بڑی سخت مہمات پیش آئیں۔ ایک موقع پر مقامی جنگجوؤں نے اچانک شب خون مارا مگر ہواز د کے جوانوں کی ثابت قدمی نے مسلمانوں کو بچا لیا جس پر ایک شاعر نے کہا۔

---

[1] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۹۱؛ فتوح البلدان، ص ۴۱۷، ط الھلال

[2] فتوح البلدان، ص ۴۱۸؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۳، ۲۰۵

[3] چچ نامہ، ص ۸۱

[4] فتوح البلدان، ص ۴۱۷

[5] چچ نامہ، ص ۷۹

[6] فتوح البلدان، ص ۴۱۷، ط الھلال؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۷، ۲۰۸

[7] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۶

أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْأَزْدَ لَيْلَةَ بُيِّتُوا ... بِنَّة كَانُوا خَيْرَ جَيْشِ الْمُهَلَّبِ

''کیا تم نے بنو ازد کو نہیں دیکھا کہ جس رات ہنوں میں ان پر شب خون مارا گیا تو وہ مہلّب کے لشکر میں سب سے بہتر ثابت ہوئے۔''[1]

اس کے بعد وہ اپنی فوج کے ساتھ یلغار کرتے ہوئے جنوب مشرق کی طرف مڑے اور ''الاہور'' کے قریب جا پہنچے۔ یہاں ایک بڑی خونریز جنگ ہوئی جس میں ہندوؤں کو شکستِ فاش ہوئی اور حضرت مہلّب رحمہ اللہ شہر پر قبضہ کیے بغیر بھاری مقدار میں مالِ غنیمت لے کر لوٹے۔[2]

واپسی پر مہلّب بن ابی صفرہ رحمہ اللہ قیقان (جبل کھیر تھر) کے راستے سے دوبارہ بلوچستان میں داخل ہوئے۔ قیقان میں وہ ایک موقع پر تنہا تھے کہ اٹھارہ ترک گھڑ سواروں نے اچانک ان پر حملہ کر دیا مگر مہلّب نے اکیلے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان ترکوں کے گھوڑوں کی ایال (گردن کے بال) اوروں میں تراشی ہوئی تھیں جس کے باعث گھوڑے خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ مہلّب بن ابی صفرہ رحمہ اللہ کو یہ وضع پسند آئی اور انہوں نے کہا: ''ان عجمیوں کے مقابلے میں ہم ایسا کرنے کے کہیں زیادہ حق دار ہیں۔'' چنانچہ انہوں نے گھوڑوں کے بال تراشنے کا سلسلہ جاری کیا۔ مسلمانوں میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے یہ طریقہ رائج کیا۔[3]

عبداللہ بن سوار رحمہ اللہ کی دوبارہ امارتِ بلوچستان:

کچھ دنوں بعد عبداللہ بن سوار رحمہ اللہ نے دمشق سے واپس آ کر اپنی سابقہ ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ۴۷ھ میں قبائلی جنگجو ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ''ترکوں'' سے مدد لے کر ایک بہت بڑا لشکر تیار کر لیا۔[4]

اس بار دشمن نے پہاڑوں میں ناکہ بندی کر کے مسلمانوں کے خلاف چھاپہ مار جنگ شروع کر دی۔ یہاں تک کہ مسلمان پوری طرح ان کے گھیرے میں آ گئے اور ان کا دباؤ برداشت نہ کر کے منتشر ہونے لگے، تاہم عبداللہ بن سوار رحمہ اللہ اپنے خاص سپاہیوں اور جانبازوں کے ساتھ اپنی جگہ جمے رہے۔ انہوں نے فنا و بقا کا معرکہ سر پر دیکھ کر صدا بلند کی:

''اے مہاجرو! اے انصاریو! کافروں سے منہ نہ پھیرو، کہیں تمہارے ایمان میں خلل نہ آ جائے۔ آؤ، شہادت کے درجے پر فائز ہو جاؤ۔''

یہ سن کر بکھرے ہوئے مسلمان اپنے امیر کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ دشمن اب مسلمانوں کو گھیرنے کے علاوہ سامنے صفیں باندھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر قبیلہ عبدالقیس کے ایک رئیس نے دشمنوں سے مبارزت طلبی کی۔ قبائلی جنگجوؤں کا ایک سردار مقابلے پر نکلا۔ چند لمحے کے ہولناک مقابلے کے بعد عبدالقیس کے رئیس نے دشمن سردار کو مار گرایا۔ یہ دیکھ

---

[1] الکامل فی التاریخ: ۳/۳۳

[2] تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۶ ــــ لاہور سے مراد غالباً پاکستان کے صوبہ کے پی کے ضلع صوابی کا قدیم تاریخی شہر ''چھوٹا لاہور'' مراد ہے۔

[3] فتوح البلدان، ص ۴۱۷، ط الھلال [4] فتوح البلدان، ص ص ۴۱۷؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۷، ۲۰۸

کر دشمن نے عام حملہ کر دیا۔ عبد اللہ بن سوار رحمہ اللہ اور ان کے ہمراہی بڑی دلیری سے لڑے اور حریف کے بے شمار افراد کو قتل کرنے کے بعد جام شہادت نوش کر گئے۔ تاہم آخری لمحات میں انہوں نے سنان بن سلمہ رحمہ اللہ کو مسلمانوں کا امیر مقرر کر دیا تھا۔ اس لڑائی میں فریقین کے اس قدر افراد قتل ہوئے کہ یہاں وادیاں اور پہاڑ نعشوں سے بھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ لڑائی سے بچ نکلنے والے مسلمان کسی نہ کسی طرح مکران کے قلعے تک پہنچ گئے۔ [1]

اس سے پرے کے تمام علاقے پر مشرکین کا تسلط ہو گیا۔ [2]

سنان بن سلمہ رحمہ اللہ کی فتوحات:

عبد اللہ بن سوار رحمہ اللہ کی شہادت کی خبر سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عراق کے امیر زیاد کو درج ذیل مراسلہ بھیجا:

''تم غور کرو کہ محاذ ہند کے لیے کونسا شخص موزوں ترین ہے۔''

زیاد نے غور و فکر کے بعد حضرت سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو عامل بنا دیا جبکہ عبد اللہ بن سوار رحمہ اللہ کی وصیت بھی یہی تھی۔ یہ ۴۸ھ کی بات ہے۔ سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے دو سال ایک ماہ تک حکومت کی اور خود کو مفتوحہ علاقوں کے دفاع تک محدود رکھا۔ [3]

راشد بن عمرو جدیدی کی دوبارہ امارت:

۵۰ھ میں عراق کے امیر زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو بلوچستان کی ولایت سے معزول کر دیا [4] اور یہ عہدہ راشد بن عمرو جدیدی رحمہ اللہ کو سونپ دیا۔ راشد بن عمرو رحمہ اللہ مکران پہنچ کر سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے ملے اور ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر اعتراف کیا کہ وہ ایسے عظیم اور دلیر انسان ہیں جو واقعی امارت اور سپہ سالاری کے لائق ہیں۔ چونکہ سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو اس دشوار گزار علاقے میں ایک مدت ہو گئی تھی لہٰذا راشد بن عمرو رحمہ اللہ ان سے اچھی طرح معلومات اور مشورے لیتے رہے۔

ایسا لگتا ہے کہ حضرت سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ کا انداز حکومت نرم خوئی پر مشتمل تھا، اس لیے گزشتہ دو سال سے انہوں نے کوئی فوج کشی نہیں کی تھی حالانکہ متعدد ماتحت قبائل نے اس دوران خراج تک ادا نہیں کیا تھا۔ غالباً راشد بن عمرو رحمہ اللہ کی تقرری اس پالیسی کو بدلنے کے لیے ہوئی تھی۔ پس راشد بن عمرو رحمہ اللہ نے تمام معلومات لینے کے بعد بلا تاخیر ان علاقوں پر یلغار کر دی جہاں سے خراج ملنا بند ہو گیا تھا۔ انہوں نے ''کوہ پایہ'' اور ''قیقان'' پہنچ کر جبراً خراج وصول کیا۔ [5]

---

① چچ نامہ: ص ۷۹

② فتوح البلدان، ص: ص ۳۱۷، ط الهلال؛ تاريخ خليفة بن خياط، ص: ۲۰۸،۲۰۷

③ تاريخ خليفة بن خياط، ص ۲۱۱،۲۰۹؛ فتوح البلدان: ص ۳۱۸

④ چچ نامہ: ص ۸۱

⑤ چچ نامہ: ص ۸۱ —— یاد رہے کہ کوہ پایہ کھیر تھر جبل کے جنوب میں ہے۔

پھر وہ قزاقی کرنے والے ''مید'' قبائل سے جہاد کے لیے نکلے۔[1] یہ دشوار گزار مہم ایک سال تک جاری رہی۔[2] ان کی واپسی پر غیر مسلم قبائل نے ان کے خلاف پچاس ہزار افراد کا لشکرِ عظیم جمع کر کے ان کا راستہ روک لیا۔ صبح سے نمازِ ظہر تک نہایت گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں راشد بن عمرو رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔[3] کفار کو ایک بار پھر غلبہ حاصل ہو گیا اور مکران سمیت خاصا علاقہ پھر مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔[4]

حارث بن مُرّہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن سوار رضی اللہ عنہ کے بعد یہ تیسرے اسلامی افسرِ اعلیٰ تھے جنہوں نے محاذِ ہند پر شہادت پائی۔

سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی قیادت:

ان کی شہادت کی خبر ملنے پر سرحدوں کے معاملات ایک بار پھر سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے سنبھال لیے[5] اور عراق کے امیر زیاد نے بھی محاذِ ہند کی قیادت انہی کے نام کر دی۔ سنان رضی اللہ عنہ نے بہت جلد افواج مرتب کر کے ہاتھ سے نکلے ہوئے علاقوں کی بازیابی کی تیاری کر لی۔ وہ فوج لے کر روانہ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں: ''تمہارے والد کو تمہاری دلیری پر ناز ہے۔ آج کا دن تمہاری فتح کا دن ہے۔ بہت سا علاقہ تمہارے قبضے میں آئے گا۔ وہاں عدل و صلاح کے ساتھ حکومت کرنا۔'' یہ بشارت پوری ہوئی۔ سنان رضی اللہ عنہ مختلف علاقے فتح کرتے چلے گئے اور ہر جگہ بڑی خوش اسلوبی اور مہربانی سے انتظامات کیے۔[6]

پہلے انہوں نے خضدار اور اس کے نواحی علاقوں کو فتح کیا۔[7] پھر دشمن کے مضبوط ترین گڑھ ''قیقان'' کی طرف پیش قدمی کی۔ جب دونوں لشکر آمنے سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ حریف کی فوج ٹڈی دل کی مانند بکثرت ہے۔[8]

حضرت سنان رضی اللہ عنہ نے اپنے مجاہدین کو قسم کھلا رکھی تھی کہ جو لڑائی سے بھاگا اس کی بیوی کو طلاق۔[9]

دشمن کی کثرت دیکھ کر انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ہمت دلائی اور فرمایا: ''بشارت ہو! تمہیں دو میں سے ایک کامیابی ضرور ملے گی: یا جنت یا فتح۔'' پھر انہوں نے سات پتھر اٹھائے اور مجاہدین کے سامنے آ کر کہا:

''جب مجھے حملہ کرتے دیکھو تو تم بھی ٹوٹ پڑنا۔''

حضرت سنان رضی اللہ عنہ نے فوج کو تیار حالت میں رکھا۔ جب سورج عین سر پر آیا تو تکبیر کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۹، ۲۱۱؛ فتوح البلدان: ص ۳۱۸
② چچ نامہ: ص ۸۲
③ چچ نامہ: ص ۸۲
④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۹، ۲۱۱؛ فتوح البلدان: ص ۳۱۸
⑤ فتوح البلدان: ص ۳۱۸
⑥ چچ نامہ: ص ۸۲
⑦ فتوح البلدان: ص ۳۱۸
⑧ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۲۲
⑨ فتوح البلدان، ص ۳۱۷

چھے پتھر دشمن کی طرف پھینکے۔ اس کے بعد مزید انتظار کیا، جب سورج ذرا ڈھلنے لگا تو ساتواں پتھر اچھالتے ہوئے نعرہ لگایا: "حٰمٓ لا ینصرون۔" پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے بت پرستوں پر حملہ آور ہو گئے۔

مسلمان بھی دشمن پر پل پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں مشرکین کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے جبکہ باقی ماندہ بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے بارہ میل (ساڑھے ۱۹ کلومیٹر) تک ان کا تعاقب کیا۔ آخر مفرورین ایک مضبوط قلعے میں جا چھپے۔ مسلمانوں نے قلعے کو گھیرا تو مقامی لوگوں نے اندر سے کہلوایا: "اللہ کی قسم! ہمیں تم نے نہیں مارا بلکہ چتکبرے گھوڑوں پر سوار سفید عمامہ پوشوں نے ہمیں مارا ہے۔" مسلمانوں نے کہا: "یہ اللہ کی نصرت تھی۔"

اس جنگ میں مسلمانوں کا صرف ایک فرد شہید ہوا۔ بعد میں کسی سپاہی نے حضرت سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے دشمن پر حملے میں اتنے توقف کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی کیا کرتے تھے۔"[1]

حضرت سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے اس مہم میں مکران کو بزور شمشیر دوبارہ فتح کیا اور اس پورے علاقے کو از سر نو آباد اور منظم کیا۔ وہ دو سال (۵۰ھ تا ۵۲ھ) تک اپنے عہدے پر رہے اور یہاں بڑی خوبی سے حکومت کرتے رہے۔[2]

سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ کے بعد:

حضرت سنان رضی اللہ عنہ کے بعد امیر عراق زیاد بن ابی سفیان نے ۵۳ھ میں اپنے بیٹے عباد بن زیاد کو سرحدات ہند کی ذمہ داری سونپی تھی۔ عباد نے دریائے ہلمند کے گرد و نواح کے علاقوں اور قندھار کو دوبارہ فتح کیا۔[3]

اس دوران ایک ہندوستانی لشکر پیش قدمی کرتا ہوا سرحد پر آیا مگر عباد نے اسے شکست دے کر پسپا کر دیا۔ عباد کی مہمات بجستان کی حدود میں رہیں اور ان کا دائرہ بلوچستان یا سندھ تک وسیع نہیں ہو سکا۔[4]

منذر بن جارود:

۶۳ھ میں یزید بن معاویہ کے امیر عبید اللہ بن زیاد نے منذر بن جارود کو "قندابیل" کا عامل بنا دیا جو سرحدات ہند کا اہم محاذ تھا۔[5] منذر بن جارود نے بوقان، قیقان اور خضدار سمیت ان تمام علاقوں کو دوبارہ فتح کیا جہاں کے لوگ سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ کے بعد بغاوت کر چکے تھے۔ ان مہمات میں اسلامی لشکر ہر طرف پھیل گئے اور بکثرت غنائم ان کے ہاتھ لگے۔ منذر نے اسی محاذ پر وفات پائی۔[6]

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۱۲، ۲۱۳
② فتوح البلدان، ص ۴۱۸، ط الہلال
③ فتوح البلدان: ص ۴۱۸
④ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۱۹
⑤ فتوح البلدان: ص ۴۱۸
غالباً اس وقت انتظامی لحاظ سے قندابیل کو مرکز بنا دیا گیا تھا، اس لیے وہاں کا عامل بنانے کا مطلب تمام سرحدات ہند کا عامل بنانا تھا
⑥ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۶ ——— نوٹ: مذکورہ عبارات میں بوقان سے غالباً "بولان" (بلوچستان) مراد ہے۔

ان کے بعد ان کے بیٹے حکم بن منذر نے مرکز سے بغاوت کر دی اور قندابیل میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔[1]

کچھ مدت بعد عراق کے امیر عبید اللہ بن زیاد نے حری بن حری الباہلی کو سرحدات ہند کا افسر فوج مقرر کر دیا۔ حری بن حری نے وہاں بڑی سخت جنگیں لڑیں اور فتح یاب رہ کر بکثرت مال غنیمت حاصل کیا۔[2]

اس کے بعد سرحدات ہند کے بارے میں تاریخ خاموش ہو جاتی ہے اور عبد الملک بن مروان کے دور تک وہاں کسی انتظامی تبدیلی یا نئے حادثے کا ذکر نہیں ملتا۔

یزید کے دور کی بے برکتی کے باعث بلوچستان اور سرحدات سندھ کا سارا مفتوحہ علاقہ شام کی مرکزی حکومت کے ہاتھ سے نکل گیا اور پھر ایک طویل مدت تک مسلمان یہاں فتوحات حاصل نہ کر سکے۔ ۶۳ھ سے ۷۳ھ تک شامی امراء نے عراق و حجاز کی خلافتِ زبیریہ کے خلاف جنگوں کا سلسلہ جاری رکھا جس کی انتہاء حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے سانحہ شہادت پر ہوئی۔ خانہ جنگی کے اس طویل دور میں ہندوستان اور سندھ کے محاذ پر کوئی توجہ نہ دی جا سکی۔

سعید بن اسلم:

۷۸ھ میں عراق کے امیر حجاج بن یوسف نے سرحدات ہند کے انتظامات پر توجہ دی اور سعید بن اسلم کو مکران کا امیر بنا کر بھیجا۔ کچھ مدت بعد اس نے کسی وجہ سے خاندان علاف کے بعض لوگوں کو قتل کرا دیا جس پر علافی بھڑک اٹھے اور اس خاندان کے ایک رئیس محمد بن حارث علافی نے جس کا نسبی تعلق بنو سامہ بن لوی سے تھا، اپنے بھائی معاویہ کے ساتھ مل کر بغاوت کر دی اور سعید بن اسلم کو قتل کر کے مکران پر قابض ہو گیا۔[3]

مُجاعہ بن سعر:

حجاج بن یوسف نے یہ صورتحال دیکھی تو سخت غضب ناک ہوا۔[4] اس نے مُجاعہ بن سعر تمیمی کو سرحدات ہند کا امیر بنا کر روانہ کر دیا۔ مُجاعہ بن سعر نے ۷۹ھ میں مکران پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور علافی برادران فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ مُجاعہ نے آگے بڑھ کر قندابیل کا کچھ نواحی علاقہ بھی فتح کر لیا۔ تاہم کچھ ہی دنوں بعد اس کی وفات ہو گئی۔[5]

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۶

یاد رہے کہ یزید کی بدتدبیری اور زیادتیوں نے پورے عالم اسلام میں بے چینی پیدا کر دی تھی، جس کے باعث اسی سال ۶۳ھ میں اہل کابل نے بھی بغاوت کی، حجاز میں بھی یزید کی اطاعت کا طوق گلے سے اتار دیا گیا۔ ادھر افریقہ میں بھی شورش کی آگ پھیل گئی اور وسیع و عریض مفتوحہ علاقے ہاتھ سے نکل گئے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے تاریخ الطبری: سنۃ ۶۳ھ، سنۃ ۶۴ھ؛ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۶۳ھ، سنۃ ۶۴ھ۔

غالباً حکم بن منذر کی بغاوت بھی اسی منظرنامے کا حصہ تھی۔

② فتوح البلدان: ص ۴۱۹

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۷۷؛ چچ نامہ: ص ۸۶، ۸۷

④ چچ نامہ: ص ۸۶، ۸۷

⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۷۸؛ فتوح البلدان: ص ۴۱۹؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۷۵ھ

محمد بن ہارون بن ذراع:

اب حجاج بن یوسف نے سرحدات سندھ کی امارت محمد بن ہارون بن ذراع نمری کو سونپ دی اور اسے حکم دیا کہ وہ علافی برادران کو کسی بھی قیمت پر ٹھکانے لگائے۔[1] محمد بن ہارون نے سرتوڑ کوشش کر کے معاویہ بن حارث علافی کا کام تو تمام کر دیا البتہ محمد بن حارث علافی ہاتھ نہ آیا۔[2]

اسی زمانے میں خراسان کے جرنیل عبدالرحمن بن اشعث نے حجاج بن یوسف کے خلاف بغاوت کر دی۔ محمد بن حارث علافی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس مہم میں شریک ہو گیا مگر جب عبدالرحمن بن اشعث کو شکست ہوئی اور اس کا گروہ بکھر گیا تو محمد بن حارث علافی پانچ سو عربوں کے ساتھ سندھ چلا آیا اور راجہ داہر کی فوج میں شامل ہو کر اس کے جرنیلوں میں شمار ہونے لگا۔[3]

ادھر حجاج بن یوسف کو اس بات سے تشویش رہی کہ محمد بن حارث علافی کیسے بچ نکلا۔ وہ اس فکر میں رہا کہ کسی طرح موقع ملے تو اسے بھی ٹھکانے لگا دیا جائے۔ کچھ دنوں بعد ایک اور ایسا حادثہ پیش آیا کہ سندھ پر حملہ ضروری ہو گیا۔[4]

ہوا یہ کہ سری لنکا میں آباد عرب تاجروں کے بعض کنبے وطن واپس جا رہے تھے۔ ان کا ارادہ حج بیت اللہ کر کے دمشق جانے کا تھا تاکہ خلیفہ ولید سے ملاقات کریں۔ سری لنکا کا راجا ایک صلح پسند انسان تھا۔ اس نے خلیفہ کے لیے بڑے قیمتی تحائف بھی اس بیڑے کے ساتھ کر دیے جس میں آٹھ کشتیاں تھیں۔ سندھ کے قریب بحری طوفان نے بیڑے کا رخ پھیر کر اسے دیبل کے سامنے پہنچا دیا اور یہاں کے قزاقوں نے کشتیوں کو گھیر لیا۔

سراندیپ کے اہلکاروں نے یہ منظر دیکھ کر کہا:

''ہم مسلمانوں کے خلیفہ کے پاس جا رہے ہیں، یہ مال اور ساز و سامان انہی کے لیے ہے۔''

مگر حملہ آوروں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے عورتوں کو گرفتار کر لیا اور سارا سامان لوٹ لیا۔ ساتھ ہی کہا:

''اگر رہائی چاہیے تو اس کا تاوان ادا کرنا ہوگا۔''

اس وقت قبیلہ بنی یربوع کی ایک خاتون نے چیخ کر کہا: ''اے حجاج! اے حجاج! مدد کو پہنچ!''

چند خوش قسمت مسلمان اس موقع پر جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ سیدھا حجاج کے پاس پہنچے اور ان خواتین کی فریاد سنائی۔ یہ ماجرا سنتے ہی حجاج کے منہ سے نکلا: ''شاید میں سو رہا تھا۔ اس آواز نے مجھے جگا دیا ہے۔''

پھر وہ بے تابانہ پکار اٹھا: ''لبیک! لبیک!''

---

(1) تاریخ خلیفہ بن خیاط میں ۹۰ھ کے تحت امیر کا نام ہارون بن ذراع منقول ہے جبکہ آگے ۸۶ھ کے تحت جہاں عبدالملک بن مروان کے تمام عاملین کے نام ایک ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اس امیر کا نام محمد بن ہارون نقل کیا ہے اور یہی صحیح ہے جیسا کہ فتوح البلدان اور چچ نامہ میں بھی یہی نام مذکور ہے۔

(2) تاریخ خلیفة بن خیاط: ص ۲۷۸؛ تاریخ الاسلام للذهبي: ۳۳۸/۵، ت تدمری

(3) چچ نامہ، ص ۷۱ (4) چچ نامہ، ص ۸۹

اس نے فوراً ایک سفیر کے ہاتھ راجہ داہر کو مراسلہ بھیجا کہ ان قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے اور لوٹا ہوا مال واسباب واپس دیا جائے۔ بصورت دیگر ریاست سندھ کو سخت نتائج بھگتنا ہوں گے۔

حجاج نے سفیر کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ اغوا کیے جانے والے قافلے کا پتا لگا کر ان کا حال احوال معلوم کرے۔

سفیر سندھ پہنچا اور حجاج کا پیغام پہنچایا۔ داہر نے طاقت کے نشے میں اس مراسلے کی کوئی پروا نہ کی اور بات کو ٹالتے ہوئے کہہ دیا: "یہ کام سمندری ڈاکوؤں کا ہے۔ ان پر ہمارا بس نہیں چلتا۔"[1]

حجاج کو ایسے حیلے بہانوں سے دھوکا نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس نے دربار خلافت سے سندھ میں جہاد کی اجازت طلب کی اور منظوری ملتے ہی بلوچستان کے حاکم عبید اللہ بن نبہان کو سندھ میں پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ عبید اللہ بن نبہان محاذ پر پہنچے تو زبردست جنگ ہوئی۔ عبید اللہ شہید ہو گئے اور فوج کو پسپا ہونا پڑا۔

حجاج کو خبر ہوئی تو اپنے دوسرے جرنیل بدیل بن طہفہ کو اس مہم پر بھیجا۔ اس بار بھی بڑی خونریز لڑائی ہوئی جس کے دوران بدیل بن طہفہ شہید ہو گئے اور اسلامی لشکر کو ایک بار پھر پیچھے ہٹنا پڑا۔

آخر حجاج نے بڑے اصرار کے ساتھ خلیفہ ولید بن عبد الملک سے برصغیر میں ایک بڑی مہم شروع کرنے کی اجازت حاصل کی اور منظوری ملتے ہی جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ دار الخلافہ سے چھ ہزار شامی سپاہیوں کی کمک منگوائی اور اس مہم کی قیادت کے لیے بصرہ کے سابق حاکم قاسم بن محمد کے نوجوان بیٹے محمد بن القاسم کا انتخاب کیا۔

حجاج بن یوسف نے لشکر کو تمام آلات اور ضروری سامان کے ساتھ تیار کیا۔ قلعہ شکن منجنیقوں اور آتش زنی کے لیے بارودی مسالے سے لے کر دھاگے تک ہر چیز ساتھ رکھی۔ عرب سپاہی سالن پکانے کے لیے سرکہ استعمال کرتے تھے جو سندھ میں کم یاب تھا۔ سندھ کی گرمی کے باعث بوتلوں میں بھیجا گیا سرکہ بھی خراب ہو سکتا تھا؛ اس لیے حجاج نے سرکے کو روئی میں بھگو کر سائے میں خشک کرایا اور اس روئی کی بوریاں اس ہدایت کے ساتھ روانہ کر دیں کہ جب بھی ضرورت ہو، اس روئی کو پانی میں بھگو کر حسب ضرورت سرکہ حاصل کر لیا جائے۔ اس ساز وسامان میں سب سے عجیب چیز "عروس" نامی منجنیق تھی جو خلیفہ ولید بن عبد الملک کی تھی اور خاص دار الخلافہ دمشق سے بھیجی گئی تھی۔ اسے پانچ سو آدمی مل کر چلاتے تھے۔

۹۲ھ کے وسط میں یہ لشکر روانہ ہوا اور حجاج کی ہدایت کے مطابق شیراز پہنچ کر ٹھہر گیا۔ جب دمشق سے بھیجا جانے والا عسکری ساز وسامان آ گیا تو محمد بن قاسم نے اسے کشتیوں کے ذریعے دیبل کی طرف روانہ کیا اور خود خشکی کے راستے مکران کا رخ کیا۔ مکران میں مقامی امیر محمد بن ہارون نے محمد بن قاسم کا استقبال کیا۔[2]

---

① چچ نامہ، ص ۸۹، ۹۰ ــــ داہر کی یہ بات بالکل غلط تھی کیوں کہ بعد میں محمد بن قاسم نے ان قیدیوں کو داہر کے قلعوں سے بازیاب کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ داہر اس قسم کے قزاقوں کی غیر اعلانیہ سرپرستی کرتا تھا۔

② چچ نامہ، ص ۹۱ تا ۱۰۰

چند دن کی تیاری کے بعد لشکرِ اسلام آگے بڑھا اور پنج گور کو فتح کیا۔[1]

اس کے بعد لشکر ارمائیل (لس بیلہ) پہنچا۔ محمد بن ہارون نے بیماری کے باوجود لشکر کے ہم رکاب رہ کر بڑی ہمت کا مظاہرہ کیا تھا مگر ارمائیل کے قریب پہنچ کر حالت اتنی بگڑ گئی کہ آخر وہیں وفات پائی۔[2]

محمد بن قاسم:

ہارون بن ذراع کی وفات کے بعد حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو سندھ اور تمام نومفتوحہ علاقوں کا والی بنا دیا۔ اُدھر محمد بن قاسم نے ارمائیل (لس بیلہ) پر حملہ کر کے اسے مسخر کرلیا۔[3]

فتح کے بعد یہیں حجاج بن یوسف کا ہدایت نامہ پہنچا جس میں دیبل کے معرکے کی بابت اہم ہدایات دی گئی تھیں۔ لشکرِ اسلام نے اب ساحلی پٹی کا رُخ کیا اور سندھ کی حدود میں داخل ہو کر جمعہ کے دن دیبل کے سامنے فروکش ہوا۔ انتظامات اتنے عمدہ تھے کہ اسی دن سمندر کے راستے بحری فوج بھی سازوسامان اور قلعہ شکن آلات کے ساتھ پہنچ گئی۔[4]

اس دوران راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ نیرون کوٹ (حیدر آباد) میں تھا۔ اس نے باپ کو اس لشکر کی آمد کی خبر دی اور اس پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی۔ داہر نے علاقیوں سے مشورے کے بعد جے سنگھ کو پیش قدمی سے منع کر دیا۔[5]

دیبل کا مندر:

دیبل کا مندر بہت مشہور تھا جس میں گوتم بدھ کا بہت بڑا مجسمہ نصب تھا۔ اس کی عمارت ساٹھ فٹ بلند تھی جس پر مزید ساٹھ فٹ اونچا گنبد تھا۔ گنبد کی چوٹی پر ایک کھمبا تھا جس پر ایک بہت بڑا ریشمی سرخ پرچم عجیب کاری گری سے بنایا گیا تھا۔ وہ چار سمتوں میں چار جھنڈوں کی شکل میں کھلتا تھا اور جب ہوا چلتی تو یہ چاروں جھنڈے پنکھے کی طرح گردش کرتے تھے۔ دیبل کے لوگ اسے ایک طلسم سمجھتے تھے۔[6]

شہر کے سامنے پڑاؤ ڈالنے اور اپنے حفاظتی انتظامات مستحکم کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے منجنیقوں کو نصب کرایا۔ حجاج بن یوسف بصرہ میں بیٹھ کر اس محاذ کی ایک ایک بات کی خبر رکھتا۔ محمد بن قاسم کا خط تین دن میں حجاج کو اور حجاج کا

---

① فتوح البلدان: ص ۴۳۳ ② چچ نامہ: ص ۱۰۰

③ فتوح البلدان: ص ۴۳۳ ④ چچ نامہ: ص ۱۰۲

چچ نامے کے مطابق محمد بن قاسم کا لشکر اوائل محرم ۹۳ھ میں دیبل پہنچا تھا۔ تقویمی حسابات کی رو سے یہ سات محرم، مطابق پانچ نومبر ۷۱۱ء ہوگا۔ مگر یہ تاریخ درست معلوم نہیں ہوتی کیوں کہ چچ نامہ ہی کے مطابق دیبل کو فتح کرنے میں ایک ماہ بھی نہیں لگا تھا۔ اور یہ بھی چچ نامہ کا بیان ہے کہ دیبل کی فتح کے بشارت نامے کے جواب میں حجاج کا جو مراسلہ پہنچا تھا وہ وسط رجب ۹۳ھ کو لکھا گیا تھا۔ محمد بن قاسم کی جانب سے اس مہم کی ہر بات حجاج کو بتانے کا معمول تھا اور چھٹے یا ساتویں دن اس کا جواب آجاتا تھا۔ دیبل کی فتح جیسے اہم واقعے کی اطلاع میں نہ محمد بن قاسم کی طرف سے تاخیر ہو سکتی تھی اور نہ ہی حجاج کی جانب سے جواب میں سستی کا کوئی امکان تھا۔ اس لیے محرم میں دیبل کا فتح ہونا کتابت یا راوی کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ حجاج کے خط رجب ۹۳ھ کے مراسلے کو دیکھتے ہوئے قرین قیاس یہ ہے کہ دیبل کو جمادی الآخرہ ۹۳ھ کے اواخر میں گھیرا گیا اور رجب کے پہلے عشرے میں اس کی فتح ہوئی۔

⑤ چچ نامہ: ص ۱۰۰ ⑥ چچ نامہ: ص ۱۰۳؛ فتوح البلدان: ص ۴۲۰؛ الکامل فی التاریخ: ۳/ ۱۹

جوابی ہدایت نامہ تین دن میں محمد بن قاسم کو پہنچ جاتا تھا۔[1]

محمد بن قاسم کی جانب سے روزانہ کے حالات لکھ کر بھیجے جاتے اور حجاج کا مراسلہ ہر روز موصول ہوتا اور حملے میں توقف کی ہدایت کی جاتی۔ آٹھویں دن حجاج کی طرف سے اجازت ملی۔ اب محمد بن قاسم نے شہر پر دھاوا بول دیا۔ شہر کے سپاہی حملے کی تاب نہ لا کر قلعے میں محصور ہو گئے۔ اس دوران شہر کے کچھ خاص لوگوں نے محمد بن قاسم سے خفیہ طور پر ملاقات کی۔ ان میں ایک نجومی بھی تھا جس نے عرض کیا: ''ہمارا حساب کتاب بتاتا تھا کہ یہاں کے بادشاہ کی مدت پوری ہو چکی ہے اور اب مسلمانوں کا دور آنے والا ہے۔ اس لیے ہم دیبل میں قید مسلمانوں کو تسلی دیتے رہتے تھے۔'' محمد بن قاسم نے اس کی درخواست پر اسے امان نامہ لکھ دیا اور اس نے جا کر قیدیوں کو خوشخبری سنائی کہ حجاج کا بھتیجا محمد بن قاسم آیا ہے، اس کے ہاتھ پر قلعہ فتح ہوگا اور تمہیں رہائی نصیب ہوگی۔

اسی طرح ایک برہمن خفیہ طور پر محمد بن قاسم سے ملا اور اطلاع دی کہ اہل شہر کے عقیدے کے مطابق جب تک مندر پر لہرانے والا پرچم نہیں گرے گا، یہ شہر مسخر نہیں ہو سکتا۔ یہ سن کر محمد بن قاسم نے اپنے لشکر کے ماہر ترین سنگ انداز جعونہ کو پیش کش کی کہ اگر وہ اس جھنڈے اور گنبد کو سنگ باری سے گرا دے تو اسے دس ہزار درہم انعام دیے جائیں گے۔ جعونہ نے حامی بھر لی۔ محمد بن قاسم نے پوچھا: ''اگر تم ناکام رہے تو پھر کیا سزا ہوگی؟''

جعونہ نے کہا: ''میرے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔''[2]

محمد بن قاسم نے اپنے مراسلے میں یہ تمام حالات حجاج کو بتائے اور جعونہ کے ساتھ طے کیا گیا انعام اور ناکامی کی صورت میں سزا بھی لکھ بھیجی۔ ساتھ ہی حجاج نے جعونہ کے ساتھ طے کردہ شرط کی توثیق کر دی اور تاکید کی کہ اہل دیبل کے سوا سندھ میں جو بھی امان طلب کرے، اسے امان دے دینا۔[3]

فتح دیبل:

اب محمد بن قاسم نے جعونہ کو عروس کے ذریعے پرچم پر سنگ باری کا حکم دیا۔ اس مجاہد نے پہلے ہی نشانے میں پرچم کو اڑا دیا جبکہ دوسرے نشانے میں گنبد کو توڑ دیا۔ اب دیبل کے بت پرستوں کو شکست کا یقین ہو گیا مگر ان کے نزدیک دیوتاؤں کے غضب سے بچنے کے لیے لڑ کر مرجانا ضروری تھا لہٰذا وہ شہر کے دروازے کھول کر میدان میں آ گئے

---

① فتوح البلدان: ص ۴۲۰

② چچ نامہ، ص ۱۰۵

③ چچ نامہ، ص ۱۰۶ —— یہاں بلاذری کا بیان ہے کہ حجاج نے مندر پر سنگ باری کے حوالے سے خصوصی ہدایات دی تھیں اور جواب میں لکھا تھا: ''عروس کو تھوڑا سا مشرق کی طرف موڑ دو اور اسے ایک زاویہ کم کر کے نشانہ لگاؤ۔'' (فتوح البلدان: ص ۴۲۱)
مگر چچ نامہ کے مطابق تحقیق کا رخ متعین کرنے میں حجاج کا کوئی دخل نہ تھا۔ یہ بات بیت محمد بن قاسم اور جعونہ کے مابین ہوئی تھی اور جعونہ ہی نے کہا تھا کہ منجنیق کو اس طرح نصب کیا جائے۔ چچ نامہ کا بیان قرین قیاس ہے جبکہ بلاذری کا بیان بعید از عقل ہے۔ حجاج کی ہوشیاری اور تجربہ کاری اپنی جگہ مگر یہ قیاس سے بعید ہے کہ محاذ پر موجود ماہر ترین منجنیقچی کو نشانہ باندھنے کا اور موقع سے غائب شخص صرف حالات پڑھ کر نشانہ درست کرا دے۔

مگر مسلمانوں نے ایک زوردار حملہ کر کے انہیں پسپا کر دیا۔ اہل دیبل نے شہر میں گھس کر پھاٹک بند کر لیا۔ تاہم مجاہدین رسیوں کے ذریعے فصیل پر چڑھ گئے اور وہاں قبضہ کر لیا۔ بنو مراو کے ایک سپاہی نے سب سے پہلے فصیل پر اسلامی پرچم نصب کیا۔ اب دیبل کے سپاہیوں نے شہر کے دروازے کھول کر امان طلب کی مگر شہر بزور شمشیر فتح ہوا تھا، اس لیے محمد بن قاسم نے کہا: ''مجھے اس کی اجازت نہیں۔''

چنانچہ تین دن تک دیبل میں جنگجوؤں کے خلاف کارروائی جاری رہی۔ تاہم بت خانے کا پجاری جاہین قلعے کی دیوار پھاند کر نکل گیا اور دریائے سندھ عبور کر کے راجہ داہر کے پاس پہنچ گیا اور اسے شکست کا حال سنایا۔ اسی طرح دیبل کا حاکم جسے رائے کہا جاتا تھا، اپنے باقی ماندہ مفرور سپاہیوں سمیت نیرون کوٹ پہنچ گیا جہاں کا حاکم داہر کا بیٹا جے سنگھ تھا۔

ادھر محمد بن قاسم نے دیبل پر قبضہ کرنے کے بعد ان قیدی مسلمان عورتوں اور مردوں کو بازیاب کرایا جو سندھیوں نے گرفتار کیے تھے۔ محمد بن قاسم نے انہیں ہر طرح کی راحت و آسائش پہنچائی تاکہ ان کی تکالیف کا مداوا ہو سکے۔ محمد بن قاسم نے عام شہریوں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کیا۔ اس کے علاوہ چار ہزار مسلمانوں کو یہاں آباد کر کے برصغیر میں پہلی مسلم آبادی کی داغ بیل ڈالی اور اس خطے کی پہلی مسجد تعمیر کرائی۔[1]

وادیٔ مہران کے مشرقی حصے کی فتح:

راجہ داہر کی عادت تھی کہ وہ گرمی کے ایام اپنے جنوبی پایۂ تخت ''راوڑ'' میں گزارتا تھا۔[2]

اس وقت موسم گرما تھا اور راجہ داہر وہیں تھا، اس لیے اسے فوری طور پر ہر اطلاع پہنچ رہی تھی۔ اس نے دیبل کی تسخیر کی خبر سنتے ہی اپنے بیٹے جے سنگھ کو حکم دیا کہ وہ سیدھا برہمن آباد پہنچے اور نیرون کوٹ کو ''بھشنی'' نامی بدھ راہب کے حوالے کر کے اسے شہر کی حفاظت کی سخت تاکید کرے۔[3]

نیرون کوٹ کی فتح:

راجہ داہر سے ٹکر لینے سے قبل محمد بن قاسم نے دریائے سندھ کے مغربی علاقوں پر قبضہ مستحکم کرنا ضروری سمجھا تاکہ راوڑ پر حملے کے دوران پشت سے کسی حملے کا خدشہ نہ ہو۔ چنانچہ لشکر اسلام نے نیرون کوٹ کی طرف کوچ کیا۔[4]

محمد بن قاسم نے منجنیقوں اور دیگر بھاری سامان کو کشتیوں پر لدوا کر انہیں دریائے سندھ کی شاخ ''ساکرہ'' کے

---

① چچ نامہ، ص ۱۰۷ تا ۱۱۰؛ فتوح البلدان، ص ۳۲۰، ۳۲۱؛ تاریخ یعقوبی، ص ۲۲۹؛ الکامل فی التاریخ: ۱۸/۴، ۱۹۔

② چچ نامہ، ص ۴۸۔ ''راوڑ'' اور ''اروڑ'' میں اکثر مغالطہ لگ جاتا ہے۔ ''اروڑ'' شمالی سندھ میں روہڑی کے قریب تھا اور بہت قدیم قلعہ تھا جبکہ راوڑ کی بنیاد چچ نے رکھی تھی اور داہر نے اسے مکمل کرایا تھا۔ یہ جنوبی سندھ حیدرآباد اور ٹھٹھہ کے درمیان دریائے سندھ کے مشرق میں تھا۔ (چچ نامہ، ص ۵۲)

③ چچ نامہ، ص ۱۱۲ تا ۱۱۴

④ چچ نامہ، ص ۱۱۵۔۔۔ حیدرآباد سندھ دراصل ''نیرن'' (نیرون یا نیرون کوٹ) کی قدیم بستی کی جگہ پر آباد ہے۔ (نبی بخش بلوچ، حواشی چچ نامہ)

ذریعے روانہ کیا اور خود خشکی کے راستے سے نیرون کی سمت پیش قدمی کی۔ نیرون کے قریب پانی دستیاب نہ تھا۔ مجاہدین کا پیاس سے بُرا حال ہو گیا۔ یہ دیکھ کر محمد بن قاسم نے دو رکعت نماز ادا کی اور یہ دعا پڑھی:

يَا دَلِيلَ الْمُتَحَيِّرِيْنَ وَ يَا غِيَاثَ الْمُسْتَغِيْثِيْنَ، اَغِثْنِيْ بِحَقِّ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(اے بھٹکے ہوؤں کے رہنما! اے فریادیوں کے مشکل کشا! بسم اللہ کی برکت سے ہم پر بارش برسا۔"

دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل ہو گیا اور ہر طرف پانی کے تالاب بھر گئے۔ اُدھر نیرون کے لوگوں نے صلح کے ساتھ شہر محمد بن قاسم کے حوالے کر دیا اور مجاہدین کی سواریوں کے لیے چارے کا بندوبست بھی کیا۔ محمد بن قاسم نے بھی ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔[1]

شمالی سندھ کی فتح:

اب محمد بن قاسم نے شمالی سندھ کا رُخ کیا۔ لشکرِ اسلام جہاں بھی پہنچا، فتح و نصرت قدم نے بڑھ کر قدم چوم لیے۔[2] لشکرِ اسلام نے کچھ ہی دنوں میں پہلے سیہون میں اپنے پرچم گاڑے اور پھر منچھر جھیل کے کنارے واقع قلعہ سیسم فتح کر لیا۔ اس کے بعد سیہون کے شمال میں صوبہ بدھیہ (لاڑکانہ، جیکب آباد اور شکارپور) کی آخری حدود تک تمام علاقے مسخر ہو گئے جہاں دریائے سندھ کے پار بکھر کا قلعہ تھا۔[3]

سیہون کے شمال سے شکارپور تک کے وسیع و عریض علاقے میں فوج کشی کی ضرورت پیش نہیں آئی اور داہر کی زیادتیوں سے تنگ آئے ہوئے مقامی سرداروں نے مسلمانوں کے حسنِ سلوک کی خبریں سننے کے بعد از خود ان کی اطاعت کو ترجیح دی۔

نیرون واپسی:

بکھر کو فتح کر کے راجہ داہر کے پایۂ تخت "اروڑ" پر حملہ کرنا زیادہ مشکل نہ تھا اور غالباً محمد بن قاسم کا ارادہ یہی تھا مگر حجاج بن یوسف کا منصوبہ مختلف تھا۔ اس نے حکم دیا کہ مسلمان تمام علاقوں کو چھوڑ کر فوراً نیرون واپس پہنچیں اور دریا کے پار اتر کر راجہ داہر کی سرکوبی کی تیاری کریں۔ محمد بن قاسم نے حکم کی تعمیل کی۔ لشکرِ اسلام نیرون واپس آیا اور محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کو تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کیا۔ حجاج نے جواب میں پوری احتیاط کے ساتھ مناسب ترین مقام سے دریائے سندھ عبور کرنے کی ہدایات دیں اور تاکید کی کہ داہر کو دریا کے پار مت آنے دینا۔[4]

دریائے سندھ کیسے عبور کیا گیا؟

آخر محمد بن قاسم نے دریائے سندھ کے کنارے کی طرف کوچ کر دیا اور اشبہار (ٹنڈو محمد خان) کو فتح کر کے دریا کے ساتھ ساتھ جنوب کی سمت سفر شروع کر دیا۔ موسم گرما کے باعث برف پگھلنے سے دریا کی سطح عام دنوں سے

---

① چچ نامہ، ص ۱۱۵ تا ۱۱۹ ② فتوح البلدان، ص ۴۳۱
③ چچ نامہ، ص ۱۱۹ تا ۱۲۲ ④ چچ نامہ، ۱۲۲ تا ۱۳۰

بلند تھی، اس لیے اسے عبور کرنا آسان نہ تھا مگر جولائی شروع ہونے والا تھا اور مزید کچھ دن گزر جاتے تو برسات کے باعث مہران کو عبور کرنا ممکن ہی نہ رہتا۔ خوش قسمتی سے مسلمانوں کو یہاں ایک مددگار میسر آ گیا۔ یہ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر واقع قلعہ "بھٹ" کے حاکم وسایو کا بیٹا موکو تھا۔ اس نے محمد بن قاسم کو اپنی پوری حمایت کا یقین دلایا۔ محمد بن قاسم نے بدلے میں اسے ایک بڑی جاگیر دینے کا وعدہ کیا۔ موکو محمد بن قاسم کی خدمت میں آنا چاہتا تھا مگر برادری میں عزت برقرار رکھنے کے لیے اس نے محمد بن قاسم کو لکھا:

"اگر میں جنگ کیے بغیر ہتھیار ڈال دوں تو یہ دشمنوں کی ملامت اور خاندان کی رسوائی کا سبب ہوگا۔ اب میں ساکرہ (ساکرو) کے رانا سے اپنی بیٹی کی شادی (کی بات) کرنے کے بہانے وہاں جا رہا ہوں۔ آپ اس دوران ایک ہزار سپاہی بھیج کر مجھے گرفتار کر لیں۔"

محمد بن قاسم نے تجویز سے اتفاق کیا۔ موکو ایک سو خدام اور سپاہیوں کے ہمراہ ساکرہ (ساکرو) کی طرف روانہ ہوا اور ادھر محمد بن قاسم کے سالار بنانہ بن حنظلہ نے منصوبے کے مطابق تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ محمد بن قاسم نے موکو کی بڑی خاطر مدارات کی اور ساتھ ہی پروانہ لکھ دیا کہ ضلع بھٹ کی حکومت نسل در نسل اسی کے پاس رہے گی۔

محمد بن قاسم نے اب دریا عبور کرنے کا فیصلہ کر کے مزید نشیب میں ایسی جگہ قیام کیا جہاں دریا کے پار قلعہ راوڑ واقع تھا۔ یہیں محمد بن قاسم نے موکو سے دریائے سندھ عبور کرنے کے لیے کشتیاں طلب کیں اور ساتھ ہی راجہ داہر کے پاس ایک سفیر بھیجا جس نے محمد بن قاسم کا یہ پیغام سنایا:

"اگر تم دریا کے پار آنا چاہو تو تمہیں اختیار ہے۔ راستہ کھلا ہے۔ تمہیں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ بصورت دیگر تم راستہ کھلا رکھو تا کہ لشکرِ عرب دریا عبور کر کے تمہاری طرف آ جائے۔"

داہر نے اپنے وزیر "سیاکر" سے مشورہ لیا۔ اس نے کہا: "لشکرِ عرب کو دریا عبور کرنے دیا جائے۔ اس طرح مہران کا پانی ان کے پیچھے ہوگا اور انہیں کوئی کمک نہیں پہنچ سکے گی۔"

داہر ان دنوں اپنے آپ کو بے خوف ظاہر کرنے کے لیے شراب و کباب، شطرنج و چوسر اور سیر و شکار میں منہمک رہنے لگا تھا۔ اس کے ایک مشیر نے مشورہ دیا کہ وہ "صحرائے کچھ" چلا جائے اور ہندوستان کے حکمرانوں سے مدد لے کر آئے مگر داہر نے اسے مسترد کر دیا اور مقابلے پر تلا رہا۔

اُدھر لشکرِ اسلام مزید جنوب میں جا کر میرپور ساکرو میں دریائے سندھ کے اس گھاٹ پر پہنچ گیا جہاں دوسری سمت بھٹ کا قلعہ واقع تھا۔ موکو بن وسایو نے لشکر کو دریا عبور کرانے کے لیے حسبِ وعدہ کشتیوں اور تختوں کا انتظام کر دیا۔

داہر کو یہ خبر مل گئی تھی کہ ضلع بھٹ کے حاکم وسایو کا بیٹا موکو محمد بن قاسم سے ملا ہوا ہے اور کشتیاں فراہم کرنے میں تعاون کر رہا ہے۔ اس نے موکو کے بھائی راسل کو حکم دیا کہ وہ قلعہ بھٹ پہنچ کر مسلمانوں کو روکے۔

جب محمد بن قاسم نے دریا پر کشتیوں کا پل باندھنے کی کوشش کی تو راسل بن وسایو نے اپنی فوج کے ساتھ ان پر

حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آخر کار محمد بن قاسم نے کشتیوں کو دریا کے درمیان باندھنے کی بجائے ایک اور ترکیب پر عمل کیا۔ دریا کے پاٹ کی چوڑائی کو صحیح ناپ کر دریا کے مغربی کنارے پر کشتیوں کو عرضاً باندھ کر ایک طویل زنجیر بنائی گئی اور اس میں چیدہ سپاہیوں کو بٹھا دیا گیا۔ اس زنجیر کا ایک سرا ایک مضبوط کھونٹے سے باندھ کر باقی حصے کو دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دیا گیا۔ پانی کا بہاؤ خود بخود کشتیوں کے اس پل کو دھکیل کر دوسرے کنارے تک لے گیا۔ کشتیوں میں بیٹھے سپاہی ڈھالوں کے ذریعے خود کو دشمن کے تیروں سے بچاتے رہے اور دوسرے کنارے پر پہنچتے ہی دشمن پر پل پڑے۔ آخر دشمن بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ اب کشتیوں کے پل کو میخیں گاڑ کر دوسری سمت باندھ دیا گیا اور سارا لشکر ٹولیوں کی شکل میں پل سے گزرنے لگا۔ اس دوران فقط ایک مجاہد دریا میں ڈوب کر شہید ہوا۔ باقی سب سلامتی سے پار آ گئے اور ان کی یلغار کے سامنے راسل بن وسایو کے سپاہی پسپا ہو کر ادھر اُدھر منتشر ہو گئے۔[1]

راجہ داہر سے فیصلہ کن معرکہ:

محمد بن قاسم نے دریا عبور کر کے فوج کے سامنے ایک ولولہ انگیز خطاب کیا جس میں کہا:

"لشکرِ اسلام! مہران کا پانی تمہاری پشت پر ہے اور کفار کا لشکر تم سے مقابلے کے لیے آنے والا ہے۔ جس کے دل میں واپسی کا خیال ہے، وہ یہیں سے واپس ہو جائے۔ کیوں کہ جب دشمن سے سامنا ہوگا اور جنگ شروع ہوگی، اس وقت کسی نے منہ موڑا تو باقی لشکر بھی دل شکستہ ہو کر راہِ فرار اختیار کرے گا اور دشمن غالب آجائے گا۔ یہ بڑی ذلت ہوگی۔ بھاگنے والا حرام موت مرے گا اور آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوگا۔"

پہلے دن کی لڑائی:

اُدھر سے داہر نے اپنے بیٹے جے سنگھ کو لشکر دے کر بھیجا تا کہ مسلمانوں کو مزید پیش قدمی سے روک لیا جائے۔ جے سنگھ اپنے دستے کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہوا مگر اسے شکست ہوئی اور اس کے تقریباً تمام سپاہی مارے گئے۔ جے سنگھ خود گھیرے میں آ گیا۔ قریب تھا کہ وہ گرفتار ہو جاتا مگر اس کا ہاتھی رسّہ توڑ کر تیزی سے بھاگ نکلا، یوں جے سنگھ کی جان بچ گئی۔ داہر اس وقت پیش قدمی کر کے راوڑ کی سرحدی جھیل کے شرق میں محاذ کے قریب آ چکا تھا۔ جے سنگھ زندہ سلامت اس کے پاس پہنچا اور شکستِ فاش کا حال سنایا۔

اس دوران حجاج بن یوسف کا تازہ مکتوب محمد بن قاسم کو پہنچ چکا تھا کہ جنگ کو جلد انجام تک پہنچاؤ۔ چنانچہ محمد بن قاسم کے لشکر نے تیزی سے پیش قدمی کی اور راوڑ کے قریب ایک دریائی شاخ کے کنارے خیمے لگا دیے۔

اب لشکر قریب سے قریب تر ہونے لگے یہاں تک کہ جنگ کے لیے درمیان میں فقط ڈیڑھ میل کا میدان رہ گیا۔ جس کے کنارے پر ایک جھیل تھی۔ اگلے دن دونوں لشکروں کے مابین باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ پہلے دن داہر کا ایک ٹھاکر "چندھا سردار" لشکر لے کر مقابلے پر نکلا۔ صبح سے شام تک جنگ ہوتی رہی مگر فیصلہ نہ ہو سکا۔

---

[1] چچ نامہ، علی بن حامد الکوفی، ص ۱۲۲ تا ۱۳۳ ؛ فتوح البلدان، ص ۴۴۱

دوسرے دن داہر نے دہل اور بھٹ کے سابق قلعہ دار جاہین کو مقابلے پر بھیجا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد وہ قتل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر وزیر سیاکر نے داہر سے عرض کیا: "جنگ کی یہ روش غلط ہے۔ آپ نے کئی بار غلطیاں کی ہیں اور تجربات سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ آپ کو عربوں کا سامنا اس وقت کرنا چاہیے تھا جب وہ ٹولیوں کی شکل میں مہران عبور کر رہے تھے۔ اب وہ اکھٹے ہو کر سامنے ہیں اور مقابلے پر جانے والا ہر ٹھا کر مارا جاتا ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ اب آپ تمام گھڑ سواروں، پیادوں اور ہاتھیوں کو لے کر یک بارگی حملہ کیجیے۔"

داہر کو چار و ناچار ایسا ہی کرنا پڑا۔ اگلے دن نو رمضان ۹۳ ہجری کو وہ لشکر لے کر نکلا۔ اس دن اس کے لشکر میں پانچ ہزار گھڑ سوار، بیس ہزار پیادے اور ساٹھ ہاتھی تھے۔ اس نے لشکر کے دو حصے کر دیے: ایک حصے کو اپنے بیٹے جے سنگھ کی کمان میں دیا اور دوسرے حصے کو لے کر خود آگے بڑھا۔ اس نے زرہ پہنی ہوئی تھی اور اپنی خاص کمان تھام رکھی تھی۔ وہ فولادی خول سے گھری ہوئی ایک پالکی میں ہاتھی پر سوار تھا جس پر دو کنیزیں بھی ساتھ تھیں۔ اس کے دائیں طرف تیر اندازوں کے دستے تھے۔ بائیں طرف گھڑ سوار تھے، درمیان میں ہاتھیوں کے غول اور پیچھے پیادوں کی صفیں تھیں۔

اُدھر لشکرِ اسلام میں محمد بن قاسم کا خطاب جاری تھا:

"اے اہل عرب! آج جدوجہد کا دن ہے۔ اسلام کی کامرانی کے لیے کوشش کرو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، تا کہ تم مشرکین کو پسپا کر سکو اور ان کا ملک و مال تمہارے قبضے میں آئے۔ اگر تم مضبوط نہ رہے، اگر تم پریشان اور شکستہ دل ہو گئے، اگر تم نے عاجزی اور کمزوری کو جگہ دی، تو مشرکین تم پر غالب آجائیں گے، میدان ان کے ہاتھ رہے گا۔ وہ تم سب کو قتل کر دیں گے۔ ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یاد رکھو! اگر تم نے کفار کے مقابلے سے منہ پھیرا تو تمہارا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور تمہارے بزرگوں کی عزت پر دھبہ لگ جائے گا۔"

اس کے بعد محمد بن قاسم نے صفیں مرتب کیں۔ محرز بن ثابت کو قلب میں اپنے ساتھ رکھا۔ جہم بن زحر کو دائیں بازو، ذکوان بن علوان کو بائیں بازو، عطاء بن مالک قیسی کو ہراول دستوں اور نباتہ بن حنظلہ کو عقبی دستوں پر مقرر کر کے اعلان کیا:

"اگر میں شہید ہو جاؤں تو محرز بن ثابت امیر ہوں گے۔"

محمد بن قاسم کے حکم پر سب سے پہلے محرز بن ثابت اور اویس بن قیس جیسے ہزار سپاہیوں کو لے کر جھیل سے گزرے اور داہر کے لشکر کے سامنے پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے عطاء بن مالک قیسی اور ذکوان بن علوان البکری بھی جھیل پار کر کے اپنے دستوں کے ساتھ میدان جنگ میں صف بستہ ہو گئے۔

داہر نے فی الفور تمام طاقت کے ساتھ اس طرف دھاوا بولنے کی تیاری کر لی۔ یہ دیکھ کر محمد بن قاسم نے اپنے پاس فقط چند دستے چھوڑ کر باقی تمام فوج اسی طرف بھیج دی اور پیچھے پیچھے خود بھی موکو بن وسایو کے ساتھ جھیل سے گزر کر معرکۂ کارزار میں قدم رکھ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نہایت خونریز جنگ چھڑ گئی۔ مست ہاتھیوں کا غول سامنے آیا تو مسلمانوں نے ٹولیوں میں تقسیم ہو کر انہیں گھیر لیا اور نو ہاتھیوں کو زخمی کر کے بھگا دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے کفار کو

دھکیل کر میدان کے آخری سرے تک پہنچا دیا۔ تاہم اس دن جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ ان کے نائب امیر محرز بن ثابت شہید ہو گئے۔

اگلے دن جمعرات دس رمضان ۹۳ھ کو فیصلہ کن معرکہ تھا۔ (1)

مسلمانوں نے نمازِ فجر اس طرح ادا کی کہ لشکر پانچ صفوں میں کھڑا تھا۔ پہلی صف میں بنو عالیہ۔ دوسری صف میں بنو تمیم، تیسری صف میں بنو بکر بن وائل، چوتھی صف میں عبد القیس اور پانچویں صف میں بنو ازد کے جانباز تھے۔ فرض ادا کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے لشکر سے یوں خطاب کیا:

"اے اہلِ عرب! کفار کی فوج نے جنگ کے لیے ہماری طرف رُخ کر لیا ہے۔ تم ہمت سے کام لو۔ اللہ کی مدد سے ان پر حملہ کرو۔ ہم اللہ کی قوت کے سہارے انہیں تلواروں کی خوراک بنا دیں گے۔ تم ثابت قدم رہنا۔ پریشان نہ ہونا۔ خاموشی کو اپنا زیور بنانا۔ اپنے اپنے مقام پر جم کر اس کا دفاع کرنا۔ کوئی بھی قلب سے دائیں بازو اور دائیں سے بائیں بازو جا کر دوسروں کی مدد میں مصروف نہ ہو۔ ہر ایک اپنی جگہ اور اپنی صف میں ڈٹا رہے۔ اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کا انجام بخیر کرتا ہے۔ تم ہر وقت اپنی زبان پر کلام اللہ کی تلاوت جاری رکھنا۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ کا ورد کرتے رہنا۔ مسلمانو! استغفار بکثرت کرو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دو خاص چیزیں بھیجی ہیں: ایک حضور ﷺ پر درود و سلام بھیجنا۔ دوسرے گناہوں سے استغفار کرنا۔ تمہیں اپنے دلوں کو مضبوط رکھنا چاہیے تاکہ اللہ عزوجل تمہیں دشمن پر غالب کر دے۔"

اس دوران بنو بکر بن وائل اور بنو تمیم کے کچھ لوگوں نے آ کر اطلاع دی:

"لشکرِ کفار بہت بڑی بلا کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ وہ لوگ اسلحہ اور سامانِ جنگ تیار کر چکے ہیں، خوشیاں منا رہے ہیں اور لڑائی میں عجلت ظاہر کر رہے ہیں۔"

محمد بن قاسم نے جواباً کہا: "اے بنی تمیم کے عزیزو! دشمن تمہارے سامنے آ کھڑا ہوا ہے اور جنگ کے لیے مستعد ہے تو تمہیں بھی پوری قوت اور جانفشانی کے ساتھ نبرد آزما ہونا چاہیے۔"

محمد بن قاسم کا یہ ولولہ انگیز خطاب ختم ہوا تو سب کے دلوں میں ایک نیا جذبہ موجزن ہو چکا تھا۔ پانچ صفوں میں

---

(1) چچ نامہ میں یہاں تاریخ پنج شنبہ (جمعرات)، دہم رمضان سنہ ثلاث و تسعین (۹۳ھ) درج ہے اور یہی تاریخ آج تک سب نقل کرتے آئے ہیں مگر یہاں غلطی سے ۹۳ ہجری ہے۔ کیوں کہ چچ نامہ کے مطابق دیبل سے نیرون کا سفر رجب ۹۳ھ کے آخر میں ہوا تھا۔ پھر نیرون کا محاصرہ ہوا۔ پھر سیوستان اور پھر سیسم کا محاصرہ ہوا۔ اس کے بعد دوبارہ لشکر نیرون آیا۔ پھر اشبہار کا محاصرہ ہوا۔ اس کے بعد لشکر یا ترتیب ہے ور، راوڑ، میرپور سا کرہ اور پھر بیٹ پہنچا۔ یہاں پچاس روز انتظار کیا۔ اس کے بعد دریا پار کیا گیا۔ پھر بیٹ کا محاصرہ ہوا۔

اگر راوڑ سے جنگ دس رمضان ۹۳ھ کو ہوئی تھی تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ تمام مہمات فقط چالیس دن میں انجام پائیں جو بالکل ناممکن ہے۔ اتنی مہمات تو در کنار فقط سفر کے لیے کئی ماہ درکار تھے۔ اگر راوڑ سے معرکے کو ۹۴ھ میں مان لیا جائے تو بات درست ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبد العزیز بن غانم کے تقویمی سوفٹ ویئر سے اسی کی تائید ہو رہی ہے کیوں کہ اس کے مطابق دس رمضان ۹۴ھ میں جمعرات کو پڑا تھا جبکہ ۹۳ھ میں یہ تاریخ اتوار کو آئی تھی۔

کھڑے نمازیوں میں سے ہر ایک دوسرے کو حوصلہ دے رہا تھا۔

محمد بن قاسم نے لشکر کو نئی حکمت عملی کے ساتھ صف بستہ کیا۔ دائیں بازو کی کمان نباتہ بن حنظلہ اور بائیں بازو کی ذکوان بن علوان کے ہاتھ میں تھی۔ جوازد کے ہذیل بن سلیمان اور زیاد بن حواری چنیدہ دستوں کے ساتھ کفار کے قلب کے بالمقابل تعینات کیے گئے تھے۔ ان میں سے محمد بن مصعب بن عبدالرحمان اور خریم بن عروہ خاص راجہ داہر کے دستے کے سامنے تھے۔ ہراول دستے کے افسر سلیمان بن نبہان اور ابو فضہ قشیری تھے جن کی کمان میں جو کندہ کے دوسو آزاد کردہ جنگجو غلام تھے۔

محمد بن قاسم نے اپنے خاص گھڑسواروں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے لشکر کے دائیں بازو، بائیں بازو اور عقبی دستوں کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ آتشیں تیر چلانے کے ماہر نو سو سپاہی بھی لشکر میں شامل تھے جنہیں تین حصوں میں تقسیم کر کے تین سو کو دائیں بازو، تین سو کو بائیں بازو اور تین سو کو قلب میں کھڑا کر دیا گیا۔ انہیں حکم دیا گیا کہ اپنی مشعلیں روشن اور آتشیں تیر تیار رکھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان تیراندازوں نے آتشیں تیر کمانوں پر چڑھا لیے۔

یہ سخت گرمی کا موسم اور رمضان کا مہینہ تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر خود بھی روزہ نہیں رکھا تھا اور صحابہ کو بھی اسی کی ترغیب دی تھی تاکہ دشمن کے مقابلے میں قوت حاصل رہے۔[1] چنانچہ سندھ کی اس فیصلہ کن جنگ میں بھی اکثر مسلمان روزے دار نہیں تھے اور اسی لیے محمد بن قاسم نے جنگ سے پہلے لشکر کے ہر گوشے میں پانی کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے سقوں کو مقرر کیا اور انہیں کہا: ''مشکیں پانی سے بھر کر صفوں میں گشت کرتے رہو۔''

سپاہیوں کو حکم دیا: ''(جنگ کے دوران) کوئی بھی پانی کی طلب میں اپنی جگہ سے ادھر اُدھر نہ ہٹے۔''

اُدھر راجہ داہر بھی اپنی طاقت میں مزید اضافے کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا۔ آج اس کے زرہ پوش گھڑسواروں کی تعداد دوگنی ہو کر دس ہزار ہو گئی تھی جو لشکر کا قلب بن کر اس کے بیٹے جے سنگھ کی کمان میں تھے۔ دائیں اور بائیں بازو میں سندھ کے بڑے بڑے ٹھاکروں اور سرداروں کی فوجیں تھیں۔ پشت پر جاٹوں کے جتھے تھے۔ نہایت جنگجو چنیدہ سپاہیوں کو لشکر کی اگلی صفوں میں رکھا گیا۔ ہاتھیوں کے دستے جاٹین کی کمان میں تھے اور ان کے غول دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں میں تقسیم کر دیے گئے تھے۔ داہر خود بھی ہاتھیوں کے ایک غول کے بیچ میں براجمان تھا۔

جنگ کے آغاز میں فریقین کے ہراول ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ اسلامی ہراول کے افسر سلیمان بن نبہان اور ابو فضہ قشیری اپنے دوسو مجاہدین کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ کفار کا ہراول کچھ دیر مقابلے کے بعد بہت سی لاشیں چھوڑ کر پسپا ہو گیا۔ داہر نے یہ دیکھ کر ہراول کو تازہ دم دستے فراہم کیے جنہوں نے دوبارہ حملہ کیا۔ اس بار ابو فضہ نے انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔ داہر نے تیسری بار کچھ ٹھاکروں کو بھیجا مگر ابو فضہ نے انہیں ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ وہ اپنی خیمہ گاہ تک بھاگتے چلے گئے۔ کئی گھنٹوں تک لڑائی پوری شدت سے جاری رہی یہاں تک کہ سورج ڈھلنے لگا۔

[1] سنن الترمذی، ج: ۱، ا ۷، ابواب الصوم، باب ما جاء فی کراهية الصوم فی السفر

سہ پہر کے وقت کچھ مقامی سپاہی داہر کا ساتھ چھوڑ کر محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور امان طلب کرنے کے بعد مشورہ دیا کہ اگر ایک دستہ ان کے ساتھ کر دیا جائے تو وہ داہر کی فوج پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے رہنمائی کر سکتے ہیں۔ محمد بن قاسم نے مروان بن انجم اور تمیم بن زید کے دستوں کو دو پرچم دے کر ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔

ان جانبازوں نے یکایک جا کر لشکرِ کفار پر عقب سے دھاوا بول دیا۔ داہر کے لشکر میں اس ہل چل سے ایک کہرام بچ گیا۔ اگرچہ عقب سے حملہ کرنے والے مجاہدین زیادہ نہ تھے مگر داہر نے ہیبت زدہ ہو کر ایک بھاری تعداد اس طرف روانہ کر دی۔ یوں اس کا لشکر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ یہ دیکھتے ہی محمد بن قاسم نے للکار کر کہا:

''مجاہدین عرب! دشمن دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ حملہ کرو۔ آج تمہاری جد و جہد کا دن ہے۔''

اُدھر راجہ داہر نے بھی انجام قریب دیکھ لیا تھا۔ وہ چار سو آہن پوش محافظوں کے جلو میں اپنے سفید ہاتھی پر سوار ہوا جو طاقت اور ہیبت میں بے نظیر تھا اور اس کے حملے کے سامنے کسی کا ٹھہرنا مشکل تھا۔ داہر کے فیل بان نے ہاتھی کو مسلمانوں پر چڑھانا شروع کیا۔ ساتھ ہی داہر کے چار سو محافظ تلواروں اور نیزوں کو پورے جوش و خروش سے گردش دینے لگے۔ داہر کی دونوں کنیزیں اس کے ساتھ عماری میں بیٹھی تھیں۔ ایک اسے پان کھلا رہی تھی جبکہ دوسری اسے تیر پکڑا رہی تھی۔ داہر کی کمان نہایت کڑی تھی جس کا چلہ کھینچنا عام سپاہیوں کے بس سے باہر تھا۔ اس کے پاس دو قسم کے تیر تھے۔ ایک نوکدار جو جسموں کو چیر پھاڑ کر نکل جاتے تھے۔ دوسرے قینچی کی طرح دوشاخہ جو گردن کو سر سے الگ کر دیتے تھے مگر داہر کا سب سے عجیب ہتھیار کمند کی مانند ایک گول چکر تھا جس میں آئینے کی طرح چمکدار چھریاں نصب تھیں۔ جب داہر کا فیل بان ہاتھی کو مسلمانوں پر چڑھاتا تو داہر وہ چکر گھمانا شروع کر دیتا۔ جو مجاہد بھی ہاتھی پر حملہ کرنے قریب آتا، داہر چکر پھینک کر اسے اپنی طرف کھینچ لیتا اور اس کا سر قلم کر دیتا۔ یوں داہر کا ہاتھی اور اس کا طوفانی دستہ مسلمانوں کے لیے بڑی مصیبت بننے لگے جس سے چھٹکارے کے لیے داہر کے ہاتھی کو گرانا ضروری تھا۔

یہ دیکھ کر محمد بن قاسم کے لشکر کے ایک نہایت دلیر اور کہنہ مشق سپاہی ''شجاع حبشی'' نے قسم کھائی کہ وہ داہر کے ہاتھی کو زخمی کر کے دم لے گا۔ اس نے اپنے مُشکی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اسے سرپٹ دوڑاتا ہوا داہر کی طرف گیا۔ داہر کے کسی مصاحب نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا: ''یہ گھڑ سوار آپ پر حملہ کرنے آ رہا ہے۔''

داہر نے یہ سنتے ہی فیل بان کو حکم دیا کہ ہاتھی کو اس پر چڑھا دے۔ اُدھر شجاع حبشی اپنے گھوڑے کو ہاتھی کے سامنے لے آیا تھا مگر اس دیو پیکر جانور کو دیکھ کر گھوڑا بدکنے لگا۔ شجاع نے فوراً اپنا عمامہ اتار کر گھوڑے کی آنکھوں پر باندھ دیا اور پھر اسے ایڑ لگا کر ہاتھی پر حملہ کیا۔ اس کی شمشیر کی ضرب سے ہاتھی کی سونڈ زخمی ہو گئی مگر اس دوران داہر اپنی کمان پر دوشاخہ تیر کھینچ چکا تھا۔ جب اس نے چلہ چھوڑا تو قینچی نما تیر شجاع کے سر کو اڑاتا ہوا نکل گیا۔

مسلمانوں نے شجاع کی سربریدہ لاش دیکھی تو جوش میں آ کر ایک نہایت تند و تیز حملہ کیا مگر دشمن نے قدم جما کر اس حملے کو روکا اور پھر ایسا زوردار جواب دیا کہ مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہونے لگیں۔ داہر کے پسپا ہو کر بکھر جانے والے

دستے بھی پلٹ کر واپس آگئے اور یوں اس مشترکہ طاقت نے ایسا حملہ کیا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ یہ جنگ کا واحد موقع تھا کہ محمد بن قاسم پر بھی ایک لمحے کے لیے سراسیمگی طاری ہو گئی مگر اگلے ہی لمحے اسلام کے اس مجاہد نے سنبھل کر فوج کو للکارا: ''اے عربو! کہاں بھاگتے ہو۔ میں محمد بن قاسم ہوں، تمہارا امیر۔ میں اپنی جگہ موجود ہوں۔''

یہ پکار سن کر بکھرا ہوا لشکر محمد بن قاسم کے گرد جمع ہو گیا۔ موکو بن وسایو اپنے سپاہیوں سمیت پیدل ہو کر محمد بن قاسم کے شانہ بشانہ کھڑا ہو گیا۔ محمد بن قاسم نے فوج کے افسران کو نام بنام پکارا اور پھر آواز لگائی:

''دوستو! عزیزو! مسلح جوانو! شمشیر زنو! نیزہ بازو! تم اسلام کا سہارا ہو۔ اپنی صفیں درست کرو۔ اپنی جگہوں پر جم جاؤ۔ پریشان مت ہونا۔ حوصلہ برقرار رکھنا۔''

اب مسلمانوں نے ایک بار پھر منظم ہو کر حملہ کیا اور جنگ ایسی شدت کے ساتھ شروع ہوئی کہ گزشتہ تمام معرکے اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ سروں کی فصلیں کٹ رہی تھیں۔ تلواروں اور نیزوں کی ضربات ایسی شدید تھیں کہ مارنے والوں کے ہاتھوں کی چمڑی چھل رہی تھی۔ سینکڑوں سپاہیوں کے ہتھیار ٹوٹ ٹوٹ کر ختم ہو چکے تھے اور جگہ جگہ لاتوں اور گھونسوں سے لڑائی ہو رہی تھی۔ آخر کار دشمنوں کی ہمت جواب دے گئی اور ان کے قدم اکھڑ گئے۔ ان کے ہزاروں سپاہی قتل ہو گئے اور ہزاروں راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ اس وقت سورج زرد پڑ چکا تھا اور شام کے سائے دراز ہو رہے تھے۔ داہر کے پاس اب فقط ایک ہزار محافظ سپاہی رہ گئے تھے جن کے ساتھ وہ پیچھے ہٹتا ہوا اپنی خیمہ گاہ کی طرف بھاگا، مگر کچھ مسلمان سپاہی پہلے ہی اس کی خیمہ گاہ تک پہنچ کر اس کی باندیوں کو گرفتار کر چکے تھے۔ شام کے دھندلکے اور جنگ کے گرد و غبار کے باعث داہر سمجھ نہ پایا کہ خیمہ گاہ کے پاس گشت کرنے والے کون ہیں۔ وہ انہیں اپنے سپاہی سمجھ کر چلایا: ''میں ادھر ہوں۔ میرے پاس آؤ۔''

اس کی آواز فضا میں دور تک گونج گئی۔ جواب میں اسے اپنی باندیوں کی پکار سنائی دی: ''ہم تمہاری عورتیں ہیں۔ ہم لشکرِ عرب کی قید میں ہیں۔'' داہر غصے سے پاگل ہو گیا۔ وہ چیخا: ''کس نے قید کیا تمہیں؟ ابھی تو میں زندہ ہوں!!''

یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھی کو گھمایا اور مسلمان سپاہیوں پر چڑھ جانے کے لیے آگے بڑھایا۔

محمد بن قاسم نے یہ دیکھ کر نفط اندازوں کو پکارا: ''ہاں! اب یہ تمہارے کام کا وقت ہے۔''

ایک نفط انداز نے یہ سنتے ہی نشانہ باندھ کر راجہ داہر کے ہاتھی پر آتشیں تیر چھوڑ دیا۔ تیر ہاتھی کے ہودج کو جا لگا اور اسے آگ لگ گئی۔ ہاتھی فیل بان کے قابو سے باہر ہو گیا اور جھیل میں گھس کر بیٹھ گیا۔ اس اثنا میں داہر کے کچھ محافظ اس کی حفاظت کے لیے جھیل کے کنارے پر کھڑے تھے اور کچھ اس کے ساتھ ساتھ جھیل میں اتر چکے تھے۔ تاہم کچھ ہی دیر میں عرب گھڑ سوار سرپٹ اس طرف آئے جنہیں دیکھ کر کنارے پر کھڑے داہر کے محافظ بھاگ نکلے۔ ادھر داہر کے ہاتھی نے قلعہ راوڑ کا رخ کر لیا۔ یہ دیکھ کر ایک ماہر نشانہ باز نے تاک کر تیر چلایا جو داہر کے جسم میں جا گھسا اور وہ غش کھا کر ہاتھی پر اوندھا ہو گیا۔ ہاتھی بدک کر مڑا اور جھیل سے باہر نکل آیا۔ اس نے وحشت کے عالم میں سامنے آنے والے

ہر شخص کو کچلنا شروع کر دیا۔ داہر کے بہت سے محافظ اس کے پیروں تلے روندے گئے اور باقی بھاگ نکلے۔

چند لمحوں بعد داہر کو ہوش آ گیا۔ وہ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے ہاتھی سے اتر پڑا۔ اُدھر سے ایک عرب عمرو بن خالد اس کے محافظوں کو چیر کر آگے بڑھا اور اس پر تلوار کا ایسا کاری وار کیا کہ اس کا سر شانوں تک دو ٹکڑے ہو گیا۔

عمرو بن خالد نے اپنے کارنامے پر فخر کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھے جو داہر کی عبرت ناک موت کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں:

اَلْخَیْلُ تَشْهَدُ یَوْمَ دَاهِرَ وَالْقَنَا ... وَمُحَمَّدُ بْنُ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٖ

اِنِّیْ فَرَجْتُ الْجَمْعَ غَیْرَ مُعَرِّدٍ ... حَتّٰی عَلَوْتُ عَظِیْمَهُمْ بِمُهَنَّدٖ

فَتَرَکْتُهٗ تَحْتَ الْعَجَاجِ مُجَدَّلًا ... مُتَعَفِّرَ الْخَدَّیْنِ غَیْرَ مُوَسَّدٖ

"گھڑ سوار بھی گواہ ہیں اور محمد بن قاسم بن محمد بھی، کہ داہر سے معرکے کے دن میں جنگجوؤں کو چیر کر آگے بڑھا اور ان کے بادشاہ کے سر پر ہندوستانی تلوار بلند کی، میں اسے گرد و غبار کے پردے میں اس طرح چھوڑ آیا کہ وہ کسی تکیے کے بغیر خاک و خون میں پڑا تھا اور اس کے گال مٹی سے لت پت تھے۔"[1]

داہر کے مرتے ہی اس کے باقی ماندہ سپاہی اور محافظ بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ مجاہدین انہیں مارتے کاٹتے قلعہ راوڑ تک پہنچ گئے۔ داہر کی لاش وہیں پڑی رہ گئی تھی۔ میدانِ جنگ خالی ہونے کے بعد داہر کے کچھ ساتھی جو اس کے ساتھ جھیل میں اتر کر وہیں چھپ گئے تھے، باہر نکلے اور اس کی لاش کو جھیل کے کنارے کیچڑ اور دلدل میں دفن کر دیا۔

محمد بن قاسم نے فتح کے بعد داہر کی تلاش کا حکم دیا۔ آخر ایک برہمن نے اپنے اہل و عیال کے لیے امان طلب کرتے ہوئے اس جگہ کی نشاندہی کر دی جہاں داہر کی لاش چھپائی گئی تھی۔ داہر کی لاش نکال کر لائی گئی اور ان دو کنیزوں نے جو اس کی پالکی سے گرفتار ہوئی تھیں، اسے پہچان لیا۔ داہر کا سر قلم کر کے حجاج بن یوسف کے پاس بصرہ بھیج دیا گیا۔

داہر کی ایک رانی "لاڈی" مسلمانوں کی قید میں آ گئی۔ محمد بن قاسم نے اس کا حال حجاج بن یوسف کو لکھ بھیجا اور اسے اپنانے کی اجازت طلب کی۔ حجاج نے خلیفہ ولید سے پوچھ کر اجازت دے دی جس کے بعد محمد بن قاسم نے اسے خرید کر آزاد کر دیا اور اپنی بیگم بنا لیا۔[2]

---

[1] عمرو بن خالد کے ان اشعار کا پس منظر یہ ہے کہ بصرہ سے لشکر کی روانگی کے وقت حجاج بن یوسف نے اسے کہا تھا: محمد بن قاسم اور اس کے ساتھیوں کو دیکھتا رہ، تو کیا کرے گا؟ تو کچھ اچھا کام کر بھی سکے گا یا نہیں؟" ایسا لگتا ہے کہ عمرو بن خالد کی ماضی میں کارکردگی حجاج کی منشا کے مطابق نہیں تھی اس لیے اسے یہ طعنہ سننا پڑا۔ تب سے عمرو بن خالد نے طے کر لیا تھا کہ وہ کچھ بڑا کام کر کے دکھائے گا۔ اس کے عزمِ صمیم کا ثمرہ یہ ملا کہ داہر اسی کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ محمد بن قاسم نے اسی کے ہاتھ داہر کا سر حجاج کی خدمت میں بھیجا۔ اس نے حجاج کے دربار میں پہنچ کر کہا: "آپ نے محمد بن قاسم کو مجھ پر کوتوال بنایا تھا؟" حجاج نے کہا: "ہاں، اب بتا کہ تو نے کیا کچھ کیا؟" اس پر عمرو بن خالد نے مذکورہ اشعار پڑھے۔ (چچ نامہ، ص ۱۸۴، ۱۸۵)

فتوح البلدان میں ابن الکلبی کا قول نقل کیا گیا ہے کہ داہر کا سر کاٹنے والے مجاہد کا نام قاسم بن ثعلبہ تھا اور مذکورہ اشعار اسی کے تھے۔ مگر یہ قول مرجوح اور چچ نامہ کا بیان راجح ہے کیوں کہ چچ نامہ میں عمرو بن خالد کا واقعہ جن تفصیلات کے ساتھ مذکور ہے، ان کی جانب خود مذکورہ اشعار میں اشارہ موجود ہے۔

[2] چچ نامہ، ص ۱۳۲، ۱۸۶

راوڑ کی فتح:

داہر کی شکست کے بعد اس کے بیٹے جے سنگھ نے اپنی پھوپھی رانی مائین کے ساتھ راوڑ کے قلعے میں مورچہ بندی کر لی۔ تاہم اس کے وزیر سی ساکر نے اسے برہمن آباد جانے کا مشورہ دیا۔ آخر جے سنگھ برہمن آباد چلا گیا جبکہ رانی مائین پندرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ راوڑ میں ٹھہر گئی۔ چند دنوں بعد محمد بن قاسم نے پیش قدمی کر کے راوڑ کا محاصرہ کر لیا۔ اب محصورانہ جنگ پوری شدت کے ساتھ شروع ہو گئی۔ تاہم مسلمانوں کی مسلسل آتش زنی اور سنگ باری سے قلعے کے برج گر گئے۔ شکست سر پر دیکھ کر رانی مائین نے چتا دہکائی اور ستی کی رسم کے مطابق جل کر مر گئی۔ ادھر محمد بن قاسم نے قلعے کو سر کر لیا۔ یہاں چھ ہزار جنگجو باقی تھے جو قتل کر دیے گئے۔ ①

بھرور اور دہلیلہ کی فتح:

اس کے بعد اسلامی لشکر برہمن آباد کی طرف گامزن ہوا۔ راوڑ اور برہمن آباد کے درمیان "بھرور" اور "دہلیلہ" نامی دو قلعے تھے جن میں سولہ ہزار جنگجو مورچہ بند تھے۔ محمد بن قاسم نے پہلے بھرور کو فتح کیا اور پھر "دہلیلہ" کو گھیر لیا۔ دو ماہ تک اس قلعے کا محاصرہ جاری رہا۔ آخر دہلیلہ کا راجہ مزاحمت سے مایوس ہو کر رات کو چپکے سے بھاگ گیا۔

برہمن آباد پر حملے سے پہلے محمد بن قاسم نے ہندوستان کے تمام اطراف میں مراسلے بھیج کر انہیں اطاعت کی دعوت دی اور مکمل امان کا یقین دلایا۔ اس پیش کش سے فائدہ اٹھا کر جے سنگھ کا وزیر سی ساکر بھی محمد بن قاسم کے پاس چلا آیا۔ وہ اپنے ساتھ ان مسلمان خواتین کو بھی لے آیا جنہیں سندھی قزاقوں نے سراندیپ سے بصرہ جاتے ہوئے گرفتار کیا تھا۔ سی ساکر نے کہا: "یہ وہی خواتین ہیں جنہوں نے حجاج کا نام لے کر فریاد کی تھی۔"

محمد بن قاسم نے اس پر اظہارِ مسرت کیا اور سی ساکر کو اپنا مشیرِ خاص بنا لیا۔

اس کے بعد محمد بن قاسم نے دہلیلہ سے برہمن آباد کا رُخ کیا اور ساتھ ہی جے سنگھ کو اطاعت پر آمادہ کرنے کے لیے ایک قاصد روانہ کیا مگر جے سنگھ فرار ہو کر صحرائے چولستان کے حکمران سے مدد مانگنے اس کے پایۂ تخت "بھاٹیہ" روانہ ہو گیا۔ آخر لشکرِ اسلام نے شہر کے مشرق میں "نہر جلوالی" کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ ②

برہمن آباد:

برہمن آباد سلطنتِ سندھ کے وسط میں واقع ہونے کے باعث سندھ کا قلب تھا۔ یہاں چالیس ہزار سندھی سپاہی موجود تھے اور فصیل کی مضبوطی اور بلندی کے پیشِ نظر یہاں ایک طویل جنگ کی توقع تھی، اس لیے محمد بن قاسم نے

---

① چچ نامہ، ص ۱۹۳ تا ۱۹۵

② چچ نامہ، ص: ۱۹۸ تا ۲۰۱..... جل بمعنی پانی ہے۔ اس نہر کا نام مقامی تلفظ کے مطابق تبدیل ہوتے ہوتے "جرواری"، پھر "جراری" اور اب "جراڑی" ہے۔ اس نام کا گاؤں شہداد پور سے دس میل شرق میں موجود ہے جس کے ساتھ نہر کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نہر تقریباً پچاس میل لمبی تھی جو کھری کے قریب دریائے سندھ سے نکل کر منصورہ کے قریب دریا کی ایک اور شاخ سے مل جاتی تھی۔

خندقیں کھدوا کر اپنی خیمہ گاہ کو محفوظ بنایا اور یکم رجب ۹۵ھ کو شہر پر حملوں کا آغاز کر دیا۔ مگر شہر چھ ماہ تک فتح ہونے میں نہ آیا۔ اس دوران جے سنگھ شاہ و چولستان کی مدد سے مسلمانوں کی کمک و رسد پر مسلسل چھاپہ مار حملے کر رہا تھا، جس سے مسلمانوں کو سخت اذیت پہنچ رہی تھی۔ آخر محمد بن قاسم نے موکو بن وسایو کے پاس قاصد بھیج کر اسے بلوایا اور حل دریافت کیا۔ موکو نے کہا: ''جے سنگھ کا ٹھکانہ کچھ دور نہیں۔ اور اس پر حملے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

اب محمد بن قاسم نے نباتہ بن حنظلہ کی قیادت میں چند دستے تیار کیے اور انہیں جے سنگھ کے تعاقب میں بھیجا۔ موکو بن وسایو ان دستوں کی رہبری کر رہا تھا۔ جے سنگھ کو جب یہ خبر ملی تو وہ اہل وعیال سمیت ریگستان عبور کر کے ''چتوڑ'' چلا گیا۔[1] ساتھ ہی اپنے بھائی کوپی کو جو ''اروڑ'' میں تھا، پیغام بھیجا کہ وہ ''اروڑ'' کی پوری حفاظت کرے۔

برہمن آباد کا محاذ اس دوران پوری شدت سے گرم رہا۔ آخر چھ ماہ بعد اہل شہر میں مزید مزاحمت کی تاب نہ رہی۔ اُدھر شہر کے چار بڑے تاجروں نے مشورہ کر کے محمد بن قاسم کو پیغام بھیجا کہ کل کی جنگ میں وہ شہر کے ''جر بطری'' نامی دروازے کی طرف پسپا ہوں گے اور اسے کھلا چھوڑ دیں گے۔ مسلمان وہاں سے حملہ کر کے شہر فتح کر لیں۔ اس کے بدلے ان تاجروں نے اپنے اہل وعیال کے لیے امان طلب کی۔

آخر اس منصوبے کے مطابق اگلے دن جنگ شروع ہوئی تو اہل شہر کچھ دیر لڑنے کے بعد اسی دروازے کی طرف پسپا ہوئے اور اسے کھلا چھوڑ گئے۔ یوں مسلمانوں نے اندر داخل ہو کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ محمد بن قاسم نے ایک بار پھر مہربانی کا ثبوت دیا اور مسلح افراد کو مستثنیٰ کر کے باقی تمام عام شہریوں کو امان دے دی جبکہ چھ ہزار سپاہی قتل کیے گئے۔ ان کے علاوہ عام مسلح لوگوں کو گرفتار کر کے محمد بن قاسم کے پاس لایا جاتا تھا۔ ان میں سے جس جس نے معافی مانگی، محمد بن قاسم نے اسے آزاد کر دیا۔ محمد بن قاسم نے یہاں کے باشندوں کے ساتھ نہایت فراخدلانہ سلوک کیا۔ ان پر معمولی جزیہ مقرر کیا۔ سابق برہمن افسران کو ان کے عہدوں پر باقی رکھا اور انہیں ہدایت کی:

''حکومت اور خالق کے درمیان سچائی کا خیال رکھنا۔ ہر ایک پر اس کی برداشت کے مطابق محصول مقرر کرنا۔ متفق ہو کر کام کرنا۔ جسے کوئی درخواست پیش کرنا ہو، وہ پیش کرے، وہ سنی جائے گی اور اس کا پورا جواب دیا جائے گا اور ہر ایک کی مراد پوری کی جائے گی۔''

محمد بن قاسم نے سندھ کے لوگوں کی مذہبی رسوم اور عبادات میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ ان میں سے جو بخوشی مسلمان ہو گئے، انہیں اپنا مسلمان بھائی تصور کیا۔ جو اپنے آبائی دین پر قائم رہے، ان پر بھی کوئی جبر نہیں کیا، بلکہ انہیں تمام حقوق عطا کیے۔

محمد بن قاسم نے وزیر سلطنت سی ساگر سے مشورے کر کے سندھ کے انتظامات کو بہتر بنانے کا کام بخوبی کیا۔ تمام

---

[1] غالباً اس سے مراد راجستان کی نواحی بستی چتر ور گڑھ ہے جو کبھی ایک شہر تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ راجپوتانہ کا کوئی شہر ہو۔

شہروں پر اپنے بہترین افسران کو عامل مقرر کیا۔ کچھ ہی دنوں میں ہر طرف امن وسلامتی کا دور دورہ ہو گیا۔ ①

اروڑ کی فتح:

اس دوران حجاج بن یوسف کا مکتوب ملا جس میں حکم دیا گیا تھا کہ برہمن آباد میں قیام کی بجائے اروڑ اور ملتان پر حملہ کیا جائے۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہندوستان سے چین تک تمام علاقے فتح کرنا تم پر لازم ہے۔

آخر لشکرِ اسلام ایک بار پھر پا بہ رکاب ہوا۔ اور "ساوندری" پہنچ کر جھیل "وکر بہار" کے کنارے ٹھہرا۔ یہاں بدھ مت کے لوگ آباد تھے جنہوں نے اظہارِ اطاعت کیا۔ ②

لشکرِ اسلام "سموں" کے علاقے سے گزرا تو انہوں نے ڈھول تاشے بجا کر نہایت گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ ③

اس کے بعد لشکر "بھراور" ④ اور لوہانہ سے گزرتے ہوئے "سیتہ" پہنچا۔ ⑤

یوں منزل بمنزل لشکرِ اسلام مقامی رہبروں کے تعاون سے سلطنتِ سندھ کے سب سے بڑے شہر "اروڑ" کے قریب پہنچ گیا جہاں داہر کا بیٹا گوپی محصور تھا۔ وہ ابھی تک اپنے سپاہیوں کو حوصلہ دلانے کے لیے انہیں یہی باور کرا رہا تھا کہ راجہ داہر زندہ ہے۔ اس کا کہنا تھا: "راجہ ہندوستان سے تازہ لشکر لینے گیا ہوا ہے تاکہ اس کی مدد سے عربوں کا مقابلہ کرے۔"

محمد بن قاسم نے "اروڑ" سے ایک میل دور خیمہ گاہ لگائی اور یہاں ایک مسجد تعمیر کرا کے ہر جمعہ کو اس میں خطبہ دینے کا معمول اپنایا۔ ایک ماہ تک پیش بندیوں کے بعد لشکرِ اسلام نے اروڑ پر حملہ شروع کیا۔ اروڑ کے فریب خوردہ سپاہی فصیل پر چڑھ کر مسلمانوں سے مقابلہ کرنے لگے۔ ساتھ ہی وہ چیخ رہے تھے:

"داہر مدد لے کر آ رہا ہے۔ ہاتھیوں کا بے اندازہ لشکر تمہارے پیچھے سے آئے گا اور سامنے سے ہم باہر آ کر حملہ کریں گے۔ خود پر رحم کرو اور بھاگ جاؤ۔"

محمد بن قاسم نے یہ اندازہ لگا کر کہ اہلِ شہر خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے باعث طویل مدت تک مزاحمت کرتے رہیں گے، رانی لاڈی کو اسی سیاہ اونٹ پر سوار کرایا جس پر وہ داہر کے ساتھ جنگ کے دوران سوار تھی۔ پھر خواص کی ایک جماعت کی حفاظت میں رانی لاڈی کو فصیل کی طرف بھیجا۔ رانی نے فصیل کے قریب جا کر بلند آواز سے کہا:

"قلعہ والو! تمہاری بھلائی کی ایک بات ہے۔ تم سامنے آؤ تو کہوں۔"

---

① چچ نامہ، ص ۲۰۳ تا ۲۱۵

② "ساوندری" اب "ساوڑی" نامی ایک گاؤں ہے۔ اس سے دو میل جنوب مشرق میں پرانے "ساوندری" کے کھنڈرات ہیں۔ یہ مقام ضلع نواب شاہ میں اسٹیشن "دوڑ" اور "دولت پور" کے درمیان واقع ہے۔

③ سمہ اور لاکھہ، جنوں اور لاکھوں کی سکونت اب بھی اسی علاقے دریائے سندھ کے اطراف میں ہے۔ دریائے سندھ یہاں جنوب مشرق کی سمت میں بہتا تھا۔ سمہ جنوب والے علاقوں میں اور لاکھہ شہداد پور تعلقہ والے علاقوں میں آباد چلے آئے ہیں۔

④ یہ مقام غالباً موجودہ "بھریا" یا "بھلائی" ہے۔

⑤ مسلمانوں کی آمد کے وقت لوہانہ سلطنتِ سندھ کا ایک وسیع صوبہ تھا جو شہداد پور، جھول اور "ہالا" کو محیط تھا۔

اروڑ کے عمائد کی ایک جماعت یہ سن کر آگے آئی۔ رانی نے اب نقاب اتار کر اپنا چہرہ دکھایا اور کہا:
"میں ہوں داہر کی رانی لاڈی۔ داہر قتل ہو چکا ہے اور اس کا سر عراق اور تاج دارالخلافہ (دمشق) بھیج دیا گیا ہے۔"
مگر اروڑ کے عمائد نے اس بات پر یقین نہ کیا اور کہا:
"تو بھی ان گائے خور چنڈالوں سے جا ملی ہے اور اب عربوں کی حکومت کو ترجیح دیتی ہے۔"
تاہم داہر کی موت ایک ایسی حقیقت تھی جو زیادہ دنوں تک چھپی نہ رہ سکی۔ اروڑ میں ایک جادوگرنی رہتی تھی، جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے بھی داہر کی موت کی تصدیق کر دی۔ آخر شہر کے ارباب حل وعقد نے باہم مشاورت کی اور ایک دوسرے کو کہنے لگے: "ہم محمد بن قاسم کے عدل، ایفائے عہد اور قول کی سچائی سن چکے ہیں اور اب آنکھوں سے بھی دیکھ رہے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ امان کی شرط پر شہر کے دروازے کھول دیے جائیں۔"
مگر اس سے پہلے کہ کوئی فیصلہ کیا جاتا، گوپی اپنے خاندان کے افراد سمیت راتوں رات فرار ہو کر اپنے بھائی جے سنگھ کے پاس "چتروڑ" چلا گیا۔ داہر کا ایک اور بیٹا "دکایو" بھی وہیں تھا۔
مسلمانوں کو گوپی کے فرار کی خبر علافی خاندان کے ایک شخص نے دی جو اروڑ میں مقیم تھا۔ اس نے ایک تیر پر اطلاعی رقعہ باندھ کر اسے مسلمانوں کے لشکر میں پھینک مارا۔ یہ اطلاع ملتے ہی محمد بن قاسم نے فصیل پر ایک زوردار حملہ کر دیا۔ اہل شہر نے گھبرا کر صلح کا پیغام بھیجا جسے محمد بن قاسم نے اس شرط پر قبول کیا کہ اسی وقت اروڑ کے سپاہی فصیل سے اتر جائیں۔ اہل شہر نے فوری طور پر فصیل خالی کر دی اور دروازے کھول دیے۔[1]
اہل شہر نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ بدھ کے صنم کدے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ محمد بن قاسم نے اہل علم سے مشورہ کر کے صنم کدے کو کلیسا اور آتش کدے کے حکم میں شمار کیا اور اسے باقی رہنے دیا۔[2]

محمد بن قاسم اور پجاری:

شہر میں ایک مشہور بت خانہ تھا جسے "نوبہار" کہا جاتا تھا، اس میں ایک گھڑ سوار کی مورتی تھی جس کی پوجا کی جاتی تھی۔ گھڑ سوار کے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن تھے۔ محمد بن قاسم نے اس بت خانے میں جا کر مورتی کے ایک ہاتھ سے ایک کنگن اتار لیا اور پھر پجاری کو پکار کر کہا: "تمہارا بت یہی ہے؟"
پجاری نے کہا: "جی ہاں۔ مگر اس کے ہاتھوں میں دو کنگن تھے۔ ایک کنگن دکھائی نہیں دے رہا؟"
محمد بن قاسم نے کہا: "تمہارے معبود کو اتنی بھی خبر نہیں ہوتی کہ اس کا کنگن کس کے پاس ہے؟"
پجاری نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ محمد بن قاسم نے مسکراتے ہوئے کنگن اسے واپس کر دیا۔[3]

---

① چچ نامہ: ۲۱۷ تا ۲۲۶
② فتوح البلدان، ص ۴۲۳
③ چچ نامہ، ص ۲۲۶

فریبی برہمن سے ایفائے عہد:

محمد بن قاسم کا ارادہ تھا کہ حجاج بن یوسف کی تاکید کے مطابق اروڑ کے تمام مسلح افراد کو قتل کر دیا جائے۔ جن لوگوں کو قتل کرنا تھا ان میں سے ایک برہمن نے آگے بڑھ کر کہا: "اگر اہل و عیال سمیت میری جان بخشی کر دی جائے تو میں ایک عجوبہ پیش کروں گا۔" محمد بن قاسم نے گمان کیا کہ اس کے پاس کوئی چھپا ہوا خزانہ ہے۔ چنانچہ وعدہ کر لیا مگر برہمن نے تحریری امان نامے پر اصرار کیا۔ وہ بھی لکھ دیا گیا۔ اس کے بعد وہ عجوبہ طلب کیا گیا تو اس نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ مار کر بالوں کی گانٹھیں کھول دیں۔ ڈاڑھی اس کے پیروں کو چھونے لگی۔ برہمن نے ڈاڑھی کا سرا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کے ساتھ باندھ لیا اور ناچتے ہوئے کہنے لگا: "کسی نے آج تک ایسا عجوبہ نہ دیکھا ہوگا۔"

برہمن کے اس فریب پر مسلمانوں کو سخت طیش آیا۔ قریب تھا کہ سپاہی اسے قتل کر دیتے مگر محمد بن قاسم نے منع کرتے ہوئے کہا: "قول قول ہے اور وعدہ وعدہ۔ عہد سے پھر جانا بڑے لوگوں کا کام نہیں۔"

محمد بن قاسم نے وقتی طور پر برہمن کو قید کر دیا اور مکتوب کے ذریعے یہ معاملہ حجاج بن یوسف کے سامنے پیش کر دیا۔ حجاج نے اس پر کوفہ اور بصرہ کے علماء سے مشورہ لیا اور خلیفہ ولید بن عبدالملک کو بھی ماجرا لکھ بھیجا۔ آخر علماء نے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے طرز عمل سے استدلال کرتے ہوئے متفقہ طور پر یہی جواب دیا کہ برہمن اور اس کے متعلقین کے لیے امان ثابت ہے۔ اس پر محمد بن قاسم نے برہمن کو آزاد کر دیا۔ [1]

اہل اروڑ پر رحم:

دیگر لوگ جنہیں سزائے موت دینا طے کیا گیا تھا قتل ہونے والے تھے مگر رانی لاڈی نے ان کی سفارش کر دی۔ اس پر محمد بن قاسم نے انہیں بھی امان دیتے ہوئے کہا: "یہ رانی لاڈی کا حکم ہے۔"

محمد بن قاسم نے کچھ دن اروڑ میں گزارے اور ساتھ ہی "بغرور" (بھکر) کے انتظامات بھی درست کیے۔ اس کے بعد اروڑ کی امارت مشہور تابعی حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ کے نواسے "رواح بن اسد" کے سپرد کی اور موسیٰ بن یعقوب طائی کو ضلع کا قاضی اور جامع مسجد کا خطیب مقرر کر کے ہدایت کی: "رعایا کی دلجوئی واجب سمجھی جائے مگر نیکی کا حکم اور گناہوں سے روک تھام کا فریضہ بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔"

امیر اور قاضی کو عوام سے اچھے سلوک کی ہدایات دینے کے بعد محمد بن قاسم نے ملتان کی طرف کوچ کر دیا۔ [2]

---

① چچ نامہ، ص ۲۲۷، ۲۲۸..... **ملحوظہ:** اروڑ کو "روڑ" بھی کہا جاتا تھا۔ عرب اسے "رور" کہتے تھے اور بعض نے لام تعریف کا اضافہ کر کے اسے "الرور" کہا ہے اور بعض اسے "الور" لکھ گئے ہیں، جس کے باعث بعض نے اسے بھارت کا شہر "الور" تصور کر لیا ہے۔ جبکہ یہ سندھ کا پایہ تخت تھا جس کے کھنڈرات روہڑی سے تین میل جنوب مشرق میں دریائے سندھ کی ایک شاخ "نارا واہ" کے مغربی کنارے پر اب بھی موجود ہیں اور وہاں اب تک اروڑ نامی گاؤں آباد ہے۔ روہڑی سے ان کھنڈرات کا فاصلہ گیارہ کلومیٹر ہے۔

② چچ نامہ، ص ۲۳۴، ۲۳۵

بھاطیہ کی فتح:

لشکرِ اسلام پہلے دریائے بیاس کے جنوب میں واقع قلعہ "بھاطیہ" پہنچا جہاں داہر کا چچا زاد بھائی کسکو بن چندر حکومت کرتا تھا۔[1] کسکو بہت دانش مند شخص تھا۔ اس نے لشکرِ اسلام کی آمد پر اظہارِ اطاعت کیا اور محمد بن قاسم نے اس کی خوبیاں دیکھ کر اسے اپنا مشیر بنا لیا۔[2]

اسکلندہ کی فتح:

اس کے بعد اسلامی لشکر کے ہراول نے زائدہ بن عمیر طائی اور کسکو کی کمان میں دریائے بیاس (ستلج) عبور کر کے اسکلندہ (اُچ) کے قلعے پر حملہ کیا جہاں راجہ بجھرا کی حکومت تھی۔ یہاں صبح سے دوپہر تک نہایت خونریز جنگ ہوتی رہی اور کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ آخر ظہر کے وقت مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کر کے پوری قوت سے حملہ کیا۔ مشرکین اس کی تاب نہ لا سکے اور پسپا ہو کر قلعے میں چھپ گئے۔ سات دن تک محصورانہ جنگ ہوتی رہی۔ فریقین تیروں کی بارش اور منجنیقوں سے سنگ باری کرتے رہے۔ آخر راجہ بجھرا شب کی تاریکی میں فرار ہو کر ملتان کے قریبی قلعے "سکہ" میں محصور ہو گیا۔ اس کے فرار ہونے سے اہلِ شہر کی ہمت ٹوٹ گئی اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ محمد بن قاسم نے چار ہزار قیدی جنگجوؤں کو قتل کرا دیا جبکہ باقی تمام لوگوں کو امان دے دی اور عتبہ بن سلمہ تمیمی کو شہر کا حاکم بنا کر "سکہ" کی طرف پیش قدمی کر دی جو دریائے راوی کے جنوب میں ایک عظیم الشان قلعہ تھا۔[3]

سکہ کی فتح اور تباہی:

سکہ پر راجہ بچھرا کی حکومت تھی، نیز اُچ کا مفرور حاکم بجھرا بھی یہیں پناہ گزین تھا۔ اسلامی لشکر کے یہاں پہنچتے ہی گھمسان کی جنگ چھڑ گئی۔ سترہ دن تک اہلِ قلعہ پوری شدت سے مدافعت کرتے رہے۔ اسلامی لشکر کے دو سو پندرہ سپاہی شہید ہوئے جن میں محمد بن قاسم کے بیس بہترین افسران بھی شامل تھے۔ محمد بن قاسم کو ان کی شہادت پر اتنا دکھ ہوا کہ اس قلعے کو مسمار کر دینے کی قسم کھالی۔ آخر قلعہ فتح ہو گیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ راجہ بچھرا فرار ہو کر ملتان چلا گیا۔[4]

ملتان کی فتح:

چند دنوں بعد اسلامی فوج بھی دریائے راوی پار کر کے "ملتان" کے سامنے تھی جہاں داہر کے دوسرے چچا زاد بھائی

---

① یہاں دریائے بیاس سے مراد دریائے ستلج ہے۔ قدیم عرب مؤرخین دریائے ستلج کو "بیاس" کہتے تھے۔ قلعہ بھاطیہ سے غالباً قلعہ دراوڑ مراد ہے جو بہاولپور سے کچھ فاصلے پر صحرائے چولستان کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔

② چچ نامہ، ص ۲۳۵، ۲۳۶

③ چچ نامہ، ص ۲۳۶ تا ۲۳۷ ..... فتوح البلدان میں سکہ کو دریائے "بیاس" کے کنارے بتایا گیا ہے جو درست نہیں۔

④ چچ نامہ، ص ۲۳۷ ..... ملتان کے آس پاس سکہ نامی کسی بستی، قلعے یا اس کے کھنڈرات کا کچھ علم نہیں ہو سکا۔ غالباً محمد بن قاسم کے بعد اسے دوبارہ کسی نے تعمیر نہیں کرایا، اسی لیے تیسری صدی ہجری کے علامہ بلاذری کی یہ عبارت اسی طرف اشارہ کرتی ہے: "والسکۃ الیوم خراب" (فتوح البلدان: ص ۴۴۳)

گورسنگھ بن چندر کی حکومت تھی۔ [1]

مسلمانوں کے وہاں پہنچتے ہی ملتان کا سپہ سالار گنڈ ارائے اور راجہ پھر افو جیں لے کر مقابلے پر نکل آئے۔ صبح سے شام تک بڑی قہر انگیز لڑائی ہوئی مگر ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ دوسرے دن پھر اسی طرح کشتوں کے پشتے لگے۔ اس کے بعد ملتان کی افواج قلعے میں محصور ہو کر حملے کرتی رہیں۔ دو ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اہل قلعہ منجنیقوں سے پتھر اور بڑی کمانوں سے گزدار تیر برساتے رہے۔ تاہم اُدھر اہل شہر کی قوت مزاحمت مضمحل ہو چکی تھی۔ شہر کے حاکم گورسنگھ نے یہ صورتحال دیکھی تو فرار ہو کر کشمیر چلا گیا۔

اُدھر اسلامی لشکر کو خوراک کی سخت قلت کا سامنا تھا اور سپاہی سواری اور بار برداری کے جانور ذبح کر کے کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ تاہم اللہ کی غیبی مدد نازل ہوئی اور گورسنگھ کے فرار کے اگلے دن شہر سے ایک شخص آ کر خفیہ طور پر محمد بن قاسم سے ملا اور اطلاع دی کہ دریا کے کنارے قلعے کی شمالی دیوار میں ایک مقام کمزور ہے جہاں سے نقب لگایا جا سکتا ہے۔ محمد بن قاسم نے یہ سنتے ہی نقب اندازوں کو وہاں کھدائی کا حکم دیا۔ آخر تین دن بعد وہاں سے قلعے کی دیوار گر گئی اور اسلامی لشکر نے اندر داخل ہو کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ چھ ہزار جنگجو قتل کر دیے گئے جبکہ باقی لوگوں کو امان دے دی گئی۔ [2]

اس دوران محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف کا درج ذیل مکتوب موصول ہوا:

''تمہاری لشکر کشی کے وقت میں نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کو ضمانت دی تھی کہ لشکر کشی کے تمام اخراجات سے دوگنی رقم واپس کی جائے گی۔ اب تک تمہارے جملہ اخراجات پر ساٹھ ہزار درہم خرچ ہو چکے ہیں۔ تمہارے ذمہ ہے کہ ایک لاکھ بیس ہزار درہم دارالخلافہ بھیجو۔ تمام قدیم آبادیوں اور مشہور شہروں یا قصبوں میں مساجد اور منبر تعمیر کراؤ اور خلیفہ کے نام پر خطبہ اور سکہ جاری کرو۔'' [3]

بت کدے کا خزانہ:

اسی دن ایک برہمن نے آ کر محمد بن قاسم سے عرض کیا:

''میں آپ کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ کسی زمانے میں کشمیر کے راجاؤں کی نسل کا ایک راجہ ''جوبن'' یہاں کا حکمران تھا۔ اس نے شہر کے مشرق میں سو مربع گز کا ایک حوض بنوا کر اس کے بیچوں بیچ پچاس مربع گز کا ایک مندر بنوایا اور وہاں سُرخ سونے کا ایک بت رکھوایا اور حوض کے چاروں طرف گھنے درخت لگوا دیے۔ میں نے ملتان کے بڑے بوڑھوں سے سنا ہے کہ اس بُت کے نیچے ایک خفیہ تہہ خانہ ہے جس میں راجا جوبن نے اپنی ساری دولت چھپائی تھی۔ وہ دولت تانبے کے چالیس مٹکوں میں تھی اور ہر مٹکے میں تین سو مَن سونا تھا۔''

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دریائے راوی ملتان کے جنوب مشرق میں بہتا تھا۔ جبکہ اب مغرب میں ہے۔ فتوح البلدان میں اس دریا کا نام ''بیاس'' بتایا گیا ہے جو درست نہیں۔

[2] چچ نامہ، ص ۲۳۷، ۲۳۹

[3] چچ نامہ، ص ۲۴۰

محمد بن قاسم نے اس بات کی تصدیق کے لیے اپنے افسران کے ساتھ اس مندر کا دورہ کیا جسے "منروی مندر" کہا جاتا تھا۔ محمد بن قاسم کو اندر داخل ہوتے ہی وہ بت نظر آیا جس کی آنکھوں میں یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ محمد بن قاسم نے یہ گمان کر کے کہ یہ کوئی خطرناک آدمی ہے، تلوار نکال لی۔ بت خانے کا پجاری چیخا:

"اے امیر! یہ وہی بت ہے جو راجہ جوبن نے بنوایا تھا۔"

محمد بن قاسم نے اس بت کو اٹھوا کر وہاں سے خزانہ برآمد کر لیا۔ چالیس مٹکوں کے علاوہ بھی دو سو تیس من سونا نکلا۔ یہ کل تیرہ ہزار دو سو من سونا تھا۔ اس طرح دار الخلافہ کو دوگنا سے بھی زیادہ رقم بھیجنے کا انتظام ہو گیا۔[1]

مذکورہ بیان چچ نامہ کا ہے۔ جبکہ علامہ بلاذری کا بیان ہے کہ سندھ کی مہم پر دولتِ اُمویہ نے چھ کروڑ درہم خرچ کیے تھے۔ جب مالِ غنیمت کے ساتھ راجہ داہر کا سر حجاج کے سامنے رکھا گیا تو اس نے مالِ غنیمت کو شمار کرایا، وہ بارہ کروڑ درہم کے برابر نکلا۔ حجاج نے بے ساختہ کہا:

"ہم نے اپنا انتقام بھی لے لیا اور داہر کا سر بھی۔ اور جتنا خرچ کیا اللہ نے اس سے دوگنا عطا فرما دیا۔"[2]

بلاذری کا بیان راجح ہے کیوں کہ اتنی بڑی مہم کے لیے فقط ساٹھ ہزار درہم خرچ ہونا بہت ہی معمولی رقم ہے۔ ساٹھ ہزار درہم میں تو اس لشکر کے سواری اور بار برداری کے جانوروں کی قیمت بھی پوری نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ اس زمانے میں ایک گھوڑے یا اونٹ کی قیمت سو درہم تک ہوتی تھی۔ اسی طرح اتنے زیادہ سونے کی قیمت بھی فقط ایک لاکھ بیس ہزار درہم سے کچھ زیادہ ہونا بھی بالکل خلافِ قیاس ہے۔ یہ یقیناً کروڑوں درہم کے برابر ہونا چاہیے تھا۔

علامہ بلاذری لکھتے ہیں کہ اس قدر مالِ غنیمت کے باعث "ملتان" کو "فرج بیت الذھب" (سونے کے گھر کی سرحد) کہا جانے لگا۔[3]

ملتان کے انتظامات:

ملتان کی فتح کے بعد داہر کے خاندان کی طاقت بالکل تہ و بالا ہو گئی۔ اُدھر محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقوں کے بہتر سے بہتر انتظامات پر پوری توجہ دیتے ہوئے ملتان میں ایک جامع مسجد تعمیر کرائی اور داؤد بن نصر کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس دوران ملتان کے نواحی علاقے بھی فتح ہو چکے تھے جن پر عکرمہ بن ریحان کا تقرر کیا گیا۔ احمد بن خزیمہ مدنی کو کروڑ (کہروڑ پکا) اور "اشبار" کی قلعہ داری سونپ دی گئی۔ اس دوران بالائی پنجاب تک اسلامی فوجوں کے دھاوے جاری تھے اور دریائے جہلم کے ساحل تک تمام علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔[4]

---

① چچ نامہ، ص ۲۳۹ ② فتوح البلدان، ص ۴۲۳ ③ فتوح البلدان، ص ۴۲۳

④ اس وسیع و عریض علاقے کی فتح میں کسی جنگ کا ذکر نہیں ملتا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بالائی پنجاب کا یہ سارا علاقہ یعنی "تکاریش" بلا مزاحمت فتح ہو گیا تھا۔ بتایا جا چکا ہے کہ ملتان سے کشمیر تک کا علاقہ "تکاریش" یا "طاکیہ" کہلاتا تھا۔ کشمیر اس زمانے میں بہت وسیع علاقہ تھا جس کی حدود دریائے جہلم کے پار سے شروع ہو جاتی تھیں۔ یعنی پوٹھوہار بھی کشمیر کے ملحقات میں شمار ہوتا تھا۔

محمد بن قاسم نے بالائی پنجاب کے انتظامات کے لیے ایک قابل افسر خریم بن عبدالملک تمیمی کو دریائے جہلم کے کنارے واقع برہمپور ریاست کے قلعے ''سوپور'' میں تعینات کر دیا۔[1] یوں نہ صرف ملتان بلکہ پورے پنجاب پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔[2]

نئے محاذ:

محمد بن قاسم کے سامنے اب چار محاذ تھے:

1. وسطی ہندوستان کی ریاست ''قنوج'': جس کی سرحدیں اسلامی عملداری سے آملی تھیں اور اب وہ مجاہدین اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔
2. کشمیر: جہاں داہر کے بعض بیٹے پناہ گزین تھے۔
3. کچھ کی بعض ریاستیں: جہاں سے داہر کے خاندان کو کمک ملتی تھی۔
4. گجرات کی ریاست کیرج (کھیڑا): جہاں راجہ داہر کے جانشین جے سنگھ نے پناہ لی تھی۔

کشمیر کا سفر:

محمد بن قاسم نے پہلے کشمیر کی سرحد کا رخ کیا کیوں کہ حجاج بن یوسف کے تازہ ہدایت نامے کے مطابق سندھ کی فاتح افواج کو سرحدات چین تک پیش قدمی کرنے کا ہدف دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ راستہ کشمیر سے گزر کر جاتا تھا۔ تاہم محمد بن قاسم نے اس سفر میں کشمیر کی سرحدوں کو پار نہ کیا اور ''پنج ماہیات'' (پنج ماہیات) کے مقام تک پہنچ کر سلطنتِ سندھ اور ریاستِ کشمیر کے مابین سرحدوں کی توثیق اور تجدید کرنے پر اکتفا کیا۔ داہر کے باپ چچ نے کئی عشرے قبل اسی مقام پر سرحدی نشانات کے طور پر بید اور صنوبر کے درخت لگائے تھے۔ یوں راجہ داہر اور اس کے باپ چچ کی تمام سلطنت اسلام کے زیرِ نگین آگئی۔[3]

حجاج بن یوسف کی وفات۔ گجرات کی مہم:

کشمیر اور چین کی مہمات کو محمد بن قاسم نے مؤخر کر دیا۔ غالباً انتظامی مصروفیات اور دیگر محاذوں پر افواج کی زیادہ ضرورت کے پیش نظر یہ توقف ناگزیر تھا۔ سرحدِ کشمیر سے ملتان واپسی پر محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف کی وفات کی اطلاع ملی۔ یوں کشمیر اور چین کی مہم کو مزید مؤخر کرنے کی گنجائش پیدا ہو گئی۔[4]

تاہم ''کچھ'' اور ''گجرات'' فوری توجہ چاہتے تھے۔ درو ہر رائے کا جے سنگھ کو پناہ دینا دولتِ اُمویہ سے دشمنی

---

① ''سوپور'' دریائے جہلم کے کنارے واقع بالائی پنجاب کا کوئی شہر تھا۔ عجب نہیں کہ ''سوپور'' ''موجودہ شاہ پور'' ہو جو سرگودھا اور خوشاب کے درمیان ایک چھوٹا شہر ہے۔

② چچ نامہ، ص ۲۴۱ ③ چچ نامہ، ص ۲۴۱

④ بلاذری کی عبارت سے اشارہ ملتا ہے کہ محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف کی موت کی اطلاع ملتان میں ملی تھی۔ ومات الحجاج فاتت محمدا وفاته فرجع عن الملتان إلى الرور و بغرور (فتوح البلدان: ص ۴۲۳)
حجاج بن یوسف کی وفات ۲۷ رمضان ۹۵ھ میں ہوئی تھی۔ پس اندازاً شوال ۹۵ھ میں کے پہلے ہفتے میں محمد بن قاسم کو یہ اطلاع مل گئی ہوگی۔

مول لینے کے مترادف تھا۔ اس لیے محمد بن قاسم نے سندھ جانے کی تیاری شروع کر دی تاکہ وہاں سے "کچھ" اور "گجرات" پر یلغار کی جا سکے۔ محمد بن قاسم نے جلد ہی سندھ کی طرف مراجعت کی اور "اروڑ" میں قیام کر کے کچھ اور گجرات کے سندھ سے متصل شہروں پر فوج کشی کی تیاری کی۔ پہلے ایک لشکر "بھیلمان" بھیجا گیا جہاں کے حاکم نے لڑے بغیر صلح کر لی۔ اس کے بعد "سرست" (سورٹھ۔ سوراشٹر) پر فوج کشی ہوئی۔ یہاں "مید" (غالباً مارواڑی) قوم کے لوگ آباد تھے جو بحری قزاق تھے اور بصرہ کے (بحری) سپاہیوں سے ان کی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہاں کے لوگوں نے بھی مزاحمت کی کوشش نہ کی اور حلقہ بگوشی اختیار کر لی۔

اب محمد بن قاسم نے اپنی کمان میں لشکر لے کر "کیرج" پر حملہ کیا جہاں کے راجہ دروہر رائے نے جے سنگھ کو پناہ دی تھی۔ دروہر رائے نے شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور فرار ہو گیا۔ "کیرج" کے باشندوں نے پہلے مزاحمت کی مگر پھر مقابلے کی تاب نہ دیکھ کر ہتھیار ڈال دیے۔ وہاں مسلح سپاہیوں کو گرفتار اور قتل کیا گیا۔ دروہر کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ وہ آخر میں قتل ہو گیا تھا۔ ①

کیرج کے باقی لوگوں کو نہ صرف امان دے دی گئی بلکہ محمد بن قاسم نے ان کے ساتھ ایسا شریفانہ برتاؤ کیا کہ وہاں کے مندروں میں اس مرد مجاہد کی مورتیاں پوجی جانے لگیں۔ ②

راجپوتانہ کی مہم:

گجرات سے ملتان واپسی پر محمد بن قاسم نے وسطی ہندوستان کی ریاست "قنوج" کا رخ کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کی۔ یہ بڑی طاقتور راجدھانی تھی جس کا بانی راجا "ہرشا" تھا اور اب اس کی اولاد میں سے یہاں راجہ ہر چندر رائے تخت نشین تھا۔ محمد بن قاسم نے پچاس ہزار چیدہ مسلح گھڑسواروں کا لشکر جرار تیار کر کے "قنوج" کی طرف پیش قدمی کی اور ابو حکیم شیبانی کو دس ہزار گھڑسواروں کے ہراول کے ساتھ آگے روانہ کیا۔

یہ ہراول دستہ "قنوج" کے پایۂ تخت "اودھے پور" کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔ زید بن عمرو کلابی نے سفیر کے طور پر راجہ ہر چندر رائے کے دربار میں جا کر کہا:

"ساحل سمندر سے کشمیر تک تمام بادشاہ اور رجواڑے اسلام کے پرچم تلے آ چکے ہیں۔ کچھ اسلام کے حلقے میں آ گئے ہیں اور کچھ نے جزیہ دینا منظور کر لیا ہے۔ سب کفار کو مغلوب کرنے والے امیر عماد الدین محمد بن قاسم کے مطیع ہو چکے ہیں۔"

---

① فتوح البلدان: ۴۴۳

ایک شاعر کا یہ شعر بھی دروہر کے قتل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

نحن قتلنا داهرا ودوهرا ـــ والخيل تردى منسرا فمنسرا

② فتوح البلدان: ص ۴۴۳

رلیہ نے ترش ہو کر جواب دیا:

''سولہ صدیوں سے یہاں ہماری حکومت چلی آرہی ہے۔ کسی کو بھی ہماری حدود میں مداخلت کی مجال نہیں ہوئی۔ تمہاری کیا اوقات ہے کہ ایسی ناممکن باتیں دل میں لا رہے ہو۔ اگر قاصد کو سزا دینا جائز ہوتا تو تمہیں عبرت کا نشان بنا دیا جاتا۔ اپنے امیر سے کہہ دو کہ ایک دوسرے کی قوت کا اندازہ کرنے کے لیے مقابلہ ضروری ہے۔''

اس دوران خود محمد بن قاسم کی قیادت میں باقی فوج ''اودھے پور'' کے سامنے آچکی تھی۔ محمد بن قاسم نے رلیہ کے انکار سے مطلع ہو کر افسرانِ فوج کو ''اودھے پور'' پر حملے کی تیاری کا حکم دیا۔[1]

محمد بن قاسم کی معزولی:

تاہم اس سے اگلی صبح اچانک دارالخلافہ دمشق سے یزید بن ابی کبشہ نامی افسر کی آمد ہوئی۔ معلوم ہوا کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کی وفات ہوگئی ہے اور نئے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے محمد بن قاسم کی معزولی کا حکم دیا ہے۔ محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقوں میں عدل و انصاف اور مہربانی سے حکومت کر کے لوگوں کے دل جیت لیے تھے اس لیے پورے ہندوستان کا فتح ہو جانا کوئی بعید نہ تھا مگر نئے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے اس مایہ ناز جرنیل کو واپس بلالیا۔[2]

سندھ کے باشندے محمد بن قاسم کو یاد کر کے مدتوں رویا کرتے تھے۔ کیرج کے ہندوؤں نے بت خانوں میں اس کی تصاویر اور مجسمے بنائے اور اسے دیوتا کا درجہ دینے لگے۔[3]

محمد بن قاسم کی معزولی کی وجہ:

محمد بن قاسم کی فتوحات اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور میں ہوئی تھیں۔ ولید اپنے آخری ایام میں اپنے باپ عبدالملک کی وصیت کو پامال کر کے چھوٹے بھائی سلیمان کی جانشینی منسوخ کرنا چاہتا تھا۔ حجاج بن یوسف اور اس کے ماتحت جرنیل اس کے ہم خیال تھے مگر اس خیال پر عمل درآمد سے پہلے حجاج بن یوسف اور پھر ولید بن عبدالملک فوت ہو گئے اور عبدالملک کی قدیم وصیت کے مطابق سلیمان خلیفہ بن گیا۔ اسے اپنے بھائی کے عزائم کی اطلاع تھی لہٰذا وہ ولید بن عبدالملک اور حجاج بن یوسف کے وفادار جرنیلوں سے خطرہ محسوس کرنے لگا۔[4]

چنانچہ اس نے پہلی فرصت میں ان امراء اور سپہ سالاروں کو معزول کرنا شروع کر دیا جو حجاج بن یوسف کے مقرب یا ولید کے خاص وفادار تھے۔ عراق کا اُمیر یزید بن ابی مسلم حجاج بن یوسف کا مقرب رہا تھا۔ سلیمان نے اسے معزول کر کے اس کی جگہ عراق کی حکومت یزید بن مُہلّب کے حوالے کر دی۔[5]

---

① چچ نامہ، ص ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳

② چچ نامہ، ص ۲۳۳

③ الکامل فی التاریخ: ۳/۲۰، ۲۲، ۹۳، ط دار الکتاب العربی؛ فتوح البلدان: ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹

④ تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی، ص ۵۱۹؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/۹۱۳؛ تاریخ دمشق: ۳۶/۳۶۹

⑤ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ۳۱۳

مگر چونکہ یزید بن مُہلّب عموماً مشرقی صوبوں کے محاذ پر رہتا تھا لہٰذا ساتھ ہی صالح بن عبدالرحمٰن کو وزیر مالیات و امورِ داخلہ کے طور پر عراق کی حکومت میں شریک کر دیا گیا۔ یوں عملاً عراق کا سارا انتظام صالح بن عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں آ گیا۔[1] یہ شخص عربی و فارسی کا ماہر اور مالیاتی شعبے میں بڑا تجربہ رکھتا تھا[2] مگر ساتھ ہی اسے حجاج بن یوسف اور اس کے خاندان سے سخت عداوت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ حجاج بن یوسف نے خوارج کو بڑی سختی سے کچلا تھا۔ صالح بن عبدالرحمٰن کا بھائی آدم بن عبدالرحمٰن بھی خوارج کا ہم مذہب تھا، اس لیے حجاج نے اسے بھی قتل کرا دیا تھا۔[3]

اب سلیمان بن عبدالملک نے خلیفہ بن کر صالح بن عبدالرحمٰن کو خاص طور پر یہ مہم سونپی کہ وہ حجاج بن یوسف کے خاندان آلِ ابوعُقیل کے عہدے داروں کو چُن چُن کر گرفتار کرے،[4] ان پر تشدد کرے اور انہیں قتل کرے۔[5]

حجاج نے اپنے دور میں ایک مدت تک بنو مُہلّب کو بہت اختیارات سونپ رکھے تھے مگر پھر وہ ان کی تذلیل کے درپے ہو گیا۔ یزید بن مُہلّب کو اس نے معزول کرا کے جبس و تشدد کا نشانہ بھی بنایا تھا۔[6] اس لیے آلِ مُہلّب کو بھی اس انتقام لینے کی مہم میں شریک کر لیا گیا اور عبدالملک بن مُہلّب کو بنو عقیل کے گرفتار شدگان کو زدوکوب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔[7]

صالح بن عبدالرحمان نے "احتساب" کی اسی مہم کے تحت محمد بن قاسم کو بھی معزول کرنے کا منصوبہ بنایا اور فاتح سندھ کی مقبولیت اور محبوبیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کئی نزاکتوں کو ملحوظ رکھا۔ اس نے آلِ مُہلّب کو نمایاں طور پر شریک کار بنایا کیوں کہ اس وقت بنو مُہلّب بڑے عروج پر تھے۔ نیز ان کے والد مُہلّب بن ابی صفرہ کا نام تاریخ میں ایک جلیل القدر تابعی اور فاتح کے طور پر مشہور تھا۔ پس محمد بن قاسم جیسے فاتح پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ایک فاتح کی اولاد کو ساتھ رکھنا اہم سمجھا گیا تاکہ کچھ تو اخلاقی سہارا مل سکے۔

چنانچہ صالح بن عبدالرحمٰن نے سندھ کے نئے انتظامات یوں طے کیے کہ وہاں کی امارتِ حرب یزید بن مُہلّب کے بھائی حبیب بن مُہلّب کے نام کر دی اور مالیاتی و داخلی امور کی وزارت یزید بن ابی کبشہ کو سونپ دی، یعنی سندھ کا نائب حاکم وہی قرار پایا، پس محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق بھیجنے کا کام بھی اسی کے سر ڈالا گیا اور صالح بن عبدالرحمٰن نے یزید بن ابی کبشہ کو یہ احکامات دے کر بھیجا کہ محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق منتقل کر دیا جائے۔[8]

---

① تاریخ الطبری: ۶/۵۲۲؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۳۱۳
② مختصر تاریخ دمشق: ۱۱/۳۳
③ فتوح البلدان: ص ۴۴۳
④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۳۱۸
⑤ تاریخ الطبری: ۶/۵۰۶
⑥ المعارف لابن قتیبۃ: ص ۴۰۰؛ تاریخ الطبری: ۶/۴۳۶
⑦ تاریخ الطبری: ۶/۵۰۶
⑧ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۳۱۸

محمد بن قاسم کی گرفتاری اور قید و بند:

چونکہ محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقوں میں عدل و انصاف اور مہربانی سے حکومت کر کے لوگوں کے دل جیت لیے تھے اس لیے رعایا اس پر سخت دل گرفتہ ہوئی۔ محمد بن قاسم کے مداح چاہتے تھے کہ واپسی اور گرفتاری کے احکامات کی تعمیل نہ کی جائے اور یہاں آزاد حکومت قائم کر لی جائے۔

محمد بن قاسم کے لیے ایسا کرنا کوئی مشکل نہ تھا مگر اس دور اندیش نوجوان نے ذاتی مفاد پر قومی سلامتی کو ترجیح دی اور امت کے مابین کسی خانہ جنگی کا سبب بننا گوارا نہ کیا۔ ابن قاسم نے انکار کا ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر صرف اتنا کہا:

أَضَاعُونِي وَأَيَّ فَتًى أَضَاعُوا — لِيَوْمِ كَرِيهَةٍ وَسِدَادِ ثَغْرِ

''انہوں نے مجھے ضائع کر دیا۔ افسوس کیسے جوان کو ضائع کر دیا
جو جنگ کے دن اور سرحدوں کی حفاظت میں ان کے کام آتا۔''[1]

محمد بن قاسم نے خود کو یزید بن ابی کبشہ اور ان حبشی غلاموں کے سپرد کر دیا جو خلیفہ کی جانب سے آئے تھے۔[2] اس کارروائی میں سندھ کا نیا امیر حبیب بن مہلب پوری طرح ملوث تھا۔ اس کے حکم سے محمد بن قاسم کو ٹاٹ کا لباس پہنا کر اور زنجیروں میں جکڑ کے[3] معاویہ بن مہلب کے حوالے کر دیا۔ وہ فاتح سندھ کو لے کر عراق روانہ ہو گیا۔[4]

عراق میں صالح بن عبدالرحمن نے محمد بن قاسم کو واسط کے جیل خانے میں ڈال دیا جہاں بنو عقیل کے دوسرے لوگ بھی قید تھے۔ کال کوٹھری کی گھٹن میں محمد بن قاسم نے جو دردناک اشعار کہے، ان کا ہر مصرعہ دلوں کے تاروں کو جھنجوڑ دیتا ہے۔ ابن قاسم نے کہا تھا:

فَلَئِنْ ثَوَيْتُ بِوَاسِطٍ وَبِأَرْضِهَا — رَهْنَ الْحَدِيدِ مُكَبَّلًا مَغْلُولًا

''اگر آج میں واسط کے قید خانے اور اس سرزمین میں بیڑی اور طوق میں جکڑا ہوا ہوں تو کیا ہوا۔''

فَلَرُبَّ فِتْيَةِ فَارِسٍ قَدْ رُعْتُهَا — وَلَرُبَّ قِرْنٍ قَدْ تَرَكْتُ قَتِيلًا

''میں نے کتنے ہی شہ سواروں کے ہوش اڑا دیے، اور کتنے مدِ مقابل قتل کر کے چھوڑے۔''

أَتَنْسَى بَنُو مَرْوَانَ سَمْعِي وَطَاعَتِي — وَإِنِّي عَلَى مَا فَاتَنِي لَصَبُوْرُ

''کیا بنو مروان نے میری وفاداری اور اطاعت کو فراموش کر دیا،
حالانکہ مجھ سے کچھ چھن جائے تو میں صبر کا عادی ہوں۔''

---

[1] فتوح البلدان: ص ۴۲۳

[2] فتوح البلدان: ص ۴۲۳؛ چچ نامہ: ص ۴۴۳

[3] تاریخ یعقوبی: ۳/ ۳۲،۳۱

[4] فتوح البلدان: ص ۴۲۳

فَتَحْتُ لَهُمْ مَا بَيْنَ سَابُوْرَ بِالْقَنَا إِلَى الْهِنْدِ مِنْهُمْ زَاحِفٌ وَمُغِيْرٌ

''میں نے انہیں سابور سے لے کر ہندوستان تک کا علاقہ نیزے کے وار سے فتح کر کے دیا جہاں کے لوگ جنگ کے ماہر ہیں اور چھاپہ مار حملوں کے بھی۔''

وَلَوْ كُنْتُ أَجْمَعْتُ الْقَرَارَ لَوُطِّئَتْ إِنَاثٌ أُعِدَّتْ لِلْوَغٰى وَ ذُكُوْرٌ

''اگر میں (سندھ میں) جم جانے کا عزم کر لیتا تو کتنے ہی مرد وزن ماتم کرنے پر مجبور ہو جاتے۔''

وَمَا دَخَلَتْ خَيْلُ السَّكَاسِكِ عَسْكَرِيْ وَلَا كَانَ مِنْ عَكٍّ عَلَيَّ أَمِيْرٌ

''نہ سکاسک کے گھڑ سوار میری فوجی خیمہ گاہ میں داخل ہوتے، نہ عک کا کوئی فرد مجھ پر امیر مقرر ہوتا۔''

وَلَا كُنْتُ لِلْعَبْدِ الْمَزُوْنِيِّ تَابِعًا فَيَا لَكَ دَهْرٌ بِالْكِرَامِ عَثُوْرٌ

''اور نہ ہی میں مزونی غلام کا ماتحت بنتا۔ آہ! زمانہ شریفوں کو کس طرح ٹھوکر مارتا ہے۔''[1]

محمد بن قاسم کا انجام:

محمد بن قاسم کے انجام کے بارے میں تین روایات ہیں:

❶ پہلی روایت یہ ہے کہ سلیمان بن عبدالملک تک جب مذکورہ اشعار پہنچے تو اس نے محمد بن قاسم کو آزاد کر دیا۔ مگر بنو مہلب کی آتش انتقام ابھی سرد نہیں ہوئی تھی، چنانچہ معاویہ بن مُہلّب نے محمد بن قاسم کا سر قلم کر دیا۔[2]

❷ دوسری روایت یہ ہے کہ صالح بن عبدالرحمٰن نے محمد بن قاسم کو واسط کے جیل خانے ہی میں سخت اذیتیں دے کر قتل کر دیا تھا۔[3]

❸ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ محمد بن قاسم نے یزید بن مُہلّب کی قید میں خودکشی کر لی تھی۔[4]

پہلی روایت سلیمان بن عبدالملک کی شرافت اور نیک سیرتی کے مطابق تو ہے مگر یہ بعید ہے کہ خلیفہ آزاد کرنے کا حکم دے اور نائب افسر اپنی صوابدید پر قیدی کو قتل کر دے۔

دوسری روایت کو اکثر مؤرخین نے نقل کیا ہے جس کے مطابق صالح بن عبدالرحمٰن نے محمد بن قاسم کو جیل میں قتل کر دیا تھا اور یہی روایت درست معلوم ہوتی ہے۔

تیسری روایت مغالطے پر مبنی ہے۔ خودکشی کا واقعہ محمد بن قاسم کا نہیں، اس کے بیٹے عمرو بن محمد کا تھا جو آگے آ رہا ہے۔

یہ افسوس ناک سانحہ ۹۶ھ میں رونما ہوا تھا۔[5] اس طرح اُمتِ مسلمہ کا ایک نہایت جری، بڑا قابل، مہربان اور ہر دلعزیز سپہ سالار اپنوں کی ناقدری کی نذر ہو گیا۔

---

① الكامل في التاريخ: ۶۲/۳، ۶۳؛ فتوح البلدان: ص ۴۴۴، ۴۴۵؛ معجم الشعراء للمرزباني م ۳۸۴ھ: ۴۱۴، ط العلمية

② معجم الشعراء للمرزباني م ۳۸۴ھ: ۴۱۴، ۴۱۳، ط العلمية ③ فتوح البلدان: ص ۴۴۵

④ جمهرة انساب العرب: ص ۲۶۸ ⑤ نزهة الخواطر: ۳۶/۱

محمد بن قاسم کی دردناک وفات پر شعراء نے مرثیے کہے۔ ایک شاعر نے کہا:

اِنَّ الشَّجَاعَةَ وَالسَّمَاحَةَ وَالنَّدٰى　　لِمُحَمَّدِ بْنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدِ

قَادَ الْجُيُوْشَ لِسَبْعَ عَشْرَةَ حِجَّةً　　يَا قُرْبَ ذٰلِكَ سُؤْدَدًا مِنْ مَوْلِدِ

''بے شک دلیری، سخاوت اور کرم نوازی قاسم بن محمد کے بیٹے محمد کے لیے طے ہو چکی ہے۔ اس نے سترہ سال کی عمر میں لشکروں کی قیادت کی۔ واہ واہ۔ پیدائش کے بعد یہ قیادت کتنی جلد مل گئی۔''[1]

داہر کی بیٹیوں کی گرفتاری کی روایت:

چچ نامہ میں محمد بن قاسم کی گرفتاری کے ضمن میں ایک ایسے واقعے کا ذکر ہے جس کے باعث خلیفہ نے یکدم محمد بن قاسم کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا۔ چچ نامہ کے مطابق محمد بن قاسم نے راجہ داہر کی دو شہزادیوں: سری دیوی اور پرمل دیوی کو گرفتار کر کے عزت و احترام کے ساتھ دار الخلافہ ''بغداد'' بھیج دیا تھا۔ خلیفہ ''ولید بن عبد الملک'' نے ایک دن ان سے حال احوال پوچھا تو ایک شہزادی کو محمد بن قاسم سے اپنے باپ داہر کا بدلہ لینے کا حیلہ سوجھا۔ اس نے محمد بن قاسم پر اپنی عصمت دری کرنے کا جھوٹا الزام لگا دیا۔ خلیفہ یہ سن کر مشتعل ہو گیا اور اس نے حکم جاری کیا کہ محمد بن قاسم خود کو کچی کھال میں بند کرا کے دربار خلافت حاضر ہو۔ چنانچہ محمد قاسم نے خود کو کچی کھال میں لپیٹ لیا اور اُسے ایک صندوق میں بند کر کے روانہ کر دیا گیا۔ محمد بن قاسم دو دن بعد اسی صندوق میں دم گھٹنے سے جاں بحق ہو گیا۔

محمد بن قاسم کی موت کے بعد داہر کی بیٹیوں نے خلیفہ کے سامنے اپنے جھوٹ کا اقرار کرتے ہوئے کہا: ''محمد بن قاسم نے ہمارے ساتھ بھائیوں جیسا برتاؤ کیا تھا۔ ہم نے اس پر جھوٹا الزام لگایا تھا تاکہ باپ کے خون کا بدلہ لیں۔''

یہ سن کر خلیفہ کا پشیمانی سے برا حال ہو گیا۔ اس نے داہر کی بیٹیوں کو قید خانے میں ڈال دیا اور رنج و غم سے اپنی انگلیاں چبانے لگا۔[2]

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۳۰۳، الکامل فی التاریخ: ۳/۹۳، تاریخ دمشق: ۱۹۳/۶۵
بعض روایات میں یہ شعر اس طرح ہے:

سَاسَ الرِّجَالَ لِسَبْعَ عَشْرَةَ حِجَّةً　　وَلِدَاتُهُ اِذْ ذَاكَ فِي اَشْغَالِ

(اس نے سترہ سال کا ہو کر مردوں کی قیادت کی جبکہ اس کے ہم عمر اس وقت کھیل کود میں مشغول ہوتے ہیں۔)

چچ نامہ کے مطابق یہ اشعار حمزہ بن بیض حنفی کے ہیں جو اس نے محمد بن قاسم کی فتوحات فارس پر اس لیے کہے تھے کہ اس وقت محمد بن قاسم فقط سترہ سال کا تھا۔ اتنی کم عمری میں اتنی بڑی کامیابی باعث حیرت تھی۔ (چچ نامہ، ص ۹۲)

بلاذری اور ابن اثیر نے بھی انہیں حمزہ بن بیض حنفی کے اشعار بتایا ہے مگر انہیں محمد بن قاسم کی وفات کے بعد درج کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ اشعار اس کے غم میں کہے گئے مرثیوں کا ایک ٹکڑا ہیں۔ واللہ اعلم۔ مگر خلیفہ بن خیاط اور ابن عساکر نے انہیں یزید بن الحکم (بن ابی العاص) کے اشعار کے طور پر ذکر کیا ہے۔ (تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۳۰۳، تاریخ دمشق: ۱۹۳/۶۵)

بہر کیف اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ محمد بن قاسم کی عمر سندھ کی مہم کے وقت سترہ برس تھی۔ یہ ایک تاریخی مغالطہ ہے جس پر ہم تاریخ اُمت مسلمہ حصہ سوم کے حواشی میں (ولید بن عبد الملک کے دور میں سندھ کی فتح کے ضمن میں) کلام کر چکے ہیں۔

② چچ نامہ: ۲۲۲، ۲۲۳

چچ نامہ کی اس روایت پر جناب نبی بخش خان بلوچ مرحوم نے سخت تنقید کرتے ہوئے اسے یکسر ناقابل اعتماد قرار دیا ہے۔ راقم کو ان کی تحقیق سے اس حد تک اتفاق ہے کہ یہ واقعہ من وعن درست نہیں ہوسکتا کیوں کہ چچ نامہ کے مؤلف نے جو روایت نقل کی ہے اس میں محمد بن قاسم کے قتل کا حکم خلیفہ ولید کی طرف منسوب کیا گیا ہے، حالانکہ اس وقت کا ولید کا انتقال ہو چکا تھا۔ اسی روایت میں دار الخلافہ بغداد کو بتایا گیا ہے جبکہ بغداد کا اس وقت وجود ہی نہ تھا۔

نیز اس روایت میں محمد بن قاسم کا کچی کھال میں لپٹ کر صندوق میں بند ہونے کے باعث راستے ہی میں فوت ہو جانے کا ذکر ہے۔ مگر روایت کا یہ حصہ بھی تمام مؤرخین کے بیانات کے بالکل خلاف ہے۔ محمد بن قاسم کا سلیمان کے دور میں اس کے حکم سے گرفتار ہونا اور واسط تک زندہ سلامت پہنچنا اور بعد میں قتل کیا جانا ایک متفقہ امر ہے۔

رہی یہ بات کہ کیا محمد بن قاسم نے داہر کی بیٹیوں کو دار الخلافہ بھیجا تھا؟ یہ کسی تاریخی جزئی، کسی اسلامی حکم اور مسلمانوں کی اخلاقی اقدار سے متصادم نہیں۔ اس لیے اگر کوئی اس قدر بات کو قبول کرلے تو اس پر نکیر نہ ہوگی۔

یہاں دمشق کی جگہ بغداد اور خلیفہ سلیمان کی جگہ خلیفہ ولید کا ذکر راوی کے سہو یا وہم پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح داہر کی بیٹیوں کا محمد بن قاسم کی جھوٹی شکایت لگا کر خلیفہ کو مشتعل کرنا بھی بالکل قرین قیاس ہے کیوں کہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتی تھیں۔ پس کوئی بعید نہیں کہ خلیفہ کا محمد بن قاسم سے بدظن ہونا جہاں اس بنا پر تھا کہ وہ اس کے مخالف گروہ یعنی حجاج بن یوسف کے گروہ کا فرد ہے، وہاں فوری اشتعال کا کوئی اور سبب بھی ہوسکتا تھا جو عین ممکن ہے کہ یہی ہو کہ اسے داہر کی بیٹیوں نے بھڑکایا ہو..... إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ

ایک بات یہ رہ جاتی ہے کہ چچ نامہ کی اس روایت میں محمد بن قاسم کے خلاف کارروائی کا حکم خلیفہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے جبکہ اکثر مؤرخین کے مطابق گرفتاری کا حکم صالح بن عبد الرحمٰن نے دیا تھا جو حجاج بن یوسف کی جگہ عراق کا امیر بنا تھا۔ تو اس تعارض میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

اگر یہ روایت اپنے اوہام کو مستثنیٰ کر کے قابل قبول ہو تو یہاں تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ داہر کی بیٹیوں کی شکایت سے خلیفہ متاثر ہوا ہو، اور اس نے صالح بن عبد الرحمٰن کو اس کارروائی کا حکم دیا ہو۔ تاہم خلیفہ نے فقط گرفتاری کا حکم دیا ہوگا نہ کہ قتل کرنے یا کچی کھال میں لپیٹ کر صندوق میں بند کرنے کا۔ چچ نامہ کے بیان میں جہاں دیگر سخت اغلاط و اوہام ہیں وہاں یہ بھی غلطی ہے کہ گرفتاری کے حکم کی بجائے ایسا حکم خلیفہ کی طرف منسوب کردیا گیا جو یقیناً سزائے موت سنا دینے کے زمرے میں آتا تھا۔

یہ تمام گفتگو اس امکان کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے کہ اس روایت میں خلط ملط ہے۔ اس کی کچھ چیزیں دیگر روایات سے تصادم کے باعث یقیناً غلط ہیں اور کچھ جزئیات درست ہوسکتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی اس روایت کو یکسر مسترد کرتا ہے تو اس کی بھی پوری گنجائش ہے جیسا کہ جناب نبی بخش خان بلوچ مرحوم کی رائے ہے۔

✦✦✦

محمد بن قاسم کے بعد سندھ کے اُموی اُمراء

محمد بن قاسم کے بعد سندھ میں یکے بعد دیگرے اُموی خلفاء کے کئی عمال تعینات رہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

یزید بن ابی کبشہ (۹۶ھ):

یزید بن ابی کبشہ وہ نائب اُمیر ہے جس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق بھیجا تھا۔ مگر فقط اٹھارہ دن حکومت کر کے وہ اچانک فوت ہو گیا۔[①]

عبیداللہ بن ابی کبشہ: (۹۶ھ)

یزید بن ابی کبشہ کے بعد ہنگامی طور پر اس کے بھائی عبیداللہ بن ابی کبشہ کو قائم مقام حاکم سندھ بنایا گیا۔[②]

عمران بن نعمان کلاعی: (۹۶ھ)

کچھ مدت بعد اسے معزول کر کے عمران بن نعمان کلاعی کو یہ عہدہ بخش دیا گیا۔[③]

حبیب بن مُہَلّب (۹۶ھ تا ۱۰۰ھ):

کچھ دنوں بعد حبیب بن مُہلّب کو امیر بنا کر بھیجا گیا۔[④]

اس نے بعض اہم عسکری مہمات انجام دیں۔ محمد بن قاسم کی گرفتاری کے بعد سندھ کے بعض علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے اور وہاں کے مفرور راجاؤں نے واپس آ کر ان کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ ان میں راجا داہر کا بیٹا جے سنگھ بھی تھا جو برہمن آباد واپس لوٹ آیا تھا۔ حبیب بن مہلب نے اس کی خلاف فوج کشی کی اور دریائے سندھ کے کنارے واقع مشہور قلعے ''راوڑ'' کا محاصرہ کر کے اسے مسخر کیا اور دشمنوں کو شکست دی۔[⑤]

عمرو بن مسلم باہلی (۱۰۰ھ تا ۱۰۱ھ):

حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ بنے تو انہوں نے سابق خلفاء کے تمام غلط فیصلوں کی تلافی کی کوششیں کیں۔ اسی ضمن میں انہوں نے بنو مُہلّب کو لگام دیتے ہوئے یزید بن مُہلّب کو مالی خیانت کے جرم میں عراق کی امارت سے

① فتوح البلدان: ص ۴۴۳
② تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۳۱۸
③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۳۱۸
④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ۳۱۸
⑤ فتوح البلدان: ص ۴۴۳

معزول کر کے قید کر دیا۔[1] اس کے بھائی حبیب بن مہلب کو بھی سندھ کی امارت سے ہٹا دیا[2] اور اس کی جگہ سندھ میں ماوراء النهر کے فاتح قتیبہ بن مسلم کے بھائی عمرو بن مسلم باہلی کا تقرر کیا جس نے سندھ کے بعض علاقوں میں جہاد کیا اور فتح یاب ہوا۔ عمر بن عبدالعزیز نے سندھ کی بغاوتوں کے انسداد کے لیے مقامی سرداروں اور عمائد کے دل جیتنے کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے راجاؤں کو خطوط لکھ کر اسلام کی دعوت دی اور ان سے وعدہ کیا کہ انہیں ان کی حکومتوں پر برقرار رکھا جائے گا۔ نیز یہ یقین دلایا کہ انہیں وہ تمام حقوق میسر ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کے ہیں اور ان پر بھی فقط وہ ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو دیگر مسلمانوں پر لاگو ہیں۔ سندھ کے راجاؤں کو عمر بن عبدالعزیز کی حسن سیرت اور عدل وانصاف کا علم ہو چکا تھا، چنانچہ راجہ داہر کے بیٹے جے سنگھ سمیت بہت سے ہندو راجاؤں اور بکثرت غیر مسلموں نے اسلام قبول کر لیا اور عربی نام اختیار کر لیے۔[3]

ہلال بن احوز تمیمی: (۱۰۲ھ تا ۱۰۵ھ)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی وفات کے بعد یزید بن عبدالملک نے مسند خلافت سنبھال کر سندھ کی ولایت ہلال بن احوز تمیمی کے نام کر دی۔[4] اسی زمانے میں یزید بن مہلب نے طاقت پکڑ کر بغاوت کر دی مگر شکست کھا کر مارا گیا اور اس کا خاندان فرار ہو کر قندابیل (بلوچستان) میں چھپ گیا۔[5] تاہم سندھ کے امیر ہلال نے قندابیل پر حملہ کر کے آل مہلب کے مفرورین ختم کر دیا جن میں عبدالملک بن مہلب اور معاویہ بن مہلب بھی شامل تھے۔[6]

جس طرح آل مہلب نے اپنے سیاسی حریفوں کو ہدف ستم بنایا تھا، اسی صورتحال سے وہ خود دوچار ہوئے۔ محمد بن قاسم پر زیادتی کے مرکزی کردار صالح بن عبدالرحمٰن کا انجام بھی بہت برا ہوا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے دور میں اسے عراق کی حکومت سے معزول کر دیا۔[7] پھر یزید بن عبدالملک کے دور میں عراق کے امیر عمر بن ہبیرہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر اسے قتل کر دیا۔[8] مقام عبرت ہے کہ محمد بن قاسم پر ظلم میں شریک رہنے والے بھی لوگ چند سال کے اندر اندر اپنے انجام کو پہنچے۔

جنید بن عبدالرحمٰن مُرّی (۱۰۷ھ تا ۱۱۱ھ):

خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دور میں ہندوستان کی حکومت کے لیے جنید بن عبدالرحمٰن کا انتخاب کیا گیا۔ جنید نے دیبل پہنچ کر دریائے سندھ کے ساحل کا رخ کیا مگر جے سنگھ نے اسے دریائے سندھ عبور نہ کرنے دیا اور پیغام بھیجا:

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۳۲۰
② فتوح البلدان: ص ۴۲۵
③ فتوح البلدان: ص ۴۲۵
④ فتوح البلدان: ص ۴۲۵
⑤ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۰۲ھ
⑥ المعارف لابن قتیبۃ: ۳۶۲/۱
⑦ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۰۲ھ
⑧ مختصر تاریخ دمشق: ۳۳/۱۱

''میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ مجھے نیک خلیفہ (عمر بن عبدالعزیز) نے اس سرزمین کا والی بنایا تھا۔ مجھے تم پر اعتماد نہیں۔''

جنید نے موقع کی نزاکت کے تحت بڑی حکمت سے کام لیا اور گفت وشنید جاری رکھی۔ آخر طے پایا کہ جے سنگھ خراج ادا کرتا رہے گا اور سندھ کی حکومت اسی کے پاس رہنے دی جائے گی۔ قول وقرار کو پختہ کرنے کے لیے فریقین ایک دوسرے کے پاس کچھ افراد ضامن رکھوائے۔

مگر افسوس کہ باہمی اعتماد قائم نہ رہ سکا اور فریقین نے ضامن واپس کر دیے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں غلطی جنید کی تھی جس نے جے سنگھ پر کوئی زیادتی کی تھی۔ بہر حال وجہ جو بھی تھی، نتیجہ یہ نکلا کہ جے سنگھ نے بغاوت کر دی۔

جے سنگھ ہندوستان سے افواج جمع کر کے لے آیا، جنہیں کشتیوں کے بیڑے کی مدد بھی حاصل تھی۔ جنید نے اس دوران کسی طرح دریائے سندھ عبور کر لیا تھا۔ آخر دریا کے مشرقی ساحل پر ہولناک جنگ ہوئی جس میں جے سنگھ کو شکست ہوئی، وہ کشتی میں بیٹھ کر فرار ہونے لگا مگر اس کی کشتی ڈوب گئی۔ اسے پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔

داہر کے دوسرے بیٹے چچ نے بھائی کا یہ انجام دیکھا تو عراق روانہ ہونے کی کوشش کی تاکہ بصرہ کے امیر سے جنید کی اس بد عہدی کی شکایت کرے۔ تاہم جنید اسے مسلسل تسلی آمیز پیغامات بھیجتا رہا۔ آخر چچ نے خود کو جنید کے سپرد کر دیا مگر جنید نے وعدہ خلافی کی اور قابو پانے کے بعد اسے قتل کر دیا۔

اس کے بعد جنید نے کچھ اور گجرات پر فوج کشی کی جہاں ''کیرج'' میں بغاوت ہو چکی تھی۔ جنید نے سختی سے محاصرہ کر کے فصیل شکن آلات کے ذریعے شہر کی دیوار توڑ دی اور شہر پر قبضے کے بعد بہت سے لوگوں کو قتل اور گرفتار کیا۔

ان فتوحات کے بعد جنید نے اپنے لشکر مختلف اطراف میں پھیلا دیے اور اپنے افسران کو بھیج کر مرمد، دہنج، بھڑوچ اور منڈل کو فتح کیا۔ صوبہ مالوہ میں اُجین ایک مستحکم شہر تھا۔ جنید نے اس پر چڑھائی کے لیے حبیب بن مُرّہ کو بھیجا جس نے ''اُجین'' اور مالوہ کو اپنی جولان گاہیوں کا نشانہ بنایا۔ پھر ''بھریمد'' (مارواڑ) پر بھی دھاوا بولا اور اس کے مضافات کو نذر آتش کر دیا۔ دوسری طرف جنید نے واپس پلٹ کر ''بھیلمان'' پر حملہ کیا اور گجروں کو شکست فاش دی۔ ان جنگوں میں جنید کو بے پناہ مال غنیمت ہاتھ لگا۔[1]

مگر ہشام بن عبدالملک کے دور کی ان فتوحات کو استحکام نصیب نہ ہو سکا۔ وجہ یہ تھی کہ ان فتوحات میں افسران فوج کی جانب سے ایسے اقدامات بھی سرزد ہوئے تھے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھے۔ سیاسی واخلاقی غلطیوں نے مسلمانوں کے بارے میں غلط تاثر پھیلایا اور بغاوتوں کے ابھرنے اور انہیں کچلنے کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

تمیم بن زید عتبی (۱۱۱ھ تا......ھ):

۱۱۱ھ میں یہ سندھ کا امیر بنا۔ بڑا سخی اور عوام پرور مگر غیر محتاط تھا۔ جب اسے سندھ کی حکومت ملی تو یہاں کے خزانے

[1] فتوح البلدان: ص ۴۲۵، ۴۲۶؛ نزھۃ الخواطر: ۱/ ۳۲، ۳۳

میں ایک کروڑ اسی لاکھ درہم موجود تھے جنہیں اس نے تیزی سے خرچ کرنا شروع کر دیا۔[1] مگر تمیم مقامی سرداروں اور امراء کو خوش نہ رکھ سکا اور اُمرائے سندھ اس کی اطاعت سے منحرف ہو گئے۔[2]

ان حالات کے باعث تمیم کے دور میں سندھ پر مسلمانوں کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ تمیم بن زید کا دیبل کے مضافات میں واقع ایک جھیل کے کنارے انتقال ہو گیا جسے "ماء الجوامیس" یعنی "بھینسوں کی جھیل" کہا جاتا تھا۔ تمیم کے دور میں مفتوحہ صوبوں کے حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ سندھ اور ہندوستان کے دیگر علاقوں سے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہمسایہ مسلم ممالک کی طرف نقل مکانی کرنے لگی۔[3]

حکم بن عوانہ کلبی: (تا ۱۲۲ھ)

تمیم کے بعد حکم بن عوانہ کا تقرر ہوا۔ جب وہ سندھ پہنچا تو حالات نہایت ابتر تھے۔ ہندو بغاوتیں کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ کے سوا تمام راجے مہاراجے اطاعت سے منحرف ہو گئے۔ سندھ کے مسلمانوں کے لیے کوئی شہر محفوظ نہ تھا۔ حکم بن عوانہ کی خوش قسمتی تھی کہ فاتح سندھ محمد بن قاسم کا بیٹا عمرو اس کے ہم رکاب تھا جو اپنے والد کی طرح انتہائی بہادر، ہوشیار اور سمجھدار تھا۔ حکم بن عوانہ نے اسے غیر معمولی اختیارات اور ذمہ داریاں سپرد کر دی تھیں۔

حکم بن عوانہ نے سب سے پہلے مسلمانوں کے لیے ایک مستحکم اور محفوظ شہر تعمیر کرایا جسے "محفوظہ" کا نام دیا گیا۔

اس شہر کو مرکز بنانے کے بعد عمرو بن محمد کو بغاوت کرنے والوں کے خلاف عسکری مہمات سونپی گئیں چنانچہ وہ محاذ پر روانہ ہو گیا اور بغاوت کے شعلے ٹھنڈے کر کے کچھ مدت بعد کامیاب و کامران لوٹ آیا۔ حکم بن عوانہ کے دور میں بیشتر مفتوحہ علاقے دشمنوں سے بازیاب کرا کر امن و امان قائم کر دیا گیا تھا اس لیے لوگ اس کی حکومت سے خوش تھے۔[4]

آخر میں حکم بن عوانہ ایک بڑی مہم جوئی کے لیے نکلا اور دشمن کے علاقے میں گھستا چلا گیا۔ اسی مہم میں اس نے جام شہادت نوش کیا۔[5] یہ ۱۲۲ھ کا واقعہ ہے۔[6]

محمد بن عرار کلبی: ۱۲۲ھ

حکم بن عوانہ کی شہادت کے بعد محمد بن عرار کلبی نے جو حکم بن عوانہ کے قبیلہ بنو کلب سے تعلق رکھتا تھا، حکومت سنبھال لی مگر زیادہ تر لوگ عمرو بن محمد بن قاسم کے گرویدہ تھے۔ آخر خلیفہ ہشام نے بھی اسی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

عمرو بن محمد بن قاسم: (۱۲۲ھ تا ۱۲۶ھ)

اب عمرو بن محمد بن قاسم نے سندھ کی ولایت سنبھال لی۔ وہ بڑا دور اندیش جرنیل تھا۔ اس نے دریائے سندھ کے

---

① فتوح البلدان: ص ۴۲۵، ط الهلال
② فتوح البلدان: ص ۴۲۷
③ فتوح البلدان: ص ۴۲۵، ط الهلال
④ فتوح البلدان: ص ۴۲۶، ط الهلال؛ الكامل في التاريخ: ۹۳/۴؛ تاريخ ابن خلدون: ۸۳/۳
⑤ تاريخ يعقوبي: ۹۹/۳ ⑥ تاريخ خليفة بن خياط: ص ۳۵۴

موڑ پر ایک محفوظ اور مستحکم شہر کی بنیاد رکھی جسے ''منصورہ'' کا نام دیا گیا۔ صدیوں تک یہی سندھ کی اسلامی حکومت کا دار الحکومت رہا۔ [1] عمرو بن محمد کے امیر بننے پر ہندو راجاؤں نے خطرہ محسوس کیا اور مسلمانوں کے علاقوں پر ٹوٹ پڑے۔ ابتداء میں انہیں کامیابی ہوئی اور وہ منصورہ تک آن پہنچے۔ عمرو نے والیِ عراق یوسف بن عمر سے مدد مانگی۔ اس نے چار ہزار سپاہی بھیج دیے۔ اس کمک کے آتے ہی دشمن منصورہ کا محاصرہ چھوڑ کر پسپا ہوگئے۔

عمرو بن محمد نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی قوت کو مستحکم کیا اور اس کے بعد دشمن کی طرف یلغار کی۔ اس فوج کے ہر اوّل دستے کی قیادت معن بن زائدہ شیبانی جیسے نامی گرامی افسر کے ہاتھ میں تھی۔ معن بن زائدہ نے راتوں رات دشمن پر شب خوں مارا جس کے بعد ایک قہر انگیز جنگ شروع ہوگئی۔ معن بن زائدہ کے سپاہیوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ آخر میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا جبکہ راجا باقی ماندہ لوگوں کے ساتھ فرار ہوگیا۔ [2]

عمرو بن محمد کی ان کامیابیوں نے اسے بڑی شہرت دی مگر حاسدین اس سے جلنے لگے۔ ان میں یزید بن مُہلّب کا بیٹا مروان پیش پیش تھا جو اس وقت سندھ کی فوج کا ایک بڑا افسر تھا۔ اس نے آلِ مُہلّب کی آلِ عقیل سے پرانی دشمنی کو ایک بار پھر تازہ کرتے ہوئے، عین اس وقت جب عمرو بن محمد کی افواج جہاد میں مشغول تھیں، اپنے حامی افسران کے ساتھ لشکرگاہ کو لوٹ لیا اور بے پناہ مال واسباب اور مویشی لے کر بھاگ نکلا۔ عمرو بن محمد نے معن بن زائدہ کو ساتھ لے کر اس کا تعاقب کیا۔ آخر مروان کی جمعیت منتشر ہوگئی اور وہ خود قتل کر دیا گیا۔ عمرو بن محمد بن قاسم اُموی دور کے کامیاب حاکمانِ سندھ میں آخری شخص تھا۔ [3]

ربیع الآخر ۱۲۵ھ میں خلیفہ ہشام بن عبدالملک فوت ہوگیا اور اس کی جگہ اس کا نالائق بھتیجا ولید بن یزید تخت نشین ہوگیا جس نے اپنے چچا کے پسندیدہ عمال کو معزول کرنا شروع کر دیا۔ اسی ضمن میں ۱۲۶ھ میں عمرو بن محمد بن قاسم کو بلاوجہ معزول کر کے سندھ کی ولایت محمد بن عرار کلبی کو سونپ دی گئی۔ اقتدار ملتے ہی محمد بن عرار نے عمرو بن محمد کو گرفتار کر لیا۔ عمرو بن محمد کو اندیشہ تھا کہ محمد بن عرار اسے سخت تشدد کا نشانہ بنائے گا، اس ڈر سے اس نے پہرے داروں سے تلوار چھین کر اپنے شکم سے آر پار کر دی اور اسی زخم سے تین دن بعد فوت ہوگیا۔ [4]

محمد بن قاسم اور عمرو بن محمد دونوں باپ بیٹا جذبۂ جہاد میں بھی ایک سے تھے اور فہم و تدبر میں بھی۔ دونوں کی خدمات کی سخت ناقدری ہوئی اور دونوں ایک حسرت ناک انجام سے دوچار ہوئے۔

---

① منصورہ کے کھنڈرات شہداد پور (سندھ) سے بارہ تیرہ کلومیٹر جنوب مشرق میں نہر ''جمڑاؤ'' سے متصل ''داور'' کے ٹیلے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ بعض حضرات اسے برہمن آباد کے کھنڈرات بھی کہتے ہیں مگر درست یہ ہے کہ برہمن آباد کے کھنڈرات وہ ہیں جو شہداد پور سے کچھ دور ٹیپ لطاری (تحصیل ٹنڈو آدم) کے مضافات میں دکھائی دیتے ہیں۔

② کسی تاریخی عبارت یا قرائن سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ راجا کس علاقے کا تھا۔ شاید اس کا تعلق راجپوتانہ سے ہو۔

③ فتوح البلدان: ص ۴۲۷، ط الہلال

④ تاریخ الطبری: ۲۴۲/۷

محمد بن عرار کلبی: (۱۲۶ھ)

محمد بن عرار کلبی ایک آزمودہ سپاہی تھا۔ اس نے دشمنوں کے خلاف اٹھارہ جنگیں لڑیں اور ملکی نظم ونسق کو برقرار رکھا۔ [1]

محمد بن عرار کی امارت چند ماہ تک رہی۔ اس کے بعد عراق کے سابق حاکم منصور بن جمہور نے سندھ آ کر تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

منصور بن جمہور: (۱۲۶ھ تا ۱۳۲ھ)

منصور بن جمہور ایک فتنہ پرور انسان تھا۔ [2] اس وقت دولت بنوامیہ زوال کے انتہاء پر تھی اور جگہ جگہ امراء خود مختار ہو رہے تھے۔ ایسے میں منصور بن جمہور نے بھی بنوامیہ کے خلاف بغاوت کی مگر اسے عراق میں کامیابی نہ ہوئی۔ [3]

آخر کار وہ سندھ روانہ ہو گیا جہاں اس کا رشتہ دار محمد بن عرار حاکم تھا۔ منصور کو اس کے ہاں خیر مقدم کی اُمید تھی مگر جب وہ دریائے سندھ کے پار پہنچا تو محمد بن عرار جو اس کے فتنہ پرور مزاج سے واقف تھا گھبرا گیا اور اسے آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی۔ باہمی کش مکش میں منصور غالب آ گیا اور اس نے بڑی بے رحمی سے محمد بن عرار کو ایک ستون میں زندہ چنوا دیا۔ [4]

عباسی خلافت کا قیام:

یہ وہ زمانہ تھا کہ بنوہاشم کے چند سیاسی رہنما بنوامیہ سے اقتدار چھیننے کے لیے سرگرداں تھے اور ہزار ہا لوگوں کو خفیہ رابطوں کے ذریعے اپنا حامی بنا چکے تھے۔ اس تحریک کی بنیاد حضرت عبداللہ بن عباس کے پوتے محمد بن علی نے رکھی تھی اور ۱۲۶ھ میں یہ تحریک ایک تناور درخت بن چکی تھی۔ خصوصاً عراق، خراسان اور سندھ میں اس کے وفادار بکثرت تھے۔ آخری عباسی خلیفہ مروان بن محمد الحمار کے دور میں اُموی افواج کی عباسی تحریک کے رضا کاروں کے ساتھ باقاعدہ جنگیں ہوئیں جن میں انجام کار عباسی غالب آ گئے۔ ۱۳۲ھ میں بنوامیہ کا مرکز شام بھی ان سے چھن گیا اور مروان بن محمد اپنے خاندان کے ساتھ دربدر ہو کر قتل ہوا۔ یوں بنوامیہ کی جگہ بنوعباس کی خلافت قائم ہو گئی اور اسپین کے سوا باقی پورے عالم اسلام میں پہلے عباسی خلیفہ ابوالعباس سفاح کی بیعت کر لی گئی۔

۱۳۲ھ میں آخری اُموی خلیفہ مروان حمار کے قتل اور بنوعباس کی خلافت قائم ہونے تک سندھ منصور کے پاس تھا۔ [5]

◆◆◆

---

① تاریخ یعقوبی: ۳/۷۹

② تاریخ الطبری: ۷/۴۴۳

③ تاریخ الطبری: ۷/۳۴۳ تا ۳۴۹؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۳۸۳

④ تاریخ یعقوبی: ۳/ ۸۰، ۸۱

⑤ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ۴۰۶

عباسی دور میں سندھ کے نائبین

۱۳۶ھ میں عباسیوں نے سندھ پر بھی قبضہ کر لیا اور یہاں اپنے نائبین (اُمراء) مقرر کر دیے۔ ان کا تعارف مندرجہ ذیل ہے:

ابو العباس سفاح کے دور میں

موسیٰ بن کعب تمیمی: (۱۳۶ھ تا ۱۴۱ھ)

ابو العباس سفاح نے سندھ پر قبضے کے لیے ایک افسر مُغلّس کو وہاں بھیجا تھا مگر اسے منصور بن جمہور کے مقابلے میں شکست ہوئی تھی، اس لیے کچھ مدت تک عباسیوں نے سندھ کا رُخ نہ کیا۔[1] جب عباسیوں نے اطراف و اکناف میں اچھی طرح قدم جما لیے تو سفاح نے ۱۳۴ھ میں سندھ فتح کرنے کا فیصلہ کیا اور الجزیرہ کے امیر موسیٰ بن کعب تمیمی کو بیس ہزار سپاہی دے کر اُدھر روانہ کر دیا۔

موسیٰ بن کعب بڑا ہوشیار شخص تھا۔ اس نے پہلے قندابیل پہنچ کر قیام کیا اور اس دوران سندھ کے پایۂ تخت منصورہ کے امراء اور قبائلی عرب سرداروں کو خفیہ پیام رسانی کے ذریعے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس گٹھ جوڑ میں کامیابی کے بعد وہ لشکر لے کر دریائے سندھ کے کنارے آن پہنچا۔ اُدھر سے منصور بھی مقابلے پر نکلا۔[2]

۲۷ رمضان ۱۳۶ھ کو فریقین میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں منصور بن جمہور شکست فاش سے دوچار ہوا اور اس کی خود مختار حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ منصور بن جمہور صحرا کی طرف نکل گیا اور پیاس سے بے دم ہو کر فوت ہو گیا۔[3]

اب سندھ خلافتِ عباسیہ کے پرچم تلے آ چکا تھا۔ موسیٰ بن کعب نے منصورہ کو مرکز بنایا اور اس کی جامع مسجد کی توسیع کرائی۔[4] موسیٰ بن کعب کامیابی سے سندھ اور ہندوستانی اضلاع پر حکومت کرتا رہا۔ آخر میں خلیفہ منصور نے اسے بُلا کر محکمۂ شرطہ (پولیس) کا افسرِ اعلیٰ بنا دیا جبکہ سندھ میں اس کا بیٹا عُیَینہ اس کی نیابت کرتا رہا۔ موسیٰ ۱۴۱ھ میں فوت ہوا۔[5]

---

① قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سندھ پر قبضے کی یہ کوشش اس وقت ہوئی تھی جب عباسی خراسان پر قبضہ کر چکے تھے مگر ابھی ان کی خلافت قائم نہ ہوئی تھی۔
② تاریخ یعقوبی: ۹۸/۳ ③ فتوح البلدان: ص ۴۲۷؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۳۱۳، ۳۱۵
④ فتوح البلدان: ص ۴۲۷ ⑤ تاریخ الطبری: ۵۱۱/۷

منصور کے دور میں

عُیَیْنَہ بن موسیٰ: (۱۴۱ھ تا ۱۴۲ھ)

موسیٰ کے بعد اس کا بیٹا عُیَیْنَہ جو پہلے ہی عملاً اس کی جگہ لے چکا تھا، سندھ کا امیر بنا مگر وہ ایک مُدبر حاکم ثابت نہ ہو سکا۔ پھر وہ بنو تمیم سے تعلق رکھتا تھا اس لیے ربیعہ کے نزاری اور یمن کے قحطانی افسران نے اس کے خلاف بغاوت کی کوشش کی۔ عُیَیْنَہ نے بغاوت کو کچل کر اس میں شریک تمام لوگوں کو بے دریغ موت کی نیند سلا دیا۔ اس سے عرب قبائل کی باہمی عصبیت مزید بھڑک اٹھی۔

عُیَیْنَہ نے اپنی بدفہمی کا مزید ثبوت یہ دیا کہ کچھ مدت بعد اس نے خلیفہ منصور کے خلاف بغاوت کر دی۔[1]

خلیفہ منصور نے یہ سن کر عمر بن حفص کو جو اپنی دلیری کے باعث ''ہزار مرد'' کہلاتا تھا سندھ بھیج دیا۔ وہ ۱۴۲ھ میں سندھ پہنچا اور گیارہ ماہ کے محاصرے کے بعد منصورہ کو مسخر کر کے عُیَیْنَہ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے عُیَیْنَہ کو منصور کے پاس روانہ کر دیا مگر وہ راستے میں پہرے داروں کو چکمہ دے کر بھاگ نکلا۔ وہ بجستان جانا چاہتا تھا مگر ''رخج'' کے مقام پر بعض یمانی عربوں نے اسے قتل کر دیا اور اس کا سر دار الخلافہ لے جا کر منصور کو پیش کر دیا۔[2]

عمر بن حفص بن ابی صفرہ عتکی، عرف ہزار مرد: (۱۴۲ھ تا ۱۵۱ھ)

عمر بن حفص بن ابی صفرہ نے نو سال تک سندھ اور ہندوستانی اضلاع پر کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ اس دور میں خلافتِ عباسیہ کی دارو گیر سے بچنے کے لیے مختلف فرقوں کے پیشوا سندھ کا رُخ کر رہے تھے۔ ۱۴۸ھ میں خوارج کے ایک داعی حسان بن مجالد ہمدانی نے بحری راستے سے سندھ آ کر اسے اپنا مرکز بنانے کی کوشش کی مگر عمر بن حفص نے اس کی دال نہ گلنے دی اور وہ عراق واپس چلا گیا۔[3]

اسی زمانے میں خلیفہ منصور کو سادات کے خروج سے پالا پڑا جس کی قیادت محمد نفسِ زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کر رہے تھے۔ اس دوران محمد نفسِ زکیہ نے اپنے بیٹے عبداللہ اشتر کو سندھ بھیج دیا تا کہ عمر بن حفص کو جو سادات کا گرویدہ تھا، ساتھ ملا کر عباسیوں کے خلاف محاذ کھولا جائے۔ عمر بن حفص نے عبداللہ اشتر کی دعوت قبول کر لی اور عباسیوں کے خلاف خروج کا فیصلہ کر لیا مگر اچانک اسے محمد نفسِ زکیہ کے مدینہ منورہ میں قتل کی اطلاع ملی جس پر وہ رک گیا۔

اس نے عبداللہ اشتر کو خفیہ طور پر ایک ہندو راجا کی ریاست میں ٹھہرا دیا۔ بہت سے زیدی شیعہ یہ سن گن ملنے پر دور دراز سے وہیں چلے آئے۔ انھی لوگوں نے ہندوستان میں پہلی بار تشیع کا بیج بویا۔

---

① الکامل فی التاریخ: ۵/ ۹۲ ..... نزاری قبیلہ نزار بن معد بن عدنان کی طرف منسوب ہے۔ درجنوں عرب قبائل کے اجداد، ربیعہ اور مضر نزار ہی کی اولاد تھے۔ قحطان، بنو عدنان کے بالمقابل عرب قبائل کی دوسری جڑ ہے۔ قحطانی زیادہ تر یمن میں آباد ہوئے اس لیے یمانی قبائل قحطانی ہیں۔

② تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۴۳۳؛ تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۱۴؛ تاریخ الطبری: ۷/ ۵۱۱، ۵۱۲ ③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۴۸ھ

۱۵۱ھ میں خلیفہ منصور کو یہ راز معلوم ہو گیا۔ اس نے عمر بن حفص کی جگہ ہشام بن عمرو کا تقرر کر دیا۔ ①

ہشام بن عمرو تغلبی: (۱۵۱ھ تا ۱۵۷ھ)

منصور نے ہشام بن عمرو کو سندھ کی امارت سونپتے ہی پہلا حکم یہ دیا کہ عبداللہ اشتر کو گرفتار کرو مگر ہشام بن عمرو دلی طور پر سادات کا طرف دار تھا لہٰذا اس معاملے کو ٹالتا رہا۔ بد قسمتی سے کچھ مدت بعد اس کے بھائی سُفَیح کا ایک دن عبداللہ بن اشتر کے قافلے سے آمنا سامنا ہو گیا۔ سُفَیح نے حملہ کر کے ان سب کو قتل کر دیا۔ ہشام بن عمرو کو یہ اطلاع ملی تو اسے بہت صدمہ ہوا مگر اس کے بھائی نے جو کچھ کیا تھا، وہ عین خلیفہ منصور کی مرضی تھی، اس لیے ہشام اپنے بھائی کو کچھ نہ کہہ سکا۔ دربار خلافت میں یہ خبر بڑی مسرت کے ساتھ سنی گئی۔ ساتھ ہی حکم بھیجا گیا کہ پڑوسی ہندو راجا کی ریاست پر حملہ کیا جائے کیوں کہ عبداللہ اشتر کے اہل وعیال ابھی تک وہیں ہیں۔ ہشام نے خواہی نخواہی ہندو راجا کی ریاست پر حملہ کیا جس میں راجا مارا گیا۔ عبداللہ اشتر کے اہل وعیال جو راجا کی پناہ میں تھے، گرفتار کر کے دربار خلافت بھیج دیے گئے جہاں سے انہیں ان کے آبائی شہر مدینہ منورہ بھیج دیا گیا۔ ②

اس جھنجھٹ سے فارغ ہو کر ہشام بن عمرو نے مزید فتوحات پر توجہ دی۔ قندابیل خلفائے راشدین کے دور سے سندھ یا سرحدات ہند میں شامل سمجھا جاتا رہا تھا مگر دولتِ اُمویہ کے زوال کے بعد وہاں عرب امراء نے خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ ہشام بن عمرو فوج کشی کر کے قندابیل کو ایک بار مرکزِ خلافت کے ماتحت لانے میں کامیاب ہو گیا جس کے بعد باغی عرب امراء کو وہاں سے جلاوطن کر دیا گیا۔ ③

ملتان بھی اسلامی ریاست ہوتے ہوئے مرکزِ خلافت سے الگ ہو چکا تھا اس لیے ہشام بن عمرو کو مشیروں نے وہاں حملے کا مشورہ دیا۔ ہشام اپنے بھائی بسطام کو نائب بنا کر ملتان پر حملہ آور ہوا اور اسے از سر نو فتح کیا۔ ④

پھر اس کی فوجیں سرحداتِ کشمیر تک جا پہنچیں اور وہاں سے بکثرت مالِ غنیمت، غلام اور باندیاں لے کر آئیں۔ ⑤

ان فتوحات کے بعد ہشام کو گجرات کی تسخیر کا خیال آیا۔ پہلے اس نے عمرو بن جمل نامی افسر کو کشتیوں کا بیڑا دے کر وہاں بھیجا۔ غالباً یہ فوج فقط جائزہ لینے کے لیے گئی تھی۔ ⑥

اس کے بعد وہ کشتیوں کا ایک بیڑا تیار کر کے دریائے سندھ کے راستے بحیرۂ عرب پہنچا اور گجرات کی بندرگاہ

---

① الكامل في التاريخ: ۱۶۶/۵، ۱۶۷؛ تاريخ الطبري سنة ۱۵۱ھ؛ المنتظم لابن الجوزي، سنة ۱۵۱ھ؛ تاريخ خليفة بن خياط: ص ۳۳۳

② الكامل في التاريخ: ۱۶۷/۵، ۱۶۸ ③ فتوح البلدان: ص ۴۲۷

④ علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرے خیال میں ملتان کے لوگ محمد بن قاسم کے بعد ۱۱۱ھ میں ہی خود مختار ہو گئے تھے اور چونکہ برہمن آباد پر بے محمود دوبارہ قابض ہو گیا تھا اس لیے ملتان پر دوبارہ فوج کشی نہ ہو سکی اور اسی لیے تاریخ میں ہشام سے پہلے اس کا کوئی ذکر نہیں آتا۔'' (تاریخ سندھ: ص ۱۵۷ حاشیہ)

⑤ فتوح البلدان ص ۴۲۷ ⑥ فتوح البلدان ص ۴۲۷

قندھار (گندھارا) پر حملہ کیا جو بدھ مت کا بڑا مرکز تھا۔ ہشام بن عمرو نے بدھ کا مجسمہ پاش پاش کر دیا اور وہاں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ ①

ہشام بن عمرو بڑا قابل حکمران تھا۔ اس کے زمانے میں ہر طرف امن اور برکت رہی۔ ۱۵۷ھ میں اسے معزول کر دیا گیا۔ جب وہ واپس دارالخلافہ بغداد پہنچا تو اس نے خلیفہ منصور کی خدمت میں اس قدر بیش بہا تحائف اور نوادرات نذر کیے جو اس سے پہلے کسی اُمیر نے پیش نہیں کیے تھے۔ ②

معبد بن خلیل: (۱۵۷ھ تا ۱۶۰ھ)

ہشام بن عمرو کے بعد منصور عباسی نے سندھ کی ولایت معبد بن خلیل کے سپرد کر دی۔ وہ خلیفہ مہدی کے دور تک اس عہدے پر رہا۔ ۱۶۰ھ میں اس کی وفات ہوگئی۔ ③

مہدی عباسی کے دور میں

اب خلیفہ مہدی کا دور شروع ہوا جو دس سال تک رہا یعنی ذوالحجہ ۱۵۸ھ سے محرم ۱۶۹ھ تک۔ ان دس سالوں میں سندھ کے چھے اُمرا تبدیل ہوئے:

محمد بن معبد بن خلیل: (۱۶۰ھ)

معبد بن خلیل کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد بن معبد امیر بنا مگر مہدی نے جلد ہی اسے معزول کر دیا۔ ④

روح بن حاتم: (۱۶۰ھ)

مہدی نے اپنے وزیر ابوعبید اللہ کے مشورے سے سندھ کے نئے امیر کے طور پر روح بن حاتم مہلبی کا تقرر کر دیا۔ ⑤ مگر اس دوران دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر آباد جاٹوں نے شورش برپا کر دی جس پر روح بن حاتم قابو نہ پاسکا۔ چنانچہ اسے برطرف کر دیا گیا۔ ⑥

بُسطام بن عمرو: (۱۶۰ھ)

اب سندھ کی امارت بسطام بن عمرو کو دے دی گئی جو خلیفہ منصور کے دور کے کامیاب ترین اُمیر سندھ ہشام بن عمرو کا بھائی تھا اور اس کی مہمات ملتان کے دوران سندھ کا نائب حاکم بھی رہا تھا، اس لحاظ سے وہ ایک تجربہ کار شخص تھا

---

① فتوح البلدان ص ۴۲۷؛ تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۱۲
② فتوح البلدان: ص۴۲۷؛ تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۱۲
③ تاریخ الطبری: ۸/ ۵۳، ۱۱۷
④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۴۴۱
⑤ تاریخ الطبری: ۸/ ۱۱۷
⑥ تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۳۶؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۴۴۱؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۶۰ھ؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۵۹ھ

تاہم کچھ ہی دنوں بعد اسے بھی برطرف کر دیا گیا۔[1]

روح بن حاتم:

بسطام بن عمرو کے بعد روح بن حاتم کو دوبارہ امیر بنا دیا گیا۔[2]

نصر بن محمد الاشعث خزاعی: (۱۶۱ھ)

روح کے بعد نصر بن محمد اشعث خزاعی کو یہ عہدہ دیا گیا۔ ابھی وہ عہدہ سنبھالنے سندھ پہنچا ہی تھا کہ پیچھے پیچھے اس کی معزولی کا فرمان چلا آیا۔[3]

محمد بن سلیمان اور عبدالملک بن شہاب: (۱۶۱ھ)

اب محمد بن سلیمان بن علی ہاشمی کو یہ عہدہ سونپ دیا گیا۔ اس امیر نے شاید گزشتہ امراء کا حال دیکھ کر خود سندھ جانے کی بھی زحمت نہ کی اور اپنی جگہ عبدالملک بن شہاب مسمعی کو نائب امیر کے طور پر سندھ بھیج دیا۔[4]

نصر بن محمد۔ دوبارہ: (۱۶۲ھ)

عبدالملک بن شہاب نے بیس دن بھی پورے نہ کیے تھے کہ دربار خلافت سے نصر بن محمد کو دوبارہ امارت بخشے جانے کا فرمان آن پہنچا۔ نصر بن محمد معزولی کے بعد سندھ کے پایہ تخت منصورہ سے روانہ ہو گیا تھا مگر ابھی وہ چھ فرسخ (اٹھارہ میل) دور ہی پہنچا تھا کہ اسے نیا فرمان ملا اور وہ واپس آ کر دوبارہ مسند حکومت پر بیٹھ گیا۔[5]

زبیر بن عباس: (۱۶۳ھ)

ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ مہدی عباسی کو خیال آیا کہ حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے زبیر بن عباس اس عہدے کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ انہیں امیر سندھ بنا کر روانہ کر دیا گیا۔[6]

سطیح بن عمرو تغلبی: (۱۶۳ھ تا ۱۶۵ھ)

مگر زبیر بن عباس کے سندھ کے پایہ تخت پہنچنے سے قبل فیصلہ تبدیل ہو گیا اور سطیح بن عمرو تغلبی کو یہ عہدہ دے دیا گیا۔ سطیح بن عمرو منصور کے دور کے امیر سندھ ہشام بن عمرو تغلبی کا بھائی تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح کچھ وقت گزار لیا۔[7]

ان امراء کے حالات، کارکردگی اور معزول ہونے کے اسباب کے بارے میں تاریخ بالکل خاموش ہے۔ البتہ

---

[1] تاریخ یعقوبی: ۱۳۶/۳؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۶۰ھ

[2] تاریخ الطبری: سنة ۱۶۰ھ

[3] تاریخ یعقوبی: ۱۳۶/۳؛ تاریخ الطبری: ۱۳۰/۸

[4] تاریخ یعقوبی: ۱۳۶/۳؛ تاریخ الطبری: ۱۳۰/۸

[5] تاریخ یعقوبی: ۱۳۶/۳؛ تاریخ الطبری: ۱۳۰/۸

[6] تاریخ یعقوبی: ۱۳۶/۳؛ تاریخ الطبری: ۱۳۰/۸

[7] تاریخ یعقوبی: ۱۳۶/۳

یعقوبی نے اس دور کے دو اہم بحرانوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

1. اس زمانے میں سندھ کے عرب امراء میں قبائلی عصبیت ابھر چکی تھی۔
2. ان ایام میں سندھ میں جاٹوں نے ایک آفت مچا رکھی تھی۔[1]

غالباً کچھ افسران کو ان مسائل پر قابو پانے میں ناکامی کے باعث معزول کیا گیا اور کچھ کو اتنا وقت ہی نہیں دیا گیا کہ وہ کچھ کر پاتے۔ محض بدظنی کی بناء پر انہیں تبدیل کر دیا گیا۔

لیث مولیٰ مہدی: (۱۶۵ھ تا ۱۷۴ھ)

مختلف اُمراء کو آزمانے کے بعد آخر میں مہدی نے اپنے غلام لیث کو سندھ کا امیر بنا کر بھیجا۔ اس نے خلیفہ مہدی سے ایک زبردست فوج منگوا کر جاٹوں کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائیاں کیں اور ان کی طاقت کو فنا کر کے رکھ دیا۔ اس کامیابی کے باعث اس نے طویل مدت تک حکومت کی اور مہدی کی وفات کے بعد ہارون الرشید کے دور تک سندھ کا امیر رہا۔[2]

خلیفہ مہدی کے دور خلافت میں ایک اہم کام یہ ہوا کہ سندھ، ہندوستان، خراسان اور چین کے بادشاہوں کو تبلیغ اسلام کی گئی اور اس بارے میں خطوط بھیجے گئے۔ اس کے نتیجے میں پندرہ حکمرانوں نے اسلام قبول کیا جن میں ایک سندھ اور ایک ہندوستان کا راجا بھی شامل تھے۔[3]

ہارون الرشید کے دور میں

ہارون الرشید کے عاملین سندھ درج ذیل تھے:

سالم یونسی:

ہارون نے لیث مولیٰ مہدی کو معزول کر کے سالم یونسی کو امیر بنایا۔ یہ اچھا حاکم تھا مگر زیادہ مدت تک حکومت نہ کر سکا۔

اسحاق بن سلیمان ہاشمی: (۱۷۴ھ)

یہ بڑے پاکباز اور نیک بزرگ تھے۔[4] ۱۷۴ھ میں سندھ اور بلوچستان کے اُمیر بن کر آئے۔[5] ان کی سندھ

---

[1] تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۳۶

[2] تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۴۳۱، تاریخ الطبری: سنۃ ۱۶۱ھ، ۱۶۳ھ، تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۳۶

[3] تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۳۶
ان راجاؤں کے بارے میں کہیں کوئی تفصیل نہ مل سکی کہ وہ کون تھے اور کن علاقوں پر حکومت کرتے تھے؟ سندھ کے مختلف گوشوں میں قائم قدیم کتب خانوں میں صدہا مخطوطات موجود ہیں مگر ان پر تحقیق کر کے ان کی اشاعت پر کوئی ملکی یا غیر ملکی ادارہ توجہ نہیں دے رہا۔ اگر یہ مخطوطات شائع ہو جائیں تو اُمید ہے کہ ہمیں ان میں سندھ کی تاریخ کا بہت سا گمشدہ مل جائے گا۔

[4] تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۳۶

[5] تاریخ یعقوبی ۳/ ۱۳۶

سے معزولی کی تاریخ کسی نے درج نہیں کی مگر بہر حال دو تین سال انہوں نے ضرور حکومت کی تھی۔

طیفور بن عبداللہ بن منصور حمیری:

اسحاق بن سلیمان کے بعد طیفور بن عبداللہ حمیری کو سندھ کا والی بنایا گیا۔ اس کے تقرر کے بعد سندھ میں یمانی اور نزاری عصبیت مزید بھڑک اٹھی۔ ①

کثیر بن سلم:

حالات پر قابو پانے کے لیے سندھ کی حکومت سعید بن سلم بن قتیبہ کے نام کر دی گئی جس نے اسے اپنے بھائی کثیر بن سلم کے حوالے کر دیا۔ مگر کثیر ایک نالائق حاکم ثابت ہوا۔ ②

محمد بن عدی:

اب ہارون نے سندھ کو عیسیٰ بن جعفر بن منصور کے حوالے کر دیا۔ اس نے اپنی نیابت میں محمد بن عدی ثعلبی کو سندھ بھیج دیا۔ اس کے منصورہ آنے پر عرب قبائل ایک بار پھر دست و گریباں ہو گئے۔ محمد بن عدی نے یہ دیکھ کر ملتان کو اپنی ریاست بنانے کی کوشش کی مگر شکست کھا کر پسپائی سے دوچار ہوا۔ ③

ہارون نے اس کے بعد عبدالرحمٰن (غالباً عبدالرحمٰن بن عبدالملک بن صالح ہاشمی) کو اور پھر ایوب بن جعفر بن سلیمان کو یہ ذمہ داری سونپی۔ ④

داؤد بن یزید بن حاتم مُہلَّبی: (۱۸۴ھ تا ۲۰۵ھ)

ہارون الرشید سندھ میں اُمراء کے تبادلے سے اُکتا چکا تھا۔ آخر اس نے آلِ مُہلّب کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو اُموی دور میں سندھ اور خراسان سمیت مختلف اہم مقامات کے والی رہے تھے۔ ہارون نے ان کے ایک قابل فرد داؤد بن یزید کو چن لیا۔ اس نے سندھ جا کر بڑی ہمت اور تدبیر کے ساتھ وہاں کے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ کئی ماہ تک مخالف عرب قبائل سے جنگیں جاری رہیں۔ آخر کار سندھ مفسد عناصر سے پاک ہو گیا اور ولایتِ سندھ از سرِ نو مستحکم ہو گئی۔ ⑤

داؤد بن یزید مامون الرشید کے دور میں اپنی وفات تک اس عہدے پر رہا۔ اس کے دور میں ہر طرف امن و امان رہا۔ اکیس سال یہ ذمہ داری انجام دے کر ۲۰۵ھ میں سندھ میں اس کی وفات ہوئی۔ ⑥

✦✦✦

① تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۳۶
② تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۳۶
③ تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۳۶
④ تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۳۶
⑤ تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۳۶، ۱۳۷
⑥ نزھۃ الخواطر: ۱/ ۵۳

مامون الرشید کا زمانہ

بشر بن داؤد: (۲۰۵ھ تا ۲۱۳ھ)

داؤد بن یزید کی وفات کے بعد اس کا بیٹا بشر بن داؤد سندھ کا والی بنا۔ اس کا ابتدائی زمانہ اچھا گزرا۔ مگر آخر میں اس نے سندھ کا خراج بغداد بھیجنے میں کوتاہی شروع کردی۔[1]

مشہور یہ ہوگیا کہ بشر بغاوت کرچکا ہے۔ اس پر مامون نے ۲۱۳ھ میں غسان بن عباد کو سندھ کی ولایت کا پروانہ دے کر وہاں بھیج دیا۔ غسان کو وہاں پہنچ کر بغاوت کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے۔ بشر بن داؤد نے دربار خلافت کے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے عہدہ اس کے حوالے کردیا۔[2]

غسان بن عباد: (۲۱۳ھ تا ۲۱۶ھ)

غسان بن عباد نے تین سال حکومت کی اور اچھی کارکردگی دکھائی۔[3] سندھ میں اس نے ایک بار مور کا گوشت کھایا جو اسے اس قدر بھایا کہ جب تک وہ سندھ میں رہا موروں کا گوشت کھاتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے ایسا لذیذ گوشت پہلے نہیں کھایا۔[4]

موسیٰ بن یحییٰ برمکی: (۲۱۶ھ تا ۲۲۱ھ)

موسیٰ بن یحییٰ برمکی خاندان برمک کا چشم وچراغ تھا۔ اس کا باپ ہارون الرشید کے دور میں سلطنت کے سیاہ وسپید پر حاوی تھا مگر ہارون ہی کے دور میں برامکہ تمام عہدوں سے معزول کرکے قتل اور قید وبند کی نکبت میں ڈالے گئے۔

آخر مامون الرشید کے دور میں اس خاندان کے کچھ لوگوں کو دوبارہ متوسط قسم کے عہدے دیے گئے جن میں سے ایک موسیٰ بن یحییٰ برمکی بھی تھا۔ وہ امیر سندھ غسان بن عباد کا دستِ راست اور نہایت جنگجو سپاہی تھا۔

جب غسان بن عباد کو واپس بلایا گیا تو سندھ کے امور اسے سپرد کردیے گئے۔ اس کا دورِ حکومت بڑا پُرامن اور مستحکم گزرا۔ غسان کے دور میں سندھ کے راجاؤں کو منصورہ بلایا گیا تھا مگر ایک حاکم "راجہ بالا" (راج پال) نے انکار کردیا تھا۔ موسیٰ بن یحییٰ نے اس کے خلاف مہم جوئی کی۔ راجہ نے گرفتار ہونے کے بعد اپنی جان کے بدلے پانچ لاکھ درہم کی پیش کش کی مگر موسیٰ نے انکار کردیا۔ آخر راجہ قتل کردیا گیا۔[5]

موسیٰ بن یحییٰ کے دور میں سندھ میں کسی قسم کی بدامنی نہیں تھی۔ حکومتِ سندھ کی کامیاب حکمتِ عملی کے باعث نہ صرف ہمسایہ ہندو ریاستیں مناسب روابط رکھے ہوئے تھیں بلکہ حجازی اور نزاری عرب قبائل کو جو یمانی قبائل کے مخالف

---

① تاریخ الطبری سنة ۲۰۵ھ، والکامل فی التاریخ: سنة ۲۰۵ھ
② تاریخ یعقوبی: ص ۱۹۲، ۱۹۳
③ عیون الانباء فی طبقات الاطباء: ص ۲۲۰
④ تاریخ الطبری: ۲۱۳ھ
⑤ فتوح البلدان: ص ۴۲۸

تھے، قومی دھارے میں شامل کر رکھا تھا۔ اگرچہ کچھ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت نزاری اندر ہی اندر اپنی منتشر طاقت کو جمع کرنے میں مصروف اور مناسب موقع کے منتظر تھے۔

بنو عباس کے دورِ عروج کے آخری حکامِ سندھ

عمران بن موسیٰ بن یحییٰ برمکی: (۲۲۱ھ تا ۲۲۵ھ)

موسیٰ کی امارت کے دوران ۲۱۸ھ میں مامون الرشید وفات پا چکا تھا اور اب اس کا بھائی معتصم خلیفہ تھا۔ ۲۲۱ھ میں موسیٰ دنیا سے جاتے جاتے اپنے بیٹے عمران کو جانشین بنا گیا تھا۔ چونکہ موسیٰ کا دورِ حکومت اچھا گزرا تھا اس لیے خلیفہ معتصم عباسی نے اس کے بیٹے کو نیابت نامہ بھیج دیا۔ [1]

عمران بن موسیٰ نے جب سندھ کی حکومت سنبھالی تو بلوچستان میں بغاوتیں ابھر رہی تھیں۔ قندابیل (گندھاوا) کے پہاڑ پر ایک خودمختار مسلمان حاکم محمد بن خلیل نے حکومت قائم کر رکھی تھی۔ عمران بن موسیٰ نے چڑھائی کر کے اسے شکست دی اور قندابیل کو دوبارہ خلافتِ عباسیہ کے ماتحت کر دیا۔ عمران بن موسیٰ نے بلوچستان میں مستقل فوج ٹھہرانے کے لیے "بوقان" (بولان) میں ایک نیا شہر "البیضاء" کے نام سے تعمیر کرایا۔

ان دنوں "مید" گروہ کے قزاق دریائے سندھ کے ڈیلٹا سے ملتان تک جا بجا قابض تھے۔ عمران بن موسیٰ نے اس قوم کے خلاف فوج کشی کی۔ اس مہم میں تین ہزار مید قتل ہوئے۔ [2]

دشمن کے حملوں کی روک تھام کے لیے عمران بن موسیٰ نے اَروڑ (روہڑی) کے نزدیک دریائے سندھ کے کنارے قیام کیا۔ عمران نے یہاں ایک بیراج تعمیر کرایا جو "سکر المید" یعنی "مید بیراج" کے نام سے مشہور ہوا۔ [3]

مید قوم کا دوسرا مرکز ساحلِ سمندر کے علاقے تھے۔ عمران بن موسیٰ نے وہاں فوج کشی کے لیے زیادہ تیاری کی اور

---

① فتوح البلدان: ص ۳۱۹

② فتوح البلدان: ص ۳۲۸

③ وسكر سكرا يعرف بسكر الميد وعسكر عمران على نهر الرور. (فتوح البلدان: ص ۳۲۸)

ملحوظہ: علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے "سکر المید" سے پل مراد لیا ہے۔ فرماتے ہیں: "پھر عمران برمکی نے ایک پل تیار کرایا جس کا نام سکر المید (مید کا پل) رکھا۔" نیز حاشیے میں تحریر فرماتے ہیں: "بہت ممکن ہے کہ آج جس مقام کو "سکھر" کہتے ہیں یہ وہی مقام ہو جس کو "سکر المید" کہتے تھے۔ پل وغیرہ تو برباد ہو گئے اور نام تخفیف ہو کر "سکر" اور پھر "سکر" سے "سکھر" ہو گیا ہو۔" (حاشیہ تاریخ سندھ، ص ۸۲)

راقم عرض کرتا ہے کہ "سکر" کا معنی ایسا عارضی بند ہے جو دریا کے پانی کو روکنے اور اسے نہروں میں تقسیم کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے جسے انگریزی میں "بیراج" (Barrage) کہا جاتا ہے۔ وسَكَرَ النهرَ يَسْكُرُه سَكْرًا: سدّ فاه وكلُّ شقٍّ سُدّ، فقد سُكِر، والسِّكْرُ ما سُدَّ به. (لسان العرب: ج ۴ ص ۳۷۵) اگرچہ بیراج سے پل کا کام بھی لیا جاتا ہے مگر یہ فائدہ ثانوی ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ "سکر" کا اصل معنی "بیراج" ہے اور اس مقام پر تیسری صدی ہجری میں بیراج بنایا گیا تھا جو بعد میں تباہ ہو گیا۔ عین ممکن ہے کہ اس بیراج کی قریبی آبادی کو "سکر" یا "سکھر" کہا جانے لگا ہو اور عجب نہیں کہ برطانوی حکومت کا تعمیر کردہ "سکھر بیراج" (جو ۱۹۲۳ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۲ء میں مکمل ہوا تھا) اسی مقام پر یا اس کے قریب تعمیر ہوا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

مید قوم کا دوسرا مرکز ساحل سمندر کے علاقے تھے۔ عمران بن موسیٰ نے وہاں فوج کشی کے لیے زیادہ تیاری کی اور پہلے جاٹوں کو مسخر کر کے ان پر جزیہ مقرر کیا۔

جاٹوں کو منظم کرنے اور ان کے سرداروں کو فوج کا حصہ بنانے کے بعد عمران بن موسیٰ نے مید قوم کے سمندر کے ساحل پر واقع ٹھکانوں کا رخ کیا۔ میدوں کے ٹھکانے جنگل میں ایک ندی کے ساتھ تھے۔ اسی ندی سے انہیں میٹھا پانی میسر آتا تھا۔ عمران بن موسیٰ نے جاٹوں سے کھدائی کرا کے سمندر کے پانی کو اس ندی سے ملا دیا جس سے دشمن کو سخت اذیت ہوئی۔ اس کے بعد عمران نے ان کے خلاف چھاپہ مار حملے شروع کیے اور انہیں بہت نقصان پہنچایا۔[1]

عمران کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا کہ خود سندھ کے نزاری اور یمانی عربوں میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ چونکہ سندھ میں اُمراء کی پالیسی نزاریوں کو دبائے رکھنے کی تھی، اس لیے عمران نے یمانی گروہ کا ساتھ دیا مگر تب تک نزاری بہت قوت پکڑ چکے تھے۔ چنانچہ جنگ کے نتیجے میں عمران بن موسیٰ نزاری گروہ کے سردار عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔[2] عمران کے دور میں سندھ کا خراج جو دار الخلافہ کو بھیجا جاتا تھا، دس لاکھ درہم سالانہ تھا۔[3]

۲۲۵ھ میں عمران بن موسیٰ کے قتل کے بعد سندھ میں حالات کشیدہ ہو گئے تھے اور جگہ جگہ قلعہ داروں اور صوبہ داروں نے خود مختاری اختیار کر لی تھی۔ باج گزار ہندو راجا بھی باغی ہو گئے تھے۔[4]

عنبسہ بن اسحاق ضبی: (۲۲۵ھ تا ۲۳۳ھ)

عمران کے قتل کے بعد سندھ کی حکومت عنبسہ بن اسحاق کو سونپی گئی۔ اس نے سندھ آ کر بڑی حکمت کے ساتھ سابق امیر کے قتل سے ابھرنے والے فتنوں کو دبایا۔ تمام باغی سرداروں نے اس کے دربار میں حاضر ہو کر اظہارِ اطاعت کیا۔ سب سے بڑا باغی سردار عمر بن عبدالعزیز ہباری بھی جس نے گزشتہ امیر کو قتل کیا تھا، ساکت رہا۔ دراصل ہباری کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور اس پر ہاتھ ڈالنا حکومت کے لیے پریشان کن ہو سکتا تھا۔ یہ نئے امیر کی سمجھداری تھی کہ اس نے معاملے کو خوش اسلوبی سے سنبھال لیا یوں اس کا دور پُر امن رہا۔ البتہ عثمان نامی ایک سردار بدستور بغاوت پر مصر رہا جس کے باعث عنبسہ کو اس کے خلاف چڑھائی کرنا پڑی۔[5]

عنبسہ کو اس زمانے میں مجرموں کی سرزنش اور تادیب کے لیے ایک خاص جیل خانہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔[6] اس مقصد کے لیے اس نے دیبل شہر کو منتخب کیا جہاں عربوں کا تسلط انتہائی مستحکم تھا اور کسی بھی وقت بصرہ سے وہاں پر کمک منگوائی جا سکتی تھی۔ دیبل میں جیل خانے کے لیے اگر کوئی نئی عمارت بنائی جاتی تو اس پر خاصا

---

[1] فتوح البلدان: ص ۴۲۸
[2] فتوح البلدان: ص ۴۲۸
[3] المسالک والممالک لابن خرداذبہ: ص ۵۷
[4] تاریخ یعقوبی: ۲۱۳/۳
[5] تاریخ یعقوبی: ۲۱۳/۳
[6] فتوح البلدان: ص ۴۴۱

خرچ آتا۔ اس لیے عنبسہ نے دیبل کے مشہور مندر کے مینار کے بالائی حصے کو گرا دیا اور چھت ڈال کر اسے جیل خانہ بنادیا۔ یوں کسی خاص خرچ کے بغیر خطرناک مجرموں کو رکھنے کے لیے ایک نہایت محفوظ اور مضبوط جگہ تیار ہوگئی۔ مینار کے بالائی حصے کو گرا کر جو پتھر حاصل ہوا، وہ اس قدر تھا کہ اس سے شہر کی تجدید نو کا کام شروع کر دیا گیا۔[1]

۲۳۳ھ میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ عنبسہ کو مرکزِ خلافت سے اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے سندھ کی امارت از خود چھوڑ کر خلیفہ متوکل کے پاس جانا پڑا۔[2]

مؤرخین لکھتے ہیں کہ عنبسہ بن اسحاق نہایت پابندِ صوم وصلوٰۃ تھا۔ چھاؤنی سے پاپیادہ مسجد جا کر باجماعت نمازیں ادا کیا کرتا تھا۔ اس کا عدل وانصاف مثالی تھا۔ فریادیوں کی دادرسی کرتا اور ظالموں سے قطعاً کوئی رعایت نہ برتتا۔ رمضان کے مہینے میں خود گلی کوچوں میں گھوم پھر کر لوگوں کو سحری کے لیے جگایا کرتا تھا۔[3]

ہارون بن ابی خالد المروزی: (۲۳۲ھ تا ۲۴۰ھ)

متوکل عباسی نے عنبسہ کی جگہ ہارون بن ابی خالد کا تقرر کیا جو عنبسہ کی طرح محتاط حکمتِ عملی ملحوظ نہ رکھ سکا اور وہ سندھ میں جاری عرب قبائل کی کش مکش کا حصہ بن گیا۔ آٹھ سال حکومت کرنے کے بعد وہ یمانی اور نزاری گروہوں کی کش مکش کا حصہ بن کر سندھ میں قتل ہوگیا۔[4]

اس صورتحال میں نزاری گروہ کے قائد عمر بن عبدالعزیز ہباری نے سندھ میں عروج حاصل کیا اور خلیفہ متوکل نے اسے سندھ کا والی تسلیم کر لیا۔ متوکل کی زندگی کے بقیہ سات سالوں میں عمر بن عبدالعزیز ہباری سندھ کا امیر رہا۔[5]

۲۴۷ھ میں متوکل کے قتل کے بعد یکدم ہر طرف خود مختاری کی لہریں امنڈ پڑیں اور سندھ بھی عباسیوں کی گرفت سے نکل گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ۲۵۷ھ میں عباسی خلیفہ المعتمد کے نائب موفق نے سندھ کی ولایت بجستان کے نئے طالع آزما یعقوب بن لیث صفاری کے لیے تسلیم کر لی۔[6]

۲۶۵ھ میں خلافتِ بغداد نے یعقوب بن لیث صفاری کی وفات کے بعد اس کے جانشین عمرو بن لیث کو سندھ کا والی مان لیا۔[7]

✦✦✦

---

① فتوح البلدان: ص ۳۲۱
② تاریخ یعقوبی: ۲۱۹/۳
③ کتاب الولاۃ للکندی: ص ۱۵۱
④ فتوح البلدان: ص ۳۲۱؛ نزھۃ الخواطر: ۵۸،۵۶/۱؛ تاریخ یعقوبی: ۲۲۱/۳
⑤ تاریخ یعقوبی: ۲۲۱/۳
⑥ تاریخ الطبری: ۳۷۹/۹؛ الکامل فی التاریخ: ۲۹۸/۹
⑦ تاریخ الطبری: سنۃ ۲۶۵ھ؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۶۵ھ۔
عمرو بن لیث کے حکمران بننے کے وقت بھی بغداد میں عباسی خلیفہ معتمد کا دور تھا۔

سندھ کی خود مختار حکومتیں

سندھ بذاتِ خود ایک بہت وسیع سرزمین ہے جو اپنی الگ خصوصیات کی بناء پر پہچانی جاتی ہے۔ تیسری صدی ہجری کے مؤرخ ابن خرداذبہ (م ۲۸۰ھ) کے مطابق "سندھ" کے اضلاع میں دیبل اور نیرون کے علاوہ پنجاب کا شہر ملتان اور بلوچستان کے شہر مکران، خضدار، قندابیل اور قیقان بھی شامل تھے، نیز گجرات کے شہر سندان، بھڑوچ، منڈل اور کھمبایت بھی اس کے ملحقات میں شمار ہوتے تھے۔[1]

یہ تمام علاقے اُموی دور میں فتح کر لیے گئے تھے۔ بعد میں کچھ بغاوتوں کی بناء پر عباسی خلفاء: منصور اور مہدی کے دور میں انہیں ازسرِ نو فتح کیا گیا۔ مسلمانوں نے اس سرزمین کو ایمان وعرفان اور علم وحکمت سے آباد کیا۔ اس دور میں یہاں منصورہ اور دیبل جیسے شہر کوفہ اور بصرہ کی ہمسری کرنے لگے تھے۔ یہاں کی تجارتی واقتصادی سرگرمیوں کا یہ حال تھا کہ تجارتی قافلے ایک طرف خشکی کے راستے سے خراسان، وسطِ ایشیا، ایران اور ایشیائے کوچک تک جاتے تھے جبکہ دوسری طرف سمندر سے ہو کر بصرہ، بغداد، یمن اور مصر کے ساحلوں تک جا پہنچتے تھے۔ اس دور کے اہلِ علم یہاں کے ایک ایک شہر اور قریے سے واقف تھے۔ وہ ان تمام مقامات کی تاریخ، ان کے محلِ وقوع، دوسرے شہروں سے مسافت اور ان کے مشاہیر کے حالات نقل کرتے رہے۔ یہاں علماء وفقہاء کی کثرت کا یہ حال تھا کہ اسماء الرجال کی کتب میں سندھ کے رُواۃ، محدثین، فقہاء اور حکماء کا ذکر اسی طرح ملتا ہے جیسا کہ بغداد، دمشق اور قرطبہ کے ماہرینِ علوم وفنون کا۔ سندھ میں مسلمانوں کے بڑے مراکز یہی دو شہر: منصورہ اور دیبل تھے، جہاں اُموی یا عباسی خلفاء کے امیر تعینات ہوتے تھے۔

تیسری صدی ہجری میں عباسی خلفاء کے کمزور ہونے کے بعد مرکز گریزی کی تحریکیں زور پکڑ گئیں اور یوں عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں درجنوں آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں جن میں جزیرۃ العرب اور عراق کی دولتِ قرامطہ، ایران کی دولتِ بنو بُویہ اور افریقہ کی دولتِ بنو عبید سب سے نمایاں تھیں۔ یہ حکومتیں نہ صرف غالی شیعہ تھیں بلکہ عباسی خلفاء کی سخت مخالف بھی تھیں۔ ان کے علاوہ وسطِ ایشیا اور خراسان میں بھی متعدد حکومتیں بنتی اور ختم ہوتی رہیں جن کے بانی زیادہ تر عجمی تھے۔ اسی طرح سندھ میں بھی آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں تاہم ان میں سے اکثر خلفائے بنو عباس سے رسمی وفاداری نبھاتی رہیں جبکہ بعض ریاستیں مرکزِ خلافت سے بالکل لاتعلق تھیں۔

---

[1] المسالک والممالک: ص ۵۷، ۵۸

ان میں درج ذیل چھ حکومتیں سب سے اہم تھیں:

نمبر	حکومت	سیاسی مرکز	زمانہ	حیثیت
۱	دولتِ ماہانیہ	سنجان، گجرات	۱۹۸ھ تا ۲۲۷ھ	عباسی خلافت سے وابستہ
۲	دولتِ ہباریہ	منصورہ، سندھ	۲۱۷ھ تا ۴۱۶ھ	عباسی خلافت سے وابستہ
۳	دولتِ سامیہ	ملتان	۲۸۰ھ تا ۳۷۰ھ	عباسی خلافت سے وابستہ
۴	دولتِ اسماعیلیہ	ملتان	۳۷۵ھ تا ۳۸۴ھ پھر، ۳۹۳ھ تا ۴۰۱ھ	بنوعبید (مصر) سے وابستہ
۵	دولتِ معدانیہ	مکران، بلوچستان	۳۳۰ھ تا ۴۷۱ھ	آزاد
۶	دولتِ مغلیہ	مشکی، بلوچستان	۳۳۰ھ تا ۴۷۱ھ	آزاد

دولتِ ماہانیہ، سنجان (گجرات)

سنجان کو "سندان" بھی کہا گیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے مطابق یہ مقام کچھ، کاٹھیاوار، تیسری سمت راجپوتانہ اور سندھ کے درمیان واقع تھا۔[1]

مگر قاضی اطہر مبارک پوری مرحوم کے مطابق سندان بمبئی سے شمال کی جانب ۱۴۵ کلومیٹر اور سورت سے جنوب کی طرف ۱۱۸ کلومیٹر کی مسافت پر واقع ایک ساحلی قصبہ ہے جسے آج کل "سنجان" کہا جاتا ہے۔ اب اس کی حیثیت ایک معمولی ریلوے اسٹیشن کی رہ گئی ہے جبکہ مسلم دور میں یہ ایک عظیم الشان تجارتی بندرگاہ اور علم وفضل کا مرکز تھا۔[2]

دولتِ ماہانیہ کا بانی فضل بن ماہان:

سندان کو مامون الرشید عباسی کے دور میں فضل بن ماہان نے، جو بنو سامہ کا آزاد کردہ غلام تھا، فتح کیا اور مامون کی خدمت میں ہدیے کے طور پر ایک ہاتھی بھیج کر دولتِ عباسیہ کی نیابت تفویض کیے جانے کی درخواست کی جسے مامون الرشید نے قبول کر لیا۔ فضل بن ماہان نے یہاں جامع مسجد تعمیر کرائی جہاں جمعہ وعیدین کے خطبوں میں مامون الرشید کے لیے دعا کی جاتی تھی۔[3] یہاں مسلمان اور ہندو مل جل کر رہتے تھے۔ یہاں جامع مسجد بھی تھی اور ہندوؤں کا مندر بھی۔ مقامی لوگ لمبی زلفیں رکھتے تھے اور اکثر فقط ایک لنگی میں ملبوس رہتے تھے کیوں کہ یہاں کی آب وہوا گرم تھی۔[4]

یہاں بکثرت چاول کی کاشت کی جاتی تھی۔[5] پیداوار میں ناریل، کیلے، شہد اور آم قابلِ ذکر تھے۔ البتہ کھجوریں یہاں پیدا نہیں ہوتی تھیں۔[6] یہاں کے جنگلات ساگوان کی بہترین لکڑی کے لیے مشہور تھے۔[7] یہاں کی مرچ بھی دنیا بھر میں پسند کی جاتی تھی۔[8]

+++

---

[1] تاریخ سندھ، از علامہ سید سلیمان ندوی: ص ۱۷۹، ۱۸۰
[2] ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں: ص ۵۳
[3] فتوح البلدان: ص ۳۲۸، ۳۲۹
[4] حدود العالم من المشرق الی المغرب: ص ۸۳
[5] احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم للمقدسی: ص ۴۸۱
[6] المسالک و الممالک للاصطخری: ص ۱۷۶
[7] المسالک والممالک لابن خرداذبہ: ص ۶۲
[8] المسالک والممالک لابن خرداذبہ: ص ۱۷

محمد بن فضل:

فضل بن ماہان کے بعد اس کا بیٹا محمد بن فضل اس ریاست کا حاکم بنا۔ اس کے دور میں اس ریاست کی قوت عروج پر تھی۔ اس کا بحری بیڑا سواحل ہندوستان کے مضبوط ترین بحری بیڑوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بحیرۂ عرب پر قزاقوں کی اجارہ داری تھی جو آتے جاتے جہازوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ محمد بن فضل نے ان کے خلاف ایک بڑی مہم شروع کی جس کی ابتداء پر وہ ستر بحری جہازوں کا بیڑا لے کر قزاقوں کی سرکوبی کے لیے نکلا اور ان کا ایسا قلع قمع کیا کہ پھر وہ ایک زمانہ دراز تک سر نہ اٹھا سکے۔

اس فتح کے بعد محمد بن فضل نے اپنی ریاست کی حدود کی توسیع کی اور "فالی" (پالی تھانہ) کو بھی مسخر کرلیا۔[1]

مگر عین اس وقت جبکہ محمد بن فضل کی قیادت میں دولتِ سندان تیزی سے وسیع اور خوشحال ہو رہی تھی، اس کا بھائی ماہان بن فضل اقتدار کے لالچ میں اس کا مخالف بن گیا اور اس نے بھائی کی عدم موجودگی میں بغاوت کرکے پایۂ تخت پر قبضہ کرلیا۔[2]

+++

ماہان بن فضل:

اس وقت تک خلیفہ مامون الرشید کی وفات ہو چکی تھی اور اس کی جگہ معتصم باللہ مسند نشین ہو چکا تھا۔ ماہان بن فضل نے اس سے روابط قائم کرکے خود کو مرکزِ خلافت کا وفادار باور کرایا اور خلیفہ کی خوشنودی کے لیے ساگوان کی ایسی لمبی چوڑی اور عمدہ لکڑی ہدیہ میں بھیجی کہ اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی تھی۔

تاہم ماہان بن فضل اپنی رعایا کو مطمئن نہ رکھ سکا اور کچھ مدت بعد مقامی ہندو افسران نے بغاوت کرکے اسے تخت سے اتار دیا اور سولی دے دی۔ اس کامیابی کے بعد ہندو افسران نے خود سندان پر قبضہ کرلیا۔ اگرچہ انہوں نے خلافت بنو عباس سے کشیدگی سے بچنے کے لیے مقامی مسلمانوں کے ساتھ رواداری کا رویہ رکھا اور جامع مسجد کو ان کے لیے کھلا رہنے دیا مگر اس اکھاڑ پچھاڑ کے نتیجے میں "دولتِ اسلامیہ سندان" کا خاتمہ ہوگیا۔[3]

دولتِ سندان کی کل مدت لگ بھگ ۲۹ سال تھی۔ اس کا آغاز مامون کے دور میں اور خاتمہ معتصم باللہ کے زمانے میں ہوا۔

+++

---

① فتوح البلدان: ص ۳۲۸، ۳۲۹....
قاضی اطہر مبارکپوری مرحوم کی تحقیق کے مطابق پالی تھانہ "سوراشٹر" میں گھوگہ بندرگاہ کے قریب ایک پہاڑ پر واقع قلعے کا نام ہے۔ (ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ص ۳۴)

② فتوح البلدان: ص ۳۲۸، ۳۲۹

③ فتوح البلدان: ص ۳۲۸، ۳۲۹

دولتِ ہبّاریہ، منصورہ

تیسری صدی ہجری میں سندھ پر عباسیوں کی گرفت کمزور دیکھ کر ایک نزاری قریشی سردار عمر بن عبدالعزیز ہبّاری نے منصورہ کو مرکز بنا کر اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی جو ''دولتِ ہبّاریہ'' کہلائی۔ یہ حکومت ۲۴۰ھ سے لگ بھگ ۴۰۱ھ تک یعنی ڈیڑھ صدی سے زائد مدت تک قائم رہی۔ ①

بنوہبّار کے جدِ امجد ہبّار بن اسود رضی اللہ عنہ نامی صحابی تھے۔ وہ قریش کے قبیلہ بنو اسد سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلام لانے سے پہلے انہی کے ہاتھوں سیدہ زینب رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ ہجرت کرتے ہوئے نیزے کا زخم لگا تھا۔ فتح مکہ کے بعد ہبّار بن اسود نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر توبہ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے مثال رحمت کا معاملہ فرماتے ہوئے انہیں معاف کر دیا۔ ہبّار بن اسود رضی اللہ عنہ اسلام لا کر ثابت قدم رہے۔ ②

سندھ کی فتوحات کے زمانے میں ہبّار بن اسود رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے کچھ لوگ یہاں آ بسے۔ ہبّار کے پڑپوتے منذر بن زبیر (بن عبدالرحمن بن ہبّار) ان لوگوں میں شامل تھے جو دوسری صدی ہجری کے آغاز میں سندھ کے امیر حکم بن عوانہ کلبی کے ساتھ سندھ آئے تھے۔ ③

عمر بن عبدالعزیز ہبّاری کا ظہور:

دولتِ بنو عباس لگ بھگ سوا صدی تک پوری آب و تاب سے دنیا کے افق پر چھائی رہی مگر تیسری صدی ہجری کے وسط میں اسے گہن لگ گیا۔ یہ خلیفہ واثق عباسی کا دور تھا جس میں سندھ کے نزاری اور یمانی عرب افسران کے مابین قبائلی رقابت بہت بڑھ چکی تھی۔ اس کش مکش میں بنوہبّار کے ایک افسر عمر بن عبدالعزیز بن منذر ہبّاری کا ظہور ہوا جس کا تعلق سندھ کے شہر ''بانیہ'' سے تھا۔ ④

عمر بن عبدالعزیز ہبّاری نے نزاریوں کا ساتھ دیا۔ دوسری طرف سندھ کا امیر عمران بن موسیٰ صلح و صفائی کرانے کی بجائے فریق بن کر یمانیوں کا سرپرست بن گیا۔ آخر فریقین کے اسی قتل و قتال میں عمران بن موسیٰ مارا گیا۔ ⑤

---

① فتوح البلدان: ص ۴۴۰ تا ۴۴۷ ② الاستیعاب: ۳/۱۵۳۶؛ الاصابۃ: ۶/۴۱۱ تا ۴۱۳

③ فتوح البلدان: ص ۴۲۸

④ المسالک والممالک للاصطخری: ص ۱۷۶۔

یہ چھوٹا سا شہر دارالحکومت منصورہ سے کچھ فاصلے پر جنوب کی سمت دریائے سندھ کے شرقی کنارے پر آباد تھا۔ (نزہۃ المشتاق: ص ۱۷۰)

⑤ فتوح البلدان: ص ۴۲۸

اس فتح نے عمر بن عبدالعزیز ہباری کو نزاری عربوں میں بہت مقبول بنا دیا۔ تاہم کئی سال تک عمر بن عبدالعزیز ہباری نے اپنی خود مختاری کا اعلان نہیں کیا۔ اس کے باوجود اس کی طاقت اور حیثیت اس قدر تھی کہ جب بھی عباسیوں کے کسی والی کا سندھ پر تقرر ہوتا تو وہ والی پہلے آ کر عمر ہباری سے ملتا اور پھر اپنے مفوضہ شہر کا انتظام سنبھالتا۔[1]

عمر بن عبدالعزیز ہباری کی امارت:

۲۴۰ھ میں جب سندھ کے والی ہارون بن ابی خالد کی وفات ہو گئی تو عمر بن عبدالعزیز ہباری نے خلیفہ متوکل کو مراسلہ لکھ کر درخواست کی کہ اگر سندھ کی ولایت اس کے سپرد کر دی جائے تو وہ اس کا انتظام اچھی طرح چلائے گا۔ خلیفہ متوکل نے اسے منظور کر لیا۔ یوں متوکل کے باقی دور میں عمر بن عبدالعزیز ہباری نے سندھ کے امیر کے طور پر حکومت کی۔[2]

عمر بن عبدالعزیز ہباری کی خود مختاری:

۲۴۷ھ میں بنو عباس کے عظیم الشان خلیفہ متوکل کی وفات کے ساتھ ہی عباسیوں کا دورِ عروج ختم ہو گیا اور ہر طرف خود مختاری اور مرکز گریزی کی آندھیاں چل پڑیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عمر بن عبدالعزیز ہباری نے بھی سندھ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی جس کا پایۂ تخت ''منصورہ'' تھا۔[3]

دولتِ ہباریہ آخر تک بنو عباس سے رسمی تعلق نبھاتی رہی اور یہاں خلفائے بنو عباس کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔[4]

عبداللہ بن عمر ہباری:

عمر بن عبدالعزیز ہباری کی وفات کے بعد اس کے بیٹے عبداللہ بن عمر ہباری نے حکومت سنبھالی۔ اس کے ہندوستان کے دیگر راجاؤں اور حکمرانوں سے بہت اچھے تعلقات تھے اور دولتِ ہباریہ انہیں اسلام کی دعوت دیتی اور تعلیمات سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔[5]

عبداللہ بن عمر ہباری کے زمانے میں سجستان اور خراسان کی نوخیز ''دولتِ صفاریہ'' عروج پر تھی، اس لیے ۲۵۷ھ میں عباسی خلیفہ موفق نے سندھ کی حکومت اس کے نام کر دی۔[6] یعنی سندھ کا والی عبداللہ بن عمر ہباری اب خراسان کے صفاری حکمرانوں کا نائب بن گیا۔ بہر حال یہ الحاق رسمی تھا، یہی وجہ تھی کہ دولتِ ہباریہ اپنی جگہ قائم رہی۔ بنو ہبار کو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ صفاریوں نے جو طوفان کی طرح خراسان، ایران اور عراق کو دباتے جا رہے تھے، کبھی سندھ کی طرف بڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

---

① جمهرة نسب قريش لابن بكار: ص ٥٢٠

② تاريخ يعقوبي: ٢٢٣/٣، ط حيدريه نجف

③ جمهرة انساب العرب لابن حزم: ص ١١٩،١١٨

④ صورة الارض لابن حوقل: ص ٣٢٠؛ احسن التقاسيم: ص ٣٨٥

⑤ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں از قاضی اطہر: ص ۹۱ تا ۹۳، بحوالہ عجائب الہند از بزرگ بن شہریار

⑥ الكامل في التاريخ: سنة ٢٥٧ھ

موسیٰ بن عمر ہباری:

عبداللہ بن عمر ہباری کے بعد اس کا بھائی موسیٰ بن عمر ہباری حکمران ہوا۔ ۲۷۱ھ میں اس نے عباسی خلیفہ معتمد کے پاس کچھ تحائف بھیجے جن میں ایک ایسا کوہ پیکر ہاتھی تھا جس کی نظیر کبھی دیکھی نہیں گئی تھی، ایسے سیاہی مائل ہرن تھے جن کی جسامت گائے کے قریب قریب تھی۔ علاوہ ازیں مشک، عنبر، ریشم اور چاندی کے تین مجسمے بھی تھے۔ ①

عمر بن عبداللہ بن عمر ہباری:

موسیٰ کے بعد اس کا بھتیجا عمر بن عبداللہ بن عمر تخت نشین ہوا۔ اس کا زمانہ تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل کا تھا۔ وہ بڑا طاقتور حکمران تھا۔ اس کی فوج میں اسی ہاتھی تھے اور پیادہ فوج چالیس ہزار تھی۔ ②

عمر بن عبداللہ کے دو بیٹے تھے: محمد اور علی۔ ③ کسی مؤرخ نے یہ وضاحت نہیں کی کہ ان میں سے کون سا شہزادہ اپنے باپ کا جانشین ہوا، مگر اندازہ یہ ہے کہ ان میں سے محمد بن عمر بادشاہ بنا ہوگا کیوں کہ آگے بادشاہی اس کی نسل میں چلتی رہی۔

یحییٰ بن محمد اور اس کا اپنے نام کا خطبہ جاری کرنا:

چوتھی صدی ہجری کے نصفِ آخر میں ہباریوں کا ایک حکمران یحییٰ بن محمد گزرا ہے۔ غالباً وہ شہزادہ محمد بن عمر کا بیٹا تھا۔ پورا سندھ اس کے زیرِ تسلط تھا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ جاری کر رکھا تھا۔ ④

دولتِ ہباریہ میں بُویہی حکمران عضد الدولہ کا خطبہ:

چوتھی صدی ہجری میں پورے ایران وعراق پر بنو بُویہ کے اثنا عشری امراء کا تسلط تھا۔ عباسی خلفاء ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن چکے تھے اور دور دراز کی ریاستیں بھی ان سے دبتی تھیں۔ ۳۶۸ھ میں عباسی خلیفہ طائع نے بُویہی حکمران عضد الدولہ کے ایماء پر یہ فرمان جاری کیا کہ آئندہ سے عضد الدولہ کے نام کا خطبہ دیا جائے۔ ⑤

ہباری خانوادے نے بھی بنو بُویہ کی سرپرستی قبول کر لی اور وہاں بُویہی حکمران عضد الدولہ (م ۳۷۲ھ) کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔ تاہم بعد میں ان کے ہاں دوبارہ بنو عباس کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ ⑥

دولتِ ہباریہ کا خاتمہ:

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی تحقیق کے مطابق دولتِ ہباریہ کا خاتمہ اسماعیلی داعیوں کے ہاتھوں ہوا۔ ۳۰۱ھ میں ان کا سب سے بڑا مرکز ملتان غزنوی افواج کے ہاتھوں فتح ہو چکا تھا۔ چونکہ اسماعیلی داعی ہمیشہ کہیں نہ کہیں محفوظ مرکز تلاش کرتے رہتے ہیں، اس لیے ملتان سے محرومی کے بعد لامحالہ ان کا اگلا ہدف منصورہ ہی تھا۔ جس اسماعیلی

---

① الذخائر والتحف للقاضی رشید بن زبیر (قرن الخامس الهجری): ص ۳،۷، ط کویت

② مروج الذهب: ۱/۲۰۰، ط لبنان ③ مروج الذهب: ۱/۲۰۰، ط لبنان

④ معجم البلدان: ۳/۴۴۷ ⑤ تاریخ الخلفاء: ص ۲۹۲

⑥ احسن التقاسیم للبشاری المقدسی م نحو ۳۸۰ھ، ص ۴۸۵

داعی نے منصورہ پر قبضہ کر کے ہباریوں کو ختم کیا تھا، اس کا نام ''خفیف'' تھا۔

منصورہ پر اس نے کب قبضہ کیا؟ اور ہباریوں کا خاتمہ کب ہوا؟ اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔ بہر حال یہ ۴۰۱ھ سے ۴۱۰ھ کے درمیان کا کوئی سال تھا۔

دولتِ ہباریہ کو ختم کرنے والے اسماعیلیوں پر سلطان محمود غزنوی کا حملہ:

سلطان محمود غزنوی نے کچھ مدت تک منصورہ پر اسماعیلیوں کے قبضے کو نظر انداز کیا۔ ممکن ہے منصورہ پر قابض ہونے والے اسماعیلی اس وقت تک تقیہ سے کام لے کر اپنے باطل افکار کی کھلم کھلا اشاعت سے باز رہے ہوں اور خود کو عام مسلمانوں کی طرح ظاہر کرتے رہے ہوں۔

مگر یہ بات آخر کھل گئی۔ سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۶ھ میں جب گجرات پر حملہ کر کے سومنات فتح کیا تو واپسی میں سندھ سے ہوتے ہوئے ملتان جانے کا قصد کیا۔ اسی دوران سلطان کو معلوم ہوا کہ منصورہ کا حاکم قرامطی ہو گیا ہے۔ دراصل حاکم منصورہ ''خفیف'' پہلے سے باطنی اسماعیلی تھا مگر سلطان کو اس کے باطنی ہونے کا علم ۴۱۶ھ میں ہی ہوا تھا۔ اس لیے سلطان نے اب اس کا سر کچلنے میں دیر نہ لگائی اور منصورہ پر حملہ کیا۔ حاکم منصورہ نے مقابلے کی تاب نہ دیکھ کر ساحل مہران کے جنگلات میں پناہ لی مگر سلطان کی افواج نے جنگل کو دونوں طرف سے گھیر لیا۔ آخر حاکم منصورہ اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت مارا گیا۔①

یوں دولتِ ہباریہ کے خاتمے کے بعد اس پر قابض اسماعیلی بھی جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

✦✦✦

① الکامل فی التاریخ: سنة ۴۱۶ھ۔ تاریخ ابن خلدون: ۴۹۳/۴

دولتِ سامیہ (بنو مُنَبِّہ) ملتان

ملتان اصل میں سنسکرت کے دو لفظوں سے مرکب ہے: "مول" یعنی جڑ اور "ستھان" یعنی جگہ۔ پس ملتان کا مطلب ہوا: اصل جگہ۔ [1] ملتان کو محمد بن قاسم نے ۹۵ھ میں فتح کیا جس کے بعد یہ خطہ تاریخ کی گرد میں روپوش ہو گیا اور ایک طویل مدت تک اس کے بارے میں تاریخ خاموش نظر آتی ہے۔ اس دوران سندھ پہلے اُموی اور پھر عباسی اُمراء کے زیرِ انتظام تھا مگر ملتان الگ تھلگ رہا جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں کوئی الگ حکومت تھی۔

منصور عباسی کے دور میں جب سندھ پر ہشام بن عمرو کا تقرر ہوا تو اس کے مشیروں نے اسے کہا: "آپ کے لیے منصورہ کافی نہیں جبکہ ملتان بہت وسیع ریاست ہے۔" اس ترغیب پر ہشام بن عمرو نے ملتان کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ اس کی آمد پر حاکمِ ملتان بہت بڑی فوج لے کر باہر نکلا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں ہشام فتح یاب ہوا اور حاکمِ ملتان فرار ہو گیا۔ ہشام نے ملتان پر قبضہ کر کے وہاں بکثرت لوگوں کو قیدی بنایا۔ [2]

معلوم ہوتا ہے کہ جلد ہی ملتان نے اپنی خود مختاری دوبارہ حاصل کر لی تھی کیوں کہ ہارون الرشید کے دور میں سندھ کے امیر محمد بن عدی نے ملتان کو دوبارہ مسخر کرنے کی کوشش کی تھی جو بالکل ناکام رہی تھی۔ محمد بن عدی اپنا تمام ساز و سامان اور اسلحہ گنوا کر بڑی بُری حالت میں منصورہ واپس پہنچا تھا۔ [3]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن عدی کی شکستِ فاش کے بعد عباسیوں نے ملتان کا خیال ترک کر دیا تھا۔ اسی لیے لگ بھگ ایک صدی کے لیے ملتان ایک بار پھر اوراقِ تاریخ سے غائب ہو جاتا ہے۔

تیسری صدی ہجری کے وسط میں جب عباسی زوال پذیر ہوئے اور مختلف صوبوں اور اضلاع میں خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں تو اسی زمانے میں ہم ملتان میں ایک عرب خانوادے بنو سامہ بن لوی بن غالب کو حکمران دیکھتے ہیں اور مؤرخ مسعودی کے بقول اس خاندان کی ملتان پر حکومت محمد بن قاسم ثقفی کے بعد سے چلی آ رہی تھی۔

یہ خاندان کون تھا؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خاندان کون تھا؟ اس کے جواب میں درج ذیل امکانات سامنے آتے ہیں:

1. ایک احتمال یہ ہے کہ یہ محمد بن حارث علافی کا خاندان ہو۔ محمد بن حارث علافی ان عربوں میں شامل تھا جو

---

① ثم مولستان أی الموضع الأصلی فإن مول هو الأصل و تان هو الموضع. (کتاب الهند: ص ۲۲۳)

② تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۲۶؛ فتوح البلدان: ص ۴۲۷ ③ تاریخ یعقوبی: ۳/ ۱۲۶

پہلی صدی ہجری میں اپنے قبیلوں سمیت مکران آئے تھے۔ ۸۷ھ میں جب مکران کی امارت سعید بن اسلم کو ملی اور اس نے خاندان علاف کے بعض لوگوں کو قتل کرایا تو علافی بھڑک اٹھے اور اس خاندان کے ایک رئیس محمد بن حارث علافی نے جس کا نسبی تعلق بنوسامہ بن لؤی سے تھا، بغاوت کردی اور سعید بن اسلم کو قتل کر کے مکران پر قابض ہو گیا۔ [1]

محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے سے قبل محمد بن حارث علافی بھاگ کر راجہ داہر کے پاس پہنچ چکا تھا اور اس کی فوج کا افسر مقرر ہوا تھا۔ محمد بن قاسم کے مقابلے میں راجہ داہر قتل ہوا تو وہ اس کے بیٹے جے سنگھ کا مصاحب بن گیا مگر جب جے سنگھ کو بھی پسپائی ہوئی تو علافی کشمیر کے راجہ کے پاس چلا گیا جس نے اسے کشمیر کا مضافاتی علاقہ "شاکلہار" بطور جاگیر دے دیا۔ [2] اموی خلفاء نے محمد بن قاسم کو معزول کر کے یزید بن ابی کبشہ کو نومفتوحہ علاقوں کا نائب امیر بنایا مگر وہ جلد ہی فوت ہو گیا اور اس کے بعد لگ بھگ دو عشروں تک یہاں سیاسی ابتری رہی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی کوشش سے جے سنگھ بن داہر سمیت بعض ہندو راجا مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے مگر یزید بن عبدالملک کے دور میں انہوں نے بغاوت کردی تھی۔ اگرچہ جنید بن عبدالرحمٰن نے آ کر انہیں پسپا کیا مگر وہ ملتان کو بازیاب نہ کرا سکا۔ پس ان حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملتان ۱۰۱ھ سے قبل ہی بنوامیہ کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ ان حالات میں محمد بن حارث علافی یا اس کے قبیلے نے ملتان پر قبضہ کرلیا ہو اور تیسری صدی ہجری میں ہم جس خاندان بنوسامہ کو ملتان کا حاکم دیکھتے ہیں، وہ محمد بن حارث علافی ہی کی نسل ہو۔

❷ ایک احتمال یہ ہے کہ یہ داؤد بن نصر کی اولاد ہو۔ داؤد بن نصر کو محمد بن قاسم نے ملتان کو فتح کر کے یہاں کا امیر مقرر کیا تھا۔ [3] محمد بن قاسم کی معزولی اور گرفتاری کے بعد پیدا ہونے والی ہنگامی صورتحال میں کوئی بعید نہیں کہ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے داؤد بن نصر نے ملتان پر اپنی خودمختار حکومت قائم کرلی ہو اور تیسری صدی ہجری کے نوشتوں میں مذکور دولت بنوسامہ ملتان اسی داؤد بن نصر کی اولاد کی ہو کیوں کہ داؤد بن نصر کا تعلق عمان سے تھا [4] جہاں قبیلہ بنوسامہ کی نشو و نما ہوئی تھی۔ [5] اس لیے اگر داؤد بھی بنوسامہ سے ہو تو کوئی بعید نہیں۔

ملتان کے یہ حکمران "بنوسامہ" کے علاوہ "بنوغُنبَہ" بھی کہلاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تیسری صدی ہجری میں اس خانوادے میں ایک حکمران غُنبَہ بن اسد گزرا ہے۔ یہ حکومت اس کی اولاد میں بھی چلتی رہی۔ اس لیے یہ لوگ "بنوغُنبَہ" کہلانے لگے۔ [6]

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۲۷۷؛ چچ نامہ: ص ۸۶، ۸۷

② چچ نامہ، ص ۲۰۳ ـــ شاکلہار کا تعین مشکل ہے تاہم غالب ممکن ہے کہ یہ "کلرکہار" ہو جو پنجاب میں چکوال کے قریب واقع ہے۔

③ چچ نامہ، ص ۲۳۱ ④ چچ نامہ، ص ۲۳۱

⑤ انساب الاشراف: ۳۶/۱؛ الانساب للصحاری: ص ۲۰۱

⑥ مروج الذھب: ۱۹۹/۱

مسعودی کا بیان بھی یہی ہے کہ ملتان کی یہ حکومت محمد بن قاسم کے بعد سے چلی آرہی تھی۔ وہ لکھتا ہے:

''ملتان سونے کی ریاست کے طور پر مشہور ہے۔ اس کا حکمران ایک قریشی شخص ہے جو بنوسامہ سے ہے۔ یہاں سے خراسان تک مسلسل قافلے چلتے ہیں۔ اسی طرح منصورہ کا حکمران بھی قریشی ہے اور ہبار بن اسود کی اولاد میں سے ہے۔ ان لوگوں کی حکومت اور حاکم ملتان کی حکومت اسلام کے شروع سے موروثی چلی آرہی ہے۔''[1]

اسد بن عُتبہ:

تاریخ میں بنوسامہ کے جس حکمران کا ذکر پہلی بار وضاحت سے آیا ہے وہ اسد بن عُتبہ ہے۔ مؤرخ مسعودی نے جو ۳۰۳ھ کے لگ بھگ ہندوستان آیا تھا، اس کا تذکرہ یوں کیا ہے:

''ملتان کے حکمران کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ وہ سامہ بن لوی بن غالب کی اولاد میں سے ہے۔ وہ لشکروں اور طاقت والا حکمران ہے۔ یہ مقام مسلمانوں کی ایک بڑی سرحد ہے۔ ملتان کی حدود میں شمار کیے گئے دیہات ایک لاکھ بیس ہزار ہیں۔ ملتان میں ایک مشہور بُت ہے۔ سندھ اور ہندوستان کے دور دراز کے علاقوں سے لوگ آکر اس پر مال و دولت، ہیرے جواہرات اور مشک و عنبر نچھاور کرتے ہیں۔ ہزاروں لوگ اس کی زیارت کرتے ہیں۔ ملتان کے حاکم کی آمدن کا بڑا ذریعہ وہ ''عود قماری'' نامی خوشبو ہے جو اس بُت پر چڑھائی جاتی ہے جس کے ایک اوقیہ کی قیمت سو اشرفیاں ہے۔ یہ عود اتنی عمدہ ہوتی ہے کہ اس پر مہر لگائی جاتی ہے تو موم کی طرح اس پر نشان پڑ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی عجیب وغریب چیزیں اس بُت پر چڑھائی جاتی ہیں۔ جب ہندوستان کے راجے مہاراجے ملتان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور مسلمان ان کے مقابلے سے عاجز ہوتے ہیں تو وہ اس بُت کو توڑنے اور اس کی آنکھ پھوڑنے کی دھمکی دیتے ہیں جس سے دشمنوں کی افواج مجبوراً واپس ہو جاتی ہیں۔ میں ۳۰۰ھ کے بعد ملتان گیا تھا۔ تب وہاں کا حاکم مُنبّہ بن اسد قرشی تھا۔''[2]

اس کے بعد ابن حوقل (اَلْمُتَوَفّٰی بعد: ۳۶۷ھ) نے یہی بیان کیا ہے کہ ملتان کا حاکم قریشی ہے۔[3]

پھر ''حدود العالم من المشرق الی المغرب'' کا مصنف جس کی وفات ۳۷۲ھ کے بعد کی ہے، سندھ کے حالات لکھتے ہوئے بتاتا ہے: ''ملتان کا بادشاہ قریشی ہے اور بنوسامہ سے ہے۔''[4]

مگر اس کے چند سال بعد جب بشاری المقدسی (اَلْمُتَوَفّٰی نحو: ۳۸۰ھ) سندھ آیا تو یہاں شیعوں کا غلبہ تھا، یعنی پانسا پلٹ چکا تھا اور بنوسامہ کی جگہ اسماعیلی یہاں مسلط ہو چکے تھے جو مصر کی دولتِ بنوعبید کا خطبہ پڑھتے تھے۔

✦✦✦

---

[1] مروج الذھب: ۱۱۴/۱

[2] مروج الذھب: ۱۹۹/۱

[3] صورۃ الارض: ۳۲۱/۲

[4] حدود العالم من المشرق الی المغرب، ص ۸۵

ملتان کی اسماعیلی شیعہ حکومت

ملتان میں اسماعیلی حکومت کے قیام کے عمل کو سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخ کے اس پس منظر کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ یہ افریقہ میں دولت بنو عبید کا دور عروج تھا جس کے یہودی النسل حکمران مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کے لیے خود کو ''بنو فاطمہ'' کہلاتے تھے۔ مصر پر قبضے کے بعد بنو عبید نے خود کو بنو عباس کے بالمقابل ایک متبادل عالمگیر خلافت کے طور پر متعارف کرایا اور اس کی پشت پناہی کے ساتھ اسماعیلی داعیوں نے جگہ جگہ اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔ جو علاقے رفض کی اس تحریک سے متاثر ہوئے، ان میں ملتان بھی شامل تھا۔

تاریخ میں ملتان کے حکمران خاندان بنو منبہ کے خاتمے اور اسماعیلیوں کے برسر اقتدار آنے کے عجیب وغریب انقلاب کے خدوخال کہیں مذکور نہیں۔ مگر قیاس اس کے سوا کچھ اور کہنا ممکن نہیں کہ یہاں اسماعیلی داعیوں نے خفیہ طور پر بے شمار امراء، افسران فوج اور عوام کو اپنا ہم عقیدہ بنالیا تھا۔ اندازاً اس ذہن سازی کا زمانہ ایک سے دو عشروں تک ضرور محیط رہا ہوگا۔ جب اسماعیلیوں کی ایک مضبوط جمعیت یہاں میسر آگئی تو انہی لوگوں نے اندرونی طور پر بغاوت کرکے ملتان پر قبضہ کرلیا ہوگا۔

ملتان میں اسماعیلیوں کے برسر اقتدار آنے کا ماہ وسال کہیں مذکور نہیں مگر اندازاً یہ ۳۷۳ھ سے ۳۷۶ھ تک کوئی سال تھا کیوں کہ المقدسی (المتوفی بعد ۳۸۰ھ) کے ایام حیات میں یہ انقلاب آچکا تھا جبکہ مؤلف ''حدود العالم من المشرق الی المغرب'' جس کا سن وفات ۳۷۲ھ کے بعد کا کوئی سال ہے، یہاں بنو سامہ کی حکومت کا شاہد رہا ہے۔

یہ انقلاب جن افراد کے ہاتھوں آیا، ان میں درج ذیل کے نام ملتے ہیں:

جلم بن شیبان:

سلطان محمود غزنوی کا معاصر مؤرخ ودانشور البیرونی ملتان کے مشہور بُت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''جب قرامطی (جو اسماعیلی شیعوں کا ایک فرقہ تھے) ملتان پر غالب آگئے تو جبراً قابض ہونے والے جلم بن شیبان نے اس بُت کو مسمار کردیا اور اس کے پجاریوں کو قتل کرادیا۔''[1]

اس سے معلوم ہوا کہ ملتان سے بنو منبہ کی حکومت ختم کرنے کی تحریک کا قائد جلم بن شیبان تھا جو قرامطی داعی تھا۔ غالباً ملتان پر جلم بن شیبان کی حکومت ۳۸۰ھ سے چند سال بعد تک رہی تھی اور اس دوران رفض بڑی تیزی سے یہاں عام ہوگیا جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی کہ یہاں پہلے ہی تشیع کے لیے اذہان ہموار کیے جاچکے تھے۔

---

[1] کتاب الھند: ص ۸۱

المقدسی نے غالباً اسی زمانے میں ملتان کا سفر کر کے اس کے متعلق درج ذیل تاثرات بیان کیے تھے:

''رہا ملتان تو وہاں فاطمیوں (بنو عبید) کا خطبہ پڑھا جاتا ہے اور یہ لوگ اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کرتے۔ ان کے سفیر اور ہدایا مسلسل مصر پہنچتے رہتے ہیں۔''[1]

ملتان میں اذان شیعی مذہب کے مطابق کر دی گئی تھی اور شعائر رفض ہر طرف رائج تھے۔ اگرچہ عوام میں اہل سنت بھی بکثرت تھے اور ان کے علماء و فقہاء جابجا موجود تھے۔ بشاری المقدسی لکھتا ہے:

''اہل ملتان شیعہ ہیں، اذان میں ''حی علیٰ خیر العمل'' کہتے ہیں اور اقامت کو دُہراتے ہیں۔ یہاں کے شہر حنفی فقہاء سے خالی نہیں، یہاں مالکی، معتزلی اور حنبلی کا کوئی وجود نہیں۔''[2]

شیخ حمید لودھی:

جلم بن شیبان کے بعد ہمیں اچانک ملتان پر لودھی قبیلے کا ایک پٹھان شیخ حمید حکمرانی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

مورخ محمد قاسم فرشتہ کے مطابق شیخ حمید لودھی ایک افغان سردار تھا۔ اس زمانے میں غزنی پر ایک ترک سردار سبکتگین (محمود غزنوی کے والد) کی حکومت قائم ہو چکی تھی جس نے ہندوستان پر حملے شروع کر دیے تھے اور بالائی پنجاب کا علاقہ اس کی زد میں رہتا تھا اس لیے پنجاب اور کشمیر کا ہندو راجا جے پال اس کی روک تھام کے لیے فکر مند تھا۔ ایسے میں بھاٹنہ (بھاٹیہ نزد بہاول پور) کے راجا نے جے پال کو مشورہ دیا کہ وہ سرحدات ہندوستان کی حفاظت کے لیے افغان افسر شیخ حمید کو استعمال کرے جو ایک قابل اعتماد شخص ہے۔

جے پال نے اس مشورے کو پسند کرتے ہوئے شیخ حمید کو بالائی پنجاب اور موجودہ خیبر پختون خواہ کا حاکم مقرر کر دیا۔ حمید نے ہر جگہ اپنے نائب افسران مقرر کیے اور یہیں سے پہلی بار (ہندوستان میں) افغانوں کی حکومتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

شیخ حمید نے ایک طرف جے پال کو مطمئن رکھا اور دوسری طرف سبکتگین سے بھی روابط استوار کر لیے اور اسے پیغام بھیجا کہ ہم مسلمان ہم مذہب ہونے کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔ لہٰذا آپ کو چاہیے کہ آپ افغانوں کو اپنا سمجھے اور اگر ہندوستان پر حملہ کریں تو افغانوں کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ چنانچہ جب سبکتگین جے پال کے خلاف فتح یاب ہوا تو اس نے شیخ حمید کو اس کے علاقے (ملتان وغیرہ) کی حکومت پر برقرار رہنے دیا۔[3]

شیخ حمید کی ملتان پر حکمرانی کا آغاز سبکتگین کی زندگی میں ہوا تھا اور پھر اس نے سلطان محمود غزنوی کے دور میں اس کے وفادار کے طور پر بھی ایک مدت تک حکومت کی تھی۔ سبکتگین کی وفات ۳۸۷ھ میں ہوئی تھی، اس لیے شیخ حمید اس سے دو تین سال پہلے حکمران ملتان بن چکا ہوگا۔ یوں شیخ حمید کا زمانہ اندازاً ۳۸۴ھ سے ۳۹۳ھ تک بنتا ہے۔

---

[1] احسن التقاسیم: ص ۴۸۵

[2] احسن التقاسیم: ص ۴۸۱ [3] تاریخ فرشتہ اردو: ص ۳۸

داؤد بن نصر:

شیخ حمید کے بعد اس کا نالائق پوتا داؤد بن نصر ملتان کا حاکم بنا۔ بدقسمتی سے وہ نادانی کے باعث جلد ہی اسماعیلی داعیوں کے جال میں پھنس گیا اور اس نے رافضی عقائد اختیار کر لیے۔ یوں ملتان پر ایک بار پھر اسماعیلی داعیوں کا قبضہ ہو گیا۔

مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے:

''سلطان محمود غزنوی واپس آیا۔ ۳۹۶ھ میں اس نے پھر ملتان پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ ملتان کا مرحوم حاکم شیخ حمید لودھی امیر سبکتگین مرحوم کے بہی خواہوں میں سے تھا اور ہر طرح سے امیر مرحوم کی اطاعت وفرماں برداری بجالاتا تھا۔ شیخ حمید کے بعد اس کا بے دین پوتا ابوالفتح ملتان کا حاکم مقرر ہوا۔ کچھ عرصے تک تو ابوالفتح نے اپنے اسلاف کی پیروی کی اور محمود کے حلقہ بگوشوں میں شامل رہا لیکن بعد ازاں مذہب کے ساتھ حقوقِ خدمت سے بھی منہ پھیر لیا۔''[1]

تاریخ فرشتہ کی درج ذیل عبارت شیخ حمید کے کردار کو بے داغ کر کے واضح کر دیتی ہے کہ ملتان پر قرامطیوں کے قبضے کا مجرم وہ نہیں، اس کا پوتا داؤد بن نصر تھا۔

داؤد بن نصر نے دولتِ غزنویہ کے ساتھ اپنے دادا کے معاہدے کو بھی فراموش کر دیا جس کے باعث سلطان محمود غزنوی نے اسے سبق سکھانا ضروری سمجھا اور ۳۹۶ھ میں اپنے ہندوستان کے سفر میں ملتان پر بھی حملہ کیا۔ داؤد نے مجبوراً اظہارِ اطاعت کر کے جان بچائی مگر کچھ مدت بعد اس نے پھر نمک حرامی شروع کر دی۔ آخر ۴۰۱ھ میں سلطان محمود نے ملتان پر فیصلہ کن حملہ کیا اور اسے فتح کر کے یہاں سے قرامطیوں اور اسماعیلیوں کا تسلط ختم کر دیا۔ داؤد گرفتار ہو گیا۔ اسے غزنی کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ ایک مدت بعد وہ حالتِ قیدی میں راہی عدم ہوا۔[2]

الغرض ملتان پر اسماعیلی تسلط دو بار رہا: ❶ پہلی بار جلم بن شیبان کے ہاتھوں ۳۷۵ھ میں۔ اس کے بعد ۳۸۲ھ میں شیخ حمید آ گیا جو سُنی تھا۔ اندازاً ۳۹۳ھ تک اس کی حکومت رہی۔

❷ پھر اس کا پوتا داؤد بن نصر حکمران بنا اور کچھ مدت بعد اسماعیلی ہو گیا اور یوں ملتان پر ایک بار پھر اسماعیلی حکمرانی کے تحت آ گیا۔ ۴۰۱ھ میں اس کی گرفتاری کے ساتھ ہی ''دولتِ اسماعیلیہ'' ملتان کا خاتمہ ہو گیا۔

منصورہ اور ملتان کی فتح کے بعد سلطان محمود غزنوی کو سندھ کے جاٹوں کی سرکوبی کا خیال رہ رہ کر آتا رہا مگر اس کے لیے مہم جوئی ایک مدت بعد ۴۱۸ھ میں کی گئی۔ سلطان نے خشکی اور دریا دونوں راستوں سے ان پر حملہ کیا۔ جاٹوں کی زبردست مزاحمت کے باوجود سلطانی افواج انہیں مغلوب کرنے میں کامیاب رہیں۔

یوں غزنی سے قنوج اور ملتان سے سندھ تک تمام علاقہ دولتِ غزنویہ کا حصہ بن گیا۔[3]

✦✦✦

---

[1] تاریخ فرشتہ اردو: ۱/۶۳ [2] تاریخ فرشتہ: ۱/۶۸ [3] الکامل فی التاریخ: سنۃ ۴۱۸ھ

دولتِ معدانیہ، مکران

صوبہ بلوچستان ایک زمانے میں ایک وسیع وعریض ملک تھا جس کی بڑی ریاستیں: قیقان، قندابیل اور مکران تھیں۔
بلوچستان میں مسلمانوں کے قدم پہلی بار ۱۸ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت میں پڑے۔[1]
۲۳ ہجری میں اسلامی لشکر نے حکم بن عمیر تغلبی رحمہ اللہ کی قیادت میں مکران کو بھی مسخر کر لیا۔[2] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ان کے حکم پر ۲۹ھ میں عبید اللہ بن معمر رحمہ اللہ کی قیادت میں ایک اور فوج نے مکران کی فتح کی تکمیل کی۔[3]

بلوچ قبائل سے معاہدے:

میر نصیر خان احمد زئی نے (جو بلوچستان میں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے) اپنی تصنیف "تاریخ بلوچستان وبلوچ" میں مقامی روایات کی بنیاد پر کچھ غیر معمولی معلومات دی ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان روایات کی اسنادی حیثیت کیا ہے، یہ معلومات اپنی جگہ بڑی دلچسپ ہیں اور اگر یہ اسناداً ثابت ہوں تو بلاشبہ بڑی مفید ہیں۔

ان معلومات کا خلاصہ یہ ہے کہ ۸۵۳ سال قبل از مسیح میں "ماد کرد" قبیلہ اپنے سردار کیقباد کی قیادت میں بلوچستان پر حملہ آور ہوا اور اسے فتح کرنے کے بعد اپنے قبیلے سمیت یہیں بس گیا۔ یہی لوگ "اکراد بلوچ" کہلاتے ہیں اور بلوچوں کے مختلف قبائل انہی سے نکلے ہیں۔

میر نصیر خان کے مطابق قدیم دور میں بلوچستان کا بیشتر علاقہ دو ریاستوں پر مشتمل تھا، مشرقی حصہ "توران" کہلاتا تھا جس کا صدر مقام "قلات" تھا جبکہ مغربی حصہ "مکران" کہلاتا تھا۔

میر نصیر خان بتاتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں جب توران اور مکران فتح ہوئے تو اسی وقت یہاں کے تمام اکراد بلوچ بخوشی اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ یہ معاہدہ ہوا تھا کہ انہیں یہاں سے کہیں اور منتقل نہیں کیا جائے گا۔ یہ اکراد بلوچ خلافتِ راشدہ، خلافتِ بنو امیہ اور خلافتِ بنو عباس میں عرب سے سندھ جانے والی اسلامی افواج میں جوق در جوق شامل ہوتے رہے اور مفتوحہ علاقوں میں مسلسل آباد ہوتے رہے۔ جس کے باعث آج سندھ کی کم وبیش نصف آبادی نسلاً بلوچ ہے۔

---

[1] تاریخ الطبری: سنۃ ۱۷ھ
[2] تاریخ الطبری: سنۃ ۲۱ھ، سنۃ ۲۳ھ؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۱ھ، سنۃ ۲۳ھ
[3] تاریخ الطبری سنۃ ۲۹ھ؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۹ھ؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۱۸۰

میر نصیر خان قدیم بلوچی روایات کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ دورِ خلافتِ راشدہ میں بلوچستان کے نصف حصے پر جسے مکران کہا جاتا تھا، مسلمان پوری طرح قبضہ کر چکے تھے اور عرب امراء کے ماتحت پانچ بلوچ امراء کی مجلس تمام انتظامی امور انجام دیتی تھی جس کے ارکان: امیر مردان، امیر خلف، امیر آلاک، امیر تاکول اور امیر آکول تھے۔

دوسری طرف اس زمانے میں بلوچستان کا باقی نصف علاقہ جسے توران کہا جاتا تھا، بت پرستوں کے قبضے میں تھا جن کے ہر حکمران کو "سیوا" کہا جاتا تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں یہاں "سیوا ازوراک" کی حکومت تھی۔ اگرچہ اکراد بلوچ من حیث القوم مسلمان ہو چکے تھے مگر ان میں سے جو لوگ "توران" میں بت پرستوں کے ماتحت آباد تھے، انہیں سیاسی واقتصادی وجوہ سے عموماً جنگوں میں غیر جانبدار رہنا پڑتا تھا تاکہ غیر مسلم ان کی املاک کو نقصان نہ پہنچائیں۔ میر نصیر خان کے مطابق اس زمانے میں "طوران" کا دار الحکومت "کیکان" (قیقان) تھا۔ اس علاقے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں حملہ کیا گیا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں قندابیل اور قیقان کی فتح:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ۳۹ھ میں ایک لشکر حارث بن مرہ کی قیادت میں کوہ قیقان (کوہ کھیر تھر) پہنچا اور دشمن کے نرغے میں آنے کے باوجود آخر کار فتح یاب رہا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک حارث بن مُرّہ رحمہ اللہ یہاں کے والی رہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوسرے سال سن ۴۲ھ میں وہ ایک مہم میں شہید ہو گئے۔[3]

اُموی دور میں:

۴۲ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے راشد بن عمرو جدیدی نے یہ عہدہ سنبھال کر مکران سے ہو کر سندھ میں دور تک یلغار کی۔[4] ۴۳ھ میں عبداللہ بن سوار رحمہ اللہ بلوچستان کے امیر بنے جنہوں نے خونریز لڑائیوں کے بعد قیقان کو از سرِ نو فتح کیا مگر ۴۷ھ میں قبائلی جنگجوؤں نے "ترکوں" سے مدد لے کر ایک بار پھر بغاوت کر دی۔ اس جنگ میں عبداللہ بن سوار رحمہ اللہ شہید ہو گئے اور مکران سے پرے کے تمام علاقے پر مشرکین کا تسلط ہو گیا۔[5]

اب حضرت سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے بلوچستان کی حکومت سنبھالی اور خود کو مفتوحہ علاقوں کے دفاع تک محدود رکھا۔[6]

۵۰ھ میں بلوچستان کی ولایت دوبارہ راشد بن عمرو جدیدی رحمہ اللہ کو سونپ دی گئی جنہوں نے ان علاقوں پر

---

① تاریخ بلوچستان و بلوچ: ۳/۱۲تا۱۶
② چچ نامہ: ص ۷۵،۷۶،۷۷؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ۱۹۱؛ فتوح البلدان للبلاذری، ص: ۳۱۷، ۳۱۸
③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۹۱؛ فتوح البلدان، ص ۳۱۷، ط الهلال
④ فتوح البلدان، ص ۳۱۸؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۳، ۲۰۵
⑤ چچ نامہ: ص ۷۹، فتوح البلدان، ص: ص ۳۱۷، ط الهلال؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص: ۲۰۷، ۲۰۸
⑥ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۹، ۲۱۱؛ فتوح البلدان: ص ۳۱۸

یلغار کی جہاں سے خراج ملنا بند ہو گیا تھا۔ انہوں نے ''کوہ پایہ'' اور ''قیقان'' پہنچ کر جبراً خراج وصول کیا۔ تاہم آخر غیر مسلم قبائل سے ایک جنگ میں راشد بن عمرو رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے اور مکران اور اس کے مشرق کا تمام علاقہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔[1]

اب سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ ایک بار پھر بلوچستان کے والی بنے۔ انہوں نے قیقان اور مکران کو بازیاب کرالیا۔[2]

۵۳ھ میں عباد بن زیاد کو یہ عہدہ سونپا گیا جس نے دریائے ہلمند کے نواحی علاقوں اور قندہار کو دوبارہ فتح کیا۔[3]

۶۳ھ میں بلوچستان کا انتظامی مرکز مکران کی بجائے قندابیل کو قرار دیا گیا اور نئے اُمیر منذر بن جارود نے وہاں انتظامات سنبھال کر ان تمام علاقوں کو دوبارہ فتح کیا جہاں کے لوگ سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ کے بعد بغاوت کر چکے تھے۔ مُنذر نے انہی مہمات کے دوران وفات پائی۔[4]

مُنذر کے بعد ان کے بیٹے حکم نے مرکز سے بغاوت کر کے قندابیل میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اس کا زور توڑنے کے لیے ایک بار پھر سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا۔[5]

اُموی دور میں مکران، قندابیل اور قیقان خلافتِ اسلامیہ ہی کے ماتحت رہے۔ تاہم ۷۸ھ میں ایک مفرور عرب سردار محمد بن حارث علافی نے مکران پہنچ کر مسلمان اُمیر کے خلاف بغاوت کر دی اور کچھ مدت کے لیے یہاں آزادانہ حکومت کی مگر ۷۹ھ میں حجاج بن یوسف نے اس کی سرکوبی کے لیے نئے اُمیر مجاعہ بن سعر کو بھیجا تو وہ فرار ہو گیا۔[6]

مُجاعہ نے آگے بڑھ کر قندابیل کا کچھ نواحی علاقہ بھی فتح کر لیا۔ تاہم جلد ہی اس کی وفات ہو گئی[7] اور بلوچستان کی امارت محمد بن ہارون بن ذراع نمری کو سونپ دی گئی۔[8]

۹۲ھ میں سندھ پر حملے کے لیے محمد بن قاسم ثقفی کو بھیجا گیا۔ اس لشکر نے سندھ میں داخلے سے پہلے ''پنج گور'' اور ''لس بیلہ'' کو فتح کیا۔ اس مہم کے دوران محمد بن ہارون کی وفات ہو گئی اور حجاج بن یوسف نے بلوچستان اور سندھ کی ولایت محمد بن قاسم کے نام کر دی۔[9] اس کے بعد بلوچستان کا انتظام سندھ کے اُموی والیوں ہی کے ہاتھ میں رہا۔ تاہم بلوچستان کا صوبائی انتظام قندابیل سے ہوتا تھا جہاں والیِ سندھ کا نائب حکومت کرتا تھا۔

یزید بن عبدالملک کے دور میں بنومُہلّب باغی ہو کر کچھ مدت کے لیے قندابیل پر قابض ہو گئے مگر یزید بن عبدالملک

---

① چچ نامہ: ص ۸۱، ۸۲؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۰۹، ۲۱۱؛ فتوح البلدان: ص ۳۱۸

② چچ نامہ: ص ۸۲، ۸۳؛ فتوح البلدان: ص ۳۱۷، ۳۱۸؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۱۲، ۲۱۳

③ فتوح البلدان: ص ۳۱۸؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۲۱۹

④ فتوح البلدان: ص ۳۱۸؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۲۳۶

⑤ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۲۳۶

⑥ فتوح البلدان: ص ۳۱۹؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۳۸/۵؛ چچ نامہ: ص ۸۶، ۸۷

⑦ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۲۷۸؛ فتوح البلدان: ص ۳۱۹؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۷۵ھ

⑧ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۲۷۸؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۳۸/۵، ت تدمری

⑨ چچ نامہ: ص ۹۱ تا ۱۰۰؛ فتوح البلدان: ص ۳۲۳

کے حکم پر سندھ کے نئے والی ہلال بن احوز تمیمی نے قندابیل پر چڑھائی کرکے آلِ مُہلّب کا خاتمہ کر دیا۔[1]

غرض اُموی دور میں عمومی طور پر بلوچستان کے اضلاع خلافت کے ماتحت رہے اور سندھ کے پایۂ تخت منصورہ سے ان کا انتظام سنبھالا جاتا رہا۔ یہی سلسلہ عباسیوں کے دور میں بھی رہا۔

عباسی دور میں عیسیٰ بن معدان کی آزاد حکومت:

چوتھی صدی ہجری کے وسط میں بلوچستان پر ایک خود مختار امیر عیسیٰ بن معدان نے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی جو عباسی خلفاء کا رسمی خطبہ بھی نہیں پڑھتی تھی۔ عیسیٰ بن معدان کو ہندو سندھ والے ''مہاراج'' کہتے تھے۔ اس کا پایۂ تخت ''کیز'' (کیچ) تھا جو مکران کے قریب ایک مشہور شہر ہے۔ عیسیٰ بن معدان کا دورِ حکومت کب شروع اور کب ختم ہوا؟ اس کے متعلق تاریخ بالکل ساکت ہے۔ البتہ اصطخری (م ۳۴۶ھ) نے اسے اپنے دور کا حاکمِ مکران قرار دیا ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا دورِ حکومت ۳۴۶ھ سے کچھ پہلے شروع ہوا ہوگا۔[2]

عیسیٰ بن معدان کا تعلق عرب قبیلے بنو سہم سے تھا۔ اس کا دورِ حکومت یقیناً طویل رہا ہے کیوں کہ ابن حوقل (متوفی بعد ۳۶۷ھ) جب ''صورۃ الارض'' تحریر کر رہا تھا تو اس وقت بھی مکران کا حاکم عیسیٰ بن معدان ہی تھا۔[3]

مکران پر بنو بُویہ کا حملہ:

اسی زمانے میں ضلع مکران پر بنو بویہ کا حملہ ہوا جن کی حکومت اس زمانے میں پورے عراق اور ایران پر تھی اور ان کا امیر عضد الدولہ عروج پر تھا۔ ۱۹ ربیع الاول ۳۶۱ھ کو بلوچ قبائل سے فیصلہ کن معرکہ ہوا جو طلوعِ آفتاب سے غروب تک جاری رہا۔ اس میں بلوچوں کی قوت فنا ہو گئی اور ان کا سب سے بڑا سردار ابن ابی الرجال قتل ہو گیا۔[4]

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے ان واقعات کو ذکر کرتے ہوئے ان جنگجو قبائل کو ''خوارج'' سے تعبیر کیا ہے۔[5]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حملہ مکران کی دولت معدانیہ کو ختم کرنے کے لیے نہیں تھا، بلکہ اس کا مقصد ان اطراف میں چھپنے والے بلوچ خوارج کو ختم کرنا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دولتِ معدانیہ ہمیں اس کے بعد بھی ایک مدت تک قائم دکھائی دیتی ہے۔ عیسیٰ بن معدان کی حکومت کب ختم ہوئی اور اس کا جانشین کون ہوا؟ تاریخ یہاں بھی خاموش ہے۔

معدان بن عیسیٰ:

البتہ علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۲۲ھ میں مکران کے ایک حاکم کی وفات ہوئی تھی جس کا نام معدان تھا۔ ہو سکتا ہے یہ معدان عیسیٰ بن معدان کا بیٹا ہو۔[6]

---

① فتوح البلدان: ص ۳۲۵؛ الكامل فی التاریخ: سنة ۱۰۲ھ

② المسالک والممالک للاصطخری: ص ۱۷۷

③ صورة الارض: ۳۲۵/۲

④ تجارب الامم وتعاقب الهمم لابن مسكويه: ۳۳۹/۶ تا ۳۴۲ط سروش طهران سنة ۲۰۰۲ء

⑤ تاریخ ابن خلدون: ۲۳۶/۴

⑥ الكامل فی التاریخ: سنة ۳۲۲ھ

عیسیٰ بن معدان ثانی:

معدان کے دو بیٹے: ابوالعساکر اور عیسیٰ تھے۔ عیسیٰ نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ اس پر ابوالعساکر ناراض ہو کر خراسان چلا گیا اور سلطان محمود غزنوی کے جانشین سلطان مسعود سے مدد طلب کی۔

سلطان نے اس کے ساتھ ایک لشکر بھیج دیا تا کہ عیسیٰ سے اقتدار چھین کر ابوالعساکر کو دیا جائے یا دونوں بھائی مل کر دولتِ غزنویہ کے ماتحت ہو جائیں۔ مگر عیسیٰ کسی طرح نہ مانا اور مقابلے کے لیے اٹھارہ ہزار سپاہی تیار کر لیے۔ مگر عین موقع پر عیسیٰ کے بہت سے سپاہی بھاگ کر ابوالعساکر سے آملے اور امان طلب کی۔ عیسیٰ شکست کھا کر بھاگ نکلا مگر کچھ دیر بعد وہ کچھ نفری لے کر پھر آدھمکا اور میدانِ جنگ کے بیچوں بیچ لڑتے لڑتے قتل ہو گیا۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ بن معدان ثانی بڑا جری اور طاقتور شخص تھا جس نے اپنے دور کی سب سے بڑی طاقت دولتِ غزنویہ سے ٹکر لینے میں بھی باک نہ کیا۔

ابوالعساکر حسین بن معدان:

عیسیٰ بن معدان ثانی کے قتل کے بعد اس کے بھائی ابوالعساکر نے مکران پر قبضہ کرلیا۔ وہ اہل مکران سے اتنا ناراض تھا کہ تین دن تک شہر کو لوٹتا رہا۔[2] ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالعساکر کا اصل نام ''حسین'' تھا۔[3]

وہ علم طب میں بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ اور دنیا کے نامور طبیبوں سے طبی مسائل پر خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ جب وہ بائیں جانب کے فالج میں مبتلا ہوا تو اس نے نامور مصری طبیب ابوالحسن علی بن رضوان (م ۴۵۳ھ) سے اس کے علاج معالجے کے بارے میں خط و کتابت کی۔[4]

چونکہ ابوالعساکر کی حکومت دولتِ غزنویہ کی پشت پناہی کے باعث قائم ہوئی تھی، اس لیے وہ پوری طرح تاجِ غزنی کی وفادار تھی اور وہاں سلطان غزنی مسعود بن محمود کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔[5]

بنو معدان کے خاتمے کے بارے میں تاریخ بالکل ساکت ہے۔

✦✦✦

---

① الكامل في التاريخ: سنة ۴۲۲ھ

② الكامل في التاريخ: سنة ۴۲۲ھ

③ عيون الانباء في طبقات الاطباء: ۵۶۶

④ عيون الانباء في طبقات الاطباء: ۵۶۶

⑤ تاريخ ابن خلدون: ۴۹۹/۳

دولتِ مشکیہ

بنوعباس کے دورِ زوال میں بلوچستان میں مکران سے کچھ فاصلے پر واقع شہر ”مشکی“ میں ایک چھوٹی سی آزاد ریاست قائم تھی جس کے حکمرانوں میں سے فقط ”مطہر بن رجاء“ نامی ایک شخص کا نام ملتا ہے جس کے آبا و اجداد کا کچھ حال کہیں مذکور ملتا ہے نہ اس کے جانشینوں کا۔

اصطخری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مطہر بن رجاء دولتِ معدانیہ مکران کا پڑوسی اور عیسیٰ بن معدان کا معاصر تھا۔ اس دور میں خود مختار بادشاہوں کی اجارہ داری تھی اور اکثر چھوٹی ریاستیں ان کی سرپرستی میں رہتی تھیں مگر مطہر بن رجاء یقیناً غیر معمولی دلیر شخص تھا اور غالباً اس کا علاقہ بھی قدرتی طور پر بڑا محفوظ تھا، اس لیے وہ بے باکی کے ساتھ فقط خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتا تھا اور کبھی سلاطین یا کسی اور بادشاہ کا نام خطبے میں نہیں لیتا تھا۔[1]

+++

① المسالک والممالک ص۱۷۷، ۱۷۸

سومرہ

سومرہ قوم سندھ کی قدیم نسل ہے جو سندھ، کچھ، کاٹھیاواڑ، گجرات اور بلوچستان میں بکثرت آباد ہے۔ اسی نسل کے حاکموں نے کبھی محض اندرونِ سندھ اور کبھی پورے سندھ پر حکومت کی۔ ان کی حکومت سندھ کے شہر "تھری" سے شروع ہوئی۔ بعد میں اپنے دورِ عروج میں سومرہ سرداروں نے جن مقامات کو مرکزِ حکومت بنایا ان میں ملتان، اسکلندہ (اُچ)، محمد طور، عمرکوٹ، دیبل، ساموئی، برہمن آباد، اروڑ اور سیہون شامل ہیں۔

سومروں کو بعض مؤرخین نے نسلاً راجپوت قرار دیا ہے مگر علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے بڑی طویل تحقیق کے بعد اسے راجح قرار دیا ہے کہ یہ لوگ عرب تھے۔ ۲۴۲ھ میں انہوں نے موجودہ "ماتلی" (سندھ) کے قریب ایک قصبے "تھری" (تھرڑی) میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کر لی تھی جو نیم خود مختار تھی اور منصورہ کی دولتِ ہباریہ کے عروج کے دوران رسماً اس کے ساتھ وابستہ تھی۔ اگرچہ یہ لوگ سُنّی عرب تھے مگر ہندی و سندھی زبان و ثقافت کے زیرِ اثر ان کے نام مقامی انداز کے ہوگئے۔ غالباً یہ لوگ بیک وقت دو دو نام رکھتے تھے۔ گھر کا نام عربی ہوتا تھا اور باہر جس نام سے انہیں پکارا جاتا تھا، وہ ہندی یا سندھی ہوتا تھا۔

تقریباً سوا صدی بعد جب ملتان میں اسماعیلی داعیوں کا زور ہوا تو ان کے داعی سندھ میں بھی سرگرم ہو گئے جس کے باعث سومرہ خاندان نے ان کا مذہب قبول کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اسماعیلی داعیوں کے ایماء پر منصورہ کی حکومت کے خلاف متعدد بار بغاوت کی۔

سلطان محمود غزنوی نے ۴۰۱ھ میں ملتان سے دولتِ اسماعیلیہ کا خاتمہ کر کے اس فرقے پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی مگر یہ لوگ ختم نہیں ہوئے بلکہ یہ لوگ اندر ہی اندر اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے رہے اور ان کے جاگیر دار مثلاً خفیف اور سعد اپنے علاقوں میں محفوظ رہے۔

خفیف:

کچھ مدت بعد خفیف نے دولتِ ہباریہ کے خلاف بغاوت کر کے منصورہ پر قبضہ کر لیا۔ اس نے سلطان محمود غزنوی سے خائف ہو کر اپنے باطنی اسماعیلی ہونے پر تقیہ کا پردہ ڈالے رکھا اور مخالفانہ انداز و اطوار کے اظہار سے احتراز کیا۔ مگر آخر سلطان محمود کو اس کی حقیقت معلوم ہو گئی جس کے فوراً بعد غزنوی افواج نے ۴۱۶ھ میں حملہ کر کے منصورہ پر قبضہ کر لیا اور خفیف جھڑپ کے دوران مارا گیا۔

سومرہ اوّل:

کچھ مدت بعد سومرہ قوم اپنے ایک سردار کی قیادت میں دوبارہ ابھری جس کا ہندی نام "انگ پال" تھا۔ سومروں کا پہلا نامور سردار یہی ہے۔ اس کا لقب سوم راہ (رائے) تھا۔ یہی "سوم راہ" مختصر ہو کر "سومرا" ہو گیا۔ "سوم راہ" کے بعد اس کی اولاد "سومرا" کہلانے لگی اور اس کا ہر جانشین اپنے نام کے ساتھ یہی لقب استعمال کرنے لگا۔ وہ سلطان محمود غزنوی کا معاصر تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں شکست کے باعث سومرہ قوم وقتی طور پر دب گئی تھی، اس لیے سومرہ اوّل نے بھی کسی مخالفانہ تحریک سے احتراز کیا۔ سلطان محمود غزنوی کی وفات کے لگ بھگ ایک سال بعد ۴۲۲ھ میں سومرہ اوّل کی وفات ہو گئی۔

راجہ پال بن سومرہ:

سومرہ اوّل کا بیٹا جس کا ہندی نام "پال" تھا، اس کا جانشین ہوا۔ وہ مصر کی دولتِ بنوعبید کا معتقد تھا اور سندھ میں اسماعیلی حکومت قائم کرنے کے حوالے سے اس کا دربارِ مصر سے مراسلاتی رابطہ رہتا تھا۔ اس کے مقام و مرتبے کی بنا پر سندھ میں اسے "راجہ" کہا جاتا تھا، یوں وہ "راجہ پال" کہلانے لگا۔ اس نے کئی بار سندھ میں دولتِ غزنویہ کے خلاف بغاوت کی کوشش کی مگر چونکہ تختِ غزنی پر سلطان محمود غزنوی کا بیٹا سلطان مسعود براجمان تھا جو ایک مضبوط حکمران تھا، اس لیے ہر کوشش ناکام رہی۔

سومرہ دوم:

دو عشروں بعد جب شہزادوں کی خانہ جنگی کے باعث غزنوی حکومت کمزور پڑ گئی اور مختلف سرحدی علاقے خود مختاری حاصل کرنے لگے تو سومروں نے بھی موقع پا کر ۴۴۳ھ میں تھری (ماتلی، سندھ) میں جمع ہو کر اپنے ایک قابل شخص کو سندھ کا حکمران منتخب کر لیا جو فقط اپنے لقب "سومرہ" ہی سے مشہور ہوا۔ سومرہ دوم کو اقتدار کے فقط دو سال ملے مگر وہ مخالفین کو پسپا کرنے میں کامیاب رہا۔ ۴۴۶ھ میں سومرہ دوم کی وفات ہو گئی۔

بھونگر:

سومرہ دوم نے "سعد" نامی سندھ کے ایک بڑے جاگیردار کی بیٹی سے شادی کی تھی جس سے ۴۴۵ھ میں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ وہ اپنے ہندی نام "بھونگر" سے مشہور ہوا۔ سومرہ کے بعد ۴۴۶ھ میں یہی بھونگر فقط ایک سال کی عمر میں رسمی طور پر تخت نشین ہوا۔ پندرہ سال بعد ۴۶۱ھ میں بھونگر سولہ یا سترہ سال کی عمر میں وفات پا گیا۔

دودا اوّل:

بھونگر کے بعد اس کا دو سالہ بیٹا "دودا" تخت نشین ہوا جس کی ولادت ۴۵۹ھ میں ہوئی تھی۔ غالباً اس کا اصل نام داؤد تھا جو مقامی تلفظ میں "دودا" ہو گیا۔ اس نے کل ۲۶ سال عمر پائی۔ کم عمری کے باوجود وہ بڑا لائق ثابت ہوا۔ اس نے زیریں سندھ کے مشرقی حصے کو بھی فتح کر لیا۔ وہ ۲۴ سال تخت پر رہا اور ۴۸۵ھ میں اس کی وفات ہو گئی۔

بائی:

دودا کی وفات کے وقت اس کا بیٹا سنگھر تین سال کا تھا، اس لیے دودا کی بیٹی "بائی" نے امورِ حکومت خود انجام دینا شروع کر دیے اور پندرہ برس تک حکومت کی۔

سنگھر:

اس کا نام اصل میں سنگھ رائے تھا جو مختصر ہو کر "سنگھار" اور پھر "سنگھر" رہ گیا۔ اس کی ولادت ۴۸۲ھ میں ہوئی تھی۔ ۵۰۰ھ میں وہ بالغ ہو گیا اور حکومت اپنی بہن سے لے کر خود سنبھال لی۔ اس نے پندرہ سال حکومت کی اور ۵۱۵ھ میں ۳۳ سال کی عمر میں وفات پا گیا۔ اس نے اپنی راجدھانی کو مزید وسیع کر کے مکران تک پھیلا دیا۔

ہیموں۔ خفیف:

سنگھر کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کی وفات کے بعد اس کی بیوی "ہیموں" نے اپنے دو بھائیوں: "خفیف" اور "اناڑ" کی مدد سے سلطنت کو چلایا۔ سلطنت کی وسعت کے باعث ہیموں نے بڑے بھائی خفیف کو اپنے ساتھ تھری میں رکھا جب کہ اناڑ کو سلطنت کے ایک دوسرے حصے میں واقع شہر "طور" بھیج دیا۔ غالباً یہ اُچ کے قریب واقع "احمد پور" تھا۔ خفیف ۳۳ سال تک امورِ حکومت انجام دے کر ۵۴۸ھ میں فوت ہوا۔ غالباً اس کی بہن ہیموں اس سے پہلے ہی فوت ہو گئی تھی۔

اناڑ (عمر سومرہ اول):

خفیف کی وفات کے وقت اس کا چھوٹا بھائی اناڑ ۵۱ برس کا ہو چکا تھا۔ بھائی کے بعد وہ ہی پوری سومرہ سلطنت کا مالک بن گیا اور احمد پور یا اس سے متصل اُچ سے سارے معاملات کو سنبھالنے لگا۔ اس نے ۵۴۸ھ سے ۵۷۱ھ تک تخت پر ۲۳ سال گزارے اور ۷۲ سال کی عمر میں اپنی بیوی کے ہاتھوں اس وقت قتل ہوا جب افغانستان کے غوری حکمرانوں نے ہندوستان پر یلغار کی اور نامور فاتح شہاب الدین غوری اُچ پر حملہ آور ہوا۔

جب قلعہ فتح کرنے میں تاخیر ہوتی چلی گئی تو سلطان کے جاسوسوں نے اپنا کام دکھایا اور "اناڑ" کی چھوٹی رانی سے رابطہ کیا جو "اناڑ" سے سخت ناراض تھی۔ رانی نے سلطان کے حملے کو اچھا موقع تصور کیا اور زہر کھلا کر شوہر کو قتل کر دیا جس کے بعد جنگ بند کرا کے قلعے کے دروازے کھلوا دیے۔ یوں سومروں کا یہ سب سے مضبوط مرکز غوریوں کے قبضے میں آ گیا۔

یہ پہلا سومرہ حکمران تھا جو اُچ میں رہتا تھا۔ اس کا گھریلو نام "عمر" ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ سُنّی تھا اسماعیلی نہیں، کیوں کہ روافض حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نام کبھی نہیں اپناتے۔

عمر سومرہ کے سُنّی ہو جانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں سندھ کے سومروں میں سنی عقائد کی اشاعت شروع ہو چکی تھی اور اُچ کے مشائخ کا اس میں بہت اہم کردار تھا جن کے سومرے بھی معتقد تھے۔

اسی زمانے میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر سے بنو عبید کا خاتمہ کیا تھا، یوں اسماعیلیت کا عالمی مرکز ختم ہو گیا

تھا اور پوری دنیا میں ان کی قوت پر کاری ضرب لگی تھی۔ عمر سومرہ اول کے بعد اس نام کے متعدد حکمران سومروں میں گزرے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد سومروں میں سنی عقائد کی اشاعت کا کام روبہ ترقی رہا۔

دودا دوم:

عمر سومرہ کی وفات سے کچھ مدت پہلے دودا نامی ایک سومرہ سردار زیریں سندھ میں بغاوت کر کے اپنی حکومت قائم کر چکا تھا۔ اُچ اور بالائی سندھ سے پسپا ہونے والے سومرہ جنگجو سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ دودا نے دیبل کو پایۂ تخت بنالیا مگر اسے زیادہ مہلت نہ ملی۔ ۵۷۶ھ میں شہاب الدین غوری کی فتوحات کا رُخ زیریں سندھ کی طرف ہو گیا۔ غوریوں نے دیبل پر حملہ کیا جس میں سومروں کی بچی کھچی طاقت بھی ختم ہو گئی۔

اسی زمانے میں دیبل سے کچھ دور ٹھٹھہ شہر آباد ہوا تھا۔ دیبل کے لوگ وہاں منتقل ہو گئے اور دیبل ویرانی کے دور سے گزر کر کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔ دودا کی مدت حکومت پانچ چھے برس سے زیادہ نہیں ہوئی۔

بھٹو:

غوریوں نے زیریں سندھ کو مستقل طور پر ماتحت رکھنے کا کوئی انتظام نہ کیا۔ چنانچہ ان کا ریلا گزرنے کے کچھ عرصے بعد حالات سازگار دیکھ کر ایک اور سومرہ سردار ''بھٹو'' نے (جو بھونگر کی نسل سے تھا) از سرِ نو سندھ کے کچھ حصے پر حکومت قائم کرلی۔ بھٹو لگ بھگ ۳۳ برس حکومت کر کے ۶۱۱ھ میں فوت ہوا۔ اُدھر سلطان شہاب الدین غوری کی شہادت کے بعد پنجاب اور بالائی سندھ پر اس کا امیر ناصر الدین قباچہ خود مختار حکمران بن بیٹھا جس نے جلد ہی زیریں سندھ کا بڑا حصہ بھی فتح کرلیا۔ اس نے سومروں کو بری طرح پامال کیا اور ان سے جاگیریں چھین کر انہیں فقط کاشت کاری پر لگا دیا۔ اس طرح سومروں کا اثر و رسوخ ختم ہو گیا۔ صرف ''جام'' میں ان کی ایک ریاست باقی رہ گئی۔ [1]

گھن را:

بھٹو کے بعد اس کا بیٹا گھن رائے سومروں کا حکمران بنا جسے مختصراً ''گھنرا'' کہا جاتا تھا۔ اس نے ''جام'' میں لگ بھگ چھے سال حکومت کی اور ۶۱۷ھ میں وفات پائی۔

رلیہ بے سنگھ:

اس کے بعد بے سنگھ ''جام'' کا حکمران بنا۔ اسی زمانے میں چنگیز خان کا عالم اسلام پر حملہ ہوا۔ اس سے خوارزم کو بچانے میں ناکامی کے بعد خوارزمی حکمران سلطان جلال الدین نے ہندوستان میں قدم جمانے کی کوشش کی اور ناصر الدین قباچہ کو شکست دے کر پنجاب اور سندھ کا بہت بڑا علاقہ مسخر کرلیا۔ اس دوران خوارزمی لشکر نے جام پر بھی حملہ کیا۔ رلیہ بے سنگھ اپنے خزانے اور اہل و عیال کو لے کر کشتیوں کے ذریعے کسی محفوظ دریائی جزیرے میں روپوش ہو گیا۔ [2] اس

---

① ''جام'' وہی علاقہ ہے جسے چچ نامہ میں ''جہم'' یا ''جھیم'' کہا گیا ہے۔ موجودہ ضلع ٹھٹھہ کے شمال میں کلری جھیل سے لے کر ٹھٹھہ کے جنوب میں میرپور ساکرو تک تمام علاقہ اس میں شامل تھا۔ یعنی ''جام'' موجودہ ضلع ٹھٹھہ کا قدیم نام تھا۔
② تاریخ فرشتہ اردو: ۲/۹۲۲

کے بعد بے سنگھ کے انجام کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

محمد طور سومرہ:

اگرچہ خوارزمی لشکر ۶۲۰ھ میں واپس چلا گیا تھا مگر ناصر الدین قباچہ کی تلوار مزید دو سال تک سومروں کے سر پر لٹکی رہی۔ آخر ۶۲۲ھ میں ناصر الدین قباچہ سلطان دہلی شمس الدین التمش سے لڑائی میں مارا گیا جس کے بعد ملتان سے سندھ تک تمام بڑے شہروں اور دریائی وادیوں پر التمش کا قبضہ ہو گیا۔

سومرہ قوم بُری طرح دب چکی تھی۔ زیریں سندھ میں ان کا واحد ٹھکانہ "جام" بھی ان کے پاس نہ رہا تھا۔ ایسے میں ان کے ایک سردار محمد طور نے دریائے سندھ کی اس سرسبز وادی کو چھوڑ دیا جہاں طاقتور حکمران اکثر قبضے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اس نے جنوب مشرقی سندھ کی سرحد پر تھر پارکر میں ایک غیر معروف جگہ تلاش کی جہاں ایک طرف صحرائے کچھ دوسری طرف جیسلمیر اور جودھ پور کی ریاستیں تھیں اور دریائے سندھ کی ایک شاخ بھی وہاں قریب سے گزرتی تھی جس کے باعث وہاں کچھ زراعت بھی ہو سکتی تھی۔

یہاں اس نے ایک نیا گاؤں آباد کیا جو اس کے نام پر "محمد طور" کہلایا جس کا سندھی تلفظ "مہاتم تور" ہے۔ سومرہ قوم کے بہت سے لوگ اسی علاقے میں اس کے گرد جمع ہو گئے۔

سلطان شمس الدین التمش کے زمانے تک محمد طور نے اپنے بچاؤ پر اکتفا کیا مگر ۶۳۳ھ میں اس کی وفات کے فوراً بعد اس کے داعی دہلی میں سرگرم ہو گئے اور وہاں انقلاب لانے کی کوشش کی مگر یہ سازش ناکام ہو گئی اور سلطان التمش کی جانشین سلطانہ رضیہ نے اس کے بھیجے ہوئے داعی نور ترک کو اس کے سندھی اور گجراتی ساتھیوں سمیت پکڑ کر قتل کرا دیا۔ مذکورہ واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد طور اسماعیلی تھا۔ یعنی ساتویں صدی ہجری کے سومرہ حکام میں سے بعض سنی تھے اور بعض اسماعیلی۔ محمد طور ۶۲۰ھ سے ۶۳۵ھ تک پندرہ برس حکومت کر کے فوت ہوا۔

گھنرا دوئم:

محمد طور کے بعد اس کا بیٹا گھنرا (گھن رائے) دوئم تخت نشین ہوا۔ اس نے فقط چار برس حکومت کی۔

دودا سوئم:

۶۳۹ھ میں اس کا بیٹا دودا سوئم تخت نشین ہوا۔ اس وقت دہلی کی مرکزی حکومت ایک طرف اندرونی خلفشار کا شکار ہو رہی تھی اور دوسری طرف تاتاری بار بار سرحدوں پر حملے کر رہے تھے جن سے جنگوں کی مصروفیت کے باعث اسماعیلیوں کے اس مرکز کی طرف توجہ نہ دی جا سکی۔ موقعے سے فائدہ اٹھا کر سومرہ ایک بار پھر مجتمع اور مضبوط ہونے لگے۔ یوں دودا سوئم نے بارہ برس آرام سے حکومت کی۔ ۶۵۱ھ میں اس کی وفات ہوئی۔

بائی:

دودا کے مرتے وقت اس کی اولاد بالغ نہ تھی، اس لیے سومرہ قوم کی ایک عورت "بائی" نے جو غالباً دودا کی بیوی یا

بہن تھی، حکومت سنبھال لی اور پندرہ سال تک یہ ذمہ داری نبھائی۔ اس نے دہلی کی مرکزی حکومت کی مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر دیبل کو بھی دوبارہ سومرو راجدھانی میں شامل کرلیا اور وہاں چنیسر نامی ایک نائب کا تقرر کر دیا۔

چنیسر:

چنیسر اصل میں گنیش رائے کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ وہ سومرہ اور اسماعیلی سے نہ تھا بلکہ نسلاً و مذہباً ہندو تھا۔ یہ بائی کا نائب السلطنت تھا جس نے بائی کے مرنے کے بعد ۶۶۶ھ میں حکومت پر قبضہ کرلیا اور دیبل کو پایۂ تخت قرار دیا۔ اس نے ۱۸ سال حکومت کی اور ۶۸۴ھ میں فوت ہوا۔

بھونگر دوئم:

گنیش رائے کی موت کے بعد سومرہ نسل کے ایک شخص بھونگر کو حکومت ملی۔ اس نے پندرہ برس اقتدار کے مزے لوٹے اور ۶۹۹ھ میں فوت ہوا۔

خفیف دوئم:

بھونگر کے جانشین خفیف دوئم نے آٹھ سال حکومت کی اور ۷۰۷ھ میں فوت ہوا۔

دودا چہارم:

اس نے پانچ برس حکومت کر کے ۷۱۲ھ میں انتقال کیا۔

دلورائے:

خفیف دوئم یا دودا چہارم کے زمانے ہی میں سومروں کے ایک اور طالع آزما دلورائے نے سر اٹھا کر بہت بڑا علاقہ فتح کرلیا اور آخرکار وہی سومروں کا بادشاہ بن گیا۔ مشہور لوک داستان "سیف الملوک" اسی کے دور سے منسوب ہے۔

اس کی حکومت شمال میں ڈیرہ غازی خان سے جنوب میں حیدرآباد سندھ تک تھی۔ اس نے دریائے سندھ کی ایک شاخ کے کنارے واقع سندھ کے قدیم شہر اروڑ کو پایۂ تخت بنالیا۔ وہ نہایت ظالم حکمران تھا۔ اس کے علاقے میں کسی کی عزت و آبرو محفوظ نہ تھی۔ جو تاجر وہاں سے گزرتا، اسے لوٹ لیا جاتا۔ اس کے ظلم کی نحوست سے اروڑ ویران ہو گیا جس کے بعد دلورائے کو بھی اروڑ چھوڑ کر برہمن آباد آنا پڑا۔

برہمن آباد میں منتقلی کے بعد اس کا چھوٹا بھائی عمرانی نزدیک واقع اہل سنت کے مشہور علمی مرکز "بھکر" چلا گیا اور وہاں سنی علماء سے کسب فیض کیا اور آخر قرآن مجید حفظ کر کے لوٹا۔ پھر وہ مکہ چلا گیا اور ایک عرب حافظ قاریہ کو بیوی بنا کر واپس آیا۔ وہ اپنے بھائی دلورائے کو برابر ظلم و ستم سے منع کرتا رہا مگر دلورائے پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ آخر عمرانی اپنی بیوی سمیت یہ اعلان کرتا ہوا شہر سے نکل گیا کہ یہاں اللہ کا عذاب آئے گا۔ تین دن بعد نصف شب کو ایسا ہولناک زلزلہ آیا کہ پورا شہر زمین میں دھنس گیا، ایک مینار کے سوا وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں دلورائے اپنی آل اولاد سمیت پیوند زمین ہو گیا اور اس کی حکومت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

عمر سومرہ دوئم:

دلورائے کی ہلاکت اور برہمن آباد کی تباہی کے کچھ عرصے بعد ہمیں تاریخ کے اوراق میں عمر سومرہ دوئم نامی سومرہ حکمران ''محمد طور'' کو پایۂ تخت بنا کر حکومت کرتا دکھائی دیتا ہے۔[1] برہمن آباد کی تباہی کے بعد وہی سومروں کا حکمران مان لیا گیا تھا۔ اس نے شاہانِ دہلی کی ماتحتی اختیار کر لی۔ اس وقت دہلی میں علاؤ الدین خلجی کی بادشاہت تھی۔ عمر سومرہ اس کے صوبہ دار کی حیثیت سے ''محمد طور'' اور اس کے مضافات پر حکومت کرتا رہا۔

عمر سومرہ تعمیرات کا بھی شوقین تھا۔ اس نے ضلع تھرپارکر میں موجودہ میر پور خاص کے قریب ایک عظیم الشان قلعہ اور شہر تعمیر کرایا جو ''عمر کوٹ'' کے نام سے موسوم ہوا۔ ہندو اسے ''امر کوٹ'' کہتے ہیں۔ مغل بادشاہ ہمایوں کی جلاوطنی کے دوران اس کے جانشین جلال الدین محمد اکبر کی ولادت اسی قلعے میں ہوئی تھی۔ سندھ کی لوک داستان ''عمر ماروئی'' اسی عمر سومرہ کی طرف منسوب ہے۔ عمر سومرہ کی حکومت کا خاتمہ سلطان علاؤ الدین خلجی کے ہاتھوں ہوا جس کی یلغار سے سندھ میں سومروں کی حکومت فنا ہو گئی اور انہیں بھاگ کر بلوچستان میں پناہ لینا پڑی۔

جب خلجیوں کی حکومت ختم ہوئی اور تغلق خاندان ایوانِ اقتدار پر قابض ہوا تو مکران بھاگ جانے والے سومرہ قوم کے لوگ واپس آ کر دریائے سندھ کے مغرب میں آباد ہو گئے۔ ان میں عمر سومرہ بھی تھا جو واپس آ کر سیہون میں قیام پذیر ہو گیا۔ عمر سومرہ نے کچھ دنوں بعد ''بکھر'' میں اپنی حکومت قائم کر لی مگر اقبال منہ پھیر چکا تھا۔ سمّوں نے بہت قوت حاصل کر لی تھی اور بلوچستان سے مغربی اور جنوبی سندھ تک پھیل چکے تھے۔ ان کے سردار ''کاہہ بن تماچی'' نے عمر سومرہ کے خلاف جنگ چھیڑ کر فتح حاصل کی اور اسے گرفتار کر کے اپنے ساتھ بہرام پور لے آیا جہاں اسے قتل کر دیا گیا۔ یوں عمر سومرہ تقریباً ۲۵ برس حکومت کر کے اندازاً ۷۳۲ھ میں جان کی بازی ہار گیا۔

یہ عمر سومرہ دوئم بھی بلاشبہ سُنّی تھا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں سومروں کی اکثریت سنی ہو چکی تھی اور غالباً عمر سومرہ دوئم کے بعد آنے والے تمام سومرہ حکام سُنّی تھے۔

بھونگرہ سوم:

عمر سومرہ کے بعد بھونگرہ سوم اس کا جانشین ہوا۔ وہ سلطان محمد تغلق کی ماتحتی کا معترف رہا اور رسمی نیاز مندی کا تعلق نبھاتا رہا۔ چونکہ سلطان محمد تغلق اودھ، بنگال اور مالوہ کی بغاوتوں سے پریشان تھا اور قحط نے بھی پنجے گاڑ دیے تھے، اس لیے بھونگرہ سوم کو اپنی قوت بڑھانے کا موقع مل گیا اور اس نے مشرقی سندھ پر بھی قبضہ کر لیا جو علاؤ الدین خلجی کے دور میں سومروں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ بھونگرہ سوم نے دس برس حکومت کی اور سومروں کو ایک بار پھر ایک بڑی طاقت بنا کر دکھایا، یہاں تک کہ اس کی عملداری اُچ تک وسیع ہو گئی جہاں اس زمانے میں سید جلال الدین بخاری عرف مخدوم

---

[1] راقم کے خیال میں یہ عمر سومرہ غالباً اسی عمرانی کا بیٹا تھا۔ شاید عمرانی برہمن آباد چھوڑ کر ''محمد طور'' میں آ بسا تھا۔ اس لیے عمر سومرہ نے اسی جگہ کو اپنا مرکز بنا کر حکومت قائم کی۔

جہانیاں جہاں گشت رحمہ اللہ اُچ میں مقیم تھے۔

امیر ارمائیل:

سومروں کا یہ آخری حکمران بدکردار اور ظالم تھا۔ لوگ اس سے خوش نہ تھے۔ اگرچہ ممکن تھا کہ ان حالات میں بھی سومروں کی حکومت مزید کچھ عشرے گزار دیتی مگر سومروں کی پے در پے غلطیوں نے ان کا خاتمہ نوشتۂ تقدیر بنا دیا۔

اس کی ایک حماقت کے باعث سلطان محمد تغلق نے ۷۵۲ھ میں اس کے مرکز ٹھٹھہ پر چڑھائی کی تیاری کر لی تھی مگر اس کی اچانک علالت اور وفات نے جنگ کو ٹال دیا۔ تاہم سومروں کے مظالم ان کے لیے سیاسی خودکشی بن گئے۔ اس زمانے کے سومرہ سردار شراب نوشی کے بے حد رسیا تھا۔ جب چاہتے تھے سموں کے مویشی ہانک کر لے جاتے اور ان کے کباب بنا کر محفل ناؤنوش جماتے۔

آخر سموں نے ہتھیار اٹھا لیے اور "اُنّار بن بانبیہ" نامی سردار کو اپنا حاکم مان کر اس کی قیادت میں سومروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند معرکوں کے بعد دریائے سندھ کے مشرق و مغرب میں سومروں کو شکست ہوئی اور تمام شہر ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ چند برس کے اندر اندر سموں کی حکومت پورے سندھ کو محیط ہو گئی اور سومرہ قوم محکوم کے طور پر رہنے لگی۔ اگرچہ اس کے پاس جاگیریں اور افرادی قوت ضرور تھی مگر اسے ویسا سیاسی غلبہ پھر کبھی نصیب نہ ہوا اور اقتدار کی باگ ڈور اس قوم کے ہاتھ سے نکل گئی۔ سومرے سیاست سے لاتعلق ہو کر زیادہ تر کاشت کاری میں مصروف ہو گئے۔[1]

سومرہ دور میں سندھ کی سرکاری زبان عربی تھی۔ سومروں کی حکمرانی ختم ہوتے ہی سندھ کی سرکاری زبان فارسی ہو گئی۔

سومروں کے دور میں سندھ کی عشقیہ داستانوں، جنگ ناموں اور سندھ کے بہادر سرداروں کے کارناموں کو بیان کرنے کا رواج عروج پر پہنچ گیا۔ بلکہ بعض عشقیہ داستانیں سومروں ہی کے دور میں وجود میں آئیں۔

سومروں کے دور میں کئی جلیل القدر صوفیائے کرام گزرے ہیں جن میں ملتان کے خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی، پاک پتن کے بابا فرید الدین گنج شکر، اُچ کے سید جلال الدین بخاری، سیہون کے شیخ عثمان قلندر شہباز اور شیخ حسین المعروف پیر بھوجن رحمہ اللہ زیادہ مشہور ہیں۔ سومرہ قوم کے متعدد افراد اب بھی سندھ کے جاگیردار ہیں اور اسی بنا پر صوبائی و ملکی سیاست میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ مختلف پارٹیوں سے ہونے کے باوجود وہ آپس میں اتفاق سے رہتے ہیں اور خاندانی وابستگی ملحوظ رکھتے ہیں۔[2]

✦✦✦

---

① تاریخ سندھ، از سید سلیمان ندوی مرحوم، ص ۳۲۷ تا ۳۲۹

② سومرہ سرداروں کے تقریباً تمام حالات تاریخ سندھ از علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ سے لیے گئے ہیں۔ اگر کہیں کسی اور ماخذ سے کچھ لیا ہے تو اس کا حوالہ درج کر دیا ہے۔ تاریخ سندھ سے لیے گئے مواد کا ہر جگہ حوالہ درج نہیں کیا گیا۔ نیز سومرہ سرداران کی حکومت کے آغاز و انجام کے سنین میں سخت اختلاف ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے اس پر بڑی دقیق بحث کی ہے اور قدیم مورخین کے متعدد اندراجات کو غلط قرار دیتے ہوئے حتی الامکان درست سنین کو سامنے لائے ہیں۔ راقم نے بھی انہی کی تحقیق پر اعتماد کیا ہے۔

سموں کا دورِ حکومت

سندھ میں زمانہ قدیم سے سومروں کے شانہ بشانہ سمہ گان بھی آباد تھے۔ یہ لوگ بھی زمیندار اور کاشت کار تھے اور ساتھ ساتھ فنونِ حرب میں بھی یکتا تھے۔ افرادی اور عسکری طاقت میں سومروں کے بعد انہی کا نام تھا۔ یہ لوگ سُنی تھے۔ سومروں سے ان کی چپقلش کی ایک وجہ شیعہ سُنی اختلاف بھی تھا۔ تاہم آخر میں سومروں نے بھی مذہب اہل سنت قبول کرلیا تھا۔ یوں آخر میں یہ اختلاف فقط نسلی اور سیاسی رہ گیا۔ آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں جب سومروں کا زوال ہوا تو سندھ کی حکومت سموں کے ہاتھ میں آگئی۔ ان کی حکومتیں عموماً سلاطین دہلی و آگرہ کے ماتحت رہیں مگر کبھی کبھار ان کا کوئی سردار آزاد ہو کر علم بغاوت بھی بلند کر دیتا تھا۔ سمہ سردار خود کو ایرانی بادشاہ "جمشید" کی اولاد قرار دیتے تھے، اس لیے ان کے اکثر سردار اپنے نام کے ساتھ بطور لقب "جام" لگاتے تھے۔

پہلا سمہ حکمران۔ جام افزاوہ: (۷۳۸ھ تا ۷۴۲ھ)

یہ سموں کا پہلا حکمران تھا جس نے "جام" کا لقب استعمال کیا۔ تین سال چھ ماہ تک حکمران رہا۔ دور اندیش اور معاملہ فہم انسان تھا۔ اس کی حکومت ایک سردار کے طور پر تھی۔ سندھ میں اس وقت غالب طاقت سومروں کی تھی۔

جام جونا: (۷۴۲ھ تا ۷۵۶ھ)

۷۵۲ھ کے بعد سموں نے آخری سومرہ حاکم ارمائیل کے خلاف بغاوت کی اور "انڑ بن بانبیہ" کی قیادت میں ایک طرف ٹھٹھہ اور دوسری طرف "محمد طور" پر بھی قبضہ کرلیا اور اس کے قریب ایک اور شہر "ساموئی" آباد کرلیا۔ کچھ مدت بعد انڑ نے سندھ کے شمال مغربی اضلاع بھی مسخر کر لیے۔ یوں تقریباً تمام سندھ پر سموں کی حکومت قائم ہوگئی۔[1]

مذکورہ بیان کے مطابق سموں کا وہ حکمران جو آخری سومرہ حکمران ارمائیل کے مقابلے میں کھڑا ہوا تھا، اس کا نام انڑ بن بانبیہ تھا۔ مگر تاریخ فرشتہ کے مطابق اس دور کا سمہ حکمران "جام جونا" تھا جو جام افزاوہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ نیک اور عادل حکمران تھا، اس نے چودہ برس تک حکومت کی۔ راقم کے خیال میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اسی انڑ نے "جام جونا" کا لقب اختیار کیا تھا۔ اس طرح تعارض ختم ہو جاتا ہے۔

جام مانی بن جام جونا: (۷۵۶ھ تا ۷۷۱ھ)

جام مانی نے سلطنتِ دہلی کو خراج دینے سے انکار کر دیا جس کے باعث سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۷۶۲ھ میں

---

① تاریخ سندھ از علامہ سید سلیمان ندوی، ص ۳۴۰ تا ۳۴۳

سندھ پر حملہ کر دیا۔ جام مانی نے ایک بار شاہی افواج کو پسپا کر دیا مگر دوسرے حملے میں وہ گرفتار ہو گیا۔ فیروز شاہ تغلق جام مانی کو اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ وہاں اس نے ایسے دل و جان سے سلطان کی خدمت کی کہ اس نے مطمئن ہو کر دوبارہ اسی کو سندھ کا حاکم مقرر کر دیا۔ جام مانی پندرہ برس حکومت کر کے فوت ہوا۔

جام تماچی بن مانی: (۷۷۱ھ تا ۷۸۵ھ)

جام مانی کے بیٹے جام تماچی نے تیرہ برس اور چند ماہ تک امن و سکون کے ساتھ حکومت کی۔

جام صلاح الدین: (۷۸۵ھ تا ۷۹۶ھ)

جام صلاح الدین نے گیارہ برس حکومت کی۔ اس کا دور چین اور سلامتی کا تھا۔

جام نظام الدین بن صلاح الدین: (۷۹۶ھ تا ۷۹۹ھ)

جام نظام الدین نے دو سال چند ماہ تک حکومت کی۔

جام علی شیر بن نظام الدین: (۷۹۹ھ تا ۸۰۵ھ)

اس کا دورِ حکومت سموں کا عہدِ زریں تھا۔ ہر طرف امن و امان تھا۔ چوروں ڈاکوؤں کا بالکل قلع قمع ہو گیا تھا۔ لوگ نہایت خوش حال اور فارغ البال تھے۔ اس نے چھے برس اور چند ماہ تک حکومت کی۔ اس کی وفات پر سندھ میں ہر طرف صفِ ماتم بچھ گئی۔

جام کراں بن جام تماچی: (۸۰۵ھ تا ۸۰۷ھ)

جام علی شیر کی وفات کے بعد جام تماچی کے بیٹے جام کراں نے حکومت پر اپنے استحقاق کا دعویٰ کر دیا اور آخر سرداروں نے اسی کو مسند پر بٹھا دیا۔ مگر ڈیڑھ برس بعد اس کی وفات ہو گئی۔

جام سکندر بن فتح خان: (۸۰۷ھ تا ۸۲۲ھ)

جام کراں کی وفات پر جام سکندر بن جام فتح خان کو حکومت ملی۔ اس نے پندرہ برس یہ عہدہ نبھایا۔

جام تغلق بن جام سکندر: (۸۲۲ھ تا ۸۵۰ھ)

جام سکندر کی وفات پر اس کا بیٹا جام تغلق مسند نشین ہوا۔ اس نے ۲۸ برس تک اچھی حکومت کی اور لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ تاہم اب سموں میں پہلے جیسی طاقت نہ تھی، لہٰذا جام تغلق نے گجرات کے حکمرانوں سے تعلق قائم کر کے اپنی پشت مضبوط رکھی۔ اس کے بعد سندھ کے حکمران طویل زمانے تک شاہانِ گجرات سے مدد لیتے رہے۔

جام مبارک: (۸۵۰ھ)

جام تغلق کے بعد اس کے رشتہ دار جام مبارک نے مسند سنبھالی مگر تیسرے دن اس کی وفات ہو گئی۔

جام اسکندر بن جام فتح بن جام سکندر: (۸۵۰ھ تا ۸۵۲ھ)

اس کے بعد جام اسکندر نے جو فتح خان بن اسکندر کا لڑکا تھا، حکومت سنبھالی مگر اسے فقط ڈیڑھ سال ہی مل سکا۔

جام سنجر: (۸۵۲ھ تا ۸۶۰ھ)

اب شاہی خاندان کے ایک قابل فرد جام سنجر کو مشورے سے مسند پر بٹھایا گیا۔ وہ ایک تجربہ کار شخص تھا اس لیے بہت اچھا حکمران ثابت ہوا۔ اس نے آٹھ سال چند ماہ تک حکومت کی۔

جام نظام الدین عرف نندا: (۸۶۰ھ تا ۹۲۰ھ)

جام سنجر کے بعد جام نظام الدین تخت نشین ہوا۔ وہ ملتان کے نامور حکمران حسین لنگاہ کا معاصر تھا۔ وہ سموں کا سب سے طویل مدت تک حکمرانی کرنے والا سردار تھا۔ اس نے ساٹھ برس تک حکومت کی۔ اس کے زمانے میں قندھار کے حکمران شاہ بیگ ارغوان نے سندھ پر قبضے کی لگاتار کوششیں کیں۔ جام نظام بڑی مستعدی سے اس کا مقابلہ کرتا رہا مگر آخر میں سندھیوں کی کم ہمتی کے باعث شاہ بیگ پہلے بھکر اور پھر سیہون پر بھی قابض ہو گیا۔ اس شکست سے جام نظام پر بہت منفی اثر ہوا۔ وہ اپنی مملکت کو زوال کی طرف جاتا دیکھ کر بیمار پڑ گیا اور کچھ دنوں بعد فوت ہو گیا۔

جام فیروز: (۹۲۰ھ تا ۹۲۷ھ)

جام نظام کے بعد اس کا لڑکا جام فیروز مسند پر بیٹھا۔ اس کے دور میں سموں کے ایک اور سردار جام صلاح الدین نے بغاوت کی اور بار بار جام فیروز سے نبرد آزما ہوا تاہم اسے ہر بار ناکامی ہوئی۔ تاہم ۹۲۶ھ میں جام صلاح الدین کا پلہ بھاری ہو گیا اور اس نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ جام فیروز نے مجبور ہو کر قندھار کے حکمران شاہ بیگ سے مدد طلب کی۔ وہ کب سے سندھ پر قبضے کا موقع تاک رہا تھا، اس نے اپنے غلام کبیل کی کمان میں ایک بڑی فوج سندھ بھیج دی جس کی مدد سے جام فیروز نے جام صلاح الدین کو شکست فاش دی، صلاح الدین اور اس کے بیٹے مارے گئے اور سندھ جام فیروز کو واپس مل گیا۔ مگر یہ فتح قندھاریوں کے بل بوتے پر تھی، اس لیے ناپائیدار ثابت ہوئی۔ جلد ہی بیگ مزید فوج کے ساتھ قندھار سے سندھ پہنچا اور وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ ۹۲۷ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''سموں'' کی حکومت کا دور ختم ہو گیا۔

جام فیروز دو تین سال تک سندھ کے نواح میں دربدر پھرتا رہا۔ اس نے اپنی حکومت واپس لینے کی بڑی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر وہ اہل و عیال سمیت گجرات چلا گیا اور وہاں کے بادشاہ بہادر شاہ کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔[1]

◆◆◆

---

① تاریخ فرشتہ: ۲/۹۹۳ تا ۹۹۶

نوٹ: سندھ سرداروں کے تقریباً تمام حالات تاریخ فرشتہ سے لیے گئے ہیں۔ اگر شاذ و نادر کہیں کسی اور ماخذ سے کچھ لیا ہے تو اس کا حوالہ درج کر دیا ہے۔ تاریخ فرشتہ سے لیے گئے مواد کا ہر جگہ حوالہ درج کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

نوٹ: سندھ سرداران کی حکومت کے آغاز و انجام کے سنین تاریخ فرشتہ میں صراحتاً مذکور نہیں ہیں بلکہ وہاں فقط اسی قدر منقول ہے کہ فلاں فلاں سردار کی حکومت اتنے برس رہی۔ البتہ آخری حکمران کے انجام کا سن ۹۲۷ھ مذکور ہے۔ راقم نے حکمرانوں کی مدت حکومت سے اندازہ کر کے تمام سندھ سرداروں کی تاریخ آغاز و انجام حکومت کو درج کیا ہے۔ یہ اندازہ ہے جو ان شاء اللہ درست یا درست کے قریب ہوگا۔

برصغیر پر مسلمانوں کی آمد کے اثرات

مسلمانوں کی برصغیر میں آمد سے پہلے یہاں کے لوگ برہمنوں کی ناجائز اجارہ داری تلے دبے ہوئے تھے اور ان کی فطری صلاحیتوں کو زنگ لگ چکا تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے یہاں ذات پات کے استحصالی نظام پر کاری ضرب لگی اور ہر کسی کو علوم وفنون کی تحصیل اور ترقی وخوشحالی میں آگے بڑھنے کے مواقع دیے گئے۔

بڑے بڑے مسلمان علماء، اطباء، ادیب ودانشور، تاجر اور صنعت کار سندھ میں آباد ہو گئے۔ مسلمانوں نے یہاں تعلیم کے لیے درسگاہیں کھولیں اور ہندی کتابوں کے عربی تراجم کیے۔ جنوبی ایشیا کے ساحلوں کے ساتھ بین الاقوامی تجارت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ نومسلموں میں علم کا ایسا ذوق بیدار ہوا کہ ان میں سے بہت سے اپنے وطن کو چھوڑ کر کوفہ، بغداد اور شام کے علمی حلقوں میں جا پہنچے۔ انہی میں امام اوزاعی رحمہ اللہ (م ۱۵۷ھ) تھے جن کا خاندان سندھ سے قیدی بنا کر شام بھیجا گیا تھا۔[1] امام اوزاعی رحمہ اللہ نے وہیں پرورش پائی اور فقہاء تابعین کے حلقوں سے اس قدر فیض حاصل کیا کہ ابن شہاب زہری رحمہ اللہ اور عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ جیسے نامور محدثین ان کے شاگرد ہوئے۔[2]

انہی میں ابو معشر سندھی رحمہ اللہ تھے جو ایک غلام کے بیٹے تھے۔ وہ حدیث، سیرت اور تاریخ سیکھنے مدینہ منورہ چلے گئے اور وہاں مغازی اور سیرت کی روایات میں ایسی مہارت حاصل کی کہ اس فن کے امام کہلانے لگے۔ بعد میں بغداد آ گئے۔ ۱۷۰ھ میں ان کی وفات ہوئی تو خود خلیفہ ہارون الرشید نے نماز جنازہ پڑھائی۔[3]

ابو معشر کے صاحبزادے عبدالملک محمد رحمہ اللہ (م ۲۴۴ھ) بھی نہایت بلند پایہ عالم تھے۔ ابو نصر فتح بن عبداللہ رحمہ اللہ بھی ایک سندھی غلام تھے جو علوم اسلامیہ حاصل کر کے ''الفقیہ المتکلم'' کہلائے۔ سندھی نومسلموں میں سے ابو العطاء عربی کے نامور شاعر تھے جن کے اشعار دیوان حماسہ میں بھی نقل کیے گئے ہیں۔

سندھ سے بغداد جانے والے ایک سپاہی سندھی بن شاہک کو ہارون الرشید کے خاص الخاص افسر کا اعزاز نصیب ہوا۔ برامکہ پر قابو پانے کے لیے ہارون الرشید نے سب کو چھوڑ کر اسی سندھی افسر پر اعتماد کیا۔ پھر اس سندھی جرنیل کی

---

① امام اوزاعی رحمہ اللہ کے بارے میں نامور محدث ومؤرخ امام ابوزرعہ رحمہ اللہ کا قول ہے: ''کان اصلہ من سباء السند.'' (تاریخ دمشق: ۳۵/ ۱۵۵) تاہم اس بارے میں دیگر اقوال بھی ہیں۔

② سیر اعلام النبلاء: ۷/ ۱۰۷، ۱۰۸، ط الرسالۃ

③ تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۴۱۴

اولاد میں عربی کا نامور شاعر "کشاجم" پیدا ہوا۔ ان کے علاوہ خلف بن سالم سندھی (م ۲۳۱ھ)، فضل بن سکین سندھی، اور ان جیسے بہت سے علماء، فضلاء، ادباء اور دانشور تھے جن سے ایک دنیا نے استفادہ کیا۔ یہ سب برصغیر میں اسلامی حکومت قائم ہونے کا ثمرہ تھے۔ [1]

جنوبی ہندوستان میں اسلام

بحری تجارت کے بڑے مراکز جنوبی ہندوستان کی ریاست کیرالا اور سری لنکا تھے۔ کیرالا جانے والے عرب تاجروں میں سے شرف بن مالک، مالک بن دینار اور مالک بن حبیب کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں جو موقع بموقع اسلام کی تبلیغ بھی کرتے رہتے تھے۔ مالابار کے راجہ چکرورتی نے ان حضرات سے حضور ﷺ کے کمالات دریافت کیے۔ جب اسے معجزہ شق القمر کا واقعہ سنایا گیا تو وہ بے حد متاثر ہوا اور اس نے بلا تردد اسلام قبول کر لیا۔

کچھ دنوں بعد وہ ان مبلغین کے ساتھ مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے حجاز روانہ ہوا مگر جزیرۃ العرب کے جنوبی ساحل تک پہنچ کر وہ ایسا سخت بیمار پڑ گیا کہ بچنے کی امید نہ رہی۔ وفات سے پہلے اس نے ان عرب تاجروں کو ایک دستاویز لکھ کر مالابار میں وسیع اراضی کا مالک بنا دیا تاکہ وہ وہاں آباد ہو کر مساجد تعمیر کریں اور اسلام کی اشاعت کرتے رہیں چنانچہ عرب تاجروں نے وہاں سکونت اختیار کر کے مساجد تعمیر کیں اور اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ ان عرب مبلغین میں سے مالک بن حبیب کی قبر مالابار کے شمالی شہر "کنڈنکلور" میں آج بھی موجود ہے۔ [2]

برصغیر میں فرقہ واریت۔ اسلامی حکومت کا زوال اور شیعیت کا فروغ:

برصغیر کے مسلم علاقوں میں فرقہ واریت کا تخم اسی وقت لگ گیا تھا جب حجاز میں محمد نفس زکیہ نے عباسیوں کے

---

① الانساب للعلامہ سمعانی: ۷/ ۲۶۸ تا ۲۷۲، تحت سندی

② تاریخ الاسلام فی الهند للدکتور عبد المنعم النمر: ص ۸۹ تا ۹۳، ط المؤسسة الجامعیة للنشر والتوزیع، ۱۹۸۱ء

ڈاکٹر نمر کے مطابق مالابار کے قدیم علماء میں سے شیخ زین الدین بن عبد العزیز المعبری رحمہ اللہ نے یہ حالات اپنی تاریخ "تحفة المجاهدين في بعض أخبار البرتغاليين" میں لکھے ہیں۔ شیخ زین الدین رحمہ اللہ کے والد ابو یحییٰ رحمہ اللہ بھی مشہور عالم تھے۔ ان کا خاندان آج بھی مالابار کے مسلمانوں میں معروف ہے۔ مالابار کے شہر "پنانی" میں شیخ کی تعمیر کردہ جامع مسجد موجود ہے اور اسی کے احاطے میں شیخ زین الدین رحمہ اللہ اور شیخ ابو یحییٰ رحمہ اللہ کی قبریں ہیں۔

مقامی لوگ ان بزرگوں کو "مخدوم" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ مالابار کے راجہ کے قبول اسلام کی سن کہیں محفوظ نہیں۔ مقامی مسلمانوں میں مشہور ہے کہ راجہ نے شق القمر کا معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اسلام قبول کر کے نبی اکرم ﷺ کی زیارت کے لیے حجاز روانہ ہوا تھا۔

یہ بھی مشہور ہے کہ مالک بن دینار اور ان کے عرب رفقاء صحابہ تھے۔ تاہم یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ صحابہ کرام کے احوال میں ان حضرات کا ذکر اور یہ واقعہ کہیں موجود نہیں۔ راجح یہ ہے کہ یہ حضرات تابعین یا تبع تابعین تھے اور راجہ کے قبول اسلام کا واقعہ پہلی صدی ہجری کے اواخر یا دوسری صدی ہجری کے اوائل کا ہے۔ عرب تاجروں کے خاندان اسی دور میں یہاں آباد ہوئے۔ (ملخص از تاریخ الاسلام فی الہند)

خلاف خروج کی خفیہ تحریک شروع کی تھی۔ اسی دوران سندھ میں بھی اس تحریک کے حامی تیار کیے گئے تھے۔ ان کے ایک بیٹے عبداللہ اشتر نے سندھ میں پناہ لے کر یہاں تحریک کو فروغ دینے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ اشتر کو قتل کر دیا گیا مگر اس گروہ کے لوگ باقی رہے۔ اس وقت تک ان کی اکثریت شیعانِ مخلصین یا زیدی شیعوں پر مشتمل تھی مگر آگے چل کر ان میں سے بہت سے لوگ مختلف بداعتقادیوں میں مبتلا ہو کر رافضی بنتے چلے گئے جب کہ شیعانِ مخلصین جمہور اہل سنت کے مذہب کو اپنی فکر و نظر اور قرآن و سنت سے ہم آہنگ پا کر انہی میں ضم ہو گئے۔ اُدھر رفض کے دائرے میں قدم رکھنے والے بھی اپنے افکار کی اشاعت کرتے رہے۔ یہی لوگ برصغیر میں رفض کے فروغ کا سبب بنے۔[1]

چوتھی صدی ہجری میں افریقہ، مصر، عراق، حجاز اور بحرین میں مختلف شیعہ فرقوں کی بالادستی قائم ہو گئی۔ اسماعیلی عبیدیوں نے افریقہ، اثنا عشریوں نے عراق و فارس اور قرامطیوں نے حجاز و بحرین پر پنجے گاڑ دیے۔ چونکہ سندھ اور بلوچستان کے ساحل، بحرین اور عمان کے قریب تھے، اس لیے وہاں کے مذہبی و سیاسی انقلابات بہت جلد یہاں بھی اثر انداز ہوئے اور لگ بھگ ۳۷۰ھ میں سندھ کے سومرہ قبائل نے اسماعیلی مذہب اختیار کر لیا جبکہ اسی دوران ملتان میں قرامطیوں نے اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ اس طرح برصغیر ایک طرف مذہبی فرقہ واریت اور دوسری طرف سیاسی انتشار کی دلدل میں پھنس گیا۔

◆◆◆

---

[1] کتاب الھند البیرونی ص ۳۴۲

کتابیات

حصہ پنجم

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	﴿حرف الف﴾	
1	آئینہ تاریخ	از پروفیسر بی این ورما
2	انساب الاشراف	احمد بن یحییٰ البلاذری
3	الانساب	ابوسعد عبدالکریم بن محمد السمعانی
4	الانساب	ابوالمنذر الصحاری
5	احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم	ابوعبداللہ البشار المقدسی
6	اخبار الدول وآثار الاول فی التاریخ	از احمد بن یوسف القرمانی
7	الامیر عبدالقادر رائد الکفاح الجزائری	از دکتور یحییٰ بوعزیز
8	امیر البیان شکیب ارسلان	از احمد شرباصی
9	اعمال الاعلام فیمن بویع قبل الاحتلام	لسان الدین الخطیب
10	الاحاطۃ فی اخبار غرناطۃ	لسان الدین الخطیب
11	الاندلسیون المواركة	دکتور عادل سعید بشتاوی
12	الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ	ابن حجر عسقلانی
13	اعیان العصر واعوان النصر	صلاح الدین ایبک الصفدی
14	افغانستان در مسیر تاریخ	از میر غلام محمد غبار
15	الاعلام	خیر الدین زرکلی
16	الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ	شہاب الدین الجروی السلاوی
17	انباء الغمر بابناء العمر	ابن حجر عسقلانی
18	الانس الجلیل بتاریخ القدس والخلیل	ابوالیمن عبدالرحمٰن بن محمد الحنبلی
19	الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب	ابن عبدالبر المالکی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
		﴿حرف الف﴾	
مذکور نہیں	1	مطبوعہ رام پرشاد اینڈ برادرز، آگرہ	۱۹۳۳ء
۲۷۹ھ	13	دار الفکر، بیروت	۱۹۹۶ء
۲۶۲ھ	1	دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد، دکن ہند	۱۹۶۲ء
۵۱۱ھ	1	المکتبۃ الشاملۃ	مذکور نہیں
۳۸۱ھ	1	دار صادر، بیروت	۱۳۱۱ھ
۱۰۱۹ھ،۱۶۱۰ء	2	عالم الکتب بیروت	۱۹۹۳ء،۱۴۱۳ھ
مذکور نہیں	1	الدار العربیۃ للکتاب، تیونس	۱۹۷۷ء
مذکور نہیں	1	دار الکتاب العربی بمصر	۱۹۶۳ء
۷۷۶ھ	2	دار الکتب العلمیہ بیروت	۲۰۰۳ء
۷۷۶ھ	4	دار الکتب العلمیہ، بیروت	۱۴۲۴ھ
مذکور نہیں	1	رابع الطبقی جمعہ القاہرہ	۲۰۰۱ء
۸۵۲ھ	8	دار الکتب العلمیہ	۱۴۱۵ھ
۷۶۴ھ	5	دار الفکر المعاصر، بیروت	۱۹۹۸ء
مذکور نہیں	1	مرکز نشر انقلاب، کابل	۱۹۶۷ء
۱۹۷۶ء	8	دار الملایین	۲۰۰۲ء
۱۳۱۵ھ	3	دار الکتاب، الدار البیضاء	مذکور نہیں
۸۵۲ھ	4	لجنۃ احیاء التراث الاسلامی، مصر	۱۹۶۹ء
۹۲۸ھ	2	مکتبہ وندیس، عمان	مذکور نہیں
۴۶۳ھ	4	دار الجیل، بیروت	۱۹۹۲ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	﴿حرف ب﴾	
21	بابوات من الحیٔ الیہودی	مصنف: بوائیم بریز، مترجم: خالد اسعد عیسیٰ
22	البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب	ابن عذاری المراکشی
23	بدیع الزمان سعید نورسی، حیات وواقعات	زبیر کوندوزالپ، مصطفیٰ صونغور
24	البدایہ والنہایہ	ابن کثیر دمشقی
	﴿حرف ت﴾	
25	تاریخ الاسلام فی الہند	عبدالمنعم النمر
26	تجارب الامم وتعاقب الہمم	ابوعلی احمد بن یعقوب ابن مسکویہ
27	تاریخ بلوچ وبلوچستان	میر نصیر خان احمد زئی کمبرانی بلوچ
28	تذکرۃ الحفاظ	شمس الدین الذہبی
29	تاریخ الدولۃ العلیۃ العثمانیۃ	فرید بک المحامی
30	تاریخ الدولۃ العثمانیۃ	مصنف: دکتور یلماز اوزتونا مترجم: عدنان محمود سلمان
31	تاریخ عثمانی	مصنف: اسماعیل حقی اوزون تشارشیلی مترجم: ڈاکٹر ایرج نوبخت
32	تاریخ الدولۃ العثمانیۃ وعلاقاتہا الخارجیۃ	از دکتور علی حسون
33	تاریخ سلاطین بنی عثمان من اول نشأتہم حتی الآن (تاریخ سلاطین آل عثمان)	از عزتلو یوسف بیگ آصاف
34	تاریخ عجائب الآثار فی التراجم والاخبار	عبدالرحمٰن بن حسن الجبرتی
35	التاریخ الاسلامی	دکتور محمود شاکر

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
﴿حرف ب﴾			
مذکور نہیں	1	دار حسان للنشر والتوزیع، دمشق	۱۹۸۳ء، ۱۴۰۳ھ
۶۹۶ھ	4	دار الثقافۃ، بیروت	۱۹۸۳ء
مذکور نہیں	1	بیت السلام	۲۰۱۹ء
۷۷۴ھ	21	دار ہجر	۲۰۰۳ء
﴿حرف ت﴾			
۱۹۹۱ء	1	المؤسسۃ الجامعیۃ للنشر والتوزیع	۱۹۸۱ء
۳۴۱ھ	7	سروش طہران	۲۰۰۴ء
مذکور نہیں	3	نوری نصیر خان مرکز اشاعت، کوئٹہ	۱۹۹۴ء
۷۴۸ھ	4	دار الکتب العلمیۃ بیروت	۱۹۹۸ء
۱۳۳۸ھ	1	دار النفائس، بیروت، ۱۴۰۱ ہجری	۱۹۸۱ء
۲۰۱۴ء	2	مؤسسۃ فیصل، استنبول	۱۹۹۰ء
۱۹۷۷ء	6	ترک تاریخ، انقرہ	۱۹۷۳ء
مذکور نہیں	1	المکتب الاسلامی، بیروت	۱۹۹۴ء، ۱۴۱۵ھ
مذکور نہیں	1	مؤسسۃ ہنداوی، مصر	۲۰۱۴ء
۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۲ء	4	دار الکتب المصریۃ، قاہرہ	۱۹۹۸ء
۲۰۱۴ء	22	المکتب الاسلامی بیروت	۱۹۹۵ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
36	تاریخ الدولۃ العثمانیۃ	دکتور سید محمد
37	تمدن عرب	مصنف گستاؤلی بان مترجم سید علی بلگرامی
38	ترکیا ونفط العراق	خالد ابو ہریرۃ
39	التاریخ الیہودی العام	دکتور صابر طعیمہ
40	التاریخ الاندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ	عبد الرحمٰن علی الحجی
41	التاریخ الاسلامی	دکتور احمد شلبی
42	تاریخ العرب وحضارتہم فی الاندلس	دکتور خلیل سامرائی
43	تاریخ افتتاح الاندلس	ابن قوطیہ
44	تاریخ علماء الاندلس	ابو الولید ابن الفرضی
45	تاریخ الادب الاندلسی عصر الطوائف والمرابطین	دکتور احسان عباس
46	التاریخ الاسلامی العام	دکتور علی ابراہیم حسن
47	تاریخ سندھ	علامہ سید سلیمان ندوی
48	تاریخ خلیفہ بن خیاط	خلیفہ بن خیاط العصفری
49	تاریخ ابن خلدون (دیوان المبتدأ والخبر)	عبد الرحمٰن ابن خلدون
50	تاریخ الاسلام تحقیق عبد السلام تدمری	شمس الدین الذہبی
51	تاریخ الاسلام تحقیق دکتور بشار عواد	شمس الدین الذہبی
52	تاریخ افریقیا الشمالیہ	مصنف: اندری جولیان، مترجم: محمد مزالی
53	التعدیل والتجریح لمن خرج عنہ البخاری فی الجامع الصحیح	سلیمان بن خلف ابو الولید القرطبی الباجی
54	تاریخ ہندوستان	از مولوی ذکاء اللہ دہلوی
55	تاریخ ہندوستان، نوشتہ قدیم ویونانی مؤرخین	دینا ناتھ پوری ایم اے

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
مذکور نہیں	مذکور نہیں	مکتبۃ الآداب، قاہرہ	۱۴۲۸ھ، ۲۰۰۸ء
۱۹۳۱ء	1	اعظم پریس، حیدر آباد دکن	۱۹۳۶ء
مذکور نہیں	مذکور نہیں	ویب سائٹ: ترکیا الآن	یکم مارچ ۲۰۲۰ء
مذکور نہیں	مذکور نہیں	دار الجیل، بیروت	۱۴۱۱ھ، ۱۹۹۱ء
۲۰۲۱ء	1	دار القلم، دمشق	۱۹۸۱ء
۲۰۰۰ء	10	مکتبۃ النہضۃ المصریۃ، قاہرہ	۱۹۸۷ء
مذکور نہیں	1	دار الکتب الجدیدۃ المتحدۃ، بیروت لبنان	۲۰۰۰ء
۳۶۷ھ	1	دار الکتاب المصری، قاہرۃ	۱۹۸۹ء
۴۰۳ ہجری	2	مکتبۃ الخانجی، قاہرہ	۱۹۸۸ء
۱۳۴۴ھ	1	دار الثقافۃ، بیروت	۱۹۷۸ء
مذکور نہیں	1	مکتبۃ النہضۃ المصریۃ	۱۹۶۳ء
۱۹۵۳ء	1	دار الاشاعت، کراچی	۱۹۹۵ء
۲۳۰ھ	1	دار القلم، دمشق، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت	۱۳۹۷ھ
۸۰۸ھ	8	دار الفکر، بیروت	۱۹۸۸ء
۷۴۸ھ	52	دار الکتاب العربی، بیروت	۱۹۹۳ء
۷۴۸ھ	15	دار الغرب الاسلامی	۲۰۰۳ء
مذکور نہیں	1	مؤسسۃ نوال الثقافیۃ	۱۹۶۸ء
۴۷۳ھ	3	وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ المغرب	مذکور نہیں
۱۹۱۰ء	10	انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ	۱۹۱۳ء
مذکور نہیں	1	نولکشور پریس لکھنؤ	۱۹۲۷

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
56	تاریخ تمدن ہند	محمد مجیب
57	تاریخ ہند	تاپاررومیلا
58	تاریخ ہند	ڈاکٹر محمد شیخ اقبال، لالہ رام پرشاد پروفیسر ہسٹری گورنمنٹ کالج لاہور
59	تاریخ فرشتہ	محمد قاسم فرشتہ، مترجم: مشفق خواجہ
60	تاریخ طبری	محمد بن جریر الطبری
61	تاریخ سندھ	عبدالحلیم شرر
62	تاریخ یعقوبی	احمد بن ابی یعقوب
63	تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی	ابوزرعۃ الدمشقی
64	تاریخ دمشق	علامہ ابن عساکر
65	تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ)	مصنف محمد قاسم فرشتہ مترجم مشفق خواجہ
	﴿حرف ج﴾	
66	جامع الدول تاریخ الدولۃ العثمانیہ	ازمنجم باشی احمد بن لطف اللہ
67	جمہرۃ انساب العرب	علامہ ابن حزم
68	جمہرۃ نسب قریش	زبیر بن بکار
	﴿حرف چ﴾	
69	چچ نامہ فارسی (فتح نامہ سندھ)	قاضی محمد اسماعیل بن علی، مترجم عربی سے فارسی: علی بن حامد الکوفی تحقیق ڈاکٹر عمر بن داؤد پوتہ
70	چچ نامہ اردو ترجمہ	مترجم اختر رضوی، تحقیق نبی بخش خان بلوچ

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
مذکور نہیں	1	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۹۹ء
	1	مرکز تحقیقات رایانہ، اصفہان	مذکور نہیں
	1	ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور	۱۹۱۳ء
۲۰۰۵ء	4	المیزان، لاہور	۲۰۰۸ء
۳۱۰ھ	11	دار التراث، بیروت	۱۳۸۷ھ
۱۹۲۶ء	1	دلگداز پریس، لکھنؤ	۱۹۰۷ء
۲۹۴ھ	3	مکتبۃ الحیدریۃ	۱۹۶۴ء
۲۸۱ھ	1	مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق	
۵۷۱ھ	80	دار الفکر، دمشق	۱۹۹۵ء
	4	المیزان، لاہور	۲۰۰۸ء
		﴿حرف ج﴾	
۱۱۱۳ھ.....۱۷۰۲ء	1	دار الکتب العلمیۃ	۲۰۲۰ء
۳۵۶ھ	1	الدار المصریۃ، قاہرۃ	۱۹۹۶ء
۴۵۶ھ	1	مطبع المدنی	۱۳۸۱ھ
		﴿حرف چ﴾	
۶۱۳ھ	1	مطبوعہ مرکز تحقیقات رایانہ، اصفہان	مذکور نہیں
	1	سندھی ادبی بورڈ، جام شورو	۲۰۰۸ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	﴿حرف ح﴾	
71	حدود العالم من المشرق الی المغرب	مؤلف مجہول
72	حاجی صاحب ترنگ زئی	عزیز جاوید
73	الحلل السندسیۃ فی الاخبار والآثار السندسیۃ	امیر شکیب ارسلان
74	الحلۃ السیراء	ابن الابار البلنسی
75	الحماسۃ المغربیۃ	ابو العباس احمد التادلی
76	الحلل الموشیۃ فی ذکر اخبار المراکشیۃ	آٹھویں صدی ہجری کا مجہول اندلسی مورخ
	﴿حرف خ﴾	
77	خلافتِ اسلامیہ سقوط و احیاء	حق نواز
78	خریدۃ العجائب وفریدۃ الغرائب	سراج الدین ابو حفص ابن الوردی
79	خریدۃ القصر وجریدۃ العصر، قسم شعراء المغرب والاندلس، الجزء الثانی	عماد الدین کاتب الاصفہانی
	﴿حرف د﴾	
80	الدولۃ العثمانیۃ، عوامل النہوض واسباب السقوط	دکتور علی محمد الصلابی
81	دولتِ عثمانیہ	از ڈاکٹر محمد عزیر
82	الدولۃ العثمانیۃ فی التاریخ الاسلامی الحدیث	دکتور اسماعیل احمد یاغی
83	الدولۃ العثمانیۃ المجہولۃ	دکتور احمد آق کوندوز، دکتور سعید اوزتورک
84	الدماء المدہورۃ لاجل النفط، مضمون نگار	عزیز اوجل
85	دور الیہود فی اسقاط الخلافۃ العثمانیۃ	صیلۃ بنت سعد بن محمد السلمی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
		﴿حرف ح﴾	
۳۷۲ھ	1	دار الثقافة للنشر، قاہرہ	۱۴۲۳ھ
	1	ادارہ تحقیق وتصنیف، پاکستان، لاہور	۱۹۸۱ء
۱۹۳۶ء	3	دار الکتب العلمیة، بیروت	۱۹۹۷ء
۶۵۸ھ	1	دار المعارف، قاہرہ	۱۹۸۵ء
۲۰۹ھ	2	دار الفکر المعاصر، بیروت	۱۹۹۱ء
	1	دار الرشاد الحدیثة	۱۹۷۹ء
		﴿حرف خ﴾	
	1	زبیر پبلیکیشنز پاکستان	
۸۵۲ھ		مکتبة الثقافة، قاہرہ	۲۰۰۸ء
۵۹۷ھ	1	الدار التونسیة للنشر	۱۹۷۱ء
		﴿حرف د﴾	
	1	دار التوزیع والنشر، مصر	۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۱ء
	2	دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ہندوستان	۲۰۰۹ء
	1	مکتبة العبیکان، السعودیة	۱۹۹۸ء
	1	وقف البحوث العثمانیة، استنبول	۲۰۰۸ء
		ویب سائٹ: ترک پریس (TurkPress.co)	۱۷ نومبر ۲۰۱۳ء
	1	جامعة ام القریٰ بمکة المکرمة	۱۴۲۲ھ، ۲۰۰۱ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
86	دولۃ الاسلام فی الاندلس	محمد عبداللہ عنان
87	دائرۃ المعارف للقرن العشرین	محمد فرید وجدی
88	الدرر الکامنۃ فی اعیان المائۃ الثامنۃ	ابن حجر العسقلانی
	﴿حرف ذ﴾	
89	الذخیرۃ فی محاسن اہل الجزیرۃ	علی بن بسام الشنترینی
90	الذخائر والتحف	القاضی رشید بن زبیر
	﴿حرف ر﴾	
91	الرجل الصنم مصطفی کمال اتاتورک	آرم سٹرونگ عربی ترجمہ عبداللہ عبدالرحمن
92	الروض المعطار فی خبر الاقطار	ابو عبداللہ محمد بن عبدالمنعم الحمیری
93	رحلۃ ابن بطوطۃ (تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار)	محمد بن عبداللہ ابن بطوطۃ
	﴿حرف ز﴾	
94	الزلاقۃ معرکۃ من معارک الاسلام	جمیل عبداللہ محمد المصری
	﴿حرف س﴾	
95	السلطان عبدالحمید الثانی آخر سلاطین العثمانیین الکبار	دکتور محمد حرب
96	سمط النجوم العوالی فی انباء الاوائل والتوالی	عبدالملک بن حسین العصامی المکی
97	سیرت سلطان ٹیپو شہید	مولانا محمد الیاس ندوی
98	السلوک لمعرفۃ دول الملوک	تقی الدین المقریزی
99	سیر اعلام النبلاء	شمس الدین الذہبی
100	سنن الترمذی	محمد بن عیسیٰ سورۃ الترمذی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
۱۳۰۶ھ	5	مکتبہ الخانجی، قاہرہ	۱۹۹۷ء
۱۹۵۴ء	10	دارالمعرفۃ، بیروت	۱۹۷۱ء
۸۵۲ھ	6	مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن	۱۹۷۴ء
		﴿حرف ذ﴾	
۵۴۴ھ	8	الدار العربیۃ للکتاب، لیبیا	۱۹۷۹ء
پانچویں صدی ہجری	1	کویت	۱۹۵۹ء
		﴿حرف ر﴾	
	1	الالباب للنشر والتوزیع	۲۰۱۳
۹۰۰ھ	1	مؤسسۃ الناصر للثقافۃ، بیروت	۱۹۸۰ء
۷۷۹ھ	5	اکادیمیۃ المملکۃ المغربیۃ، الرباط	۱۳۱۷ھ
		﴿حرف ز﴾	
	1	الجامعۃ الاسلامیۃ بالمدینۃ المنورۃ	مذکور نہیں
		﴿حرف س﴾	
	1	دارالقلم، دمشق	۱۴۱۰ھ، ۱۹۹۰ء
۱۱۱۱ھ	4	دارالکتب العلمیۃ، بیروت	۱۹۹۸ء
	1	مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنو	۱۹۹۶ء۔ ۱۴۱۷ھ
۸۴۵ھ	7	دارالکتب العلمیۃ	۱۹۹۷ء
۷۴۸ھ	25	مؤسسۃ الرسالۃ	۱۹۸۵ء
۲۷۹ھ	5	مطبع مصطفیٰ بابی الحلبی، مصر	۱۹۷۵ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	﴿حرف ش﴾	
101	شذرات الذہب فی اخبار من ذہب	ابن العماد العکری الحنبلی
	﴿حرف ص﴾	
102	صحیح البخاری	محمد بن اسماعیل ابوعبداللہ البخاری
103	صحوۃ الرجل المریض سلطان عبدالحمید الثانی والخلافۃ الاسلامیۃ	دکتور موفق بنی المرجۃ
104	صفۃ جزیرۃ الاندلس	ابوعبداللہ محمد بن عبدالمنعم الحمیری
105	صورۃ الارض	محمد بن حوقل البغدادی الموصلی
106	الصراع بین یوسف الاول واثرہ فی اضعاف مملکۃ غرناطۃ	دکتورۃ نورۃ بنت محمد بن عبدالعزیز التویجری
	﴿حرف ط﴾	
107	طبقات ابن سعد (الطبقات الکبریٰ)	محمد بن سعد
	﴿حرف ع﴾	
108	عثمانی ترک	ڈاکٹر ایس ایم علی
109	عجائب الآثار فی التراجم والاخبار	از عبدالرحمٰن بن حسن الجبرتی
110	العثمانیون فی التاریخ والحضارۃ	دکتور محمد حرب
111	العبر فی خبر من غبر	شمس الدین الذہبی
112	عہد اسلامی کا ہندوستان	مولانا ریاست علی ندوی
113	عرب وہند کے تعلقات	علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم
114	عیون الاخبار	ابن قتیبۃ الدینوری
115	عیون الانباء فی طبقات الاطباء	ابن ابی اصیبعہ

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
		﴿حرف ش﴾	
۱۰۸۹ھ	11	دار ابن کثیر، دمشق	۱۹۸۶ء
		﴿حرف ص﴾	
۲۵۶ھ	9	دار طوق النجاۃ	۱۴۲۲ھ
	1	مؤسسۃ صقر الخلیج، الکویت	۱۹۸۴ء
۹۰۰ھ	1	دار الجیل، بیروت	۱۹۸۸ء
۳۶۷ھ	2	دار صادر، بیروت	۱۹۳۸ء
	1	نشرت فی مجلۃ جامعۃ ام القریٰ، السنۃ العاشرۃ، العدد الخامس عشر	۱۳۱۷ھ
		﴿حرف ط﴾	
۲۳۰ھ	8	دار صادر، بیروت	۱۹۶۸ء
		﴿حرف ع﴾	
	1	کمال پبلشرز، کراچی	۱۹۹۶ء
۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۲ء	4	دار الکتب المصریۃ، قاہرہ	۱۹۹۸ء
	1	المرکز المصری للدراسات العثمانیۃ، قاہرہ	۱۴۱۴ھ، ۱۹۹۳ء
۷۴۸ھ	4	دار الکتب العلمیۃ، بیروت	مذکور نہیں
	1	ادارۃ المصنفین، پٹنہ	۱۹۵۰ء
۱۹۵۳ء	1	مطبوعہ دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۱۹۴۹ء
۲۷۶ھ	4	دار الکتب العلمیۃ	۱۴۱۸ھ
۲۶۸ھ	1	دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت	مذکور نہیں

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	﴿حرف غ﴾	
116	غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء	شمس الدین ابن جزری
117	غرناطۃ فی ظل بنی الاحمر	ڈاکٹر یوسف شکری فرحات
	﴿حرف ف﴾	
118	فی اصول التاریخ العثمانی	احمد عبدالرحیم مصطفیٰ
119	فقہ التمکین عند دولۃ المرابطین	علی محمد الصلابی
120	فتوح البلدان	احمد بن یحییٰ البلاذری
121	فیروز اللغات فارسی اردو	مقبول بدخشانی
	﴿حرف ق﴾	
122	قراءۃ جدیدۃ فی تاریخ الدولۃ العثمانیۃ	زکریا سلیمان بیومی
123	قدیم تاریخ ہند	ونسنٹ اے سمتھ، مترجم-مولوی جمیل الرحمٰن
124	قدیم ہندوستان کی تاریخ	رما شنکر ترپاٹھی، مترجم- سید تقی حسن نقوی
	﴿حرف ک﴾	
125	کیف سقطت الدولۃ العثمانیۃ	سلیمان بن صالح الخراشی
126	کتاب الہند (تحقیق ماللہند)	ابوالریحان البیرونی
127	کتاب الولاۃ	ابو عمرو الکندی
128	الکامل فی التاریخ	از علامہ ابن الاثیر الجزری ابوالسعادات
	﴿حرف ل﴾	
129	لسان العرب	ابن منظور افریقی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
		﴿حرف غ﴾	
۸۳۳ھ	3	مکتبہ ابن تیمیہ	۱۳۵۱ھ
	1	دارالجلیل، بیروت	۱۹۹۳ء
		﴿حرف ف﴾	
	1	دارالشروق، قاہرہ	۱۹۸۴ء
	1	مؤسسۃ اقرا للنشر والتوزیع، قاہرہ	۲۰۰۶ء
۴۷۹ھ	1	مکتبۃ الہلال	۱۹۸۸ء
	1	فیروز سنز، لاہور	۲۰۰۳ء
		﴿حرف ق﴾	
	1	عالم المعرفۃ، جدۃ	۱۴۱۱ھ، ۱۹۹۱ء
	1	جامعہ عثمانیہ، دکن	۱۹۲۴ء
	1	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	
		﴿حرف ک﴾	
	1	دارالقاسم، ریاض	۱۴۲۰ھ
۴۴۰ھ	1	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۳ھ
۳۵۵ھ	1	دارالکتب العلمیہ	۱۴۲۴ھ
۶۳۰ھ	10	دارالکتاب العربی، بیروت	۱۹۹۷ء
		﴿حرف ل﴾	
۷۱۱ھ	15	دارصادر، بیروت	۱۴۱۴ھ

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	﴿حرف م﴾	
130	مذکرات السلطان عبدالحمید	مصنف: سلطان عبدالحمید الثانی مترجم ومرتب: دکتور محمد حرب
131	موجز تاریخ الیہود	محمود بن عبدالرحمن قدح
132	مسند احمد	ابوعبداللہ امام احمد بن حنبل
133	معجم المفسرین من صدر الاسلام حتی العہد الحاضر	از عادل نویہض
134	الموسوعۃ المیسرۃ فی الادیان والمذاہب والاحزاب المعاصرۃ	الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی۔ تحقیق: از دکتور مانع بن حماد الجہنی
135	مصطفی صبری المفکر الاسلامی	دکتور مفرح بن سلیمان القوسی
136	الموسوعۃ العربیۃ العالمیۃ	
137	موقف الدولۃ العثمانیۃ من الحرکۃ الصہیونیۃ	حسان علی حلاق
138	مصطفی کامل فی محکمۃ التاریخ	دکتور عبدالعظیم رمضان
139	المقتبس من انباء الاندلس	ابن حیان القرطبی
140	مروج الذہب ومعادن الجوہر	علی بن الحسین المسعودی
141	المقتبس فی ذکر ولاۃ الاندلس	محمد بن فتوح المیورقی
142	المسالک والممالک	ابوعبید عبداللہ بن عبدالعزیز البکری
143	المسالک والممالک	عبیداللہ ابن خرداذبہ
144	المغرب فی حلی المغرب	ابوالحسن علی بن موسیٰ المغربی الاندلسی
145	المطرب من اشعار اہل المغرب	ابن دحیہ کلبی
146	المعجب فی تلخیص اخبار المغرب	محی الدین عبدالواحد المراکشی

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
﴿حرف م﴾			
١٩١٨ء	1	دار القلم، دمشق	١٤١٢ھ-١٩٩١ء
	1	کلیۃ الدعوۃ واصول الدین	مذکور نہیں
٢٤١ھ	45	مؤسسۃ الرسالۃ	٢٠٠١ء
	2	مؤسسۃ نویھض، بیروت	١٤٠٩ھ، ١٩٨٨ء
	2	دار الندوۃ الاسلامیۃ	١٣٢٠ھ
	1	دار القلم، دمشق	٢٠٠٦ء، ١٤٢٧ھ
		المکتبۃ الشاملۃ	
	1	جامعۃ بیروت العربیۃ، دار الاحد، بیروت	١٩٧٨ء، ١٣٩٨ھ
	1	مکتبۃ الاسکندریۃ	٢٠٠٣ء
٣٦٩ھ	1	المجلس الاعلیٰ للشؤون الاسلامیۃ، قاہرہ	١٣٩٠ھ
٣٢٦ھ	5	منشورات الجامعۃ اللبنانیۃ، بیروت	١٩٦٦ء
٣٨٨ھ	1	الدار المصریۃ للتالیف والنشر، قاہرہ	١٩٦٦ء
٣٨٧ھ	2	دار الغرب الاسلامی	١٩٩٣ء
٣٨٠ھ	1	دار صادر، بیروت	١٨٨٩ء
٦٨٥ھ	2	دار المعارف، قاہرہ	١٩٥٥ء
٦٣٣ھ	1	مکتبۃ الشاملۃ	
٦٣٧ھ	1	المکتبۃ العصریۃ، صیدا، بیروت	٢٠٠٦ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
147	مطالعہ پاک و ہند	ڈاکٹر مقصود چودھری،
148	معجم الشعراء	ابوعبید اللہ محمد بن عمران المرزبانی
149	معرفۃ الصحابۃ	ابونعیم الاصبہانی
150	مختصر تاریخ دمشق	ابن منظور الافریقی
151	المعارف	ابن قتیبۃ الدینوری
152	المسالک والممالک	ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الفارسی الاصطخری الکرخی
153	معجم البلدان	یاقوت حموی
	﴿حرف ن﴾	
154	نحن والقاتیکان واسرائیل	انیس القاسم
155	نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر	حکیم عبدالحئی الحسنی
156	نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب	از احمد بن المقری التلمسانی
157	نہایۃ الارب فی فنون الادب	شہاب الدین النویری
158	نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق	محمد بن عبداللہ الحسنی الشریف الادریسی
159	نبذۃ العصر فی احوال ملوک بنی نصر	نویں صدی ہجری کا نامعلوم اندلسی مؤرخ
	﴿حرف و﴾	
160	والدی السلطان عبدالحمید الثانی	شہزادی عائشہ عثمان بنت عبدالحمید، ترجمہ ترکی سے عربی از صالح سعداوی
161	وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان	شمس الدین ابن خلکان

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
	1	نشتر اکیڈمی	۱۹۸۶ء
۳۸۴ھ	1	دار الکتب العلمیہ، بیروت	۱۹۸۲ء
۴۳۰ھ	7	دار الوطن، ریاض	۱۹۹۸ء
۱۱۷۷ھ	29	دار الفکر للنشر والتوزیع، دمشق	۱۹۸۴ء
۴۷۶ھ	1	الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، قاہرہ	۱۹۹۴ء
۳۳۶ھ	1	دار صادر، بیروت	۲۰۰۴ء
۶۲۶ھ	7	دار صادر، بیروت	۱۹۹۵ء
		﴿حرف ن﴾	
	1	مرکز دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، تہران	
۱۴۳۱ھ	8	دار ابن حزم، بیروت	۱۴۳۰ھ، ۱۹۹۹ء
۱۰۴۱ھ	5	دار صادر، بیروت	۱۹۹۷ء
۷۳۳ھ	33	دار الکتب والوثائق القومیہ، قاہرہ	۱۴۲۳ھ
۵۶۰ھ	2	عالم الکتب، بیروت	۱۴۰۹ھ
	1	دار احسان، دمشق	۱۴۰۴ھ
		﴿حرف و﴾	
	1	دار البشیر، عمان اردن	۱۴۱۱ھ، ۱۹۹۱ء
۶۸۱ھ	7	دار صادر، بیروت	۱۹۹۴ء

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف
	﴿حرف ہ﴾	
162	ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں	مولانا قاضی اطہر مبارک پوری
163	ہوئے تم دوست جس کے	ڈاکٹر حقی حق
	﴿حرف ی﴾	
164	یہود الدونمة	سید محمد علی قطب
165	الیہود والماسونیة	علامہ عبدالرحمن الدوسری

سن وفات	جلدیں	ناشر	سن اشاعت
		﴿حرف و﴾	
۱۹۹۶ء	1	ندوۃ المصنفین، دہلی	۱۹۶۷ء
	1	شفیق پبلیکیشنز، لاہور	۲۰۰۷ء
		﴿حرف ی﴾	
	1	دار الانصار	۱۹۷۸ء
	1	دار السنۃ	۱۴۱۴ھ مطابق ۱۹۹۳ء

Death	Publisher	Publication
1856	A.B University of Illinois Encyclopaedia Britannica	19 17
1931	T.Fisher Unwin,London	1888
	Ossian Publrs.,Glasgow	1993
1883	Chatto & Windus London	1913
	Macmillan co London	1951
	15th Edition ,32 Vol	2010

No.	Name Book	Writer
1	THE CONGRESS AND TREATY OF PARIS	SEBASTIAN SOLON SIMPSON
2	Moors in Spain	stanly lane poole
3	Hidden Menace to World Peace	James Gbb Stuart
4	The Muslims in spain	Reinhart Dozy
5	History of Arabs	Philip Hitti 1978
6	Encyclopædia Britannica	

تاریخِ امتِ مسلمہ

جلدِ اول

تحقیق
مؤرخ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

المنہل پبلشر
0321-3135009|0321-2000870
www.almanhalpublisher.com
almanhalpublisher@gmail.com

تاریخ اُمتِ مُسلمہ

جلدِ دُوم

تحقیق

مورخ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

المنهل پبلشرز
0321-3135009 | 0321-2000870
www.almanhalpublisher.com
almanhalpublisher@gmail.com

تاریخ امت مسلمہ
جلد ششم
تحقیق
مورخ اسلام مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ
زیر طبع
المنہل پبلشرز
0321-3135009|0321-2000870
www.almanhalpublisher.com
almanhalpublisher@gmail.com

تاریخ اُمت مسلمہ کے چھ حصے ایک نظر میں

مبادیاتِ تاریخ، احوالِ سابقین علیہم السلام اور ان کی معاصر سلطنتیں، ما قبل از اسلام دنیا کی حالت، سیرتِ نبویہ ﷺ، عہدِ خلافتِ راشدہ، دورِ فتوحات (خلافتِ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تا خلافتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ)، امہات المؤمنین، عشرہ مبشرہ اور اکابر صحابہ کا تعارف، اسباقِ تاریخ

تاریخی روایات کی تحقیق وتنقیح کے اصول، دورِ مشاجرات، خلافتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ، جنگِ جمل، جنگِ صفین، خلافتِ حضرت حسن رضی اللہ عنہ، خلافتِ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، اموی دور، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی جدوجہد، سانحہ کربلا، سانحہ حرہ، خلافت وشہادتِ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، دورِ فتن سے حاصل شدہ اسباق، پہلی صدی ہجری میں امت کی علمی واخلاقی تربیت کرنے والے مشاہیر صحابہ وتابعین کا تعارف، اہم شبہات کے جوابات

خلافتِ بنو امیہ وبنو عباس، خلافتِ عباسیہ کی معاصر آزاد مسلم حکومتیں، ائمہ اربعہ اور عظیم مجددین ومصلحین کے کارنامے، فرقوں کے آغاز اور ظہور کی تاریخ، باطل فرقوں کی حکومتیں، اہم شبہات کے جوابات

تاریخِ مغرب، صلیبی جنگیں، یورشِ تاتار، دولتِ ایوبیہ، دولتِ ممالیک، تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام، تاریخِ برصغیر، سلطنتِ عثمانیہ، دورِ تاسیس واستحکام، دولتِ اسلامیہ اندلس، دورِ تاسیس تا دورِ مرابطین وموحدین، امتِ مسلمہ کی فکری ونظریاتی رہنمائی کرنے والے اہم مجددین، فقہاء اور صوفیاء کی جدوجہد کا تذکرہ

زوال وسقوط دولتِ اسلامیہ اندلس، سلطنتِ عثمانیہ دورِ عروج تا سقوطِ خلافت، سلطنتِ مغلیہ ہندوستان، بابر تا بہادر شاہ ظفر

برطانوی استعماری حکومت، تحریکاتِ آزادی، تحریکِ پاکستان، عالمِ اسلام کے اہم ممالک کی مختصر تاریخ، غیر مسلم دنیا کے اہم ممالک کی مختصر تاریخ، مسلم تہذیب وتمدن اور مسلمانوں کے علمی وفنی کارناموں پر ایک نظر

بلاک A-1، گلشنِ جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی
0321-3135009 | 0321-2000870
almanhalpublisher@gmail.com
almanhalpublisher@hotmail.com
www.almanhalpublisher.com